DATA ENTERED

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ) ...... تا ...... (سُوْرَةُ هُوْدٍ)

(جلد: ۵)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم ۔ اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ) ...... تا ...... (سُوْرَۃُ ھُوْدٍ)

(جلد: ۵)

مؤلف

ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی

ایم۔اے پی ایچ۔ڈی

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

۲۹۷۶۱۴
۱ ا لم ت
109513
۱۵ ۲۰۱۲ء

نام کتاب	:	تفسیر روح القرآن
مؤلف	:	ڈاکٹر مولانا محمد اسلم صدیقی
ناشر	:	ادارہ هُدًى لِلنَّاسِ
کمپوزنگ	:	زاہد حسین
پرنٹرز	:	محمد ندیم پرنٹنگ پریس، لاہور
تاریخ اشاعت دوئم	:	جنوری 2012ء
تعداد	:	1000
قیمت	:	700 روپے

ملنے کا پتہ

ا۔ 343- مہران بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔فون 042-35426800

۲۔ ادارہ اسلامیات نئی انارکلی لاہور۔

۳۔ مکتبہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور۔

۴۔ ادارہ منشورات ملتان روڈ بالمقابل منصورہ لاہور۔

۵۔ ۳۔کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور۔فون: 042-37248676-37320961

ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ لاہور۔ 042-35417074

۶۔ ادارہ البدر پبلی کیشنز 23 راحت مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

موبائل: 0300-8485030۔فون: 042-37225030

Marfat.com

(ایک ضروری گزارش)

بعض احباب کے اصرار پر ادارہ هُدًی لِلنَّاسِ نے اس کتاب کا نام ''دروس القرآن'' کی بجائے ''تفسیر روح القرآن'' تجویز کیا ہے۔ اس کتاب کی بیشتر جلدیں چونکہ دروس القرآن کے نام سے چھپ چکی ہیں اس لئے اپنے قارئینِ کرام کو کسی خلطِ مبحث یا غلط فہمی سے بچانے کیلئے یہ گزارش ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ مناسب سمجھیں تو اپنے پاس نسخوں میں نام کی تبدیلی کرلیں، اور اگر کہیں کتاب کے اندر سابقہ نام کا ذکر آئے تو اسے بھی نئے نام سے بدل دیں۔

Marfat.com

Marfat.com

صاحبِ تالیف

نام: ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی ابن مولانا فضل کریم صدیقی
(بانی دار العلوم ربانیہ)

ولادت: 4 اپریل 1940ء

تعلیم:
۱...... حافظِ قرآنِ مجید
۲...... تکمیل درسِ نظامی، جامعہ اشرفیہ لاہور
۳...... فاضل عربی، پنجاب بورڈ
۴...... بی۔اے، پنجاب یونیورسٹی
۵...... ایم۔اے، گولڈ میڈلسٹ، پنجاب یونیورسٹی
۶...... پی۔ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی
۷...... فاضل مدینہ یونیورسٹی

تدریس:
۱...... ادب، تفسیر اور حدیث کی تدریس، مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور
۲...... وزیٹنگ پروفیسر ھیلی کالج، پنجاب یونیورسٹی
۳...... وزیٹنگ پروفیسر انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
۴...... وزیٹنگ پروفیسر شعبہ اسلامیات برائے ایم۔اے کلاسز
۵...... وزیٹنگ پروفیسر اسلامک سنٹر برائے ایم فل

خطابت:
۱...... خطیب جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور (ایک مختصر وقت کے لیے)
۲...... خطیب اسلام آباد یونیورسٹی، اسلام آباد

Marfat.com

۳...... خطیب جامع مسجد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مناصب: ۱...... چیئرمین شعبہ مساجد پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲...... چیئرمین ادارہ ھُدًی للناس ، لاہور

تالیفات: دروسِ قرآن

۱...... سورۃ الفاتحہ

۲...... سورۃ البقرہ (جلداول)

۳...... سورۃ البقرہ (جلددوم)

۴...... سورۃ آلِ عمران

۵...... سورۃ النساء

۶...... سورۃ المائدہ

۷...... سورۃ الانعام

۸...... سورۃ الاعراف

۹...... سورۃ الانفال، التوبہ، یونس، ھود (زیرِطبع)

۱۰...... خطباتِ صدیقی (جلداول)

۱۱...... خطباتِ صدیقی (جلددوم)

۱۲...... خطباتِ صدیقی (جلدسوم)

۱۳...... معرفت حق کا سفر

Marfat.com

فہرست مضامین

سُوْرَۃُ الْاَنْفَال کا تعارف	1
سُوْرَۃُ الْاَنْفَال	11
سُوْرَۃُ الْاَنْفَال کا مفہوم	13
سوال کی نوعیت	13
مسلمانوں کی مقصدی حیثیت	14
تقویٰ	15
اصلاح ذات البین	15
اطاعتِ خدا اور رسولؐ	15
پہلی صفت خشیتِ الٰہی	16
دوسری صفت ایمان میں ترقی	17
تیسری صفت توکل علی اللہ	17
چوتھی صفت اقامتِ صلوٰۃ	17
پانچویں صفت انفاق فی سبیل اللہ	18
کما کا مفہوم	19
بدر کیلئے آنحضرتؐ کا نکلنا ایماء الٰہی سے اور ایک مقصدِ حق کیلئے تھا	20
مقصدِ حق کے بروئے کار آنے کی صورت	20
مسلمانوں سے طائفتین میں سے ایک کا وعدہ	21
مسلمانوں کی دعا کی استجابت ایک ہزار فرشتوں کی صورت میں	23
اللہ تعالیٰ کی نصرت اسباب کے پردے میں	24
اللہ تعالیٰ کے مزید احسانات کا بدلہ	27
نعاس کا مفہوم	28
فرشتوں کو احکام	29
فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ ...... الخ کا مفہوم	29
عرب میں جنگ کے دو معروف طریقے	30
احکام تخفیف	31
آنحضرت ﷺ کی آستین سے دستِ غیب کے کارنامے	31

Marfat.com

آیت کا پس منظر	33
منافقین کو خطاب	35
یہود کی طرف اشارہ ہے	36
بدترین خلائق لا یعقل جانور ہیں	36
سنت اللہ	38
تین حقائق کا انکشاف	38
نیکی کا خیال معزز مہمان کی مانند ہے	40
فتنہ سے بچو	41
اللہ کے خصوصی احسانات کا تذکرہ	42
شانِ نزول	44
تقویٰ تمام کمزوریوں کا علاج اور فرقان کی شرطِ اولیں ہے	48
اہلِ تقویٰ پر اللہ کے انعامات	50
آنحضرت ﷺ کی ہجرت تاریخ کے آئینہ میں	50
قریش کا اسلام سے متعلق عام رویہ	53
جسارت کی انتہا	53
عذاب نہ دینے کے دو سبب	54
کعبہ کی تولیت کے حقدار متقی لوگ ہیں، قریش جیسے لوگ نہیں	55
کفار کی زر پاشیاں بھی اسلامی انقلاب کو روک نہ سکیں گی	57
اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کا اظہار	60
ترغیب کے بعد تنبیہ	61
مسلمانوں کو جہاد کا حکم	61
فتنہ سے کیا مراد ہے؟	61
مسلمانوں کو تسلی	63
مالِ غنیمت سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی حیثیت	64
دوسرا تصور	65
ضابطۂ تقسیم	65
جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ کی کارسازی	67
جنگ کا مقصد	68
اللہ کی کارسازی کی دوسری مثال	68
آئندہ پیش آنے والے حالات کیلئے ہدایات	71
ثابت قدمی	71
اللہ کی یاد	72

Marfat.com

اسباب کے پردے میں اللہ کی مدد	73
اللہ اور رسولؐ کی اطاعت	73
صبر کی تلقین	74
مسلمانوں کا کردار اس کی پہچان ہے	75
قریشِ مکہ کی تین برائیاں	75
ایک اہم حقیقت کا انکشاف	77
شیطان کی خاص عادت	78
منافقین کا تبصرہ	81
جواب شرط کے حذف کا فائدہ	81
مبالغہ فی النفی کا مفہوم	82
تاریخ دعوت اور سنت اللہ	83
اللہ تعالیٰ نعمت سے محروم کیوں کرتا ہے؟	83
شَرَّ الدَّوَآبِّ کا مفہوم	84
شَرَّ الدَّوَآبِّ کی ایک مثال	86
یَذَّکَّرُوْنَ کے دو مفہوم	87
معاہدات سے متعلق ضروری ہدایات	87
دشمنانِ اسلام کو وارننگ	90
قوت اور رباط کا مفہوم	91
جنگی تیاری آنحضرت ﷺ کی سنت ہے	92
جنگی تیاری کا معیار	93
انفاق فی سبیل اللہ	93
مصالحت کی اجازت	94
سیاقِ کلام کے اعتبار سے آیت کا مفہوم	95
مسلمانوں کو قتال پر ابھارنے کی ہدایت	97
مسلمان کافر پر بھاری کیوں ہوتا ہے؟	98
مسلمانوں کی ذمہ داری میں تخفیف	98
سیرت و کردار کا اعلیٰ ترین معیار	99
مسلمانوں کو تنبیہ	100
نوشتہ سے مراد	101
مالِ غنیمت سے متعلق حکم	102
بدر کے قیدیوں سے خطاب	104
اسلام میں اجتماعی زندگی کی اہمیت اور اس کی اساسات	106

Marfat.com

پانچ بنیادیں 107

معاہدے کا احترام ضروری ہے 110

مسلمانوں کی مندرجہ بالا بنیادوں پر تشکیل کیوں ضروری ہے؟ 111

مندرجہ بالا صفات کے حامل ہی اسلام کی اصل قوت ہیں 113

دارالکفر کے مسلمانوں کو ترغیب اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تنبیہہ 114

اُولُوا الْاَرْحَامِ کے حقوق مقدم ہیں 115

اُولُوا الْاَرْحَامِ کی وضاحت 115

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ التَّوْبَۃِ کا تعارف 117

بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ 117

سُوْرَۃُ التَّوْبَۃِ کے بنیادی مباحث 118

غلبۂ دین کے اعلان کا وقت 120

سُوْرَۃُ التَّوْبَۃِ 122

مشرکین سے براءت کا اعلان 123

مشرکین کو چار مہینوں کی مہلت 124

یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ سے مراد؟ 125

حج اکبر سے مراد؟ 125

نقضِ عہد نہ کرنے والوں سے ایفائے عہد کرو 126

اشھرِ حرم کا مفہوم 127

توبہ کرنے والے اسلامی اخوت کا حق رکھتے ہیں 127

اسلام سے آگاہی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے 128

دفعِ دخلِ مقدر 131

معاہدہ توڑنے کی دو وجہ 131

متذکرہ خرابیوں کا سبب 133

انفرادی زندگی میں بھی مسلمان دشمنی 133

دشمنی کے باوجود اللہ کی رحمت کا فیضان 134

اسلام سے وفاداری کیلئے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی 135

آیت کے دو مصداق اور قتال کا حکم 135

مسلمانوں کو براہِ راست قتال کا حکم 136

روشنی کا دریچہ 137

ایمان کی آزمائش سنت اللہ ہے 138

Marfat.com

مساجد کی تولیت کن لوگوں کا حق ہے 141
قریش کی نااہلی کی دلیل 142
کفر کے ساتھ نیکیاں قبول نہیں کی جاتیں 142
مساجد کو جمع لانے کا سبب 143
مسجدوں کو آباد رکھنے والوں کی صفات 143
ایک خوش فہمی کا ازالہ 145
مومن کا سراپا 146
تین صفات پر تین بشارتیں 149
اللہ سے ولایت کے رشتے میں کوئی دوسرا رشتہ حائل نہیں ہوسکتا 151
کامیابی صرف نصرت الٰہی سے ہوتی ہے پھر پریشانی کیسی؟ 155
غزوۂ حنین کی تفصیل 156
محاصرۂ طائف 158
تقسیمِ غنائم 159
انصار کے احساسِ محرومی پر آنحضرت ﷺ کا خطاب 159
آیاتِ کریمہ میں بیان کردہ ہدایات 160
مشرکین کے بارہ میں آخری ہدایت 162
اہلِ کتاب کے بارہ میں پالیسی کا اعلان 164
سابقہ آیت میں لگائے گئے الزامات کے ثبوت 168
عزیر علیہ السلام کون ہیں؟ 168
دوسرے الزام کا ثبوت 171
یہود کا اصل چہرہ 173
اہلِ کتاب کی معاندانہ مساعی 173
آپ کی بعثت کا مقصد 174
اہلِ کتاب کا مخلوقِ خدا سے رویہ 175
سونا چاندی جمع کرنے کی مذمت 177
کنز کی حقیقت 177
عذاب کی جھلک 178
خدائی تقویم 179
اشہرِ حرم میں حدود سے تجاوز نہ کرنا 180
نسی کا سبب اور طریقہ 180
غزوۂ تبوک کا پس منظر 183
استقامت کا ایک نمونہ 184

Marfat.com

صحابہ کرامؓ کا ایک تعارف 185
حق و باطل کی آویزش میں حق کا ساتھ ایمان کی دلیل ہے 187
اللہ کا دین کسی کا محتاج نہیں 189
نفیرِ عام کے بعد جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے 190
منافقین کے بہانوں کی حقیقت 191
پروردگار کا دلنواز عتاب 195
معصومیت کا مفہوم 195
منافق کی ایک علامت 196
منافقین کے جھوٹ پر دلیل 196
مصلحتِ الٰہی 197
منافقین کے جھوٹ کے شواہد 198
ایک منافق کی جسارت 198
منافقین کی حقیقت 199
منافق اور مومن میں سوچ کا فرق 200
انفاق قبول نہ کرنے کی وجہ 201
امیر منافقین کی کیفیت 202
غریب منافقین کا حال 203
مصارفِ زکوٰۃ 206
۱......فقراء 206
۲......مساکین 206
۳......عمالِ حکومت 206
۴......مؤلفۃ القلوب 207
۵......الرقاب 207
۶......قرض دار 207
۷......راہِ اللہ میں 208
۸......مسافر 208
منافقین کی ایذا رسانیوں کا ذکر 209
قسموں کی مہم 210
ضمیر واحد لانے کا سبب 210
منافقین کے اصل ارادے 211
اپنے کرتوتوں سے خوفزدہ 211
منافقین کا تعارف 215

Marfat.com

علامتیں	216
منافقین کو دھمکی	217
قرآنِ کریم کا اسلوب	218
دو نمایاں باتیں	218
منافق اور مومن میں تقابل	219
عدن کا مفہوم	219
رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ کا مفہوم	220
منافقین کے بارے میں سخت ہو جانے کا حکم	222
منافقین کی در پردہ زبان درازیوں اور سازشوں کا ذکر	223
ان کی اسلام دشمنی کا سبب	225
منافقین کے مزید چند خصائلِ بد	226
اظہارِ تعجب	228
سخت ہو جانے کی تاکید	229
استغفار سے روکنے کی وجہ	230
منافقین کی ناعاقبت اندیشی	232
یہ مصاحبت کے قابل نہیں	233
منافقین دوسروں میں بے دلی پیدا کرتے ہیں	233
اپنے انجام پر روئیں	233
منافقین کی آرزو کی ناکامی	234
منافقین کی محرومی	234
منافقین سے آخری قطعِ تعلق	235
آنحضرت ﷺ سے خطاب	237
مسلمانوں سے خطاب	237
سورۃ اور ایمان سے مراد	238
منافقین کا کردار	238
اہلِ ایمان کا کردار	239
مسجد قبا اور اس کے نمازیوں کی تعریف	260
مسجد قبا اور مسجد ضرار کا فرق ایک مثال	261
اللہ اور بندوں کے مابین وشراء کی حقیقت اور مقتضیات	265
سچے اہلِ ایمان کی صفات	267
آیت کی تمہید	270
آیت کا شانِ نزول	271

Marfat.com

ایک اشتباہ کا ازالہ 272
ایک حقیقت کا افشاء 273
آیتِ توحید 274
تأب کا معنی، ساعۃ العسرۃ کا مفہوم 274
تین صحابہ کون ہیں؟ 275
حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان 276
حصول نصیحت وعبرت کے مواقع 280
طالب علم دین کا فرض ہونا اور اس کے آداب وفرائض 287
علم دین کے فضائل 287
علم دین کے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کی تفصیل 287
فرضِ عین 288
علم دین کا نصاب 288
علم دین حاصل کرنے کے بعد عالم کے فرائض 289
ربطِ آیات 296

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ یُوْنُسَ کا تعارف 299
زمانۂ نزول 299
سُوْرَۃُ یُوْنُسَ 301
ایک تنبیہ 303
دین رحمت ہے جس پر شکر واجب ہے 303
مشرکین کا اعتراض اور اس کا جواب 304
ایک پہلودار بات 305
آپ کی بعثت کا مقصد 306
آپ کے کمالات کو سحر کہا گیا 306
ساحر کی پھبتی چسپاں نہیں ہوتی 307
تمہید 308
عقیدۂ آخرت کے اساسی حقائق 311
عمل کی آمادگی کے دو سبب 313
قیامت کا وقوع عدل کا تقاضا ہے 315
گزشتہ مضمون کی مزید تسہیل 316
دلائلِ آفاق نہایت سہل انداز میں 317

Marfat.com

انسان کا اصل روگ اور اس کا صحیح علاج 318
آخرت کی فکر کا انجام 321
آخرت کے عقیدہ کو نقصان پہنچانے والے تصورات 324
مشرکینِ مکہ کے کردار کی بنیادی خرابی 326
سابقہ امتوں کی ہلاکت سے عبرت دلائی جا رہی ہے 328
مشرکینِ مکہ کی جانب سے قرآن میں ترمیم کا مطالبہ 330
مشرکین کی اصل گمراہیاں 330
قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل 331
پس منظر اور دلیل 335
متعدد گمراہیوں کی اصلاح 335
مشرکین کی اصل گمراہی 341
حیاتِ دنیا کی تمثیل 346
مشرکین اور ان کے شرکاء آخرت میں 349
شرکاء کون ہیں 349
شرکاء کا اعلانِ براءت 351
سب کی پیشی اللہ کے سامنے 351
مشرکین کا فکری تضاد 354
اللہ کا قانونِ ہدایت و ضلالت 359
مشرکین کی ایک اور گمراہی 359
رہنمائی کے حوالے سے اصولی بات 361
حق کے مقابلے میں ظن کی پیروی 362
قرآنِ کریم سابق پیشگوئیوں کی تصدیق ہے 362
قرآنِ کریم کا چیلنج 364
انکار کا اصل سبب 365
عذاب لانے سے متعلق اللہ کا قانون 366
آنحضرت ﷺ کو تسلی 369
مشرکین کو تنبیہ 369
دو مفہوم 370
اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت 371
مشرکین کی ایک اور فطری گمراہی 371
عذاب سے متعلق مشرکین کی غلط فہمی 373
اتمامِ حجت کے بعد فیصلہ کر دیا جاتا ہے 373

Marfat.com

ہدایت سے انکار انسان کو فہم وشعور سے عاری کر دیتا ہے 374
قریش کے مطالبۂ عذاب کا جواب 375
جلد بازوں سے ایک سوال 376
عذاب کا مذاق اڑانے والوں کو جواب 377
متکبرین کی اصل حیثیت 379
قرآن کی چار صفات 381
قرآنِ کریم عظیم نعمت 383
توحید کا ایک پہلو 383
گرفت میں تاخیر اللہ کی رحمت ہے 385
مخالفتوں کے ہجوم میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی 388
محولہ بالا لوگ ہی اولیاء اللہ ہیں 390
اولیاء کی تحقیق 391
آنحضرت ﷺ کو تسلی 392
انسان فریبِ نظر کا شکار ہے 393
قرآنِ کریم کا طریقِ استدلال 394
"ولد" کا معنی 397
مشرکین کے عقائد کا رد 397
مشرکین کو وارننگ 398
مشرکین کی اصلاح کیلئے حضرت نوحؑ کی سرگزشت سے استشہاد 401
نَبَاءَ نُوحٍ کا مفہوم 402
قریش کو انذار 403
طوفان عالمگیر تھا یا نہیں 404
بعد کے رسولوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ 405
توفیق کے معاملے میں اللہ کا قانون 405
حضرت موسیٰؑ کے حالات سے استشہاد 406
حق اور سحر میں فرق 407
حضرت موسیٰؑ پر سیاسی الزام 408
حضرت موسیٰؑ کے ابتدائی ساتھی 411
ایک غلط فہمی کا ازالہ 412
ایمان کی حقیقت 413
توکل کی حقیقت 414
فتنہ کا مفہوم 415

Marfat.com

تربیت کا ذریعہ	416
حضرت موسیٰؑ کی بددعا	417
دُعا کا انداز	417
قبولیتِ دُعا	418
بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون پر عذاب	419
نشانِ عبرت	420
بنی اسرائیل پر اللہ کا انعام اور ان کی ناشکری	422
آیت کی تفہیم کیلئے تین باتوں کی وضاحت	424
سُنتِ الٰہی	425
قریش کو تربیت	426
حضرت یونسؑ کا واقعہ	427
آنحضرت ﷺ کو تسلی	430
مطالبۂ معجزات کا جواب	431
آیت کے فہم کیلئے چند امور کی وضاحت	434
شرک کے بطلان پر دلیل	438
آخری تنبیہ	439
آنحضرت ﷺ کو ہدایت اور تسلی	440

☆☆☆☆

سُوْرَۃُ ھُوْدٍ کا تعارف	441
نام	441
زمانۂ نزول	441
مضامین اور مباحث	442
سُوْرَۃُ ھُوْدٍ	443
اُحْکِمَتْ اور فُصِّلَت کا مفہوم اور مراد	445
قرآنِ کریم کا پیغام	446
آنحضرتؐ اسی پیغام کیلئے بشیر ونذیر بن کے آئے	446
ایمان کے بعد اعمال کی اصلاح	447
ایک غلط فہمی کا ازالہ	448
عذابِ آخرت	448
یثنون اور یستغشون کا مفہوم اور مراد	449
علمِ الٰہی کی وسعت	450

Marfat.com

مشرکین کیلئے تعریض 451
اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ 451
ایام سے کیا مراد ہے 451
کائنات کا مقصدِ تخلیق 452
انسان کا ذکر کرنے کا فائدہ 457
چند تمہیدی باتیں 459
مخالفین قرآن کو متبادل کلام پیش کرنیکا چیلنج 461
مخالفینِ قرآن پر اتمامِ حجب 463
دنیا سے متعلق اسلامی تصور 463
ایک وضاحت 465
تنبیہ سے مراد بات 466
ایک نفسیاتی حقیقت 467
ہر دور میں حق پر گواہی 468
نورِ فطرت کی حفاظت 469
افترا کی نوعیت 469
مشرکین کے جرائم 470
اہل ایمان کے فضائل 471
چند ابتدائی باتیں 474
حضرت نوحؑ کی سرگزشت 475
نذیرِ مبین کا مفہوم 476
تین اعتراضات 476
اعتراضات کا جواب 477
قوم کی نخوت پر چوٹ 478
گزشتہ مضمون کی تائید وتوثیق 479
باقی اعتراضات کا جواب 479
قومِ نوحؑ کا مطالبۂ عذاب 480
فیصلۂ الٰہی کا وقت آپہنچا 484
قومِ نوحؑ کا استہزا 484
حضرت نوحؑ کے جواب کا مفہوم 485
تمسخر کا مزید جواب 486
عذاب ہمیشہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے 486
مومن کا اصل سہارا 487

Marfat.com

عذاب تو عظیم تھا ہی بچانے والا عظیم تر تھا 488
ارض و سما کو احکام 489
کیا طوفان عالمگیر تھا؟ 489
کشتی کہاں رکی؟ 489
بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ کا مفہوم 490
ایک اہم حقیقت 490
حضرت نوحؑ کی شفقت پدری 491
ایک تنبیہہ 492
جاہل کا مفہوم 492
حضرت نوحؑ کی عظمت 492
تعمیر نو کا آغاز 493
آنحضرتؐ کی طرف التفات 494
دعوت کی پہلی ضرورت اجنبیت کے احساس کا خاتمہ 497
پیغمبر کی دعوت 498
آیت کے دو مفہوم 499
استغفار و توبہ کی ترغیب 500
ایک غلط فہمی کا ازالہ 500
بَیِّنَة کا مطالبہ 501
قومِ ہود کی ہرزہ سرائی اور اس کا جواب 502
مومن کا اصل سہارا 502
حضرت ہودؑ کی آخری تنبیہہ 503
اللہ تعالیٰ کا عذاب 504
قوم عاد کے بڑے بڑے جرائم 505
قومِ ثمود کی سرگزشت بھی گزشتہ واقعات کی کڑی ہے 508
حضرت صالحؑ کی دعوت اور دلائل 509
اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ میں ایک جہانِ معنی مضمر ہے 510
انسان جلدی تبدیلی قبول نہیں کرتا 511
حضرت صالحؑ کا جواب سوال کی صورت میں 512
قوم کا مطالبہ اور اس کا جواب 513
سرکشی کی انتہا 514
حضرت صالحؑ پر ایمان لانیوالوں کو عذاب سے نجات 515
عذاب کی نوعیت 515

Marfat.com

قومِ لوط کی سرگزشت کیلئے تمہید 518
حضرت ابراہیمؑ کی میزبانی 519
ایک شبہے کا ازالہ 519
حضرت ابراہیمؑ کی تشویش اور اس کا سبب 519
حضرت سارہ کی مسرت اور حیرت 520
اہلِ بیت کون ہیں؟ 521
حضرت ابراہیمؑ کے اللہ سے جدال کا مفہوم 521
حضرت ابراہیمؑ کو سفارش سے روک لیا گیا 522
مشرکینِ مکہ کیلئے لمحہ فکریہ 523
حضرت لوطؑ کی پریشانی 523
حضرت لوطؑ کی پیشکش کا مفہوم 524
جاہلیت جدیدہ قومِ لوط کی راہ پر 524
فرشتوں نے حضرت لوطؑ کو تسلی دی 525
قومِ لوط پر عذاب 526
اہلِ مدین کا محل و وقوع اور ان کی حقیقت 529
حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت 529
سابقہ آیت کا مضمون ایک دوسرے پہلو سے 530
گزشتہ مضمون کی تکمیل 531
حضرت شعیبؑ کی دعوت کا جواب قوم کی طرف سے طنزیہ انداز میں 532
بَيِّنَةِ اور رزق حسن کا مفہوم 533
مَآ أُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ کا محمل 533
پیغمبر کی حیثیت 533
ہدایت کے رد و قبول میں افراد کی ذہنیت 534
استغفار و توبہ کی ترغیب 534
بات نہ سمجھنے کا مفہوم 535
نبی کا سہارا خاندان نہیں، خدا ہے 536
اظہار براءت 537
قومِ شعیب پر عذاب 537
تمہید 540
حضرت موسیٰؑ و فرعون کی سرگزشت اور سلطان مبین کا مفہوم 540
ورد کا معنی 541
گزشتہ سرگزشتوں کی طرف اشارہ 542

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا	542
گمراہی کا عمومی سبب	543
قریش کو تنبیہ	544
آیت کا مفہوم اور آج کی گمراہی	544
قیامت کو دُور مت سمجھو	546
قیامت کی ہیبت	546
انسانوں کی تقسیم	547
اہلِ جنت کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے گی	547
عتاب مخالفین پر ہے	548
آنحضرت ﷺ کو تسلی	550
لَمَّا کی تحقیق	552
مشرکین کو تنبیہ	552
جادۂ مستقیم پر استقامت کی ہدایت	553
نماز سے استقامت پر مدد لیجئے	554
صبر بھی ذریعۂ استقامت ہے	555
مشکل الفاظ کی تشریح	555
عذاب کے اسباب	555
ظلم کے مختلف مفاہیم	556
ہدایت وضلالت کے معاملہ میں قانونِ الٰہی	557
معذب قوموں کے واقعات سنانے سے مقصود	558
مخالفین کو فیصلہ کن جواب	558

☆☆☆☆

Marfat.com

Marfat.com

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِ اللّٰہِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورۃ الانفال مدنی ہے یعنی ہجرت کے بعد سن ۲ ہجری میں نازل ہوئی ہے۔ ہر وہ سورۃ جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے چاہے اس کا مقامِ نزول کوئی بھی ہو اسے "مدنی سورۃ" کہا جاتا ہے۔ نام اس کا "الانفال" ہے۔ سورتوں کے ناموں کے سلسلے میں ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ سورتوں کے نام ان کے عنوان نہیں ہیں بلکہ وہ صرف نام ہیں جن سے سورتوں کی شناخت مقصود ہے۔ کسی سورۃ میں کوئی اہم واقعہ اگر زیرِ بحث آیا ہے تو عام طور پر اس کی طرف نسبت کر کے سورۃ کا نام رکھ دیا جاتا ہے، لیکن سورہ کے مباحث اسی سے متعلق نہیں ہوتے۔ اس سورۃ میں بھی مالِ غنیمت کے احکام بیان ہوئے ہیں اور سب سے پہلا سوال اسی حوالے سے ہوا ہے، اس لئے اس نسبت سے اس کا نام "الانفال" رکھ دیا گیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سورۃ جنگِ بدر کے بعد بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔ ممکن ہے مختلف مواقع پر اس کا نزول ہوا ہو لیکن سورۃ میں کہیں ایسا جھول دکھائی نہیں دیتا جس سے اندازہ ہو سکے کہ سورۃ کے مندرجات مختلف وقتوں میں نازل ہوئے ہیں۔ سورۃ کے تمام مضامین ایک دوسرے سے غائیت درجہ پیوست اور عبارت اور مضامین میں انتہا درجہ کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

اس سورۃ کا اصل موضوع جنگِ بدر کا تاریخی پس منظر، بدر میں پیش آنے والے واقعات، مسلمانوں پر اللہ کے انعامات، مسلمانوں کی راہِ حق میں استقامت اور جاں فروشی، بعض مسلمانوں کی طرف سے بعض کوتاہیوں اور فروگزاشتوں پر مناسب تنبیہ، جنگ کی تہذیب اور اس کے بارے میں ضروری احکام اور اس دور کے مسلمانوں کی امتِ مسلمہ کا ہراول ہونے کی وجہ سے ذمہ داریاں اور خصوصی صفات کا تذکرہ اور اس بارے میں ضروری ہدایات ہیں۔ ان تمام باتوں کو جاننے کیلئے ضروری ہے کہ جنگِ بدر کے حالات اور تعارف میں کسی حد تک تفصیل سے ضروری گزارشات پیش کر دی جائیں تا کہ سورۃ الانفال کے مضامین کو سمجھنے میں سہولت ہو۔

بدر ایک گاؤں کا نام ہے جہاں سال کے سال میلہ لگتا تھا۔ یہ مقام اس نقطہ کے قریب ہے جہاں شام سے مدینہ جانے کا راستہ دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ مدینہ منورہ سے تقریباً اسی (۸۰) میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس گاؤں کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس سے زیادہ اہمیت نہیں تھی کہ یہ ایک چوراہا تھا' جہاں سے مختلف تجارتی راستے مختلف ملکوں کی طرف نکلتے تھے۔ اس لیے تجارتی کارواں بعض دفعہ آتے جاتے وہاں ٹھہرتے' ایک بازار سا لگ جاتا' تھوڑا بہت کاروبار ہوتا جس سے مضافات کے لوگ فائدہ اٹھاتے اور چونکہ وہاں چند چشمے اور کھجوروں کے کچھ جھنڈ بھی تھے جن کے سائے میں آتے جاتے لوگ آرام کرتے اور چشموں کے پانی سے پیاس بجھاتے اور بعض دفعہ امراء دادِ عیش دینے کے لیے وہاں عیش ونشاط کی مجلسیں بھی منعقد کرتے جہاں گانے والی لونڈیاں اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں اور لوگ شرابیں پیتے اور مختلف تفریحی مشاغل سے حظ اٹھاتے۔ لیکن آج اس جگہ کو تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ قریش اور مسلمانوں میں حق و باطل کا پہلا معرکہ اسی جگہ برپا ہوا۔ اسی لیے اس کو "غزوۂ بدر" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پیشتر اس سے کہ ہم اس غزوہ کی تفصیلات عرض کریں

Marfat.com

تمہیدی طور پر کچھ ایسی باتیں کہنا چاہتے ہیں جن کا اس غزوہ کے اسباب سے بھی تعلق ہے اور ان پھیلائی گئی افواہوں سے بھی جس سے اسلامی تاریخ کو داغدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مخالفینِ اسلام نے عموماً اور مستشرقین نے بالخصوص اسلامی غزوات کو اس طرح سے پیش کیا اور سیرتِ نبوی ﷺ کو اس انداز سے لکھا ہے کہ وہ لڑائیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہے جس کی ابتداء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قدم جماتے ہی کر دی تھی۔ آپؐ نے لگاتار چھوٹے چھوٹے دستے لوٹ مار کے لیے روانہ کرنے شروع کر دیئے۔ جس سے ایک طرف مسلمانوں کو لوٹ مار کی تربیت دی جا رہی تھی اور دوسری طرف اپنے لیے فوجی مفادات کے حصول کے مواقع پیدا کیے جا رہے تھے۔ چنانچہ لوٹ مار ہی کے سلسلے کا وہ واقعہ ہے جس نے قریش کے ساتھ مخاصمت کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اب تک تو صرف لوٹ مار تک بات رکی ہوئی تھی کہ رجب دو (۲) ہجری میں مسلمانوں کے ایک فوجی دستے نے بطنِ نخلہ میں قریش کے ایک مختصر سے تجارتی قافلے پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں ایک شخص مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور قافلے کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ جو لوگ گرفتار اور قتل ہوئے وہ بڑے معزز خاندان کے لوگ تھے۔ عمرو بن الحضرمی جو مقتول ہوا عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا جو حرب بن امیہ کا حلیف تھا۔ حرب قریش کا رئیس اعظم تھا اور عبدالمطلب کے بعد ریاستِ عام اسی کو حاصل ہوئی تھی۔ مستشرقین کا کہنا یہ ہے کہ اس واقعے نے قریش کو بری طرح مشتعل کیا۔ انہوں نے اسے اپنی اہمیت اور عظمت کے لیے چیلنج سمجھا اور پھر مسلمانوں کی نوزائیدہ مملکت کو خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے ختم کرنے کی تجویزیں کرنے لگے اور وہ یقیناً اس میں حق بجانب تھے کیونکہ مسلمانوں نے ان کے لیے مسائل پیدا کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن ابھی وہ کوئی اقدام کرنے کا فیصلہ کر نہیں پائے تھے کہ ان کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں ملک شام کی طرف گیا۔ اس کی واپسی پر قریش کو مصدقہ اطلاعات ملیں کہ مسلمان اسے حسبِ معمول لوٹنا چاہتے ہیں۔ واقعہ نخلہ کے زخم ابھی تازہ تھے کہ اس اطلاع نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ چنانچہ قریش پوری طاقت اور قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لیے اٹھے اور اس کے نتیجے میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ اس پوری صورتِ حال سے مستشرقین یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی یقیناً ایک پیغمبر کی زندگی تھی، لیکن مدینہ طیبہ میں جیسے ہی انہیں طاقت میسر آئی اور قدم جمانے کا موقعہ ملا تو انہوں نے وہ تمام اقدامات شروع کر دیئے جو دنیوی حکمران وسعتِ اقتدار کے لیے کیا کرتے ہیں اور پھر اس پر اسلام کے خلاف انہوں نے وہ وہ طومار باندھے ہیں کہ جس سے ان کے اندر کا چھپا ہوا بغض بار بار نمایاں ہو کر جھانکنے لگتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس چابکدستی سے اس پر علمی تحقیق کا غلاف چڑھا رکھا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اصل چہرہ ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ غزوۂ بدر کے واقعات بیان کرنے سے پہلے اس کے اسباب بیان کر دیئے جائیں اور یہ دکھایا جائے کہ جن بنیادوں پر مستشرقین نے غلط فہمیوں کی عمارت استوار کی ہے وہ بنیادیں کس قدر بودی اور غلط ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قریش مکہ ہی میں اسلام کی اٹھتی ہوئی طاقت کو فنا کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے مسلمان یکے بعد دیگرے ہجرت کرتے گئے اور ایک وقت آیا جب وہ اپنے تئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ مکمل کر چکے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے اور اس طرح سے آپؐ اور تمام مسلمان بخیریت مدینہ طیبہ پہنچ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا اس طرح بچ کے نکل جانا قریش کے لیے سخت خفت کا باعث تھا۔ اب انہوں نے اپنے جذبۂ انتقام کی تسکین اور اپنی خفت مٹانے کے لیے ایسے تمام اقدامات کرنے کا فیصلہ کیا جن سے مدینہ کی اٹھتی ہوئی طاقت کو تباہ کیا جا سکتا ہو۔ انہوں نے سب سے پہلے عبداللہ بن ابی کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہنچنے سے پہلے رئیس الانصار تھا اور انصار نے اس کی تاج پوشی کی شاہانہ رسم ادا کرنے کے لیے تیاری بھی کر لی تھی خط لکھا جس کے الفاظ یہ تھے:

'انکم آویتم صاحبنا و انا نقسم باللّٰہ لتقاتلنہ او تخرجنہ او لنسیرن الیکم باجمعنا حتی نقتل مقاتلتکم و نستبیح نسائکم (سنن ابی داؤد)

(تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، ہم خدا کی قسم اٹھاتے ہیں کہ یا تو تم لوگ انہیں قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم سب لوگ تم پر حملہ کریں گے اور تم کو فنا کر کے تمہاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔)

Marfat.com

عبداللہ بن ابیؔ اس پر کچھ آمادہ شر ہوا۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سمجھایا کہ کیا تم خود اپنے بیٹوں اور بھائیوں سے لڑو گے؟ اور چونکہ انصار اکثر مسلمان ہو چکے تھے اس لیے عبداللہ اس نقطہ کو سمجھا اور قریش کے حکم کی تعمیل نہ کر سکا۔

اسی زمانہ میں سعد بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس الاعظم تھے عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ وہاں عین حرم کے دروازے پر ابو جہل سے ملاقات ہو گئی۔ ابو جہل نے انہیں نہایت درشتی سے کہا ''تم لوگوں نے صابیوں کو پناہ دی ہے (کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو صابی یعنی مرتد کہتے تھے) میں کبھی یہ نہیں دیکھ سکتا کہ تم کعبہ میں آسکو خدا کی قسم اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو بچ کر واپس نہیں جا سکتے تھے۔'' حضرت سعد نے جواب میں کہا ''واللہ لئن منعتنی هذا لامنعنک ما هو اشد علیک منه' طریقک علی المدینة'' ﴿اللہ کی قسم اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمہیں اس چیز سے روک دوں گا جو تمہارے لیے اس سے شدید تر ہے' یعنی مدینہ پر سے تمہاری راہ گزر﴾

حرم کی تولیت اور مجاورت کی وجہ سے تمام عرب قریش کا احترام کرتا تھا اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے ہوئے تھے سب قریش کے زیر اثر تھے۔ اس بنا پر قریش نے تمام قبائل کو اسلام کا مخالف بنا دیا اور قبائل کی مخالفت کی وجہ سے دور دراز کے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ نہیں پاتے تھے۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کعب بن اشرف کو جو یہود کا اہم سردار تھا' انگیخت کیا کہ تم مسلمانوں کے استیصال میں ہماری مدد کرو' چنانچہ یہود کی سازشوں اور عبداللہ ابیؔ کے ساتھیوں نے مدینہ میں اس طرح کی صورتِ حال پیدا کر دی کہ مسلمان راتوں کو مسلح حالت میں سوتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سخت خطرے میں تھی۔ آپؐ ذرا بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتے تو صحابہ پریشان ہو کر تلاش کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور آپؐ کے لیے پہرے کے بغیر سونا مشکل ہو گیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے قریش کی پس پردہ کوششوں کے باعث حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے' لیکن اس خرابی میں مزید اضافہ اس بات سے ہوا کہ قریش نے مدینہ کی طرف غارت گر دستے بھیجنا شروع کر دیئے۔ انہی دستوں میں سے ایک دستے نے کرز بن جابر الفہری کی قیادت میں عین مدینہ کے قریب ڈاکہ ڈالا اور اہل مدینہ کے مویشی لوٹ لیے اور چرواہوں کو قتل کر ڈالا۔ یہ گویا اس بات کی علامت تھی کہ اب مسلمان مدینہ میں رہتے ہوئے بھی قریش کی دسترس سے باہر نہیں۔ قریش نے قبائل کو آمادۂ شر کر کے ایک طرف مسلمانوں کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی تھی اور دوسری طرف اپنے غارت گر دستے بھیج کر مسلمانوں کے سروں پر تلوار لٹکا دی تھی اور اس طرح سے مسلمانوں کو پیغام دیا جا رہا تھا کہ تم اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دو اور انہیں ہمارے حوالے کر دو۔

ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ مسلمان حفاظت خود اختیاری کے لیے وہ تمام مساعی بروئے کار لاتے اور ایسے تمام اقدامات کرتے جس سے ان کے لیے خطرات میں زندہ رہنے کا امکان پیدا ہو جاتا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دو تدبیریں فرمائیں، اول یہ کہ قریش کی شامی تجارت جو ان کا مایۂ غرور تھی بند کر دی جائے تاکہ وہ صلح پر مجبور ہو جائیں اور یہ وہی بات تھی جس کی دھمکی حضرت سعد بن معاذ﷜ نے ابو جہل کی دھمکی کے جواب میں دی تھی۔ دوسرے یہ کہ مدینہ کے قرب و جوار کے جو قبائل ہیں ان سے امن و امان کا معاہدہ کیا جائے۔ چنانچہ پہلی تدبیر کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنا شروع کیے اور انہیں حکم دیا کہ قریش کے تجارتی قافلے جس شاہراہ سے گزرتے ہیں تم اس کے آس پاس منڈلاتے رہو تاکہ قریش کو اندازہ ہو جائے کہ اگر انہوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو ہم ان کی ملک شام سے تجارت بند کر سکتے ہیں۔ چنانچہ پہلے سال اس طرح کے چار دستے گئے جو مغازی کی کتابوں میں سریہ حمزہ' سریہ عبیدہ بن حارث' سریہ سعد بن ابی وقاص اور غزوۃ الابواہ کے نام سے موسوم ہیں اور دوسرے سال کے ابتدائی مہینوں میں دو مزید تاختیں اسی جانب روانہ کی گئیں۔ جن کو اہلِ مغازی غزوۂ بواط اور غزوۂ ذوالعشیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مستشرقین کا الزام یہ ہے کہ اس طرح سے مسلمانوں کو لوٹ مار کی تربیت دی جا رہی تھی' حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی میں نہ تو کشت و خون ہوا اور نہ کوئی قافلہ لوٹا گیا۔ اگر مقصود لوٹ مار ہوتا تو صحابہ کے سامنے جب تجارتی قافلہ گزر رہا ہوتا اور اس کے محافظ بھی کوئی بڑی تعداد میں نہیں ہوتے تھے تو آخر انہیں لوٹ مار سے روکنے والا کون تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان تاختوں کا اصل مقصود ہوا کا رخ بتانا تھا اور پھر اس میں یہ بھی احتیاط کی گئی کہ ایسے کسی دستے میں انصار کا

Marfat.com

کوئی آدمی نہیں لیا بلکہ تمام دستے خالص مکی مہاجرین ہی سے لئے گئے تاکہ یہ کشمکش قریش کے اپنے ہی گھر والوں تک محدود رہے اور دوسرے قبیلوں کے لوگوں کے اس میں الجھنے سے آگ پھیل نہ جائے۔

دوسری تدبیر کے طور پر مدینہ اور ساحل بحر احمر کے درمیان شاہراہِ تجارت سے متصل جو قبائل آباد تھے ان کے ساتھ گفت وشنید شروع کی تاکہ وہ حلیفانہ اتحاد یا کم از کم ناطرفداری کے معاہدے کرلیں۔ چنانچہ اس میں آپ کو پوری کامیابی ہوئی۔ چنانچہ سب سے پہلے جہینہ قبیلے سے معاہدہ ہوا۔ یہ قبیلہ مدینے سے تین منزل پر آباد تھا اور ان کا کوہستان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر یکم ہجری کے آخر میں بنی ضمرہ سے معاہدہ ہوا۔ آپ نے چند روز بنوضمرہ میں قیام فرمایا جن کا سردار مخشی بن عمرو ضمری تھا۔ معاہدہ کے الفاظ یہ تھے:

"هذا كتاب من محمد رسول الله لبنى ضمره فانهم امنون على اموالهم و انفسهم وان لهم النصر على من رامهم الا ان يحاربوا فى دين الله و ان النبى اذا دعاهم لنصره اجابوهم"

(یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر ہے بنوضمرہ کے لیے ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی بجز اس صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلہ میں لڑیں اور پیغمبر جب ان کو مدد کے لیے بلائیں گے تو یہ مدد کو آئیں گے۔)

بنومدلج بنوضمرہ کے حلیف تھے اس لیے دو ہجری کے وسط میں وہ بھی اس معاہدے میں شریک ہوگئے۔

یہ مختلف دستوں کا شاہراہِ تجارت کی نگرانی کے لیے بھیجنا اور قبائل سے معاہدے کرنا صرف اس لیے تھا تاکہ مسلمان مدینے میں قریش کی دست برد سے محفوظ رہیں اور انہیں بالآخر بقائے باہمی کا احساس دلا کر معاہدے پر مجبور کیا جائے۔ عبداللہ ابن جحش کا واقعہ بھی اسی سلسلے کا ایک واقعہ ہے۔ انہیں صرف قریش کی کارروائیوں پر نظر رکھنے اور اطلاع دینے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن مستشرقین نے بالکل اسے دوسرے رنگ میں اچھالا اور اس کی غلط رپورٹنگ کی حالانکہ واقعہ کی اصل حقیقت یہ ہے کہ رجب دو (۲) ہجری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش ؓ کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف بھیجا۔ یہ مقام مکہ اور طائف کے بیچ میں ایک شبانہ روز کی مسافت پر ہے۔ آپ نے حضرت عبداللہ کو ایک خط دے کر فرمایا کہ دو دن کے بعد اسے کھولنا۔ حضرت عبداللہ نے خط کھولا تو لکھا تھا کہ مقام نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگاؤ اور اطلاع دو۔ اتفاق یہ کہ قریش کے چند آدمی جو شام سے تجارت کا مال لیے آتے تھے سامنے سے نکلے۔ حضرت عبداللہ نے ان پر حملہ کیا' ان میں سے ایک شخص عمرو بن الحضرمی مارا گیا دو گرفتار ہوگئے اور مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ حضرت عبداللہ نے مدینہ میں آ کر یہ واقعہ بیان کیا اور غنیمت کی چیزیں پیش کیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے تم کو یہ اجازت نہیں دی تھی' غنیمت قبول کرنے سے بھی آپ نے انکار فرمایا۔ صحابہ نے نہایت برہم ہو کر حضرت عبداللہ سے کہا:

"صنعتم مالم تؤمروا به و قاتلتم فى الشهر الحرام و لم تؤمروا بقتال" (طبری)

(تم نے وہ کام کیا جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا اور ماہِ حرام میں لڑے حالانکہ اس مہینہ میں تم کو لڑنے کا حکم نہ تھا۔)

لیکن ان سے غلطی یہ ہوئی کہ جیسے ہی ان کے سامنے تجارتی قافلہ آیا تو سالوں پرانے زخم سلگ اٹھے۔ وہ تمام اذیتیں یاد آئیں جو مکی زندگی میں قریش مکہ انہیں پہنچاتے رہے۔ اس لیے وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور قافلہ پر حملہ کردیا اور ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سخت تنبیہہ فرمائی اور صحابہ بھی بہت برہم ہوئے اور جہاں تک تعلق ہے ابوسفیان کے قافلۂ تجارت کا اس کا مقصد صرف تجارت نہیں تھا بلکہ درحقیقت مسلمانوں پر حملہ کرنے اور ان کا استیصال کرنے کا قریش نے جو فیصلہ کیا تھا اس کے لیے مصارفِ جنگ پورا کرنے کی ایک تدبیر تھی کیونکہ اس قافلۂ تجارت کی ایک ایسی خصوصیت مؤرخین نے لکھی ہے جو ہمیں اور کہیں نہیں دکھائی دیتی۔ ابن سعد نے ابوسفیان سردارِ قافلہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"والله ما بمكة من قرشي ولا قرشية له نش وصاعداً الا بعث به معنا"

(اللہ کی قسم مکہ میں کوئی قریشی مرد اور کوئی قریشی عورت جس کے پاس معمولی سا مال بھی تھا ایسی نہیں رہی جس نے اپنا مال ہمارے سپرد نہ کردیا ہو۔)

Marfat.com

اس کا مطلب یہ ہے کہ مکے میں ایک ایک آدمی بلکہ عورتوں نے بھی اس قافلۂ تجارت میں اپنا حصہ ڈالا' مکے میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی قافلۂ تجارت میں مکے کے تمام مرد شریک ہوں اور عورتیں تو گنتی کی ایسی تھیں جو تجارت سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ لیکن اس قافلے میں سب کے شریک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص مذہبی حمیت کی وجہ سے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتا تھا اور یہ قافلہ بھی کوئی چھوٹا سا نہ تھا ایک ہزار اونٹوں پر سامان لدا ہوا تھا اور چالیس سے لے کر ستر افراد تک اس کے محافظ روایت کیے جاتے ہیں اور اس میں پچاس ہزار دینار کا سامان تھا جو عرب کی تاریخ میں ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مدینہ اور اہل مدینہ کی حفاظت کے لیے نہایت چوکنا رہتے تھے اور وحی الٰہی کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی آپ ہمیشہ باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے اور یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے آگاہی حاصل کرنا مشکل ہوتا' چنانچہ جیسے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے مستقبل قریب کے خدشات کو محسوس کرتے ہوئے اقدام کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ ادھر سردار قافلہ کو بھی اس بات کا پورا احساس تھا کہ مسلمانوں کو جیسے ہی ہماری تیاری کا علم ہوگا وہ یقیناً قافلہ کا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ جیسے ہی اس کا قافلہ پرخطر علاقے میں پہنچا تو اس نے ایک آدمی کو مکہ کی طرف دوڑایا۔ اس شخص نے مکہ پہنچتے ہی عرب کے قدیم قاعدے کے مطابق اپنے اونٹ کے کان کاٹے' اس کی ناک چیر دی' کجاوے کو الٹ کر رکھ دیا اور اپنی قمیص آگے پیچھے سے پھاڑ کر شور مچانا شروع کر دیا کہ

"یا معشر قریش! اللطیمه اللطیمه ' اموالکم مع ابی سفیان قد عرض لها محمد فی اصحابه لا اریٰ ان تدرکوها الغوث الغوث"

(اے قریش کی جماعت! اپنے قافلۂ تجارت کی خبر لو۔ تمہارے مال جو ابوسفیان کے ساتھ ہیں محمد (ﷺ) اپنے آدمی لے کر ان کے درپے ہو گیا ہے' مجھے امید نہیں کہ تم انہیں پا سکو گے، مدد مدد۔)

اس پر سارے مکہ میں ہیجان برپا ہو گیا۔ قریش کے تمام بڑے بڑے سردار جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ تقریباً ایک ہزار مردانِ جنگی جن میں سے چھ سو زرہ پوش تھے اور جن میں سو سواروں کا رسالہ بھی شامل تھا۔ پوری شان و شوکت کے ساتھ لڑنے کے لیے چلے۔ ان کے پیشِ نظر صرف یہ کام نہ تھا کہ اپنے قافلے کو بچانا ہے بلکہ وہ اس ارادے سے نکلے تھے کہ اس آئے دن کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں کیونکہ جب یہ قافلہ خطرے کی زد سے نکل گیا اور ابوسفیان نے سردارانِ قریش کو پیغام بھیجا کہ اب تمہارے آگے جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ قافلہ بخیریت مکہ پہنچنے والا ہے۔ مکی لشکر کو یہ پیغام جحفہ میں ملا۔ لیکن قریش کے طاغوتِ اکبر ابوجہل نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور نہایت کبر و غرور سے بولا:

"خدا کی قسم! ہم واپس نہ ہوں گے یہاں تک کہ بدر جا کر وہاں تین روز قیام کریں گے اس دوران اونٹ ذبح کریں گے' لوگوں کو کھانا کھلائیں گے اور شراب پلائیں گے' لونڈیاں ہمارے لیے گانے گائیں گی اور سارا عرب ہمارا اور ہمارے سفر و اجتماع کا حال سنے گا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے ان پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔"

اور طاقت کے نشے میں مخمور ایسے لشکر سے کیا بعید تھا کہ وہ مدینہ پر چڑھ دوڑتا اور مدینہ کو پامال کر دیتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حالات سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے محسوس فرمایا کہ فیصلہ کی گھڑی آ پہنچی ہے اور یہ ٹھیک وہ وقت ہے جب کہ ایک جسورانہ اقدام اگر نہ کر ڈالا گیا تو دشمن طاقتیں منہ زور ہو جائیں گی' اسلام کی نوزائیدہ قوت کے لیے مسائل بڑھتے جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ مدینے کے یہود اور منافقین کو اس سے حوصلہ ملے اور وہ مسلمانوں کا جینا مشکل کر دیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ دارالہجرت میں آئے ابھی پورے دو سال بھی نہ ہوئے تھے' مہاجرین بے سروسامان' انصار ابھی ناآزمودہ' یہودی قبائل برسرِ مخالفت' خود مدینہ میں منافقین و مشرکین کا ایک اچھا خاصا طاقتور عنصر موجود اور گرد و پیش کے تمام قبائل قریش سے مرعوب بھی اور مذہباً ان کے ہمدرد بھی' ایسے حالات میں اگر قریش مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کا خاتمہ ہو جائے' لیکن اگر وہ حملہ نہ کریں اور صرف اپنے زور سے قافلے کو بچا کر ہی نکال لے جائیں اور مسلمان دبکے بیٹھے رہیں تب بھی یکلخت مسلمانوں کی ایسی ہوا اکھڑے گی کہ عرب کا بچہ بچہ ان پر دلیر ہو جائے گا اور ان کے لیے ملک بھر میں پھر کوئی جائے پناہ باقی نہ رہے گی۔ آس پاس کے سارے قبائل قریش کے اشاروں پر کام کرنا شروع کر دیں گے' اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا کہ جو طاقت بھی اس وقت

Marfat.com

میسر ہے اسے لے کر نکلیں اور میدان میں فیصلہ کریں کہ جینے کا بل بوتا کس میں ہے اور کس میں نہیں؟
پروردگار نے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاورت کا حکم دیا ہے اس لیے آپؐ نے انصار و مہاجرین کو جمع فرمایا اور انہیں تمام حالات سے
آگاہ کیا کہ ایک طرف شمال میں تجارتی قافلہ ہے دوسری طرف جنوب سے قریش کا لشکر چلا آ رہا ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک تمہیں
مل جائے گا۔ بتاؤ تم کس کے مقابلہ پر چلنا چاہتے ہو؟ جواب میں ایک بڑے گروہ کی طرف سے اس خواہش کا اظہار ہوا کہ قافلے پر حملہ کیا جائے، لیکن نبی
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر کچھ اور تھا۔ اس لیے آپؐ نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر مہاجرین میں سے مقداد بن عمروؓ نے اٹھ کر کہا:
یا رسول اللہ! جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے آپ اسی طرف چلئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں جس طرف بھی آپ جائیں۔
ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا لڑیں ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں! ہم کہتے ہیں کہ چلئے آپ
اور آپ کا خدا دونوں لڑیں اور ہم آپ کے ساتھ جانیں لڑائیں گے جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔
مگر لڑائی کا فیصلہ انصار کی رائے معلوم کیے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ابھی تک فوجی اقدامات میں ان سے کوئی مدد نہیں لی گئی تھی اور ان کے
لیے یہ آزمائش کا پہلا موقع تھا کہ اسلام کی حمایت کا جو عہد انہوں نے اول روز کیا تھا اسے وہ کہاں تک نبھانے کے لیے تیار ہیں۔ اس لیے حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے براہِ راست ان کو مخاطب کیے بغیر پھر اپنا سوال دہرایا۔ اس پر سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اٹھے اور انہوں نے عرض کیا "شاید حضور کا روئے سخن
ہماری طرف ہے؟" فرمایا "ہاں" انہوں نے کہا:

"لقد امنا بک و صدقناک و شهدنا ان ما جئت به هو الحق و اتیناک عهودنا و مواثیقنا علی السمع والطاعة فامض یا رسول الله لما اردت فوالذی بعثک بالحق لو استعرضت بنا هذا البحر فَخُضْتَهُ لخضناه معک وما تخلف منا رجل واحد وما نکره ان تلقی بنا عدونا غداً انّا لنصبر عند الحرب صُدُق عند اللقاء ولعل الله یریک منا ما نقربه عینک فسربنا علی برکة الله"

(ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں، آپ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپؐ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپؐ سے سمع و اطاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسول! جو کچھ آپ نے ارادہ فرما لیا ہے اسے کر گزریئے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم آپ کے ساتھ کود دیں گے اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو یہ ہرگز ناگوار نہیں ہے کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں، ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے، مقابلہ میں سچی جاں نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھوا دے جسے دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیں۔)

اس کے بعد یہ فیصلہ ہو گیا کہ لشکرِ قریش کے مقابلے کے لیے نکلنا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ جو لوگ اس تنگ وقت میں لڑائی کے لیے اٹھے تھے ان کی تعداد تین سو تیرہ، تین سو چودہ یا تین سو سترہ تھی۔ جن میں سے بیاسی یا تراسی یا چھیاسی مہاجر تھے اور بقیہ انصار۔ پھر انصار میں سے اکسٹھ قبیلہ اوس کے تھے اور ایک سو ستر قبیلہ خزرج سے۔ پورے لشکر میں صرف دو گھوڑے تھے، ایک حضرت زبیر بن عوامؓ کا دوسرا حضرت مقداد بن اسود کندیؓ کا اور ستر اونٹ تھے، جن میں سے ہر اونٹ پر دو یا تین آدمی باری باری سوار ہوتے تھے۔ مدینہ کا انتظام حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر کو سونپا گیا۔ لشکر کی تنظیم اس طرح کی گئی کہ ایک جیش مہاجرین کا بنایا گیا اور ایک انصار کا۔ مہاجرین کا علم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیا گیا اور انصار کا علم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا گیا اور جنرل کمان کا پرچم جس کا رنگ سفید تھا حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیا گیا۔ میمنہ کے افسر حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ مقرر کیے گئے اور میسرہ کے افسر حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ساقہ کی کمان حضرت قیس بن ابی صعصعہ کے حوالے کی گئی اور سپہ سالارِ اعلیٰ کی حیثیت سے جنرل کمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سنبھالی۔

Marfat.com

مکہ معظمہ سے قریش بڑے سروسامان سے نکلے۔ ہزار آدمی کی جمعیت تھی' سوسواروں کا رسالہ تھا۔ رؤساءِ قریش سب شریک تھے۔ ابولہب مجبوری کی وجہ سے نہ آسکا تھا اس لیے اپنی طرف سے اس نے قائم مقام بھیج دیا تھا۔ رسد کا یہ انتظام تھا کہ امراءِ قریش یعنی عباس بن عبدالمطلب' عتبہ بن ربیعہ' حارث بن عامر' نضر بن الحارث' ابوجہل اور امیہ وغیرہ باری باری ہر روز دس دس اونٹ ذبح کرتے اور لوگوں کو کھلاتے تھے۔ عتبہ بن ربیعہ جو قریش کا سب سے معزز رئیس تھا فوج کا سپہ سالار تھا۔

بارہ رمضان المبارک کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے نکلے ایک میل چل کر فوج کا جائزہ لیا جو کم عمر تھے واپس کر دیئے گئے کہ ایسے پر خطر موقعوں پر بچوں کا کام نہیں۔ عمیر بن ابی وقاص کم سن بچے تھے' جب ان سے واپسی کو کہا گیا تو رو پڑے۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ عمیر کے بھائی حضرت سعد بن ابی وقاص نے کم سن سپاہی کے گلے میں تلوار حائل کی۔ سترہ رمضان کو آپ بدر کے مقام پر پہنچے۔ خبر رسانوں نے خبر دی کہ قریش وادی کے دوسرے سرے تک آ گئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہیں رک گئے اور فوجیں اتر پڑیں۔

قریش چونکہ پہلے پہنچ گئے تھے انہوں نے مناسب موقعوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کی طرف کوئی چشمہ یا کنواں تک نہ تھا' زمین ایسی ریتلی تھی کہ اونٹوں کے پاؤں ریت میں دھنس دھنس جاتے تھے۔ حضرت حباب بن منذر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے؟ ارشاد ہوا کہ وحی نہیں ہے۔ حضرت حباب نے کہا تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنویں بیکار کر دیئے جائیں۔ آپؐ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ تائید ایزدی اور حسن اتفاق سے مینہ برس گیا جس سے گرد جم گئی اور جابجا پانی کو روک کر چھوٹے چھوٹے حوض بنا لیے گئے تاکہ وضو اور غسل کے کام آئیں۔ بظاہر بارش کا برسنا ایک اتفاقی امر ہے' لیکن قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے احسان کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔ اس لیے کہ بعض دفعہ اتفاقی واقعات بڑے بڑے نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "واٹرلو" کی جنگ میں نپولین کا ایک جرنیل بارش ہونے کی وجہ سے اگر سات منٹ لیٹ نہ ہوتا تو نپولین کو شکست نہ ہوتی اور یہی وہ شکست ہے جس نے نپولین کے عزائم خاک میں ملا دیے اور فرانس کی تاریخ بدل گئی اور عرب جیسے علاقوں میں جہاں بارش بہت کم برستی ہے وہاں بارش کا نزول تو دلوں کے اطمینان اور پریشانیوں کے ازالے کا باعث بنتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ اللہ نے اس بارش سے تمہارے حوصلوں میں اضافہ کیا' تمہارے وسوسوں کو دور کر دیا' شیطان نے بظاہر مشکلات پیدا کر دی تھیں اللہ نے ان تمام گندگیوں کو دور فرما دیا۔ پانی جو ایک لشکر کے لیے بنیادی ضرورت ہے اسے باحسن طریق پورا فرما دیا اور باقی چشموں پر بھی مسلمانوں نے اگرچہ قبضہ کر لیا تھا لیکن ساقی کوثر کا فیض عام تھا۔ دشمنوں کو بھی پانی لینے کی عام اجازت تھی۔ یہ رات کا وقت تھا تمام صحابہ نے کمر کھول کھول کر رات بھر آرام کیا۔ لیکن صرف ایک ذات تھی جو صبح تک بیدار اور مصروف دعا رہی۔ صبح ہوئی تو لوگوں کو نماز کے لیے آواز دی اور نماز کے بعد جہاد پر وعظ فرمایا۔

قریش جنگ کے لیے بیتاب تھے تاہم کچھ نیک دل بھی تھے جن کے دل خونریزی سے لرزتے تھے۔ ان میں حکیم ابن حزام (جو آگے چل کر اسلام لائے) نے سردار فوج عتبہ سے جا کر کہا آپ چاہیں تو آج کا دن آپ کی نیک نامی کی ابدی یادرہ جائے۔ عتبہ نے کہا کیونکر؟ حکیم نے کہا قریش کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ صرف حضرمی کا خون ہے۔ وہ آپ کا حلیف تھا آپ اس کا خون بہا ادا کر دیجئے۔ عتبہ نیک نفس آدمی تھا۔ اس نے نہایت خوشی سے منظور کیا۔ لیکن چونکہ ابوجہل کا اتفاقِ رائے ضرور تھا۔ حکیم عتبہ کا پیغام لے کر گئے۔ ابوجہل ترکش سے تیر نکال کر پھیلا رہا تھا۔ عتبہ کا پیغام سن کر بولا معلوم ہوتا ہے عتبہ کی ہمت نے جواب دے دیا ہے۔ عتبہ کے فرزند حضرت ابوحذیفہ اسلام لا چکے تھے اور اس معرکہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے تھے اس بنا پر ابوجہل نے یہ بدگمانی کی کہ عتبہ اس لیے لڑائی سے جی چراتا ہے کہ اس کے بیٹے پر آنچ نہ آئے۔ ابوجہل نے حضرمی کے بھائی عامر کو بلا کر کہا دیکھتے ہو تمہارا خون بہا تمہاری آنکھ کے سامنے آ کر نکلا جاتا ہے۔ عامر نے عرب کے دستور کے مطابق کپڑے پھاڑ ڈالے اور گرد اڑا کر "واعمراہ واعمراہ" کا نعرہ مارنا شروع کیا۔ اس واقعے نے تمام فوج میں آگ لگا دی۔ عتبہ نے ابوجہل کا طعنہ سنا تو غیرت سے سخت برہم ہوا اور کہا میدانِ جنگ بتادے گا کہ نامردی کا داغ کون اٹھاتا ہے؟ یہ کہہ کر مغفر مانگا' لیکن اس کا سر اس قدر بڑا تھا کہ کوئی مغفر اس کے سر پر ٹھیک نہیں اترا۔ مجبوراً سر سے کپڑا لپیٹا اور لڑائی کے ہتھیار سجے۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی صفیں درست فرمائیں۔ تاکید فرمائی کہ کوئی صف سے آگے یا پیچھے نہ ہونے پائے' صف کی درستگی کے دوران ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ آپؐ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا جس کے ذریعے آپؐ صف سیدھی فرما رہے تھے کہ سواد بن غزیہ کے پیٹ پر جو صف سے کچھ آگے نکلے ہوئے تھے تیر کا دباؤ ڈالتے ہوئے فرمایا ''سواد برابر ہو جاؤ'' سواد نے کہا ''اے اللہ کے رسول آپ نے مجھے تکلیف پہنچا دی' بدلہ دیجئے۔'' آپؐ نے اپنا پیٹ کھول دیا اور فرمایا ''بدلہ لے لو'' سواد آپؐ سے چمٹ گئے اور آپؐ کے پیٹ کا بوسہ لینے لگے۔ آپؐ نے فرمایا ''سواد اس حرکت پر تمہیں کس بات نے آمادہ کیا؟'' انہوں نے کہا ''اے اللہ کے رسول! جو کچھ درپیش ہے آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ میں نے چاہا کہ ایسے موقع پر آپؐ سے آخری معاملہ یہ ہو کہ میری جلد آپ کی جلد سے چھو جائے۔'' اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعائے خیر فرمائی۔ پھر جب صفیں درست کی جا چکیں تو آپؐ نے لشکر کو ہدایت فرمائی کہ جب تک اسے آپؐ کے آخری احکام موصول نہ ہو جائیں جنگ شروع نہ کریں۔ جب تک مشرکین قریب نہ آ جائیں تیر نہ چلانا' اپنے تیر بچا کے رکھنا۔ جب تک وہ تم پر چھا نہ جائیں' تلوار نہ کھینچنا۔ اس کے بعد آپؐ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ سائبان کی طرف واپس چلے گئے۔

اس معرکہ کا پہلا ایندھن اسود بن عبدالاسد مخزومی تھا۔ یہ شخص بڑا اڑیل اور بد خلق تھا۔ یہ کہتے ہوئے میدان میں نکلا کہ ''میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ ان کے حوض کا پانی پی کر رہوں گا ورنہ اسے ڈھا دوں گا یا اس کے لیے جان دے دوں گا۔'' جب یہ ادھر سے نکلا تو ادھر سے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب برآمد ہوئے۔ دونوں میں حوض سے پرے ہی مڈبھیڑ ہوئی۔ حضرت حمزہ نے ایسی تلوار ماری کہ اس کا پاؤں نصف پنڈلی سے کٹ کر اڑ گیا اور وہ پیٹھ کے بل گر پڑا۔ اس کے پاؤں سے خون کا فوارا نکل رہا تھا' لیکن اس کے باوجود وہ گھٹنوں کے بل گھسٹ کر حوض کی طرف بڑھا اور اس میں داخل ہوا ہی چاہتا تھا تاکہ اپنی قسم پوری کر لے' اتنے میں حضرت حمزہ نے دوسری ضرب لگائی اور وہ حوض کے اندر ہی ڈھیر ہو گیا۔ یہ اس معرکے کا پہلا قتل تھا۔ اس کے بعد جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ قریش کے تین بہترین شاہسوار نکلے جو سب کے سب ایک ہی خاندان کے تھے۔ عتبہ' اس کا بھائی شیبہ اور اس کا بیٹا ولید' تینوں اپنی صف سے نکلے اور مبارزت طلب کی۔ مسلمانوں کی طرف سے انصار کے تین جوان حضرت عوف ؓ' حضرت معوذ ؓ یہ دونوں حارث کے بیٹے تھے تیسرے عبداللہ بن رواحہ ؓ مقابلہ کے لیے نکلے۔ قریشیوں نے ان کا نام ونسب پوچھا۔ جب معلوم ہوا کہ ان کا تعلق انصار سے ہے تو انہوں نے کہا آپ لوگ شریف مدمقابل ہیں' لیکن ہمیں آپ سے سروکار نہیں۔ ہم تو اپنے چچیرے بھائیوں کو چاہتے ہیں اور پھر عتبہ نے بلند آواز سے کہا کہ محمد! ہمارے پاس ہماری قوم کے ہمسروں کو بھیجیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبیدہ بن حارث' حمزہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو مقابلے کے لیے جانے کا حکم دیا۔ جب ان کو ان کے نام معلوم ہوئے تو کہنے لگے کہ آپ لوگ شریف مدمقابل ہیں اور ہمارے برابر کے لوگ ہیں۔ حضرت عبیدہ نے جو سب سے معمر تھے عتبہ بن ربیعہ سے مقابلہ کیا حضرت حمزہ نے شیبہ سے اور حضرت علی نے ولید سے۔ حضرت حمزہ اور حضرت علی نے تو اپنے اپنے مقابل کو جھٹ مار لیا' لیکن حضرت عبیدہ اور ان کے مدمقابل کے درمیان ایک ایک وار کا تبادلہ ہوا اور دونوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کو گہرا زخم لگایا۔ اتنے میں حضرت علی اور حضرت حمزہ اپنے اپنے مقابل سے فارغ ہو کر پہنچ گئے اور آتے ہی عتبہ کا کام تمام کر دیا۔ حضرت عبیدہ کو اٹھا لائے' انکا پاؤں کٹ گیا تھا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر پوچھا کہ کیا میں دولت شہادت سے محروم رہا؟ آپؐ نے فرمایا نہیں تم نے شہادت پائی۔ حضرت عبیدہ نے کہا آج ابوطالب زندہ ہوتے تو تسلیم کرتے کہ ان کے اس شعر کا مستحق میں ہوں۔

و نسلمه حتی نصرّع حوله

و نذهل عن ابنائنا و الحلائل

(ہم محمد ﷺ کو اس وقت دشمنوں کے حوالہ کرینگے جب ان کے گرد لڑ کر مر جائیں اور ہم اپنے بیٹوں اور بیویوں سے بھلا دیئے جائیں۔)

سعید ابن العاص کا بیٹا عبیدہ سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبا ہوا صف سے نکلا اور پکارا کہ ''میں ابوکرش ہوں۔'' حضرت زبیر اس کے مقابلہ کو نکلے اور چونکہ صرف اس کی آنکھیں نظر آتی تھیں تاک کر آنکھ میں برچھی ماری' وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ برچھی اس طرح پیوست ہو گئی تھی کہ حضرت زبیر نے اس کی لاش پر پاؤں اڑا کر کھینچا تو بڑی مشکل سے نکلی لیکن دونوں سرے خم ہو گئے۔ یہ برچھی یادگار رہی۔ حضرت زبیر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگ لی۔ پھر چاروں خلفاء کے پاس منتقل ہوتی رہی۔ پھر حضرت عبداللہ بن زبیر کے پاس آئی۔

Marfat.com

اب عام حملہ شروع ہو گیا۔ مشرکین اپنے بل بوتے پر لڑ رہے تھے' لیکن ادھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سربسجدہ صرف خدا کی قوت کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔ ابو جہل کی شرارت اور دشمنی اسلام کا عام چرچا تھا۔ اس بنا پر انصار میں سے دو بھائیوں نے عہد کیا تھا کہ یہ شقی جہاں نظر آ جائے گا اس کو مٹا دیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف ؓ کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ دفعتہً مجھ کو دائیں بائیں دونو جوان نظر آئے ایک نے مجھ سے کان میں پوچھا "ابو جہل کہاں ہے؟" ابھی میں جواب دے نہیں پایا تھا کہ دوسرے نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا۔ میں نے کہا "برادر زادہ ابو جہل کو پوچھ کر کیا کرے گا؟" اس نے جواب دیا۔

قسم کھائی ہے مر جائیں یا ماریں گے ناری کو
سنا ہے گالیاں دیتا ہے وہ محبوب باری کو
یہ کہتے کہتے غیرت سے ہوئے منہ لال دونوں کے
شہادت کے لہو سے تمتمائے گال دونوں کے

میں نے دونوں کو اشارہ سے بتایا کہ ابو جہل وہ ہے۔ بتانا تھا کہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور ابو جہل خاک پر تھا۔ دونوں جوان عفرا کے بیٹے تھے معوذ و معاذ ؓ۔ ابو جہل کے بیٹے عکرمہ نے عقب سے آ کر معاذ کے بائیں شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا' لیکن تسمہ باقی لگا رہا۔ معاذ نے عکرمہ کا تعاقب کیا' وہ بچ کر نکل گیا۔ معاذ اسی حالت میں لڑ رہے تھے لیکن ہاتھ کے لٹکنے سے زحمت ہوتی تھی۔ ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر کھینچا کہ تسمہ بھی الگ ہو گیا اور اب وہ آزاد تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ کوئی شخص جا کر خبر لائے کہ ابو جہل کا کیا انجام ہوا؟ حضرت عبداللہ بن مسعود نے جا کر لاشوں میں دیکھا کہ زخمی پڑا ہوا دم توڑ رہا تھا۔ بولے "تو ابو جہل ہے؟" اس نے کہا "ایک شخص کو اس کی قوم نے قتل کر دیا یہ فخر کی کیا بات ہے؟" ابو جہل نے ایک دفعہ ان کو تھپڑ مارا تھا۔ انہوں نے اس کے انتقام میں اس کی گردن پر پاؤں رکھا۔ ابو جہل نے کہا "او بکری چرانے والے دیکھ تو کہاں پاؤں رکھتا ہے؟" حضرت عبداللہ بن مسعود اس کا سر کاٹ لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا۔

عتبہ' ابو جہل اور بڑے بڑے لوگوں کے قتل سے قریش کا لشکر حوصلہ ہار بیٹھا اور عام پسپائی شروع ہو گئی۔ مسلمانوں نے ان کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ ان کے بڑے بڑے لوگ قتل ہو گئے' ان کی اصل قیادت میدان میں کام آئی۔ ستر لوگ مارے گئے اور ستر گرفتار ہوئے۔ مسلمانوں میں سے صرف چودہ شخصوں نے شہادت پائی' جن میں چھ مہاجر اور باقی انصار تھے۔ لیکن دوسری طرف قریش کی اصل طاقت ٹوٹ گئی۔ وہ رؤسائے قریش جو شجاعت میں نامور اور قریش کے سپہ سالار تھے ایک ایک کر کے مارے گئے۔

خاتمۂ جنگ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین کی طرف توجہ فرمائی۔ عام طور پر لڑائیوں میں آپ کا معمول رہا ہے کہ جہاں کوئی لاش نظر آتی تھی آپؐ اس کو وہیں زمین میں دفن کرا دیتے تھے' لیکن اس موقعہ پر چونکہ مقتولین کی تعداد زیادہ تھی اس لیے ایک ایک کا الگ الگ دفن کرانا مشکل تھا۔ آپؐ نے حکم دیا کہ تمام لاشیں ایک وسیع اور بند کنوئیں میں پھینک دی جائیں۔ چنانچہ سب لاشیں اس میں ڈال دی گئیں' لیکن امیہ کی لاش پھول کر اس قابل نہیں رہی تھی کہ اپنی جگہ سے ہٹائی جائے' اس لیے وہیں خاک میں دبا دی گئی۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ بدر میں جب تیسرا دن آیا تو آپؐ کے حکم کے مطابق آپ کی سواری پر کجاوہ کسا گیا۔ آپؐ پیدل چلتے ہوئے صحابہ کرام کی معیت میں اس کنویں تک آئے جس میں لاشیں پھینکی گئی تھیں۔ کنویں کی باڑ پر کھڑے ہوئے اور مقتولین اور ان کے باپوں کے نام لے لے کر پکارنا شروع کیا "اے فلاں! اور اے فلاں ابن فلاں! کیا تمہیں یہ بات خوش آتی ہے کہ تم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی کیونکہ ہم سے ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا اسے ہم نے برحق پایا تو کیا تم سے تمہارے رب نے جو وعدہ کیا تھا اسے تم نے برحق پایا؟" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کی "یا رسول اللہ! آپؐ ایسے جسموں سے باتیں فرما رہے ہیں جن میں روح ہی نہیں۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ لوگ اسے سن رہے ہیں' لیکن یہ جواب نہیں دے سکتے۔"

Marfat.com

جب مشرکین کی لاشوں کو کنویں میں ڈالنے کا حکم دیا گیا اور عتبہ بن ربیعہ کو کنویں کی طرف گھسیٹ کر لے جایا جانے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے صاحبزادے ﴿جو بفضلہ تعالیٰ مسلمان تھے اور جنگ بدر میں مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے﴾ کے چہرے پر نظر ڈالی تو آپؐ نے محسوس کیا کہ ان کا چہرہ غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ''ابو حذیفہ ؓ! غالباً اپنے والد کے سلسلے میں تمہارے دل کے اندر کچھ احساسات ہیں؟'' انہوں نے کہا ''نہیں واللہ یا رسول اللہ! میرے اندر اپنے باپ کے بارے میں اور ان کے قتل کے بارے میں ذرہ بھی لرزش نہیں۔ البتہ! میں اپنے باپ کے متعلق جانتا تھا کہ ان میں سوجھ بوجھ ہے' دور اندیشی اور فضل وکمال ہے اس لیے میں آس لگائے بیٹھا تھا کہ یہ خوبیاں انہیں اسلام تک پہنچا دیں گی۔ لیکن اب ان کا انجام دیکھ کر اور اپنی توقع کے خلاف کفر پر ان کا خاتمہ دیکھ کر مجھے افسوس ہے۔'' اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو حذیفہ ؓ کے حق میں دعائے خیر فرمائی اور ان سے دلجوئی کی بات کہی۔

اس کے بعد آپؐ اسیرانِ جنگ کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں دو دو چار چار کی صورت میں صحابہ میں تقسیم فرمایا اور حکم دیا کہ انہیں آرام کے ساتھ رکھو۔ حکم کی تعمیل میں صحابہ کا ان کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ انہیں کھانا کھلاتے تھے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابو عزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے اپنے گھر میں قید کر رکھا تھا جب صبح یا شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے رکھ دیتے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے' مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دے دیتا' لیکن وہ ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے اور مجھی کو واپس دے دیتے اور یہ اس بنا پر تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی تھی کہ قیدیوں سے اچھا سلوک کیا جائے۔

قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو تھا جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ''یا رسول اللہ! اس کے دو نیچے کے دانت اکھڑوا دیجئے کہ پھر اچھا نہ بول سکے۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں اگر اس کے عضو بگاڑوں گا تو گو نبی ہوں لیکن اللہ اس کی جزاء میں میرے اعضاء بھی بگاڑے گا۔''

حضرت عباس کے بدن پر کرتا نہ تھا' لیکن ان کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہیں اترتا تھا۔ عبداللہ بن ابیّ ﴿رئیس المنافقین﴾ نے جو کہ حضرت عباس کا ہم قد تھا اپنا کرتہ منگوا کر دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے کفن کے لیے جو اپنا کرتہ عنایت فرمایا تھا وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔

اسیرانِ جنگ میں سے دو آدمیوں کے سوا کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ جن دو شخصوں کو قتل کیا گیا ان میں پہلا شخص نضر بن حارث ہے۔ یہ شخص جنگِ بدر میں مشرکین کا علمبردار تھا۔ اسلام دشمنی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی میں حد درجہ بڑھا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی صفراء میں اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ علیہ وسلم نے حکم کی تعمیل میں اس کی گردن ماردی۔ اس کے بعد جب آپؐ عرق الظبیہ پہنچے تو عقبہ بن ابی معیط کے قتل کا حکم دیا۔ یہی شخص ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن پر چادر لپیٹ کر آپ کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وقت پر نہ پہنچ جاتے تو اس نے تو اپنی دانست میں آپؐ کا گلا گھونٹ ہی دیا تھا۔ جب آپؐ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا تو کہنے لگا ''اے محمد (ﷺ)! بچوں کے لیے کون ہے؟'' آپؐ نے فرمایا ''آگ'' اس کے بعد حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے اس کی گردن اڑا دی۔ یہ دونوں اشخاص جنگی نقطہ نظر سے صرف جنگی قیدی ہی نہ تھے بلکہ آج کی اصطلاح میں ''جنگی مجرم'' بھی تھے۔

غزوۂ بدر ایک ایسی نصیحت خیز اور عبرت آموز داستان ہے۔ جسے قرآنِ کریم نے ''الفرقان'' کا نام دیا ہے۔ جس کے اثرات نے حق و باطل کی کشمکش کو ایک نیا موڑ دیا۔ تاریخ پر اس نے گہرے اثرات چھوڑے، مسلمانوں کو آنے والے جانگسل مراحل کیلئے اس طرح تیار کیا کہ وہ ہر معرکے میں کندن بن کر نکلے۔ اس میں سرفروشی اور جاں سپاری کی ایسی مثالیں قائم ہوئیں جسے تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا گیا۔ یہ مختصر سا لشکر چونکہ امتِ مسلمہ کا ہراول دستہ تھا اس لئے اس کے کارنامے اور اس کی خوبیاں امت کے راستے کا سنگِ میل بنیں اور اس کی معمولی فروگزاشتوں پر پروردگار نے سورۃ الانفال میں بے لاگ تبصرہ کر کے مسلمانوں کی سیرت و کردار کو ہر طرح کی کمزوری سے پاک کر دیا اور ان پر یہ بات واضح کر دی کہ تم اللہ کا وہ پسندیدہ اور منتخب لشکر ہو جس نے دنیا میں اسلامی انقلاب کی بنیادیں رکھنی ہیں اور کفر کے جتھوں کو اپنی ایمانی قوت سے توڑنا اور منتشر کرنا ہے۔ تمہاری ایک ایک بات تاریخ کا عنوان بننے والی ہے۔ اس لئے اس سورۃ کے آئینہ میں تمہیں اپنے خدوخال پہچاننے چاہئیں اور جہاں کہیں معمولی داغ دکھائی دے اسے اللہ کے دین کی راہنمائی میں دور کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جسے سامنے رکھتے ہوئے ہم سورۃ الانفال سے صحیح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

Marfat.com

ایَاتُھَا ۷۵	سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ مَدَنِیَّۃٌ	رُکُوْعَاتُھَا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ
قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ
يَتَوَكَّلُوْنَ ۝۲ۚۖ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ؕ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ
مَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝۴ۚ كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۪
وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ۙ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ
بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ؕ
وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ
اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ
بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ۙ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ
الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸ۚ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ

Marfat.com

لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝۹ وَ مَا جَعَلَهُ
اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَ لِتَطْمَىٕنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۱۰

وہ تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے! انفال اللہ اور رسول کیلئے ہے، پس تم اللہ سے ڈرو اور باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔ (۱) بلاشبہ مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں ان کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ کریں۔ جو نماز قائم کریں اور اس مال میں سے جو ہم نے انہیں بخشا ہے خرچ کریں، یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کیلئے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ (۲ تا ۴) اسی طرح نکالا آپ کو آپ کے رب نے آپ کے گھر سے ایک مقصدِ حق کی خاطر اور اہل ایمان کی ایک مختصر ٹولی ناخوش تھی، وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑتے تھے۔ اس کے بعد کہ حق ظاہر ہو چکا تھا گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے تھے اور وہ دیکھ رہے تھے۔ (۵ تا ۶) اور اس وقت کو یاد کرو جس وقت اللہ تم سے وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک یقیناً تمہارے لئے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے کلمات سے حق کو حق ثابت کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے تاکہ وہ حق کو حق ثابت کرے اور باطل کو باطل ثابت کرے اگرچہ ناراض ہوں گناہ گار۔ (۷ تا ۸) اور اس وقت کو یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سنی کہ میں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا جن کے پرے کے بعد پرے نمودار ہوں گے۔ (۹) اور نہیں کیا اللہ نے (فرشتوں کی خبر دینے کو) مگر خوشخبری تاکہ اس سے تمہارے دل مطمئن ہو جائیں اور مدد تو اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے، بیشک اللہ زور آور حکمت والا ہے۔ (۱ تا ۱۰) (رکوع: ۱)

یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ ۪ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (الانفال: ۱)

وہ تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے! انفال اللہ اور رسول کیلئے ہے، پس تم اللہ سے ڈرو اور باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو ۝

Marfat.com

انفال کا مفہوم

انفال، "نفل" کی جمع ہے۔عربی زبان میں نفل اس چیز کو کہتے ہیں جو واجب سے یا حق سے زائد ہو۔جب یہ تابع اور ماتحت کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ رضا کارانہ خدمت ہوتی ہے جو ایک بندہ اور ملازم اپنے آقا کیلئے فرض سے بڑھ کر تطوعاً بجالاتا ہے اور جب یہ متبوع کی طرف سے ہو تو اس سے مراد وہ عطیہ اور انعام ہوتا ہے جو آقا اپنے بندے کو اس کے حق سے زائد دیتا ہے۔قرآن وسنت کی اصطلاح میں نفل اور انفال مالِ غنیمت کیلئے بھی بولا جاتا ہے جو کفار سے بوقتِ جہاد حاصل ہوتا ہے۔قرآنِ کریم نے مالِ غنیمت کیلئے تین الفاظ استعمال کیے ہیں۔انفال،غنیمت،فیئے۔

غنیمت عموماً اس مال کو کہتے ہیں جو جنگ وجہاد کے ذریعے مخالف فریق سے حاصل ہو اور فیئے اس مال کو کہتے ہیں جو بغیر جنگ وقتال کے کفار سے ملے،خواہ وہ چھوڑ کر بھاگ جائیں یا رضامندی سے دینا قبول کرلیں اور نفل اور انفال کا لفظ جیسا کہ عرض کیا گیا اس انعام کے لئے بولا جاتا ہے جو امیرِ جہاد کسی خاص مجاہد کو اس کی کارگزاری کے صلہ میں علاوہ غنیمت کے حصہ کے بطور انعام عطا کرے اور کبھی یہ لفظ مطلقاً مالِ غنیمت پر بھی بولا جاتا ہے اور اس آیتِ کریمہ میں مالِ غنیمت ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

سوال کی نوعیت

اس آیت میں جو سوال کیا گیا ہے اس سلسلے میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے جو وضاحت فرمائی اسے مسند احمد،ترمذی،ابن ماجہ اور مستدرک وغیرہ میں اس طرح روایت کیا گیا ہے کہ یہ آیت اصحابِ بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔جس کا واقعہ یہ تھا کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے باعث مسلمانوں میں کچھ اختلاف پیدا ہوگیا۔صورت یہ پیش آئی کہ مسلمان سب غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے دونوں فریق میں گھمسان کی جنگ کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی۔تو اب مسلمان لشکر کے تین حصے ہوگئے۔کچھ لوگوں نے دشمن کا تعاقب کیا تاکہ دشمن واپس نہ آسکے۔کچھ لوگ کفار کے چھوڑے ہوئے اموالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے اور کچھ لوگ رسولِ کریم ﷺ کے گرد اس لئے جمع رہے کہ کسی طرف سے چھپا ہوا دشمن آنحضرت ﷺ پر حملہ نہ کردے۔جب جنگ ختم ہوگئی اور رات کو ہر شخص اپنے ٹھکانے پر پہنچا تو جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا وہ کہنے لگے کہ یہ مال تو ہم نے جمع کیا ہے اس لئے اس میں ہمارے سوا کسی کا حصہ نہیں،جو لوگ دشمن کے تعاقب میں گئے تھے انہوں نے کہا کہ تم لوگ ہم سے زیادہ اس کے حقدار نہیں ہو کیونکہ ہم ہی نے دشمن کو پسپا کیا اور تمہارے لئے موقع فراہم کیا کہ تم بے فکر ہو کر مالِ غنیمت جمع کرلو اور جو لوگ آنحضرت ﷺ کی حفاظت کیلئے آپ کے گرد جمع رہے انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے تو ہم بھی مالِ غنیمت جمع کرنے میں تمہارے ساتھ شریک ہوتے لیکن آنحضرت ﷺ کی حفاظت جو جہاد کا سب سے اہم کام تھا ہم اس میں مشغول رہے،اس لئے ہم بھی اس کے مستحق ہیں۔

مسلمانوں جیسی بلند اخلاق قوم میں مالِ غنیمت کے حوالے سے اختلاف پیدا ہونا بظاہر عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کیونکہ اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کو پہلی مرتبہ پرچمِ اسلام کے نیچے لڑنے کا اتفاق ہوا تھا اور اسلام میں اب تک جنگ اور مالِ غنیمت کے بارے میں احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ایسی صورتحال میں مسلمانوں کے ذہن میں صرف وہی تصورات تھے جو اسلام سے پہلے عربوں میں رائج تھے۔قدیم زمانے سے طریقہ یہ چلا آرہا تھا کہ جو مال جس کے ہاتھ لگتا وہی اس کا مالک قرار پاتا۔عربوں کی اسی روایت کے مطابق جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا وہ جائز طور پر اپنے آپ کو اس کا مالک سمجھنے لگے اور جب دوسرے لوگوں نے اپنا استحقاق جتلایا تو انہیں ناگوار گزرا اور ان کا انکار باقی مسلمانوں کیلئے دل گرفتگی کا باعث بنا۔چونکہ یہ آنحضرت ﷺ کے تربیت یافتہ اور اللہ سے ڈرنے والے لوگ تھے اس لئے یہ اختلاف صرف زبانوں تک محدود رہا اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ورنہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ افواج میں مالِ غنیمت کے اختلافات ہمیشہ نازک صورت اختیار کر جاتے ہیں۔خانہ جنگی شروع ہوجاتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جیتی ہوئی بازی ہار دی جاتی ہے۔لیکن اس موقعہ پر مسلمانوں نے صرف یہ کیا کہ نبی کریم ﷺ سے مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں پوچھا۔چنانچہ اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی اور اس کا آغاز ہی اس طرح ہوا کہ یہ لوگ آپ سے انفال کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ قرآنِ کریم نے

Marfat.com

اگرچہ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل پر اصلاحی انداز میں تنقید فرمائی ہے۔ لیکن یہ بات امرِ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو اس سے پہلے اس حوالے سے کوئی ہدایات نہیں دی گئی تھیں۔ جنگی تہذیب کی ابھی تک بنیاد نہیں رکھی گئی تھی۔ بہت سے تمدنی معاملات ابھی تک اصلاحی احکام کے انتظار میں تھے۔ ایسی صورتحال میں یہ انسانی کمزوری ہے کہ انسان پرانے رسم ورواج کے طریقے پر چل پڑتا ہے چنانچہ مسلمانوں میں بھی یہ اختلاف اسی سبب سے ہوا۔ جو اب میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں ایک تو مسلمانوں کو ان کی اصل حیثیت یاد دلائی گئی ہے اور دوسری یہ بات کہ اسلام جنگ اور اس سے متعلقہ امور میں جو اصلاح کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔

مسلمانوں کی مقصدی حیثیت

جہاں تک مسلمانوں کو ان کی مقصدی حیثیت یاد دلانے کا سوال ہے اس کی طرف اشارہ سوال کے انداز اور جواب کے اسلوب میں مضمر ہے کہ تم نے مالِ غنیمت کے بارے میں سوال اٹھا کر یہ تاثر دیا ہے کہ گویا تم جنگ اس لئے لڑتے ہو تا کہ تمہیں مالِ غنیمت ہاتھ آئے حالانکہ مسلمانوں کی کفار سے جنگ صرف جنگ نہیں بلکہ جہاد ہے۔ جس کا مقصد اعلائے کلمۃ الحق اور اللہ کی رضا کا حصول ہے اور یہی وہ مقصد ہے جس کی خاطر تمہیں اٹھایا گیا ہے۔ دنیا کو مقصد بنا کر شب وروز کی محنت، جان ماری اور پھر اس سلسلے میں ہر طرح کی صعوبتوں کا برداشت کرنا، دوسروں کے حقوق چھیننا، دوسروں کی محرومیوں پر اپنی کامیابیوں کے قلعے استوار کرنا، دنیا بھر کی قوموں کا رات دن کا معمول ہے اگر تمہارا مطلوب ومقصود بھی دنیا ہوتا تو پھر بطور ایک امت کے تمہیں برپا کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ یہ دنیا مختلف اقوام کی آماجگاہ ہے یہاں قدم قدم پر آویزشیں ہیں۔ ظلم اور فساد ہے، انسانوں کے حقوق کی تباہ کاری ہے۔ تمہارا کام اس کھیل میں شریک ہونا نہیں بلکہ اللہ کی زمین پر انسانوں کو نئی زندگی نئے دستور العمل، نئے اہداف اور نئی منزلوں سے آگاہ کرنا ہے۔ حق وباطل کی آویزش کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ اس میں صرف اللہ کے نام اور اس کے دین کی سربلندی سامنے ہوتی ہے، ایک مسلمان اسی کیلئے محنت کرتا، جان کھپاتا، زخمی ہوتا حتی کہ اس راستے میں قربان ہو جاتا ہے۔ اس کے مقاصد اور اہداف میں دور دور تک دنیا طلبی اور سامانِ دنیا کے حصول کا کوئی تصور نہیں کیونکہ مسلمانوں کے لئے جاں سپاری اور سرفروشی کا اصل انعام تو آخرت میں ملے گا۔ جس میں جنت کی نعمتیں ان کے انتظار میں ہیں۔ البتہ! کبھی کبھی فتح وکامرانی کی صورت میں بھی یہ انعام ملتا ہے اور فتح کی صورت میں مالِ غنیمت کا ہاتھ آ جانا اصل مقصد سے ایک زائد بات ہے۔ جس کی طرف یہاں انفال کہہ کر اشارہ فرمایا گیا ہے کہ مالِ غنیمت تمہارا حق نہیں کیونکہ حق وہ ہوتا ہے جس کی خاطر جنگ لڑی جاتی ہے اور تمہاری لڑائیاں اور جنگیں تو اس مقصد کیلئے نہیں ہیں۔ رہی یہ بات کہ تمہیں جنگ میں کامیابی کی صورت میں مالِ غنیمت ملنا چاہئے تو یہ اللہ کا وہ انعام ہے جو وہ اپنی رضا کے ساتھ ساتھ عطا فرماتا ہے۔ لیکن اس کی خواہش تمہارے دل ودماغ میں دور تک نہیں ہونی چاہیے کیونکہ:

شہادت ہے مقصود و مطلوبِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اس لئے تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ مالِ غنیمت چونکہ تمہارا حق نہیں اس لئے تمہیں اس کے مطالبے کا بھی حق نہیں۔ مالِ غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا حق اور ان کی ملکیت ہے۔ اللہ کا چونکہ نمائندہ اللہ کا رسول ہوتا ہے اس لئے وہی اللہ کے حق کا استعمال کرتا ہے۔ اس لئے یہ مالِ غنیمت اللہ کے رسول کی تحویل میں ہوگا۔ جیسے وہ چاہے گا ویسے اس میں تصرف کرے گا۔ یہاں مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا گیا۔ اس کی وضاحت آگے چل کر فرمائی گئی۔ یہاں مقصود چونکہ تصورات کی اصلاح ہے کیونکہ تصورات ہی اعمال کی بنیاد بنتے ہیں۔ اس لئے بات کو یہیں تک محدود رکھا گیا۔ البتہ! یہ بات کہ مسلمانوں کا مالِ غنیمت پر اختلاف کرنا اور پھر دلوں کا اس سے متاثر ہونا چونکہ مسلمانوں کی شان کے لائق نہیں اس لئے ایسی ہدایات کا دینا ضروری ہے جس سے آئندہ یہ سوال پیدا نہ ہونے پائے اور اگر پیدا ہو تو اس کے برے اثرات دلوں تک نہ پہنچیں۔ اس کے بعد تین ہدایات عطا فرمائی گئی ہیں۔ ۱: تقویٰ...... ۲: اصلاح ذات البین...... ۳: اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت۔

Marfat.com

ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اگر تم واقعی مومن ہو اور تمہارے مومن ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ جنگِ بدر میں تم اپنے ایمان کو پوری طرح ثابت کر چکے ہو، البتہ! اسے مزید جلا دینے اور اس کی روشنی کو مزید تیز کرنے کیلئے ان تین باتوں کی ضرورت ہے۔

ا:)......تقویٰ:

تقویٰ دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ جس میں نیکی کی طرف میلان اور برائی سے نفرت بڑھ جاتی ہے۔ ایک مومن کے دل کے احساسات اتنے مصفا ہو جاتے ہیں کہ اللہ کی رضا کی طلب اس کی زندگی بن جاتی ہے اور اللہ کی نافرمانی اسے موت محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کا دل اللہ کی محبت سے بیدار ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے معمولی غفلت اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے باہر تڑپتی ہے اور پانی سے اسے آسودگی ملتی ہے اسی طرح اللہ کی یاد اس کے احکام کی اطاعت، اس کے دین کی سربلندی کیلئے کاوشیں، اس کے بندوں کی خدمت اور عاجزی اور فروتنی اس کی آسودگی کا سامان بن جاتی ہیں۔ دنیا اس کی ضرورت ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اس کی خاطر کبھی دل کی پاکیزگی کو میلا نہیں ہونے دیتا۔ دعائے نیم شبی اور فغانِ سحر گاہی اس کے دل کی پکار بن جاتی ہیں۔

۲:)......اصلاحِ ذات البین:

باہمی تعلقات کی درستی اور معاملات کی خوش اطواری جس طرح انفرادی زندگی کا حسن ہے اسی طرح مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی ضرورت ہے۔ سورۂ نساء میں پروردگار نے تقویٰ اور رحمی رشتوں کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بنیاد ٹھہرایا ہے۔ رحمی رشتے ہوں یا صہری رشتے، معاشرتی روابط ہوں یا معاشی معاہدے، ملکی ضوابط ہوں یا قومی روابط، یہ سب چیزیں اجتماعی زندگی کی استواری کا باعث ہیں۔ ان میں جہاں بھی کسی خرابی سے دراڑیں پڑتی ہیں وہیں اجتماعی زندگی میں شکست و ریخت شروع ہو جاتی ہے۔ اللہ کے تقویٰ سے جس طرح مسجدیں آباد ہوتی ہیں اسی طرح گھر اور تعلقات کے تمام ادارے بھی مضبوط ہوتے ہیں کیونکہ جس کے احساسات پاکیزہ نہیں اور اس کے دل میں اللہ کا خوف نہیں وہ تعلقات کی نزاکتوں کو کبھی ملحوظ نہیں رکھ سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ تقویٰ تو دل کی کیفیت کا نام ہے اور باہمی تعلقات دیکھا جانے والا تجربہ ہے جس سے صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی تقویٰ کی کس منزل میں ہے نمازوں میں خشوع و خضوع کے جاننے کا کوئی پیمانہ نہیں لیکن تعلقات اور معاملات میں قدم قدم پر ایسے پیمانے موجود ہیں جس سے انسان کا اللہ سے اور اس کے بندوں سے تعلق کا امتحان ہوتا ہے اور مزید یہ کہ مسلمان ایک مجاہد امت ہے جو دنیا کی اصلاح کیلئے اٹھی ہے۔ اسے قدم قدم پر مخالفتوں سے واسطہ پڑے گا۔ مخالفین اس کا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اس امت کے افراد میں باہمی محبت اور مؤدت نہیں ہوگی اور ان کے آپس کے تعلقات میں اخلاص اور گہرائی نہیں ہوگی تو یہ دشمن کے مقابلے میں کبھی سیسہ پلائی دیوار نہیں بن سکتے۔ اس لئے پہلے ہی معرکے میں باہمی تعلقات میں ہلکی سی خراش دیکھ کر پروردگار نے اس کے مستقل ازالے کیلئے یہ ہدایت نازل فرمائی اور اسی کا نتیجہ ہوا کہ میدانِ جہاد میں ایسے وفاشعار مسلمانوں کو بھی دیکھا گیا جنہوں نے موت کی جانکنی میں بھی دوسرے کو پہلے پانی پلانے کیلئے پیاس کے ہاتھوں جان دے دی۔ ایسے حیرت انگیز واقعات انہی لوگوں میں پیش آتے ہیں جو اللہ کے ان احکامات کو قلب و نظر میں بسا چکے ہوں۔

۳:)......اطاعتِ خدا اور رسولؐ:

زندگی کے تمام معاملات میں خوش اسلوبی اور بندوں کے اللہ سے تعلقات میں گہرائی اور خوش اطواری صرف ایک ہی صورت سے پیدا ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ سے تعلق پیدا کرنے کے مختلف طریقے انسانوں نے ایجاد کیے ہیں لیکن وہ افراط و تفریط سے خالی نہیں ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی کو ہموار راستوں پر لڑانے کیلئے مختلف آداب اختیار کئے گئے ہیں۔ لیکن وہ بھی آلودگیوں سے بیگانہ نہیں۔ صحیح زندگی کا صحیح معیار صرف اللہ کے رسول کی زندگی ہے۔ اسی زندگی میں اللہ کے احکام کی اطاعت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے

Marfat.com

تو اس کے لئے اسوۂ حسنہ اللہ کے رسول کی ذات ہے اور اگر اللہ کے رسول جیسی زندگی اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا نمونہ بھی ذاتِ رسالت مآب ہے۔ایک ہی ذات میں اللہ اور رسول کی اطاعت جمع ہو جاتی ہے۔اس لئے مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ زندگی کا کوئی معاملہ ہو عبادت سے متعلق ہو یا معاملات سے، جنگ کے بارے میں ہو یا مالِ غنیمت سے متعلق، تمہارے لئے ایک ہی بارگاہ ہے جہاں سے تمہیں صحیح راہنمائی ملے گی وہ ہے اللہ کا رسول۔مالِ غنیمت کے بارے میں تفصیلی جواب تو بعد میں آئے گا اس وقت تو ضروری بات یہ ہے کہ اپنے احساسات اور تصورات کو ان تین حوالوں سے پاکیزہ بنالو۔جب ہر طرح کے معاملے میں اللہ کے رسول کی ذات نمونہ قرار پائے گی تو پھر کبھی آپس کے اختلافات پیدا نہیں ہوں گے اور کبھی شیطان کو گمراہ کرنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ایمان کی لازمی شرط اللہ اور رسول کی اطاعت ہے اور اس کا ہدف تقویٰ اور آپس کے معاملات کی پاکیزگی ہے۔اگر تم مومن ہو تو اپنے ایمان کو ان بنیادی احکام کا پابند بناؤ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا جائزہ لیتے رہو کہ تمہارے اندر مومن کا وہ سراپا پیدا ہو سکا ہے یا نہیں جس کی تصویر اگلی آیتِ کریمہ میں کھینچی گئی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝ (الانفال : ۲ تا ۴)

بلاشبہ مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے ان کے دل دہل جائیں اور جب اس کی آیتیں اُن کو سنائی جائیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کریں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ کریں ۝ جو نماز قائم کریں اور اس مال میں سے جو ہم نے انہیں بخشا ہے خرچ کریں ۝ یہی لوگ سچے مومن ہیں ان کے لئے ان کے رب کے پاس درجے اور مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ ۝

قانونی زبان میں ہر وہ شخص مومن ہے جو ان باتوں کا زبان سے اقرار کرتا ہے جن کا ماننا ایمان لانے کیلئے ضروری ہے۔جب تک کوئی آدمی ایمانیات میں سے کسی بات کا انکار نہیں کرتا قانونی زبان میں اسے مومن ہی سمجھا جاتا ہے۔لیکن حقیقی معنوں میں مومن صرف زبانی اقرار سے نہیں بنتا اس کے لئے دل ونگاہ کا مومن ہونا بھی ضروری ہے۔

پہلی صفت خشیتِ الٰہی :

اس لئے پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں حقیقی مومن کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں جن میں پہلی صفت ''خشیتِ الٰہی'' ہے جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں، دلوں میں کپکپی طاری ہو جاتی ہے، کھالیں ان کی پھڑ پھڑانے لگتی ہیں، جسم سکڑنے لگتا ہے، رنگ اڑ جاتا ہے، اللہ کی کبریائی اس کی قدرتوں کی بے پناہی اور اس کی جلالتِ قدر کا تصور کر کے دل پگھلنے لگتا ہے۔کبھی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور کبھی دل کے احساسات آہوں کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔راتوں کی نیند اچاٹ ہونے لگتی ہے اور آہِ سحر گاہی زندگی کا معمول بن جاتی ہے۔جب بھی کوئی معاملہ کسی بھی مومن کے سامنے آتا ہے تو وہ فوراً سوچنے لگتا ہے کہ اس سے متعلق میرے اللہ کا حکم کیا ہے اور اگر کسی گوشے سے اس کی مخالفت سر اٹھاتی ہے تو اس کا دل چیخ اٹھتا ہے کہ خداوندِ ذوالجلال کی مخالفت بھی کی جاسکتی ہے؟ جس کے جلال سے زمین کانپتی اور سمندر پایاب ہو جاتے ہیں جس کے غضب سے قوموں کا تختہ الٹ دیا جاتا ہے۔جس کی برہمی سے انسانوں پر پتھر برستے ہیں۔کیا اس کی نافرمانی اس آدمی سے ممکن ہے جسے واقعی اللہ کی کبریائی کا شعور حاصل ہے؟ آدمی گناہ پر دلیر اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اللہ سے غافل ہوتا ہے اور اس کے دل میں اللہ کے سوا غیر اللہ کی حکومت یا محبت ہوتی ہے۔لیکن وہ شخص جسے اللہ کی کبریائی کا صحیح تصور حاصل ہے۔وہ تو اپنے رب کی بڑائی، عظمت اور شان کا تصور کر کے کانپنے لگتا ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کسی نے دیکھا کہ جب وہ نماز کیلئے وضو کرنے لگتے ہیں تو ان کا رنگ اڑنے لگتا ہے اور جب وہ وضو کر کے نماز کیلئے آگے بڑھتے ہیں تو رنگ ان کا پیلا پڑ جاتا ہے۔پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا: جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اپنے رب کے سامنے پیشی کیلئے جا رہا ہوں تو اس کی عظمت کا تصور کر کے میرا دل بے قابو ہو جاتا ہے اور میں سہم سہم جاتا ہوں۔

Marfat.com

دوسری صفت ایمان میں ترقی:

ایسے شخص کے سامنے جب قرآنِ کریم کی آیات اور اللہ کے احکام پڑھ کر سنائے جاتے ہیں تو چونکہ اس کا دل اللہ کے تصور اور اس کی محبت سے آباد ہو چکا ہے اور اس کی نافرمانی کے خوف سے دہل اٹھتا ہے تو وہ ان احکام کو سن کر لپکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا ہے اور اس میں دوسری صفت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ہے ''ایمان میں ترقی''، یعنی اس کے دل کی وہ کیفیت جو ایمان کا نتیجہ ہے اس میں پہلے سے اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایمان اگر ایک پودا ہے تو اس کے احکام اس کے برگ و بار ہیں۔ ایمان کا پودا جب برگ و بار نکالنے لگتا ہے تو اس کا مالک اور اس کا کاشتکار یقیناً خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور وہ اپنی فصل کو لہلہاتا ہوا دیکھ کر شاد ہو جاتا ہے۔

اللہ کی آیات کی حیثیت اللہ کے پیغاموں کی ہے۔ جو دل اللہ کی محبت سے سرشار ہے وہ جب اس کی آیات کو سنتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ میرے محبوب کا پیغام میرے نام آیا ہے۔ دنیا میں کون سا ایسا محب ہے جو محبوب کے پیغام کو پا کر خوشی سے دیوانہ نہیں ہو جاتا۔ ایک عاشقِ صادق کیلئے محبوب کا تصور ہی فرحت بخش ہوتا ہے اسی تصور کے سہارے اس کی زندگی گزرتی ہے۔ محبوب کا معمولی التفات اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دیتا ہے اور اگر کہیں محبوب کا کوئی سندیسہ یا کوئی محبت نامہ اسے وصول ہو جائے تو کوئی شخص اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس کی وارفتگی کا عالم کیا ہوگا۔ یہی کیفیت اس مومن کی ہے جو صرف اپنے اللہ سے لو لگا چکا ہو۔

تیسری صفت توکل علی اللہ:

اللہ کی محبت تصورِ جاناں کی مانند نہیں کہ عاشق اس تصور کو لئے بیٹھا رہے بلکہ اس کی محبت زندگی کا ایک پیغام ہے۔ زندگی کا ایک ضابطہ ہے، باطل کے خلاف ایک کشمکش ہے، ہر غلط بات کے خلاف ایک جہاد ہے، ایک ایسا جہاد جس میں زندگی کے تمام وسائل جھونکنے پڑتے ہیں۔ ایک ایسی کشمکش جس میں بعض دفعہ ہر سہارا ٹوٹنے لگتا ہے، ارادے جواب دینے لگتے ہیں، ایسے موقعہ پر بھی مومن کبھی ہراساں اور سراسیمہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے رب کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ باقی ذرائع اور وسائل میری ضرورت ہیں مجھے انہیں فراہم کرنا چاہئے۔ لیکن اگر کبھی وسائل جواب دے جائیں یا نایاب ہو جائیں اور مقصد برابر پکار رہا ہو تو پھر ایک مومن کیلئے اللہ پر بھروسہ ایک ایسی قوت بن جاتا ہے جس کی موجودگی میں وہ کبھی مضمحل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بدوی برہنہ تلوار لے کر آنحضرت ﷺ سے پوچھتا ہے کہ بتا اب تجھے مجھ سے کون بچا سکتا ہے؟ تو اللہ پر بھروسے کا یہ سب سے عظیم پیکر اور اسوۂ حسنہ بڑے اطمینان سے فرماتا ہے ''اَللّٰہُ''۔ بدوی اس سے اس قدر مرعوب ہوتا ہے کہ تلوار اس کے ہاتھ سے گر جاتی ہے۔ ایک مومن بلاوجہ کبھی خطرات میں داخل نہیں ہوتا، لیکن جب خطرات میں داخل ہونا اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ضروری ہو جائے یا اللہ اور اس کے دین کی عزت و حرمت کی بقا کیلئے ضرورت بن جائے تو پھر وہ بے خطر اس آگ میں کود جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میرا اللہ میرے ساتھ ہے اور مجھے صرف اسی پر بھروسہ کرنا ہے کیونکہ:

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

کافر وسائلِ جنگ پر بھروسہ کرتا ہے اور مومن اللہ پر بھروسہ کرتا ہے۔ وسائل کی فراہمی کیلئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن ان پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وسائل ہوں تو بھی اس کا بھروسہ اللہ ہی پر ہوتا ہے۔

چوتھی صفت اقامتِ صلوٰۃ:

وہ مومن جس کے ایمان کا اللہ کے یہاں اعتبار ہے اس کی ایک صفت ''اقامتِ صلوٰۃ'' بھی ہے۔ یہ مستقل ایک صفت بھی ہے اور باقی صفات کا مقدمہ اور تمہید بھی۔ مومن کی جو صفت بھی مندرجہ بالا صفات میں سے وجود میں آتی ہے اس کا دار و مدار اقامتِ صلوٰۃ پر ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد صرف نماز

Marfat.com

پڑھنا نہیں بلکہ نماز کی اقامت ہے۔ اقامت کے لفظی معنی ”کسی چیز کو سیدھا کرنے“ کے ہوتے ہیں۔ مراد اس سے یہ ہے کہ نماز پورے آداب و شرائط کے ساتھ اس طرح بجالائی جائے جس طرح نبی کریم ﷺ ادا فرماتے تھے۔ آپ کے عمل سے ہمیں نماز کے جن آداب و شرائط کا علم ہوا ہے ان کی پابندی کے بغیر اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم وجود میں نہیں آتا۔ اسی طرح قرآن وسنت میں نماز کے جو فوائد، آثار اور برکات ذکر فرمائی گئی ہیں اگر نماز کی پابندی سے ان کا ظہور نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ میں کمی ہے۔ فقہی نقطہ نگاہ سے تو اوقاتِ مخصوصہ میں چند مخصوص اعمال کا بجالانا نماز کہلاتا ہے اور ایسا کرنے والا نمازی کہلائے گا لیکن حقیقی نماز جس کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اس کا تحقق اسی وقت ہوگا جب اس کے آثار اور فوائد نظر آئیں گے۔ مثلاً قرآن کریم کہتا ہے:

ان الصلٰوۃ تنھٰی عن الفحشاء و المنکر (بیشک نماز بے حیائی اور ہر گناہ سے روکتی ہے۔)

اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے اور ساتھ بے حیائی اور منکرات کا ارتکاب بھی کرتا ہے تو اس نے اقامتِ صلوٰۃ نہیں کی محض نماز کی مشق کی ہے۔ اسی طرح قرآنِ کریم میں فرمایا گیا۔ اقم الصلوٰۃ لذکری ﴿میری یاد کیلئے نماز قائم کرو﴾ اگر کوئی شخص نمازی ہونے کے باوجود اللہ کی یاد سے غافل ہے وہ جب گناہ کرنے لگتا ہے اسے اللہ کی یاد نہیں آتی۔ جب وہ ظلم کرنے لگتا ہے تو اللہ کے خوف سے اس کا ہاتھ نہیں کانپتا، جب وہ بے حیائی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے اللہ سے شرم نہیں آتی۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی نماز محض فارمیلیٹی ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ حقیقی نماز وہ ہے جو قرآن کریم کے بیان کردہ آثار و نتائج کی حامل ہو، یہی وہ نماز ہے جسے ”رأس الصفات“ کہا گیا ہے۔ پانچ وقت ایسی نماز کی ادائیگی نمازی میں ان صفات کو پیدا کرتی ہے جو ایمان کا تقاضا ہیں اور اس سے وہ اسلامی زندگی وجود میں آتی ہے جیسی زندگی ایک مومن کی ہونی چاہئے۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک اقامتِ صلوٰۃ، نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنے کا نام ہے کیونکہ کسی چیز کا قائم ہونا بہ ہمہ وجوہ قائم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ ہم جب کہتے ہیں عدالت قائم ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے عدالت کی عمارت بن گئی، جج کا تقرر ہوگیا، مدعی اور مدعا علیہ پیش ہونے لگے، مقدمات کے فیصلے ہونے لگے، لوگوں کو انصاف ملنے لگا، غرضیکہ وہ تمام امور وجود میں آگئے جو عدالت کیلئے ضروری ہیں۔ ایسے ہی اقامتِ صلوٰۃ کا مفہوم ہے مسجدوں کی تعمیر، ائمہ کا تقرر، لوگوں کو نماز کی ترغیب اور اس کی پابندی، نماز کے آداب وسنن کی تعلیم اور ایک ایسی تحریک جو نماز کی فرضیت اور افادیت دلوں میں اتار دے۔ اس پورے پراسس کو اقامتِ صلوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پانچویں صفت انفاق فی سبیل اللہ:

پانچویں صفت انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ انسان کی بہت سی کمزوریاں جس طرح نفسانی تقاضوں سے وجود میں آتی ہیں اسی طرح مال و دولت کی حد سے بڑھی ہوئی محبت بھی انسان کے سیرت و کردار میں بہت سے مفاسد کا سبب بنتی ہے۔ مال انسان پر اثر انداز ہونے والی چیزوں میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک ایسی ضرورت بھی ہے جس کے بغیر زندگی کی گاڑی نہیں چلتی۔ لیکن ساتھ ہی ایک ابتلاء بھی ہے جو قدم قدم پر کبھی بخل پر اکساتا ہے اور کبھی تبذیر پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی کے نتیجے میں کتنے منکرات کو راستہ ملتا ہے اور اگر اس کی جہت درست کردی جائے اور اس کے بارے میں تصورات پاکیزہ کردیئے جائیں تو یہ نیکی کی بہت بڑی قوت بن جاتا ہے۔ اسی سے خدمتِ خلق ممکن ہوتی ہے اور اسی سے غلبۂ دین کو مدد ملتی ہے۔ اس لئے ایک مومن کی صفت کے طور پر اس کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک مومن مال و دولت میں سے جو کچھ اپنے پاس رکھتا ہے اسے وہ اللہ کی دین سمجھتا ہے۔ اسے اللہ کی امانت سمجھ کر اس کے حق کی ادائیگی کی فکر کرتا ہے۔ اپنی ضرورتوں سے جو کچھ بچتا ہے اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرکے اللہ کے سامنے سرخرو ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں اس کے سیرت و کردار میں جلا پیدا ہوتی اور اللہ کے دین کو سربلندی ملتی ہے۔

ان پانچ صفات کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جنہیں سچے اور حقیقی مومن قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ محض ایمان کا دعویٰ کسی کو حقیقی مومن نہیں بنا دیتا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ اے ابوسعید! کیا آپ مومن ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ بھائی ایمان دو قسم کے ہیں تمہارے سوال کا اگر مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، جنت و دوزخ، قیامت اور حساب کتاب پر ایمان رکھتا ہوں تو جواب یہ ہے کہ بے شک میں مومن ہوں اور اگر تمہارے سوال کا مطلب یہ ہے کہ میں وہ مومنِ کامل ہوں جس کا ذکر سورۃ الانفال کی آیات میں ہے تو مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں ان میں داخل ہوں یا نہیں۔

Marfat.com

یہی وہ حقیقی مومن ہیں جنہیں اللہ کے یہاں تقرب حاصل ہے اور جن پر ہمیشہ اللہ کی نوازشات کی بارش برستی ہے۔ اپنے خصوصی کرم کا اظہار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ان حقیقی مومنوں کیلئے تین قسم کے انعامات ہیں۔ ا:۔ درجاتِ عالیہ...... ۲:۔ مغفرت...... ۳:۔ عمدہ رزق۔

(تفسیر بحر محیط میں ہے کہ اس سے پہلی آیات میں سچے مومنین کی جو صفات بیان ہوئی ہیں۔ وہ تین قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق قلب اور باطن کے ساتھ ہے۔ جیسے ایمان، خوف خدا، توکل علی اللہ۔ دوسرے وہ جن کا تعلق جسمانی اعمال سے ہے، جیسے نماز وغیرہ۔ تیسرے وہ جن کا تعلق انسان کے مال سے ہے، جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ ان تینوں قسموں کے بالمقابل تین انعاموں کا ذکر آیا ہے۔ ''درجاتِ عالیہ'' قلبی اور باطنی صفات کے مقابلہ میں اور ''مغفرت'' ان اعمال کے مقابلہ میں جو انسان کے ظاہر بدن سے متعلق ہیں، جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ نماز گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے اور ''رزقِ کریم'' اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے مقابلہ میں کہ جو کچھ خرچ کیا اس سے بہت بہتر اور بہت زیادہ اس کو آخرت میں ملے گا۔) (ماخوذ از معارف القرآن)

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ (الانفال: ۵،۶)

اسی طرح نکالا آپ کو آپ کے رب نے آپ کے گھر سے ایک مقصدِ حق کی خاطر اور اہلِ ایمان کی ایک مختصر ٹولی ناخوش تھی ۝ وہ آپ سے حق کے بارے میں جھگڑتے تھے اس کے بعد کہ حق ظاہر ہو چکا تھا گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے تھے اور وہ دیکھ رہے تھے ۝

کما کا مفہوم:

قرآنِ کریم نے ''کذلک، کذابک، کما'' یہ تینوں الفاظ مختلف مواقع پر تشریح کیلئے استعمال کئے ہیں۔ البتہ! دوسرے حروفِ تشبیہ اور ان میں فرق یہ ہے کہ ان میں مشبہ اور مشبہ بہ متعین نہیں ہوتے بلکہ ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ پیشِ نظر دونوں کا انجام ہوتا ہے اور یہ انجام اور نتیجہ دونوں واقعات میں مشابہت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں ''کما'' کا لفظ تشبیہ کیلئے آیا ہے۔ تو تشبیہ کس چیز کو کس چیز سے دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں اہلِ علم کے مختلف اقوال ہیں۔ امام تفسیر ابوحیان نے تقریباً پندرہ (۱۵) اقوال نقل کیئے ہیں۔ لیکن پوری صورتحال پر غور کرنے کے بعد دو مفہوم ایسے ہیں جو زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتے ہیں۔

ا:۔ اس سورۃ کی پہلی آیت میں مسلمانوں کی طرف سے مالِ غنیمت کے بارے میں ایک سوال کا ذکر کیا گیا ہے اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال کی نوبت اس لئے آئی کہ جن لوگوں نے مالِ غنیمت جمع کیا تھا اور وہ ان کے قبضے میں تھا وہ عرب کی روایت کے مطابق یہ سمجھ رہے تھے کہ مالِ غنیمت اس کا ہوتا ہے جس کے قبضے میں ہو تو اس لئے یہ مال ہمارا ہے۔ دوسرے مسلمان اس میں شریک نہیں ہیں۔ اس سے اختلاف پیدا ہوا اور اس کے اثرات دلوں تک پہنچے چنانچہ پروردگار نے اس پر تنبیہ فرمائی اور اصلاح کے لئے ہدایات جاری فرمائیں۔

اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح تم نے مالِ غنیمت کے معاملے میں ایک غلطی کا ارتکاب کیا اگر اللہ تعالیٰ تمہیں بروقت ہدایت سے نہ نوازتا اور تمہیں اطاعتِ رسول کی توفیق نہ دیتا تو مالِ غنیمت میں پیدا ہونے والے اختلافات بعض دفعہ بڑی بڑی جنگوں میں بھی جیتی ہوئی بازی کو شکست میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ تو جس طرح تم نے مالِ غنیمت کے معاملے میں غلط اندیشی کا ثبوت دیا اسی طرح تم میں سے کچھ لوگوں نے اس وقت بھی غلط اندیشی کا ثبوت دیا جب نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ ایک مقصدِ حق کی خاطر گھر سے نکلنے کا حکم دے رہا تھا۔ اس پر بھی اللہ کا کرم یہ ہوا کہ تم نے اپنی بات پر ضد کرنے کی بجائے صحیح بات کو قبول کیا تو اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کے اختلاف کی طرح اس اختلاف کو بھی ختم کر دیا اور نہ صرف اس کے برے نتائج سے بچایا بلکہ بہتر نتائج سے نوازا۔

Marfat.com

۲: بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ یہاں ''کما'' کا لفظ تشبیہ کیلئے نہیں بلکہ بیانِ سبب کیلئے ہے اور اس سے پہلے ''نصرک'' محذوف ہے۔ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ غزوۂ بدر میں پروردگار کی جانب سے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی جو نصرت و امداد فرمائی گئی اس کا سبب یہ تھا کہ آپ اس جہاد کیلئے اپنی کسی نفسانی خواہش کیلئے نہیں نکلے تھے۔ آپ کے پیشِ نظر کوئی مالی یا سیاسی منفعت نہیں تھی بلکہ آپ خالصۃً حکمِ خداوندی کے تابع ہو کر نکلے تھے اور ایک مقصدِ حق کے حصول کے سوا کوئی اور مقصد آپ کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ بلاشبہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک محدود تعداد ایسی بھی تھی جو اس نکلنے میں خوش نہ تھی۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایات سے نوازا اور اپنی نصرت اور تائید سے آپ کو کامیاب فرمایا۔

بدر کیلئے آنحضرت کا نکلنا ایماءِ الٰہی سے اور ایک مقصدِ حق کیلئے تھا:

اب اس کے مندرجات کو ملاحظہ فرمایئے۔ اس آیتِ کریمہ میں پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ان کے گھر یعنی مدینہ منورہ سے ایک مقصدِ حق کے لئے نکلنے کا حکم دیا۔ اس میں پہلی بات تو یہ صاف ہو جاتی ہے کہ آپ خود کسی مقصد کیلئے نہیں نکلے تھے بلکہ آپ کا نکلنا اللہ کے حکم سے تھا اور اس کا ایک خاص مقصد تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ مقصد کیا تھا؟ تیسری آیتِ کریمہ میں فرمایا ہے کہ:

يُرِيْدُاللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ

(اللہ تعالیٰ چاہتا تھا کہ حق کو حق ثابت کرے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔)

مقصدِ حق کے بروئے کار آنے کی صورت:

یہ وہ مقصدِ حق تھا جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو نکلنے کا حکم دیا تھا۔ جن لوگوں کی نظر قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر ہے اور وہ جانتے ہیں کہ قوموں کی عزت و حشمت اور ان کی بقا کے اساسی وسائل کیا ہوتے ہیں۔ ان کیلئے یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ قریش کا قافلۂ تجارت اگرچہ اپنے ساتھ سیاسی اور جنگی مقاصد بھی رکھتا تھا اس لئے مکہ کے ہر مرد و عورت نے مقدور بھر اس میں شرکت کی تھی اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کے پس انداز کو مسلمانوں کے استیصال کیلئے صرف کیا جائے گا۔ بایں ہمہ! یہ ایک حقیقت ہے کہ قریشِ مکہ کی اصل طاقت ان کے قافلۂ تجارت پر منحصر نہیں تھی، ان کی طاقت کا سب سے بڑا ذریعہ ان کی افرادی قوت اور جنگی مہارت تھی۔ یہ قافلۂ تجارت شائد بھیجا ہی اس لئے گیا تھا کہ مسلمان اسے روکنے کیلئے نکلیں گے اور یا ہم ایک مفروضہ قائم کر کے قافلے کو بچانے کا نام دے کر مسلمانوں پر لشکر کشی کریں گے اور اس طرح سے ہمیں اس نوزائیدہ قوت کے استیصال کرنے کا موقع مل جائے گا۔ عرب ہمیں قطع رحمی کا طعنہ بھی نہیں دیں گے بلکہ وہ یہ سمجھیں گے کہ جب مسلمانوں نے خود ہی ایسے حالات پیدا کئے تو پھر قریشِ مکہ اس آخری اقدام کیلئے مجبور تھے۔ اس صورتحال میں یہ سمجھنا کہ نبی کریم ﷺ قافلۂ تجارت کو لوٹنے کیلئے نکلے تھے یہ قرآنِ کریم کی وضاحت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ اگر آپ اس کے لوٹنے کیلئے نکلتے اور آپ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے تو اس کے نتیجے میں قریش اور اس کے حریفوں کی بے پناہ یورش کا مقابلہ کرنا آپ کیلئے آسان نہ ہوتا وہ دورانہ وار مدینہ پر حملہ آور ہوتے اور ان کے حریف قبائل یہ محسوس کر کے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یقیناً ان کا ساتھ دیتے اور پھر صورتحال بالکل مختلف ہوتی اور اگر فرض کریں کہ وقتی طور پر یہ آندھی نہ بھی اٹھتی تو آئندہ کسی وقت بھی پوری قوت سے اس طوفان کا اٹھنا اسی طرح قرینِ قیاس تھا جس طرح جنگِ خندق میں اس کے اسباب پیدا ہوئے اور اس وقت تک مسلمان معاشرہ اتنے بڑے طوفان کا سامنا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جیسے ہی نبی کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ ایک طرف سے قافلہ آ رہا ہے اور دوسری طرف سے قریش کا لشکر تو آپ سمجھ گئے کہ اب فیصلہ کن وقت آ پہنچا ہے۔ اب آگے بڑھ کر میدان میں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ جینے کی صلاحیت کس میں ہے ورنہ مسلمانوں کی ایسی ہوا خیزی ہوگی کہ مدینہ کے اڑوس پڑوس میں رہنے والے قبائل اور خود مدینہ کی اندرونی قوتیں مسلمانوں پر دلیر ہو جائیں گی۔ اس لئے پروردگار نے مدینہ ہی سے آپ کو اس

Marfat.com

مقصدِ حق کی بجا آوری کیلئے بدر کی طرف نکلنے کا حکم دیا۔ لیکن مسلمانوں میں سے ایک مختصر سا گروہ جو یقیناً مخلص لوگوں پر مشتمل تھا۔ لیکن بعض مخلص لوگ زیادہ محتاط بھی ہوتے ہیں۔ ان کی احتیاط پسندی کی وجہ سے ایسی صورتحال پیدا ہوئی کہ وہ لشکرِ قریش کی طرف نکلتے ہوئے ناخوشی محسوس کر رہے تھے اور آنحضرت ﷺ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ابھی ہمیں قافلۂ تجارت کی طرف نکلنا چاہئے جب طاقت مل جائے گی تو پھر ہم قریش سے بھی دو دو ہاتھ کرلیں گے۔ لیکن اس بے سروسامانی اور محدود افرادی قوت کے ساتھ اتنے بڑے طوفان کا رخ کرنا موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہے۔

ان دونوں آیتوں کو سامنے رکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ لشکرِ قریش کی طرف جانے کا فیصلہ گھر سے نکلتے ہوئے ہوا ہے یعنی مدینہ طیبہ ہی میں یہ بات طے ہوگئی تھی کہ ہمیں جانا کدھر ہے اور کس مقصد کے لئے جانا ہے اور اسی کو دیکھتے ہوئے مسلمان دلوں میں سہم رہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کفار کے لشکر کی تعداد بہت بڑی ہے اور ان کے پاس اسلحہ جنگ کی بھی فراوانی ہے۔ اگر بجائے لشکرِ قریش کے قافلہ تجارت کی طرف جانا ہوتا تو اس کے محافظوں کی تعداد تو چالیس یا ستر بیان کی جاتی ہے۔ اس کے لئے نہ تو تین سو تیرہ (۳۱۳) افراد کی ضرورت تھی اور نہ مسلمانوں کے دلوں میں کسی اندیشہ کے در آنے کا کوئی موقعہ تھا۔ اس لئے بعض اصحاب سیر کا یہ سمجھنا کہ مدینہ سے تو حضور قافلہ کے ارادے سے نکلے تھے لیکن راستے میں جا کر خبر ہوئی کہ قریش کا ایک لشکرِ عظیم آرہا ہے اور مزید یہ بات کہ اگر حضور قافلے کیلئے نکلتے تو آپ کا رخ ملکِ شام کی جانب ہوتا، آپ بدر کی طرف رخ کر کے کبھی سفر کا آغاز نہ کرتے کیونکہ قافلہ ملکِ شام سے آرہا تھا۔ اسے کسی ایسی جگہ روکنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی جہاں قریب قریب قریش کا کوئی حریف قبیلہ موجود نہ ہوتا کہ وہ اس کی مدد کیلئے نہ پہنچ سکیں اور وہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ شام اور مدینہ کے مابین کسی جگہ قافلہ کو روکا جائے ورنہ جہاں تک مدینہ اور مکہ کے درمیان پھیلے ہوئے قبائل کا تعلق ہے ان میں بیشتر قریش کے زیرِ اثر تھے۔ البتہ! یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ قافلہ تجارت کا نام مسلمانوں کی زبان پر کیسے آیا؟ اس کا جواب اگلی آیتِ کریمہ سے ملتا ہے۔

وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآئِفَتَيۡنِ اَنَّهَا لَـكُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ الشَّوۡكَةِ تَكُوۡنُ لَـكُمۡ وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّحِقَّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡـكٰفِرِيۡنَ ۙ‏ لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ‌ ۚ

اور اس وقت کو یاد کرو جس وقت اللہ تم سے وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک یقیناً تمہارے لئے ہے اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے کلمات سے حق کو حق ثابت کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ ڈالے ○ تاکہ وہ حق کو حق ثابت کرے اور باطل کو باطل ثابت کرے اگرچہ ناراض ہوں گناہ گار ○ (الانفال : ۷، ۸)

مسلمانوں سے طائفتین میں سے ایک کا وعدہ:

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار نے وحیِ الٰہی کے ذریعے اپنے رسولِ برحق کی معرفت مسلمانوں سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ تمہارے سامنے دو جماعتیں ہیں ایک جماعت قافلۂ تجارت پر مشتمل ہے اور دوسری جماعت قریش کا عظیم الشان لشکر ہے۔ ان میں سے تم جس کیلئے کوشش کرو گے اس پر تمہارا قبضہ ہوجائے گا۔ روایات میں تجارتی قافلے کو "عیر" سے تعبیر کیا گیا ہے اور مسلح فوج کو جو مکہ سے آرہی تھی "نفیر" کا نام دیا گیا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ نے یہی مبہم بات مشاورت کیلئے صحابہ کے سامنے رکھی کہ ایک طرف سے قافلہ تجارت آرہا ہے اور دوسری طرف سے قریش کا لشکر۔ مشورہ دو ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ لیکن خود آنحضرت ﷺ نے اپنی طرف سے کسی بات کا اظہار نہیں فرمایا کیونکہ اگر آپ دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کا تعین فرما دیتے تو پھر مشاورت کا کوئی مفہوم نہ تھا اور مسلمانوں کیلئے آنحضرت ﷺ کی طے کردہ بات پر عمل کرنا فرض ہوجاتا۔ آپ نے اس مبہم بات کو مسلمانوں کا امتحان بنا دیا تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ مسلمان خطرات سے کھیلنے کی ہمت رکھتے ہیں یا نہیں اور ان کے اندر اولوالعزم اور سرفروشوں کی تعداد کتنی ہے اور سہل انگاروں کی کتنی کیونکہ مسلمانوں کو آئندہ چل کر جو پر خطر معرکے پیش آنے والے تھے ان معرکوں سے عہدہ برآہ ہونے کیلئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو خطر پسند اور متوکل علی اللہ طبیعتوں کا مالک بنایا جاتا۔ چنانچہ جیسے ہی آپ نے یہ سوال ان کے سامنے رکھا تو ان میں سے جو احتیاط کے راستے پر چلنے والے تھے اور جنہیں خطرات سے کھیلنا مشکل معلوم ہوتا تھا انہوں نے اسی بات پر اصرار کیا کہ ہمیں وہ راستہ اختیار کرنا چاہئے جس میں کوئی کانٹا نہ چبھے یعنی مشکلات پیش نہ آئیں۔

Marfat.com

شوکۃ جسے اردو زبان میں ''عزت وہیبت'' کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ عربی زبان میں ''کانٹے'' کو کہتے ہیں۔ ذَاتِ الشَّوْکَۃ کا معنی ہے ''کانٹے والا''، یعنی پرخطر کام اور غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃ ''وہ کام جس میں کانٹا چبھنے کا اندیشہ نہ ہو''، جس میں کوئی مشکل پیش نہ آتی ہو۔ اس لئے کچھ لوگوں نے قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کی رائے دی۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے بجائے ان کی طرف توجہ دینے کے فرمایا لوگو! مجھے مشورہ دو۔ اکابر مہاجرین سمجھ گئے کہ آنحضرت ﷺ لشکر کی طرف جانا چاہتے ہیں چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نہایت سرفاشانہ تقریریں کیں۔ آپ نے دونوں کو دعاؤں سے نوازا اور پھر اپنی بات کو دہرایا۔ اس پر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ:

(اے اللہ کے رسول ﷺ! اللہ نے آپ کو جس بات کا حکم دیا ہے آپ اس کیلئے اقدام کیجئے۔ آپ جہاں کیلئے نکلیں گے ہم آپ کے ہم رکاب ہیں۔ ہم آپ سے وہ بات کہنے والے نہیں ہیں جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ ''تم اور تمہارا رب دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھتے ہیں'' بلکہ ہمارا قول یہ ہے کہ آپ اور آپ کا رب دونوں جنگ کیلئے نکلیں جب تک کہ ایک آنکھ بھی ہم میں گردش کرتی ہے ہم سر کٹانے کیلئے حاضر ہیں۔)

آنحضرت ﷺ خوش ہوئے اور ان کو دعائیں دیں مگر ابھی تک حضرات انصار کی طرف سے موافقت میں کوئی آواز نہ اٹھی تھی اور یہ احتمال تھا کہ حضرات انصار نے جو معاہدہ نصرت وامداد کا آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیا تھا وہ اندرونِ مدینہ کا تھا۔ مدینہ سے باہر امداد کرنے کے وہ پابند نہیں اس لئے آپ نے پھر مجمع کو خطاب کر کے فرمایا کہ لوگو مجھے مشورہ دو کہ اس جہاد پر اقدام کریں یا نہیں۔ اس خطاب کا روئے سخن انصار کی طرف تھا۔ حضرت سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ ہم سے پوچھنا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ کی تصدیق کی ہے۔ ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ جو دین آپ لے کر آئے ہیں وہی حق ہے ہم نے آپ سے سمع واطاعت کا عہد ومیثاق کیا ہے۔ پس اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے جو ارادہ فرمایا ہے وہ پورا کیجئے اس خدا کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں اس سمندر کے کنارے لے جا کر اس میں کود پڑیں گے تو آپ کے ساتھ ہم بھی اس میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوگا۔ ہم اس بات سے نہیں گھبراتے کہ آپ ہمیں ہمارے دشمنوں کے مقابلہ کیلئے جا کھڑا کریں، ہم جنگ میں ثابت قدم رہیں گے۔ مقابلہ کے وقت ہم راست باز ثابت ہوں گے اور کیا عجب ہے کہ اللہ ہمارے ہاتھوں وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں تو اللہ کا نام لے کر آپ ہمیں ہم رکابی کا شرف بخشئے۔

رسول اللہ ﷺ یہ سن کر بہت مسرور ہوئے اور قافلہ کو حکم دے دیا کہ اللہ کے نام پر چلو اور یہ خوشخبری سنائی کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ ان دونوں جماعتوں میں سے ایک جماعت پر ہمارا غلبہ ہوگا۔ دونوں جماعتوں سے مراد، ایک ابوسفیان کا تجارتی قافلہ اور دوسرا یہ مکہ سے آنے والا لشکر ہے پھر فرمایا کہ اللہ کی قسم میں گویا اپنی آنکھوں سے مشرکین کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں۔ اس آخری جملے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چند کہ نبی کریم ﷺ سے دو جماعتوں میں سے ایک جماعت پر غلبے کا وعدہ فرمایا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے پیشِ نظر قافلہ نہیں بلکہ اس لشکر پر فتح پانا ہے جس کے نتیجے میں آپ ان کافروں کی قتل گاہیں دیکھیں گے جن کی قتل گاہیں آپ کو وحی کے ذریعے دکھادی گئی تھیں اور اس طرح سے آپ باطل کو باطل ثابت کریں گے اور حق کا حق ہونا واضح کر دیں گے اور قریشِ مکہ کی پہلی صف کے قتل ہونے کے نتیجے میں قریشِ مکہ کی جڑ کاٹ دی جائے گی کیونکہ جب کسی قوم کی قیادت قتل ہو جاتی ہے اور ان کے زعما مارے جاتے ہیں تو اس قوم کی جڑ کٹ جاتی ہے اور جس طرح سے اللہ تعالیٰ اپنے اس ارادے کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وہ بھی پورا ہو جائے گا۔

اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ فَاسْتَجَابَ لَکُمْ اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ O

(اور اس وقت کو یاد کرو! جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سنی کہ میں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کروں گا جن کے پرے کے بعد پرے نمودار ہوں گے۔) (الانفال: 9)

109513

Marfat.com

مسلمانوں کی دعا کی استجابت ایک ہزار فرشتوں کی صورت میں:

مسلمان اللہ کے حکم کے مطابق میدانِ جنگ میں پہنچ گئے دونوں فوجوں نے اپنے اپنے پڑاؤ ڈال لئے تو مسلمانوں نے دیکھا کہ ان کے مقابلے میں تین گنا سے بھی زیادہ قوت ہے۔ ان میں ایک ایک مقابلے میں تین کافر ہیں اور پھر مزید یہ کہ ان میں سے ہر شخص پوری طرح مسلح ہے۔ ان کے مقابلے میں مسلمان صرف افرادی قوت ہی میں کم نہیں بلکہ بے سروسامان بھی ہیں۔ چند آدمیوں کے سوا کسی کے پاس زرہ نہیں ہے، صرف آٹھ آدمیوں کے پاس شمشیریں ہیں باقیوں کے پاس معمولی ہتھیار ہیں اور بعض بالکل نہتے ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ نے کھجور کی چھڑیاں عنایت فرمائیں جو ان کے ہاتھوں میں جا کر تلواریں بن گئیں۔ پوری فوج میں صرف دو گھوڑے ہیں۔ افراد کی کمی اور بے سروسامانی کی یہ کیفیت دیکھ کر مسلمانوں نے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے اور اپنے اللہ سے فریاد کی کہ یا اللہ! تیرے دین کی سربلندی کیلئے ہم بے سروسامانی کے باوجود کافروں کے مقابلے میں کھڑے ہیں ہمارے پاس جو کچھ تھا ہم لے کر حاضر ہو گئے ہیں۔ بظاہر کفر کے پاس بہت بڑی طاقت ہے لیکن ہمیں تیری طاقت پر بھروسہ ہے اگر تیری تائید اور نصرت ہمیں حاصل ہے تو پھر ہمیں کوئی اندیشہ نہیں۔ ادھر آنحضرت ﷺ نے بھی نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے اللہ سے دعائیں مانگیں اور مسلمان اس پر آمین کہتے رہے۔ ان سب دعاؤں کو یکجا ذکر فرما کر جمع کے صیغے کے ساتھ پروردگار نے ارشاد فرمایا: اس وقت کو یاد کرو! جب تم اپنے اللہ سے فریاد کر رہے تھے۔ پس اللہ نے تمہاری فریادسنی اور اپنے رسول پر وحی اتاری کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں تمہارے سامنے اگر ایک ہزار کا لشکر ہے تو میں اس کے مقابلے میں ایک ہزار فرشتہ بھیج رہا ہوں اور فرشتے اس طرح آئیں گے کہ فرشتوں کی ٹکڑیاں یکے بعد دیگرے آپ کے پاس پہنچیں گی۔ جنگ میں اس بات کی بے حد اہمیت ہوتی ہے کہ لڑائی کا آغاز ہونے سے پہلے ہی فوج کو کمک پہنچنا شروع ہو جائے چنانچہ اگر یہ کمک مسلسل پہنچتی رہے تو ایک ایک سپاہی کے پہنچنے پر فوج کے حوصلے میں اضافہ ہوتا ہے۔ شریانوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے۔ ایک ایک سپاہی نئی توانائی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لئے ''مردفین'' فرمایا گیا۔

سورۂ آلِ عمران میں مزید دو خوشخبریوں کا ذکر بھی ہے۔ کفار کے ایک ہزار کے لشکر کے مقابلے میں پہلے ایک ہزار فرشتہ بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔ دوسری خوشخبری اس وقت آئی جب مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ کفار کے لشکر کیلئے نئی کمک پہنچنے والی ہے اور کرز بن جابر محاربی مشرکین کی امداد کیلئے ایک بڑا لشکر لے کر آ رہا ہے اس خبر سے مسلمانوں میں بے چینی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ چنانچہ اس پر تین ہزار فرشتے بھیجنے کا وعدہ فرمایا اور تیسرا وعدہ اس وقت فرمایا جب یہ بات مشہور ہوئی کہ کفار کی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ مسلمانوں پر شب خون مارنے آ رہا ہے۔ اس پر پروردگار نے فرمایا:

بلی ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھذا یمددکم ربکم بخمسة الف من الملئکة مسوّمین

﴿اگر تم ثابت قدم رہے اور تقویٰ پر قائم رہے اور مقابل لشکر یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑا تو تمہارا رب تمہاری امداد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو خاص نشان یعنی خاص وردی میں ہوں گے﴾

یہ بعد کے دونوں وعدے مشروط تھے کہ اگر کفار کو مزید کمک پہنچی اور انہوں نے اچانک یکبارگی حملہ کرنے کی کوشش کی تو پھر اللہ تعالیٰ تین ہزار ایسے فرشتے بھیجے گا جو پہلے سے زمین پر خدمات انجام دینے میں مصروف نہیں بلکہ آسمان سے تازہ دم فرشتے بھیجے جائیں گے اور اگر انہوں نے اچانک حملہ کر دیا تو پھر پانچ ہزار فرشتے اتریں گے جن میں سے ایک ایک فرشتہ ایک خاص لباس اور علامت کے ساتھ نازل ہوگا۔ جیسا کہ روایاتِ حدیث میں ہے کہ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کے عمامے ''سفید'' اور غزوۂ حنین میں مدد کیلئے آنے والے فرشتوں کے عمامے ''سرخ'' تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ صبح کے وقت آپ نے مسلمانوں کی صفیں درست فرمائیں، جہاد کی ترغیب دی، اللہ کے وعدوں کی نوید سنائی، پھر اپنے سائبان میں تشریف لے گئے اور نہایت آہ و زاری کے ساتھ اللہ کے حضور دست بدعا ہوئے۔

اللھم انجزلی ما وعدتنی اللھم انشدک عھدک ووعدک۔

﴿اے اللہ تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا فرما دے، اے اللہ میں تجھ سے تیرے عہد اور تیرے وعدے کا سوال کرتا ہوں﴾

پھر جب باقاعدہ حملہ ہو گیا اور لڑائی شروع ہو گئی تو آپ نے یہ دعا فرمائی

Marfat.com

اللھم ان تھلک ھذہ العصابة الیوم لا تعبد، اللھم ان شئت لم تعبد بعد الیوم ابداً

اے اللہ اگر آج یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو تیری عبادت نہ کی جائے گی اے اللہ اگر تو چاہتا ہے آج کے بعد تیری عبادت کبھی نہ کی جائے۔

آپ نے خوب تضرع کے ساتھ دعا کی یہاں تک کہ دونوں کندھوں سے چادر گر گئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے چادر درست کی اور عرض پیرا ہوئے کہ اللہ کے رسول بس فرمایئے آپ نے اپنے رب سے بڑے الحاح کے ساتھ دعا فرمالی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کو ایک جھپکی آئی پھر آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا: ابوبکر خوش ہو جاؤ تمہارے پاس اللہ کی مدد آ گئی یہ جبریل علیہ السلام ہیں اپنے گھوڑے کی لگام تھامے اور اس کے آگے آگے چلتے ہوئے آ رہے ہیں اور گردوغبار میں اٹے ہوئے ہیں اس کے بعد رسول اللہ ﷺ چھپر کے دروازے سے باہر تشریف لائے آپ نے زرہ پہن رکھی تھی۔ آپ پرجوش طریقے سے آگے بڑھ رہے تھے اور فرماتے جا رہے تھے۔

سیھزم الجمع ویولون الدبر ﴿عنقریب یہ جتھہ شکست کھائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گا﴾

اس کے بعد آپ نے ایک مٹھی کنکریلی لی اور قریش کی طرف رخ کر کے فرمایا شاھت الوجوہ ﴿چہرے بگڑ جائیں﴾ اور ساتھ ہی مٹی ان کے چہروں کی طرف پھینک دی۔ مشرکین میں سے کوئی نہیں ہوگا جس کی آنکھوں، نتھنے اور منہ میں اس مٹی کا کچھ نہ کچھ حصہ گیا نہ ہو۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰی وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

اور نہیں کیا اللہ نے (فرشتوں کی خبر دینے کو) مگر خوشخبری تا کہ اس سے تمہارے دل مطمئن ہو جائیں اور مدد تو اللہ ہی کے پاس سے آتی ہے، بیشک اللہ زورآور حکمت والا ہے ۝ (الانفال : ۱۰)

اللہ تعالیٰ کی نصرت اسباب کے پردے میں:

اس آیتِ کریمہ میں دو باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ایک تو یہ بات کہ کسی شخص کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی مدد کیلئے فرشتوں یا اسباب کا محتاج ہے۔ کائنات کی ہر مخلوق اپنی قوتوں اور اپنے خواص کیلئے اللہ کی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی مخلوق کا محتاج نہیں۔ فرشتے اگر کسی کی مدد کرتے ہیں تو اللہ کے حکم اس کے اذن اور اس کی دی ہوئی طاقت سے کرتے ہیں۔ اپنے طور سے وہ کسی کی مدد کرنے پر قادر نہیں۔ البتہ! اللہ کی ایک سنت ہے جس کے مطابق دنیا کا نظام چل رہا ہے کہ وہ جب بھی کسی کی مدد کرتا ہے تو اسباب کے پردے میں کرتا ہے۔ انسانی نظر چونکہ اسباب کو دیکھتی ہے اور اسباب ہی سے متاثر ہوتی ہے اس لئے جب وہ اسباب کو حرکت میں دیکھتی ہے تو اسے ایک گونہ سکون اور حوصلہ ملتا ہے۔ اس لئے پروردگار نے فرشتوں کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا لیکن ساتھ یہ بتانا ضروری سمجھا کہ تم کہیں اپنے آپ کو فرشتوں کا محتاج نہ سمجھ لینا اور نہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہونا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کا محتاج ہے۔ جب بھی کسی کی مدد ہوتی ہے تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ البتہ! نگاہیں اسباب کے پردے میں الجھ کر رہ جاتی ہیں۔ روشنی پاور ہاؤس سے آتی ہے لیکن نگاہیں ٹیوب اور بلب کو دیکھتی ہیں۔ لیکن بجلی کے نظام کو جاننے والا جانتا ہے کہ بجلی کہاں سے آ رہی ہے۔ ایک مسلمان کو بھی اس بات سے آگاہ ہونا چاہئے کہ اس کا سررشتہ کس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا ہاتھ کس کے سامنے پھیلنا چاہئے۔

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ جنگِ بدر میں پروردگار نے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور ان کی حوصلہ افزائی کیلئے فرشتوں کی فوج بھیجی لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اللہ کی نصرت کا یہ وعدہ صرف جنگِ بدر کے ساتھ مخصوص تھا یا اس وقت کے مسلمانوں کے ساتھ خاص تھا کیونکہ ان میں اللہ کے آخری رسول موجود تھے بلکہ مسلمانوں کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ جب بھی تقویٰ اور صبر کی تصویر بن کر صرف اللہ کی رضا کے حصول اور اعلائے کلمۃ الحق کیلئے مسلمان دشمن سے نبرد آزما ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی مدد ضرور اترے گی۔ ضروری نہیں کہ فرشتوں کی شکل میں مدد اترے کسی بھی صورت میں مدد آ سکتی ہے۔ وہ چاہے تو پرندوں کو فرشتوں کی طاقت دے دے، چاہے تو سمندر کی موجوں کو بے لگام کر دے، وہ چاہے تو آسمان کے دروازے بارشوں کیلئے کھول دے، لیکن عموماً وہ اپنے بندوں کی مدد کیلئے فرشتے اتارتا ہے۔ اس لئے ہر کٹھن وقت اور خطرناک حق و باطل کے معرکے

Marfat.com

میں مسلمانوں کو یقین رکھنا چاہئے کہ اگر انہوں نے کوئی کمزوری نہ دکھائی اور تقویٰ اور صبر کو ملحوظ رکھا اور وہی فضا پیدا کر دی جو جنگِ بدر میں تھی اور اللہ کے سامنے گڑگڑا کر اس سے مدد مانگی تو کوئی وجہ نہیں کہ مدد کیلئے فرشتے نازل نہ ہوں۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ

(مدد جب بھی آتی ہے اللہ کی طرف سے آتی ہے بے شک اللہ غالب حکمت والا ہے۔)

مسلمانوں کے عقیدے کی بنیاد ہی یہ ہے کہ مدد جب بھی آتی ہے اللہ کی طرف سے آتی ہے۔ اس لئے بھروسہ اللہ پر ہونا چاہئے دستِ سوال اسی کے سامنے دراز ہونا چاہئے، امیدیں اسی سے باندھنی چاہئیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہی ایک ذات ہے جو سب سے زور آور اور سب پر غالب ہے۔ جب وہ کسی کی مدد کرنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، کوئی راستے میں رکاوٹ کھڑی نہیں کر سکتا۔ البتہ! یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ مسلمان اللہ سے مدد طلب کرے لیکن ادھر سے مدد نہ آئے اور بظاہر یہ سمجھا جائے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو اپنی مدد سے محروم کر دیا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو تو مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ جس طرح "عزیز" ہے اسی طرح "حکیم" بھی ہے۔ اگر اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو تربیت کیلئے مصائب سے گزارا جائے تو وہ مصائب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے محروم کر دیا ہے بلکہ یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اس میں بھی اہلِ ایمان کیلئے کوئی مصلحت ہے۔

اِذْ یُغَشِّیْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً
مِّنْهُ وَ یُنَزِّلُ عَلَیْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ
یُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَ لِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ وَ یُثَبِّتَ
بِهِ الْاَقْدَامَ ؕ ⑪ اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَی الْمَلٰٓىِٕكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ
فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ؕ ⑫
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ

Marfat.com

رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ۚ ﴿۱۵﴾ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ
يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ
بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾
فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ
اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾
اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ
وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ
وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع

اس وقت کو یاد کرو! جب وہ تم پر نیند طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے چین دینے کیلئے اور اس نے تم پر آسمان سے پانی برسایا تا کہ اس سے تم کو پاکیزگی بخشے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کر دے اور تا کہ اس سے تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور قدموں کو جمائے (۱۱) اس وقت یاد کرو! جب تیرے رب نے فرشتوں کو حکم بھیجا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم ایمان والوں کو جمائے رکھو میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا۔ سو مارو گردنوں پر اور مار وان کے پور پور پر۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے کیلئے اٹھے ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے کیلئے اٹھتے ہیں تو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ یہ تو تم نقد چکھو اور جان رکھو کہ کافروں کیلئے دوزخ کا عذاب ہے۔ (۱۲ تا ۱۴) اے ایمان والو! جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو فوج کشی کی صورت میں تو پھر ان سے پیٹھ مت پھیرو جو کوئی ان سے پیٹھ پھیرے

Marfat.com

اس دن مگر یہ کہ جنگ کیلئے پینترا بدلنا چاہتا ہو یا کسی جماعت کی طرف سمٹ رہا ہو تو وہ لوٹا اللہ کا غضب لے کر اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔(۱۵تا۱۶) پس تم لوگوں نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا ہے اور آپ نے نہیں پھینکی (مٹھی خاک کی) جس وقت آپ نے پھینکی لیکن اللہ نے پھینکی تا کہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان، بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یہ جو کچھ ہوا سامنے ہے اور جان رکھو کہ اللہ سست کر دے گا تدبیر کافروں کی۔(۱۷تا۱۸) اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو آ گیا تمہارے پاس فیصلہ اور اگر تم باز آ جاؤ تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے اور کچھ کام نہ آئے گی تمہارے تمہاری جماعت خواہ وہ کتنی زیادہ ہو اور جان لو کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔(۱۹تا۱۹) (رکوع: ۲)

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (الانفال:۱۱)

اس وقت کو یاد کرو! جب وہ تم پر نیند طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے چین دینے کیلئے اور اس نے تم پر آسمان سے پانی برسایا تا کہ اس سے تم کو پاکیزگی بخشے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کر دے اور تا کہ اس سے تمہارے دلوں کو مضبوط کرے اور قدموں کو جمائے۔

اللہ تعالیٰ کے مزید احسانات کا بدلہ:

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے مسلمانوں پر اپنے مزید احسانات کا ذکر فرمایا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مسلمان جب میدانِ بدر میں پہنچے تو کفار کا لشکر اس سے پہلے ایک ایسے مقام پر قبضہ کر چکا تھا جو نسبتاً بلندی پر تھا اور زمین اس کی سخت اور ہموار تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کو وادی کے نچلے حصے میں جگہ ملی جس کی تفصیل اس سورۃ کی بیالیسویں (۴۲) آیت میں آرہی ہے۔ حضرت حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے اس جگہ کو جنگی اعتبار سے نامناسب دیکھ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! جو مقام آپ نے پسند فرمایا ہے یہ وحیِ الٰہی ہے یا جنگی حکمتِ عملی ہے؟ آپ نے فرمایا: وحی نہیں۔ تو حضرت حباب بن منذر ﷺ نے عرض کیا تو پھر بہتر یہ ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر قریشِ مکہ کے قریب ایسی جگہ پر قبضہ کیا جائے جس میں پانی بھی قریب ہو چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس مشورے کو پسند فرمایا اور آگے بڑھ کر پانی پر قبضہ کر لیا لیکن یہ جگہ بھی نشیبی اور ریتلی تھی جس میں پاؤں دھنس دھنس جاتے تھے۔ مسلمان اس صورتحال کو دیکھ کر محسوس کر رہے تھے کہ ہماری تعداد بھی دشمن کے مقابلے میں تشویش ناک حد تک کم ہے، وسائلِ جنگ نہ ہونے کے برابر ہیں اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ جگہ ایسی ملی ہے کہ جس میں چلنا پھرنا بھی دشوار ہے۔ ان تمام باتوں کو سوچ کر دلوں میں عجیب و غریب خیالات آتے تھے اور شیطان کو وسوسہ اندازی کا موقع ملتا تھا۔ اب اگر یہ خیالات طبیعت کی بے سکونی اور پریشانی کا سبب بنے رہتے تو نیند کسے آتی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ صبح معرکۂ کارزار میں مسلمان وہ کارکردگی نہ دکھا سکتے جس کی ان سے توقع کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ پروردگار نے ایسے دو احسانات فرمائے جس نے پوری صورتحال کو بدل ڈالا۔ پہلا احسان یہ کیا کہ طبیعتوں کو سکون دینے اور شیطان کی وسوسہ اندازی کو روکنے کیلئے مسلمانوں پر نیند طاری کر دی۔ وہ رات کو بیشتر حصہ اطمینان کی نیند سوئے، تازہ دم ہو کر اٹھے تو طبیعت کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا کیونکہ انسانی کمزوری یہ ہے کہ وہ خالی پیٹ تو کسی حد تک لڑ سکتا ہے لیکن مسلسل بے آرامی جسم کو توڑ کر رکھ دیتی ہے، اعصاب جواب دینے لگتے ہیں۔ اس لئے آج کی ملٹری سائنس میں اس بات کی شدید کوشش کی جاتی ہے کہ دشمن پر اعصابی حملے کیے جائیں، افواہیں پھیلائی جائیں جس سے دشمن کی بے سکونی میں اضافہ ہو۔ راتوں کی نیند اچاٹ ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وقت سے پہلے ہی دشمن ہتھیار ڈال دے گا۔ اس لئے مدبر جرنیل اور ہمدرد حکومتیں ہمیشہ اپنی فوج اور اپنی قوم کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ چنانچہ پروردگار نے اسی لئے نیند کی صورت میں مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا۔ حضرت علی ﷺ فرماتے ہیں کہ اس رات ہم میں سے ہر شخص خواہ وہ سونا چاہتا تھا یا نہیں ضرور نیند کی گرفت میں آیا اور جی بھر کر آرام کیا۔

Marfat.com

نعاس کا مفہوم:

ممکن ہے کسی کو یہ خیال آئے کہ آیت میں ''نعاس'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی میں ''ابتدائی نیند'' یعنی اونگھ اور جھپکی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ نعاس کا لفظ مطلق نیند کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے اور ''نوم'' کے معنی میں آتا ہے اور دوسری یہ بات کہ ایک ذمہ دار فوج جسے صبح ایک فیصلہ کن معرکہ میں اترنا ہے، اس کا ایک ایک سپاہی قوت کارکردگی کی بحالی کیلئے آرام کی خواہش تو ضرور رکھتا ہے لیکن گھوڑے بیچ کر سونا کبھی پسند نہیں کرتا۔ وہ سوتا ہے تو کھٹکے کی نیند سوتا ہے۔ اس لئے نعاس کے لفظ نے دونوں باتوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ مسلمانوں کو آرام اور چین بھی ملا لیکن ذمہ داری کا احساس ان سے الگ بھی نہ ہوا۔

دوسرا احسان اللہ نے یہ فرمایا کہ بارش نازل فرمادی۔ لیکن اس کیلئے تعبیر یہ اختیار فرمائی کہ آسمان سے پانی اتارا۔ یہ نہایت دلنواز تعبیر ہے جس میں شائد اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کفار قریش نے تمہیں زمین کے پانی سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے تو کیا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں آسمان سے پانی نازل فرمادیا اور نازل بھی اس طرح فرمایا جس طرح کہ روایات میں مذکور ہے کہ قریش کی طرف زور کی بارش اتری اور مسلمانوں کی طرف ہلکی ہلکی بارش نازل ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قریش کی طرف کی زمین کیچڑ کیچڑ ہوگئی جس سے پھسلن پیدا ہوگئی اور چلنا دشوار ہوگیا اور مسلمانوں کی زمین ریتلی ہونے کی وجہ سے جم گئی اور سخت ہو کر ہر طرح کی آمدورفت کیلئے آسان ہوگئی۔ مزید فائدہ یہ ہوا کہ کفار کی طرح پانی کی ضرورت مسلمانوں کیلئے صرف پینے کی حد تک نہیں تھی کیونکہ اسلام نے ان کے ذوق ورجحان پر جو اثر ڈالا ہے اس کے نتیجے میں ان کی نئی اقدار وجود میں آئیں اور نئے پیمانے تشکیل پائے۔ پانی کی کمی ان کیلئے اس لئے پریشانی کا باعث تھی کہ نماز کیلئے وضو کیسے کریں، غسل واجب ہوا اس کا کیا کیا جائے گا، جسم کی طہارت جو روح کی پاکیزگی کا پیش خیمہ ہے پانی کے بغیر اگرچہ تیمم سے بھی ممکن ہے لیکن ہر آدمی یہ خواہش کرتا ہے کہ کاش پانی میسر آجائے تاکہ میں صحیح معنی میں پاکیزہ ہوسکوں اور یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ گندے جسم میں شیطان کو وسوسہ اندازی کا زیادہ موقعہ ملتا ہے۔ بارش ہوجانے کے بعد جب طہارت کی ساری ضرورتیں پوری ہوگئیں اور شیطانی وساوس کی گندگیاں دور ہوگئیں، نیند سے طبیعت کا بوجھ اترا، پانی نے اس فرحت اور مسرت میں اضافہ کیا، اس کے نتیجے میں دلوں کے حوصلے توانا ہوگئے اور قدموں میں استقلال آگیا۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ بارش کا ہوجانا ایک اتفاقی امر ہے۔ اتفاقات کو احسانات کا نام دینا عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ اللہ کی سلطنت میں اتفاق کا کہیں گزر نہیں، اس کے قوانین اتنے مستحکم اور اس قدر حاوی ہیں کہ کوئی واقعہ اپنے طور پر وجود میں نہیں آسکتا اور جب ہم تاریخ کے جھروکوں میں نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہی اتفاقی واقعات تاریخ میں انقلاب کا ذریعہ بنے ہیں۔ نپولین کا ایک جرنیل واٹرلو کے میدان میں اگر سات منٹ دیر سے نہ پہنچتا تو نپولین کو جنگ میں شکست نہ ہوتی۔ اس شکست نے فرانس کی تاریخ بدل ڈالی اور یہ ثابت کردیا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ ''میرے لغت میں ناممکن کا لفظ نہیں۔ میں ہر بات کے ممکن کردینے پر قادر ہوں'' اس کے انجام کو دیکھئے جس کا سبب صرف بارش کا ایک واقعہ بنا۔ یہاں بھی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ بارش کو جس طرح اللہ تعالیٰ نے بطور احسان کے ذکر فرمایا ہے اس نے حالات کی تشکیل میں کیسا کچھ رول ادا کیا ہوگا۔

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّکَ اِلَی الْمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیْ مَعَکُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ کُلَّ بَنَانٍ O ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ یُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ O ذٰلِکُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابَ النَّارِ O (الانفال: ۱۲ تا ۱۴)

(اس وقت کو یاد کرو! جب تیرے رب نے فرشتوں کو حکم بھیجا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم ایمان والوں کو جمائے رکھو میں عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا۔ سو مارو گردنوں پر اور مارو ان کے پور پور پر O یہ اس سبب سے ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ کیلئے اٹھے ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ کیلئے اٹھتے ہیں تو بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے O یہ تو تم نقد چکھو اور جان رکھو کہ کافروں کیلئے دوزخ کا عذاب ہے۔)

Marfat.com

فرشتوں کو احکام:

جو فرشتے مسلمانوں کی مدد کیلئے بھیجے گئے تھے اس آیتِ کریمہ میں انہی کا تذکرہ ہے کہ فرشتوں کی یہ فوج براہِ راست رب الافواج کی کمانڈ میں تھی۔ جنگ کے دوران پروردگار کی جانب سے براہِ راست انہیں یہ پیغام مل رہے تھے اور احکام کا ذریعہ وہی وحیِ الٰہی تھا جو اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے اپنے تمام تر مقامات کی بلندی اور معصومیت کے باوجود براہِ راست اللہ تک رسائی کی طاقت نہیں رکھتے، انہیں بھی جب حکم پہنچتا ہے تو وحی کے ذریعے پہنچتا ہے۔

انہیں پہلا حکم یہ دیا گیا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تمہارا کام یہ ہے کہ تم مسلمانوں کو ثابت قدم رکھو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت اور تائید و نصرت کے بغیر فرشتے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کی تمام طاقتیں صرف اللہ کی دین ہی نہیں بلکہ اس کی تائید سے حرکت میں آتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ فرشتوں کو اللہ نے بے پناہ قوتوں کا حامل بنایا ہے، روایات میں آتا ہے کہ قومِ لوط پر عذاب حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطے سے آیا۔ حضرت جبریل نے اپنے ایک پر سے اس دھرتی کو اٹھایا جس پر قوم لوط آباد تھی اور اوپر لے جا کر اسے الٹ دیا۔ پھر ان پر پتھر برسائے گئے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو ذات اپنے ایک پر سے زمین کا ایک بڑا حصہ اٹھا سکتی ہے اس کی طاقت کا کیا عالم ہوگا؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی فرشتہ اپنی مرضی سے کوئی کام کرنے پر قادر نہیں تاوقتیکہ اسے اللہ کی طرف سے حکم نہ ملے اور اللہ کی تائید اسے حاصل نہ ہو۔ یہاں فرشتوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم جا کر لڑائی کا سارا کام سنبھال لو اور مسلمانوں سے کہہ دو کہ وہ اطمینان سے اپنے کیمپ میں بیٹھیں، فرشتے خود دشمن کو نیست و نابود کر دیں گے بلکہ یہ فرمایا کہ تم اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرو ان کے حوصلوں میں اضافہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ میں جلد ہی کافروں کے دلوں میں رعب اور دہشت پیدا کر دوں گا۔ فوج کی اصل قوت حوصلہ اور مورال (MOrale) ہی ہوتی ہے۔ جب کوئی قوم حوصلہ ہار دیتی ہے تو پھر وہ بھیڑوں کا ریوڑ ہو کر رہ جاتی ہے اور حوصلہ مند فوج اسے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتی ہوئی لے جاتی ہے۔

فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ ......الخ کا مفہوم:

دوسرا حکم یہ دیا: فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (ان کی گردنوں پر مارو اور ان کے پور پور پر مارو۔)

اس آیت کی تفسیر میں اہلِ علم کا اختلاف ہے بعض اہلِ علم اس آیت کا خطاب فرشتوں سے سمجھتے ہیں اور سیاقِ کلام کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فرشتوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم مسلمانوں کے حوصلے بھی توانا رکھو اور ساتھ ساتھ کسی حد تک قتال میں بھی شرکت کرو اور کافروں کی گردنوں پر چوٹیں لگاؤ اور ان کی ایک ایک پور پر مارو۔ بعض احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ تفسیر مظہری نے بعض واقعات کا کسی حد تک تذکرہ کیا ہے۔ ابنِ سعد کی روایت میں حضرت عکرمہ سے مروی ہے کہ اس دن آدمی کا سر کٹ کر گرتا اور یہ پتہ نہ چلتا کہ اسے کس نے مارا ہے اور آدمی کا ہاتھ کٹ کر گرتا اور یہ معلوم نہ ہوتا کہ اسے کس نے کاٹا۔ ابنِ عباس فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان ایک مشرک کا تعاقب کر رہا تھا کہ اچانک اس مشرک کے اوپر کوڑے کی مار پڑنے کی آواز آئی اور ایک شاہسوار کی آواز سنائی دی جو کہہ رہا تھا کہ حیزوم ﴿آگے بڑھ﴾ مسلمان نے مشرک کو اپنے آگے دیکھا کہ وہ چت گرا۔ لپک کر دیکھا تو اس کی ناک پر چوٹ کا نشان تھا۔ چہرہ پھٹا ہوا تھا جیسے کوڑے سے مارا گیا ہو اور اس کا پورا جسم ہرا پڑ گیا تھا۔ اس انصاری مسلمان نے آکر رسول اللہ ﷺ سے یہ ماجرا بیان کیا۔ تو آپ نے فرمایا: تم سچ کہتے ہو یہ تیسرے آسمان کی مدد تھی۔ ابوداؤد مازنی کہتے ہیں کہ میں ایک مشرک کو مارنے کیلئے دوڑ رہا تھا کہ اچانک اس کا سر میری تلوار پہنچنے سے پہلے ہی کٹ کر گر گیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے میری بجائے کسی اور نے قتل کیا ہے۔ ایک انصاری حضرت عباس بن عبدالمطلب کو قید کر کے لایا تو حضرت عباس کہنے لگے واللہ! مجھے اس نے قید نہیں کیا ہے مجھے تو ایک بے بال کے سر والے آدمی نے قید کیا ہے جو نہایت خوبرو تھا اور ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار تھا۔ اب میں اسے لوگوں میں دیکھ نہیں رہا۔ انصاری نے کہا اے اللہ کے رسول انہیں میں نے قید کیا ہے۔ آپ نے فرمایا خاموش رہو اللہ نے ایک بزرگ فرشتے سے تمہاری مدد فرمائی ہے۔

Marfat.com

دوسرے اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اس جملے کے مخاطب مسلمان ہیں۔انہیں حکم دیا جارہا ہے کہ میں نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا ہے اب یہ بھیڑوں کا ریوڑ ہیں تم آگے بڑھو اور انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ڈال دو۔ان کی گردنوں پر مارو، ان کے ایک ایک پور پر مارو، یہ مرعوبیت کے باعث تمہارے سامنے سر نہیں اٹھا سکیں گے کیونکہ جب کوئی آدمی حوصلہ ہار دیتا ہے تو اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں تو پھر جو شخص چاہے اس کی چندیا پر جوتے لگا دے، اس کی کیسی ہی تحقیر و تذلیل کرے وہ مدافعت پر قادر نہیں ہوتا۔

اگلی آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ کافروں کے دلوں میں رعب ڈالنے اور انہیں بے بسی کے ساتھ مارنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے کیلئے اٹھے ہیں اللہ کے رسول کی دعوت نے پوری طرح ان پر اتمام حجت کر دیا ہے انہیں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اس کے باوجود اللہ اور رسول کے مقابلے میں آنا ایک ایسی جسارت ہے جس پر کوئی عذر قابلِ قبول نہیں تو ایسے لوگوں کو دنیا میں بھی خطرناک سزا ملتی ہے اور آخرت میں تو ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جس میں وہ سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

تیسری آیتِ کریمہ میں قریش کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جنگِ بدر میں جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا یہ تھوڑا سا عذاب ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ عذاب کی پہلی قسط ہے۔اگر تم اب بھی راہِ راست اختیار کر لو تو تم بڑے عذاب سے بچ سکتے ہو اور اگر اپنے آپ کو بدلنے کیلئے تیار نہیں ہو تو پھر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ نے کافروں کیلئے جہنم کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ۝ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ۝ (الانفال: ۱۵، ۱۶)

(اے ایمان والو! جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو فوج کشی کی صورت میں تو پھر ان سے پیٹھ مت پھیرو جو کوئی ان سے پیٹھ پھیرے اس دن مگر یہ کہ جنگ کیلئے پینترا بدلنا چاہتا ہو یا کسی جماعت کی طرف سمٹ رہا ہو تو وہ لوٹا اللہ کا غضب لے کر اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانہ ہے۔)

عرب میں جنگ کے دو معروف طریقے:

عرب میں جنگ کے دو معروف طریقے تھے۔ایک طریقہ تو وہ تھا جس میں باقاعدہ دو منظم فوجیں آمنے سامنے منظم طریقے سے لڑتی تھیں۔ ایسی جنگ میں عرب بھی بھاگ نکلنے کو عار سمجھتے تھے۔جو قبیلہ بھی کسی منظم جنگ میں پشت دکھاتا اور بھاگ نکلتا تھا مدتوں تک وہ عربوں کے سامنے سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا۔شاعر ہجو کے ذریعے اس کا جینا مشکل کر دیتے تھے۔ان کے شعرا کی زبانیں شرم کی وجہ سے گنگ ہو کر رہ جاتی تھیں۔ایسی ہی جنگ کے بارے میں یہاں فرمایا جارہا ہے کہ جب تمہاری کافروں سے ایسی کوئی جنگ ہو تو دیکھنا کبھی پشت نہ دکھانا اور جو شخص یا جو فوج ایسا کرے گی وہ اللہ کے غضب کی سزاوار ہوگی۔مسلمان ہونے کے باوجود ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا اور یہ کون نہیں جانتا کہ جہنم کتنا برا ٹھکانہ ہے۔البتہ! اس میں دو باتوں کا استثناء کیا گیا ہے۔۱:۔ متحرفا لقتال ...... ۲:۔ متحیزاً الی فئة

یعنی پشت پھیرنا صرف دو حالتوں میں جائز ہے۔تحرف کسی ایک جانب مائل ہونے کو کہتے ہیں۔اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کا کمانڈر محسوس کرتا ہے کہ دشمنوں کی فوجی ترتیب توڑنے کیلئے اپنی فوج کو قدم قدم پیچھے ہٹایا جائے جس سے دشمن اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ مسلمان شاید پسپائی اختیار کرنے والے ہیں۔اس کی صفیں بکھر کر مسلمانوں کو گھیرنے کی کوشش کریں تو جیسے ہی اس کی صفوں میں شگاف پڑے تو مسلمان یکبارگی حملہ کر دیں ایسی پسپائی جو کسی جنگی چال کیلئے یا پینترا بدلنے کیلئے ہو اس کی اجازت دی گئی ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان اپنی فوج کا ایک پہلو کمزور دیکھ کر اسے پیچھے ہٹنے کی ترغیب دیں اور اسے اس بازو کے ساتھ ملا دیا جائے جس کی طاقت اس سے بہتر ہو اور یا پیچھے سے کمک پہنچنے کے انتظار میں وقتی طور پر فوج کے کسی دستے کو پیچھے ہٹا لیا جائے۔یہ دوسری شکل ہے جسے اختیار کرنے کی اجازت ہے۔مطلب یہ ہے کہ حرام صرف میدانِ جنگ سے فرار ہے لیکن میدانِ جنگ میں ایسی تبدیلی اور ایسی پہلو تہی جو بہتر جنگ کا پیش خیمہ ہو اس کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ جنگی حکمتِ عملی کے تحت اس کی تحسین بھی کی جانی چاہئے۔

Marfat.com

جنگ کی دوسری قسم گوریلا وار ہے۔ جسے عربی زبان میں ''کرّ وفرّ'' کی جنگ کہتے ہیں۔ یہ منظم فوج کشی نہیں ہوتی بلکہ چھوٹے چھوٹے دستے دشمن کو پریشان کرنے کیلئے نکلتے ہیں یا جنگی فوائد حاصل کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے۔ ان کے پیشِ نظر جم کر لڑنا نہیں ہوتا بلکہ وہ تیزی سے حملہ کرتے ہیں اور اپنا مقصد پورا کر کے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی مخصوص ضابطہ نہیں ہوتا۔ پس جس طرح کامیاب چھاپہ مارا جاسکے اور اپنے آپ کو بچایا جاسکے وہی اس کا اصلی ہنر ہے۔ یہ طریقہ اس وقت بھی رائج تھا اور آج بھی رائج ہے۔ کمزور قوتیں عموماً یہ طریقہ اختیار کرتی ہیں۔ اس میں پسپائی اور بھاگ کھڑا ہونا کہیں بھی عیب نہیں سمجھا جاتا۔

احکام میں تخفیف:

ان آیتوں میں پسپائی کی حرمت کے بارے میں اور جنگ کے پہلوتہی کے حوالے سے جو سخت احکام دیئے گئے ہیں یہ جنگِ بدر کے زمانے کی بات ہے۔ ان احکام کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہے کتنی بڑی تعداد سے مقابلہ درپیش ہو اور دشمن چاہے کتنا بھی زبردست کیوں نہ ہو کسی صورت بھی دشمن کے مقابلے سے بھاگنا بدترین حرام ہے۔ لیکن اس کے بعد سورۃ الانفال ہی میں تخفیف کے احکام نازل ہوئے۔ چنانچہ آیت نمبر ٦٦ میں فرمایا کہ اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی کردی اور تمہاری کمزوری کے پیشِ نظر یہ قانون جاری کردیا کہ اگر مسلمان سو آدمی ثابت قدم ہوں تو دو سو کفار پر غالب آسکیں گے اس میں اشارہ کردیا کہ اپنے سے دوگنی تعداد تک تو مسلمانوں کے ہی غالب رہنے کی توقع ہے اس لئے پشت پھیرنا جائز نہیں ہاں! فریقِ مخالف کی تعداد دوگنی سے بھی زیادہ ہوجائے تو ایسی حالت میں میدان چھوڑ دینا جائز ہے۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباس ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اکیلا تین آدمیوں کے مقابل سے بھاگا وہ بھاگا نہیں ہاں جو دو آدمیوں کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگنے والا ہے یعنی گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے۔ اب یہی حکم قیامت تک باقی ہے۔ جمہور امت اور ائمہ اربعہ کے نزدیک حکم شرعی یہی ہے کہ جب تک فریقِ مخالف کی تعداد دوگنی سے زائد نہ ہو اس وقت تک میدانِ جنگ سے بھاگنا حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۖ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ O ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ O (الانفال: ۱۷، ۱۸)

(پس تم لوگوں نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا ہے اور آپ نے نہیں پھینکی (مٹھی خاک کی) جس وقت آپ نے پھینکی لیکن اللہ نے پھینکی تاکہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان، بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے O یہ جو کچھ ہوا سامنے ہے اور جان رکھو کہ اللہ سست کردے گا تدبیر کافروں کی۔)

آنحضرت ﷺ کی آستین سے دستِ غیب کے کارنامے:

ابنِ جریر طبری اور بیہقی وغیرہ نے حضرت عبداللہ ابنِ عباس سے یہ نقل کیا ہے کہ معرکۂ بدر کے دن جب مکہ کے ایک ہزار جوانوں کا لشکر ٹیلہ کے پیچھے سے میدان میں آیا تو اپنی کثرت وقوت پر فخر کرتا اور اتراتا ہوا اور مسلمانوں کی کمزوری کا مذاق اڑاتا ہوا سامنے آیا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے پروردگار کے سامنے دعا کیلئے ہاتھ پھیلا دیئے کہ الٰہی یہ تیرے جھٹلانے والے قریش فخر وتکبر کرتے ہوئے آرہے ہیں۔ پس اب وہ فتح بھیج دے جس کا تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ اس پر جبریلِ امین تشریف لائے اور عرض کیا کہ آپ ایک مٹھی خاک لے کر دشمن کے لشکر کی طرف پھینک دیں آپ نے ایسا ہی کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے تین مرتبہ مٹی اور کنکروں کی مٹھی بھری ایک لشکر کے داہنے حصے پر دوسری بائیں حصے پر اور تیسری سامنے کی جانب پھینکی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ایک یا تین مٹھی بھر کنکریوں کو قدرت نے معجزانہ انداز میں اس طرح پھیلا دیا کہ مخالف لشکر کا کوئی آدمی باقی نہ رہا جس کی آنکھوں میں اور چہروں پر یہ دھول اور کنکریاں نہ پہنچی ہوں۔ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے مٹھی خاک کی پھینکتے ہوئے یہ بھی فرمایا:

Marfat.com

شاهت الوجوہ ﴿چہرے بگڑ جائیں﴾ عربی میں یہ لعنت کا فقرہ ہے۔ ویسے بھی کسی کے اوپر خاک جھونکنا لعنت ہی کا استعارہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے ان پر لعنت فرماتے ہوئے مسلمانوں کو یکبارگی حملہ کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے جیسے ہی زوردار حملہ کیا دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے ایک بھگدڑ مچ گئی۔ مسلمانوں نے کافروں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنا شروع کیا۔ اور جو ہتھیار پھینک چکے تھے انہیں باندھنا شروع کر دیا۔

ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے کہ مسلمانوں کو اس فتح کی نسبت اپنی طرف نہیں کرنی چاہئے یہ فتح سراسر اللہ کی توفیق اور تائید و نصرت کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قریش مسلمانوں کے ہی ہاتھوں قتل ہوئے اور مٹھی خاک کی آنحضرت ہی نے پھینکی تھی۔ لیکن بعض مرتبہ فعل کی نفی سے مقصود نفسِ فعل کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس فعل کے ساتھ ان شاندار نتائج کی نسبت کی نفی ہوتی ہے جو اس فعل کے پردے میں ظاہر ہوں۔ مٹھی بھر نہتے مسلمانوں کے ہاتھوں قریش کے عظیم لشکر کا کٹ جانا اور آنحضرت ﷺ کے دستِ مبارک سے پھینکی ہوئی خاک کی ایک مٹھی کا طوفان بن جانا یہ وہ غیر معمولی نتیجہ ہے جو سراسر اللہ کی قدرت کا ظہور ہے۔ اللہ کے نبی کا تو ہر کام اللہ ہی کے دستِ غیب سے وجود میں آتا ہے اور اس کے حلق سے نکلا ہوا ہر بول اللہ ہی کا قانون کہلاتا ہے لیکن مسلمان بھی جب اپنا سب کچھ اللہ کی رضا کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ سرتاسر اللہ کے دین کے دست و بازو بن جاتے ہیں تو اللہ کی قوت بھی ان کے ہاتھ، آنکھیں اور پاؤں بن جاتی ہے وہ دیکھتے ہیں تو اسی کی قوت سے دیکھتے ہیں، پکڑتے ہیں تو اسی کی قوت سے پکڑتے ہیں چلتے ہیں، تو اسی کی قوت سے چلتے ہیں وہ اپنے کسی کارنامے کو اپنی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اسی سے عقیدۂ توحید کی قوت کو جلا ملتی ہے۔ جب ہر مومن یہ سمجھتا ہے کہ پیغمبر کے معجزات بھی اللہ کی نصرت و تائید کا اظہار ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے کارنامے بھی اللہ کی توفیق سے وجود میں آتے ہیں۔ اصل قوت اللہ کی قوت ہے اس سے اسباب کی بجائے مسبب الاسباب کا تصور دلوں میں راسخ ہوتا چلا جاتا ہے اور مومن بڑے سے بڑا کارنامہ سرانجام دے کر بھی کسی عُجب میں کبھی مبتلا نہیں ہوتا۔

وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا (تاکہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان)

بلٰی کے لفظی معنی "امتحان" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی مصیبت و مشقت میں مبتلا کر کے امتحان لیتے ہیں اور کبھی راحت و دولت دے کر آزماتے ہیں۔ راحت و دولت کی صورت میں امتحان یہ ہوتا ہے کہ جسے یہ نعمتیں نصیب ہوتی ہیں وہ اسے اپنی ذاتی قابلیت کا نتیجہ سمجھ کر فخر و ناز میں مبتلا تو نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ یہاں اللہ نے اپنے جن انعامات کا ذکر فرمایا ہے اس کے بعد فرمایا کہ دیکھنا ان انعامات کو اپنی ذاتی قابلیت کا نتیجہ نہ سمجھ لینا اور انہیں اپنی طرف منسوب کر کے اللہ کی نصرت و تائید سے محروم نہ ہو جانا۔ یہی وہ مومنوں کی آزمائش ہے جو یہاں کی جا رہی ہے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ یہ تو ہیں اللہ کے وہ احسانات جو غزوۂ بدر کی نسبت سے تم پر ہوئے۔ لیکن ابھی تمہارا سفر رکنے والا نہیں ابھی اس کلی کو پھول بننے میں وقت لگے گا، ابھی اسلامی انقلاب کی منزل دور ہے، ابھی اس کشمکش میں بہت سے مراحل پیش آنے والے ہیں۔ اگر تم نے اپنے آپ کو اللہ کے انعامات کا مستحق ثابت کیا تو اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ کافروں کی ہر تدبیر کو کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جائے گا۔ مسلمان اپنی غلطیوں سے مشکلات پیدا کریں تو اور بات ہے کافروں کی تدبیریں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی کیونکہ اللہ کی تائید و نصرت ان کے ساتھ ہے۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الانفال: ۱۹)

(اگر تم فیصلہ چاہتے ہو تو آ گیا تمہارے پاس فیصلہ اور اگر تم باز آ جاؤ تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے اور کچھ کام نہ آئے گی تمہاری جماعت خواہ وہ کتنی زیادہ ہو اور جان لو کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔)

Marfat.com

آیت کا پس منظر:

اس آیتِ کریمہ کا پس منظر یہ ہے کہ قریشِ مکہ جب مسلمانوں کے استیصال کیلئے مکہ سے نکل رہے تھے تو لشکر کے سب سے فتنہ پرور آدمی ابوجہل نے بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر کچھ دعائیں مانگیں جس کا ذکر ہماری روایات میں موجود ہے۔ اس نے اپنی دعا میں یہ بھی کہا تھا یا اللہ دونوں لشکروں میں سے جو اعلیٰ اور افضل ہے اور دونوں جماعتوں میں جو زیادہ ہدایت پر ہے اور دونوں پارٹیوں میں سے جو زیادہ کریم و شریف ہے اور دونوں میں سے جو دین افضل ہے اس کو فتح عطا فرما دیجئے۔ یہ جاہل اور بے وقوف یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں اعلیٰ اور افضل بھی ہیں اور زیادہ ہدایت پر بھی۔ اس کی ایک دعا کے الفاظ تو یہ ہیں ''فریقین میں سے جو سب سے زیادہ قطع رحم کا مجرم ہوا ہے تو کل اس کو کچل دے۔'' چنانچہ اس آیت کریمہ میں قریشِ مکہ کی انہی دعاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے تمہاری دعا قبول کی تم نے اعلیٰ اور افضل اور ہدایت والے کیلئے فتح مانگی تھی چنانچہ ہم نے اس فریق کو فتح دے دی جو اعلیٰ اور افضل بھی ہے اور ہدایت یافتہ بھی اور وہی تم میں کریم اور شریف بھی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جنگِ بدر میں حق و باطل کا فیصلہ کر دیا۔ اسی لیے جنگِ بدر کے دن کو ''یوم الفرقان'' قرار دیا گیا۔ قریشِ مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اپنی دعا کے مطابق اس فیصلے کو قبول کر لینا چاہئے اور نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر ایمان لے آنا چاہئے۔ لیکن اگر تمہاری سرکشی اب بھی رکنے والی نہیں اور خدائی فیصلہ کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہو تو پھر یاد رکھو کہ تمہاری سرکشی تمہیں لے بیٹھے گی اگر تم اب بھی رک جاؤ اور راہِ راست پر آ جاؤ تو تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم نے پھر مسلمانوں پر لشکر کشی کی اور تم نے اپنی مخالفت اور معاندت کو جاری رکھا تو یاد رکھو ہم کہیں چلے نہیں گئے ہیں ہم یہیں ہیں تم اپنی عادتوں کی طرف لوٹو گے تو ہم بھی اپنی سنت کی طرف لوٹیں گے اور تمہارا سر کچلنے کیلئے پھر آ موجود ہوں گے اور اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم آئندہ ایک بڑی افرادی قوت لے کر مسلمانوں پر حملہ کرو گے تو یاد رکھو تمہاری قوت اور کثرت تمہارے کام نہیں آئے گی اور آخر میں ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا جو کافروں کی کمر توڑ دینے والا اور مسلمانوں کیلئے حوصلوں کا سرمایہ ہے۔ فرمایا:

وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿اور بے شک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے﴾

اس کے بعد کسی بات کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿20﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿21﴾ اِنَّ شَرَّ
الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿22﴾ وَ
لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا
وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿23﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ

Marfat.com

لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ
بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً
لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ
فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ
اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٢٦﴾
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا
اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٧﴾ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ
اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾ ع

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو اس حال میں کہ تم سنتے ہو (۲۰) ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں (۲۱) بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو سمجھتے نہیں (۲۲) اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو ان کو ضرور سنا دیتا اور اگر بدوں بھلائی انہیں سناتا تو وہ ضرور بھاگ جاتے اس لئے کہ وہ ہیں ہی اعراض کرنے والے (۲۳) اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جبکہ وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور خوب جان لو کہ اللہ حائل ہو جاتا ہے آدمی اور اس کے دل کے درمیان اور یاد رکھو کہ اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے۔ (۲۴) اور بچو اس فتنہ سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک نہیں پہنچے گی جنہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہوگا اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (۲۵) اور یاد کرو! جس وقت تم تھوڑے تھے اور ملک میں دبے ہوئے تھے ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لیں تو اللہ نے تمہیں ٹھکانہ دیا اور اپنی نصرت سے نوازا اور تم کو پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا تاکہ تم شکرگزار بنو۔ (۲۶) اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے اور رسول سے اور خیانت نہ کرو آپس کی امانتوں میں، اس حال میں کہ تم جانتے ہو۔ اور جان لو کہ بیشک تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں اور بیشک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔ (۲۰ تا ۲۸) (رکوع۔۳)

Marfat.com

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ۝ (الانفال : ۲۰)

(اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے روگردانی نہ کرو اس حال میں کہ تم سنتے ہو۔)

منافقین کو خطاب:

گزشتہ دو رکوعوں میں ہم نے دیکھا کہ خطاب نبی کریم ﷺ سے رہا یا مسلمانوں سے روئے سخن تمام تر مسلمانوں سے متعلق رہا۔ مسلمانوں میں بے خبری یا انسانی کمزوری کے باعث اگر کوئی کمزوری پیدا ہوئی تو اس پر تنبیہ فرمائی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے اخلاص اور استقامت کا ثمر یہ دیا کہ مسلسل ان پر عنایات فرمائیں اور پھر ایک ایک عنایت کا تذکرہ بھی فرمایا اور مزید یہ کہ ان عنایات کی صورت میں جو باتیں پیشِ نظر رکھنے کی تھیں ان کی طرف بھی توجہ دلائی۔ جس سے عقیدے میں قوت پیدا ہوئی اور آئندہ ہمیشہ کیلئے اسلامی زندگی کو ایک راہنمائی میسر آئی۔

جب ہم مسلمانوں پر اللہ کی عنایات اور اس کے ابرِ کرم کو برستا ہوا دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ بدر اللہ کی نگاہ میں مقبول ترین لوگ ہیں یہ امتِ مسلمہ کا وہ ہراول دستہ ہے جنہوں نے اپنے خون کی روشنائی سے تاریخ کا سنہری باب رقم کیا ہے اور اپنی استقامت سے حق و باطل میں فرقان بن گئے ہیں۔ قیامت تک کیلئے ان کا یہ کارنامہ درخشندہ و تابندہ رہے گا اور آنے والی نسلیں اس سے ہمیشہ حوصلہ پائیں گی۔

اہلِ بدر کی قربانی اور استقامت میں صرف یہی نہیں کہ اللہ سے فتح و نصرت کا انعام پایا ہے بلکہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مستقل مغفرت کے ساتھ ساتھ فضائل و رفعِ درجات کی ایسی بشارتیں ملی ہیں جس نے ان کا مقام و مرتبہ باقی تمام صحابہ سے بلند کر دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ فتح مکہ کیلئے قریشِ مکہ پر لشکر کشی کی تیاریوں میں مصروف تھے تو آپ کی خواہش یہ تھی کہ ہماری تیاریوں کی خبر قریشِ مکہ تک نہ پہنچنے پائے تاکہ ہم اچانک مکہ پر حملہ آور ہوں اور انہیں سنبھلنے کا موقعہ دیئے بغیر مکہ فتح کر لیں۔ اس سے حرم کی حدود میں خون ریزی کا اندیشہ کم سے کم ہو جائے گا۔ لیکن اچانک ایک واقعہ پیش آیا جس نے صحابہ کرام کو مشتعل کر دیا۔ واقعہ یہ ہوا کہ حاطب ابن بلتعہ ؓ جو اصحابِ بدر میں سے تھے انہوں نے مکہ والوں کو ایک خط لکھا جو مکہ معظمہ جانے والی ایک عورت کے ہاتھ بھیجا۔ جس میں یہ اطلاع دی گئی تھی کہ نبی کریم ﷺ عنقریب تم پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو وحی الٰہی کے ذریعے اس کی اطلاع دی گئی چنانچہ آپ نے دو صحابہ کو اس عورت کے تعاقب میں بھیجا اور آپ نے بتا دیا کہ وہ تمہیں فلاں جگہ جاتی ہوئی مل جائے گی۔ انہوں نے اسے جا پکڑا اور اس سے خط کے بارے میں پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حضرت علی ؓ نے اسے دھمکی دی کہ اس بات میں تو شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ خط تمہارے پاس ہے کیونکہ اس کی اطلاع نبی کریم ﷺ ہمیں دے چکے ہیں۔ البتہ! یہ ممکن ہے کہ تم نے ایسی جگہ چھپایا ہو جہاں انسانی نظر مشکل سے پہنچتی ہے تو ہمیں اس کے لئے اگر تمہیں برہنہ بھی کرنا پڑا تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ اس نے جب دیکھا کہ یہ معاملہ ٹلنے والا نہیں تو اس نے اپنے سر کے بالوں میں چھپایا ہوا خط نکال کر ان کے حوالے کر دیا اور اس نے بتایا کہ مجھے حاطب نے یہ خط دیا ہے۔ جب یہ بات یقینی ہوگئی کہ حضرت حاطب نے ایک ایسی غلطی کی ہے جو اسلامی ریاست سے غداری کے مترادف ہے تو حضرت عمرِ فاروق ؓ نے آنحضرت ﷺ سے اجازت طلب کی کہ آپ مجھے اجازت دیں میں اسے قتل کر دوں کیونکہ یہ شخص منافق ہے۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرِ فاروق ؓ سے فرمایا کہ "عمر! تم کیا جانو کہ اللہ نے اہلِ بدر کو ایک نظر دیکھا اور فرمایا آج کے بعد تم جو چاہو کرو تمہیں کوئی گناہ نقصان نہیں دے گا۔ حاطب نے بڑا قصور کیا ہے لیکن وہ اہلِ بدر میں سے ہیں۔ وہ یقیناً منافقین میں سے نہیں ہو سکتے"۔ حاطب ؓ کو بلا کر پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ حضور میں ایک مخلص مسلمان ہوں میرے اخلاص میں کوئی شبہ نہیں میری اس غلطی کا سبب یہ ہے کہ میرے اہلِ خانہ ابھی تک مکہ معظمہ میں ہیں اور قریش کے رحم و کرم پر ہیں۔ میں نے قریش پر یہ ایک چھوٹا سا احسان کر کے یہ چاہا ہے کہ وہ میرے بچوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔ میرے اطلاع دینے سے انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کی مشیت نہیں بدلے گی اور اسلامی کاز کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا البتہ یہ امید ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ اس احسان کے بدلے میں قریش میرے بچوں کی حفاظت کریں گے۔

اس واقعہ سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اہلِ بدر کا مقام و مرتبہ کیا ہے۔ ایک طرف تو یہ بات ذہن میں رکھئے اور دوسری

Marfat.com

طرف پیشِ نظر آیتِ کریمہ کا لب ولہجہ اور تنقیدی اسلوب جو اگلی آیات میں اور نکھر گیا ہے وہ بھی پیشِ نظر رکھئے تو خودبخود یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بظاہر یہ خطاب مسلمانوں سے ہے لیکن حقیقت میں یہ خطاب اہلِ بدر سے نہیں بلکہ مدینہ کے منافقین سے ہے۔ اہلِ بدر تو وہ ہیں جنہوں نے جنگِ بدر میں اپنے ایمان کا ثبوت دیا لیکن مدینہ طیبہ میں اہلِ بدر کے ساتھ ساتھ جہاں کچھ دوسرے مخلص مسلمان ہیں وہیں ان کے ساتھ ایک محدود تعداد منافقین کی بھی ہے اور آیات کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین وہ ہیں جو یا تو یہود میں سے آئے ہیں اور یا یہود کے زیرِ اثر ہیں۔ کیونکہ اگلی آیتِ کریمہ میں جن لوگوں کی مشابہت سے روکا گیا ہے وہ یقیناً یہود ہیں۔ ارشاد فرمایا:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ○ (الانفال: ۲۱)

(ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنتے نہیں۔)

یہود کی طرف اشارہ ہے:

اس آیتِ کریمہ میں جن لوگوں کی مشابہت سے روکا گیا ہے اور ان کی بطورِ خاص ایک صفت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ وہ صفت خود بول رہی ہے کہ اشارہ یہود کی طرف ہے کیونکہ قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر یہود کی اس عادتِ بد کا ذکر فرمایا کہ جب بھی ان کے پیغمبروں نے ان سے کہا کہ "سنو اور اطاعت کرو" تو وہ جواب میں کہتے "سمعنا و عصینا" سمعنا کو بلند آواز سے کہتے اور عصینا دبی آواز سے کہتے۔ جس کا معنی یہ ہے کہ "ہم نے سن لیا اور ہم نے نافرمانی کی"، یا ممکن ہے یہ ان کے حال کی تصویر ہو کہ وہ زبان سے تو سمعنا کہتے تھے کہ ہم نے آپ کا حکم سن لیا ہے لیکن اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے تھے کہ ہم وہ لوگ ہیں جو سننے کے بعد عمل نہیں کیا کرتے بلکہ بعض دفعہ تو ان کی سنگدلی اور حق دشمنی اس انتہا کو پہنچ جاتی کہ وہ صاف کہتے کہ ہمارے دل غلافوں میں ملفوف ہیں تم جو کہتے ہو ہمارے دلوں میں اترتا نہیں۔ اس لئے ہم اس کے قبول کرنے سے معذور ہیں۔ یہاں ان کے اسی رویے کی طرف اشارہ فرما کر مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم ان یہود کی طرح بننے کی کوشش مت کرو کہ وہ لوگ اپنے پیغمبروں کی تعلیمات اور تنبیہات کو سنتے ضرور تھے لیکن قبول نہیں کرتے تھے اور سننے سے مقصودِ اصل تو قبول کرنا ہی ہوتا ہے کیونکہ محض سننا اور پھر اس کا کوئی اثر قبول نہ کرنا یہ وہ چیز ہے جو حیوانیت کی سطح سے بھی گری ہوئی ہے کیونکہ حیوانوں میں سے جن جانوروں کو سدھایا جاتا ہے وہ نہ صرف سنتے ہیں بلکہ اس کے نتیجے میں وہی کچھ کرنے لگتے ہیں جو انہیں سکھایا جاتا ہے۔ انسانوں میں یہ طرزِ عمل صرف منافقین کا ہوتا ہے کیونکہ کافر تو سرے سے سنتا ہی نہیں آپ اصرار کریں تو وہ سننے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ دوسروں کو بھی نہ سننے دیا جائے۔ لیکن منافق اپنے آپ پر پردہ ڈالنے کیلئے بظاہر قریب ہو کر سنتا ہے لیکن کسی بات کو دل میں اترنے نہیں دیتا کیونکہ اس کے دل اور زبان کے درمیان نفاق کی دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ تو تم اگر یہی رویہ اختیار کر کے منافقت کے راستے پر چلنے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر سوچ لو تمہارا انجام بھی وہی ہو گا جو اس سے پہلے یہود کا ہو چکا ہے۔ وہ دنیا میں عبرت کے طور پر زندہ رکھے گئے ہیں لیکن انسانوں کا عجیب حال ہے بجائے ان سے عبرت حاصل کرنے کے ان کے راستے پر چلنا پسند کرتے ہیں حالانکہ یہ راستہ مسلمانوں سے تو فروتر ہے ہی انسانوں کی سطح سے بھی گرا ہوا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ○ (الانفال: ۲۲)

(بے شک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے ہیں جو سمجھتے نہیں۔)

بدترین خلائق لایعقل جانور ہیں:

"دَوَآبّ" دابّۃ کی جمع ہے۔ اہلِ لغت کے نزدیک ہر زمین پر چلنے والے کو دابّۃ کہا جاتا ہے۔ مگر عرف و محاورہ میں صرف چوپایہ جانوروں کو دابّۃ کہتے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات سے افضل پیدا فرمایا ہے۔ اس کی تخلیق احسنِ تقویم میں ہوئی ہے۔ اسے صلاحیتوں سے مالا مال

Marfat.com

کیا گیا ہے۔اسے حواسِ خمسہ عطا فرمائے گئے ہیں۔ جس سے وہ محسوسات میں راہنمائی لیتا ہے۔ پھر اسے جوہرِ عقل عطا فرمایا گیا ہے جس سے حواس سے حاصل کردہ معلومات کو عقل کی قوت سے کام لے کر ایجادات واختراعات میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس طرح دنیا میں ایسا تنوع، ایسی رنگا رنگی اور ایسی جدت کو بروئے کار لاتا ہے جس سے انسانی زندگی حیوانیت سے بالکل الگ ہو کر اپنی وسعت اور ہمہ ہمی میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور پھر یہی وہ عقل ہے جو قوت تمیز بن کر خیر وشر کی شناخت میں انسان کو راہنمائی مہیا کرتی ہے۔ اللہ کے ہاں جزا وسزا کا ترتب اللہ کی عطا کردہ اسی قوت پر ہوتا ہے۔ تو جو شخص عقل سے کام نہیں لیتا اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ جہانِ خیر وشر میں کسی ایسے فیصلے تک پہنچ سکے جو دنیا اور آخرت میں خیر وفلاح کا باعث ہو۔ یہ وہ انسانی سطح ہے جو ہدایت وضلالت کے حوالے سے پیغمبروں کی اصل مخاطب ہے۔ اس لئے جو آدمی اس سطح سے گر جاتا ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ حیوانیت کی سطح پر اتر گیا کیونکہ حیوان بھی اپنے پاس حواس کی دولت تو رکھتے ہیں۔ اسی کے نتیجے میں وہ اپنی زندگی کے معمولات انجام دیتے ہیں۔ زندگی کی ضروریات فراہم کرتے ہیں۔ بچوں کو پالتے ہیں۔ موسم کی شدت سے بچنے کیلئے اپنے بھٹ بناتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص حواس کی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے صحیح فیصلہ کرنا تو دور کی بات ہے وہ کسی بات کو نہ سنتا ہے اور نہ بولتا ہے یعنی کوئی اسے پکارتا ہے تو وہ سنتا نہیں اور نہ خود کسی کو پکارتا ہے تا کہ کوئی اس کے کام آسکے۔ تو یہ وہ حیوان ہے جسے حیوانوں میں سے بھی بدترین قرار دیا گیا ہے۔ حیوانوں میں بھی عزت کے لائق وہی حیوان ہوتے ہیں جو اپنے مالک کی بات سنتے ہیں اور وہ حیوان جو گدھے کی طرح صرف ڈنڈے کی زبان سمجھتے ہیں وہ حیوانوں میں بھی حیوانوں جیسی عزت نہیں پاتے۔ مدارج کی اس تقسیم کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ جو منافقین اللہ کے رسول جیسی دلآویز شخصیت اور دل میں اتر جانے والے لب ولہجہ کو بھی سننے کے قابل نہیں سمجھتے اور اگر سنتے بھی ہیں تو سننے کے تقاضوں پر کان نہیں دھرتے۔ تو یہ تو ایسے حیوان ہیں جو حیوانی صفات سے بھی محروم ہیں اور ایسے انسان ہیں جو انسانی صفات سے محروم ہیں کیونکہ یہ بہرے بھی ہیں اور گونگے بھی۔ یہی حیوانی صفات ہیں اور یہ عقل سے کام نہیں لیتے یہ انسانی صفت ہے۔ ایسے لوگوں کو خود سوچنا چاہیے کہ اس روش کا آخر انجام کیا ہوگا؟ کیونکہ انسانی زندگی کا آغاز ہی یہاں سے ہوتا ہے کہ انسان دوسروں کی سنے، دوسروں سے پوچھے اور سمجھے اور پھر اپنی حاصل کردہ معلومات سے عقل کے ذریعے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک انسان کی اجتماعی زندگی کا تعلق ہے اس کا آغاز سمع واطاعت سے ہوتا ہے تو اس اجتماعیت میں رہنے والوں کیلئے ضروری ہے کہ اپنے نظم اور اپنے نظم کے سربراہ کی ہدایات کو سنیں، سمجھیں اور انہیں قبول کریں کیونکہ کوئی بھی اجتماعی نظم جسے دنیا میں اپنا وزن ڈالنا ہو اور جسے ایک مضبوط قوت بن کر اٹھنا ہو اور جس کے پیش نظر ایک صالح معاشرے کی تشکیل ہو اور جو خیر کی قوت بن کر دنیا کو راہِ راست دکھانے کی فکر بھی رکھتا ہو اس کی اصل قوت سمع واطاعت میں مضمر ہوتی ہے۔ فوج ہر ملک کی منظم اور مضبوط قوت سمجھی جاتی ہے۔ اس کی تنظیم اور اس کی قوت کا راز کس بات میں ہوتا ہے؟ صرف سمع اطاعت میں۔ کوئی سپاہی یا کوئی افسر فوج میں رہ کر اپنی مرضی کرنے کی عادت نہیں بنا سکتا۔ وہاں سب کو اپنے سے بالا کی بات سننا اور اطاعت کرنا پڑتی ہے اور اسی کے نتیجے میں ان کے اندر ایک ڈسپلن پیدا ہوتا ہے اور فوج کے تمام افراد ایک اکائی بن کر سیسہ پلائی دیوار میں ڈھل جاتے ہیں۔ ان تین آیتوں میں بنیادی طور پر یہی حقیقت واشگاف کی گئی ہے کہ ایک مضبوط قوت بننے کیلئے تمہیں اپنے اندر سمع اطاعت کی خو پیدا کرنی چاہئے اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو تم حیوانوں کی ایک بھیڑ تو بن سکتے ہو ایک مضبوط امت نہیں بن سکتے۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ (الانفال : ۲۳)

اگر اللہ تعالیٰ ان میں کچھ بھلائی جانتا تو ان کو ضرور سنا دیتا اور اگر بدوں بھلائی انہیں سنا تا تو وہ ضرور بھاگ جاتے اس لئے کہ وہ ہیں ہی اعراض کرنے والے ○

Marfat.com

سنت اللہ:

اس آیتِ کریمہ میں ایک اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جو ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ اعتراض یہ ہے کہ یہاں منافقین کی جس عادت بد کا ذکر فرمایا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر طرح کے خیر سے محروم ہو گئے ہیں وہ ان کا نہ سننا ہے یا سن کر اثر قبول نہ کرنا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے کام لے کر انہیں سننے کی طرف مائل کر دے اور جو وہ سنیں ان کے دلوں میں آتار دے؟ اس طرح سے وہ بنیادی رکاوٹ جو ان کی ہدایت کے راستے میں حائل ہے وہ دور ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کا جواب دینے کیلئے یا اس شبہ کو دور کرنے کیلئے اپنی ایک سنت اور قانون کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ اس نے ہر انسان کو عقل اور قوت تمیز سے نوازا ہے پھر اس کی عقل کی رہنمائی کیلئے پیغمبر بھیجے اور کتابیں اتاری ہیں جو ان کے سامنے حق اور باطل کو پوری طرح واضح کر کے رکھ دیتے ہیں۔ حق کا حق ہونا دلائل سے ثابت کر دیا جاتا ہے اور باطل کا باطل ہونا پوری طرح مبرہن کر دیا جاتا ہے جس آدمی کی عقل ہر طرح کے ٹیڑھ، الجھن، آلودگی اور جانب داری سے پاک ہے اس کیلئے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا ہے کہ حق مجھ سے کس بات کا تقاضا کرتا ہے۔ چنانچہ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ اسے حق کا ساتھ دے کر اللہ کے نبی پر ایمان لانا ہے یا باطل کا ساتھ دے کر خیر کی قوتوں کی مخالفت کرنی ہے۔ وہ اگر حق کی حمایت کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حواس اور اس کی عقل میں توفیق کا چراغ جلا دیتا ہے وہ حق کی بات کو سنتا بھی ہے اور سمجھتا بھی ہے۔ حق کے راستہ میں اس کیلئے کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔ لیکن اگر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے باطل کا ساتھ دینا ہے اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنی ہے تو پروردگار اسے مہلتِ عمل دیتا ہے۔ اس کے نبی تبلیغ و دعوت میں تیزی پیدا کر دیتے ہیں لیکن جب وہ پوری طرح اپنے بارے میں ثابت کر دیتا ہے کہ اس کے اندر خیر کی ہر قوت دم توڑ چکی ہے اور خیر کے سوتے خشک ہو چکے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اسے توفیق دینے کی بجائے اس کی محرومی کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ اگر اس نے خیر کی قوتوں کو مفلوج نہ کر دیا ہوتا اور بھلائی کے سوتے خشک نہ ہو گئے ہوتے تو ضرور اللہ تعالیٰ اسے حق کی آواز سناتا اور ضرور یہ حق کی آواز اس کے دل و دماغ میں اترتی لیکن چونکہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس سے محروم کر چکا ہے۔ تو اب اگر اللہ تعالیٰ اسے زبردستی بھی سنائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی روگردانی میں اور اضافہ ہوگا۔ اس کو مثال میں یوں سمجھئے کہ جب کسی شخص کا معدہ خراب ہو جاتا ہے اور اس میں ہضم کرنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے تو آپ اسے جتنی بہتر سے بہتر غذا دینے کی کوشش کریں گے اتنا ہی معدہ اسے قبول کرنے سے انکار کرے گا۔ آپ اس کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اس کیلئے مرغن اور طاقت بخش غذائیں تجویز کریں گے لیکن اس کا معدہ چونکہ ہضم کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے اس لئے فوراً قے کر کے اسے نکال دے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کی صحت پہلے سے بھی زیادہ بگڑ جائے گی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ (الانفال : ۲۴)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جبکہ وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے اور خوب جان لو کہ اللہ حائل ہو جاتا ہے آدمی اور اس کے دل کے درمیان اور یاد رکھو کہ اسی کی طرف تم جمع کیے جاؤ گے ۝

تین حقائق کا انکشاف:

اس آیتِ کریمہ میں تین باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے بلکہ تین حقائق کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ سب سے پہلی بات جو ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور جسے نظر انداز کر دینے سے انسان کی بدنصیبی اور اس کی ضلالت میں ہمیشہ اضافہ ہوا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ انسان نے اپنی عقل و خرد سے کام لے کر جن مختلف علوم و فنون کو وجود دیا ہے ان میں سے ایک ایک پر غور کر کے دیکھ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کا موضوع اور سب کا ہدف صرف یہ ہے کہ انسانی ضروریاتِ زندگی کو بہتر سے بہتر صورت میں اور زیادہ سے زیادہ فراوانی کے ساتھ کس طرح حاصل کیا جائے اور ہر انسان اور انسانوں کے مختلف گروہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ہم وسائلِ رزق پر زیادہ سے زیادہ کس طرح قبضہ حاصل کر سکیں۔ نفس کی ایک بھوک ہے جسے کہیں سیری نصیب

Marfat.com

ہوتی۔ معدے کی ایک آگ ہے جو کسی حد تک بھی بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ دل و دماغ کی آرزوؤں اور امنگوں کی ہوس ہے جسے کسی حد پر پہنچ کر بھی قرار نہیں۔ پیٹ کی ضرورتیں، نفس کے تقاضے، حیوانی اور سفلی جذبات کے حصول کیلئے دماغی کاوشیں، ایسا معبود ہیں کہ صبح سے لیکر شام تک بلکہ بعض دفعہ راتوں کو بھی ہر شخص اسی کی پوجا میں لگا ہوا ہے۔ معدہ ایک ایسا کعبۂ مقصود بن چکا ہے کہ پوری دنیا اس کے طواف میں مصروف ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مطاف میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ علم وفن کے نام سے انسانی دماغ نے جو کچھ اختراع کیا ہے اس کے ناموں پر نہ جائیے اس کی حقیقت میں اتر کر دیکھئے ہر جگہ آپ کو اسی رویے اور اسی فکر کی کارفرمائی دکھائی دے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شکم کی ضرورتوں نے انسانیت کو دبا کر ہر جگہ اپنی حکمرانی قائم کر لی ہے اور دل کی دنیا آہستہ آہستہ مردنی کا شکار ہوتی جا رہی ہے کیونکہ انسان جس راستے پر پڑ چکا ہے اس کی فکر جو اسلوب اختیار کر چکی ہے اور اس کی تگ وتاز اپنے لئے جو میدان منتخب کر چکی ہے اس کا کوئی راستہ دل کی طرف نہیں جاتا بلکہ سب کے پیشِ نظر شکم پروری اور شکم پرستی کے سوا کچھ نہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ شکم اور قلب کے تقاضوں میں ایسا بعد المشرقین ہے کہ یہ دونوں کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

پیغمبر اس کے بالکل برعکس ایک دوسری دعوت لے کر آتے ہیں جس کا موضوع شکم پروری نہیں بلکہ دل کی بیداری ہے۔ وہ انسان کو اس کے خالق و مالک کے وجود کی خبر دیتے ہیں۔ اسے اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ تجھے تیرے مالک نے ایک مقصدِ حیات دے کر پیدا کیا ہے یہ دنیا تیرے لئے میدانِ عمل بنائی گئی ہے اور زندگی مہلتِ عمل کے لئے بخشی گئی ہے۔ عمل کے اصول وضوابط اور حسن وقبح کے معیارات سے تیرے مالک نے اپنے رسول بھیج کر اور کتابیں اتار کر تمہیں آگاہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات واضح کی ہے کہ تمہارے مالک کے بھیجے ہوئے ضابطۂ حیات کے مطابق جو زندگی گزرے گی اسے یہاں بھی بھلائی کا پھل لگے گا اور آخرت میں بھی سرخرو ہوگی۔ لیکن جو زندگی اس ضابطۂ حیات کے انکار پر اٹھے گی وہ وقتی طور پر چکا چوند بھی پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن اس کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا کیونکہ اس کی چکا چوند اور دل آویزی جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری کے سوا کچھ نہیں۔ بالآخر ایک وقت آتا ہے جبکہ اہلِ دنیا خود اس سے تنگ آ کر خودکشی کی موت مرتے ہیں یا آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں کیونکہ زندگی کا وہ رویہ جو شکم پروری کے سوا کچھ اور نہیں سکھاتا اور جس نے انسانی اقدار کو جلا دینے کی بجائے حیوانی صفات کو عزت و احترام دیا ہے اس کے نتیجے میں بھوک میں تو اضافہ ہو سکتا ہے، آرام و راحت کی طلب تو بڑھ سکتی ہے، درہم و دینار اور عہدہ ومنصب کی ہوس میں تو افزونی ہو سکتی ہے، اپنے منڈیر کو اونچا کرنے کیلئے دوسروں کی عمارتیں گرانے کا شوق تو پیدا ہو سکتا ہے، اپنے آپ کو سب سے بڑا ثابت کرنے اور اپنے ملک کو وسیع کرنے کیلئے ظلم اور ظالمانہ فتوحات کے شوق میں اضافہ تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے دل میں وہ رعنائی پیدا نہیں ہو سکتی جو دل کی بیداری کا باعث ہو جس سے بصارت کو بصیرت نصیب ہو جس سے عقل کو وہ نور حاصل ہو جو آفاق وانفس کے اسرار و حقائق سے پردہ اٹھا سکے اور دل کو وہ زندگی نصیب ہو جو تجلیات و انوارِ الٰہی کا مہبط بن سکے۔ یہ دولت صرف اللہ کے نبیوں کی دعوت کے نتیجے میں نصیب میں آتی ہے۔ اس سے وہ دلِ بیدار پیدا ہوتا ہے جو خالق ومخلوق کے رشتہ کی حقیقت کو جانتا اور جو مخلوق کے آئینہ میں اپنے خالق کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ جس میں ایسی نزاکت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے انسان کی معمولی تکلیف اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ وہ خود دکھ اٹھا کر دوسروں کو سکھ پہنچاتا ہے اور اسی میں راحت محسوس کرتا ہے اور یہی درحقیقت وہ حقیقت ہے جس کے نتیجے میں ایسا انسان وجود میں آتا ہے جس پر خلافتِ ارضی ناز کرتی ہے اور جس کے دامن میں فرشتے نماز پڑھ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسی سے فاروقی اور حیدری صفات وجود میں آتی ہیں اور انسانی کائنات کی ایک ایک بگڑی ہوئی کل ٹھیک جگہ پر بیٹھ جاتی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ؎

دلِ بیدار فاروقی دلِ بیدار کراری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

Marfat.com

۲:۔) اس آیتِ کریمہ میں دوسری حقیقت جو منکشف فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ منافقین یا کمزور مسلمانوں کو ایک تنبیہ کی جارہی ہے کہ اللہ کے نبی تمہیں جس حیات بخش پیغام کی طرف بلا رہے ہیں اور تمہارے دلوں کی زندگی کا جو سامان کر رہے ہیں یہ مت سمجھو کہ یہ بلاوا اور یہ دعوت مسلسل اسی طرح جاری رہے گی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آسانی اور پھر اتمامِ حجت کیلئے ایک خاص وقت تک اپنے پیغمبر کے ذریعے دعوت کا اہتمام جاری رکھتا ہے۔ پیغمبر دکھ اٹھا کر مخالفین کی مخالفتوں کے باوجود خون کے گھونٹ پی پی کر لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیتے رہتے ہیں۔ لیکن جب پروردگار محسوس فرماتا ہے کہ انسانوں کی طرف سے اس پیغام کی ناقدری اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے تو پھر وہ زیادہ دیر تک مہلت کو جاری نہیں رکھتا، تنبیہات سے کام لیتا ہے، کبھی جھٹکے بھی دیتا ہے۔ جب یہ ساری کوششیں اکارت جاتی ہیں تو پھر اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنے انکار اور عناد سے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ مجھے اللہ کے دین اور اللہ کے رسول کی دعوت سے کوئی سروکار نہیں میں یہ ماننے کیلئے تیار نہیں کہ اللہ میرا خالق ومالک ہے اور اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ میرے لئے ایک ضابطۂ حیات نازل کرے اور میرے لئے لازم ہے کہ میں اس ضابطۂ حیات کے مطابق زندگی گزاروں۔ میں ان میں سے ہر بات کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں، میں تو من مرضی کی زندگی گزاروں گا۔ مجھے کسی آنے والی زندگی سے کوئی خطرہ نہیں، مجھے کہیں بھی جواب دہی کا اندیشہ نہیں۔ اس پر اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے تو وہ ایسے آدمی سے قبولیتِ حق کی استعداد چھین لیتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے دلوں پر مہر کرنا کہتے ہیں اور اسی کو قرآنِ کریم نے ”رَین“ قرار دیا ہے۔

انسان کا دل ایک آئینے کی مانند ہے جس کی آب وتاب انسان کے رخِ زیبا کے عکس کو منعکس کرتی ہے۔ لیکن آئینے کا یہ انعکاس اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک وہ داغ دھبوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر اس کے چہرے پر مسلسل زنگ چڑھتا رہے یا مختلف قسم کے داغ اس کی آب وتاب کو مٹاتے رہیں تو ایک وقت آئے گا جب یہ آئینہ بے نور ہو کر رہ جائے گا۔ اب آپ اس میں دیکھنا چاہیں گے تو وہ موجود ہوتے ہوئے بھی آپ کو کچھ نہ دکھا سکے گا۔ اپنے اسی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے منافقو! تمہارے پاس ابھی وقت باقی ہے کہ تم اللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہو اور اپنے دلوں کی دنیا کو آباد کر لو اور اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا اور تم اپنی روش پر قائم رہے تو پھر یاد رکھو وہ وقت دور نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہارے دلوں کے درمیان حائل ہو جائے گا یعنی اس کا قانون حائل ہو جائے گا۔ وہ تم سے قبولیت کی استعداد چھین لے گا، تمہارے دلوں کی آب وتاب زنگ آلود کر دے گا۔ اس کے بعد کوئی کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکے گی۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تم نے اگر رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی ناقدری جاری رکھی اور تم اپنے نفاق سے تائب نہ ہوئے تو یاد رکھو انسانوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں میں ہیں وہ جب چاہتا ہے الٹ دیتا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ تم دل کی استعداد کو بروئے کار لاؤ اور ہدایت کی دولت پالو اور اگر اللہ نے تمہارے دلوں کی حالت بدل ڈالی تو پھر تم ہمیشہ کیلئے محروم رہ جاؤ گے۔

نیکی کا خیال معزز مہمان کی مانند ہے:

ہدایت وضلالت کا یہ عقدہ تو نہایت نازک موقعہ ہے جو ہاتھ سے چھوٹ گیا تو چھوٹ گیا۔ بزرگانِ دین تو فرماتے ہیں کہ ہر نیکی کے بارے میں ایک مومن کو نہایت محتاط ہونا چاہئے جب نیکی کا کوئی خیال دل میں آتا ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ ایک معزز مہمان آپ کے گھر کے دروازے پر آیا ہے۔ کوئی بھی معزز مہمان اپنی عزت کے معاملے میں نہایت حساس ہوتا ہے اگر میزبان اس کے استقبال میں ذرا بھی سرد مہری کا ثبوت دیتا ہے تو معزز مہمان دروازے ہی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔ نیکی کا خیال بھی ایک معزز مہمان کی مانند ہے جیسے ہی آئے تو لپکتے ہوئے اسے تھام لینا چاہئے اور پہلی فرصت میں اس پر عمل کرنا چاہئے اور اگر تساہل سے کام لیا تو یہ آیا ہوا مہمان لوٹ بھی سکتا ہے تو پھر عین ممکن ہے کہ کبھی لوٹ کر نہ آئے۔

۳:۔) آیتِ کریمہ میں تیسری بات جو ایک سخت تنبیہ بھی ہے وہ یہ ہے کہ منافقین سے کہا گیا ہے کہ آج اگر تم اپنے مفادات اور تعلقات میں اندھے ہو کر زندگی بخش پیغام کی بھی قدر نہیں کر رہے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تمہیں یہاں ہمیشہ زندہ نہیں رہنا ہے۔ بہت جلد یہ زندگی ختم ہونے والی ہے تو پھر بالآخر تمہیں اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے وہاں تم سب جمع کئے جاؤ گے اور وہاں ہر شخص اپنے اپنے ایمان وعمل کے مطابق اپنا انجام دیکھے گا۔ سوچ لو کہ آج کی یہ بے نیازیاں اس روز کتنی مہنگی ثابت ہوں گی۔ اس وقت عمل یا توبہ کا کوئی موقعہ نہیں ہوگا۔ وہ تو فیصلے کا دن ہے اس دن کا پچھتاوا بہت پچھتاوا ہے۔ بہتر ہے کہ اس دن کے آنے سے پہلے اپنی حالت کی اصلاح کر لی جائے۔

Marfat.com

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (الانفال : ۲۵)

(اور بچو اس فتنہ سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک نہیں پہنچے گی جنہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہوگا اور خوب جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔)

فتنہ سے بچو:

معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں خطاب صرف منافقین اور کمزور مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ تمام مسلمانوں سے ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بعض لوگوں کی بے حسی، ناقدری یا اندھی مخالفت سے تنگ آکر صحابہ کرام نے مسلمانوں میں ایسے عناصر کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا ہے اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ ان پر اب وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، ہمیں اپنی اصلاح یا اسلام کی دوسری ذمہ داریوں کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے۔ لیکن پروردگار نے ایسے لوگوں کو متنبہ فرمایا اور قیامت تک آنے والے مسلمانوں کیلئے ایک مستقل ہدایت قائم کردی جس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر آدمی اپنی ذات کے حوالے سے براہِ راست اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس لئے اسے سب سے زیادہ اپنے ایمان وعمل کی فکر کرنی چاہیے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمان ایک امت ہیں ان کی انفرادی زندگی اجتماعی زندگی سے الگ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ان کا ایک ایک فرد ربطِ ملت سے قائم ہے افراد کے سیرت وکردار کی بھی ایک اہمیت ہے کیونکہ انہی سے ملکر امت تشکیل پاتی ہے۔ لیکن اگر ربطِ ملت میں کمی رہ جائے اور پوری امت کے مفادات کو سامنے نہ رکھا جائے اور پوری امت کی یکساں فکر نہ کی جائے تو افراد بھی دیر تک اپنی ایمانی صحت کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی بستی میں رہنے والے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ہماری بستی کا ایک ایک فرد صحت مند رہے تو انہیں لازماً اس بات کی پابندی کرنا ہوگی کہ کہیں بھی حفظانِ صحت کے اصولوں کی مخالفت نہ ہونے پائے۔ کہیں بھی جوہڑوں میں مچھر نہ پلنے پائیں، کہیں بھی گندگی کے ڈھیر نہ دکھائی دیں، اگر بستی کا ایک ایک گھر یہ سمجھنے لگے کہ مجھے تو صرف اپنے گھر کی فکر کرنی ہے میرے گھر کے اندر میرے گھر کے باہر کہیں گندگی کے ڈھیر نہیں ہونے چاہئیں اور اگر میرے اڑوس پڑوس یا بستی میں کسی اور جگہ گندگی پھیل رہی ہے جو کسی بھی وبا کا باعث بن سکتی ہے۔ تو مجھے اس سے کیا غرض۔ میرا گھر تو صاف ستھرا ہے۔ ایسی سوچ رکھنے والا نہ صرف اپنی بستی کا دشمن ہے بلکہ اپنا بھی دشمن ہے کیونکہ جب اس طرح کے لوگ زیادہ ہوجائیں گے جو دوسروں کو کہنا سننا پسند نہیں کریں گے اور پوری بستی کی صفائی کی فکر نہیں کریں گے تو ایک نہ ایک دن یہ گندگی وبا کی صورت اختیار کر جائے گی اور پھر اس کے نتیجے میں فضا میں بھی سمیت سرایت کر جائے گی، ہوا بھی اپنے دوش پر گندگی کے اثرات کو لے کر اڑے گی پھر بستی کا کوئی گوشہ اس کے اثرات سے محفوظ نہیں ہوگا۔ یہی حال اخلاقی اور روحانی نجاستوں کا بھی ہے اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور صالح سوسائٹی کے رعب سے دبی رہیں تو ان کے نقصانات محدود ہوتے ہیں۔ لیکن جب سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر کمزور ہوجاتا ہے، جب اخلاقی برائیوں کو دبا کر رکھنے کی طاقت اس میں نہیں رہتی، جب اس کے درمیان برے اور بے حیا اور بداخلاق لوگ اپنے نفس کی گندگیوں کو اعلانیہ اچھالنے اور پھیلانے لگتے ہیں اور جب اچھے لوگ اپنی انفرادی اچھائیوں پر قانع ہوکر بیٹھ جاتے ہیں اور اجتماعی برائیوں پر چپ سادھ لیتے ہیں تو مجموعی طور پر پوری سوسائٹی کی شامت آجاتی ہے اور وہ فتنۂ عام برپا ہوتا ہے جس میں چنے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ اس لئے اکثر اہلِ علم نے فتنہ سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دینا مراد لیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مختلف مواقع پر اس کی تاکید بھی فرمائی اور اس کو مثالوں سے واضح بھی فرمایا۔ ایک موقعہ پر ایک کشتی کی مثال دے کر سمجھایا کہ اگر کچھ لوگ ایک کشتی میں سفر کریں کچھ اس کے اوپر کے حصے میں، کچھ نیچے والے حصے میں۔ نیچے والے یہ محسوس کرکے کہ انہیں پانی کیلئے اوپر جانے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے یہ فیصلہ کریں کہ ہم کیوں نہ کشتی کے نیچے کے حصے میں سوراخ کرلیں اور اوپر والے یہ خیال کرکے کہ وہ اپنے حصے میں سوراخ کر رہے ہیں ہمیں اس سے کیا سروکار، اس پر خاموش رہیں تو نیچے والوں کے اس فعل کے نتیجے میں جب کشتی ڈوبے گی تو اوپر والوں اور نیچے والوں دونوں کو لے کر ڈوبے گی۔ یہی حقیقت ہے جس کی وجہ سے اسلام نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ہر شخص پر عائد کی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

Marfat.com

”تم میں سے کوئی شخص بھی کوئی برائی دیکھے اگر ہاتھ سے اس کو روک سکتا ہو تو ہاتھ سے روکے اور اگر ہاتھ سے نہ روک سکتا ہو تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو دل سے اسے برا سمجھے لیکن اسے اضعف الایمان یعنی ایمان کا سب سے کمزور درجہ قرار دیا“

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر یا معاشرے یا دفاتر یا اداروں میں کوئی سی برائی دیکھتا ہے اور اس کے دل کو ٹھیس نہیں پہنچتی، اسے بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوتی، اسے سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے دل میں ایمان کی رتی بھی نہیں۔ بیشک وہ اٹھتا بیٹھتا ایمان کی باتیں کرتا ہو، بیشک وہ تہجد گزار اور وظائف کا پابند بھی ہو لیکن اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور شریعتِ اسلامی کے احکام کا تمسخر اور کھلی بے حیائی اس کی پیشانی پر شکن بھی نہیں پیدا نہیں کرتی تو اس کے سارے وظائف کے باوجود اسے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے۔

اسی طرح یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ ہر آدمی کی ذمہ داری اس کی اپنی ذات کے بعد اس کے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ گھر کا سربراہ یقیناً اپنے گھر میں حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے وہ اگر سنجیدگی سے کوشش کرے تو بہت سی برائیوں کو روک سکتا ہے لیکن اگر وہ بیوی بچوں کی دلجوئی کی خاطر چپ رہتا ہے تو اسے اس کا جواب دینا ہوگا۔

اسی طرح ہر ادارے اور ہر دفتر کا سربراہ اپنے اپنے دائرہ کار میں جواب دہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اصولی طور پر یہ بات بیان فرمائی ہے کہ:

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ

(تم میں سے ہر ایک آدمی چرواہا اور حکمران ہے اور ہر شخص اپنی رعیت کے بارے میں مسئول اور جواب دہ ہے)

گھر کے سربراہ سے گھر کے بارے میں، ماں سے بیٹیوں کے بارے میں، افسر سے ماتحتوں کے بارے میں، بڑے آفیسر سے اپنے وسیع تر دائرۂ اقتدار کے بارے میں اور حکمرانوں سے مملکت کے بارے میں سوال ہوگا۔ جہاں جہاں بھی شریعت کے احکام ٹوٹ رہے ہیں وہیں وہیں اس کے ذمہ دار سے باز پرس ہوگی۔ پھر اس پر آخرت میں جو سزا ہوگی وہ تو آخرت میں دیکھا جائے گا دنیا میں جو کچھ ہوگا اس کے بارہ میں آپ نے ارشاد فرمایا اور نہائیت جوش سے فرمایا۔ بیان کرنے والا کہتا ہے کہ آپ ٹیک لگائے بیٹھے تھے جوش میں آ کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ:

”تمہیں نیکی کا حکم دینا ہے اور برائی سے روکنا ہے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم دعائیں مانگو گے اور تمہاری دعائیں سنی نہیں جائیں گی“

حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جب لوگ کسی ظالم کو دیکھیں اور ظلم سے اس کا ہاتھ نہ روکیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا عذاب عام کر دیں۔

حاصل کلام یہ کہ اس آیتِ کریمہ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جس اصلاح و ہدایت کے کام کیلئے اٹھے ہیں اور تمہیں جس خدمت کے کام میں ہاتھ بٹانے کیلئے بلا رہے ہیں اسی میں درحقیقت شخصی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے تمہارے لئے زندگی ہے۔ اگر اس میں سچے دل سے مخلصانہ حصہ نہ لو گے اور ان برائیوں کو جو سوسائٹی میں پھیلی ہوئی ہیں برداشت کرتے رہو گے تو ایک ایسا فتنہ اٹھے گا جس کی لپیٹ میں آئے بغیر کوئی نہ بچے گا۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَ اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (الانفال : ۲۶)

اور یاد کرو! جس وقت تم تھوڑے تھے اور ملک میں دبے ہوئے تھے ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لیں تو اللہ نے تمہیں ٹھکانہ دیا اور اپنی نصرت سے نوازا اور تم کو پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا تاکہ تم شکر گزار بنو۔

اللہ کے خصوصی احسانات کا تذکرہ:

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ ان احسانات کا ذکر فرما رہے ہیں جو مسلمانوں پر بطورِ خاص کئے گئے ہیں اور جن کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ مکہ معظمہ میں تیرہ سال تک مسلمانوں نے نہایت اذیت ناک زندگی گزاری۔ ان کا اپنا شہر جس میں اللہ کا گھر اور اللہ کا حرم موجود ہے ان کے

Marfat.com

لئے جہنم بنادیا گیا تھا۔قریش کی جانب سے جب ایذا رسانی انتہا کو پہنچ گئی تو مسلمانوں نے چھپ کر دو دفعہ حبشہ کی طرف ہجرت کی لیکن مستقل طور پر تیرہ سالوں میں کہیں بھی دارالامان میسر نہ آسکا اور نہ دور دور تک کہیں اس کے آثار دکھائی دیتے تھے۔اہلِ مکہ نے جب رسول اللہ ﷺ کی دعوت کیلئے اپنے دل بالکل بند کر لئے تو آپ نے طائف کا سفر فرمایا لیکن طائف کے سرداروں نے جو سلوک آپ کے ساتھ کیا اسے آپ ساری زندگی نہ بھول سکے۔اسے اللہ کا غیر معمولی فیصلہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ اچانک مدینہ منورہ کی جانب سے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا آیا۔مدینہ کے آئے ہوئے حاجیوں میں سے 6 آدمی آپ سے ملے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔پھر دوسرے سال ایک معقول تعداد آپ سے ملنے کیلئے آئی اور انہوں نے محض تقدیرِ الٰہی سے وہ فیصلہ کیا جو آپ کی ہجرت کا سبب بنا اور اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے حالات میں ایک ٹھکانہ اور دارالامان بخشا جبکہ مسلمانوں کی تعداد بھی بہت تھوڑی تھی اور قریشِ مکہ آپ کے اور دیگر مسلمانوں کے بارے میں نہایت مکروہ عزائم رکھتے تھے۔آپ کے قتل کی منصوبہ بندی تو اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والی تھی جب اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور آپ قریش کی تمام کوششوں کے باوجود بخیریت تمام مدینہ منورہ پہنچ گئے۔پھر ابھی یہاں پہنچے ایک سال ہی ہوا ہوگا کہ آپ پر جنگ مسلط کر دی گئی بلکہ مدینہ منورہ پہنچنے کے ساتھ ہی آپ کو دھمکیاں دی جانے لگیں دشمنوں کو آپ کے خلاف انگیخت کیا جانے لگا۔سازشوں کا ہر طرف جال پھیلا دیا گیا لیکن ان تمام حالات میں اللہ تعالیٰ نے قدم قدم پر اپنی نصرت سے آپ کو نوازا۔قریش نے جو قدم بھی اٹھایا وہ ان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔بالآخر جنگِ بدر ایک ہی سال کے بعد قریش کے لئے عذاب کی پہلی قسط ثابت ہوئی۔ان کی اصل قوت میدان میں ڈھیر ہوگئی جبکہ مسلمانوں کے پاس مقابلے کی کوئی طاقت نہ تھی۔لیکن یہ سراسر اللہ کی تائید و نصرت تھی جس نے مسلمانوں کو جزیرۂ عرب میں ایک قابلِ لحاظ قوت بنا دیا۔مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مدینہ منورہ کوئی بہت بڑی بستی نہ تھی جس میں ہزاروں آدمیوں کے وسائل معاش کا انتظام ہو سکتا۔لیکن ہجرت کے فرض ہو جانے کے بعد ہر مسلمان ہونے والا مدینہ منورہ کا رخ کرنے لگا اب ہونا یہ چاہئے تھا کہ اہلِ مدینہ تنگ آکر ہر آنے والے کو اگلنا شروع کر دیتے لیکن اس پر تاریخ ہمیشہ انگشت بدنداں رہے گی کہ آج جبکہ کہیں بھی مہاجرین کا سیلاب آتا ہے تو حکومتیں ہل کر رہ جاتی ہیں حالانکہ ہر حکومت کے پاس آج کے دور میں بے پناہ وسائل ہیں۔لیکن اہلِ مدینہ نے جس طرح آنے والوں کیلئے اپنے دل وا کئے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے وسائل میں برکت عطا فرمائی وہ بجائے خود اللہ کا بہت بڑا احسان ہے۔جس کو بطورِ خاص ذکر فرمایا کہ اللہ نے تمہیں پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا تاکہ مسلمان اللہ کے شکر گزار ثابت ہوں۔دنیا میں جابجا اللہ کی نعمتیں پھیلی ہوئی ہیں اور بڑے سے بڑا کافر ان سے شاد کام ہو رہا ہے۔لیکن مسلمان جو اپنے اللہ اور کائنات کے بارے میں حقیقی تصورات کا حامل ہے اسے جب یہ نعمتیں ملتی ہیں تو اس کا مقصد صرف ایک ہی ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے۔

شکر ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں۔

۱:۔زبان سے محسن کے احسانات کا تذکرہ کیا جائے، حمد و ثنا کے کلمات سے اس کی تحسین کی جائے اور زبان کی پوری طلاقت لسانی کو ادائے شکر میں صرف کر دیا جائے۔

۲:۔اعضاء و جوارح کو محسن کا شکر ادا کرنے کیلئے ہر ممکن خدمت کیلئے تیار کیا جائے۔محسن آئے تو اس کے قدموں میں بچھنے سے دریغ نہ کیا جائے۔وہ کوئی کام کہے تو بلا تاخیر اسے بجا لایا جائے۔یہ آرزو کی جائے کہ ایسی کون سی صورت ہو کہ میں اپنے محسن کے کسی کام آسکوں اور اس کی کسی ضرورت کو پورا کر سکوں جس سے میرا محسن مجھ سے خوش ہو جائے۔

۳:۔دل و دماغ کو محسن کے احسان کے تصور سے آباد رکھا جائے۔دل حمد و ثناء کے تصور سے معمور رہے جب بھی دل و دماغ میں محسن کا تصور آئے تو یوں محسوس ہو کہ بہار آگئی ہے۔

اللہ کریم کے بارے میں اس کی نعمتوں کو دیکھتے ہوئے اس کے مسلمان بندوں کے ایسے ہی تشکر کے جذبات ہونے چاہئیں۔وہ زبان سے اللہ کی حمد و ثناء کریں، زیادہ سے زیادہ اس کا ذکر کریں، دل و دماغ میں اس کی نعمتوں کی یاد تازہ کریں اور اپنے اعضاء و جوارح کو اس کی اطاعت پر لگا

Marfat.com

دیں۔عبادات کے وقت میں عبادت ہو، معاملات میں عہد کی پابندی اور زبان کی پاسداری ہو۔لوگوں سے میل جول میں حقوق کی رعایت ہو اجتماعی زندگی میں عدل واحسان کی عمل داری ہو، ہر سانس اس کی یاد میں آباد رہے اور دل کی ہر دھڑکن اسی کے تصور سے شاداب ہو اسی کے دین کے غلبے کی فکر رہے اسی کی رضا کا حصول زندگی کا سب سے بڑا ہدف بن جائے، حتی کہ اس کے دین پر زندگی کو قربان کر دینا کامیابی کی علامت ٹھہرے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ○

(اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے اور رسول سے اور خیانت نہ کرو آپس کی امانتوں میں، اس حال میں کہ تم جانتے ہو۔اور جان لو کہ بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں اور بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔) (الانفال : ۲۷ تا ۲۸)

شانِ نزول:

مفسرین نے ان آیات کا ایک شانِ نزول بھی لکھا ہے۔وہ یہ ہے کہ یہود کے قبیلوں میں سے بنو قریظہ کا قبیلہ ابھی تک مدینہ میں آباد تھا اس سے پہلے دو قبیلے اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے۔یہ قبیلہ مسلمانوں کے ساتھ بقائے باہمی اور مدینہ کے دفاع کے معاہدے میں شریک تھا۔لیکن غزوۂ خندق میں جب یہود کے دوسرے قبیلے کے سرداروں نے انہیں انگیخت کیا اور بہکایا تو ان کے بہکاوے میں آ کر انہوں نے مسلمانوں سے معاہدہ توڑ ڈالا اور مسلمانوں کیلئے ایک ایسی خطرناک صورتحال پیدا کر دی جس سے عہدہ برآ ہونا بظاہر ناممکن دکھائی دیتا تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ نے خصوصی تائید اور نصرت سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ایک تیز آندھی اور طوفان نے کفار کی فوج کے خیمے الٹ دیئے، دیگیں اوندھی ہو گئیں، جانور رسیاں تڑا کر بھاگ نکلے، ایک ایسا ہراس طاری ہو گیا جس کا جدھر منہ اٹھا وہ پناہ کی تلاش میں ادھر چل پڑا۔صبح ہونے تک ہزاروں کا لشکر میدان چھوڑ کر بھاگ چکا تھا۔اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا غلبہ عطا فرمایا اور مسلمان دوپہر تک اپنے خیموں سے گھروں کو لوٹ آئے۔لیکن عصر کی نماز سے پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور اللہ کا حکم پہنچایا کہ بنو قریظہ کو عہد شکنی کی سزا دینے کیلئے فوراً ان کا محاصرہ کر لیا جائے۔شروع شروع میں تو بنو قریظہ نے بڑی ہیکڑی دکھائی لیکن 21 روز کے محاصرے نے ان کے تمام کس بل نکال دیئے۔مجبور ہو کر انہوں نے نبی کریم ﷺ سے وطن چھوڑ کر ملکِ شام چلے جانے کی درخواست کی۔لیکن آپ نے ان کی گزشتہ عہد شکنیوں کو دیکھتے ہوئے اس کو منظور نہیں فرمایا بلکہ صرف یہ فرمایا کہ صلح کی ایک ہی صورت ہے کہ سعد بن معاذ ؓ تمہارے بارے میں جو کچھ فیصلہ کریں اس پر راضی ہو جاؤ۔انہوں نے درخواست کی کہ سعد بن معاذ ؓ کی بجائے ابولبابہ ؓ کو یہ کام سپرد کر دیا جائے کیونکہ حضرت ابولبابہ کے اہل وعیال اور جائداد بنو قریظہ میں تھے۔اس لئے بنو قریظہ کا خیال تھا کہ حضرت ابولبابہ ہمارے معاملہ میں رعایت کریں گے۔آپ نے ان کی درخواست پر حضرت ابولبابہ ؓ کو بھیج دیا۔بنو قریظہ کے سب مرد وزن ان کے گرد جمع ہو کر رونے لگے اور یہ پوچھا کہ اگر ہم رسول اللہ ﷺ کے حکم پر اتر آئیں تو کیا ہمارے معاملہ میں وہ کچھ نرمی فرمائیں گے۔ابولبابہ ؓ کو معلوم تھا کہ ان کے معاملہ میں نرمی برتنے کی رائے نہیں ہے۔انہوں نے کچھ ان لوگوں کی گریہ وزاری سے اور کچھ اپنے اہل وعیال کی محبت سے متاثر ہو کر اپنے گلے پر تلوار کی طرح ہاتھ پھیر کر اشارہ سے بتلا دیا کہ ذبح کیے جاؤ گے۔گویا اس طرح آنحضرت ﷺ کا راز فاش کر دیا۔

مال واولاد کی محبت میں یہ کام کر تو گزرے مگر فوراً تنبہ ہوا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے خیانت کی ہے۔جب وہاں سے واپس ہوئے تو اس درجہ ندامت سوار ہوئی کہ آپ کی خدمت میں لوٹنے کی بجائے سیدھے مسجد میں پہنچے اور مسجد کے ایک ستون کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ لیا اور قسم کھائی کہ اب انہیں رسول اللہ ﷺ ہی اپنے دستِ مبارک سے کھولیں گے اور وہ آئندہ بنو قریظہ کی سرزمین میں کبھی داخل نہ ہوں گے۔ادھر رسول اللہ ﷺ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی واپسی میں دیر ہو رہی ہے پھر جب تفصیلات کا علم ہوا تو فرمایا اگر وہ میرے پاس آ گئے ہوتے تو میں ان کیلئے مغفرت کی دعا کر دیتا اور

Marfat.com

توبہ قبول ہو جاتی۔ لیکن جب وہ وہی کام کر بیٹھے ہیں تو اب میں بھی انہیں ان کی جگہ سے کھول نہیں سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے۔ حضرت ابولبابہ ﷜ 6 رات مسلسل ستون سے بندھے رہے ان کی بیوی ہر نماز کے وقت آ کر کھول دیتی اور وہ نماز سے فارغ ہو کر پھر اسی ستون سے بندھ جاتے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ پر صبح دم ان کی توبہ نازل ہوئی۔ اس وقت آپ حضرت ام سلمہ ﷝ کے مکان میں تشریف فرما تھے۔ حضرت ابولبابہ ﷜ کا بیان ہے کہ حضرت ام سلمہ نے اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر مجھ سے کہا: اے ابولبابہ! خوش ہو جاؤ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ یہ سن کر صحابہ انہیں کھولنے کیلئے اچھل پڑے، لیکن انہوں نے انکار کر دیا کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی بجائے کوئی اور نہ کھولے گا۔ چنانچہ جب نبی کریم ﷺ نمازِ فجر کیلئے نکلے اور وہاں سے گزرے تو انہیں کھول دیا۔

شانِ نزول میں اگرچہ صرف حضرت ابولبابہ ﷜ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے لیکن آیتِ کریمہ کا مفہوم ایک واقعہ میں محدود نہیں۔ پوری امت میں یہ بات مسلمہ ہے کہ اگر کوئی حکم قرآنِ کریم میں کسی خاص موقعہ پر نازل ہوا ہے تو اس موقعہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتا بلکہ پوری امت اور تمام مواقع کیلئے عام ہوتا ہے۔ لیکن اس کے عموم کا ذکر کرنے سے پہلے اس واقعہ پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ حضرت ابولبابہ ﷜ نے کوئی خیانت نہیں کی کوئی جرم نہیں کیا، بجز اس کے کہ بنوقریظہ سے پرانے تعلقات اور ان کے مرد وزن کا رونا دھونا دیکھ کر ان کی طبیعت پسیج گئی اور انہوں نے چونکہ آپ کو مشورہ کیلئے طلب کیا تھا کہ ہمیں اپنے آپ کو قلعوں سے اتر کر نبی کریم ﷺ کے سپرد کر دینا چاہیے یا نہیں۔ تو آپ کو چونکہ معلوم تھا کہ ان کے کرتوت اور ان کی خطرناک عہد شکنیوں نے معافی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں اور آنحضرت ﷺ کوئی سخت فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس لئے انہوں نے اشارۃً یہ بتلا دیا کہ تمہاری خیر نہیں۔ اس سے یہ تو ممکن تھا کہ وہ چند دن اور اڑے رہتے اور مسلمانوں کو محاصرے کی مزید صعوبتیں اٹھانی پڑتیں۔ لیکن جو طے ہو چکا تھا اور جو نوشتۂ تقدیر بن چکا تھا وہ تو صاف نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس تھوڑی سی کوتاہی پر آنحضرت ﷺ کے راز کے افشا ہونے کے خیال سے حضرت ابولبابہ پر خشیتِ الٰہی کا ایسا حملہ ہوا کہ وہ آنحضرت ﷺ کا سامنا بھی نہ کر سکے بلکہ براہِ راست اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کی تربیت کس قدر مکمل تھی اور وہ کس طرح اللہ سے ڈرتے تھے اور ہر معاملے میں اللہ اور رسول کی رضا کو ترجیح دیتے تھے۔ ان کی کوتاہی تاریخ میں وہ اہمیت نہیں رکھتی جو اہمیت ان کی توبہ کو ہے اور ان کے اس رویے کو ہے جو انہوں نے اختیار کیا۔ غلطی ہو جانا اور حالات کے تاثر میں بہہ جانا اگرچہ ایک کمزوری ہے لیکن یہ انسانی کمزوری ایسی ہے جس کا صدور عموماً ہو جاتا ہے۔ لیکن جس طرح سے انہوں نے توبہ کی اور اپنی ذات کو اللہ کے سامنے سپر انداز کر دیا وہ ایک ایسی مثال ہے جس پر تاریخ ہمیشہ ناز کرتی رہے گی کیونکہ:

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے سو بار ندامت ہوتی ہے

جہاں تک اس آیت کے مضمون کے عموم کا تعلق ہے۔ اس کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں امانتوں سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو کسی بھی شخص پر اعتماد کرتے ہوئے اس کے سپرد کی جاتی ہیں۔ خواہ وہ عہدِ وفا کی ذمہ داریاں ہوں یا اجتماعی معاہدات کی یا جماعت کے رازوں کی یا شخصی یا جماعتی اموال کی یا کسی ایسے عہدہ ومنصب کی جو کسی شخص پر بھروسہ کرتے ہوئے جماعت اس کے حوالے کر دے۔ بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ امانت اس سرمائے کا نام ہے جو آدمی کسی شخص کے پاس حفاظت کیلئے بطورِ امانت رکھتا ہے۔ بلاشبہ یہ بھی امانت ہے لیکن جیسے میں نے عرض کیا کہ امانت کا ایک وسیع تصور ہے جس میں پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی سمٹ آتی ہے۔ ہم جس ذمہ داری اور جس منصب کو ایک حلف اور وعدے کے ساتھ قبول کرتے ہیں وہ درحقیقت ایک امانت ہے جس میں کسی قسم کی کوتاہی خیانت کہلاتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر آپ دیکھیں تو دو آدمیوں کا آپس میں قول وقرار، دو قوموں کے درمیان معاہدات، ہر ذمہ داری سے متعلق رازوں اور فنڈز کی حفاظت، حتیٰ کہ مجلسی باتوں کو دوسروں تک نہ پہنچانے کی احتیاط، یہ سب امانت کا حصہ ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے ایک تو امانت کے تصور کو محدود کر دیا اور دوسرا اس کی اہمیت آہستہ آہستہ زندگی سے خارج کر دی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پوری قوم زندگی کے ہر دائرے میں بے اعتبار ہو کر رہ گئی۔ جس مومن کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا کہ مومن وہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی زندگی بھی اس کے پاس امانت رکھنے کیلئے تیار ہو جائیں اور انہیں بھروسہ ہو کہ ہماری زندگی کو ٹھیس نہیں لگے گی۔ وہ مومن ہر ملکی سطح پر بھی اور بین الاقوامی سطح پر بھی پوری طرح برہنہ ہو کر رہ گیا ہے اور ہماری زندگی کے فیصلے

Marfat.com

کرنے والوں کو نہ صرف کہ اس کا احساس نہیں بلکہ اس کا اندازہ بھی نہیں کہ ہم کتنے بڑے حادثے سے دوچار ہو چکے ہیں۔

دوسری آیتِ کریمہ میں وہ تمام ایمانی کمزوریاں جن کا تعلق عہدِ وفا سے ہو یا حقوق و معاملات سے، وہ مالی خیانتیں ہوں یا ذمہ داری کی خیانتیں، ان کا حقیقی سبب واضح فرمایا گیا ہے۔ انسان جب بھی راہِ راست سے پھسلتا ہے یا کسی بھی خیانت کا ارتکاب کرتا ہے تو ہمیشہ اس کے پس منظر اور تہہ منظر میں مال کی محبت یا اولاد کی محبت کی کارفرما ہوتی ہے۔ جو آدمی زندگی کا سب سے بڑا مقصد مال و دولت کے حصول کو بنا لیتا ہے اسے دولت کی کوئی مقدار بھی آسودگی نہیں بخشتی بلکہ جب وہ کسی ایک مقدار پر پہنچتا ہے تو اس کی جوع البقر اور بھڑکتی ہے وہ استسقاء کے بیمار کی طرح اور زیادہ بے چین ہوتا ہے۔ ایک کارخانے کے بعد دوسرا کارخانہ اور ایک کوٹھی کے بعد دوسری کوٹھی اس کی بے کلی کا سبب بن جاتی ہے۔ جیسے جیسے وہ آگے قدم بڑھاتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی بھوک اور پیاس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور یہ آگ برابر پھیلتی چلی جاتی ہے تا آنکہ آدمی پر سکرات الموت طاری ہو جاتے ہیں۔ جس طرح مال و دولت کی محبت میں کہیں نقطۂ انجماد نہیں اور نہ کہیں نقطۂ اختتام ہے یہی حال اولاد کی محبت کا بھی ہے۔ آدمی اپنی ذات میں کفایت بھی کر لیتا ہے، محنت بھی کرتا ہے، مشکل وقت بھی گزار لیتا ہے، لیکن اولاد کا موہوم مستقبل ہمیشہ اسے پریشان رکھتا ہے۔ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی ہوس اور بہتر سے بہتر سکول میں تعلیم اپنی بساط سے باہر ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب کوئی جائز راستہ نظر نہیں آتا تو پھر ناجائز راستے اختیار کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ تاریخ کی بڑی بڑی غداریاں اور بڑی بڑی سازشوں میں شرکت یا مال و دولت کی محبت کی وجہ سے ہوئی ہے اور یا اولاد کی محبت کی وجہ سے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے بار بار انہی دونوں چیزوں کو انسان کیلئے آزمائش قرار دیا ہے کہ دیکھنا مال کی محبت تمہیں حلال اور حرام اور جائز ناجائز سے بے نیاز نہ کر دے۔ اسی طرح اولاد کی محبت حق سے انحراف کا ذریعہ نہ بنے۔ اگر تم نے محبت کے ان دونوں رشتوں پر حق کی مہر نہ لگائی اور تقویٰ کی زنجیر نہ پہنائی اور اللہ کا خوف دامن گیر نہ ہوا تو پھر یاد رکھو کہ تم اس آزمائش میں ناکام ہو جاؤ گے۔ یہ صحیح ہے کہ مال و دولت میں بڑی اپیل ہے اور اولاد بڑھاپے کا سہارا ہے لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص ان دونوں کمزوریوں پر قابو پا لیتا ہے اس کے لئے اللہ کے یہاں اجرِ عظیم ہے۔ اگر اجرِ عظیم پر ایک مومن مراقبہ کر لے تو کوئی غلط سے غلط اکساہٹ اسے خیانت پر مجبور نہیں کر سکتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ
سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٢٩﴾ وَ
اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ
وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿٣٠﴾ وَاِذَا تُتْلٰى
عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ
اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣١﴾ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ
هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ

Marfat.com

أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ
فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٣٣﴾ وَمَا لَهُمْ
أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٤﴾ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَ
تَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٥﴾ إِنَّ
الَّذِينَ كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ
فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ
مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ
جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾ ع

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے ہو تو وہ تمہیں کسوٹی عطا کرے گا اور تم سے تمہاری برائیاں جھاڑ دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے (۲۹) اس وقت کو یاد کرو جب کافر تیرے خلاف تدبیر کر رہے تھے تا کہ وہ تجھے قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے ملک بدر کر دیں۔ وہ بھی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے (۳۰) اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں بس سن لیا اگر ہم چاہیں ہم بھی ایسا کلام پیش کر دیں یہ تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں (۳۱) اور یاد کرو جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہی حق ہے تو تیری طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لا (۳۲) اور اللہ ہرگز ان کو عذاب دینے والا نہ تھا جب تک آپ ان میں تھے اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہیں ہو سکتا ہے جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے۔ (۳۳) اور ان میں کیا بات ہے کہ اللہ انہیں عذاب نہ دے

Marfat.com

جبکہ وہ مسجدِ حرام سے روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں۔ اس کے متولی تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں، لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت سے واقف نہیں۔ (۳۴) نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس مگر سیٹی بجانا اور تالیاں پیٹنا تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ (۳۵) بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ اپنے مال خرچ کررہے ہیں تاکہ وہ اللہ کے راستے سے روکیں سو ابھی وہ خرچ کریں گے پھر یہ ان کیلئے سرمایہ حسرت بنیں گے اور آخر مغلوب ہوں گے اور یہ کافر جمع کر کے جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے۔ تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے جدا کردے اور رکھے ناپاک کو ایک کو ایک پر اور پھر اس کو ڈھیر کردے اکٹھا پھر اس کو جہنم میں جھونک دے یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔ (۲۹ تا ۳۷) (رکوع ۴)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّ یُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۝

(اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو تو وہ تمہیں کسوٹی عطا کرے گا اور تم سے تمہاری برائیاں جھاڑ دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔) (الانفال : ۲۹)

گزشتہ رکوع کی آخری دو آیات میں دو نصیحتیں فرمائی گئی ہیں اور پھر تمام برائیوں اور بیماریوں کا حقیقی سبب بتایا گیا ہے جس کی وجہ سے اکثر اخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں جو بالآخر عقیدے کی خرابی پر منتج ہوتے ہیں۔ جو دو نصیحتیں فرمائی گئی ہیں ان میں سے پہلی یہ ہے کہ اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو یعنی تم نے اللہ اور رسول کے ساتھ جو ایمان کی صورت میں عہد و پیمان کیا ہے اگر تم نے اس میں کچھ بھی کمزوری دکھائی اور اس کے تقاضوں کے خلاف کوئی کام کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کررہے ہو اور یہ بات ایسی ہے کہ جسے ہم پورے دین کی بنیاد کہہ سکتے ہیں۔

دوسری جو نصیحت فرمائی وہ یہ ہے کہ مسلمانو تم اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو یعنی تمہارے مالی معاملات، عدالتی معاملات، تجارتی معاملات، قومی معاملات، اور بین الاقوامی معاملات کی بنیاد تمہارا آپس کا عہد و پیمان اور تمہارے باہمی معاہدے ہیں۔ جب بھی ایفائے عہد اور ایفائے معاہدہ میں نیت کی خرابی پیدا ہوتی ہے تو وہیں خیانت کا ارتکاب شروع ہو جاتا ہے اور پوری اجتماعی زندگی اس کے نتیجے میں تلپٹ ہو کر رہ جاتی ہے۔

ان دو نصیحتوں کے بعد تمام ایمانی، اخلاقی اور معاملاتی خرابیوں کے پیدا ہونے کے جو دو سبب ہیں انہیں واضح طور پر متعین کر کے بیان فرمایا گیا ہے کہ تم جب بھی کبھی اللہ اور رسول کے تعلق میں کمزوری کا شکار ہوتے ہو یا باہمی معاملات کی کسی بھی جہت میں خیانت کا ارتکاب کرتے ہو تو اس کے سبب صرف دو ہوتے ہیں ایک مال و دولت کی محبت اور دوسرا اولاد کی محبت۔ یہ دونوں محبتیں فطری ہیں لیکن جب یہ حد سے گزر جاتی ہیں تو پھر یہ کسی انتہا پر بھی رکتی نہیں اور اس کے نتیجے میں اسلامی خوبیاں تو ایک طرف رہیں انسانی خوبیاں بھی رخصت ہو جاتی ہیں۔ آدمی دولت کے حصول کو زندگی کا مقصد بنالیتا ہے اور اولاد کو بہتر سے بہتر مستقبل دینے کیلئے اپنے ایمان اخلاق اور عزت و آبرو کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ ان بنیادی بیماریوں اور کمزوریوں سے بچنے کیلئے پیش نظر آیتِ کریمہ میں ایک علاج تجویز کیا گیا ہے۔ یہ علاج ایسا ہے جس سے ایک طرف برائیاں ختم ہوتی ہیں اور برائیوں کے اسباب دور ہوتے ہیں تو دوسری طرف اللہ کی طرف سے ایک ایسا انعام ملتا ہے جس سے پوری زندگی راہِ صواب پر چل نکلتی ہے۔

تقویٰ تمام کمزوریوں کا علاج اور فرقان کی شرطِ اولین ہے:

اس آیت میں جو علاج تجویز کیا گیا ہے اس کا نام ہے "تقویٰ"۔ قرآن کریم نے تقویٰ پر جتنا زور دیا ہے کسی اور چیز پر اتنا زور نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے تقویٰ پورے دین کی اساس، اس کی روح اور اس کا ست ہے۔ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ بیشتر آیات کے اول یا آخر میں تقویٰ کا حکم دیا ہے۔ تمام عبادات حتیٰ کہ عدل و احسان کا مقصد اس نے تقویٰ کا حصول بتایا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ بڑی سے بڑی نیکی بھی تقویٰ کی روح سے اگر خالی ہو تو

Marfat.com

وہ قبول نہیں ہوتی۔ جنت کی جتنی نعمتیں ہیں انہیں بالعموم اہل تقویٰ کیلئے مخصوص فرمایا ہے۔

تقویٰ کا معنی تو ہے "ڈرنا اور بچنا"۔ لیکن اصطلاحِ قرآنی میں یہ دل کی ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں نیکی کی گہری طلب اور تڑپ ہو اور برائی سے انتہائی نفرت۔ نیکی کی طرف دل اس طرح لپکتا جائے جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی کی طرف لپکتا ہے اور بدی سے اس طرح وحشت اور خوف محسوس ہو جیسے آدمی دہکتے انگاروں سے بچتا ہے۔ آدمی کے اندر یہ احساس روز بروز پختہ ہوتا جاتا ہے کہ میں ہر وقت اپنے اللہ کے سامنے ہوں میرا کوئی عمل اس سے مخفی نہیں۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب اپنے اعمال کی جواب دہی کیلئے میں اللہ کے حضور پیش کیا جاؤں گا۔ جیسے جیسے یہ احساس یقین کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے ویسے ویسے آدمی کی زندگی پاکیزہ ہوتی جاتی ہے۔ وہ ہر قدم سوچ کر اٹھاتا ہے، منہ سے کوئی لفظ بولنے سے پہلے اسے تول کر دیکھتا ہے، اس کی سوچ پر جواب دہی کا پہرہ رہتا ہے۔ کسی دوسرے شخص سے معاملہ کرتے ہوئے وہ اس شخص کو سامنے نہیں رکھتا بلکہ اللہ کو سامنے رکھتا ہے۔ ایسے شخص سے بہت مشکل ہے کہ وہ امانت میں خیانت کا ارتکاب کرے یا مال کی محبت اللہ کی محبت پر غالب آجائے یا اولاد کی محبت اللہ کے حضور جواب دہی سے بے نیاز کردے۔ دل و دماغ کے ان احساسات کے نتیجے میں دل کے اندر ایک قوت پیدا ہوتی ہے جسے قوتِ تمیز یا ضمیر کی قوت کہا جاتا ہے۔ ایک ایسا نور طلوع ہوتا ہے جس کی روشنی میں آدمی بند راستوں میں دیکھنے پر بھی قادر ہو جاتا ہے۔ زندگی کی الجھنیں اور اڑچنیں اولاً تو پیدا نہیں ہوتیں اور اگر کبھی پیدا ہو جائیں تو قدرت قدم قدم پر دستگیری کرتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس قوت کو "فرقان" کہا ہے۔ فرقان کا معنی ہوتا ہے "حق و باطل اور غلط اور صحیح میں فرق کرنے والا" اس کی دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ دل کی ایسی بیداری اور ضمیر کی ایسی روشنی جو زندگی کے ہر معاملے میں صحیح راہنمائی کرے۔ جب لوگ یہ محسوس کریں کہ ہم قومی معاملات میں ایک بند گلی میں داخل ہو گئے ہیں جس میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تو جسے اللہ نے فرقان عطا فرمایا ہے وہ اس بند گلی میں بھی نکلنے کا راستہ دیکھ لے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ارشاد ہے:

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً (جو شخص اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اسے نکلنے کا راستہ عطا فرماتا ہے۔)

اس لحاظ سے یہ ایک نور ہے جو تاریک راستوں کو روشن کرتا اور الجھی ہوئی گتھیوں کو حل کرتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ فرقان ایک کسوٹی ہے۔ کسوٹی کا کام کھرے اور کھوٹے کو الگ کر کے بتاتا ہے۔ ایک مومن کے اندر ایک ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں ہر مرحلے پر کسوٹی کی طرح اس کو بتاتی ہے کہ تمہارے لئے کھرا کیا ہے اور کھوٹا کیا ہے، صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے، چنانچہ ایک مومن اپنی اس خداداد صلاحیت کی وجہ سے زندگی کے معاملات میں غلطی کرنے سے محفوظ رہتا ہے۔

ان دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے صاحبِ ایمان لوگ جب امت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو پھر ان کے اجتماعی فیصلے، باطل قوتوں سے ان کا تصادم اور مفسد طاقتوں سے ان کی لڑائی، بجائے خود فرقان بن جاتی ہے۔ ان کا وجود باقی امتوں کیلئے فرقان ہوتا ہے۔ ان کے کارنامے تاریخ کیلئے فرقان بن جاتے ہیں۔ ان کی جنگیں حق و باطل میں فرقان ہوتی ہیں۔ تاریخ ہمیشہ ان کے وجود اور ان کے کارناموں سے استدلال کرتی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں معلوم ہوتا ہے کہ یہی کچھ فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اپنے اندر تقویٰ کی صلاحیت پیدا کر لی تو ہم تمہارے اندر ایک ایسا نور روشن کر دیں گے جو کسوٹی کا کام دے گا اور تمہاری حیثیت دوسری قوموں کیلئے ایک مثال بن جائے گی اور تمہارے کارنامے حق و باطل کی تمیز میں منارۂ نور بن جائیں گے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اولاً تو تم سے کوتاہیاں ہوں گی نہیں اور اگر کہیں بشری تقاضوں سے کچھ فروگزاشتیں ہو ہی گئیں تو اللہ تعالیٰ ایسی فروگزاشتوں کو جھاڑ دے گا اور معاف کر دے گا کیونکہ اللہ بڑے فضل والا ہے لیکن اس کے فضل کے حصول کیلئے دل و دماغ میں تقویٰ کی فصل کاشت کرنی پڑتی ہے۔

وَ اِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ ؕ وَیَمْکُرُوْنَ وَ یَمْکُرُ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمٰکِرِیْنَ ۝

(اس وقت کو یاد کرو جب کافر تیرے خلاف تدبیر کر رہے تھے تا کہ وہ تجھے قید کر دیں یا تجھے قتل کر دیں یا تجھے ملک بدر کر دیں وہ بھی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔) (الانفال : ۳۰)

Marfat.com

اہلِ تقویٰ پر اللہ کے انعامات:

''مکر'' اردو زبان میں برے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی نسبت اللہ کی طرف دیکھ کر بعض لوگوں کو حیرانی ہوتی ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کا وہ مفہوم نہیں عربی زبان میں مکر اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور برے معنوں میں بھی۔ کوئی آدمی اگر کسی کو نقصان پہنچانے کیلئے کوئی تدبیر کرتا ہے تو وہ بھی مکر ہے ظاہر ہے کہ اسے برا ہی کہا جائے گا اور اگر دوسرا شخص اس کی تدبیر کو ناکام کرنے یا اس کے برے ارادوں کو واشگاف کرنے کیلئے کوئی تدبیر عمل میں لاتا ہے تو اسے بھی ہم مکر کہتے ہیں اور یہ یقیناً ایک اچھائی ہے۔ کافروں کا مکر اور تدبیر سراسر رسول اللہ ﷺ کو تکلیف پہنچانے اور اسلام کا راستہ روکنے کیلئے تھی لیکن اللہ کی تدبیر ان کی تمام تدبیروں کو ناکام کرنے کیلئے تھی۔

آنحضرت ﷺ کی ہجرت تاریخ کے آئینہ میں:

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کی بھنک جیسے ہی قریشِ مکہ کے کانوں میں پڑی تو انہیں آنے والے خطرات کا صحیح اندازہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ اب تک آنحضرت کی دعوت مکہ معظمہ تک محدود تھی ہم نے اپنی طاقت اور مخالفت سے اس کے تمام راستے بند کر دیئے تھے لیکن اب جبکہ اس کے اثرات مدینہ منورہ تک پہنچ گئے ہیں اور وہاں سے ایک معقول تعداد میں اشراف نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دے دی ہے اور اسی مقصد کی خاطر مسلمان رفتہ رفتہ مکہ سے غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ کو دار الہجرت قرار دے چکے ہیں۔ اب بھی اگر ہم نے آنحضرت ﷺ کو مزید مہلت دینے کی غلطی کی تو نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ کسی روز اچانک آنحضرت ﷺ ہماری بے خبری میں مدینہ منورہ پہنچ جائیں گے اور اس طرح انہیں ایک آزاد مرکز ہاتھ آ جائے گا جس کو بنیاد بنا کر ممکن ہے وہ ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں پھر ایک ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ وہ مکہ پر حملہ آور ہو کر مکہ فتح کر لیں۔

قریش ذہین لوگ تھے انہوں نے اپنی فراست سے ان تمام خطرات کا اندازہ کر لیا اور انہوں نے سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم کوئی ایسا فیصلہ کریں تا کہ یہ خطرہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو کر رہ جائے۔ چنانچہ انہوں نے تمام اشراف قریش کو دار الندوہ میں جمع ہونے کی دعوت دی۔ دار الندوہ کی عمارت قصی ابن کلاب نے حرم کے ساتھ تعمیر کی تھی۔ آج جہاں باب الزیادات ہے کہا جاتا ہے اسی جگہ پر وہ عمارت تھی۔ جب بھی قریش کو کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی عمارت میں مشاورت کیلئے جمع ہوتے تھے۔ چنانچہ اب بھی وہ جمع ہوئے اور آنحضرت ﷺ اور آپ کی دعوت کے استیصال کیلئے غور و فکر شروع کیا کہ اچانک دروازے پر ایک سفید ریش بزرگ نمودار ہوا جس کی شخصیت نہایت وجیہ اور مسحور کن تھی۔ وہ سلام کہہ کر آگے بڑھا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں نجد سے آیا ہوں اور وہاں کے ایک قبیلے کا رئیس ہوں۔ مجھے معلوم ہوا کہ آپ ایک اہم معاملے کا فیصلہ کرنے والے ہیں تو میں بھی اس لئے حاضر ہو گیا ہوں کہ شائد اس سلسلے میں میں بھی کوئی مشورہ دے سکوں۔ چنانچہ اشراف قریش نے بڑے احترام سے اس کا استقبال کیا اور اسے اپنے پہلو میں بٹھایا یہ آنے والا بزرگ درحقیقت ابلیس تھا جو انسانی شکل میں ان کی راہنمائی کیلئے آیا تھا۔ چنانچہ مشاورت کا آغاز ہوا تو سب سے پہلی تجویز جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ محمد (ﷺ) کو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر اور پاؤں میں زنجیریں ڈال کر ایک مکان میں بند کر دیا جائے تا آنکہ موت وہیں ان کا فیصلہ کر دے۔ ابلیس نے یہ سن کر کہا کہ یہ رائے کوئی مناسب رائے نہیں اس لئے کہ محمد (ﷺ) کے پیروکار جو ہجرت کر کے جا چکے ہیں انہیں جیسے ہی پتہ چلے گا کہ ان کے پیغمبر کو قید کر دیا گیا ہے تو وہ طاقت فراہم کر کے کوئی بھی موقعہ غنیمت دیکھ کر حملہ کریں گے اور آپ کو چھڑا کر لے جائیں گے۔ اس لئے کوئی اور تجویز سامنے لاؤ۔

دوسری تجویز یہ دی گئی کہ آپ کو ملک بدر کر دیا جائے، اس سے ہماری جان چھوٹ جائے گی وہ جہاں کہیں جائے گا تو وہاں کا اجنبی ماحول، اجنبی لوگ، خود ہی اس کا کام تمام کر دیں گے۔ ہم تو یہاں تیرہ سال تک قرابت داری کی وجہ سے کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے سے رکے رہے لیکن اجنبی لوگوں کیلئے ایسی کوئی دشواری نہیں ہو گی اور جہاں تک اس دین کی مخالفت کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ پورے عرب میں کوئی قبیلہ ایسا نہیں جو اس دعوت کو آسانی سے قبول

Marfat.com

کر سکتا ہو بلکہ وہ اپنے مذہب کی عصبیت میں ہم سے بھی آگے ہیں تو ان کیلئے اس قصے کا ختم کرنا اور اس کے داعی کا کام تمام کر دینا بڑی آسان بات ہوگی۔

لیکن ابلیس نے کہا کہ تمہاری یہ رائے بھی قابلِ عمل نہیں کیونکہ تم جانتے ہو کہ محمد (ﷺ) ایک دلآویز شخصیت کے مالک ہیں ان کی دعوت میں بلا کی تاثیر ہے وہ اپنے کردار و عمل میں بے پناہ اپیل رکھتے ہیں۔ ایسے شخص کیلئے اجنبی لوگوں اور اجنبی ماحول میں بھی اپنے ہم خیال تیار کر لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ ایک مختصر وقت میں ایک بڑی قوت فراہم کر کے تم پر چڑھ دوڑیں گے تو تمہارے پاس پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ کسی اور تدبیر پر غور کرنا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوجہل نے رائے دی کہ میرا خیال یہ ہے کہ عرب کے تمام معزز قبیلوں سے ایک ایک تنومند نوجوان جو تلوار کا دھنی ہو انتخاب کیا جائے۔ تمام قبیلوں کے نوجوان مل کر آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیں جیسے ہی موقعہ ملے ایک ساتھ تلواریں ان کے جسم میں پیوست کر دیں۔ اس طرح ہمیشہ کیلئے اس فتنے کا سدِ باب ہو جائے گا۔ ہماری اس مصیبت سے جان چھوٹ جائے گی اور قتل کی ذمہ داری بھی تمام قبائل پر تقسیم ہو جانے کے باعث کسی ایک قبیلے پر اس کا بوجھ نہیں پڑے گا۔ بنو عبد مناف جب دیکھیں گے کہ ہم سارے قبیلوں سے جنگ نہیں کر سکتے تو وہ بھی دیت لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ہم دیت ادا کر کے معاملے کو ختم کر دیں گے۔

ابلیس نے کہا یہ وہ رائے ہے جسے قابلِ عمل کہا جا سکتا ہے چنانچہ سب نے اس رائے پر اطمینان کا اظہار کیا اور طے پایا کہ پہلی فرصت میں نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے اور رات کو آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا جائے۔ چنانچہ جس دن یہ فیصلہ ہوا اسی روز آنحضرت ﷺ کو اللہ کی جانب سے اس کی اطلاع دے دی گئی اور آپ کو ہجرت کرنے کا حکم دے دیا گیا۔ اسی دن کی دوپہر کو آنحضرت ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے تاکہ ان کے ساتھ ہجرت کے سارے پروگرام اور مرحلے طے فرما لیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ٹھیک دوپہر کے وقت ہم لوگ اپنے مکان میں بیٹھے تھے کہ کسی کہنے والے نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سر ڈھانکے تشریف لا رہے ہیں یہ ایسا وقت تھا جس میں آپ تشریف نہیں لایا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ اس وقت کسی اہم معاملے ہی کی وجہ سے تشریف لائے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اجازت طلب کی۔ آپ کو اجازت دی گئی اور آپ اندر داخل ہوئے پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تمہارے پاس جو لوگ ہیں انہیں ہٹا دو۔ ابوبکر نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں آپ کے اہلِ خانہ ہی ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ مجھے اللہ کی طرف سے ہجرت کی اجازت مل گئی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو نہایت بے تابی سے پوچھا کہ میں بھی معیت کی عزت سے نوازا جاؤں گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔

ادھر قریش نے جن اکابر مجرمین کا انتخاب کیا ان کی تعداد گیارہ ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔

۱:۔ ابوجہل بن ہشام ۲:۔ حکم بن عاص، ۳:۔ عقبہ بن ابی معیط ۴:۔ نضر بن حارث، ۵:۔ امیہ بن خلف، ۶:۔ زمعہ بن اسود،

۷:۔ طعیمہ بن عدی، ۸:۔ ابولہب، ۹:۔ ابیّ ۱۰:۔ نبیہ بن الحجاج، ۱۱:۔ منبہ بن الحجاج

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب رات ذرا تاریک ہو گئی تو یہ لوگ گھات لگا نبی کریم ﷺ کے دروازے پر بیٹھ گئے کہ جیسے ہی آپ باہر نکلیں تو یہ لوگ آپ پر ٹوٹ پڑیں۔ ان لوگوں کو پختہ یقین تھا کہ ان کی یہ ناپاک سازش کامیاب ہو کر رہے گی۔

ادھر آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم میرے بستر پر لیٹ جاؤ اور میری یہ سبز حضرمی چادر اوڑھ کر سو رہو۔ تمہیں ان کے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ رسول اللہ ﷺ یہی چادر اوڑھ کر سویا کرتے تھے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لے آئے مشرکین کی صفیں چیرتے ہوئے نکلے ایک مٹھی سنگریزوں والی مٹی لے کر ان کے سروں پر ڈالی۔ لیکن اللہ نے ان کی نگاہیں پکڑ لیں وہ آپ کو دیکھ نہ سکے۔ اس وقت آپ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے۔

وجعلنا من بین ایدیھم سدا و من خلفھم سدا فاغشینا ھم فھم لا یبصرون

(ہم نے ان کے آگے رکاوٹ کھڑی کر دی اور ان کے پیچھے رکاوٹ کھڑی کر دی پس ہم نے انہیں ڈھانک لیا ہے اور وہ دیکھ نہیں رہے۔)

اس موقعہ پر کوئی بھی مشرک باقی نہ بچا جس کے سر پر آپ نے مٹی نہ ڈالی ہو اس کے بعد آپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے اور پھر ان کے مکان کی ایک کھڑکی سے نکل کر دونوں حضرات نے رات ہی رات یمن کا رخ کیا اور چند میل پر واقع ثور نامی پہاڑ کے ایک غار میں

Marfat.com

جا چھپے ادھر محاصرہ کرنے والوں کے پاس ایک غیر متعلق شخص آیا اور انہیں آپ کے دروازے پر دیکھ کر پوچھا کہ آپ لوگ کس کا انتظار کر رہے ہیں؟ انہوں نے کہا: محمد (ﷺ) کا۔ اس نے کہا آپ لوگ ناکام اور نامراد ہوئے۔ خدا کی قسم محمد (ﷺ) تو آپ لوگوں کے پاس سے گزرے اور آپ لوگوں کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے اپنا کام کر گئے۔ لیکن محاصرہ کرنے والوں کو یقین نہیں آیا، انہوں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ حضور کی چادر اوڑھ کر دلیٹے ہوئے تھے انہوں نے سمجھا کہ حضور لیٹے ہوئے ہیں صبح تک انتظار کرتے رہے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ بستر سے اٹھے تو مشرکین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

آنحضرت ﷺ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ غار ثور جا پہنچے۔ غار کے پاس پہنچ کر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا اللہ کیلئے ابھی آپ غار میں داخل نہ ہوں پہلے میں داخل ہو کر دیکھے لیتا ہوں اگر اس میں کوئی چیز ہوئی تو آپ کی بجائے مجھے اس سے سابقہ پیش آئے گا چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اندر داخل ہوئے، غار کو صاف کیا ایک جانب چند سوراخ تھے انہیں اپنی چادر پھاڑ کر بند کیا لیکن دو سوراخ باقی بچے رہے۔ ان دونوں پر حضرت ابو بکر نے اپنے پاؤں رکھ دیئے۔ پھر رسول اللہ سے عرض کی کہ اندر تشریف لائیں آپ اندر تشریف لے گئے اور حضرت ابو بکر کی آغوش میں سر رکھ کر سو گئے۔ ادھر ابو بکر کے پاؤں میں کسی چیز نے ڈس لیا مگر اس ڈر سے ہلے بھی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ جاگ نہ جائیں۔ لیکن ان کے آنسو رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر ٹپک گئے اور آپ کی آنکھ کھل گئی۔ آپ نے فرمایا: ابو بکر تمہیں کیا ہوا؟ عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے کسی چیز نے ڈس لیا ہے۔ رسول اللہ نے اس پر لعاب دہن لگا دیا اور تکلیف جاتی رہی۔

قریش کو جیسے ہی اپنی ناکامی کا احساس ہوا انہوں نے آپ کی گرفتاری کیلئے چاروں طرف تعاقب کرنے والے دوڑا دیئے اور اعلان کیا کہ جو ان میں سے کسی ایک کو زندہ یا مردہ حاضر کرے گا اسے ہر ایک کے بدلے سو اونٹوں کا گراں قدر انعام دیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ تلاش کرنے والے غار کے دھانے تک پہنچ گئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ غار میں تھا سر اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لوگوں کے پاؤں نظر آرہے ہیں میں نے کہا: اے اللہ کے نبی! اگر ان میں سے کوئی شخص محض اپنی نگاہ نیچی کردے تو ہمیں دیکھ لے گا۔ آپ نے فرمایا: "ابو بکر خاموش رہو ہم دو ہیں جن کا تیسرا اللہ ہے"۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ماظنک یاابا بکر باثنین اللہ ثالثھما (ابو بکر ایسے دو آدمیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ ہے۔)

مختصر یہ کہ تین دن کے بعد حضور غار سے نکلے۔ راہنما کی نگرانی میں ساحل کا راستہ اختیار کیا مختلف راستوں سے بچتے ہوئے اور اجنبی راستوں سے گزرتے ہوئے دوشنبہ ۸ ربیع الاول ۱۴ سنِ نبوی مطابق 23 ستمبر 622 عیسوی کو قبا میں وارد ہوئے۔

کفار قریش کی آپ کے بارے میں منصوبہ بندی اور آنحضرت کا سفرِ ہجرت دونوں کو واقعات کے آئینہ میں دیکھیں صاف نظر آتا ہے کہ قریش نے ایک مکر کیا یعنی حضور کی جان لینے کی کوشش کی اور وہ تمام ممکن کوششیں پایۂ تکمیل کو پہنچا دیں جس کو دیکھتے ہوئے آپ کے زندہ رہنے کے امکانات صفر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں ایک مکر اللہ نے کیا یعنی اللہ نے قریش کے مکر اور تدبیر کو ناکام کرنے کی تدبیر کی۔ جس کے نتیجے میں ان کی تمام یقینی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور اللہ کے نبی بخیریت تمام ان کی منصوبہ بندی کے جال کو توڑتے ہوئے اور ان کی سازشوں کو ناکام کرتے ہوئے منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ قریش اگرچہ آنحضرت کے بچ کے نکل جانے سے سخت برہم تھے لیکن ایک ان کو اطمینان بھی تھا کہ ان کے پہلو کا کانٹا نکل گیا اور وہ امید کرتے تھے کہ اجنبی ماحول میں آپ کی دعوت خود اپنی موت مر جائے گی۔ لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ اب تک سورج گہن میں تھا اب وہ گہن سے نکل آیا ہے اور پوری آب و تاب سے مدینہ کے افق پر جگمگانے لگا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے نکل جانے سے قریش کے جسدِ قومی کی روح نکل گئی۔ اس کی ذات سے انہیں جو ایک تحفظ حاصل تھا وہ تحفظ اٹھ گیا۔

گزشتہ آیتِ کریمہ میں تمام کامیابیوں کی کلید تقویٰ کو ٹھہرایا گیا ہے اور یہ آیت اس کی سب سے بڑی دلیل ہے کیونکہ متقیوں کے امام آنحضرت ﷺ ہیں۔ ان کی زندگی سرتاپا تقویٰ سے عبارت ہے چنانچہ ان کو مشکل ترین حالات میں جس طرح اللہ نے محفوظ رکھا اور کامیابیوں سے نوازا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے اور اس کے راستے پر چلنے والے اور اپنا تن من دھن اسی کے سپرد کر دینے والے چاہے ہزاروں مشکلات میں بھی گھر جائیں اللہ کبھی ان کو بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ وہ اس طرح ان کی مدد کرتا ہے کہ دشمن کی منصوبہ بندیاں دھری رہ جاتی ہیں۔

Marfat.com

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ O

(اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں بس سن لیا اگر ہم چاہیں ہم بھی ایسا کلام پیش کر دیں یہ تو بس اگلوں کی کہانیاں ہیں۔) (الانفال: ۳۱)

قریش کا اسلام سے متعلق عام رویہ:

گزشتہ آیتِ کریمہ میں کافروں نے جس طرح آنحضرت ﷺ کی جان لینے اور اسلامی دعوت کو فنا کرنے کی تدبیر کی اور اللہ نے جس طرح اسے ناکام بنایا اس کا تذکرہ ہم نے پڑھا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ قریش نے اس آخری منصوبہ بندی سے پہلے بھی کوئی تدبیر ایسی نہیں چھوڑی جس سے اسلامی دعوت کو ناکام کیا جاسکتا ہو اور قریش نے اسے بروئے کار لانے کی کوشش نہ کی ہو۔ آنحضرت ﷺ جب اپنی دعوت کے مبادی کا ذکر اور بنیادی عقائد کی وضاحت فرماتے تو اس کی تائید میں جستہ جستہ انبیائے کرام کی دعوت کا ذکر بھی ضرور فرماتے۔ اسی طرح جب قریش کو ان کے انجام سے باخبر کرنے کیلئے تنبیہ فرماتے تو سابقہ انبیائے کرام کی امتوں پر آئے ہوئے عذابوں کا ذکر بھی کرتے۔ مقصود صرف یہ ہوتا کہ قریش آنحضرت ﷺ کی دعوت کو کوئی نئی بات یا اجنبی خیال نہ کریں اور جب سابقہ امتوں پر عذاب کا ذکر کرتے تو مقصد یہ تھا کہ انہیں اس بات کا یقین آجائے کہ ہم کوئی سابقہ امتوں سے کوئی مختلف امت نہیں ہیں اگر ہم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اللہ کا عذاب ہم پر بھی اتر سکتا ہے۔ لیکن قریش کے بگڑے ہوئے سردار بجائے اس سے اثر قبول کرنے کے مذاق اڑاتے انبیائے کرام کی عبرت آموز اور پر از حکمت دعوت اور حالات زندگی کو گزشتہ لوگوں کے قصے کہانیوں سے تعبیر کرتے اور لوگوں کو یہ تصور دیتے کہ کہانیاں تو ہمیشہ دل بہلانے کیلئے ہوتی ہیں ہم تمہیں اس سے بہتر کہانیاں سنا سکتے ہیں۔ قریش کا ایک سربرآوردہ آدمی نضر بن حارث جو اپنی تجارت کے سلسلے میں ملکوں ملکوں گھومتا اور مختلف قوموں کے حالات سے آشنا تھا وہ وہاں سے بطورِ خاص ایسی دلچسپ کہانیاں خرید کر لاتا تا کہ قرآنِ کریم کے مقابلے میں انہیں لوگوں کو سنایا جاسکے۔ اس لئے جب بھی اس کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تو وہ اپنی لائی ہوئی کہانیوں کو سنانا شروع کر دیتا اور قرآنِ کریم کو بھی کہانیوں پر مشتمل کتاب قرار دیتا اور یہ دعویٰ کرتا کہ میں اگر چاہوں تو اس سے بہتر کہانیاں لکھ سکتا ہوں۔ اندازہ کیجئے کہ اللہ کی آخری کتاب جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں نہیں اور عرب اپنی ساری کاوشوں کے باوجود اس کی ایک سورۃ کا جواب نہ لاسکے اور اس کتاب کے پیش کرنے والے کی دلآویز شخصیت اور اس کا ہر عیب سے پاک کردار جس پر قریش کبھی کوئی چھینٹا نہ اڑا سکے ان کو دیکھتے ہوئے بھی جو شخص یا قریش کے سربرآوردہ لوگ اس طرح کی باتیں کریں تو ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل نہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں انتہائی جسارتوں کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اس کے دین کے بارے میں اس حد تک دلیر ہو چکے ہیں کہ انہیں کوئی بات کہتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے نہ اللہ کے عذاب کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں ان کی ایسی ہی حد سے بڑھی ہوئی جسارت کا حوالہ دیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ O

(اور یاد کرو! جب انہوں نے کہا کہ اے اللہ! اگر یہی حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی دردناک عذاب لا۔) (الانفال: ۳۲)

جسارت کی انتہا:

کفار کے اس مطالبے کو دیکھئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کفر میں ہر حد سے گزر چکے تھے اور ان کی جسارت کا عالم یہ تھا کہ وہ اللہ کو چیلنج کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ انہوں نے سالوں تک اللہ کے دین کا مذاق اڑایا رسول اللہ ﷺ کی توہین کی اور صحابہ کرام کو انتہائی ایذا رسانی کا نشانہ بنایا لیکن پروردگار نے بار بار ان کو مہلت دی، بار بار انہیں سنبھلنے کا موقعہ دیا، کبھی ترغیب سے کام لیا کبھی ترہیب سے، اس سے انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ

Marfat.com

عذاب کی باتیں محض ڈراوے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں اگر عذاب کو آنا ہوتا تو کبھی کا آ چکا ہوتا یہ ایسا جہاز ہے جو کہیں بھی لنگر انداز ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اسی تصور کے تحت انہوں نے یہ انتہائی مطالبہ کر ڈالا۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں پروردگار نے اس عقدہ سے نقاب اٹھایا ہے کہ ہم نے آج تک قریش پر عذاب کیوں نہیں نازل کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی ان پر واضح کی ہے کہ جس ذاتِ عزیز کی تم توہین کی جرأت کر گزرتے ہو تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ ان کا مقام و مرتبہ کیا ہے اور پروردگار کو وہ کس حد تک عزیز ہیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝

(اور اللہ ہرگز ان کو عذاب دینے والا نہ تھا جب تک آپ ان میں تھے اور اللہ ان کو عذاب دینے کا روادار نہیں ہو سکتا ہے جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے ۝) (الانفال : ۳۳)

عذاب نہ دینے کے دو سبب:

قریش کا یہ سمجھنا کہ چونکہ اللہ کی طرف سے اب تک عذاب نہیں آیا ہے حالانکہ پیغمبر نے انہیں بار بار تنبیہ کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عذاب آنے کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے پروردگار نے اپنی ایک سنت ذکر فرمائی ہے۔ اللہ کی سنت اور قانون یہ ہے کہ جب تک اللہ کا رسول اپنی قوم میں موجود ہوتا ہے اس کی حیثیت قوم میں ایک سپر اور ڈھال کی ہوتی ہے۔ قوم کے کرتوت اللہ کے عذاب کو دعوت دیتے ہیں لیکن پیغمبر کی ذات اور اس کا استغفار اس عذاب کو اترنے نہیں دیتا چنانچہ اب تک جو قریش پر اللہ کا عذاب آنے سے رکا رہا ہے تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی مکہ معظمہ میں موجود تھی۔ لیکن اب جبکہ آپ نے ہجرت فرمائی ہے تو قریش اپنے تحفظ سے محروم ہو گئے ہیں وہ ایک ایسا جسد ہیں جن کے اندر سے روح نکل گئی ہے۔ کسی وقت بھی اللہ کے عذاب کا کوڑا ان پر برس سکتا ہے۔ قریش نے جس طرح آنحضرت ﷺ کی زندگی دشوار کر کے اور قتل کا منصوبہ بنا کر آپ کو ہجرت پر مجبور کیا اس سے انہوں نے ہر طرح سے اپنے آپ کو غیر محفوظ کر لیا۔ وہ امان اور سپر اٹھ گئی اور وہ روح نکل گئی جس سے انہیں زندگی میسر تھی۔ لیکن ان کی خوش قسمتی کہہ لیجئے کہ اللہ کے ایک اور قانون نے ان کو کسی حد تک تحفظ دیا۔ عذاب کے جھٹکے آئے لیکن مکمل تباہی سے محفوظ رہے۔ جنگِ بدر عذاب ہی کی ایک شکل تھی، ایک جھٹکا دیا گیا جس نے ان کی قومی قیادت کی پہلی صف لپیٹ دی اور وہ تمام سردار اپنے انجام کو پہنچ گئے جو آج تک اسلام کے راستے کی سب بڑی رکاوٹ تھے۔ باقی رہ جانے والوں کو چند سال کی زندگی اس لئے مل گئی کہ مکہ کے لوگوں نے اندر ہی اندر اسلام سے تعلق قائم رکھا اور ان کی ایک محدود تعداد در پردہ مسلمان ہو گئی۔ وسائل کی نایابی کے باعث وہ ہجرت تو نہ کر سکے لیکن مسلسل اپنے استغفار اور اپنی عبادتوں سے مکہ پر اللہ کے عذاب کے اترنے کے راستے میں حائل رہے کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ

(اللہ ان کو ہرگز عذاب دینے والا نہیں اس حال میں کہ ان کے اندر استغفار کرنے والے موجود ہیں۔)

معاہدہ حدیبیہ میں قریش جب یہ شرط منوانے میں کامیاب رہے کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ پہنچے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ چنانچہ ابو بصیر مسلمان ہو کر مدینہ پہنچے لیکن آنحضرت ﷺ نے معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے انہیں واپس کر دیا۔ وہ ساحلِ سمندر پر جا بیٹھے چند مہینوں کے اندر اندر ستر (۷۰) کی تعداد میں مسلمان جو مکہ میں چھپے ہوئے تھے موقعہ ملنے پر ان کے پاس پہنچ گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ مکہ نے مکمل طور پر اسلامی دعوت کو دیس نکالا نہیں دیا کیونکہ ان ستر کے علاوہ بھی ایسے لوگ مکہ میں موجود تھے جو مسلمان تھے لیکن نکلنے کا راستہ نہیں پا رہے تھے۔ چنانچہ انہیں لوگوں کے استغفار نے اہلِ مکہ کو اللہ کے عذاب سے بچائے رکھا۔ حق و باطل کے معرکوں میں جو لوگ حق سے ٹکراتے رہے وہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوتے رہے لیکن مجموعی طور پر استغفار کرنے والوں کی برکت سے اللہ نے انہیں عذاب کا نشانہ نہیں بنایا۔

Marfat.com

آج امتِ مسلمہ کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ ہم نے جس طرح اللہ کے قانون کو پورے عالم اسلام میں یتیم بنا دیا ہے اور کسی ایک مسلمان ملک میں بھی اسے حاکمانہ اقتدار حاصل نہیں وہ عام مسلمانوں کا عقیدہ تو ہے لیکن اسے دین کے طور پر اختیار کرنے اور پھر زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے سے جس طرح ہم نے گریز کیا ہے یہ ایسا جرم ہے جس کے نتیجے میں کسی وقت بھی اللہ کا عذاب آ سکتا ہے اور پھر ہماری جسارتوں کی یہی انتہا نہیں بلکہ ہم نے تو مخلص اور وفا شعار مسلمانوں کا جینا اپنے ملکوں میں مشکل کر دیا ہے۔ جس دین نے انسان کو عزت و حرمت عطا کی وہی دین آج انسانوں کی بے بسی کا حوالہ بن گیا ہے۔ آج ہمارے کندھے کفر کیلئے استعمال ہو رہے ہیں ہمارے وسائل مسلمانوں کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ہم غیر مسلم قوتوں کے ہاتھوں بالکل مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں چونکہ اس پوری صورتحال کے ہم خود ذمہ دار ہیں اس کا نتیجہ لازماً یہ ہونا چاہئے تھا کہ اس امت کی بڑی تعداد اللہ کے عذاب ہاتھوں تباہ ہو جاتی۔ لیکن جس چیز نے ہمیں پناہ دے رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہم اللہ کے عذاب کا نشانہ بننے سے بچے ہوئے ہیں، وہ دینی مدارس ہیں جن کے اندر ابھی تک یتیم اور مسکین بچے اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے حصول میں شب و روز لگے ہوئے ہیں۔ وہ مساجد ہیں جہاں اللہ کا ذکر ہوتا اور اس کی عبادت ہوتی ہے۔ وہ خانقاہیں ہیں جہاں ابھی تک آہِ سحرگاہی کی دولت سے مالا مال لوگ موجود ہیں۔ انہی لوگوں کا استغفار، دین سے گہری محبت اور دین کیلئے بے پناہ تڑپ، وہ سائبان ہے جس کے سائے میں امت اجتماعی عذاب سے بچی ہوئی ہے۔ آخرت میں تو سب کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہے لیکن دنیا میں اجتماعی عذاب سے بچاؤ کی یہی پناہ گاہیں ہیں جنہیں ہم نے اپنے ہاتھوں مسمار کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ کس سے یہ بات کہی جائے:

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تم نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہوگی

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

(اور ان میں کیا بات ہے کہ اللہ انہیں عذاب نہ دے؟ جبکہ وہ مسجدِ حرام سے روکتے ہیں حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں۔ اس کے متولی تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر اس حقیقت سے واقف نہیں ○) (الانفال: ۳۴)

کعبہ کی تولیت کے حقدار متقی لوگ ہیں، قریش جیسے لوگ نہیں:

اللہ کو ماننے والی یا کسی بھی مذہب کی پرستار قومیں جب بگڑتی ہیں تو وہ اللہ کے دین اس کے احکام اور اس کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کو بالائے طاق رکھ دیتی ہیں اور خانہ ساز قسم کی چند مذہبی رسوم کو مکمل مذہب قرار دے کر اور اللہ سے اپنی چند نسبتیں اختراع کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتی ہیں اور یہ یقین کر لیتی ہیں کہ ہماری زندگی کا یہ رویہ اور اللہ سے ہماری نسبتیں ہمارا وہ سرمایہ ہیں جس کی موجودگی میں ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی نوازشات ہمارے ساتھ ہیں اس کی رحمتیں ہمارے ہی لیے ہیں اور آخرت میں بھی ہم اس کی نعمتوں سے سرافراز کیئے جائیں گے۔

قریش نے بھی ایسی ہی چند مذہبی رسوم اور اللہ سے چند تعلق کی بنیادوں کو اپنے لئے وجہِ اختصاص بنا رکھا تھا اور وہ مطمئن تھے کہ ہمیں اللہ کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔ وہ اپنا سب سے بڑا امتیاز یہ سمجھتے تھے کہ ہم خانہ کعبہ کے متولی ہیں، رفادہ اور اسقایا کی خدمتیں انجام دینے والے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اللہ کے گھر کے سائے میں رہتے ہیں اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کی حفاظت میں آباد ہیں۔ ایسی صورت میں اللہ کا عذاب ہمیں کیسے چھو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں کوئی حسب نسب نہیں چلتا بلکہ وہاں ایمان و عمل کا سکہ چلتا ہے۔ اس لحاظ سے تم نے کبھی غور کیا ہے کہ تمہارے اندر ایسی کون سی خصوصیت ہے جو تمہیں اللہ کے عذاب سے بچانے کی ضمانت دے سکتی ہو۔ تم اپنا سب سے بڑا امتیاز مسجدِ حرام سے وابستگی کو سمجھتے ہو اور حال تمہارا یہ ہے کہ تم لوگوں کو مسجدِ حرام آنے سے روکتے ہو تم نے اپنے آپ کو اللہ کے گھر

Marfat.com

کا متولی سمجھ رکھا ہے حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ اللہ کے گھر کے متولی اللہ سے ڈرنے والے اس کی عبادت کرنے والے اور اس دین کے پیروکار ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام لے کر آئے تھے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب امامت کے منصب پر سرفراز کرنے کا وعدہ فرمایا گیا تھا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا تھا کہ "کیا یہ منصب میری ذریت کو بھی حاصل رہے گا؟" تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا:

لاینال عھدی الظالمین (میرا یہ عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔)

اس کے مستحق صرف صالحین ہوں گے اور صالحین وہ ہوں گے جو حضرت ابراہیم کے طریقے پر چلنے والے اور ان کی پیروی کرنے والے ہوں گے۔ تم نے حضرت ابراہیم کی پیروی تو کیا کرنا تھی تم نے تو اس گھر کی روایت تک بدل کر رکھ دی۔ اس گھر کو جس مقصد کیلئے بنایا گیا تھا وہ مقصد تم نے فراموش کر دیا۔ یہ اللہ کی توحید کا مرکز تھا تم نے تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت لا کر یہاں بٹھا دیئے۔ ایسی صورتحال میں تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمہیں اللہ کا عذاب نہیں چھو سکتا؟ تمہارے کرتوت تو اللہ کے عذاب کو ہر وقت دعوت دے رہے ہیں۔ اگر تمہارے اندر اللہ کے رسول نہ ہوتے اور اب ان کے بعد در پردہ ایمان لانے والے کمزور مسلمان نہ ہوتے تو تم ہر لحاظ سے اس کے مستحق تھے کہ اللہ کے عذاب کا کوڑا تم پر برستا۔ لیکن تم میں سے اکثر کو کچھ خبر ہی نہیں کہ جس گھر کے متولی ہونے کا تم دعویٰ کرتے ہیں اس گھر کے بنانے والے نے بناتے ہوئے اللہ سے کیا التجائیں کی تھیں؟ حضرت ابراہیم اس سرزمین پر کیوں تشریف لائے تھے؟ ان کی دعوت کیا تھی؟ وہ جس ملت کے داعی ہوئے اس کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو انہوں نے یہاں کیوں بسایا تھا؟ تم نے اللہ کے اس گھر کی حیثیت بدل کر اسے قومی معبد بنا دیا جس کی کلید برداری اور اس کے مختلف شعبوں کی سربراہی وراثت کے طور پر مختلف خاندانوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اور تم آبائی جاگیر کی طرح اس پر فخر کرتے ہو۔ تمہاری یہ مجرمانہ حرکتیں تو اس قابل ہیں کہ تم پر اللہ کی طرف سے پتھر برسیں لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم اپنے ان کرتوتوں کے باوصف اس کے متولی ہونے کے دعویدار ہو۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ (الانفال : ۳۵)

(نہیں ہے ان کی نماز بیت اللہ کے پاس مگر سیٹی بجانا اور تالیاں پیٹنا تو اب چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں ۝)

تمہاری بے خبری کا عالم تو یہ ہے کہ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا کیا دعائیں مانگی تھیں اور اس میں بطور خاص اقامتِ صلوٰۃ کی جو دعا مانگی تھی اس کی شکل و صورت اور اس کا مفہوم کیا تھا؟ قرآن کریم نے سورۂ ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چند دعاؤں کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراھیم: ۳۵ تا ۳۷)

(اور یاد کرو! جب ابراہیم نے دعا کی اے میرے رب! اس سرزمین کو پرامن سرزمین بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھ ۝ اے میرے رب! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کر رکھا ہے سو جو میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو غفور رحیم ہے ۝ اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولادوں میں سے کچھ کو تیرے محترم گھر کے پاس ایک بن کھیتی کی سرزمین میں بسایا ہے۔ اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز کا اہتمام کریں پس تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر اور ان کو پھلوں کی روزی عطا فرما تاکہ وہ تیرے شکرگزار رہوں۔)

Marfat.com

اس دعا کو غور سے پڑھئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل کو کس مقصد کیلئے مکہ معظمہ بسایا تھا اور انہوں نے اپنی اولاد کیلئے کیا دعائیں مانگی تھیں۔ ربنا لیقیموا الصلوٰۃ کے الفاظ سے بطورِ خاص معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کو عبادت کا مرکز بنایا گیا تھا اور حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد کو اس گھر کے پڑوس میں بسانے سے اصل مدعا نماز کا اہتمام و قیام تھا۔ لیکن قریش نے جس طرح بیت اللہ کو توحید کا مرکز بنانے کی بجائے بت خانہ بنا کر رکھ دیا اسی طرح جس نماز کی خاطر انہیں یہاں بسایا گیا تھا اس کی صرف شکل ہی نہیں بگاڑی بلکہ اسے کھیل تماشے میں بدل ڈالا۔

مُکَآءً کا معنی ہے "منہ سے سیٹی بجانا"۔ تَصْدِیَۃً کا معنی ہے "تالی پیٹنا"۔ یہ لوگ بیت اللہ کے پاس سیٹیاں بجاتے تالیاں پیٹتے اور اس مسخرہ پن کو نماز سمجھتے۔ جس قوم کو عبادت کا ذرا سا بھی تصور میسر ہو وہ کم از کم اسے ایسی شکل تو نہیں دے سکتی جسے دیکھنے والا کھیل تماشا سمجھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قومیں جب نفسانیت کا شکار ہوتی ہیں اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متانت رخصت ہو جاتی ہے تو جس طرح وہ عام زندگی میں میلوں ٹھیلوں کی رسیا ہو جاتی ہیں اور ہر وقت یہ چاہتی ہیں کہ ان کی نفسانی خواہشات اور سفلی جذبات کی تسکین کا سامان ہوتا رہے اسی طرح وہ اپنے مذہب کو بھی بگاڑ کر اسی ڈھب میں لے آتی ہیں۔ عیسائیوں نے جس طرح اپنے عبادت خانوں میں گھنٹے بجانے کی رسم ڈالی اور ہندوؤں نے بھجن گانے کے ساتھ ساتھ دوشیزاؤں کے رقص کو عبادت کا حصہ بنایا اور مسلمانوں نے تعزیہ داری کی رسوم، مزاروں پر ہونے والی خرافات اور ذکر اللہ کی مجلسوں میں ناچ اور بھنگڑا، اسی بگڑے ہوئے ذوق کی علامتیں ہیں۔ قریش چونکہ اپنے بگاڑ میں حیوانی سطح تک اتر چکے تھے انہوں نے نماز جو اللہ کے ساتھ قرب اور تعلق کا سب سے اہم ذریعہ ہے کو بگاڑ کر ایسی شکل میں تبدیل کر دیا جس سے کبھی وہم بھی نہیں ہو سکتا کہ ایسی چیز کبھی نماز رہی ہوگی۔ تو ایسی قوم جنہوں نے اللہ کے گھر کی ہیئت بدل ڈالی روایات پامال کر دیں، تاریخ مسخ کر دی، مقاصد تبدیل کر دیئے، بیت اللہ کی بجائے قومی معبد کی شکل دے دی اور عبادت اور نماز کو سیٹی اور تالیوں میں تبدیل کر دیا ان کا انجام عذاب کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس لئے پروردگار نے براہِ راست ان سے خطاب کر کے فرمایا کہ تم اب بگاڑ کی جس انتہا کو پہنچ گئے ہو کہ اب اس کی پاداش میں اللہ کا عذاب چکھنے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ اس عذاب کا پہلا تھپڑ تو میدانِ بدر میں انہیں مارا گیا اور آئندہ کیلئے انہیں وارننگ دی گئی کہ اگر تم نے اپنے آپ کو نہ بدلا تو پھر ایسے ہی اور تھپڑ لگیں گے اور بالآخر تمہاری ہر حیثیت تباہ کر دی جائے گی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَیُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَیْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ یُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ یُحْشَرُوْنَ ۙ لِیَمِیْزَ اللّٰهُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَیَجْعَلَ الْخَبِیْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَیَرْكُمَهٗ جَمِیْعًا فَیَجْعَلَهٗ فِیْ جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۠

(بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے وہ اپنے مال خرچ کر رہے ہیں تاکہ وہ اللہ کے راستے سے روکیں سو بھی وہ اور خرچ کریں گے پھر یہ ان کیلئے سرمایہ حسرت بنیں گے اور آخر مغلوب ہوں گے اور یہ کافر جمع کر کے جہنم کی طرف ہنکائے جائیں گے ○ تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے جدا کر دے اور رکھے ناپاک کو ایک کو ایک پر اور پھر اس کو ڈھیر کر دے اکٹھا پھر اس کو جہنم میں جھونک دے یہی لوگ نامراد ہونے والے ہیں۔) (الانفال: ۳۶ تا ۳۷)

کفار کی زرپاشیاں بھی اسلامی انقلاب کو روک نہ سکیں گی:

ہم نے گزشتہ آیات میں دیکھا ہے کہ کفار کی جسارتیں اور اسلام سے عداوتیں اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ اللہ کا رسول جو دنیا میں اللہ کا نمائندہ اور انسانیت کا شاہکار ہوتا ہے، اسے قتل کرنے کی تدبیریں کی گئیں۔ قرآن کریم جو اللہ کا اہلِ زمین کیلئے پیغام ہے اس کا مذاق اڑایا گیا اور جب انہیں تنبیہ کی گئی تو منہ پھاڑ کر یہاں تک کہہ ڈالا کہ اگر یہ دین اللہ کی جانب سے ہے تو ہم بجائے اسے قبول کرنے کے اس بات کو ترجیح دیں گے کہ ہم پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں۔ نماز جو عبد اور معبود کے درمیان رابطہ کی سب اہم صورت ہے اسے کھیل تماشہ بنا دیا گیا۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر اپنے آخری داؤ کھیلنے کیلئے تیار ہو چکا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے کی ایک بات اس آیتِ کریمہ میں فرمائی گئی ہے کہ کسی بھی ضابطۂ حیات طرزِ زندگی اور انقلابی فکر کو

Marfat.com

ناکام کرنے کیلئے دو ہی چیزیں ضروری ہوتی ہیں ایک یہ کہ مخالفین اپنی افرادی قوت کو اسے روکنے پر لگا دیں اور دوسری یہ کہ اپنی تجوریوں کا منہ اپنی مخالفت اور عناد کو مستحکم کرنے کیلئے کھول دیں۔ چنانچہ کفر نے افرادی قوت کے ساتھ ساتھ مالی قوت کو بھی مکمل طور پر اس راستے پر لگا دیا ہے۔ جب وہ لوگ میدان بدر میں ہمیشہ کیلئے اسلامی قوت کو کچلنے کے لئے آئے تھے تو مکہ کی پوری طاقت میدان میں آگئی تھی اور ساتھ ساتھ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ان کے سرداروں میں سے ایک ایک آدمی ایک ہزار کے لشکر کو تنہا کھانا کھلاتا اور اس کی جنگی ضرورتیں پوری کرتا تھا۔ لیکن نہ ان کی قوت کام آئی اور نہ ان کی زر پاشیاں کام آئیں۔ ان کی قیادت کی پہلی صف اس طرح ڈھیر ہوئی کہ ایک اندھا کنواں ان کا مدفن بنا اور ان کا تمام سرمایہ خود اپنی موت کا ذریعہ بن گیا۔ لیکن ابھی تک ان میں کس بل باقی تھا۔ وہ اتنا نقصان اٹھا کر بھی اپنی دشمنی اور رعونت سے باز آنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ جن لوگوں کے عزیز جنگِ بدر میں مارے گئے انہوں نے اکٹھے ہو کر ابو سفیان سے درخواست کی کہ تم جو ایک بڑا قافلہ تجارت لے کر ملکِ شام گئے تھے اور وہاں سے تم بہت کچھ کما کر واپس آئے ہو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس قافلہ تجارت کا سارا منافع آئندہ جنگ کی تیاری اور مسلمانوں کے استیصال پر صرف کر دیا جائے۔ اس آیت میں فرمایا گیا کہ یہ لوگ پہلے بھی خرچ کر کے اس کا انجام دیکھ چکے ہیں۔ یہ آئندہ بھی خرچ کریں گے اور تم دیکھو گے کہ آئندہ کا سارا خرچ کیا ہوا مال حسبِ سابق ان کیلئے سرمایۂ حسرت بن جائے گا۔ یہ جس طرح اپنے مقتولوں پر روئیں گے اسی طرح اپنے مال و دولت کے ضائع ہونے پر بھی آنسو بہائیں گے۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی ساری کاوشیں اس طوفان کو روک نہیں سکیں گی جو اسلام کے نام پر آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ اپنی تمام انسانیت دشمن کارروائیوں سے اس چشمۂ صافی سے لوگوں کو زیادہ دیر تک دور رکھنے میں کامیاب نہیں ہوں گے جس چشمہ کا ایک ایک قطرہ آبِ حیات کا حکم رکھتا ہے بلکہ ان کا اپنا انجام یہ ہوگا کہ دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں انہیں جہنم کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا اور وہاں اس فرقان کا پوری طرح ظہور ہوگا جو مسلمانوں کا اصل سرمایہ ہے۔ وہاں خبیث کو طیب سے الگ کر دیا جائے گا۔ ہر کافر خبیث ہے اور ہر مومن طیب ہے۔ طیب طیب جگہ میں یعنی جنت میں رکھے جائیں گے اور ان تمام خبثاء کو ایک دوسرے پر تہہ بہ تہہ ڈھیر کر دیا جائے گا۔ رَکَمَ کا معنی کسی شے کو ایک دوسرے پر تہہ بہ تہہ ڈھیر کرنا ہے۔ کوڑے کرکٹ کو جلانا ہو تو سارا کوڑا جمع کر کے تہہ بہ تہہ ڈھیر کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کو آگ دکھا دی جاتی ہے۔ تہہ بہ تہہ جمع کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آگ زیادہ مقدار میں ایندھن دستیاب ہونے کی وجہ سے پوری قوت سے بڑھکتی ہے اور جمع شدہ انبار کا ہر حصہ دوسرے حصے کو جلانے میں مددگار بن جاتا ہے۔ اہلِ کفر نے جس طرح اسلام کا راستہ روکنے میں ایک دوسرے کی مدد اور پشت پناہی کی ہے اسی طرح جہنم میں یہ ایک دوسرے کو جلانے میں معاون ثابت ہوں گے۔ لاشیں ایندھن کی طرح جلیں گی اور ہر لاش دوسرے کو جلانے کا کام دے گی۔ اس وقت انہیں اندازہ ہوگا کہ قرآن کریم نے اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ فرما کر انہیں کس انجام کی خبر دی تھی۔ لیکن اس وقت کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ
كَفَرُوْٓا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ
وَاِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ
حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ
انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا

Marfat.com

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝٤٠

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ

وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ
كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٤١ اِذْ اَنْتُمْ
بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ
مِنْكُمْ ۭ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ
اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ڏ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّ
يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝٤٢ اِذْ
يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ۭ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَ
لَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ
الصُّدُوْرِ ۝٤٣ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا
وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَ
اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝٤٤ ع

کہہ دیجئے! ان کفر کرنے والوں سے کہ اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے معاف کر دیا جائے گا اور وہ پہلا رویہ ہی جاری رکھیں تو پہلوں کے بارے میں سنتِ الٰہی گزر چکی ہے۔ ان سے جنگ کرو تا کہ آنکہ فتنہ باقی نہ رہے اور سارا دین اللہ کا ہو جائے، پس اگر وہ باز آجائیں تو اللہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر انہوں نے روگردانی کی تو خوب جان لو کہ اللہ تمہارا مولا ہے کیا ہی خوب مولا ہے اور کیا ہی اچھا مددگار۔ اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں غنیمت ملے تو بیشک اس کا خمس اللہ کیلئے ہے اور رسول کیلئے ہے اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کیلئے ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر ہم نے اپنے

Marfat.com

بندے پر اتاری فیصلہ کے دن جس دن بھڑ گئیں دونوں جماعتیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یاد کرو! جب تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اگر تم آپس میں میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو میعاد پر پہنچنے میں ضرور تم مختلف ہو جاتے لیکن اللہ کو کر ڈالنا تھا ایک کام جو مقرر ہو چکا تھا تا کہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنا ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ یاد کرو! جب اللہ نے آپ کو وہ کافر دکھلائے آپ کے خواب میں تھوڑے اور اگر آپ کو وہ کافر زیادہ دکھا دیتا (تو اے مسلمانو!) تم پست ہمت ہو جاتے اور معاملے میں اختلاف کرتے لیکن اللہ نے بچا لیا۔ بیشک وہ دلوں کی باتوں کا جاننے والا ہے۔ اور یاد کرو! کہ جب اس نے تمہیں ان کافروں کو دکھایا تمہارے مقابلہ کے وقت تمہاری آنکھوں میں تھوڑا اور تمہیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھلایا تا کہ اس امر کا فیصلہ کر دے جس کا ہونا طے شدہ تھا اور سارے معاملات اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ (۳۸ تا ۴۴) (رکوع:۵)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ○

(کہہ دیجئے! ان کفر کرنے والوں سے کہ اگر وہ باز آ جائیں تو جو کچھ ہو چکا ہے معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ پہلا رویہ ہی جاری رکھیں تو پہلوں کے بارے میں سنتِ الٰہی گزر چکی ہے۔) (الانفال: ۳۸)

سابقہ آیاتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ کے بڑے بڑے جرائم کو ذکر فرمانے کے بعد ان کے دینوی اور اخروی انجام کا ذکر فرمایا اور ان پر یہ بات واضح کر دی کہ تم بہت جلد دنیا میں دیکھو گے کہ اسلام کی راہ میں تمہاری مخالفتیں، تمہاری تگ و دو اور تمہاری خرچ کی ہوئی دولت تمہارے لئے سرمایہ حسرت بن جائے گی اور آخرت میں تم سب کوڑے کرکٹ کی طرح ایک انبار کی شکل میں جہنم میں پھینک دیئے جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کا اظہار:

اب اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے اپنی شانِ کریمی اور دعوت الی اللہ کے تقاضے کے مطابق ایک ایسی بات ارشاد فرمائی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم واقعی اللہ کی کتاب ہے اور اس کا بھیجنے والا پروردگارِ عالم ہے جس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کر رکھا ہے اور وہ رسول جس کی زبان سے یہ اعلان کروایا جا رہا ہے وہ واقعی رحمۃ للعالمین ہے۔ کہنا یہ ہے کہ تمہارے کرتوت تو اس قابل ہیں کہ دنیا میں بھی تم پر عذاب کا کوڑا برسے اور آخرت میں تمہیں جہنم کی نذر کر دیا جائے۔ لیکن اللہ کو کسی سے انتقام نہیں لینا وہ تمہارے تمام تر عناد کے باوجود کسی شخصی جذبے کی گرفت میں اسیر نہیں ہوتا۔ جس طرح اس کی ذات ہر طرح کے نفسیاتی عوارض سے پاک ہے اسی طرح اس کی دعوت اور اس کا دین بھی اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتا ہے۔ تمہاری اذیتیں اور مخالفتیں اپنی جگہ لیکن آنحضرت ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان کافروں سے کہئے کہ اگر یہ لوگ اپنے رویے کو بدل لیں اور اسلام کی مخالفت سے باز آ جائیں اور انہوں نے اللہ کے گھر کو جس طرح اللہ والوں پر ممنوع قرار دے رکھا ہے اس سے توبہ کر لیں اور اسلام کی آغوش میں آ جائیں تو وہ اب تک جتنے بڑے بڑے جرائم کر چکے ہیں اس کے بارے میں ان سے بالکل نہیں پوچھا جائے گا بلکہ ان کی تمام چھوٹی بڑی غلطیاں اور زیادتیاں معاف کر دی جائیں گی۔

اسلام ایک ایسی انمول نعمت ہے کہ اسلام لانے والا کسی ذہنی یا عرفی شکست سے دوچار نہیں ہوتا اور اسے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا کہ میں اب تک اسلامی دعوت اور اللہ کے پیغمبر سے جو سلوک کر چکا ہوں مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی اور امتِ مسلمہ مجھے قبول کرنے سے پہلے میرے بڑے بڑے جرائم کی سزا دے گی۔ آنحضرت ﷺ نے تو ایک شخص کو جو اپنی ایک سے زیادہ بیٹیاں زندہ در گور کر چکا تھا اور اب اسلام کی وجہ سے جب ضمیر نے انگڑائی لی تو شدید کرب کی حالت میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا قصہ سنا رہا تھا اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ (اسلام حالتِ کفر میں کئے ہوئے ہر گناہ کو ختم کر دیتا ہے۔)

Marfat.com

اگر کسی شخص کے گناہوں سے زمین وآسمان کے درمیان ساری فضا بھر جائے تو کلمہ طیبہ کے چند بول اسے ختم کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس آیت میں بھی اسی رحمت کا اظہار ہو رہا ہے اور آنحضرت ﷺ جو عملی قرآن تھے اور جن کے اخلاق سے اللہ کے پسندیدہ اخلاق کا اظہار ہوتا تھا انہوں نے بھی فتح مکہ کے موقعہ پر جب کہ بدترین دشمن آپ کے سامنے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے اپنی قسمتوں کا فیصلہ سننے کے انتظار میں کھڑے تھے فرمایا تھا کہ

میں تم سے آج وہی کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ تم سب آزاد ہو آج تم سے کوئی باز پرس نہیں ہو گی اللہ تمہیں معاف کرے وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

ترغیب کے بعد تنبیہ:

آیت کے دوسرے حصے میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے اللہ کی اس دعوتِ استغفار کو قبول نہ کیا اور کفر سے نکل کر اسلام کی آغوش میں نہ آئے بلکہ تم نے اپنے اندھے پن پر اصرار جاری رکھا تو پھر یاد رکھو اس سے پہلے لوگوں کے ساتھ اللہ کی جو سنت رہی ہے وہ گزر چکی ہے۔ یعنی اللہ کی جس سنت، اللہ کے جس طریقے اور اللہ کے جس قانونِ عدل سے سابقہ امتیں دوچار ہو چکی ہیں ان کی تاریخ تمہارے سامنے ہے۔ تم قومِ عاد اور قومِ ثمود، مدین اور قومِ لوط وغیرہ کے کھنڈرات سے تجارتی اسفار میں گزرتے رہتے ہو۔ ان کے تمام علاقے اللہ کے عذاب کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ وہ اپنے اپنے زمانے کے نہایت ترقی یافتہ اور مضبوط لوگ تھے۔ پہاڑوں میں کھدے ہوئے ان کے محلات آج بھی فنِ تعمیر میں ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اگرچہ ان کی آبادیاں ریت کے طوفانوں کے نیچے دب گئی تھیں لیکن ان کے آثار اتنی بڑی تعداد میں اس وقت تک باقی تھے جس سے یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل نہ تھا کہ جب ان قوموں نے بغاوت اور تمرد کو جاری رکھنے پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ کے عذاب نے کس طرح ان کی کمر توڑی۔ قریش سے کہا جا رہا ہے کہ تم اللہ کی اس سنت کو آج بھی ان کے کھنڈرات میں شناخت کر سکتے ہو اور اس آئینے میں بڑی آسانی سے اندازہ کر سکتے ہو کہ جس بدترین صورتِ حال سے وہ قومیں دوچار ہوئی تھیں اسی صورتحال سے تم بھی دوچار ہو سکتے ہو۔ اس لئے کہ تمہارے اور ان کے رویے اور اعمال میں کوئی فرق نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل اور قانونِ اتمامِ حجت علی حالہٖ قائم ہے۔ جس طرح باطل نے اپنی سرشت نہیں بدلی حق نے بھی اپنے قوانین نہیں بدلے۔ حق و باطل کے معرکوں میں قوموں کے نام بدل جاتے ہیں لیکن معرکۂ حق و باطل کے خصائص میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اقبال نے ہر دور کیلئے ٹھیک کہا:

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی فطرتِ اسداللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ (الانفال : ۳۹، ۴۰)

(ان سے جنگ کرو تا آنکہ فتنہ باقی نہ رہے اور سارا دین اللہ کا ہو جائے پس اگر وہ باز آ جائیں تو اللہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر انہوں نے روگردانی کی تو خوب جان لو کہ اللہ تمہارا مولا ہے کیا ہی خوب مولا ہے اور کیا ہی اچھا مددگار ہے۔)

مسلمانوں کو جہاد کا حکم:

کفر کی طاقتیں اگر اپنا رویہ بدلنے کیلئے تیار نہیں تو پھر مسلمانوں کیلئے حکم یہ ہے کہ کافروں سے لڑائی لڑو اور یہ لڑائی اس وقت تک جاری رہے جب تک فتنے کا سدباب نہیں ہو جاتا اور دین سراسر اللہ کا نہیں ہو جاتا۔ سوال یہ ہے کہ یہاں دین سے کیا مراد ہے؟ اور فتنہ کا کیا معنی ہے؟

فتنہ سے کیا مراد ہے؟

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو تفسیر منقول ہے اس کے حوالے سے فتنہ سے مراد کفر ہے اور دین سے مراد دینِ اسلام ہے۔ مفہوم

Marfat.com

اس کا یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی براہِ راست بعثت عربوں کی طرف ہوئی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عربوں پر اتمامِ حجت ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اللہ کے رسول کو دیکھا، اس کی دعوت کو سنا، اس کے کردار کو پرکھا، اس کے معجزات دیکھے، اب ان کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہا کہ وہ اسلام کو قبول نہ کریں کیونکہ اللہ کے نبی کی شخصیت بجائے خود معجزہ ہوتی ہے۔ اس کی دعوت اپنے اندر بلا کی تاثیر رکھتی ہے۔ اس کے معجزات ہر زندہ ضمیر کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ تو ہر نبی کی شان ہے، نبی آخر الزماں جو اہلِ زمین کیلئے اللہ کا آخری نمائندہ اور آخری حجت بن کر آیا ہے، اس کی شان کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا اس کو دیکھ لینے اور سن لینے کے بعد کسی طرح کی حیل وحجت کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اس لئے جزیرۂ عرب سے باہر تو نبی کریم ﷺ اور پروردگار نے کفر کے باقی رہنے کی اجازت دی کہ وہ مسلمان ملکوں میں شہری بن کر بھی رہ سکتے ہیں اور معاہد بن کر بھی، اور کافر اور مسلمان ملکوں میں باہمی معاہدات بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن جزیرۂ عرب کی حد تک پابندی لگا دی گئی کہ یہاں دو دین نہیں رہ سکتے۔ اللہ کے دین کے آجانے کے بعد کسی دوسرے دین کیلئے کوئی گنجائش نہیں اور اللہ کے رسول کی بعثت کے بعد کسی کفر کیلئے کوئی موقع نہیں۔ یہاں کسی کو کافر رہ کر رہنے کی اجازت نہیں ہو سکتی کیونکہ جزیرۂ عرب اسلام کا مرکز اور Base ہے۔ یہاں کے رہنے والے اسلام کا ہراول ہوں گے۔ ان کے ساتھ ایسی قوتوں کو رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی جو مسلمانوں کو مذہبی، اخلاقی یا سیاسی طور پر پریشان کر سکتے ہوں۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے وصیت فرمائی کہ اہلِ کتاب کو جزیرہ عرب سے نکال دینا اور عربوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں ایک محدود مدت تک مہلت دی جاتی ہے اسلام قبول کر لیں یا ملک چھوڑ دیں ورنہ اس کے بعد ان کا خون مباح ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق ؓ نے یہود کو خیبر سے نکال دیا اور عیسائیوں سے نجران خالی کرا لیا گیا اور پورا جزیرہ عرب خالص مسلمانوں کا مرکز بن کر رہ گیا۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ فتنہ سے مراد، حضرتِ عبداللہ ابنِ عمر ؓ کی رائے کے مطابق وہ رویہ ہے جو قریش نے مسلمانوں کو دینِ حق سے روکنے کیلئے اختیار کر رکھا تھا۔ انہوں نے امکانی حد تک لوگوں کیلئے دین قبول کرنا ناممکن بنا دیا تھا اور اگر کوئی پھر بھی دین قبول کرنے کی جسارت کر گزرتا تو اس کے لئے زندگی عذاب بنا دی جاتی۔ نہ اس کی عزت محفوظ رہتی اور نہ مال ودولت اور نہ اس کی جان کیلئے کوئی تحفظ رہتا۔ اسی صورتحال سے نکلنے کیلئے مسلمانوں کو جب بھی موقعہ ملا وہ ہجرت کر گئے۔ حتیٰ کہ آنحضرت ﷺ بھی ہجرت فرما کر مدینہ پہنچ گئے۔ اب کوئی ایسا شخص مکہ میں باقی نہ رہ گیا جو ہجرت کی استطاعت رکھتا ہو اور پھر بھی وہ مکہ میں قیام پذیر ہو۔ لیکن قریش کے ظلم وتعدی کو کسی حد پر بھی قرار نہ تھا انہوں نے جب دیکھا کہ مسلمان مدینہ کو اپنا مرکز بنا چکے ہیں تو انہوں نے مدینہ پر شب خون مارنا شروع کر دیئے اور مدینہ میں بھی مسلمانوں کیلئے زندگی گزارنا مشکل کر دیا۔ اس آیتِ کریمہ میں اس صورتحال کو فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے اس سے مراد غلبۂ دین ہے یعنی اسلام جزیرۂ عرب کی حد تک ایک غالب قوت بن جائے کیونکہ اس کے بغیر نبی کریم ﷺ کی بعثت کا مقصدِ اولیٰ بھی پورا نہیں ہوتا تھا کیونکہ آنحضرت ﷺ پوری دنیا کی ہدایت اور ساری زمین پر اللہ کے دین کے غلبے کیلئے تشریف لائے تھے۔ لیکن آپ کا اولین ہدف یہ تھا کہ اللہ کا وہ گھر جسے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے توحید کا مرکز اور ہدایت کا سرچشمہ بنایا تھا اور جہاں سے ایک ایسی امت کے اٹھائے جانے کی دعائیں مانگیں تھیں۔ امتِ مسلمہ یعنی خالص اللہ کے سامنے جھکنے والی اللہ کی توحید کی پرستار اور اپنا سب کچھ اللہ کی رضا اور غلبۂ دین کیلئے جھونک دینے والی ہو اور اس منبع ہدایت کو پوری دنیا کا مرکز بنانے کیلئے ایک ایسے رسول کیلئے دعائیں مانگی تھیں جو قریش میں سے ہو یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہو اور جو اللہ کے اس گھر سے ہدایت کی ایسی تحریک لے کر اٹھے جو پوری دنیا کو روشنی سے منور کر دے۔

لیکن جب حضور کی بعثتِ مبارکہ ہوئی تو آپ کو یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام جیسے موحدِ اعظم کی اولاد نے توحید کے اس منبع کو بت خانہ میں تبدیل کر دیا تھا۔ عرب کے تمام قبائل کے بتوں کو اللہ کے گھر میں جگہ دی گئی تا کہ عرب کے تمام قبائل اپنے بتوں کی وجہ سے مکہ معظمہ سے وابستہ رہیں اور قریش کو اللہ کے گھر کے متولی سمجھ کر ان کو پروہتوں کی طرح پوجتے رہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی ایک ایک بات کو انہوں نے بدل کر رکھ دیا تھا۔ مناسکِ حج تک تبدیل کر دیئے گئے تھے۔ عبادت کے بنیادی تصورات کے بگاڑ کے ساتھ ساتھ انہوں نے اللہ کے اس گھر کو قومی معبد کی شکل دے دی تھی۔ جس میں مرضی خدا کی نہیں بلکہ قریش کی چلتی تھی۔ آنحضرت ﷺ چونکہ ملتِ ابراہیم پر مبعوث ہوئے تھے اس لئے آپ کی پہلی ذمہ داری یہ تھی کہ اللہ کے گھر کی اصل حیثیت کو بحال کیا جائے۔ اس کی عظمت واپس لائی جائے۔ شرک کی ایک ایک بات کو وہاں سے نکالا جائے اور اللہ کے گھر کو ان ہاتھوں میں دیا جائے جو اللہ سے ڈرنے والے اور اس کی توحید کے پرستار ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے مکہ معظمہ میں تیرہ سال تک اسی

Marfat.com

مقصد کو سامنے رکھ کر کام کیا۔ لیکن قریش بجائے اس کام کی قدر کرنے اور اسلام کی آغوش میں آنے کے انہوں نے اس دعوت کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی اور مسلمان جب مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر گئے تو انہوں نے مسلمانوں پر اس گھر کے راستے ہمیشہ کیلئے بند کر دیئے۔ ۶ ہجری میں آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ کے ساتھ اللہ کے گھر کا عمرہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو قریش نے آپ کا مکہ معظمہ میں داخلہ بند کر دیا آپ تمام تر کوششوں کے باوجود عمرہ ادا نہ کر سکے۔ یہ وہ فتنہ تھا جس نے اسلام کا ہر راستہ روک رکھا تھا۔ جہاں ملتِ ابراہیمی کیلئے مشکلات تھیں اور بت پرستی کیلئے آسانیاں۔ اللہ کا دین مظلوم و مقہور تھا اور کفر اور شرک کی قوتیں برسرِ اقتدار تھیں۔ جب تک کفر و شرک کے غلبہ کی جگہ دین کو غلبہ نہ ملے اور کفر کی جارحانہ قوت کا پنجہ نہ مروڑا جائے اس وقت تک توحید اور اسلام کے مستقبل کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کیلئے ایک ہی راستہ تھا کہ مسلمان اللہ کے بھروسے پر طاقت کا علم لے کر اٹھیں اور تلوار کے زور سے کفر و شرک کی طاقت کو جڑ سے اکھاڑ دیں چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اسی مقصد کیلئے قتال کا حکم دیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے بعض ارشادات میں اس کی وضاحت بھی فرمائی۔ صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

(مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ میں دشمنانِ اسلام سے قتال کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو قبول کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور جب وہ ایسا کریں تو ان کے خون اور اموال سب محفوظ ہو جائیں گے بجز اس کے کہ اسلامی قانون کے تحت کسی جرم کی پاداش میں ان کو سزا دی جائے۔)

مسلمانوں کو تسلی:

آیت کے دوسرے حصے میں فرمایا کہ اگر اس قتال کے نتیجے میں کفار فتنہ پروری سے رک جائیں وہ اسلام قبول کر لیں یا اللہ کا گھر مسلمانوں کے حوالے کر دیں تو پھر مسلمانوں کو بھی ہاتھ روک لینا چاہئے اور اس بات پر ان کو پریشان نہیں ہونا چاہئے کہ ان کے رویے کی یہ تبدیلی ممکن ہے دھوکہ دہی کی ایک چال ہو فرمایا وہ تمہیں دھوکہ دے سکتے ہیں لیکن اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ مسلمانوں کو مطمئن رہنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال سے باخبر ہے اور اگر وہ اپنا رویہ بدلنے سے انکار کر دیں تو پھر خوب جان لو اللہ تمہارا مولا ہے، وہی تمہارا اچھا ہے، وہی تمہارا کارساز ہے، وہی تمہارا پشت پناہ ہے، کافروں کی کثرتِ تعداد اور اسلحہ کی قوت تمہیں پریشان نہ کرے کیونکہ جس کا مولا پروردگار ہو اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے کیونکہ اللہ سے بہتر نہ کوئی مولا ہے اور نہ کوئی مددگار۔ جس نے اس کا دامن پکڑ لیا دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی قوت اس کے ہاتھ میں آ گئی۔

کیا غم ہے اگر ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (الانفال : ۴۱)

(اور جان رکھو کہ جو کچھ تمہیں غنیمت ملے تو بے شک اس کا خمس اللہ کیلئے ہے اور رسول کیلئے ہے اور قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کیلئے ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری فیصلہ کے دن جس دن بھڑ گئیں دونوں جماعتیں اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔)

آپ کو یاد ہو گا کہ سورۃ الانفال کی پہلی آیت میں مسلمانوں نے انفال یعنی مالِ غنیمت سے متعلق سوال کیا تھا۔ وہاں اس کا اجمالی جواب دیا گیا تھا اور پھر جنگ مسلمانوں اور ان کی مصلحت کے حوالے سے جو باتیں زیادہ ضروری تھیں ان کی طرف کلام کا رخ پھر گیا اور ایک سے دوسری حقیقت واشگاف ہوتی گئی ان بنیادی اور اساسی حقائق کا ذکر کرنے کے بعد اب اسی سوال کا تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

مالِ غنیمت سے کیا مراد ہے؟ اور اس کی حیثیت:

میں نے عرض کیا کہ نفل اور غنیمت دونوں ایک ہی چیز ہیں غنیمت اس مال کو کہا جاتا ہے جو دشمن سے حاصل کیا جائے۔ اس لحاظ سے اسلامی شریعت میں اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ مالِ غنیمت ہے جو لڑائی اور دشمن کی شکست کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے۔ اسے غنیمت یا نفل کہتے ہیں اور دوسرا وہ مالِ غنیمت ہے جو بغیر لڑائی کے صلح اور رضامندی سے حاصل ہو جائے۔ مثلاً دشمن مرعوب ہو کر جزیہ دینے پر صلح کر لے یا خراج دینا قبول کر لے یا اپنی دشمنی اور جرائم کی معافی کیلئے اپنے مکان اور اپنی زمینیں چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں منتقل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ چھوڑ کر جائے گا وہ سب کچھ مسلمانوں کے قبضے میں آ جائے گا۔ اسے ''فئی'' کہتے ہیں۔

مالِ غنیمت کے سہام کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلی بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اس سورۃ کی پہلی آیت میں صرف اسی حقیقت کے ذکر پر اکتفا کیا گیا تھا وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے تمام کائنات کا اصل مالک اللہ جل جلالہٗ ہے۔ اس کائنات کی ایک ایک چیز پر اس کی ملکیت ہے۔ انسان براہ راست اپنی ذات میں کسی چیز کا مالک نہیں بجز اس کے کہ قانون کسی چیز کو اس کی ملکیت میں دے دے۔ سورۂ یٰسین میں جانوروں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاما فھم لھا مالکون

(کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ چوپاؤں کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا پھر لوگ ان کے مالک ہو گئے۔)

یعنی تخلیق کے اعتبار سے ذاتی ملکیت صرف اللہ کو حاصل ہے انسانوں کو جانوروں پر تصرف کا حق ذاتی ملکیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ملکیت کی وجہ سے ہے جو اللہ نے انہیں عطا کی ہے۔

انسانوں کی یہ ملکیت قانوناً اور اخلاقاً اس وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک وہ اللہ کی حیثیت اور اس کے قانون کو تسلیم کرتے ہیں لیکن جب وہ کفر اور شرک کا راستہ اختیار کر کے اللہ سے بغاوت کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو وہ اللہ کی عطا کردہ ملکیت سے محروم ہو جاتے ہیں اور قانونی اور اخلاقی طور پر ان کا جان و مال مباح ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا عملی وقوع اس وقت ہوتا ہے جب ان کی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے رسول بھیجتے ہیں کتابیں اتارتے ہیں اور اس طرح سے ان پر اتمام حجت کر دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ راہ راست اختیار نہیں کرتے اور بغاوت سے اطاعت کی طرف نہیں آتے تو پھر اللہ اپنے رسول اور رسول پر ایمان لانے والوں کو ان سے جہاد و قتال کا حکم دے دیتا ہے۔ ان کا قتل جائز ٹھہرتا ہے اور ان کے مال دوبارہ پھر خالصتاً اللہ کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں اور ان کا حقِ ملکیت ساقط ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے جہاد و قتال کے نتیجے میں مسلمانوں کو کافروں سے جو مال ہاتھ آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مِلک سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ کافروں کی مِلک جب ختم کر دی گئی تو پھر ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹ گئی اور صرف اس پر اللہ کی ملکیت باقی رہی۔ اب جب وہ مال مسلمانوں کی ملکیت میں آئے گا تو وہ اللہ کی ملکیت سے براہِ راست منتقل ہو کر آئے گا اور درمیان میں کسی انسانی ہاتھ کا واسطہ نہیں ہوگا جبکہ انسان کے پاس جتنا مال اور جیسا مال بھی آتا ہے وہ انسانوں کے واسطہ سے آتا ہے چاہے وہ ہبہ کی صوت میں ہو، میراث کی صورت میں یا تجارت کے نتیجے میں ہر جگہ انسان انسانوں سے وصول کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ جو مال انسانی ہاتھوں سے آئے گا اس میں انسانی ہاتھوں کا میل بھی شامل ہوگا اور جو مال براہِ راست اللہ کی مِلک سے مسلمانوں کی مِلک میں منتقل ہوگا وہ ایسی ہر آلودگی سے پاک ہوگا۔ چنانچہ مالِ غنیمت کی اسی طہارت، پاکیزگی اور فضیلت کی وجہ سے پہلی امتوں کو اس کے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ خالصتاً اللہ کی ملکیت ظاہر کرنے کیلئے حکم دیا گیا کہ ایسے مال کو کسی بلند جگہ پر رکھ دو تاکہ اللہ کی طرف سے آگ آ کر اسے جلا دے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اسے قبول فرما لیا۔ نبی کریم ﷺ پر پروردگار کے جو خصوصی انعامات ہوئے ہیں ان میں سے ایک انعام یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کو جسے حدیث میں ''اطیب الاموال'' کہا گیا ہے، اس امت کو استعمال کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ لیکن اس تصور کو ان کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا کہ یہ کبھی مت بھولنا کہ یہ مال براہِ راست اللہ کی ملکیت ہے۔ تمہاری مِلک میں اللہ نے اپنی عطا کے طور پر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس بنیادی تصور نے مسلمانوں کو مالِ

Marfat.com

غنیمت کے بارے میں اس حد تک محتاط کر دیا تھا کہ وہ اپنے طور پر مالِ غنیمت میں سے ایک سوئی لینے کے بھی روادار نہیں ہوتے تھے۔ ہر چیز اپنی اصل حالت میں مرکز پر پہنچائی جاتی تھی۔ مرکز کی طرف سے جب اس کی تقسیم ہوتی تو ہر ایک کو اس کا حصہ مل جاتا لیکن وہ اپنے طور پر کسی چیز کو روکنا اس لئے حرام سمجھتے تھے کہ یہ سارا مال اللہ کا ہے جسے اللہ کے رسول کی تحویل میں دیا گیا ہے وہ جیسے سمجھیں گے اسے تقسیم فرمائیں گے۔ اسی تصور نے قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کے اندر وہ اخلاق پیدا کیا کہ بڑی بڑی جنگوں میں ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا کہ کسی سپاہی نے اپنے طور پر مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز چھپانے کی کوشش کی ہو۔ قیصر و کسریٰ جیسی حکومتوں کے تخت الٹ دیئے گئے ان کی صدیوں کی جمع کی ہوئی دولت مسلمانوں کے ہاتھوں میں آئی اور وہاں سے سینکڑے میل دور اسے مدینہ منورہ میں منتقل کیا گیا لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ جنگ کے دوران، جنگ کے بعد یا مدینہ کے سفر میں کوئی ایک مثال بھی ایسی سامنے نہ آئی جسے خیانت سے تعبیر کیا جاسکتا بلکہ مورخین یہ کہتے ہیں کہ جب یہ اربوں روپے کا مالِ غنیمت مدینہ منورہ پہنچا ہے تو مسلمانوں کے سالار نے اس سامان کی جو فہرست ساتھ بھجوائی تھی اس فہرست میں اور اس مال میں ایک سوئی کا بھی فرق نہیں تھا۔

دوسرا تصور:

دوسرا تصور جو نفل اور غنیمت کے لفظ سے لیا گیا وہ یہ ہے کہ غنیمت کارکردگی کا صلہ نہیں بلکہ سر تا سر انعام ہے کیونکہ غنم الشیء کے معنی ہوتے ہیں فاز بہ ونالہ بلا بدل اس نے فلاں چیز بغیر کسی عوض کے حاصل کر لی اور جو چیز کسی کے عوض میں حاصل ہو اسے غنیمت نہیں کہتے اسے اجرت کہا جاسکتا ہے یا کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے لیکن غنیمت نہیں کہا جاسکتا۔ مقصود یہ تصور دینا ہے کہ اسلامی جہاد و قتال میں اگرچہ گردنیں اترتی ہیں، خون بہتا ہے، جسم زخمی ہوتے ہیں، ایک قیامت سے آدمی گزرتا ہے، لیکن ان میں سے کسی قربانی کا صلہ بھی دنیا کی کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے ہر قربانی کا بدلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس طرح عطا فرمائیں گے کہ جب لینے والا ان بیش قیمت نعمتوں کو دیکھے گا تو آنحضرت کے ارشاد کے مصداق وہ تمنا کرے گا کہ کاش! میری کھال اللہ کے راستے میں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی تاکہ آج میں اس کا اور بھی صلہ وصول کرتا۔ غزا اور شہادت کا صلہ اللہ کے ہاں اخروی انعامات ہیں جو اس کی ابدی زندگی میں محفوظ کر دیئے جاتے ہیں۔ دنیا میں وہ کسی عوض اور معاوضے کا روادار نہیں ہوتا وہ جانتا ہے کہ جہاد و قتال میرا فرض ہے اس راستے میں اگر جان چلی گئی تو یہ فرض کی ادائیگی ہے اور اگر اس راستے میں پوری زندگی بھی صرف ہوگئی تو یہ فرض کی ادائیگی کی ایک کوشش ہے۔ جس پر مجاہد کبھی یکسو اور مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اس کے دل میں یہ کھٹک باقی رہتی ہے کہ اللہ نہ کرے میری قربانیوں کو رد کر دیا جائے۔ وہ بڑی سے بڑی قربانی دیتا ہے اور ساتھ ہی قبولیت کی بھیک بھی مانگتا ہے۔ جس دین نے اپنے ماننے والوں کو یہ تصورات دیئے ہوں اس میں مالِ غنیمت کے حوالے سے کسی اختلاف کے پیدا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ لیکن جب یہ تصورات ماند پڑنے لگتے ہیں اور دلوں میں مالِ غنیمت کی ہوس پیدا ہونے لگتی ہے تو محض اس ہوس کی وجہ سے جیت بھی ہار میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کامیابیاں ناکامیاں بن جاتی ہیں۔ خوارزم شاہ نے دولتِ دنیا کی ہوس اور تخت و تاج کی نخوت میں مبتلا ہو کر ایک بہت بڑی سلطنت تباہ کروالی۔ اس کا بیٹا تلافی کیلئے اٹھا اس نے شجاعت اور بہادری کے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور ایک دو جنگوں میں تاتاریوں کو عبرتناک شکست بھی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب تاریخ بدل جائے گی اور مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو شاید حاصل کر لیں گے۔ لیکن محض مالِ غنیمت میں اختلاف کی وجہ سے چالیس ہزار کا لشکر اسے چھوڑ کر چلا گیا جیسے ہی تاتاریوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اپنے زخم چاٹنے کی بجائے آندھی کی طرح اٹھے اور طوفان بن کر حملہ آور ہوئے اب سلطان کے پاس فرار کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ایسے ہی عبرتناک نتائج سے بچنے کیلئے قرآن کریم نے مالِ غنیمت کے بارے میں وہ تصورات دیئے کہ جس نے عموماً مسلمانوں کو ایسی شرمناک صورتحال سے دوچار ہونے سے محفوظ رکھا۔

ضابطۂ تقسیم:

ان بنیادی تصورات کے بعد اس ضابطۂ تقسیم کو بیان کیا جا رہا ہے جس کے مطابق مالِ غنیمت تقسیم کیا جائے گا۔ سورۃ انفال کی پہلی آیت میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ مالِ غنیمت اجتماعی ملکیت ہے اس کا براہ راست مالک اللہ ہے اور اس کے عملی نمائندے اللہ کے رسول ہیں۔ اس لئے اس کی

Marfat.com

تقسیم فوج کے ذمہ دار اپنی مرضی سے نہیں کرسکیں گے بلکہ پہلے یہ مال جمع کر کے اجتماعی تحویل میں دیا جائے گا اس کے بعد نبی کریم اسے اللہ کے نبی اور سربراہِ مملکت کی حیثیت سے تقسیم فرمائیں گے اور آپ کے بعد یہ ذمہ داری اسلامی مملکت کے سربراہ پر ہوگی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس ضابطۂ تقسیم کو تفصیلاً بیان کرنے کی بجائے صرف اس کے خمس کو بیان کیا گیا۔ لیکن قرآن کریم کے اسلوب کو جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی میں پورے ضابطے کو بیان کردیا گیا ہے کیونکہ ماغنمتم کے لفظ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت میں مجاہدین کا حق تسلیم کیا ہے اور اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنے حق سے اس مال کو ان کے حق میں منتقل فرمایا۔ اب رہی یہ بات کہ ان کا حق کتنا ہے تو اس میں سب سے پہلے اس حق کو ذکر فرمایا جو سب سے اہم اور سب سے اشرف ہے وہ یہ کہ پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور ذوی القربیٰ اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کیلئے ہوگا۔ باقی چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں گے۔ البتہ! اس تقسیم کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ اس کی تفصیل احادیث اور فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کی ذات کے حصے کا تعلق ہے تو یہ بات معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات تو ہر چیز سے بے نیاز اور غنی ہے اس کا حق رسول اللہ ﷺ کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اس لئے اصلاً پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ کا ہے اور یہ حق آپ کا اسلامی ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے ہے اور اسے آپ بعد میں بیان کردہ مستحقین پر صرف فرمائیں گے۔ رسول ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے رکھی تھیں۔ لیکن سربراہِ مملکت کی حیثیت سے جب آپ کا ایک ایک لمحہ ریاست کی ذمہ داریوں کی ادائیگیوں کیلئے صرف ہونے لگا تو اب ضروری تھا کہ ریاست کے واسطے سے جو وسائل پیدا ہوتے ہیں اس میں آنحضرت ﷺ کا حق بھی رکھا جاتا۔ چنانچہ اسی لیے مالِ غنیمت میں سب سے پہلے آپ کا حق رکھا گیا کہ آپ اس خمس میں اپنی ذات اور اپنی ازواج مطہرات پر بھی خرچ کریں گے اور ان ذوی القربیٰ پر بھی جن کی کفالت کی ذمہ داری آپ پر ہے یا آپ اخلاقاً جن کی مدد کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں بنو ہاشم تو اس لئے شریک تھے کہ وہ آپ کا خاندان تھا اور بنو مطلب کو آپ نے اس لئے شریک فرمایا تھا کیونکہ شعبِ ابی طالب کے ہولناک مصائب میں انہوں نے خود اپنے آپ کو بنی ہاشم کے ساتھ شریک رکھا تھا اور مزید یہ بات بھی کہ آنحضرت ﷺ پر اور آپ کی وجہ سے آپ کے خاندان بنی ہاشم پر زکوٰۃ کا لینا ممنوع قرار دیا گیا ہے کیونکہ زکوٰۃ لوگوں کے ہاتھوں کا میل ہے جو آپ کی ذات اور آپ کے خاندان کے لئے مناسب نہیں اور اگر کہیں اسلام اس کی اجازت دے دیتا تو مسلمان آنحضرت ﷺ کے قرابت داروں کو آپ کی نسبت کی وجہ سے دوسروں کو محروم کر کے بھی زیادہ سے زیادہ زکوٰۃ دینے کی کوشش کرتے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بنی ہاشم کو مستقلاً ریاست کے وسائل سے محروم نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے مالِ غنیمت کے خمس میں سے ان کا بھی حق رکھا اور ذوی القربیٰ پر "لام" لا کر بطورِ خاص اس کی اہمیت کو واضح فرمایا۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں تو ذوی القربیٰ سے مراد بنی ہاشم اور بنی مطلب ہی تھے اور انہیں کا خمس میں حصہ رکھا گیا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد ذوی القربیٰ کا حصہ کس کو پہنچتا ہے؟ اس میں مسلمانوں میں اختلاف ہوا۔ ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بعد یہ حصہ منسوخ ہوگیا۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ حضور کی وفات کے بعد یہ حصہ اس شخص کے اقربا کو پہنچے گا جو حضور کی جگہ خلافت کی خدمت انجام دے گا۔ تیسرے گروہ کے نزدیک یہ حصہ خاندانِ نبوت کے فقراء میں تقسیم کیا جاتا رہے گا۔ تحقیق سے تیسری بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ خلفائے راشدین کے زمانے میں حضرت علی ؓ کو تمام ذوی القربیٰ کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان کے واسطے سے ذوی القربیٰ میں یہ حصہ تقسیم کیا جاتا تھا۔

رہے یتیم، مسکین اور مسافر تو یہ ذوی القربیٰ میں سے بھی ہوسکتے ہیں اور اس سے باہر بھی خمس کو ان پر خرچ کرنے کا بھی اختیار دیا گیا۔ خمس میں ان کے متعین حقوق نہیں بلکہ اس کا اختیار سربراہِ مملکت کو ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق ان پر خرچ کرے اور ان کی ذمہ داریوں کو محسوس کرے۔ ذوی القربیٰ کے تحت ان کو ذکر کرنا بجائے خود اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طبقے کی عزت افزائی فرمائی ہے اور ان کی ضرورتوں کا احساس دلایا ہے۔ اسلامی نظام کو غور سے دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یتیموں اور مسکینوں کی حیثیت سربراہِ ریاست کے کنبے کی ہے۔ سربراہِ حکومت کو جس طرح اپنے کنبہ کی فکر کرنی پڑتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کو یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کی مدد کرنی پڑتی ہے۔ خلفائے راشدین کا طرزِ عمل اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ راتوں کو چھپ کر اس لئے گشت کرتے تھے تاکہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورت سے آگاہ ہوسکیں اور کہیں مدینہ سے باہر کے مسافروں کا قافلہ اترا ہے تو اس کے حالات کا جائزہ لے سکیں اور پھر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے جس طرح اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جوابدہ سمجھتے تھے اس طرح تو ایک باپ بھی شائد اپنے بچوں کے حوالے سے نہیں سوچتا۔ وہ ہر مسکین اور یتیم اور مسافر کی

Marfat.com

ذمہ داری براہ راست اپنے اوپر محسوس کرتے تھے۔ وہ اسلام کے مزاج شناس تھے وہ جانتے تھے کہ جس مملکت میں یتیم دھکے کھائیں، مسکین لاوارث ہوں اور مسافر کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ تقسیم غنیمت سے متعلق احکام محض انتظامی احکام نہیں ہیں بلکہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے فرمایا کہ اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر فرقان کے دن نازل کیا یعنی جس دن دونوں جماعتیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں تو پھر تمہیں ان احکام کی پابندی میں کمزوری نہیں دکھانی چاہئے اور اگر ان احکام کی بجا آوری میں ذرا سا پس وپیش ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ایمان میں بھی کمزوری ہے اور بدر کے دن تم نے جس طرح اللہ کی طرف سے نصرت وتائید اترتے دیکھی ہے اس کی بھی ناقدری ہے۔ ایسی صورتحال میں تم اس دن سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہو جبکہ وہ "یوم الفرقان" ہے یعنی حق وباطل میں فرق کرنے والا دن۔ جس دن ایک مٹھی بھر جماعت نے ایک بڑے لشکر کو محض اللہ کی تائید اور نصرت اور حق کی پاسداری کی برکت سے شکست سے دوچار کیا اور جس نے بھی اس صورتحال پر غور کیا اسے یقین ہو گیا کہ آج کے دن حق وباطل کا فیصلہ ہو گیا۔ حق کے حق ہونے کا کوئی شبہ نہیں رہا اور باطل کے باطل ہونے میں کوئی اخفا نہیں رہا اور اسے یقین ہو گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو اس کے راستے میں سب کچھ قربان کرنے کیلئے نکل کھڑے ہوں گے وہ تھوڑے بھی ہوں، بے دست وپا بھی ہوں تب بھی اللہ کی قدرت سے کامیاب ہوں گے۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِى الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ۬ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَىَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ (الانفال : ۴۲)

(یاد کرو! جب تم وادی کے قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور کے کنارے پر اور قافلہ تم سے نیچے تھا اگر تم آپس میں میعاد ٹھہرا کر نکلتے تو میعاد پر پہنچنے میں ضرور تم مختلف ہو جاتے لیکن اللہ کو کر ڈالنا تھا ایک کام جو مقرر ہو چکا تھا تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے حجت دیکھ کر ہلاک ہو اور جسے زندگی حاصل کرنی ہے وہ حجت دیکھ کر زندگی حاصل کرے اور بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔)

جنگِ بدر میں اللہ تعالیٰ کی کارسازی:

جنگِ بدر جس طرح وقوع پذیر ہوئی اور جیسے کچھ اس کے نتائج نکلے اس پر غور کرنے سے قدم قدم پر اللہ کی تدبیر اور قدرت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ہر صاحب بصیرت محسوس کرنے لگتا ہے کہ جن حالات سے مسلمان گزر رہے تھے اور مسلمانوں کی جماعتی حیثیت جس صورتحال سے دوچار تھی اور وسائل کی کمیابی نے مسلمانوں کیلئے جس طرح کے مسائل پیدا کر رکھے تھے اسے دیکھتے ہوئے مسلمانوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ قریشِ مکہ کی طاقت سے ٹکرانے کی کبھی غلطی کر سکتے تھے۔ مسلمان امت تعمیر کے مراحل سے گزر رہی تھی اور اسلامی ریاست ابھی پوری طرح استحکام پیدا نہیں کر سکی تھی۔ مدینہ میں پھیلے ہوئے دشمن ابھی تک مسلمانوں کیلئے ایک مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ ایسی صورتحال میں کسی بڑے اقدام کا فیصلہ کرنا آسان کام نہ تھا۔ دوسری طرف قریشِ مکہ بھی ابھی تک لشکر کشی کا فیصلہ نہیں کر پائے تھے۔ وہ عرب کی روایت کو دیکھتے ہوئے ڈرتے تھے کہ جنگوں کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے۔ اگرچہ انہیں اپنی طاقت کا زعم تھا لیکن ابھی مزید تیاری کی فکر میں تھے اور اسی تیاری کیلئے انہوں نے ایک بڑا قافلہ تجارت ملک شام بھیجا تھا تاکہ اس کے منافع سے فوجی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ لیکن ان تمام موانع کی موجودگی میں جنگِ بدر کے حالات کا پیدا ہو جانا اور پھر دونوں فوجوں کا بیک وقت میدانِ جنگ میں پہنچ جانا اللہ کی قدرت کے ظہور کے سوا کچھ نہیں۔ فوجیں ہزار منصوبہ بندی کے ساتھ کسی جنگ کا فیصلہ کرتی ہیں لیکن میدانِ جنگ میں اس طرح ایک ساتھ دونوں فوجوں کا پہنچنا کہ جس میں نہ تقدیم کی شکایت ہو نہ تاخیر کی، ایک حیران کن بات ہے۔ چنانچہ انہی باتوں کی طرف توجہ دلانے کیلئے اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچا ہے تاکہ ہر صاحبِ بصیرت جان سکے کہ یہاں قدم قدم پر اللہ کی

Marfat.com

منصوبہ بندی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔"عدوۃ" عربی زبان میں ایک جانب کو کہتے ہیں اور "دنیا" ادنیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں قریب تر۔ آخرت کے مقابلے میں اس جہان کو بھی دنیا اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ عالمِ آخرت کی نسبت انسان کے زیادہ قریب ہے۔"قصویٰ"، اقصیٰ سے بنا ہے۔ اقصیٰ کے معنی ہیں بعید تر۔ میدانِ جنگ کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا کہ بغیر کسی منصوبہ بندی کے تم اور قریش جس طرح میدانِ بدر میں پہنچے حیرانی کی بات ہے کہ اس کے قریبی کنارے پر تم تھے اور دوسرے کنارے قریش تھے اور جس قافلے کو بچانے کیلئے قریش نکلے تھے وہ ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ تین میل کے فاصلے پر جارہا تھا۔ بغیر کسی منصوبہ بندی کے دو فوجوں کا ایک ہی میدان میں اور ایک ہی دن صبح شام کے فاصلے سے پہنچ جانا جنگ کی تاریخ کا ایک حیرت ناک واقعہ ہے کیونکہ فوجوں کا پس وپیش اور فوجوں کا دوسرے کو دھوکہ دینے کی کوشش، عزائم کو چھپا کر رکھنے کیلئے اقدام کا رخ کسی اور طرف رکھنا یہ فوجوں کے معمولات میں سے ہیں۔ لیکن دونوں فوجوں کا اچانک آمنے سامنے آجانا اور دونوں کا آمادۂ جنگ ہونا اور پس وپیش کے کسی امکان کا باقی نہ رہنا یہ سراسر اللہ کی منصوبہ بندی تھی جو کھلی آنکھوں سے نظر آتی تھی۔

جنگ کا مقصد:

اس کے بعد فرمایا کہ یہ منصوبہ بندی بے سبب نہیں تھی اور یہ محض حسنِ اتفاق نہ تھا بلکہ یہ حسنِ اتفاق اللہ کی منصوبہ بندی سے وجود میں آیا تھا اور پیشِ نظر یہ تھا کہ قریش اور مسلمانوں کا ایک تصادم ہو جس میں نظر بظاہر فتح کی تمام علامتیں اور تمام اسباب قریش کے ساتھ ہوں اور مسلمانوں کے پاس بجز اللہ کی تائید ونصرت کے یقین اور حسنِ کردار کے اسباب کی دنیا کے کوئی چیز نہ ہو۔ دنیا اس تصادم سے پہلے یقین رکھتی ہو کہ مسلمان موت کے منہ میں جارہے ہیں اور ان کے دین نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ لیکن جب تصادم کا غبار چھٹے اور جنگ کا نتیجہ سامنے آئے تو مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت کامیاب اور کامران دکھائی دے اور قریش کی بے پناہ قوت لاشوں کے انبار میں بدل جائے اور ایک بڑی تعداد قیدیوں کی صورت رسیوں میں بندھی ہوئی دکھائی دے، پورا لشکر ڈرے ہوئے جنگلی جانوروں کی طرح بھاگتا ہوا دکھائی دے، تو یہ ساری صورتحال خود منہ سے بولتی ہے کہ جس پروردگار نے اس جنگ کی منصوبہ بندی فرمائی تھی اس کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ ہم یہ جنگ اس لئے کروا رہے ہیں تا کہ حق وباطل کا فرق واضح ہو جائے۔ حق غالب آجائے اور باطل مغلوب ہو جائے۔ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ باطل مٹ جانے والی چیز ہے اور حق غالب آنے والی قوت ہے۔ حق کی قبولیت زندگی کی علامت ہے اور کفر سے تعلق ہلاکت اور بربادی ہے۔ اس جنگ کی صورت میں سب کچھ واضح ہو جانے کے بعد اب جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی زندگی اور حق کی دلیل دیکھ کر زندہ رہے اور جس کی قسمت میں ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلیل دیکھ کر ہلاک ہو تا کہ اہلِ کفر کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے اور ایمان لانے والوں کیلئے ابہام کی دھند چھٹ جائے۔ چنانچہ یہ ہے وہ حقیقت جسے بروئے کار لانے کیلئے اللہ نے اس جنگ کا اہتمام فرمایا اور اسے فرقان بنا دیا۔ بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

> اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ (الانفال : ۴۳، ۴۴)
>
> (یاد کرو! جب اللہ نے آپ کو وہ کافر دکھلائے آپ کے خواب میں تھوڑے اور اگر آپ کو وہ کافر زیادہ دکھا دیتا (تو اے مسلمانو) تم پست ہمت ہو جاتے اور معاملے میں اختلاف کرتے لیکن اللہ نے بچا لیا بے شک وہ دلوں کی باتوں کا جاننے والا ہے ۝ اور یاد کرو! کہ جب اس نے تمہیں ان کافروں کو دکھایا تمہارے مقابلہ کے وقت تمہاری آنکھوں میں تھوڑا اور تمہیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھلایا تا کہ اس امر کا فیصلہ کر دے جس کا ہونا طے شدہ تھا اور سارے معاملات اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔)

اللہ کی کارسازی کی دوسری مثال:

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی کی دوسری مثال بیان فرمائی ہے کہ جس طرح اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے مسلمانوں اور قریش کو ایک ساتھ میدانِ جنگ میں پہنچایا اور جنگ کے امکانات پیدا فرمائے اسی طرح اس نے کچھ ایسے اقدامات بھی فرمائے جن کی وجہ سے دونوں

Marfat.com

فوجوں کیلئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے میں تردد اور تامل کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا احسان یہ فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کو خواب میں قریشِ مکہ کی جو فوج دکھائی گئی اسے قلیل التعداد دکھایا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بہت بڑی فوج نہیں بلکہ ایک چھوٹا لشکر ہے اور ساتھ ہی اللہ نے یہ وعدہ بھی فرمایا کہ اس لشکر پر مسلمانوں کو غلبہ عطا کیا جائے گا۔ اسی آیت کے دوسرے حصے میں یہ بھی فرمایا کہ ہمارا کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا ہم نے اپنے پیغمبر کے خواب میں اس فوج کی تعداد اس لئے تھوڑی دکھائی تا کہ مسلمانوں کے حوصلوں پر اس کا اثر نہ پڑے جب آنحضرت ﷺ لوگوں کے سامنے اپنا خواب بیان فرمائیں تو ان کے اندر پست ہمتی کی بجائے امیدوں کے چراغ جلنے لگیں اور اگر قریش کی فوج جیسی تھی ویسی ہی آپ کے خواب میں دکھائی جاتی اور آپ یقیناً اسی طرح مسلمانوں کے سامنے بیان فرماتے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ بعض مسلمانوں کے حوصلے کمزور پڑنے لگتے اور وہ آنحضرت ﷺ سے درخواست کرتے کہ ہمیں اس جنگ کو ٹالنے کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ ہمیں تیاری کیلئے موقعہ مل جائے ورنہ اس صورت میں تو مقابلے کی کوئی صورت بنتی ہی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام امکانات کو ختم کرنے کیلئے آپ کی نگاہوں میں انہیں تھوڑا کر کے دکھایا۔ دوسری آیت میں ایک اور کارسازی کا ذکر فرمایا کہ جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے سامنے آئیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو حیرت کی بات ہے کہ مسلمان دیکھنے کے باوجود کفار کو اپنے آپ سے کم دیکھ رہے تھے اور کفار کا حال یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی تعداد کو کم دیکھ رہے تھے۔ مسلمانوں کو قریش کی تعداد عین لڑائی کے وقت اس لئے کم دکھائی جا رہی تھی تا کہ وہ جرأت اور ہمت سے آگے بڑھیں اور ان کی افرادی قوت سے مرعوب نہ ہوں اور کافروں کو مسلمانوں کی تعداد اس لئے تھوڑی دکھائی گئی کہ کافر تو بنیادی طور پر بزدل ہوتا ہے۔ انہیں اگرچہ اپنی افرادی قوت پر ناز تھا لیکن دل ان کے پھر بھی دھڑک رہے تھے۔ اب جب کہ مسلمانوں کو انہوں نے اپنے آپ سے کم دیکھا تو اس بات کا امکان کم ہو گیا کہ وہ مسلمانوں سے مرعوب ہو کر جنگ سے بچنے کی کوشش کریں گے اور پروردگار کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد تھا کہ حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی فوج بھی میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرے کیونکہ اس کے بعد ہر فوج کو تاویل اور توجیہ کرنے کا موقع باقی رہے گا اور اصل صورتحال پردوں میں لپٹی رہے گی۔ لیکن اگر حق و باطل کا تصادم ہو گیا اور حق نے باطل کو تہہ و بالا کر ڈالا تو دنیا پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اسباب اور قوت رکھنے کے باوجود قریش کو اس لئے شکست ہوئی کہ وہ اہلِ باطل تھے اور مسلمانوں کو اس لئے فتح ہوئی کہ وہ اہلِ حق تھے۔ یہ جو فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے کافروں کو کم تعداد میں دیکھا اور کافروں نے مسلمانوں کو۔ اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعود ﷛ فرماتے ہیں کہ لڑائی شروع ہونے کے وقت ہم نے جب اپنے مقابل لشکر کی طرف نظر ڈالی تو میں نے اپنے قریب ایک آدمی سے کہا کہ یہ لوگ نوے (۹۰) آدمیوں کی تعداد میں ہوں گے اس شخص نے کہا کہ نہیں سو (۱۰۰) ہوں گے۔ اسی طرح بعض روایات میں ہے کہ ابوجہل نے مسلمانوں کے لشکر کو دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ مسلمانوں کی تعداد اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی جن کی خوراک ایک اونٹ ہو۔ عرب میں کسی لشکر کی تعداد معلوم کرنے کیلئے اس سے اندازہ کیا جاتا تھا کہ کتنے جانور ان کی خوراک کیلئے ذبح ہوتے ہیں۔ ایک اونٹ سو (۱۰۰) آدمیوں کی تعداد کیلئے سمجھا جاتا ہے۔

فوجوں کی نفسیات پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ فوجیں دوسری فوجوں کے بارے میں ہمیشہ وہی احساسات رکھتی ہیں جن کی امنگ اور ترنگ ان کے دل و دماغ سے پھوٹتی ہے۔ اگر کوئی فوج عددی قوت کو ہی سب کچھ سمجھتی ہو اور اسلحۂ جنگ کو فیصلہ کن حیثیت دیتی ہے اور ہر چیز کو ظاہر بین نگاہوں سے دیکھتی ہے تو اس کے سامنے ایک بڑی فوج بھی چھوٹی دکھائی دیتی ہے لیکن جب معرکۂ کارزار گرم ہوتا ہے تو ایسی سرسری نگاہ رکھنے والی فوجیں ہمیشہ ریت کا انبار ثابت ہوتی ہیں۔

اسی طرح وہ فوجیں جو معنوی اور اخلاقی حیثیت کو اصل قوت سمجھتی ہیں اور ان کے فیصلے ہمیشہ دل کے تابع ہوتے ہیں وہ جب محسوس کرتی ہیں کہ ان کے دلوں میں ایک حوصلہ اور ایک امنگ ہے ایمان و اعتماد ہے جذم و یقین ہے مقصد کی صداقت اور اس کے لئے مر مٹنے کا جذبہ ہے انہیں اپنے سامنے بڑی سے بڑی فوج بھی چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ شاید اسی حقیقت سے اس آیت کریمہ میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔ کافروں کا مسلمانوں کو قلیل التعداد دیکھنا یا تو اس لئے تھا کہ مسلمانوں کی تعداد ہی تھوڑی تھی یا اس لئے تھا کہ طاقت کے زعم نے انہیں ایک نشہ میں مبتلا کر رکھا تھا اور مسلمانوں کا کافروں کو اپنے سے قلیل دیکھنا اس وجہ سے تھا کہ کافروں کے سروں کی تعداد تو زیادہ تھی لیکن ان کے اندر معنوی اور اخلاقی قوت نہیں تھی اور مسلمانوں کے دل اسی قوت سے ابل رہے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے سامنے پہاڑ بھی ایک تودۂ ریگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

Marfat.com

بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو بعض دفعہ کوئی غلط چیز بھی دکھا دیتا ہے جیسے یہاں فوج کی تعداد کو غلط دکھایا گیا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے اس لئے کہ پیغمبر کا خواب وحیِ الٰہی ہوتا ہے اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوتا البتہ! یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ خواب میں کوئی حقیقت مجاز کے لباس میں دکھائی جائے یا کوئی چیز ظاہر کی بجائے معنوی حقیقت میں سامنے لائی جائے۔ ایسی صورت میں خواب کی تعبیر میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے خواب میں قریش کی فوج کو کم دکھانا درحقیقت ان کی معنوی اور اخلاقی حیثیت کو دکھانا تھا کہ وہ تعداد میں اگرچہ زیادہ ہیں لیکن اخلاقی اور معنوی قوت کے اعتبار سے نہایت فروتر۔ ان کے اندر جزم ویقین نہیں عزائم کا فقدان ہے وہ صرف قوت پر اعتماد کرنا جانتے ہیں۔ ایسی فوج بڑی تعداد میں بھی ہو تو کوئی معرکہ انجام نہیں دے سکتی چنانچہ جنگِ بدر میں ایسا ہی ہوا۔

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں یعنی معاملات کا سررشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے فتح دیتا ہے، جسے چاہتا ہے شکست دیتا ہے، جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے، جسے چاہتا ہے ذلت کا شکار کر دیتا ہے۔ اس لئے ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنا فرض انجام دے لیکن بھروسہ اللہ پر رکھے۔ کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہ ہو کہ میں اللہ سے بے نیاز ہو کر بھی کوئی کامیابی حاصل کر سکتا ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً
فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٤٧﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ
جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ
اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْۤ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْۤ اَخَافُ اللّٰهَ
وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿٤٨﴾

Marfat.com

اے ایمان والو! جب تم بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں مت جھگڑو ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور وہ اللہ کے راستے سے روکتے تھے اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اور یاد کرو! جب مزین کر دیئے ان کیلئے شیطان نے ان کے اعمال اور کہا کہ آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں ہوگا اور میں تمہارا حمایتی ہوں تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو وہ الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا کہ تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۴۵ تا ۴۸) (رکوع:۶)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۝ (الانفال: ۴۵، ۴۶)

(اے ایمان والو! جب تم بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۝ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں مت جھگڑو ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

آئندہ پیش آنے والے حالات کیلئے ہدایات:

ان آیات میں مسلمانوں کو آئندہ پیش آنے والے حالات میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ جنگِ بدر سے ان غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا مسلمان جن سے مستقبل قریب میں دوچار ہونے والے تھے۔ جنگِ بدر میں قریش کو ایک سخت ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس میں اگرچہ ان کا بہت نقصان ہوا لیکن یہ نقصان ایسا نہ تھا جس سے ان کی کمر ٹوٹ جاتی اور آئندہ وہ مسلمانوں کے مقابلے میں آنے کی جرأت نہ کرتے۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح حملے کیلئے مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور حالات پر نگاہ رکھنے والا ہر صاحبِ بصیرت دیکھ سکتا تھا کہ آئندہ حق و باطل کے درمیان ایک طویل معرکوں کا سلسلہ پیش آنے والا ہے۔ پروردگار تو اپنے ابدی اور جامع علم کے حوالے سے یقینی طور پر جانتا تھا کہ مسلمانوں کو کیسے کیسے حالات سے گزرنا ہوگا۔ چنانچہ ان آیات میں ایسے ہی حالات کو سامنے رکھ کر ایسی مؤثر ہدایات دی گئی ہیں جن پر عمل کے نتیجے میں اللہ کی تائید و نصرت مسلمانوں کے شاملِ حال ہو سکتی ہے اور حق و باطل کی کشمکش میں مسلمان فلاح پا سکتے ہیں۔

ثابت قدمی:

پہلی آیتِ کریمہ میں دو ہدایات دی گئیں۔ پہلی ہدایت یہ دی گئی کہ مسلمانو! جب بھی کبھی تمہارا کافروں سے تصادم ہو، کافروں کی تعداد تھوڑی ہو یا زیادہ ہو، ان کے پاس اسلحۂ جنگ کی کیسی ہی فراوانی ہو اور تم ان کے مقابلے میں جیسی بھی پوزیشن رکھتے ہو تمہیں بہر صورت ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ فَاثْبُتُوْا کا مصدر ''ثبات'' ہے۔ اس کا معنی ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم ہے جسے ہم ''ثابت قدمی'' کہتے ہیں۔ مسلمان کا اصل جوہر میدانِ جنگ میں کھلتا ہے۔ جب دیکھنے والی نگاہیں دیکھتی ہیں کہ جنگی نکتہ نگاہ سے کمزور پوزیشن میں ہونے کے باوجود مسلمان کبھی ہراساں نہیں ہوتا۔ وہ بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جاتا ہے لیکن پسپائی کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا۔ مسلمانوں میں جب تک اسلامی زندگی غالب رہی ہے کسی چھوٹی بڑی جنگ میں انہوں نے کبھی پشت نہیں دکھائی۔ باطل سے آویزش حق کا مقدر رہا ہے اور یہ سلسلہ کبھی نہیں رکا اور آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد تو دنیائے کفر نے اسلام کو مٹانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لیکن مسلمان حق کی قوت بن کر اس طرح

Marfat.com

اٹھے کہ جزیرۂ عرب کی حد تک تو عہدِ نبوت ہی میں مسلمانوں کے پھریرے لہرانے لگے۔لیکن اسکے بعد خلافتِ راشدہ اور بعد کے ادوار میں مسلمانوں کی فتوحات کی تگ وتاز کے سامنے زمین سمٹنے لگی۔ کتنے ملکوں کے جغرافیے بدل گئے، کتنی مملکتیں اسلامی مملکت کا حصہ بن گئیں۔صدیوں کی جمی ہوئی اور مستحکم حکومتیں، قیصر و کسریٰ کے نام سے جو دنیا کی عظیم قوت سمجھی جاتی تھیں، مسلمان قلتِ تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود مسلسل اس وقت تک ان سے نبرد آزما رہے جب تک انہیں ختم نہیں کرڈالا۔عجیب بات یہ ہے کہ کسی بھی معرکے میں مسلمانوں کے پاس ایسی قوت کبھی نہ تھی جس سے ان کی کامیابی کی امید کی جاسکتی۔لیکن کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں جس میں مسلمانوں نے پسپائی کی تہمت اٹھائی ہو یا راہِ فرار اختیار کی ہو۔مسلمانوں کے دل ودماغ میں یہ بات پیوست کردی گئی تھی کہ تمہیں اللہ کا پیغام بہرصورت اللہ کے بندوں تک پہنچانا ہے اور ان کے لئے اللہ کی زمین پر اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ممکن بنانا ہے اور اگر ظالم قوتیں ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتیں تو تمہیں ایسے تخت وتاج کو ختم کرنا ہے اور ایسی قوتوں کی حکمرانی کو سرنگوں کرنا ہے۔اس کیلئے تمہیں بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرانا ہوگا یاد رکھو یہ سوچ کر کبھی میدانِ جنگ میں نہ اترنا کہ تمہیں بہرصورت فتح حاصل کرنی ہے۔تمہارے سامنے ایک فرض کی انجام دہی ہے اس فرض کو انجام دیتے ہوئے اگر تمہیں کامیابی ملتی ہے تو یہ مزید ادائے فرض کیلئے آگے بڑھنے کا پیغام ہے اور اگر تم اس راستے میں کام آجاتے ہو تو شہادت ہی اصل مقصود اور اصل اللہ کا انعام ہے جس کی ہمیشہ ایک مومن تمنا کرتا ہے۔یہی وہ پختہ اعتقاد تھا جو مسلمانوں کو میدانِ جنگ میں ثابت قدم رکھتا تھا۔اس لئے آیت کریمہ میں سب سے پہلے اسی کا حکم دیا گیا۔

اللہ کی یاد:

دوسری جس بات کا حکم دیا گیا وہ یہ ہے کہ تم کثرت سے اللہ کو یاد کرو۔جنگ کی تیاری کے ایام ہوں یا جنگ کی ہولناکی کے لمحات۔ایک مومن کی اصل قوت اور محبوب متاع اللہ کا ذکر اور اس کی یاد ہے۔یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کسی مشکل میں مبتلا ہوتا یا کسی معرکے میں شریک ہوتا ہے تو اسے ہمیشہ اپنی محبوب ترین چیز کی یاد آتی ہے۔کوئی اپنی اولاد کو یاد کرتا ہے،کوئی مال ومتاع کو یاد کرتا ہے اور کوئی اپنی جان کی فکر میں پریشان ہوتا ہے۔ایک مومن کی محبوب ترین متاع چونکہ اللہ کا ذکر اور اسکی یاد ہے اس لئے وہ عین حالتِ جنگ میں بھی اسی کو یاد کرتا ہے۔زبان سے اسی کا ذکر کرتا ہے اور دل اسی کی محبت سے آباد رہتا ہے اور پھر یہ محبوب ایسا ہے جو صرف دل کی تسکین ہی کا باعث نہیں بنتا بلکہ مومن کی قوت کا اصل سرچشمہ بھی وہی ہے۔مومن کی تگ وتاز کا اصل مقصد ومنزل بھی وہی ہے۔ایک مومن اسی کی رضا کیلئے میدانِ جنگ میں اترتا ہے،اسی کی نصرت وتائید کے سہارے بڑی سے بڑی قوت سے ٹکراتا ہے،اسی کو اپنی کمزوریوں کا مداویٰ سمجھتا ہے اور اسی کو اپنی کامیابی یا ناکامی کے نتیجے میں اجر وثواب اور جزا کا مالک سمجھتا ہے۔اس لحاظ سے اس کی یاد، یادوں کا ایک گلدستہ ہے جس کی ہر پتی خوش رنگ اور جس کی ہر لہر مشامِ جاں کو ہمیشہ کیلئے معطر رکھنے والی ہے۔اس کی یاد میں ڈوب کر ایک مومن جب آگے بڑھتا ہے تو پھر وہ اپنی ذات میں بظاہر ایک فرد ہوتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اللہ کی تجلیات کا پرمورد تو ہوتا ہے۔وہ بظاہر ایک قطرہ ہوتا ہے لیکن وہ ایک ایسے سمندر کا قطرہ ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں۔وہ سمندر سے کٹ جائے تو اسے گرم ہوا کا ایک جھونکا ختم کرنے کیلئے کافی ہے۔لیکن سمندر سے متعلق رہ کر وہ ایک ایسا طوفان ہے جس کا سامنا کرنے کی کسی میں ہمت نہیں۔اس کے جسم کا ایک ایک عضو اللہ کی چاکری کا غماز ہے۔اس کے احساس کی ایک ایک لہر اللہ کی یاد کی خوشبو ہے۔وہ دیکھتا ہے تو اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔وہ چلتا ہے تو اللہ کی تائید سے چلتا ہے،وہ پکڑتا ہے تو اس کی قوت سے پکڑتا ہے۔اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب وکار آفریں کار کشا وکار ساز

اس قوت کا اصل سرچشمہ اللہ کا ذکر اور اس کی یاد ہے۔اسی طرح یہ ذکر اور یاد ایک مومن کا حصار بھی ہے اور اس کا نگران بھی۔وہ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو یہ تصور کبھی اس سے الگ نہیں ہوتا کہ میں اپنے اللہ کی نگاہوں میں ہوں۔اس کے دماغ میں سوچ کی ایک لہر اٹھتی ہے۔تو

Marfat.com

جانتا ہے کہ میری سوچ بھی اللہ کے علم سے باہر نہیں اسلیئے نہ اس کا دماغ بھٹکتا ہے نہ اس کا عمل سرکشی کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ چونکہ ایک ہمہ وقتی اور ہمہ جہت کام ہے اس لئے اذکروا کے ساتھ کثیراً کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ اللہ کو زیادہ سے زیادہ اور کثرت سے یاد کرو۔ جب کہ کسی اور عبادت کے بارے میں کہیں بھی کثیراً کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ کہیں یہ نہیں فرمایا نماز کثرت سے پڑھو، روزہ کثرت سے رکھو، اس کی وجہ یہ ہے کہ باقی تمام عبادات وقتِ مخصوص میں اعمالِ مخصوصہ کی ادائیگی کا نام ہے لیکن ذکر کیلیئے کوئی وقت نہیں نہ اس کا کوئی خاص طریقہ ہے، نہ اس کی کوئی خاص شرائط ہیں، نہ اس میں وضو کی پابندی ہے، نہ اس میں لباس لازمی ہے، نہ قبلہ کی طرف رخ کرنا ضروری ہے۔ ہر شخص ہر حال میں باوضو، بے وضو، کھڑے، بیٹھے، لیٹے، اللہ کا ذکر کرسکتا ہے۔ یوں تو یہ ذکر ہر حال میں مومن کی زندگی ہے لیکن جنگ میں یہی ذکر مومن کیلیئے کبھی سہارا بنتا ہے اور کبھی قوت کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ کبھی دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگنا ذکر ہے اور کبھی کفر کو ہراساں کرنے کیلیئے ''نعرۂ تکبیر'' لگانا اللہ کا ذکر ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مسلمان جب اللہ کی یاد میں ڈوب کر اپنی زندگی اس کی اطاعت میں دے کر اسی پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے اور صرف اسی کی قوت کے سہارے اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے تھے تو فی الواقع کفر کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ بعض دفعہ تو ایسا بھی ہوا کہ قلعہ کی فصیلیں گر گئیں۔ اس لئے کہ بظاہر یہ ایک لفظ ہے جس کو انسانی لہجہ ادا کرتا ہے لیکن حقیقت میں یہ اللہ کی قوت کا ظہار ہے اس لئے فرمایا کہ اگر تم نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور اللہ کی یاد کو حرزِ جان بنایا تو امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تمہیں فلاح سے نوازے گا۔

اسباب کے پردے میں اللہ کی مدد:

اللہ جب کسی کی مدد کرنا چاہتا ہے تو اسے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اسباب کے بغیر بھی مدد کرسکتا ہے۔ لیکن اس کا قانون یہ ہے کہ وہ جب بھی مدد کرتا ہے اسباب کے پردے میں کرتا ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کرتا کہ اپنے پیغمبر پر ایمان لانے والوں کو یہ کہہ دے کہ تم آرام سے گھر بیٹھو، تمہیں معرکۂ کارزار میں جانے کی زحمت اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہماری قدرتیں اس کیلیئے کافی ہیں۔ ہم تمہارے دشمن کو فنا کیے دیتے ہیں شہروں کے راستے تمہارے لئے کھول دیتے ہیں تم خراماں خراماں چلو اور شہروں پر جا کر قابض ہو جاؤ۔ بنی اسرائیل کے ایسے ہی بگڑے ہوئے تصورات تھے جس نے انہیں اللہ کی رحمت سے محروم کردیا۔ اس لئے مسلمانوں کو صاف صاف بتایا گیا کہ میدانِ جنگ میں اترنا دشمن سے نبرد آزما ہونا استقامت اور پامردی کی تصویر بن جانا اور کہیں بھی کمزوری کا اظہار نہ کرنا اور ہر طرح کے حالات میں اللہ کو یاد کرنا اور اسی سے سہارا چاہنا یہ تمہاری ذمہ داری ہے اس کے بعد نصرت وتائید کیلیئے فرشتے اتارنا، دشمن کے دلوں میں رعب ڈال دینا مٹھی بھر سنگریزوں میں بموں کی طاقت بھر دینا۔ یہ پروردگار کا کام ہے لڑو گے تم لیکن قوت وہ عطا کرے گا، حوصلہ تم دکھاؤ گے حوصلوں کو ثمر بار وہ کرے گا۔ اسلام کا یہی وہ راز ہے جس کا کفر کو کبھی ادراک نہ ہوسکا لیکن وہ نہ سمجھتے ہوئے بھی آج تک اس سے لرزاں وترساں ہے۔ دنیا اس بات کو جانتی ہے کہ میدانِ جنگ میں ہمیشہ فوجوں کے حوصلے لڑتے ہیں مورال کام آتا ہے بے حوصلہ فوجیں تو دھرتی کا بوجھ ہوتی ہیں اور حوصلہ مند مختصر تعداد میں بھی ہوں تو وہ قوت کی علامت ہوتے ہیں لیکن دنیا اس راز کو نہیں پاسکی کہ حوصلہ اور مورال ظاہری تدبیروں سے نہیں بلکہ اپنے موقف کی صداقت اپنے راستے کی سچائی اور اللہ پر اعتماد اور توکل اور اس کے ذکر سے پیدا ہوتا ہے اور یہ وہ دولت ہے جس کی اس آیتِ کریمہ میں خبر دی گئی ہے۔

اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت:

دوسری آیتِ کریمہ میں کچھ تو مزید ہدایات دی گئی ہیں اور کچھ چیزوں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلی بات یہ فرمائی کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ ذکر اللہ کا لازمی نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہی ہونا چاہیئے۔ ایسا ذکر اور ایسی یاد جس کے نتیجے میں اپنی محبوب ذات کی اطاعت پیدا نہیں ہوتی وہ محض زبان کا جمع خرچ اور دماغ کی عیاشی ہے۔ ایسی یاد کو نفاق تو کہا جاسکتا ہے ایمان کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا، اس لئے ضروری ہے کہ حالات کیسے ہی ہوں کبھی اللہ اور رسول کی اطاعت سے قدم باہر نہیں جانا چاہیئے۔ ممکن ہے اس آیتِ کریمہ میں اللہ اور رسول کی عام اطاعت کے ساتھ ساتھ حالتِ

Marfat.com

جنگ میں بطور خاص رسول اللہ ﷺ کے احکام کی اطاعت پر توجہ دلائی گئی ہو کیونکہ جنگ کی حالت میں عام حالت کی نسبت احکام کی اطاعت میں ذرا بھی کمزوری آجائے تو فوج کا ڈسپلن تباہ ہوجاتا ہے۔ جس کی ایک مثال مسلمانوں نے جنگ احد میں دیکھی اور اس کے نتیجے میں بہت نقصان بھی اٹھایا۔ آنحضرت ﷺ نے کچھ تیراندازوں کو جبل الرماۃ پر متعین فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہو تمہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلنا لیکن جب قریش کا لشکر بھاگ نکلا تو ان تیراندازوں نے یہ سمجھا کہ اب جنگ ختم ہوگئی ہے چنانچہ وہ بھی مال غنیمت سمیٹنے کیلئے پہاڑ سے نیچے اتر آئے ان کے امیر نے ہر چند سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں ہر حال میں آنحضرت ﷺ نے یہاں سے قدم ہٹانے سے منع کیا تھا لیکن ان کی اکثریت نے یہ کہہ کر جگہ چھوڑ دی کہ جب جنگ ہی ختم ہوگئی ہے تو اب یہاں رک کر کیا کرنا۔ خالد بن ولید نے جب دیکھا کہ میدان خالی ہے، انہوں نے پہاڑ کے اوپر سے چکر کاٹ کر ادھر سے حملہ کیا اور جنگ کا پانسہ پلٹ دیا، جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہوگئی۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ آنحضرت ﷺ کے حکم کی تعمیل میں کوتاہی ہوئی۔ اس لئے یہاں فرمایا کہ دیکھنا اللہ اور رسول کی اطاعت میں کمی نہ کرنا ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم آپس میں اختلاف کا شکار ہوجاؤ گے۔ کچھ لوگ حکم کی تعمیل پر زور دیں گے اور کچھ لوگ اس کی تاویل کر کے حکم کی تعمیل سے نکل جائیں گے۔ اس لئے مستقل حکم دیا کہ آپس میں مت جھگڑو آپس میں اختلاف مت کرو۔ تمہیں ہر معاملے میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرنی ہے اور اگر تم آپس میں اختلاف کرنے لگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کمزور ہوجاؤ گے تم میں کمزوری اور بزدلی آجائے گی کیونکہ کوئی بھی فوج ہو ان کا باہمی اتحاد ان کی اصل قوت ہوتا ہے۔ اگر اس اتفاق واتحاد میں دراڑیں پڑ جائیں تو یوں سمجھئے کہ قوم کی عمارت میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ قومی زندگی کے قلعے کی فصیلوں میں ڈھے جانے کے آثار پیدا ہوجاتے ہیں اور باہر کی قوتوں کو جب اس کا اندازہ ہوتا ہے تو مسلمانوں کی قوت کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ دشمن اس خیال سے ہمیشہ لرزاں براندام رہتا ہے کہ مسلمان ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں ان میں شگاف ڈالنا ممکن نہیں۔ لیکن جب مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے تو دشمن کے دلوں سے ان کا رعب جاتا رہتا ہے اور یہ وہ خطرناک بات ہے جس سے زیادہ تباہ کن بات کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ایسی تمام کمزوریوں پر قابو پانے کیلئے ایک ایسا حکم دیا جس پر عمل کے نتیجے میں تمام ممکن کمزوریوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

صبر کی تلقین:

فرمایا ''وَاصْبِرُوْا'' اور صبر کرو۔ یعنی اپنے جذبات وخواہشات کو قابو میں رکھو کیونکہ جذبات وخواہشات کے بے قابو ہونے کے نتیجے میں اختلافات کو در آنے کا موقعہ ملتا ہے۔ جلد بازی، گھبراہٹ، ہراس، طمع اور نامناسب جوش سے بچو۔ ٹھنڈے دل اور جچی تلی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرو۔ خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو قدموں میں لغزش نہ آنے پائے۔ اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیض وغضب کا ہیجان غالب نہ آنے پائے۔ مصائب کا طوفان بھی کبھی اللہ کے اعتماد کو شکست نہ دے سکے اور بڑی سے بڑی پریشانی بھی کبھی حواس پر اپنی گرفت قائم نہ کرسکے۔ کبھی دنیوی منافع اور فوائد اور لذات نفس کی ترغیبات، طبیعت کی آسودگی کو شکست نہ دے سکیں۔ ایسے تمام کمزور جذبات کو صبر کی زنجیر پہنا کر رکھو اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ اگر کبھی رائے کا اختلاف پیدا ہو اور ایسا پیدا ہونا ناگزیر بھی ہے تو دیکھو اپنی رائے پر ضرورت سے زیادہ جماؤ اختیار نہ کرو اور اپنی بات پر حد سے زیادہ اصرار نہ کرو۔ نیت میں کبھی اپنی ہی رائے پر پسندیدگی کے اثرات غالب نہ آنے پائیں۔ اپنی بات کہنا اور دوسروں کی سننا یہ دو متوازن پلڑے ہیں جس کے نتیجے میں صراط مستقیم کھلتی ہے ان تمام پہلوؤں کو برابر رکھنے کا نام صبر ہے۔ اس صبر کے نتیجے میں تنازعات پر غلبہ پایا جاسکتا ہے اور اسی سے باہمی تلخیوں پر قابو پایا جاسکتا ہے اور اسی سے اللہ کا وہ انعام میسر آسکتا ہے جسے اللہ کی معیت کہا گیا ہے اور یہ وہ انعام ہے جب مسلمان کو نصیب ہوجاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی قوت نہ اس کا کچھ بگاڑ سکتی ہے نہ اس کے سامنے کھڑی رہ سکتی ہے۔ اس لئے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔

وَلَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○

اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور وہ اللہ کے راستے سے روکتے تھے اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔) (الانفال: ۴۷)

Marfat.com

مسلمان کا کردار اس کی پہچان ہے:

مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے سیرت و کردار کے جس معیار کو اپنانے کی ہدایت کی گئی ہے ان میں سے کچھ ہدایات تو وہ ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی امن کی زندگی سے ہے۔ لیکن اس رکوع میں وہ ہدایات دی جارہی ہیں جن کا تعلق حالتِ جنگ سے ہے۔ گزشتہ دو آیات میں جنگ کے دوران مسلمانوں کو جس کردار کا نمونہ ہونا چاہیے اس کے بارے میں ہدایات دی گئیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ جس طرح تم حق کے علمبردار اور حق کے گواہ بن کر اٹھے ہو تمہاری ایک ایک بات اور تمہارا ایک ایک عمل بالکل اسی طرح اس کا منہ بولتا ثبوت ہونا چاہیے۔ جس طرح قریشِ مکہ کا لشکر جس جاہلیت کا علمبردار بن کر اٹھا ہے اور اس کی بقا اور اسلام کو ختم کرنے کیلئے جس طرح وہ قوت کا اظہار کرتا ہوا اور اپنے کردار کو اچھالتا ہوا میدانِ جنگ میں پہنچا اس سے دیکھنے والی نگاہوں کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ اسلام جس جاہلیت اور کفر کو مٹانے کیلئے اٹھا ہے وہ دراصل وہ سیرت و کردار اور وہ رویہ ہے جس کی مکمل تصویر قریشِ مکہ ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کیلئے لازم ہے کہ آئندہ کی زندگی میں کبھی کسی کافر گروہ کے کردار کا عکس ان میں دکھائی نہیں دینا چاہئے۔ ورنہ ان کی اصل حیثیت گم ہوجائے گی۔ وہ جس چیز کو اپنے ایمان اور عمل سے ختم کرنے کیلئے اٹھے ہیں اگر اسی چیز کے اثرات ان میں بھی دکھائی دینے لگیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکیم اور طبیب جن امراض اور وباؤں کے علاج کیلئے جان پر کھیل کر نکلے تھے انہوں نے انہیں امراض کے ساتھ سازگاری پیدا کرلی ہے تو اب ان کا شمار اطباء میں نہیں بلکہ بیماروں میں ہوگا۔ اللہ حق کی گواہی کیلئے جس گروہ کو اٹھاتا ہے وہ اللہ سے کسی نسبت سے نہیں پہچانے جاتے بلکہ ان کی پہچان ان کی سیرت و کردار ہوتا ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں قریشِ مکہ کی نمایاں علامتوں کو واضح فرما کر حکم دیا گیا ہے کہ مسلمانوں یہ باتیں تمہارے اندر کبھی نہ آنے پائیں ورنہ تم اپنی شناخت گم کردو گے۔

قریشِ مکہ کی تین برائیاں:

قریشِ مکہ کی تمام برائیوں کو سمیٹ کر تین بڑی بڑی خرابیوں کی صورت میں بیان فرمایا۔ جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور تکبر اور نخوت کا اظہار کرتے ہوئے نکلے ہیں۔ وہ اپنے بندہ ہونے کو بھول کر اپنی خدائی کا ناسور پھونکنا چاہتے ہیں۔ انہیں بالکل یاد نہیں کہ انہیں ایک دن مرنا ہے۔ دنیوی اسباب چند دنوں کی بات ہے آج اس کے پاس ہے کل اس کے پاس۔ موت کی ایک پھونک ہمیشہ کے کروفر کو بجھا کر رکھ دیتی ہے۔ مصیبت کا ایک جھونکا آرام و راحت کی صف لپیٹ دیتا ہے۔ زندگی کا کوئی حادثہ خوشحالیوں کو تلخ یادوں میں تبدیل کردیتا ہے۔ لیکن وہ زندگی کے ان حقائق کو بالکل بھول کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس وقت کی سب سے بڑی قوت ہیں۔ کوئی قوم بھی جب اپنی اصل حقیقت کو بھول کر مصنوعی زندگی اختیار کرلیتی ہے تو انسانیت کا پیراہن باقی نہیں رہتا۔ انسانی سیرت و کردار کی بجائے حیوانی خصلتیں اور بہیمانہ جبلتیں دل و دماغ پر غالب آجاتی ہیں۔ وہ زندگی کا حاصل انسانی کمالات کو نہیں سمجھتے بلکہ عیش کوشی اور سفلی جذبات کی تسکین ان کی زندگی کا حاصل بن جاتی ہے۔ جب انہیں وسائل کی وسعت نظر آتی ہے تو وہ نفسانی آلودگیوں میں ڈوب جانے کو آسودگی سمجھنا شروع کردیتے ہیں۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے بے حیائی کی مجالس، نا ؤ نوش کے سامان، قحبہ گری کے امکانات، ان کے وسائل کا ہدف بن جاتے ہیں۔ چنانچہ قریشِ مکہ بھی جب ایک عظیم لشکر لے کر نکلے تو وہ اپنی بڑائی کے زعم میں یہ سمجھتے تھے کہ ہماری بڑائی کا زعم ناتمام رہے گا۔ اگر ہم نے صرف طاقت کا اظہار کیا لیکن عیش و عشرت کو بہ ہمہ وجوہ بروئے کار نہ لاسکے۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھ گانے بجانے والی لونڈیاں لے کر نکلے جن کے ساتھ وہ جگہ جگہ ٹھہر کر رقص و سرود اور شراب نوشی کی محفلیں برپا کرتے ہوئے جارہے تھے۔ جو سردار شراب کے نشے میں زیادہ مخمور ہوتا اور بے حیائی کا زیادہ اظہار کرتا وہ اتنا ہی زیادہ اپنے آپ کو بڑا آدمی سمجھتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک یہی بڑائی کی علامت تھی۔ مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ دیکھنا اس راستے پر چلنے کی کبھی کوشش نہ کرنا وسائل کو اللہ کی امانت سمجھنا اور ان کا حق ادا کرکے اللہ کے سامنے سرخرو ہوکر جانا۔

قریشِ مکہ کے لشکر کی دوسری صفت جس کا ذکر فرمایا گیا ہے وہ تھی "رِئَاءَ النَّاسِ" کہ وہ اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے۔ جو قبیلہ یا جو قریہ راستے میں آیا۔ ان پر اپنی طاقت اور شوکت اور اپنی کثرتِ تعداد اور اپنے سروسامان کا رعب جماتے ہوئے نکلے۔ ان کی زبانوں پر اپنی بڑائی کے

Marfat.com

نعرے اوران کے سروں میں اپنی عظمت کا سودا سمایا ہوا تھا۔ جا و بے جا چیلنج کرتے کہ آج ہمارے مقابل کون آسکتا ہے کس میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ہمارا راستہ روک سکے۔ وہ اپنے آپ کو وقت کی سب سے بڑی قوت سمجھتے تھے جب اس طرح کا پندار کسی بھی قوم کے سروں میں سماجاتا ہے تو ظلم کی کھیتی ہری ہوتی اور مظلومیت کے سائے گہرے ہو جاتے ہیں۔ کمزور، کمزور تر اور مظلوم، مظلوم تر ہو جاتا ہے۔ زمین جنگل کی طرح صرف طاقت ور کو جگہ دیتی ہے اور کمزور شکار ہونے کیلئے رہ جاتا ہے۔ اب دنیا میں کشمکش حق و باطل کی نہیں بلکہ طاقت اور ضعیفی کے درمیان ہوتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں سے فرمایا کہ جب بھی اللہ تمہیں طاقت وقوت عطا فرمائے تو دیکھنا اپنی طاقت کو اللہ کی طاقت سمجھنا اور اپنا سر اس کی طاقت کے سامنے جھکا دینا اسی کی کبریائی کا اعلان کرنا اور اپنی بندگی کو بندگی کے آداب سکھانا۔

آیتِ کریمہ میں ایک تیسری بات کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ پہلی دونوں باتیں قریشِ مکہ کے کردار اور خصائل کا حصہ تھیں تو یہ تیسری بات ان کیلئے مقصد کا درجہ رکھتی ہے۔

وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (وہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔)

ان کی زندگی کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ کے راستے پر نہ چلنے دیں۔ ان کی اخلاقی حالت کا بگاڑ کہاں تک پہنچا تھا وہ تو ہم نے ان کی دو خصلتوں کے آئینے میں دیکھا لیکن ان کے مقصدِ زندگی کی شناعت نے ان کے اخلاقی بگاڑ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ اتنی بڑی قوت لے کر مکہ سے اس لئے نہیں نکلے کہ اچھائی کی کسی بات کو توانا کیا جائے اور سچائی کی کسی بات کو عظمت دی جائے بلکہ وہ اس لئے نکلے ہیں کہ حق وراستی اور عدل وانصاف کا جو پرچم لے کر مسلمان اٹھے ہیں اس کو ہمیشہ کیلئے سرنگوں کر دیا جائے تا کہ ہماری طاغوتی زندگی اور ہمارا نمرودی تخت وتاج ہر طرح کی تنقید اور تصادم سے پاک رہے۔ ہم اللہ کی زمین میں شیطانی زندگی گزارنے میں آزاد ہوں۔ ہمارے ظلم کو روکنے والا کوئی نہ ہو اور ہماری مصنوعی عظمتوں کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ اٹھے۔ مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم دنیا کیلئے مینارۂ نور ہو، قیامت تک کیلئے ہر طرح کی تاریکیوں میں روشنی کا سامان تمہارے دم سے ہے اگر تمہاری روشنی بادلوں میں ڈوب گئی یا تم خود تاریک راہوں کے مسافر بن گئے تو دنیا اندھیر ہو جائے گی اور یہ مت سمجھو کہ جاہلیتِ قدیمہ کے بعد جاہلیتِ جدیدہ نہیں آئے گی۔ اشرارِ قریش کے بعد کہیں اشرار کا لشکر تیار نہیں ہوگا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ جس طرح اہلِ حق کا قافلہ آگے بڑھے گا اسی طرح اہلِ باطل بھی جب موقع ملے گا سر اٹھائیں گے۔ چنانچہ آج ہم کفار کے لشکر اور کفر کی طاقتوں کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جو حال قریشِ مکہ کا تھا ان کا حال ان سے بھی بدتر ہے۔ آج بھی وہی قحبہ خانے، فواحش کے اڈے، شراب کے مٹکے، ہر لشکر کیلئے لازمی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر بھی اسلامی قوتوں کو ختم کرنا اور اسلامی مراکز کی جڑ اکھاڑنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اقبال نے انہیں کو دیکھتے ہوئے شاید کہا تھا:

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی قوتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

اخلاقی بگاڑ پہلے سے کہیں بڑھ چکا کفر کے مکروہ ارادوں میں پہلے سے زیادہ طاقت آگئی ہے۔ وسائلِ جنگ میں پہلے سے کہیں فراوانی ہے۔ ٹیکنالوجی کی قوت نے کافر طاقتوں کو خدائی کے منصب پر بٹھا دیا ہے۔ شیطان پوری طرح مطمئن ہے کہ میرے اسلحۂ جنگ میں کوئی کمی نہیں۔ لیکن مومن کی بے سروسامانی پہلے سے بڑھ گئی ہے نہ عقیدے میں قوت ہے نہ اخلاق میں دلآویزی اور نہ مقصد کی لگن حالانکہ:

مومن کو ہے پھر معرکۂ روح وبدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو ہے پامردیِ مومن کا بھروسہ
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

Marfat.com

آج شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے عہدِ رفتہ کو یاد کریں۔ اپنے مقاصدِ زندگی کو سمجھیں۔ اپنے فرائض کو پہچانیں۔ کافر قوتوں کے تزویری داؤ پیچ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آندھی جو سر پر تلی کھڑی ہے اس کے آنے سے پہلے اپنے بکھرے ہوئے شیرازے کو سمیٹ لیں اور اس بات کا یقین رکھیں کہ اگر یہ اللہ کے بھروسے پر اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے تو کفر کی طاقت چاہے کیسے بھی سہی:

وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ　(وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں جاسکتے۔)

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

(اور یاد کرو! جب مزین کردیئے ان کے لئے شیطان نے ان کے اعمال اور کہا کہ آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں ہوگا اور میں تمہارا حمایتی ہوں تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو وہ الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا کہ میں تم سے بری ہوں، میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں، اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔) (الانفال: ۴۸)

ایک اہم حقیقت کا انکشاف:

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے واقعات کے تناظر میں ایک ایسی حقیقت کا انکشاف فرمایا ہے جس کے سمجھ لینے سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں اور اس حقیقت کی اہمیت کے پیشِ نظر پروردگار نے قرآنِ کریم میں متعدد مواقع پر اس کا ذکر فرمایا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے اور آپ کو بھی بعض دفعہ اس صورتحال سے واسطہ پڑا ہوگا کہ آپ اپنے کسی ایسے عزیز کو غلط کام سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں جو پے در پے غلطیوں کا ارتکاب کررہا ہے۔ لیکن آپ کو اس وقت انتہائی تعجب ہوتا ہے جب آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی ساری کوششیں اکارت جارہی ہیں۔ وہ شخص یا تو آپ کی بات ہی نہیں سنتا یا سنتا ہے تو آپ کی کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی۔ بالکل سطحی سی باتوں پر اس کا اصرار جاری رہتا ہے۔ آپ اسے جن نقصانات کا حوالہ دے کر روکنا چاہتے ہیں وہ انہیں نقصانات کو فوائد سمجھتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ کسی وجہ سے اس شخص کے دل و دماغ میں اس کے اپنے اعمالِ بد یا اس کے غلط فیصلے ایک ایسی شکل اختیار کرچکے ہیں جو اس کو اچھی لگنے لگی ہے۔ وہ بری ہونے کے باوجود اسے بری نہیں لگتی بلکہ وہ اسی میں خوش رہتا ہے اور اسی کو اپنی خوشیوں کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ شراب نوشی ہر سمجھدار آدمی کے نزدیک ''ام الخبائث'' ہے۔ لیکن شراب نوشوں کو عقلی دلائل یا اخلاقی نصیحتوں سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔ کام چوروں کو باور نہیں کرایا جاسکتا کہ تم اپنی زندگی برباد کررہے ہو۔ بدمحنت اور نکمے لوگوں کو یہ سمجھانا آسان نہیں کہ جو وقت تمہارے ہاتھوں سے نکل رہا ہے وہ لوٹ کر نہیں آئے گا کیونکہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا رویہ ایسا خوشنما محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسے بدلنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ یہ وہ چیز ہے جسے قرآنِ کریم تزئینِ شیطان کا نام دیتا ہے کہ شیطان نہایت چابک دستی اور ہوشیاری سے انسانی برائیوں اور کوتاہیوں کو خوشنما شکل میں ارتکاب کرنے والوں کے سامنے رکھتا ہے اور ایسے ایسے سبز باغ ان کو دکھاتا ہے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہوجاتے ہیں کہ جو کچھ ہم کررہے ہیں وہی صحیح ہے۔ ایک سگریٹ پینے والا اپنے ہاتھوں سے اپنی دولت کو آگ لگاتا ہے، شراب پینے والا جانتا ہے کہ میں خود اپنی عقل کا دشمن ہوں۔ بایں ہمہ! وہ شیطان کے جال سے نکلنے کی کبھی کوشش نہیں کرتا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس حقیقت کے انکشاف کے ساتھ ساتھ قریشِ مکہ کی صورتحال کی توجیہ پیش کی گئی ہے۔ تیرہ سال تک نبی کریم ﷺ نے ان کے سامنے اللہ کے دین کی دعوت پیش کی، حق کا حق ہونا واضح فرمایا اور باطل کا باطل ہونا کھول کر رکھ دیا۔ اپنی صداقت و حقانیت کے عجیب عجیب نشانات دکھائے اپنی استقامت سے اپنا برسرِ حق ہونا پوری طرح واضح کردیا لیکن قریش کی اکثریت اور بڑے بڑے سردار کسی طرح ایمان لانے کیلئے تیار نہ ہوئے اور اب وہ حق کی اس آواز کو ہمیشہ کیلئے خاموش کرنے کی خاطر ایک بڑی قوت لے کر مکہ سے نکل رہے ہیں اور شیطان نے ان کے ایک ایک عمل کو اس طرح ان کے سامنے مزین کیا ہے کہ وہ پوری طرح مطمئن ہیں کہ ہم جو کچھ کررہے ہیں اس میں کسی غلطی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

مفسرین نے ان کی ایک پریشانی کا بھی ذکر کیا ہے جسے شیطان نے اپنی عیاری سے دور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حق کے مقابلے میں ان کی تمام کوششیں شیطان کی اسی فنکاری کا نتیجہ تھیں۔

امام ابن جریر نے حضرت عبداللہ ابنِ عباس کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جب قریشِ مکہ کا لشکر مسلمانوں کے مقابلے کیلئے مکہ سے نکلا تو ان کے دلوں میں ایک پریشانی تھی کہ ہمارے قریب میں قبیلہ بنوبکر آباد ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مسلمانوں کے مقابلہ پر جائیں اور یہ دشمن قبیلہ موقعہ پا کر اپنا ہاتھ دکھا جائے۔ ابوسفیان کے اطلاع دینے پر قریش گھبرا کر یا طیش میں آ کر نکل تو کھڑے ہوئے لیکن یہ خطرہ برابران کیلئے پریشانی کا باعث تھا۔ چنانچہ شیطان نے اس خطرے کے علاج کیلئے سراقہ ابنِ مالک کی صورت اختیار کی اور اس طرح قریش کے سامنے آیا کہ اس کے ہاتھ میں جھنڈا تھا اور اس کے ساتھ ایک دستہ بہادر فوج کا تھا۔ سراقہ بن مالک اس علاقہ اور قبیلہ کا بڑا سردار تھا۔ وہ آگے بڑھ کر قریش سے ملا اور انہیں یقین دلایا کہ تمہیں کسی طرح کی بھی پریشانی نہیں ہونی چاہئے تم عرب کی سب سے بڑی قوت ہو۔

لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ　(آج لوگوں میں سے تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔)

کیونکہ عرب میں تمہارے مقابلے کی کوئی طاقت نہیں یہ مٹھی بھر مسلمان تمہارا کیا بگاڑ سکتے ہیں یا کوئی اور قبیلہ تمہاری طرف کیسے میلی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے اور دوسری یہ بات اِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ ﴿میں تمہارا حمائتی ہوں﴾ اگر کوئی ایسا خطرہ ہوا بھی تو میں ہر طرح تمہاری مدد کروں گا اس طرح شیطان نے سراقہ ابنِ مالک کی شکل میں انہیں یقین دلا دیا کہ تم سب سے بڑی قوت ہو آج کوئی خطرہ تمہارا راستہ نہیں روک سکتا۔ اس طرح سے وہ قریش کو لے کر میدانِ بدر میں پہنچ گیا۔ لیکن جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں اور شیطان نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ساتھ حضرت جبرئیل اور میکائیل کی قیادت میں فرشتے بھی مدد کیلئے کھڑے ہیں تو اب اسے حقیقی خطرے کا احساس ہوا۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباس ﷺ کی روایت کے مطابق شیطان ایک قریشی جوان حارث بن ہشام کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا جیسے ہی فرشتوں کو دیکھا فوراً اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا حارث نے ٹوکا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ تم عرب کے سردار ہو اور تم نے ہماری معاونت کا وعدہ کیا ہے۔ اب عین وقت پر ہمارا ساتھ کیوں چھوڑ رہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں تم سے بری ہوں کیونکہ میں وہ کچھ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے کیونکہ وہ تو فرشتوں کو دیکھ رہا تھا لیکن انسانوں کو فرشتے نظر نہیں آرہے تھے۔ اس طرح وہ کفار کو میدان میں چھوڑ کر اپنا لشکر لے کر بھاگ گیا۔

شیطان کی خاص عادت:

ابنِ کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ شیطان کی یہ ہمیشہ سے عادت ہے کہ جب تک انسان برائی میں مبتلا نہیں ہو جاتا وہ برابر اس کے ساتھ لگا رہتا ہے اور برائی کو خوشنما بنا کر اس کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب وہ شخص برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر اسے چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے کیونکہ شیطان کے پیشِ نظر کسی انسان کا ہمیشہ ساتھ دینا نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد گمراہ کرنا ہے جب مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ الگ ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ O

شیطان کی عادت یہ ہے کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر یعنی اسے ترغیب دیتا رہتا ہے اور جب انسان کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے تو یہ کہہ کر الگ ہو جاتا ہے کہ میں تو تجھ سے بری ہوں کیونکہ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔　(الحشر: ١٦)

حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو عقل وخرد اور قوتِ تمیز دے کر خیر وشر کی پہچان عطا فرمائی ہے اور مزید کرم یہ فرمایا کہ اپنے رسول اور کتابیں بھیج کر حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا پوری طرح واضح فرما دیا۔ اسی طرح انسان کے امتحان کیلئے اللہ نے شیطان کو دجل وتلبیس کی مختلف صلاحیتوں سے بہرہ ور کیا ہے۔ وہ کبھی دل میں وسوسہ ڈالتا ہے اور کبھی سامنے آ کر انسانی شکل میں بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا خاص ہنر یہ ہے کہ انسان جس برائی کی طرف میلان اختیار کرتا ہے اس کو وہ زیادہ سے زیادہ خوشنما بنا کر دکھاتا ہے۔ لیکن اس کی انسان دشمنی کا عالم یہ ہے کہ جب انسان گمراہی میں ڈوب جاتا ہے اور حق کے راستوں سے پوری طرح منہ موڑ لیتا ہے اور وہ اسے چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اللہ کا مزید احسان یہ ہے کہ اس

Marfat.com

نے شیطانی طریقِ واردات کو کھول کر بیان کر دیا ہے تا کہ انسان اگر اس سے بچنا چاہے تو بچ سکے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ شیطانی تلبیسات سے بچنے کیلئے اللہ کے دین وشریعت کا علم بہت ضروری ہے کیونکہ شیطان بعض دفعہ نیکی کی صورت میں برائی دلوں میں اتار دیتا ہے۔ دین کا نام دے کر بے دینی کا بیج بو دیتا ہے۔ جو شخص شرعی احکام سے واقف نہیں ہے وہ بعض دفعہ نیکی کی محبت سے بدعات وخرافات کو نیکی سمجھنے لگتا ہے اور اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن جو شخص اللہ کی شریعت سے واقف ہے اسے اس طرح فریب دینا شیطان کیلئے آسان نہیں ہوتا۔

مزید یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شیطان چونکہ وسوسہ اندازی میں بہت مہارت رکھتا ہے اس لئے اس کی تلبیس سے بچنے کیلئے جہاں علم و احساس کی ضرورت ہے وہیں اللہ کی توفیق کی اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لئے ایک مومن کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے اللہ سے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق مانگتا رہے اور شیطانی تلبیسات سے محفوظ رہنے کیلئے ان تمام اعمال کو بروئے کار لائے جس کا ذکر حدیث وسنت میں موجود ہے۔

اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ
فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ
عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۴۹﴾ وَلَوْ تَرٰۤی اِذْ یَتَوَفَّی الَّذِیْنَ
كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا
عَذَابَ الْحَرِیْقِ ﴿۵۰﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ
بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۵۱﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ
كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ
شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۵۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ یَكُ مُغَیِّرًا نِّعْمَةً
اَنْعَمَهَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ
عَلِیْمٌ ﴿۵۳﴾ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا
بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ

Marfat.com

وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿٥٤﴾ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٥﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ
عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿٥٦﴾ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ
فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿٥٧﴾
وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى
سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ ع

یا کرو! جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہتے تھے ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اور جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں تو اللہ عزیز و حکیم ہے۔ اور اگر تم دیکھ پاتے جب روح قبض کرتے ہیں فرشتے ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا ہے مارتے ہیں ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر (اور یہ کہتے ہیں) اب چکھو مزہ جلنے کے عذاب کا، یہ بدلہ ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں سے اور اللہ بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔ (ان کا حال وہی ہے) جیسے حال تھا قومِ فرعون اور ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ بیشک اللہ زور آور سخت عذاب دینے والا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو دی ہو جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے طرزِ عمل کو اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ان کا حال وہی ہے جو حال تھا آلِ فرعون کا اور ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں ہلاک کر دیا ان کے گناہوں کی پاداش میں اور آلِ فرعون کو ہم نے غرق کر دیا اور یہ سارے کے سارے ظالم تھے۔ بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا پھر وہ کسی طرح ایمان نہیں لاتے۔ (خصوصاً ان میں سے وہ لوگ) جن سے آپ نے معاہدہ کیا ہے پھر وہ ہر مرتبہ اس معاہدے کو توڑ دیتے ہیں اور وہ بالکل نہیں ڈرتے، سو اگر آپ پائیں انہیں لڑائی میں تو انہیں ایسی مار ماریں کہ تتر بتر ہو جائیں وہ لوگ جو ان کے پیچھے ہیں امید ہے کہ وہ نصیحت حاصل کریں گے۔ اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو پھینک دیجئے ان کی طرف کا عہد اس طرح کہ آپ اور وہ برابر ہو جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۴۹ تا ۵۸) (رکوع:۷)

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○
یاد کرو! جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہتے تھے ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکے میں ڈال دیا ہے اور
جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں تو اللہ عزیز و حکیم ہے ○ (الانفال : ۴۹)

Marfat.com

منافقین کا تبصرہ:

مسلمان جب قریش کے مقابلے میں میدانِ بدر کی طرف نکلے تو جو لوگ صرف سر کی آنکھوں سے دیکھتے اور دماغ سے سوچتے تھے ان کیلئے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ یہ مٹھی بھر لوگ قریش کے عظیم لشکر کا مقابلہ کیسے کر پائیں گے۔ افرادی قوت تو جیسی کچھ ہے وہ سامنے ہے، وسائلِ جنگ کا نام نہیں، نہ جانے کس برتے پر اتنا بڑا اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے ان میں وہ لوگ بھی تھے جو ابھی تک نفاق کے مریض تھے۔ ایک منافق کیلئے یقیناً دل سے سوچنا اور ایمان کے نور سے دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ لوگ بھی یہی بات کہہ رہے تھے جن کے دلوں میں بیماری تھی۔ دلوں کی بیماری کو نفاق بھی کہتے ہیں اور حسد بھی۔ یہاں یقیناً نفاق تو مراد نہیں کیونکہ اس کا ذکر ''منافقون'' کے لفظ میں آ گیا، البتہ! اس سے مراد حسد ہو سکتا ہے اور حسد کرنے والے یوں تو بہت سے ہوں گے لیکن ان میں نمایاں گروہ یہود کا تھا معلوم ہوتا ہے یہاں وہی لوگ مراد ہیں۔ وہ حسد کے مارے دل کے پھپھولے پھوڑنے کیلئے ایسی باتیں کرتے تھے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ طالوت اور جالوت کی جنگ میں منظر نامہ اس سے مختلف نہیں تھا۔ طالوت کا لشکر اتنا ہی تھا جتنا مسلمانوں کا اور جالوت کے ساتھ ایک جم غفیر تھا۔ لیکن نتیجہ کیا رہا؟ اہلِ تورات خوب جانتے تھے۔ لیکن حسد کے مارے یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے کہ جس حق کو لے کر حضرتِ طالوت قلتِ تعداد کے باوجود نکلے تھے آج اسی حق کو لے کر مسلمان نکلے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کی بجائے یہ کہہ رہے تھے کہ درحقیقت مسلمانوں کو ان کے دین نے دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے ان کے پیغمبر کی شخصیت اور دعوت نے ایک ایسا افسوں پھونکا ہے کہ نفع وضرر کے پیمانے انہوں نے توڑ ڈالے ہیں۔ جنت کی خواہش نے زندگی کی خواہش کو شکست دے دی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انہیں موت کی طرف نکلتے ہوئے خوف نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان مادہ پرست لوگوں کو اس حقیقت کا ادراک کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کر لیتا ہے اور پھر اسی کے دین کی سربلندی کیلئے سب کچھ اس کی رضا کی خاطر جھونک دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو کبھی ضائع نہیں ہونے دیتا۔ وہ ہمیشہ ان کی مدد فرماتا ہے، وہ چونکہ عزیز ہے اس لئے اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ جس کی وہ مدد کر رہا ہے اس کے مقابلے میں کتنی بڑی طاقت ہے اور وہ چونکہ حکیم ہے اس لئے اس کا ہر فیصلہ حکمت کی تصویر ہوتا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ○ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○

(اور اگر تم دیکھ پاتے جب روح قبض کرتے ہیں فرشتے ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کیا ہے، مارتے ہیں ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر (اور یہ کہتے ہیں) اب چکھو مزہ جلنے کے عذاب کا ○ یہ بدلہ ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں سے اور اللہ بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔) (الانفال: ۵۰، ۵۱)

جوابِ شرط کے حذف کا فائدہ:

وَلَوْ تَرٰٓى میں ''لَوْ'' حرفِ شرط ہے۔ لیکن اس کا جوابِ شرط آیت میں ذکر نہیں فرمایا گیا۔ اہلِ بلاغت کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کے ہولناکی یا اس کے کمال کو بیان کرنا مقصود ہو تو وہاں عموماً جوابِ شرط محذوف کر دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے کہ اگر آپ دیکھ لیتے کہ جب کافروں کی جانیں نکالی جاتی ہیں ان کے ساتھ کیا گزرتی ہے تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ وہ کس عظیم مصیبت اور ہولناک عذاب سے دوچار ہوتے ہیں۔ لفظوں میں اسے ذکر کرنے کی بجائے اسے محذوف فرما کر اس کی ہولناکی کے منظر کو کہیں زیادہ ہولناک بنا دیا ہے۔

Marfat.com

مبالغہ فی النفی کامفہوم:

آیت کے آخر میں فرمایا: لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ اس کا بظاہر یہ معنی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر زیادہ ظالم نہیں کیونکہ ظَلَّامٍ اسمِ مبالغہ ہے حالانکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ پروردگار بالکل ظالم نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان میں جب مبالغہ پر نفی آتی ہے تو اس سے مبالغہ فی النفی کا مضمون پیدا ہوتا ہے۔ یہاں بھی اس کا مفہوم یہ نہیں کہ وہ بندوں پر زیادہ ظالم نہیں بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں۔

اب آیت کا مفہوم دیکھئے۔ سیاقِ کلام دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پروردگار یہ فرمار ہے ہیں کہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ میدانِ بدر میں جو کچھ گزری بظاہر وہ ایسی چوٹ ہے جس کی گہرائی کا اندازہ کرنا آسان نہیں۔ وہ لشکر جسے زعم یہ تھا کہ آج اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا وہ جزیرۂ عرب کی سب سے بڑی قوت ہے اسے چند غیر مسلح اور نہتے مسلمانوں نے وہ سبق سکھایا جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ ان کی پوری قیادت تہِ تیغ کردی گئی، قیادت کی دوسری صف زنجیروں میں باندھ لی گئی، اس شکست سے پورے عرب میں ان کی طاقت کا بھرم کھل گیا، وہ رسوائی ہوئی کہ الامان والحفیظ۔ لیکن اللہ فرماتا ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں اگر تم کہیں اس منظر کو دیکھ لیتے جبکہ جنگِ بدر میں قتل ہونے والوں کی جانیں نکالی جارہی تھیں۔ فرشتے کوڑوں اور گرزوں سے ان کے چہروں پر مار رہے تھے اور ان کے کولہوں پر ضربیں لگا رہے تھے اور جو کچھ ان پر گزر رہی تھی تب شائد آپ کو اندازہ ہوتا کہ ان پر کیا قیامت گزری ہے اور پھر اسی پر بس نہیں ان کو مارتے اور ادھیڑتے ہوئے یہ بھی کہتے تھے کہ موت تو ایک وقتی لمحاتی تکلیف ہے اصل عذاب تو جہنم میں تمہارا انتظار کررہا ہے۔ وہاں کی آگ جو پتھروں کو پگھلا دیتی ہے، تمہاری تواضع کیلئے چشم براہ ہے اور یا اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر دنیا سے تو گزر ہی جائیں گے، اصل ان کا عذاب دیکھنے کا تو وہ ہے جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرتے ہیں۔ ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے ہیں اور پھر انہیں جہنم کے عذاب سے ڈراتے ہیں اور یہ انجام ہر کافر کا ہوتا ہے۔ کاش! تم ان کی اس کیفیت کو دیکھ سکتے تو تمہیں اندازہ ہوتا کہ کس طرح ان پر قیامت سے پہلے قیامت آجاتی ہے اور یہ جو کچھ ان کے ساتھ بیتتی ہے، یہ ایسا نہیں کہ ان پر ظلم ہوتا ہے بلکہ انہوں نے زندگی بھر جو فصل بوئی اور پروان چڑھائی یہ اسی کا پھل ہے جو ان کو کاٹنا پڑتا ہے۔ یہ انہی کے ہاتھوں کی کمائی ہے جسے وہ مرتے ہوئے سمیٹتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر رتی بھر ظلم کا روادار نہیں۔ اس کا قانونِ عدل بے لاگ ہے۔ وہ اپنی ذات میں نہایت رحیم وکریم ہے لیکن اس کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰي قَوْمٍ حَتّٰي يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ○ ﴿الانفال : ۵۲ تا ۵۴﴾

(ان کا حال وہی ہے) جیسے حال تھا قوم فرعون اور ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تو اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا بے شک اللہ زور آور سخت عذاب دینے والا ہے ○ اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو دی ہو جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے طرزِ عمل کو اور بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ○ ان کا حال وہی ہے جو حال تھا آلِ فرعون کا اور ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں ہلاک کردیا ان کے گناہوں کی پاداش میں اور آلِ فرعون کو ہم نے غرق کردیا اور یہ سارے کے سارے ظالم تھے۔)

Marfat.com

تاریخ دعوت اور سنت اللہ:

''دأب'' کا معنی ہوتا ہے ﴿حال یا عادت﴾ آیت سے پہلے دأبھم کا لفظ محذوف ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ قریشِ مکہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ انبیاء کی تاریخ دعوت اور اللہ کی سنت کے خلاف نہیں ہے۔ اس کا ہمیشہ یہ معمول رہا ہے کہ وہ انسانوں کو فہم وشعور عطا فرماتا ہے نعمتوں سے نوازتا ہے ہر طرح کے وسائل سے بہرور کرتا ہے اور جب وہ لوگ فہم وشعور سے کام لینے سے عاجز رہتے ہیں تو اللہ ان پر مزید احسان یہ کرتا ہے کہ اپنے رسول بھیجتا ہے اور اپنی کتابیں اتارتا ہے اور افہام وتفہیم کے تمام ذرائع سے کام لے کر ان پر حجت تمام کر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ رسول کی دعوت کو قبول کرنے کی بجائے مخالفت پر تل جاتے ہیں اور راہِ راست اختیار کرنے کی بجائے ہدایت کے راستے پر چلنا مشکل بنا دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں تنبیہ کرنے اور متوجہ کرنے کیلئے آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے۔ کبھی کوئی وبا ان پر بھیجتا ہے کبھی کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے اور اللہ کا نبی انہیں بار بار آگاہ کرتا ہے کہ یہ مصائب کے جھٹکے دیکر تمہیں جگانے کی کوشش کی جارہی ہے اور ساتھ ساتھ وارننگ بھی دی جارہی ہے کہ اگر تم اپنا رویہ نہیں بدلو گے تو تم پر اللہ کا عذاب بھی نازل ہو سکتا ہے۔ یہ اس کی چھوٹی چھوٹی تنبیہات جن کی برداشت کی تم میں طاقت نہیں اور اگر اس کا عذاب آگیا تو پھر سوچو تمہارا کیا بنے گا؟ تمہاری بستیاں تباہ ہو جائیں گی، تمہارا وجود ختم ہو جائے گا۔ اس آیتِ کریمہ میں خاص طور پر آلِ فرعون کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ان سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئیں ان کا حال بھی ان سے مختلف نہ تھا۔ آلِ فرعون سے مراد صرف فرعون کے اہل وعیال اور اس کا خاندان نہیں بلکہ اس کی پوری قوم ہے۔ ان کی طرف اللہ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ انہوں نے سالوں تک مصر میں تبلیغ کا فرض انجام دیا جب آلِ فرعون نے حق کو قبول کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے مختلف مصائب میں انہیں مبتلا کیا۔ کبھی زلزلہ آیا، کبھی قحط سالی آئی، کبھی ٹڈیوں اور مینڈکوں کی وبا پھیلی، کبھی دریاؤں کا پانی خون میں بدل دیا گیا، ہر تنبیہ کے بعد فرعون اور آلِ فرعون وعدہ کرتے کہ اس تکلیف کو واپس لے لیا جائے تو ہم راہِ راست اختیار کر لیں گے۔ لیکن جب تکلیف ہٹا دی جاتی تو وہ پھر اپنی ڈگر پر چل پڑتے۔ ان کی اس تاریخ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآنِ کریم قریشِ مکہ سے کہہ رہا ہے کہ تمہارے ساتھ بدر کے میدان میں جو کچھ گزری ہے اور تم جس عذاب اور رسوائی سے دوچار ہوئے ہو یہ اللہ کی اسی سنت کا تسلسل ہے۔ جس میں آلِ فرعون اور دوسری قومیں مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ لیکن آپ غور فرمائیے! اس آیتِ کریمہ میں یہ تو فرمایا کہ اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں انہیں پکڑا لیکن یہ نہیں فرمایا کہ انہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ پکڑنے سے مراد وہی تنبیہات ہیں جن سے مقصود قوموں کو جگانا اور ہوشیار کرنا ہوتا ہے اور ساتھ ہی یہ تصور دینا ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی طرف سے ان تنبیہات کی گرفت اور وسعت کا یہ عالم ہے تو خود اندازہ کرو اس کا عذاب کتنا شدید ہوگا اس لئے اس کے عذاب آنے سے پہلے اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کرو۔

اللہ تعالیٰ نعمت سے محروم کیوں کرتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں وہ تو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اس کی رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ وہ کبھی اپنے بندوں پر ظلم تو دور کی بات ہے معمولی تکلیف کا بھی روادار نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ عادل بھی ہے، بندوں کے اعمال کی جزا اور سزا اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ تمہیں اس نے وجود بخشا، تمہاری نمود و پرداخت کے انتظامات کئے، تمہاری ضرورتوں کیلئے غذا کا دسترخوان بچھایا۔ زندگی کے راستوں پر چلنے کیلئے حواس اور عقل کے چراغ بخشے۔ وہ وہ نعمتیں عطا فرمائیں جس کا شمار تو دور کی بات ہے ان کا ادراک کرنا بھی مشکل ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کرم فرمایا تاکہ تم اس کو پہچانو، اس کا شکر ادا کرو، اپنے آپ کو پہچانو اور اپنی بندگی کا حق ادا کرو۔ لیکن جب تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کرتے ہو اور تمہارے دل و دماغ میں اس کے شکر کی بجائے ناشکری پلنے لگتی ہے اور اس کے اعتراف کی بجائے تم اس کا انکار کرنے لگتے ہو اس کے سامنے جھکنے کی بجائے اکڑنے لگتے ہو، اسی کا کھا کر اور اسی کی عطا کردہ زندگی سے مستفید ہو کر اسی کے دشمنوں کا دم بھرتے ہو اور اس کی مخلوقات میں سے نہ جانے کس کس کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانون حرکت میں آتا ہے تو وہ ان نعمتوں کو واپس لے لیتا ہے۔ جو نعمتیں اس نے محض اس لئے عطا کی تھیں تاکہ ان کے ذریعے

Marfat.com

سے انسان اپنے منعم اور محسن کو پہچانے۔ وہ اپنے وجود کو دیکھے اور خالق تک پہنچے۔ ربوبیت کے فیضان کو دیکھ کر رب کو پہچانے، رزق کی ہمہ گیری کو دیکھ کر رازق کو دیکھنے کی کوشش کرے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی نعمتوں کو دیکھ کر نعمتوں کے دینے والے کا ادراک کرے۔ لیکن جب اس کی بجائے انسان الٹے راستے پر چل پڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم کسی قوم کو نعمت دے کر کبھی نہیں چھینتے لیکن جب وہ قوم اپنا طرز عمل بدل دیتی ہے اپنے اندر کی دنیا بدل دیتی ہے ان کے نفسوں میں اللہ کی جگہ طاغوت اتر آتا ہے اور وہ اپنے اندر بندگی کی پرورش کی بجائے سرکشی اور بغاوت کو پالتی ہے تو پھر ہم ان سے اپنی نعمتیں چھین لیتے ہیں۔ شروع میں کچھ نعمتیں چھین کر تنبیہ کرتے ہیں اور اگر وہ قوم اس تنبیہ کو سمجھ کر اللہ کے سامنے جھک جاتی ہے اور پیغمبر پر ایمان لے آتی ہے تو ہم اس کی نعمتوں کو بحال کر دیتے ہیں بلکہ اپنی طرف سے مزید بھی عطا کرتے ہیں اور وہ عزت اور سرافرازی ان کا مقدر بنا دیتے ہیں جس سے وہ ساری دنیا کیلئے ایک نمونہ بن جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ آل فرعون اور دوسری معذب قوموں کی طرح پلٹنے کی بجائے کفر اور سرکشی کے راستے پر بڑھتی چلی جاتی ہے اور اپنی تکذیب پر مزید اڑ جاتی ہے تو پھر ہمارے عذاب کا کوڑا حرکت میں آتا ہے۔ اور ہم انہیں ان کی تکذیب کی پاداش میں ایسا پکڑتے ہیں کہ انہیں ہلاکت کی نذر کر دیتے ہیں۔ کبھی ان کی دھرتی الٹ دیتے ہیں، کبھی ان پر پتھروں کی بارش کرتے ہیں، کبھی ان کے لیے زمین کا سینہ شق کر دیتے ہیں اور کبھی آل فرعون کی طرح انہیں بحر قلزم میں غرق کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پوری طرح ظالم ثابت کر دیتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر چیز کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں اور اللہ کی تنبیہات کو پلے باندھنے کی تیار نہیں ہوتے۔

جنگِ بدر پہلی آیت کے مصداق ایک بہت بڑی تنبیہ کی صورت تھی۔ اس طرح قریش کو ایک جھٹکا دیا گیا کہ وہ اب بھی اپنے طرز عمل کو بدلنے کی کوشش کریں تو وہ ازسر نو اللہ کی رحمت کے مستحق بن سکتے ہیں۔ لیکن اگر انہوں نے اپنا طرز عمل نہ بدلا اور یہ ثابت کر دیا کہ معذب قوموں کی طرح وہ ہر طرح کے خیر کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں اور ان کے اندر قبولیتِ حق کے سوتے بالکل خشک ہو گئے ہیں تو پھر انہیں انتظار کرنا چاہئے آل فرعون کی طرح بالآخر انہیں بھی تباہ کر دیا جائے گا۔ تیسری آیتِ کریمہ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ اھلکنھم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی آل فرعون جب تنبیہ کے مرحلے میں ناکام ہو گئے تو پھر اللہ کی سنت کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا کہ اللہ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ لیکن قریش اس لحاظ سے خوش قسمت نکلے انہوں نے اگرچہ اسلام اور آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی لیکن ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ قبولیتِ اسلام کا سلسلہ یکسر ختم نہیں ہوا اندر ہی اندر حق کی رو بہتی رہی اور اس سے سیراب ہونے والے خاموشی سے سیراب ہوتے رہے۔ ایک وقت آیا کہ چپکے چپکے ستر (۷۰) نوجوان ساحلِ سمندر پر بسیرا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس کی وجہ سے قریشِ مکہ کے قافلوں کا گزرنا خطرے سے خالی نہ رہا۔ انہوں نے خود ہی آنحضرت ﷺ سے گزارش کی کہ آپ ان سر پھروں کو اپنے پاس بلا لیجئے۔ یہ انہی سر پھروں کا فیض تھا کہ مختصر سی مدت کے بعد مکہ سرنگوں ہو گیا اور قریش کو اپنی قسمت بدلنے کا موقعہ ہاتھ آ گیا۔ گنتی کے چند افراد کو چھوڑ کر سب لوگ ایمان لے آئے اس طرح یہ لوگ اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

بے شک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا پھر وہ کسی طرح ایمان نہیں لاتے ۝ (خصوصاً ان میں سے وہ لوگ) جن سے آپ نے معاہدہ کیا ہے پھر وہ ہر مرتبہ اس معاہدے کو توڑ دیتے ہیں اور وہ بالکل نہیں ڈرتے ۝ سو اگر آپ پائیں انہیں لڑائی میں تو انہیں ایسی مار ماریں کہ تتر بتر ہو جائیں وہ لوگ جو ان کے پیچھے ہیں امید ہے کہ وہ نصیحت حاصل کریں گے ۝ ﴿الانفال : ۵۵ تا ۵۷﴾

شَرَّ الدَّوَآبِّ کا مفہوم:

دَوَآبّ، دابۃ کی جمع ہے۔ اس کا لغوی معنی "زمین پر چلنے پھرنے والا جاندار" ہے۔ اس لحاظ سے اس میں حیوانات بھی شامل ہیں اور انسان بھی۔ لیکن بالعموم اس کا اطلاق حیوانات پر ہوتا ہے۔ اللہ کی مخلوق ہونے کے اعتبار سے تمام جاندار برابر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی صلاحیتوں اور ان

Marfat.com

کی زندگی کے مقاصد کے حوالے سے بعض مخلوقات کو دوسری مخلوقات پر فوقیت دی ہے۔ اس لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اسے سوچنے سمجھنے، غور وفکر کرنے اور اس کے نتیجے میں صحیح بات تک پہنچنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے جبکہ حیوانات اور حشرات الارض وغیرہ اس صلاحیت سے محروم ہیں۔ حیوانات کو جن مقاصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس کیلئے حواس کی راہنمائی کافی ہے۔ انہیں غور وفکر کرنے اور سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تمام حیوانات کو انسان کی تحویل میں دیا گیا ہے۔ وہ اپنی اپنی حیثیت میں انسان کی چاکری کر رہے ہیں اور اس چاکری کیلئے غور وفکر کی نہیں مکمل اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ہر حیوان کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ زود یا بدیر اپنے مالک کی اطاعت کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسان کو جس قسم کی زندگی اور زندگی کے مقاصد عطا کئے گئے ہیں، ان کی قبولیت اور ادائیگی کیلئے انسان کو غور وفکر کی صلاحیت یعنی عقل اور ضمیر کا نور عطا کیا گیا ہے۔ حیوان سے اس کا مالک جو کام بھی لینا چاہتا ہے، وہ بالجبر اور طاقت کے زور سے لے لیتا ہے۔ لیکن انسان کو فی الجملہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے آزادی سے اور سوچ سمجھ کر کرے۔ اس لحاظ سے آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق سوچنے اور غور وفکر کرنے کا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان اپنی زندگی کا مقصد کھانا، پینا اور اپنی خواہشات کو پورا کرنا بنا لے اور انسانی اقدار اور انسانی مقاصد پر غور وفکر کرنے کیلئے کبھی تیار نہ ہو تو اس میں اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ زندگی کی بقا کیلئے جس طرح کی ضرورتیں انسان کو لاحق ہیں یعنی اسے غذا چاہئے، آرام چاہئے، گھر کی چھت چاہئے اور اپنے ارادے کے مطابق زندگی گزارنے کی صلاحیت چاہئے۔ یہی بنیادی چیزیں کم وبیش معیار کے فرق کے ساتھ حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، موسم کی شدت سے بچتے ہیں، مکان کی ضرورت پوری کرنے کیلئے ایک بھٹ بنا لیتے ہیں۔ انسان اپنی ضرورتیں بہتر اور خوبصورت انداز میں پوری کرتا ہے اور حیوان نہائیت سادگی کے ساتھ۔ انسان ایک سادہ چیز کو اپنی ذہانت سے کچھ سے کچھ شکل دے لیتا ہے اور لطف ولذت میں اسے کہیں کا کہیں پہنچا دیتا ہے۔ حیوان ان باتوں سے محروم ہے، لیکن بنیادی ضرورتیں وہ بھی بہر حال پوری کرتا ہے۔ اگر انسان اسی حد تک محدود رہتا تو یقیناً حیوان میں اور اس میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ وہ انسانیت کی صف میں اس وقت شامل ہوتا ہے جب وہ اپنی عقل کو استعمال کرتا ہے اور عقل سے کام لے کر ان صداقتوں کو قبول کر لیتا ہے جن کا عقلِ سلیم مطالبہ کرتی ہے اور زندگی کی ان وادیوں میں جہاں عقل کام نہیں دیتی وہ وحیِ الٰہی کو قبول کر لیتا ہے کیونکہ اس کی عقل یہ تسلیم کرتی ہے کہ ہماری زندگی جن دوائر میں پھیلی ہوئی ہے ان کا تعلق صرف محسوسات اور معقولات تک ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہماری زندگی کے رشتے مابعد الطبیعات سے بھی ہیں اور عالمِ غیب سے بھی۔ اس آیت میں پروردگار اس بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ کافر جب پیغمبر کی دعوت پر کان نہیں دھرتا جبکہ پیغمبر کی دعوت عقل کا تقاضا ہے اور اس کی دعوت کی ہر بات عقل اور فطرت کے ترازو میں تل کر نکلتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہ ایک ایسا رویہ ہے جو حیوان کا تو ہو سکتا ہے انسان کا نہیں ہو سکتا۔ اگر معاملہ یہیں تک ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس سے ایک قدم آگے ہے۔

حیوان کا مالک انسان ہے اور جس انسان کے تصرف میں جس حیوان کو بھی دیا گیا ہے، آپ کبھی نہیں دیکھیں گے کہ اس حیوان نے اپنے مالک کو پہچاننے میں غلطی کی ہو یا اس کی اطاعت کرنے سے اس نے انکار کیا ہو۔ بار برداری کے جانور اپنے مالک کیلئے بار برداری کا فرض انجام دیتے ہیں۔ سواری کے جانور اپنے مالک کا بوجھ اٹھانے سے کبھی انکار نہیں کرتے۔ ہل جوتنے والے اور فصل کاشت کرنے والے بیل کبھی اس خدمت سے پہلو تہی نہیں کرتے۔

لیکن انسان کو جن مقاصد کیلئے پیدا کیا گیا ہے، ان مقاصد سے اس کا انحراف جب خطرناک حدود کو چھونے لگتا ہے تو تب اللہ کے نبی تشریف لاتے ہیں اور اللہ کی جانب سے کتابیں اترتی ہیں۔ لیکن جو شخص اللہ کے نبی کی بات کو سننے اور اللہ کی کتاب کو پڑھنے سے انکار کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حیوانیت کی سطح سے بھی گر گیا ہے کیونکہ اگر اس میں حیوانیت بھی بدرجہ کمال ہوتی تو وہ اپنے مالک، محسن اور مربی کی پہچان میں کبھی غلطی نہ کرتا۔ وہ اپنے رزق دینے والے کو ضرور پہچانتا اور یہی بنیادی باتیں اسے اللہ کے نبی کے دین کو قبول کرنے پر آمادہ کر دیتیں۔ لیکن جو شخص ان باتوں کو قبول کرنا تو دور کی بات ہے اللہ کے نبی کی دشمنی پر تل جاتا ہے اور وہ ہر قیمت پر اس کی دعوت کا راستہ روکنا چاہتا ہے۔ تو ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ایسا شخص بدترین خلائق ہے کیونکہ انسان کا اشرف المخلوقات ہونا اس سبب سے نہیں ہے کہ اسے کوئی سرخاب کے پر لگے ہیں یا وہ بڑی سے بڑی مخلوق سے زیادہ طاقتور ہے یا اس کے جسم میں دوسری مخلوقات کی نسبت کوئی غیر معمولی چیز پائی جاتی ہے۔ اس کے اشرف ہونے کی تو ایک ہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مقاصدِ

Marfat.com

حیات کی بجا آوری اور اس کیلئے محنت اور قربانی کرنے میں سب سے عظیم واقع ہوا ہے۔ لیکن اگر وہ پست ترین مقاصد کا شکار ہو کر حیوانیت کی سطح پر اتر جاتا ہے تو وہ یقیناً اپنی شرافت کھو دیتا ہے۔ جگر نے بالکل ٹھیک کہا:

گرے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

انسان جب راہِ راست اختیار کرتا ہے تو وہ اقدارِ انسانی اور مکارمِ اخلاق کو اپنے عمل کی صورت میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ فرشتے اس کے دامن میں نماز پڑھنا فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ ظلم کا راستہ روکنے کیلئے بڑے سے بڑے ظالم سے ٹکرا جاتا ہے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ خود چیتھڑوں میں لپٹ کر دوسروں کی تن پوشی کا سامان کرتا ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے سر کٹوانا اور خون بہانا اپنے لئے باعثِ اعزاز سمجھتا ہے۔ لیکن جب وہ بگڑتا ہے اور حیوانیت کی سطح پر اترتا ہے تو اس کا ظلم درندوں کی درندگی کو شکست دے دیتا ہے۔ اس کا دجل و فریب لومڑی کی مکاری کو ماند کر دیتا ہے۔ بھیڑیا ظلم کی ایک مثال سمجھا جاتا ہے، لیکن آپ نے کبھی نہیں سنا ہوگا کہ بھیڑیوں نے مل کر کوئی فوج تیار کی ہوتا کہ وہ انسانوں کی بستیاں اجاڑیں۔ چیتا بڑا ظالم جانور ہے لیکن اس کا ظلم ایک انسان کا خون پی کر اپنی نیند سو جاتا ہے۔ لیکن انسان جب درندگی پر اترتا ہے تو وہ ایسے تباہ کن آلات تیار کرتا ہے جن سے وہ ایک لمحے میں آباد اور بستے ہوئے شہروں کو جہنم میں تبدیل کر دیتا ہے۔ انسان کا بنایا ہوا ایک بم ایک لمحے میں شہروں کو صفحۂ ہستی سے غائب کر سکتا ہے۔ کل تک ہیروشیما اور ناگاساکی ایسے ہی انسانی کمالات کی بولتی ہوئی مثالیں تھیں لیکن آج کے مہذب انسان کو اگر اس کے اصل روپ میں دیکھنا ہو تو عراق، افغانستان، چیچنیا، کشمیر اور فلسطین میں دیکھ لیجئے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "جو لوگ اللہ کو اپنا خالق و مالک ماننے اور نبی کی دعوت پر ایمان لانے سے انکار کرتے ہیں وہ صرف حیوان ہی نہیں بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہیں"۔

شَرَّالدَّوَآبِّ کی ایک مثال:

دوسری آیتِ کریمہ میں ایسے انسان جو حیوانوں سے بھی بدتر ہیں ان کی ایک مثال دی ہے۔ نام اگرچہ نہیں لیا گیا لیکن آنحضرت ﷺ کی معاصر تاریخ پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس سے مراد مدینہ کے یہود اور گرد و پیش کے وہ قبائل ہیں جن سے آنحضرت ﷺ نے بقائے باہمی کے معاہدے کئے تھے۔ آپ نے مدینہ طیبہ پہنچ کر مسلمانوں کی معاشرت کی ابتدا کرتے ہوئے ان میں مواخات قائم فرمائی اور مدینہ کے ماحول کو پرامن رکھنے کیلئے آپ نے یہود اور باہر کے قبیلوں سے ایک معاہدہ کیا جسے "میثاقِ مدینہ" کہتے تھے۔ اس میثاق کی رو سے یہود اور پڑوسی قبائل اس بات کے پابند تھے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن کی مدد نہ کریں اور مدینہ پر حملہ کی صورت میں مدینہ کے دفاع کیلئے مسلمانوں کی مدد کریں۔ لیکن ان کی حیوانیت کا عالم یہ ہے کہ جب بھی انہیں موقعہ ملتا تو وہ معاہدے کی پرواہ کئے بغیر قریش کی درپردہ مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ قریش کو مسلمانوں کے حالات کے بارے میں اطلاعات دیتے رہتے بلکہ بنو نضیر کا سردار کعب بن اشرف تو وقتاً فوقتاً قریش کو اکساتا رہتا۔ جنگِ بدر میں جب قریش کو رسوا کن ہزیمت سے رسوا ہونا پڑا تو قریش پر جو مصیبت گزری سو گزری کعب بن اشرف نے ان سے بڑھ کر محسوس کیا اور بے ساختہ پکار اٹھا کہ "اب زمین کی سطح سے زمین کا پیٹ ہمارے لئے بہتر ہے" یعنی اب زندگی میں کوئی مزہ نہیں اس زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر مکہ معظمہ گیا وہاں قریش کے مقتولین کے مرثیے کہے اور ان کو اپنے مقتولین کا قصاص لینے کیلئے بہت شدت سے اکسایا۔ ان کی اس معاہدہ شکنی کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ یوں تو تمام کافر بھی اپنے رویے کی وجہ سے بدترینِ خلائق ہیں لیکن خصوصاً یہود اور وہ قبائل جو عہد شکنی میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے وہ تو یقیناً حیوانوں سے بھی گئے گزرے ہیں کیونکہ کافروں میں بھی کچھ نہ کچھ اخلاقی اصول تھے۔ انہیں میں سے یہ بات عربوں میں ہمیشہ مسلم رہی کہ وہ عہد شکنی کو بہت بڑا عیب سمجھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قبائل کی زندگی میں عہد کی پابندی ایک بہت بڑا سہارا ہے اور اگر یہ سہارا ٹوٹ گیا تو اس کا انجام بہت خطرناک ہوگا۔ لیکن مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی کرتے ہوئے انہیں کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ اہلِ کتاب ہونے کے باوجود نہ آخرت کا خوف تھا اور عرب میں رہنے کے باوجود نہ عہد شکنی کے انجام کی پرواہ تھی۔ ایسے لوگ ظاہر ہے اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے کوئی بھی رعایت کی جائے اس لئے تیسری آیتِ کریمہ میں ان کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا گیا۔

Marfat.com

یہود کی تاریخ یہ ہے کہ ان سے بڑھ کر سازشی قوم روئے زمین پر کوئی نہیں۔ کہیں بھی حق اور صداقت کے خلاف کوئی سازش ہو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس کے پیچھے ڈور ہلانے والے یہود تھے۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے بڑے فتنے اٹھے ہیں آپ تحقیق کر کے دیکھ لیجئے ہر جگہ آپ کو فتنے کا تانا بانا تیار کرنے والا ہمیشہ یہودی ذہن نظر آئے گا۔ فتنے اٹھانا اور سازش کرنا اس میں کوئی قوم ان کی ہمسر نہیں لیکن جہاں تک میدان میں آکر جرأت اور بہادری سے مقابلہ کرنے کا تعلق ہے اس لحاظ سے وہ نہایت بزدل واقع ہوئے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہی فرمایا جارہا ہے کہ یہود خود کھل کر تمہارے مقابلے میں نہیں آئیں گے۔ البتہ! یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے گروہ کے ساتھ مل کر یا اس کے پردے میں مسلمانوں سے دشمنی کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا ہو تو پھر آپ لوگوں کو بھی اس بات کی ہرگز پرواہ نہیں کرنی چاہیئے کہ آپ کے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہے کیونکہ معاہدے کی پابندی اس وقت ضروری ہوتی ہے، جب دونوں فریق اس کی پابندی کریں اور اگر ایک فریق معاہدے کی پرواہ نہیں کرتا تو دوسرے فریق کو بھی اجازت ہے کہ وہ اس معاہدہ شکنی کی دوسرے فریق کو سزا دے۔ چنانچہ یہاں یہی فرمایا جارہا ہے کہ اگر آپ یہود کے کچھ افراد کو دوسروں کی مدد کرتے ہوئے ان کی تائید میں لڑتا ہوا پالیں تو آپ ان کا وہ حشر کریں اور ایسی مار ماریں کہ نہ صرف ان کا دماغ درست ہو جائے بلکہ جو ان کے پشت پناہ ہیں اور پیچھے بیٹھ کر ڈوریاں ہلا رہے ہیں ان کے حواس بھی ٹھکانے لگ جائیں۔

یَذَّکَّرُوْنَ کے دو مفہوم:

لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ ان پر ایسا زوردار حملہ کیجئے اور ایسی کڑی سزا دیجئے کہ ان کے حواس درست ہو جائیں اور وہ آئندہ کیلئے عہد شکنی کی کبھی جرأت نہ کریں اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ممکن ہے وہ نصیحت قبول کر لیں۔ یعنی ایک طرف تو آپ ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کریں لیکن ساتھ ہی اگر کبھی ایسا موقعہ مل جائے کہ آپ انہیں نصیحت کر سکتے ہوں تو یہ سوچ کر نصیحت کرنے سے احتراز نہ کریں کہ یہ تو مسلمانوں کے چھپے دشمن ہیں اور ہمیشہ مسلمانوں کے درپے رہتے ہیں اس لئے انہیں نصیحت کرنے کا کیا فائدہ۔ دل و دماغ اللہ کے قبضے میں ہیں وہ جس طرح بعض انسانوں کے برے اعمال اور حق دشمنی کے باعث ان کی حق سے محرومی کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح بدترین کافر بھی دین کی طرف رغبت کے باعث اللہ سے رحمت کی امید کر سکتا ہے اور ممکن ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے ایمان کا فیصلہ فرما دیں۔ اس لئے ایک داعی الی اللہ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی تبلیغ اور سمجھانے بجھانے کے سلسلے کو کبھی ختم نہ کرے۔ نہ جانے کس وقت کس کی قسمت سنور جائے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ط اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ O

(اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو پھینک دیجئے ان کی طرف ان کا عہد اس طرح کہ آپ اور وہ برابر ہو جاؤ، یقیناً اللہ تعالیٰ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔) (الانفال: ۵۸)

اس آیت کی تفسیر میں صاحب تفہیم القرآن نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کیا جائے۔

معاہدات سے متعلق ضروری ہدایات:

اس آیت کی رو سے ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ یا ملک سے ہمارا معاہدہ ہو اور ہمیں اس کے طرزِ عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے یا یہ اندیشہ پیدا ہو جائے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے ساتھ غداری کر بیٹھے گا تو ہم اپنی جگہ خود فیصلہ کر لیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان معاہدہ نہیں رہا اور یکا یک اس کے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار کرنا شروع کر دیں جو معاہدہ نہ ہونے کی صورت ہی میں کیا جا سکتا ہو۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو ہم کوئی مخالفانہ کارروائی کرنے سے پہلے فریق ثانی کو صاف صاف

Marfat.com

بتا دیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا تا کہ فسخ معاہدہ کا جیسا علم ہم کو حاصل ہے ویسا ہی اس کو بھی ہو جائے اور وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ معاہدہ اب بھی باقی ہے۔اسی فرمان الٰہی کے مطابق نبی ﷺ نے اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول قرار دیا تھا کہ:

من كان بينه وبين قوم عهد فلا يحلن عقده حتى ينقضي امدها اوينبذ اليهم على سواء

''جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو اسے چاہئے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے۔یا نہیں تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔''

پھر اسی قاعدے کو آپ نے اور زیادہ پھیلا کر تمام معاملات میں عام اصول یہ قائم کیا تھا کہ **لا تخن من خانک** ''جو تجھ سے خیانت کرے تو اس سے خیانت نہ کر'' اور یہ اصول صرف وعظوں میں بیان کرنے اور کتابوں کی زینت بننے کیلئے نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس کی پابندی کی جاتی تھی۔چنانچہ ایک مرتبہ جب امیر معاویہ نے اپنے عہد بادشاہی میں سرحد روم پر فوجوں کا اجتماع اس غرض سے کرنا شروع کر دیا کہ معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی یکا یک رومی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے تو ان کی کارروائی پر عمرو بن عَبَسَہ صحابیؓ نے سخت احتجاج کیا اور نبی کریم ﷺ کی یہی حدیث سنا کر کہا کہ معاہدہ کی مدت کے اندر یہ معاندانہ طرزِ عمل اختیار کرنا غداری ہے۔آخر کار امیر معاویہ کو اس اصول کے آگے سر جھکا دینا پڑا اور سرحد پر اجتماع فوج کو روک دیا گیا۔

یک طرفہ فسخ معاہدہ اور اعلانِ جنگ کے بغیر حملہ کر دینے کا طریقہ قدیم جاہلیت میں بھی تھا اور زمانہ حال کی مہذب جاہلیت میں بھی اس کا رواج موجود ہے۔چنانچہ اس کی تازہ ترین مثالیں جنگِ عظیم میں روس پر جرمنی کے حملے اور ایران کے خلاف روس و برطانیہ کی فوجی کارروائی میں دیکھی گئی ہیں۔عموماً اس کارروائی کے لئے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ حملہ سے پہلے مطلع کر دینے سے دوسرا فریق ہوشیار ہو جاتا اور سخت مقابلہ کرتا یا اگر ہم مداخلت نہ کرتے تو ہمارا دشمن فائدہ اٹھالیتا۔لیکن اس قسم کے بہانے اگر اخلاقی ذمہ داریوں کو ساقط کر دینے کیلئے کافی ہوں تو پھر کوئی گناہ ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی بہانے نہ کیا جا سکتا ہو۔ہر چور، ہر ڈاکو، ہر زانی، ہر قاتل، ہر جعل ساز اپنے جرائم کیلئے ایسی ہی کوئی مصلحت بیان کر سکتا ہے۔لیکن یہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ بین الاقوامی سوسائٹی میں قوموں کیلئے ان بہت سے افعال کو جائز سمجھتے ہیں جو خود ان کی نگاہ میں حرام ہیں جب کہ ان کا ارتکاب قومی سوسائٹی میں افراد کی جانب سے ہو۔

اس موقع پر یہ جان لینا بہت ضروری ہے کہ اسلامی قانون صرف ایک صورت میں بلا اطلاع حملہ کرنے کو جائز رکھتا ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ فریقِ ثانی علی الاعلان معاہدہ توڑ چکا ہو اور اس نے صریح طور پر ہمارے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو۔ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں رہتا کہ ہم اسے آیت مذکورہ بالا کے مطابق فسخ معاہدہ کا نوٹس دیں بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع جنگی کارروائی کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔فقہائے اسلام نے یہ استثنائی حکم نبی کریم ﷺ کے اس فعل سے نکالا ہے کہ قریش نے جب بنی خزاعہ کے معاملہ میں صلح حدیبیہ کو اعلانیہ توڑ دیا تو آپ نے پھر انہیں فسخ معاہدہ کا نوٹس دینے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی بلکہ بلا اطلاع مکہ پر چڑھائی کر دی۔لیکن اگر کسی موقع پر ہم اس قاعدہ استثناء سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو لازم ہے کہ وہ تمام حالات ہمارے پیش نظر رہیں جن میں نبی ﷺ نے یہ کارروائی کی تھی تا کہ پیروی ہو تو آپ کے پورے طرزِ عمل کی ہو نہ کہ اس کے کسی ایک مفید مطلب جز کی۔حدیث اور سیرت کی کتابوں سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ کہ:

اولاً، قریش کی خلاف ورزیِ عہد ایسی صریح تھی کہ اس کے نقضِ عہد ہونے میں کسی کلام کا موقع نہ تھا خود قریش کے لوگ بھی

Marfat.com

اس کے معترف تھے کہ واقعی معاہدہ ٹوٹ گیا ہے۔ انہوں نے خود ابوسفیان کو تجدید عہد کیلئے مدینہ بھیجا تھا جس کے صاف معنی یہی تھے کہ ان کے نزدیک بھی عہد باقی نہیں رہا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ناقض عہد قوم کو بھی اپنے نقض عہد کا اعتراف ہو۔ البتہ! یہ یقیناً ضروری ہے کہ نقضِ عہد بالکل صریح اور غیر مشتبہ ہو۔

ثانیاً، نبی ﷺ نے ان کی طرف سے عہد ٹوٹ جانے کے بعد پھر اپنی طرف سے صراحۃً یا اشارۃً وکنایۃً ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ ایماء نکلتا ہو کہ اس بدعہدی کے باوجود آپ ابھی تک ان کو ایک معاہد قوم سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ آپ کے معاہدانہ روابط اب بھی قائم ہیں۔ تمام روایات بالاتفاق یہ بتاتی ہیں کہ جب ابوسفیان نے مدینہ آ کر تجدید معاہدہ کی درخواست پیش کی تو آپ نے اسے قبول نہیں کیا۔

ثالثاً، قریش کے خلاف جنگی کارروائی آپ نے خود کی اور کھلم کھلا کی۔ کسی ایسی فریب کاری کا شائبہ تک آپ کے طرزِ عمل میں نہیں پایا جاتا کہ آپ نے بظاہر صلح اور بباطن جنگ کا کوئی طریقہ استعمال فرمایا ہو۔

یہ اس معاملہ میں نبی کریم ﷺ کا اسوہ حسنہ ہے، لہٰذا آیت مذکورۂ بالا کے حکمِ عام سے ہٹ کر اگر کوئی کارروائی کی جاسکتی ہے تو ایسے ہی مخصوص حالات میں کی جاسکتی ہے اور اسی سیدھے سیدھے شریفانہ طریقہ سے کی جاسکتی ہے جو حضور نے اختیار فرمایا تھا۔

مزید برآں اگر کسی معاہد قوم سے کسی معاملہ میں ہماری نزاع ہو جائے اور ہم دیکھیں کہ گفت وشنید یا بین الاقوامی ثالثی کے ذریعہ سے وہ نزاع طے نہیں ہوتی یا یہ کہ فریقِ ثانی اس کو بزور طے کرنے پر تلا ہوا ہے تو ہمارے لئے یہ بالکل جائز ہے کہ ہم اس کو طے کرنے میں طاقت استعمال کریں۔ لیکن آیتِ مذکورہ بالا ہم پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد کرتی ہے کہ ہمارا یہ استعمالِ طاقت صاف صاف اعلان کے بعد ہونا چاہئے اور کھلم کھلا ہونا چاہئے، چوری چھپے ایسی جنگی کارروائیاں کرنا جن کا اعلانیہ اقرار کرنے کیلئے ہم تیار نہ ہوں ایک بداخلاقی ہے جس کی تعلیم اسلام نے ہم کو نہیں دی ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۭ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿59﴾ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ
مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ
وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا
تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ

Marfat.com

لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى
اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ
فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾
وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا
مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾

اور گمان نہ کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جاسکیں گے۔ اور تیار کروان سے لڑائی کیلئے جتنی طاقت رکھتے ہو قوت سے بندھے ہوئے گھوڑوں سے، ہیبت زدہ کردو اس سے اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا کردیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس کیلئے جھک جایئے اور اللہ پر بھروسہ رکھئے۔ بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا۔ اور اگر وہ آپ کو دھوکہ دینا چاہیں گے تو اللہ آپ کیلئے کافی ہے اور وہی ہے جس نے آپ کی تائید کی اپنی مدد سے اور مومنین کے ذریعے سے۔ اور ان کے دلوں میں ان کیلئے الفت ڈال دی اگر آپ سارا خرچ کردیتے جو کچھ زمین میں ہے تو بھی ان کے دلوں میں آپ محبت نہ ڈال سکتے لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈال دی بیشک وہ غالب اور حکیم ہے۔ اے نبی! کافی ہے آپ کیلئے اللہ اور وہ مومن جو آپ کے پیروکار ہیں۔ (۵۹ تا ۶۴) (رکوع:۸)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۭ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ○ ﴿الانفال : ۵۹﴾
(اور گمان نہ کریں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہمارے قابو سے باہر نہیں جاسکیں گے۔)

دشمنانِ اسلام کو وارننگ:

جنگِ بدر میں جو لوگ بچ کر نکل گئے وہ بجائے نصیحت حاصل کرنے کے آئندہ کیلئے اسلام کے خلاف مزید منصوبہ بندیوں میں مصروف ہو گئے۔ قافلۂ تجارت کے منافع کو اسلام اور مسلمانوں کے استیصال میں صرف کرنے کے فیصلے ہونے لگے۔ یہود نے اس آگ میں اپنا حصہ ڈالنے کیلئے قریش کے حوصلے بڑھائے اور انہیں یقین دلایا کہ تم نے جلد بازی میں مکمل تیاری کیے بغیر لڑائی کا ڈول ڈال دیا۔ لیکن اس لڑائی کو آخری لڑائی مت سمجھو۔ ابھی تو آغاز ہوا ہے مستقبل تمہارا ہے۔ جو لوگ بچ کر آگئے ہیں وہ مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ قریش اور دوسرے دشمنانِ دین کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ ﴿یہ لوگ یہ گمان نہ کریں کہ وہ ہم سے بچ کر نکل گئے ہیں اور آئندہ وہ ہمارے قابو میں نہیں آئیں گے﴾ انہیں

Marfat.com

اللہ کی بے پناہ قدرتوں کا علم نہیں۔ انہیں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ اب وہ ہماری گرفت میں نہیں آسکتے۔ جو لوگ جنگِ بدر میں بچ کر نکلے تھے انہیں بچ نکلنے کا موقع اس لئے دیا گیا تا کہ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر راہِ ہدایت اختیار کریں۔ یہ مہلت ان کیلئے رحمت ثابت ہوسکتی ہے بشرطیکہ اسلام کی آغوش میں آجائیں ورنہ یہی مہلت ان کے جرائم کو بڑھانے اور فائل کو موٹا کرنے میں مؤثر ہوگی اس کے بعد جب اللہ کی گرفت آئے گی تو پھر ان کے لئے بھاگ نکلنے کا کوئی موقع نہیں ہوگا۔

انھم لایعجزون...... اعجزہ الصید: کے معنی ہیں فاتہ ولم یقدر علیہ "شکار قابو سے باہر نکل گیا، پکڑا نہ جاسکا"۔ یہ لوگ ایسا شکار نہیں جو اللہ کے ہاتھ سے نکل گیا ہو اور اب وہ قابو میں نہیں آسکتا کیونکہ اللہ کی قدرت اور طاقت اس قدر عظیم ہے کہ وہ جب کسی کو پکڑنے پر آتا ہے تو اس کے بچ نکلنے کے تمام امکانات ختم ہوجاتے ہیں اور جب اسے بچ نکلنے کا موقع ملتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ابھی مزید سنبھلنے کا موقع دے رہا ہے۔ پکڑنے میں جلد بازی کرنا کمزور حکمرانوں کا کام ہے۔ وہ اپنی کمزوری کے باعث خدشات کا شکار رہتے ہیں، لیکن طاقتور حکمران مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتے انہیں یقین ہوتا ہے کہ جب چاہیں گے پکڑ لیں گے۔

وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ○

اور تیار کرو ان سے لڑائی کیلئے جتنی طاقت رکھتے ہو قوت سے اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے، ہیبت زدہ کردو اس سے اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اور ان کے علاوہ دوسروں کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا کردیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ (الانفال: ۶۰)

قوت اور رباط کا مفہوم:

"قوت" قرآنِ کریم کی زبان میں فوج اور افرادی قوت کو بھی کہتے ہیں اور اسلحۂ جنگ کو بھی۔ "رباط" مصدری معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور مربوط کے معنی میں بھی۔ مصدر کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے "گھوڑے باندھنا" اور مفعول کی صورت میں اس کے معنی ہوں گے "بندھے ہوئے گھوڑے"۔ مااستطعتم "جتنی تم میں طاقت ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں پر اب جس تیاری کو لازم کیا جارہا ہے اس سے مراد مقدور بھر تیاری ہے۔ ملکی وسائل، ملکی حالات اور ملکی آبادی کو سامنے رکھتے ہوئے ملک کے دفاع کیلئے جو کچھ بھی کیا جانا ممکن ہو ہر ملک کے مسلمان اس کے مکلف ہیں۔ اس میں تساہل اور غفلت کی اللہ کے یہاں جواب دہی کرنا ہوگی۔

میں اس سے پہلے عرض کرچکا ہوں کہ جنگِ بدر کے بعد دشمن نے اپنی تیاریوں میں کہیں زیادہ اضافہ کردیا تھا اور ایسے دشمن جو یہ سمجھتے تھے کہ قریش تنہا مسلمانوں کو ختم کرنے کیلئے کافی ہیں وہ بھی قریش کی شکست سے بجائے ہراساں ہونے کے مسلمانوں کے استیصال کیلئے اپنی ذمہ داریاں پہلے سے بڑھ کر محسوس کرنے لگے تھے اور مسلمانوں نے بھی دیکھ لیا کہ اب بات زبان سے گزر کر میدان اور اسلحۂ جنگ تک پہنچ گئی ہے۔ اس صورتحال میں پروردگار نے مسلمانوں کو آئندہ کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ تیاری کرنے کا حکم دیا ہے۔ "وَ اَعِدُّوْا" امر کا صیغہ ہے۔ جس طرح "اقیموا" امر کا صیغہ ہے۔ اقیمو الصلوٰۃ سے نماز فرض ہوگئی، اسی طرح "اَعِدُّوْا" سے بھی مسلمانوں پر اتنی تیاری فرض ہوگئی کہ جو ملکی دفاع کیلئے کافی ہو اور اس میں کوئی بھی کمزوری اللہ کے یہاں سخت جواب دہی کا باعث ہوگی۔ تیاری کیلئے "قوت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق قوت فراہم کرو۔ اس سے مراد فوج بھی ہوسکتی ہے اور اسلحۂ جنگ بھی۔ اگر اس سے مراد فوج لی جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمان عربوں کی طرح لڑائی کے وقت ہی اپنے پاس موجود اسلحہ اور گھوڑا لے کر نکلتے اور اسی سے لڑائی کا سامان تیار ہوتا۔ لیکن اب یہ فرمایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت کی نمائندہ حکومت کو اس ذمہ داری کی ادائیگی خود اپنے ذمہ لینی چاہئے۔ مسلمان انفرادی طور پر مجاہد ہے اور اسے ہر وقت جہاد کی فکر رہتی ہے اور اس کیلئے

Marfat.com

مناسب تیاری بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مقدور بھر جتنی افرادی قوت یعنی فوج مہیا کرسکتی ہے اس میں کوتاہی نہ کرے اور اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ عین جنگ کے پیش آجانے کے وقت لوگوں کو نکلنے کا حکم نہ دیا جائے بلکہ مسلمان مملکت کی ایک سٹینڈنگ آرمی بھی ہونی چاہئے جو مختصر سے مختصر وقت میں میدانِ جنگ میں اتر سکتی ہو ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ دشمن اچانک حملہ کردے اور مسلمان مجاہدین کے جمع ہونے تک وہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا کر راہِ فرار اختیار کرے اور اگر اس سے مراد اسلحۂ جنگ لیا جائے تو اس سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حکومت کو اپنی سطح پر زیادہ سے زیادہ اسلحہ مہیا رکھنا چاہئے۔

وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ کا ذکر نمونے کے طور پر کیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جنگ میں کامیابی کا زیادہ تر مدار بہترین عربی گھوڑوں کی فراہمی پر تھا ہر گھوڑا لڑائی کے قابل نہیں ہوتا ایسے گھوڑے جو جنگ کی تربیت پاچکے ہوں وہ جنگ کی کامیابی میں سب سے مؤثر رول ادا کرتے ہیں۔ اس لئے کوئی عرب بہترین گھوڑے کی تیاری سے غافل نہیں ہوتا تھا۔ خوشحال لوگ بڑی تعداد میں قیمتی گھوڑے اپنے اصطبل میں رکھتے تھے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لوگ اپنے طور پر چاہے کیسا ہی اہتمام کریں حکومت کی ذمہ داری کے بغیر جنگی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے فرمایا کہ بندھے ہوئے گھوڑے یعنی بہترین تربیت یافتہ گھوڑے بڑی تعداد میں حکومت کی زیرِ نگرانی تیار رہنے چاہئیں کیونکہ اسلحۂ جنگ میں گھوڑا اس زمانے میں سب سے کارآمد سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس زمانے کے اسلحۂ جنگ میں بھی گھوڑے کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں شامل تھیں ایک ایسی چیز کا نام لے کر جو جنگ کیلئے ناگزیر تھی دوسری چیزوں کی طرف اشارہ کردیا کہ تلواریں، نیزے، شمشیریں، ڈھالیں، بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں مہیا ہونی چاہئیں اور آنے والے دنوں میں نئی نئی ضرورتوں کے مطابق جو نیا نیا اسلحہ وجود میں آئے، اس کی ایک ایک چیز مسلمان کی ضرورت ہے جسے دینی فریضہ سمجھ کر اسے مہیا کرنا ہے۔ آج کے دور میں ٹینک، راکٹ، میزائل، ہیلی کاپٹر، جنگی جہاز، بحری جہاز، آبدوزیں، بم، حتیٰ کہ ایٹم بم بھی جنگ کی ضرورت ہیں اور ان کی تیاری مسلمانوں کے دینی فرائض میں شامل ہے۔ ان میں کوتاہی اللہ کے یہاں بالکل اسی طرح ایک جرم ہے، جس طرح نماز نہ پڑھنا، زکوٰۃ نہ دینا، فرض ہوجانے کے بعد حج نہ کرنا۔ نبی کریم ﷺ نے اسی لئے اپنی مبارک زندگی میں ہمیشہ اس تیاری کا اہتمام فرمایا حالانکہ آپ اللہ کے نبی تھے فرشتے آپ کے ہمرکاب رہتے تھے، آپ کی دعاؤں سے اللہ کی تائید و نصرت میسر ہوتی تھی۔ بایں ہمہ! اپنی استطاعت کے مطابق نئے نئے آلات کی فراہمی کی بھی کوشش فرماتے تھے۔

جنگی تیاری آنحضرت ﷺ کی سنت ہے:

ابنِ کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ذکر کیا ہے کہ جنگِ حنین میں طائف کے قلعوں پر سنگ باری کیلئے آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے منجنیق تیار فرمائی اور اپنے دو صحابہ کو شام کے مشہور صنعتی شہر ''حمرش'' میں جدید اسلحہ کی ٹیکنیک حاصل کرنے کیلئے بھیجا۔ اس لئے دونوں صحابہ جنگِ حنین میں شرکت نہ کرسکے۔ اس وقت اس شہر میں زبور، دبابہ اور منجنیق کی صنعت عروج پر تھی۔ زبور اور دبابہ اس دور کے ٹینک سمجھ لیجئے۔ آپ نے ان دونوں صحابہ کو اس کی ٹیکنیک اور تیاری کے ضروری مراحل کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے بھیجا تاکہ یہ اسلحہ یہاں آسانی سے تیار کیا جاسکے۔ اس سے پہلے بھی آنحضرت ﷺ نے حسبِ ضرورت نئی جنگی ٹیکنیک کو استعمال کرنے سے کبھی احتراز نہیں فرمایا۔ جنگِ احزاب میں جب دیکھا کہ قریش ایک بہت بڑا لشکر لے کر مدینہ پر حملہ آور ہورہے ہیں اور مسلمانوں کی افرادی قوت اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تو آپ نے حضرت سلمان فارسی کے مشورے سے خندق کھود کر اور اس کے پیچھے مورچوں میں بیٹھ کر شہر کا دفاع کرنے کا فیصلہ فرمایا حالانکہ اس سے پہلے عرب اس طرح کی جنگ کے طریقے سے بالکل بے خبر تھے لیکن آپ نے اس کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ اس کی تحسین بھی فرمائی۔

غزوۂ ذات السلاسل ۷ ہجری میں حضرت عمرو ابن العاص کی زیرِ قیادت ہوا۔ آپ نے اس جنگ میں تین راتوں تک آگ جلانے کی اجازت نہیں دی تاکہ دشمن کو مسلمانوں کی قلتِ تعداد کا علم نہ ہوسکے۔ یہ غالباً تاریخ کا پہلا ''Black Out'' ہے جو آج سے ساڑھے چودہ سو سال پہلے ہوا جبکہ دنیا میں کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا۔ آنحضرت ﷺ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نہایت خوش ہوئے اور حضرت عمرو ابن العاص کو دعا دی۔

Marfat.com

جنگی تیاری کا معیار:

تُرْھِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جنگی تیاری کس سطح کی ہونی چاہئے۔ عام طور پر یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی فوج اور اسلحۂ جنگ کو اس حد تک ترقی دینی چاہئے کہ اس سے ملک کا دفاع ممکن ہو سکے۔ لیکن آیت کے اس حصے میں جو معیار مقرر کیا ہے وہ اس سے بہت آگے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے پیشِ نظر صرف اپنے ملک کا دفاع ہی نہیں بلکہ ان کی ذمہ داری اس حد تک جنگی تیاری کرنا ہے اور اس کے لئے اسلحۂ جنگ کو وجود دینا ہے جس سے دشمن خوف زدہ ہو جائے اور وہ حملہ کرنے سے پہلے سو دفعہ سوچے کہ جس ملک کی دفاعی قوت اس حد کو پہنچی ہوئی ہو اس پر حملہ کرنا موت کو دعوت دینا ہوگا۔ اور دشمن کے بارے میں بھی وضاحت فرمائی کہ دشمن کے تعین میں سب سے پہلے یہ دیکھو کہ اس کے ساتھ تمہاری دشمنی محض چند معاملات میں اختلاف کی وجہ سے ہے یا وہ اس وجہ سے تمہارا دشمن ہے کہ تم اللہ کے دین کی بات کیوں کرتے ہو۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کو بالاتر کیوں بنانا چاہتے ہو؟ ایسے لوگ یقیناً دشمنی میں عام دشمنوں سے بہت بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر وہ بھی خوف زدہ ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی مسلمانوں نے تیاری کا حق ادا کیا ہے۔ مزید فرمایا کہ ہم جو تمہیں بطورِ خاص مقدور بھر تیاری کا حکم دے رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے دشمن صرف وہی نہیں ہیں جنہیں تم جانتے ہو بلکہ ایسے لوگ بھی تمہارے دشمن ہیں جنہیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ جانتا ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے کھلا دشمن صرف قریش تھے کیونکہ وہ پہلے دن سے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی دشمنی ابھی پردے میں تھی اور وہ پردے میں رہ کر سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ ان سے مراد یہود ہیں اور وہ قبائل بھی جن کے ساتھ آنحضرت ﷺ نے غیر جانبداری کا معاہدہ کر رکھا تھا لیکن اب وہ بھی مسلمانوں کے خلاف پر تولنے لگے تھے۔ علاوہ ازیں! مدینہ کے اندر اور مدینہ کے ہمسائے میں منافقین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جو دشمنوں کو مدد پہنچانے کیلئے ہر وقت آمادہ رہتی تھی۔ قرآن کریم نے انہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝ (توبہ: 101)

(اور تمہارے اردگرد جو اعراب ہیں ان میں بہتیرے منافق ہیں اور اہلِ مدینہ میں بھی منافق ہیں یہ اپنے نفاق میں بڑے مشاق ہیں تم ان کو نہیں جانتے ہم ان کو جانتے ہیں ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر یہ ایک عظیم عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے۔)

اندرونی دشمنوں کے علاوہ کچھ بیرونی دشمن بھی تھے جو ابھی تک پردۂ اخفا میں تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے تھے کہ وہ وقت دور نہیں جب مسلمانوں کا ان سے بھی تصادم ہوگا۔ ان میں رومی، غسانی اور ایرانی وغیرہ تھے۔ غسانیوں سے تو آنحضرت ﷺ کو بھی کسی حد تک سابقہ پڑا جنگِ تبوک ایک طرح سے رومیوں ہی سے لڑی جانے والی جنگ تھی۔ لیکن قیصر نے سرحد پر نہ پہنچ کر اس جنگ کو ٹال دیا۔ اس طرح سے آنحضرت ﷺ کے زمانے میں قیصر سے تصادم نہیں ہوا لیکن خلافتِ راشدہ میں قیصر و کسریٰ دونوں بڑی قوتوں سے اس طرح تصادم ہوا کہ صدیوں کی جمی ہوئی ان قوتوں کو مسلمانوں نے ادھیڑ کر رکھ دیا۔

انفاق فی سبیل اللہ:

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جنگ میں جس طرح فوج اور اسلحۂ جنگ اپنا رول ادا کرتے ہیں اسی طرح مال کا بھی اپنا ایک رول ہے فوج اخراجات پورے کئے بغیر تیار نہیں ہو سکتی اور اسلحہ کی تیاری یا خریداری تو سراسر مالی قوت پر منحصر ہے۔ کتنے ایسے جدید ہتھیار ہیں جنہیں بعض ملک اس لئے نہیں خرید سکتے کہ ان کے مالی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے جبکہ آج کے دور میں ہر حکومت کے اپنے مستقل وسائل ہیں دفاعی بجٹ اکثر ممالک میں سب سے بڑا بجٹ ہوتا ہے۔ لیکن جب جنگ چھڑ جاتی ہے تو دفاعی بجٹ اور ملکی وسائل ناکافی ثابت ہوتے ہیں۔ پھر حکومت کی جانب سے قوم سے اپیلیں

Marfat.com

ہوتی ہیں کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق انفاق کرے تاکہ فوجی ضرورتیں پوری کی جاسکیں اور آیتِ کریمہ میں جس زمانے کی بات ہو رہی ہے اس وقت تو مسلمانوں کے پاس اپنا بیت المال بھی نہیں تھا۔ اخراجات کا تمام تر بوجھ مسلمانوں کے جذبۂ انفاق پر تھا۔ اس لئے جنگی تیاری کا حکم دینے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی اور ساتھ ہی ایک مژدہ بھی سنایا کہ ہمیں معلوم ہے کہ تم اپنا پیٹ کاٹ کر اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے۔ لیکن یہ اطمینان رکھو کہ تم جو کچھ اللہ کے راستے میں دو گے وہ پورے کا پورا تمہیں لوٹایا جائے گا۔ اللہ کے یہاں پائی پائی کا حساب ہوتا ہے بلکہ امید یہ ہے کہ جو اس کا قانون اعمال کے اجر و ثواب کے سلسلے میں ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا دیا جاتا ہے اور اخلاص میں ترقی کے ساتھ ساتھ اجر و ثواب میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے انفاق فی سبیل اللہ میں بھی یہی قانون کارفرما ہوگا اور اللہ کے راستے میں دینے والوں کو اسی حساب سے واپس کیا جائے گا۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴿الانفال : ۶۱ تا ۶۳﴾

(اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس کیلئے جھک جایئے اور اللہ پر بھروسہ رکھئے بے شک وہی ہے سننے والا جاننے والا ۝ اور اگر وہ آپ کو دھوکہ دینا چاہیں گے تو اللہ آپ کیلئے کافی ہے اور وہی ہے جس نے آپ کی تائید کی اپنی مدد سے اور مومنین کے ذریعے سے ۝ اور ان کے دلوں میں ان کیلئے الفت ڈال دی اگر آپ سارا خرچ کر دیتے جو کچھ زمین میں ہے تو بھی ان کے دلوں میں آپ محبت نہ ڈال سکتے لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈال دی بے شک وہ غالب اور حکیم ہے۔)

مصالحت کی اجازت:

مسلمانوں کی غیر مسلموں سے لڑائی، قتال فی سبیل النفس یا فی سبیل البلاد نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ہے۔ اس کا مقصد دنیا سے فتنہ ختم کرنا اور اللہ کے دین اور اس کی حاکمیت کو غالب کرنا ہے۔ ظاہر ہے یہ مقصد کفر کو ختم کئے یا مغلوب کئے بغیر ممکن نہیں لیکن یہ حیرانی کی بات ہے کہ ایسا واضح مقصد رکھنے والی قوم کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اگر تمہارا دشمن تمہاری طرف صلح کا ہاتھ بڑھائے تو تم ان کے مظالم اور زیادتیوں کی طرف نہ دیکھو بلکہ اس کا ہاتھ تھام لو اور تم بھی صلح کیلئے تیار ہو جاؤ کیونکہ مقصد دنیا میں خون بہانا نہیں بلکہ فساد فی الارض کو ختم کرنا ہے۔ غلبۂ دین کی ضرورت کیلئے بعض دفعہ لڑائی لڑنی پڑتی ہے لیکن درحقیقت اس کا مقصد دنیا سے خون ریزی اور فساد کے تمام امکانات کو ختم کرنا ہے۔ یہ امکانات جس طرح غلبہ سے ختم ہوتے ہیں اسی طرح دعوت الی اللہ کے امکانات پیدا ہونے سے بھی ختم ہوتے ہیں۔ اگر دشمن اس شرط پر صلح کر لیتا ہے کہ مجھے مسلمانوں کی تبلیغ و دعوت پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا تو مسلمانوں کو اپنا ہدف حاصل کرنے میں ایک ایسا مؤثر ذریعہ مل جاتا ہے جس کے نتیجے میں دلوں کی دنیا بدل جاتی ہے۔ نیا انسان پیدا ہوتا ہے نئی سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔ معاہدہ حدیبیہ جو صرف دو سال تک چل سکا لیکن اس کے نتائج دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ حدیبیہ میں پندرہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر آئے تھے اور اس وقت تک آپ کی نبوت کو انیس سال گزر چکے تھے۔ لیکن دو سال کے بعد آپ جب فتح مکہ کیلئے نکلے تو آپ کے ساتھ دس ہزار قدوسیوں کا لشکر تھا۔ یہ حیران کن اضافہ دو سالوں میں مسلمانوں کی دعوت و تبلیغ، مسلمانوں کے اخلاق اور معاملات میں مسلمانوں کی صفائی اور دیانت و امانت کا نتیجہ تھا۔ اس لئے یہاں بھی حکم دیا گیا ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں مسلمانوں کا رویہ صلح جویانہ لیکن جسورانہ ہونا چاہئے۔

اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے بظاہر یہ ایک رسک معلوم ہوتا ہے کیونکہ قریش سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ کسی وقت بھی مسلمانوں کو دھوکہ دے سکتے تھے۔ لیکن جس قوم کو اپنے نظریے اور اپنے اخلاق سے تاریخ بنانا ہوتی ہے وہ ایسے خطرات سے کھیلے بغیر نہیں رہ سکتی۔ لیکن اللہ کا یہ بے حد کرم ہے کہ ان خطرات کو دیکھتے ہوئے پروردگار نے اللہ پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلایا کہ وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ دشمن جو کچھ کر رہا ہے یا کرے گا اللہ ہر وقت اسے سنتا ہے اور ان کی در پردہ سازشوں کو جانتا بھی ہے۔ تم اللہ کے بھروسے پر ان خطرات کو انگیخت کرو۔ اللہ اس

Marfat.com

کے برے نتائج سے تمہاری حفاظت کرے گا کیونکہ دنیا میں لوگوں سے تمہاری دشمنی کسی ذاتی مفاد کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اللہ کی خاطر ہے۔تم آج اللہ سے اپنا رشتہ توڑ لو تمہارے آج کے دشمن تمہارے دوست بن جائیں گے۔تمہاری دوستی اور دشمنی جب صرف اللہ کی رضا کیلئے ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ اپنے وفاداروں کو لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔اس کا اصول ہی یہ ہے کہ جو اس کا ہوجاتا ہے اللہ بھی اس کا ہوجاتا ہے۔سچ کہا ظفر علی خاں نے ۔

یثرب سے اب بھی گونجتی ہے یہ صدا سنو !
وہ جو خدا کے ہو گئے ان کا خدا ہوا

رہی یہ فکر کہ وہ آپ کو دھوکہ دیں گے تو آپ کو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیئے۔جسے اللہ اپنی حفاظت میں لے لے اسے دنیا کی کوئی قوت گزند نہیں پہنچا سکتی۔بڑی سے بڑی قوت کسی کیلئے کفائت نہیں کرسکتی لیکن اللہ آپ کی مدد کیلئے کافی ہے۔اس کی تائید ونصرت کا مشاہدہ کرنا ہو تو قریبی تاریخ میں جنگِ بدر کا واقعہ پیش آیا ہے اس کے واقعات میں غور کرکے دیکھ لو کس طرح اس نے اپنی نصرت سے تمہاری مدد کی اور کس طرح مٹھی بھر مسلمانوں سے آپ کی فتح کا سامان کیا اور کس طرح مسلمانوں کو آپ کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنادیا۔غور کیجئے! ان لوگوں کی اپنی تاریخ کیا ہے مکہ کے مہاجرین مختلف قبائلی تعصبات میں بٹے ہوئے اور کبر ونخوت میں گرفتار تھے۔اسی طرح اوس وخزرج کے لوگ جو ہمیشہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے۔جنہوں نے سالہا سال تک ''حربِ بسوس'' لڑی جس میں ہزاروں آدمی کام آئے ان کے اختلافات،تعصبات،مفادات اور رسوم وآداب کو دیکھتے ہوئے کوئی آدمی توقع نہیں کرسکتا تھا کہ یہ بھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر چل سکتے ہیں۔جو لوگ ایک دوسرے کے دیوتا کو برداشت نہیں کرتے تھے، جنہوں نے پوجا پاٹ کیلئے الگ الگ بت بنا رکھے تھے،جو قبیلے کی عصبیت کی دیواروں سے کبھی باہر جھانکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے،ان کے دلوں کو جس طرح جوڑا گیا،جس طرح وہ ایک دوسرے کے قریب ہوئے اور جس طرح باہمی اخوت میں پروئے گئے،جس طرح وہ ایک دوسرے کی ضرورت کی خاطر جان دینے کیلئے بھی تیار ہوگئے،یہ ایک ایسی حیرت انگیز تبدیلی ہے جس کو ممکن بنانے والی اللہ کی ذات کے سوا دنیا میں کوئی اور قوت نہیں اس لئے پروردگار نے فرمایا کہ اگر آپ زمین بھر کے خزانے ان کے اختلافات دور کرنے کیلئے خرچ کرڈالتے تو بھی آپ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔یہ سراسر اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ان کے دلوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا اور ان کے دلوں میں محبت پیدا کردی۔

بے شک وہ عزیز اور حکیم ہے۔وہ جب کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے تو کوئی رکاوٹ اس کے راستے میں حائل نہیں ہوسکتی اور ساتھ ہی ساتھ وہ حکمت والا بھی ہے اس لئے وہ جو کام بھی کرتا ہے وہ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُکَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۠

اے نبی! کافی ہے آپ کیلئے اللہ اور وہ مومن جو آپ کے پیروکار ہیں۔(۶۴)

سیاقِ کلام کے اعتبار سے آیت کا مفہوم:

پہلی آیتِ کریمہ کے دو ترجمے ہوسکتے ہیں ایک تو وہ جو ہم نے آیت کے نیچے لکھا ہے اور دوسرا یہ کہ

﴿اے نبی! اللہ آپ کو کافی ہے اور آپ کے پیروکار مومنوں کے لئے کافی ہے○﴾

ان دونوں میں معنویت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں لیکن سیاقِ کلام کے اعتبار سے پہلا معنی زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ آیت نمبر ۶۱ میں فرمایا گیا ہے:اے نبی! اگر دشمن آپ کے ساتھ دھوکہ کرنے کی کوشش کرے تو آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہر حال میں اللہ آپ کیلئے کافی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جنگِ بدر میں اس نے اپنی نصرت سے آپ کی تائید کی یعنی آسمان سے فرشتے بھیجے اور دوسرا ان قلیل اور غیر مسلح مسلمانوں سے آپ کی مدد کرائی جو اپنے بچاؤ کیلئے بھی کافی نہ تھے انہیں دیکھ کر کوئی اندازہ نہ کرسکتا تھا کہ یہ کسی بڑی فوج کا مقابلہ کرسکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت سے ان کے دلوں میں وہ اعتماد وہ حوصلہ اور وہ طاقت بھردی کہ وہ اپنے سے کئی گنا بڑی فوج سے اس طرح ٹکرا گئے کہ ان کا بھرکس نکال کر رکھ دیا نہ وہ ان کی تعداد سے مرعوب ہوئے اور نہ ان کی اسلحی قوت سے اثر قبول کیا۔ان کا یہ حیران کن کارنامہ اور ان کی جسارت واستقامت ان کے اپنے ذاتی

Marfat.com

کمال کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سراسر اللہ کی عطا اور توفیق ہے جس نے مولوں کو شہباز کی طاقت عطا فرمادی اور ان میں ایسی وفاشعاری اور جاں سپاری کا جوہر بھر دیا کہ وہ ہر وقت اور ہر میدان میں نبی کریم ﷺ کی حفاظت اور آپ کے مشن کی تکمیل کیلئے ہر قربانی کیلئے آمادہ ہیں۔ جس طرح فرشتے اللہ ہی کے حکم اور مدد سے اس کے بندوں کی مدد کرتے ہیں اسی طرح یہ مسلمان بھی اللہ ہی کی توفیق سے آنحضرت ﷺ کے ہمرکاب ہیں اور کسی بھی طوفان سے لڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی مقصد کیلئے تیار کیا ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی بات کو دوسرے اسلوب سے ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تو ہمیشہ اپنے نبیوں اور اپنے بندوں کیلئے کافی ہوتا ہی ہے لیکن وہ جب چاہتا ہے تو اس پر ایمان لانے والوں کو بھی ایسی قوت میں تبدیل کر دیتا ہے اور ایسے عزائم سے آشنا کر دیتا ہے کہ وہ بھی اللہ کی تائید و نصرت کی شکل میں پیغمبر کیلئے کافی ہو جاتے ہیں۔ وہ تعداد میں تھوڑے اور غیر مسلح بھی ہوں تب بھی وہ فیصلہ کن قوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ
عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ
مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾
اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًاؕ فَاِنْ یَّكُنْ
مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ
اَلْفٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۶۶﴾
مَا كَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِؕ
تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَاۖ وَ اللّٰهُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَةَؕ وَ اللّٰهُ
عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۶۷﴾ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِیْمَاۤ
اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۶۸﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَیِّبًا ۖۚ
وَّ اتَّقُوا اللّٰهَؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۶۹﴾ ع

Marfat.com

اے نبی! مومنوں کو جنگ پر ابھارو اگر تم میں سے ۲۰ صابر ہوں تو وہ ۲۰۰ پر غالب آئیں گے اور اگر ۱۰۰ آدمی ہوں تو وہ ہزار کافروں پر غالب رہیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سے ۱۰۰ آدمی صابر ہوں تو وہ ۲۰۰ پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار آدمی ایسے ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے ۲۰۰۰ پر بھاری رہیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ کسی نبی کیلئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دیں۔ تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ سبقت نہ کر چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تمہیں بڑا عذاب پہنچتا۔ پس کھاؤ اس سے جو تمہیں غنیمت سے ملا ہے، وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ (۶۵ تا ۶۹) (رکوع: ۹)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْۤا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

اے نبی! مومنوں کو جنگ پر ابھارو اگر تم میں سے بیس (۲۰) صابر ہوں تو وہ دوسو (۲۰۰) پر غالب آئیں گے اور اگر سو (۱۰۰) آدمی ہوں تو وہ ہزار (۱۰۰۰) کافروں پر غالب رہیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے۔ 65 اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سے سو (۱۰۰) آدمی صابر ہوں تو وہ دوسو (۲۰۰) پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار (۱۰۰۰) آدمی ایسے ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار (۲۰۰۰) پر بھاری رہیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (الانفال: ۶۵ تا ۶۶)

مسلمانوں کو قتال پر ابھارنے کی ہدایت:

اے پیغمبر! اللہ کی تائید و نصرت اور ایسے جاں نثاروں کی موجودگی میں آپ کیلئے پریشانی کا کوئی موقع نہیں آپ کا کام صرف یہ ہے کہ اب چونکہ کفر سے لڑائی چھڑ چکی ہے اب حق و باطل کا فیصلہ معرکہ کارزار میں ہونے والا ہے اس لئے آپ مسلمانوں کو قتال پر ابھاریئے انہیں اللہ کے وعدے یاد دلا کر ہر طرح کے دشمن دین سے نبرد آزما ہونے کیلئے تیار کیجئے اور انہیں یہ یاد دلایئے کہ تم اپنی ذات میں کمزور صحیح لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر وہ بجلیاں بھر دی ہیں جن کا سامنا کرنا خس و خاشاک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ تمہارا کام اتنا عظیم اور تمہارے عزائم اتنے بلند ہیں کہ تم اگر بیس آدمی صبر کی تصویر بن کر میدانِ کارزار میں اترو تو یقین جانو کہ تم دوسو پر غالب آسکتے ہو اور اگر تمہاری تعداد ایک سو ہو تو تم ایک ہزار پر بھاری ہو یعنی تم میں سے ایک ایک فرد دس کے مقابلے کیلئے کافی ہے۔ تمہارے اندر اللہ پر اعتماد اس کے وعدوں کا یقین، جان پر کھیل جانے کا جذبہ اور خطرات کے مقابلے میں استقامت، اس درجے کی ہے کہ تمہارا ایک ایک شخص دس پر بھاری ہے اور ایک سو، ایک ہزار پر غالب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دو باتیں ارشاد فرمائی جا رہی ہیں۔ ایک تو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم دس گنا دشمن کے مقابلے میں بھی استقامت کا ثبوت دینا۔ دس گنا دشمن کے سامنے سے بھی تمہیں ہٹنے اور پسپائی اختیار کرنے کی اجازت نہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ بشارت دی جا رہی ہے کہ اگر تم دس گنا دشمن کے سامنے بھی صبر دکھاؤ گے اور حوصلے کا ثبوت دو گے تو ہم یقیناً تمہیں فتح عطا فرمائیں گے۔ بس شرط صرف ایک ہی ہے کہ تمہارے کسی عمل سے بے صبری کا اظہار نہ ہو۔ دشمن کی تعداد اور ان کی اسلحی قوت دیکھ کر تمہارے دل میں خوف زدگی کے احساسات پیدا ہونے نہ پائیں۔ تم انسان ہوتے ہوئے میدانِ جنگ کی ضرورتوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتے لیکن تمہیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ افراد اور اسلحے میں طاقت پیدا کرنے والی اللہ کی ذات ہے۔ فیصلہ کن قوت نہ افراد ہیں نہ اسلحہ بلکہ وہ اللہ کی ذات ہے۔ وہ چاہے تو چڑیوں سے ابرہہ جیسا لشکر تباہ کرا دے اور چاہے تو فرعون جیسے طاقتور دشمنِ خدا کو بحرِ قلزم میں غرق

Marfat.com

کر دے۔ جب بھی کسی فوج کے دل میں یہ تصور اتر جائے کہ فیصلہ کن قوت اللہ کی ذات ہے اور وہ ہمیشہ اہلِ حق کا ساتھ دیتی ہے تو وہ باطل کی بڑی سے بڑی قوت کو بھی کبھی خاطر میں نہیں لاتی۔ وہ شعلہ بھی ہو تو خس وخاشاک کے ڈھیر کو جلا کر رکھ دیتا ہے اور جن شعلوں کو اللہ نے دنیا کی روشنی کا سامان کرنے اور کفر کے محلات کو جلانے کیلئے اٹھایا ہوان کی قوت کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

وہ چنگاری بھلا خس وخاشاک سے کیونکر دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

مسلمان کافر پر بھاری کیوں ہوتا ہے؟

آیت کے آخر میں اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ ایک مومن دس کافروں پر بھاری کیوں ہوتا ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ مفہوم اس کا یہ ہے کہ کافر یہ تو جانتا ہے کہ لڑنے کیلئے افرادی قوت درکار ہے اور اسلحہ کی قوت کے بغیر کوئی لڑائی جیتی نہیں جاسکتی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ حق اور باطل میں فرق کیا ہے۔ حق کی طاقتوں کا سر رشتہ اللہ کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور باطل ہمیشہ شیطانی سہاروں سے کھڑا ہوتا ہے۔ کافر چاہے کیسی بہادری دکھائے مگر اس کے پیشِ نظر اپنی جان بچانا اور فتح حاصل کرنے کے سوا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ امکانات کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ وہ زندگی سے پیار کرتا اور موت سے ڈرتا ہے۔ اگر اس کے سامنے چند لاشے گر جائیں تو وہ اپنی موت کا تصور کر کے حوصلہ چھوڑ دیتا ہے۔ اسے اس بات کا بالکل شعور نہیں ہے کہ کسی مقصد کی خاطر خون دینا اور بدرجہ آخر جان دے دینے میں کیا مزہ ہے؟ اس کے نزدیک انسانی منزل دنیوی نعمتیں ہیں اس کے ادراک سے یہ بات کوسوں دور ہے کہ موت کے بعد بھی ایسی نعمتیں میسر آسکتی ہیں جن کا خیال نہ کبھی کسی دل میں آیا، نہ کسی آنکھ نے انہیں دیکھا اور نہ کبھی کسی کان نے اس کی خوبصورتی کے متعلق کچھ سنا اور جسے اس بات کا یقین ہوجائے کہ اللہ کے راستے میں زندہ رہنا امانت کی ادائیگی ہے اور اس کے راستے میں مرجانا ابدی زندگی کی ضمانت ہے۔ دنیا میں قیام کی مدت گنے چنے چند سال ہیں اور آخرت کے قیام کی مدت ہمارے پیمانوں میں نہیں آسکتی۔ جس شخص کو موت کے بعد کی زندگی اور وہاں ملنے والی آسائشوں اور نعمتوں کا یقین آجائے وہ زندہ رہنے کیلئے نہیں مرنے کیلئے جیتا ہے۔ زندگی کا حریص ہمیشہ کمزوری کا شکار رہتا ہے اور موت سے کھیلنے والا زندگی سے بے نیاز ہو کر جب آگے بڑھتا ہے تو موت اس سے خائف ہوجاتی ہے۔ کافر چونکہ ان تصورات سے بالکل بے خبر ہے اور مومن کا اصل اسلحہ یہی تصورات ہیں اس لئے ایک مومن دس کے مقابلے میں بھی کیا سو کے مقابلے میں بھی کھڑا ہوسکتا ہے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری میں تخفیف:

اس کے بعد تیسری آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ مومن اور کافر کے اصل مقابلے کا معیار تو یہی ہے اور جب بھی مومن صبر کی ایسی قوت سے میدان میں اترے گا تو اللہ کا یہ وعدہ کہ وہ دس پر ایک مومن کو بھاری رکھے گا ضرور پورا ہوگا لیکن یہ بھی ایک امرِ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے نظریاتی قوت میں وسعت آتی ہے اور حق کے پرستاروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے تو ان میں ایسے مخلصین بھی ہوتے ہیں جو اپنے اخلاص کے باجود سابقون الاولون کے معیار کو برقرار نہیں رکھ سکتے کبھی نہ کبھی چھوٹی موٹی انسانی کمزوریاں مسلمانوں میں در آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان انسانی کمزوریوں کا لحاظ فرماتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اب تمہاری ذمہ داریوں میں کمی فرمادی ہے کہ تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس بات کو بہت گراں سمجھتے ہیں کہ ایک شخص دس کے مقابلے میں کیسے پورا اتر سکتا ہے؟ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس تناسب کو کم فرماتے ہوئے اور ان کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اب ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اب اگر تمہاری تعداد ایک سو ہوگی تو اسے دو سو کے مقابلے میں ثابت قدم رہنا ہوگا اور اگر وہ ایک ہزار ہوں گے تو انہیں دو ہزار سے بے ساختہ ٹکرا جانا ہوگا۔ اب یہ قیامت تک کیلئے مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ تمہارا اصل معیار تو وہی ہے کہ تم اسے دس گنا دشمن سے بھی خوف نہ کھاؤ لیکن قیامت تک مسلمانوں کا معیار یکساں نہیں رہ سکتا اس لئے آخری معیار یہ ہے کہ اپنے دگنے دشمن کے مقابلے سے کبھی پسپائی اختیار نہ کرنا۔ کوشش کرنا کہ سیرت وکردار اور اللہ پر اعتماد اور ثابت قدمی اور جاں نثاری میں روز بروز اضافہ ہو اور تم اپنے سے دس گنا دشمن کے سامنے ٹھہرنے کا اپنے اندر حوصلہ پاؤ۔ لیکن تمہارا معیار

Marfat.com

اس سے فروتر تو کبھی نہ ہونا چاہئے کہ تم اپنے دوگنا دشمن کے سامنے سے بھی فرار کا راستہ اختیار کرو اور اس بات کو ہمیشہ کیلئے یاد رکھو کہ حق و باطل کی کشمکش یا قوموں کے تصادم میں خوفزدگی ہمیشہ تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور ایسی احتیاط جو بزدلی کو بھی شرما دے وہ تاریخ کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔ جس قوم کے سربراہ اپنے سے بڑے دشمن کے مقابلے میں ہمیشہ وسائل اور اسباب کو سامنے رکھ کر سوچتے ہوں اور دشمن کے وسائل کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے خوف زدگی کی بنیاد پر منصوبہ بندی کرتے ہوں ان سے زیادہ اپنی قوم کا دشمن اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ جو قوم مرنے کا فیصلہ کر لیتی ہے اسے دنیا میں کوئی نہیں مار سکتا اور جو قوم بہر صورت زندہ رہنا چاہتی ہے وہ صرف ذلیل ہو کر زندہ رہ سکتی ہے عزت کی زندگی کا راستہ خطرات سے گزرتا ہے۔ آزادی اور سرافرازی کے نخلستان، اس سرزمین پر لہلہاتے ہیں جو شہیدوں کے خون سے سیراب ہوتی ہے۔ جو قوم حبِّ دنیا میں مبتلا ہو کر یا موت سے ڈر کر خون دینے میں کوتاہی کرتی ہے وہ پھر ندامت کے آنسوؤں سے اپنی تاریخ لکھتی ہے جس کا کوئی عنوان عزت اور سربلند نہیں ہوتا۔

جو دیکھی ہسٹری تو دل کو پھر کامل یقیں آیا
جسے مرنا نہیں آیا اسے جینا نہیں آیا

وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ کا یہی مفہوم ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ ﴿الانفال : ٦٧﴾

کسی نبی کیلئے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دیں۔ تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

سیرت و کردار کا اعلیٰ ترین معیار:

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مسلمانوں کی سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے اعلیٰ ترین معیار مسلمانوں کے سامنے رکھا جا رہا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان دنیا میں واحد گروہ ہیں جو اللہ کیلئے جیتے اور اللہ کے لئے مرتے ہیں۔ وہ نفع و ضرر کے تمام پیمانوں کو توڑ کو اور خواہشاتِ دنیا سے منہ موڑ کر ایک ایسے راستے پر چل نکلے ہیں جس میں قدم قدم پر قیامتیں ہیں لیکن اس کی منزل اور انجام اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی ہے۔ وہ اسلام کا ایسا ہراول ہیں جس سے تاریخ وجود میں آئے گی اور دنیا ایسے انسانوں کو دیکھے گی جس کی نظیر اس سے پہلے چشمِ فلک نے نہیں دیکھی۔ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم پیشِ نظر آیتِ کریمہ کو دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی سیرت و کردار کا بلند معیار اللہ کو ایسا عزیز ہے کہ وہ اس میں معمولی کمی بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ مسلمان جب جنگ میں اترتے ہیں تو ان کے پیشِ نظر اعلائے کلمۃ الحق اور اللہ کی خوشنودی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ فتح عطا فرماتے ہیں تو لوگوں کو قیدی بنانا اور مالِ غنیمت کا ہاتھ آنا یہ جنگ کے معمولات میں سے ہے اور کسی قوم کو بھی اس سے گریز نہیں۔ لیکن اس سے فی الجملہ چونکہ دنیا اور دولتِ دنیا کی طرف رغبت معلوم ہوتی ہے اور بلند معیار سے زوال کے سفر کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اس لئے پروردگار نے ایسی بات پر بھی سخت سرزنش فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہی باتیں کسی اور گروہ میں ہوتیں تو قابلِ قدر سمجھی جاتیں، لیکن مسلمانوں کی فکری اور عملی پاکیزگی کو دیکھتے ہوئے اسے بھی قابلِ گرفت سمجھا گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ استاد اور شاگرد کی سطح کبھی یکساں نہیں ہوتی، راہنماؤں اور پیچھے چلنے والوں سے ایک جیسے معیار کا تقاضا نہیں کیا جاتا۔ علماء اور مشائخ اور سیاسی لیڈروں کو بھی ایک ترازو میں نہیں تولا جاتا۔ اسی طرح وہ امت جو دنیا کی سیادت کیلئے اٹھائی جا رہی ہے اسے چونکہ مینارۂ نور بن کر زندگی گزارنی ہے اور امتوں کیلئے سنگ ہائے میل چھوڑنے ہیں۔ ان کی معمولی فروگزاشت بھی دوررس اثرات کی حامل ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان پر گرفت فرمائی اور سخت گرفت فرمائی حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ جب جنگِ بدر ختم ہوئی تو مسلمانوں نے گرچہ بھاگنے والوں کا تعاقب بھی کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زیادہ توجہ تعاقب کی بجائے مالِ غنیمت اکٹھا کرنا اور دشمن کے افراد کو گرفتار کرنے کی

Marfat.com

طرف رہی۔ بجائے اس کے کہ وہ قتلِ عام کے ذریعے ان کی طاقت ہمیشہ کیلئے توڑ دیتے انہوں نے گرفتار کر کے ان کی زندگیاں محفوظ کر دیں اور مالِ غنیمت سمیت لینے میں اس لئے بھی زیادہ دلچسپی لی کیونکہ مسلمان بری طرح وسائل کی کمیابی کا شکار تھے اور جب ان گرفتار قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو بجائے ان کی طاقت کچلنے کے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا گیا۔ پروردگار نے ان پر گرفت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی انتہائی ذہانت وفراست اور تقویٰ اور للّٰہیت کے باوجود ابھی تک نبی کریم ﷺ کے اصل ہدف کو سمجھ نہیں سکے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ ہم مال اس لئے لے رہے ہیں تاکہ آئندہ دشمنوں سے جنگوں کی تیاری کر سکیں اور قیدیوں سے حسنِ سلوک اس لئے کر رہے ہیں ممکن ہے وہ اسلام کی آغوش میں آجائیں۔ لیکن وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکے کہ اللہ کا نبی دنیا میں نہ قیدیوں کو گرفتار کرنے کیلئے آتا ہے اور نہ مال و دولت کو جمع کرنے کیلئے۔ اس کے پیشِ نظر دشمن کی قوت کو توڑ کر اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے۔ وہ تخت و تاج کا طلب گار نہیں بلکہ وہ جھونپڑے میں رہ کر زمین پر اللہ کے نام کو بلند کرنا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو خوب معلوم ہے کہ قیدیوں کا ایک ایک فرد واپس جا کر کفر کی طاقت ثابت ہوگا اور کفر از سرِ نو شیرازہ بندی بھی کرے گا اور منصوبہ بندی بھی۔ اگر ان کی طاقت کو کچل دیا جاتا تو پہلی ہی جنگ ان کی طاقت توڑنے کیلئے کافی تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان اپنی ساری للّٰہیت کے باوجود ابھی تک دنیا کی طلب اور دنیا کی محبت سے کنارہ کش نہیں ہو سکے۔ درحقیقت یہ ایک ایسی فطری طلب ہے جس سے مکمل کنارہ کشی ممکن ہی نہیں۔ لیکن جس قدر کنارہ کشی ہو سکے اس کی اگر امید کی جاسکتی ہے تو مسلمانوں ہی سے کی جاسکتی ہے کیونکہ:

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انہیں کے جگر میں

لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝

اگر اللہ کا نوشتہ سبقت نہ کر چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تمہیں بڑا عذاب پہنچتا۔ ﴿الانفال: ۶۸﴾

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے مسلمانوں کو سخت تنبیہ فرمائی ہے اور یہ ایسی تنبیہ ہے جو اس کے علاوہ قرآنِ کریم میں مسلمانوں کو کہیں نہیں فرمائی گئی۔ سوال یہ ہے کہ تنبیہ کس بات پر ہے؟

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ ہے کہ مسلمان عذابِ عظیم کا شکار ہو جاتے اگر اس سے پہلے اللہ کا نوشتہ نہ لکھا جا چکا ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ نوشتہ کیا ہے؟

مسلمانوں کو تنبیہ:

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے اس کا جواب تو پچھلی آیتِ کریمہ میں موجود ہے اس میں صاف فرمایا گیا ہے کہ تم دنیا کا سامان چاہتے ہو حالانکہ اللہ آخرت چاہتا ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جو کسی اور قوم سے ہو تو شاید قابلِ معافی ہو، لیکن مسلمانوں سے اس کا صدور قیامت سے کم نہیں کیونکہ دین کا ہر فرد اور ہر قوم دنیا کی مسافر ہے۔ ہر مسافر کے پیشِ نظر ضروریاتِ زندگی ہی نہیں بلکہ دولتِ دنیا کا حصول ہے۔ دنیا کی محبت سے آزاد ہو جانا دنیا میں کر ممکن دکھائی نہیں دیتا، اس لئے لوگوں نے ترکِ دنیا یعنی رہبانیت کا راستہ اختیار کیا۔ جو سراسر انسانی فطرت اور اللہ کی مشیت کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے خطرناک نتائج سے کسی کو انکار نہیں اگر دنیا اور آخرت کی طلب میں توازن باقی نہ رہے تو دنیا طلبی انسانی زندگی کا مقصد تبدیل کر دیتی ہے۔ اس لئے ازبس ضروری ہے کہ کوئی قوم ایسی اٹھائی جائے جو دنیا سے تعلق کو ضبط میں رکھے۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ ضرورت کا درجہ دے، لیکن ہدف اور منزل آخرت ہو۔ مسلمان اسی کارِ عظیم کیلئے اٹھائے گئے ہیں، اگر وہ بھی اس صراطِ مستقیم پر نہ چل سکیں تو پھر ہدایت کا نور بجھ جائے گا۔ انسانی راہنمائی کیلئے کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا۔ اس لئے اس پر سخت تنبیہ فرمائی گئی۔ البتہ یہ بات دیکھنے کی ہے کہ مسلمانوں نے جنگِ بدر میں کس چیز کو ترجیح دی تھی جسے دنیا طلبی کہا گیا ہے؟ ہمارے محترم مفسرین نے بعض روایات کے حوالے سے لکھا ہے کہ مالِ غنیمت تم سے پہلے کسی قوم اور کسی امت کے لئے حلال نہیں تھا۔ بدر

Marfat.com

موقعہ میں جب مسلمان مال غنیمت اکٹھا کرنے میں لگ گئے حالانکہ ابھی تک ان کے لئے مال غنیمت حلال نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ مال غنیمت کے حلال ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کا یہ اقدام ایسا گناہ تھا کہ اس پر عذاب آجانا چاہئے اسی طرح ابھی تک فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنے کا حکم بھی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس لئے قیدیوں سے فدیہ لینا ایک طرح سے حدود سے تجاوز کرنا تھا۔ لیکن اس بات پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ اگر مال غنیمت یا فدیہ لینا حلال نہیں تھا یا اس کی حلت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا تو آنحضرت ﷺ اور جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا فیصلہ کیسے فرمالیا؟

نوشتہ سے مراد:

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ وہ نوشتہ کیا تھا جس کی وجہ سے عذاب ٹل گیا؟ ہمارے قدیم مفسرین کا خیال ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ حکم ہے جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے کہ اس امت کیلئے مال غنیمت حلال کیا جائے گا اور وہ حکم عنقریب نازل ہونے ہی والا تھا۔ اس حکم کی وجہ سے مسلمانوں سے عذاب ٹال دیا گیا۔

ایک دوسری تحقیق صاحب تفہیم القرآن کی ہے وہ لکھتے ہیں:

(میرے نزدیک اس مقام کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ جنگ بدر سے پہلے سورۂ محمد میں جنگ کے متعلق جو ابتدائی ہدایات دی گئی تھیں ان میں یہ ارشاد ہوا تھا کہ:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۚ (محمد : ۴)

اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت تو دے دی گئی تھی لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی تھی کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے پھر قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے۔ اس فرمان کی رو سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد جو ان سے فدیہ وصول کیا وہ تھا تو اجازت کے مطابق مگر غلطی یہ ہوئی کہ "دشمن کی طاقت کو کچل دینے" کی جو شرط مقدم رکھی گئی تھی اسے پورا کرنے میں کوتاہی کی گئی۔ جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت کو لوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا تعاقب کیا حالانکہ اگر مسلمان پوری طاقت سے ان کا تعاقب کرتے تو قریش کی طاقت کا اسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ عتاب فرما رہا ہے اور یہ عتاب نبی ﷺ پر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں پر ہے۔ فرمان مبارک کا منشا یہ ہے کہ "تم لوگ ابھی نبی کے مشن کو اچھی طرح نہیں سمجھے ہو نبی کا اصل کام یہ نہیں ہے کہ فدیے اور غنائم وصول کر کے خزانے بھرے بلکہ اس کے نصب العین سے جو چیز براہ راست تعلق رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طاقت ٹوٹ جائے۔ مگر تم لوگوں پر بار بار دنیا کا لالچ غالب ہو جاتا ہے پہلے دشمن کی اصل طاقت کے بجائے قافلے پر حملہ کرنا چاہا پھر دشمن کا سر کچلنے کے بجائے غنیمت لوٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے پھر غنیمت پر جھگڑنے لگے۔ اگر ہم پہلے فدیہ وصول کرنے کی اجازت نہ دے چکے ہوتے تو اس پر تمہیں سخت سزا دیتے۔ خیر اب جو کچھ تم نے لیا ہے وہ کھا لو مگر آئندہ ایسی روش سے بچتے رہو جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے"۔ میں اس رائے پر پہنچ چکا تھا کہ امام جصاص کی کتاب احکام القرآن میں یہ دیکھ کر مجھے مزید اطمینان حاصل ہوا کہ امام موصوف بھی اس تاویل کو کم از کم قابل لحاظ ضرور قرار دیتے ہیں پھر سیرت ابن ہشام میں یہ روایت نظر سے گزری کہ جس وقت مجاہدین اسلام مال غنیمت لوٹنے اور کفار کے آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگے ہوئے تھے نبی ﷺ نے دیکھا کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر کچھ کراہت کے آثار ہیں۔ حضور نے ان سے دریافت فرمایا کہ "اے سعد! معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی یہ کارروائی تمہیں پسند نہیں آرہی ہے۔" انہوں نے عرض کیا "جی ہاں یا رسول اللہ! یہ پہلا معرکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہل شرک کو شکست دلوائی ہے" اس موقع پر انہیں قیدی بنا کر ان کی جانیں بچالینے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ان کو خوب کچل ڈالا جاتا۔ (جلد ۲۔ صفحہ ۲۸۔ ۲۸۱)

Marfat.com

اس ناچیز کے خیال میں دونوں تحقیقات میں کوئی بنیادی فرق نہیں صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔ صاحب تفہیم القرآن اصل کوتاہی اثخان فی الارض میں کوتاہی کو قرار دیتے ہیں اور جمہور مفسرین مالِ غنیمت اور فدیہ یعنی دنیا کا مال لینے کو اصل غلطی سمجھتے ہیں اور دوسری یہ بات کہ صاحبِ تفہیم القرآن کی تحقیق کا دارومدار "سورہ محمد" کی آیت پر ہے۔ لیکن اس کیلئے بنیادی شرط یہ ہے کہ "سورہ محمد" کو "سورۃ الانفال" پر مقدم مانا جائے جبکہ اہلِ علم میں اس معاملے میں اختلاف ہے کہ دونوں سورتوں میں نزول کے اعتبار سے تقدم کسے حاصل ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

پس کھاؤ اس سے جو تمہیں غنیمت سے ملا ہے، وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ (الانفال: ۶۹)

مالِ غنیمت سے متعلق حکم:

گزشتہ دو آیتوں میں چونکہ مالِ غنیمت حاصل کرنے پر مسلمانوں پر سخت تنقید کی گئی جس سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید مالِ غنیمت مسلمانوں کے لئے حلال نہیں اور سابقہ مذاہب کی روایات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ سابقہ مذاہب میں مالِ غنیمت سے فائدہ اٹھانا حلال نہیں تھا بلکہ جنگ میں فتح کے بعد جو مالِ غنیمت مسلمانوں کو ملتا تھا وہ بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے اسے کسی بلند جگہ پر رکھ دیتے تھے، اگر اللہ کو مسلمانوں کی وہ فتح قبول ہوتی تو آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی وہ اس مالِ غنیمت کو جلا دیتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمالیا اور اگر مالِ غنیمت جلایا نہ جاتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے اسے قبول نہیں فرمایا، پھر وہ مال وہیں پڑا رہ جاتا، مسلمان اسے منحوس سمجھتے اور کوئی اس کے قریب نہ جاتا۔ ان روایات سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید اب بھی مالِ غنیمت مسلمانوں کیلئے حلال نہیں ہے۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں اس شبہ کو دور کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ

﴿تمہیں جو مالِ غنیمت ملا ہے اسے شوق سے کھاؤ وہ تمہارے لئے حلال بھی ہے، پاکیزہ بھی﴾

تنقید اس بات پر نہیں کہ مالِ غنیمت حلال ہے یا نہیں بلکہ تنقید اس بات پر ہے کہ تم نے دشمن کی قوت توڑنے سے پہلے مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح سے ایک ایسی چیز کو ترجیح دی جو ترجیح کے قابل نہ تھی۔ مزید فرمایا کہ یہ حلال بھی ہے اور طیب بھی اس لئے کہ حلال اور حرام ٹھہرانا یہ سراسر اللہ کا اختیار ہے چنانچہ اس نے جب اسے مسلمانوں کے لئے جائز قرار دے دیا تو اب اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا اور اسی طرح جس چیز کو پروردگار حلال کر دیتے ہیں وہ پاکیزہ بھی ٹھہرتی ہے کیونکہ مسلمانوں کیلئے تمام پاکیزہ نعمتیں حلال کی گئی ہیں اور جن چیزوں میں کسی طرح کی نجاست پائی جاتی ہے چاہے وہ عقیدے کی نجاست ہو یا خلقی نجاست ان چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دے دیا ہے۔ اس لئے تمام خبائث کو حرام قرار دیا گیا ہے اور غیر اللہ کے نام پر پُن کیے جانے والے یا ذبح کئے جانے والے جانور حرام قرار دیئے گئے ہیں کیونکہ ان میں عقیدے کی گندگی پائی جاتی ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے کہ مسلمانوں سے مالِ غنیمت کے معاملے میں اگرچہ جلد بازی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئیں لیکن اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما چکا ہے، اب وہ سرتاسر اللہ کے رحم کے مستحق ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ

لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰۤى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

Marfat.com

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٠﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ
مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ
شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ج وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ
النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ط وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٧٢﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ط
اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ط ﴿٧٣﴾ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ
اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ
رِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا
مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ط وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ
فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٧٥﴾ ع

Marfat.com

اے نبی! کہہ دیجئے ان سے جو آپ ہاتھوں میں قیدی ہیں، اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو وہ عطا فرمائے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اگر تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انہوں نے اللہ سے بدعہدی کی تو اللہ نے تم کو ان پر قابو دے دیا اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی رشتۂ ولایت نہیں۔ یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ مدد طلب کریں تم سے دین کے معاملے میں تو تم پر مدد واجب ہے مگر یہ کہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابلے میں ہو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد مچے گا۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ پکے مومن ہیں۔ ان کیلئے مغفرت اور باعزت روزی ہے۔ اور جو ایمان لائیں اس کے بعد اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ جہاد میں شریک ہوں تو وہ بھی تم ہی میں سے ہیں اور رحمی رشتے والے اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، بیشک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ (۷۰تا۷۵) (رکوع: ۱۰)

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

اے نبی! کہہ دیجئے ان سے جو آپ کے ہاتھوں میں قیدی ہیں، اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تم کو وہ عطا فرمائے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ اور اگر یہ تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انہوں نے اللہ سے بدعہدی کی تو اللہ نے تم کو ان پر قابو دے دیا ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ (الانفال: ۷۰، ۷۱)

بدر کے قیدیوں سے خطاب:

ان آیات کریمہ میں جنگِ بدر میں پکڑے قیدیوں سے آنحضرت ﷺ کے واسطے سے خطاب فرمایا جا رہا ہے۔ جس میں ان کیلئے ایک پیغام بھی ہے اور دھمکی بھی۔ پیغام یہ ہے کہ تمہاری واضح اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے اسلام کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کی اذیت رسانی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تمہارے لگائے ہوئے زخم ابھی تک مسلمانوں کے دلوں پر تازہ ہیں اور پھر جنگِ بدر کی صورت میں تمہارا حملہ بجائے خود مسلمانوں کے استیصال کیلئے تھا تم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ تمہیں ایسی رسوا کن ہزیمت سے واسطہ پڑے گا۔ تمہاری تاریخ اور تمہارے کارنامے بار بار سفارش کر رہے ہیں کہ تمہیں زندہ نہ چھوڑا جائے اور اگر تمہیں زندہ چھوڑا گیا تو تم واپس جا کر اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے سوا اور کچھ نہیں کرو گے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ کے نبی اور اس کے ساتھیوں نے تم سے فدیہ لے کر آزاد کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایک ایسی نعمت غیر مترقبہ اور ایسا احسانِ عظیم ہے جس کا تصور بھی تمہارے دلوں میں نہیں گزرا ہو گا۔ لیکن یہ احسان تم پر اس لئے کیا گیا ہے تا کہ تمہیں اندازہ ہو جائے کہ اسلام دنیا میں گردنیں کاٹنے اور ملکوں پر قبضہ کرنے کیلئے نہیں آیا بلکہ اس کے پیشِ نظر ایک ایسا انقلاب ہے جس کے نتیجے میں انسان کے اندر تبدیلی آئے اور وہ اپنے کفر و جحود اور غفلت سے نکل کر اللہ کے آستانے پر جھک جائے اور وہ ہدایت کا راستہ اختیار کر کے دنیا اور آخرت کی تباہی سے بچ جائے۔ تمہیں زندہ رہنے کا موقعہ اس لئے دیا جا رہا ہے کہ تم آزاد ہو کر آزادانہ سوچ کے بعد خوش دلی سے یہ فیصلہ کرو کہ اسلام اور اللہ کی اطاعت بہتر ہے یا کفر اور شرک؟ اور پھر اگر تم صحیح فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو یاد رکھو! ایک طرف تو اللہ تعالیٰ تمہیں جہنم سے آزادی دے کر جنت کا وارث بنا دے گا اور دوسری طرف فدیہ کی صورت میں جو کچھ تم سے حقیر مال لیا گیا ہے اس سے بہت زیادہ تمہیں واپس کرے گا۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس کے بعد اسلام قبول کیا اس میں سے ایک ایک شخص کی زندگی اس سچائی کی منہ بولتی

Marfat.com

سورۃ تھی اور حضرت عباس ﷜ کا واقعہ جو مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر بیان کیا ہے وہ بجائے خود اس کی وضاحت کیلئے کافی ہے۔

حضرت عباس ﷜ بھی بدر کے قیدیوں میں شامل تھے چنانچہ جب ان سے فدیہ کا مطالبہ کیا گیا تو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے گزارش کی کہ میں اپنے ساتھ سات سوگنی سونا لے کر آیا تھا جو مسلمانوں نے میری گرفتاری کے وقت مجھ سے لے لیا۔ آپ فدیہ کی رقم میرے اس مال میں سے کاٹ لیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آپ یہ مال کفر کی مدد اور کافروں پر خرچ کرنے کیلئے لائے تھے چنانچہ آپ کی گرفتاری کے ساتھ وہ مال بھی مالِ غنیمت بن گیا اب وہ مال مسلمانوں کا ہے آپ کا اس پر کوئی حق نہیں۔ مزید فرمایا کہ آپ کے دو بھتیجے بھی مسلمانوں کی قید میں ہیں، عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن حارث، ان دونوں کا فدیہ بھی آپ ادا کیجئے کیونکہ وہ اپنے طور پر فدیہ ادا نہیں کر سکتے اور آپ ان کے ولی اور بزرگ ہیں اس لئے آپ کو ان کا زرِ فدیہ ادا کرنا چاہئے۔ حضرت عباس ﷜ نے کہا کہ اگر آپ اتنا مالی بار مجھ پر ڈالیں گے تو مجھے واپس جا کر قریش سے بھیک مانگنا پڑے گی کیونکہ میں اس کے بعد بالکل فقیر ہو جاؤں گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ آپ نے مکہ سے روانگی کے وقت جو مال اپنی زوجہ ام الفضل کو دیا تھا وہ مال بھی تو آپ کا ہے۔ حضرت عباس نے حیران ہو کر کہا: آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ کیونکہ میں نے وہ مال رات کی تاریکی اور تنہائی میں اپنی بیوی کے سپرد کیا تھا، کوئی تیسرا آدمی اسے دیکھنے والا نہ تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے اس کی تفصیل بتائی ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو پہلے ہی آپ سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے یہ جواب سن کر ان کی عقیدت میں اور اضافہ ہو گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ آپ اسی وقت اسلام کا اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن ان کیلئے مشکل یہ تھی کہ ان کا بہت سارو پیہ قریش کے ذمہ قرض تھا۔ اگر وہ اس وقت مسلمان ہونے کا اعلان کر دیتے تو وہ روپیہ مارا جاتا اور مزید یہ بات بھی کہ آنحضرت ﷺ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ کوئی قیدی قید سے مجبور ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کرے۔ فتح مکہ سے پہلے حضرت عباس ﷜ نے ایک دفعہ پھر اپنے اسلام کے اظہار اور ہجرت کی آنحضرت ﷺ سے اجازت چاہی لیکن آپ نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ آپ مکہ میں رہیں تا کہ ہمیں قریش کے حالات کی اطلاع ملتی رہے۔

قرآنِ کریم کا یہ پیغام کہ قیدیوں سے جو کچھ لیا گیا ہے اس سے بہت بہتر ان کو دیا جائے گا اس کے بارے میں حضرت عباس ﷜ کہتے ہیں کہ میں تو اس وعدہ کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں کیونکہ مجھ سے بیس اوقیہ سونا فدیہ میں لیا گیا تھا۔ اس وقت میرے بیس غلام مختلف جگہوں میں تجارت کر رہے ہیں اور کسی کا کاروبار بیس ہزار درہم سے کم نہیں ہے اور اس پر مزید انعام یہ ہے کہ مجھے حجاج کو آبِ زم زم پلانے کی خدمت سپرد کی گئی ہے جو میرے نزدیک ایسا گراں قدر کام ہے کہ سارے مکہ کے اموال بھی اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

دوسری آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کے ایک خدشے کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ قیدی آزادی کے بعد وطن جا کر اپنے وعدوں کا ایفا نہیں کریں گے اور مسلمانوں کے احسانات کو یکسر نظر انداز کر کے پھر مسلمانوں کی دشمنی اور اسلام کو نقصان پہنچانے کا کام شروع کر دیں گے تو اس سلسلہ میں میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے اور قیدیوں کو دھمکی دی گئی ہے۔ تسلی کا مضمون یہ ہے کہ اگر یہ آپ سے واپس جا کر خیانت کریں اور آپ کے احسانات سے یکسر بے وفائی برتیں تو اس میں نئی بات کیا ہے؟ یہ تو پہلے بھی ایسا کر چکے ہیں۔ اللہ نے ان پر کیسے کیسے احسانات کئے، انہیں حرم کا مکین بنایا، حرم کی پاسبانی ان کے حوالے کی، ملتِ ابراہیم کی وراثت ان کے سپرد کی گئی۔ انہوں نے نہ حرم کے تقدس کا خیال کیا اور نہ ملتِ ابراہیمی کے بگاڑ سے باز آئے۔ بدر میں جو کچھ بھی ان کے ساتھ ہوا یہ اسی بے وفائی کی پہلی سزا ہے اور اگر اب بھی یہ اس طرزِ عمل سے باز نہ آئے تو اے پیغمبر! یہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ ہم نے جس طرح پہلے آپ کو ان پر حاوی کیا اور انہیں آپ کے قابو میں دے دیا اسی طرح آئندہ بھی ہم آپ کو ان پر غالب رکھیں گے۔ لیکن ہم انہیں زندگی دے کر انہیں سنبھلنے کا ایک اور موقع دینا چاہتے ہیں تا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی زندگی بھی بنا لیں اور آخرت بھی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ ۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ ﴿الانفال : ۷۲﴾

Marfat.com

(بے شک جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اپنی جان ومال سے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تمہارا ان سے کوئی رشتۂ ولایت نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ مدد طلب کریں تم سے دین کے معاملے میں تو تم پر مدد واجب ہے مگر یہ کہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابلے میں ہو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۔)

اسلام میں اجتماعی زندگی کی اہمیت اور اس کی اساسات:

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ سے پیشتر آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سامنے یہ بات کھول کر رکھ دی ہے کہ تم نے ہدایت کا جو راستہ اختیار کیا ہے اور دنیا کو جس نئی روشنی کی طرف بلانے کیلئے اٹھے ہو اس کے نتیجے میں راتوں کے مسافر اور گمراہیوں کو زندہ رکھنے والے تمہارے لئے جینا مشکل کر دیں گے۔ ان کے ہاتھوں سے جنگل کے درندوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ چور اور ڈاکو ان کے لئے قابلِ برداشت ہیں۔ لیکن جو لوگ انہیں کسی طرح گوارا نہیں وہ تم ہو کیونکہ وہ تمہاری زندگی میں اپنی موت دیکھتے ہیں۔ عنقریب تمہیں ایک بڑی کشمکش اور ایک بڑے تصادم سے سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اس کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ تم اپنی شیرازہ بندی کی بنیادوں کو اچھی طرح سمجھ لو اور جو چیزیں تمہارے وجود اور تمہاری بقا کی ضامن ہیں انہیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو اور اپنی اجتماعی زندگی کو انہیں اساسات پر اٹھاؤ جن پر تمہاری اجتماعی زندگی کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔

اسلام جس ماحول میں آیا اس میں اجتماعی زندگی کی بنیاد اور باہمی توافق اور تخالف کی اساس قبیلے کی عصبیت پر قائم تھی۔ خاندان کی مختلف شاخیں پھیل کر جب ایک قبیلے کی شکل اختیار کر لیتی تھیں تو وہ اجتماعی زندگی کا حصار بن جاتا تھا۔ قبیلے کا ہر فرد قبیلے کی عصبیت کو اپنی قوت اور طاقت سمجھتا تھا اور قبیلہ اپنے ایک ایک فرد کی حفاظت و نصرت اپنا فریضہ خیال کرتا تھا۔ قبیلے کے کسی فرد سے باہر کے کسی آدمی کی لڑائی ہو جاتی تو قبیلے کے فرد کیلئے صرف قبیلے کا نام لے کر دہائی دینا اور مدد کیلئے پکارنا کافی تھا۔ قبیلے کا کوئی فرد یہ جاننا ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ لڑائی میں حق پر کون ہے اور ناحق پر کون۔ انہیں تو صرف اتنا معلوم تھا کہ جب ہمارے قبیلے کا کوئی آدمی قبیلے کے نام پر ہمیں مدد کیلئے پکارتا ہے تو ہمیں اس کی مدد صرف اس لئے کرنی ہے کہ وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ غلطی پر ہے یا صواب پر۔ قبیلے کا غلام بھی قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اتنا اہم ہو جاتا تھا کہ دوسرے قبیلے کا سردار بھی اس کی مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا ورنہ اسے قبیلے کی دشمنی سے واسطہ پڑتا تھا۔

توافق و تخالف اور تعاضد و تناصر کی یہ بنیاد اس قدر پختہ اور ہمہ گیر تھی کہ حلیف قبائل بھی اس میں شریک ہو جاتے تھے اور پھر اسی بنیاد پر سالوں تک لڑائیاں چلتی تھیں اور ہزاروں لوگ تہ تیغ ہوتے تھے۔ اسلام نے سب سے زیادہ زور اسی بنیاد کو بدلنے پر صرف کیا۔ کوئی بھی اجتماعی نظم اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ اجتماعی زندگی کیلئے باہمی تعاون کی کوئی مشترکہ بنیاد ہونی چاہیے۔ جس کی وجہ سے اجتماعی زندگی میں شریک ایک ایک فرد حرکت میں آ جائے۔ لیکن اصل سوال یہ تھا کہ وہ بنیاد کیا ہو؟ عربوں نے قبیلے کی وحدت کو اجتماعیت کی بنیاد بنایا، اسی کی عصبیت کو اس کی مضبوطی کیلئے استعمال کیا لیکن اس کا نتیجہ جو ہر صاحبِ بصیرت پر روشن تھا وہ یہ تھا کہ اس کے نتیجے میں قبائل کی آویزش اور دشمنی بجائے کم ہونے کے روز افزوں تھی۔ جس کی وجہ سے پورا عرب دہکتا ہوا جہنم بن چکا تھا۔ اسلام نے اجتماعیت کی بنیاد کو تسلیم کیا لیکن قبیلے کی عصبیت کو صالح اجتماعیت کا دشمن قرار دیا۔ اس نے اجتماعیت کیلئے وہ بنیادیں فراہم کیں جس کی نتیجے میں نہ صرف قبیلے کی عصبیت ختم ہوئی اور انسان اس تنگ نائے سے نکلنے پر قادر ہوا بلکہ عرب سے باہر دنیا نے رنگ و نسل اور جغرافیے کو جس طرح وحدت کا ذریعہ سمجھ رکھا تھا اس گمراہی کا بھی ازالہ فرمایا اور مسلمانوں پر نہایت کامیابی سے یہ راز آشکارا کیا کہ تم ایک ایسے دین کے داعی بن کر اٹھے ہو جو پوری نوعِ انسانی کی ضرورت ہے۔ جس طرح اس کا محتاج عرب ہے اسی طرح عجم بھی ہے۔ جس طرح کالے اور سانولے اس سے فائدہ اٹھانے کے پابند ہیں اسی طرح گورے اور سرخ بھی اسی کی تعلیم کے محتاج ہیں۔ اگر تم اپنی پرانی بنیادوں کو نہیں توڑو گے اور قبیلے کے محدود ماحول سے نہیں نکلو گے تو دنیا کے دوسرے ملکوں اور انسانوں کے پورے قافلے

Marfat.com

میں تمہاری دعوت کیسے قبول کی جائے گی؟ اور یہ بات بھی ان پر واضح کی کہ دنیائے کفر جب تمہارے خلاف متحد ہو کر تم پر حملہ آور ہو گی تو تم نے اگر وسیع تر بنیادوں پر اپنی صف بندی نہ کی تو ان کا مقابلہ کیسے کرسکو گے؟ چنانچہ ان ضرورتوں کے پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں ان اساسات کو واضح فرمایا جن پر مسلمانوں کی قومی وحدت استوار کی جاسکتی ہے۔

پانچ بنیادیں:

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسلامی اجتماعیت اور اسلامی وحدت کیلئے پانچ بنیادوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

ا۔ ایمان: ایمان چند بنیادی حقائق کا زبان سے اقرار کرنے، دل سے تصدیق کرنے اور اعضاء و جوارح سے اس کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے۔ ایمان یقین کی وہ قوت ہے جس سے ایک عام آدمی کا رشتہ اپنے خالق و مالک سے قائم ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی کبریائی کو اس طرح دل و نگاہ میں بٹھا لیتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کی نظروں میں جچتی نہیں۔ دنیا کا کوئی نظریہ اس کیلئے قابلِ قبول نہیں رہتا کسی آستانے پر اس کا سر نہیں جھکتا اور کسی کے سامنے وہ دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ وہ زندگی کا ہر فیصلہ اس شریعت کے مطابق کرتا ہے جو اسے اپنے اللہ سے ملی ہے اور اس کی زندگی کیلئے عملی نمونہ وہ رسولِ گرامی ہے جسے اللہ نے انسانوں کیلئے ہدایت کیلئے مبعوث فرمایا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ جب اللہ کے روبرو حاضری ہو گی تو کیا میں اپنے عمل کا جواب دے سکوں گا یا نہیں؟ یہ زندگی دار العمل ہے اس کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ یہ زندگی آنے والی زندگی کی تیاری میں صرف ہو جائے۔ جو شخص ان بنیادی حقائق کو تسلیم کر لیتا ہے وہ ایک نئی امت اور نئی اجتماعی قوت کا رکن بن جاتا ہے اس کا قبیلے کی عصبیت سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تعاضد و تناصر میں قبیلے کے اشتراک کو نہیں دیکھتا بلکہ ایمان کے اشتراک کو دیکھتا ہے۔ وہ اگر قریشی ہے تو اس کا ابولہب اور ابوجہل سے کوئی رشتہ نہیں حالانکہ وہ اس کے خاندان کے لوگ ہیں۔ اس کا رشتہ بلال ﷺ سے ہے، صہیب ﷺ سے ہے یا ایسے ہی دوسرے لوگوں سے جو اللہ کے رسول کی دعوت پر ایمان لا چکے ہیں۔ بلال کالا کلوٹا سہی اور صہیب رومی غلام سہی، لیکن یہ اس نئی اجتماعیت کے افراد ہیں جن کی بنیاد ایمان پر ہے۔ اس اجتماعیت میں شریک لوگ نفع و ضرر کے احساسات میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کیلئے جیتے اور ایک دوسرے کیلئے مرتے ہیں۔ ان سب کے پیشِ نظر اسی نئی بنیاد اور وحدت پر امت کے دائرے کو وسیع کرنا ہے۔ وہ شب و روز اسی دھن میں گزارتے ہیں کہ کس طرح ایک ایک شخص کو اس نئی وحدت میں شامل کیا جائے۔ جب مخالف قوت ان کا جینا مشکل کر دیتی ہے اور ان کی دعوت کے راستے بند کر دیتی ہے تو وہ اپنے اس مضبوط تعلق کو ثابت کرنے کیلئے ایک فیصلہ کرتے ہیں، جس سے اسلامی اجتماعیت کی دوسری بنیاد جنم لیتی ہے۔

۲: ہجرت:) ہجرت درحقیقت ایمان کی قیمت ادا کرنا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ ہمارا وہ شہر جس میں ہمیں وجود ملا اور ہمارے وہ گھر جس میں ہم نے شب و روز گزارے اور ہمارے وہ بڑے جن کی شفقت کے سائے میں ہم پروان چڑھے اور ہمارے وہ بھائی اور ساتھی جن کے ساتھ کھیلتے ہوئے ہم جوان ہوئے۔ ہمارے مکانات، ہمارے باغات، ہمارے کاروباران میں سے کوئی چیز ایمان اور دین کا بدل نہیں ہوسکتی۔ اگر کفر کی طاقتیں ہمارے لئے ایمان کے ساتھ جینا مشکل کر رہی ہیں تو ہم ایسے شہر، ایسے تعلق دار اور ایسے ماحول کو اپنے دین پر قربان کرنے کیلئے تیار ہیں۔ چنانچہ وہ محض اپنے ایمان کی حفاظت اور اسلامی ذمہ داریوں کی بجا آوری کیلئے اپنا وطن چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ دیس کی راحتوں پر اس پردیس کو ترجیح دیتے ہیں جس میں ان کی ایمانی زندگی سلامت ہو۔ چنانچہ ایمانی زندگی کی حفاظت کیلئے وطن چھوڑ دینا اور ایک ایک تعلق سے دستبردار ہو جانا ''ہجرت'' کہلاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ہجرت بھی ایمان کی طرح فرض تھی۔ چنانچہ جو لوگ ہجرت کرنے میں تامل کرتے تھے ان کے ایمان کو بے اعتبار ٹھہرا دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایمان کوئی ساکت و جامد چیز نہیں۔ یہ عمل کی صورت میں اسلام بن جاتا ہے اور اسلام اللہ کے تمام احکام کی اطاعت کا نام ہے اور اللہ کے احکام آنحضرت ﷺ پر مسلسل نازل ہو رہے تھے جنہیں آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل کو پہنچنا تھا۔ جو شخص ہجرت کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نہیں پہنچتا تھا وہ اسلامی احکام سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی اسلامی زندگی بھی ادھوری رہتی اور اسلامی تربیت بھی نامکمل رہتی تھی اور

Marfat.com

دوسری یہ بات کہ مسلمان جس روشنی کو لے کر اٹھے تھے اس کا چراغ صرف ان کے اپنے گھروں ہی میں نہیں جلنا تھا بلکہ اس شمع کو ہر اس جگہ پہنچنا تھا جہاں کہیں انسان بستے تھے اور جہاں دھرتی پانی دیتی تھی۔ یہ ایک جانگسل کشمکش کا آغاز تھا جس میں حق وباطل کے قدم قدم پر معرکے تھے۔ اس لئے یہ بات انتہائی ناگزیر تھی کہ آنحضرت ﷺ کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ ایسے افراد کا ہجوم ہوتا جن میں سے ایک ایک کے دل میں طوفان موجزن ہوتے۔ آئے دن جن کی تعداد میں اضافہ ہوتا تاکہ اہلِ حق کی اتنی بڑی قوت وجود میں آجائے جو کفر کے اجتماعی جتھوں کا مقابلہ کر سکے۔ ان ضرورتوں کے پیشِ نظر مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ایمان لائیں اپنا گھر اور وطن چھوڑ کر اللہ کے رسول کی خدمت میں مدینہ طیبہ ہجرت کر جائیں۔ ان دو بنیادوں نے ایک امت کی تشکیل وتعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

۳:۔ پناہ دینا:) مختلف علاقوں سے لوگ جب ہجرت کر کے مرکزِ اسلام میں پہنچیں گے تو سب سے پہلی ضرورت جو پہلے ہی دن پیش آئے گی وہ یہ ہے کہ کیا مرکزِ اسلام اور وہاں کے رہنے والے ان نئے آنے والے مہمانوں کیلئے پناہ گاہ بننے کیلئے بھی تیار ہیں یا نہیں کیونکہ کسی بھی ملک یا شہر پر مہاجرین کا ہجوم ایک ایسا مسئلہ ہے جو قوموں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ کسی ملک میں حالات خراب ہوتے ہیں تو بعض دفعہ وہاں کے عوام پناہ کیلئے ہمسایہ ملک کا رخ کرتے ہیں اور ہمسایہ ملک کیلئے انہیں پناہ دینا اور ان کی ضروریات کا فراہم کرنا بعض دفعہ ایسا مسئلہ بن جاتا ہے کہ دوسرے ملکوں سے اپیلیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن جب معاملہ ایک ایسی امت کا ہو جو نئی بنیادوں پر وجود میں آ رہی ہے اور پرانی جاہلیت اور پرانا سماج انہیں کسی طرح گوارا کرنے کو تیار نہیں تو ایسی صورت میں ان کی مدد کیلئے اپیل بھی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس ہجرت کا بوجھ تمام تر ان لوگوں کو اٹھانا پڑتا ہے جو پہلے سے ان کی نظریاتی زندگی سے وابستہ اور ایمانی توانائی سے آراستہ ہوں کیونکہ دوسرا کوئی شخص اس میں شریک ہونے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جس طرح ہجرت ایک مشکل معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سوچ سمجھ سے اللہ سے وابستگی کا عہد کر چکے ہوں، اسی طرح انہیں پناہ دینے کا فیصلہ بھی آسان نہیں۔ اس کا ارادہ بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو پوری دنیا سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

۴:۔ نصرت:) مہاجرین کو صرف پناہ دینا کافی نہیں بلکہ ان کیلئے ضروریات کی فراہمی بھی ناگزیر ہے۔ ان کی رہائش کا بندوبست، ان کے کھانے پینے کا انتظام، ان کے کاروبار کی کوئی شکل وصورت، ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے نظر انداز کیا جا سکے یہی وہ چیز ہے جسے "نصرت" کہا گیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے ہجرت کی اور مرکزِ اسلام کو اپنا وطن بنایا انہیں "مہاجر" کہا گیا اور جن لوگوں نے انہیں ٹھکانہ دیا اور نصرت کی انہیں "انصار" کے معزز لقب سے یاد کیا گیا۔ جس طرح مہاجرین نے ہجرت کی صعوبتیں اٹھا کر ایمان واخلاص کی نئی نئی جہتوں کو آشکارا کیا اسی طرح انصار نے نصرت وایثار کی وہ مثالیں قائم کیں جنہیں چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ انصار نے اپنے گھر مہاجرین کے لئے خالی کر دیئے، اپنی زمینیں تقسیم کرنے کیلئے تیار ہو گئے، بعض لوگ تو اس حد تک سراپا ایثار بن گئے کہ ان میں سے کسی ایک کی اگر دو بیویاں تھیں تو اس نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میں ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہوں تم اس سے نکاح کر لو۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ مہاجر اور انصار دونوں اسی عرب قوم کے افراد تھے جو اپنے قبیلے سے باہر کسی آدمی کیلئے کلمۂ خیر کہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کی ہمدردیاں اور محبتیں صرف اپنے قبیلے کے افراد تک محدود تھیں اور اب ان کی محبت اور نصرت کیلئے ایمان اور ہجرت کا حوالہ کافی تھا۔ اس تعلق نے ان کے درمیان ایک ایسے مضبوط رشتے کو وجود دیا جس کی وجہ سے باقی تمام رشتے ماند پڑ گئے۔ اس مضبوط شیرازہ بندی اور مخلصانہ معنوی وحدت نے عزم وحوصلہ کی ایک ایسی قوت کو جنم دیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے مال اور اپنی جانیں اللہ کے راستے میں قربان کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ چنانچہ یہ وہ جذبۂ بے پناہ ہے جسے "جہاد" سے یاد کیا جاتا ہے۔

۵: جہاد:) جہاد ایک جہدِ مسلسل کا نام ہے۔ جس میں نہ اپنی ذات پیشِ نظر ہوتی ہے نہ مال ومتاع کا حصول، نہ شہرت ونا موری، نہ کسی ملک پر قبضہ کرنا، نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی، صرف ایک فکر ہوتی ہے کہ اللہ کے دین کی دعوت تمام نوعِ انسانی تک پہنچ جائے۔ جن قوتوں نے اس دعوت کا راستہ روک رکھا ہے اور وہ اس آبِ حیات کو دوسروں تک پہنچنے کی اجازت نہیں دیتے ان قوتوں سے ٹکرانا اور راستے سے ہٹانا جہاد کی ایک ضرورت بن جاتا ہے۔ مقصود صرف اللہ کی دعوت کو پہنچانا ہے اگر اس کیلئے راستے ہموار ہیں تو کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تخت وتاج کے مالک اس دعوت کو اپنے تخت وتاج کیلئے خطرہ سمجھتے ہیں تو پھر ان سے نبرد آزما ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

بہر حال یہ پانچ بنیادیں ہیں جن پر ایک امت کی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔جن میں نظریاتی وحدت کی قوت بھی ہے اور اس راستے میں ہر چیز کو چھوڑ دینے کی صلاحیت بھی اور اگر اس کیلئے اپنا مال و متاع قربان کرنا پڑتا ہے تو اس کیلئے ایثار کی قوت بھی ہے۔ پھر یہ تمام معنوی قوتیں مل کر ایک ایسے لشکر میں بدل جاتی ہیں جو اللہ کے نام کی سربلندی اور اس کے دین کی بالادستی کیلئے بہمہ وجود تیار رہتا ہے اور یہ لوگ آپس میں ایسا گہرا رشتہ رکھتے ہیں جس کی گہرائی خونی رشتے سے زیادہ ہے۔ان میں صرف اخوت ہی قائم نہیں ہوتی بلکہ ان کے درمیان ایک ولایت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو اپنی وسعت میں اخوت کے رشتے سے بڑھ کر ہے۔ انہیں کے بارے میں فرمایا کہ یہ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ اسلامی اخوت کا رشتہ صرف ایمان سے وجود میں آتا ہے لیکن اسلامی ولایت کیلئے ہجرت اور نصرت ضروری ہیں اور جو لوگ ہجرت نہیں کرتے ان کے درمیان اسلامی اخوت تو ضرور باقی رہتی ہے بشرطیکہ ان کا اسلام سے مخلصانہ تعلق ہو لیکن ان میں ولایت کا قانونی رشتہ قائم نہیں ہوتا اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ جو لوگ ہجرت پر آمادہ نہیں ہوتے تمہارے اور ان کے درمیان ولایت کا کوئی رشتہ نہیں۔ یعنی وہ رشتہ جو اسلامی حکومت اور اس کے زیرِ سایہ رہنے والوں کے درمیان ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اسلامی حکومت اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کے بنیادی حقوق کی ضامن ہوتی ہے اور اسلامی ریاست کے زیر اثر رہنے والے افراد میں سے ایک ایک فرد اپنی ریاست کا ہمدرد اور غمگسار ہوتا ہے وہ اس کے مفادات کو اپنے مفادات پر ترجیح دیتا ہے اور اسلامی ریاست اس کے مفادات کو اپنے مفادات سمجھتی ہے اور وہ کسی ممکن طریقے سے کسی طرف سے بھی اس کے مفادات کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دیتی۔ حضور ﷺ کا مشہور ارشاد ہے:

﴿اگر خدانخواستہ میں ایک طرف کعبہ کو گرتا ہوا دیکھوں اور دوسری طرف مسلمان کا خون بہتا ہوا تو میں پہلے مسلمان کو بچانے کی فکر کروں گا کیونکہ مسلمان ریاست کو اس کا پاسبان بنایا گیا ہے۔﴾

اس لئے حضرت عمر فاروق ؓ نے فرمایا کہ:

﴿اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھوکا مر جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اس کا سوال کیا جائے گا۔﴾

اور جہاں تک مسلمانوں اور ان کے بچوں کا تعلق ہے اس کیلئے تو مسلمان خلفاء کی راتوں کی نیندیں اڑ جاتی تھیں۔ حضرت عمر فاروق ؓ مدینہ سے باہر پڑاؤ ڈالنے والے قافلوں کی ضرورتوں کا جائزہ لینے کیلئے رات کو گشت فرماتے تھے اور جب کبھی معلوم ہوتا کہ ان کے بچے بھوکے ہیں تو خود اپنی کمر پر بوجھ لاد کر ان کی ضروریات پوری کرتے اور اس وقت انہیں چین آتا تھا جب ان کے بچے کھا پی کر خوشی سے کھیلنے لگتے تھے اور جب حضرت عمر فاروق کو یہ معلوم ہوا کہ بعض مائیں بچے کے وظیفے کی خاطر بچے کا قبل از وقت دودھ چھڑا دیتی ہیں تو صبح کی نماز آپ کیلئے پڑھانا مشکل ہو گیا گریہ وزاری کا آپ پر اس قدر غلبہ ہوا کہ بار بار نماز میں چیخ نکل جاتی تھی۔ نماز کے ختم ہوتے ہی فرمایا "عمر برباد ہو گیا نہ جانے کتنی ماؤں نے بچے قبل از وقت دودھ چھڑا کر ہلاک کر دیئے اس لئے میں حکم جاری کرتا ہوں کہ ہر بچہ کا وظیفہ پیدا ہوتے ہی لگا دیا جائے تا کہ کسی ماں کو قبل از وقت دودھ چھڑانے کی ضرورت نہ پڑے"۔ یہی وہ ولایت کا رشتہ ہے جو حکومت اور رعیت کے درمیان ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے پاسبان ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق کے پاسبان ہیں اور یہ رشتہ ہجرت کے بعد قائم ہوتا ہے اس لئے اس آیت میں حکم دیا گیا کہ اگر کچھ مسلمان ہجرت نہیں کرتے اور دارالکفر میں رہنا ان کے لئے گوارا ہے تو مسلمانوں سے ان کا کوئی رشتۂ ولایت نہیں جس کی وجہ سے مسلمان ان کے حقوق اور مفادات کی نگرانی کی ذمہ داری محسوس کریں کیونکہ ولایت کا لفظ عربی زبان میں ﴿حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات﴾ کیلئے بولا جاتا ہے اور اس آیت کے سیاق و سباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست اپنے شہریوں سے اور شہریوں کا اپنی ریاست سے اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے۔ پس یہ آیت دستوری اور سیاسی ولایت کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت اور حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔﴾

Marfat.com

معاہدے کا احترام ضروری ہے:

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اور اگر وہ مسلمان جنہوں نے ہجرت نہیں کی تم سے مدد طلب کریں تو پھر تم پر مدد کرنا لازم ہے۔ یعنی وہ اس طرح کی شکایت کریں کہ جس شہر یا جس ملک میں وہ رہ رہے ہیں وہ اس لئے ان پر ظلم کر رہے ہیں کہ وہ مسلمان کیوں ہیں۔ اس طرح انہیں مسلمان ہونے کی سزا دی جا رہی ہے تو مسلمانوں کیلئے لازم ہے کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے۔ غیر مسلموں کے مظالم کو رکوائیں ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ کافر انہیں دوبارہ کفر میں لے جائیں گے۔ ان کے ایمان کی حفاظت کیلئے ان کی مدد ضرور کی جائے لیکن اگر مدد ایسی قوم کے خلاف مانگی جا رہی ہے جن کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاہدہ ہے۔ تو پھر معاہدے کی پابندی پہلے ضروری ہے کیونکہ مسلمان کسی حال میں بھی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جو معاہدے کی رُوح کے خلاف ہو البتہ! مسلمانوں کو بالکل بے سہارا بھی نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ انہوں نے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کر کے خود اپنے آپ کو غیر محفوظ کر لیا ہے اس لئے مسلمان ایک خاص حد سے آگے ان کی مدد کرنے کے مکلف نہیں ہیں۔ البتہ! سفارتی ذرائع سے اخلاقی اور سیاسی دباؤ استعمال کر کے مسلمانوں کی کسی نہ کسی حد تک مدد ضرور ہونی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیبیہ میں نبی کریم ﷺ قریش کے نمائندے کی طرف سے معاہدے کی یہ دفعہ جب قبول کر چکے کہ ''اگر کوئی شخص مکہ معظمہ سے مسلمان ہو کر مدینہ منورہ جائے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے'' تو اسی دوران ابوجندل ؓ جو قریش کے نمائندہ کے بیٹے اور قریش کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اس حال میں مسلمانوں کے سامنے پہنچے کہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ وہ نہ جانے کس طرح بیڑیاں کھینچتے ہوئے حدیبیہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا اور جسم پر تشدد کے آثار تھے۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو اپنے زخم دکھاتے ہوئے درخواست کی کہ مجھے اس ظلم سے نجات دلائیں اور اپنے ساتھ مدینہ لے چلیں۔ قریش کے نمائندہ نے فوراً کہا کہ ہم یہ شق قبول کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ آپ اگر معاہدے کے پابند ہیں تو آپ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ آنحضرت ﷺ نے ہر چند اصرار کیا کہ ابھی معاہدہ مکمل نہیں ہوا لیکن قریش کا نمائندہ کسی طرح ماننے پر آمادہ نہ ہوا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں ذاتی طور پر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم میری خاطر لڑکے کو میرے حوالے کر دو لیکن اس نے صاف کہا کہ اگر آپ اسے لے جانے پر اصرار کریں گے تو میں معاہدہ توڑ دوں گا۔ چنانچہ آپ نے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے ابوجندل ؓ کو واپس جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا۔ اسی طرح ابوبصیر ؓ مکہ سے بھاگ کر مدینہ پہنچ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے قریش کے دو قاصد انہیں لینے کے لئے پہنچے آنحضرت ﷺ نے انہیں ان کے حوالے کیا اور ساتھ جانے کا حکم دے دیا۔ انہوں نے راستے میں موقع پا کر ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ گیا اور پھر مدینے چلے آئے۔ دو میں سے جو شخص جان بچا کر بھاگا تھا، وہ بھی پیچھے پیچھے مدینہ جا پہنچا اور جا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سارا واقعہ سنایا آپ نے ابوبصیر کو بلایا تو انہوں نے عرض کیا کہ حضور آپ معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے مجھے ان کے حوالے کر چکے ہیں اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا یہ شخص جنگ کی آگ بھڑکانے والا ہے۔ ابوبصیر ؓ سمجھ گئے کہ حضور دوبارہ مجھے اس شخص کے ساتھ جانے کا حکم دیں گے۔ چنانچہ وہ مدینہ سے نکلے اور ساحلِ سمندر پر جا بیٹھے اور وہیں انہوں نے اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمان جو دارالکفر میں رہتے ہوں اور ہجرت نہ کر سکے ہوں ان سے اس حد تک ہمدردی ہو سکتی ہے جس میں کسی معاہدے کی شکست کا خطرہ نہ ہو یا جنگ کی آگ بھڑکنے کا اندیشہ نہ ہو۔ لیکن بالکلیہ انہیں کافروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

آخر میں فرمایا تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں کہ تم مسلمانوں کی جتنی مدد کر سکتے تھے وہ بھی نہیں کر رہے اور یا تم حدود سے بڑھ کر اس طرح مدد کر رہے ہو کہ تمہیں معاہدے کی پابندی کا احساس نہیں رہا۔ یعنی دونوں پہلوؤں پر اللہ کی نگاہ ہے نہ معاہدے کو نقصان پہنچے اور نہ مسلمان نظر انداز ہوں۔

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ؕO ﴿الانفال : ۷۳﴾

(اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد مچے گا۔)

مسلمانوں کی مندرجہ بالا بنیادوں پر تشکیل کیوں ضروری ہے؟

سابقہ آیتِ کریمہ میں امتِ مسلمہ کی اجتماعی زندگی کی ان اساسات کو بیان کیا گیا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کا سبب اور حکمت بیان کی گئی ہے کہ اگر مسلمان ایمان، ہجرت، نصرت اور جہاد کو اپنی اجتماعی زندگی کی بنیاد نہیں بناتے اور اس طرح سے وہ ایک مضبوط سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی صورت اختیار نہیں کرتے اور تفریق اور امتیاز کے تمام اسباب کو ختم کر کے صرف انہیں بنیادوں پر اپنی شیرازہ بندی نہیں کرتے تو پھر انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ دنیائے کفر انہیں دنیا میں زندہ رہنے کا حق دینے کیلئے کبھی تیار نہ ہوگی۔ کافر مسلمانوں کا بطور مسلمان زندہ رہنے کو کبھی گوارا نہیں کرتے۔ جیسے میں عرض کر چکا ہوں دنیا میں ان کے لئے ہر طرح کی مخلوق گوارا ہے بلکہ وہ درندوں تک سے پیار کرتے ہیں، حیوانات کی بقا کیلئے وہ نہ صرف اسباب فراہم کرتے ہیں بلکہ قانون بھی بناتے ہیں، ان کی نمود و پرداخت کیلئے چڑیا گھر بنائے جاتے ہیں تا کہ لوگوں میں ان کی ضرورت و دلچسپی کا شعور پیدا کر کے ان کے لئے مراعات کو یقینی بنائیں۔ انسدادِ بے رحمی حیوانات مستقل محکمہ ہے جو ہر جگہ کام کرتا ہے۔ جس جانور کی نسل کم ہونے لگتی ہے اس کے شکار کو ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگر کبھی سمندر کے کنارے پر وہیل مچھلیاں ریت میں پھنس جائیں تو ان کو نکالنے کیلئے مملکت کے پورے وسائل حرکت میں آ جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی بدنصیب گروہ کیلئے ان کے دلوں میں جگہ ہے نہ ان کی آبادیوں میں تو وہ صرف امتِ مسلمہ کے افراد ہیں۔ ان سے بطور مزدور کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ ان کے اپنے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ لیکن انہیں عزت و احترام نہیں دیا جا سکتا ان کی عزتِ نفس کی پاسداری نہیں کی جا سکتی، ان کی کتابِ مقدس اور رسولِ مقدس کی حرمت کا کوئی انتظام نہیں کیا جا سکتا، ان کے ملکوں پر چڑھ دوڑنا ان کے وسائل پر قبضہ کر لینا، ان کے غداروں کو استعمال کر کے ملکی معیشت کو تباہ کرنا، اور ان کی تہذیب و تمدن کو برباد کرنا وہ ان باتوں کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے کسی ملک میں کسی کی مداخلت کو کبھی برداشت نہیں کرتے لیکن مسلمان ملکوں میں ان کی مداخلت ایک معمول بن کر رہ گئی ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان دشمنی میں ان میں کوئی اختلاف نہیں حالانکہ ان میں ایسے ایسے اختلافات موجود ہیں جنہیں کبھی کوئی قوم گوارا نہیں کرتی۔ لیکن وہ تمام اختلافات بھلا کر مسلمان دشمنی میں اکٹھے ہیں۔ یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ کیا جس طرح سے ان کی والدہ پر بدچلنی کا الزام لگایا اور عیسیٰ علیہ السلام کو ناجائز اولاد قرار دیا اور پھر انہیں بقول ان کے سولی پر چڑھایا اور اس طرح سے انہیں لعنت کی موت مرنے پر مجبور کیا۔ لیکن عیسائی دنیا ان کی ان تمام باتوں کو جاننے کے باوجود اور ان تمام الزامات کو سننے کے باوجود محض مسلمان دشمنی میں نہ صرف انہیں گوارا کرتی ہے بلکہ لے پالک بچے کی طرح انہیں پالتی بھی ہے اور قلبِ عرب میں ایک ناسور بنا کر اس لئے گاڑ دیتی ہے تا کہ مسلمان ہمیشہ اس اذیت کا شکار رہیں اور مسلسل انہیں ہر طرح کی مدد باہم پہنچا کر عربوں کیلئے ناقابلِ تسخیر بنا دیتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کیونکہ اس آیت کے مطابق وہ ایک دوسرے کے ولی، ہمدرد غمگسار اور کارساز ہیں۔ اسی طرح دنیا میں پھیلے ہوئے اور کافر بھی اسلام دشمنی میں ان کے ساتھ ہیں۔ ہندو، نہ عیسائی کو برداشت کرتا ہے نہ یہودی کو لیکن مسلمان دشمنی اور اسلام کی عداوت میں وہ ان دونوں سے کندھا سے کندھا ملا کر چلتا ہے۔ ان کے اس متحدہ محاذ اور متحدہ قوت کا مقابلہ کرنے کی ایک ہی صورت ممکن ہے کہ مسلمان بھی اپنے تمام اختلافات اور امتیازات اور ملکوں کے تفرقات اور مسالک کے تفردات کو مٹا کر ایک حبل اللہ المتین کو تھام لیں اور وہ یہ عہد کر لیں کہ جس طرح دنیائے کفر ایک ہے اس طرح دنیائے اسلام بھی ایک ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو دنیا میں ایک فتنہ اٹھے گا اور بہت فساد مچے گا۔ تاریخ بار بار اس بات کی سچائی کو ثابت کر چکی ہے۔ مسلمان جب اندلس میں داخل ہوئے تو صرف مسلمان تھے ان میں عربی، عجمی اور کالے، گورے کی کوئی تمیز نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قلتِ تعداد کے باوجود چند دنوں میں پورے اندلس کے حاکم ہو گئے۔ پھر جب تک اسلام ہی ان کی اصل قوت رہا اسی کی راہنمائی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی گزرتی رہی تو عیسائی اپنی ساری کوششوں کے باوجود اندلس کے مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ لیکن جب مسلمانوں میں عربی اور اندلسی کا سوال پیدا ہوا، بربر اور غیر بربر کے امتیاز نے سر اٹھایا۔ اسلام کی بجائے دوسرے امتیازات مرغوب ہوتے گئے، حبِ دنیا دین کی محبت پر غالب آ گئی، نتیجہ معلوم ہے کہ آٹھ سو سال تک اندلس پر حکمرانی کرنے والی قوم اس طرح وہاں سے نکالی گئی

Marfat.com

کہ ایک فرد بھی مسلمان نام کا وہاں باقی نہ رہا۔ مسلمان بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے گئے ان کی یونیورسٹیاں اور ان کی دانش گاہیں جو کبھی پورے یورپ کیلئے علم و دانش کا سرچشمہ تھیں انہیں آگ لگا دی گئی۔ مسلمانوں کے علمی مراکز جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ جو ترکی یا مراکش کی طرف ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے وہ زندہ رہے اور جو نکل نہ سکے یا جن کو بہلاوے دے کر روک لیا گیا انہیں قتل کر دیا گیا یا عیسائی بنا لیا گیا۔ آج بھی پوری دنیا میں جگہ جگہ اس حقیقت کو دہرایا جا رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ اسلام دشمنی کا مرکز بن چکی ہے ایک فتنے کی آگ ہے کہ پوری دنیائے اسلام اس کی لپیٹ میں ہے۔ لاکھوں مسلمان موت کی نیند سلائے جا چکے ہیں۔ کتنی مسلمان ریاستیں ہیں جو اپنے حقوق کی بازیافت کیلئے ہر طرح کی اذیتوں کا شکار ہیں۔ جگہ جگہ فساد کی آگ بھڑک رہی ہے اور اس کا ایندھن صرف مسلمان ہیں۔ ہندوستان جہاں صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی وہاں مسلمان کا خون پانی سے ارزاں ہو گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر فتنہ سامانی اور کیا ہو گی کہ خود مسلمان ملکوں میں اسلامی زندگی گزارنا ایک الزام بن گیا ہے۔ مختلف الزامات کے تحت احتسابی ادارے جس کو پکڑ لیتے ہیں اس کی کوئی داد ہے نہ فریاد۔ یوں تو تاریخ کے ہر دور میں یہ آیت مسلمانوں کو پکارتی رہی ہے لیکن آج تو مسلمانوں کا نوشتۂ تقدیر معلوم ہوتی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے مسلمان کب اس پر کان دھریں گے اور اس حقیقت کو سمجھ کر از سرِ نو اپنی عظمتِ رفتہ کیلئے کوشش کرنے کا عہد کریں گے۔ اپنی ناکامیوں کے اصل اسباب کو سمجھیں گے اور اس حقیقت کا پوری طرح ادراک کریں گے کہ امتِ مسلمہ کی کسی ایک نسل یا کسی ایک جغرافیے میں سمٹ کر رہنے والی امت کا نام نہیں۔ اس میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بیسیوں نسلوں کے لوگ ہیں جن کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہر براعظم میں ان کا وجود پایا جاتا ہے۔ کوئی محدود جغرافیہ انہیں اپنے اندر سمیٹ نہیں سکتا۔ اس طرح تفرقات اور امتیازات میں بٹی ہوئی امت اگر کسی بنیاد پر اکٹھی ہو سکتی ہے اور ان کا شیرازہ کسی ایک رسی سے باندھا جا سکتا ہے اور ان کے جہاز کسی ایک لنگر سے باندھے جا سکتے ہیں اور ان کے اجزائے ہستی کو کسی ایک سریش سے جوڑا جا سکتا ہے تو وہ صرف ''اسلام'' ہے۔ صرف وہ نسخۂ شفا ہے جسے نبی کریم ﷺ لے کر آئے تھے۔ وہ کل بھی ہماری قوت تھا آج بھی ہماری قوت ہے۔ یہی وہ تاریخی حقیقت ہے جو اس آیتِ کریمہ سے نمایاں ہو رہی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اولیاء کے لفظ پر غور کرتے ہوئے ذہن ایک اور بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ایمان کی بنیاد پر مسلمانوں میں اخوت کا رشتہ قائم ہوتا ہے اور یہی اخوت ہے جسے اسلامی اخوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کی اسلام میں بہت قدر و منزلت ہے۔ لیکن دوسرا وہ رشتہ ہے جو ہجرت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اس رشتہ کو سابقہ آیتِ کریمہ میں ولایت کا نام دیا گیا ہے۔ ولایت کا رشتہ اخوت کے رشتے سے بڑھ کر ہے۔ جب مسلمان ہجرت کر جاتے ہیں تو اخوت اور ولایت کے دونوں رشتے جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو شخص ہجرت نہیں کرتا وہ اخوت کا رشتہ رکھتے ہوئے بھی اخوت کے بعض مظاہر سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ ہجرت نہ کرنے کی صورت میں ایک تو اس چیز کا فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کر رہا ہے کیا وہ اپنے دعوے میں مخلص بھی ہے یا نہیں کیونکہ اخلاص کا ثبوت ہجرت ہی سے ملتا ہے اور دوسری یہ بات کہ ہجرت ہی وہ ذریعہ ہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں سے جوڑتا اور ایک متحدہ طاقت کا حصہ بناتا ہے اور یہی طاقت وقت آنے پر جہاد کی قوت ثابت ہوتی ہے۔ جو شخص ہجرت نہیں کرتا وہ دریا سے نکلی ہوئی ایک لہر ہے جس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں اور جس کے وجود سے دریا کی قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا وجود ہے جو بے اصل بھی ہے اور بے ثمر بھی۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمانو! تم ایک دوسرے کے ولی ہو اس لئے ولی ہونے کی حیثیت سے تمہارے آپس میں رشتے دہرے ہیں۔ تم باہمی بھائی بھائی بھی ہو اور ایک دوسرے کے ولی بھی۔ جس طرح تمہارا آپس کا ایک رشتہ ہے اسی طرح تمہارا رشتہ ریاست کے ساتھ بھی ہے۔ تم سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ہمدرد ہو۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعیت کے ایک ایک فرد کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ ان میں ایسے ادارے قائم کرے جو ان میں عدل و انصاف کو بروئے کار لائیں۔ ان کے گرے پڑے طبقے بے بسی کا شکار ہونے کی بجائے ریاست کی طاقت اور افرادِ امت کی طاقت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکیں۔ ریاست جس حد تک افراد کے حقوق کی نگہداشت کرے گی اور افراد جس حد تک ریاست کے ساتھ اخلاص کا ثبوت دیں گے اسی حد تک امتِ اسلامیہ اپنی قوت و عظمت میں پختہ تر ہوتی چلی جائے گی اور اگر دونوں نے اپنی اپنی سطح پر اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو زمین میں فتنہ پھیلنے اور فساد کو بھڑکنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

Marfat.com

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○ ﴿الانفال : ۷۴﴾

اور جولوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ پکے مومن ہیں۔ ان کیلئے مغفرت اور باعزت روزی ہے ○

مندرجہ بالا صفات کے حامل ہی اسلام کی اصل قوت ہیں:

اس آیتِ کریمہ میں بار دگر اس حقیقت کا اظہار کیا جارہا ہے کہ امتِ مسلمہ کی اصل قوت مسلمان ہیں چونکہ یہ ایک نظریاتی گروہ ہے اس لئے کوئی دوسرا گروہ اولاً تو اس میں شامل نہیں ہوسکتا اور اگر ریاست کا شہری بن کر شامل ہو بھی جائے تو اصل قوت کا سبب نہیں بن سکتا کیونکہ نظریاتی تفاوت کبھی بھی اخلاص پیدا ہونے نہیں دیتا۔لیکن یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ مومن اور مسلمان کوئی ایسا گروہ نہیں جن کیلئے صرف نام اختیار کر لینا کافی ہو۔مومن اور مسلم دراصل چند صفات کے حامل کو کہتے ہیں اگر امت کے افراد اپنے آپ کو مومن تو کہتے ہوں لیکن ان میں مومنانہ صفات نہ پائی جاتی ہوں تو ان کی تعداد چاہے ریت کے ذروں کی طرح کیوں نہ ہوں وہ امتِ اسلامیہ کی قوت میں اضافہ تو کیا کریں گے اسے باقی بھی نہیں رکھ سکتے ۔اس لئے اس آیتِ کریمہ میں زور دے کر فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سچے اور پکے مومن وہ ہیں جن کے اندر ایمان ہو، جنہوں نے ایمان کی خاطر ہجرت کی ہو، اپنا سب کچھ اللہ کی رضا اور دین کی خاطر قربان کر چکے ہوں اور انہوں نے ہجرت کر کے آنے والوں کو پناہ دی ہو اور نصرت کی ہو اور پھر دونوں کا اصل جوہر یہ کہ انہوں نے کفر کی طاقتوں سے پنجہ آزمائی کرنے کا حوصلہ بھی کیا ہو۔وہ تعداد اور اسلحۂ جنگ سے بے نیاز ہو کر محض اللہ کی رضا کیلئے خلعتِ شہادت سے بہرہ ور ہونے کیلئے جنگ کی آگ میں کود چکے ہوں۔وہ نفع وضرر سے بے نیاز اور سود وزیاں کے پیمانوں سے لاتعلق ہو کر صرف اسلام کو اپنا مستقبل قرار دے چکے ہوں۔یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے یہاں حقیقی مومن ہیں کیونکہ عرصۂ حیات اور کارزارِ حیات میں جو قوتیں کام آتی ہیں وہ محض نام کی قوتیں نہیں ہوتیں بلکہ صفات کی قوتیں ہوتی ہیں۔زندگی کا بوجھ زندگی کا جوہر اٹھاتا ہے۔اس شخص سے زندگی پناہ مانگتی ہے جسے خود زندگی گزارتی ہے۔جو شخص ایمان کا نام لیتا ہو لیکن اصولِ اسلام پر یقین نہ رکھتا ہو، جو اللہ کے راستے میں کوئی قربانی دینے کیلئے تیار نہ ہو اور اگر کفر سے تصادم کا خطرہ پیدا ہو جائے تو مصلحت کا جال بننے لگے اور کوئی ایسا راستہ نکالنے کی تدبیر کرے جس میں کفر کے ساتھ سازگاری ہو سکے۔ایسا شخص نام کا تو مومن ہوسکتا ہے لیکن اسے سچا اور پکا مومن نہیں کہا جاسکتا اور اسلام اپنے ترکش کا اسے تیر تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔اس کا وجود امتِ مسلمہ کیلئے ایک ایسے خطرے کی علامت ہے جس کے باقی رہنے سے کفر سرافراز ہوتا اور اسلام سرنگوں ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس اگر امتِ مسلمہ کے افراد واقعی آیت میں بیان کردہ صفات کا حقیقی مرقع بن جاتے ہیں اور ان کا ایک ایک فرد ان کی چلتی پھرتی تصویر بن جاتا ہے۔تو ایسی امت جب اللہ کے پاس جائے گی تو مغفرت اور بخشش اس کے انتظار میں ہوگی اور جب تک وہ دنیا میں رہے گی عزت کی روزی اس کا مقدر ہوگی۔روزی تو ہر جاندار کو ملتی ہے لیکن کرگس کی روزی اور شاہین کی روزی میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔عزت وافتخار سے صرف وہی قوم جیتی ہے جو ان صفات کی حامل بن کر غیرت سے زندگی گزارنا جانتی ہے کیونکہ یہی وہ وصف ہے جس کی موجودگی چھوٹوں کو بڑا کر دیتی ہے اور جس سے محرومی بڑوں بڑوں کی گردنیں جھکا دیتی ہے۔اقبال نے ٹھیک کہا:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ ودو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

Marfat.com

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ مِنْكُمْؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۠ ﴿الانفال : ۷۵﴾

(اور جو ایمان لائیں اس کے بعد اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ جہاد میں شریک ہوں تو وہ بھی تم ہی میں سے ہیں اور رحمی رشتے والے اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔)

دارالکفر کے مسلمانوں کو ترغیب اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تنبیہہ:

ایک نوزائیدہ امت جو امتِ مسلمہ کے نام سے وجود میں آئی ہے اور جس کی تعمیر ایسی بنیادوں پر اور شیرازہ بندی ایسے وسائط سے کی جارہی ہے جس کی مثال اُس وقت کی موجودہ دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ اس لیے پیشِ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ یہ ایک نیا تجربہ ہے اس لئے اس کے اندر کوئی سقم کوئی خرابی اور کوئی کمزوری نہیں ہونی چاہئے۔ مکہ معظمہ میں چونکہ دعوت صرف ایمان کی دی جارہی تھی تو جو لوگ ایمان لائے وہ یقیناً ایمان ہی کو اسلامی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔ لیکن جب ایمان ہی کی طرح ہجرت کو بھی فرض قرار دے دیا گیا تو اگرچہ مسلمانوں کی فیصلہ کن اکثریت نے اس کو سمجھا اور اس پر عمل کیا لیکن پھر بھی کچھ لوگ پیچھے رہ گئے۔ ہجرت کی اہمیت کے پیشِ نظر انہیں دوسرے درجے کے مسلمان قرار دیا گیا۔ یہ تو تسلیم کیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایمانی اخوت میں شریک ہیں لیکن وہ ولایتِ اسلامی سے محروم کر دیئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ وہ دوسرے مسلمانوں کے وارث ہوں گے اور نہ مسلمان ان کے وارث ہوں گے اور نہ مہاجرین کے ساتھ ان کے نکاح کا رشتہ قائم ہو سکے گا اور نہ اسلامی ریاست ان کے اجتماعی حقوق کی محافظ رہے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اگر اپنے دل میں ایمان رکھتے ہیں تو امید کی جاسکتی ہے کہ وہ کسی وقت بھی ہجرت کرنے کی کوشش کریں۔ اس لئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں انہیں ایک طرح سے شوق دلایا جارہا اور ترغیب دی جارہی ہے کہ تم اگر واقعی امتِ مسلمہ کا حصہ بن کر زندگی گزارنا چاہتے ہو تو وہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ تمہیں ہجرت کر کے مرکزِ اسلام میں امتِ مسلمہ کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہئے اور ساتھ ایک اور بات بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ آچکے ہیں وہ مسلسل مصائب کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ہر آنے والا دن ان کے لئے نئی آزمائشیں لے کر آتا ہے۔ عرب کا کفر اور اہلِ کتاب کا حسد ان کے لئے بہت بڑا خطرہ بنتا جارہا ہے۔ لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود مسلمانوں کا یہ مختصر سا گروہ پوری توانائی جاں فروشی اور اعتماد علی اللہ کے ساتھ ان مشکلات کا سامنا کر رہا ہے۔ اب اگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نئے لوگ ہجرت کر کے ان کے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے دل و دماغ انہیں قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوں اور اس طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہو جائیں کہ اب جبکہ آہستہ آہستہ مسلمانوں کی سرفروشیوں اور اللہ کی تائید و نصرت کے ساتھ حالات بدلنے لگے ہیں کافر طاقتیں اپنے زخم چاٹنے لگی ہیں اور مسلمانوں کو روز بروز قوت ملتی جارہی ہے تو ہجرت کرنے والے لوگ یہ سمجھ کر شاید آرہے ہیں کہ اب آسانیوں کا زمانہ شروع ہونے والا ہے ہمیں جا کر اس میں حصہ بٹانا چاہئے۔ چنانچہ ایسے ہی اندیشہ ہائے دور دراز کو سامنے رکھتے ہوئے پروردگار نے حکم دیا کہ جس وقت بھی کوئی شخص ہجرت کر کے تمہارے ساتھ شامل ہو جاتا ہے اور نہایت اخلاص کے ساتھ جہاد میں تمہارا دست و بازو بنتا ہے تو تمہیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ تمہارا ایسا ساتھی ہے جو ہمیشہ ہی تمہارے ساتھ تھا۔ اسے فیصلہ کرنے میں دیر ضرور لگی لیکن تمہیں انہیں قبول کرنے میں دیر نہیں لگنی چاہئے۔ اپنے دلوں کے دروازے ان کے لئے کھلے رکھو وہ تمہارے ہی وجود کے اجزاء ہیں۔ تمہارے اندر ان کے بارے میں کوئی احساسِ برتری پیدا ہونا نہیں چاہئے اور نہ انہیں قبول کرنے میں دلوں میں کوئی تنگی ہونی چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ جن لوگوں نے حدیبیہ سے پہلے ہجرت کی وہ ان لوگوں سے مرتبہ و مقام میں یقیناً بلند ہیں جنہوں نے حدیبیہ کے بعد ہجرت کی لیکن مقامات کی بلندی اللہ کی طرف سے انہیں عطا ہوتی ہے جو کبھی احساسِ برتری کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ تمام مراتب کے باوجود ہمیشہ تواضع کا پیکر بنے رہتے ہیں۔ ان کیلئے امتِ مسلمہ کا ایک ایک فرد جسم کے اعضاء کی طرح ہے۔ جن کی افادیت اور ضرورت اپنی جگہ مسلم ہے اور جن میں بعض کو بعض پر یقیناً ترجیح بھی حاصل ہے۔

Marfat.com

اُولُوا الْاَرْحَامِ کے حقوق مقدم ہیں:

والوالارحام بعضهم اولیٰ ببعض فی کتب الله من المومنین والمهاجرین الا ان تفعلوا الی اولیاء کم معروفاً ط کان ذلک فی الکتب مسطوراO ﴿الاحزاب : ﴾

(اور مومنین اور مہاجرین میں رحمی رشتے والے ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں اللہ کے قانون میں مگر یہ کہ تم اپنے اولیا کے ساتھ کوئی حسنِ سلوک کرو یہ چیز کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔)

اُولُوا الْاَرْحَامِ کی وضاحت:

اُولُوا الْاَرْحَام کی کچھ تفصیل ہم معارف القرآن سے نقل کرتے ہیں۔

﴿ لفظ اولو عربی زبان میں صاحب کے معنی میں آتا ہے۔ جس کا ترجمہ اردو میں "والے" سے کیا جاتا ہے جیسے اُولُوالعقل عقل والے، اولوالامر امر والے، اس لئے اولوالارحام کے معنی ہوئے ارحام والے۔ ارحام، رَحِم کی جمع ہے۔ جو اصل میں اس عضو کا نام ہے جس کے اندر بچہ کی تخلیق عمل میں آتی ہے اور چونکہ رشتہ داری کا تعلق رَحم کی شرکت سے قائم ہوتا ہے اس لئے اُولُوا الْاَرْحَام رشتہ داروں کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

معنی آیت کے یہ ہیں کہ اگرچہ ایک ولایت عامہ سب مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حاصل ہے جس کے سبب بوقتِ ضرورت ایک دوسرے کی امداد واعانت بھی واجب ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے ہیں لیکن جو مسلمان آپس میں قرابت اور رشتہ کا تعلق رکھتے ہوں وہ دوسرے مسلمانوں سے مقدم ہیں۔ فِیْ کِتٰبِ اللّٰہِ کے معنی اس جگہ فِیْ حُکْمِ اللّٰہِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے حکمِ خاص سے یہ قانون بنا دیا ہے۔

اس آیت نے یہ ضابطہ بتا دیا کہ تقسیم وراثت رشتہ داری کے معیار پر ہونا چاہئے اور لفظ اُولُو الْاَرْحَام مطلقاً اقرباء اور رشتہ داروں کے لئے بولا جاتا ہے۔ ان میں سے خاص خاص رشتہ داروں کے حصے تو خود قرآن کریم نے سورۂ نساء میں متعین فرما دیئے جن کو علمِ میراث کی اصطلاح میں اہلِ فرائض یا ذوی الفروض کہا جاتا ہے ان کو دینے کے بعد جو مال بچے وہ اس آیت کی رو سے دوسرے رشتہ داروں میں تقسیم ہونا چاہئے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سب رشتہ داروں میں کسی مال کا تقسیم کرنا کسی کی قدرت میں نہیں کیونکہ دور کی رشتہ داری تو ساری دنیا کے انسانوں کے درمیان بلاشبہ موجود ہے کہ سب کے سب ایک ہی باپ اور ماں آدم وحواء علیہما السلام سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کی عملی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ قریبی رشتہ داروں کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔ جس کا تفصیلی بیان احادیثِ رسول کریم ﷺ میں اس طرح موجود ہے کہ ذوی الفروض کے حصے دینے کے باوجود جو کچھ بچے وہ میت کے عصبات یعنی جدی رشتہ داروں کو درجہ بدرجہ دیا جائے یعنی عصبہ قریب کو بعید پر مقدم رکھ کر قریب کے سامنے بعید کو محروم کیا جائے۔

اور اگر عصبات میں سے کوئی بھی زندہ موجود نہیں تو پھر باقی رشتہ داروں میں تقسیم کی جائے۔

عصبات کے علاوہ جو دوسرے رشتہ دار ہوتے ہیں علمِ میراث وفرائض کی خاص اصطلاح میں لفظ ذوی الارحام انہیں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ لیکن یہ اصطلاح بعد میں مقرر کی گئی ہے ہے قرآنِ کریم میں اولوالارحام کا لفظ لغوی معنی کے مطابق تمام رشتہ داروں پر حاوی ہے۔ جس میں ذوی الفروض اور عصبات اور ذوی الارحام سب اجمالی طور پر داخل ہیں۔

Marfat.com

پھراس کی کچھ تفصیل سورۂ نساء کی آیات میں آگئی ہے جن میں خاص خاص رشتہ داروں کے حصے حق تعالیٰ نے خود مقرر فرمادیئے ہیں جن کو اصطلاحِ میراث میں ذوی الفروض کہتے ہیں اور باقی کے متعلق رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الحقوا الفرائض باھلھا فما بقی فھولأ ولی رجل ذکر۔(بخاری)

یعنی جن کے حصے قرآن نے مقرر کردیئے ہیں وہ پورے ان کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ ان لوگوں کو دیئے جائیں جو میت سے قریب تر مرد ہوں۔

ان کو اصطلاح میراث یں عصبات کہا جاتا ہے۔اگر کسی میت کے عصبات میں کوئی موجود نہ ہو تو رسول کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق پھر دوسرے رشتہ داروں کو دیا جاتا ہے جن کو اصطلاح میں ذوی الارحام کہتے ہیں جیسے ماموں، خالہ وغیرہ۔﴾

اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔﴾

امت کی تاسیس وتعمیر کیلئے کیسی بنیادیں ہونی چاہئیں، امتِ مسلمہ کے اہداف کیا ہونے چاہئیں، افرادِ امت کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہئے، دینی اخوت وولایت کا دائرہ کیا ہونا چاہئے اور رحمی قربت وقرابت کے کیا حقوق ہونے چاہئیں۔ان میں سے ایک ایک چیز اللہ نے اپنے بے پایاں علم کے ذریعے امت کو جو عطا فرمائی ہے، اس میں کسی طرح بھی غلطی، کوتاہی اور نارسائی کا شائبہ بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اللہ کی ذات اور اس کا علم ایسے ہر شائبہ سے پاک ہے۔وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر بات کے انجام سے باخبر ہے۔اسلئے امت کیلئے لازم ہے کہ اس نے جس مقام کیلئے جو احکام دیئے ہیں اور جس بات کیلئے جو ہدایت عطا فرمائی ہے وہ اسے زندگی کا دستور بنالے اسی میں اس کی دنیا اور اسی میں اس کی عقبیٰ ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوۡرَةُ التَّوۡبَه

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَۃُ التَّوْبَةِ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ سورۃ قرآنِ کریم کی نوویں سورۃ ہے۔اس میں سولہ 16 رکوع اور 129 آیات ہیں۔اس کے متعدد نام ہیں جن میں سے دو نام زیادہ معروف ہیں۔ا:۔البراءۃ ۲:۔التوبۃ

قرآنِ کریم کی بیشتر سورتوں کی طرح اس سورۃ کے نام اس کے عنوان نہیں بلکہ شناخت کیلئے صرف نام ہیں۔جن سے مقصود یہ ہے کہ جب یہ نام لیے جائیں تو ان سے یہ سورۃ ذہن میں آجائے۔

البراءۃ کا معنی ہوتا ہے''بیزاری، بری ہونا، ذمہ داریوں اور معاہدات سے دستبردار ہو جانا، تعلق توڑ لینا'' چونکہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے اظہار بیزاری فرمایا ہے، تمام معاہدات کے ختم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے، ان کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کی ذمہ داری سے دستبرداری کا اعلان کر دیا ہے، اس لئے اسے ''سورۃ البراءۃ'' کہا گیا ہے۔

التوبۃ کا نام شاید اس لئے دیا گیا ہے کہ ان میں چند مخلص مسلمانوں کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے جنہوں نے محض تساہل کی وجہ سے جنگِ تبوک میں شرکت نہیں کی تھی اور پھر اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کر دیا تھا۔پچاس دن کے بعد ان کی توبہ کی قبولیت قرآنِ کریم کی آیات کی شکل میں اتری اور تاقیامت ان کے لئے اعزاز بن گئی چونکہ ان باتوں کا تذکرہ اس سورۃ میں ہوا ہے، اس لئے اسے ''سورۃ التوبۃ'' کہا گیا۔

بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ:

اس سورۃ میں عجیب بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے عام معمول سے ہٹ کر اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی حالانکہ قرآنِ کریم کی اس سورۃ کے علاوہ ہر سورہ سے پہلے بسم اللہ درج ہے اور بسم اللہ کا لکھا جانا علامت ہے۔اس بات کی کہ یہاں سے نئی سورۃ شروع ہو رہی ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ بسم اللہ کیوں نہیں لکھی گئی؟ اس کے جواب میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن سب سے بہتر بات وہی ہے جو امام رازی اور بعض دوسرے مفسرین نے لکھی ہے۔وہ بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب کسی رکوع یا آیت کا نزول ہوتا تو آپ کاتبِ وحی کو بلا کر حکم دیتے کہ اسے فلاں سورۃ اور فلاں جگہ لکھا جائے اور جہاں نئی سورۃ نازل ہوتی اس سے پہلے اللہ کی جانب سے بسم اللہ بھی نازل ہوتی تو آنحضرت ﷺ نئی سورۃ سے پہلے بسم اللہ بھی لکھواتے۔یہ اس بات کا اعلان ہوتا کہ پہلی سورۃ ختم ہوگئی، اب یہ نئی سورۃ شروع ہو رہی ہے۔لیکن سورۃ توبہ کے نزول کے وقت آنحضرت ﷺ نے بسم اللہ نہیں لکھوائی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بسم اللہ نازل ہی نہیں ہوئی۔آپ نے کاتبِ وحی کو بلا کر بغیر بسم اللہ کے سورۃ توبہ کا آغاز فرمایا۔قرآنِ کریم چونکہ نہایت احتیاط سے منضبط ہوا ہے۔اس لئے یہ اسی طرح پڑھا گیا جس طرح آنحضرت ﷺ کے سامنے حضرت جبرئیل نے پڑھا اور پھر یہ اسی طرح لکھا گیا جس طرح

Marfat.com

آنحضرت ﷺ نے اللہ کی ہدایت کے مطابق اسے لکھنے کا حکم دیا۔ اگر اس میں ذراسی بھی اپنی مرضی کرنے کی گنجائش ہوتی تو کاتبانِ وحی اس میں بسم اللہ کا اضافہ کر دیتے یا بعد میں مسلمانوں نے جب دورِ صدیق رضی اللہ عنہ اور دورِ عثمان رضی اللہ عنہ میں قرآنِ کریم مرتب کیا اس وقت بسم اللہ لکھوادی جاتی۔ لیکن وہ لوگ چونکہ ہر بات میں اللہ کے رسول کی ہدایت کے پابند تھے اور ان کا ہر کام اللہ کے رسول کے اتباع میں ہوتا تھا اس لئے انہوں نے بھی سورۂ توبہ کے شروع میں بسم اللہ کا اضافہ مناسب نہیں سمجھا اور قرآنِ کریم چونکہ آج تک اسی احتیاط کے ساتھ لکھا جارہا ہے اس لئے آج بھی آپ کسی مصحف میں سورۂ توبہ سے پہلے بسم اللہ لکھی ہوئی نہیں پائیں گے حالانکہ لکھنے کیلئے یہ دلیل کافی تھی کہ اگر یہ سورۃ الگ سورۃ ہے تو قرآنِ کریم کے اسلوب کے مطابق اس سے پہلے بسم اللہ ہونی چاہئے۔ لیکن انہوں نے اس معاملے میں بھی مکمل اتباعِ رسول کا ثبوت دیا۔ مصاحفِ عثمان جنہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سرکاری طور پر مرتب کیا گیا اور پھر ایک ایک نسخہ مملکتِ اسلامیہ کے ہر اقلیم میں بھیج دیا گیا۔ ان میں سے غالباً تین نسخے آج بھی مختلف جگہ موجود ہیں اور وہ نسخہ بھی ترکی میں محفوظ ہے جس پر تلاوت کرتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا۔ ان نسخوں میں بھی سورۂ توبہ سے پہلے بسم اللہ مکتوب نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کو کس احتیاط سے جمع کیا گیا اور اگلی نسلوں تک منتقل کیا گیا۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ذہن میں بھی اسی طرح کا لیکن ایک دوسری نوعیت کا سوال پیدا ہوا۔ انہوں نے براہِ راست حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے کیونکہ وہ جامع القرآن تھے اس بارے میں استفسار کیا۔ انہوں نے کہا کہ قرآنِ کریم کی سورتوں کی ایک ترتیب قائم کی گئی ہے کہ سب سے پہلے وہ بڑی بڑی سورتیں رکھی گئی ہیں جن میں آیات کی تعداد سو (١٠٠) یا اس سے زیادہ ہے۔ انہیں اصطلاح میں ''مئین'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بڑی سورتیں رکھی گئی ہیں جن میں آیات کی تعداد سو سے کم ہے۔ انہیں ''مثانی'' کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چھوٹی سورتیں رکھی گئی ہیں جن کو ''مفصلات'' کہا جاتا ہے۔ اس ترتیب کا تقاضا یہ ہے کہ سورۃ توبہ کو سورۃ انفال سے پہلے رکھا جائے کیونکہ سورۃ توبہ کی آیتیں سو (١٠٠) سے زائد اور انفال کی سو (١٠٠) سے کم ہیں۔ تو سورۃ انفال کو سورۂ توبہ سے پہلے لاکر آخر اس اصول کی مخالفت کیوں کی گئی ہے؟ حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے اس کا جو جواب دیا اس کا حاصل بھی یہی تھا کہ آنحضرت ﷺ نے سورۂ انفال کو پہلے رکھا اور سورۂ توبہ کو بعد میں اور درمیان میں بسم اللہ بھی نہیں لکھوائی اور ہم اسی کے پابند ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن کریم کی جمع وترتیب کی ایک ایک بات اللہ کے حکم اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق وجود میں آئی ہے اور اسی طرح بعد کی نسلوں کو قرآنِ کریم محفوظ صورت میں ملا ہے۔ البتہ! جب ہم ان دونوں سورتوں کے مضامین پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سورتوں میں عمود و مضمون کے لحاظ سے نہایت گہرا اتصال بھی ہے اور مقصد وغایت کے اعتبار سے فی الجملہ انفصال بھی۔ ایک کا رخ بالکلیہ مسلمانوں کی طرف ہے اور دوسری کا رخ اصلاً مشرکین، اہلِ کتاب اور منافقین کی طرف ہے۔ ایک کی نوعیت تیاری کی ہے اور دوسری کی اعلانِ جنگ کی۔ اشتراک و انفصال کے ان دونوں پہلوؤں کو ممیّز کرنے کیلئے حکمتِ الٰہی مقتضی ہوئی کہ یہ سورۃ سابق سورۃ سے بالکل الگ بھی نہ ہو لیکن فی الجملہ نمایاں اور ممتاز بھی رہے۔ بسم اللہ نہ لکھے جانے سے یہ دونوں پہلو بیک وقت نمایاں ہوگئے۔

حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سورۃ براءۃ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ﴿ بسم اللہ الرحمن الرحیم ﴾ ''امان'' ہے اور سورۃ براءۃ میں کفار کی امان اور عہد و پیمان کو ختم کیا گیا ہے۔ علمی نکتہ کے لحاظ سے اس بات کی ایک اہمیت ہے۔ لیکن حقیقی سبب بسم اللہ نہ لکھنے کا وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

سورۂ توبہ کے بنیادی مباحث:

سورۂ توبہ بھی قرآنِ کریم کی دوسری سورتوں کی طرح متنوع مضامین پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے عام مباحث تین باتوں سے متعلق ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب قریشِ مکہ نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تو آنحضرت ﷺ نے محسوس فرمایا کہ قریشِ مکہ اور عرب کے دوسرے قبائل کا نوجوان طبقہ کسی طرح بھی اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کو ہضم نہیں کر پا رہا وہ دیکھ رہا تھا کہ معاہدہ حدیبیہ سے پہلے مسلمان ایک محدود علاقے میں گھرے ہوئے تھے۔ مدینہ میں منافقین ان کے لئے مسائل پیدا کرتے رہتے تھے اور اطرافِ مدینہ میں اگرچہ آنحضرت ﷺ نے نہایت حکمت سے کام لیتے ہوئے بعض قبائل

Marfat.com

سے بقائے باہمی اور دوستی کے معاہدات کر لئے تھے لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ جب بھی انہیں موقعہ ملتا تھا وہ در پردہ قریشِ مکہ کی حمایت کرتے تھے اور ان کی بھی دلی آرزو تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے مسلمانوں کا استیصال کر دیا جائے۔ خیبر میں پڑے ہوئے یہودی مختلف طریقوں سے ان کی ہموائی کرتے رہتے تھے۔ ان حالات کے پیشِ نظر نبی کریم ﷺ نے قریشِ مکہ کو سنبھلنے کا موقعہ نہ دیا۔ ابوسفیان نے خود مدینہ پہنچ کر تجدیدِ معاہدہ کی کوشش کی لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور جنگ کی تیاریاں تیز کر دیں۔ چنانچہ رمضان آٹھ ہجری کو آپ نے مکہ معظمہ فتح کر لیا۔ مکہ معظمہ اللہ کے گھر کی وجہ سے عربوں کا نہ صرف مرکزِ عبادت اور مرکزِ عقیدت تھا بلکہ ان کی قبائلی عزت و وجاہت کا مظہر بھی تھا۔ مکہ کے سرنگوں ہونے سے اگرچہ ان کی اصل طاقت ٹوٹ گئی۔ بیشتر لوگ مسلمان ہو گئے اور باقی لوگوں نے ادھر ادھر پناہ لینے میں عافیت سمجھی۔ آنحضرت ﷺ نے بھی عفو و درگزر سے کام لیا اور کسی سے گزشتہ اعمال کا حساب نہ پوچھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے سرنگوں ہونے سے عرب طاقت بالکل مٹ گئی تھی۔ طائف میں ہوازن، ثقیف، نضر اور جشم ابھی تک بہت بڑی طاقت رکھتے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ مسلمان صبح نو بہار کی طرح آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں تو انہوں نے جاہلی نظام سے محبت کرنے والوں اور بت پرستی پر جان دینے والوں کو جمع کیا اور اسلام کے اصلاحی انقلاب کا راستہ روکنے کیلئے اپنی ساری طاقت میدان میں جھونک دی۔ ان کے پاس افرادی قوت کی بھی کمی نہ تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ پہاڑوں کی قدرتی پناہ گاہیں اور پرانے قلعے ان کے لئے چھاؤنیوں کا کام دے رہے تھے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے جلد ہی بعد طائف کی طرف کوچ فرمایا اور وہ عظیم جنگ برپا ہوئی جسے "جنگِ حنین" کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس جنگ میں بھی مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور کافر قوت کی کمر ٹوٹ گئی۔

آنحضرت ﷺ واپس مدینہ تشریف لے آئے لیکن آپ مسلسل دیکھ رہے تھے کہ اگرچہ عرب میں کفر و شرک کے مراکز توڑ دیئے گئے ہیں لیکن پھر بھی عرب کی کافر اور مشرک قوتیں بالکل تباہ نہیں ہوئیں اور مدینہ کے منافقین خاص طور پر قیصر سے مسلسل رابطے میں ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ جیسے ہی مسلمانوں میں کوئی نازک موقعہ پیدا ہو تو اندر سے کافر اور مشرک قوتیں اور مدینہ کے منافقین شورش برپا کریں اور باہر سے قیصر حملہ کر کے اس نوزائیدہ قوت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ آنحضرت ﷺ نے اس صورتحال کا تدارک کرنے کیلئے اندرونِ عرب عربوں سے عفو و درگزر کا معاملہ کیا اور تبلیغ و دعوت کے ذریعے انہیں اسلام کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی اور جن لوگوں کو تالیفِ قلب کے ذریعے مائل کیا جا سکتا تھا انہیں اس طرح بھی مائل کیا گیا اور شمال کی قوتوں کو خطرہ بننے سے پہلے آپ نے وہاں تبلیغی وفود بھیجے جو کہ عرب سے شمال کی طرف سرحدِ شام سے متصل جو قبائل آباد تھے اگرچہ یہ عیسائی تھے لیکن ان میں سے بعض قبائل کا نسبی تعلق عربوں سے تھا۔ لیکن رومی سلطنت کے زیرِ اثر رہنے کی وجہ سے یہ عربوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ان کی طرف پندرہ آدمیوں کا وفد بھیجا۔ لیکن ان لوگوں نے "ذات الطلح" کے مقام پر اس وفد کے تمام ارکان کو قتل کر دیا اور صرف رئیسِ وفد کعب بن عمیر غفاری رضی اللہ عنہ بچ کر آنے میں کامیاب ہوئے۔ اسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ نے بصریٰ کے رئیس شرحبیل بن عمرو کے نام بھی دعوتِ اسلام کا پیغام بھیجا تھا۔ اس نے بھی آپ کے ایلچی حارث بن عمیر ؓ کو قتل کر دیا۔ آپ نے جب اس علاقے کے لوگوں کی شوریدہ سری اور حد سے بڑھی ہوئی رعونت دیکھی تو آپ نے جمادی الاولیٰ آٹھ (۸) ہجری میں تین ہزار (۳۰۰۰) مجاہدین کی ایک فوج سرحدِ شام کی طرف بھیجی تا کہ آئندہ کے لئے یہ علاقہ مسلمانوں کے لئے پرامن ہو جائے اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بے زور سمجھ کر ان پر زیادتی کرنے کی جرأت نہ کریں۔ یہ فوج جب "معان" کے قریب پہنچی تو معلوم ہوا کہ شرحبیل بن عمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر مقابلہ پر آ رہا ہے اور خود قیصرِ روم "حمص" کے مقام پر موجود ہے اور اس نے اپنے بھائی فیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی مزید فوج روانہ کی ہے۔ لیکن ان خوفناک اطلاعات کے باوجود تین ہزار سرفروشوں کا یہ مختصر سا دستہ آگے بڑھتا چلا گیا اور موتہ کے مقام پر شرحبیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرایا۔ اس جسارت کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مسلمان بالکل پس جاتے، لیکن سارا عرب اور تمام شرقِ اوسط یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور تینتیس (۳۳) کے اس مقابلہ میں کفار مسلمانوں پر غالب نہ آ سکے۔

اس صورتحال سے دو نتیجے سامنے آئے ایک تو یہ کہ مسلمانوں کی اس غیر معمولی شجاعت و بہادری اور اللہ پر بے پناہ توکل نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی جو قیصر کے زیرِ اثر تھے اسلام کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بنی سلیم، اشجع، غطفان، ذبیان اور فزارہ کے لوگ اسی زمانہ میں داخلِ اسلام ہوئے اور اسی زمانہ میں سلطنتِ روم کی عربی

Marfat.com

فوجوں کا ایک کمانڈر فروہ بن عمرو الجذامی مسلمان ہوا اور اس نے ایمان کا ایسا زبردست ثبوت دیا کہ گردوپیش کے سارے علاقے اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ قیصر کو جب فروہ کے قبولِ اسلام کی اطلاع ملی تو اس نے انہیں گرفتار کر کے اپنے دربار میں بلایا اور ان سے کہا کہ دو چیزوں میں سے ایک کو منتخب کر لو یا ترکِ اسلام، جس کے نتیجے میں تم کو نہ صرف رہا کیا جائے گا بلکہ تمہیں اپنے عہدے پر بھی بحال کر دیا جائے گا اور یا اسلام، جس کے نتیجہ میں تمہیں سزائے موت دی جائے گی۔ انہوں نے ٹھنڈے دل سے اسلام کو چن لیا اور راہِ حق میں جان دے دی۔ اندازہ کیجئے کہ جنگِ مؤتہ کے شہدا کا خون اور راہِ خدا میں ان کی شہادت کے اثرات کس قدر سریع الاثر ثابت ہوئے کہ وہ قبائل جن کی فطرت آزاد تھی ان میں تیزی سے اسلام پھیلنا شروع ہوا اور دوسری طرف اس کے برعکس ایک دوسرا نتیجہ بھی ظاہر ہوا وہ یہ کہ قیصر نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کا تین ہزار کا لشکر ہماری ایک لاکھ فوج سے نہ صرف کہ خوف زدہ نہیں ہوا بلکہ فوج کی انتہائی کوشش کے باوجود اسے شکست نہ دی جاسکی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جنوب کی طرف سے اٹھنے والی بادِ بہاری اپنے اندر آندھی اور طوفان سے زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ چنانچہ اس نے اس نوزائیدہ طاقت کو کچلنے کیلئے سرحدوں پر فوجوں کا اجتماع شروع کر دیا۔ آنحضرت ﷺ چونکہ ایسی ہر طرح کی صورتحال سے باخبر رہتے تھے۔ آپ نے اس صورتحال کو دیکھا، اس کی سنگینی کو سمجھا اور اسکے دوررس نتائج کے پیشِ نظر محسوس کیا کہ ایسے فیصلہ کن وقت میں خاموشی اسلام کیلئے تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے لیکن ساتھ ہی آپ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ملک میں قحط سالی ہے اور گرمی کا موسم پورے شباب پر ہے۔ فصلیں پکنے کے قریب ہیں۔ وسائلِ جنگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مقابلہ ایک ایسی طاقت سے ہے جس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی آپ کے پیشِ نظر یہ منظر بھی تھا کہ اللہ کے دین کے غلبے کیلئے مسلسل بائیس (۲۲) سال تک جو جان توڑ کوششیں ہوئی ہیں اور جس کیلئے مسلسل قربانیاں دی گئی ہیں آج اس کی قسمت ترازو میں ہے آج معمولی سی کمزوری بھی ہولناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ تمام مشکلات کے باوجود آپ نے قیصر کی قوت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا اور قرآنِ کریم نے مسلسل مسلمانوں کو اس جہاد کیلئے ہر ممکن ترغیب دی۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی بڑھ چڑھ کر قربانیاں دیں۔ مالداروں نے اپنی دولت پیش کر دی۔ مزدور صحابہ نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جو کچھ ہو سکا حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار کر دے دیئے۔ سرفروشوں کے لشکر ملک کے ایک ایک کونے سے جان وتن کا نذرانہ لے کر حاضر ہو گئے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ تیس ہزار (۳۰۰۰۰) کا لشکرِ جرار لے کر رجب ۹ ہجری کو شام کی طرف روانہ ہوئے۔ جن میں دس ہزار (۱۰۰۰۰) سوار تھے، اونٹوں کی اتنی کمی تھی کہ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے۔ مسلمانوں کی سرفروشی اور انتہا درجہ کے ایثار نے اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کر لیا چنانچہ تبوک پہنچ کر اندازہ ہوا کہ قیصر اور اس کے امراء نے سرحد پر فوجیں اکٹھا کرنا شروع کی تھیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ سرفروشوں کا لشکر جو تین ہزار (۳۰۰۰) کی تعداد میں ہوتے ہوئے ہمارے لاکھوں سے ٹکرا گیا تھا۔ اب اسی قبیلۂ فکر کے لوگ ایک بڑی تعداد میں اپنے پیغمبر کی قیادت میں آرہے ہیں۔ ہم تین ہزار کو قابو نہ کر سکے تو ان تیس ہزار کا پیغمبر کی موجودگی میں کون سامنا کر سکتا ہے۔ عافیت اسی میں ہے کہ فوجیں سرحدوں سے ہٹالی جائیں۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اسی اخلاقی فتح کو کافی سمجھا، بجائے شام کی حدود میں داخل ہونے کے آپ تبوک ہی میں رک گئے۔ وہاں بیس دن قیام رہا اور بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو جو سلطنتِ روم اور دارالاسلام کے درمیان واقع تھیں اور اب تک رومیوں کے زیرِ اثر رہی تھیں انہیں فوجی دباؤ سے سلطنتِ اسلامی کا باج گزار بنالیا گیا۔ بعض نصرانی رؤسا نے جزیہ دینا قبول کر لیا اس طرح سے سرحد کے حالات کو بہتر بنا کر اور وہاں ممکن خطرات کا ازالہ فرما کر آپ نے واپسی کا قصد فرمایا۔

غلبۂ دین کے اعلان کا وقت:

آپ کی واپسی کی اطلاع پورے عرب میں پھیل گئی اور جو لوگ اس امید میں تھے کہ مسلمان قیصر کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ یہ نئی ریاست استحکام سے پہلے ہی تباہی کا شکار ہو جائے گی۔ انہوں نے جب دیکھا کہ آنحضرت اور مسلمان کامیاب اور کامران واپس تشریف لے آئے ہیں تو ان کے برے ارادے آپ اپنی موت مر گئے۔ چنانچہ اب وہ وقت آ گیا جس کا اعلان قرآنِ کریم میں کیا گیا تھا کہ اللہ وہ ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کر دے۔ چنانچہ آپ نے اب جزیرۂ عرب کی حد تک تمام ادیان کو مغلوب کرنے یا نکال باہر کرنے کا عزم کر لیا۔ حکم دے دیا کہ جزیرۂ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں۔ یہاں صرف ایک اسلام باقی رہے گا۔ اسلام دوسرے مذاہب

Marfat.com

کا احترام کرتا ہے لیکن اللہ کی زمین پر اس کے دین کو غالب کرنے کیلئے ضروری تھا کہ ایک مضبوط مرکز، ایک مضبوط جماعت اور ایک مضبوط بیس (Base) وجود میں آتا۔ جس سے کلمۃ اللہ کی سربلندی کا کام لیا جاتا۔ چنانچہ اس لئے اس سورۃ کے آغاز ہی میں تمام مشرک اور کافر قوتوں کو آگاہ کر دیا گیا کہ وہ اسلام قبول کر لیں تو مسلمانوں کے بھائی ہوں گے اور اگر وہ اسلام قبول کرنا نہیں چاہتے اور ان کا تعلق اہلِ کتاب سے ہے تو وہ جزیہ دے کر مسلمان ملک میں عزت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انہیں جزیرۂ عرب سے نکلنا ہوگا کیونکہ جزیرۂ عرب اسلامی قوتوں کا بیس (Base) ہے جس میں دوسرے کسی دین کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ ایک ایسی جگہ ہونی چاہئے جہاں مسلمان یکسوئی سے فیصلے کر سکیں اور جہاں فتنہ انگیزی اور فتنہ پروری کا کوئی امکان نہ ہو۔ عرب مشرکین کی طرف چونکہ نبی کریم ﷺ کی براہِ راست بعثت ہوئی، ان کی اکثریت نے آپ کی دلآویز شخصیت کو دیکھا، آپ کے معجزانہ اخلاق دیکھے، آپ کے بے عیب سیرت و کردار کو ملاحظہ کیا، آپ پر اترتی ہوئی وہ کتاب دیکھی جس کے سامنے دنیا کا علم ماند پڑ گیا۔ اس لئے عربوں کیلئے جزیہ کی گنجائش باقی نہیں رکھی گئی انہیں صرف یہ حکم دیا گیا کہ دیکھو تمہارا دین، تمہاری زبان میں آیا رسول تمہاری زبان بولتا ہے، تم جس ملتِ ابراہیمی کے ماننے والے ہو اسی کی تمہیں دعوت دی گئی۔ اس کے باوجود اگر تم نے اسلام قبول نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم قبولیت کے مادے اور انسانیت کو گم کر چکے ہو۔ تم دھرتی کا بوجھ ہو اس لئے تمہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں چنانچہ ان کے لئے اس سورۃ کے پہلے پانچ رکوعوں میں مختلف اعلانات فرمائے گئے۔ جنگِ تبوک کیلئے نکلنے میں جن مخلص مسلمانوں نے کوتاہی کی انہیں ترغیب بھی دی اور ترہیب سے بھی کام لیا۔ منافقین کو بھی بار بار سرزنش کی۔ جنگِ تبوک سے واپسی پر پیچھے رہ جانے والوں کے بائیکاٹ کا حکم دیا منافقین پر سختی کی گئی۔ ان کی مسجدِ ضرار جو مسجد کے روپ میں سازشوں کا اڈہ تھا۔ ابوعامر راہب راتوں کو چھپ کر وہاں آتا، اسے جلانے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح سے اسلامی انقلاب کے تمام گوشوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کیلئے جن ہدایات کی ضرورت تھی وہ اس سورۃ میں عطا کی گئیں۔

Marfat.com

رُكُوْعَاتُهَا ١٦	سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ	اٰيَاتُهَا ١٢٩

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؕ (١)
فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ
مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ (٢) وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ
تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (٣) اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْــًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْۤا
اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (٤)
فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ
وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ
تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ

Marfat.com

اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ ۝

اعلان براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ سو اب ملک میں چار ماہ چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور بیشک اللہ کافروں کو رسوا کر کے رہے گا۔ اور اطلاع عام ہے اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن تمام لوگوں کیلئے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہے۔ پس اگر تم توبہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کرو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور کافروں کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری پہنچا دو۔ مگر وہ مشرک جن سے تم نے معاہدے کئے اور انہوں نے اس میں نہ تم سے کوئی خیانت کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدتِ معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ پھر جب اشھر حرم گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی انہیں پاؤ اور انہیں پکڑو اور انہیں گھیرو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دو یہ اس لئے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں رکھتے۔ (۱تا۶) (رکوع: ۱)

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَی الَّذِیْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝ فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِی الْكٰفِرِیْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَی النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ۬ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ ﴿التوبة: ۱ تا ۳﴾

(اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ (۱) سو اب ملک میں چار ماہ چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور بے شک اللہ کافروں کو رسوا کر کے رہے گا۔ (۲) اور اطلاع عام ہے اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن تمام لوگوں کیلئے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہے پس اگر تم توبہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کرو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور کافروں کو ایک دردناک عذاب کی خوشخبری پہنچا دو۔ (۳)

مشرکین سے براءت کا اعلان:

احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذیقعدہ ۹ ہجری میں رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیرِ حج بنا کر مکہ معظمہ روانہ کر چکے تھے کہ ان آیات کا نزول ہوا۔ فتح مکہ کے بعد یہ دوسرا حج تھا ۸ ہجری کا حج قدیم طریقے سے ہوا کیونکہ فتح مکہ کے بعد عفوِ عام کا اعلان کر دیا گیا تھا تاکہ مشرکین

Marfat.com

عرب اچھی طرح اپنے معاملے پر غور کرلیں اور مسلمانوں کو آہستہ آہستہ پورے جزیرۂ عرب پر کنڑول کرنے کا موقعہ میسر آجائے۔اس کے بعد جنگِ حنین میں جاہلیت قدیمہ نے آخری کوشش کی کہ اسلام کا راستہ روکیں لیکن انہیں اپنے ارادوں میں بری طرح ناکامی ہوئی لیکن اس سے یہ بات ضرور واضح ہوگئی کہ اگرچہ جزیرۂ عرب میں اسلام کے اثرات تیزی سے پھیل رہے ہیں لیکن ابھی تک بعض جگہ ایسی قوتیں موجود ہیں جو اس انتظار میں ہیں کہ جیسے ہی کوئی بڑا حادثہ پیش آئے وہ باہر کی قوتوں کی مدد سے اسلام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں۔رسول اللہ ﷺ وحی الٰہی کی روشنی میں حالات کے مدوجزر سے پوری طرح واقف تھے۔آپ کوئی عاجلانہ اقدام کرنے کی بجائے اس انتظار میں تھے کہ اسلام کے اثرات منطقی انداز میں اپنے انجام کو پہنچیں اور پھر پورے جزیرۂ عرب کو شرک سے پاک کرنے کا اقدام کیا جائے۔اسی دوران شمالی سرحدوں پر اسلامی قوتوں کی سرکوبی کیلئے اندرونی منافقین کی دعوت پر قیصر نے کچھ کارروائی کرنے کا ارادہ کیا لیکن آنحضرت ﷺ اس کی تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے سر پر جا پہنچے اور اسے اپنی فوجیں پیچھے ہٹانے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔اس طرح سے آنحضرت ﷺ کو سرحدی حالات درست کرنے اور سرحدوں کو محفوظ کرنے کا موقع مل گیا اور جزیرۂ عرب کے اندر اس کے اثرات یہ ہوئے کہ جن خفیہ قوتوں کو ابھی تک باہر سے کچھ مدد ملنے کی امید تھی ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں اور انہوں نے یہ بات سمجھ لی کہ اب جزیرۂ عرب کی قسمت اسلام سے وابستہ ہے چنانچہ یہی وہ وقت تھا جب آنحضرت ﷺ کو جزیرۂ عرب کی یکسوئی، دین کی وحدت، کامل غلبۂ دین اور جزیرۂ عرب کی حد تک اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کا اعلان کرنا چاہیے تھا۔چنانچہ اسی غلبۂ دین اور حاکمیتِ الٰہی کے نفاذ کے اعلان کیلئے سورۂ توبہ کے ابتدائی رکوع نازل ہوئے اور چونکہ اسلامی نظام زندگی میں عدل اور ایفائے عہد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے اس لئے جزیرۂ عرب کیلئے آخری اعلان کرنے سے پہلے ان تمام معاہدات سے دستبرداری کا اعلان فرمایا تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ اسلام نے نقضِ عہد کا ارتکاب کیا ہے۔چنانچہ کافر قوتوں کو جن سے کسی طرح کے بھی معاہدے تھے وہ چونکہ بارہا ان معاہدوں کو عملی طور پر توڑ چکے تھے۔ظاہری اعلان کی ایک رسم باقی تھی جس سے ایک بھرم بنا ہوا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ درپردہ قریشِ مکہ کی حمایت کرتے تھے،انہیں صاف صاف بتادیا گیا کہ آج کے بعد ہر طرح کے معاہدات سے اللہ اور اس کا رسول دستبرداری کا اعلان کرتے ہیں۔

مشرکین کو چار مہینوں کی مہلت:

جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ نو (۹) ہجری کے حج کے لئے حضرت صدیقِ اکبر ؓ کو امیرِ حج بنا کر آنحضرت ﷺ روانہ فرما چکے تھے کہ سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں اگرچہ اس کے بعض حصے اس سے پہلے نازل ہو چکے تھے۔اس میں چونکہ معاہدات سے دستبرداری کا اعلان اور جزیرۂ عرب کیلئے یک مستقل پالیسی کا اعلان تھا۔اس لئے ان آیات کی حیثیت عام آیاتِ قرآنی سے ذرا مختلف تھی اور پھر اس میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ حج کے دنوں میں اس کی عام منادی کی جائے تو صحابہ کرام نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ ان آیاتِ کریمہ کو حضرت ابوبکر ؓ کے پاس بھیج دیا جائے تاکہ وہ حج میں اس کا اعلان کردیں۔لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عرب کی روایت کے مطابق اس اہم معاملہ کا اعلان میری طرف سے ہونا چاہیے یا میرے ہی گھر کے کسی آدمی کی طرف سے ہونا چاہیے۔چنانچہ آپ نے حضرت علی ؓ کو اس خدمت پر مامور فرمایا۔آپ ؓ ان آیات کو لیکر مکہ معظمہ پہنچے،انہیں دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو گمان ہوا کہ شاید آنحضرت ﷺ نے انہیں امیرِ حج بنا کر بھیجا ہے۔استفسار پر حضرت علی ؓ نے فرمایا کہ میں تو ایک کارِ خاص کیلئے بھیجا گیا ہوں،امیرِ حج تو آپ ہی ہیں۔چنانچہ انہوں نے عرفات اور منیٰ میں بطورِ خاص اور حاجیوں کے ہر اجتماع میں عمومی طور پر ان آیات کا اعلان فرمایا۔جن میں پہلی بات تو ان لوگوں کے معاہدات سے دستبرداری تھی جو ہمیشہ درپردہ دشمنانِ دین کی حمایت کرتے رہے تھے۔لیکن اسلام نے اپنے عادلانہ اور کریمانہ طریقے کے خلاف یہ نہیں کیا کہ اسی وقت مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکل جانے یا ان کے قتلِ عام کا حکم دے دیا جاتا بلکہ نہائیت مہربانی کا سلوک کرتے ہوئے انہیں چار مہینے کی مہلت دی گئی اور ساتھ ہی یہ بات واضح کردی گئی کہ چار مہینے کی مہلت تمہیں اس لئے دی جارہی ہے کہ تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے اور اگر تمہیں ملک چھوڑنا ہو تو اس کے انتظامات کرنے کی دشواری نہ ہو۔لیکن اگر تم یہ سمجھو کہ تم ان چار مہینوں میں اسلامی انقلاب کے خلاف کوئی ایسی طاقت فراہم کرلو گے یا باہر سے تمہیں کوئی کمک پہنچ جائے گی جس سے تم اسلامی انقلاب کا راستہ روک لوگے تو یہ تمہیں نہیں کیونکہ یہ انقلاب اللہ کا دین ہے،اس کی بالادستی ہے،زمین کے مالک کا زمین پر حاکمانہ اقتدار ہے،جس کی مخالفت اللہ کی مخالفت ہے۔تم نے

Marfat.com

تک ہر مرحلے پر دیکھا ہے کہ مسلمان محدود قوت رکھتے ہوئے ہمیشہ غالب آتے رہے ہیں۔اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے ساتھ اللہ کی قوت ہے۔ اسلام کی بالادستی مسلمانوں کی نہیں اللہ کی بالادستی ہے۔اس لئے اگر تم اس کو روکو گے تو تمہارا براہِ راست تصادم اللہ سے ہوگا، تو اللہ کو تو دنیا میں کوئی عاجز نہیں کرسکتا۔ان ابتدائی ارشادات کے بعد عام اعلان فرمایا گیا۔قرآنِ کریم کے اعلان کے ساتھ ساتھ مزید چار باتوں کی بھی تشہیر کی گئی جن کا ذکر احادیث مبارکہ میں ہے۔

ا:۔ جنت میں کوئی ایسا شخص داخل نہ ہوگا جو دینِ اسلام کو قبول کرنے سے انکار کرے۔

۲:۔اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کیلئے نہ آئے۔

۳:۔ بیت اللہ کے گرد برہنہ طواف کرنا ممنوع ہے۔

۴:۔ جن لوگوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا معاہدہ باقی ہے یعنی جو نقضِ عہد کے مرتکب نہیں ہوئے ان کے ساتھ مدتِ معاہدہ تک وفا کی جائے گی۔

اس اعلان کیلئے حجِ اکبر کا دن چنا گیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب اپنی ساری قباحتوں اور گمراہیوں کے باوجود اللہ کے گھر سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر سال ایامِ حج میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں وہاں حاضری دیں۔اس لئے ان تک کسی بات کے پہنچانے کا سب سے مؤثر ذریعہ یہ تھا کہ حج کے دنوں میں اس کا اعلان کیا جائے کیونکہ جب یہ لوگ واپس جائیں گے تو وہ اعلان ملک کے کونے کونے میں پہنچ جائے گا۔پھر اس کے بعد ملک کے کسی گوشے میں کسی شخص کے پاس یہ عذر باقی نہیں رہے گا کہ مجھے اللہ کے اس اعلان کی اطلاع نہیں تھی۔حاجی اگرچہ یمن سے بھی آتے تھے لیکن مزید احتیاط کیلئے آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا اور وہاں بھی ان کے ذریعے اس کا اعلان کیا گیا۔

ضمنی طور پر دو باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔

يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ سے مراد؟

ا:۔ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ سے کیا مراد ہے؟ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس سے مراد ''یوم العرفہ'' ہے۔بعض دوسرے اہلِ علم اس سے ''یوم النحر'' مراد لیتے ہیں۔حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ ''حج کے پانچوں دن'' مراد لیتے ہیں۔ان میں سے کوئی بات بھی غلط نہیں۔لیکن حدیث میں آنحضرت ﷺ نے یوم النحر کے بارے میں فرمایا: ﴿ هذا يوم الحج الاكبر ''یہ حجِ اکبر کا دن ہے'' ﴾

حجِ اکبر سے مراد؟

۲:۔ حجِ اکبر سے کیا مراد ہے؟ حجِ اکبر سے مراد وہ حج ہے جو ہم آٹھ ذی الحج سے بارہ یا تیرہ ذی الحج تک مناسکِ حج کی ادائیگی کی صورت میں کرتے ہیں۔اسے اکبر اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ حجِ اصغر، عمرہ کو کہتے ہیں۔اس لحاظ سے ہر حج، حجِ اکبر ہے۔عوام میں جو یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ جو حج جمعہ کے دن ہو یعنی نو تاریخ یوم عرفہ اگر جمعہ کے دن میں واقع ہو تو اسے حجِ اکبر کہتے ہیں۔یہ بالکل غلط ہے۔یہ محض اتفاق ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو حج کیا جسے حجۃ الوداع کہتے ہیں اس میں یوم عرفہ جمعہ کے دن تھا۔

حجِ اکبر میں یہ اعلان کیا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول مشرکین سے بری ہیں۔اس کی وضاحت آئندہ آیات میں آرہی ہے۔لیکن بات جو سامنے کی بالکل ہے وہ یہ ہے کہ اب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مشرکین کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔اس حج کے بعد وہ جزیرۂ عرب میں نہیں رہ سکیں گے اور وہ اللہ کے گھر اور حرم کے قریب کوئی مشرکانہ حرکت نہیں کرسکیں گے۔جزیرۂ عرب کی غالب قوت چونکہ اب مسلمان ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ پورے جزیرۂ عرب میں اسلامی ریاست قائم ہو چکی ہے۔اس لئے یہاں کا ہر باشندہ ریاست پر اپنے حقوق رکھتا ہے۔اس

Marfat.com

حوالے سے اعلان کیا جارہا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکین کے کسی حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی جان، ان کا مال اور ان کی آبرو، ان مہینوں کے گزرنے کے بعد جن کی مہلت دی گئی ہے، مباح ہو جائے گی۔ اب ان کیلئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ جاہلیتِ قدیمہ سے اسلام کی طرف پلٹ آئیں۔ مشرکانہ طور اطوار چھوڑیں اور توحید کے پرستار بن جائیں۔ ان سے براہِ راست خطاب کر کے فرمایا کہ یہی تمہارے لئے بہتر ہے، اسی میں تمہارے لئے عافیت ہے کیونکہ اللہ کے آخری نبی کے ہجرت کر جانے کے بعد تم پر اللہ کا عذاب آجانا چاہئے تھا۔ لیکن صرف اس وجہ سے کہ عرب کے بعض علاقوں بالخصوص مکہ معظمہ میں قبولیتِ اسلام کا سلسلہ کسی نہ کسی حد تک جاری رہا، تمہیں اللہ کی طرف سے مہلت ملتی رہی۔ اب وہ مہلت ختم ہوگئی ہے اب جزیرۂ عرب کے بارے میں یہ فیصلہ ہوگیا ہے کہ اسے مرکزِ اسلام، اسلامی ریاست اور اسلام کا بیس (Base) بن کر رہنا ہے۔ یہاں کسی دوسرے دین کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ اہلِ کتاب کو بھی یہاں سے نکلنا ہوگا اور مشرکین کو نکلنا ہوگا یا قتل ہونا ہوگا۔ اس لئے عافیت میں اسی میں ہے کہ تم اسلام کے سایۂ عافیت میں آجاؤ۔ لیکن اگر تم روگردانی کرو تو بار دگر اس کا اعلان فرمایا کہ تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں بھی اگر یہ خیال موجود ہے کہ تم اللہ کو عاجز کر سکتے ہو تو اسے نکال دو اور اللہ کا فیصلہ سن لو کہ وہ کافروں کو دردناک عذاب دینے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿التوبة : ۴﴾

مگر وہ مشرک جن سے تم نے معاہدے کیے اور انہوں نے اس میں نہ تم سے کوئی خیانت کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدتِ معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ (۴)

نقضِ عہد نہ کرنے والوں سے ایفائے عہد کرو:

گزشتہ آیت نمبر دو (۲) سے یہ معلوم ہوا کہ عرب کے جن قبیلوں نے معاہدے کیے لیکن اس کی پابندی کبھی نہ کی اور وہ قبیلے جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدے میں شریک نہیں تھے۔ ان سب کو چار مہینے کی مہلت دی گئی کہ وہ عرب میں چل پھر لیں اپنے معاملات درست کر لیں اور آئندہ کیلئے کسی فیصلے تک پہنچ جائیں۔ لیکن انہیں قبائل میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے نبی کریم ﷺ سے معاہدے کیے اور پھر نہ تو انہیں توڑا اور نہ کبھی کسی مسلمانوں کے دشمن کی در پردہ مدد کی۔ وہ مکمل طور پر غیر جانبدار رہے اور ہمیشہ معاہدے کی پاسداری کی۔ ان کے بارے میں حکم دیا جارہا ہے کہ ان کے معاہدوں کی مدت پوری کی جائے۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ معاہدے کی پابندی کرنے والوں سے مراد بنو ضمرہ اور بنو مدلج تھے۔ انہوں نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی یا مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی۔ ان کے معاہدے کی باقی مدت نو مہینے تھی۔ اس لحاظ سے انہیں مزید نو (۹) مہینے یعنی رمضان دس (۱۰) ہجری تک جزیرۂ عرب میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ لیکن اس مدت کے گزرنے کے بعد ان کیلئے بھی وہی حکم تھا جو باقی عربوں کیلئے تھا کیونکہ ان کے ساتھ جو معاہدات کئے گئے تھے وہ اس لئے تھے تاکہ اسلام کی دعوت کیلئے آسانیاں پیدا ہوں اور لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانا کسی رکاوٹ کے بغیر ممکن ہو۔ لیکن جب دعوت الی اللہ سے آگے بڑھ کر غلبۂ دین اور اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کا وقت آگیا تو ان معاہدات کی ضرورت ختم ہوگئی۔ لیکن اسلام چونکہ بغیر کسی شرعی مجبوری کے معاہدے کی مدت ختم کرنے کی اجازت نہیں دیتا اس لئے حکم دیا گیا کہ تم معاہدے کی مدت پوری کرو۔ لیکن اس کے بعد ان قبیلوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ اب ان کی زندگی کی بقا کیلئے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اسلام کی آغوش میں آجائیں۔ اہلِ کتاب کی طرح ذمی بن کر رہنے کی ان کیلئے کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ان پر جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں پوری طرح اتمامِ حجت ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کو نہ تو ان کے معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے ان سے تعرض کرنے کی اجازت ہے اور نہ وہ ان پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ اسی طرح مدت ختم ہو جانے کے بعد ان کو سابقہ رویے کی وجہ سے کسی رعایت دینے کی بھی اجازت نہیں۔ ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا جو باقی عربوں کے ساتھ ہوگا اور مسلمان کو ہر حال میں اللہ سے ڈرنا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنے کی فکر کرنی چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ متقین کو پسند کرتا ہے۔

Marfat.com

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ٥

(پھر جب اشہر حرم گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی انہیں پاؤ اور انہیں پکڑو اور انہیں گھیرو اور ہر جگہ ان کی تاک میں بیٹھو پھر اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے۔) ﴿التوبة : ۵﴾

اشہرِ حرم کا مفہوم:

بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ جزیرۂ عرب کے عام رہنے والوں کو چار مہینوں کی مہلت دی گئی تھی۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو معاہدوں کے باوجود نقضِ عہد کرتے رہے اور وہ لوگ بھی جن سے کوئی معاہدہ نہیں تھا لیکن مسلمانوں کی دشمنی میں انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اس آیت میں اشہرِ حرم سے مراد وہی چار مہینے ہیں جن کی انہیں مہلت دی گئی تھی۔ اشہرِ حرم ان مہینوں کو اس لئے کہا گیا کیونکہ ان چار مہینوں میں مسلمان کفار سے کوئی تعرض نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے یہاں اشہرِ حرم ممنوع مہینوں کے معنی میں استعمال کیا گیا۔ لیکن دیگر مفسرین کا خیال ہے کہ اشہرِ حرم سے مراد متذکرہ بالا چار مہینے نہیں بلکہ اس سے وہی حرمت والے مہینے مراد ہیں جن کی حرمت تمام عربوں کے نزدیک مسلم تھی۔ اس لحاظ سے اس سے قریشِ مکہ مراد ہیں۔ انہوں نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑ کر اپنے آپ کو ہر رعایت سے محروم کرلیا تھا۔ لیکن فتح مکہ کے بعد چونکہ ان کی اکثریت مشرف بہ اسلام ہوگئی اور باقیوں کو نبی کریم ﷺ نے عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے معاف فرمادیا۔ انہوں نے رمضان آٹھ ہجری سے لے کر ذیقعدہ نو (۹) ہجری تک ہر طرح کی آزادی سے دن گزارے اور آئندہ کیلئے غور و فکر کے بعد فیصلہ کرنے کا انہیں طویل موقع میسر آیا۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں ان سے فرمایا جارہا ہے کہ یہ اعلان دس (۱۰) ذی الحج کو کیا جارہا ہے اور ذی الحج کے بعد محرم مسلسل اشہرِ حرم میں سے باقی رہ جائے گا۔ اس کے گزر جانے کے بعد ان کے لئے آزادی کے لمحات بھی ختم ہوجائیں گے۔ اب انہیں یا تو اسلام کی آغوش میں آنا ہوگا اور یا پھر قتل ہونے کیلئے تیار ہونا ہوگا۔

توبہ کرنے والے اسلامی اخوت کا حق رکھتے ہیں:

ان لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ انہیں جہاں بھی پاؤ قتل کرو، گرفتار کرو، انہیں گھیرو، ان کی گھات میں بیٹھو تاکہ یہ کوئی فتنہ پردازی نہ کرسکیں لیکن اگر وہ توبہ کا راستہ اختیار کریں اسلام کی طرف آنا چاہیں تو تمہارے پرانے زخم سلگنے نہیں چاہئیں۔ تم وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرو۔ جس طرح فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ کا بدترین دشمن ابوجہل کا بیٹا عکرمہ یہ سمجھ کر کہ میرے لئے اب کوئی جائے پناہ نہیں میرے باپ نے جو کچھ کیا اور جو کچھ میں کرتا رہا ہوں اسے دیکھتے ہوئے عفو و درگزر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یمن بھاگ گیا۔ لیکن اس کی بیوی نہایت سمجھدار تھیں وہ اسلام قبول کرچکی تھیں، وہ یمن پہنچیں اور اسے سمجھا کر واپس لائیں۔ اسے یقین دلایا کہ اسلام کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔ تم اگر اسلام قبول کرلو اور آنحضرت کی اطاعت کا فیصلہ کرلو تو تم حضور کو سراپا شفقت پاؤ گے۔ چنانچہ جب وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے پہنچا تو حضور اس قدر بیتابی کے ساتھ اس کی پیشوائی کے لئے اٹھے جیسے کوئی کسی عزیز ترین دوست کو خوش آمدید کہتا ہے۔ آپ نے فرمایا: ﴿ مرحباً بالراكب المهاجر "مہاجر سوار کو خوش آمدید" ﴾

اس کا اسلام قبول فرمایا، شفقت فرمائی اور پھر اللہ نے عکرمہ کو اپنی اور باپ کی زیادتی کی تلافی کا اس طرح موقع عطا فرمایا کہ خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔ مسلمانوں کو اسی طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیا جارہا ہے کہ جو بھی اسلام کی طرف آئے اس کا اسلام قبول کرو۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے والا صرف اللہ اور رسول پر ایمان لانے کا اقرار ہی نہ کرے بلکہ نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے کیونکہ نماز کے بعد ثابت ہوجاتا ہے کہ یہ شخص بتوں کی چوکھٹوں سے سر اٹھا کر اللہ کے آستانے پر جھک چکا ہے۔ اس نے تمام بڑائیوں اور عظمتوں کا انکار کر کے اللہ کی کبریائی کو اپنے دل میں بسالیا ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی اپنی ذات کی پاکیزگی کے بعد مال و دولت کی پاکیزگی اور اللہ کی امانت ہونے کا اقرار ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں جس سے انسانی

Marfat.com

زندگی کی جہت واضح ہو جاتی ہے اور اس کے اہداف متعین ہو جاتے ہیں اور اگر کوئی شخص ایمان لانے کے بعد نماز اور زکوٰۃ سے گریز کرتا ہے، وہ دراصل ایمان کے اقرار کو تحفظ ذات کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے اور موقعہ کی تلاش میں ہے کہ جب بھی موقعہ ملے اسلام سے بغاوت کر دے۔

ایمان کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا لازمہ اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ خلافتِ صدیقی کے انعقاد کے بعد جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ہم اللہ، اس کے رسول اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن ہم مدینے کی حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے کیلئے تیار نہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے جب ان کے خلاف قتال کا ارادہ کیا تو مسلمانوں کو نہایت تردد ہوا کہ کلمہ گو لوگوں کے خلاف ہم تلوار کیسے استعمال کر سکتے ہیں؟ حضرت صدیق اکبرؓ نے اسی آیتِ کریمہ سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ اس آیتِ کریمہ میں صاف فرمایا گیا ہے کہ اگر وہ لوگ توبہ کریں پھر نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ لیکن اگر وہ ان تینوں میں کسی ایک کو بھی چھوڑیں تو ان کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ صحابہ نے اس دلیل کو تسلیم کیا اور بالاجماع ان کے خلاف فوجی کارروائی کی گئی۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴿التوبة : ٦﴾

(اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دو یہ اس لئے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو علم نہیں رکھتے۔)

اسلام سے آگاہی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے:

اللہ کا جو اپنے بندوں کے ساتھ نہایت کریمانہ اور عادلانہ رویہ ہے یہاں اس کا پورا اظہار ہو رہا ہے۔ بائیس (۲۲) سال تک نبی کریم ﷺ نے، تیرہ (۱۳) سال تک مکہ معظمہ اور نو (۹) سال تک مدینہ منورہ میں، شب و روز اللہ کے دین کی دعوت پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اللہ کے دین کی مخالف قوتوں کے قلعوں کو مسمار کیا۔ دشمنانِ دین کے جتھوں کو توڑا۔ جزیرۂ عرب میں جہاں جہاں بھی کفر اور شرک کے مراکز تھے انہیں سرنگوں کیا۔ جگہ جگہ تبلیغی وفود بھیجے۔ مسلمانوں نے اپنی ہمت سے بڑھ کر تبلیغی مساعی انجام دیں۔ اس طرح سے کوئی قبیلہ ایسا نہیں رہ گیا تھا جس میں اللہ کے دین کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ لیکن پھر بھی اس بات کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی شخص ایسا رہ گیا ہو جسے اللہ کے دین کی دعوت نہ پہنچی ہو یا دین کی بنیادی تعلیمات سے اسے پوری طرح آگاہی نہ ہوئی ہو چنانچہ اس امکان کو ختم کرنے کیلئے اور انسانوں سے رحیمانہ سلوک کی انتہا کرتے ہوئے اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اگر کوئی شخص تم سے یہ چاہے کہ میں اس لئے تمہاری پناہ میں آنا چاہتا ہوں تاکہ دین کی بنیادی باتوں سے آگاہی حاصل کر سکوں اور میرے دل میں اسلام کے خلاف اگر کوئی شکوک و شبہات ہیں تو ان کے ازالے کیلئے کوشش کروں تو تمہارے لئے لازم ہے کہ تم اسے پناہ دو پھر اللہ کا کلام اسے سناؤ یعنی دین کی بنیادی باتوں سے آگاہ کرو۔ جس جس طریقے سے اسے مطمئن کیا جا سکتا ہے مطمئن کرو اور یہ مت سمجھو کہ وہ اپنی جان بچانے کیلئے بہانہ کر رہا ہے۔ وہ بہانہ بھی کر رہا ہو تب بھی تمہیں اپنا فرض ضرور انجام دینا ہے۔ جب اسے اللہ کا کلام سنا دو اور دینی صداقتوں سے فی الجملہ آگاہ کر دو تو پھر اسے ایسی جگہ پہنچا دو جو اس کیلئے امن کی جگہ ہو تاکہ وہ آزادی سے اللہ کے دین کے بارے میں فیصلہ کر سکے۔ آخر میں فرمایا کہ ہم اس بات کا حکم اس لئے دے رہے ہیں کہ عرب قوم ایک جاہل قوم ہے وہ نہ مذہب سے واقف ہے نہ نبوت سے۔ دینی صداقتوں کی ہوا بھی اسے چھو کر نہیں گزری۔ اڑھائی ہزار سال سے کوئی نبی جزیرۂ عرب میں نہیں آیا۔ وہ فطری سادگی اور بدویانہ اکھڑپن سے زندگی گزارتے رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں اس بات کا بعید امکان ہے کہ لوگ اپنی بے خبری کو ہی خبر سمجھنے لگیں اور بے علمی کو علم گرداننے لگیں۔ اس لئے ایسی کسی قوم کا کوئی فرد اگر دین سمجھنے کیلئے پناہ میں آنا چاہتا ہے تو اس کیلئے رعایت ہونی چاہیے اور اس رعایت سے اگر وہ ایمان کی دولت پا گیا تو یہ وہ خوش نصیبی ہے جو ایمان قبول کرنے والے کیلئے تو سرمایۂ آخرت ہے ہی اس کا

Marfat.com

ذریعہ بننے والے کیلئے بھی انتہائی خوش بختی کا باعث ہے۔اس سے علماء نے یہ بات سمجھی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم یا گمراہ مسلمان علماء سے دین کو سمجھنے کیلئے درخواست کرے تو علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے زیادہ سے زیادہ امکانات مہیا کریں۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ
اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ
الْمُتَّقِيْنَ ﴿٧﴾ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ
اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَ
اَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٨﴾ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا
عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩﴾ لَا يَرْقُبُوْنَ
فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ﴿١٠﴾ فَاِنْ
تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ
وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿١١﴾ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ
اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ﴿١٢﴾ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا
نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ
مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣﴾
قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ

Marfat.com

يَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ
وَيَتُوبُ اللَّهُ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٥﴾ أَمْ
حَسِبْتُمْ أَن تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ
وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِن دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ
وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾

کیسے رہ سکتا ہے مشرکین سے کوئی معاہدہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک؟ ہاں! جن سے تم نے مسجدِ حرام کے پاس معاہدہ کیا تو جب تک وہ قائم رہیں تم بھی قائم رہو، بیشک اللہ ایفائے عہد کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ کس طرح مشرکین سے معاہدہ رہ سکتا ہے اس حال میں کہ اگر وہ تم پر غالب آجائیں تو نہ لحاظ کریں کسی قرابت کا نہ عہد کا وہ خوش کرتے ہیں تمہیں اپنی باتوں سے اور ان کے دل انکار کر رہے ہوتے ہیں اور ان کی اکثریت بدعہد اور بدقماش ہے۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے عوض میں ایک نہایت حقیر قیمت اختیار کرلی اور اس طرح وہ اللہ کی راہ سے رک گئے، بیشک بہت برا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ وہ لحاظ نہیں کرتے کسی مومن کے بارے میں کسی قرابت کا اور نہ کسی عہد کا، یہی لوگ ہیں جو حدود کو توڑنے والے ہیں۔ پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور ہم آیات کی تفصیل بیان کر رہے ہیں ان لوگوں کیلئے جو جاننا چاہیں۔ اگر یہ توڑ دیں اپنے قول و قرار کو عہد کر چکنے کے بعد اور تمہارے دین کے بارے میں طعن کریں تو تم کفر کے ان سرخیلوں سے لڑو ان کے کسی قول و قرار کا کوئی وزن نہیں تاکہ یہ اپنی حرکتوں سے رک جائیں۔ کیا تم ایسے لوگوں سے لڑو گے جنہوں نے اپنے قول و قرار توڑ دیئے اور انہوں نے رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا اور وہی ہیں جنہوں نے تم سے جنگ چھیڑنے میں پہل کی کیا تم ان سے ڈرتے ہو اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔ تم ان سے لڑو اللہ تمہارے ہاتھوں سے انہیں سزا دے گا اور ان کو رسوا کرے گا تم کو ان پر غلبہ دے گا اور اہلِ ایمان کے ایک گروہ کے سینوں کو شفا دے گا۔ اور دور کر دے گا ان کے دلوں کے غیض و غضب کو اور توبہ کی توفیق دے گا جن کو چاہے گا اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو چھانٹا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیے اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ (۷ تا ۱۶) (رکوع: ۲)

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللَّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ٥ كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ ٥ ﴿التوبة: ۷، ۸﴾

Marfat.com

کیسے رہ سکتا ہے مشرکین سے کوئی معاہدہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک؟ ہاں! جن سے تم نے مسجدِ حرام کے پاس معاہدہ کیا تو جب تک وہ قائم رہیں تم بھی قائم رہو، بیشک اللہ ایفائے عہد کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (۷) کس طرح مشرکین سے معاہدہ رہ سکتا ہے اس حال میں کہ اگر وہ تم پر غالب آ جائیں تو نہ لحاظ کریں کسی قرابت کا نہ عہد کا وہ خوش کرتے ہیں تمہیں اپنی باتوں سے اور ان کے دل انکار کر رہے ہوتے ہیں اور ان کی اکثریت بدعہد اور بدقماش ہے۔)

یہ دونوں آیتیں مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی آیت میں جو بات شروع کی گئی ہے اسے دوسری آیت میں مکمل فرمایا گیا ہے اور پہلی آیت میں اِلَّا کے بعد جملہ معترضہ لایا گیا ہے۔ اس کا تعلق اگرچہ دونوں آیتوں میں بیان کردہ بات سے ہے لیکن وہ ایک حد تک الگ بھی ہے۔ اس کو ذکر کیے بغیر چونکہ یہ بات مکمل نہیں ہو سکتی تھی اس لئے بات روک کر اس کو ذکر فرمایا گیا اور پھر اصل بات کو مکمل کیا گیا ہے۔

دفعِ دخلِ مقدر:

ان دونوں آیتوں میں ایک ایسے اشکال یا سوال کا جواب دیا جا رہا ہے جو ممکن ہے زبانوں تک بھی آیا ہو دلوں میں تو بہت سے لوگوں کے مچل رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اسلام تو عہد کی پاسداری کی بے حد تاکید کرتا ہے اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ مشرکین سے معاہدوں کی پابندی فرمائی اور مزید یہ کہ اسلام دراصل ایک دعوتِ فکر ہے وہ بنیادی طور پر دلوں میں انقلاب برپا کرتا ہے، اس کے نتیجے میں خود بخود باہر بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ یہ یکا یک کیا تبدیلی آئی ہے کہ تمام معاہدوں کو توڑنے کا اعلان کر دیا گیا ہے اور مشرکین کو دعوت دینے کی بجائے ان سے بیزاری کا اظہار کیا جا رہا ہے اور قوت اور طاقت سے جو لوگ اسلام کی آغوش میں آنے کیلئے تیار نہیں ہیں، انہیں ختم کیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں ایک بات تو وہ جو دونوں آیتوں میں فرمائی گئی ہے اور دوسری بات وہ ہے جسے جملہ معترضہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ جملہ معترضہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تم کہتے ہو اسلام نے معاہدات کے ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے حالانکہ اسلام نے ان معاہدات کو ختم کرنے اور ان لوگوں سے ترکِ تعلق کا اعلان کیا ہے جو بار بار نقضِ عہد کا ارتکاب کرتے رہے۔ وہ معاہدہ، ایفائے عہد کے جذبے سے نہیں کرتے تھے بلکہ محض وقت گزاری یا مسلمانوں کو دھوکہ دینے کیلئے۔ اب چونکہ اسلامی انقلاب اپنی تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے، تو ان لوگوں سے معاہدات باقی رکھنا جو جانتے ہی نہیں وفا کیا ہے، ضیاعِ وقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ البتہ! وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک معاہدے نہیں توڑے اور انہوں نے دشمن سے بھی ساز باز نہیں کی، ان کے بارے میں صاف حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں سے تم نے مسجدِ حرام کے پاس معاہدہ کیا تھا اور انہوں نے ابھی تک اسے توڑا نہیں تم بھی ان معاہدوں کی پابندی کرو۔ جب تک وہ قائم رہیں تم بھی قائم رہو۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اس سے مراد معاہدہ حدیبیہ ہے جو چھ (۶) ہجری میں مسلمانوں اور قریشِ مکہ کے درمیان ہوا اور یہ آیت معلوم ہوتی ہے اسی زمانے میں نازل ہوئی تھی اور مضمون کی مناسبت سے اسے ان آیات میں شامل کر دیا گیا ہے۔ بعض دوسرے اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ یہ آیت اسی سلسلۂ آیات کی ہے اور اس سے مراد وہ معاہدہ ہے جو بنی کنانہ اور بنی خزاعہ اور بنی ضمرہ اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا اور یہ معاہدہ ابھی تک چل رہا تھا۔ معاہدہ حدیبیہ ختم ہو جانے کے بعد تو مکہ فتح ہو گیا لیکن ان قبائل کے ساتھ یہ معاہدات باقی رہے۔ یہاں انہیں معاہدات کی پابندی کو باقی رکھنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ حکم کو مؤکد کرنے کیلئے فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نقضِ عہد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اللہ کے پسند نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انہیں سزا دیتا ہے اور ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ تقویٰ کا لفظ جس طرح حقوق و فرائض کی پاسداری کیلئے بولا جاتا ہے، اسی طرح نقضِ عہد سے بچنے کیلئے بھی بولا جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ مشرکوں سے معاہدے توڑنے کا اعلان کیوں کیا گیا ہے تو اس کی وجہ دو (۲) ہیں۔

معاہدہ توڑنے کی دو وجہ:

پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا کوئی رسول جب بھی انسانوں کی طرف ہدایت کیلئے بھیجا جاتا ہے تو وہ اس وقت تک تبلیغ و دعوت سے کام لیتا ہے تا آنکہ یا تو لوگ مسلمان ہو جائیں اور یا ان پر اتمامِ حجت ہو جائے۔ ان کے انکار کی صورت میں اور اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد اللہ کے رسول کو ہجرت کا حکم

Marfat.com

ہوتا ہے اور کافروں پر اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے سالہا سال تک تبلیغ و دعوت کا کام کیا۔ تمام ممکن ذرائع بروئے کار لائے۔ اللہ نے برکت عطا فرمائی اور آپ کے لئے کامیابی کے راستے کھلتے گئے۔ بالآخر جزیرۂ عرب میں ایک وقت آیا کہ مکمل اسلامی غلبے کا امکان پیدا ہوگیا۔ عرب کی اکثریت پر اتمام حجت ہوگیا اور اگر کہیں اس کا امکان باقی رہا کہ شاید ان تک دعوت نہ پہنچی ہو یا اسے وہ سمجھ نہ پائے ہوں تو انہیں چار مہینے کی مہلت دی گئی اور جن سے ابھی معاہدے باقی تھے انہیں مدتِ معاہدہ تک آسانیاں دی گئیں۔ ایسی صورتحال میں چار مہینے مدت گزرنے کے بعد مزید مہلت دینا یا معاہدات کرنے کی کوشش کرنا بلاوجہ اسلامی انقلاب اور غلبۂ دین میں تاخیر کرنے کے مترادف ہوتا جبکہ مقصود غلبۂ دین کے سوا کچھ نہیں اور جس سے اس مقصد کی بجا آوری میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو ظاہر ہے کہ اس کے باقی رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مشرکین کا اپنا رویہ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ مسلمان کوئی باہر سے آئی ہوئی قوم نہیں بلکہ اسی سرزمین پر رہنے والے اور انہیں بستیوں کے باسی ہیں۔ مشرکین سے ان کی خاندانی نسبتیں اور قرابت کے رشتے ہیں۔ ہر مسلمان کسی نہ کسی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور مہاجرین کی اکثریت تو قریش کے قبیلے سے وابستہ ہے اور جن کے ساتھ رشتۂ قرابت نہیں ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی سیاسی رشتہ ہے جو معاہدات کی صورت میں پیدا ہوا ہے اور یہ بات جانی پہچانی ہے کہ دنیا میں رشتے دو ہی قسم کے ہیں ایک تو وہ رشتہ جو رحمی قرابت سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے ننھیال اور ددھیال وجود میں آتے ہیں اور دوسرا وہ رشتہ جو سیاسی معاہدوں کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ مشرکینِ عرب کے دونوں رشتے مسلمانوں سے قائم تھے۔ اس آیتِ کریمہ میں قرابت کے رشتے کو اِلًّا سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے رشتے کو ذِمَّۃً سے یاد کیا گیا ہے۔ مشرکین نے اسلام دشمنی میں ان دونوں رشتوں کو ہمیشہ پامال کیا۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا کہ مشرکین سے کس طرح معاہدات کئے جاسکتے ہیں یا کس طرح انہیں باقی رکھا جاسکتا ہے؟ جبکہ انہوں نے ان دونوں رشتوں کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ جب بھی ان کو موقع ملا ہے انہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ حدیبیہ میں جو معاہدہ ہوا دوسرے ہی سال جس طرح اس کے پرزے اڑائے گئے تاریخ کا ہر طالب علم اسے جانتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنوبکر قریش کے۔ رات کی تاریکی میں بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کیا اور قریش کے نوجوانوں نے نقاب پہن کر ان کا ساتھ دیا اور انہیں اس حملے کیلئے ہتھیار مہیا کئے۔ بنوخزاعہ جان بچانے کیلئے حرم میں گھسے انہیں وہاں بھی زندہ نہ چھوڑا گیا اور جہاں تک قرابت کے رشتوں کا سوال ہے سیرت کا طالب علم شعب ابی طالب کو کیسے بھول سکتا ہے جس میں مسلمان محض اپنی جان بچانے کیلئے محصور ہوئے۔ تین سال تک حج کے دنوں کے علاوہ کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ باہر سے آئے ہوئے کسی قافلۂ تجارت سے اگر مسلمان غلہ خریدنے کی کوشش کرتے تو قریش ہر قبیلے پر پابندی لگا دیتے کہ آپ مسلمانوں کو کوئی چیز بیچنے کے مجاز نہیں ہیں اور اگر آپ کو یہ خیال ہو کہ یہ چیز بکے بغیر رہ جائے گی تو ہم اسے خریدنے کی ضمانت دیتے ہیں۔ مسلمانوں نے ان دنوں درختوں کے پتے اور ٹہنیاں کھائیں۔ کوئی چمڑہ انہیں مل جاتا اسے توے پر بھون کر کھا جاتے۔ بچوں کے رونے کی آوازیں انہیں باہر سنائی دیتیں لیکن ان ظالموں کے دل کبھی نہ پسیجتے۔ ایسے لوگوں سے معاملات کے باقی رکھنے کا کیا امکان ہوسکتا ہے۔ اسلام اب چونکہ ایک غالب قوت ہے اور اب اسے پہلی فرصت میں جزیرۂ عرب کو مکمل طور پر مرکزِ اسلام میں تبدیل کرنا ہے۔ اس لئے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ راستے کے ان کانٹوں سے دامن چھڑا کر منزل کی طرف بڑھا جائے اور ان کی سخن سازیوں کی حقیقت سمجھ کر ان کے قلبی ارادوں اور نیتوں کے فسادات کو جان کر اور یکسو ہو کر آخری اقدام کر ڈالا جائے اور اس بات کا ادراک کرلیا جائے کہ ان کی قطعی اکثریت وعدہ خلاف اور سیرت و کردار سے تہی دامن لوگوں پر مشتمل ہے۔

فاسق قرآنِ کریم کی زبان میں ایسے ہی لوگوں کو کہا جاتا ہے جو ہر شرافت کو چھوڑ چکے اور ہر سچائی سے منہ موڑ چکے ہوں۔ اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنے میں انہیں کوئی باک نہ ہو۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴿التوبۃ : 9﴾

(انہوں نے اللہ کی آیات کے عوض میں ایک نہایت حقیر قیمت اختیار کرلی اور اس طرح وہ اللہ کی راہ سے رک گئے، بیشک بہت برا ہے جو کچھ وہ کررہے ہیں۔)

Marfat.com

متذکرہ خرابیوں کا سبب:

متذکرہ بالا خرابیاں ان کے اندر اس لئے راہ پا گئی ہیں اور اب وہ مستقل طور پر ان کے اخلاق کا حصہ ہیں کیونکہ انہوں نے دین کے بدلے میں دنیا کو اپنا محبوب اور مقصود بنالیا ہے اللہ کے رسول ان کی طرف زندگی بخش پیغام لے کر آئے لیکن یہ اس پر کان دھرنے کی بجائے زندگی کے نفع ونقصان کے خیالات میں کھوئے رہے۔ وہ دنیا اور دنیوی دولت کو ایک حقیقت سمجھتے ہیں اور اس کے مقابلے میں ہر معنوی، روحانی اور اخروی قدر وعظمت کو ایک افسانہ سمجھتے ہیں۔ انہیں چونکہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا یقین نہیں اور کسی جواب دہی کا اندیشہ نہیں اس لئے ان کے نفس کے تقاضے ایسے بے لگام ہو گئے ہیں کہ وہ ان سے دنیا اور دولتِ دنیا کے حصول کیلئے ہر غلط سے غلط اور ہر برے سے برا کام کرانے کیلئے آمادہ رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک وحیِ الٰہی محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ دنیا ان کے نزدیک ایک نیلام گھر ہے جس میں ہر چیز پیسے سے خریدی جاسکتی ہے۔ وہ اللہ کی آیات کو بھی خرید وفروخت کی چیز سمجھتے ہیں۔ دنیا کے بارے میں ان کے ان تصورات نے ان کی سوچ کو اس نہج پر ڈال دیا ہے کہ ان کا کوئی قدم اللہ کے راستے کی طرف اٹھنے کیلئے تیار نہیں بہت برا ہے وہ رویہ جس کو یہ اختیار کر چکے ہیں۔ اس رویے سے کسی خیر کی امید رکھنا خود فریبی ہے ایسے لوگوں کے ساتھ ہر سوچنے والا آدمی فیصلہ کر سکتا ہے کہ اللہ اور رسول کا کوئی عہد کیسے رہ سکتا ہے۔

لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ o فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ o ﴿التوبة : ۱۰، ۱۱﴾

وہ لحاظ نہیں کرتے کسی مومن کے بارے میں کسی قرابت کا اور نہ کسی عہد کا، یہی لوگ ہیں جو حدود کو توڑنے والے ہیں۔ (۱۰) پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور ہم آیات کی تفصیل بیان کر رہے ہیں ان لوگوں کیلئے جو جاننا چاہیں۔ (۱۱)

انفرادی زندگی میں بھی مسلمان دشمنی:

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ان کی اجتماعی زندگی کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ ان کی اجتماعی سوچ مسلمانوں کے خلاف ہے اور اجتماعی سوچ میں وہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ انفرادی زندگی میں بھی ان کا حال یہ ہے کہ کوئی بھی ایسا شخص جوان سے کیسی ہی قرابت کیوں نہ رکھتا ہو اور اس کے ساتھ چاہے کتنے ہی معاہدات ہوں اگر وہ صاحب ایمان ہے تو محض ایمان لانے کے جرم میں یہ نہ تو اس کی قرابت کی پرواہ کرتے ہیں اور نہ اس سے معاہدے کا پاس کرتے ہیں ان کے نزدیک اگر کوئی جرم ناقابلِ معافی ہے تو وہ ایمان لانا ہے۔ ایمان لانے والا ان کا چاہے بیٹا کیوں نہ ہو محبت اور شفقت کے تمام جذبات اس کے لئے ممنوع قرار پاتے ہیں۔ جب حدیبیہ کا معاہدہ لکھا جا رہا تھا اور یہ شق بھی لکھی جاچکی تھی کہ جو شخص مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ منورہ جائے گا مسلمان اسے واپس کافروں میں مکہ معظمہ بھیجنے کے پابند ہوں گے لیکن اگر مدینہ سے کوئی شخص مرتد ہو کر مکہ معظمہ آجائے تو قریش اسے بھیجنے کے پابند نہیں ہوں گے۔ یہ سراسر یک طرفہ فیصلہ تھا۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اسے بھی قبول فرمالیا۔ عین اس وقت قریش کا سفیر سہیل ابن عمرو کا بیٹا ابو جندل بیڑیاں کھنکھناتا ہوا افتاں وخیزاں مسلمانوں کے پاس پہنچ گیا اور مسلمانوں کو اپنے زخم دکھائے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس پر بہت تشدد کیا گیا ہے۔ سہیل نے کہا کہ ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ آپ کسی مسلمان کو پناہ نہیں دیں گے اس لئے یہ میرا بیٹا اگرچہ مسلمان ہو چکا ہے لیکن آپ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابھی معاہدہ پورا نہیں ہوا۔ اس لئے ابھی اس کی پابندی لازم نہیں۔ سہیل نے کہا اگر آپ اس کی پابندی قبول نہیں کرتے تو معاہدہ پھاڑ دیتا ہوں۔ حضور نے یہاں تک فرمایا کہ میں ذاتی طور پر اس لڑکے کیلئے تم سے درخواست کرتا ہوں۔ وہ کسی طرح نہیں مانا حتیٰ کہ اسے مارتا پیٹتا اپنے ساتھ واپس لے گیا۔ ابو جندل اس

Marfat.com

کے بیٹے تھے جو ہر طرح سے باپ کی شفقت کے مستحق تھے۔ لیکن وہ ایمان لانے کا جرم کر چکے تھے اس لئے کفر کی نگاہ میں ان کے تمام رشتے کٹ چکے تھے۔ اس آیت کریمہ میں پروردگار یہی بات فرما رہے ہیں کہ انہیں مسلمانوں کے ایک ایک فرد سے ایسی دشمنی ہے کہ جس نے انہیں بالکل اندھا کر دیا ہے، باپ کو باپ ہونا یاد نہیں اور بیٹے کو بیٹا ہونا۔ انہوں نے اپنے رویے سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ انسانیت کی ہر حد کو پھلانگ چکے ہیں۔ اعتراض کرنے والے بتائیں کہ جن لوگوں کا تاریخی پس منظر یہ ہو جن کا ذہنی سانچہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلام دشمنی میں ڈھل چکا ہو جنہیں انسانیت کی ایک ایک قدر سے دشمنی ہو ان سے معاہدے کرنا چہ معنی دارد؟

دشمنی کے باوجود اللہ کی رحمت کا فیضان:

اس کے باوجود اللہ کی رحمت کی آغوش اسقدر وسیع ہے کہ اسے دیکھتے ہوئے آدمی حیرت میں ڈوب جاتا ہے بالآخر اسے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر یہ دین کسی انسان کا بنایا ہوا ہوتا تو اس میں رحمت و محبت کی یہ برکھا کبھی برستی دکھائی نہ دیتی۔ اس میں جذبات کا یہ توازن کبھی ممکن نہ ہوتا۔ جس کا اظہار اگلی آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ اپنی ساری اسلام دشمنی اور عقربی فطرت کے باوجود اگر یہ لوگ توبہ کر لیں۔ توبہ کا معنی ہوتا ہے لوٹنا یعنی یہ کفر سے اسلام کی طرف لوٹ آئیں اسلام انسان کا اپنا گھر ہے اور باقی تمام ازم اور راستے اس کے بگاڑ کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے جب کوئی شخص بگاڑ کے ان راستوں سے پلٹ کر اسلام کی طرف آتا ہے تو یوں سمجھئے کہ وہ اپنے گھر اور اپنی ماں کی آغوش میں آ جاتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اگر وہ لوٹ آئیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ یہاں رک کر ذرا غور فرمایئے دنیا میں اللہ کے اولوالعزم رسولوں کے سوا شاید آپ کو کہیں اور یہ مثال نہ مل سکے کہ کسی نے اپنے خون کے پیاسوں، جان کے دشمنوں، اپنے پیاروں کے قاتلوں اور برسہا برس تک اذیت پہنچانے والوں کو صرف ایک کلمہ بولنے کی وجہ سے اس طرح اپنی آغوش میں لیا ہو کہ برسوں سے اس راستے پر چلنے والے قربانیاں دینے والے، زندگیاں کھپانے والے اور ہر طرح کا دکھ اٹھانے والے جس قدر و منزلت اور سلوک کے مستحق ہیں آنیوالے کو بھی اسی سلوک کا مستحق سمجھا جائے۔ جو حقوق و مراعات حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کو اسلامی مملکت میں حاصل ہیں وہی حقوق و مراعات اس کو میسر آ جائیں۔ اس کی عبادات اسی طرح قبول کی جائیں۔ معاشرتی زندگی میں اس کو وہی احترام ملے۔ معاشی راستے اس کیلئے بھی ویسے ہی کھلے ہوں یہ بھی اگر شہادت کے خلعتِ فاخرہ سے نوازا جائے تو جنت کے راستے اس کیلئے بھی کھل جائیں۔ خونی رشتے اس کے سامنے ماند پڑ جائیں۔ حضرت مصعب بن عمیر ؓ جنگِ بدر کے قیدیوں کو دیکھنے کیلئے نکلے تو آپ نے دیکھا کہ ایک گھر میں ایک انصاری جن قیدیوں کو باندھ رہا ہے ان میں ان کا بھائی بھی ہے آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ انصاری بھائی اس کو کس کر باندھنا تاکہ یہ بھاگ نہ جائے۔ بھائی نے یہ بات سنی تو آنکھوں میں آنسو آ گئے رو کر کہا کہ مصعب! مجھے یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ تمہارا خون اس قدر سفید ہو گیا ہے۔ تم بجائے میری سفارش کرنے کے مجھے کس کر باندھنے کی ترغیب دے رہے ہو۔ حضرت مصعب نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ تم میرے بھائی نہیں ہو، میرا بھائی وہ ہے جو تمہیں باندھ رہا ہے۔ یہ وہ اسلامی اخوت ہے جو خونی رشتوں پر غالب آ جاتی ہے۔ یہی وہ اخوت ہے، جس کی یہاں ترغیب دی جا رہی ہے کہ ان لوگوں نے اگرچہ اکیس (۲۱) سال تک تم پر خوفناک مظالم توڑے ہیں دیکھنا انہیں دیکھ کر تمہارے زخم سلگنے نہ لگیں۔ تم آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرو، یہ اپنی منزل سے بچھڑے ہوئے لوگ ہیں جو اب پلٹ آئے ہیں تو تمہاری توجہ اور محبت کے مستحق ہیں۔ اللہ کے اسی حکم کا نتیجہ تھا کہ جن کے جرائم بظاہر نا قابلِ معافی تھے انہیں بھی آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے نہ صرف قبول کیا بلکہ ہر طرح کے حصولِ مراتب کے دروازے ان کیلئے کھول دیئے۔ حضرت وحشی ؓ جو حضرت حمزہ ؓ کے قاتل ہیں۔ ان کے جرم کی شدت کو کون بھول سکتا تھا۔ لیکن انہیں بھی معاف کر دیا گیا۔ ہند جس نے حضرت حمزہ ؓ کی نعش مبارک کو مثلہ کیا، آپ کا بند بند کاٹا وہ ایمان قبول کرنے کیلئے حاضر ہوئیں آپ نے پوچھنا بھی پسند نہ فرمایا۔ ابوسفیان جو بار بار لشکر کشی کرتے رہے ان کا نہ صرف ایمان قبول کیا گیا بلکہ انہیں عزت بھی بخشی گئی۔ اسلامی ریاست میں کبھی کسی مسلمان نے دوسرے مسلمان کو یہ طعنہ نہیں دیا تھا کہ تم تو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ کے یہاں مقام و مرتبہ میں بعد میں ایمان لانے والے سابقین کے برابر نہیں ہو سکتے۔ لیکن دنیا میں حقوق و مراعات کے لحاظ سے اسلام نے کسی فرق کی گنجائش نہیں رکھی۔

Marfat.com

اسلام سے وفاداری کیلئے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی:

یہ بھی یاد رہے کہ اخوتِ دینی میں شامل ہونے کیلئے صرف توبہ کافی نہیں تمام فرائض کی پابندی ضروری ہے۔ لیکن اظہارِ وفاداری کیلئے سب سے پہلے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی ضروری ٹھہرائی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز، نماز کا وقت آتے ہی فرض ہو جاتی ہے۔ آدمی کسی وقت بھی اسلام قبول کرے سب سے پہلے نماز ہی کے فرض سے اس کا واسطہ پڑے گا اور مزید یہ بات بھی کہ اسلام کی بنیاد اللہ کی عظمت اور اس کی کبریائی کے سامنے جھکنے پر ہے اور اسلامی زندگی کی پہچان اللہ اور رسول کے احکام کی اطاعت میں ہے۔ نماز میں ان دونوں باتوں کی طرف سب سے زیادہ توجہ دلائی جاتی ہے۔ آدمی کا ایک ایک عمل ان دونوں باتوں کا عکاس بن جاتا ہے۔ زکوٰۃ مالی معاملات کی پاکیزگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اسی سے حقوق العباد کے شعور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں انسانوں کے درمیان طبقات کو ختم کرنے میں مدد ملتی ہے اور لوگوں کے ساتھ رحم و مروت کے جذبات کو جلا ملتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کی پابندی کو اسلام کی قبولیت کیلئے شرط قرار دیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نے اسی آیت سے استدلال کرتے ہوئے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف قتال پر لوگوں کو مطمئن کیا تھا۔ آیت کے آخر میں فرمایا کہ ہم اللہ کی آیات کو اسی طرح تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہو اور وہ احکامِ خداوندی کو آسانی سے سمجھ سکیں لیکن اس کا فائدہ ان لوگوں کو پہنچتا ہے جو علم رکھتے ہیں یا علم کا شوق رکھتے ہیں۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ۝

(اگر یہ توڑ دیں اپنے قول و قرار کو عہد کر چکنے کے بعد اور تمہارے دین کے بارے میں طعن کریں تو تم کفر کے ان سرغنوں سے لڑو ان کے کسی قول و قرار کا کوئی وزن نہیں تاکہ یہ اپنی حرکتوں سے رک جائیں۔) ﴿التوبۃ : ۱۲﴾

آیت کے دو مصداق اور قتال کا حکم:

اہلِ علم کی ایک رائے کے مطابق یہ آیتِ کریمہ پچھلی آیت کا تسلسل ہے۔ جیسا میں عرض کر چکا ہوں ان کے خیال میں مسجدِ حرام کے پاس جس معاہدے کا ذکر کیا گیا ہے وہ معاہدہ حدیبیہ ہے اور اس کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ جب تک قریش اس پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ اس معاہدے کو توڑ دیں یہ گویا ایک طرح سے پیش گوئی ہے کہ وہ عنقریب معاہدہ توڑ دیں گے کیونکہ ان کے عہد و پیمان اور قسموں کا کوئی اعتبار نہیں اور مسلمانوں کے دین میں نیش زنی کرنے لگیں اور اسلام کا راستہ روکنے کیلئے اپنے معمول کے مطابق کارروائیاں شروع کر دیں تو پھر تم بھی ان آئمہ کفر سے لڑو۔ قریش چونکہ پورے عرب کے قائد تھے سیاسی اور مذہبی طور پر پورے عرب میں ان کا احترام تھا اور لوگ ہمیشہ ان کی قیادت کو قبول کرتے تھے۔ اس لئے انہیں آئمہ کفر کہا گیا۔ مقصود یہ ہے کہ تم قریش سے لڑو جنگ ہی ایک ایسی چیز ہے جو انہیں اپنے مذموم ارادوں سے روک سکتی ہے کیونکہ یہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔ نصیحت سے انہیں نفرت ہے اور عقل سے دشمنی ہے۔ بھیڑیئے کی طرح شیر کا فولادی پنجہ ہی ان کو اپنے مظالم اور بری حرکتوں سے رکنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

دیگر اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ سورت کے آغاز سے مسلسل ایک ہی سلسلۂ مضمون چل رہا ہے۔ مکہ فتح ہو چکا ہے، عرب کی بیشتر قوتیں سرنگوں ہو چکی ہیں۔ البتہ ابھی تک جزیرۂ عرب میں ایسی مخفی قوتیں باقی ہیں جنہوں نے نفاق کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے یا مرکزِ اسلام سے دور ہونے کی وجہ سے وہ اسلام دشمن کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ عرب کے بیشتر لوگ اگرچہ اسلام کی آغوش میں آ چکے ہیں لیکن ان نئے ایمان لانے والوں میں ابھی تک وہ صلابتِ فکر اور ہر طرح کے حالات میں ایمانی استقامت پیدا نہیں ہوئی اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ابھی تک جاہلیتِ قدیمہ کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ انہیں جیسے ہی کسی طرف سے امید کی کوئی کرن دکھائی دی تو مسلمانوں کے خلاف اٹھنے میں تاخیر نہیں کریں گے۔ اس لئے آئندہ جس طرح کے حالات پیش آ سکتے ہیں ان کے خلاف پیشگی تیاری کے طور پر یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اگرچہ بیشتر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے لیکن اس سے یہ اطمینان نہیں

Marfat.com

ہونا چاہئے کہ یہ لوگ اپنے ایمان پر قائم رہیں گے۔ یہ کسی وقت بھی اپنے قول وقرار سے پھر سکتے ہیں۔ ان میں ایسے ایسے آئمہ کفر موجود ہیں جو صرف مناسب حالات کے انتظار میں ہیں۔ مدینہ کے منافقین کے ابو عامر راہب کے واسطے سے قیصر سے بھی روابط ہیں۔ ان میں سے بعض سرحدی حکمرانوں سے امیدیں باندھ چکے ہیں۔ مسلمانوں کو صورتحالات کی سنگینی کو سمجھ کر ہر وقت حالات کا مقابلہ کیلئے تیار رہنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کفر کی طاقتیں جو صدیوں سے عرب میں پاؤں جمائے بیٹھی تھیں وہ آسانی سے مسلمانوں کو پاؤں جمانے نہیں دیں گی۔ ان کے دماغوں سے اس طرح کے خناس نکالنے کیلئے مسلمانوں کی فوجی تیاری ہی کافی ہوسکتی ہے۔ وہ اس وقت تک اپنے ترکش کا ہر تیر آزمانے کی کوشش کریں گے جب تک انہیں یقین نہیں ہوجاتا کہ اب مسلمانوں سے ٹکرانا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اگلی آیتِ کریمہ میں صورتحال کی سنگینی کو مزید واضح کرنے کیلئے کفارِ عرب بالخصوص قریشِ مکہ کی قریبی تاریخ سے استشہاد کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنی تیاریوں میں کوئی کمی نہ آنے دیں۔

ارشاد فرمایا:

اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ o قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ o وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ o

(کیا تم ایسے لوگوں سے نہ لڑو گے جنہوں نے اپنے قول وقرار توڑ دیئے اور انہوں نے رسول کو نکالنے کا ارادہ کیا اور وہی ہیں جنہوں نے تم سے جنگ چھیڑنے میں پہل کی کیا تم ان سے ڈرتے ہو اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم واقعی مومن ہو۔ (۱۳) تم ان سے لڑو اللہ تمہارے ہاتھوں سے انہیں سزا دے گا اور ان کو رسوا کرے گا تم کو ان پر غلبہ دے گا اور اہلِ ایمان کے ایک گروہ کے سینوں کو شفا دے گا۔ (۱۴) اور دور کردے گا ان کے دلوں کے غیض وغضب کو اور توبہ کی توفیق دے گا جن کو چاہے گا اللہ علم والا حکمت والا ہے۔) ﴿التوبة : ۱۳ تا ۱۵﴾

مسلمانوں کو براہِ راست قتال کا حکم:

اب براہِ راست مسلمانوں سے خطاب کیا جارہا ہے اور حالات کے رخ کا تعین کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ عرب کی مخفی قوتوں نے ایمان قبول کرکے جو عہد و پیمان کا راستہ اختیار کیا تھا اسے چھوڑ دیا ہے۔ منافقین نے اپنے نفاق کا گھونگھٹ الٹ دیا ہے۔ وہ دبے دبے طریقے سے مسلمانوں کیلئے کھائیاں کھود رہے ہیں تاکہ اسلامی انقلاب آگے نہ بڑھنے پائے۔ حالات کی سطح پر اگرچہ سکون نظر آتا تھا لیکن اس کی تہہ میں سازشوں کے جو بھنور اٹھ رہے تھے انہیں خطرناک صورت اختیار کرنے سے روکنے کیلئے یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ہر آنے والے خطرے سے ٹکرانے کیلئے پوری طرح تیار کرلیا جائے۔ آندھی چلنے کے بعد شیرازے کو باندھنا بعض دفعہ ممکن نہیں رہتا لیکن جن کی نگاہیں شفق کے بدلتے ہوئے رنگوں کو پہچانتی ہیں وہ آندھی اٹھنے سے پہلے شیرازہ بندی کرلیتے ہیں۔ حالات کے تیور سمجھنے کیلئے چند باتوں کا جان لینا شاید کفایت کرے گا۔

۱۔ سورۂ توبہ کی ابتدائی آیات کے ذریعے تمام مشرک قبائل کو بیک وقت معاہدات کی منسوخی کا چیلنج دے دیا گیا۔ رسومِ جاہلیت یکسر بند کردیئے گئے مشرکین کو اپنی عقیدتوں کے مرکز خانہ کعبہ کے قریب آنے سے سختی سے منع کردیا گیا۔ اس طرح سے ان کے حج پر پابندی لگادی گئی۔ یہ وہ اقدامات تھے جس نے مشرکینِ عرب کو تو مشتعل کرنا ہی تھا نئے ایمان لانے والے بھی اس کی ضرب کو محسوس کررہے تھے۔

۲۔ مشرکین کے لئے حج پر پابندی کا مطلب صرف یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی مذہبی رسم بجا نہیں لاسکیں گے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ ان کی معاشی حیثیت کو بھی ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا کیونکہ ان کی معاشی استواری کا بہت حد تک انحصار حج کے دنوں میں آمد و رفت کی

Marfat.com

آزادی اور وہاں تجارتی منڈیوں اور بازاروں کا انعقاد تھا جس سے وہ اپنی سال بھر کی ضرورتوں کا سامان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

۳:۔ مشرکینِ عرب سے براءت کے اعلان کا مطلب یہ تھا کہ یا تو وہ اسلام قبول کریں ورنہ قتل کیلئے تیار ہو جائیں یا ملک چھوڑ دیں۔ مشکل یہ تھی کہ جو لوگ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ ان کی قرابت داریاں اور تعلقات مشرکین کے ساتھ قائم تھے اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے مفادات قدیم نظامِ جاہلی کے مناصب سے وابستہ تھے۔ براءت کے اس اعلان نے انہیں ایک امتحان میں ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ جزیرۂ عرب کو ہر شرک اور کافر سے خالی کر دینا چاہتا تھا۔ اس کیلئے اگر تصادم کی نوبت آ گئی تو نئے مسلمانوں کو بھی اپنے عزیزوں اور قرابتداروں سے لڑائی لڑنا پڑے گی۔ یہ ایک ایسا سخت امتحان تھا جس نے نئے مسلمان ہونے والوں کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا تھا۔

ان تین نکات پر غور کر کے دیکھ لیجئے حالات کا جو نقشہ ان سے ابھرتا ہے اس میں مسلمانوں کیلئے خطرات ہی خطرات ہیں۔ پروردگار ان خطرات سے ہراساں ہونے کی بجائے مسلمانوں کو ان پر غالب آ جانے کی تلقین کر رہا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس طرح کے حالات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اس طرح کے حالات پیش نہیں آئے اور مسلمانوں کو پورے جزیرۂ عرب پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کیلئے کسی بڑی آویزش سے گزرنا نہیں پڑا۔ لیکن جو بھی حقیقت کی نگاہ رکھتا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ان حالات کے پیدا نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا امکان نہیں تھا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی بروقت تیاری اور ان کے بے پناہ جذبۂ ایثار و سرفروشی نے ہر اٹھنے والی طاقت کا اٹھنے سے پہلے سراسیمہ کر دیا اور انہوں نے پہلے سے اپنے انجام کا اندازہ کر لیا اور اگر مسلمان بروقت تیاری نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ انہیں آنے والے خطرات سے عہدہ برآ ہونے کا حکم نہ دیتے تو فتنۂ ارتداد کا جو طوفان ڈیڑھ سال بعد حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت میں اٹھا اور جس نے پوری اسلامی ریاست کو ہلا کر رکھ دیا وہ طوفان اس سے پہلے بھی اٹھ سکتا تھا اور ڈیڑھ سال بعد اٹھنے والے طوفان پر بھی مسلمانوں نے اس لئے قابو پا لیا کہ وہ پہلے سے اس کیلئے تیار تھے۔

ان آیات میں مسلمانوں کو جس طرح تمام خطرات سے ٹکرانے کا حکم دیا گیا ہے اس میں ان کیلئے جذبات کی ایسی کمک بھی پہنچائی گئی ہے جس میں بیک وقت عقل اور جذبہ گندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ تم ان لوگوں سے کیسے نہیں لڑو گے جن کے نزدیک ایمان کے عہد و پیمان کی کوئی قیمت نہیں۔ جن کی مجرمانہ تاریخ کا عالم یہ ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو اپنے شہر سے نکلنے پر مجبور کیا اور اس کیلئے تمام اقدامات کئے اور یہ اتنا بڑا جرم تھا جس کے نتیجے میں اس خطے پر عذاب آ سکتا تھا کیونکہ رسول کے ہجرت کر جانے کے بعد اس کی امتِ دعوت غیر محفوظ ہو جاتی ہے اور مستقلاً عذاب کی زد میں رہتی ہے۔ پھر ہجرت کے بعد بھی انہوں نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو آرام سے بیٹھنے نہیں دیا بلکہ لڑائی کی ابتدا ان کی طرف سے ہوئی۔ اب جبکہ اسلامی انقلاب ثمر آور ہونے کو ہے اور اسلامی دعوت برگ و بار پیدا کر رہی ہے اور کامیابیاں راہ دیکھ رہی ہیں تو تم کفر کی قوتوں سے ڈرو گے۔ معلوم ہوتا ہے یہ خطاب منافقین سے ہے یا نئے مسلمانوں سے ہے کہ تمہیں ڈرنا ہے تو صرف اللہ سے ڈرو۔ مسلمان اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ تم جب اس کے بھروسے پر آگے بڑھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہارے ہاتھوں سے کافروں کو سزا دے گا اور انہیں رسوا کرے گا اور مسلمانوں میں سے کتنے ایسے لوگ ہیں جو آج تک ان کے زخم سہلا رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے سینوں میں فتح و نصرت اور بشارت کی ٹھنڈک عطا فرمائے گا۔ ان کے دلوں کی آگ کو ٹھنڈا کرے گا ان کی آتشِ غضب کو سرد کرے گا۔

روشنی کا دریچہ:

وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ فرما کر حالات کے بالکل برعکس روشنی کا ایک دریچہ بھی کھولا کہ حالات جس طرف اشارہ کر رہے ہیں، اس کا مقابلہ کرنے کیلئے تو مسلمانوں کو تیار رہنا چاہئے۔ لیکن ساتھ ہی اس امکان کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہئے کہ بہت سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمائے گا۔ لیکن اسے نمایاں طور پر بیان نہیں کیا گیا۔ ریکارڈ کا حصہ ضرور بنایا گیا لیکن نمایاں کرنے سے اس لئے احتیاط کی گئی تا کہ مسلمانوں کی تیاری پر اس کا اثر نہ پڑے۔ چنانچہ مسلمانوں کی تیاری نے ایک طرف تمام خطرات کے سامنے بند باندھ دیئے اور دوسری طرف اللہ کی رحمت اور اس کی توفیق نے لوگوں کے دلوں پر اثر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نو اور دس ہجری میں ملک کے گوشے گوشے سے اسلام قبول کرنے کے لئے وفد پر وفد آنحضرت ﷺ

Marfat.com

کی خدمت میں پہنچے۔ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہ گیا جہاں سے اسلام کی قبولیت کیلئے ایک معتد بہ تعداد مدینہ نہ پہنچی ہو۔ قرآن کریم نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ "تو لوگوں کو دیکھتا ہے کہ وہ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں"

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴿التوبة : ١٦﴾

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو چھانٹا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کئے اور اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔(١٦)

ایمان کی آزمائش سنت اللہ ہے:

اس آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن نئے ایمان لانے والوں کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ فتح مکہ کے بعد یا جنگِ تبوک کے بعد مسلمان ہوئے ہیں انہیں بظاہر اسلام قبول کرنے کے بعد کسی بڑی قربانی سے واسطہ نہیں پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کے رویے کو بدل کر اسلامی زندگی اختیار کی۔ شرک اور کفر سے تائب ہو کر توحید اور خدا پرستی کو اپنا راہنما بنایا لیکن چونکہ ملک میں لادینی قوتیں سرنگوں ہو چکی تھیں اس لئے انہیں کسی تصادم سے نہیں گزرنا پڑا۔ انہیں کسی ہجرت سے واسطہ نہیں پڑا۔ انہیں اسلام کی کوئی قیمت ادا کرنا نہیں پڑی۔ اس لئے وہ تو ٹھنڈے ٹھنڈے اسلام میں آئے اور اسلام کی جیتی ہوئی بازی سے محظوظ ہونے لگے۔ لیکن پروردگار فرما رہے ہیں کہ تم یہ گمان مت کرو کہ تم بغیر کسی آزمائش کے چھوڑ دیئے جاؤ گے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب بھی کوئی اس کا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ اس کو آزمائے بغیر نہیں رہتا۔ وہ آزمائش کی کٹھالی میں ڈال کر کھوٹ الگ کر دیتا ہے اور خالص سونا الگ ہو جاتا ہے۔ اللہ سے تعلق تو دنیا اور آخرت کا سب سے بڑا رشتہ ہے جس کی قیمت اور عظمت کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ انسانوں کے درمیان وہ رشتہ جسے محبت کا نام دیا جاتا ہے وہ بھی آزمائش سے گزرے بغیر معتبر نہیں ٹھہرتا محبوب کو کبھی یقین نہیں آتا کہ میرا چاہنے والا واقعی میرا ہے کسی اور کا نہیں اس لئے ہر جگہ محبت کو آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے:

محبت کے مقدر میں کہاں آرام اے ہمدم !
کہیں شعلہ کہیں بجلی کہیں سیماب ہوتی ہے

یہاں بھی اسی سنتِ الٰہی کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ نئے نئے مسلمان ہونے والے ابھی تک کسی آزمائش سے نہیں گزرے لیکن ان کا ایمان اس وقت معتبر ٹھہرے گا جب وہ یہ ثابت کر دیں گے کہ وہ اللہ کے راستے میں جہد و عمل کی ہر صعوبت اٹھانے کیلئے تیار ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول اور اس کے دین سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں۔ وہی ایک مومن کی ضرورت اور وہی اس کا ہدف اور منزل ہے۔ اس وقت جو امتحان پیش نظر ہے وہ یہ ہے جو لوگ کفر سے نکل کر دائرۂ اسلام میں آئے ہیں ان کا یقیناً کسی نہ کسی قبیلے اور برادری سے تعلق ہوگا کوئی نہ کوئی ان کا حلقۂ احباب ہوگا۔ ان کے معاشی اور سماجی روابط ہوں گے۔ ایک مومن کو اپنے ایمان کے ثبوت کیلئے یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ میرے تمام تعلقات اللہ اور اس کے رسول کے تعلقات کے سامنے کالعدم ہیں۔ جو تعلق اور رشتہ بھی اللہ سے تعلق میں حائل ہوگا میں اس تعلق کو ختم کر دوں گا۔ میری اصل برادری مسلمان ہیں میں مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی برادری یا کسی دوسرے تعلق کو کبھی اہمیت نہیں دوں گا اگر مسلمانوں کے مفادات اور میری برادری کے مفادات میں تصادم ہوگا تو اسلامی مفادات کی پاسداری کروں گا۔ میں کبھی اللہ اور رسول اور مسلمانوں کے مقابلے میں کسی دوسرے کو ہم راز اور دوست نہیں بناؤں گا۔

اس سے پہلے غالباً سورۂ نساء میں بطانۃ کا لفظ گزر چکا ہے۔ ولیجۃ اور بطانۃ ایک ہی معنی کے حامل ہیں۔ تعلقات کو اسلام یا مسلمانوں کی قیمت پر غیر مسلموں سے قائم رکھنا ایک ایسا شر ہے جس نے ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر یہ بات کھول

Marfat.com

بیان کی ہے کہ جو شخص غیر مسلموں کو امتِ مسلمہ کے راز پہنچاتا ہے، ان کے تہذیب وتمدن کو اپنے تہذیب وتمدن پر فوقیت دیتا ہے، اوران کے مفادات کو مسلمانوں کے مفادات پر ترجیح دیتا ہے وہ مسلمانوں میں سے نہیں بلکہ انہیں میں سے ہے، اس کا انجام بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ نئے مسلمان ہونے والوں کے چونکہ ابھی تک تمام تر مختلف قسم کے تعلقات مشرکوں کے ساتھ قائم تھے، ان سے یکسر لاتعلق ہونا اور دل وجان سے اسلام کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کردینا، اپنی قلبی وابستگیوں کو اللہ اور اس کے رسول کی نذر کردینا، ایک ایسی آزمائش ہے جس میں انہیں مبتلا کیا گیا۔ مخلص مسلمان اس میں سے سرخرو ہو کر نکلے اور جن کے ایمان میں کھوٹ تھا وہ ناکام ہوگئے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ

اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ
اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا
يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ
اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ
اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ
مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۙ ﴿۲۱﴾ خٰلِدِيْنَ

Marfat.com

فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿٢٢﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا
الْكُفْرَ عَلَي الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٣﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَ
اَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰي يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ
وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٤﴾ ع

مشرکین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں۔ اس حال میں کہ وہ خود اپنے نفسوں پر کفر کے گواہ ہیں۔ ان میں لوگوں کے سارے اعمال برباد ہو گئے اور یہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے۔ اللہ کی مسجدوں کو صرف وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے سو امید ہے کہ وہ لوگ راہ یاب ہو جائیں۔ کیا تم نے کر دیا ہے حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجدِ حرام کا بسانا اس شخص کے برابر جو ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور جہاد کیا اللہ کے راستے میں، یہ برابر نہیں اللہ کے نزدیک اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے اور وہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔ خوشخبری دیتا ہے ان کو ان کا رب اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کیلئے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بیشک اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔ اے ایمان والو! تم اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو اپنا ولی نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور تم میں سے جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی لوگ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ٹھہریں گے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں کھٹکا لگا رہتا ہے اور وہ حویلیاں جو تمہیں پسند ہیں اگر تمہیں اللہ اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے اور اللہ بد عہدوں کو بامراد نہیں کرتا۔ (۱۷ تا ۲۴) (رکوع: ۳)

Marfat.com

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ښ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ○ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ○ ﴿التوبة : ۱۷، ۱۸﴾

مشرکین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں اس حال میں کہ وہ خود اپنے نفسوں پر کفر کے گواہ ہیں، ان لوگوں کے سارے اعمال برباد ہو گئے اور یہ ہمیشہ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔ (۱۷) اللہ کی مسجدوں کو صرف وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روزِ آخرت پر اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے سو امید ہے کہ وہ لوگ راہ یاب ہو جائیں۔ (۱۸)

مساجد کی تولیت کن لوگوں کا حق ہے ؟

سابقہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین عرب سے براءت اور ترکِ تعلق کا اعلان کیا گیا تھا جو نقضِ عہد کے مجرم تھے یا جن سے کوئی معاہدہ نہ تھا، ان سے آئندہ تمام معاہدوں سے دستبرداری کا اعلان کیا گیا اور جن سے معاہدوں کی مدت باقی تھی ان سے مدت گزر جانے کے بعد براءت کا اعلان کیا گیا۔ اس پر بعض منافقین یا نئے اسلام لانے والوں میں بے چینی پیدا ہوئی کہ آخر اتنا سخت اعلان اور ترکِ تعلق کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ چنانچہ گزشتہ آیات میں تفصیل سے اس کا جواب دیا گیا اور تاریخ کے آئینہ میں مشرکین کے اصل کردار کو نمایاں کر کے دکھایا گیا۔ پیشِ نظر آیات میں اعتراضات کا جواب دینے کے بعد مزید ایک اعلان کیا جا رہا ہے لیکن اس کا انداز ایسا ہے جس میں بیک وقت ترکِ تعلق اور براءت کا اعلان بھی ہے اور ساتھ ہی اس کو دلیل سے ثابت بھی کیا گیا ہے۔

اس اعلان کو سمجھنے سے پہلے ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہئے وہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد اگرچہ مکہ معظمہ اور جنگِ حنین کے بعد مکہ معظمہ کے گرد و پیش میں بھی اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی لیکن مشرکین پر کوئی قدغن عائد نہیں کی گئی تھی۔ وہ آزادانہ بیت اللہ کے طواف کیلئے آتے تھے اور اپنے طریقے سے بیت اللہ کے ادب و احترام کے تقاضوں کو بروئے کار لاتے لیکن ساتھ ساتھ بعض ایسی حرکتیں بھی کرتے تھے جن کا ارتکاب بیت اللہ کے سامنے نہایت بے شرمی اور کفر کی بات ہے۔ لیکن اسلام نے نہایت رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے رمضان آٹھ (۸) ہجری سے لے کر ذی الحج نو (۹) ہجری تک ان تمام منکرات کو برداشت کیا اور عربوں کو زیادہ سے زیادہ اس بات کا موقع دیا کہ وہ اسلام کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنے رویے پر نظرِ ثانی کریں۔ یہ بات کہ ان پر کوئی قدغن عائد نہیں کی گئی تھی اس کی دلیل ذی الحج نو (۹) ہجری کو حضرت علی ﷛ کی زبان سے جو اعلان کرایا گیا تھا اس میں موجود ہے۔ اس میں ایک تو ان سے ترکِ تعلق کا اعلان ہے اور دوسرا یہ فرمایا گیا ہے۔

لا یحجن بعد العام مشر کین ولا یطوفن بالبیت عریان

"اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا اور کوئی ننگا آدمی بیت اللہ کا طواف نہ کر سکے گا"

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس اعلان سے پہلے فتح مکہ کے بعد بھی مشرکین کو اپنے طریقے سے حج کرنے اور ننگے طواف کرنے سے روکا نہیں گیا۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرکین میں سے اگر کسی قبیلے کے افراد بیت اللہ کی کوئی خدمت انجام دیتے تھے تو ان سے وہ خدمت بھی واپس نہیں لی گئی بلکہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نرمی اور دل جوئی کا سلوک کیا گیا تا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہوں۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں نہایت دھیمے لہجے میں ایک ایسی مضبوط بات فرمائی گئی ہے جس کا انکار کرنا کسی کے بس میں نہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ مشرکین کو ہرگز اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کے گھر کو آباد کریں۔ آباد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کا انتظام و انصرام کریں یا انتظامی معاملات میں دخل دیں اور آبادی کی دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے گھر میں عبادت کریں اور اس کا طواف کریں۔ یہی حقیقت میں اس کی آبادی ہے۔ تو مشرکین کیلئے ایسی عبادت جس میں شرک کی آمیزش ہو اور برہنہ طواف جو بے حیائی کا کھلا اظہار ہے اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ اللہ کا یہ گھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کے مرکز کے طور پر تعمیر کیا تھا۔ جس میں کسی طرح کے شرک کی گنجائش نہیں تھی۔ اسی طرح اس گھر کے سائے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کی جا سکتی جو اللہ کے احکام کے خلاف ہو اور یہ بات مسلّم ہے کہ شرم و حیا کی پاسداری ہر پیغمبر کی شریعت میں بنیادی احکام میں موجود رہی ہے۔ حیا کو

Marfat.com

نصف ایمان کے طور پر ہر شریعت کا جز بنایا گیا ہے تو جو اللہ کا گھر مرکزِ توحید کے طور پر بنایا گیا ہو اور جس گھر سے ایک ایسی امت اٹھائی جانے والی تھی جس نے دنیا کے بیشتر حصے پر اللہ کے دین کو نافذ کرنا ہے، اس گھر کے سامنے ایسی کسی حرکت کا جواز نہیں جس سے اس گھر کی اصل حقیقت کو نقصان پہنچتا ہو اور مشرکین چونکہ اپنے عقیدے اور عمل کے اعتبار سے سراسر اس حقیقت کی ضد ہیں، انہیں اس بات کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ کے اس گھر پر قابض رہیں یا اس کے انتظام وانصرام کے متولی رہیں کیونکہ کسی بھی ادارے کی سربراہی یا اس کی خدمت کا حق اسے دیا جاسکتا ہے جو اس کے اصل مقصد کو بروئے کار لانے میں مخلص ہو۔ لیکن جس کا حال یہ ہو کہ ادارہ جس مقصد کیلئے وجود میں لایا گیا ہے وہ اس مقصد کے بالکل برعکس اس ادارے کو چلانا چاہے تو دنیا کا کوئی شخص اس کا انتظام وانصرام اس کے ہاتھ میں دینے کی کبھی سفارش نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی شخص تعلیمی ادارے کو سٹیڈیم میں تبدیل کردے اور دعویٰ یہ کرے کہ میں اس کا سربراہ ہوں اور مجھے ایسا کرنے کا حق ہے تو ہر شخص یہ کہے گا کہ تم نے تعلیمی ادارے کے اصل مقصد سے ہی بغاوت کردی ہے تمہاری سربراہی تو کجا تمہیں تو اس کے قریب پھٹکنے کی بھی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ اسی طرح جو شخص اللہ کی مسجد کو بت خانے میں تبدیل کردے اور اس میں انسانیت برہنہ ہو کر رہ جائے تو خدا لگتی کہیے ایسے لوگوں کا اس مسجد سے کیا تعلق ہوسکتا ہے۔ یہی بات یہاں فرمائی جارہی ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اس گھر کی مرمت کی، تم نے حج کیلئے آنے والوں کی خدمت بھی کی، لیکن تم چونکہ اس گھر کے اصل مقصدِ تعمیر سے انحراف کرچکے ہو اس لئے تمہیں اس کا انتظام چلانے کا کوئی حق نہیں۔

قریش کی نااہلی کی دلیل:

اس پر دلیل دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اللہ کا گھر مرکزِ توحید ہے اور ہر آنے والے کیلئے لازم ہے کہ وہ اس گھر میں اللہ کی بندگی بجالائے لیکن قریش اور دوسرے مشرکین نے جو کچھ اس گھر میں کیا ہے یا کررہے ہیں وہ خود ان کے کفر اور شرک پر گواہی دینے کیلئے کافی ہے۔ انہوں نے اللہ کے گھر میں تین سو ساٹھ (۳۶۰) بت لاکر رکھے پھر باقاعدہ ان کی پوجا کی۔ اپنے معمولات سے کعبہ کو شرک کا مرکز بنا کر رکھ دیا۔ ان کے اعمال میں سے ایک ایک عمل پکارتا ہے کہ ان کا اللہ کی بندگی اور توحید سے دور کا بھی رشتہ نہیں اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ مشرکینِ عرب اپنی قومی شناخت میں باقی قوموں سے نہایت مختلف واقع ہوئے تھے۔ باقی قوموں میں کوئی قوم ایسی نہیں جو شرک کا ارتکاب نہ کرتی ہو۔ عیسائی تین خداؤں کے دعویدار ہیں۔ ہندوؤں کے خداؤں کا کوئی شمار نہیں۔ بدھ مت کے ماننے والوں میں مہاتما بدھ کی حیثیت خدا اور شریکِ خدا سے کم نہیں۔ یہود بھی حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ بااین ہمہ! ان قوموں یا ان اہلِ مذاہب میں سے کسی کو آپ مشرک کہہ کر پکاریں تو وہ آپ سے لڑنے پر آمادہ ہوجائے گا کیونکہ وہ شرک کرنے کے باوجود اپنے آپ کو مشرک کہلوانا پسند نہیں کرتے اپنے شرک کو تاویل کے پردے میں لپیٹ کر دوسرے ناموں سے تعبیر کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ لیکن مشرکینِ عرب کا عجیب حال تھا کہ وہ اپنے آپ کو مشرک کہلانا نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ اس پر فخر کرتے تھے کہ انہوں نے شرک کو بطور دین اور عقیدہ کے اختیار کررکھا تھا۔ یہ ان کے تصورِ الوہیت کا ایک غیر منفک حصہ تھا۔ ایسے لوگ جو توحید سے اس حد تک بیزار ہوں انہیں آخر بیت اللہ جیسے مرکزِ توحید کے متولی ہونے کا کیا حق پہنچتا ہے؟

کفر کے ساتھ نیکیاں قبول نہیں کی جاتیں:

رہی یہ بات کہ انہوں نے ہمیشہ بیت اللہ سے عقیدت کا اظہار کیا اس کی تعمیر اور مرمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حجاج کی ہمیشہ خدمت کی۔ کیا یہ نیکیاں ان کے کسی کام نہیں آئیں گی؟ وہ انہیں نیکیوں کو توشۂ آخرت سمجھتے تھے اور آج بھی بہت سے لوگ ہیں کہ رفاہی کاموں اور لوگوں کے بھلے کے کام کرنے کو آخرت میں نجات کیلئے کافی سمجھتے ہیں۔ غیر مسلموں میں کئی ایسے لوگ گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں جنہوں نے لوگوں کی بھلائی کیلئے بہت سے کام کیے۔ تعلیمی ادارے قائم کیے، ہسپتال بنائے یا اور اس طرح کے کام ہیں جنہیں دیکھ کر لوگوں کو گمان ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنت میں کیوں نہیں جائیں گے؟ ان کی تو ضرور بخشش ہونی چاہئے۔ قرآن کریم نے اس آیتِ کریمہ میں اپنے مخصوص انداز میں مختصر جواب دیا ہے۔ جو شاہانہ کلام کی شان

Marfat.com

ہوتی ہے۔ بادشاہ اپنی بات کی دلیل نہیں دیتے بلکہ بتادیتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا اور یہی بات بادشاہ کے وفاداروں کیلئے کافی ہوتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ان کے اس طرح کے خدمت کے تمام کام ضائع ہوگئے۔ یہ اللہ کے یہاں کسی صلہ کے مستحق نہیں ہوں گے یہ انجام کے اعتبار سے ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔
لیکن آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سوال پر کسی حد تک تفصیل سے کام لیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ ابنِ جدعان جو عرب میں بھلائی کے کام کرنے میں معروف تھا اور زندگی بھر لوگوں کے کام آتا رہا، کیا اس کے ان کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں فرمائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اس لئے کہ اس نے کبھی اپنے اللہ سے یہ نہیں کہا تھا کہ یا اللہ! مجھے بخش دے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان کو اپنی عبدیت اور اللہ کے معبود ہونے، اپنے مملوک ہونے اور اللہ کے مالک ہونے کا اعتراف نہیں ہوتا اور وہ اس کے احکام پر عمل کرنا لازمی سمجھ کر اپنی غلطیوں کیلئے اللہ سے معافی نہیں مانگتا اور اپنی بخشش کیلئے اللہ کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا اس وقت تک اللہ تعالیٰ اسے نہیں بخشتا کیونکہ سب سے بنیادی بات اللہ کی اور اپنی حیثیت کا اعتراف ہے۔ جسے یہ اعتراف میسر نہیں اسے اللہ سے کسی طرح کی امید رکھنے کا بھی حق نہیں۔ جس طرح ایک شخص ملک کے حکمران کے حقِ حکمرانی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے آپ کو اس کا محکوم نہیں سمجھتا لیکن اپنے طور پر لوگوں کے بھلے کے کام کرتا ہے، بہت سی اچھائیاں اس سے ظہور پذیر ہوتی ہیں تو دنیا کا کوئی حکمران اس کی اچھائیوں کو دیکھتے ہوئے حکومت کے انکار جیسے جرم کو برداشت کرنے کیلئے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ اللہ کا کائنات کا مالک ہونا، انسانوں کا خالق و مالک اور معبود ہونا اور انسان کا اللہ کا بندہ ہونا، اس قدر واضح ہے کہ کائنات کا پتہ پتہ اس پر دلیل ہے اور پھر انبیاء کی آمد اور کتبِ ہدایت کے نزول نے اسے اور زیادہ محکم بنادیا ہے۔ اس کے باوجود اللہ کا انکار، اس کے احکام کا انکار، اس کی ذات و صفات سے استہزاء، اس کی دی ہوئی زندگی اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھا کر اسی سے تنفر کا اظہار، یہ ایک ایسا جرم ہے جسے اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں فرماتے۔ اس لئے فرمایا کہ ایسے لوگ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔

مساجد کو جمع لانے کا سبب:

اس آیتِ کریمہ میں مساجد کو جمع لایا گیا ہے کیونکہ مساجد، مسجد کی جمع ہے حالانکہ مراد اس سے "مسجدِ حرام" ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے جمع لانے سے شاید اس طرف اشارہ ہے کہ مسجدِ حرام کا معاملہ تنہا مسجدِ حرام ہی کا نہیں بلکہ تمام مساجدِ الٰہی کا معاملہ ہے کیونکہ تمام مسجدیں مسجدِ حرام کی بیٹیاں ہیں۔ تمام مساجد کا اصل مرکز و محور اور سب کا قبلہ بیت اللہ ہے۔ اس لئے وہاں اگر کوئی غلط روایت پنپتی ہے تو باقی مساجد پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں ہدایت و سعادت کا سارا ڈھانچہ بگڑ کر رہ جاتا ہے اور دوسرا شاید اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح مسجدِ حرام کا متولی ہونا کسی کافر اور مشرک کیلئے جائز نہیں اسی طرح کسی مسجد کا انتظام بھی کسی کافر اور مشرک کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ردالمختار، شامی اور مراقی جیسی کتابوں میں فقہا نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کسی مسجد یا کسی اسلامی وقف کا متولی اور منتظم کافر نہیں ہوسکتا۔ ہاں مسجد کی تعمیر میں کافر سے کام لیا جاسکتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ مسلمانوں میں پرہیزگار لوگ مسجدوں کی تعمیر کریں۔ اس طرح اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر مسجد بنادے یا مسجد بنانے کیلئے مسلمانوں کو چندہ دے دے تو اگر اس کا کاروبار خنزیر، سود یا خمر و خمار جیسے محرمات سے متعلق نہیں تو اس سے چندہ لیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس سے کسی دینی یا دنیوی نقصان یا الزام یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا خطرہ نہ ہو۔

مسجدوں کو آباد رکھنے والوں کی صفات:

دوسری آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں جو اللہ کے گھروں کا آباد کرسکتے ہیں اور انہیں حق ہے کہ اللہ کے گھروں کو آباد کریں یعنی اللہ کے گھروں کے متولی بنیں، ان کے انتظامی معاملات کے کفیل ہوں اور خاص طور پر مسجدِ حرام کا متولی ہونا اور اس کے انتظامات کا ذمہ دار ہونا ان لوگوں کو زیب دیتا ہے جن میں یہ صفات پائی جاتی ہوں جو اس آیتِ کریمہ میں بیان ہوئی ہیں۔ اب ہم آیت میں بیان کردہ صفات کو اسی ترتیب سے بیان کرتے ہیں۔

Marfat.com

۱:۔اللہ اور آخرت پر ایمان :۔ اللہ کے گھروں کو وہ آباد کرسکتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں۔اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی ذات کو اس طرح مانتے ہوں جس طرح اسے ماننے کا حق ہے۔اس کی ان صفات پر یقین رکھتے ہوں جو قرآن وسنت میں بیان کی گئی ہیں۔ایمان کا معنی ہوتا ہے، مان لینا اور یقین کرنا۔یہی وہ یقین ہے جسے دل کی تصدیق بھی کہا جاتا ہے اور پھر اللہ کی ذات کو اس طرح ماننا کہ جس میں کسی شرک کی آمیزش ہو، نہ کسی دوسرے خدا کے تصور کا کوئی جواز ہو، نہ اس کی ان صفات میں جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں کسی اور کو شامل کرنے کی جسارت ہو۔جب آدمی اس بات کا اقرار کرے کہ اللہ کا علم بہت وسیع ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے اور ہر کام کرنے والا اس کی نگاہوں میں ہے۔تو اسے کبھی یہ وہم بھی نہ ہو کہ میرا کوئی کام اللہ سے مخفی سے رہ سکتا ہے، میری کوئی دعا اللہ کے ہاں سنی نہیں جاتی، میرے دل میں آنے والا کوئی خیال اس سے مخفی رہ سکتا ہے، میرا لوگوں سے کوئی معاملہ اس کے علم میں آئے بغیر رہ سکتا ہے۔وہ اتنی باخبر ذات ہے کہ صحرا میں گرنے والا درخت کا پتہ اس کی نظروں سے دور نہیں رہتا۔کوئی رطب ویابس چیز ایسی نہیں جو اس کے علم میں نہ ہو۔اسی طرح جب وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ اللہ کی قدرتیں بے پناہ ہیں تو اسے یہ یقین ہونا چاہئے کہ اللہ جب اپنے ماننے والوں کو امید دلاتا ہے کہ تم اگر اپنا آپ میرے دین کیلئے وقف کردو گے تو میں تمہاری قوت بن جاؤں گا، تمہاری پشت پناہی کروں گا، تمہیں کفر پر غالب رکھوں گا اور تمہیں دشمن کے سامنے کبھی ذلیل نہیں ہونے دوں گا شرط صرف یہ ہے کہ تم اللہ سے بے وفائی نہ کرنا، اس کے توکل میں کمی نہ کرنا اور اس کے وعدوں پر یقین رکھنا۔اسی طرح جب ایک مومن یہ مانتا ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں تو اسے پھر اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ میری بندگی میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔میرا سر اس کے سوا کسی اور کے سامنے نہیں جھک سکتا۔میرے جسم وجان کی تمام رعنائیاں اسی کیلئے وقف ہیں۔میری تمام صلاحیتیں اس کے دین کی بالادستی کیلئے صرف ہوں گی۔مختصر یہ کہ اس پر ایمان لانے کا اصل جوہر یہ ہے کہ اس کی صفات پر مکمل یقین، اس کے وعدوں پر حتمی ایقان، اس کے دیئے ہوئے آئین وقانون کے مقابلے میں ہر وضعی آئین وقانون کو اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں حاکمانہ حیثیت سے قبول کرنے سے انکار اور اس کے ساتھ ساتھ آخرت پر یقین اس کا لازمی حصہ ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مومن اس بات پر پختہ یقین رکھے کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب مجھے اپنے ہر قول وفعل کا حساب دینا ہوگا۔اگر میں جواب دہی میں کامیاب ٹھہرا تو جنت میرا مسکن ہوگا اور اگر اس میں ناکامی ہوئی تو یہ وہ نامرادی ہے جس سے کوئی چھٹکارا نہیں دلا سکتا۔

آپ نے دیکھا کہ اس آیت میں اللہ پر ایمان اور آخرت کے دن پر ایمان کا ذکر ہے۔لیکن اللہ کے رسول پر ایمان کا کوئی تذکرہ نہیں۔اس سے بظاہر ایک غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شاید نجات کیلئے اللہ اور آخرت پر ایمان کافی ہے ہر رسول کو ماننا ضروری نہیں۔لیکن اگر ایمان باللہ کا صحیح مفہوم سمجھ لیا جائے تو اس غلط فہمی کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم جانتے ہو اللہ پر ایمان کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔آپ نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی قابلِ عبادت نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ رسول پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے میں داخل ہے۔

۲:۔اقامتِ صلوٰۃ :اقامتِ صلوٰۃ درحقیقت ایمان باللہ کی عملی تصویر وتعبیر ہے۔اگر کوئی شخص یہ دیکھنا چاہے کہ اللہ پر ایمان لانے والے شخص کا حقیقی روپ کیا ہے، تو وہ ایک ایسے مومن کو دیکھے جو نماز کو واقعی ویسے ہی پڑھتا ہو جیسے نماز پڑھنے کا حق ہے۔جب وہ اللہ اکبر کہہ کر نماز کی نیت باندھے تو اہلِ دنیا کی ساری عظمتیں اس کے سامنے ڈھیر ہوجائیں۔تخت وتاج کی کوئی قیمت اس کی نگاہوں میں نہ رہے۔وہ جب ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو تو اس کا انگ انگ اللہ کی غلامی کا اقرار کرے۔اس کی زبان اللہ کی حمد وثنا میں زمزمہ سنج ہو۔وہ جھکے یا اٹھے ہر موقع پر اللہ کی کبریائی کا ترانہ اس کے لبوں پر ہو۔وہ اپنی زندگی کا سارا سرمایہ اللہ کی کبریائی کے سامنے ڈھیر کردے۔جو شخص دن میں پانچ مرتبہ ہر بڑائی سے انکار اور اللہ کی عظمت اور بڑائی کا اقرار اس

Marfat.com

طرح کرے کہ خشوع خضوع کی لہریں اس کے دل ودماغ سے اٹھیں اور چہرے پر نور بن کر پھیل جائیں یہی وہ زندگی ہے جو انسانیت کیلئے قابلِ فخر ہے۔

۳:۔ایتائے زکوٰۃ: انسانی زندگی کا بیشتر حصہ معاملات سے عبارت ہے اور معاملات کا فعال حصہ مالیات سے تعلق رکھتا ہے جس طرح انسانی صلاحیتیں اللہ کی اطاعت وبندگی میں صرف ہونی چاہئیں، اسی طرح اس کے تمام مالی معاملات شریعت کی ان حدود وقیود سے چھن کر گزرنے چاہئیں اور ایک مومن کو یہ یقین ہونا چاہیے کہ مال ودولت، دولت کے مالک کی ملکیت نہیں بلکہ اللہ کی ملکیت اور اس کے پاس امانت ہے۔ آدمی جن صلاحیتوں سے کام لے کر دولت کماتا ہے، وہ اللہ کی عطا کردہ ہیں۔ اس کے علاوہ دولت کے دیگر وسائل وہ بھی اللہ کی دَین ہیں۔ جب تک مالی معاملات میں تطہیر نہ ہو اور انسان اپنے معاملات پر اللہ کی نگرانی کا یقین نہ رکھے اور دولت کی کمی بیشی میں اس کو مؤثر نہ مانے اس وقت تک انسانی زندگی کا بیشتر حصہ تقویٰ کی دولت سے محروم رہتا ہے۔

۴:۔وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ ''وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا'': اللہ کے گھر چونکہ اسلامی تعلیم وتربیت کے مرکز ہیں وہیں سے توحید کی نعمت نصیب ہوتی ہے۔ ڈر ایک تو وہ کیفیت ہے جو انسان کسی ڈراؤنی چیز سے اپنے اوپر محسوس کرتا ہے۔ وہ تو انسانی فطرت ہے، یہاں وہ مراد نہیں۔ یہاں ڈر سے مراد وہ ڈر ہے جس کی وجہ سے آدمی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا۔ اللہ کے احکام کی اطاعت میں وہ کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اللہ کے دین کی سربلندی اس کی عزت کے دفاع اور ملک وملت کے دفاع کیلئے لڑنا ناگزیر ہو جائے تو اسے ساری دنیا سے ٹکرانے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔

یہ ہیں وہ لوگ جو اللہ کے گھروں کو آباد رکھنے کا حق رکھتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ کے فضل وکرم سے اپنی منزل تک کامیابی اور کامرانی سے پہنچیں گے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۘ ﴿التوبة : ١٩﴾

کیا تم نے کر دیا ہے حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجدِ حرام کا بسانا اس شخص کے برابر جو ایمان لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور جہاد کیا اللہ کے راستے میں، یہ برابر نہیں اللہ کے نزدیک اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔(۱۹)

ایک خوش فہمی کا ازالہ:

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قریش کے فخر وامتیاز کا سب سے بڑا سرمایہ بیت اللہ کی خدمت اور حاجیوں کی دیکھ بھال تھی۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کے گھر کی آبادی اس کے انتظام کی خدمت اور حج کے موقع پر حاجیوں کو پانی پلانا اور کھانا کھلانا یہ اتنا بڑا اعزاز ہے کہ جو لوگ اس منصب پر فائز ہیں دوسرے لوگ ان کی برابری نہیں کر سکتے۔ فتح مکہ تک تو ہر قریشی اسی فریب خوردگی کا شکار تھا۔ جنگِ بدر میں حضرت عباسؓ بھی گرفتار تھے اور وہ ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جب ان کے مسلمان عزیزوں نے اس کوتاہی پر توجہ دلائی تو انہوں نے کہا کہ تمہیں ہماری کوتاہیاں تو یاد رہتی ہیں لیکن بیت اللہ کی خدمت اور حاجیوں کا پانی پلانا یہ کیوں یاد نہیں رہتا حالانکہ اس سے بڑی نیکی اور کیا ہو سکتی ہے؟ معلوم ہوتا ہے فتح مکہ کے بعد اگرچہ خیالات اور اعتقادات میں انقلاب عظیم واقع ہوا لیکن یہ تصور پھر بھی کسی نہ کسی حد تک باقی رہا۔ چنانچہ ہمیں بعض روایات میں اس طرح کے واقعات کا ثبوت ملتا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ وہ ایک روز جمعہ کے دن مسجدِ نبوی میں چند صحابہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کے منبر کے پاس جمع تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ اسلام اور ایمان کے بعد میرے نزدیک حجاج کو پانی پلانے سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں

Marfat.com

ہے اور مجھے اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے عمل کی پرواہ نہیں۔ ایک دوسرے صاحب نے ان کے جواب میں کہا کہ نہیں! اللہ کی راہ میں جہاد سب سے بڑا عمل ہے۔ ان دونوں میں بحث ہونے لگی تو حضرت فاروقِ اعظم ؓ نے دونوں کو بحث کرنے سے روکا اور کہا مناسب یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد یہ بات خود رسولِ کریم ﷺ سے دریافت کرلی جائے۔ چنانچہ جمعہ کے بعد آپ سے دریافت کیا گیا تو اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ اس میں مشرکینِ قریش کو بھی اصل حقیقت سے آگاہ کیا گیا اور مسلمانوں کو بھی فرقِ مراتب کا علم دیا گیا۔ قریش کو تو یہ بات سمجھائی گئی کہ شرک کی موجودگی میں کوئی بڑے سے بڑا عمل بھی اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں۔ اعمال ایک عمارت کی طرح ہیں جو عقائدِ صحیحہ کی بنیادوں پر اٹھائے جاتے ہیں اور جس عمل کے نیچے صحیح عقیدے کی بنیاد نہ ہو اس کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ توحید اللہ کے ہاں سارے عقائد کی جان ہے اور اسی سے باقی عقائد مستقیم ہوتے ہیں اور شرک عقیدۂ توحید کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے اسی لئے مشرک کے بارے میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مومن کی کوتاہیوں کو معاف کرسکتا ہے لیکن شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا کیونکہ جس شخص نے اپنے خالق و مالک کی ذات کے ساتھ اخلاص نہ رکھا اور اس کی وحدانیت پر حملہ کیا اور شرک سے دراڑیں ڈالیں اس کا دوسرا کوئی عمل قابلِ قبول ہونا تو دور کی بات ہے قابلِ برداشت بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے گزشتہ آیتِ کریمہ میں صاف فرمایا گیا کہ ان کے سارے اعمال ضائع ہوگئے۔

مسلمانوں کو فرقِ مراتب واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ ایمان کے ساتھ بیت اللہ کی آبادی اور حاجیوں کی خدمت اگرچہ بہت بڑی نیکی اور بہت اجر و ثواب کا حامل عمل ہے لیکن یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ ایمان اسلامی زندگی کی اساس ہے اور اسلامی زندگی کے راستے میں پیش آنے والی تمام مشکلات کو دور کرنا اور تمام مخالف گروہوں کو ختم کرنا اور اللہ کے دین کو ادیانِ باطلہ پر غالب کرنا یہ "جہاد" ہے اور اس جہاد کے بغیر ایمان کی اساس نہ مستحکم ہوسکتی ہے، نہ اس کے اوپر اسلام کی عمارت اٹھائی جاسکتی ہے اور نہ غلبۂ دین کا خواب دیکھا جاسکتا ہے۔ اللہ کے گھر کو مشرکانہ قوتوں کی دستبرد سے بچانا، اسے اسلام کا مرکز بنانا، وہاں سے توحید کی دعوت دوسرے علاقوں تک پہنچانے کا انتظام کرنا اور ایک ایسی امت کا اٹھانا جو اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو غالب کردے، یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اللہ کا گھر ان قوتوں کی تولیت میں ہو جو ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کے محاسن سے آراستہ ہوں۔ ان حقائق کا اگر ادراک کرلیا جائے تو پھر یہ وہم کبھی نہیں ہوسکتا کہ محض بیت اللہ کی خدمت اور حاجیوں کو پانی پلانا ایمان اور جہاد کے برابر ہوسکتا ہے اور ایسا کرنے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ مومن اور مجاہد اسلام کا سرمایہ اور قوت ہیں اور ایمان سے خالی بیت اللہ سے عقیدت رکھنے والے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے نہ اپنی حقیقت پہچانی اور نہ بیت اللہ کی۔ ایسے ظالم لوگ جب تک اپنی کج فکری کا علاج نہیں کرتے اس وقت تک اللہ تعالیٰ انہیں کبھی ہدایت نہیں دیتا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ ﴿التوبۃ : ٢٠ تا ٢٢﴾

جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے اور وہی لوگ کامیاب و کامران ہیں۔ (٢٠) خوشخبری دیتا ہے ان کو ان کا رب اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کیلئے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں۔ (٢١) جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے بے شک اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔ (٢٢)

مومن کا سراپا:

بحث کو سمیٹتے ہوئے مسلمانوں کے سامنے مکمل اور ہمیشہ کی راہنمائی کیلئے ان انسانوں کا سراپا لا کر کھڑا کردیا ہے جو اللہ کو مطلوب اور محبوب ہیں تاکہ جب بھی مسلمان کامیابی اور کامرانی کا راستہ تلاش کریں تو یہ سراپا انہیں راہنمائی کیلئے کفایت کرے۔ اس میں سب سے پہلی صفت وہی بیان کی گئی ہے جس کا ذکر سابقہ آیتِ کریمہ میں بھی ہوا کیونکہ ایک مومن جو دنیا بھر کے کافروں سے الگ راستہ اختیار کر کے ایک نئی زندگی اختیار کرتا ہے اس کا آغاز ایمان سے ہی ہوتا ہے۔ اہلِ دنیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کامیابیوں اور کامرانیوں کا راز دولتِ دنیا اور اقتدار میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا پھر اس کے بل بوتے پر

Marfat.com

انسانوں کو اپنا غلام بنانا اور پھر اسی کے سہارے اقتدار کے مناصب پر فائز ہو جانا یہ ایک دنیادار انسان کی زندگی کا خلاصہ بھی ہے اور معراج بھی۔ تعلیم صرف دولت کمانے کا ذریعہ ہے اور دولت ہر طرح کی آسائش حاصل کرنے، سر پر کلغی سجانے، اپنی عظمت کے ڈنکے بجانے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کا نام ہے۔ لیکن اسلام بالکل اس کے برعکس ایک دوسرا تصور دیتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ دولتِ دنیا ایک ضرورت ہے اور ضروریات کے حصول کا ذریعہ بھی۔ لیکن انسانی زندگی کا حاصل اور اس کی معراج چند مقاصد سے وابستہ ہے۔ ان مقاصد کا حصول انسان کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ اور انہی مقاصد کو انسانی زندگی کی کامیابی کی ضمانت بنایا گیا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کیلئے محنت حیوان بھی کرتا ہے اور کافر بھی اور مسلمان کو بھی زندگی کی بقاء کیلئے ایک حد تک ان کیلئے محنت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن مسلمان کا اصل ہدف صرف دنیا کمانا اور اس کو بیش از بیش ترقی دینا، عیش و عشرت کے اسباب فراہم کرنا اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی دھن میں زندگی صرف کر دینا نہیں ہے۔ اس کا اصل ہدف اللہ کی معرفت اور اس کی رضا کا حصول ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ کائنات کی ایک ایک چیز میری چاکری میں دی گئی ہے میں ان کا مقصود بنایا گیا ہوں اور وہ میری خدمت بجالانے میں کبھی کوتاہی کی مرتکب نہیں ہوتیں۔ میری غذا بہم پہنچانے کیلئے سورج چاند، ہوا اور مٹی اور موسموں کے تغیرات اپنا اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ صرف اتنی بات کیلئے کہ مجھے غذا ملنی چاہئے تمام عناصرِ قدرت مسلسل کوشاں نظر آتے ہیں کیونکہ انہیں اسی مقصد کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ انسان جو کائنات کا گلِ سرسبد ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا گیا ہو اللہ کے پیغمبر اور ان پر اترنے والی کتابیں انسانوں پر واضح کرتی ہیں کہ تم کائنات کے مخدوم ہو لیکن اللہ کے بندے ہو۔ اس کی بندگی بجالانا تمہارا اولین فریضہ ہے۔ رہی یہ بات کہ بندگی کا حق ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور اس کی کتابیں اس ضرورت کو بتمام و کمال ادا کرتی ہیں۔ انسان کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کو پہچان کر اپنے فریضۂ زندگی کو جان کر اللہ کے نبیوں کی راہنمائی میں زندگی گزارے۔ جب آدمی اس بات کو سمجھ لیتا ہے اور قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اسی کو "ایمان" کہتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے آنے والی راہنمائی کو قبول کرنا اور دل کی گہرائیوں سے اس کا یقین کرنا اور پھر کبھی اس میں شک و ارتیاب کا کانٹا نہ چبھنے دینا یہ وہ ایمان ہے جس سے انسان کی حقیقی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی بیشتر باتیں چونکہ انسان کی خواہشات کے برعکس ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بہت سی باتیں عالمِ غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان باتوں کو قبول کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آدمی اس بات کا یقین پیدا نہ کرے کہ اللہ کی طرف سے آنے والی راہنمائی میں جو کچھ میرے حوالے کیا جا رہا ہے اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ اللہ کے آخری نبی کے آجانے اور آخری کتاب کے نزول کے بعد اللہ کی طرف سے آنے والی راہنمائی مکمل ہو گئی۔ اب اس سے فائدہ اٹھانے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آدمی اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرے اور یقین کے ساتھ تسلیم کرے۔ دنیا اپنے عقل و دانش کے بل بوتے پر ہزار نئی راہیں نکالے اور زندگی کے نئے نئے تجربے کرے لیکن ایک مومن کیلئے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کی راہنمائی کے سوا کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے اور کبھی اس کے یقین میں لرزش پیدا نہ ہو۔ اسے کامل یقین ہو کہ اللہ کا علم ہر نارسائی سے پاک ہے۔ اس کا آخری نبی باقی نبیوں کی طرح ہر انسانی کمزوری سے مبرا ہے۔ اس کی لائی ہوئی تعلیم کے بنیادی ماخذ بتمام و کمال محفوظ ہیں۔ نئی ضرورتوں کیلئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ لیکن جن باتوں پر شریعت فیصلہ دے چکی ہے ان میں کوئی قلم کاری نہیں ہو سکتی۔ اس پر جتنا پختہ ایمان اور یقین ہو گا اتنا ہی اللہ اور اس کے رسول کی راہنمائی پر چلنا ایک مومن اور امتِ مسلمہ کے لئے آسان ہو جائے گا اور دوسری یہ بات کہ جب آدمی اللہ کے احکام پر عمل کرے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس بات کا سو فیصد یقین رکھے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہوں، میری کوئی تنہائی اس سے محفوظ نہیں، وہ میرے صرف ظاہری اعمال کو نہیں بلکہ باطنی اعمال اور دل کے رازوں سے بھی واقف ہے۔ جس آدمی کو اس بات کا یقین ہو گا وہ کبھی گناہ نہیں کر سکے گا۔ کبھی گناہ کی بات سوچ بھی نہیں سکے گا، وہ کبھی کسی کا نقصان نہیں کرے گا، اس کا قدم کبھی غلط جگہ پر چل کر نہیں جائے گا۔ اس کی نگاہ آوارہ نہیں ہو گی، اس کے دل کے خیالات بے قابو نہیں ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ اگر اسے اس بات کا بھی یقین میسر آجائے کہ میرے اللہ کی قدرتیں بے پناہ ہیں، دنیا ساری مل کر اس کے ارادے کو بدل نہیں سکتی، وہ چاہے تو چشم زدن میں سمندر کو صحرا میں اور صحرا کو سمندر میں تبدیل کر دے۔ اس کی بے پناہ قدرت ہمیشہ اس آدمی کی تائید و نصرت میں ہوتی ہے جو شریعت کے مطابق اور اللہ کی رضا کے حصول کیلئے زندگی کا ہر قدم اٹھاتا ہے، وہ بڑے بڑے بادشاہوں کو کٹھ پتلیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان کی طاقت مصنوعی اور چند روزہ ہے۔ اللہ کے لشکر بے شمار ہیں، اللہ جب اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ ایمان کے ادنیٰ تقاضے ہیں جس سے بہرہ ور ہو کر انسانی زندگی میں انقلاب

Marfat.com

عظیم آ جاتا ہے۔اس کی زندگی طہارتِ فکر اور طہارتِ عمل کا پیکر بن جاتی ہے۔وہ چیتھڑے پہن کر بھی اللہ کے بھروسے پر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں ایک بے طاقت آدمی ہوں لیکن میری پشت پر سب طاقتوں کا پروردگار ہے۔ان تصورات سے چونکہ زندگی کی بنیاد اٹھتی ہے اور اسی کی روشنی میں زندگی کی عمارت بلند ہوتی ہے اس لئے قرآنِ کریم نے بار بار ایمان کا ذکر کیا ہے۔

۲: ایمان کے بعد اس آیتِ کریمہ میں ہجرت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ہجرت ایمان کا تقاضا بھی ہے اور ایمان کا پھل بھی۔ہجرت کا معنی ہے ''چھوڑ دینا''۔فتح مکہ سے پہلے اپنا گھر اور اپنا مال و دولت چھوڑ کر مدینہ پہنچنا ہجرت کہلاتا تھا۔لیکن فتح مکہ کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مرکزِ اسلام میں پہنچنا اس لئے ضروری نہ رہا کیونکہ پورا جزیرۂ عرب آہستہ آہستہ اسلام کے زیرِ نگیں آ گیا اور اسلامی ریاست قائم ہو گئی۔لیکن فتح مکہ کے بعد بھی ہجرت کا ایک تصور باقی رہا اور قیامت تک باقی رہے گا۔وہ ہجرت وہ ہے جس کے بارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

المهاجر من هجر مانهي الله عنه ﴿مہاجر وہ ہے جو ہر وہ چیز چھوڑ دے جس سے اللہ نے روکا ہے﴾

پہلے وطن چھوڑنے کو ہجرت کہا جاتا تھا اب ہر اس بات کو چھوڑ دینا جسے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے اللہ کے اوامر پر عمل کرنا اور نواہی سے رکنا، یہ وہ ہجرت ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔یہ ہجرت جیسا کہ عرض کیا گیا ایمان کا لازمی تقاضا ہے، جو آدمی اللہ اور اسکے رسول کے ہر حکم کی صداقت پر یقین رکھتا ہے وہ اگر کرنے کی بات ہے تو اس پر ضرور عمل کرے گا اور اگر رکنے کی بات ہے تو وہ اسے ضرور چھوڑ دے گا۔اور اگر وہ شریعت کی حرام کردہ چیزوں سے رکتا نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے شریعت کے احکام پر یقین نہیں وہ انہیں مانتا ضرور ہے لیکن ایسی بے دلی سے جس کا عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ایمان ایسے ماننے کو نہیں کہتے۔اس لئے قرآنِ کریم نے ایک جگہ فرمایا

یایها الذین امنوا امنوا ﴿اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ﴾

یعنی ایسا ایمان جو تمہیں آمادۂ عمل نہیں کرتا جو تمہاری زندگی پر حکمران نہیں جس کی موجودگی میں تم اللہ کی نافرمانی کرنے کی جسارت کر گزرتے ہو اور اللہ کے رسول کی سنتوں کو توڑتے ہو وہ ایمان نہیں محض زبان کا جمع خرچ ہے۔حقیقی ایمان آدمی کو اللہ سے غافل نہیں ہونے دیتا، رسول اللہ ﷺ کی محبت پر کسی اور محبت کو غالب نہیں آنے دیتا۔شریعت کی ایک ایک بات اس کے دل کی آواز بن جاتی ہے اور اگر کبھی بشری تقاضے سے کوئی گناہ کر گزرتا ہے تو اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔معمولی غفلت پر وہ اس قدر رنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

> حضرت طلحہؓ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دن اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔باغ کا گھنا سایہ کھجوروں کے باہم پیوستہ درخت، انگور کی چڑھی ہوئی شاخیں، ایسے گھنے سائے میں نہ جانے چند چڑیاں کیسے گھس آئیں۔انہوں نے باہر نکلنا چاہا راستہ نہ ملنے پر ٹہنی ٹہنی پر پھدکنا شروع کیا اور اپنی آہ و بکا سے وہ سماں باندھا کہ حضرت طلحہؓ یکسوئی قائم نہ رکھ سکے، نظر ان کے ساتھ بھٹکنے لگی۔اس منظر میں ایسے کھوئے کہ یاد ہی بھول گیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔جیسے ہی خیال آیا اس قدر دل گرفتہ ہوئے کہ دیر تک بیٹھے روتے رہے پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا کر سارا ماجرا کہہ سنایا اور اجازت چاہی کہ میں اپنا سارا باغ جو بہت قیمتی تھا صدقہ کرنا چاہتا ہوں چنانچہ اجازت ملنے پر انہوں نے صدقہ کر دیا۔

چند منٹ کی غفلت جو چڑیوں کے پیچھے سے پیدا ہوئی تھی اور نماز سے غفلت کا سبب بن گئی تھی اس کی اتنی بڑی قیمت ادا کی کہ سارا باغ اللہ کی نذر کر دیا۔صحابہ کے اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایمان ایک ایسی زندہ حقیقت تھی جو ان کی زندگی پر حکمران ان کے اعمال کی نگران اور محرک تھی، ایسا ایمان جب نصیب ہو جاتا ہے تو پھر انسان کیلئے ہر اس بات کو چھوڑنا جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے مشکل نہیں رہتا کیونکہ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ مجھے جن باتوں سے روکا گیا ہے ان سے رکنے میں میری بھلائی ہے اور جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا کرنا میرے لئے آسودگی کا باعث ہے۔وہ اپنی خواہشاتِ نفس کو شریعت کی زنجیر پہنا کر رکھتا ہے۔اس کے عمل کی تمام قوتوں اور محرکات پر اللہ کے خوف کا غلبہ ہوتا ہے۔وہ خواہشاتِ نفس کی خاطر شریعت میں چور دروازے نکالنے کی کوشش نہیں کرتا۔جب کہیں یہ دیکھ کر اس کے قدم رکنے لگتے ہیں کہ آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں، اس کا ایمان اسے سہارا دیتا ہے اور عمل کی قوتیں اس سے اور توانا ہو جاتی ہیں۔

Marfat.com

۳:۔ایمان سے دل ونگاہ کی آبیاری ہوتی ہے اور ایک مضبوط قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے اور ہجرت سے آدمی تمام آلائشوں سے پاک ہو کر خوبصورت کردار وعمل کا پیکر بن جاتا ہے۔اس کے نتیجے میں اس کے اندر یہ احساس ابلتا ہے کہ یہ ایمان کی روشنی کیا صرف میری ذات تک محدود رہے گی اور کیا گناہوں کا چھوڑ دینا اور اللہ کی نافرمانی سے تائب ہو جانا کیا میری ذات تک محدود رہ کر معاشرے اور سماج میں وہ نتائج پیدا کر سکے گا جس سے صالح انسانی معاشرے کی تعمیر ہو سکے۔ایک فرد چاہے اپنی ذات میں کیسا ہی مخلص اور پاکیزہ صفات کیوں نہ ہو اگر اس کے گردوپیش میں بدعملی کے طوفان اٹھ رہے ہوں اور بے یقینی کی وبا پھیلی ہوئی ہو تو اس کی ذاتی خوبیاں اور اس کے عمل کی پاکیزگی دیر تک باقی نہیں رہ سکتی اس لئے کہ کوئی آدمی بھی گھر میں بند رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔اسے گلی محلے میں بھی نکلنا ہے،اسے ہمسائیوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے،اس کے بچے سکول کی عمر کو پہنچ کر سکول بھی جائیں گے، اسے اپنے محلے میں غمی اور خوشی کے مواقع میں شریک ہونا ہے۔اس کے کئی کام دوسروں سے متعلق ہوں گے اور دوسروں کے اس سے۔یقیناً ایک دوسرے سے ملنا ایک مجبوری ہوگی۔ایسی صورت میں فرد کا سرتاپا خیر ہو جانا بھی اس وقت تک کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اندر ایک جذبہ نہ ابھرے،جس سے وہ اپنے گردوپیش کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کرنے کا تہیہ کرلے وہ یقین کرلے کہ میرا گھر اس وقت تک محفوظ ہے جب تک کہ یہ محلہ محفوظ ہے اور یہ محلہ اس وقت تک محفوظ ہے جب تک یہ شہر محفوظ ہے اگر مجھے اپنے گھر کو باقی رکھنا ہے تو مجھے شہر کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔اگر میں اپنے بچوں کو برائیوں سے بچانا چاہتا ہوں تو مجھے باقی بچوں کو بھی صاف ستھرا کردار دینا ہوگا۔اگر میں چاہتا ہوں کہ میرے گھر میں چوری نہ ہو میرے گھر میں ملاوٹ کا مال نہ پہنچے،تو مجھے اپنے معاشرے کے ایک ایک فرد میں دیانت وامانت کا ذوق اور اللہ کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہوگی کیونکہ ایک فرد اچھا ہے تو صرف اس کی اچھائی کافی نہیں اور اس کی اچھائی کی بقا کی کوئی ضمانت بھی نہیں کیونکہ

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اپنی خیریت،اپنے بچوں کی خیریت،اپنی بقاء اور اپنے بچوں کی بقا اسی صورت میں ہے کہ معاشرے میں جہاں تک ہو سکے خیر کے جذبات کو عام کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو شر کے عوامل کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔اپنی ذات سے باہر خیر کی قوتوں کو سپورٹ کرنا اور شر کی قوتوں کو کمزور کرنے اور ختم کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کو بروئے کار لانا اسی کو قرآن کریم کی زبان میں "جہاد" کہتے ہیں۔اس کیلئے اپنا مال صرف کرنا پڑے تو مال صرف کرنا ضروری ہے۔پسینہ بہانا پڑے تو پسینہ بہانا فرض ہے حتی کہ بدرجۂ آخر اگر جان دینا پڑے تو جان دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ۱۳ سال تک مکہ معظمہ میں جان کھپائی،پسینہ بہایا،اذیتیں برداشت کیں،صرف اس لئے تاکہ انسانوں کو صحیح معنی میں انسان بنایا جائے۔انہیں اللہ کے راستے پر چلنے کی ترغیب دی جائے،انہیں معرفتِ حق دے کر بندگی کا شعور بخشا جائے۔جب انہوں نے آپ کا جینا مشکل کر دیا اور آپ کے تمام راستے بند کر دیئے تو آپ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ پہنچ کر دعوت کی قوتوں کو بھی منظم کیا اور جہاد کی سپرٹ بھی پیدا کی۔ہر ایمان لانے والے کے دل میں ایمان کو قوت بنایا،اللہ کی ہر نافرمانی چھوڑ دینے کا جذبہ پیدا کیا پھر اسی متاعِ فکر کو عام کرنے کیلئے دعوت کو زیادہ قوت سے پھیلانے کی کوشش کی اور اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو طاقت سے دور کرنے کا نہ صرف تہیہ کیا بلکہ آہستہ آہستہ انہیں دور بھی کر دیا۔آج بھی ہم غور کریں تو ایک مسلمان کی زندگی کے یہی تین عنوانات ہیں۔﴿ایمان،ہجرت اور جہاد﴾ اور تینوں کا رشتہ آپس میں اس قدر جڑا ہوا ہے کہ کسی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ایمان ایک ایسی روشنی ہے جس کی موجودگی میں اللہ کی نافرمانی کی ظلمت کو جگہ نہیں مل سکتی اور اگر کچھ قوتیں یا نفسانی خواہشیں راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں تو پھر جہاد کے ہتھیار سے کام لے کر ان قوتوں کو سرنگوں کرنا پڑتا ہے۔

تین صفات پر تین بشارتیں:

یہ تین بنیادی صفات ہیں جن سے ایک مومن کا سراپا تیار ہوتا ہے انہیں صفات سے موصوف افراد سے جب امت تیار ہوتی ہے تو وہ حزب اللہ کہلاتی ہے۔اس کی پشت پر اللہ کی تائید ہوتی ہے اور ان کے پیشِ نظر اللہ کی رضا اور اس کے دین کے غلبے کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا وہ اپنے دل میں کسی

Marfat.com

شک وشبہ کو آنے کا راستہ نہیں دیتے۔ان کی زندگی میں اللہ کی نافرمانی داخل نہیں ہوسکتی۔وہ اللہ کی زمین پر اللہ کی نافرمانی اور لادینی کی قوتوں کے غلبے کو دیکھ کر بے چین ہوجاتے ہیں۔وہ افراد کی اصلاح کیلئے بھی جہاد کرتے ہیں اور لادینی قوتوں کے خاتمے کیلئے بھی جہاد کرتے ہیں۔یوں کہنا چاہئے کہ ایک مومن کی مومنانہ زندگی کی تعمیر ایمان اور ہجرت سے ہوتی ہے اور اس کی زندگی کے مقاصد کی تکمیل جہاد سے ہوتی ہے۔ان میں سے کوئی صفت بھی ایسی نہیں جسے عرصۂ انتظار میں رکھا جائے۔جو لوگ ایمان ویقین کی محنت کو منکرات کے خاتمے اور جہاد سے الگ رکھ کر دیکھتے ہیں وہ محنت اور یقین کی فضا بھی پیدا نہیں کرسکتے کیونکہ صالح غذا ایسے ماحول میں کبھی پیدا نہیں ہوتی جس کی فضا میں سمیت رچی بسی ہو اور کوئی فضا بھی زہر کی آلودگی سے پاک نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہاں کے رہنے والے اس کی سرکوبی یعنی جہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں ہوتے اور اسے بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کرتے۔افسوس یہ ہے کہ جو یقین وایمان کی بات کرتے ہیں وہ نہی عن المنکر کے تصور سے خالی اور جہاد سے بے بہرہ ہیں اور جو جہاد کی بات کرتے ہیں وہ اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ نمازیں بے روح ہوگئی ہیں، ایمان میں نور باقی نہیں رہا اور گھروں تک میں منکرات پہنچ گئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک مکمل اسلامی زندگی سے صدیوں سے محروم چلے آرہے ہیں۔قرآنِ کریم نے تینوں کو ایک ترتیب اور ایک ہی جگہ بیان فرما کر اس کی یکجائی کا تصور دیا ہے اور یہ اشارہ ہے کہ اگر تم اسلامی زندگی کی برکات سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہو تو ان تینوں صفات کو ایک ساتھ پیدا کرنے کی کوشش کرو ورنہ نسخے کے الگ الگ اجزا اپنے اندر کیسی بھی افادیت رکھتے ہوں کبھی بھی مریض کی صحت یابی کا باعث نہیں بنتے۔مکمل روحانی بالیدگی انہیں کو نصیب ہوتی ہے جو ان تینوں کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہی اللہ کے یہاں سب سے اعلیٰ اور سب سے بڑے مرتبے کے مالک ہیں اسی لئے فرمایا:

اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ "وہی اللہ کے نزدیک سب سے عظیم مرتبہ کے مالک ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں"

اَعْظَمُ اگرچہ اسمِ تفضیل ہے لیکن یہاں یہ تقابل کے معنی میں نہیں آیا بلکہ مطلقاً ان لوگوں کے مرتبے کے بیان کیلئے آیا ہے جو ان تینوں صفات کے حامل ہیں اور یہی لوگ دنیا وآخرت میں کامیاب ہیں۔

اگلی آیتِ کریمہ میں ان تین صفات کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے تین طرح کے انعامات کی بشارت دی ہے۔ایمان کے مقابلے میں اپنی رحمت اور مہربانی کی بشارت دی ہے جبکہ کافر اور مشرک پر اللہ کا غضب بھڑکتا ہے۔حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اللہ کی ذات وصفات میں شرک کرتا ہے تو اللہ کی غیرت جوش میں آتی ہے۔لیکن جب کوئی شخص اللہ کی ذات وصفات کو تسلیم کرکے اور اس کے تمام احکام کے واجب الاطاعت ہونے کا اقرار کرکے ایمان لانے کا اعلان کرتا ہے تو اللہ کی رحمت اس کا استقبال کرتی ہے اور انہیں صاحبِ ایمان لوگوں کی وجہ سے کافر ومشرک اللہ کے غضب سے بچے رہتے ہیں۔اللہ کا فضل وکرم اور اس کے انعامات اس کی رحمت ہی کا اظہار ہیں جب کسی کی طرف اس کی رحمت متوجہ ہوجاتی ہے تو پھر وہ اللہ کے انعامات اور فضل وکرم کا مورد بن جاتا ہے۔اس کی نیکیاں برگ وبار پیدا کرتی ہیں اور اس کی کوتاہیاں اور غلطیاں عفو ودرگزر کی سزاوار ٹھہرتی ہیں۔

جو شخص اللہ کی رضا کیلئے اس کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور جن باتوں سے اس نے روکا ہے ان میں سے ایک ایک کو چھوڑ دیتا ہے وہ اپنی سابقہ زندگی میں جن باتوں کا عادی تھا اور جن باتوں کیلئے اس نے ہمیشہ لڑائیاں لڑی تھیں، اب اللہ کی شریعت کو تسلیم کرنے کے بعد وہ ان میں سے ایک ایک سے دامن کشاں ہوجاتا ہے۔وہ جن چیزوں کو اپنے لئے خوشی کا سامان سمجھتا تھا ان سے منہ پھیر لیتا ہے۔جن مجلسوں میں اس کے خوشی کے لمحات گزرتے تھے وہ ان مجلسوں پر لعنت بھیجتا ہے۔اب اسے صرف ایک بات کی فکر رہتی ہے کہ مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہونے نہ پائے جس میں اللہ کی نافرمانی پائی جاتی ہو۔اللہ تعالیٰ اس کے انعام کے طور پر فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے چونکہ میری خاطر اپنی مرضیات کو چھوڑا ہے، اپنے کافر احباب کو چھوڑا ہے اپنی پرانی مجالس کو چھوڑا ہے اور اپنے مرغوبات کو چھوڑا ہے، ہم قیامت کو اس کا صلہ یہ دیں گے کہ ہم اسے اپنی رضا سے نوازیں گے۔

رضوان جنت میں ایک مقام بھی ہے جو اس کے خاص بندوں کو عطا ہوگا اور رضوان جنت کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے اور رضوان اللہ کی رضا کو بھی کہتے ہیں اور یہ رضا اتنا بڑا انعام ہے کہ جب اہلِ جنت کو یہ انعام عطا ہوگا تو وہ یوں محسوس کریں گے کہ جنت کی ساری نعمتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

تیسری صفت جہاد ہے۔اس کے انعام کے طور پر ارشاد فرمایا کہ جہاد کرنے والوں کو ہم جنتوں سے نوازیں گے یہ جنتیں ایسی ہوں گی جس میں اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں پائی جائیں گی جنہیں نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کبھی کسی کان نے سنا اور نہ کبھی کسی دل میں اس کا خیال تک گزرا اور مزید یہ کہ ان نعمتوں

Marfat.com

کبھی زوال نہیں آئے گا۔ بڑی سے بڑی نعمت استعمال کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن جنت کی ہر نعمت دائمی اور ابدی ہوگی۔ دنیا میں کتنی ایسی نعمتیں ہیں کہ ان کی عمر خود انسان سے طویل ہے۔ محلات کھڑے رہ جاتے ہیں محلات میں رہنے والے ختم ہو جاتے ہیں۔ زمینیں باقی رہتی ہیں اور زمیندار اٹھ جاتے ہیں۔ ایوان ہائے حکومت تا دیر باقی رہتے ہیں اور حکمران چل دیتے ہیں۔ یہ دنیا کی ریت ہے لیکن جنت میں نہ نعمتوں کو زوال آئے گا اور نہ نعمت والوں پر موت آئے گی۔ جنت بھی ہمیشہ رہے گی اور اہلِ جنت بھی ہمیشہ رہیں گے۔ یہ وہ تین نعمتیں ہیں جو ایک ایک صفت کے بدلے میں دی گئی ہیں لیکن عجیب ماجرا یہ ہے کہ جس طرح متذکرہ بالا تینوں صفات الگ الگ نتیجہ خیز نہیں ہوتیں بلکہ ان کے اثرات ایک دوسرے سے مل کر پیدا ہوتے ہیں اسی طرح یہ تینوں نعمتیں الگ الگ ہونے کے باوجود الگ نہیں ہوں گی۔ جنت ہی میں اللہ کی رضوان بھی ملے گی اور جنت ہی اللہ کی رحمت مہربانی اور اس کے فضل وکرم کا مرکز اور محور ہے۔

آخری جملہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴾ یہ ایسا بلیغ جملہ ہے کہ ادراک اس کی وسعتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا کہ تم نے جن نعمتوں کا تذکرہ پڑھا ہے۔ ان میں سے ایک ایک نعمت کی عظمت کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اسی پر تمام نہیں ہو جاتیں اس کے پاس تو اجرِ عظیم بھی ہے یعنی وہ اپنے بندوں کو جب نوازنے پر آئے گا تو صرف جنت اور اس کی نعمتوں پر اکتفا نہیں فرمائے گا بلکہ اس کے علاوہ بھی وہ کچھ عطا کرے گا جسے وہ خود عظیم فرما رہا ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کی اپنی شخصیت کے مطابق بلندی اور پستی ہوتی ہے اور اپنی وجاہت کے مطابق کثرت اور قلت ہوتی ہے۔ جب ایک بچہ کسی چیز کو بڑا کہتا ہے تو وہ بڑی چیز اس کے اپنے ہاتھوں کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن جب باپ کسی چیز کو بڑا کہتا ہے تو وہ اس کے خیال کی وسعتوں کے مطابق ہوتی ہے۔ پھر بڑی عمر کے لوگوں میں بھی علم، دولت اور حوصلہ کے اعتبار سے انسانوں کی بے شمار قسمیں ہیں اور ہر شخص کے بڑے اور چھوٹے الگ الگ پیمانے ہیں۔ ایک غریب آدمی چند ہزار روپے کو بہت بڑی رقم سمجھتا ہے لیکن ایک امیر آدمی چند ہزار کو خاطر میں لانا ہی پسند نہیں کرتے۔ بادشاہ سونا اچھالتے اور اشرفیاں لٹاتے ہیں اور عام آدمی ایک ایک اشرفی کو سنبھال کر رکھتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ اجرِ عظیم ہر ایک کی اپنی حیثیت کے مطابق ہے جب بندہ کسی اجر کو بڑا کہتا ہے تو وہ ایسا ہی اجر ہوگا جسے بندے دے سکتے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی اجر کو اجرِ عظیم کہتا ہے تو وہ اس کی اپنی شان کے لائق ہے۔ اس کی وسعتیں انسانوں کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔ ہمارے حساب کتاب اور ناپ تول کے پیمانے اس کے سامنے شکست ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنی پرواز کے مطابق اندازہ کر سکتا ہے کہ اللہ کا اجرِ عظیم کیا ہوگا لیکن سچائی یہ ہے کہ اس کا صحیح علم صرف قیامت کو ہو سکے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴿التوبة : ۲۳، ۲۴﴾

اے ایمان والو! تم اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو اپنا ولی نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور تم میں سے جو لوگ ان کو اپنا ولی بنائیں گے تو وہی لوگ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ٹھہریں گے۔ (۲۲) ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں کھٹکا لگا رہتا ہے اور وہ حویلیاں جو تمہیں پسند ہیں اگر تمہیں اللہ اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرما دے اور اللہ بد عہدوں کو بامراد نہیں کرتا۔ (۲۳)

اللہ سے ولایت کے رشتے میں کوئی دوسرا رشتہ حائل نہیں ہو سکتا:

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی کامیابی، اللہ کے یہاں رفعِ درجات جنت کی نعمتوں کا استحقاق اور اللہ سے اجرِ عظیم کی امید کا دار و مدار صرف تین باتوں پر رکھا گیا ہے۔ ﴿ایمان، ہجرت اور جہاد﴾ کیونکہ یہی وہ تین اساسی باتیں ہیں جس کو اختیار کرنے کے بعد ایک شخص اللہ کا وفادار، اللہ کے رسول کا فرمانبردار اور مومن کہلا سکتا ہے اور انہیں صفات کے حامل مومن جب جماعت کی شکل اختیار کرتے ہیں تو وہ حزب اللہ بن جاتے

Marfat.com

ہیں اور آنحضرت ﷺ کی راہنمائی میں ایک ایسی امت تشکیل پاتی ہے جو اپنے نظریات میں مخلص، اپنے رجحانات میں واضح، اپنے فیصلوں میں یکسو اور اپنے انجام پر کامل یقین رکھنے والی اور دل و دماغ کے رشتوں میں اللہ اور رسول کی کامل وفادار ہوتی ہے۔ وہ اپنی عبادات میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتی، اپنے تعلقات اور محبتوں میں اللہ اور اس کے رسول پر کسی کو ترجیح نہیں دیتی، اس کا ایک ایک فرد دل آویز شخصیت کا مالک ہوتا ہے، دل نوازی کا سلیقہ اس کے لہو میں گردش کرتا ہے۔ اس کی تمام وفاداریاں اور اس کی محبتوں کے تمام علاقے اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین سے پیوست ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں میں انسانوں کی طرح رہتا ہے۔ ماں باپ کے حقوق ادا کرتا اور ان سے محبت کرتا ہے۔ بھائیوں کے حقوق بجالاتا ہے، معاشرے کا سب سے منجھا ہوا اور شائستہ انسان ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان میں کوئی رشتہ اللہ اور اس کے رسول کے رشتے کی قیمت بن جائے یا کوئی رشتہ اللہ اور اس کے رسول کے رشتے پر غالب آنے لگے، ماں باپ اور اقربا اپنے گمراہ نظریات پر چلنے کیلئے اصرار کریں تو ایک مومن اپنے طبعی تقاضوں اور خونی رشتوں کو ایک طرف رکھ کر دینی رشتوں کے تقاضوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے کیونکہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا مفہوم ہی یہ ہے کہ نظریات کی دنیا میں اور راہنمائی کے حوالے سے ان کے مقابلے میں کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا جاسکتا اور اگر کبھی ان کے تعلق اور دوسرے تعلقات میں تصادم کی کیفیت پیدا ہو جائے تو ایمان کی قوت پہلے لمحے میں یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ مجھے کس طرف جانا ہے۔ اسے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا

رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا

میں نے اللہ کو رب کے طور پر اپنا لیا ہے وہ صرف میرا روزی دہندہ ہی نہیں بلکہ مجھے آئین اور قانون دینے والا بھی ہے۔ حلت و حرمت اور جائز اور ناجائز کے فیصلے اسی کی بارگاہ سے ہوں گے۔ میں نے اسلام کو دین کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ اب میری زندگی کا طرز عمل اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کا قانون اور مسلمان مملکت کا آئین صرف اسلام ہوگا اور محمد ﷺ کو میں نے نبی مان لیا ہے ایک وہی ہیں جو اللہ اور میرے درمیان واسطہ ہیں۔ ان پر اللہ کی وحی اترتی ہے۔ وہ اپنی ذات میں معصوم عن الخطا ہیں۔ دنیا کا کوئی راہنما کمزوریوں سے مبرّا نہیں لیکن وہ ہر کمزوری سے بالا ہیں اور ہر نارسائی سے محفوظ ہیں۔ ان کے واسطے سے جو ہمیں دین ملا ہے، وہ از اول تا آخر ہمارا سرمایہ ہے۔ اس کے راستے میں اگر باپ جیسا عظیم رشتہ بھی حائل ہو اور بھائیوں جیسے دست و بازو بھی دوسری طرف کھینچنے کی کوشش کریں تو میں اس رشتے کو توڑ ڈالوں گا۔ میں ان علاقات کو جھٹک دوں گا کیونکہ ہجرت نے مجھے ایمان کے راستے پر چلنا اور غیر اسلام سے دامن کشاں ہونا سکھایا ہے۔ میں اسلام کیلئے وطن بھی چھوڑ چکا ہوں اور ان رشتوں کو بھی جو اس راستے میں حائل ہوتے اور ایمان پر کفر کو ترجیح دیتے ہوں بلکہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر ان تمام قوتوں کے خلاف جدوجہد اور بدرجۂ آخر قتال کرنے کا پابند ہوں جو اسلام کے راستے میں حائل ہوں اور اللہ کی زمین پر کفر کو غالب رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ ہے وہ بات جو اس آیت کریمہ میں فرمائی گئی ہے۔ اس میں نام اگرچہ صرف دو رشتوں کا لیا گیا ہے یعنی باپ اور بھائی۔ لیکن اگلی آیتِ کریمہ میں اس اجمال کو کھول دیا گیا ہے اور ایمان، ہجرت اور جہاد کے اصل ہدف کو واضح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ انسانوں کے انسانوں سے تعلقات ایک ضرورت ہیں لیکن اس کی حدود بھی ہیں۔ اصل ہدف اور منزل وہ اللہ کا دین ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے رشتے سے وجود میں آتا ہے۔ اسی دین کی پابندی اور بالادستی سے زندگی کا وہ رویہ وجود میں آتا ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی زندگی ایک خاص قالب میں ڈھلتی ہے۔ نئی معاشرت وجود میں آتی ہے، نئی تہذیب اور نیا تمدن جنم لیتا ہے، اجتماعی زندگی کے تمام ادارے اسلامی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اس سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک ایسی یکسوئی پیدا ہوتی ہے کہ مسجدوں میں جس کی عبادت ہوتی ہے گھروں میں اسی کی محبت اور اس کے رسول کی محبت بچوں کے ذہنوں میں اتاری جاتی ہے۔ اسی کے رسول کی راہنمائی میں اصولِ تربیت اور اصولِ خانہ داری وجود میں آتے ہیں۔ اسی دین کی بنیاد پر تعلیم کی نشوونما ہوتی ہے اور وہاں سے نکلنے والا ہر نوجوان اللہ کے دین کا علمبردار اور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس میں ایمان اور ہجرت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایمان کی راہنمائی میں انسانیت کی تشکیل ہوتی ہے اور ہجرت کی نگرانی میں ہر غلط بات سے اجتناب کیا جاتا ہے اور اگر کبھی مملکتِ اسلامیہ پر باہر سے نظریاتی یا فوجی حملہ ہوتا ہے تو جہاد کی قوت سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے۔ زندگی کی اس تصویر میں اگر آپ غور کریں گے تو اس بات کی کوئی گنجائش نہیں مل سکتی کہ کسی اور رشتے یا کسی اور چاہت کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین کے رشتوں پر ترجیح دی جائے لیکن دین کی اس ہمہ گیری کے باوجود پھر بھی اگر کوئی اپنے تعلقات کی باگ ڈور ان لوگوں کے ساتھ باندھ لیتا ہے جو دین کے دشمن اور دوسروں کے ایجنٹ ہیں۔ تو اس

Marfat.com

صاف مطلب یہ ہے کہ اس کا رشتہ اللہ اور رسول سے محض زبان کا رشتہ ہے حقیقت میں اللہ کو وہ اپنا ولی نہیں سمجھتا بلکہ اس کے اولیاء وہی ہیں جن سے وہ تعلقات نبھانے پر اصرار کرتا ہے۔ ہمارے تعلق کی تو سادہ سی پہچان یہ ہے

بہت سادہ سا ہے اپنا اصولِ دوستی کوثر
جو ان سے بے تعلق ہے ہمارا ہو نہیں سکتا

اس لئے آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جو اسلام کے مخالفین سے رشتۂ ولایت رکھنے پر مصر ہیں وہ در حقیقت انہیں میں سے ہیں۔ وہ انہیں کے مفادات کے نگران اور انہیں کے مفادات۔ کے نمائندے ہیں۔ ایسے لوگ جو مسلمان کہلا کر دوسری وابستگیاں (جو اسلام کو نقصان پہنچاتی ہیں) ختم نہ کر سکیں تو یہی لوگ در حقیقت ظالم ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ دلوں کی بیداری کن تعلقات سے ہونی چاہیے۔

اگلی آیتِ کریمہ میں تمام ممکن تعلقات کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے۔ لیکن ان تعلقات کو نہایت خوبصورت ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان نفسیاتی طور پر رشتوں میں کس ترتیب کو پسند کرتا ہے۔ پہلے باپ، بیٹے، بھائی، بیوی اور خاندان کے رشتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بنیاد محبت یا عصبیت پر ہے۔ پھر اموال، کاروبار اور مکانات کا ذکر کیا ہے جو انسان کیلئے علائق کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن انسانی ضروریات اور ترجیحات کے حوالے سے انسان کیلئے ان سے دامن کشاں ہونا بہت مشکل ہے۔ اموال کے ساتھ ﴿اقْتَرَفْتُمُوْهَا﴾ کی قید لگائی گئی ہے۔ جو اس کے محبوب ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ جس مال کو آدمی کماتا ہے وہ اسے زیادہ محبوب بھی رکھتا ہے۔ تجارت کے ساتھ ﴿تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا﴾ کی قید اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ وہ کامیاب اور چلتی ہوئی تجارت ہے اور تجارت کرنے والے کے دل و دماغ کا ایک ایک ریشہ اس میں پھنسا ہوا ہے۔ ایسی تجارت اور ایسے تعلق میں توازن قائم رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ توازن قائم رکھتے ہوئے عموماً حلال و حرام کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور تجارت کا رشتہ غالب آ جاتا ہے۔ یہ تمام رشتے جن کا ذکر کیا گیا ہے حقیقت میں انسانی زندگی کیلئے ایک بت کی حیثیت رکھتے ہیں انسان دن رات ان کی پوجا کر رہا ہے۔ بظاہر اللہ کو وحدہٗ لاشریک سمجھتا ہے لیکن زندگی کے معاملات میں پوجا ہمیشہ ان رشتوں کی ہوتی ہے اور انہیں کے حوالے سے زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اقبال نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

ان تمام رشتوں کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد پروردگار مسلمان کہلانے والوں سے سوال کرتا ہے کہ تم بتاؤ تمہیں یہ رشتے زیادہ عزیز ہیں یا اللہ اور اس کا رسول؟ تمہیں یہ رشتے زیادہ پیارے ہیں یا اللہ کے راستے میں جہاد کرنا؟ اگر تو تم اللہ اور اس کے رسول کو اور اس کے دین کی بالادستی کیلئے جہاد کرنے کو ان تمام رشتوں پر ترجیح دیتے ہو تو پھر کامل مومن ہو اور اگر ایسا نہیں تو پھر معاملہ انتہائی خطرناک ہے۔ تم ایک ایسی امت ہو جسے قیامت تک کیلئے فیصلہ کن حیثیت دی گئی ہے۔ اگر اللہ اور اس کے رسول سے تمہارے تعلق اور اس کے راستے میں جان فدا کرنے کے حوالے سے تمہاری عصبیت میں کوئی دراڑ پیدا ہو گئی یا کوئی کمی رہ گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ کی بنیادیں کج ہو جائیں گی۔ انسان کی منزل کھوٹی ہو جائے گی اور انسانیت کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ
مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ
تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ

Marfat.com

وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ
ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا
اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ
عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۸﴾ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ
اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾ ع

بیشک اللہ نے تمہاری مدد فرمائی ہے بہت سے مواقع پر اور حنین کے دن بھی جبکہ تمہیں غرہ میں مبتلا کر دیا تھا تمہاری کثرت نے پس وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پشت پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی سکنیت نازل فرمائی اور ایسی فوجیں نازل کیں جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو عذاب دیا اور یہی بدلہ ہے کافروں کا۔ پھر اللہ توبہ کی توفیق دے دیتا ہے اس کے بعد جسے چاہتا ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ایمان والو! بلاشبہ مشرکین بالکل پلید ہیں پس یہ اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب بھی پھٹکنے نہ پائیں اور اگر تمہیں اندیشہ ہو معاشی بدحالی کا تو اللہ اگر چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے مستغنی کردے گا۔ بیشک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ لڑو ان اہلِ کتاب سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روزِ آخرت پر اور نہ حرام ٹھہراتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور نہ دین بناتے ہیں تا آنکہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں۔ (۲۵ تا ۲۹) (رکوع: ۴)

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ
بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

Marfat.com

بے شک اللہ نے تمہاری مدد فرمائی ہے بہت سے مواقع پر اور حنین کے دن بھی جبکہ تمہیں غرہ میں بتلا کر دیا تھا تمہاری کثرت نے پس وہ کثرت تمہارے کسی کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پشت پھیر کر بھاگ نکلے۔(۲۵) پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسی فوجیں نازل کیں جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور کافروں کو عذاب دیا اور یہی بدلہ ہے کافروں کا۔(۲۶) پھر اللہ توبہ کی توفیق دے دیتا ہے اس کے بعد جسے چاہتا ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔(۲۷)

﴿التوبة : ۲۵ تا ۲۷﴾

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ مسلمانوں میں منافقین بھی تھے اور کمزور ایمان والے بھی۔ انہوں نے جب یہ سنا کہ پروردگار نے تمام اہلِ عرب سے ترکِ تعلق کا اعلان کر دیا ہے اور ذمہ داری سے دستبرداری ظاہر فرمائی ہے تو انہیں شدید پریشانی ہوئی کیونکہ ان میں سے وہ لوگ جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ ان کا تعلق مسلمانوں سے ابھی اتنا قائم نہیں ہوا تھا جتنا وہ اپنے کفار رشتہ داروں سے رکھتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ نے عفو و درگزر کی جو پالیسی اپنائی ہے شاید یہی چلتی رہے گی اور ہمارے کافر رشتہ داروں سے تعلقات بدستور باقی رہیں گے اور اس طرح سے ہمارے مالی معاملات اور کاروباری تعلقات میں کسی نقصان کا اندیشہ پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن اچانک سورۃ توبہ کی بعض آیات کی شکل میں ترکِ معاہدات اور ترکِ تعلق کا اعلان ان کے لئے انتہائی تشویش کی بات تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بعض لوگ ایسے تھے جو اس اعلان میں خطرات کی بو سونگھ رہے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جزیرۂ عرب میں ابھی تک مشرکین کی ایک معقول تعداد موجود ہے ایسے اعلانات ان میں اشتعال پیدا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ وہ جب یہ دیکھیں گے کہ ان کا وطن ان سے چھینا جا رہا ہے تو وہ یقیناً اس کیلئے آخری اقدام سے بھی گریز نہیں کریں گے، اس کے نتیجے میں یقیناً کوئی بڑا معرکہ وجود میں آسکتا ہے۔ اس طرح سے مسلمانوں کیلئے خطرناک صورتحال پیدا ہو سکتی ہے۔

کامیابی صرف نصرتِ الٰہی سے ہوتی ہے پھر پریشانی کیسی؟

اس پوری صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے پیشِ نظر آیات کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم حالات کے تیوروں سے گھبرا رہے ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کی مختصر تاریخ میں اس سے پہلے کئی دفعہ بڑے بڑے پیچیدہ حالات پیدا ہو چکے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر موقع پر مسلمانوں کی مدد فرمائی، اب تو اسلام اور مسلمان جزیرۂ عرب کی فیصلہ کن قوت ہیں۔ لیکن جنگِ بدر کے وقت مٹھی بھر مسلمانوں کے سوا کون سی قوت تھی جو مسلمانوں کو فتح دلانا تو دور کی بات ہے تحفظ کی بھی ضمانت دے سکتی۔ مقابلے میں قریش کا طاقتور لشکر اور چاروں طرف پھیلے ہوئے ان کے ہم مذہب قبائل اسلحہ کی فراوانی اور رسد و کمک کے غیر معمولی وسائل، لیکن ایسی خطرناک صورتحال میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم عطا فرمائی جس کی نظیر شاید تاریخ میں نہ مل سکے۔ جنگِ احد میں اپنی غلطیوں سے اگرچہ مسلمان حادثے کا شکار بھی ہوئے لیکن محض اللہ کی تائید و نصرت سے میدان انہیں کے ہاتھ رہا اور غنیم کو پسپائی کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی۔ جنگِ خندق میں ہر شخص مسلمانوں کی تباہی دیکھ رہا تھا ایک طرف پورے جزیرۂ عرب کی منتخب اور خونخوار قوت اور دوسری طرف تین ہزار نہتے اور کمزور مسلمان لیکن نتیجہ سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی مدد فرمائی کہ دشمن اپنی ناکامی کے زخم چاٹتا ہوا واپس جانے پر مجبور ہو گیا اور آنحضرت ﷺ نے ایک ایسا تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جس کی صداقت تاریخ کی سچائی بن گئی۔ آپ نے فرمایا کہ

﴿آج کے بعد تم ہی قریش پر چڑھ کر جاؤ گے، قریش اپنی اقدامی قوت کھو چکے ہیں۔﴾

مختصر یہ کہ کوئی موقع ایسا نہیں جس میں پروردگار نے انتہائی خطرناک حالات میں بھی مسلمانوں کی مدد نہ فرمائی ہو۔ تو پھر کس قدر عجیب بات ہے کہ آج کچھ کمزور ایمان کے لوگ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر کمزوری کا اظہار کر رہے ہیں۔

پہلے جملے میں ایک مجمل اور مطلق بات کہنے کے بعد ایک مثال سے اس کی وضاحت فرمائی گئی اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک شبہے کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ یوں تو اللہ کی تائید و نصرت کا ایک ایک موقع تمہارے سامنے ہے لیکن اگر تم کسی واقعہ کو بطور نمونہ یا بطور دلیل دیکھنا چاہتے ہو تو قریبی تاریخ میں تمہارے سامنے "حنین" کا واقعہ گزر رہا ہے۔ اس میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے نہایت ناگفتہ بہ حالات میں مسلمانوں کی مدد فرمائی وہ بجائے

Marfat.com

خود اس قدر سبق آموز ہے کہ اس کے بعد کسی اور حقیقت کو دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ وہ ایک طرف اگر اللہ کی تائید و نصرت کی کھلی مثال ہے تو دوسری طرف اس لحاظ سے مسلمانوں کے لئے سبق آموز ہے کہ اس میں مسلمانوں کو اپنی ایک غلطی کا خمیازہ بڑی خطرناک صورت میں برداشت کرنا پڑا اگر بروقت اللہ کی نصرت حوصلہ نہ دیتی اور فرشتے مسلمانوں کے ہمرکاب نہ ہوتے تو کوئی سی ناگوار صورتحال پیش آسکتی تھی۔ اس واقعہ کی اہمیت کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ غزوۂ حنین کے بارے میں کچھ تفصیل عرض کردی جائے۔

غزوۂ حنین کی تفصیل:

حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے۔ حنین کے قریب ایک اور وادی ہے جسے ''وادیٔ اوطاس'' کہتے ہیں۔ اسے بنو ہوازن کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ یہ وادی اگرچہ حنین سے علیحدہ ہے لیکن عام طور پر اس علاقے کو حنین ہی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

مکہ معظمہ فتح ہوجانے کے بعد عام تاثر یہ تھا کہ عرب کا مرکز قوت سرنگوں ہوگیا ہے کیونکہ قریش کو پورے عرب میں مرکزی اور حاکمانہ حیثیت حاصل تھی۔ اسی لئے عام قبائل نے خود پیش قدمی کی اور اسلام قبول کرنا شروع کردیا۔ لیکن طائف پر اس کا بالکل الٹا اثر پڑا۔ وہاں کے دو بڑے قبیلے اپنی طاقت اور مالداری کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ ہوازن اور ثقیف کے قبیلوں نے بجائے اسلام قبول کرنے کے جنگ کی تیاریاں شروع کردیں۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر ہم نے ذرا کمزوری دکھائی تو مکہ کے بعد ہماری باری ہے اور مسلمان اس علاقے کو فتح کیے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ انہیں چونکہ اپنی بہادری اور فنونِ جنگ سے آگاہی پر غیر معمولی ناز تھا، اس لئے ہوازن اور ثقیف کے رؤسا نے مضر، جشم اور سعد بن بکر کے قبائل کو اپنے ساتھ شامل کرکے باقاعدہ فوجوں کا اجتماع شروع کردیا۔ مالک بن عوف جو ہوازن کا رئیسِ اعظم تھا، اسے بالاتفاق فوجوں کا کمانڈر چنا گیا اور درید بن الصمہ کو بطور مشیر اپنے ساتھ لیا گیا۔ وہ اگرچہ سو سال کا بہت بوڑھا ہوچکا تھا لیکن اس کی بہادری اور تجربہ کاری مسلّم تھی۔ اس لئے مشورہ کیلئے اسے ساتھ رکھا گیا۔ جوش و جذبہ کا عالم یہ تھا کہ ہر قبیلہ اپنے تمام اہل و عیال ساتھ لے کر آیا تھا اور خیال یہ تھا کہ بچے اور عورتیں ساتھ ہوں گی تو ان کی حفاظت کی غرض سے لوگ جانیں دے دیں گے۔ آنحضرت ﷺ کو جب وادیٔ اوطاس میں دشمن کے غیر معمولی اجتماع کی خبر ملی۔ تو آپ نے بھی مقابلہ کی تیاریاں شروع کیں۔ رسد اور سامانِ جنگ کیلئے قرض کی ضرورت پیش آئی۔ عبداللہ بن ربیعہ ؓ نہایت دولت مند تھے ان سے تیس ہزار درہم قرض لیا۔ صفوان بن امیہ جو مکہ کا رئیس اعظم اور مہمان نوازی میں مشہور تھا لیکن اب تک اسلام نہیں لایا تھا اس سے آنحضرت ﷺ نے اسلحۂ جنگ مستعار مانگے اس نے سو (۱۰۰) زرہیں اور اس کے لوازمات پیش کیے۔

شوال آٹھ (۸) ہجری مطابق جنوری و فروری ۶۳۰ء میں اسلامی فوجیں جن کی تعداد بارہ ہزار تھی، اس سروسامان سے حنین کی طرف بڑھیں کہ بعض صحابہ کی زبان سے بے اختیار نکل گیا کہ آج ہم پر کون غالب آسکتا ہے۔ لیکن بارگاہِ ایزدی میں یہ نازش پسند نہ تھی۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

اسلامی لشکر منگل اور بدھ کی درمیانی رات دس (۱۰) شوال کو حنین پہنچا۔ لیکن مالک بن عوف یہاں پہلے ہی پہنچ کر اور اپنا لشکر رات کی تاریکی میں اس وادی کے اندر اتار کر، اسے راستوں، گزرگاہوں، گھاٹیوں، پوشیدہ جگہوں اور دروں میں پھیلا اور چھپا چکا تھا اور یہ حکم دے چکا تھا کہ مسلمان جوں ہی نمودار ہوں انہیں تیروں سے چھلنی کردینا پھر ان پر یکدم اکٹھے ٹوٹ پڑنا۔

بنو ہوازن اور بنو ثقیف تیر اندازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ یوں تو وہ کسی حوالے سے دوسروں سے کم نہ تھے لیکن تیر اندازی ان کا خاص جوہر تھا۔ صبح کے وقت رسول اللہ ﷺ نے لشکر کی ترتیب و تنظیم فرمائی اور پرچم باندھ باندھ کر لوگوں میں تقسیم کیے۔ پھر صبح کے

Marfat.com

جھٹ پٹے میں مسلمانوں نے آگے بڑھ کر وادیٔ حنین میں قدم رکھا۔ وہ دشمن کے وجود سے قطعی بے خبر تھے۔ انہیں مطلق علم نہ تھا کہ اس وادی کے دروں کے اندر ثقیف اور ہوازن کے جیالے ان کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ اس لئے وہ بے خبری کے عالم میں پورے اطمینان کے ساتھ اتر رہے تھے کہ اچانک ان پر تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔ پھر فوراً ہی ان پر دشمن کے پرے کے پرے ایک دم اکٹھے ٹوٹ پڑے۔ اس اچانک حملے سے مسلمان سنبھل نہ سکے اور ان میں ایسی بھگدڑ مچی کہ کوئی کسی کی طرف دیکھ نہ رہا تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہ بھاگنے والے وہ لوگ تھے جن کے پاؤں کبھی کسی میدان میں پیچھے نہیں ہٹے تھے۔ لیکن اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو مسلمانوں کی پسپائی خلاف تعجب معلوم نہیں ہوتی۔ ایک فوج جو صبح کے اندھیرے میں پہاڑی وادی میں اترتی ہے اور ابھی اسے صفیں باندھنے اور پاؤں جمانے کا موقعہ نہیں ملتا کہ اس پہاڑی وادی کے دروں اور غاروں میں چھپے ہوئے ہزاروں تیرانداز اچانک ان پر تیروں کی بارش کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ لوہے کے نہیں گوشت پوست کے بنے ہوئے تھے، اس بارش میں کیسے کھڑے رہ سکتے تھے؟ وہ پیچھے پلٹے لیکن بھاگنے کیلئے نہیں بلکہ سنبھلنے کیلئے اور ساتھ ہی ایک اور بات بھی ذہن میں رکھئے کہ ان میں دو ہزار کی تعداد میں ایسے لوگ تھے جنہیں ''طلقاء'' کہا جاتا ہے۔ جن میں بیشتر ابھی ایمان نہیں لائے تھے۔ اپنی منافقت چھپانے کیلئے لشکر میں چلے آئے تھے بلکہ سب سے آگے آگے تھے۔ مقصود پہلے سے یہ تھا کہ جیسے ہی کوئی بہانہ ملا ہم بھاگ کھڑے ہوں گے تاکہ مسلمانوں کو پاؤں جمانے کا موقع نہ مل سکے۔ یہ بات میں پہلی دفعہ نہیں کہہ رہا بلکہ بعض صحابہ کی بھی یہی رائے تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ام سلیم ﷞ جو اس جنگ میں شریک تھیں انہوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ حضور ان طلقاء کو قتل کر دیجئے، انہیں کی وجہ سے مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ لیکن جہاں تک صحابہ کرام کا تعلق ہے وہ اگرچہ تیراندازی کی آندھی میں کسی حد تک حواس باختہ ہو گئے لیکن انہوں نے سنبھلنے میں تاخیر نہیں کی۔ تیروں کا مینہ برس رہا تھا، مسلمانوں کی فوج دائیں بائیں جگہ بنانے کی فکر میں تھی۔ لیکن دشمن انہیں کہیں بھی پاؤں ٹکانے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ ایسے حال میں بھی ایک پیکرِ مقدس سراپا استقلال بنے کھڑا تھا جو تنہا ایک فوج، ایک ملک، ایک اقلیم، ایک عالم بلکہ مجموعہ کائنات تھا۔ آنحضرت ﷺ نے داہنی جانب دیکھا اور پکارا یامعشر الانصار، آواز کے ساتھ انصار کی صدا آئی: لبیک یا رسول اللہ ابشر نحن معک ﴿ہم حاضر ہیں یارسول اللہ آپ خوش ہیں کہ ہم آپ کے پاس ہیں﴾ ایک دوسری روایت میں ہے: نحن بین یدیک ﴿ہم حاضر ہیں یارسول اللہ ہم آپ کے سامنے ہیں﴾ پھر آپ نے بائیں جانب مڑ کر پکارا اب بھی وہی آواز آئی۔ آپ سواری سے اتر پڑے اور جلالِ نبوت کے لہجہ میں فرمایا ''میں اللہ کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہوں''۔ بخاری کی دوسری روایت میں ہے: انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب ﴿میں پیغمبر ہوں یہ جھوٹ نہیں ہے میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں﴾۔ حضرت عباس ﷜ نہایت بلند آواز تھے۔ آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین اور انصار کو آواز دو۔ انہوں نے نعرہ مارا ﴿ یامعشر الانصار! اے گروہ انصار۔ یااصحاب الشجرۃ! اے اصحاب شجرۃ (بیعت رضوان والے) ﴾ اس پُر اثر آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج دفعۃً پلٹ پڑی۔ جن لوگوں کے گھوڑے کشمکش اور گھمسان کی وجہ سے مڑ نہ سکے، انہوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے۔ نبی کریم ﷺ نے نظر اٹھا کر دیکھا تو گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اب چولہا گرم ہوگیا ہے۔ پھر آپ نے زمین سے ایک مٹھی مٹی لے کر دشمن کی طرف پھینکتے ہوئے فرمایا: ﴿شاھت الوجوہ ''چہرے بگڑ جائیں''﴾۔ یہ مٹھی بھر مٹی اس طرح پھیلی کہ دشمن کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جس کی آنکھ اس سے بھر نہ گئی ہو۔ دفعۃً لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ کفار بھاگ نکلے اور جو رہ گئے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ بنو مالک جم کر لڑے لیکن ان کے ستر آدمی مارے گئے اور جب ان کا علم بردار عثمان بن عبداللہ مارا گیا تو وہ بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔

Marfat.com

شکست خوردہ فوج ٹوٹ پھوٹ کر کچھ اوطاس میں جمع ہوئی اور کچھ طائف میں جا کر پناہ گزیں ہوئی۔ جن کے ساتھ سپہ سالار لشکر مالک بن عوف بھی تھا۔

درید بن الصمہ کئی ہزار کی جمعیت لے کر اوطاس میں آیا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو عامر اشعری ؓ کے ماتحت تھوڑی سی فوج اس کے استیصال کیلئے بھیج دی۔ حضرت ابو عامر، درید کے بیٹے کے ہاتھ سے مارے گئے اور علمِ اسلام اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابو موسیٰ اشعری نے آگے بڑھ کر حملہ کیا، دشمن کو قتل کر کے علم اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ درید ایک شتر پر ہودج میں سوار تھا۔ ربیعہ بن رفیع نے اس پر تلوار کا وار کیا لیکن اچٹ کر رہ گئی، اس نے کہا تیری ماں نے تجھے اچھے ہتھیار نہیں دیئے۔ پھر کہا میرے محمل میں تلوار ہے۔ نکال لو اور جب اپنی ماں کے پاس جانا تو کہنا کہ میں نے درید کو قتل کر دیا۔ ربیعہ نے جا کر ماں کو اس کے قتل کی خبر دی۔ تو اس نے کہا خدا کی قسم! درید نے تیری تین ماؤں کو آزاد کرایا تھا۔

(اسیرانِ جنگ کی تعداد ہزاروں سے زیادہ تھی۔ ان میں حضرت شیما بھی تھیں جو رسول اللہ ﷺ کی رضاعی بہن تھیں۔ لوگوں نے جب ان کو گرفتار کیا تو انہوں نے کہا میں تمہارے پیغمبر کی بہن ہوں۔ لوگ تصدیق کرنے کیلئے آنحضرت ﷺ کے پاس لائے انہوں نے پیٹھ کھول کر دکھائی، ایک دفعہ بچپن میں آپ نے دانت سے کاٹا تھا۔ یہ اس کا نشان ہے۔ فرطِ محبت سے آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ان کے بیٹھنے کیلئے خود ردائے مبارک بچھائی، محبت سے باتیں کیں، چند شتر اور بکریاں عنایت فرمائیں اور ارشاد کیا کہ "جی چاہے تو میرے گھر چل کر رہو اور گھر جانا چاہو تو وہاں پہنچا دیا جائے۔ انہوں نے خاندان کی محبت سے وطن جانا چاہا چنانچہ عزت واکرام کے ساتھ پہنچا دی گئیں"۔

محاصرۂ طائف: حنین کی بقیہ شکست خوردہ فوج طائف میں جا کر پناہ گزیں ہوئی اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں طائف نہایت محفوظ مقام تھا۔ طائف، اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے گرد شہر پناہ کے طور پر چار دیواری تھی۔ یہاں ثقیف کا جو قبیلہ آباد تھا، نہایت شجاع، تمام عرب میں ممتاز اور قریش کا گویا ہمسر تھا۔ عروہ بن مسعود جو یہاں کا رئیس تھا ابو سفیان (حضرت امیر معاویہ کے باپ) کی لڑکی اس کو بیاہی تھی۔ کفار مکہ کہتے تھے کہ قرآن اگر اترتا تو مکہ یا طائف کے رؤسا پر اترتا یہاں کے لوگ فنِ جنگ سے بھی واقف تھے۔ طبری اور ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ عروہ بن مسعود اور غیلان بن سلمہ نے جرش (یمن کا ایک ضلع) میں جا کر قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ، ضبور اور منجنیق کے بنانے اور استعمال کرنے کا فن سیکھا تھا۔

یہاں ایک محفوظ قلعہ تھا، اہلِ شہر اور حنین کی شکست خوردہ فوج نے اس کی مرمت کی، سال بھر کا رسد کا سامان جمع کیا، چاروں طرف منجنیق اور جا بجا قدر انداز متعین کئے۔

آنحضرت ﷺ نے حنین کے مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں اور خود طائف کا عزم کیا۔ حضرت خالد مقدمۃ الجیش کے طور پر پہلے روانہ کر دیئے گئے تھے۔ غرض محاصرہ ہوا اور اسلام میں یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکن آلات یعنی دبابہ اور منجنیق استعمال کئے گئے۔ دبابہ پر اہلِ قلعہ نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں اور اس شدت کی تیر باری کی کہ حملہ آوروں کو ہٹنا پڑا، بہت سے لوگ زخمی ہوئے، بیس دن تک محاصرہ رہا لیکن شہر فتح نہ ہو سکا۔ آنحضرت ﷺ نے نوفل ابن معاویہ کو بلا کر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا: لومڑی بھٹ میں گھس گئی ہے۔ اگر کوشش جاری رہی تو پکڑ لی جائے گی لیکن چھوڑ دی جائے تب بھی کچھ اندیشہ نہیں۔

چونکہ صرف مدافعت مقصود تھی۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ صحابہ نے عرض کی آپ ان کو بددعا دیں۔ آپ نے یہ دعا دی۔

اللھم اھد ثقیفا وائت (اے اللہ! ثقیف کو ہدایت کر اور توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں)

Marfat.com

تقسیمِ غنائم : محاصرہ چھوڑ کر آپ ﷺ جعرانہ تشریف لائے۔ غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا۔ چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار (سے زیادہ) بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے۔ لیکن کئی دن گزرنے پر کوئی نہ آیا تو مالِ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے۔ چار حصے حسب قاعدہ اہلِ فوج کو تقسیم کئے گئے خمس بیت المال اور غرباء و مساکین کیلئے رکھا گیا۔

مکہ کے اکثر رؤسا جنہوں نے حال میں اسلام قبول کیا تھا، ابھی تک مذبذب الاعتقاد تھے، انہی کو قرآنِ مجید میں مؤلفة القلوب کہا ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں جہاں زکوٰۃ کے مصارف بیان کئے گئے ہیں ان لوگوں کا نام بھی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کو نہایت فیاضانہ انعامات دیئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

ابوسفیان مع اولاد	۳۰۰ اونٹ، اور ۱۲ اوقیہ چاندی
حکیم بن حزام	۲۰۰ اونٹ
نضیر بن حارث بن کلدہ ثقفی	۱۰۰ اونٹ
صفوان بن امیہ	۱۰۰ اونٹ
قیس بن عدی	۱۰۰ اونٹ
سہیل بن عمرو	۱۰۰ اونٹ
حویطب بن عبدالعزی	۱۰۰ اونٹ

(ان کے علاوہ تین غیر مکی نومسلم رئیس بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرے)

اقرع بن حابس (تمیمی)	۱۰۰ اونٹ
عینیہ بن حصن (فزاری)	۱۰۰ اونٹ
مالک بن عوف (نصری)	۱۰۰ اونٹ

ان کے سوا بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے گئے۔ عام تقسیم کی رو سے فوج کے حصہ میں جو آیا فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں تھیں۔ لیکن چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا، اس لئے ہر سوار کے حصہ میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں۔

جن لوگوں پر انعام کی بارش ہوئی، عموماً اہلِ مکہ اور اکثر جدید الاسلام تھے۔ اس پر انصار کو رنج ہوا۔ بعضوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے قریش کو انعام دیا اور ہم کو محروم رکھا حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کے خون کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ بعض بولے کہ مشکلات میں ہماری یاد ہوتی ہے اور غنیمت اوروں کو ملتی ہے۔

انصار کے احساسِ محرومی پر آنحضرت ﷺ کا خطاب:

آنحضرت ﷺ نے یہ چرچے سنے تو انصار کو طلب فرمایا۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا جس میں لوگ جمع ہوئے آپ نے انصار کی طرف خطاب کیا کہ تم نے ایسا کہا؟ لوگوں نے عرض کی کہ "حضور! ہمارے سربرآوردہ لوگوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا۔ نوخیز نوجوانوں نے یہ فقرے کہے تھے۔" صحیح بخاری باب مناقب الانصار میں حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے انصار کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ تو چونکہ انصار جھوٹ نہیں بولتے تھے، انہوں نے کہا "آپ نے جو سنا صحیح ہے" آپ نے ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس کی نظیر فنِ بلاغت میں نہیں مل سکتی۔ انصار کی طرف خطاب فرما کر کہا:۔

Marfat.com

﴿ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم پہلے گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعہ سے تم کو ہدایت کی، تم منتشر اور پراگندہ تھے۔ اللہ نے میرے ذریعہ سے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے اللہ نے میرے ذریعہ سے تم کو دولتمند کیا۔ ﴾

آپ یہ فرماتے جاتے تھے اور ہر فقرہ پر انصار کہتے جاتے تھے کہ "خدا اور رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے"

آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! تم یہ جواب دو کہ اے محمد (ﷺ)! تجھ کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی، تجھ کو لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی، تو مفلس آیا تھا ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔

یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ تم یہ جواب دیتے جاؤ اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم محمد (ﷺ) کو لے کر اپنے گھر آؤ۔

انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمد ﷺ درکار ہیں"۔ اکثروں کا یہ حال ہوا کہ روتے روتے داڑھیاں تر ہو گئیں۔ آپ نے انصار کو سمجھایا کہ مکہ کے لوگ جدید الاسلام ہیں۔ میں نے ان کو جو کچھ دیا حق کی بنا پر نہیں بلکہ تالیفِ قلب کیلئے دیا۔

حنین کے اسیرانِ جنگ اب تک جعرانہ میں محفوظ تھے۔ ایک معزز سفارت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی کہ اسیرانِ جنگ رہا کر دیئے جائیں۔ یہ وہ قبیلہ تھا کہ آپ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ اسی قبیلہ کی تھیں۔ رئیسِ قبیلہ (زہیر بن صرو) نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور آنحضرت ﷺ کی طرف مخاطب ہو کر کہا "جو عورتیں چھپروں میں محبوس ہیں، انہی میں آپ کی پھوپھیاں اور آپ کی خالائیں ہیں۔ خدا کی قسم اگر سلاطینِ عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو ان سے بہت کچھ امیدیں ہوتیں اور آپ سے تو اور بھی زیادہ توقعات ہیں"۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ خاندانِ عبدالمطلب کا جس قدر حصہ ہے وہ تمہارا ہے لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے بعد جب مجمع ہو تو سب کے سامنے یہ درخواست پیش کرو۔ نمازِ ظہر کے بعد ان لوگوں نے یہ درخواست مجمع کے سامنے پیش کی آپ نے فرمایا۔ "مجھ کو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں تمام مسلمانوں سے ان کیلئے سفارش کرتا ہوں"۔ مہاجرین اور انصار بول اٹھے: ہمارا حصہ بھی حاضر ہے، اس طرح چھ ہزار دفعۃً آزاد تھے۔) (ماخوذ از سیرۃ النبی)

آیاتِ کریمہ میں بیان کردہ ہدایات:

غزوۂ حنین کا تذکرہ ہم نے تفصیل سے پڑھا آیاتِ کریمہ ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ بعض کمزور مسلمانوں کو مشرکینِ عرب کی طرف سے ذہنی تحفظات ہیں۔ وہ آنے والے خطرات کو ضرورت سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں حالانکہ انہیں خوب معلوم ہے کہ اسلامی قافلہ چند سالوں میں کامرانی کی جن منازل کو طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے وہ اس کے اپنے دست و بازو کا نتیجہ نہیں بلکہ سراسر اللہ کی عنایت اور اس کا فضل و کرم ہے۔ اس نے قدم قدم پر مسلمانوں کی مدد فرمائی، اسی سلسلے میں بارہ تیرہ مہینے پہلے پیش آنے والا غزوۂ حنین جس میں پہلے مرحلے پر مسلمانوں کے پاؤں اس بری طرح سے اکھڑے کہ مسلمانوں کے رکنے اور ٹھہرنے کے تمام امکانات ختم ہوتے جا رہے تھے۔ پوری فوج بری طرح تتر بتر ہو چکی تھی لیکن اس حال میں اللہ کی طرف سے سکینت نازل ہوئی آنحضرت ﷺ اور آپ کے مخلص ساتھیوں پر عزیمت و استقامت اور اللہ پر اعتماد کی وہ کیفیت نازل ہوئی جس نے ان کو تیروں کی بارش میں کھڑا رہنے کا حوصلہ دیا اور پھر ان کی برکت سے دوسرے مسلمانوں کو یہ دولت ملی اور چند ہی لمحوں میں پوری فوج نے صفیں باندھ لیں اور دشمن کو تلواروں پر رکھ لیا۔ اللہ کی طرف سے اگر یہ بروقت امداد نازل نہ ہوتی اور فرشتوں کی فوجیں مسلمانوں کے ہمرکاب نہ ہوتیں تو اس کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اکھڑے ہوئے پاؤں پھر جم جاتے اور بھاگنے والے لشکر کو فتح کی مسرت نصیب ہوتی۔

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید اور اس کے فرشتوں کی فوجیں ہمیشہ مسلمانوں کی معاونت پر ہوتی ہیں۔ لیکن جب کبھی مسلمانوں کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آتا یا شکست سی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو اس کی وجہ مسلمانوں کی اپنی کوئی نہ کوئی کوتاہی ہوتی ہے۔ اسی لیے سورۂ

Marfat.com

انفال کی آیت نمبر ۴۵ تا ۴۷ میں جو ہدایات دی گئی ہیں انہیں کامیابی کی ضمانت ٹھہرایا گیا ہے۔ جب بھی ان میں سے مسلمانوں نے کسی بات کی طرف سے صرف نظر کیا ہے تو ضرور کسی افتاد سے دوچار ہوئے ہیں۔ آیت نمبر ۴۵ میں فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں ثابت قدم رہنا اور اللہ کو بہت یاد کرنا اور آیت ۴۶ میں فرمایا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا، آپس میں اختلاف رائے نہ پیدا ہونے دینا ورنہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور ہر طرح کے حالات میں صبر کرنا اور آیت نمبر ۴۷ میں فرمایا کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو گھروں سے اتراتے اور نمائش کرتے ہوئے نکلے۔ ان ہدایات کو اگر ایک ترتیب سے دیکھا جائے تو اس کی صورت یہ بنتی ہے:

۱:۔ثبات قدم ۲:۔کثرت سے ذکر اللہ ۳:۔اللہ اور رسول کی اطاعت ۴:۔تنازع سے پرہیز

۵:۔صبر ۶:۔اترانے اور نمائش سے احتراز

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ یہ وہ ہدایات ہیں جن پر مسلمانوں کی کامیابیوں کا دارومدار ہے۔ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور آپس کا اختلاف اس قدر خطرناک ہے کہ جنگِ احد میں اسی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ ہار میں تبدیل ہو گئی اور مسلمانوں کو ستر جنازے اٹھانے پڑے۔

غزوۂ حنین میں ذکر اللہ میں کمی کے باعث اللہ کی طرف سے غفلت پیدا ہوئی اس کی قدرتوں کے استحضار کی بجائے اپنی افرادی قوت اور اپنی طاقت پر گھمنڈ پیدا ہوا اور ایک طرح سے ان لوگوں سے مشابہت پیدا ہو گئی جو اپنی قوت پر اتراتے ہوئے نکلتے ہیں اور اللہ کی قوت کو بھول جاتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پہلے ہی مرحلے میں تمام تر افرادی کثرت اور اسلحی قوت دھری رہ گئی۔ تیروں کی ایسی بارش ہوئی کہ پوری فوج نے بھاگنے میں اپنی عافیت سمجھی۔ افرادی کثرت کے باوجود کوئی انہیں پناہ دینے والا نہ تھا۔ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود ان کیلئے تنگ ہو گئی۔ اب اگر اللہ کی طرف سے دستگیری نہ ہوتی تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ مسلمانوں پر کیا قیامت گزر جاتی۔ لیکن جیسے ہی مسلمانوں کو اپنی غلطی پر تنبہ ہوا اور آنحضرت ﷺ کی ایک آواز پر اپنی سواریوں سے کود گئے تو اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی اور اس نے نہ صرف فتح مندی سے نوازا بلکہ جو کافر درانہ وار بڑھتے چلے آرہے تھے انہیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے سزا دلوائی۔ بنی ہوازن کے ستر آدمی مارے گئے اور ہزاروں لوگ گرفتار ہوئے۔

تیسری بات جو آخری آیتِ کریمہ میں فرمائی گئی ہے وہ سب سے اہم معلوم ہوتی ہے اور جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گفتگو کا آغاز یہاں سے ہوا تھا کہ پروردگار نے تمام مشرکینِ عرب کو ترکِ تعلق اور براءت کے اعلان سے اشتعال میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہت ممکن ہے یہ اشتعال انہیں مسلمانوں کے خلاف کسی بڑے معرکہ پر آمادہ کر دے اور اس طرح مسلمانوں کیلئے دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کیلئے دشواریاں پیدا نہیں ہوں گی بلکہ اللہ یہ جانتا ہے اور اس کا علم گواہی دیتا ہے کہ مشرکینِ عرب اپنی بقا کیلئے آخری کوششیں کریں گے لیکن اس کا عجیب نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ نہ صرف اس میں ناکام ہوں گے بلکہ انہیں میں سے بہت سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق دے گا۔ یعنی وہ ایمان قبول کریں گے اور اسلامی قافلے میں شامل ہو کر اسلام کی قوت ثابت ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بنو ہوازن اور بنو ثقیف جو فتح مکہ کے زخم کو برداشت نہیں کر پائے اور اسلام کو ختم کرنے کیلئے انہوں نے آخری حرکتِ مذبوحی بھی کر ڈالی۔ انہیں قبیلوں میں اللہ کی قدرت نے ایسا کیا کہ انہیں ایمان کی دولت نصیب فرمائی۔ وادیٔ حنین میں شکست کھانے کے بعد یہ لوگ طائف کے پہاڑوں میں محصور ہو گئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے چند دن تک ان کا محاصرہ جاری رکھا یا آخر محاصرہ اٹھا کر وادی جعرانہ میں تشریف لے آئے اور وہاں سے چلتے ہوئے فرمایا کہ یا اللہ انہیں ہدایت عطا فرما اور انہیں میرے پاس لے آ۔ چنانچہ وادی جعرانہ میں چند دن کے بعد ان کے سردار اس حال میں آئے کہ وہ اپنے ایمان کا اعلان کر رہے تھے اور آپ سے عفو و درگزر اور احسان کے خواستگار تھے۔

آخر میں فرمایا وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ "اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"۔ مسلمانوں کی کفار سے جنگیں نہ جارحیت ہیں نہ انتقامی کوششیں بلکہ یہ اسلام کی سربلندی اور کفر کو سرنگوں کرنے کی کاوشیں ہیں تاکہ لوگ اسلام کی طرف آزادانہ بڑھ سکیں۔ اگر اسلام کے پیشِ نظر کافروں کو صرف سزا دینا ہوتا تو ان پر عذاب بھیج دیا جاتا۔ لیکن رحمۃ للعالمین کی تشریف آوری سراسر اللہ کی رحمت کا ظہور ہے۔ چنانچہ جن لوگوں میں بھی قبولیت حق کی ذرہ بھر بھی استعداد پائی جاتی ہے، ان کی سابقہ زندگی کیسی بھی گزری ہو اللہ تعالیٰ کبھی نہ کبھی انہیں اسلام کی دولت سے مشرف فرماتے ہیں کیونکہ یہی اس کی مغفرت و رحمت کا ظہور ہے۔

Marfat.com

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖۤ اِنْ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴿التوبة : ۲۸﴾

اے ایمان والو! بلاشبہ مشرکین بالکل پلید ہیں پس یہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے قریب بھی پھٹکنے نہ پائیں اور اگر تمہیں اندیشہ ہو معاشی بدحالی کا تو اللہ اگر چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے مستغنی کردے گا بے شک اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ (۲۸)

مشرکین کے بارہ میں آخری ہدایت:

سورہ توبہ کے آغاز سے جو براءت کا مضمون شروع ہوا تھا اور مشرکین کے سامنے اس حوالے سے جو اعلانات کیے گئے تھے یہ ان سب کی آخری کڑی ہے۔ فتح مکہ کے بعد اگرچہ حرم کا اقتدار اور مسجدِ حرام کی تولیت اور بیت اللہ کی آبادی مسلمانوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی اور مسلمان ہر لحاظ سے صاحب اختیار تھے۔ لیکن مشرکین کو بھی مسجدِ حرام میں آنے جانے اور اپنے مذہبی اعمال ادا کرنے کی آزادی تھی۔ فتح مکہ اور اس اعلان کے دوران آٹھ اور نو ہجری کے دو موسم حج گزرے اور دونوں میں مشرکین نے اپنے طریقے سے حج اور عمرہ کے مناسک ادا کیے اور کسی جگہ بھی انہیں کسی بات سے روکا نہیں گیا۔ لیکن سورۂ توبہ کی متعلقہ آیات کے بعد ان پر جہاں اور پابندیاں لگائی گئیں وہاں اس آیتِ کریمہ کے حوالے سے حرم کی حدود میں ان کا داخلہ بالکل بند کر دیا گیا اور یہ داخلہ صرف مذہبی مناسک کی ادائیگی کیلئے ہی بند نہیں کیا گیا بلکہ امام شافعی کے فتویٰ کے مطابق مکمل طور پر انہیں حرم کی حدود میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ ایک بات یہاں سمجھ لینی چاہیے کہ حرم کی حدود میں داخل ہونے پر پابندی صرف مشرکین کیلئے نہیں بلکہ تمام غیر مسلموں کیلئے ہے چاہے وہ اہلِ کتاب ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن حرم کے علاوہ عرب کی حدود میں اگر اسلامی حکومت اجازت دے تو مشرکین اور دیگر غیر مسلم رہ سکتے یا اپنا کاروبار کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک مشرکینِ عرب کا تعلق ہے ان پر حجت تمام ہو جانے کی وجہ سے جزیرۂ عرب میں ان کا قیام ممنوع قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ آج بھی سعودی حکومت کے تمام شہروں میں ہر طرح کے غیر مسلم پائے جاتے ہیں جو ملازمتیں بھی کر رہے ہیں اور اپنے کاروبار بھی۔ لیکن جہاں تک مکہ معظمہ کا تعلق ہے وہاں کسی غیر مسلم کو جانے کی اجازت نہیں دی جاتی کیونکہ حرم، ملتِ ابراہیمی کے تقدس کی مرکزیت اور اللہ کے گھر کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہاں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ ہو۔ کوئی شخص اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت اور ذکر نہ کرے اور نہ وہ مذہبی رسوم بجا لائے جنہیں مشرکانہ رسوم کہا جاتا ہے۔ وہاں سراسر اللہ کی توحید کا غلبہ ہو اور وہاں صرف عبادت ہی میں نہیں بلکہ کاروبار، سیاست اور حکومت میں بھی اس بات کا اظہار ہو کہ یہاں اللہ کے سوا کسی اور کی حکومت نہیں تاکہ دنیائے اسلام اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود مرکزِ اسلام کو اپنا نمونہ سمجھ کر اپنے اپنے ملکوں کو اس کا پرتو بنانے کی کوشش کرے۔ سعودی حکومت اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اللہ کا شکر ہے کہ وہاں نہ کسی غیر مسلم کو داخل ہونے دیتی ہے اور نہ حتی الامکان کسی قسم کے شرک کو برداشت کرتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شاہ سعود کے زمانے میں ہندوستان کا وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو سعودی حکومت کے دورے پر گیا اس کی بڑی آؤ بھگت کی گئی اور اسے رسول السلام کا خطاب دیا گیا تھا۔ جدہ پہنچ کر جواہر لال نے شاہ سعود سے کہا کہ میں اللہ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے مکہ معظمہ لے چلیں۔ شاہ سعود نے تمام تر سیاسی تعلقات کو ایک طرف رکھتے ہوئے صاف صاف اعتراف کیا کہ مکہ معظمہ میں میری حکومت نہیں، وہاں صرف اللہ کی حکومت ہے اس لئے وہاں کسی غیر مسلم کو جانے کی اجازت نہیں دی۔ اس لئے میں آپ کو وہاں لے جانے سے معذور ہوں۔

آیت کریمہ میں مشرکوں کو نجس قرار دیا گیا ہے۔ نجس سے مراد یہ ہے کہ ان میں عقائد، اخلاق، آداب اور ہر طرح کے معاملات کی خرابی پائی جاتی ہے۔ ہر طرح کی آلودگی اور گندگی ان کے کردار میں پیدا ہو چکی ہے۔ حرم جس طرح خالص توحید کا مرکز ہے اسی طرح وہ خالص بندگی، دیانت وامانت، مکارمِ اخلاق اور معاملات میں اللہ سے ڈر کا پیغام بھی ہے۔ جو لوگ اس کے برعکس آلودگیاں اپنے اندر رکھتے ہیں وہ اگر ایسی صاف ستھری جگہ اور ایسے مہذب لوگوں میں آکر رہیں گے تو یقیناً اپنی بدکرداری اور بدمعاملگی کا تعفن پھیلائیں گے۔ اور اسے حرم کی حدود میں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لئے کسی شاعر نے کہا تھا

؎ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

Marfat.com

آیت کے دوسرے حصے میں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ ہے جس کا تعلق مسلمانوں کے امتحان سے ہے۔ مشرکین کا اللہ کے گھر سے روکا جانا یقیناً مشرکین کیلئے ایک بہت بڑی ابتلا تھا کیونکہ وہ اللہ کے گھر کے ساتھ صدیوں سے عقیدت رکھتے تھے اور اپنی تمام تر گمراہیوں کے باوجود اپنے آپ کو اس گھر سے وابستہ سمجھتے تھے۔ لیکن مسلمانوں کیلئے بھی یہ پابندیاں امتحان سے کم نہ تھیں کیونکہ ابھی تک جزیرۂ عرب میں مشرکین کی بہت بڑی تعداد پائی جاتی تھی اور ان کا معمول یہ تھا کہ اشہر حج میں وہ نہ صرف حج کیلئے آتے تھے بلکہ یہی مہینے ان کی تجارت کیلئے بھی تھے۔ حج ان کی مذہبی عبادت تھی لیکن یہی حج تجارت اور کاروبار کا بہت بڑا ذریعہ بن گیا تھا چونکہ ان مہینوں میں کوئی قافلہ لوٹا نہیں جاتا تھا اور کوئی کسی کو روکنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس لئے لوگ آزادانہ بغیر کسی خوف کے جس طرح قربانی کے جانور اپنے ساتھ لاتے تھے اسی طرح تجارت کا مال بھی بہت بڑی تعداد میں اپنے ساتھ لے کر آتے تھے، اونٹ لدے ہوئے آتے تھے۔ باہر کا مال مکہ میں پہنچتا اور مکہ کی چیزیں باہر کے تاجر خرید کر لے جاتے۔ ایامِ حج میں منیٰ اور عرفہ اور سوقِ عکاظ تجارت کے مرکز بن جاتے۔ وہاں ہر طرح کی چیز دستیاب ہوتی۔ مکہ کے رہنے والے اپنے شہر میں ہوتے ہوئے سال بھر کی روزی کما لیتے تھے۔ مشرکین انہیں فتوحات بھی دیتے کیونکہ وہ انہیں بیت اللہ کا مجاور اور پروہت سمجھتے تھے اور ساتھ ہی قریش چونکہ بہت بڑے تاجر بھی تھے اس لئے وہ تجارت سے خوب نفع کماتے۔ چنانچہ جب مشرکین پر حرم کی حدود میں داخل ہونے پر پابندی لگائی گئی تو مسلمانوں کو فکر لاحق ہوئی کہ ہمارے کاروبار ہماری تجارت بلکہ ہماری معاشی ضرورتوں کا کیا بنے گا؟ ابھی تک جزیرۂ عرب میں مشرکین کی ایک بہت بڑی تعداد پائی جاتی تھی۔ وہ اگر حج کیلئے نہیں آئیں گے تو ہماری تجارت پر ناگوار اثر پڑے گا اور ہم معاشی طور پر تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ پروردگار نے اس کے جواب میں صرف ایک جملہ ارشاد فرمایا۔ حیرانی کی بات ہے کہ اس میں کسی پیکج کا اعلان نہیں، کوئی مراعات دینے کا وعدہ نہیں صرف یہ فرمایا وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ کہ اگر تمہیں اندیشہ ہے معاشی بدحالی یا تنگدستی کا تو اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل وکرم سے تمہیں مستغنی کر دے گا اور یہ بات تو جانی پہچانی تھی کہ پروردگار تو جانوروں تک کا رزق اپنے ذمہ لے چکا ہے مسلمان تو سراسر اس کے فوجدار ہیں۔ اسی کیلئے جیتے اور مرتے ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دے۔ چنانچہ اس جملے کے نازل ہوتے ہی مسلمانوں کے چہروں پر اطمینان کی بہار چھا گئی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ جب اللہ نے ہماری تنگدستی دور کرنے کا وعدہ کر لیا ہے تو اس میں کسی طرح کے تخلف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ نو ہجری کے بعد تاریخ کا طالب علم اس بات سے بے خبر نہیں کہ مسلمان جہاں جہاں بھی آباد تھے ان کی حالت سنورنا شروع ہو گئی۔ فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ مصر وشام اور روم وایران کے خزانے اونٹوں پر لد لد کر اسلام کے بیت المال میں پہنچنے لگے۔ مسلمان اپنی زکوٰۃ کا مال جھولیوں میں ڈال کر لینے والوں کو تلاش کرتے تھے، لیکن کوئی ملتا نہیں تھا جنہیں یاد دلاتے کہ آپ نے گزشتہ سال مجھ سے زکوٰۃ وصول کی تھی تو وہ جواب میں کہتے کہ اس سال تو میں خود صاحبِ نصاب ہو گیا ہوں۔

کاش! امتِ مسلمہ اس حقیقت پر غور کرے کہ عرب جیسی سرزمین میں مسلمانوں کی نئی ریاست قائم ہوتی ہے، جن کا اپنا بیت المال تک نہیں۔ ایمان کی دولت کے سوا ان کے پاس آمدنی کے کوئی ذرائع نہیں۔ مکہ کی سرزمین ایک پتی تک نہیں اگاتی، ان کا تمام گزر بسر تجارت پر ہے۔ مسلمانوں کے پاس جہاد وقتال کی مصروفیات کے باعث تجارت کیلئے کوئی وقت نہیں۔ حج کے موقع پر آنے والے حاجیوں کی وجہ سے جو تجارت ہو رہی تھی اسے ان مشرکین پر پابندی لگا کر ختم کر دیا گیا ہے۔ مکہ معظمہ کے رہنے والے مسلمان اس پابندی کی وجہ سے بجا طور پر پریشان ہیں کہ ہمارے پاس گزر بسر کا ایک ہی ذریعہ تھا وہ بھی روک دیا گیا۔ ان کے اطمینان کیلئے ایک جملہ نازل ہوتا ہے جس میں انہیں مستغنی کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ مسلمان اس وعدے پر کھل اٹھتے ہیں اور کوئی بھی پلٹ کر نہیں پوچھتا کہ یہ استغنا کہاں سے آئے گا؟ تجارت کا ذریعہ تو ختم ہو گیا اب یہ مالداری اور دولت مندی کہاں سے پھوٹے گی؟ لیکن وہ لوگ چونکہ اللہ کے وعدے پر یقین کرنے والے لوگ تھے اور وہ جانتے تھے کہ رزق کے خزانے اللہ کے ہاتھ میں ہیں یہ تجارت یا زراعت بظاہر وسائل ہیں حقیقت نہیں ہیں۔ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے اس کے رزق میں وسعت عطا کر دیتا ہے۔ چنانچہ جیسے میں عرض کر چکا ہوں مؤرخ آج تک گواہی دے رہے ہیں کہ اس کے بعد مکہ والوں نے تنگدستی نہیں دیکھی۔ ہم پر اللہ نے اس وعدے کے ساتھ سود حرام کیا ہے کہ اگر تم سود پر پابندی لگا دو گے تو ہم تمہارے رزق میں اضافہ کر دیں گے اور اگر تم سود سے نہیں رکے تو پھر سمجھ لو کہ تم اللہ اور اس کے رسول سے اعلانِ جنگ کر رہے ہو اور یہ بھی بار بار فرمایا کہ اگر تم اللہ کے دین کو نافذ کر دو گے تو ہم آسمان کی

Marfat.com

برکتوں کے دروازے کھول دیں گے۔ اوپر سے رزق برسے گا اور نیچے سے ابلے گا۔ لیکن ہمیں اللہ کے کسی وعدے پر اعتبار نہیں۔ نتیجہ سامنے ہے کہ ہم سالہا سال سے اپنی مالی حالت بہتر کرنے اور رزق کے وسائل کو ترقی دینے کیلئے کیا کیا پاپڑ بیل رہے ہیں۔ اس کیلئے ہم نے اپنی عزت وافتخار اور قومی خودداری کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے۔ لیکن حال ہمارا یہ ہے کہ:

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۠ ﴿التوبة : ٢٩﴾

لڑو ان اہلِ کتاب سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روزِ آخرت پر اور نہ حرام ٹھہراتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور نہ دینِ حق کو دین بناتے ہیں تا آنکہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں۔ (۲۹)

اہلِ کتاب کے بارہ میں پالیسی کا اعلان:

گزشتہ آیتِ کریمہ تک اللہ تعالیٰ نے مشرکین عرب کے بارے میں اپنی پالیسی کا اعلان فرمایا۔ انہیں ایک خاص مہلت دی گئی اور اسکے بعد انہیں صاف فرمادیا گیا کہ تمہیں جزیرۂ عرب میں رہنے کی اجازت نہیں۔ مسلمان ہو جاؤ تو مسلمانوں جیسی عزت تمہیں بھی ملے گی ورنہ اس ملک کی سرزمین تمہیں جگہ نہیں دے گی۔ ملک چھوڑ جاؤ گے یا قتل کردیئے جاؤ گے۔ اب اس آیتِ کریمہ میں اہلِ کتاب کے بارے میں پروردگار اپنی پالیسی کا اعلان فرماتے ہیں۔ اعلان کے ضمن میں کچھ ایسی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں جنہیں دفع دخل مقدر کہا جا سکتا ہے۔ اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب بھی اللہ آخرت کو اس کے رسولوں کو اور اس کی کتابوں کو مانتے ہیں پھر مسلمانوں سے ان کی بیگانگی کیسی؟ ان کے پاس بھی ایک آسمانی مذہب ہے اور آسمانی کتاب ہے تو مسلمانوں کو ان سے تنفر اختیار کرنے کی بجائے انہیں کسی طرح اپنے اندر شامل کرنا چاہیے۔ اس آیت میں سب سے پہلے اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول، آخرت اور کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ ان میں سے کسی پر بھی ایمان نہیں رکھتے اگر وہ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہوتے اور ان کی زندگی اس پر گواہ ہوتی تو نبی کریم ﷺ تشریف نہ لاتے کیونکہ کسی رسول کا بطورِ خاص آنا اس وقت تک قدرت کا معمول نہیں جب تک کہ پہلے رسول کی امت اپنے تمام ایمانی خصائص سے محروم نہیں ہو جاتی۔ قدرت محسوس کرتی ہے کہ اس جھاڑ جھنکار کو ختم کر کے ازسرِ نو اس زمین کی آبادی کا انتظام ہونا چاہیے۔ اہلِ کتاب یہود ہوں یا نصاریٰ، ان پر اگرچہ کتابیں نازل ہوئیں، رسول آئے، انسانوں کی ہدایت کی ذمہ داری انہیں ڈالی گئی، دنیا کی امامت کے منصب پر انہیں فائز کیا گیا، لیکن رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے آپ کو ہر خوبی سے محروم کر لیا۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ یہ لوگ نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں نہ روزِ آخرت پر۔ دلائل تو اگلی آیات میں آ رہے ہیں لیکن اس سے پہلے بھی متعدد مواقع پر اللہ تعالیٰ نے ان اصل چہرہ دکھایا ہے۔ مثال کے طور پر وہ زبانی حد تک اللہ کو مانتے ہیں لیکن جہاں تک اس کی وحدانیت کا تعلق ہے اس میں وہ اسی طرح شرک کرتے ہیں جس طرح مشرکین کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ جانے اللہ کے سوا کتنی شخصیتوں کو خدا بنایا، اس کی صفات میں شریک کیا، اللہ کا وہ تصور پیش کیا جو تصور کوئی برگزیدہ انسان بھی قبول نہیں کر سکتا اور جہاں تک آخرت پر ایمان لانے کا تعلق ہے اس کا اندازہ آپ اس سے کر لیجئے کہ انہوں نے اپنے بارے میں عقیدہ اختیار کیا کہ ہم اللہ کی اولاد ہیں اور اسکے چہیتے ہیں، ہماری کسی طرح کی باز پرس نہیں ہو گی، جہنم کی آگ ہمیں چھو بھی نہیں سکے گی، سوال یہ ہے آخرت کا عقیدہ تو دیا ہی اس لیے گیا ہے تا کہ لوگ اپنے اعمال کی فکر کریں۔ انہیں اس بات کا یقین ہو کہ قیامت کے دن ہماری بخشش کا دارومدار ایمان حسنِ عمل پر ہے۔ جنت میں صاحبِ کردار لوگ جائیں گے اور جہنم میں بے ایمان اور بدعمل لوگ۔ لیکن جو قوم اپنے آپ کو نجات یافتہ اور بخشا ہوا سمجھتی

Marfat.com

اور اسے یقین ہے کہ اس سے کوئی باز پرس نہیں کرے گا تو اس کیلئے آخرت کا کیا مفہوم ہے؟ جب اسے کسی بات کا جواب ہی نہیں دینا اور کسی بات کی جواب دہی نہیں کرنا تو پھر اس کیلئے آخرت کے آنے کا کیا معنی ہو سکتا ہے؟ اس نے ان تصورات کے ذریعے آخرت کا ابطال کر دیا۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو حرام کیا ہے یہ اسے حرام نہیں ٹھہراتے یعنی ان پر نازل ہونے والی کتابوں اور ان کی طرف آنے والے رسولوں نے جو ان کو شریعت دی تھی اسے انہوں نے یکسر بدل ڈالا، حرام کو حلال کر دیا اور حلال کو حرام کر دیا اور کتنی نئی چیزیں اس میں شامل کر دیں۔ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ ان کے اہلِ کتاب ہونے کا کیا مطلب ہے۔ نام کے اعتبار سے تو وہ کتاب والے ہیں لیکن حقیقت میں ان کا کتاب سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

چوتھی بات یہ ارشاد فرمائی کہ یہ دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے انہیں خوب معلوم ہے اور ان کتابوں نے اس کی گواہی دی ہے کہ آخری رسول جب آئے گا تو اس کا دین ساری دنیا کا دین ہوگا اور سارے مذاہب اسے قبول کریں گے۔ اس کی موجودگی میں کسی دوسرے دین کو قبول نہیں کیا جائے گا لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ اللہ کے آخری رسول کے لائے ہوئے دین کو قبول تو کیا کرتے انہوں نے اس کا راستہ روکنے اور اسے ناکام کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ہر ممکن سازش کی۔ غور فرمایئے! جس امت کا یہ حال ہو کہ وہ نہ اللہ پر ایمان میں سچی ہو، نہ آخرت پر ایمان میں، نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام اور حلال کی پابند ہو اور وہ اپنے اوپر نازل ہونے والی کتابوں کو تحریف کی نذر کر چکی ہو اور اب آخری رسول پر ایمان لانے کی بجائے ہر ممکن طریقے سے اس کا راستہ روک رہی ہو، تو کیا ایسی قوم زمین پر زندہ رہنے کے قابل ہے؟ یہ تو دھرتی کا بوجھ ہے اور ایسا جھاڑ جھنکار ہے جس نے ہر صحت مند پودے کو پیدا ہونے سے روک رکھا ہے۔ اسے تو پہلی فرصت میں ختم کرنا چاہئے۔ اسی لئے فرمایا کہ ان سے قتال کرو۔ اگر وہ ایمان لے آئیں تو بہت بہتر ہے اور اگر وہ انکار کریں اور مصالحت کے لئے آمادہ ہوں تو مسلمانوں کے امیر کو اجازت ہے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں ان سے معاہدہ کر لیں۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ زمین پر حاکمانہ حیثیت سے رہنے کا انہیں کوئی حق نہیں۔ انہیں حکومت مسلمانوں کے حوالے کرنا ہوگی تاکہ اللہ کی زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم ہو اور اگر وہ طاقت استعمال کر کے مسلمانوں کا راستہ روکنا چاہیں تو پھر مسلمان اس وقت تک ان سے لڑیں گے جب تک وہ جزیہ دینے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

"ید" سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے غلبے کو تسلیم کریں اور مغلوبانہ حیثیت سے مسلمانوں کے ماتحت رہنا قبول کر لیں۔ ﴿وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ اسی کی تشریح ہے "اور وہ چھوٹے بن کر رہیں"۔ یعنی انہیں اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ مسلمانوں کے ملک میں پالیسی مسلمانوں کی چلے گی، آئین انہیں کا نافذ ہوگا، غلبہ اللہ کے دین کا ہوگا، البتہ! اہلِ کتاب کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے عبادت خانے کھلے رہیں گے، ان کی جان مال اور آبرو بالکل اسی طرح محفوظ ہوگی جس طرح مسلمانوں کی۔ انہیں ہر طرح کی معاشی آزادیاں ہوں گی لیکن وہ سودی کاروبار نہیں کر سکیں گے اور اپنی آبادیوں سے باہر خنزیر اور شراب کو بیچ نہیں سکیں گے۔ اپنے تحفظ کے بدلے میں وہ ایک خاص ٹیکس دیں گے جس کا نام "جزیہ" ہے۔ یہ کوئی گالی نہیں، مسلمان فوجی خدمت بھی انجام دیتے ہیں اور ساتھ وہ زکوٰۃ، فطرانہ اور مختلف قسم کے عطیات بھی دیتے ہیں۔ لیکن غیر مسلم صرف ایک ٹیکس دیں گے جسے جزیہ کہا جاتا ہے اور اگر وہ مسلمانوں کے ملک میں معاہدے کے نتیجے میں رہنا چاہیں تو وہ جزیہ کو کسی اور نام سے بھی ادا کر سکتے ہیں جزیہ کی رقم ہر ایک سے یکساں نہیں لی جاتی بلکہ اس میں مالی حالت سے فرق پڑتا ہے۔ جو غیر مسلم مالی پریشانیوں کے باعث جزیہ ادا نہ کر سکتا ہو، حکومت اسے معاف کر دینے کی مجاز ہوتی ہے۔ معاہدۂ صلح کے نتیجے میں اسلامی حکومت غیر مسلموں سے کیے ہوئے وعدوں کی پابند ہوگی بغیر کسی شرعی سبب کے اسلامی حکومت اسے ہرگز توڑ نہیں سکتی۔ یہاں اگرچہ اہلِ کتاب کا ذکر ہے لیکن آنحضرت ﷺ نے اہلِ مجوس کو بھی اہلِ کتاب کے مشابہ قرار دے کر ان سے بھی یہی معاملہ کیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مشرکینِ عرب کے علاوہ تمام غیر مسلم اہلِ کتاب ہی کے حکم میں ہیں ان سے جزیہ لے کر یا کسی معاہدے کی صورت میں انہیں مسلمان مملکت میں رہنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس آیت میں اہلِ کتاب کے بارے میں جو الزامات لگائے گئے ہیں اگلی آیات میں ان کے ثبوت فراہم کیے گئے ہیں۔

Marfat.com

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ
ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٣٠﴾ اِتَّخَذُوْٓا
اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ
مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ
سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٣١﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ
بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٣٢﴾
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ
عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿٣٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا
اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ
بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ
الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿٣٤﴾ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى
بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ
فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿٣٥﴾ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا

Marfat.com

عَشَرَ شَهْرًا فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ
اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ
اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٣٦﴾ اِنَّمَا النَّسِىْٓءُ زِيَادَةٌ فِى
الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ
عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ
لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٧﴾

اور یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ یہ نقل کر رہے ہیں ان لوگوں کی جو ان سے پہلے کافر تھے۔ اللہ ان کو ہلاک کرے، کہاں ان کی عقل الٹی ہوئی جا رہی ہے۔ انہوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب ناڈالا اور مسیح ابنِ مریم کو بھی حالانکہ انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا مگر صرف اس بات کا کہ وہ ایک ہی معبود کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنی پھونکوں سے اور اللہ انکار کرتا ہے مگر یہ کہ وہ پورا کر کے رہے گا اپنے نور کو اگرچہ کافر ناپسند کریں۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر تا کہ وہ اس دین کو غالب کر دے تمام دینوں پر اگرچہ مشرکوں کو ناگوار گزرے۔ اے ایمان والو! بیشک بہت سے پادری اور راہب ایسے ہیں جو لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جوڑ کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ جس دن دوزخ میں اس پر آگ دہکائی جائے گی پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں اور انہیں بتایا جائے گا کہ یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا تو اب چکھو سزا اس کی جو تم جمع کیا کرتے تھے۔ بیشک مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک نوشتۂ الٰہی میں بارہ مہینے ہیں جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ان میں چار حرمت والے ہیں، یہی دینِ قیم ہے۔ پس تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور تم مشرکوں سے جنگ کرو من حیث الجماعت، جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں من حیث الجماعت اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ بیشک نسی کفر میں ایک اضافہ ہے، گمراہ کئے جاتے ہیں اس سے وہ لوگ جو کافر ہیں، حلال کر دیتے ہیں ایک ماہ کو ایک

Marfat.com

سال اور حرام کر دیتے ہیں اسی کو دوسرے سال تا کہ وہ پوری کریں گنتی ان مہینوں کی جنہیں اللہ نے حرام کیا ہے پھر حلال کریں جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ مزین کر دیئے گئے ہیں ان کیلئے ان کے برے اعمال اور اللہ ہدایت نہیں دیتا کافر قوم کو۔(۳۰ تا ۳۷) (رکوع: ۵)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ج يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ط قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ج اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿التوبة : ۳۰﴾

اور یہود نے کہا عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ سب ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ یہ نقل کر رہے ہیں ان لوگوں کی جوان سے پہلے کافر تھے۔ اللہ ان کو ہلاک کرے، کہاں ان کی عقل الٹی ہوئی جا رہی ہے۔(۳۰)

سابقہ آیت میں لگائے گئے الزامات کے ثبوت:

سابقہ آیتِ کریمہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو چارج شیٹ کیا۔ اور ان پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے ان کے چند جرائم کا ذکر فرمایا ہے۔ جن میں سے پہلا جرم اور گمراہی یہ ہے کہ وہ اللہ اور یومِ آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس الزام کا ثبوت دیا جا رہا ہے اور جو جرم ان پر عائد کیا گیا ہے اس کی دلیل دی جا رہی ہے۔ اللہ پر ایمان لانے کا معنی صرف اسے مان لینا نہیں بلکہ اس طرح ماننا ہے جس طرح اللہ کے نبیوں اور اس کی کتابوں نے تعلیم دی ہے۔ جو بھی نبی دنیا میں آیا اور جو کتاب بھی نازل ہوئی اس کی پہلی دعوت یہ تھی

﴿اعبدو الله مالكم من اله غيره ''اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں''﴾

اور جا بجا اس کی وضاحت فرمائی کہ کوئی نہ تو اللہ کی ذات میں شریک ہے، نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے حقوق میں۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہ ہر طرح کی احتیاج سے پاک ہے۔ وہ نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہے۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ اس کی کوئی نظیر اور مثال نہیں۔ لیکن اہلِ کتاب میں سے یہود نے باوجود اہلِ کتاب ہونے اور باوجود ایک پیغمبر کی امت ہونے کے اللہ کو تسلیم تو کیا لیکن ساتھ ہی حضرت عزیر علیہ السلام کا اللہ کا بیٹا بھی بنایا۔ جو شخص بھی اللہ کیلئے اولاد ثابت کرتا ہے اور پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ میں اللہ کو مانتا ہوں تو اس کے ماننے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کو ماننا ضرور ہے لیکن وحدہٗ لاشریک نہیں مانتا۔ الوہیت کوئی ایسا منصب نہیں جس کی نسبت مختلف ذاتوں کی طرف کی جا سکے۔ اس کے لئے ایک ہونا اور لاشریک ہونا اس کے منصب کا تقاضا ہے۔ بیٹا اپنے باپ کا ہمرنگ، ہم جنس اور شریک ہوتا ہے۔ وہ ان تمام خصوصیات اور صفات کا مالک ہوتا ہے جس سے باپ متصف ہوتا ہے۔ اگر باپ الٰہ ہے تو بیٹا بھی الٰہ ہوگا، اگر باپ خالق ہے تو بیٹا بھی خالق ہوگا۔ اگر باپ معبود ہے تو بیٹا بھی معبود ہوگا۔ اگر باپ اختیاراتِ کلی کا مالک ہے تو بیٹا بھی مختارِ کل ہوگا۔ اندازہ فرمایئے! اس طرح سے بیٹے کو ماننے کے بعد اللہ کی الوہیت اور اس کی وحدانیت کا کیا تصور باقی رہ جاتا ہے۔ اس لئے یہاں بطورِ دلیل فرمایا گیا ہے کہ ایک طرف تم اللہ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہو اور دوسری طرف اس کیلئے بیٹا بھی ثابت کرتے ہو۔ سوچو اس تضاد کا جواز کیا ہے؟

عزیر علیہ السلام کون ہیں؟

عزیر وہی ہیں جنہیں تورات ''عزرا'' کے نام سے ذکر کرتی ہے۔ ان کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح ہے۔ بخت نصر کے حملوں کے بعد یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ ہیکلِ سلیمانی زمین بوس کر دیا گیا۔ بنی اسرائیل بہت بڑی تعداد میں مقتول ہوئے اور بہت سے غلام بنا کر بابل میں لے جائے گئے۔ سب سے بڑا حادثہ یہ ہوا کہ تورات کا کوئی نسخہ باقی نہ رہا۔ ایک ایک نسخہ جلا دیا گیا۔ بنی اسرائیل مسلمانوں کی طرح اپنی کتاب کے حافظ نہیں تھے۔ تورات کے جلا دینے کا مطلب یہ تھا کہ تورات کا وجود دنیا سے ختم ہو گیا۔ لیکن یہود کی تاریخ یہ کہتی ہے کہ جب ایرانیوں نے اہلِ بابل کو شکست دی تو

Marfat.com

انہوں نے بنی اسرائیل پر رحم کھاتے ہوئے انہیں قید سے رہائی دی اور واپس فلسطین اور یروشلم جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ واپس آنے والے قیدیوں میں عزیر بھی شامل تھے انہیں ایرانی بادشاہ نے مجاز بنایا کہ تم ہیکلِ سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرواور بنی اسرائیل کے حالات درست کرو۔ چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت عزیر علیہ السلام نے تورات کے عہدنامہ عتیق کواز سرِ نو مرتب کیا اور بنی اسرائیل کی نشأۃ ثانیہ اور شریعت کی تجدید کا وہ زبردست کام کیا جس سے بنی اسرائیل کواز سرِ نو قومی زندگی نصیب ہوئی۔ ان کے اسی کارنامے کی وجہ سے بنی اسرائیل میں ان کا بہت احترام پایا جاتا ہے اور یہ احترام اور تعظیم بعض گروہوں میں اس حد تک بڑھ گیا کہ انہوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دے دیا۔ قرآنِ کریم نے تمام یہود پر عزیر کو بیٹا بنانے پر الزام نہیں لگایا بلکہ اس کے بعض گروہوں کی طرف اس کی نسبت کی گئی ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کے اسلوب اور یہود کی خاموشی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ الزام یہود کو تسلیم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہمارے آباؤ اجداد بھی یہ عقیدہ رکھتے تھے اور اب بھی اس اعقیدہ کے حاملین موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے قرآنِ کریم کے اس الزام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بعض اہلِ علم کا گمان یہ ہے کہ یہود نے ایک خاص مقصد کیلئے حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں یہ عقیدہ اختراع کیا۔ وہ مقصد یہ تھا کہ یہود کے عوام وخاص کو یہ بات معلوم تھی کہ تورات دنیا سے ناپید ہو چکی ہے، اب اس کا کوئی وجود نہیں۔ لیکن جب حضرت عزیر نے اسے از سرِ نو اپنے طور سے کچھ بزرگانِ قوم کو ساتھ لے کر مرتب کر کے قوم کے سامنے پیش کیا تو لوگوں کیلئے اسے تسلیم کرنا مشکل تھا وہ یہ باور کرنے کیلئے تیار نہیں تھے کہ محض اپنی یادداشت سے ایک کتاب دوبارہ مرتب کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ہمارے یہاں اس کی کوئی مثال نہیں تو کچھ لوگوں نے انہیں باور کرانے کیلئے یہ مشہور کر دیا کہ اسے مرتب کسی عام شخص نے نہیں کیا بلکہ اس عظیم کام کیلئے اللہ نے اپنے بیٹے کو بھیجا ہے اور اس نے بنی اسرائیل پر یہ احسان کیا ہے۔ اس طرح سے لوگوں کیلئے نئی تورات کو قابلِ قبول بنایا گیا۔

نصاریٰ پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے مسیح کو اللہ کا بیٹا بنالیا اور اس کے ثبوت کی چنداں حاجت بھی نہیں۔ اس لئے کہ نصاریٰ من حیث الامت اس عقیدے کو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے لئے آج تک یہ مسئلہ دردِ سر بنا ہوا ہے کہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ کا کوئی وجود نہیں انہیں ایک کنواری لڑکی نے جنا ہے اور دنیا میں چونکہ آج تک بغیر باپ کے کوئی پیدا نہیں ہوا یہ اللہ کا ایک اٹل قانون ہے کہ وہ ماں باپ سے اولاد پیدا کرتا ہے تو عیسیٰ چونکہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پروردگار ان کا باپ ہے اور وہ ابن اللہ ہیں۔ قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر اس فاسد عقیدہ کی تردید فرمائی ہے اور ایک جگہ اس عقیدہ کے خلافِ عقل ہونے پر ایسی سادہ لیکن محکم بات فرمائی گئی ہے جس کا کوئی جواب ممکن نہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ

﴿ ان مثل عیسیٰ عنداللہ کمثل آدم "عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے ہاں آدم علیہ السلام کی مثال ہے" ﴾

حضرت آدم کو تمام اہلِ مذاہب کے عقیدے کے مطابق اللہ نے بغیر ماں باپ کے محض اپنے دستِ قدرت سے بنایا اور کلمہ کن سے تخلیق فرمائی۔ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ ہر شخص کے وجود کیلئے ماں باپ کا ہونا ضروری ہے اور جس کا باپ کوئی نہیں اس کا باپ خدا ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر تو حضرت آدم علیہ السلام کا نہ باپ ہے نہ ماں۔ تو کیا یہ کہا جائے گا کہ ان کا باپ بھی خدا ہے اور ان کی ماں بھی خدا ہے حالانکہ ایسی خلافِ عقل بات آج تک کسی نے نہیں کہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ مذہب کو یہ بات تسلیم ہے کہ ہر شخص کا وجود محض اللہ کی قدرت سے ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو بغیر ماں باپ کے حضرت آدم کو پیدا کر دے وہ چاہے تو ماں باپ ہوتے ہوئے بھی اولاد نہ دے اور چاہے تو ماں باپ بے شک اولاد کی عمر سے گزر چکے ہوں انہیں اولاد دے دے۔ جیسے حضرت زکریا کو حضرت یحییٰ جیسا بیٹا دیا گیا اور چاہے تو صرف ماں سے بیٹا پیدا کر دے جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا گیا یہ مختلف طریقے اس کی قدرت کا ظہور ہیں اور اس کی قدرت کسی ایک طریقے کی پابند نہیں۔ اس لئے عیسائیوں کا یہ عقیدہ اختیار کرنا اور ساتھ اللہ کی وحدانیت اور توحید کا دعویٰ کرنا اور اللہ پر ایمان رکھنے کا زعم رکھنا اس کی حیثیت ایک مذاق سے زیادہ نہیں۔

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ "یہ ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں"۔ یعنی ایسی باتیں ہیں جن پر دلیل کوئی نہیں۔ انہوں نے بے سوچے سمجھے اپنے منہ سے نکال دی ہیں۔ جو پہلوں نے کہا بعد والوں نے اسی کی جگالی کی۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ﴾

Marfat.com

﴿یُضَاهِئُوْنَ﴾ باب مفاعلۃ سے ہے۔ اس کا مصدر مضاھاۃ مشابہت اور مماثلت کے معنی میں آتا ہے۔ یعنی یہ فرمایا جارہا ہے کہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو عقیدہ اختیار کیا یہ پہلی مشرک قوموں کی نقل کے سوا کچھ نہیں۔ ہر دور میں ایسی مشرک قومیں موجود رہی ہیں جنہوں نے اللہ کی ذات وصفات میں برگزیدہ لوگوں کو شریک ٹھہرایا ہے اور ان کے بارے میں عجیب وغریب تصورات اختیار کئے ہیں۔ اللہ کا ہر نبی اور رسول سب سے پہلے اللہ کی وحدانیت کی دعوت دیتا ہے اور شرک کی تمام ممکنہ صورتوں کا ابطال کرتا ہے۔ وہ بے میل اور بے عیب توحید دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بھی پروردگار کے بارے میں ایسے ہی پاکیزہ تصورات اپنے ماننے والوں کو دیئے چنانچہ ان کے حواریوں نے یہی پاکیزہ تعلیم آگے لوگوں تک پہنچائی۔ لیکن عیسائیت کے ساتھ حادثہ یہ ہوا کہ سینٹ پال جو ایک یہودی تھا اور جس نے عیسیٰ علیہ السلام کی دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر اٹھائے جانے کے بعد ایک سازش کے تحت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے لگا بلکہ اس کی جسارت یہاں تک بڑھی کہ اس نے کہا کہ میں نے بادل میں عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھا ہے انہوں نے مجھے اپنا جانشین بنایا ہے۔ اس طرح سے اس شخص نے حواریوں کو پیچھے چھوڑ کر مسیحیت کی نمائندگی کا تاج اپنے سر پر سجایا اور عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت کی نسبت سے ایسے ایسے عقیدے اختراع کیے جس کا تصور بھی انبیاء کی تعلیمات میں شرک اور کفر سے کم نہیں۔ اس نے سب سے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی امت کو شریعت سے آزاد کر دیا ہے۔ ان کی ایمانی زندگی کیلئے چند بنیادی اعتقادات کافی ہیں۔ لیکن اپنی عملی زندگی کیلئے وہ جو چاہیں طریقہ اختیار کریں اس میں آزاد ہیں۔ اس طرح سے اس امت کو شریعت کی پابندیوں سے آزاد کر کے ہوائے نفس کا خوگر بنا دیا اور دوسرا کارنامہ یہ انجام دیا کہ اس کے گرد وپیش پھیلی ہوئی مشرک قوموں کے تصورات کو نئے رنگ وروغن اور نئی تعبیرات کے ساتھ عیسائیت کا حصہ بنا دیا چنانچہ رومیوں اور یونانیوں میں اللہ کے بارے میں جو مشرکانہ تصورات پائے جاتے تھے انہیں اس طرح قبول کیا کہ ان پر متشابہ الفاظ اور کلمات کا رنگ چڑھا دیا۔ مثلاً انجیل میں اللہ کو باپ کہہ کر پکارا گیا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اپنی دعوت اور دعاؤں میں اللہ کو باپ کہہ کر پکارتے ہیں اور خود اپنے آپ کو بیٹا قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ ایمان لوگوں کو اللہ کو پیغام دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ تمہارا باپ یہ کہتا ہے۔ ان الفاظ سے پال نے فائدہ اٹھایا کیونکہ عبرانی زبان میں ''اب'' کا لفظ باپ کیلئے بھی آتا ہے اور رب کیلئے بھی اور ''ابن'' کا لفظ بیٹے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور بندے کے معنی میں بھی۔ ہر جگہ قرائن سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں یہ لفظ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ تورات وانجیل حقیقت میں عبرانی زبان میں تھیں لیکن جب ان کے ترجمے ہوئے اور عبرانی زبان متروک ہوتی گئی تو ترجموں کے الفاظ کو اصل الفاظ سمجھ لیا گیا۔ مثلاً اب اور ابن عربی زبان میں باپ اور بیٹے کیلئے ہی بولا جاتا ہے، چنانچہ اسی معنی کو حتمی قرار دے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور اللہ کو باپ قرار دے دیا گیا اور اس طرح سے خالق ومخلوق میں باپ اور بیٹے کا رشتہ قائم کر دیا گیا حالانکہ بات بالکل واضح تھی کہ عبرانی زبان میں اب کو رب کے معنی میں اور ابن کو بندہ کے معنی میں استعمال کیا گیا تھا اور یہی وہ حقیقی تعلیم ہے جو ہر پیغمبر نے پیش کی اور یہی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی پیش کی تھی۔ یہی صورتحال دوسرے مقامات میں بھی پیش آئی اصل کتاب چونکہ باقی نہیں رہی اور ترجموں میں بات کو کچھ سے کچھ بنا دیا گیا۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی گمراہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان کے پیش رو گمراہوں نے ان کیلئے کفر وضلالت کا جو گورکھ دھندہ تیار کیا ہے یہ آنکھ بند کر کے اسی کی تقلید کیے جارہے ہیں۔ اس کے بعد نہایت سخت جملہ فرمایا کہ اللہ انہیں ہلاک کرے یہ ایک لعنت کا کلمہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی رحمت سے دور ہو چکے ہیں اور جب کوئی قوم رحمت سے محروم ہوتی ہے تو پھر ان کی عقلیں یا تو کام نہیں کرتیں اور یا غلط رخ پر کرتی ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ ذرا دیکھو ان کی عقلیں کہاں الٹی ہوئی جارہی ہیں۔ ایک سیدھی سے بات کو سمجھنے سے عاجز ہو گئی ہیں کہ خالق ومخلوق میں توالد وتناسل کا سلسلہ کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اور اللہ پر ایمان لانے والے اس طرح کے لایعنی تصورات کے حامل کیسے ہو سکتے ہیں؟

Marfat.com

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ ﴿التوبة : ۳۱﴾

انہوں نے اللہ کے سوا اپنے فقیہوں اور راہبوں کو رب بناڈالا اور مسیح ابنِ مریم کو بھی حالانکہ انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا مگر صرف اس بات کا کہ وہ ایک ہی معبود کی عبادت کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔(۳۱)

دوسرے الزام کا ثبوت:

گزشتہ سے پیوستہ آیتِ کریمہ کو ایک نظر پھر دیکھ لیجئے، اس میں پروردگار نے اہلِ کتاب پر جو الزامات لگائے ہیں ان میں دوسرا الزام ﴿وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس الزام کے ثبوت کے لیے دلیل دی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پہلا الزام اللہ کی ذات کو نہ ماننے یعنی اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے کا تھا۔ اب اس دوسرے الزام کا تعلق اللہ کی صفات کے ساتھ ہے کہ جس طرح وہ اپنی ذات میں وحدہٗ لاشریک ہے کہ نہ دوسرا خدا ہوسکتا ہے اور نہ خدا کی اولاد ہوسکتی ہے۔ اسی طرح وہ اپنی صفات میں بھی وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ صفات جو اس کیلئے مخصوص ہیں ان صفات میں کسی دوسرے کی شرکت کا تصور بھی کفر ہے۔ اس کی خصوصی صفات میں ایک صفت یہ ہے کہ تحلیل وتحریم اسی کی صفتِ خاصہ ہے اور اسی کا حق ہے۔ دنیا میں کوئی اور ذات یا کوئی ادارہ کوئی گروہ یا کوئی قوم اس بات کا حق نہیں رکھتا کہ وہ کسی چیز کو از خود حرام یا حلال کرسکے۔ مطلقاً تحلیل وتحریم صرف اللہ کا حق ہے۔ اس طرح کی قانون سازی کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں حرام، فلاں جائز ہے اور فلاں ناجائز، یہ صرف اللہ کی شان ہے۔ البتہ! جن معاملات میں اس کی شریعت خاموش ہے اس کی خاموشی بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ان معاملات میں انسانوں کو قانون سازی کا حق ہے بشرطیکہ ان کی قانون سازی اسلامی شریعت کے مزاج کے خلاف نہ ہو۔ لیکن وہ امور اور وہ معاملات جو منصوص ہیں یعنی جن میں پروردگار اپنے احکام عطا فرما چکے ہیں اور قرآن وسنت نے اسے بیان کردیا ہے اور پہلی قوموں میں ان کی کتابیں انہیں بیان کرچکی ہیں تو ان میں کسی شخص یا کسی ادارے کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ تحلیل وتحریم کا حق استعمال کرے یا حرام کو حلال سے یا حلال کو حرام سے تبدیل کردے۔ لیکن اس لحاظ سے یہود اور نصاریٰ دونوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا دونوں نے تحلیل وتحریم کا حق کتاب اللہ سے چھین کر اپنے احبار ورہبان کو دے دیا۔ ان کی عدالتیں آزادانہ فیصلے کرنے لگیں۔

احبار، حبر کی جمع ہے۔ جس کا معنی ''بہت پڑھا لکھا آدمی'' ہوتا ہے۔ لیکن عموماً اس کا استعمال یہود کے فقہا کیلئے ہوا ہے اور رہبان راہب کی جمع ہے، اس کا معنی تو ہے ''تارک الدنیا شخص''۔ لیکن اس کا استعمال نصاریٰ کے مشائخ اور صوفیوں کیلئے ہوتا رہا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اپنے فقہا اور اپنے مشائخ کو تحلیل وتحریم کے حوالے سے اللہ کا شریک بنادیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب عدی بن حاتم طائی مسلمان ہونے کیلئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اپنے اشتباہات دور کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ سے ایک سوال کیا کہ میں نے سنا ہے کہ قرآنِ کریم نے یہود ونصاریٰ پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے اپنے احبار ورہبان کو رب بنالیا ہے۔ میں خود عیسائی ہوں اور میں جانتا ہوں کہ ہم نے یہ جرم کبھی نہیں کیا۔ حضور نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں کہ جو وہ حرام کردیں اس کو تم حرام مان لیتے ہو اور جسے وہ جائز قرار دے دیں اسے تم جائز اور حلال سمجھتے ہو؟ عدی بولے: ہاں! یہ بات تو ہے۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جسے تحلیل وتحریم کا حق دے دیا جائے وہی رب ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے تم نے انہیں اپنا رب بنالیا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت یقیناً اہلِ کتاب کی یہی حالت تھی کہ ان کے علماء اور مشائخ بہت کچھ الٰہی اختیارات پر قبضہ جما چکے تھے۔ عیسائیوں کو پال نے اگرچہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد کردیا تھا لیکن اس کے باوجود نجات کے تصور نے انہیں بہت حد تک مذہبی طبقے کا مرہونِ منت بنادیا تھا۔ حکمرانوں کی قانون سازی بے قید اور آزاد تھی۔ لوگ اپنی زندگی گزارنے میں بھی کسی شرعی پابندی کے مکلف نہیں تھے۔ لیکن چند عقائد اور نجات کے تصورات ایسے ضرور تھے جس نے پوپ کے ادارے کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے تھے۔ نشأۃ ثانیہ اور احیائے علوم کی تحریکوں کے بعد اگرچہ مذہبی

Marfat.com

طبقے کی گرفت کمزور ہوگئی لیکن نجات کے حوالے سے ابھی تک انہیں بہت سے اختیارات حاصل ہیں جنہیں قانون کی تائید حاصل رہی ہے اور تحلیل و تحریم کے حوالے سے جو اختیارات مذہبی طبقے کے پاس تھے وہ تمام تر پارلیمنٹ کی طرف منتقل ہوگئے ہیں۔ اس طرح سے یہودیت اور عیسائیت میں انسانوں کو اس قدر آزادی ہے کہ ان کے یہاں الٰہی قانون کا کوئی تصور نہیں۔ اب وہ پوری طرح سے اپنی پارلیمنٹ کو رب بنا چکے ہیں۔ لیکن دکھ کی بات تو یہ ہے کہ مسلمان جو اپنے پاس محفوظ کتاب رکھتے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں پیغمبر کی زندگی محفوظ حالت میں موجود ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بہر صورت اسلامی شریعت کے پابند ہیں۔ اس کے باوجود پورے عالمِ اسلام میں کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں جو مکمل طور پر اسلامی شریعت کو نافذ کر چکا ہو بلکہ بیشتر مسلمان ملک ایسے ہیں جو مسلمان کہلاتے ہوئے اپنی پارلیمنٹ میں اسلامی شریعت اور اس کے احکام کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے اور ذہنوں میں تبدیلی لانے والے اداروں کے راستے سے رائے عامہ کو اس حد تک متاثر کر لیا گیا ہے کہ وہ بھی اسلامی شریعت اور اسلامی قانون کو قصۂ ماضی سمجھنے لگے ہیں اور جو لوگ ابھی تک اس راستے پر چلنے کیلئے کوشاں ہیں ان کے بارے میں وہ سمجھتے ہیں کہ:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

تشویشناک بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب کے جن جرائم کی وجہ سے ان کے وجود کو دھرتی کیلئے نقصان دہ قرار دے رہا ہے اگر وہی جرائم مسلمانوں میں پائے جائیں اور مسلمان انہیں جرائم کو عیب سمجھنے کی بجائے ہنر سمجھ بیٹھے ہوں اور جو لوگ انہیں ان کوتاہیوں پر ٹوکیں تو وہ انہیں گردن زدنی قرار دینے سے بھی گریز نہ کریں تو پھر سوال یہ ہے کہ ایسے مسلمانوں کا انجام کیا ہوگا؟ اللہ کا عدل تو بے لاگ ہے۔ وہ کسی نسبت کا لحاظ نہیں کرتا اس کے یہاں تو ایمان و عمل کے سکے کے سوا کوئی سکہ نہیں چلتا۔ ادھر سے تو بار بار آواز آ رہی ہے کہ

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

جب تک کوئی مریض اپنے آپ کو بیمار سمجھے تو کبھی نہ کبھی اس کا علاج ممکن ہے اور اس کی صحت کی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن جب مریض اپنے آپ کو صحت مند سمجھنے لگے اور مریض کہنے والوں کو پاگل سمجھے تو اس کے لیے کسی خیر کی امید رکھنا پاگل پن کے سوا کچھ نہیں۔ ہم شاید اسی حالت کو پہنچ رہے ہیں کہ ہم مرض کو صحت قرار دینے لگے ہیں۔ اپنے زوال کو ترقی سمجھتے ہیں۔ اپنے اخلاقی بگاڑ کو روشن خیالی کا نام دے رہے ہیں۔ اپنے ماضی سے کٹ جانے کو اعتدال پسندی شمار کرنے لگے ہیں۔ بے غیرتی کا نام ہم نے رواداری رکھ دیا ہے۔ حیوانیت کو انسانیت سمجھ بیٹھے ہیں۔ اہلِ کتاب اپنے پاس دین رکھنے کے باوجود جن کوتاہیوں اور گمراہیوں کی وجہ سے اپنے انجام نامراد کو پہنچے۔ قرآنِ کریم نے جابجا ان کا ذکر کر کے اس امت کو تنبیہ کیا ہے۔ لیکن ہم قرآنِ پاک اپنے پاس رکھنے کے باوجود ان باتوں کی طرف توجہ دینے کیلئے بھی تیار نہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ جو قوم اپنی حالت سے اس قدر بے فکر اور اپنے انجام سے اس قدر بے نیاز ہو اس کی کشتی منزلِ مراد تک کیسے پہنچے گی؟

﴿ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ﴾ جس طرح اہلِ کتاب نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے علاوہ رب بنا لیا تھا اسی طرح نصاریٰ نے مسیح ابنِ مریم کو بھی رب بنا لیا تھا۔ لیکن ان کا الگ ذکر اس لئے کیا گیا ہے تاکہ اس بات کی طرف اشارہ ہو جائے کہ انہیں صرف رب ہی نہیں بنایا گیا تھا بلکہ خدا کا بیٹا اور بعض فرقوں نے عینِ خدا بھی بنا دیا تھا حالانکہ ان سب کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کریں یعنی وہ چاہے یہودی ہوں یا عیسائی ان میں جو پیغمبر بھی آیا اس نے انہیں صرف اللہ کی عبادت کرنے کی تعلیم دی اور اللہ کے ساتھ ہر طرح کے شرک کو ممنوع قرار دیا۔

اس کے بعد فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَهٗ ﴾ یہ لفظِ تنزیہ ہے جس سے اللہ کو ہر طرح کے شرک سے پاک ثابت کرنا مقصود ہے۔ لیکن اس کے اندر توحید کی دلیل بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ ہر مشرک بھی اللہ کے بارے میں چند تصورات رکھتا ہے اور اس کی چند صفات سب کے نزدیک مسلم ہیں۔ مثلاً کوئی مشرک بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ خالق ہے اور باقی سب مخلوق ہیں۔ اللہ بے نیاز ہے باقی سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ ازل سے ہے اور قدیم ہے اور باقی سب حادث ہیں۔ ان صفات کو ذہن میں رکھئے اور پھر سوچئے کہ مخلوق خالق کی شریک کیسے ہو سکتی ہے؟ حاجت مند بے نیاز ذات کا شریک کیسے ہو سکتا ہے؟ جس پر کبھی عدم طاری رہ چکا ہے وہ ایک ایسی ذات کا شریک کیسے ہو سکتا ہے جو قدیم اور ابدی ہے؟ ہر مخلوق غذا کی محتاج ہے لیکن اللہ

Marfat.com

صرف یہ کہ کھاتا نہیں بلکہ وہ سب کو کھلاتا ہے، دونوں میں شرکت کا رشتہ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ وہ تضادات ہیں جن کی موجودگی میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ پاک ہے وہ ذات کہ جس کی وحدانیت کو عقل بھی چیلنج نہیں کرسکتی۔ اس کی شانِ الوہیت ہر طرح کی پستیوں سے مبرّا ہے۔ وہ شرک کی ہر اس آمیزش سے بلند ہے جس میں مشرک ملوث ہیں۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴿التوبة : ۳۲﴾

(وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھادیں اپنی پھونکوں سے اور اللہ انکار کرتا ہے مگر یہ کہ وہ پورا کر کے رہے گا اپنے نور کو اگرچہ کافر ناپسند کریں۔ (۳۲)

یہود کا اصل چہرہ:

سابقہ آیات میں مسلمانوں کو اہلِ کتاب سے اس وقت تک لڑنے کا حکم دیا یہاں تک کہ وہ اسلام کی حاکمیت اور اپنی محکومیت کو قبول کر کے جزیہ دینا قبول کرلیں۔ اہلِ کتاب کے بارے میں ان کے ہم عصر دوسرے لوگ ہمیشہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ ان کے پاس اللہ کی کتاب ہے، وہ کتاب کا علم رکھتے ہیں، پیغمبروں کے اسوہ کے وہ وارث ہیں، اس لئے وہ ہر لحاظ سے احترام کے مستحق ہیں۔ اسلام نے جب ان کے خلاف بھی قتال کا حکم دیا تو یقیناً بہت سے لوگوں کو قتال کی حکمت سمجھنے میں دشواری ہوئی۔ چنانچہ ان کی یکسوئی کیلئے اللہ تعالیٰ نے ان کا اصل چہرہ لوگوں کے سامنے کھولنا ضروری سمجھا، بتایا گیا کہ وہ توحید کے دعویدار ہوتے ہوئے ہر طرح کے شرک میں ملوث ہیں۔ اپنے پاس کتاب رکھنے کے باوجود حلت وحرمت کا حق اپنے مذہبی راہنماؤں کو دے چکے ہیں۔ اخلاق سے گری ہوئی کوئی ایسی حرکت نہیں جس سے ان کا دامن صاف ہو۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ مذہبی سیادت کے دعویدار ہونے اور دنیا میں اللہ کا نمائندہ کہلانے کے باوجود انہیں اللہ کے دین کی ہر بات سے اس حد تک نفور ہے کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ اللہ کے نور کو اپنی کوششوں سے بجھادیں۔ مذہب سے تعلق کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر ایسے مذہب کا آگے بڑھ کر استقبال کریں جو ان کا تعلق خالق ومالک سے بجا طور پر درست رکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ بگڑے ہوئے اور گم کردہ راہ انسانوں کو دوبارہ اللہ کے آستانے پر جھکانا چاہتا ہو اور اہلِ کتاب کو بار بار ان کی بھولی ہوئی منزل یاد دلاتا ہو۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور قرآنِ کریم جو اللہ کی طرف سے ہدایت کے آفتاب وماہتاب بن کر آئے ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ ان کی مساعی کو ناکام کر کے رکھ دیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کسی دیے کی مانند نہیں، وہ تو ایک آفتاب ہے، جسے پھونکوں سے بجھایا نہیں جاسکتا۔ اس سے پہلے مختلف نبوتوں کے چراغ جلتے رہے اللہ نے ان کے ذریعے انسانوں کو ہدایت سے نوازا۔ ان میں سے ہر ایک چراغِ ہدایت کی طرح اپنے اپنے وقت تک جلتا رہا اور اپنی عمر گزار کر اپنی صف لپیٹتا رہا۔ لیکن اب ہدایت کا وہ چراغ آیا ہے کہ جسے بجھانا تو دور کی بات ہے اس کی لو بھی کبھی مدہم نہیں ہوگی۔ وہ صبح کے ستارے کی طرح مختصر عمر لے کر نہیں آیا بلکہ آفتاب کی طرح تمام انسانوں کیلئے روشنی کا سامان بن کر آیا ہے۔ اس کے آجانے کے بعد ہدایت کے تمام ستارے ماند پڑ گئے ہیں۔

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

اہلِ کتاب کی معاندانہ مساعی:

اہلِ کتاب نے اس آفتاب کو گرہن لگانے کیلئے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے، غلط فہمیوں کی فصل بوئی، الزامات کی آندھیاں اٹھائیں، سازشوں کے جال بنے، دوسروں کو ساتھ لے کر میدانِ جنگ میں بھی قسمت آزمائی، لیکن اللہ جل جلالہ نے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ اسلام کے نورِ ہدایت پر کہیں آنچ نہیں آنے دے گا۔ اسلام کا نور درخشاں سے درخشاں تر ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے ماننے والوں کی تعداد وقت کے ساتھ ساتھ فزوں تر ہوتی جائے گی۔ چنانچہ اللہ کا

Marfat.com

فیصلہ غالب آیا اور آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں جزیرۂ عرب کی حد تک اسلام غالب آ گیا۔ لیکن یہ قافلہ بہار رکا نہیں، آنحضرت اپنے پیچھے ایسے جانثاروں اور سرفروشوں کی جماعت چھوڑ گئے جنہوں نے ربع صدی میں دنیا کا نقشہ بدل ڈالا۔ صدی کے اختتام تک وہ دنیا کی سب سے بڑی قوت بن چکے تھے۔ بروبحر میں ان کا پھریرہ لہراتا تھا۔ اسلام کا ہراول دستہ یقیناً عرب کے صحرا سے اٹھا لیکن نصف صدی گزرنے نہیں پائی تھی کہ اس کی تگ و تاز روڈس اور صقلیہ تک پہنچ چکی تھی اور پھر رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ یہ صحرانشین خشکی کے ساتھ ساتھ سمندر پر بھی چھا گئے۔ جسے یاد کر کے اقبال کہتا ہے۔

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ۝

وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر تاکہ وہ اس دین کو غالب کردے تمام دینوں پر اگرچہ مشرکوں کو ناگوار گزرے۔ (۳۳) ﴿التوبۃ : ۳۳﴾

آپ کی بعثت کا مقصد:

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نبی اور رسول دنیا کی اصلاح اور ہدایت کیلئے تشریف لاتے ہیں ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو نصیحت فرماتے اور افہام و تفہیم سے کام لیتے ہیں۔ سعید روحیں انہیں قبول کر لیتی ہیں لیکن بگڑے ہوئے بداطوار لوگ نہ صرف قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں بلکہ اللہ کے نبیوں کو ہر ممکن اذیت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس دعوت کو آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا جائے۔ لیکن اللہ کے نبی ان کی معاندانہ روش کے باوجود نصیحت اور ہدایت کا کام جاری رکھتے ہیں حتیٰ کہ ہدایت و اصلاح کی انہی مساعی میں وہ دنیا سے واپس چلے جاتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ اللہ کی زمین پر قوت اور کوشش سے اللہ کا دین نافذ کیا جائے اور اللہ کے بگڑے ہوئے بندوں کو اس کے آستانے پر جھکایا جائے وہ سراسر یہ کام اپنے مخاطبوں پر چھوڑتے ہیں جو قبول کر لیتے ہیں، وہ عنداللہ آخرت میں اجر پائیں گے اور جو قبول نہیں کرتے وہ آخرت میں جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ لیکن پیشِ نظر دونوں آیتوں سے ایک بالکل مختلف صورتحال سامنے آتی ہے، اللہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنا آخری رسول بھیج کر اہلِ دنیا پر اتمامِ حجت کر دی ہے میرے پیشِ نظر اس سے کم تر کوئی چیز نہیں کہ میں اپنے نورِ ہدایت کو مکمل کر کے رہوں گا۔ یعنی جس قوم اور جس سرزمین پر آخری رسول مبعوث ہوئے ہیں اس پر اللہ کی شریعت بتمام و کمال نافذ ہو کر رہے گی اور دینِ اسلام کو مکمل غلبہ نصیب ہوگا کیونکہ اللہ نے اپنا آخری رسول اسی ارادے کے ساتھ بھیجا ہے کہ اپنے دین کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کردے۔ علمی طور پر بھی اس کی عظمت کو تسلیم کیا جائے اور سیاسی طور پر بھی۔ سرزمینِ حرم پر پہلے مرحلے میں کوئی دوسرا دین باقی نہ رہے۔ جزیرۂ عرب کو ہر آلائش سے پاک کر دیا جائے، اسے امتِ مسلمہ کا ایک ایسا بیس (Base) اور مضبوط مرکز بنا دیا جائے جہاں سے پوری دنیا کی ہدایت اور روشنی کا انتظام کیا جا سکے۔ یہاں سے سرفروشوں کی وہ جماعت اٹھے جن کے پیشِ نظر اللہ کے دین کی بالادستی کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہو۔ پھر ان کی کوششوں سے دنیا کے بیشتر حصے پر اللہ کے دین کا پھریرا لہرائے، چاہے یہ بات مشرکینِ عرب کو کیسی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں پورے جزیرۂ عرب کو اسلام کی آغوش میں دے دیا اور آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانے میں اسلام دنیا کی ایک غالب قوت بن گیا اور صدی گزرنے سے پہلے پہلے وہ اتنی بڑی سیاسی قوت بن گیا کہ دنیا میں کوئی اور قوت اس سے ٹکر لینے کے قابل نہ رہی۔ بیشتر ریاستیں اس کی باج گزار اور خراج ادا کرنے والی تھیں اور لوگوں نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

حضرت مقداد ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ روئے زمین پر کوئی کچا پکا مکان باقی نہ رہے گا جس میں اسلام کا کلمہ نہ داخل ہو جائے۔ عزت داروں کی عزت کے ساتھ اور ذلیل لوگوں کی ذلت کے ساتھ۔

Marfat.com

جن کو اللہ تعالیٰ عزت دیں گے وہ مسلمان ہو جائیں گے اور جن کو ذلیل کرنا ہوگا وہ اسلام کو قبول تو نہ کریں گے مگر اسلامی حکومت کے تابع ہو جائیں گے۔ ایک ہزار سال تک تاریخ نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ صحرا سے اٹھنے والی ایک تحریک اور مٹھی بھر جماعت نے محض اپنے دین کی سچائی اور اللہ کی تائید و نصرت کے بل بوتے پر دنیا کے بیشتر حصے کو اسلام کے نور سے جگمگا دیا اور اللہ کی زمین پر ایسا عادلانہ نظام قائم کیا جس کی نظیر چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق قیامت سے پہلے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا تو دنیا یہ سچائی بھی دیکھ لے گی کہ روئے زمین پر صرف اسلام باقی رہے گا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری سے عیسائیوں پر حجت تمام ہو جائے گی اور وہ سب مسلمان ہو جائیں گے۔ یہود اپنی فطری اور طبعی کج روی کے باعث قتل کر دیئے جائیں گے۔ دنیا پر صرف اسلام کا جھنڈا بلند ہوگا۔ آج اگرچہ مسلمان حالات کے پھیر میں آئے ہوئے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں تک دلیل و برہان کا تعلق ہے، آج بھی اسلام تمام مذاہب پر غالب ہے۔ کوئی مذہب نہ اپنے پاس اللہ کی محفوظ کتاب رکھتا ہے اور نہ اپنے پیغمبر کا اسوہ۔ چند دینی مراسم کے سوا ان کے پاس کچھ نہیں۔ اپنی کمزوری کے اعتراف کے طور پر انہوں نے سیکولرازم کو اپنا مذہب بنا لیا ہے۔ آج اگر سیاسی طور پر مسلمان کمزوری کا شکار ہیں اس کا سبب بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اسلام سے دور ہٹ گئے ہیں اسلام ان کا عقیدہ ضرور ہے لیکن دین نہیں۔ جدید تعلیم نے انہیں بھی سیکولرسٹ بنا دیا ہے۔ وہ دین کو فرد اور اللہ کے درمیان پرائیویٹ معاملہ سمجھنے لگے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی اسلامی ریاست میں اللہ کا دین مملکت کا آئین نہیں۔ اسے وہ حیثیت حاصل نہیں جو اسے دورِ خلافتِ راشدہ میں حاصل تھی۔ دین سے دوری بلکہ دین بیزاری کی یہ سزا ہے جس میں آج مسلمان مبتلا ہیں۔ آج بھی اگر وہ اپنی اصلاح کر لیں اور اللہ اس کے رسول اور اس کے بھیجے ہوئے دین سے وہی تعلق قائم کر لیں اور اسی طرح اپنی زندگیاں اس کے حوالے کر دیں جس طرح دین کا مطالبہ ہے تو آج بھی مسلمان دنیا کی غالب قوت بن سکتے ہیں اور اللہ کا دین تمام دوسرے دینوں پر غالب آ سکتا ہے۔ آج کے مشرک اور کافر اسی طرح اس کا راستہ روکنے سے عاجز ہو جائیں گے جیسے عہد نبوت میں عاجز ہو گئے تھے۔

آج بھی ہو جو ابراہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ؕ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ۝

اے ایمان والو! بے شک بہت سے پادری اور راہب ایسے ہیں جو لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جوڑ کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے۔ (۳۴) جس دن دوزخ میں اس پر آگ دہکائی جائے گی پھر داغی جائیں گی اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پشتیں اور انہیں بتایا جائے گا کہ یہ ہے وہ جو تم نے اپنے لئے جمع کر رکھا تھا تو اب چکھو سزا اس کی جو تم جمع کیا کرتے تھے۔ (۳۵) ﴿التوبۃ: ۳۴، ۳۵﴾

اہلِ کتاب کا مخلوقِ خدا سے رویہ:

گزشتہ سے پیوستہ آیات میں اہلِ کتاب کے ان جرائم کو بیان کیا گیا تھا جن کا تعلق خالق کی معرفت اور اس کے حقوق سے تھا۔ اب ان کے ان جرائم کو بیان کیا جا رہا ہے جن کا تعلق مخلوقِ خدا سے ہے۔ جس طرح اللہ کی ذات و صفات اور اس کے حقوق میں انہوں نے بڑی بڑی خیانتیں کیں جس سے توحید کا تصور بگڑ کر رہ گیا۔ اسی طرح انہوں نے دینی راہنما ہوتے ہوئے اور اصلاح و ہدایت کا لبادہ اوڑھ کر اللہ کے بندوں کے ساتھ وہ فریب کیے جس کے نتیجے میں ان کیلئے لوگوں کے مال بٹورنے آسان ہو گئے۔ جہاں تک یہود کا تعلق ہے انہوں نے زکوٰۃ اور قربانی مذہبی طبقے بالخصوص

Marfat.com

حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد کیلئے مخصوص کردی حالانکہ اللہ نے ہر شریعت میں زکوٰۃ کی فرضیت کا مقصد یہ بیان فرمایا تھا کہ اغنیاء سے دولت وصول کی جائے گی اور غریبوں پر خرچ کی جائے گی۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اسی مقصد کو مزید واضح کر کے بیان فرمایا۔

﴿ناخذُ من اغنیاء ھم و نرد علی فقراء ھم "ہم مالداروں سے لیں گے اور ناداروں پر لوٹا دیں گے"﴾

یہود نے اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ زکوٰۃ وصدقات کو مذہبی طبقے کیلئے مخصوص کر کے اپنے احبار ورہبان کیلئے جلب زر کا اہتمام کیا بلکہ انہوں نے مذہبی راہنما اور سیادت و مشیخیت کے دعویدار ہونے کے باوجود رشوت لینے اور سود کھانے کو بھی اپنا معمول بنالیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا بگاڑ اس انتہا تک پہنچا اور حب دنیا نے اس حد تک انہیں روحانیت سے محروم کر دیا کہ حصولِ زر کے وہ ذرائع جو ان کی شریعت میں بھی یکسر حرام تھے انہیں اپنے اور قوم کیلئے حلال کر دیا۔ مزید ستم یہ کیا کہ چونکہ عدالتوں کے تمام مناصب انہی کی تحویل میں تھے چنانچہ عدالتی اختیارات کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنالیا جو مقدمہ ان کے پاس آتا چونکہ قوم ان کے سیرت و کردار سے واقف ہو چکی تھی اس لئے فیصلے سے پہلے فریقین یا کوئی ایک فریق ان سے رابطہ کرتا تو جس سے ان کے مالی معاملات طے ہو جاتے وہ اس کے حق میں فیصلہ دیتے اس طرح سے عدالتیں بھی حرام خوری اور بد دیانتی کا مرکز بن گئیں۔ انصاف قدم قدم پر بکنے لگا اور یہ نام نہاد پروہت انصاف کی قیمت وصول کرنے لگے۔

جہاں تک مذہبی معاملات کا تعلق ہے وہ اس بارے میں اپنی قوم کو اس بات کا خوگر بنا چکے تھے کہ تم کوئی مذہبی رسم اپنے طور پر ادا نہیں کر سکتے ہو۔ پیدائش کا مرحلہ ہو یا عقیقے کی رسم ہو۔ نکاح کا معاملہ ہو یا مرگ کے بعد کی رسمیں، ان میں سے کوئی کام بھی مذہبی راہنما کی موجودگی کے بغیر انجام نہیں پا سکتا تھا اور انہوں نے ایسے ہر کام میں شرکت کی فیس مقرر کر رکھی تھی۔ بچے کے کان میں اذان اور عقیقے کی دعا حصولِ زر کے بغیر ناممکن تھی۔ موت کی رسمیں بھی اپنی قیمت رکھتی تھیں۔ مرنے والے کے گھر سے ایک مدت تک مذہبی راہنما کے گھر میں پر تکلف کھانا بھیجا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ انہوں نے قدم قدم پر اپنے لئے حصولِ زر کے مواقع پیدا کر لیے تھے۔

رہے عیسائی تو ان کے مذہبی راہنماؤں نے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ کیتھولک فرقہ کے پاپائے اعظم نے اپنے آپ کو حضرت مسیح کا جانشین قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ گناہ گاروں کی بخشش صرف ان کی سفارش سے ہو سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مسیحی جنت کے حصول کیلئے پاپائے اعظم کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ وہ یقین رکھتا تھا کہ اگر میں نے پاپائے اعظم کو خوش نہ کیا تو یہ چونکہ زمین پر اللہ کا نمائندہ ہے تو اس کی ناراضگی کی صورت میں میں اللہ کی بادشاہت میں کبھی داخل نہیں ہو سکتا۔ پاپائے اعظم ہر شخص کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھاتا اور ہر آنے والے کی مالی حالت کا اندازہ کر کے جنت کی رقم وصول کرتا اور پھر جنت کا ٹکٹ جاری کرتا۔ پاپائے اعظم کے جانشینوں نے اپنے اپنے عہدہ ومنصب کے مطابق لوگوں کے گناہ بخشنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیا کیونکہ لوگوں کو یہ عقیدہ دیا گیا کہ تم جب تک اپنے گناہوں کی تفصیل پادری یا پوپ کے سامنے بیان کر کے اور اس کی فیس ادا کر کے بخشش کا سرٹیفیکیٹ حاصل نہیں کرو گے اس وقت تم جنت میں داخل نہیں ہو سکو گے۔ چنانچہ وہ بھی لوگوں سے ان کی بداعمالیوں کی تفصیل مزے لے لے کر سنتے اور پھر ان سے ایک بڑی رقم وصول کرنے کے بعد بخشش کے چیک جاری کرتے۔ ایسے ضعیف الاعتقاد اور خوش عقیدت لوگ اسی وقت تک نام نہاد مذہبی راہنماؤں کی عقیدت کے جال میں گرفتار رہ سکتے ہیں جب تک انہیں دین کے صحیح تصور اور مسائل کے صحیح علم سے دور رکھا جائے چنانچہ عیسائی علماء کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی کتاب کا صحیح علم نہ پہنچنے دیں اور چونکہ اہلِ کتاب کے پاس اپنے پیغمبر کی سنت محفوظ نہیں رہی تھی جو کتاب اللہ کے ہر حکم کے منشا کو متعین کر سکتی چنانچہ اس خلا کو پر کرنے کیلئے انہوں نے ایسے طریقے اختیار کیے جس سے اللہ کی کتابیں موم کی ناک بن کر رہ گئیں۔

آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد جب لوگوں کے سامنے دین کے بنیادی اعتقادات واضح ہو کر سامنے آنے لگے اور ان کے مذہبی راہنماؤں کی خیانتیں بھی بتائی جانے لگیں تو ان کے علماء نے محسوس کیا کہ اگر نبی آخر الزماں ﷺ کا اعتماد لوگوں کے دلوں میں اتر گیا اور رفتہ رفتہ ان کے علم میں وہ علامتیں بھی آگئیں جو ہماری کتابوں میں نبی آخری الزمان کے بارے میں بیان کی گئی ہیں تو پھر انہیں نہ صرف اسلام سے دور رکھنا ناممکن ہو جائے گا بلکہ ہماری راہنما حیثیت بھی ایک سوالیہ نشان بن جائے گی۔ لوگ ہماری ایک ایک خیانت کو پکڑیں گے اور سوال کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ آنحضرت ﷺ اور اسلام کے بارے میں ایسی بدگمانیوں کی دھول اڑائی جائے جس میں صحیح اور غلط کی تمیز مشکل ہو جائے۔ آیتِ کریمہ میں ﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ کا شاید یہی مفہوم ہے۔

Marfat.com

انتہائی تکلیف دہ بات جس سے پتہ پانی ہونے لگتا ہے وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم جن بداعمالیوں کا ذکر اہلِ کتاب کے حوالے سے کر رہا ہے ان میں سے کون سی ایسی بات ہے جو آج مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی؟ ان کے علماء کی ایک بڑی تعداد حبِ دنیا کی مریض ہو چکی ہے، ان کی بڑی بڑی گدیوں کے سجادہ نشین اپنے بزرگوں کی ولایت کی قیمت وصول کر رہے ہیں، ان کے بزرگوں نے بھوکا رہ کر لوگوں کو دین سکھایا، یہ لوگوں کی جیبیں کاٹ کر لوگوں کو بے دین بنا رہے ہیں۔ انہیں کچھ خبر نہیں کہ اللہ نے ان پر کتنی بڑی ذمہ داری ڈالی ہے اور انہیں کتنے بڑے منصب پر فائز کیا ہے۔

میراث میں آئی ہے انہیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

سونا چاندی جمع کرنے کی مذمت:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ سیاقِ کلام کے اعتبار سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اشارہ انہیں اہلِ کتاب کے علماء اور یہود کی طرف ہے، جن کی زر پرستی کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ لیکن بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اگر صرف اہلِ کتاب مراد ہوتے تو پھر الذین کے اضافہ کی ضرورت نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں عموم پایا جاتا ہے۔ اس کا اسلوب بھی عام تعلیم کا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو لوگ بھی حبِ دنیا کے اسیر ہوں گے اور سونا چاندی جمع کرنا اور انہیں سینت سینت کر رکھنا ان کی زندگی کا مقصد ہوگا اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے ہمیشہ پہلوتہی کرتے ہوں گے، وہ سب اس میں شامل ہیں۔ چاہے وہ اہلِ کتاب میں سے ہوں اور چاہے مسلمانوں میں سے کیونکہ اسلام نے سونا چاندی یعنی دولتِ دنیا کو ضرورت کی چیز بنایا ہے مقصد نہیں اور مزید یہ کہ یہ انسان کی ملکیت نہیں بلکہ امانت ہے اور امانت کی ہمیشہ ادائیگی کی فکر ہوتی ہے کوئی بھی اسے سینت سینت کر رکھنا پسند نہیں کرتا۔ اسے اللہ کے راستے میں خرچ ہوتے رہنا چاہئے۔ اللہ کے راستے سے مراد ہر وہ مصرف ہے جس سے مخلوقِ خدا کی ضرورتیں پوری ہوتیں اور اللہ کے دین کی نشر و اشاعت اور سربلندی میں مدد ملتی ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ سال بہ سال آدمی اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکالے، مال نقدی کی صورت میں ہو یا تجارت کی شکل میں، زراعت ہو یا مویشیوں کے ریوڑ، ہر ایک میں اللہ نے نصاب بھی مقرر کیا ہے اور زکوٰۃ کی مقدار بھی۔ جو شخص پوری احتیاط کے ساتھ زکوٰۃ نکالتا ہے اس کا مال اسے کوئی نقصان نہیں دیتا۔ بشرطیکہ ملک کے حالات، مسلمانوں کی ضرورتیں، اس کا گردوپیش اس سے مزید طلب نہ کرتا ہو۔ اگر جنگ چھڑ جاتی ہے اور جنگی ضرورتیں اہلِ وطن سے ایثار کا مطالبہ کرتی ہیں یا ملک میں قحط پھیل جاتا ہے، لوگ بھوک سے بلبلا اٹھتے ہیں یا اڑوس پڑوس میں یتیموں مسکینوں یا بیواؤں کی ضرورتیں صدقاتِ واجبہ سے پوری نہیں ہوتیں یا کسی نادار اور لاوارث کی بے گور و کفن لاش مزید ایثار کی متقاضی ہے تو ایسی صورت میں صرف زکوٰۃ کافی نہیں بلکہ اللہ کے راستے میں مزید انفاق کرنا بھی فرض ہو جاتا ہے۔

کنز کی حقیقت:

﴿کنز﴾ یوں تو خزانے پر بولا جاتا ہے لیکن لغت میں اس مال کو کہتے ہیں جسے اکٹھا کر کے جمع کر لیا جائے۔ اس آیتِ کریمہ میں چونکہ کنز پر تنبیہ آئی ہے، اس لئے صحابہ نے اس پر غور کیا کہ ''کنز'' سے کیا مراد ہے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ طبعی طور پر اس معاملے میں بڑے متشدد تھے۔ ان کا رجحان ترکِ دنیا کی طرف تھا۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے آپ کو اس امت کا مسیح قرار دیا تھا، ان کی رائے یہ تھی کہ وہ مال جو ضرورت سے زیادہ ہو اس کو جمع کر کے رکھنا کنز ہے اور اس کی یہی سزا ہے۔ لیکن جمہور صحابہ جن میں خلفائے راشدین بھی شامل ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز نہیں اس لئے وہ اس وعید میں داخل نہیں۔ یہی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے اپنے زیور پر زکوٰۃ کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر زیور کی مقدار اتنی ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے اور پھر تم اگر اس پر زکوٰۃ ادا کر دیتی ہو تو وہ کنز نہیں اور اگر زکوٰۃ ادا نہیں کرتی ہو تو وہ کنز کے حکم میں شامل ہے۔ مزید برآں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جیسے مالدار صحابہ

Marfat.com

بھی موجود تھے۔ اور ان کی مالداری آپ کے علم میں تھی کیونکہ وہ کئی دفعہ مسلمانوں کی ضرورتوں اور اعلائے کلمۃ الحق کیلئے بڑی بڑی رقمیں دے چکے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے کبھی انہیں حکم نہیں دیا کہ تم سارا مال صدقہ کر دو بلکہ حضرت سعد بن ابی وقاص ﷛ نے جب اپنا سارا مال اللہ کے راستے میں دینے کا ارادہ کیا تو آپ نے منع فرمایا، صرف ایک تہائی دینے کی اجازت دی۔ لیکن اگر حالات جیسے میں پہلے عرض کر چکا ہوں مزید فیاضی کا تقاضہ کر رہے ہوں تو اس وقت صرف زکوٰۃ کی ادائیگی پر اکتفا کرنا اور یہ سمجھ لینا کہ میری نجات کیلئے یہی کافی ہے بہت غلط بات ہے ایسے حالات میں بڑھ چڑھ کر انفاق کرنا چاہئے اور بعض حالات میں تو اسلام حاکمِ وقت کو بھی حق دیتا ہے کہ اگر حالات کا تقاضا ہو تو وہ لوگوں سے مال زبردستی بھی وصول کر سکتا ہے تاکہ ملک کو بچایا جا سکے اور لوگوں کی جانیں بچائی جا سکیں۔

عذاب کی جھلک:

یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا ...... الخ اس آیتِ کریمہ میں اس عذاب کی ہلکی سے تفصیل بیان کی گئی ہے جس کی سابقہ آیات میں خوشخبری سنائی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں چونکہ رائج الوقت سکہ سونا چاندی ہی سے ڈھلتا تھا بلکہ بعض دفعہ سونا اور چاندی مستقلاً سکے کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ آج کی طرح کاغذ کا سکہ نہیں ہوتا تھا۔ جو آدمی مال جمع کرنا چاہتا تھا اسے سونا چاندی ہی سے سابقہ رہتا تھا۔ اسی سے پیار کرتا اور اسی کو سینت سینت کر رکھتا تھا چنانچہ اسی کو عذاب کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ اسی سونے چاندی کو جہنم کی آگ میں دہکایا جائے گا اور پھر اس سے پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور جب آدمی اس کی تکلیف کی شدت سے تڑپے گا تو اسے یہ کہا جائے گا کہ یہ وہی تمہارا مال ہے جسے تم نے بڑی محنت سے سینت سینت کر رکھا تھا۔ اس میں پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کا ذکر شاید اس لئے فرمایا گیا ہے کہ جب کسی مالدار کے سامنے کوئی فقیر دستِ سوال دراز کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑتی ہیں، پھر وہ اس سے پہلو پھیرتا ہے اور اگر پھر بھی مانگنے والے کا اصرار جاری رہے تو وہ پشت پھیر کر چل دیتا ہے۔ تو دنیا میں مالدار نے جس جس طریقے سے اور جن اعضاء کے ذریعے سائل کو جھٹلایا اور مالداری کا غرور کیا انہی ذریعوں کو عذاب کا ہدف بنایا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ ﷛ کی ایک روایت میں اس کی وضاحت فرمائی گئی ہے آپ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے پاس سونا اور چاندی ہو لیکن وہ اس کا حق ادا نہیں کرتا تو قیامت کے دن اس کی تختیاں بنائی جائیں گی اور انہیں آتشِ جہنم میں گرم کر کے اس شخص کے پہلو پیشانی اور پشت پر داغ لگائے جائیں گے۔ جب بھی وہ ٹھنڈی ہو جائیں گی انہیں پھر گرم کر لیا جائے گا۔ اس طرح سے یہ عذاب جاری رہے گا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ كَآفَّةً كَمَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ○ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّ یُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّیُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَیُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُیِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ○ (التوبۃ ۳۶ تا ۳۷)

بیشک مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک نوشتۂ الٰہی میں بارہ مہینے ہیں جس دن اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ان میں چار حرمت والے ہیں، یہی دینِ قیم ہے۔ پس تم ان مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور تم مشرکوں سے جنگ کرو من حیث الجماعت، جس طرح وہ تم سے جنگ کرتے ہیں من حیث الجماعت اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ (۳۶) بیشک نسی کفر میں ایک اضافہ ہے، گمراہ کئے جاتے ہیں اس سے وہ لوگ جو کافر ہیں، حلال کر دیتے ہیں ایک ماہ کو ایک سال اور حرام کر دیتے ہیں اسی کو دوسرے سال تاکہ وہ پوری کریں گنتی ان مہینوں کی جنہیں اللہ نے حرام کیا ہے پھر حلال کریں جسے اللہ نے حرام کیا ہے مزین کر دیئے گئے ہیں ان کیلئے ان کے برے اعمال اور اللہ ہدایت نہیں دیتا کافر قوم کو۔ (۳۷)

Marfat.com

خدائی تقویم:

گزشتہ آیات میں مشرکینِ عرب اور اہلِ کتاب سے لڑنے کا حکم دیا گیا تھا اور مشرکینِ عرب کو بطورِ خاص نوٹس دیا گیا تھا کہ اب تمہارے لئے جزیرۂ عرب میں رہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ مشرکین کے خلاف یہ اقدام حرمت والے مہینوں کے گزرنے کے بعد ہونا چاہئے تاکہ ان مہینوں کی حرمت باقی رہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ضروری بحث سمیٹ لینے کے بعد دوبارہ اشہرِ حرم کی حرمت کو نمایاں کیا جا رہا ہے اور ساتھ ہی کچھ مزید احکام دیئے جا رہے ہیں۔ عربوں نے باوجود اس کے کہ وہ ان مہینوں کی حرمت کے قائل تھے ان میں بہت کچھ تبدیلیاں کر دی تھیں۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اس کی بھی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ ان مہینوں میں حرمت کی تاکید مزید کیلئے فرمایا گیا کہ ان مہینوں کی یہ حرمت لوگوں میں سے کسی نسل کے فیصلے سے نہیں کی گئی بلکہ اللہ نے جب زمین و آسمان کو پیدا کیا اور کائنات کے بارے میں ازل میں جب فیصلے لوحِ محفوظ میں ثبت کیے گئے تو اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ سال کے بارہ مہینے ہوں گے اور ان میں چار مہینے حرمت والے مہینے ہوں گے۔ جس میں لڑنا بھڑنا ممنوع ہوگا اور اس کیلئے ایک ایسا حیرت انگیز نظام تشکیل دیا جس کی حیثیت ایک قدرتی جنتری کی ہے اور جس میں کسی کمی بیشی کا امکان بھی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ زمین اپنی گردش ایک سال میں پوری کرتی ہے اور ہر مہینے چاند ایک دفعہ ہلال بنتا ہے۔ وہ بڑھتے بڑھتے قمر بنتا ہے پھر زوال کا شکار ہوتا ہے، مہینے کے آخری دنوں میں وہ ڈوب جاتا ہے اور ٹھیک ایک مہینے کے بعد وہ نئے مہینے کی نوید بن کر ہلال کی صورت میں طلوع ہوتا ہے۔ اس طرح سال کے بارہ مہینے وجود میں آتے ہیں۔ یہ ایک ایسا دینِ قیم اور مضبوط دین ہے۔ جس کی پشت پر اللہ کا فیصلہ کارفرما ہے اور ایک ایسی مضبوط جنتری ہے جس میں کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔

ازل سے چار مہینوں کو حرمت اور تقدس عطا کئے جانے کی حکمت تو اللہ ہی کے علم میں ہے لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جس کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے اور سلف صالحین کا ہمیشہ اس پر عمل بھی رہا ہے وہ یہ کہ ان مہینوں کو اللہ نے خاص فضیلت عطا فرمائی ہے اس میں کیا جانے والا ہر نیک عمل باقی مہینوں میں کئے جانے والے اعمال کی نسبت سے بہت زیادہ فضیلت کا حامل ہوتا ہے۔ ان مہینوں میں ہر عمل کا اجر و ثواب بڑھ جاتا ہے۔ دلوں کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ قلبی اصلاح کیلئے یہ مہینے نہایت مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ جس طرح ہر فصل کا ایک موسم ہوتا ہے اور وہ اسی موسم میں بڑھتی، پھلتی، پھولتی اور بارآور ہوتی ہے۔ یہ مہینے بھی حسنِ عمل اور انابت الی اللہ کے مہینے ہیں۔ یہ حیثیت تو ان کی ہمیشہ سے ہے لیکن جب جزیرۂ عرب میں بدعملی کی ایک لہر اٹھی جس نے بڑھتے بڑھتے پورے جزیرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کسی شخص کے لئے جائے امان نہ رہی اکیلے دکیلے سفر کرنا ناممکن ہوگیا۔ قافلے بھی بعض دفعہ لوٹ لیے جاتے۔ ایسی صورتحال میں ان چار مہینوں نے عربوں کو تباہ ہونے سے بچایا۔ وہ چونکہ ملتِ ابراہیم کے ماننے والے تھے اور ان کے عقیدے میں یہ بات راسخ تھی کہ ان چار مہینوں میں لڑائی سخت گناہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان چار مہینوں میں عربوں کا کہیں آنا جانا، تجارت کیلئے نکلنا حتی کہ کعبۃ اللہ کی زیارت کیلئے جانا بھی آسان ہوگیا۔ یہ چار مہینے ذیقعد، ذی الحج اور محرم مسلسل ہیں، جنہیں اشہرِ حج بھی کہا جاتا ہے یعنی انہیں مہینوں میں عرب حج کیلئے نکلتے اور اپنے علاقوں میں واپس پہنچتے۔ حج ان کے مذہب اور زمانے میں بھی آٹھ ذی الحج سے تیرہ ذی الحج تک ہی ہوتا تھا لیکن دور دراز علاقوں سے اونٹوں یا گھوڑوں پر سوار ہو کر آنے میں ایک عرصہ صرف ہو جاتا تھا اس لئے ذی الحج سے پہلے ذیقعدہ کو بھی حرمت والا مہینہ قرار دیا گیا تاکہ لوگ حج کیلئے آسانی سے پہنچ سکیں اور واپسی کیلئے ذی الحج کے باقی دن اور محرم کا پورا مہینہ اس میں شامل کیا گیا تاکہ واپسی کا سفر بھی محفوظ رہے۔ اشہرِ حرم میں چوتھا مہینہ رجب کا ہے۔ جس میں عرب عام طور پر عمرہ ادا کرتے تھے اور وہ اشہرِ حج میں عمرے کی ادائیگی کو جائز نہیں سمجھتے۔ یہ چار مہینے عربوں کیلئے نہ صرف حج اور عمرے کی ادائیگی کا ذریعہ بنے بلکہ ان کی تجارت میں فروغ کا بھی سبب بنے چونکہ کوئی عرب ان مہینوں میں کسی پر دست درازی کو جائز نہیں سمجھتا حتی کہ وہ ان مہینوں میں اپنے باپ سے قصاص لینے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا۔ اس وجہ سے پورا عرب ان مہینوں میں دارالامن بن جاتا تھا۔ لوگوں کا کہیں بھی آنا جانا، تجارت کرنا یا کسی اور معاملے کو انجام دینا آسان ہوگیا۔

Marfat.com

اشہرِ حرم میں حدود سے تجاوز نہ کرنا:

اللہ تعالیٰ اپنے اس احسان کو ذکر کرنے کے بعد فرمارہے ہیں کہ چونکہ یہ مہینے اللہ کے مقرر کردہ ہیں اور ان کی حرمت بھی اللہ کی عطا کردہ ہے تو دیکھو ان مہینوں میں کسی طرح کا حدود سے تجاوز بھی سنگین جرم ہے۔ اگر تم ایسی کوئی حرکت کروگے تو تم اپنے اوپر ظلم کروگے۔ اپنے اوپر ظلم کی حماقت کبھی نہ کرنا، کسی دوسرے پر حملہ کرنے کی جسارت نہ کرنا، کسی جنگ میں شریک نہ ہونا۔ البتہ! اگر تمہارا دشمن ان مہینوں میں سے کسی مہینے میں تم پر حملہ کردے تو تم بھی اس حملے کا جواب دینے میں آزاد ہو۔ وہ جس طرح من حیث الجماعت تمہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور تمہیں ہر ممکن طریقے سے مٹا دینا چاہتے ہیں تم بھی انہیں اپنا من الحیث الجماعت دشمن سمجھو اور پوری قوت اور وحدت کے ساتھ ان سے قتال کرو۔ البتہ! یہ بات یاد رکھو کہ تمہیں ان سے قتال میں پہل نہیں کرنی چاہئے کیونکہ اشہرِ حرم میں لڑنا سخت گناہ ہے اور اس گناہ کا بار اس پر پڑے گا جو پہل کرے گا۔ البتہ! اپنے دفاع میں لڑنے کی اجازت ہے اور اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر کافر جنہوں نے اللہ کی تمام حدود پامال کرڈالی ہیں ان کیلئے اس حد سے تجاوز کر جانا بھی کوئی مشکل بات نہیں وہ تم پر حملہ کریں اور تم اشہرِ حرم کی حرمت کی وجہ سے حملہ کا جواب دینے سے احتراز کرو تو اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کیا ہوگا؟ تقویٰ بلا وجہ اپنا سر کٹوا دینے کا نام نہیں بلکہ دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جانا اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کے احکام کی ہر ممکن تعمیل کرنا یہ تقویٰ ہے اور یہی تقویٰ والے ہیں جن سے اللہ پیار کرتا ہے۔

نسی کا سبب اور طریقہ:

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ان حرمت والے مہینوں کا بہت احترام کرتے چلے آرہے تھے اور ان میں لڑائی کرنے کو سخت ممنوع سمجھتے تھے لیکن ان کیلئے مشکل یہ تھی کہ عرصۂ دراز سے ان کی اخلاقی قدریں پامال ہو چکی تھیں، ان کے اندر کی بہیمیت ترقی کرتے کرتے درندگی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ بنابریں وہ ایسی زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے جس میں خوں ریزی، قزاقی، راہزنی، اور لڑائی نہ ہو۔ عام معمول کی پرامن زندگی ان کے نزدیک بزدلی کی علامت تھی۔ جو شخص کسی کا گھر نہیں لوٹتا، کسی کو قتل نہیں کرتا، کسی کی عزت پر حملہ آور نہیں ہوتا، وہ ان کے نزدیک مردانہ صفات سے عاری ہے۔ اپنی اس خصلت سے مجبور ہو کر انہوں نے ایک راستہ نکالا جس سے بظاہر اشہرِ حرم کی حرمت بھی باقی رہے اور ان کی درندگی کے اظہار پر کوئی قدغن بھی عائد نہ ہو۔ چنانچہ جب کبھی وہ اپنی سفاکانہ خصلت سے مجبور ہوتے اور فیصلہ کرتے کہ ہمیں فلاں قبیلہ پر حملہ کرنا ہے اور وہ مہینہ اشہرِ حرم میں سے کوئی مہینہ ہوتا یا لڑائی پھیلتے پھیلتے ایسے مہینے تک پہنچ جاتی کہ اشہرِ حرم کا آغاز ہو جاتا تو وہ یہ عجیب حرکت کرتے کہ حرام مہینے کو حلال کر لیتے اور حلال مہینے کو حرام مہینہ قرار دے دیتے۔ فرض کریں انہیں محرم میں لڑنے کی ضرورت پڑتی تو محرم کو وہ صفر قرار دے دیتے اور صفر کو محرم قرار دے کر اشہرِ حرم کی تعداد برابر کر دیتے۔ اسے انہوں نے "نسی" کا نام دے رکھا تھا اور اس میں وہ بزعم خود مطمئن رہتے کہ ہم نے اشہرِ حرم کی حرمت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا صرف اتنا ہی کیا ہے کہ مہینہ بدل ڈالا ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

نسی کا دوسرا طریقہ ان کے ہاں یہ تھا کہ وہ قمری سال کو شمسی سال کے برابر قرار دینے کیلئے کبیسہ کے نام سے ایک مہینہ کا اضافہ کر دیتے۔ شمسی سال قمری سال سے تقریباً گیارہ (۱۱) دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کی اس کمی کو پورا کرنے کیلئے ہر آٹھ سالوں میں تین ماہ بڑھائے جاتے یا ہر دوسرے یا تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا اضافہ کیا جاتا۔ اس طرح ان کی کوشش یہ ہوتی کہ حج کے ایام ایک جیسے موسم میں آئیں تاکہ نہ حج کی ادائیگی میں تکلیف ہو اور نہ تجارتی مصروفیات میں کوئی رکاوٹ پیش آئے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حج اپنے اصلی ایام میں تینتیس (۳۳) سال کے بعد آتا۔ اس طرح سے یہ اہم ترین فریضہ اپنے ایام سے ہٹ کر اپنی فرضیت اور قدر و منزلت کھو دیتا۔ نبی کریم ﷺ نے دس ہجری میں جب حج فرمایا تو حج ہزار گردشوں کے بعد اپنے اصلی ایام تک پہنچ چکا تھا۔ اس لئے ٹھیک نو اور دس ذی الحج کو مناسکِ حج کی ادائیگی کی گئی۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق السموات والارض

زمانہ گردش کر کے اپنی اصلی ہیئت پر آگیا ہے جو ہیئت اس کی اس دن قرار پائی تھی جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا۔

Marfat.com

چنانچہ آپ نے اسی دن نسی کی رسم کے خاتمے کا اعلان فرمایا اور اس وقت سے لے کر آج تک اللہ کا شکر ہے کہ خدائی تقویم کے مطابق حج ہر سال انہی ایام میں ادا ہوتا ہے جن میں اللہ کی طرف سے فرض کیا گیا تھا۔

عربوں کے اس طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے ہر صاحب بصیرت آدمی کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ ملتِ ابراہیمی پر ایمان رکھنے والے لوگ تھے اس کے باوجود اشہرِ حرم اور اشہرِ حج میں اپنے ہوائے نفس کے مطابق تبدیلی کتنی بڑی جسارت تھی لیکن کسی قبیلے کو اس کے خلاف احتجاج کی توفیق نہیں ہوتی تھی۔ اس کا جواب دیتے ہوئے پروردگار نے فرمایا کہ جب کوئی قوم انتہائی طور پر بگڑ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے یہ سزا ملتی ہے کہ اس کے برے سے برے اعمال بھی اس کیلئے مزین کر دیئے جاتے ہیں۔ یعنی بدترین اعمال بھی اسے خوبصورت اور نہایت مفید دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ کا قانون یہی ہے اور اس نے انسانی سرشت میں اس کی عمل داری اس طرح رکھی ہے کہ ہم جابجا اس کی نمود دیکھتے ہیں کہ غلامی سیاسی ہو یا اقتصادی، تہذیبی ہو یا مذہبی، رفتہ رفتہ غلامی اپنا اثر دکھاتی ہے جس کے نتیجے میں ثواب و عقاب، صحیح اور غلط اور حسن و قبح کے معیارات بدل جاتے ہیں اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتے ہیں قوموں کے ضمیر

شراب ام الخبائث ہے۔ اس کا پینے والا جس طرح کے حالات سے دوچار ہوتا ہے اس سے نفرت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بایں ہمہ! شراب پینے والوں کو کبھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ حکمرانوں تک کی کہانیاں زبان زدِ عام ہیں کہ بڑی بڑی میٹنگز میں ان کا پیشاب خطا ہو گیا اور بہکی بہکی باتیں کرنا تو ہر مجلسِ شراب کی روایت ہے۔ لیکن شیطان ایسا پاگل بناتا ہے کہ عقل والوں کی عقل بھی کام نہیں دیتی۔ اس کا سبب تزئینِ اعمال کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو شخص بھی اس ابتلا کا شکار ہو اسے ہمیشہ اپنی حالت کا جائزہ لینا چاہئے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی اللہ کے بندے کے پاس جا کر اپنی تشخیص کرانا چاہئے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ
فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّا تَنْفِرُوْا
يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ۬ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ
شَيْـًٔا ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۹﴾ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ
اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ
اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ
سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ

Marfat.com

الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ
حَكِيْمٌ ﴿٤٠﴾ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤١﴾ لَوْ كَانَ
عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ
عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا
مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿٤٢﴾

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ نکلو اللہ کے راستے میں تو ڈھے جاتے ہو زمین کی طرف کیا تم ریجھ گئے ہو دنیا کی زندگی پر آخرت کے مقابلے میں سو نہیں ہے دنیا کی زندگی کا سروسامان آخرت کے مقابلے میں مگر قلیل۔ اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہارے علاوہ ایک دوسری قوم بدل کر لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گے اور الله ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر تم اس کی مدد نہ کرو گے (تو کچھ پرواہ نہیں) اللہ نے اس وقت اس کی مدد فرمائی جبکہ کافروں نے اس کو اس حال میں نکالا کہ وہ صرف دو کا دوسرا تھا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جبکہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ تم غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسے لشکروں کے ذریعے اس کی مدد فرمائی جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے کافروں کی بات پست کی اور اللہ ہی کا کلمہ بلند رہا اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ نکلو (جہاد کیلئے) ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر آسان تو وہ لوگ ضرور تمہارے پیچھے لگ جاتے لیکن لمبی نظر آئی ان کو مسافت اور اب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم آپ کے ساتھ ضرور نکلتے یہ خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ (۳۸ تا ۴۲) (رکوع: ۶)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ○ ﴿التوبة : ۳۸﴾

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ نکلو اللہ کے راستے میں تو ڈھے جاتے ہو زمین کی طرف کیا تم ریجھ گئے ہو دنیا کی زندگی پر آخرت کے مقابلے میں سو نہیں ہے دنیا کی زندگی کا سروسامان آخرت کے مقابلے میں مگر قلیل۔ (۳۸)

اس آیتِ کریمہ سے وہ خطبہ شروع ہو رہا ہے جو غزوۂ تبوک کی تیاری کے دنوں میں آپ پر نازل ہوا ہے۔ اس خطبے کی یہ پہلی آیت ہے اور پھر یہ مضمون مسلسل دور تک چلا گیا ہے۔ اسے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم غزوۂ تبوک کا پس منظر جاننے کی کوشش کریں۔

Marfat.com

غزوۂ تبوک کا پس منظر:

آنحضرت ﷺ یوں تو پوری دنیا کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ لیکن آپ کی براہ راست بعثت جزیرۂ عرب کے رہنے والوں کی طرف تھی کیونکہ وہ لوگ کئی رشتوں میں آپ سے منسلک تھے۔ مزید یہ کہ آپ کی اور ان کی زبان ایک تھی، رسم و رواج یکساں تھے، ماحول ایک تھا، چنانچہ آپ نے تقریباً تیرہ '۱۳' سال تک مکہ معظمہ میں دعوت و تبلیغ کا کام کیا۔ لیکن جب مکہ کی سرزمین نے آپ کو مزید برداشت کرنے سے انکار کردیا تو آپ مدینہ منورہ ہجرت کر گئے۔ وہاں چھ سال کی مسلسل محنت کے نتیجے میں ایک ایسی جماعت تیار ہوگئی جس پر اللہ کے دین کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کیلئے اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ چھ ہجری میں معاہدہ حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کو موقع ملا کہ وہ اللہ کے دین کی نشر و اشاعت اور اس کے نفوذ کیلئے دوسرے قبائل اور دوسرے علاقوں میں بھی کام کریں۔ اب تک قریش کی دشمنی نے مسلمانوں کے سامنے تمام راستے بند کر رکھے تھے۔ مدینہ کے گرد و پیش بلکہ جزیرۂ عرب میں پھیلے ہوئے قبائل کا مذہبی رشتہ تو قریش سے تھا ہی، قریش کے سیاسی اثرات بھی ان پر پوری طرح حاوی تھے۔ ان کیلئے آزادانہ مسلمانوں سے تعلق رکھنا اور مسلمانوں کا تبلیغ و دعوت کیلئے بے خطر ان کے قبائل میں جانا ممکن نہ تھا۔ معاہدہ حدیبیہ نے جب ایسی تمام پابندیوں کو ختم کردیا تو آنحضرت ﷺ نے بیرونِ عرب ریاستوں کے حکمرانوں اور سلاطینِ عالم کے نام خطوط لکھے اور بعض علاقوں میں اسلامی دعوت کیلئے اپنے وفود بھیجے۔ عرب کے شمال میں سرحدِ شام سے متصل جو قبائل آباد تھے یہ زیادہ تر عیسائی اور رومی سلطنت کے زیرِ اثر تھے۔ آنحضرت ﷺ نے انہیں اسلام کی دعوت دینے کیلئے پندرہ آدمیوں پر مشتمل ایک وفد بھیجا جن کے رئیس کعب بن عمیر غفاری ؓ تھے۔ یہ وفد "ذات اطلح" کے مقام پر پہنچا تو ان لوگوں نے انہیں قتل کردیا صرف ان کے رئیس کعب بن عمیر غفاری ؓ بچ کر واپس آئے۔ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ ان لوگوں نے خود ہی کریم ﷺ سے درخواست کی تھی کہ آپ ہمارے علاقے میں مبلغین بھیجیں۔ چنانچہ آپ نے ان کی دعوت پر پندرہ صحابہ کو بھیجا اور انہوں نے نقضِ عہد اور امان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سوائے رئیسِ وفد کے تمام وفد قتل کر ڈالا۔

انہی دنوں میں آنحضرت ﷺ نے بصرہ کے رئیس شرحبیل بن عمرو کے نام بھی دعوتِ اسلام کا پیغام بھیجا اس بدبخت نے نہ صرف کہ دعوت قبول نہ کی بلکہ آنحضرت ﷺ کے قاصد کو قتل کردیا۔ پوری دنیا میں قاصد کے قتل کو ہمیشہ اعلان جنگ کے برابر سمجھا جاتا رہا ہے۔ تاتاریوں اور خوارزم شاہ میں جنگ کا آغاز اسی لئے ہوا تھا کہ چنگیز خان کے قاصد کو قتل کردیا گیا تھا اور بھی دنیا کے بڑے بڑے معرکے اسی سبب سے ہو چکے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان شہداء کا انتقام لینے کیلئے تین ہزار کی جمعیت حضرت زید بن حارثہ ؓ کی قیادت میں روانہ فرمائی۔ مقصود یہ تھا یہ علاقہ مسلمانوں کی تبلیغ و دعوت کیلئے محفوظ ہوجائے اور مبلغین آزادانہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرسکیں اور اس علاقے کے لوگ اور حکمران مسلمانوں کو لاوارث سمجھ کر حملے کرنے کی جرأت نہ کرسکیں۔ لیکن مسلمانوں کا یہ لشکر جب معان کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ شرحبیل ایک لاکھ فوج لے کر مقابلہ کیلئے آرہا ہے اور چونکہ یہ رئیس عیسائی تھا اور براہِ راست قیصرِ روم کے احکام کے تابع تھا اس لئے قیصر نے اس کی مدد کیلئے اپنے بھائی تھیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی مزید فوج روانہ کی اور خود حمص کے مقام پر موجود رہ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمان کوئی بڑی فوج لے کر اس علاقے کو تاراج کرنے کیلئے آئے ہوں گے۔ لیکن جب اسے مسلمانوں کی تعداد کا علم ہوا تو وہ حمص میں رک کر نتائج کا انتظار کرنے لگا۔ اس کیلئے یہ بات عجیب تھی کہ تین ہزار کی تعداد میں مٹھی بھر لوگ ایک ایسی سلطنت سے حالات بگاڑ رہے ہیں۔ جس کی فوجوں کی تعداد اور وسائلِ جنگ کی کوئی انتہا نہیں۔ ادھر مسلمانوں کو جب صحیح حالات کا علم ہوا تو اپنی تعداد کی انتہائی کمی کی وجہ سے انہیں آگے بڑھنے میں تأمل ہوا۔ ذمہ دار لوگ سر جوڑ کر بیٹھے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ بعض اصحاب الرائے نے کہا کہ آنحضرت ﷺ کو اطلاع دی جائے اور آپ سے کمک بھیجنے کی درخواست کی جائے لیکن حضرت عبداللہ ابنِ رواحہ نے کھڑے ہو کر ایک مؤثر تقریر کی۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

مسلمانو! ہم اللہ کے راستے میں نکلے ہیں کوئی کشور کشائی مقصود نہیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف ایک مقصد ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو یا اس راستے میں ہمارے کندھوں سے سروں کا بوجھ اتر جائے اور یہ شہادت ہی وہ آرزو ہے جسے ہم برسوں سے دلوں میں لئے پھرتے ہیں۔ آج جبکہ اس کا موقع سامنے ہے تو پھر پس و پیش کرنے کا کیا معنی ہے؟ آگے بڑھیں اور کچھ نہیں تو شہادت حاصل کرنے سے تو ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔

Marfat.com

چنانچہ یہ فیصلہ ہوجانے کے بعد مسلمان دررانہ وار آگے بڑھتے چلے گئے اور موتہ کے مقام پر پہنچ کر شرحبیل کی ایک لاکھ فوج سے جاٹکرائے۔ اس غیر معمولی اقدام کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مجاہدین بالکل پس جاتے اور موتہ کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہوتی اور ان کی ہڈیاں اس زمین کا رزق بن جاتیں۔ لیکن اللہ کی شان دیکھئے کہ پورا عرب اور تمام مشرق وسطیٰ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کافر تینتیس گنا ہونے کے باوجود مسلمانوں پر غالب نہ آسکے۔ دوروز کی مسلسل جنگ کے بعد شرحبیل کے لشکر نے پسپائی ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور مسلمان بھی جو اس جنگ میں حضرت زید بن حارثہؓ حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ جیسے عظیم جرنیلوں کی شہادت کا نذرانہ پیش کر چکے تھے اور اب حضرت خالد بن ولیدؓ مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے، نے یہی بہتر سمجھا کہ اگر شامی پیچھے ہٹ رہے ہیں تو ہمیں اسے غنیمت سمجھ کر اپنی فوج کو خیریت سے نکال لینا چاہئے۔ بظاہر تو یہ ایک ایسا برابر کا مقابلہ تھا جس میں کوئی فوج دوسرے پر غالب نہ آسکی۔ لیکن فوجوں کا تناسب دیکھتے ہوئے ہر شخص حیران و ششدر تھا کہ آخر تین ہزار کے لشکر نے ایک لاکھ فوج کو آگے بڑھنے سے کس طرح روک دیا۔ ان علاقوں کے رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ ہم یہ سمجھتے رہے ہیں کہ شامی اور رومی دنیا کی سب سے بڑی قوت ہیں اور قیصر کے مقابلے میں دنیا میں کسی دوسری قوت کو آنے کی جرأت نہیں ہوسکتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اصل قوت وہ ہے جو مسلمانوں کی صورت میں سر اٹھا رہی ہے، اگر ان کے تین ہزار ایک لاکھ کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس فوج کا ایک ایک سپاہی اپنے اندر کیسے کیسے طوفان سنبھالے ہوئے ہے۔ اگر اس فوج کی کسی بڑی تعداد نے کسی وقت ادھر کا رخ کرلیا تو اس طوفان کا روکنا ناممکن ہوگا۔ چنانچہ اسی احساس نے نیم آزاد عربی قبائل اور عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی جو کسریٰ کے زیر اثر تھے اسلام کی طرف متوجہ کردیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہوگئے۔

استقامت کا ایک نمونہ:

انہی دنوں ایک اور واقعہ پیش آیا کہ ہرقل کی عرب فوج کا ایک اعلیٰ افسر فروہ بن عمرو جذامی مشرف بہ اسلام ہوگیا۔ ہرقل نے اسے اپنے دربار میں طلب کیا اور اسے کہا کہ یا تو اس نئے دین سے تائب ہوکر اپنا سابقہ مذہب عیسائیت اختیار کرلو ورنہ تمہارا سر قلم کردیا جائے گا۔ اس نے نہایت استقامت کا ثبوت دیتے ہوئے دوبارہ عیسائی ہونے سے انکار کردیا۔ ہرقل نے برہم ہوکر اس کے قتل کا حکم دیا لیکن اس نے ایمان سے دستکش ہونا گوارا نہ کیا اور نہایت خوشی سے اسلام پر جان دے دی۔ حیرانی کی بات ہے کہ جس آدمی نے نبی کریم ﷺ کی زیارت تک نہ کی کسی صحابی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور ایک مختصر عرصہ کسی کی صحبت میں رہ کر دین سیکھا نمازیں پڑھیں لیکن اللہ نے ایسا جذبۂ اخلاص عطا فرمایا کہ وہ اسلام پر ہر چیز کو قربان کرگیا۔ ہرقل نے جب یہ صورتحال دیکھی کہ میری فوجوں کا ایک کمانڈر اس دین کو چھوڑ کر جس میں اس کی ساری عمر گزری ایک نیا دین ایک مختصر عرصہ پہلے قبول کرتا ہے اور اس کی محبت اس کے دل میں اس طرح جاگزیں ہوجاتی ہے اور وہ دین اس کے اندر ایک ایسی بے پناہ قوت پیدا کردیتا ہے کہ موت کا خوف بھی اسے لرزہ براندام نہیں کرسکتا۔ تین ہزار کا لشکر ایک لاکھ کی منظم اور مسلح فوج کو دیکھ کر بجائے سراسیمہ ہونے کے درانہ وار آگے بڑھتا ہے اور فوج سے ٹکراجاتا ہے اور ایک لاکھ فوج اپنی ساری کوششوں کے باوجود اسے شکست نہیں دے سکتی۔ حیرانی کی بات ہے کہ یہ لوگ کیسے ہیں ان کا ایک ایک فرد موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ ان کے نفع و نقصان کے پیمانے بالکل جدا ہیں۔ وہ زندگی زندہ رہنے کو نہیں سمجھتے بلکہ مقصد پر قربان ہوجانے کو سمجھتے ہیں ان کے لئے سب سے بڑا اعزاز شہادت ہے۔ اس لئے وہ خوف اور ڈر سے بالکل آگاہ نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خوف ان کی چمڑی میں نہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں قربان ہونے کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے دنیا کی کوئی طاقت عہدہ برآ نہیں ہوسکتی۔ یہ تو جدھر نکلیں گے مزاحمت کی ہر دیوار کو گرادیں گے اور کوئی قوت ان کا سامنا نہیں کرسکے گی۔ آج یہ محدود تعداد میں ہیں لیکن ان کی تبلیغ و دعوت میں جو تاثیر ہے اور ان کے افراد میں جو کردار کی پختگی ہے اگر اسے آگے بڑھنے کا موقع مل گیا تو ہماری مملکتیں باقی نہیں رہیں گی۔ اس لئے ہمیں آج ہی فیصلہ کرنا ہے کہ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو پھر ہمیں آگے بڑھ کر اس دین اور دین والوں کا قلع قمع کرنا ہوگا۔ چنانچہ انہی احساسات نے دوسرے ہی سال قیصر کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا کہ اسلامی حکومت پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے سرحد شام پر فوجی تیاریاں شروع کردیں اور اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ نبی کریم ﷺ کی خداداد

Marfat.com

بصیرت نے ان خطرات کا اندازہ کرلیا آپ نے ہر چھوٹی سے چھوٹی بات پر نگاہ رکھی تا کہ حالات بے قابو نہ ہونے پائیں۔ چنانچہ جیسے ہی آپ کو اطلاع ملی کہ قیصر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے تو آپ نے فیصلہ کرلیا کہ اس سے پہلے کہ قیصر کی تیاریاں مکمل ہوں اور وہ ایک بڑی فوج لے کر ہم پر حملہ آور ہو ہمیں آگے بڑھ کر اس عظیم طاقت سے ٹکرا جانا چاہئے کیونکہ اگر اس موقع پر ذرا بھی کمزوری دکھائی گئی تو نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ عرب کی دم توڑتی ہوئی جاہلیت جس پر حنین میں آخری ضرب لگائی جا چکی ہے پھر جی اٹھے گی۔ مدینہ کے منافقین جن کے روابط ابو عامر کے واسطے سے غسانی بادشاہ سے بھی تھے اور خود قیصر سے بھی۔ انہیں ملک کے اندر ریشہ دوانیوں کو منظم کرنے کا موقع مل جائے گا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ ملک کے اندر ایسے حالات پیدا ہوں جس سے قیصر فائدہ اٹھائے آنحضرت ﷺ نے قیصر کی طاقت کو روکنے کا فیصلہ کرلیا اور اعلان فرمادیا کہ ہمیں قیصر کا خطرہ درپیش ہے وہ اسلام اور مسلمانوں پر ایک کاری ضرب لگانا چاہتا ہے۔ ہم اسے کوئی موقع دیئے بغیر خود شام پر چڑھائی کریں گے چنانچہ مسلمانوں کو اس کی تیاری کا آغاز کر دینا چاہئے۔

آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ جب کسی جگہ حملہ کرنے کا ارادہ فرماتے تھے تو کبھی اس کا نام نہیں لیتے تھے بلکہ بعض دفعہ اسے اخفا میں رکھنے کیلئے دوسری طرف نکلنے والے راستوں کے بارے میں استفسار فرماتے تھے اور جب مدینہ سے لشکر کشی کے ارادے سے نکلتے تو بجائے منزل مقصود کی طرف سیدھا راستہ اختیار کرنے کے پھیر کی راہ سے تشریف لے جاتے تھے تا کہ یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ ہماری منزل کیا ہے۔ اس طرح سے آپ زیادہ سے زیادہ اپنے ارادوں کو مخفی رکھنے میں کامیاب رہتے تھے۔ لیکن اس موقع پر آپ نے کسی طرح کا اخفا نہیں رکھا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ روم سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے۔

قافلہ اسلام کی ترقی اور مسلمانوں کی بقا کیلئے تو اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ رومیوں سے پنجہ آزمائی کا فیصلہ کیا جاتا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ملک میں قحط سالی تھی۔ گرمی کا موسم تھا، چلچلاتی دھوپ اور جھلس دینے والی لو غضب ڈھا رہی تھی۔ ریتلی زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ قحط سالی سے نکلنے کیلئے نئی فصل پر نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ امید کے بار آور ہونے کا وقت آ پہنچا تھا فاقہ زدہ جسم اور بھنچے ہوئے پیٹ انگوروں کے لٹکتے ہوئے خوشوں میں زندگی کی نمود دیکھ رہے تھے۔ ٹھنڈا پانی گھنا سایہ اس بلا کی گرمی میں نکلنے کیلئے سب سے بڑی رکاوٹ ہو رہا تھا۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کا جنگ کیلئے نکلنا وسائل جنگ کی فراہمی اور رسد و کمک کا انتظام بجائے خود بہت بڑا امتحان تھا۔ منافقین حالات کی نامساعدت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس مہم کو ناکام کرنے کیلئے ہر ممکن تدبیر عمل میں لا رہے تھے۔ عام بے دلی پیدا کی جارہی تھی۔ رومی بادشاہت کی ہیبت اور دبدبے کے قصے سنائے جا رہے تھے، ان کی بے پناہ فوجی قوتوں کے تذکرے ہو رہے تھے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود مومنین صادقین کو بھی پورا احساس تھا کہ اللہ کے جس دین کیلئے بائیس سال سے وہ سربکف ہیں آج اس کی قسمت ترازو میں ہے۔ آج کی ذرا سی کمزوری صدیوں کی بدنصیبی بن سکتی ہے اور انسانیت کے بدلتے ہوئے نصیب پھر تاریکی میں ڈوب سکتے ہیں۔ چنانچہ اسی احساس کے ساتھ اللہ کے ان عظیم بندوں نے وفاشعاری اور فداکاری کا حق ادا کر دیا۔ سروسامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمان ؓ اور حضرت عبدالرحمن ابن عوف ؓ جیسے لوگوں نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت عمر ؓ نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا آدھا حصہ لا کر رکھ دیا۔ حضرت ابوبکر ؓ نے اپنی ساری پونجی نذر کر دی اور ثابت کر دیا:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کیلئے ہے خدا کا رسول بس

غریب صحابہ نے محنت مزدوری کر کے جو کچھ کمایا لا کر حضور کے قدموں میں ڈھیر کر دیا عورتوں نے اپنے زیور اتار اتار کر راہ خدا میں پیش کر دیئے۔ سرفروش مجاہدین کے لشکر کے لشکر ہر طرف سے امڈ امڈ کر آئے۔ وہ بار بار عرض کرتے کہ اسلحہ اور سواریوں کا انتظام ہو تو ہماری جانیں قربان ہونے کو حاضر ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو جہاد کیلئے نکلنے میں تامل کر رہے تھے۔

صحابہ کرامؓ کا ایک تعارف:

اسی تامل کی وجہ سے پیش نظر آیات کریمہ میں سرزنش فرمائی گئی ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم ان لوگوں کا تعین کریں مناسب ہوگا اگر اس وقت کے مسلمانوں کا ایک ہلکا سا تجزیہ کر لیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام کسی تعلیمی ادارے کے طالب علم نہیں تھے کہ جنہوں نے ایک ہی وقت میں داخلہ لیا ہو اور

Marfat.com

پھر ایک متعین مدت تک تعلیم و تربیت حاصل کی ہو اور پھر ڈگریاں مل گئی ہوں بلکہ صحابہ کی جماعت تو آنحضرت ﷺ کی دعوت کے نتیجے میں آہستہ آہستہ وجود میں آئی۔ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو السابقون الاولون کہلاتے ہیں یعنی جو ابتدائی دور میں ایمان لانے والے ہیں۔پھر ان میں وہ بھی ہیں جو رفتہ رفتہ مختلف وقتوں میں ایمان لائے ،مختلف ملکوں کی طرف ہجرت کی ،پھر تیرہ سال کے بعد آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے ساتھ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کا سفر کیا۔یہ وہ لوگ ہیں جنہیں مہاجرین کہا جاتا ہے پھر مدینہ طیبہ میں رہنے والے اوس وخزرج کے لوگ ہیں جن میں سے کچھ لوگوں نے ہجرت سے پہلے ایمان قبول کر لیا تھا اور کچھ نے بعد میں کیا اور یہ سب لوگ انصار کہلائے کیونکہ انہوں نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی نصرت کی بلکہ تمام آنے والے مہاجرین کو بھی سنبھالا اور ہر طرح سے ان کی مدد کی۔پھر انہی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو انصار اور مہاجرین دونوں میں سے جنگِ بدر اور جنگِ احد میں شریک ہوئے اور حدیبیہ کے معاہدے سے پہلے مختلف جنگوں میں انہوں نے اپنے ایمان کا ثبوت دیا۔ چھ ہجری میں حدیبیہ کے معاہدہ سے پہلے حدیبیہ ہی کے مقام پر ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر آنحضرت ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا انتقام لینے کیلئے مسلمانوں سے بیعتِ قصاص لی۔قرآنِ کریم میں ان تمام بیعت کرنے والوں کو اصحاب الشجرہ قرار دیا اور ان کی بخشش کا اعلان فرمایا۔پھر حدیبیہ کے معاہدے کے بعد تیزی سے قبائل میں اسلام پھیلا اور فتح مکہ تک مسلمانوں کی تعداد پہلے سے کئی گنا ہو گئی۔لیکن ان سب نے جب بھی کوئی نازک وقت آیا اپنے اخلاص کا ثبوت دیا اور مختلف اجر و ثواب اور درجات کے حصول میں کامیاب ٹھہرے۔فتح مکہ کے بعد مکہ کے جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے انہیں طلقاء کہا گیا۔یہ وہ لوگ ہیں جو فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں کے ہمسر نہیں ہو سکتے۔اس کے بعد پورے جزیرۂ عرب میں اسلام پھیل گیا اور فوج در فوج لوگ مسلمان ہوئے۔لیکن ان میں بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہوں نے آنحضرت ﷺ کی زیارت بھی نہیں کی اور نہ انہیں اسلام کی تعلیم و تربیت کے حصول کا موقع ملا۔

اس پوری تفصیل کو سامنے رکھیں تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ جنگِ تبوک کے موقع پر قرآنِ کریم جن لوگوں سے مخاطب ہے وہ سارے ایک سطح کے لوگ نہیں ہیں۔کہنے کو تو ان سب کو صحابہ کہا جاتا ہے لیکن ان سب نے یکساں آنحضرت ﷺ کی صحبت میں رہ کر تربیت حاصل نہیں کی۔لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے جن لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی صحبت میسر آگئی اور آپ کے شرف دیدار سے مشرف ہوئے یا آپ کے ساتھ کسی غزوہ میں نکلنے کی سعادت حاصل ہو گئی تو یہ ایک ایسی سعادت ہے کہ بعد والے جس کے حصول کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اپنے تمام تر شرف اور عظمت کے باوجود تمام صحابہ سرفروشی اور جاں سپاری اور اخلاص و فدائیت میں یکساں نہیں ہو سکتے۔چنانچہ جیسے ہی انہیں جنگِ تبوک کیلئے نکلنے کا حکم دیا گیا تو ان میں وہ صحابہ جنہوں نے ایک طویل عرصہ آنحضرت ﷺ کی صحبت میں گزارا تھا اور انہی کی اکثریت بھی تھی انہوں نے ایک لمحے کیلئے آمادۂ سفر ہونے میں توقف نہیں کیا۔لیکن مخلص صحابہ میں دوسری قسم کے وہ لوگ تھے جو سفر کی صعوبت اور موسم کی شدت کو دیکھتے ہوئے کچھ تردد کا شکار ہوئے لیکن جلد ہی سنبھل گئے اور اپنی طبعی کمزوری پر قابو پا لیا۔اسی سورۃ میں آگے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

تیسری قسم ان لوگوں کی تھی جو اس لئے جہاد پر نہ جا سکے کہ واقعی انہیں صحیح عذر لاحق تھا اور وہ اپنی معذوری کے باعث سفر نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اسی سورۃ میں ان کے عذر قبول کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی جن کے پاس جہاد پر نہ جانے کا کوئی عذر نہیں تھا لیکن محض کاہلی کے سبب جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔ارادے باندھتے رہے اور توڑتے رہے۔ان آیات میں سے پہلی آیت میں ایسے ہی لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے اور ان میں جو لوگ تنبیہ کے بعد بھی نہ جا سکے لیکن انہوں نے اللہ سے معافی چاہی اور آنحضرت ﷺ کے سامنے صاف صاف اپنے جرم کا اقرار کیا آگے چل کر اسی سورۃ میں ان کی قبولیتِ توبہ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

پانچواں طبقہ منافقین پر مشتمل تھا۔جو اپنے نفاق کی وجہ سے جہاد میں نکلنا نہیں چاہتا تھا اور اس کیلئے عجیب وغریب عذر پیش کرتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے عذر قبول فرماتے ہوئے ان کو نہ جانے کی اجازت دے دی۔اس طبقے کا ذکر بھی بہت ساری آیات میں ہوا ہے۔

چھٹا طبقہ ان منافقوں پر مشتمل تھا جو جاسوسی اور شرارت کیلئے مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے اور دورانِ سفر مسلمانوں کیلئے مسائل پیدا کرتے رہے۔قرآن کریم نے ان کو بھی ذکر فرمایا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تنبیہ کا انداز ہلکا ہے اور انداز اصلاحی ہے اور نشاندہی اس جرم کی کی جا رہی ہے جو بعض دفعہ مخلص لوگوں میں بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مخاطب وہ مسلمان ہیں جنہیں جانے سے انکار نہیں تھا لیکن وہ کاہلی کا

Marfat.com

شکار ہو گئے یا دنیا کی محبت ان پر غالب آ گئی۔ لیکن جہاں تنبیہ کا لہجہ تیز ہو گیا ہے اور بات عذاب تک پہنچ گئی ہے ایسا لگتا ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ اسلام میں اس رویے کی کوئی گنجائش نہیں تم اگر اپنی حالت بدلنے کی کوشش نہیں کرو گے تو مسلمانوں میں شمولیت تمہارے کسی کام نہیں آئے گی تمہیں بدترین عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

پہلی آیتِ کریمہ میں ان لوگوں سے خطاب کیا جا رہا ہے جنہوں نے سفرِ جہاد میں نکلنے میں تساہل سے کام لیا۔ ان کی نظر کھجوروں کے لٹکتے ہوئے گچھوں پر رہی۔ لہلہاتی فصل ان کی کمزوری بن گئی، کھجوروں کا گھنا سایہ ان کے پاؤں کی زنجیر بن گیا، وہ مخلص مسلمان ہوتے ہوئے بھی اخلاص پر عمل نہ کر سکے۔ پھر ان کے اصل مرض کی نشاندہی کی گئی ہے کہ تم میں یہ جو کمزوری پیدا ہوئی ہے کہ جب تمہیں اللہ کے راستے میں نکلنے کیلئے کہا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ پوری آمادگی اور نشاط کے ساتھ اٹھو اور عزم بالجزم کی تصویر بن جاؤ تم بوجھل ہو کر زمین پر ڈھے جاتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی پر ریجھ گئے ہو جبکہ ایک مومن کا حقیقی مطلوب اور اس کی اصل منزل آخرت ہے دنیا نہیں۔ دنیا اس کیلئے دار العمل اور مہلتِ عمل ہے مطلوب و مقصود نہیں۔ وہ دنیا میں رہتا ضرور ہے مگر دل نہیں لگاتا۔ دل اس کا آخرت میں اٹکا ہوا ہے۔ وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی نعمتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہاں کی ہر چیز ابدی اور لافانی ہے اور یہاں کی ہر چیز عارضی اور فانی ہے۔ دنیا چند سالہ قیام ہے جو ایک دن ختم ہو جائے گا۔ جس زندگی کی مدت ساٹھ ستر سال ہے اس کیلئے تو یہ بیتابیاں ہوں اور جو زندگی لا انتہا ہے اس کیلئے نہ کوئی تڑپ ہو نہ فکر نہ تیاری یہ ایک ایسا حادثہ ہے جس کے نتیجے میں انسان کے اندر کی دنیا تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ مقصد کے شعور سے تہی دامن ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی امنگ باقی نہیں رہتی۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ مادی دنیا کی محبت اور فانی زندگی سے عشق اور دنیا اور دولتِ دنیا کی آخرت پر ترجیح، یہ وہ بیماری ہے جس نے تمہیں راہِ جہاد میں نکلنے سے معذور کر دیا ہے۔ تمہارے اندر سرفروشی اور جاں نثاری کی قوت باقی نہیں رہی۔ اپنی اس بیماری پر قابو پاؤ یہ بیماری جب بڑھ جاتی ہے تو اسی سے نفاق کا مرض جنم لیتا ہے جو آہستہ آہستہ کفر تک پہنچا دیتا ہے اور اگر خدانخواستہ تم نے اس مرض پر قابو نہ پایا تو پھر اس کا نتیجہ وہ ہو گا جو اگلی آیتِ کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

اگر تم نہیں نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہارے علاوہ ایک دوسری قوم بدل کر لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (۳۹) ﴿التوبة : ۳۹﴾

حق و باطل کی آویزش میں حق کا ساتھ ایمان کی دلیل ہے:

اللہ کے جس قانون کے تحت قوموں کا نظام چل رہا ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے ہوتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ حق و باطل کے معرکے میں کون اپنا فرض ادا کرتا ہے اور کون نہیں۔ جب امتِ مسلمہ کہلانے والی امت اللہ کے دین کی سربلندی اور ملک و ملت کی بقا کیلئے میدانِ جہاد میں شرکت سے پہلوتہی کرتی ہے تو یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس امت کا اللہ کے دین سے اگر کوئی رشتہ ہے تو وہ صرف واجبی ہے۔ وہ دین کیلئے کوئی تکلیف اٹھانے کیلئے تیار نہیں۔ وہ اس وقت تک اللہ کے دین کے ساتھ مخلص ہے جب تک اسے کسی آزمائش سے گزرنا نہیں پڑتا۔ اور اگر کوئی آزمائش سامنے آتی ہے یا کوئی معرکۂ کارزار دعوت دیتا ہے تو وہ لوگ اپنی دنیا بچانے کیلئے دین کی اس دعوت کو مسترد کر دیتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ اللہ کے یہاں ایسے لوگوں کی کوئی قدر و منزلت نہیں ہوتی اس کے یہاں تو بندگی کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ دین کے ہر تقاضے اور بلاوے پر لبیک کہا جائے اور اگر اس کیلئے میدانِ کارزار میں کودنا پڑے یا جان و تن کے معاملے سے گزرنا پڑے۔ تو وہ اس سے کبھی پہلوتہی نہ کرے کیونکہ

ہر کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

Marfat.com

حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم پسینہ بہا کر اور خون دے کر اللہ سے اپنی وفاداری کو ثابت کرتی رہتی ہے تو اللہ کی تائید و نصرت اس کے ساتھ رہتی ہے اور جب اس قوم کو اپنے مفادات اور اپنی زندگیاں اللہ کے دین سے زیادہ عزیز ہو جاتی ہیں تو پھر اللہ ایسی قوم کو مٹا دیتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو اس خدمت کیلئے چن لیتا ہے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے، جب تک عربوں نے اسلام کی علمبرداری کا فریضہ انجام دیا اور انہوں نے کسی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس طرح مدد فرمائی کہ انہوں نے جس طرف کا رخ کیا زمین ان کیلئے لپیٹ دی گئی۔ وہ چند ہزار بھی ہوئے تو لاکھوں پر غالب آگئے۔ لیکن جب انہوں نے اللہ کے دین سے غداری کی دین کی بجائے دنیا کو اپنا مقصود بنا لیا دشمنانِ دین سے تعلقات پیدا کیے اور دین کے مخلصوں کو تختۂ دار پر لٹکایا اور جس نے بھی جہاد کا نام لیا اسے اپنا اور وطن کا دشمن گردانا تو اللہ کا قانون حرکت میں آیا تو اس نے عربوں کو مسلمانوں کی سیادت سے محروم کر دیا اور ان کی جگہ اس قوم کو اسلام کی علمبرداری کا شرف بخشا جن کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ بھی کبھی اسلام کی آغوش میں آسکتے ہیں۔ سقوطِ بغداد کے بعد ہلاکو خان کے پوتے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام قبول کرنے کی توفیق بخشی۔ پھر ایک نئی خلافت وجود میں آئی جس نے صدیوں تک اسلام کی علمبرداری کا بوجھ اٹھایا۔ اسی کی طرف اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

بعض روایات میں آتا ہے کہ اس آیت کے اترنے کے بعد صحابہ بہت پریشان ہوئے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ حضور اگر ہماری اولاد نے واقعی کمزوری دکھائی تو ان کی جگہ لینے والا کون ہوگا؟ تو آپ نے سلمان فارسی ؓ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر عرب ہمت ہار دیں گے تو اللہ تعالیٰ اہلِ عجم کو توفیق دے دے گا۔ چنانچہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم بار بار اس صداقت کے اظہار کو دیکھتے ہیں۔ اندلس میں بنی امیہ نے حکومت قائم کی جب ان کی اولاد نا اہل نکلی تو اللہ تعالیٰ نے موحدین کو یہ خدمت سپرد کر دی۔ مصر میں آزاد لوگوں نے بزدلی اور کمزوری کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بیبرس نام کے ایک غلام کو مصر میں حکومت قائم کرنے کی توفیق بخشی اور اس نے تاتاریوں کو پہلی شکست دی۔ ہندوستان میں بڑے بڑے خاندان جب ناکام ثابت ہوئے تو اللہ نے ناصر الدین محمود اور شمس الدین التمش جیسے غلاموں سے وہ کام لیا جو آزاد نہ کر سکے۔ ان مثالوں سے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ اللہ اپنے دین کی سربلندی کیلئے کسی کا محتاج نہیں وہ اپنے دین کی علمبرداری کا کام جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ جو قومیں دین کی علمبرداری سے پہلو تہی کرتی ہیں وہ مٹا دی جاتی ہیں، دین باقی رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنی بقا کیلئے دین کے محتاج ہیں۔ دین اپنی بقا کیلئے مسلمانوں کا محتاج نہیں۔ مسلمان نا اہلی دکھائیں گے تو وہ کافروں کو اسلام قبول کرنے کی توفیق دے دے گا۔ آج ہم جس صورتحال سے دوچار ہیں اس میں بظاہر اسلام کا مستقبل خطرے میں ہے۔ لیکن حقیقت میں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں مسلمان خطرے میں ہیں۔ انہیں اگر اپنی زندگی عزیز ہے تو انہیں آگے بڑھ کر اپنی قسمت اسلام کے سپرد کر دینی چاہئے۔ اللہ کی قدرت بے پناہ ہے آج کے مسلمان اگر بدل جائیں تو وہ ان کی حالت بدلنے اور انہیں عزت دینے پر قادر ہے اور اگر وہ اسی ڈگر پر چلتے رہے بالائی طبقے نے اپنا رویہ نہ بدلا اور عوام نے بے حسی نہ چھوڑی تو پھر وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں مٹا دے اور کسی دوسری قوم کو ان کی جگہ دے دے۔ اس کی قدرت کے سامنے ان میں سے کوئی چیز بھی بعید نہیں۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۭ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ ﴿التوبة : ۴۰﴾

Marfat.com

اگرتم اس کی مدد نہ کروگے (تو کچھ پرواہ نہیں) اللہ نے اس وقت اس کی مدد فرمائی جبکہ کافروں نے اس کو اس حال میں نکالا کہ وہ صرف دو کا دوسرا تھا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے جبکہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ تم غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور ایسے لشکروں کے ذریعے اس کی مدد فرمائی جنہیں تم نے نہیں دیکھا اور اس نے کافروں کی بات پست کی اور اللہ ہی کا کلمہ بلند رہا اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔(۴۰)

اللہ کا دین کسی کا محتاج نہیں:

معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں خطاب منافقین سے ہے پہلی دونوں آیتوں میں تمام اہل مسلمانوں اور منافقین کو تنبیہ فرمائی گئی اور جہاد پر نہ نکلنے کے نتیجے میں جو کچھ ہوسکتا ہے اسے واضح فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ اللہ کے رسول اور اللہ کا دین تمہاری مدد کے محتاج ہیں کیونکہ اللہ کے رسول کے پیچھے اللہ کی تائید ونصرت ہے اور اللہ تو اپنی تائید ونصرت میں کسی کا محتاج نہیں۔ آج تو مخلص مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے لیکن جب یہ بھی موجود نہیں تھے۔ تو اللہ کے رسول تو اپنا کام اس وقت بھی کرتے رہے اور جب اہلِ مکہ نے دعوتِ اسلامی کے سامنے اپنے دل بند کرلیئے اور آنحضرت ﷺ کے قتل کا منصوبہ مکمل ہوگیا اور ان کے بھپرے ہوئے نوجوانوں نے آپ کے گھر کے محاصرہ کرلیا اور وہ اس طرح موت کے نمائندہ بن کرآنحضرت کو گھیرے ہوئے تھے معلوم ہوتا تھا کہ اب موت آپ سے دور نہیں۔ لیکن اس حال میں بھی اللہ نے آپ کی مدد فرمائی۔ مکہ جو آپ کی دشمنی سے ابل رہا تھا اور جس کا ایک ایک فرد آپ کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ آپ رات کی تاریکی میں اس طرح وہاں سے نکلے کہ سورۃ یٰسین پڑھتے ہوئے محاصرہ کرنے والوں کی طرف آپ نے مٹھی بھر ریت پھینکی تو سب کی آنکھیں اندھی ہوگئیں کوئی آپ کو نہ دیکھ سکا۔ پھر آپ نے اس گھر کی طرف رخ کیا کہ دشمنوں کی اس بستی میں جس کے ایک ایک فرد پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ نفرتوں کے اس جہنم میں یہ جنت کا ایک باغیچہ تھا وہاں سے حضرت ابوبکر صدیق ؓ کو ساتھ لیا اور مدینہ کے الٹے رخ پر واقع غارِ ثور میں جاکر پناہ لی۔ غارِ ثور پہاڑ کی بلندی پر ایک مجوف غار ہے جس میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔ آدمی صرف لیٹ کر اس میں داخل ہوسکتا ہے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے حضور سے درخواست کی کہ آپ باہر تشریف رکھئے میں اندر جاتا ہوں مبادا کوئی درندہ اندر چھپا بیٹھا ہو۔ اندر جاکر غار صاف کیا اپنی دستار کی دھجیوں سے غار کا ایک ایک سوراخ بند کیا ایک سوراخ باقی رہ گیا اس کے سامنے اپنی ایڑی رکھ دی اور آنحضرت کو اندر آنے کی دعوت دی۔ آپ اندر تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکر ؓ کے زانو پر سر رکھ کر بے فکر ہوکر سو گئے۔ آپ جانتے تھے کہ یہ وہ آغوش ہے جس سے زیادہ انسانوں کی دنیا میں میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں۔ ادھر ایک سانپ آیا اس نے آپ کے پاؤں کی ایڑی پر کاٹ لیا۔ آپ درد کی شدت سے بے چین ہوئے لیکن آپ نے ہلنا گوارا نہ کیا تاکہ حضور کی آنکھ نہ کھل جائے۔ لیکن آنکھ سے بے ساختہ ایک آنسو ٹپکا جو آپ کے رخسار مبارک پر گرا۔ آپ نے آنکھیں کھولیں پوچھا ابوبکر تجھے کس نے رلایا ہے؟ عرض کیا حضور میرے پاؤں میں کسی موذی جانور نے ڈس لیا ہے۔ آپ نے اپنا لعابِ دہن ایڑی پر لگادیا جس سے آپ کو شفا ہوگئی۔ آپ تین دن شب و روز اس غار میں قیام پذیر رہے مقصد یہ تھا کہ اہلِ مکہ تلاش کرتے کرتے جب تھک جائیں تو تب ہمیں یہاں سے نکلنا چاہئے لیکن تیسرے دن قریش کے چند افراد کھوجی کی مدد سے غارِ ثور کے دھانے پر پہنچ گئے۔ کھوجی نے کہا کہ یہاں تک محمد (ﷺ) اور ابوبکر (ؓ) کے پاؤں کے نشانات آتے ہیں لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے جب وہ کسی کو بچانے پر آتا ہے تو کس طرح بچاتا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ غار کے دھانے پر ایک مکڑی نے جالا تن رکھا ہے اور جنگلی کبوتر نے انڈے دے رکھے ہیں۔ قریش کے لوگ چونکہ ذہین تھے انہوں نے کھوجی سے کہا کہ تمہارا خیال ہے کہ وہ دونوں اس غار میں ہوں گے اگر تمہارا خیال صحیح سمجھ لیا جائے تو تم بتاؤ کہ غار کے منہ پر یہ دونوں چیزیں کیسے موجود ہیں؟ اور یہ جالا تو اتنا پرانا معلوم ہوتا ہے کہ شاید محمد (ﷺ) کی پیدائش سے بھی پہلے کا ہے۔ اگر وہ اس غار کے اندر گئے ہوتے تو یقیناً جالا ٹوٹتا اور کبوتر کا گھونسلہ گر جاتا اور انڈے ٹوٹ جاتے لیکن وہ دونوں اپنی جگہ سلامت ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے کوئی نہیں گزرا۔

اندازہ فرمایئے! جب اللہ تعالیٰ حفاظت کا ہاتھ کھینچ لیتا ہے تو قرطبہ اور غرناطہ کے قلعے بھی کام نہیں آتے اور جب مدد فرمانے پر آتا ہے تو مکڑی کا جالا سب سے مضبوط قلعہ ثابت ہوتا ہے۔

Marfat.com

جب قریش کے لوگ غار کے دھانے پر کھڑے تھے اور اندر سے ان کے پاؤں نظر آرہے تھے تو حضرت ابوبکرؓ نے گھبرا کر کہا کہ حضور! تلاش کرنے والے تو ہمارے سر پر پہنچ گئے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا ابوبکرؓ مت گھبرا اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ یعنی تمہیں میری فکر ہے اور مجھے تمہاری فکر ہے اور اللہ کو ہم دونوں کی فکر ہے اور جن دو کے ساتھ تیسرا اللہ ہو ان کا دنیا میں کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کے رسول اعتماد علی اللہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے حالات کیسے بھی ہوں گھبراہٹ ان کے قریب نہیں پھٹکتی لیکن انسان ہونے کی وجہ سے اپنے اندر وہ تمام احساسات رکھتے ہیں جو باقی انسان رکھتے ہیں۔ ان کا یہ دیکھ کر بھی کہ دشمن غار کے دھانے پر پہنچ گیا ہے پریشان نہ ہونا بظاہر انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ یہاں اس کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ کے رسول کا ایک طرف تو رشتہ انسانوں سے ہے اور دوسری طرف اس کا تعلق اللہ سے ہے۔ جب بھی انسانی احساسات اسے ہراساں کرنے لگتے ہیں تو اللہ کی طرف سے سکینت نازل ہوتی ہے چنانچہ اس موقع پر بھی آپ پر ایک اطمینان اور سکون نازل کیا گیا جس کی وجہ سے آپ نے نہایت مطمئن لہجے میں فرمایا کہ گھبراؤ مت اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر آپ کی برکت سے یہی سکینت حضرت ابوبکرؓ پر نازل ہوئی اور صرف سکینت ہی نازل نہیں ہوئی بلکہ اللہ نے آپ کو فرشتوں کے حصار میں رکھا ایسے لشکر آپ کی حفاظت کر رہے تھے جو انسانی نگاہوں میں نہیں آرہے تھے۔ مقصود صرف یہ تھا کہ کافر جو کرنا چاہتے ہیں ان کی بات سرنگوں کر دی جائے اور اللہ کا کلمہ سربلند ہو کر رہے۔ چنانچہ ایسے محیر العقول طریقے سے کافروں کو خائب و خاسر کیا گیا اور آنحضرت ﷺ اللہ کے دین کا پھریرا لہراتے ہوئے بخیریت تمام مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ آج بھی اگر تم اس کی مدد نہیں کرو گے تو ہزاروں اس کے جاں نثار اس کے ساتھ ہیں۔ مزید برآں اللہ کی مدد اس کے ساتھ ہے جب اس وقت کافر اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے جب وہ دو کو دوسرا تھا تو آج تو دو کا دوسرا نہیں بلکہ تیس ہزار کا سرخیل ہے۔ تو اس وقت اگر وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں تھا تو آج بھی وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں لیکن اللہ کی مدد کا محتاج اس وقت بھی تھا اور آج بھی ہے۔ یہی ایک مدد ہے جسے اللہ کا رسول ہمیشہ مانگتا ہے۔ یہی آستانہ ہے جس پر وہ جھکتا ہے۔ دنیا کا کوئی اور آستانہ نہیں جہاں اس کا سر جھکے یا دستِ استعانت دراز ہو اور جہاں تک پروردگار کا تعلق ہے اس کیلئے مدد کرنے میں کوئی دشواری نہیں اللہ کے رسول تنہا ہوں یا دو کے دوسرے یا اس کی رکاب میں ہزاروں کا لشکر ہو وہ ہر صورت میں اپنے رسول کی مدد کرنے پر قادر ہے کیونکہ وہ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی ہے۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

نکلو (جہاد کیلئے) ہلکے ہو یا بوجھل اور جہاد کرو اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ (۴۱) ﴿التوبة : ۴۱﴾

نفیرِ عام کے بعد جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے:

خفاف، خفیف کی اور ثقال، ثقیل کی جمع ہے۔ ترکیب میں یہ حال واقع ہو رہے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ نے جہاد کیلئے ہر ایک کو نکلنے کا حکم دے دیا اور نفیرِ عام کر دیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد ایک ایک فرد پر فرض ہو گیا ہے۔ اب جہاد سے پیچھے رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ تمہارے پاس اسلحۂ جنگ یا سواری نہیں یا تم سروسامان سے بھرپور اور اسلحہ سے لیس ہو۔ ہر صورت میں تمہیں نکلنا ہوگا کیونکہ یہ عذر کہ میرے پاس سواری نہیں یا اسلحہ نہیں یہ نہ نکلنے کیلئے کافی عذر نہیں۔ ممکن ہے حکومت اس کا انتظام کر دے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کوئی مخیّر فرد اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھا لے، اس لئے اس کو بہانہ بنا کر جہاد سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی۔ روح البیان کے مصنف اور بعض دیگر مفسرین نے اسے صرف جنگ کے سروسامان تک محدود نہیں رکھا بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ ثقیل اور خفیف عام ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ تم خواہ جوان ہو یا بوڑھے، فقیر ہو یا امیر، سوار ہو یا پیادہ، تندرست ہو یا بیمار، تنہا ہو یا عیالدار، ہر حالت میں دعوتِ جہاد پر لبیک کہتے ہوئے رزمگاہِ حق و باطل میں شریک ہو جاؤ۔ یہ دیکھنا قیادت کا کام ہے کہ جنگ میں اپنے ساتھ کس کو لے جایا جائے اور کس کا عذر قبول کر لیا جائے۔ اپنے طور پر کسی آدمی کیلئے اس بات کی اجازت نہیں کہ عذرِ صحیح بھی ہو تب بھی وہ جنگ سے پیچھے رہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے

Marfat.com

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں جب اسلامی قیادت کی جانب سے نفیرِ عام ہو جائے یعنی خطرہ اتنا ہمہ گیر ہو اور دشمن نے اس طرح ہلّہ بول دیا ہو کہ صرف فوج کیلئے اس سے عہدہ برآ ہونا کافی نہ ہو اور حکومت ملک کے باشندوں سے نکلنے کی اپیل کرے۔ ایسی صورت میں ہر شخص پر جہاد فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بیماری ایسی شدید ہو کہ جنگ میں شرکت بے سود ہو یا کوئی اور عذر شدید ہو تو پھر اسلامی حکومت کے نمائندے ایسے شخص کو پیچھے رہنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔

غزوۂ تبوک ایک ایسا ہی غزوہ تھا جس میں غنیم کی فوج اور ان کے اسلحۂ جنگ کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ ایک ایک مسلمان اس میں شریک ہوتا اور مسلمان جنگی مصارف کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اپنے تمام وسائل حکومت کی نذر کر دیتے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے پیشِ نظر مسلمانوں نے دل کھول کر ایثار بھی کیا اور مخلص مسلمانوں میں سے تین افراد کے سوا جو محض تساہل کا شکار ہوئے کسی آدمی نے پیچھے رہنا پسند نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے ایثار کو قبول فرمایا اور رومی قیادت کو جب یہ علم ہوا کہ خود مسلمانوں کے پیغمبر اپنی تمام قوت کو لے کر سرحدوں کی طرف بڑھ رہے ہیں تو انہوں نے اپنی فوجیں واپس بلانے ہی میں عافیت سمجھی اور آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر کہ سرحد پر کوئی مخالف قوت موجود نہیں آپ نے تبوک میں پڑاؤ ڈال دیا اور بیس دن وہاں قیام فرما کر سرحدی معاملات کو درست فرمایا۔ اردگرد کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنا باجگزار بنایا۔ ایلہ کا عیسائی حکمران یوحنا دربارِ رسالت میں آ کر صلح کا خواہاں ہوا اور تین سو دینار سالانہ ادا کرنے پر مصالحت کی۔ دومۃ الجندل کے عیسائی حاکم اکیدر پر حملہ کرنے کیلئے حضرت خالد کو روانہ کیا چنانچہ وہ اس کو قید کر کے اور بہت سا مالِ غنیمت لے کر واپس آئے۔ سلطنتِ روم کی سرحد کے ساتھ ساتھ جتنے عرب قبائل تھے یا تو وہ مسلمان ہو گئے یا خراج ادا کرنے لگے۔ اس طرح عرب کی یہ سرحد دشمن کی یلغار سے محفوظ ہو گئی اور قیصر اور اس کے اعوان و انصار کی یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی کہ مسلمان ایک تر نوالہ ہیں جب ان کی مرضی ہو گی وہ انہیں نگل جائیں گے۔

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّا تَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿التوبة : ۴۲﴾

(اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر آسان تو وہ لوگ ضرور تمہارے پیچھے لگ جاتے لیکن لمبی نظر آئی ان کو مسافت اور اب یہ اللہ کی قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم آپ کے ساتھ ضرور نکلتے یہ خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ (۴۲)

منافقین کے بہانوں کی حقیقت:

ان آیاتِ کریمہ میں منافقین کی سخن سازیوں اور حیلہ طرازیوں سے پردہ اٹھایا جا رہا ہے۔ وہ بظاہر یہ کہتے ہیں کہ ہمیں اللہ کے نبی کے ساتھ جہاد و قتال نہایت عزیز ہے اور ہم اسے ایک فریضہ سمجھتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے پاس غزوۂ تبوک میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکلنے کیلئے وسائل نہیں ہیں۔ وسائل کی کمیابی اور حالات کی نامساعدت نے ہمیں رکنے پر مجبور کر دیا ہے اگر ہمارے اندر کچھ بھی طاقت ہوتی اور ہمارے ذرائع اس کی اجازت دیتے تو ہم آپ کے ساتھ ضرور نکلتے۔ پروردگار ان کے اس جھوٹ کا پول بھی کھول رہے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے اصل مرض کی نشاندہی بھی کر رہے ہیں۔ منافقین غزوۂ تبوک میں ساتھ چلنے سے اس لئے عاجز نہیں رہے کہ ان کے پاس وسائل کی کمیابی تھی بلکہ ان کا اصل مرض یہ ہے کہ انہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ جہاد میں شرکت یا عدمِ شرکت کا فیصلہ اپنے مفادات کو دیکھ کر کرتے ہیں۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ تبوک تو دور دراز ایک مقام ہے جہاں اس گرمی میں طویل سفر کر کے جانا آسان نہیں اور پھر مقابلہ ایک بہت بڑے دشمن سے درپیش ہے۔ دشمن کی فوجوں کی کثرت اور اس کی قوت کا ساری دنیا کو اعتراف ہے۔ نہایت طویل سفر کر کے ایک ایسی قوت سے ٹکرانا جو دنیا کی سب سے بڑی قوت سمجھی جاتی ہے جنون کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر مسافت طویل نہ ہوتی اور کسی معمولی دشمن سے تصادم ہوتا اور مالِ غنیمت ملنے کے امکانات غالب ہوتے تو منافقین کو نکلنے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ اب وہ دیکھ رہے ہیں کہ سینکڑے میل کا سفر، چلچلاتی گرمی، جھلس ڈالنے والی دھوپ، سے سابقہ ہے تو آخر نکلنے کی ہمت کہاں سے

Marfat.com

آئے اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ کھجور کی فصل تیار ہے اگر اسے بروقت توڑا نہ گیا تو اس کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے اور اسی پر اہل مدینہ کی گزر بسر کا انحصار بھی ہے۔ ایسی حالت میں نکلنے کیلئے جس مضبوط ایمان اور جاندار جذبے کی ضرورت ہے وہ منافقین کہاں سے لائیں۔ وہ تو ہر کام کرنے سے پہلے نفع وضرر کے پیمانوں سے ناپ تول کر حساب لگاتے ہیں کہ ہمیں اس کام سے فائدہ ہوگا یا نقصان۔ اگر نقصان کا اندیشہ بھی ہو تو وہ کبھی ایسا کام کرنے کا ارادہ نہیں کرتے جہاد وقتال اور بالخصوص غزوۂ تبوک جیسی معرکہ آرائی تو سراسر سب کچھ کھو کر اللہ سے کچھ پا لینے کا نام ہے۔ ایسے خطرناک اقدام کیلئے ایک منافق کبھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ وسائل کی کمیابی کا عذر پیش کر کے آپ کو اطمینان دلانا چاہتے ہیں تو بات اصل میں یہ نہیں بلکہ حقیقی بیماری وہ ہے جس کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن ان کی نادانی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ غزوۂ تبوک میں جانا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور کوئی بھی سمجھدار آدمی موت کے منہ میں جانا کبھی پسند نہیں کرتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد وقتال دنیا میں کامیابی اور آخرت میں سرخروئی کا نام ہے۔ ہلاکت ان کے لئے ہے جو اس راستے سے گریز کرتے ہیں۔ منافقین بظاہر زندگی کی حفاظت کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ہلاکت کو دعوت دے رہے ہیں۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ
صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۗ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ
يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ
كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾
لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا۟اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ
يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ
حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْهُمْ

Marfat.com

مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَ
اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ
وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ
وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿٥٠﴾ قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ
لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾ قُلْ هَلْ
تَرَبَّصُوْنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ
اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا
اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿٥٢﴾ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ
مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿٥٣﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ
مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّاۤ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ
الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٥٤﴾
فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ
لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ
كٰفِرُوْنَ ﴿٥٥﴾ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ
وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿٥٦﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ

Marfat.com

أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ﴿٥٧﴾ وَمِنْهُم مَّن
يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا رَضُوا وَإِن لَّمْ
يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ﴿٥٨﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ
اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِن فَضْلِهِ
وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ﴿٥٩﴾

اللہ نے آپ کو معاف کیا، آپ نے ان کو اجازت کیوں دی؟ یہاں تک کہ کھل جاتے آپ پر وہ لوگ جو سچے ہیں اور آپ جھوٹوں کو بھی جان لیتے۔ وہ کبھی آپ سے اجازت طلب نہیں کریں گے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے سے جہاد نہ کریں۔ اللہ اپنے متقی بندوں کو خوب جاننے والا ہے۔ رخصت مانگنے کیلئے تو وہی آتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے شک میں متردد ہیں۔ اگر انہوں نے نکلنے کا ارادہ کیا ہوتا تو انہوں نے تیار کیا ہوتا کچھ سامان لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اٹھنے کو پسند نہ کیا پس انہیں پست ہمت کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ تم بیٹھے رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ اگر یہ لوگ تم میں نکلتے تو تم میں فساد اور خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور تمہارے درمیان ان کی ساری بھاگ دوڑ فتنہ انگیزی کیلئے ہوتی اور تم میں ان کی سننے والے بھی موجود ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ یہ منافقین پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوشش کر چکے ہیں اور الٹ پلٹ کرتے رہے ہیں آپ کے سامنے معاملات کو یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا حکم غالب ہو گیا اور وہ ناخوش تھے۔ ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دیجئے اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالئے، خبردار! فتنہ میں تو وہ گر چکے ہیں بیشک جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اگر آپ کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو انہیں بری لگتی ہے اور اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور وہ لوٹتے ہیں خوشیاں مناتے ہوئے۔ کہہ دیجئے! ہرگز نہیں پہنچے گی ہمیں کوئی تکلیف مگر جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے وہی ہمارا مولا ہے اور اللہ ہی پر مومنوں کو توکل کرنا چاہئے۔ ان سے کہہ دیجئے! کہ تم انتظار نہیں کر رہے ہو ہمارے متعلق مگر دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی کا اور ہم انتظار کر رہے ہیں تمہارے لئے کہ اللہ یا تو تم پر اپنے پاس سے عذاب بھیجے گا اور یا ہمارے ہاتھوں۔ پس تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے! تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا بیشک تم ایک نافرمان قوم ہو۔ یہ اپنے انفاق کی قبولیت سے صرف اس لئے محروم ہوئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نماز

Marfat.com

کیلئے نہیں آتے مگر سست اور وہ خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہوتے ہیں۔ پس نہ تعجب میں ڈالیں آپ کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ یہ چیزیں ان کیلئے اس دنیا کی زندگی میں موجب عذاب بنیں اور ان کی جانیں حالتِ کفر میں نکلیں۔ اور یہ اللہ کی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ کوئی ٹھکانہ یا کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ پالیں تو وہ منہ پھیر لیں گے اس طرف منہ زوری کرتے ہوئے۔ ان میں سے وہ بھی ہیں جو آپ پر طعن کرتے ہیں صدقات کے بارے میں اگر انہیں دے دیا جائے ان سے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں نہ دیا جائے ان سے تو برہم ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ اس پر قانع رہتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اور کہتے کہ ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے اللہ ہمیں اپنے فضل سے نوازے گا اور اس کا رسول بھی، ہم تو اللہ کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ (۴۳تا۵۹) (رکوع: ۷)

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

اللہ نے آپ کو معاف کیا، آپ نے ان کو اجازت کیوں دی؟ یہاں تک کہ کھل جاتے آپ پر وہ لوگ جو سچے ہیں اور آپ جھوٹوں کو بھی جان لیتے۔ (۴۳) ﴿التوبة : ۴۳﴾

پروردگار کا دلنواز عتاب:

جنگِ تبوک کیلئے جب نکلنے کا وقت آیا تو منافقین چونکہ اپنی داخلی کمزوریوں کے باعث اس جنگ میں نکلنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس آ کر جھوٹے عذرات پیش کر کے جنگ سے غیر حاضری اور اپنے گھر میں بیٹھ رہنے کی اجازت طلب کی۔ آنحضرت ﷺ اگرچہ ان کے نفاق سے واقف تھے، آپ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے عذرات سراسر تراشیدہ اور تمام تر مصنوعی ہیں لیکن آپ نے اپنی کریم النفسی اور اعلیٰ ظرفی کے باعث جانتے ہوئے بھی ان کے عذرات کو قبول فرمایا اور انہیں پیچھے رہنے کی اجازت دے دی۔ پروردگار نے بظاہر اس پر عتاب فرمایا لیکن انداز ایسا دلنواز ہے جسے دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا ہے کہ مقصود عتاب نہیں بلکہ محض توجہ دلانا ہے۔

بعض خدا رسیدہ اہلِ علم کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ کا جو ایک والہانہ تعلق اپنے اللہ سے تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے ادنیٰ سے ادنیٰ عتاب کو بھی آپ کیلئے برداشت کرنا آسان نہ تھا۔ آپ کا آبگینۂ دل جو سراسر اللہ کے انوار اور اللہ کی محبت سے بھرپور رہتا تھا اس کیلئے عتاب کی معمولی جھلک بھی ناقابلِ برداشت تھی اس لئے پروردگار نے توجہ دلانے سے پہلے عفا اللہ عنک فرمایا کہ اللہ نے آپ کو معاف کر دیا تاکہ آپ کے قلبِ مبارک پر عتاب کا بار نہ پڑے۔

معصومیت کا مفہوم:

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے وہ یہ کہ اللہ کے سب نبی معصوم ہیں۔ معصوم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ان سے گناہوں کا صدور نہیں ہوتا اور وہ اللہ کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے۔ گناہ کہتے ہیں شریعت کے کسی حکم کو توڑنے اور اللہ کی نافرمانی کو۔ اس کا صدور کبھی کسی پیغمبر سے نہیں ہوا۔ البتہ! کوئی ایسی بات جو پیغمبر کے مقام بلند سے فروتر ہو، جسے خلافِ اولیٰ کہا جاتا ہے، ایسی کسی بات کا ارتکاب اور صدور پیغمبر سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اللہ کے نبی کی شان چونکہ بہت بلند ہے اور پھر اسے دوسرے انسانوں کیلئے اسوہ اور نمونہ بنایا گیا ہے، اس لئے پیغمبر سے کسی خلافِ اولیٰ کام کا بھی صدور ہوتا ہے تو پروردگار اسے بھی باقی نہیں رہنے دیتے، فوراً اس کی اصلاح فرما دیتے ہیں تاکہ اگر کوئی شخص اس زندگی کا اتباع کرے تو اسے پوری طرح اطمینان ہو کہ میں ایسی زندگی کا اتباع کر رہا ہوں جو ہر طرح کی غلطی سے مبرّا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں جس بات کی توجہ دلائی گئی ہے اور جس کی معافی کا ابھی اعلان فرمایا

Marfat.com

گیا ہے وہ کوئی گناہ نہیں کیونکہ اس سے شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ البتہ! خلاف اولیٰ ضرور ہے کیونکہ اللہ کی نگاہ میں بہتر یہ تھا کہ آپ منافقین کو پیچھے رہنے کی اجازت نہ دیتے بلکہ انہیں قتال کے فریضہ کی ادائیگی کا حکم دیتے۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو نہیں نکلنا تھا وہ اجازت نہ ہونے پر بھی نہ نکلتے۔ اس طرح مسلمانوں کے سامنے بات کھل جاتی کہ یہ منافق ہیں مومن نہیں کیونکہ ایک مومن اللہ کے رسول کے حکم کی خلاف ورزی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس طرح منافقین اور مومنین میں امتیاز ہو جاتا اور منافقین کو اپنے نفاق پر پردہ ڈالنا آسان نہ رہتا۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ ۝ إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ۝

وہ کبھی آپ سے اجازت طلب نہیں کریں گے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں کہ وہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد نہ کریں اللہ اپنے متقی بندوں کو خوب جاننے والا ہے۔ (۴۴) رخصت مانگنے کیلئے تو وہی آتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے شک میں متردد ہیں۔ (۴۵) ﴿التوبة : ۴۴، ۴۵﴾

منافق کی ایک علامت:

منافقین کی قرآن وسنت میں بہت سی علامتیں بیان فرمائی گئیں ہیں، جن کا تعلق ان کی عبادات سے بھی ہے اور ان کے معاملات سے بھی۔ لیکن دشمن کے مقابلے میں جہاد وقتال کیلئے نکلنے کے اعتبار سے اس آیتِ کریمہ میں ایک واضح علامت بیان فرمائی گئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول پر مکمل ایمان موجود ہے اور وہ آخرت کے دن کا یقین رکھتا ہے اور وہ اس بات کو یقینی سمجھتا ہے کہ قیامت آئے گی اور اللہ کے حضور حاضری ہوگی، وہاں ایک ایک عمل کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ خاص طور پر حق و باطل کی کشمکش میں حق کی سربلندی اور باطل کو سرنگوں کرنے کیلئے نکلنے کا جب وقت آئے ایسے وقت میں جان وتن کی قربانی کی بجائے زندگی بچانے کیلئے پیچھے رہنا ایک ایسا جرم ہے جس کی قیامت کے دن سخت باز پرس ہوگی کیونکہ ایسے جرم کا ارتکاب کرنے والا درحقیقت کفر کو سربلند اور اسلام کو سرنگوں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے جسے بھی اللہ نے ایمان کی دولت بخشی ہے اس سے اعمال کی کوتاہیوں کا صدور تو ممکن ہے لیکن جہاد وقتال کے فرض ہو جانے کے بعد پہلوتہی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس لئے یہاں بطور علامت کے بیان فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ آپ کے پاس جنگ میں شریک نہ ہونے کے عذر پیش کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ جانتے ہیں کہ غزوۂ تبوک ایک ایسا غزوہ ہے جس میں شرکت ہر مومن کے لئے فرضِ عین ہے۔ فرضِ عین کی ادائیگی میں جھوٹے عذرات کو سہارا بنانا کسی مخلص مومن کا کام نہیں ہوسکتا۔ ایسا تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایمان کی دولت سے محروم ہیں اور جن کے دلوں میں ابھی تک ایمان نہیں اترا اور وہ ابھی تک شک وشبہ میں مبتلا ہیں۔

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَٰكِنْ كَرِهَ اللَّهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ۝

اگر انہوں نے نکلنے کا ارادہ کیا ہوتا تو انہوں نے تیار کیا ہوتا کچھ سامان لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے اٹھنے کو پسند نہ کیا پس انہیں پست ہمت کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ تم بیٹھے رہو بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ (۴۶) ﴿التوبة : ۴۶﴾

منافقین کے جھوٹ پر دلیل:

بعض منافقین ایسے بھی تھے جو آنحضرت ﷺ کے سامنے جنگ میں ساتھ نہ چلنے کا یہ عذر پیش کرتے کہ ہم تو ہمیشہ آپ کی ہم رکابی کو اپنے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھتے ہیں اور جہاد میں شرکت تو ایک مومن کیلئے بہت بڑی سعادت ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل ہمارے حالات ناموافق ہیں اس جنگ کا اچانک اعلان ہوگیا اگر پہلے سے کچھ اندازہ ہوتا تو ہم یقیناً اس کیلئے تیار ہوتے۔ اب بعض مشکلات کے باعث ہمارا اس جنگ کیلئے نکلنا ممکن نہیں اس لئے آپ ہمیں جنگ سے غیر حاضری کی اجازت دے دیں۔ پروردگار ان کے اس جھوٹ کو نمایاں کرتے ہوئے فرما رہا ہے کہ منافق جو کچھ کہتے ہیں یہ

Marfat.com

سراسر سخن سازی اور جھوٹ پر مبنی باتیں ہیں۔ اگر ان کے اندر آنحضرت ﷺ کے ساتھ جنگ میں شرکت کا کچھ بھی ارادہ ہوتا تو یہ زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ تیاری تو ضرور کر لیتے، کچھ نہ کچھ سامانِ سفر فراہم کر لیتے کیونکہ معمولی سامانِ سفر بقدرِ ضرورت مہیا کر لینا تو ان کے لئے کچھ دشوار نہیں لیکن ان کی طرف سے کسی قسم کی تیاری کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی نیتوں میں فتور ہے۔ مختلف اعذار محض بہانے ہیں اور اپنی بدنیتی کو چھپانے کی کوششیں ہیں۔ حق و باطل کی کشمکش میں گریز پائی ان کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے۔ یہ تو بیچارے مارے باندھے مسلمانوں کے ساتھ نکلنے پر کبھی مجبور ہو جاتے ہیں ورنہ اللہ کے راستے میں تکلیفیں اٹھانا ان کے بس کی بات نہیں۔ رہی تیاری کی بات تو جن لوگوں کے اندر جذبۂ جہاد فروزاں تھا وہ روتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچے کہ ہمیں سواری اور اسلحہ دیجئے ہماری جانیں قربان ہونے کیلئے تیار ہیں اور جن کے پاس کچھ بھی تیاری کا سامان ممکن تھا وہ اسی کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے مزید امکانات کھول دیئے۔ لیکن ان کی چونکہ نیتوں ہی میں کھوٹ تھا تو اللہ تعالیٰ نے بھی جنگ میں ان کی شرکت کو پسند نہیں فرمایا۔ اللہ کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ جو شخص بیتابی اور صدقِ نیت سے اس سے مانگتا ہے وہ ضرور توفیق عطا فرماتا ہے لیکن جو شخص پیچھے رہنا چاہتا ہے تو وہ اس سے ہمت اور ارادے کی قوت چھین لیتا ہے۔ ان سے بھی اس نے اپنی سنت کے مطابق سلوک فرمایا ہے۔ نہ صرف انہیں توفیق سے محروم رکھا گیا بلکہ حکم دے دیا گیا کہ تمہیں پیچھے بیٹھ رہنا پسند ہے تو پیچھے بیٹھے رہو اب تمہیں حق و باطل کی کشمکش میں نکلنا کبھی نصیب نہ ہو گا۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَا۟اَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴿التوبة : ۴۷﴾

اگر یہ لوگ تم میں نکلتے تو تم میں فساد اور خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور تمہارے درمیان ان کی ساری بھاگ دوڑ فتنہ انگیزی کیلئے ہوتی اور تم میں ان کی سننے والے بھی موجود ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو۔ (۴۷)

مصلحتِ الٰہی:

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کیلئے تسلی بھی ہے اور مصلحتِ الٰہی کی وضاحت بھی۔ سابقہ آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مصلحت اور مشیت کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ پسند نہیں کیا کہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ نکلیں۔ ان کی بدنیتی کے باعث ان سے توفیق سلب کر لی گئی۔ یہاں اس کی وضاحت فرمائی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کا یہ فیصلہ اس وجہ سے تھا کہ اگر وہ آپ کے ساتھ نکلتے تو بجز کسی خرابی کے اور کسی چیز کا باعث نہ بنتے۔ انہیں جہاں موقع ملتا مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتے۔ ان کے ارادوں سے چونکہ پروردگار خوب باخبر ہے اس لئے اس نے مسلمانوں کی بھلائی کیلئے ان کے نہ نکلنے کو پسند فرمایا۔

مسلمانوں کو یہ کہہ کر تسلی دی جا رہی ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ ان کے نہ نکلنے سے تمہاری افرادی قوت میں کمی ہوئی ہے اور اگر وہ ساتھ ہوتے تو تمہاری قوت کا سامان بنتے حالانکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا۔ ان کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے تم ان کی فتنہ پردازی سے محفوظ رہے۔ تمہاری قیادت کے فیصلوں پر یکسوئی سے عمل ہوتا رہا۔ پوری فوج ایک اکائی کی طرح حرکت میں آتی رہی۔ اگر وہ لوگ تم میں موجود ہوتے تو قدم قدم پر تمہارے لئے دشواریاں پیدا کرتے۔ نئی نئی افواہوں سے تمہارے عزائم کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے۔ مختلف قبائل میں غلط فہمیاں پیدا کر کے تصادم کی کیفیت پیدا کر دیتے۔ اس لئے ان کا شرکت نہ کرنا تمہاری کمزوری کا باعث نہیں ہوا بلکہ تمہاری یکسوئی کا سبب بنا اور مزید ایک بات فرما کر اس بات کے امکان کو زیادہ واضح فرما دیا کہ تم میں ایسے سادہ دل مسلمان بھی ہیں جو منافق تو نہیں لیکن ابھی تک ان میں مومن کی فراست پیدا نہیں ہوئی اس لئے یہ منافق لوگ ان کی سادگی سے فائدہ اٹھانا خوب جانتے ہیں وہ طریقے طریقے سے انہیں بددل کرنے اور شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور یہ سیدھے سادے مسلمان ان کی باتوں کو کان لگا کر سنتے اور بعض دفعہ اس کا اثر بھی قبول کرتے ہیں۔ اگر وہ منافق اس جنگ میں تمہارے ساتھ ہوتے تو وہ ایسے مسلمانوں کو اپنی مطلب برآری کیلئے استعمال کرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اللہ چونکہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے اس لئے انہیں تمہارے ساتھ شرکت کی توفیق نہ دے کر تمہیں بہت سارے فتنوں سے محفوظ کر دیا۔

Marfat.com

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَ قَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ○

یہ منافقین پہلے بھی فتنہ انگیزی کی کوشش کر چکے ہیں اور الٹ پلٹ کرتے رہے ہیں آپ کے سامنے معاملات کو یہاں تک کہ حق آ گیا اور اللہ کا حکم غالب ہو گیا اور وہ ناخوش تھے۔(۴۸) ﴿التوبة : ۴۸﴾

منافقین کے جھوٹ کے شواہد:

اس آیتِ کریمہ میں سابقہ مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ منافقین کے بارے میں اس سے پہلے جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ محض بدگمانی نہیں بلکہ گزشتہ غزوات میں ان کی شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں کے شواہد موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اعلائے کلمۃ الحق کے لئے نہیں نکلتے بلکہ ان کے پیشِ نظر کسی نہ کسی فتنہ کو ہوا دینا ہوتا ہے۔ جنگِ احد میں عبداللہ بن ابی کا عین وقت پر میدانِ جنگ کے قریب پہنچ کر تین سو ساتھیوں کو لے کر پیچھے ہٹ جانا اور مسلمانوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دینا ایک ایسی سازش تھی جس سے سب مسلمان واقف ہیں۔ پھر جنگِ احد میں پیش آنے والے واقعات کو آنحضرت ﷺ اور اسلام کی حقانیت کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بنانا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ پھر یہ منافقین ہی تھے جنہوں نے جنگِ مریسیع کے موقع پر اپنی فتنہ انگیزی سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان ناخوشگوار صورتحال پیدا ہوتے ہوتے رہ گئی۔ واقعہ افک کی صورت میں ان کی فتنہ انگیزیوں کو کون بھول سکتا ہے ایسے ہی واقعات کی طرف اشارہ کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ منافقین نے جب بھی مسلمانوں کے ساتھ غزوات میں شرکت کی ہے، مسلمانوں کیلئے مشکلات ہی پیدا کی ہیں۔ غزوۂ تبوک میں بھی اگر یہ لوگ شریک ہوتے تو وہاں بھی یہ لوگ ایسی ہی حرکتیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا کرم فرمایا کہ ان کی اکثریت کو اس غزوہ میں شریک ہونے کی توفیق سے محروم کر دیا۔ ان میں سے اگر چند لوگ اس غزوہ میں ساتھ گئے بھی تو انہوں نے بھی راستے میں سازشوں میں کمی نہیں چھوڑی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کو ان کے مفاسد سے محفوظ رکھا اور ان کی تمام بدخواہیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غلبہ عطا فرمایا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ○

ان میں وہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے اجازت دے دیجئے اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالئے، خبردار! فتنہ میں تو وہ گر چکے بیشک جہنم کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔(۴۹) ﴿التوبة : ۴۹﴾

ایک منافق کی جسارت:

اس آیتِ کریمہ میں ایسے بہانہ جو منافقین کی طرف اشارہ ہے۔ جو دوسرے منافقین کی طرح ہی حق و باطل کے معرکہ میں غیر جانبدار رہنے بلکہ لاتعلق رہنے ہی کو علم و دانش کی معراج سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں نے کوئی اور بہانہ کرنے کی بجائے اپنے تقویٰ کو حق و باطل کے معرکے میں پیچھے رہنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ ممکن ہے اس قسم کے منافقین کی ایک معتدبہ تعداد ہو لیکن روایات میں جد بن قیس کا نام لیا گیا ہے۔ اس نے آ کر عرض کی کہ حضور روم کی عورتیں اپنے حسن و جمال میں بہت شہرت رکھتی ہیں میں عورت کے بارے میں دل پھینک واقع ہوا ہوں۔ حسن کا مقابلہ کرنا میرے لئے بڑی آزمائش ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں وہاں کسی گناہ میں مبتلا ہو جاؤں۔ اس لئے آپ میری کمزوری کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے جنگ میں عدمِ شرکت کی اجازت دے دیں۔ اس شخص نے اپنی کسی کمزوری یا عذر کو پیچھے رہنے کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ تقویٰ اور دین داری کی حفاظت کو اس کا ذریعہ بنایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کے حربوں کے عجیب رنگ ہیں کسی شخص کو وہ بے دینی کے نام سے بے دین کرتا ہے اور کسی شخص کو دینداری کے نام سے گمراہی کے گڑھے میں پھینکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کا جواب ایک نہایت مختصر لیکن بلیغ فقرے میں دیا ہے۔ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا کہ یہ منافق لوگ فتنے میں گر جانے کے خوف کو جہاد میں عدمِ شرکت کا عذر بنا رہے ہیں کہ اگر ہم تبوک پہنچیں تو ہو سکتا ہے وہاں کا حسن ہمیں فتنہ میں مبتلا کر دے اور ہم گناہ میں مبتلا

Marfat.com

ہو جائیں۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ وہاں جا کر فتنہ میں مبتلا ہونا تو دور کی بات ہے اور جس کی حقیقت وہم سے زیادہ نہیں کیونکہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کے سینے میں ایمان کا نور ہے وہ کبھی ایسے گناہ میں مبتلا نہیں ہو سکتا لیکن یہ منافق لوگ تو گھر بیٹھے ہی اس سے کہیں بڑے فتنے میں مبتلا ہو چکے ہیں کیونکہ فرائضِ دینی سے گریز اور فرار کیلئے عذر تراشنا بجائے خود ایک ایسا فتنہ ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور فتنہ نہیں ہو سکتا۔ غزوۂ تبوک میں شرکت ایک طرف تو فریضۂ دین ہے اور دوسری طرف غلبۂ دین اور بقائے ملت کی کوشش ہے۔ جس میں ذرا سی کوتاہی بھی امتِ مسلمہ کے مستقبل کو اندھیروں میں ڈبو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے اس کی شناعت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو شخص ایسے ہولناک گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ تو فتنہ میں اوندھے منہ گر چکا اس کی تباہی کیلئے کسی اور فتنے کی ضرورت نہیں اور ایسے شخص کے کفر میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی لوگ ہیں قیامت کے دن جہنم جن کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنے حصار میں لے لے گا۔

اِنْ تُصِبْکَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْکَ مُصِیْبَةٌ یَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَآ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ وَیَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ٥

اگر آپ کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو انہیں بری لگتی ہے اور اگر آپ کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم نے پہلے ہی اپنا بچاؤ کر لیا تھا اور وہ لوٹتے ہیں خوشیاں مناتے ہوئے۔ (۵۰) ﴿التوبة : ۵۰﴾

منافقین کی حقیقت:

جو شخص بھی غزوہ تبوک کے حالات سے واقف ہے اور جن حالات میں نبی اکرم ﷺ نے رومی قوت کو سرحد پر روکنے کا فیصلہ فرمایا ان کی خطرناکی کو سمجھتا ہے تو اس کیلئے یہ بات ناقابلِ فہم ہو جاتی ہے کہ کوئی شخص مسلمان کہلاتے ہوئے بھی ایسے حالات میں کس طرح پیچھے رہنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی الجھن کا جواب دیا گیا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے دل میں اسلام کا تھوڑا سا بھی درد ہے اور وہ ذرہ بھر بھی اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں اپنے اندر فکر مندی کا احساس رکھتا ہے۔ وہ تو یقیناً ایسی غلطی کبھی نہیں کر سکتا۔ لیکن ان منافقین کے بارے میں یہ بات واضح ہونی چاہئے کہ ان کے عذروں کو دیکھتے ہوئے ان کے دلوں میں جس ایمان کا شبہ ہوتا ہے۔ وہ سراسر نفاق کا ایک پردہ ہے۔ ورنہ حقیقت میں ان کا اسلام یا مسلمانوں سے کوئی رشتہ نہیں۔ ان کی حقیقی تصویر یہ ہے کہ اگر کوئی سی بھلائی یا فتح مندی مسلمانوں کو نصیب ہوتی ہے تو انہیں اس سے دکھ ہوتا ہے اور اگر مسلمانوں کو حق و باطل کی کشمکش میں کوئی نقصان ہوتا یا تکلیف پہنچتی ہے تو ان کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی یہ ان کی وہ حقیقی صورتحال ہے جسے جان لینے کے بعد پھر یہ الجھن پیدا نہیں ہوتی کہ وہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہنے کیلئے بہانے کیوں تراشتے تھے۔ جنگ میں شرکت کوئی سیر سپاٹے کیلئے تو نہیں ہوتی یہ تو زندگی اور موت کا کھیل ہے۔ جس میں قدم قدم پر موت سے سامنا ہوتا ہے۔ اس میں تو وہی شخص شرکت کی ہمت کرتا ہے جو آخرت پر اپنی دنیا کو قربان کر چکا ہو۔ غلبۂ دین جس کیلئے سب سے بڑی ترجیح بن چکا ہو۔ اللہ کی رضا جس کی زندگی کا مقصد قرار پا چکا ہو۔ لیکن جس کی زندگی اس کے بالکل برعکس ہو اس کا اس معرکے سے کیا تعلق؟

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ٥ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِکُمْ اَنْ یُّصِیْبَکُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَیْدِیْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَکُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ٥

کہہ دیجئے! ہرگز نہیں پہنچے گی ہمیں کوئی تکلیف مگر جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے وہی ہمارا مولا ہے اور اللہ ہی پر مومنوں کو توکل کرنا چاہئے۔ (۵۱) ان سے کہہ دیجئے! کہ تم انتظار نہیں کر رہے ہو ہمارے متعلق مگر دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی کا اور ہم انتظار کر رہے ہیں تمہارے لئے کہ اللہ یا تو تم پر اپنے پاس سے عذاب بھیجے گا اور یا ہمارے ہاتھوں۔ پس تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ (۵۲) ﴿التوبة : ۵۱، ۵۲﴾

Marfat.com

منافق اور مومن میں سوچ کا فرق:

گزشتہ آیتِ کریمہ میں منافقین کے اس اندرونی احساس کا ذکر فرمایا گیا ہے جو وہ مسلمانوں کے بارے میں رکھتے تھے۔اس آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ ان منافقین کو بتا دیجئے کہ دراصل ہم میں اور تم میں بنیادی سوچ کا فرق ہے۔ تمہیں جب کوئی کامیابی ملتی ہے یا کوئی خوشی اور راحت نصیب ہوتی ہے تو تم اسے اپنے دست وبازو کی کوششوں کا ثمر سمجھتے ہو اس لئے اس پر اترانے لگتے ہو اور اگر تمہیں کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے تو تم اسے بدنصیبی قرار دے کر یا اپنی کوششوں کی ناتمامی ٹھہرا کر پریشان اور مایوس ہو جاتے ہو۔اس طرح سے تمہاری کامیابیاں اور ناکامیاں دونوں تمہارے سیرت وکردار کے بگاڑ کا باعث بنتی ہیں۔کامیابی تم میں اتراہٹ پیدا کرتی ہے اور ناکامی تم میں مایوسی کی لہر اٹھاتی ہے۔لیکن ہم لوگ تمہاری طرح نہیں سوچتے ہمیں اگر کوئی راحت ملتی ہے تو ہم اسے اللہ کا انعام سمجھتے ہیں اور اس پر اس کا شکر بجالاتے ہیں اور اس سے ہمارے ایمان کو جلا ملتی ہے اور اگر کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو ہم اسے اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے ہیں۔تو اس پر صبر کرتے اور اللہ سے بھلائی کی دعا کرتے ہیں۔اس سے ہمارے اندر کردار کی پختگی پیدا ہوتی اور صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع ملتا ہے۔ہم ہر معاملے میں کوشش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن اس کے نتائج کا ذمہ دار اپنی کوششوں کو نہیں بلکہ اللہ کریم کو ٹھہراتے ہیں۔جو کچھ ہمیں ملتا ہے یا جو کچھ ہم پر وارد ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے آتا ہے ہم ہر چیز کو اپنے محبوب کی عطا سمجھ کر قبول کرتے ہیں اس لئے خوشی کے موقع پر ہمارے اندر اتراہٹ پیدا نہیں ہوتی اور غم کے وقت ہم شکوہ کناں نہیں ہوتے۔اے پیغمبر! ان کو بتا دیجئے کہ تم ہمارے لئے دو باتوں کی خواہش رکھتے ہو اور معرکۂ حق وباطل میں تم انہیں دو باتوں کا انتظار کرتے ہو کہ یا ہمیں فتح نصیب ہوگی اور یا ہم اس راستے میں کام آجائیں گے۔اگر ہمیں فتح ملی تو تم اپنی سخن سازیوں سے کام لے کر اس میں شریک ہونے کی کوشش کروگے اور اگر ہم مارے گئے تو یہی تمہاری اصل مراد ہے۔لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہماری کامیابیاں بھی اسی کیلئے ہیں اور بظاہر ناکامیاں بھی اسی کیلئے ہیں۔لیکن ہمارے یہاں ناکامی کا کوئی تصور نہیں۔اگر ہم جنگ سے زندہ واپس آگئے تو ہم غازی کہلائیں گے اور اللہ کے دین کے غلبے کیلئے مزید کوششوں میں جت جائیں گے اور اگر ہم اس راستے میں کام آگئے تو اللہ تعالیٰ ہمیں شہادت کی خلعتِ فاخرہ پہنائے گا اور ہماری عاقبت روشن ہو جائے گی اور یہی ہمارا اصل مقصور ہے۔دنیا ہمارے لئے مہلتِ عمل ہے دار الجزا نہیں۔اس مہلتِ عمل میں جیسے جیسے ہم مقصد کے حصول کے قریب ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے ہماری خوشیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔اہلِ دنیا کامیابی صرف منفعت کے حصول اور عہدہ واقتدار کو سمجھتی ہے۔لیکن ہم اللہ کی رضا کے حصول اور اس کے دین کے غلبے میں اپنی کامیابی تلاش کرتے ہیں۔اس کیلئے زندہ رہنا پڑے تو زندگی کامیابی ہے اور اگر جان دینی پڑے تو شہادت کامیابی ہے۔اس لئے منافقو! تم ہمارے لئے دونوں میں سے کسی چیز کیلئے بھی انتظار کرو ہمارے لئے ہر چیز میں خیر اور بھلائی ہے کیونکہ وہ ہمارے اللہ کی دین اور اس کی عطا ہے اور وہ ہمارا مولا، ہمارا حامی وناصر اور ہمارا محبوب ہے۔اے پیغمبر! انہیں بتا دو کہ ہم بھی تمہارے لئے دو باتوں میں سے ایک کی توقع رکھتے ہیں کہ تمہاری اس روش کے باعث یا تو اللہ تعالیٰ تم پر اپنے پاس سے کوئی عذاب بھیجے گا اور یا ہمارے ہی ہاتھوں تم کو سزا دلوائے گا اور ان میں سے کوئی چیز بھی تمہارے لئے خیر نہیں اللہ کا عذاب بھی تمہارے لئے تباہی کا باعث ہوگا اور اسلام کا غلبہ بھی تمہارے خاتمے کا سبب ہوگا۔پس تم بھی انتظار کرو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ○ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ○

ان سے کہہ دیجئے! تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے تم سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا بیشک تم ایک نافرمان قوم ہو۔(۵۳) یہ اپنے انفاق کی قبولیت سے صرف اس لئے محروم ہوئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور وہ نماز کیلئے نہیں آتے مگر سست اور وہ خرچ نہیں کرتے مگر اس حال میں کہ وہ ناخوش ہوتے ہیں۔(۵۴) ﴿التوبۃ : ۵۳ ، ۵۴﴾

Marfat.com

سابقہ آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ منافق حقیقت میں اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کے بدترین مخالف ہیں لیکن مسلمان معاشرہ میں گھرے ہونے اور اسلامی حکومت کے زیرِ نگین رہنے کی وجہ سے مجبور ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سے اسلام اور مسلمانوں سے اپنے تعلق کا اس طرح اظہار کریں کہ مسلمان انہیں اپنے میں سے سمجھیں۔ جنگ کا موقع آتا تو جھوٹے بہانے بنا کر پیچھے رہنے کی کوشش کرتے لیکن یہ دکھانے کیلئے کہ ہم مخلص مسلمان ہیں آگے بڑھ کر انفاق کی کوشش کرتے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں ان سے پوری طرح قطع تعلق اور اظہارِ نفرت وکراہت کرتے ہوئے فرمایا کہ اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے! تم مسلمانوں کو دھوکہ دینے کیلئے اور اپنے اسلام کے اظہار کیلئے خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے اسے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ بعض روایات میں جد بن قیس کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ دوسرے منافقین کی طرح وہ بھی چندہ لے کر حاضر ہوا لیکن آنحضرت ﷺ نے قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ اس لئے کہ اسلام کی سربلندی کیلئے چندہ بھی اسی کا قبول کیا جاسکتا ہے جو اسلام کے بارے میں مخلص ہو۔ جو شخص ایک طرف تو اسلام کی جڑ کاٹے اور دوسری طرف اپنے تعلق کی بقا کیلئے مالی تعاون کرے تو یہ سراسر ایک فریب اور دھوکہ ہے جسے مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے لیکن ہماری خودفریبی کا عالم یہ ہے کہ جن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ انہیں ہمارا وجود بھی گوارا نہیں ان کا بس چلے تو وہ اس ملک کو باقی نہ رہنے دیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان کی طرف سے ظاہری تعلق کے تمام مظاہر کو نہ صرف قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ اعتماد بھی کرتے ہیں۔ ہمارا حال تو بس یہ ہے کہ:

بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی ہے
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے ہیں

انفاق قبول نہ کرنے کی وجہ:

دوسری آیتِ کریمہ میں منافقین کے انفاق کو قبول نہ کرنے کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ اللہ نے ان کے انفاق کو قبول کرنے سے اس لئے روکا ہے کہ وہ لوگ حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول کے منکر اور کافر ہیں۔ لیکن محض دکھاوے کیلئے وہ چندہ بھی دیتے ہیں اور نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔ لیکن تم اگر غور سے ان کی نمازوں کو دیکھو تو تمہیں اندازہ ہو جائے کہ ان کی نماز مارے باندھے کی نماز ہے۔ جیسے آدمی اپنے سر سے کسی بیگار کو ٹالتا ہے اور اس لئے ادا کرتے ہیں تاکہ مسلمان دیکھ کر یقین کرلیں کہ وہ واقعی مسلمان ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ جب اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں تو کراہت اور ناخوشی سے خرچ کرتے ہیں دل کی آمادگی ساتھ نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کو دکھانے کیلئے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو یقین آجائے کہ ہم بھی اسلام کی سربلندی اور اس کی نشر و اشاعت کو عزیز رکھتے ہیں۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

پس نہ تعجب میں ڈالیں آپ کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ یہ چیزیں ان کے لئے اس دنیا کی زندگی میں موجب عذاب بنیں اور ان کی جانیں حالتِ کفر میں نکلیں۔ (۵۵) ﴿التوبة : ۵۵﴾

اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ سے بھی خطاب ہے اور آپ کے واسطہ سے باقی مسلمانوں سے بھی۔ آپ سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کے دل میں جو بے پناہ اخلاص اور ہمدردی ہے ہر انسان کیلئے کہ وہ ایمان لے آئے اور اللہ کے عذاب سے بچ جائے وہ تو ظاہر ہے لیکن آپ بطورِ خاص ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جنہیں اللہ نے کثرت سے اولاد دی اور فراوانی سے مال عطا فرمایا ہے۔ صرف اس خیال سے کہ جس شخص کے پاس جوان بیٹے ہوں اور مال کی فراوانی ہو وہ قبائل کی زندگی میں ہمیشہ خصوصی احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اس کی بات توجہ سے سنتے ہیں وہ اگر چاہے تو کسی کی بھلائی کیلئے مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ بھی ایسے منافقین کو جن کے پاس اللہ کی یہ دونوں نعمتیں تھیں زیادہ توجہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کیلئے اللہ سے دعائیں بھی کرتے تھے کہ یہ لوگ ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو جائیں تو اسلام کی قوت کا باعث بن سکتے ہیں اور اسلامی معاشرے کی بہتری کیلئے

Marfat.com

اپنا کردار بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ لیکن اب جبکہ منافقین کے مسلسل طرزِ عمل نے یہ بات واضح کر دی کہ وہ کسی طرح بھی ہدایت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تو پروردگار نے اپنے رسولِ پاک کو حکم دیا کہ آپ ان کے مال و دولت اور ان کی اولاد کی وجہ سے انہیں اہمیت نہ دیں اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ فرما چکا ہے کہ وہ دنیا میں ان کو اس طرح عذاب دے گا کہ وہ اپنی کثرتِ اولاد اور کثرتِ مال کے باعث ایمان قبول کرنے سے محروم رہیں گے یہ مال و دولت کی محبت ان کے گلے کا طوق بنی رہے گی اور اسی حال میں ان کی جان گھٹ گھٹ کر نکلے گی۔

عام مسلمانوں سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ تمہیں بعض منافقین کی کثرتِ مال و اولاد کسی دھوکے میں نہ ڈالے تم ان کی عیش و عشرت اور جاہ و منزلت دیکھ کر اس فریبِ نظر کا شکار نہ ہونا کہ اگر یہ لوگ اللہ کی نگاہ میں مبغوض ہوتے تو ان پر یہ نظرِ کرم کیوں ہوتی، یہ ان کے مال و اولاد کی کثرت درحقیقت ان کیلئے ایک عذاب ہے جو انہیں اسلام کی طرف آنے نہیں دیتا۔ یہ اسی عذاب میں مبتلا رہیں گے تا آنکہ ان کی موت کا وقت آ جائے اور یہ اسی حال میں جان دینے پر مجبور ہو جائیں اور پھر کفر کی حالت میں مرنے کی وجہ سے آخرت میں جو ان پر گزرے گی وہ کسی مسلمان سے مخفی نہیں۔

وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ○ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ○ ﴿التوبة : ٥٦، ٥٧﴾

اور یہ اللہ کی قسمیں اٹھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں لیکن وہ ایسی قوم ہیں جو ڈرتے رہتے ہیں۔ (٥٦)
اگر یہ کوئی ٹھکانہ یا کوئی غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ پا لیں تو وہ منہ پھیر لیں گے اس طرف منہ زوری کرتے ہوئے۔ (٥٧)

امیر منافقین کی کیفیت:

(مدینہ کے منافق زیادہ تر بلکہ تمام تر مالدار اور سن رسیدہ لوگ تھے۔ ابنِ کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان کی جو فہرست دی ہے اس میں صرف ایک نوجوان کا ذکر ملتا ہے اور غریب ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ یہ لوگ مدینہ میں جائدادیں اور پھیلے ہوئے کاروبار رکھتے تھے اور جہاندیدگی نے ان کو مصلحت پرست بنا دیا تھا۔ اسلام جب مدینہ پہنچا اور آبادی کے ایک بڑے حصہ نے پورے اخلاص او جوشِ ایمانی کے ساتھ اسے قبول کر لیا تو ان لوگوں نے اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصہ میں مبتلا پایا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو خود ان کے قبیلوں کی اکثریت بلکہ ان کے بیٹوں او بیٹیوں تک کو اس نئے دین نے ایمان کے نشے سے سرشار کر دیا ہے۔ ان کے خلاف اگر وہ کفر و انکار پر قائم رہتے ہیں تو ان کی ریاست، عزت، شہرت سب خاک میں مل جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے اپنے گھروں میں ان کے خلاف بغاوت برپا ہونے کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا ساتھ دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ سارے عرب سے بلکہ اطراف و نواح کی قوموں اور سلطنتوں سے بھی لڑائی مول لینے کیلئے تیار ہو جائیں۔ اغراضِ نفسانی کی بندگی نے معاملہ کے اس پہلو پر نظر کرنے کی استعداد تو ان کے اندر باقی ہی نہیں رہنے دی تھی کہ حق و صداقت بجائے خود بھی کوئی قیمتی چیز ہے جس کے عشق میں انسان خطرات مول لے سکتا ہے اور جان و مال کی قربانیاں گوارا کر سکتا ہے۔ وہ دنیا کے سارے معاملات و مسائل پر صرف مفاد اور مصلحت ہی کے لحاظ سے نگاہ ڈالنے کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس لئے ان کو اپنے مفاد کے تحفظ کی بہترین صورت یہ نظر آئی کہ ایمان کا دعویٰ کریں تا کہ اپنی قوم کے درمیان اپنی ظاہری عزت اور اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار کو برقرار رکھ سکیں مگر مخلصانہ ایمان نہ اختیار کریں تا کہ ان خطرات و نقصانات سے دوچار نہ ہوں جو اخلاص کی راہ اختیار کرنے سے لازماً پیش آنے تھے۔ ان کی اسی ذہنی کیفیت کو یہاں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ حقیقت میں یہ لوگ تمہارے ساتھ نہیں ہیں بلکہ نقصانات کے خوف نے انہیں زبردستی تمہارے ساتھ باندھ دیا ہے جو چیز انہیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرائیں وہ صرف یہ خوف ہے کہ مدینہ میں رہتے ہوئے علانیہ غیر مسلم بن کر رہیں تو جاہ و منزلت ختم ہوتی ہے اور بیوی بچوں تک سے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ مدینہ کو چھوڑ دیں تو اپنی جائدادوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور ان کے اندر کفر کیلئے

Marfat.com

بھی اتنا اخلاص نہیں ہے کہ اس کی خاطر وہ ان نقصانات کو برداشت کرنے پر تیار ہو جائیں۔ اس مخمصے نے انہیں کچھ ایسا پھانس رکھا ہے کہ مجبوراً مدینہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، بادل نخواستہ نمازیں پڑھ رہے ہیں اور زکوٰۃ کا "جرمانہ" بھگت رہے ہیں ورنہ آئے دن جہاد اور آئے دن کسی نہ کسی خوفناک دشمن کے مقابلے اور آئے دن جان و مال کی قربانیوں کے مطالبے کی جو "مصیبت" ان پر پڑی ہوئی ہے اس سے بچنے کیلئے اس قدر بے چین ہیں کہ اگر کوئی سوراخ یا بل بھی ایسا نظر آ جائے جس میں انہیں امن ملنے کی امید ہو تو یہ بھاگ کر اس میں گھس بیٹھیں۔) (از تفہیم القرآن)

اس آیت میں چند مشکل الفاظ ہیں جن کی تشریح ضروری ہے۔

مَلْجَأً: پناہ گاہ، ٹھکانہ مغارۃ: واحد ہے مغاورات کی اس کا معنی ہے چھپ کر بیٹھنے کی جگہ۔ عام طور پر غار کے معنی میں بولا جاتا ہے۔
مدخلا: وہ جگہ جس میں تکلیف سے داخل ہوا جا سکے۔ یجمحون: جمح الفرس کے معنی ہیں تغلب علی راکبہ وذھب بہ ولا ینثنی۔ (گھوڑا سوار کے قابو سے باہر ہو گیا اور اس کو لے کر بگٹٹ بھاگا یعنی جب گھوڑا سرکشی کرتا ہے اور باگ کی پرواہ نہیں کرتا تو اس وقت یہ جملہ بولتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی فرمایا جا رہا ہے کہ اگر ان منافقین کو کہیں بھی جائے پناہ مل جائے تو وہ منہ زور گھوڑے کی طرح بھاگ نکلیں گے۔ مسلمان معاشرے میں رہنا ان کی مجبوری ہے اس لئے کہ کہیں ان کے لئے جائے پناہ نہیں۔ بزدل لوگ ہیں اس لئے قسمت آزمائی کی بھی ہمت نہیں رکھتے۔)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝

ان میں سے وہ بھی ہیں جو آپ پر طعن کرتے ہیں صدقات کے بارے میں اگر انہیں دے دیا جائے ان سے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں نہ دیا جائے ان سے تو برہم ہو جاتے ہیں۔ (۵۸) اگر وہ اس پر قانع رہتے جو ان کو اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے اور کہتے کہ ہمارے لئے اللہ ہی کافی ہے اللہ ہمیں اپنے فضل سے نوازے گا اور اس کا رسول بھی ہم تو اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔ (۵۹) ﴿التوبۃ: ۵۸ تا ۵۹﴾

غریب منافقین کا حال:

سابقہ آیات میں مالدار منافقین کا حال بیان ہوا ہے۔ اب یہ غیر مالدار منافقین کا حال بیان ہو رہا ہے۔ نفاق میں دونوں یکساں ہیں۔ دونوں کو مجبوریوں نے مسلمان معاشرے میں رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ جس طرح مالدار منافقین خوف کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ متعلق ہیں اسی طرح یہ غریب لوگ بھی طمع کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جہاں تک ان کے نفاق کا تعلق ہے تو ان کا حال یہ ہے کہ اگر تو نبی کریم ﷺ زکوٰۃ وعشر کے مال میں سے انہیں نوازتے رہیں تو یہ خوش رہتے ہیں اور بڑھ بڑھ کر دوسروں سے زیادہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر آنحضرت دوسروں کا خیال کرتے ہوئے ان سے ہاتھ روکتے ہیں تو یہ ناراض ہو کر عیب چینی شروع کر دیتے ہیں کہ دوسروں کو تو فیاضی سے دیا جا رہا ہے اور ہمیں ہمارے حق کے مطابق بھی نہیں دیا جا رہا۔ اندازہ فرمایئے! جو شخص اللہ کے رسول پر بھی بے انصافی کا عیب لگائے اور ان کی تقسیم پر راضی نہ ہو اس کے اندر ایمان کی رمق کہاں آ سکتی ہے دوسری آیتِ کریمہ میں بتانا تو مسلمانوں کو مقصود ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ مسلمان اسی کی تصویر تھے لیکن سنایا منافقین کو جا رہا ہے کہ اگر تم میں ایمان کی کچھ بھی رمق ہے تو پھر اس کا تقاضا وہ طرزِ عمل نہیں جو تم نے اختیار کر رکھا ہے بلکہ اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ جتنا تم مال و دولت پر فریفتہ ہو اس سے کہیں بڑھ کر تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے تعلق ہونا چاہئے اس تعلق کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ کہ اللہ تمہیں اپنے خزانۂ کرم سے جو کچھ عطا فرماتا ہے اور اللہ کے رسول اللہ کے احکام کے مطابق جو کچھ تمہیں دیتے ہیں تمہیں اس پر قانع رہنا چاہئے۔ مال میں کمی بیشی کی شکایت بے ایمان لوگوں کا کام ہے۔ تمہارا اصل کام اور تمہاری پہچان مال و دولت نہیں بلکہ اللہ سے تعلق ہے اس لئے تمہیں ہمیشہ یہ کہنا چاہئے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے۔ اس نے پہلے بھی ہمیں دیا ہے اور آئندہ بھی اپنے فضل وکرم سے ہمیں عطا فرمائے گا اور اس کے رسول بھی مزید ہم پر مہربانی فرمائیں گے کیونکہ ہم مال و دولت کے پجاری نہیں نہ اس کے حریص ہیں بلکہ ہماری منزل تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ ہم اسی کے چاہنے والے اور اسی کیلئے جان دینے والے ہیں۔

Marfat.com

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ

وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ
وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَ
يَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ
رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٦١﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ
لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا
مُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ
لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ
الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ
قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿٦٤﴾
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ
اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ
كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ

Marfat.com

نَعُذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۚ﴿۶۶﴾

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کیلئے ہیں اور ان لوگوں کیلئے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کیلئے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضہ داروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کیلئے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔ اور انہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں وہ کانوں کا کچا ہے۔ کہہ دیجئے! وہ سراپا گوش تمہاری بھلائی کے باب میں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مومنوں کی بات پر یقین کرتا ہے اور وہ رحمت ہے ان لوگوں کیلئے جو تم میں سے ایمان لائے اور جو اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔ وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ وہ تمہیں راضی کر دیں حالانکہ اگر وہ مومن ہیں تو اللہ اور اس کا رسول اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ یہ اس کو راضی کریں۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا اس کیلئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔ منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں نازل نہ کردی جائے اہلِ ایمان پر کوئی ایسی صورت جو ان کو ان کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ کردے۔ کہہ دیجئے! مذاق اڑا لو اللہ ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم خوف زدہ ہو۔ اگر آپ ان سے پوچھیں تو جواب دیں گے کہ ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ کہہ دیجئے! کیا تم اللہ اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی مسخری کر رہے تھے؟ اب بہانے مت بناؤ تم نے ایمان کے بعد کفر کیا ہے اگر ہم درگزر بھی کرلیں تم میں سے ایک گروہ سے تو دوسرے گروہ کو ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہی اصل مجرم تھے۔ (۶۰ تا ۶۶) (رکوع: ۸)

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝

یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو۔ نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضہ داروں کی مدد کرنے میں اور راہِ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور دانا و بینا ہے۔ (۶۰)

﴿ التوبة : ۶۰ ﴾

گزشتہ آیت کریمہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب زکوٰۃ اور عشر تقسیم فرماتے تھے تو منافقین یہ کہہ کر تنقید کرتے کہ اپنے لوگوں کو تو نوازا جاتا ہے اور ہمیں ہمارا حق بھی نہیں دیا جاتا۔ اس حوالے سے یہ بات ضروری ہوگئی کہ مسلمانوں پر واضح کر دیا جائے کہ زکوٰۃ لینے کے مستحق کون لوگ ہیں تاکہ جو لوگ زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہیں وہ آگے بڑھ کر اس میں سے منافقین کی طرح حصہ بٹانے کی کوشش نہ کریں۔ چنانچہ اسی تقریب سے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ و عشر کے مصارف بیان فرمائے جا رہے ہیں۔

اگرچہ اس آیت میں صدقات کا لفظ استعمال ہوا ہے جس میں واجب اور نفلی دونوں صدقات داخل ہیں۔ مگر اس آیت میں باجماعِ امت صدقاتِ فرض ہی کے مصارف کا بیان مراد ہے اور تفسیر قرطبی میں ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظ صدقہ مطلقاً بولا گیا ہے اور کوئی قرینہ نفلی صدقہ کا نہیں ہے تو صدقہ فرض ہی مراد ہوتا ہے۔ اس آیت کو لفظ ''انما'' سے شروع کیا گیا ہے۔ یہ لفظ حصر و انحصار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس شروع کے ہی کلمہ نے بتا دیا کہ صدقات کے جو مصارف آگے بیان ہو رہے ہیں تمام صدقاتِ واجبہ صرف انہی میں خرچ ہونے چاہئیں۔ ان کے علاوہ کسی

Marfat.com

دوسرے مصرفِ خیر میں صدقات واجبہ صرف نہیں ہو سکتے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ "صدقات" صدقہ کی جمع ہے۔ صدقہ لغت میں مال کے اس جز کو کہا جاتا ہے جو اللہ کے لیے خرچ کیا جائے (قاموس) امام راغب نے مفردات القرآن میں فرمایا کہ صدقہ کو صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا دینے والا گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے قول وفعل میں صادق ہوں۔ اس کے خرچ کرنے کی کوئی غرض دنیوی نہیں بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر رہا ہوں۔ اس لیے جس صدقہ میں کوئی نام ونمود یا دنیوی غرض شامل ہو جائے قرآنِ کریم نے اس کو کالعدم قرار دیا ہے۔

اب ہم بالترتیب مصارفِ صدقات کو بیان کرتے ہیں۔ یہ تعداد میں آٹھ ہیں۔

مصارفِ زکوٰۃ:

ا......فقراء:

فقیر سے مراد ہر وہ شخص ہے جو اپنی معیشت کے لیے دوسرے کی مدد کا محتاج ہو۔ یہ لفظ تمام حاجت مندوں کے لیے عام ہے خواہ وہ جسمانی نقص یا بڑھاپے کی وجہ سے مستقل طور پر محتاج اعانت ہو گئے ہوں یا کسی عارضی سبب سے سر دست مدد کے محتاج ہوں اور اگر انہیں سہارا مل جائے تو آگے چل کر خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بے روزگار لوگ اور وہ لوگ جو وقتی حوادث کا شکار ہو گئے ہوں۔

۲......مساکین:

مسکنت کے لفظ میں عاجزی، درماندگی، بے چارگی اور ذلت کے مفہومات شامل ہیں۔ اس اعتبار سے مساکین وہ لوگ ہیں جو عام حاجت مندوں کی بہ نسبت زیادہ خستہ حال ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ ایسے لوگوں کو مستحقِ امداد ٹھہرایا ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق ذرائع نہ پا رہے ہوں اور سخت تنگ حال ہوں۔ مگر نہ تو ان کی خودداری کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت دیتی ہو اور نہ ان کی ظاہری پوزیشن ایسی ہو کہ کوئی انہیں حاجت مند سمجھ کر ان کی مدد کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ چنانچہ حدیث میں اس کی تشریح یوں آئی ہے کہ

"المسکین الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن له فیتصدق علیه ولا یقوم فیسأل الناس"

﴿مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر لوگوں سے مانگتا ہے۔ گویا وہ ایک ایسا شریف آدمی ہے جو غریب ہو﴾

۳......عمالِ حکومت:

یعنی وہ لوگ جو صدقات وصول کرنے اور وصول شدہ مال کی حفاظت کرنے اور ان کا حساب کتاب لکھنے اور انہیں تقسیم کرنے میں حکومت کی طرف سے استعمال کیے جائیں۔ ایسے لوگ خواہ فقیر و مسکین نہ ہوں، ان کی تنخواہیں بہر حال صدقات ہی کی مد سے دی جائیں گی۔ یہ الفاظ اور اسی سورہ کی آیت ۱۰۳ کے الفاظ "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات اور اپنے خاندان (یعنی بنو ہاشم) پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا۔ چنانچہ آپ نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اگر وہ اس خدمت کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے لیکن معاوضہ لے کر اس شعبے کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحبِ نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے لیکن اگر وہ غریب و محتاج یا قرض دار یا مسافر ہوں تو زکوٰۃ لینا ان کے لیے حرام ہے۔ البتہ! اس امر میں اختلاف ہے کہ خود بنی ہاشم کی زکوٰۃ بھی بنی ہاشم لے سکتے ہیں یا نہیں۔ امام ابو یوسف کی رائے یہ ہے کہ لے سکتے ہیں، لیکن اکثر فقہاء اس کو بھی جائز نہیں رکھتے۔

Marfat.com

۴......مؤلفۃ القلوب:

تألیف قلب کے معنی ہیں ''دل موہنا''۔ اس حکم سے مقصود یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت میں سرگرم ہوں اور مال دے کر ان کے جوشِ عداوت کو ٹھنڈا کیا جاسکتا ہو' یا جو لوگ کفار کے کیمپ میں ایسے ہوں کہ اگر مال سے انہیں توڑا جائے تو ٹوٹ کر مسلمانوں کے مددگار بن سکتے ہوں' یا جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ان کی سابقہ عداوت یا ان کی کمزوریوں کو دیکھتے ہوئے اندیشہ ہو کہ اگر مال سے ان کی استمالت نہ کی گئی تو پھر کفر کی طرف پلٹ جائیں گے' ایسے لوگوں کو مستقل وظائف یا وقتی عطیے دے کر اسلام کا حامی و مددگار یا مطیع و فرمان بردار یا کم از کم بے ضرر دشمن بنالیا جائے۔ اس مد پر غنائم اور دوسرے ذرائع آمدنی سے بھی مال خرچ کیا جاسکتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو زکوٰۃ کی مد سے بھی ایسے لوگوں کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ فقیر و مسکین یا مسافر ہوں تب ہی ان کی مدد زکوٰۃ سے کی جاسکتی ہے' بلکہ وہ مالدار اور رئیس ہونے پر بھی زکوٰۃ دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو تالیف قلب کے لیے وظیفے اور عطیے دیے جاتے تھے' لیکن اس امر میں اختلاف ہو گیا ہے کہ آیا آپؐ کے بعد بھی یہ مد باقی رہی یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی رائے یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ کے زمانے سے یہ مد ساقط ہو گئی ہے اور اب مؤلفة القلوب کو کچھ دینا جائز نہیں۔ امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ فاسق مسلمانوں کو تالیفِ قلب کے لیے زکوٰۃ کی مد سے دیا جاسکتا ہے مگر کافر کو نہیں اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک مؤلفۃ القلوب کا حصہ اب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔

ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کا حصہ قیامت تک کے لیے ساقط ہو جانے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت عمرؓ نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ اگر اسلامی حکومت تالیفِ قلب کے لیے مال صرف کرنے کی ضرورت نہ سمجھتی ہو تو کسی نے اس پر فرض نہیں کیا ہے کہ ضرور ہی اس مد میں کچھ نہ کچھ صرف کرے۔ لیکن اگر کسی وقت اس کی ضرورت محسوس ہو تو اللہ نے اس کے لیے جو گنجائش رکھی ہے اسے باقی رہنا چاہئے۔ حضرت عمر اور صحابہ کرام کا اجماع جس امر پر ہوا تھا وہ یہ تھا کہ ان کے زمانہ میں جو حالات تھے ان میں تالیفِ قلب کے لیے کسی کو کچھ دینے کی وہ حضرات ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ صحابہ کے اجماع نے اس مد کو قیامت تک کے لیے ساقط کر دیا جو قرآن میں بعض اہم مصالحِ دینی کے لیے رکھی گئی تھی۔

۵......الرقاب:

گردنیں چھڑانے سے مراد یہ ہے کہ غلاموں کی آزادی میں زکوٰۃ کا مال صرف کیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہے کہ اگر میں اتنی رقم تمہیں ادا کر دوں تو تم مجھے آزاد کر دو' اسے آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے۔ دوسرے یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کئے جائیں۔ ان میں سے پہلی صورت پر تو سب فقہاء متفق ہیں' لیکن دوسری صورت کو حضرت علی' سعید بن جبیر' ثوری' ابراہیم النخعی' شعبی' محمد بن سیرین' حنفیہ اور شافعیہ ناجائز کہتے ہیں اور ابن عباس' حسن بصری' مالک' احمد اور ابوثور جائز قرار دیتے ہیں۔

۶......قرض دار:

یعنی ایسے قرضدار جو اگر اپنے مال سے اپنا پورا قرض چکا دیں تو ان کے پاس قدرِ نصاب سے کم مال بچتا ہو۔ وہ خواہ کمانے والے ہوں یا بے روزگار اور خواہ عرفِ عام میں فقیر سمجھے جاتے ہوں یا غنی۔ دونوں صورتوں میں ان کی اعانت زکوٰۃ کی مد سے کی جاسکتی ہے۔ مگر متعدد فقہاء کی رائے یہ ہے کہ جس شخص نے بداعمالیوں اور فضول خرچیوں میں اپنا مال اڑا کر اپنے آپ کو قرضہ داری میں مبتلا کیا ہو اس کی مدد نہ کی جائے جب تک وہ توبہ نہ کرلے۔

Marfat.com

۷......راہِ اللہ میں:

راہِ خدا کا لفظ عام ہے۔ تمام وہ نیکی کے کام جن میں اللہ کی رضا ہو اس لفظ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس حکم کی رو سے زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کاموں میں صرف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن حق یہ ہے اور آئمہ وسلف کی بڑی اکثریت اسی کی قائل ہے کہ یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی وہ جدوجہد جس سے مقصود نظام کفر کو مٹانا اور اس کی جگہ نظامِ اسلامی کو قائم کرنا ہو۔ اس جدوجہد میں جو لوگ کام کریں ان کو سفر کے خرچ کے لیے' سواری کے لیے' آلات واسلحہ اور سروسامان کی فراہمی کے لیے زکوٰۃ سے مدد دی جا سکتی ہے خواہ وہ بجائے خود کھاتے پیتے لوگ ہوں اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیے ان کو مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اسی طرح جو لوگ رضا کارانہ اپنی تمام خدمات اور اپنا تمام وقت' عارضی طور پر یا مستقل طور پر اس کام کے لیے دے دیں ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی زکوٰۃ سے وقتی یا استمراری اعانتیں دی جاسکتی ہیں۔

یہاں یہ بات اور سمجھ لینی چاہئے کہ آئمہ سلف کے کلام میں بالعموم اس موقع پر غزوہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو قتال کا ہم معنی ہے۔ اس لیے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ زکوٰۃ کے مصارف میں فی سبیل اللہ کی جو مد رکھی گئی ہے وہ صرف قتال کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ قتال سے وسیع تر چیز کا نام ہے اور اس کا اطلاق ان تمام کوششوں پر ہوتا ہے جو کلمۂ کفر کو پست اور کلمۂ خدا کو بلند کرنے اور اللہ کے دین کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے قائم کرنے کے لیے کی جائیں' خواہ وہ دعوت وتبلیغ کے ابتدائی مرحلے میں ہوں یا قتال کے آخری مرحلے میں۔

۸......مسافر:

مسافر خواہ اپنے گھر میں غنی ہو لیکن حالتِ سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اس کی مدد زکوٰۃ کی مد سے کی جائے گی۔ یہاں بعض فقہاء نے یہ شرط لگائی ہے کہ جس شخص کا سفر معصیت کے لیے نہ ہو صرف وہ اس آیت کی رو سے مدد کا مستحق ہے۔ مگر قرآن وحدیث میں ایسی کوئی شرط موجود نہیں ہے اور دین کی اصولی تعلیمات سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص مدد کا محتاج ہو اس کی دستگیری کرنے میں اس کی گناہ گاری مانع نہ ہونی چاہئے۔ بلکہ فی الواقع گناہ گاروں اور اخلاقی پستی میں گرے ہوئے لوگوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ مصیبت کے وقت ان کو سہارا دیا جائے اور حسن سلوک سے ان کی نفس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ؕ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝ ﴿التوبة : ٦١﴾

اور انہی میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو نبی کو ایذا پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں وہ کانوں کا کچا ہے۔ کہہ دیجئے! وہ سراپا گوش تمہاری بھلائی کے باب میں ہے وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور مومنوں کی بات پر یقین کرتا ہے اور وہ رحمت ہے ان لوگوں کیلئے جو تم میں سے ایمان لائے اور جو اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔ (٦١)

ایک ضرورت کے تحت مصارف زکوٰۃ کا ذکر ضروری ہو گیا تھا اس لئے سابقہ آیت میں اس کی تفصیل بیان فرما دی گئی اب پھر اسی مضمون کو لیا جارہا ہے جو گزشتہ آیات سے جاری تھا یعنی منافقین کی بعض شرارتوں اور ایذا رسانیوں کو ذکر فرمایا جارہا ہے۔

Marfat.com

منافقین کی ایذارسانیوں کا ذکر:

ائمہ لغت کے نزدیک ﴿رجل اذن﴾ اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر ایک کی بات سن لے۔ اور ابن عباس فرماتے ہیں جو سنے بھی اور مان بھی لے۔ منافقین آنحضرت ﷺ کے لئے اپنی مجلسوں میں اس لفظ کا استعمال کرتے تھے۔ اہل علم نے اس کے دو مطلب لئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب وہ اپنی مجلسوں میں اسلام اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں بعض دفعہ نازیبا بات کہہ دیتے یا ذو معنین فقرے بولتے تو انہی میں سے کوئی شخص انہیں توجہ دلاتا کہ اگر یہی بات آنحضرت ﷺ کے کانوں تک پہنچ گئی تو تم سے جواب طلبی بھی ہو سکتی ہے اور تمہاری رسوائی بھی ہو گی۔ تو وہ بدبخت کہتے کہ اس کی کوئی فکر نہیں کیونکہ وہ کانوں کے بڑے کچے ہیں۔ کوئی ان سے کچھ بھی کہے جب ہم ان کے سامنے قسمیں کھا کر اپنی بات کا یقین دلائیں گے تو وہ ہماری بات مان لیں گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب ان کی نجی مجلسوں کی باتیں آنحضرت ﷺ تک پہنچتیں اور مسلمانوں کو اس کی خبر ہوتی تو مسلمان ان کو لعنت ملامت کرتے تو یہ انہیں کہتے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات کا جہاں تک تعلق ہے وہ بہت عظیم شخصیت ہیں ان کے کمالات کی کوئی انتہا نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی کریم النفسی اور مروت کے باعث ہر ایک کی بات سنتے اور مان لیتے ہیں۔ ہمارے بارے میں انہیں جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ اس پر یقین کر لیتے ہیں حالانکہ ہم جیسے وفا شعاروں اور اطاعت گزاروں سے ایسی کسی بات کا صدور کس طرح ممکن ہے؟ اس طرح سے وہ ایک طرف آپ کی شخصیت کو خراج تحسین بھی پیش کرتے لیکن ساتھ ساتھ آپ کو کانوں کا کچا یعنی سیدھا سادا آدمی قرار دیتے۔ کسی اور آدمی کیلئے یہ بات ممکن ہے قابلِ تعریف ہو لیکن اللہ کے نبی جو اللہ کی جانب سے بیدار دل لیکر آتے ہیں اور ہر وقت وحیِ الٰہی ان کی حفاظت کرتی ہے اور پھر ان کے پیشِ نظر ایک امت کی تعمیر و تشکیل اور ان کے ایک ایک کام کی نگرانی ہے ان سے تو اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے پروردگار نے ان کی اس بات کا نوٹس لیا اور ان کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ نبی کریم ﷺ یقیناً ہر ایک کو بات کرنے کا موقع دیتے اور کسی کی بھی عزتِ نفس کو مجروح کرنا پسند نہیں فرماتے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ہر طرح کی بات کو قبول کر لیتے ہیں، ان کے کان ہر وقت تمہاری بھلائی کی باتوں کیلئے کھلے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی امت کے اچھے کاموں، اچھی باتوں اور اچھے ارادوں کی خبریں ان کے کانوں تک پہنچتی رہیں اور ان کی خوشی کا باعث بنیں لیکن وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ وہ لوگوں کی سرگوشیوں سے آگاہ ہوں اور لوگوں کی بری باتیں جاننا چاہیں۔ انہیں تمہارے بارے میں اگر کچھ باتیں پہنچتی ہیں تو وہ عموماً کانوں تک رہتی ہیں بجز اس کے کہ کوئی بات ایسی ہو جس کی جواب طلبی ضروری ہو ورنہ تمہاری بہت ساری حرکتوں کو وہ نظر انداز فرما دیتے ہیں اور مزید یہ بات بھی کہ ان کے پاس خبر کے ذرائع تمہاری طرح نہیں ہیں جن پر اعتبار کرنا مشکل ہو بلکہ ان پر خبریں آسمان سے اترتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہر اس بات سے باخبر رکھتا ہے جس کا تعلق امت کی اجتماعی بہبود سے ہو۔ اسی طرح وہ صاحب ایمان لوگ جن کی زبانوں پر کبھی جھوٹ نہیں آتا ان کے ذریعے اگر کوئی بات آپ تک پہنچتی ہے تو آپ اس کو تسلیم کر لیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان لوگوں کیلئے جو ایمان لائے ہیں سراپا رحمت بنایا ہے۔ اس لیے اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں اس رحمت سے حصہ ملے تو تمہیں اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے جب تمہارا ایمان نفاق سے پاک ہو جائے گا تو تم بھی اس رحمت کے سائے میں آجاؤ گے۔ لیکن جب تک تمہارا یہ رویہ رہے گا کہ جب بھی تمہیں موقع ملے تو تم واہی تباہی بکتے رہو اور اس طرح سے اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاؤ تو ایسے لوگوں کے لئے اللہ نے رحمت نہیں عذاب الیم رکھا ہے۔ دونوں راستے تمہارے لئے کھلے ہیں پکے اور سچے مومن بن کر اپنے لئے رحمت خرید لو اور یا نفاق کو جاری رکھ کر عذاب الیم کے مستحق بن جاؤ۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر وہ بات جس سے اللہ کے رسولِ کریم ﷺ کا دل دکھتا ہے یا وہ آپ کی توہین کا باعث بنتی ہے یا اس بات سے آپ کے دین کو کوئی نقصان پہنچتا ہے اور امت گمراہی کا شکار ہوتی ہے یا ایسی باتوں کا فروغ جسے نبی کریم ﷺ پسند نہیں فرماتے تھے اور جس کے نتیجے میں آپ کے برپا کئے انقلاب کو نقصان پہنچتا ہے یہ ساری باتیں پیغمبر کو ایذا دہی میں شامل ہیں اور اس کا انجام عذابِ الیم ہے۔ امت کے

Marfat.com

چھوٹے بڑے لوگوں کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ہماری کتنی ایسی باتیں کتنے ایسے کام اور کتنی ایسی پالیسیاں ہیں جو اگر رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کی جاتیں تو آپ ایک لمحے کے لئے انہیں گوارا نہ فرماتے اور آپ کو یقیناً اس سے تکلیف پہنچتی اور ہماری کتنی ایسی حرکتیں ہیں جس سے آنحضرت ﷺ کا طرزِ معاشرت، آپ کی شخصیت، آپ کی تہذیب اور آپ کے تمدن کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ اس کی ہیئت کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یقیناً ایسی ساری باتیں آنحضرت ﷺ کے لئے دکھ کا باعث ہیں۔ کیا ہم اپنی ان حرکتوں سے اللہ کے عذابِ الیم کو دعوت تو نہیں دے رہے؟

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿التوبة : ٦٢﴾

وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ وہ تمہیں راضی کر دیں حالانکہ اگر وہ مومن ہیں تو اللہ اور اس کا رسول اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ یہ اس کو راضی کریں۔ (٦٢)

قسموں کی مہم:

ہم گزشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ منافقین امیر ہوں یا غریب مسلمان معاشرے میں رہنے پر مجبور تھے کیونکہ اسلام کے ایک غالب قوت بن جانے کے بعد جزیرۂ عرب کی حد تک کوئی اسے چیلنج کرنے والا نہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر منافقین عرب میں رہنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے مسلمانوں کے سوا کوئی سہارا نہیں اور مفادات کی ہوس نے ان میں یہ ہمت باقی نہیں چھوڑی تھی کہ وہ جزیرۂ عرب سے نکل کر کسی اور ملک میں قسمت آزمائی کرتے۔ اب ان کے لئے مشکل یہ تھی کہ مسلمان معاشرے میں رہنے کیلئے مسلمانوں جیسا بن کر رہنا ضروری تھا اس لئے مجبوراً نمازیں بھی پڑھتے، چندہ بھی دیتے، لیکن اپنی نجی مجلسوں میں جب بھی موقع ملتا دل کے پھپھولے پھوڑنے سے باز نہ آتے۔ ان کی نجی مجلسوں کی باتیں جب بھی مسلمانوں کے علم میں آتیں تو پھر ان کے لئے مشکلات پیدا ہوتیں۔ چنانچہ ایسے مواقع پر وہ مسلمانوں کے سامنے جھوٹی قسموں کے ذریعے اپنا مخلص مسلمان ہونا ثابت کرتے اور ان تمام کاوشوں کا حاصل صرف یہ ہوتا کہ مسلمان ان سے خوش اور مطمئن رہیں تاکہ انہیں اسلامی ریاست میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ گزشتہ آیتِ کریمہ میں ان کی ایسی ہی ایک بیہودہ بات کا ذکر کیا گیا ہے جس کی یقیناً انہوں نے تاویلیں کی ہوں گی۔ لیکن مسلمانوں کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے قسمیں اٹھا اٹھا کر مسلمانوں کو راضی کرنا چاہا ہوگا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار فرما رہے ہیں کہ مسلمانو وہ تمہارے سامنے آ کر تمہیں خوش کرنے کے لئے قسمیں اٹھاتے ہیں حالانکہ تمہارا خوش ہونا ان کی نجات کا ذریعہ نہیں بلکہ ان کی نجات اللہ اور اس کے رسول کی خوشی میں ہے۔ اس لئے ان کی گرفت اس بات پر فرمائی جا رہی ہے کہ اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو تمہارے ایمان کا تقاضا اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا حصول ہے یا مسلمانوں کی خوشی؟ اور ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول کی رضا منظور ہوتی تو تم اس کے لئے کوشش کرتے نہ کہ ان کو اُذُنٌ قرار دے کر ان کے خلاف پروپیگنڈا کی عیارانہ مہم شروع کر دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری قسموں کے پیچھے مقاصد کچھ اور مضمر ہیں۔

ضمیر واحد لانے کا سبب:

اس آیتِ کریمہ میں ﴿یرضوہ﴾ میں واحد کی ضمیر لائی گئی ہے حالانکہ اس سے پیچھے اللہ اور رسول کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے ﴿یرضوھما﴾ یعنی تثنیہ کی ضمیر ہونی چاہئے تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اشارہ اس بات کی طرف کیا جا رہا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی ذات میں تو کوئی مماثلت ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک خالق ہے دوسرا مخلوق۔ لیکن اللہ کا رسول، اللہ کے اتباع میں اپنے آپ کو ایسا فنا کر دیتا ہے اور اللہ اپنے رسول کو اتنا برگزیدہ کر دیتا ہے کہ دونوں کی رضا میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ کی رضا میں اللہ کا رسول راضی نہ ہو۔ بنا بریں رضا میں وحدت کی طرف اشارہ کرنے کیلئے ضمیر واحد لائی گئی ہے۔ اس میں ان لوگوں کیلئے بڑا سبق ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی ناراضگی سے ہمیں اللہ کے رسول بچا لیں گے۔ اس لئے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ آپ کی شفاعت میسر آ جائے اللہ کی رضا نہ بھی حاصل ہو تو جب بھی شفاعت کی وجہ سے ہم نجات پا جائیں گے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر اللہ کی رضا میسر نہیں ہوگی تو اللہ کے رسول کی رضا اور اس کی شفاعت بھی میسر نہیں ہوگی کیونکہ رسول اپنے رب کی رضا کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتا۔

Marfat.com

اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ یُّحَادِدِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْیُ الْعَظِیْمُ ○

کیا وہ نہیں جانتے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا اس کیلئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا یہ بہت بڑی رسوائی ہے۔(۶۳) ﴿التوبة : ۶۳﴾

منافقین کے اصل ارادے:

محادة کے معنی ہیں کسی کے مقابلہ میں اپنا الگ محاذ قائم کر لینا اور کسی کے مقابلے میں دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہونا۔ اس آیت کریمہ میں منافقین کے مخفی ارادوں کو بھی ظاہر فرما دیا گیا ہے کہ بظاہر وہ اپنے بارے میں مسلمانوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور اپنے اخلاص کو ثابت کرنے کیلئے مسلمانوں کے سامنے جو جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں اس سے مقصد صرف غلط فہمیوں کا دور کرنا نہیں بلکہ اس کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کے خلاف جو اپنا ایک گروہ بنا رکھا ہے اس کو مزید مستحکم کرنے اور اپنے ناپاک ارادوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملتا رہے۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ ان کے سامنے اسلامی انقلاب کی مدینہ میں نو سالہ تاریخ ہے اور ان نو سالوں میں ان کے سامنے قرآن کریم اترا ہے آنحضرت ﷺ کی وعظ و نصیحت سے وہ ہمیشہ بہرہ ور ہوتے رہے ہیں تو کیا انہیں آج تک یہ خبر نہیں ہوئی کہ جو گروہ یا جو شخص بھی اللہ اور رسول کے خلاف محاذ قائم کرتا ہے اسے بالآخر جہنم کی آگ میں جلنا ہوگا اور یہ بہت بڑی رسوائی ہے جس کا اندازہ دنیا میں رہ کر تو ممکن نہیں بجز اس کے کہ ایمان کے نور سے دیکھا جائے۔ البتہ! اس رسوائی کو بڑی رسوائی قرار دینے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس میں شاید اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ایسے لوگ آخرت میں تو بڑی رسوائی سے دوچار ہوں گے ہی دنیا میں بھی ان کے لئے رسوائی مقدر ہے۔ منافقین اپنی حالت پر ہی غور کر کے دیکھ لیں کہ ان میں سوائے ایک آدھ شخص کے اکثریت مالدار لوگوں کی ہے۔ لیکن آج مدینہ میں ان کے نفاق یا نفاق کی تہمت کی وجہ سے مدینہ میں ان کی کوئی عزت نہیں۔ ہر کوئی ان سے پہلو تہی کرتا ہے اور بے اعتباری کی نگاہ سے دیکھتا ہے ان کے ابو عامر راہب جیسے لوگ دن کی روشنی میں مدینہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ ان کے چھوٹے بڑے اسلام کی آغوش میں آ چکے ہیں ان کی نگاہوں کی ان میں کوئی عزت نہیں۔ کل تک ان کی بات سنی جاتی تھی آج انہیں کوئی اہمیت دینے کیلئے تیار نہیں۔ یہ چھوٹی رسوائی ہے جسے وہ دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن بڑی رسوائی قیامت کو دیکھیں گے۔

یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَیْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ○ ﴿التوبة : ۶۴﴾

منافقین ڈرتے ہیں کہ کہیں نازل نہ کر دی جائے اہل ایمان پر کوئی ایسی صورت جو ان کو ان کے دلوں کے بھیدوں سے آگاہ کر دے۔ کہہ دیجئے! مذاق اڑا لو اللہ ظاہر کر کے رہے گا جس سے تم خوف زدہ ہو۔(۶۴)

اپنے کرتوتوں سے خوفزدہ:

یہ عجیب بات ہے کہ منافقین اللہ کے رسول کی رسالت پر پوری طرح یکسو نہیں تھے انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں اس بات کا احساس ضرور تھا کہ بعض دفعہ ایسی باتیں آنحضرت ﷺ پر نازل کی جاتی ہیں جن کے جاننے کا وحی الٰہی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ آنحضرت کی رسالت پر یکسو نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی نجی مجلسوں میں حضور کے بارے میں تمسخر اور دریدہ دہنی سے باز نہیں آتے تھے لیکن انہی میں ایسے لوگ بھی تھے جو ڈرتے تھے کہ ان باتوں کی آپ کو اللہ کی طرف سے اطلاع نہ دے دی جائے۔ لیکن ساتھ ساتھ مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کیلئے انہوں نے قسموں کی ایک مہم چلا رکھی تھی۔ جب بھی کوئی بات ہوتی حلفاً یقین دلاتے کہ ایسی کوئی بات نہیں محض آپ کو غلط اطلاع دی گئی ہے یا اس کا مقصد وہ نہیں جو آپ سمجھے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں پروردگار فرما رہا ہے کہ یہ امر واقعہ ہے کہ تم اپنی نجی مجلسوں میں پیغمبر اور اسلام کے بارے میں تمسخر آمیز رویہ

Marfat.com

رکھتے ہو۔ مذاق اڑاتے ہو اور فقرے بازیاں کرتے ہو۔ اب تک تو ہم نے اسے نظرانداز کیا اور آنحضرت ﷺ نے بھی عفو و درگزر سے کام لیا لیکن اب اللہ تعالیٰ وہ سب کچھ ظاہر کرنے والا ہے جس کے ظاہر ہونے سے تم خوف زدہ ہو۔ اس کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے آنحضرت ﷺ کو منافقین کے نام بتائے گئے، الہام کے ذریعے ان کی علامتیں بیان فرمائی گئیں اور اس سورت میں بھی ان کی بہت ساری نشانیوں کو بیان فرمایا گیا۔ کفار اور مشرکین کے بارے میں جس طرح یہ سورت خاتمہ بحث کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح منافقین کے بارے میں بھی یہ سورۃ فیصلہ کن حیثیت کی مالک ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ ؕ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

اگر آپ ان سے پوچھیں تو جواب دیں گے کہ ہم تو صرف دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ کہہ دیجئے! کیا تم اللہ اس کی آیات اور اس کے رسول کے ساتھ ہنسی مسخری کر رہے تھے؟ (٦٥) ﴿التوبة : ٦٥﴾

"نخوض" خوض سے ہے جس کا اصل معنی تو ہے "دریا میں اتر جانا" یعنی پانی میں گھس جانا۔ لیکن جب اس کا تعلق گفتگو سے ہو تو پھر اس کا معنی ہوتا ہے بات سے بات نکالتے چلے جانا اور بات کا بتنگڑ بنا دینا۔ معلوم ہوتا ہے منافقین اپنی نجی مجلسوں میں اللہ کی ذات، رسول اللہ ﷺ کی ذات اور قرآنِ کریم اور آپ کی شریعت کو موضوعِ گفتگو بنائے رکھتے تھے۔ کوئی نیا حکم نازل ہوتا آنحضرت کوئی ہدایت جاری فرماتے یا اسلام کے حوالے سے کوئی بات زیرِ بحث ہوتی یہ اسے موضوع بنا کر بات سے بات نکالتے چلے جاتے۔ کوئی کسی پہلو سے مذاق اڑاتا کوئی کسی پہلو سے بات بناتا۔ اللہ کی ذات، اس کا رسول اور اس کا دین، ان کے لئے مذاق بن کے رہ گئے تھے اور جب کوئی ایسی بات آنحضرت ﷺ تک پہنچتی اور آپ ان سے جواب طلبی کرتے تو وہ جواب میں کہتے کہ ہم تو محض دل لگی اور خوش طبعی کر رہے تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کی اسی بات کو پکڑ لیا کہ بدبختو! کیا تم اللہ اور اس کے رسول اور اس کی آیات سے مسخریاں کرتے ہو؟ یعنی وہ جگہ جو دم بخود ہونے کی جگہ ہے جن کے سامنے سانس بھی آہستہ لیا جاتا ہے تم نے انہیں مذاق کا موضوع بنا رکھا ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے بدقماش اور کمینے لوگ اپنی ماں اور بہنوں کو اپنے تمسخر کا موضوع بنا لیا کرتے ہیں۔

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ ؕ اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةًۢ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝

اب بہانے مت بناؤ تم نے ایمان کے بعد کفر کیا ہے اگر ہم درگزر بھی کریں تم میں سے ایک گروہ سے تو دوسرے گروہ کو ضرور سزا دیں گے کیونکہ وہی اصلی مجرم تھے۔ (٦٦) ﴿التوبة : ٦٦﴾

گزشتہ آیتِ کریمہ میں بتایا گیا تھا کہ اگر آپ ان سے ان کی حرکتوں کے بارے میں پوچھیں تو وہ مختلف حیلے بہانے کرنے لگتے اور سخن سازی سے کام لیتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں صاف صاف فرمایا کہ اب تم بہانوں سے کام مت لو اور اپنی باتوں کی تاویل مت کرو۔ تم نے اللہ اور اسکے رسول اور اس کی آیات سے تمسخر کر کے کفر کا ارتکاب کیا ہے۔ تم اگر اس سے پہلے ایمان کا دعویٰ کرتے رہے ہو تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ تمہارے اعمال تمہارے ایمان کی دلیل ہوتے۔ لیکن اس کے برعکس تمہارا ایک ایک عمل اور تمہاری حرکتیں کفر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس طرح سے تمہارا شمار اب مسلمانوں میں نہیں کافروں میں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ منافقین میں کئی ٹولیاں تھیں اور سب کے جرائم یکساں نہیں تھے۔ بعض تو ان حرکتوں کے سرغنہ تھے اور بعض خاموش تماشائی اور بعض محض تائید کرنے والے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تم اگر اپنی حرکتوں کی معافیاں بھی مانگو تو جس گروہ نے محض خاموشی سے کام لیا یا محض سر ہلاتا رہا تو ممکن ہے کہ ہم اس کے جرم سے درگزر کریں لیکن تمہاری وہ ٹولیاں جو ان جرائم میں پیش پیش رہیں اور جنہوں نے پوری طرح نفاق کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ ان سے یہ جرائم سرزد نہیں ہوئے بلکہ وہ عادی مجرم ہیں۔ انہیں ہم ضرور سزا دیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ بہت سارے جرائم کو معاف فرما دیتے ہیں۔ لیکن اللہ اور اس کا رسول اور اس کی آیات کا تمسخر اڑانا اور پھر اس کو وطیرہ بنا لینا یہ وہ جرم ہے جو قابلِ معافی نہیں۔

Marfat.com

الْمُنٰفِقُوْنَ وَ
الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ط نَسُوا اللّٰهَ
فَنَسِيَهُمْ ط اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٦٧﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ
وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط هِيَ حَسْبُهُمْ ج
وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ج وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿٦٨﴾ لا كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ط فَاسْتَمْتَعُوْا
بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ط اُولٰٓئِكَ
حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ج وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ
وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ لا وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ
وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ط اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ج فَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَالْمُؤْمِنُوْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

Marfat.com

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ
طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٧٢﴾ ع

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں یہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں انہوں نے اللہ کو بلا دیا ہے تو اللہ نے بھی ان کو فراموش کر دیا ہے۔ بیشک منافق ہی نافرمان ہیں۔ اللہ نے منافق مردوں، منافق عورتوں اور کفار سے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہی ان کیلئے کافی ہے اور ان پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کیلئے دائمی عذاب ہے۔ ان لوگوں کی مانند جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں وہ زیادہ تھے تم سے قوت و شوکت اور مال و اولاد کی کثرت میں تو انہوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھالیا۔ اسی طرح جیسے فائدہ اٹھایا انہوں نے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اپنے حصہ سے اور تم نے بھی اسی طرح بکواس کی جس طرح انہوں نے کی، یہی وہ لوگ ہیں ضائع ہو گئے جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اور یہی لوگ ہیں نامراد ہونے والے۔ کیا نہیں آئی ان کے پاس ان لوگوں کی خبر جو ان سے پہلے گزرے (یعنی) قوم نوح، عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم و اہلِ مدین اور الٹی ہوئی بستیاں آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر تو اللہ ان کے اوپر ظلم کرنے والا نہیں بنا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں یہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحم فرمائے گا، بیشک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ نے وعدہ فرمایا ہے ایسے باغات کا جن کے نیچے ندیاں رواں ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ مکانات کا ابد کے باغوں میں اور اللہ کی خوشنودی ان سب سے بڑھ کر ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔ (۶۷ تا ۷۲) (رکوع: ۹)

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ
نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ

Marfat.com

فِيهَا ۚ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۝ كَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا فَاسْتَمْتَعُوا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُم بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُم بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَالَّذِي خَاضُوا ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں یہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں انہوں نے اللہ کو بھلا دیا ہے تو اللہ نے بھی ان کو فراموش کر دیا ہے بیشک منافق ہی نافرمان ہیں۔(٦٧) اللہ نے منافق مردوں، منافق عورتوں اور کفار سے جہنم کی آگ کا وعدہ کر رکھا ہے، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے یہی ان کے لئے کافی ہے اور ان پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے لئے دائمی عذاب ہے۔(٦٨) ان لوگوں کی مانند جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں وہ زیادہ تھے تم سے قوت و شوکت اور مال و اولاد کی کثرت میں تو انہوں نے اپنے حصہ سے فائدہ اٹھایا اور تم نے بھی اپنے حصہ سے فائدہ اٹھالیا اسی طرح جیسے فائدہ اٹھایا انہوں نے جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں اپنے حصہ سے اور تم نے بھی اسی طرح بکواس کی جس طرح انہوں نے کی، یہی وہ لوگ ہیں ضائع ہو گئے جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اور یہی لوگ ہیں نامراد ہونے والے۔(٦٩) ﴿التوبة: ٦٧ تا ٦٩﴾

منافقین کا تعارف:

سابقہ آیات میں پروردگار نے یہ اشارہ فرمایا تھا کہ منافقین کے طور اطوار اور احوال و ظروف پر جواب تک اخفا کا پردہ پڑا ہوا ہے پروردگار عنقریب اس کا افشا فرمانے والے ہیں اور یہ بھی اشارہ فرمایا تھا کہ منافقین اپنے طرز عمل سے کفر کا راستہ اختیار کر چکے ہیں اس لئے اب ان کا شمار مسلمانوں میں نہیں بلکہ کافروں میں ہونا چاہئے۔ منافقین کی ہر چند کوشش یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو مسلمانوں میں اس طرح گھلا ملا کر رکھیں کہ کوئی بھی ان کا شمار مسلمانوں سے باہر نہ کر سکے اور اگر کبھی مسلمانوں کو شکایت پیدا ہو تو قسموں کی آڑ لے کر انہیں مطمئن کر دیا جائے۔ لیکن پروردگار نے اس سورۃ میں جس طرح مشرکین اور اہلِ کتاب کو الگ کر کے رکھ دیا اور مسلمانوں کو ان سے ایک الگ امت کی حیثیت دے کر انفرادیت کا احساس بھی بخشا اسی طرح اب منافقین کو بھی مسلمانوں سے الگ کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو آگاہی دی جا رہی ہے کہ تمہاری انفرادیت کی حفاظت اسی صورت میں ممکن ہے کہ تم ان آستین کے سانپوں کو اچھی طرح پہچانو اور انہیں اپنی صفوں سے نکال باہر کرو۔ پیشِ نظر آیات میں منافقین کی علامتیں کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ منافق کا طرزِ زندگی اس کے سوچنے کا انداز اور اس کی زندگی کے اہداف بالکل مسلمانوں سے جدا ہیں۔ اس لئے اب انہیں مزید مسلمانوں کے اندر برداشت کرنا امتِ مسلمہ کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

منافقین کی علامتوں کو دیکھنے سے پہلے ایک اور چیز قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں منافقات کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا گیا ہے حالانکہ قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب وہ مردوں کا ذکر کر دیتا ہے تو ان کی تبعیت میں عورتوں کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے۔ ہاں! عورتوں کے خصوصی مسائل میں عورتوں کا الگ ذکر کیا جاتا ہے ورنہ وہ احکام اور اخبار میں مردوں کے ساتھ شریک سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں صراحت کے ساتھ المنافقون کے ساتھ المنافقات کا ذکر بھی فرمایا گیا ہے۔ کہنا شاید یہ مقصود ہے کہ منافق عورتوں کو بھی یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ الگ سے اپنی مستقل ذمہ داری رکھتی ہیں۔ تبعیت اور ماتحتی دین میں کوئی عذر نہیں سمجھی جاتیں۔ اپنی نجات کیلئے ہر ایک کو اپنے طور سے جدوجہد کرنا ناگزیر ہے اور مزید یہ بات بھی ہے کہ نفاق چونکہ مفادات کا ایک کھیل ہے جو زیادہ تر اپنی دنیا کی بقاء اور مفادات کے حصول کیلئے اختیار کیا جاتا ہے اور اس مرض میں جس طرح مرد مبتلا ہوتے ہیں اس سے بڑھ کر عورتیں مبتلا ہوتی ہیں بلکہ مردوں کو صحیح فیصلہ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ بیوی بچے انسان کو بخیل اور بزدل بنا دیتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی بڑا اقدام کرنا مرد کیلئے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے منافقات کا مستقل ذکر فرمایا گیا ہے تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں۔

Marfat.com

علامتیں:

اب ہم منافقین کی علامتیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ا:۔) سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ منافق مرد ہوں یا منافق عورتیں سب ایک جیسے ہیں۔ان کی سوچ، ان کے ارادوں اور ان کے اہداف میں کوئی فرق نہیں۔سب مفادات کے بندے اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ایک دوسرے سے جسمانی ہی نہیں قلبی رشتوں میں منسلک ہیں۔ان میں سے کسی گروہ کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لینے کی کوئی وجہ نہیں۔

۲:۔) وہ برائی کا حکم دیتے اور نیکی سے روکتے ہیں۔اس لحاظ سے وہ مسلمانوں کے بالکل برعکس ہیں۔مسلمانوں کو جو مقصدِ وجود دیا گیا ہے وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔دنیا میں ان کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ معروف کو فروغ دیں بلکہ اس کو عزت و حرمت بخشیں اس کا مرتبہ بلند کریں اور برائی کا سر کچل ڈالیں۔لیکن یہ منافق اس کے بالکل برعکس ہر معروف کے دشمن اور ہر منکر کے حمایتی ہیں۔ہر برائی کی ترویج و اشاعت ان کا مقصد ہے۔کہیں سے نیکی کی کوئی کرن پھوٹتی دکھائی دے تو ان کی آنکھیں اس سے چندھیا جاتی ہیں۔برائی انہیں پسند ہے چاہے اس کی شکل و صورت کوئی بھی ہو۔لوگوں میں بے حیائی پھیلے، مالی ناہمواریاں بڑھیں، معاملات میں الجھنیں پیدا ہوں، ملکی نظام تہ و بالا ہو جائے غربت بڑھتی جائے، طبقات میں اضافہ ہوتا جائے، یہ سب باتیں ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔لیکن اگر کہیں انہیں خیر کی بالادستی نظر آئے تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک ناقابلِ برداشت بات ہو گئی ہو۔

۳:۔) وہ ہر خیر کے کام میں دستِ تعاون بڑھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں یعنی بخل ان کا شیوہ ہے۔دوسرے کی ضرورتوں کیلئے ایک پائی دینا بھی انہیں گوارا نہیں۔البتہ! برائی کے کاموں میں دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔برائی کا فروغ چونکہ ان کے مقاصد میں شامل ہے اس لئے اس کیلئے خرچ کرنا بھی انہیں اچھا لگتا ہے۔بخل حبِ دنیا کو جنم بھی دیتا ہے اور حبِ دنیا کا نتیجہ بھی ہے۔اس لحاظ سے منافق دنیا کی دولت کیلئے جان دینے والے اور اسی کیلئے جان کھپانے والے ہوتے ہیں۔

۴:۔) ان کی یہ تمام عاداتِ بد اس بات کا نتیجہ ہیں کہ وہ اللہ کو بھول چکے ہیں۔انہیں اللہ کے سامنے جواب دہی کا کوئی اندیشہ نہیں۔وہ اپنے اعمال کے بارے میں ہر طرح کی باز پرس سے بے نیاز ہیں۔اس لئے کبھی وہ بھول کر بھی یہ بات نہیں سوچتے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے یا نہیں۔ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ بھی انہیں بھول چکا ہے۔یعنی اللہ نے انہیں بھلا دیا اور نظر انداز کر دیا ہے۔اللہ تو دنیا کی کسی چیز کو نہیں بھولتا مقصود اس سے نظر انداز کرنا ہے اور اللہ جب کسی کو نظر انداز کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسے کھلا چھوڑ دیتا ہے بلکہ اس کی نامرادی اور بدنصیبی پوری طرح رنگ لاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک شیطان ایسے شخص پر مسلط کر دیا جاتا ہے جو ہر وقت اسے برائی کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

ومن یعش عن ذکر الرحمن نقیض لہ شیطاناً فھو لہ قرینٌ

جو شخص رحمٰن کے ذکر سے اعراض کرتا ہے یعنی اس کی یاد بھلا دیتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پس وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے۔

اگر یہ شخص کبھی صحیح راہ پر آنا چاہے بھی تو وہ شیطان اسے آنے نہیں دیتا۔اس طرح سے اللہ کی توفیق سے یہ شخص مستقلاً محروم ہو جاتا ہے اور پوری طرح شیطان کے نرغے میں آ جاتا ہے۔

یہ ان کی اللہ کی توفیق سے محرومی کے بارے میں ممکن ہے کوئی یہ خیال کرے کہ یہ تو ان پر شاید ظلم اور زیادتی ہے جو اللہ کی طرف سے روا رکھی گئی ہے۔اس کا جواب آیت کے آخری حصے میں دیا گیا ہے کہ یہ ان کے ساتھ زیادتی نہیں بلکہ ان کی بدعہدی اور ان کے فسق و فجور کی سزا ہے۔انہوں نے اسلام کے نام سے اللہ سے سمع و اطاعت کا عہد باندھا اور پھر اسے توڑ ڈالا۔اسلام کا کلمہ پڑھ کر مسلمانوں سے مراعات حاصل کیں لیکن جب بس چلا اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔ان کے اس رویے کی یہ سزا ہے کہ انہیں توفیقِ خداوندی سے محروم کر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

اب تک جو کچھ بیان ہوا یہ تو ان کی دنیوی سزا ہے۔ لیکن اگلی آیتِ کریمہ میں آخرت میں جو انجام ان کا ہونے والا ہے اسے بیان فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے منافقین، منافقات اور کفار سے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے۔ وعدے کا لفظ شاید اس لئے استعمال فرمایا گیا ہے کہ وعدہ پورا کرنا ضروری ہے ایفائے عہد کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے بلکہ ان کی علامت بتایا گیا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ایفائے عہد نہ فرمائے؟ اس لئے قرآنِ کریم نے کئی جگہ فرمایا گیا ہے اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور کہیں فرمایا کہ اللہ سے بڑھ کر بات میں سچا کون ہے؟ یہاں بھی وعدہ کا لفظ بول کر یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ مت سمجھنا کہ آخرت میں شاید تمہارے ساتھ کوئی نرمی برتی جائے گی، ہرگز نہیں تمہیں جہنم کی آگ میں پھینکنے کا جو وعدہ فرمایا گیا ہے ٹھیک ٹھیک اس پر عمل ہوگا۔ هی حسبهم سے ایک اور بات کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے جن بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور اسلام اور مسلمانوں کو جو زخم لگائے ہیں ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ انہیں بڑی بڑی سزائیں دی جاتیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ تمام سزاؤں سے بڑی سزا جہنم ہے اور وہ ان کی تباہی و بربادی اور ان کی ایذا رسانی کیلئے کافی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ اللہ نے ان پر لعنت فرمائی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی ان کے ساتھ رحمت کا سلوک نہیں ہوگا۔ اس لئے ان کا عذاب ایک دائمی عذاب ہے جس سے ان کو کبھی رہائی نصیب نہیں ہوگی۔

منافقین کو دھمکی:

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ خبر ہے اور اس کا مبتدا ﴿انتم﴾ محذوف ہے۔ تقدیرِ کلام اس طرح ہے انتم كالذين من قبلكم اس سے پہلے منافقین کا تذکرہ غائب کے صیغوں سے کیا جا رہا تھا اب براہِ راست ان سے خطاب فرمایا جا رہا ہے۔ جس سے کلام میں تیزی پیدا ہوگئی ہے اور کلام نے دھمکی کی شکل اختیار کر لی ہے اور ساتھ ہی منافقین کی ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ فرمایا گیا ہے۔ انہیں غلط فہمی یہ تھی کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے مال و دولت اور کثرتِ اولاد سے نوازا ہے اگر ہمارا رویہ اللہ کی نگاہ میں مبغوض ہوتا تو ہمیں ان نوازشات کا مورد نہ بنایا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری روش صحیح ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ تم صفحۂ ہستی پر نمودار ہونے والی پہلی قوم نہیں ہو تم سے پہلے بھی ایسے لوگ گزر چکے ہیں جو قوت و شوکت اور مال و اولاد کی کثرت میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ انہیں ہم نے بڑی مضبوط حکومتوں سے نوازا تھا تم تو ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہو لیکن انہیں بھی یہ غلط فہمی تھی کہ ان کی خوشحالی اور فارغ البالی شاید ان کے ہدایت یافتہ ہونے کی دلیل ہے۔ اللہ کے نبی ان کی طرف آئے لیکن انہوں نے ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ اس کا کیا ہوا کہ آج ان کا تذکرہ بھی بطورِ عبرت کیا جاتا ہے۔ انہوں نے بھی اس دنیا سے جتنا فائدہ اٹھانا ان کا مقدر تھا اٹھایا اور بالآخر ہلاک کر دیئے گئے۔ تم بھی اپنے حصے کا فائدہ اس دنیا سے اٹھا چکے ہو اور جس طرح کی لن ترانیاں وہ کرتے تھے اور جس طرح کی موشگافیوں میں وہ الجھے رہتے تھے تمہاری دلچسپیاں بھی ایسی ہی باتوں میں ہیں۔ تو یاد رکھو! جس طرح ان کے مال و دولت نے انہیں سہارا نہ دیا اور ان کی عزت و شوکت ان کے کام نہ آئی اسی طرح تمہیں بھی کوئی نہ بچا سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے مال و دولت پر نہیں ایمان و عمل پر ہوتے ہیں، جس سے تم نے اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

اَلَمْ يَأْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ ﴿التوبة : ٧٠﴾

کیا نہیں آئی ان کے پاس ان لوگوں کی خبر جو ان سے پہلے گزرے (یعنی) قومِ نوح، عاد اور ثمود اور قومِ ابراہیم اور اہلِ مدین اور الٹی ہوئی بستیاں آئے ان کے پاس ان کے رسول روشن دلیلیں لے کر تو اللہ ان کے اوپر ظلم کرنے والا نہیں بنا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے تھے۔ (۷۰)

كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے جن قوموں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اب ان قوموں کا نام لے کر تنبیہ فرمائی جارہی ہے اور یہ وہ قومیں ہیں جن کی سرگزشتیں سورۃ اعراف میں گزر چکی ہیں۔ان میں قومِ ابراہیم سے مراد وہ قوم ہے جس کو انہوں نے توحید کی دعوت دی پھر ان سے مایوس ہو کر انہوں نے ہجرت فرمائی۔مُؤْتَفِكَاتْ سے مراد قومِ لوط کی بستیاں ہیں۔انہیں مُؤْتَفِكَاتْ اس لئے کہا گیا کیونکہ ان بستیوں کو الٹ دیا گیا تھا۔ان کے پاس اللہ کے رسول آئے ہر ممکن طریقے سے انہیں سمجھایا لیکن جب وہ راہِ راست پر نہ آئے تو آخر اللہ کے عذاب نے انہیں آ پکڑا۔انہوں نے اللہ اور اس کے دین کے مقابلے میں جو روش اختیار کی وہ سراسر ان کا اپنے اوپر ظلم تھا کہ انہیں اللہ نے بندہ بنایا تھا تا کہ وہ اللہ کی بندگی کریں انہوں نے بندگی کی بجائے سرکشی اختیار کی۔ان کے دل اللہ کے ذکر سے آباد رہنے کیلئے بنائے گئے تھے۔لیکن اس میں انہوں نے شیطان کو آباد کیا اور ہوائے نفس کو اپنا راہنما بنایا۔ان کے سر اللہ کے سامنے جھکنے کیلئے تھے،انہوں نے انہیں اللہ کے سوا اور ہر آستانے پر جھکایا۔اس طرح قدم قدم پر انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔یعنی اپنی ذات سے اور دل و دماغ سے وہ کام لیا جس کے لئے انہیں بنایا نہیں گیا تھا۔اس کی سزا یہ ملی کہ انہیں زمین کا رزق بنا دیا گیا اور اللہ کی لعنت اور پھٹکار ان پر پڑی۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ٥

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں یہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔یہی لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحم فرمائے گا،بے شک اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔(۷۱) ﴿التوبة : ۷۱﴾

قرآنِ کریم کا اسلوب:

قرآنِ کریم کا اسلوب یہ ہے کہ متضاد کرداروں،متضاد خصائل،متضاد آثار اور متضاد اشیاء کو آگے پیچھے بیان کرتا ہے تا کہ پہچان اور شناخت میں آسانی ہو۔اجالا اس وقت تک مکمل طور پر ذہنی افق پر روشن نہیں ہوتا جب تک اندھیرے کا وجود سامنے نہیں آتا۔راحت کی قدر اس وقت ہوتی ہے جب تکلیف دامن گیر ہوتی ہے۔﴿تعرف الاشياء باضدادها "تعارف کا فطری اصول ہے یعنی ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے"﴾ قرآنِ کریم نے بھی حق اور باطل، اچھائی اور برائی،نیکی اور بدی،ظلم اور رحم اور ان سے بننے والے کرداروں کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے تا کہ مطلوبہ تعارف میں کوئی اخفا باقی نہ رہے۔یہاں بھی منافقین کو پہلے ذکر فرمایا گیا ہے تا کہ سلسلۂ کلام مربوط رہے اور مومنین کا ذکر اب کیا جارہا ہے تا کہ دونوں گروہ اور دونوں کردار واضح طور پر سامنے آجائیں۔

دو نمایاں باتیں:

اس رکوع کو پڑھتے ہوئے جو بات سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نفاق،کفر یا ایمان محض عنوان نہیں ہیں اور نہ محض شناخت کا ذریعہ بلکہ اس کی حقیقی علامت وہ عادات وخصائل اور زاویہ نگاہ ہے جو ان دونوں کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔منافق ایک خاص طرح کے کردار کا نام ہے اور مومن بھی اپنا ایک مخصوص اسلوب رکھتا ہے۔جس میں فکر عمل اور اس کے آثار سب کچھ شامل ہے۔یہ دونوں طرح کے متضاد خصائل واعمال جہاں بھی ہوں گے ان کے حامل کو وہی نام دیا جائے گا۔قطع نظر اس سے کہ وہ خود اپنا کیا نام رکھتا ہے۔مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ پیدائشی طور پر مسلمان بھی ہو لیکن اپنی سوچ اور اپنے عمل کے اعتبار سے کافر اور منافق سے مناسبت رکھتا ہو تو اسے مومن یا مسلم نہیں کہا جاسکتا۔اس لئے اس رکوع میں دونوں کرداروں کو اعمال وخصائل کے اعتبار سے ممیز کر دیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ منافق مرد ہوں یا عورتیں وہ ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں سب ایک ہی چٹے کے بٹے ہیں۔وہ اپنے اعمال سے پہچانے جاتے ہیں۔ان کی سوچ میں بھی یکسانی ہوتی ہے۔لیکن اس تمام تر ہمرنگی کے باوجود وہ اصلاً مفادات کے بندے ہوتے ہیں۔نسل یا

Marfat.com

رنگ کی یکسانی ان کو ایک دوسرے کے قریب کرتی اور قریب رکھتی ہے اور اعمال وخصائل کی یک رنگی اس میں پختگی پیدا کر دیتی ہے۔لیکن ان میں فیصلہ کن کردار نام ونسب اور نسل اور جغرافیے کا ہوتا ہے۔لیکن صاحب ایمان لوگ صرف ایمان وعمل سے پہچانے جاتے ہیں۔ان میں نہ نسل قابلِ لحاظ چیز ہوتی ہے اور نہ رنگ اور جغرافیہ۔یہ سراسر ایک نظریاتی قوت ہوتے ہیں اور اسی قوت کے بل بوتے پر زندہ رہتے ہیں اس لئے یہ صرف ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کے معاون، مددگار، ہمدرد اور غمگسار بھی ہوتے ہیں۔جب بھی ان میں ہمدردی اور غمگساری کا جذبہ اور ایمان اور عمل کی عصبیت کم پڑتی ہے تو ان کی اجتماعی عمارت میں دراڑیں آنے لگتی ہیں۔اس لئے سب سے پہلے انہیں ایک دوسرے کے اولیا قرار دیا گیا اس کے بعد ان کے بنیادی خصائل واعمال کو ذکر فرمایا گیا ہے جو منافقین کے بالکل برعکس ہیں۔

منافق اور مومن میں تقابل:

ا:۔) منافقین منکر کا حکم دیتے اور معروف سے روکتے ہیں لیکن مومنین اس کے بالکل برعکس معروف کا حکم دیتے اور منکر سے روکتے ہیں کیونکہ مومنین کا گروہ فساد فی الارض کو ختم کرنے اور انسانوں کی اصلاح کیلئے اٹھایا گیا ہے اور یہ کام اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ نیکی اور معروف کے علمبردار بنیں اسی کے پیکر ہوں اور اسی کے فروغ اور نفاذ کیلئے اپنی کوششیں صرف کر دیں۔برائی سے دور رہیں اور مسلمانوں میں برائی کو کبھی عام نہ ہونے دیں۔اس کا راستہ اسی طرح روکیں جیسے وبا کا راستہ روکا جاتا ہے۔

۲:۔) منافقین بخیل ہوتے ہیں اور اللہ کے راستے میں کبھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔لیکن مومن زکوٰۃ ادا کرتے اور اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا حق سمجھتے ہیں اور حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کے بے چین رہتے ہیں۔

۳:۔) منافق اللہ کو کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کرتے وہ پوری طرح اللہ کو بھول جانے والے لوگ ہیں لیکن مومن نماز قائم کرتے، نماز کا اہتمام کرتے اور ذکرِ الٰہی کو اپنی زندگی سمجھتے ہیں۔نماز اللہ کی یاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس لئے بطورِ خاص اقامتِ صلوٰۃ کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

۴:۔) منافق بدعہد، غدار اور نافرمان ہوتے ہیں ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ لیکن مومن عہد کے پکے، وفا کے پتلے اور اللہ اور اس کے رسول کے اطاعت گزار ہوتے ہیں۔اس لئے اس آیتِ کریمہ میں بطورِ خاص ان کی اطاعت کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ ہیں وہ اعمال وخصائل اور غور وفکر کے معیارات جو دونوں گروہوں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیتے ہیں۔اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دونوں کا انجام بھی مختلف ہے۔منافق کا انجام دنیا میں ذلت وخواری اور آخرت میں جہنم کی آگ ہے تو مومن کا انجام دنیا میں اللہ کی رحمت اور اس کی عنایت اور آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں جو کچھ عطا فرمائے گا اس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔سیرحمھم اللہ میں حرفِ سین اس رحمت کے عنقریب ظہور کی بشارت معلوم ہوتا ہے اور بعد میں حالات نے ثابت کیا کہ دنیا میں مسلمانوں کی سرافرازی اور ان کی کامرانی اسی وعدے کا ثمر تھا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ﴿التوبۃ : ۷۲﴾

مومن مردوں اور مومن عورتوں سے اللہ نے وعدہ فرمایا ہے ایسے باغات کا جن کے نیچے ندیاں رواں ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور (وعدہ کیا ہے) پاکیزہ مکانات کا ابد کے باغوں میں اور اللہ کی خوشنودی ان سب سے بڑھ کر ہے یہی تو بڑی کامیابی ہے۔(۷۲)

عدن کا مفہوم:

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے منافقین سے نارِ جہنم کا وعدہ فرمایا تھا تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ اس سزا کے نافذ ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے میں کبھی تخلف نہیں کرتا۔یہاں مومن مردوں اور مومن عورتوں سے بھی ایسی جنتوں کا وعدہ فرمایا جا رہا ہے جن کے نیچے

Marfat.com

ندیاں رواں ہوں گی اور وعدے کے لفظ سے یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے کہ یہ محض اظہارِ خوشنودی نہیں بلکہ اس پر عمل بھی یقینی ہے اور اس خوشخبری کا ایک مزید پہلو یہ ہے کہ ان باغات میں مومنوں کو صرف سیر کیلئے نہیں لے جایا جائے گا یا ان کا قیام وہاں چند روزہ نہیں ہوگا بلکہ وہاں انہیں ایسے پاکیزہ مکانات دیئے جائیں گے جن کی پاکیزگی بجائے خود فرحت افزا ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایسے باغوں میں ہوں گے جن پر کبھی فنا یا زوال کی خزاں کا ورود نہیں ہوگا کیونکہ عدن ابد اور ہمیشہ رہنے والی جگہ کو کہتے ہیں۔ جس کے فنا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ ویسے عدن جنت کے اعلیٰ درجے کا نام بھی ہے۔ جنتیں چونکہ متعدد ہیں، عدن باقی جنتوں کے وسط میں ہے اور باقی جنتیں اس کے اردگرد ہیں، اسی میں تسنیم کا چشمہ بھی ہے۔ یہ انبیائے کرام شہدا اور صدیقین کے لئے مخصوص ہے۔

رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ کا مفہوم:

اللہ نے اپنے مقبول بندوں کیلئے جنت کے نام سے آرام وراحت اور فرحت وانبساط کے ایسے باغات اور محلات تیار فرمائے ہیں جن کی مثال نہ کسی نظر نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی دل میں اس کا خیال گزرا۔ وہ بے مثال اور بے نظیر عشرت گاہیں ہر طرح کے زوال اور ہر طرح کی فنا سے محفوظ ہوں گی۔ ان کی ایک جھلک کیلئے یہ فانی زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ لیکن وہ اپنی تمام تر قدر وقیمت اور رعنائی کے باوجود اللہ کی ایک عنایت اور نعمت کے سامنے نگوں سار ہیں۔ جس کا نام رضوان من اللہ ہے۔ یہ اللہ کی ایک ایسی نعمت ہے کہ تمام جنتیں اس کی مثال لانے سے عاجز ہیں۔ اہلِ جنت یوں تو اپنے آقا و مولا کے عطا کردہ انعامات سے نہایت شاداں اور فرحاں ہوں گی کیونکہ وہ یہ سمجھیں گے کہ یہ انعامات اسی کو مل سکتے ہیں جس سے اس کا آقا راضی ہو لیکن جب اللہ کی طرف سے خوشنودی اور رضوان کا اعلان ہوگا تو کہا جاتا ہے کہ اہلِ جنت اس اعلان سے اس قدر مسرور ہوں گے کہ ایسا معلوم ہوگا کہ اس عنایت اور نعمت کے مقابلے میں جنت کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ ویسے بھی دیکھا جائے تو ایک سچے عاشق اور محب کی نگاہ میں اگرچہ محبوب کی عطایا کا بڑا مقام ہوتا ہے لیکن اس کی نگاہ ہمیشہ اپنے محبوب کی خوشنودی اور رضا پر رہتی ہے۔ جب تک اظہارِ خوشنودی نہیں ہوتا دل میں ایک پھانس سی اٹکی رہتی ہے لیکن جب محبوب مسکراہٹیں نچھاور کرتا ہوا اپنی خوشنودی سے نوازتا ہے تو محبِ صادق کو پوری کائنات مسکراتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس کے سحر میں ڈوب کر ہر چیز کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے یہاں فرمایا کہ اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے اور یہی وہ بڑی کامیابی ہے جو اہلِ ایمان کو قیامت میں نصیب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل وکرم سے اس نعمت سے نوازے، آمین۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ جَٰهِدِ ٱلْكُفَّارَ
وَٱلْمُنَٰفِقِينَ وَٱغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَىٰهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ
ٱلْمَصِيرُ ﴿٧٣﴾ يَحْلِفُونَ بِٱللَّهِ مَا قَالُوا۟ وَلَقَدْ قَالُوا۟ كَلِمَةَ
ٱلْكُفْرِ وَكَفَرُوا۟ بَعْدَ إِسْلَٰمِهِمْ وَهَمُّوا۟ بِمَا لَمْ يَنَالُوا۟ ۚ
وَمَا نَقَمُوٓا۟ إِلَّآ أَنْ أَغْنَىٰهُمُ ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥ مِن فَضْلِهِۦ ۚ
فَإِن يَتُوبُوا۟ يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۖ وَإِن يَتَوَلَّوْا۟ يُعَذِّبْهُمُ ٱللَّهُ

Marfat.com

عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ
مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ
اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ
مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ
بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾ اَلَمْ
يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ
الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ
مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿79﴾ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ
اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ
يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ
لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۸۰﴾ ع

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سخت ہو جائیے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور بہت برا ٹھکانہ ہے۔ یہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے وہ بات نہیں کہی حالانکہ وہ کفر کی بات کہہ چکے اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کا ارتکاب کر چکے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے وہ کر نہ سکے اور یہ سب کچھ بدلہ تھا اس کا کہ دولت مند کر دیا انہیں ان کے اللہ اور رسول نے

Marfat.com

اپنے فضل سے۔ سواگر یہ توبہ کرلیں تو ان کیلئے بہتر ہے اور اگر یہ اعراض کریں تو اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو۔ اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے عطا کیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور خوب نیکیاں کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ تو اللہ نے جب ان کو اپنے فضل میں سے عطا فرمایا تو وہ اس میں بخیل بن بیٹھے اور برگشتہ ہو کر منہ پھیر لیا۔ تو اس کی پاداش میں اللہ نے نفاق ان کے دلوں میں جما دیا اس دن تک جس دن وہ اللہ سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ان کے راز اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے اور اللہ تمام غیبوں کا جاننے والا ہے۔ وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور ان پر جو اپنی محنت کے سوا کچھ نہیں پاتے پھر ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں اللہ نے ان کا مذاق اڑایا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔ آپ ان کیلئے مغفرت چاہیں یا نہ چاہیں اگر آپ ان کیلئے ستر بار بھی مغفرت چاہیں گے تو بھی اللہ ان کو بخشنے والا نہیں یہ اسی وجہ سے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اللہ بدعہدوں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ (۷۳ تا ۸۰) (رکوع: ۱۰)

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿التوبة : ۷۳﴾

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سخت ہو جائیے اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور بہت برا ٹھکانہ ہے۔ (۷۳)

منافقین کے بارے میں سخت ہو جانے کا حکم:

پیش نظر آیات کے نزول تک منافقین مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے تھے۔ ان کی بعض عادتیں اور بعض اقدامات مسلمانوں کو کھٹکتے بھی تھے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی کریم النفسی اور درگزر کے باعث مسلمان ان سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھتے تھے۔ وہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں بھی حاضر ہوتے بعض دفعہ غزوات میں شرکت بھی کرتے، ان سے کسی طرح کا امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ نبی کریم ﷺ کو ان کے ساتھ جہاد کرنے اور سختی کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے اور یہ بھی اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ اب ان کا شمار مسلمانوں میں نہیں بلکہ کفار میں ہوگا کیونکہ جہاد کے حکم میں کفار اور منافقین کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح جہاد کافروں سے کرنا ضروری ہے اسی طرح ان منافقین کے ساتھ کرنا بھی ضروری ہے۔ کافر کھلم کھلا دشمن ہیں اور وہ کسی قیمت پر اسلامی دعوت کو آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دینا چاہتے بلکہ بالجبر اور بالقوۃ دعوت کا راستہ روکنے اور مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہیں۔ منافقین اعلانیہ دشمنی تو نہیں کرتے لیکن ارادے ان کے بھی کافروں سے مختلف نہیں اور مقصد میں بھی دونوں یکساں ہیں۔ وہ اگر باہر سے حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ اندر سے ان کی معاونت کرتے اور مسلمانوں کو ڈسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ آستین کا ایسا سانپ ہیں جو باہر کے دشمن سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جو معاشرہ زندگی کے واضح مقاصد رکھتا ہو جس کے سامنے واضح اہداف ہوں، اور جو صرف دنیوی ضرورتوں کی حد تک اپنے آپ کو مکلف نہ سمجھتا ہو بلکہ اس کی قومی اور بین الاقوامی ذمہ داریاں اس کی ذاتی ضرورتوں پر بھی حاوی ہوں، ایسے معاشرے میں منافقین کا وجود کسی طور پر بھی قابل برداشت نہیں ہوتا۔ اور پھر جس معاشرے کو ہر وقت اپنے دشمنوں کی طرف سے حملے کا اندیشہ رہتا ہو اس کی صفوں میں منافقین کا پایا جانا خود اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کو آگ لگانے کے مترادف ہے۔ جو قوم منافقین کو برداشت کرتی ہے۔ وہ اپنے گھر میں غداروں کو پالنے کی غلطی کرتی ہے ایسی قوم کا کوئی قلعہ بھی محفوظ نہیں ہوتا۔ گزشتہ نو سال میں پروردگار عالم اور نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے منافقین کو برداشت کیا اس کی دو وجہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ ابھی اسلام اور مسلمانوں کو ایسی قوت میسر نہ آسکی تھی جس کے باعث وہ اندر اور باہر کے دشمنوں سے بیک وقت عہدہ برآ ہو سکتے۔ اگر وہ باہر کے دشمنوں کے ساتھ ساتھ اندر بھی لڑائی شروع کر دیتے تو بے شمار مسائل پیدا ہو جاتے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلامی معاشرہ ایک دن میں تو تشکیل نہیں پا گیا اسلامی دعوت دھیرے دھیرے دلوں میں نفوذ پیدا کرتی رہی۔ اسلام کی آغوش میں آنے والے آہستہ آہستہ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ ایمان خالص

Marfat.com

ہر کسی کو ایک دن میں نصیب نہیں ہوتا بعض لوگوں کو شکوک وشبہات سے نکلنے کیلئے ایک مدت درکار ہوتی ہے چنانچہ اسلام کیلئے جہاں اپنی صفوں کی استواری اور اسلامی ریاست کے استحکام کیلئے وقت درکار تھا وہیں اسلام کے دامن میں پناہ لینے والے لوگوں کو پختہ ایمان اور ہر آلودگی سے ممرّا اخلاص نصیب ہونے کیلئے ایک مدت تک تربیت کی ضرورت تھی۔ اب جبکہ جزیرۂ عرب کی حد تک اسلام ایک فیصلہ کن قوت بن گیا اور نو سال کے عرصے میں جن میں ذرا بھی صلاحیت تھی وہ اسلام کے بارے میں یکسو ہو گئے۔ تو اب منافقین کیلئے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو اپنا رویہ بدلنے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ جس طرح کافروں سے جہاد کرتے ہو منافقین سے بھی جہاد کرو۔ لیکن ساتھ ہی دوسرے جملے میں اس کی وضاحت بھی فرمادی اور آنحضرت ﷺ کے عمل نے اس وضاحت کو ایک متعین شکل عطا فرمادی۔ وضاحت یہ ہے کہ آپ کافروں سے جہاد بالسیف کرتے ہیں یعنی ان سے جہاد کا مطلب قتال ہے لیکن منافقین سے قتال نہیں ہوگا بلکہ ان سے صرف اپنا طرزِ عمل بدلنا ہوگا۔ پہلے آپ کے طرزِ عمل میں ان کے لئے عفو ودرگزر اور چشم پوشی غالب رہتی تھی اب آپ کو ان کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا ہوگا۔ اب انہیں احساس دلانا ہوگا کہ تمہارا نفاق اب مسلمانوں میں ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ اب تمہیں مسلمانوں میں رہ کر نفاق کا زہر پھیلانے کا موقع نہیں ملے گا۔ جماعتی کاموں میں تم سے مشورہ نہیں لیا جائے گا۔ عدالتوں میں تمہاری گواہی ناقابلِ قبول ہوگی۔ اسلامی ریاست میں تمہیں کوئی منصب وعہدہ نہیں مل سکے گا۔ مسلمان اپنی محفلوں میں تمہیں منہ نہیں لگائیں گے اور تمہاری ہر منافقانہ روش کو کھلم کھلا بے نقاب کیا جائے گا اور اگر تمہارا کوئی قابلِ اعتراض کام جو مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف ہو مسلمانوں کے علم میں آیا تو تم پر علی رؤس الاشہاد مقدمہ چلایا جائے گا اور تمہیں اس پر قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ جو جہاد ہے یہ قتال کے ہم معنی نہیں بلکہ شدتِ احتساب اور داروگیر کے مفہوم میں ہے۔ قتال صرف اعلانیہ کافروں سے ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ کے طرزِ عمل نے جو اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے منافقین کے ساتھ اختیار فرمایا اسی مفہوم کی تائید فرمائی اور اسی کے مطابق آپ نے ان کے ساتھ معاملات کیئے۔

دنیا میں کافر اور منافق کے ساتھ جہاد میں فرق ضرور ہے جیسا آپ نے ابھی ملاحظہ فرمایا لیکن جہاں تک آخرت کا تعلق ہے اس میں یہ دونوں برابر ہیں۔ کافر بھی جہنم میں جائے گا اور منافق بھی جہنم رسید ہوگا۔ اسی لئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا: ﴿ماواھم جھنم "ان کا ٹھکانہ جہنم ہے"﴾ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿التوبة : ٧٤﴾

یہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے وہ بات نہیں کہی حالانکہ وہ کفر کی بات کہہ چکے اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کا ارتکاب کر چکے اور انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے وہ کر نہ سکے اور یہ سب کچھ بدلہ تھا اس کا کہ دولتمند کر دیا انہیں ان کے اللہ اور رسول نے اپنے فضل سے۔ سو اگر یہ توبہ کر لیں تو ان کے لئے بہتر ہے اور اگر یہ اعراض کریں تو اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو۔ (۷۴)

منافقین کی در پردہ زبان درازیوں اور سازشوں کا ذکر:

اب یہاں سے منافقین کے طرزِ عمل ان کی خصلتوں اور ان کے اطوار کا ذکر ہو رہا ہے۔ ان میں سے پہلی جس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ منافقین اپنی مجالس میں اللہ کا اس کی آیات کا اور اس کے رسول کا مذاق اڑانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اور جب کبھی ان سے اس کے بارے میں پوچھا جاتا تو قسمیں کھا کھا کر صاف مکر جاتے اور یہ اپنی کہی ہوئی بات کی دور دراز کار تاویلیں کرتے۔ قرآن کریم نے اگرچہ اس کی کوئی مثال نہیں دی لیکن ہمارے اہلِ تفسیر نے بعض باتوں کا ذکر کیا ہے۔ امام بغوی نے اس آیت کے شانِ نزول میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک

Marfat.com

کے موقع پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں منافقین کی بدحالی اور انجام کا ذکر فرمایا۔ حاضرین میں ایک منافق ''جلاس'' بھی موجود تھا۔ اس نے اپنی مجلس میں جا کر اہلِ مجلس کے سامنے مزاحیہ انداز میں یہ بات کہی کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ سچ ہے تو ہم گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔ پاس ہی ایک صحابی عامر بن قیس رضی اللہ عنہ موجود تھے انہوں نے اس کی یہ بات سن لی تو انہوں نے برہم ہو کر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے جو بھی فرمایا وہ بلاشبہ سچ ہے اور تم واقعی گدھوں سے بھی زیادہ بدتر ہو۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس مدینہ طیبہ پہنچے تو عامر بن قیس رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آنحضرت ﷺ نے جلاس کو بلا کر پوچھا تو صاف مکر گیا بلکہ عامر بن قیس پر الزام لگایا کہ اس نے مجھ پر تہمت باندھی ہے اور اس پر جلاس نے قسم بھی کھالی کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ تو آنحضرت ﷺ نے دونوں کو انتظار کرنے کا حکم دیا۔ یہ لوگ ابھی اس مجلس میں موجود تھے کہ آنحضرت ﷺ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور پیشِ نظر آیتِ کریمہ کا نزول ہوا اور یہ حقیقت کھول دی گئی کہ جھوٹ عامر بن قیس رضی اللہ عنہ نے نہیں بلکہ جلاس نے بولا ہے۔

جلاس نے جب یہ آیت سنی تو فوراً کھڑے ہو کر کہنے لگے یا رسول اللہ ﷺ اب میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی اور عامر بن قیس نے جو کچھ کہا وہ سچ تھا مگر اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مجھے توبہ کا حق بھی دے دیا ہے۔ میں اب اللہ سے مغفرت چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کی توبہ کو قبول کیا اور بعد میں اللہ کی توفیق سے انہوں نے اپنے حالات کی اصلاح کر لی۔

ایک اور روایت میں منافقین کی ایک اور بات کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ تبوک کے سفر میں ایک جگہ نبی کریم ﷺ کی اونٹنی گم ہو گئی۔ مسلمان اس کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ اس پر منافقوں کے ایک گروہ نے اپنی مجلس میں خوب مذاق اڑایا اور آپس میں کہا کہ یہ حضرت آسمان کی خبریں تو خوب سناتے ہیں مگر ان کو اپنی اونٹنی کی کچھ خبر نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ ان کی اسی قسم کی باتوں کو اس آیتِ کریمہ میں کلمۂ کفر کہا گیا ہے اور ان پر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ تم بظاہر اسلام کا اظہار کرتے ہو لیکن تمہاری اس طرح کی حرکتیں اسلام کے بعد کفر کا ارتکاب ہیں۔ اولاً تو تمہارا ایمان ہی بجائے خود محلِ نظر ہے لیکن اگر اسے صحیح سمجھ بھی لیا جائے تو تمہاری اس طرح کی حرکتوں اور باتوں نے تمہارے ایمان کو کفر میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس لئے اب تمہارا شمار کافروں میں ہوتا ہے مومنوں میں نہیں۔

وھموا بمالم ینالوا انہوں نے وہ کچھ کرنے کا ارادہ کیا جسے وہ کر نہ سکے۔ اس میں بھی منافقین کی بعض ایسی سازشوں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے غزوۂ تبوک کے سلسلے میں کی تھیں۔ محدثین نے اس سلسلے میں بعض واقعات بیان کیئے ہیں جن میں سے ایک واقعہ یہ ہے۔

تبوک سے واپسی پر جب مسلمانوں کا لشکر ایک ایسے مقام کے قریب پہنچا جہاں سے پہاڑوں کے درمیان راستہ گزرتا تھا تو بعض منافقین نے آپس میں طے کیا کہ رات کے وقت کسی گھاٹی میں چھپ کر بیٹھ جائیں اور جب نبی کریم ﷺ قریب سے گزریں تو انہیں قتل کر دیا جائے یا کسی کھڈ میں پھینک دیا جائے۔ چنانچہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے آپ کو اس سازش کی خبر دے دی۔ آپ نے تمام اہلِ لشکر کو حکم دیا کہ وہ وادی کے راستہ سے نکل جائیں لیکن آپ خود صرف عمار بن یاسر اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو ساتھ لے کر گھاٹی کے اندر سے ہو کر چلے۔ اثنائے راہ میں یکا یک معلوم ہوا کہ دس بارہ منافق ڈھاٹے باندھے ہوئے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ان کی طرف لپکے تا کہ ان کے اونٹوں کو مار مار کر ان کے منہ پھیر دیں مگر منافقین دور سے ہی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو آتے دیکھ کر ڈر گئے اور اس خوف سے کہیں ہم پہچان نہ لئے جائیں فوراً بھاگ نکلے۔

دوسری ایک اور سازش کا ذکر محدثین نے کیا ہے کہ منافقین کو گمان یہ تھا کہ مسلمان ایک سپر پاور کے مقابلے میں نکلے ہیں اور وہ اتنی بڑی قوت ہے جس سے مسلمانوں کا بچ کر واپس آنا خواب و خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا چنانچہ جیسے ہی تبوک سے مسلمانوں کی شکست کی خبر پہنچے تو ہمیں عبداللہ بن ابی کو تاج پہنا کر اس کی حکومت کا اعلان کر دینا چاہئے۔ لیکن ان کی بدنصیبی یہ ہوئی کہ قیصر کو جب یہ معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ بنفسِ نفیس ایک لشکرِ جرار کی کمان کرتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں تو اس نے سرحدوں سے اپنی فوجیں پیچھے ہٹانے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے جنگ کے بغیر ہی مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی اور آنحضرت ﷺ اللہ کے فضل و کرم سے بخیریت تمام مدینہ طیبہ تشریف لے آئے تو منافقین کے ارادوں پر اوس پڑ گئی۔

Marfat.com

ان کی اسلام دشمنی کا سبب:

وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ آیتِ کریمہ کے اس حصے میں پروردگار نے ان کی طبیعت کی خست، کم ظرفی اور کمینگی کی طرف اشارہ فرمایا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے مدینہ عام قصبات کی طرح ایک قصبہ تھا۔ اس کے رہنے والے غریب لوگ تھے کیونکہ اوس وخزرج کاروبار پر کم، زراعت پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ اپنی زمینوں میں کاشت کرتے اور اسی سے روٹی پیدا کرتے ۔لیکن یہ کاشتکاری اتنی وسیع نہ تھی جو انہیں خوشحالی دے سکتی۔ اس پر بھی مزید ستم یہ کہ یہود ان کے ہمسائے میں تھے اور ان کے ان سے حلیفانہ تعلقات تھے اور خود آپس میں دونوں قبیلوں میں لڑائیاں جاری رہتی تھیں اور یہود اس سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ عموماً ان میں غلط فہمیاں پیدا کر کے لڑائی چھیڑ دیتے اور پھر دونوں قبیلوں میں سے ہر قبیلے کا حلیف یہودی قبیلہ جنگی اخراجات کیلئے انہیں قرض مہیا کرتا اور اس طرح انہیں آہستہ آہستہ قرض اور سود کی زنجیروں میں جکڑتا جاتا۔ یہ صورتحال اوس وخزرج کے مالی معاملات کو اور بھی تلپٹ کر دیتی۔ حضور ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے اور انصار نے نصرت وتائید کا حق ادا کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کی سرفروشیوں کے نتیجے میں اسلام اور مسلمانوں کو عرب کی سب سے بڑی قوت بنا دیا۔ وہ مدینہ جو ایک معمولی قصبہ تھا اب وہ اس بڑھتی ہوئی قوت کا دارالخلافہ تھا اور اوس وخزرج کے معمولی کاشتکار اس سلطنت کے اعیان واکابر تھے۔ اب ہر طرف سے فتوحات، غنائم اور تجارت کی برکات اس مرکزی شہر پر بارش کی طرح برسنے لگیں اور مسلمانوں کو ان میں سے حصہ ملنے لگا۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے چونکہ ہوسِ زر اور بخل سے دور رکھا ہے، اس لئے وہ اسلامی ریاست سے جتنا وصول کرتے اس سے زیادہ بوقتِ ضرورت ایثار بھی کرتے۔ لیکن منافقین مختلف طریقوں سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ آنحضرت ﷺ بھی ایمان میں ان کی کمزوریوں کو محسوس فرماتے ہوئے ان پر احسان کرتے تاکہ یہ اسلام کے بارے میں یکسو ہو جائیں اور پھر جو کچھ انہیں آنحضرت سے ملتا اسے اپنی بخل کی چادر میں چھپا کر رکھتے۔ حتی الامکان اسلام کیلئے ایک پھوٹی کوڑی بھی خرچ کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان کی یہ خوشحالیاں تمام تر اللہ اور اس کے رسول کے احسان کی وجہ سے ہیں۔ اس کا صلہ تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اللہ کے شکر گزار بنیں اور اللہ کے راستے میں سرفروشی اور جاں سپاری کو اپنا شعار بنائیں لیکن اس کے برعکس انہوں نے ہر قدم پر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور ہر موقع پر خست کا ثبوت دیا۔

ان کے یہ طور اطوار اور یہ عادات وخصائل اس بات کی علامت ہیں کہ وہ قبولیتِ حق کی اہلیت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن پروردگار چونکہ حتی الامکان کسی کو مایوس نہیں کرتا اور اس کا درِ توبہ ہمیشہ وا رہتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اگر یہ منافقین اب بھی توبہ کر لیں تو ان کے لئے بہتر ہوگا۔ اب بھی پروردگار ان کے حال پر مہربانی فرمائے گا۔ لیکن اگر وہ اعراض برتیں تو پھر انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ انہیں عذابِ الیم دے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور یہ بھی وہ یاد رکھیں کہ اس زمین میں کوئی ان کا نہ ہمدرد ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ پھر ان کا مقدر ان کی رسوائیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ ﴿التوبة : ۷۵ تا ۷۷﴾

اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے عطا کیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور خوب نیکیاں کرنے والوں سے میں سے ہو جائیں گے۔ (۷۵) تو اللہ نے جب ان کو اپنے فضل میں سے عطا فرمایا تو وہ اس میں بخیل بن بیٹھے اور برگشتہ ہو کر منہ پھیر لیا۔ (۷۶) تو اس کی پاداش میں اللہ نے نفاق ان کے دلوں میں جما دیا اس دن تک جس دن وہ اللہ سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی کی اور اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ (۷۷)

Marfat.com

منافقین کے مزید چند خصائلِ بد:

منافقین کے مزید چند خصائلِ بد کا پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ جن میں سرِ فہرست ان کا بخل ہے کیونکہ بخل ایک ایسا مرض ہے جو حب دنیا کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے اور جس کے اثرات ایسے شدید اور ہمہ گیر ہیں کہ افرادِ انسانیت میں سے شاید کوئی فرد ایسی نہیں جو اس سے متاثر نہ ہوتی ہو۔ لیکن آیت میں مذکورہ منافقین کا بخل تو ایک خاص سبب کی وجہ سے زیادہ مکروہ اور مذمت کے لائق ہے۔ وہ سبب یہ ہے کہ ایک ایسا آدمی جس نے محنت اور ریاضت سے دولت کمائی ہو اور اس کے لئے زندگی کا بہترین حصہ صرف کر ڈالا ہو اور پھر اس پر بخیل بن کر بیٹھ جائے اور کسی اور کو دینے کا روادار نہ ہو تو اس کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے چونکہ اس کیلئے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں اس لئے اسے اپنا مال بے حد عزیز ہے۔ اگر چہ یہ بات بھی چنداں قابلِ التفات نہیں لیکن ان منافقین کا بخل اس لئے انتہائی مذمت کے قابل ہے کہ انہوں نے مال اپنی محنت سے نہیں کمایا بلکہ اللہ سے اس وعدے پر لیا کہ اگر آپ ہمیں مال عطا کر دیں گے تو ہم آپ کے راستے میں دل کھول کر خرچ کریں گے اور جو نیکی بھی مال کے ذریعے ہو سکتی ہے ہم اس میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان کو مال دے دیا تو وہ اس کے عطا کردہ مال پر مالک بن کر بیٹھ گئے۔ مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں ایک خاص واقعہ بھی بیان کیا ہے جس سے منافقین کے طرزِ عمل کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ ایک شخص ثعلبہ ابن ابی حاطب انصاری نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بہت غریب آدمی ہوں نانِ شبینہ کا محتاج ہوں، آپ اللہ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے مال عطا فرمائے آپ نے فرمایا کیا تم کو میرا طریقہ پسند نہیں؟ میں چاہتا تو پہاڑ میرے لئے سونا بنا دیئے جاتے۔ لیکن میں نے اپنے لئے فقر کو پسند کیا اور پھر تم یہ بھی جانتے ہو کہ مالداری ایک آزمائش ہے تم کیوں اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہو؟ ثعلبہ یہ سن کر چلا گیا مگر چند دنوں کے بعد پھر آیا اور پھر یہی درخواست بڑے اصرار کے ساتھ کی اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ اگر مجھے مال مل گیا تو میں ہر حق والے کو اس کا حق پہنچاؤں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے حق میں دعا فرمائی اللہ نے قبول کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دنوں ہی میں اس کی بکریوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ مدینہ کی آبادی اس کیلئے تنگ ہو گئی۔ اس نے مضافات میں کچھ جگہ لی اور وہاں منتقل ہو گیا۔ دور ہونے کی وجہ سے صرف ظہر اور عصر کی دو نمازیں مسجد نبوی میں آکر ادا کرتا باقی نمازیں اپنی قیام گاہ پر ہی پڑھتا۔ پھر اس کے ریوڑوں میں اور اضافہ ہوا تو یہ جگہ بھی اس کیلئے ناکافی ہو گئی اب وہ مدینہ سے دور نکل گیا اور کسی کھلی جگہ میں اپنے ریوڑوں کا انتظام کیا۔ لیکن اب صرف جمعہ کی نماز کیلئے مدینہ میں آتا پھر مال میں اور اضافہ ہوا تو وہ اب اتنی دور نکل گیا کہ جمعہ سے بھی محروم ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے اس کا حال دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ اس کے مال میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ شہر کے قریب اس کا رہنا ناممکن ہو گیا ہے اس لئے وہ کسی دور جگہ جا کر بس گیا ہے۔ اسلئے یہاں نظر نہیں آتا۔ آپ نے یہ سن کر تین مرتبہ فرمایا: و یح ثعلبہ افسوس ہے ثعلبہ پر۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں آیتِ صدقات نازل ہوگئی جس میں رسول اللہ ﷺ کو مسلمانوں سے زکوٰۃ وصدقات وصول کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ آپ نے صدقات کی وصولی کا مکمل قانون لکھوا کر دو شخصوں کو عامل بنایا اور ان کو زکوٰۃ کی وصولی کیلئے بھیج دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ ثعلبہ بن حاطب کے پاس بھی پہنچیں اور بنی سلیم کے ایک اور شخص کے پاس جانے کا بھی حکم دیا۔ جب یہ دونوں عامل ثعلبہ کے پاس پہنچے اور آنحضرت کا فرمان دکھایا۔ تو ثعلبہ کہنے لگا کہ یہ تو وہ جزیہ ہے جو غیر مسلموں پر لگایا جاتا ہے تو کیا ہم پر بھی جزیہ لگا دیا گیا ہے اور پھر کہا کہ اچھا آپ آگے جائیں واپسی پر یہاں سے بھی ہوتے جائیں۔

پھر یہ دونوں شخص بنی سلیم کے اس آدمی کے پاس پہنچے جس کے پاس جانے کا آنحضرت ﷺ نے حکم دیا تھا۔ جب اس نے آپ کا فرمان سنا تو اپنے بہترین مویشی اس نے زکوٰۃ کیلئے پیش کیئے۔ عاملوں نے کہا کہ ہمیں آنحضرت کا حکم یہ ہے کہ جانوروں میں اعلیٰ درجہ کے جانور چھانٹ کر نہ لیں بلکہ متوسط وصول کریں، اس لئے ہم یہ نہیں لے سکتے۔ سلیمی نے اصرار کیا کہ میں اپنی خوشی سے یہی پیش کرنا چاہتا ہوں چنانچہ انہوں نے یہی جانور قبول کر لیئے۔ پھر یہ دونوں حضرات دوسرے مسلمانوں سے صدقات وصول کرتے ہوئے واپس ثعلبہ کے پاس پہنچے۔ تو اس نے کہا لاؤ وہ قانونِ صدقات مجھے

Marfat.com

دکھلاؤ۔ دیکھ کر کہنے لگا: ان ھی الاجزیہ "یہ تو وہی ٹیکس ہوا جو ذمیوں سے لیا جاتا ہے"۔ کہا چلو اب تم جاؤ میں غور کر کے کچھ فیصلہ کروں گا۔ جب یہ دونوں حضرات واپس مدینہ طیبہ پہنچے اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے حالات پوچھنے سے پہلے ہی فرمایا۔ یا ویح ثعلبہ یا ویح ثعلبہ یا ویح ثعلبہ یعنی ثعلبہ پر سخت افسوس ہے۔ یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔ پھر سلیمی کے معاملہ پر خوش ہو کر اس کے لئے دعا فرمائی۔

ابن جریر نے اس روایت کے آخر میں لکھا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے ثعلبہ کیلئے تین مرتبہ یا ویح ثعلبہ فرمایا تو اس مجلس میں ثعلبہ کے کچھ عزیز واقارب بھی تھے۔ ان میں سے ایک آدمی فوراً ثعلبہ کے پاس پہنچا اور اس کو ملامت کی اور اسے بتلایا کہ تیرے جیسے لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کی آیت نازل ہوئی ہے۔ یہ سن کر ثعلبہ گھبرایا اور مدینہ حاضر ہو کر درخواست کی کہ میرا صدقہ قبول کر لیا جائے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارا صدقہ قبول کرنے سے منع فرمایا ہے۔ یہ سن کر ثعلبہ اپنے سر پر خاک ڈالنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اب خاک ڈالنے سے کیا فائدہ یہ تو تمہارے اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔ میں نے تمہیں حکم دیا تم نے اطاعت نہ کی اب تمہارا صدقہ قبول نہیں ہو سکتا۔ ثعلبہ ناکام واپس ہو گیا اس کے کچھ دن بعد رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی اور صدیق اکبر ؓ خلیفہ ہوئے تو ثعلبہ صدیق اکبر ؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صدقہ کی قبولیت کی درخواست کی۔ حضرت ابو بکر ؓ نے فرمایا کہ جس مال کو آنحضرت ﷺ نے قبول کرنے سے انکار کیا ہو میں اسے کیسے قبول کر سکتا ہوں۔ ثعلبہ کو اللہ تعالیٰ نے بطور عبرت حضرت عثمان غنی ؓ کے زمانے تک زندہ رکھا۔ لیکن اس کے مال زکوٰۃ کو نہ حضرت عمر فاروق ؓ نے قبول فرمایا نہ حضرت عثمان غنی ؓ نے۔ اس کے بعد وہ وہیں پہاڑوں میں مر کھپ گیا کسی نے اس کی شکل نہ دیکھی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں۔

سب سے پہلے انسان کی اس کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جب تک کوئی چیز انسان کے پاس نہیں ہوتی تو وہ تمنا کرتا ہے کہ اگر یہ مجھے حاصل ہو جائے تو میں دوسروں کی طرح اسے غلط مقصد میں استعمال نہیں کروں گا بلکہ اس کے صحیح مصرف میں استعمال کرتے ہوئے ایک مثال قائم کروں گا لیکن جب وہ چیز اللہ تعالیٰ عطا فرما دیتا ہے تو نعمت کے مل جانے کے بعد اسے یاد بھی نہیں ہوتا کہ میں نے یہ نعمت اللہ سے مانگ مانگ کر لی تھی اور اس وعدے پر لی تھی کہ میں واقعی اس کا حق ادا کروں گا اور اسے کسی غلط مصرف میں خرچ نہیں کروں گا۔ ثعلبہ نے بھی ایسے ہی وعدوں سے مال لیا لیکن مال مل جانے کے بعد اس کا مالک بن کر بیٹھ گیا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ اس کا مالک میں نہیں بلکہ اللہ ہے۔ میرے پاس یہ مال تو امانت ہے۔ میرے لئے لازم ہے کہ میں امانت میں خیانت نہ کروں اسے وہاں خرچ کروں اور ویسے خرچ کروں جس طرح اس کے مالک نے مجھے ہدایت بخشی ہے۔

تیسری آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بعض اعمالِ بد ایسے ہیں جن کے نتیجے میں دل میں نفاق پیدا ہوتا ہے اور اگر وہ اعمالِ بد جاری رہتے ہیں تو پھر ایسے اعمال کے کرنے والے سے قبولیتِ حق کی استعداد چھین لی جاتی ہے چنانچہ ثعلبہ جیسے لوگ ایسے ہی اعمال کی پاداش میں اس نفاق کا شکار ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ موت تک یہ نفاق ان کے دلوں میں ایسا جما دیتا ہے کہ کبھی انہیں اس سے نکلنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

آیتِ کریمہ کے آخر میں بخل کے علاوہ مزید دو خصائلِ بد کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ان دونوں کو بھی نفاق پیدا کرنے کا سبب قرار دیا۔ یہ دو خصائلِ بد ہیں وعدے کی خلاف ورزی اور جھوٹ بولنا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں خصلتیں ایسی ہیں جو آپس میں لازم و ملزوم ہیں جو شخص جھوٹ بولتا ہے وہ نقضِ عہد بھی کرتا ہے اور جو نقضِ عہد کرتا ہے وہ جھوٹ بھی بولتا ہے اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ دونوں خصلتیں نفاق پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہیں اور نفاق کی علامت بھی ہیں۔ ایک حدیثِ مبارکہ میں آنحضرت ﷺ نے منافق کی تین علامتیں بیان فرمائی ہیں جن میں سے دو یہی ہیں اور تیسری امانت میں خیانت ہے۔ امانت میں خیانت بھی درحقیقت جھوٹ ہی کا ایک پہلو ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے، آمین۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ ﴿التوبة : ٧٨﴾

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ان کے راز اور ان کی سرگوشی کو جانتا ہے اور اللہ تمام غیبوں کا جاننے والا ہے۔ (٧٨)

Marfat.com

اظہارِ تعجب:

اس آیتِ کریمہ میں اظہارِ تعجب بھی ہے اور منافقین کی اصل بیماری کی نشاندہی بھی۔ اظہارِ تعجب تو اس بات پر ہے کہ مدینہ میں نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کو نو سال گزر گئے۔ ان منافقین میں سے کتنے ایسے ہیں جو نو سالوں سے ہی زیرِ تربیت ہیں۔ ان کے سامنے اسلامی انقلاب قدم قدم آگے بڑھا ہے اور آج پورا جزیرۂ عرب اس کی گرفت میں ہے۔ مسلمان شروع میں مدینہ طیبہ میں نہ تو کسی قابلِ ذکر تعداد کے مالک تھے اور نہ ان کے وسائل کسی بڑے مقصد کا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ لیکن چند ہی سالوں میں جو نتیجہ نکلا وہ سامنے ہے، اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام کی حقانیت نے خود دلوں کو اپیل کیا آنحضرت ﷺ کی دلآویز شخصیت اور تعلیم و تربیت نے انسانوں میں مضبوط کردار پیدا کیا اور اللہ کی تائید و نصرت قدم قدم پر شاملِ حال رہی تو آج پورے جزیرۂ عرب پر اسلام کا پرچم لہرا رہا ہے۔ یہ سب کچھ منافقین کے سامنے ہوا انہوں نے اپنی آنکھوں سے اللہ کے نبی کے معجزات بھی دیکھے اور قدرتِ حق کی پیہم نوازشات بھی مشاہدہ کیں۔ لیکن نہ ان کے عقیدے میں کوئی تبدیلی آئی، نہ ان کے دل و دماغ کو سیرابی ملی اور نہ ان کے اندر مضبوط کردار نے جنم لیا اس پر تعجب کے اظہار کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

ان کی جس بیماری کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نفاق دراصل اپنی حالت کے ایسے اخفا کا نام ہے جس کی بنیاد جھوٹ اور فریب پر ہو۔ آدمی جس بات کا دعویٰ کرتا ہے حقیقت میں وہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ میں مومن ہوں حالانکہ یہ اس کے دل کی آواز نہیں ہوتی زبان سے وہ ایک ایسی بات کہتا ہے جس سے دل انکار کرتا ہے۔ منافقین اپنے آپ کو مسلمانوں کا ہمدرد و غمگسار ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان کی ساری ہمدریاں مسلمانوں کے دشمنوں سے ہوتی ہیں۔ اس طرح سے اگر غور کیا جائے تو ان کی پوری زندگی قول و فعل کا تضاد ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو چھپانے کیلئے ہر قدم پر جھوٹ بولتے ہیں نفاق کا بھرم رکھنے کیلئے وہ ہمیشہ وعدوں کو توڑتے ہیں۔ یہ سب کچھ وہ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے گمان میں اللہ نہ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے۔ جب وہ مسلمانوں کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ سرگوشیوں کو نہیں سنتا۔ وہ دلوں میں اسلام کے خلاف جو کچھ چھپائے پھرتے ہیں ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ ان کو نہیں جانتا۔ اگر انہیں اللہ کے علم کی وسعتوں کا یقین ہوتا اور وہ واقعی اسے تمام غیبوں کا جاننے والا سمجھتے تو وہ کبھی بھی منافق بن کر رہنے کی جرأت نہ کرتے۔

اَلَّذِیْنَ یَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِیْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ فِی الصَّدَقٰتِ وَالَّذِیْنَ لَایَجِدُوْنَ اِلَّاجُهْدَهُمْ فَیَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ ﴿التوبة : ٧٩﴾

وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور ان پر جو اپنی محنت کے سوا کچھ نہیں پاتے پھر ان پر پھبتیاں چست کرتے ہیں اللہ نے ان کا مذاق اڑایا اور ان کیلئے دردناک عذاب ہے۔ (٧٩)

مُتَطَوِّعٌ اور مُطَّوِّعٌ دونوں ایک ہی لفظ ہیں۔ یہ اس شخص کو کہتے ہیں جو صرف فرائض و واجبات ہی ادا کر لینے پر قناعت نہ کرے بلکہ اپنی خوشی اور حوصلہ مندی سے نفلی نیکیوں میں بھی بڑھ چڑھ کا حصہ لے۔

لمز کے معنی عیب لگانا، ہجو کرنا، مذمت کرنا۔

پیچھے منافقین کے بخل کا ذکر ہوا اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ منافقین صرف اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے ہی گریز نہیں کرتے بلکہ انہیں تو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے بھی اچھے نہیں لگتے۔ جسے بھی دیکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے راستے میں خرچ کر رہا ہے اسے طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس پر عیب لگاتے ہیں، مذمت کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے جب مسجدِ نبوی میں منبر پر تشریف فرما ہو کر جنگِ تبوک کی تیاری کے سلسلہ میں لوگوں کو انفاق فی سبیل اللہ کا حکم فرمایا اور اس راستے میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کی اپیل فرمائی تو آپ کی اپیل پر دولت مند بھی آگے بڑھے اور غریب لوگ بھی۔ حضرت عثمانِ غنی ؓ اور

Marfat.com

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ؓ جیسے اغنیا نے دل کھول کر امداد فرمائی اشرفیاں پیش کیں۔ ایک بہت بڑی تعداد میں مجاہدین کیلئے گھوڑے اور اسلحۂ جنگ پیش کیا اور مجاہدین کو مسلح کرنے کیلئے ایک خطیر رقم خرچ کی۔ حضرت صدیق اکبر ؓ نے اپنے گھر کا سارا اثاثہ پیش کر دیا۔ حضرت عمر فاروق ؓ اپنی ملکیت کا نصف حصہ اٹھا لائے اور خدمت میں پیش کر دیا۔ منافقین کی ٹولی ایک طرف بیٹھی ان اغنیا کو دیکھتی تھی کہ کس طرح بڑھ چڑھ کر انفاق کر رہے ہیں لیکن بجائے اظہارِ تحسین کرنے کے وہ ان پر شہرت کی ہوس کا الزام رکھتے تھے۔ جو بھی آگے بڑھ کر کوئی بڑی رقم پیش کرتا تو وہ کہتے کہ یہ ریاکار اور شہرت پسند ہے اور اپنی دینداری کی شہرت چاہتا ہے اور لوگوں میں سخی مشہور ہونا چاہتا ہے۔ اس طرح سے لوگوں میں حوصلہ شکنی کی فضا پیدا کرتے اور ساتھ ہی ساتھ نیکی کے اثر کو پھبتیوں میں اڑانے کی کوشش کرتے اور جب وہ دیکھتے کہ کوئی غریب آدمی دن بھر یا رات بھر محنت کر کے جو کچھ بھی کما سکا ہے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اٹھا لایا ہے اور وہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ کاٹ کر کیسی خوش دلی کے ساتھ اللہ کے راستے میں معمولی سوغات پیش کر رہا ہے۔ کوئی سیر آدھ سیر کھجور لا رہا ہے اور کوئی جو کی پوٹلی باندھے ہوئے آ رہا ہے تو بجائے ان کے جذبہ اخلاص کو دیکھنے کے یہ منافقین غصہ سے تلملاتے اور طعن و تشنیع سے اپنا غبار نکالنے کی کوشش کرتے اور مذاق اڑاتے ہوئے کہتے کہ لیجئے صاحب یہی وہ مال ہے جس سے ماشاء اللہ جنگ لڑی جائے گی جس کے نتیجے میں قیصر کا تخت و تاج الٹ جائے گا۔ ٹڈی کی ٹانگوں سے قلعے مسمار کئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویے کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ بظاہر اللہ کے راستے میں خیرات کرنے والوں کا مذاق اڑا رہے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اللہ ان کا مذاق اڑا رہا ہے۔ وہ لوگ تو اپنے انفاق کے بدلے میں دولتِ کونین خرید رہے ہیں۔ جو ہزاروں اشرفیاں دے رہا ہے وہ بھی اللہ کی رضا چاہتا ہے اور جو آدھ سیر کھجور لے کر آیا ہے وہ بھی اللہ کی رضا کا طالب ہے۔ دونوں جنت کے حصول کے خواہش مند ہیں لیکن یہ مذاق اڑانے والے منافقین انہیں معلوم نہیں کہ اللہ کی طرف سے ان کی جو رسی دراز کی جا رہی ہے وہ دراصل ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے کہ تم خوش فعلیاں کر لو، کلیلیں بھر لو، تمہیں معلوم نہیں کہ قدرت کی جب پکڑ آئے گی تو ایسی جگہ سے اور اس طرح سے آئے گی جہاں سے تمہیں سان گمان بھی نہیں ہوگا اور بالآخر اللہ کا عذاب الیم تمہارے انتظار میں ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴿التوبة : ٨٠﴾

آپ ان کیلئے مغفرت چاہیں یا نہ چاہیں اگر آپ ان کیلئے ستر بار بھی مغفرت چاہیں گے تو بھی اللہ ان کو بخشنے والا نہیں یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اللہ بدعہدوں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ (۸۰)

سخت ہو جانے کی تاکید:

اس رکوع کی پہلی آیت میں واغلظ علیھم فرما کر آنحضرت ﷺ کو منافقین پر سختی کا جو حکم دیا گیا تھا پیشِ نظر آیت کریمہ اسی کی مزید تاکید ہے۔ سختی سے تو بظاہر مراد یہ تھا کہ آپ ان کے بارے میں اپنی کریم النفسی کے باعث جس چشم پوشی اور عفو و درگزر ان سے معاملہ کرتے رہے ہیں وہ اب نہ کیجئے۔ لیکن اس آیت کریمہ میں اس سختی کے دوسرے پہلو کو واضح فرمایا کہ آپ کی سختی صرف معاملات کی حد تک نہیں رہنی چاہئیے بلکہ آپ جس طرح پہلے ان منافقین کیلئے ہدایت و نجات کی دعائیں کرتے رہے ہیں، وہ دعائیں بھی اب بند کر دیجئے۔ یہ کسی طرح کی مروت اور حسنِ سلوک کے مستحق نہیں ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی طبیعت میں چونکہ ہمیشہ رأفت و رحمت کا غلبہ رہتا تھا اس لئے آپ ہمیشہ دشمنوں کے لئے بھی دعائیں فرماتے تھے۔ جس طرح آپ اپنی امت کیلئے اللہ سے مغفرت طلب کرتے تھے اسی طرح منافقین کیلئے بھی ہدایت و رحمت مانگتے تھے۔ لیکن منافقین نے رفتہ رفتہ اپنی کرتوتوں سے اپنے آپ کو اس رحمت سے محروم کر لیا۔ ان کی شقاوت اس درجہ بڑھ گئی کہ اسلام اور مسلمانوں سے کسی طرح کی ہمدردی بھی انہیں گوارا نہ تھی۔ وہ کلمہ گو ہونے کے باوجود مسلسل اسلام کے خلاف نیش زنی کرتے رہتے تھے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ کو نہ صرف استغفار کرنے سے روکا گیا بلکہ یہ بھی

Marfat.com

فرمایا گیا کہ آپ اگر ستر دفعہ بھی ان کے لئے استغفار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ ستر سے مراد ستر کا عدد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے۔ یعنی آپ جتنی دفعہ بھی استغفار کریں اللہ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔

استغفار سے روکنے کی وجہ:

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ یہ ہے وہ سبب جس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ کو استغفار سے روکا گیا۔ مراد یہ ہے کہ منافقین صرف ایمان وعمل میں کمزوریوں کا ہی شکار نہیں بلکہ وہ حقیقت میں اللہ اور اس کے رسول سے کفر کرتے ہیں۔ بظاہر وہ کلمہ پڑھتے ہیں لیکن حقیقت میں ان کے دل ایمان سے خالی ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ان کے دلوں میں اسلام کی دشمنی بھری ہوئی ہے اور وہ اللہ اور رسول کے درپردہ باغی ہیں اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ باغیوں کو بھی راہ نہیں دکھاتا۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِھِمْ

خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَکَرِھُوْٓا اَنْ یُّجَاھِدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَھَنَّمَ
اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ کَانُوْا یَفْقَھُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَلْیَضْحَکُوْا قَلِیْلًا وَّلْیَبْکُوْا
کَثِیْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاِنْ رَّجَعَکَ اللّٰہُ اِلٰی
طَآئِفَۃٍ مِّنْھُمْ فَاسْتَاْذَنُوْکَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا
مَعِیَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّکُمْ رَضِیْتُمْ
بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّۃٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ﴿۸۳﴾ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی
اَحَدٍ مِّنْھُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ ؕ اِنَّھُمْ کَفَرُوْا
بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَاتُوْا وَھُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُھُمْ
وَاَوْلَادُھُمْ ؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الدُّنْیَا

Marfat.com

وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ وَإِذَآ أُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ أَنْ
اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُوا الطَّوْلِ
مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٨٦﴾ رَضُوْا بِأَنْ يَّكُوْنُوْا
مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٨٧﴾
لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ ۭ وَأُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۡ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٨٨﴾
أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٨٩﴾

خوش ہیں وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے اپنے بیٹھ رہنے پر اللہ کے رسول سے پیچھے اور انہوں نے برا جانا کہ وہ اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انہوں نے کہا نہ نکلو اس گرمی میں۔ کہہ دیجئے! دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ سمجھے ہوتے۔ پس انہیں چاہیئے کہ وہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں اپنے اعمال کی پاداش میں۔ پس اگر اللہ تم کو ان میں سے کسی گروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تم سے جہاد کیلئے نکلنے کی اجازت مانگے تو کہہ دیجئے! تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکل سکتے اور میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے نہیں لڑ سکتے۔ تم پہلے بیٹھ رہنے پر راضی ہوئے تو اب بھی پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ آپ نماز نہ پڑھیں ان میں سے کسی پر جو مر جائے کبھی بھی اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔ بیشک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ مرے اس حال میں کہ وہ بدعہد اور سرکش تھے۔ اور تعجب میں نہ ڈالیں آپ کو ان کے مال اور ان کی اولاد۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے سبب سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں کفر کے حال میں نکلیں۔ جب کوئی سورۃ نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان کا حق ادا کرو اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کیلئے نکلو تو اجازت طلب کرنے لگتے ہیں آپ سے، ان میں سے مقدرت والے بھی اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ دیجئے ہم بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ رہیں گے۔ انہوں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ پیچھے رہ جانے والیوں کے ساتھ بنیں اور مہر لگا دی گئی ان کے دلوں پر پس وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ البتہ! رسول اور جو

Marfat.com

لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اور انہی کیلئے ساری بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ایسے باغات تیار کرر کھے ہیں جن کے نیچے سے ندیاں رواں ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔(۸۱تا۸۹) (رکوع: ۱۱)

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝ ﴿التوبة : ۸۱﴾

(خوش ہیں وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے اپنے بیٹھ رہنے پر اللہ کے رسول سے پیچھے اور انہوں نے برا جانا کہ وہ اپنے مال وجان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور انہوں نے کہا نہ نکلو اس گرمی میں۔ کہہ دیجئے! دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔ کاش! وہ سمجھے ہوتے۔(۸۱)

تشریح سے پہلے چند مشکل الفاظ کی وضاحت۔ المخلفون: المخلف کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے یعنی انہیں نظر انداز کر دیا گیا۔ مقعد: کے متعدد معنی میں سے ایک معنی ہے بیٹھ رہنا۔ خلاف: قرآنِ کریم میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ۱۔ بے ترتیب، اوتقطع ایدیهم وارجلهم من خلاف "ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ دیئے جائیں"۔ یہاں خلاف "بے ترتیب" کے معنی میں ہے۔ ۲۔ بعد یا پیچھے، اذا لا یلبثون خلفک الا قلیلا "تیرے پیچھے یہ بھی کچھ زیادہ نہ رہ سکیں گے"۔ اس میں خلاف "پیچھے" کے معنی میں ہے۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں بھی خلاف پیچھے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

منافقین کی ناعاقبت اندیشی:

کام چور، بہانہ جو، بدخصلت اور بے وفا لوگوں کا یہ طریقہ ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے آقا یا اپنے کسی بڑے سے جھوٹ بول کر یا فریب دے کر ذمہ داری سے گریز کا راستہ نکال لیں اور اپنے آپ کو جھوٹ موٹ معذور ثابت کرنے میں کامیاب ثابت ہو جائیں تو وہ آقا کی غیر حاضری میں آپس میں نہایت خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ دیکھو آج اپنے آقا کو ہم نے کیسا بے وقوف بنایا اور ہم نے کیسی ذہانت کا ثبوت دیا کہ کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ ہم حقیقت میں معذور نہیں بلکہ اصل چور ہمارے دل میں ہے کیونکہ جس ذمہ داری کی ادائیگی کیلئے ہمیں بلایا جا رہا تھا ہمارے دل میں اس ذمہ داری کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ ہم اس ذمہ داری کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس کی ادائیگی کیلئے کوئی تکلیف گوارا کریں۔ منافقین کا طرزِ عمل بھی اسی کے مشابہ تھا۔ ان میں سے بعض لوگ جھوٹ موٹ بہانہ سازی سے آنحضرت ﷺ سے جنگ میں عدم شرکت کی اجازت لے لیتے اور بعد میں اپنی بہانہ سازی کو چالاکی اور ذہانت سمجھ کر اور آنحضرت ﷺ کے اعتبار کرنے کو سادگی قرار دے کر آپس میں خوب خوشیاں مناتے کہ ہم ایک لمبے سفر، تکلیف دہ گرمی کی صعوبت اور اذیت سے بچ گئے اور وہاں جا کر جو کوفناک معرکہ پیش آنے والا تھا ہم نے اپنے آپ کو اس سے محفوظ کر لیا۔ قرآنِ کریم نے ان کے رویے کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے چند باتیں ارشاد فرمائی ہیں جس میں ایک تو ان کی چالاکی اور ہوشیاری کا پول کھولا گیا ہے اور دوسرے ان کی اصل بیماری کی نشاندہی فرمائی گئی ہے۔ المخلفون کے لفظ سے ان کی ہوشیاری کو حماقت ثابت کرتے ہوئے اشارہ فرمایا گیا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی بہانہ سازی اور چرب زبانی سے کام لے کر پیچھے رہنے میں کامیاب ہوئے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پیچھے رہنے میں ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں بلکہ آنحضرت ﷺ نے ان کی بے وفائی، نفاق اور کام چوری کو دیکھتے ہوئے یہ مناسب سمجھا کہ ان لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا جائے کیونکہ جنگ تو وفا شعاروں، سرفروشوں اور جاں نثاروں کا کام ہے۔ وہاں تلواریں اور تیغیں لڑتی ہیں زبان کی تیزی کام نہیں آتی، یہ چونکہ بزدل لوگ ہیں اور اسلام سے انہیں کوئی تعلق نہیں جہاد فی سبیل اللہ کو یہ محض مہم جوئی سمجھتے ہیں ایسے غیر مخلص اور بزدل لوگوں کا ساتھ ہونا مشکلات میں اضافے کا باعث تو بن سکتا ہے کسی فتح مندی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اس لئے اللہ کے دین

Marfat.com

کی مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں کو ساتھ لے جانے کی بجائے پیچھے چھوڑ دیا جائے اور نظرانداز کر دیا جائے۔لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تو انہیں نااہل قرار دیتے ہوئے پیچھے چھوڑا اور نظرانداز کیا اور انہوں نے اسے اپنی ذہانت کا کارنامہ سمجھا۔خود فیصلہ کیجئے کہ سادگی کس طرف ہے اور حماقت کہاں ہو رہی ہے۔

یہ مصاحبت کے قابل نہیں:

مزید فرمایا کہ اگر یہ ساتھ جانے کیلئے آمادہ بھی ہوتے اور کسی قسم کی بہانہ جوئی سے کام نہ لیتے جب بھی یہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں اسلامی فوج کی ہمرکابی کا شرف بخشا جائے کیونکہ اسلامی فوج کا ایک ایک سپاہی سرفروشی اور جاں سپاری کا پتلا اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح کا امیں ہے۔وہ آخرت کے بدلے میں حیات دنیا کو بیچ چکا ہے۔اس کی ازاول تا آخر ترجیح صرف اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ان کی مصاحبت میں ایسے لوگوں کا نکلنا جو جہاد فی سبیل اللہ کو ویسے ہی ناپسند کرتے ہوں، انہیں اپنے مالوں سے محبت اور اپنی جان کا ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہو، ایسے لوگ اگر اس سفر میں نکلیں بھی تو بزدلی کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں۔وہ خود بھی ہر معرکے میں پیچھے رہیں گے اور دوسروں کو بھی بے دلی سکھائیں گے۔ان کا یہ ذہنی اور قلبی پس منظر اس بات کا متقاضی تھا کہ انہیں جنگ تبوک سے پیچھے رکھا جائے اور مصاحبت سے محروم کر دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا لیکن وہ احمق یہ سمجھتے ہیں کہ وہ شاید اپنی چرب زبانی اور سخن سازی سے آنحضرت کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

منافقین دوسروں میں بے دلی پیدا کرتے ہیں:

مزید فرمایا کہ ان منافقین کا حال تو یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ خود جنگ سے پیچھے رہنے کو ذہانت کا کمال سمجھتے ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ دوسرے لوگوں میں بھی مختلف بہانوں سے جہاد فی سبیل اللہ سے گریز کا جذبہ پیدا کرتے ہیں انہیں راہ کی مشکلات سے ڈرا کر مسلمانوں کے ساتھ نکلنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں چونکہ یہ سفر اس زمانے میں پیش آیا جبکہ موسم گرما پورے عروج پر تھا اور آگ برسا رہا تھا۔ایسے شدت کے موسم میں اتنا طویل سفر دل ہلا دینے والا تھا۔اس لئے منافقین کمزور مسلمانوں سے طریقے طریقے سے یہ بات کہتے کہ ایسی شدت کی گرمی میں مت نکلو ورنہ جھلس کر رہ جاؤ گے، گرمی تمہارے سامنے ہے، سفر کی طوالت بھی تم سے مخفی نہیں تو پھر اس خطرناک اقدام کا مفہوم خودکشی کے سوا اور کیا ہے؟ پروردگار نے اس کے جواب میں فرمایا: یہ صحیح ہے کہ گرمی بہت شدید ہے لیکن زندگی کے فرائض اور قوموں کی وفا کے لمحے اگر ایسے ہی کسی اقدام کا تقاضا کرتے ہوں تو پھر اس کا کر گزرنا خودکشی نہیں ہوتا بلکہ اس سے گریز خودکشی ہوتا ہے۔یہ ایک ایسا ہی لمحہ ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی قسمت ترازو میں ہے۔اسے سرفروشی اور جاں سپاری سے بچایا بھی جا سکتا ہے اور بزدلی اور بے ہمتی سے گنوایا بھی جا سکتا ہے۔ایسے لمحوں میں ذرا سی فروگزاشت اگر ایک طرف اسلامی انقلاب کو صدیوں پیچھے دھکیل سکتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ جہنم کی آگ کو بڑھکا بھی سکتی ہے۔اس لئے اگر تم ایسے موقعوں پر گریز پائی کا ثبوت دو گے تو پھر یاد رکھو موسم گرما کی دھوپ کو تو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن جہنم کی آگ کی گرمی کو کوئی برداشت نہیں کر سکتا اور وہ یقیناً ان اعمال کے بدلے میں ضرور پیش آ کر رہتی ہے جنہیں منافقین نے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿التوبة : ٨٢﴾

پس انہیں چاہیئے کہ وہ کم ہنسیں اور زیادہ روئیں اپنے اعمال کی پاداش میں۔(۸۲)

اپنے انجام پر روئیں:

یہ منافقین موسم کی گرمی سے بچ کر گھروں کے عافیت کدوں میں پناہ گزیں ہو جانا چاہتے ہیں۔لیکن انہیں معلوم ہے کہ فرض کی جس پکار پر مسلمانوں نے جلا دینے والے اس موسم میں اتنے خطرناک اقدام کا فیصلہ کیا ہے اس میں پہلو تہی جہنم کی آگ کو دعوت دینے کے مترادف ہے اور یہ منافق اس آگ کو دعوت دے چکے ہیں کیونکہ انہوں نے پیچھے رہنے کو اپنی کامیابی سمجھ لیا ہے۔اپنی اس حماقت پر اب انہیں خوش ہونے کی بجائے رونا چاہیئے

Marfat.com

کیونکہ اپنے جس تخلف کو وہ کامیابی سمجھ رہے تھے اور اس پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہی ان کیلئے جہنم کی آگ بڑھکانے کا سبب بن رہا ہے، جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ چند ساعتوں یا چند دنوں کے بعد میرے آرام میں گزرنے والے یہ چند لمحے ایک بڑی تباہی کا پیش خیمہ بننے والے ہیں اگر اس کے دماغ میں کچھ بھی عقل ہے تو وہ یقیناً ماتم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس طرح پھانسی کا قیدی پھانسی کے انتظار میں چند دن پھانسی کی کوٹھڑی میں گزارتا ہے لیکن اس کا ایک ایک لحہ پھانسی کی کوٹھڑی میں کم اور پھانسی کے پھندے میں لٹکتے ہوئے زیادہ گزرتا ہے کیونکہ وہ اپنے ایک لمحے میں نہ جانے کتنی مرتبہ پھانسی کے پھندے کو گلے میں اترتا ہوا دیکھتا ہے۔ پھانسی کے پھندے پر جو اذیت ہوگی وہ تو ہوگی لیکن اس کے انتظار کی اذیت بھی اس سے کم نہیں۔ منافقین نے جہاد فی سبیل اللہ سے پیچھے رہ کر اپنے لئے پھانسی کا جو پھندا تجویز کیا ہے جو ان کے اعمال کی پاداش میں یقیناً ان کے گلے میں طوق بننے والا ہے۔ اس کے انتظار کا ایک ایک لحہ ایسا ہے جسے ہنستے ہوئے نہیں بلکہ انہیں رو کر گزارنا چاہئے۔

فَاِنْ رَّجَعَکَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْکَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِیَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِیَ عَدُوًّا ؕ اِنَّکُمْ رَضِیْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِیْنَ ○ ﴿التوبة : ۸۳﴾

پس اگر اللہ تم کو ان میں سے کسی گروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تم سے جہاد کیلئے نکلنے کی اجازت مانگے تو کہہ دیجئے! تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکل سکتے اور میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے نہیں لڑ سکتے۔ تم پہلے بیٹھ رہنے پر راضی ہوئے تو اب بھی پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھو۔ (۸۳)

منافقین کی آرزو کی ناکامی:

اس آیتِ کریمہ کو پڑھتے ہوئے چند باتیں ذہنی افق پر روشن ہوتی ہیں۔ پہلی یہ بات کہ یہ منافقین کی ایک مکروہ آرزو اور ناپاک ارادے کی ناکامی کی طرف اشارہ ہے۔ حدیبیہ کے سفر میں بھی انہوں نے ایسی ہی امیدیں باندھی تھیں اور اب جنگِ تبوک کے حوالے سے ان کو دوبارہ اپنی ناپاک امیدوں کے برآنے کی امید پیدا ہوئی آرزو ان کی یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھ جانے والے مسلمان چونکہ ایک بہت بڑی قوت کے مقابلے کے ارادے سے گئے تھے جن کے ساتھ بظاہر مقابلے کا کوئی جوڑ نہیں تھا اس لئے یہ امید پیدا ہوئی کہ اگر یہ تصادم ہو گیا تو رومی قوتوں کی کثرت اور بے پناہی کے باعث اس بات کا قوی امکان ہے کہ مسلمان قوت اس کے مقابلے میں پامال ہو کر رہ جائے۔ فوج کی اکثریت قتل ہو جائے یا گرفتار ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ کو خدانخواستہ کوئی بڑا حادثہ پیش آ جائے۔ ایسی صورت میں ان کا ارادہ یہ تھا کہ ہم عبداللہ بن ابی کے سر پر حکومت کا تاج رکھ دیں گے اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیں گے۔ اس آیتِ کریمہ میں آپ کے لوٹنے کا ذکر فرما کر یہ اشارہ فرما دیا کہ منافقین کی خواہشات پوری نہیں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ بخیریت تمام اپنے پیغمبر کو واپس مدینہ منورہ لائے گا اور وہ اس کام کی تکمیل فرمائیں گے جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی ہے۔

منافقین کی محرومی:

دوسری بات جس کی طرف اس آیتِ کریمہ سے اشارہ مفہوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ منافقین کی حرکتوں اور ان کے طرزِ عمل سے اس حد تک رنجیدہ اور بدگمان ہو گئے تھے کہ آپ اب ان کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔ اور یہ اس حکم کا فطری تقاضا بھی تھا جس میں آپ کو منافقین کے ساتھ سخت طرزِ عمل اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ پروردگار یہاں اشارہ فرما رہے ہیں کہ آپ کا منافقین سے تنفر اپنی جگہ بالکل بجا ہے اور وہ اسی بات کے مستحق بھی ہیں لیکن یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ جب آپ واپس مدینہ منورہ پہنچیں گے تو وہ لوگ اپنی خفت مٹانے کیلئے آپ کی خدمت میں ضرور حاضری دیں گے اور اپنے اخلاص کا ثبوت دینے کیلئے آئندہ آپ کے ساتھ نکلنے اور جان لڑانے کے بڑھ بڑھ کر دعوے بھی کریں گے۔ لیکن آپ ان سے صاف فرما دیجئے کہ اب تمہیں میرے ساتھ کسی سفر پر نکلنے کی ہرگز اجازت نہیں اور نہ تم میرے ساتھ کسی دشمن سے لڑائی لڑنے کے مجاز ہو۔ اللہ کے اس حکم اور اس کے نتیجے میں آنحضرت ﷺ کے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ منافقین جو آج تک مسلمانوں میں گھلے ملے رہے ہیں اور مسلمانوں ہی میں شمار ہوتے ہیں وہ

Marfat.com

جماعتِ مسلمین سے بالکل کٹ جائیں گے۔ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا اب ہمارے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ اس طرح سے ان کی معاشرے میں ایسی رسوائی ہوگی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کی مجلسی زندگی سے ان کو بالکل الگ کر دیا جائے گا ان کے تعلقات کے تمام دائرے سمٹ جائیں گے۔ وہ مدینہ میں رہتے ہوئے بھی اپنے لئے مدینہ کی سرزمین کو تنگ محسوس کریں گے۔ ان کے گھر ان کے لئے ویرانہ ہو جائیں گے کیونکہ بڑے بڑے منافقین کی اولاد ان کے قریبی عزیز بعض کی بیویاں مخلصانہ اسلام کے دائرے میں شامل ہو چکی تھیں اس آیتِ کریمہ کے نازل ہونے کے بعد ان تمام لوگوں کی نگاہوں میں ان کی عزت گر جائے گی۔

ممکن ہے ان میں سے بعض لوگ مسلمانوں سے مل کر یا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اخلاص کا ثبوت دینے کی کوشش کریں اور اپنے جھوٹے اعذار کو پھر سے دہرانے کی مشق کریں یا گزشتہ اطوار پر معافی مانگیں۔ ان کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ جب مسلمانوں اور اسلام کیلئے فیصلہ کن وقت تھا اور ایک امتحان سامنے تھا جس سے مخلص اور غیر مخلص کا فیصلہ ہو رہا تھا اس وقت تم نے مسلمانوں کا ساتھ دینے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکلنے کی بجائے پیچھے بیٹھ رہنا پسند کیا۔ اب تمہارا مقدر یہی ہے کہ تم پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھ رہو۔

اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں سفر کے دوران ہی نازل ہوئی ہیں۔ حضور ابھی سفر میں ہیں اور ابھی واپسی کا عمل شروع نہیں ہوا ہے اور منافقین ابھی بدترین امیدوں کے بر آنے کے انتظار میں ہیں۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

آپ نماز نہ پڑھیں ان میں سے کسی پر جو مر جائے کبھی بھی اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوں بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور وہ مرے اس حال میں کہ وہ بدعہد اور سرکش تھے۔ (۸۴) ﴿التوبۃ : ۸۴﴾

منافقین سے آخری قطع تعلق:

گزشتہ رکوع میں نبی کریم ﷺ کو منافقین کیلئے سخت ہو جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے بعد کی آیات میں ہم نے اسی سختی کے چند مظاہر پڑھے ہیں۔ یہ آیتِ کریمہ اس حکم کا آخری اور سخت ترین مظہر ہے۔ ایک آدمی جو کسی نظریاتی جماعت سے وابستہ ہو چکا ہے اور انہی کے ساتھ وہ اپنا حقیقی رشتہ محسوس کرتا ہے جب تک وہ زندہ ہے وہ ان کی تقریبات کا ساتھی، ان کی مجلسوں کا شریک، ان کے دکھ درد میں رفیق، ان کی خوشیوں میں مددومعاون اور انہی کی رفاقت ومحبت کے حصار میں اپنے آپ کو محصور سمجھتا ہے۔ وہ جائز طور پر یہ سمجھتا ہے کہ میرے جماعتی احباب میرے دست وبازو ہوں اور انہی کے ساتھ میری زندگی ہے اور اس کی آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ جب میں دنیا سے آخرت کا سفر کروں تو میرے جماعتی ارکان اور دوست اور میرے بھائی میری تکفین وتدفین میں شریک ہوں اور انہی کے ہاتھوں میری لاش لحد میں اتاری جائے۔ گزشتہ آیات میں منافقین کے ساتھ زندگی کے تمام رشتے ایک ایک کر کے کاٹ دیئے گئے۔ آخری رشتہ اس کے لئے دعائے استغفار یعنی نمازِ جنازہ تھی۔ اجمالی حکم تو گزشتہ رکوع کے آخر میں دے دیا گیا تھا۔ پیشِ نظر آیت کی صورت میں آخری اور تفصیلی حکم دے دیا گیا کہ آپ مسلمانوں کیلئے ماویٰ اور ملجا ہیں۔ آپ کی دعا ان کیلئے باعث سکون ہے۔ آپ کا ان کیلئے نمازِ جنازہ پڑھنا شفاعت سے کم نہیں۔ اس آخری تعلق کو توڑتے ہوئے حکم دیا جا رہا ہے کہ اب آپ ان کی نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھیں گے اور آپ ان کی قبر پر کھڑے بھی نہیں ہوں گے۔ قبر پر کھڑے ہونے کا مطلب قبر کے قریب کھڑا ہونا یا صاحبِ قبر کیلئے دعائے استغفار کرنا ہے۔ استغفار سے پہلے روک دیا گیا ہے۔ اب کھڑے ہونے سے بھی روکا جا رہا ہے کیونکہ جہاں اللہ کے رسول کھڑے ہوں وہاں عذاب ہونا ایک مستبعد سی بات ہے۔ شانِ نزول سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے جو نہایت مخلص مسلمان تھے اور جن کا نام بھی عبداللہ تھا انہوں نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ آپ کفن کیلئے اپنا کرتہ عطا فرمائیں تاکہ اسے کفن میں شامل کر دیا جائے، ہو سکتا ہے کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ میرے باپ پر رحم فرمائے اور یہ بھی التجا کی کہ آپ میرے باپ کی نمازِ جنازہ پڑھائیں۔ آنحضرت ﷺ نے وعدہ فرما لیا۔ چنانچہ

Marfat.com

آپ نمازِ جنازہ پڑھانے کیلئے قبرستان پہنچے تو حضرت عمرِ فاروق ؓ نے باصرار آپ سے التجا کی کہ حضور آپ اس شخص کی نمازِ جنازہ کیونکر پڑھاتے ہیں جبکہ اس نے گزشتہ سالوں میں مختلف مراحل پر اسلام اور مسلمانوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور اس کا نفاق ایسا کھلا ہے کہ اسے رئیس المنافقین کہا جاتا ہے اور پھر یہ بات بھی ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کیلئے استغفار کرنے سے منع فرمایا ہے اور نمازِ جنازہ استغفار ہی تو ہے۔ لیکن آپ پر چونکہ رحمت کا غلبہ رہتا تھا اور آپ یہ خیال فرماتے تھے کہ اگر میری وجہ سے کوئی شخص اللہ کے عذاب سے محفوظ ہو جاتا ہے تو اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہے، چنانچہ آپ نے حضرت عمر ؓ کی باتیں سنیں اور مسکراتے رہے۔ البتہ! یہ فرمایا کہ مجھے میرے اللہ نے استغفار کا اختیار دیا ہے میں اس اختیار سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں رہی یہ بات کہ اللہ اسے قبول کرے گا یا نہیں تو یہ سراسر اللہ کی مشیت کا معاملہ ہے چنانچہ آپ نے عبداللہ بن ابی کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔ اس میں آئندہ کیلئے حکم دے دیا گیا کہ نہ آپ ان میں سے کسی کی نمازِ جنازہ پڑھائیں اور نہ ان میں سے کسی کی قبر پر کھڑے ہوں۔ پھر اس کے بعد ممانعت کی علت بھی بیان فرمائی کہ آپ کو نماز پڑھنے سے اس لئے روکا جا رہا ہے کہ یہ لوگ زندگی بھر اللہ اور اس کے رسول کے منکر رہے اور ان کی موت اس حال میں آئی کہ وہ فاسق اور عہد شکن لوگ تھے۔ اگرچہ وہ ایمان کا دعویٰ رکھتے تھے اور اسلام کے بعض رسوم بھی ادا کرتے تھے لیکن ان کے دل ایمان سے خالی اور عہدِ وفا سے کوسوں دور تھے۔

منافقین سے مکمل ترکِ تعلق کی یقیناً یہی وجہ ہے جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہے۔ اس کی موجودگی میں نہ ان سے جماعتی تعلقات رکھے جاسکتے ہیں اور نہ ان کیلئے دعائے مغفرت کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کی دوسری وجہ بھی ہے جس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت سے ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب منافقین سے مکمل ترکِ تعلق کرلیا جائے گا اور ان کی نمازِ جنازہ تک نہیں پڑھی جائے گی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کو پنپنے کا موقع نہیں ملے گا اور مسلمانوں کے رویے کو دیکھتے ہوئے ان کی ہمتیں ٹوٹ جائیں گی اور عام مسلمان ان سے نفرت کرنے لگیں گے جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں میں نفاق کے اثرات پھیلانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔

اسی مصلحت سے اہلِ علم نے یہ استنباط کیا ہے کہ ایسے فساق اور فجار جن کا فسق و فجور مسلمانوں میں مشہور ہو اور جن کے خلافِ اسلام اقوال و اعمال سے عام مسلمان واقف ہوں۔ تو مسلمانوں کے امام اور ان کے سربرآوردہ لوگوں کو ایسے لوگوں کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہئے تاکہ لوگوں میں یہ شعور پیدا ہو کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ مخلص نہ ہوں اور شریعتِ اسلامی کا احترام تو ایک طرف رہا اس کے بارے میں زبان کھولنے میں بھی غیر محتاط ہوں اور شعائرِ اسلام کا احترام تک ان کی وجہ سے محفوظ نہ ہو تو مسلمان معاشرے میں ایسے لوگوں کی عزت افزائی اور ان کی نمازِ جنازہ میں بڑے لوگوں کی شرکت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان کی عزت اور عظمت اسلام کی عزت و عظمت سے زیادہ ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے پھر مسلمان معاشرے میں اسلامی اقدار سرنگوں ہو جائیں گی اور اسلامی پابندیوں سے آزاد لوگ مسلمانوں کی راہنمائی کے منصب پر فائز ہو جائیں گے۔

اس آیتِ کریمہ کے نزول کے بعد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب آپ کو کسی جنازے میں تشریف لانے کیلئے کہا جاتا تو آپ پہلے مرنے والے کے متعلق دریافت فرماتے اگر معلوم ہوتا کہ وہ برے چلن کا آدمی تھا تو آپ اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے اور میت کے گھر والوں سے فرما دیتے تھے کہ تم اپنے طور سے اس کی نمازِ جنازہ پڑھ لو۔

عبداللہ بن ابی کے واقعہ میں ہم نے یہ پڑھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کے کفن میں لگانے کیلئے اپنی قمیص عطا فرمائی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس کا نفاق کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا اور آنحضرت ﷺ اس کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے تھے۔ بایں ہمہ! آپ نے اپنی قمیض دینا پسند کیوں فرمائی؟ اہلِ علم نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ جانتے تھے کہ اس کے کفن میں میری قمیض لگا دینے سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود آپ نے محض ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ جو مخلص مسلمان تھے، کی دلجوئی کیلئے اپنی قمیض عطا فرمائی تھی۔ دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ آپ کے پیشِ نظر دینی مصلحت تھی۔ آپ جانتے تھے کہ وہ چونکہ حالتِ نفاق میں مرا ہے اور قرآنِ کریم نے اس کے کفر کی گواہی دی ہے۔ اس لئے اس کی مغفرت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ! اس کے ساتھ اس بھلائی اور مروت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن لوگوں پر ابھی تک اس کے اثرات ہیں، وہ یقیناً اس سے متاثر ہوں گے اور عین ممکن ہے کہ وہ مخلصانہ اسلام کی آغوش میں آجائیں۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی توقع کے عین مطابق ایک معتدبہ تعداد دائرہ اسلام میں محض اس حسنِ اخلاق کی وجہ سے داخل ہوئی۔

Marfat.com

اہلِ علم نے قمیص دینے کی ایک اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ جنگِ بدر میں حضرت عباس ﷛ اس حال میں گرفتار ہوئے کہ ان کی قمیص پھٹ چکی تھی اور وہ تن سے ننگے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ انہیں کرتہ پہنایا جائے آپ چونکہ دراز قامت تھے، اس لئے کسی کا کرتہ انہیں پورا نہ آیا۔ عبداللہ بن ابی کا قد بھی لمبا تھا چنانچہ اس نے اپنا کرتہ حضرت عباس ﷛ کو پہننے کیلئے دیا اور وہ آپ کی قامت پر پورا اترا۔ آنحضرت ﷺ نے اس احسان کو اپنے اوپر احسان سمجھا کیونکہ وہ آپ کے حقیقی چچا تھے۔ چنانچہ آپ نے اس احسان کو بدلہ اتارنے کیلئے اپنا کرتہ عطا فرمایا۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

اور تعجب میں نہ ڈالیں آپ کو ان کے مال اور ان کی اولاد۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ ان چیزوں کے سبب سے ان کو دنیا میں عذاب دے اور ان کی جانیں کفر کے حال میں نکلیں۔ (۸۵) ﴿التوبة : ۸۵﴾

آنحضرت ﷺ سے خطاب:

اس آیت کی وضاحت آیت نمبر ۵۵ میں بھی گزر چکی ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے دوبارہ لایا گیا ہے۔ اس میں خطاب اگرچہ آنحضرت ﷺ کو ہے لیکن حقیقت میں مسلمان اس کے مخاطب ہیں۔ لیکن اس بات کا ایک پہلو چونکہ آنحضرت ﷺ سے متعلق تھا اس کی وجہ سے آنحضرت ﷺ سے خطاب فرمایا گیا ہے اور پھر ان کے واسطے سے مسلمانوں سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ سے شاید یہ کہنا مقصود ہے کہ آپ اپنی کریم النفسی اور طبعی رحمت کے باعث جہاں سے اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ آپ اس کی نہ صرف قدر فرماتے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ توجہ بھی فرماتے ہیں۔ قبائلی معاشرہ میں مال اور اولاد کی کثرت عزت اور اہمیت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ لوگ ایسے شخص کی بات توجہ سے سنتے اور قبول کرتے ہیں۔ جوان بیٹے اگر ایک معقول تعداد میں ہوں تو وہ قوت کا سامان ہوتے ہیں۔ اس لئے ایسے شخص کو لوگ یہ سمجھ کر احترام دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ قوت کے کئی بازو بھی ہیں۔ مدینہ منورہ کے منافقین معلوم ہوتا ہے کہ مال دار بھی تھے اور کثرتِ اولاد بھی رکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ ان کے اثر و رسوخ کو اسلام کی طاقت کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے شدید خواہش رکھتے تھے کہ اللہ ان کو اخلاص کی دولت دے دے تاکہ یہ اسلام کی قوت ثابت ہوں۔ لیکن پروردگار نے آنحضرت ﷺ کو ایسے منافقین کو اہمیت دینے سے روک دیا۔

مسلمانوں سے خطاب:

مسلمانوں سے یہ کہنا مقصود ہے کہ تم منافقین کی کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد کو دیکھ کر اس گمان میں مبتلا نہ ہونا کہ یہ لوگ چونکہ دنیا میں خوشحال بھی ہیں اور کثرتِ اولاد کی وجہ سے طاقتور بھی اور قبائلی معاشرہ میں یہ دونوں چیزیں بے حد اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اگر یہ لوگ اللہ کی نگاہ میں قابلِ قبول نہ ہوتے تو یقیناً پروردگار انہیں اہمیت کا حامل سروسامان نہ دیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی نگاہ میں پسندیدہ ہیں اسی لئے ان کی دنیا اچھی ہے تو یقیناً یہ آخرت میں بھی پسندیدہ ٹھہرائے جائیں گے اور انہیں جنت میں رکھا جائے گا۔ مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد یہ درحقیقت آزمائش ہیں۔ بیشتر لوگ اس آزمائش میں مبتلا ہو کر ایمان تک سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دنیا طلبی کے اسیر ہو کر آخرت کو بھول جاتے ہیں۔ بیٹوں کی طاقت میسر ہونے کی وجہ سے ظالم بن جاتے ہیں۔ یہ منافق لوگ بھی اسی صورتحال سے دوچار ہیں اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ یہ اسی طلسم میں مبتلا رہیں اور اسی حال میں ان کی جانیں نکلیں اور یہ دنیا اور اس کے وسائل ان کیلئے راحت کا سامان بننے کی بجائے جہنم کا ایندھن بن جائیں۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝ ﴿التوبة : ۸۶﴾

جب کوئی سورۃ نازل کی جاتی ہے کہ اللہ پر ایمان کا حق ادا کرو اور اس کے رسول کے ساتھ جہاد کیلئے نکلو تو اجازت طلب کرنے لگتے ہیں آپ سے، ان میں سے مقدرت والے بھی اور کہتے ہیں ہمیں چھوڑ دیجئے ہم بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ رہیں گے۔ (۸۶)

Marfat.com

سورۃ اور ایمان سے مراد:

اس آیتِ کریمہ میں ''سورۃ'' کا لفظ ممکن ہے ''سورۃ'' ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس سے سورۃ کا کوئی حصہ یا ٹکڑا مراد ہو کیونکہ بعض دفعہ کسی حکم یا کسی آیت پر بھی سورۃ کے لفظ کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ پر قرینہ شاہد ہے کہ اس سے مراد صرف اللہ کو مان لینا نہیں بلکہ ایمان کا حقیقی اور کامل معنی مراد ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ منافق ہوتا ہی وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ زبانی حد تک اس کے دعویٰ ایمان میں کوئی کمی نہیں ہوتی، البتہ وہ حقیقی ایمان کی دولت سے محروم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حقیقی ایمان ہی مراد ہے۔

منافقین کا کردار:

فرمایا یہ جارہا ہے کہ جب بھی قرآنِ کریم میں ایسا کوئی حکم نازل کیا جاتا ہے کہ تم اللہ پر مکمل ایمان لاؤ جیسا ایمان لانے کا حق ہے اور اس کے اظہار کی ایک صورت یہ ہے کہ تم اللہ کے رسول کے ساتھ اپنے ایمان کا ثبوت دیتے ہوئے جہاد اور سرفروشی کیلئے نکلو تاکہ معلوم ہو جائے کہ تمہاری اللہ کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ تو ایسا حکم آنے پر ان منافقین کا حال یہ ہے کہ ان کے غریب لوگ تو غربت کا بہانہ کر کے پیچھے رہ جانے کی اجازت طلب کریں گے ہی لیکن ان کے صاحبِ مقدرت لوگ جن کے پاس نہ دولت کی کمی ہے نہ اسلحۂ جنگ کی، نہ ان کی صحت میں کوئی خرابی ہے وہ ہر طرح سے جہاد کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ طبقہ بھی اجازت طلبی کیلئے آنحضرت کے در دولت پر آ کھڑا ہوتا ہے اور مختلف حیلوں بہانوں سے جہاد میں نکلنے سے پہلوتہی کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کا جو قول نقل کیا ہے اس کے الفاظ بتلاتے ہیں کہ یہ درحقیقت ان کا قول نہیں البتہ! ان کے دل کی آواز ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ دلوں کی ایک ایک بات کو جانتا ہے، سننے والے تو صرف زبان کی بات کو سنتے ہیں لیکن اللہ وہ بھی سنتا اور جانتا ہے جو دلوں میں چھپایا جاتا ہے۔ وہ کہنے کو تو مختلف حیلوں بہانوں کا ذکر کریں گے لیکن دل میں ان کے یہ ہے جسے وہ زبان پر نہیں لا سکتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے قول کے طور پر بیان فرمایا کہ ﴿ ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِیْنَ ''ہمیں چھوڑ دیجئے تاکہ ہم پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ رہیں'' ﴾ ہم شاید اس بات کی شناعت کو پوری طرح محسوس نہ کر سکیں لیکن جو لوگ عہدِ نبوی کے عربوں کے مزاج شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ عرب جنگ سے پیچھے رہنے کو اپنے لیے بدترین ذلت گردانتے تھے اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص بغیر کسی عذر کے اپنی قومی یا نظریاتی جنگ سے پیچھے رہا ہے تو لوگ اس سے نفرت کرتے تھے اور خود اس شخص کی اپنی نگاہوں میں بھی کوئی عزت نہیں رہتی تھی۔ اس لئے کوئی منافق بھی کھل کر یہ کہنے کی جرات نہیں کرتا تھا کہ میں جہاد میں جانا پسند نہیں کرتا کیونکہ اس سے اس کا نفاق بھی کھل جاتا اور اس کی عزت بھی جاتی رہتی۔ اس لئے قرآنِ کریم نے انکے دل کی بات کو ان کا قول قرار دے کر ان کا پول کھول دیا۔ قرآنِ کریم کا یہ اسلوب ہم اور بھی قرآنی آیات میں دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً یہود کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ وہ جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو بڑھ چڑھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ ہم انتہائی مخلص لوگ ہیں اس لئے آپ جو کچھ فرمائیں گے ہم اس کو سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ اس لئے وہ بار بار سمعنا و اطعنا کا جملہ دہراتے تھے کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی لیکن قرآنِ کریم نے ان کے اس قول کو اس سے بدل دیا جو ان کے دل میں تھا کہ زبان سے تو وہ یقیناً یہی الفاظ دہراتے ہیں لیکن ان کے دل میں سمعنا و عصینا ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی یہاں بھی اسی اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔

رَضُوْا بِاَنْ یَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ ۝ ﴿التوبة: ۸۷﴾

انہوں نے اس بات کو پسند کیا کہ وہ پیچھے رہ جانے والیوں کے ساتھی بنیں اور مہر لگادی گئی ان کے دلوں پر پس وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ (۸۷)

Marfat.com

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ گزشتہ آیت میں جو فرمایا گیا وہ ان کے دل کی آواز ہے کیونکہ رضا اور پسندیدگی دل کا فعل ہے۔ تو زبان سے وہ ہزار بہانے تراشیں لیکن ان کے دل کی رضا اس میں ہے کہ وہ جہاد میں شرکت کی بجائے گھروں میں رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں۔ "خوالف" گھروں میں رہنے والی عورتوں کو کہتے ہیں۔ مرد جنگ و جہاد اور دوسرے مردانہ کاموں کیلئے گھر سے باہر نکلتے ہیں اور عورتیں بچوں اور گھروں کی دیکھ بھال کیلئے گھروں میں بیٹھتی ہیں۔ جب مرد بھی ایسے مواقع پر جب نکلنا ضروری ہو جائے گھروں میں بیٹھ رہیں تو عرب ایسے لوگوں کو طعنہ دیتے کہ تم گھروں میں بیٹھ رہنے والی بزدل عورتوں کی طرح ہو۔ وہ تو عورت ہونے کی وجہ سے جنگوں میں نہیں نکلتیں اور تم مرد ہو کر اس طرح چھپ کر بیٹھتے ہو جیسے عورتوں کو بیٹھنا چاہئے۔ یہ بزدلی اور بے غیرتی کا ایسا طعنہ ہے جسے ایک عرب کیلئے برداشت کرنا آسان نہیں۔ چنانچہ منافقین کی غیرت کو جھنجھوڑنے کیلئے قرآن کریم نے ان کے لئے اس لفظ کو استعمال فرمایا اور ساتھ ہی ان کی چہرہ نمائی بھی فرمائی کہ ان کا اصل چہرہ یہ ہے اس لئے ان سے تم کسی ایسے کام کی توقع مت رکھو جس میں جرأت و تہور اور پامردی اور سرفروشی درکار ہو۔ ان میں صرف بزدلی ہی نہیں آئی بلکہ بزدلی ان کی پسندیدہ چیز بن گئی ہے۔ ان کی اس قلب ماہیت کی وجہ سے اللہ کا قانون حرکت میں آیا اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ اب ان کا حال یہ ہے کہ مہر لگنے کے بعد چونکہ وہ قبولیت کی استعداد سے محروم ہو گئے ہیں اس لئے اب وہ ہر طرح کی سمجھنے والی بات کے سمجھنے سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ نے انہیں اپنی قسمت بدلنے اور ایمان کو جلا دینے کا موقع دیا لیکن انہوں نے پستی میں اترنا پسند کیا۔ ابرِ رحمت برسا ہر چیز کو شاداب کر گیا لیکن ان کے ایمان کی کھیتی بنجر سے بنجر ہوتی چلی گئی۔ ایسے بدنصیب لوگ اللہ کے آخری رسول کی امت اور ایک قافلہ حق کے ہمراہی ہو کر بھی محروم ہی رہے۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

البتہ! رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اور انہی کیلئے ساری بھلائیاں ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ (۸۸) اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے ندیاں رواں ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ (۸۹) ﴿التوبة : ۸۸ تا ۸۹﴾

اہلِ ایمان کا کردار:

منافقین کا کردار بیان کرنے کے بعد اب یہ اہلِ ایمان کا کردار اور ان کا انجام بیان کیا جا رہا ہے کہ منافقین کا حال تو یہ ہے کہ انہیں مال اور اپنی جانیں عزیز ہیں اور وہ اللہ کے راستے میں کوئی خطرہ انگیخت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پامردی اور جاں سپاری کے ہر موقع پر ان کے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں لیکن اس کے برعکس اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کا کردار یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنے مال اللہ کے راستے میں لٹانے کو سعادت سمجھتے ہیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کیلئے بے قرار رہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنا ہے۔ اس مقصد کی کامیابی کیلئے مال خرچ کرنا پڑے تو ہم حاضر ہیں اور اگر جان دینی پڑے تو ہمیں اس سے بھی دریغ نہیں کیونکہ یہ سب کچھ اللہ کی دین اور اس کی عطا ہے۔ جب اس کے دین کے غلبے کیلئے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت پیش آجائے تو اسے روک کر رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ یہ جیتے ہیں تو اسی کیلئے جیتے ہیں اور مرتے ہیں تو اسی کیلئے مرتے ہیں ان کی زندگی سود و زیاں کیلئے نہیں ہوتی بلکہ صرف اسی مقصد کی بجا آوری کیلئے ہوتی ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

یہ وہ لوگ ہیں جن کیلئے بھلائیاں ہیں، راحتیں ہیں، عزتیں ہیں اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامرانی ہے۔ اللہ نے ان کیلئے ایسی جنتیں تیار کر رکھی ہیں جن کے نیچے ندیاں رواں ہیں۔ جن میں یہ ہمیشہ رہیں گے اور وہ ہیں اللہ کی رضا اور قرب سے نوازے جائیں گے۔

Marfat.com

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ

لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ
وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ
حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ
سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾ لا وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ
لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ
تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ ؕ اِنَّمَا
السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ
يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾
يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا
لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ
عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا
انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ

Marfat.com

رِجْسٌ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾ يَحْلِفُوْنَ
لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى
عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ
اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ﴿۹۷﴾ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ
بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ۗ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾
وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا
يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۗ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۗ
سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ ع

بدوی عربوں میں سے بھی بہانہ باز لوگ آئے کہ انہیں رخصت دی جائے اور بیٹھ رہے وہ لوگ بھی جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا ان میں جنہوں نے کفر کیا اور ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ کوئی حرج نہیں جہاد سے پیچھے رہ جانے پر کمزوروں، بیماروں اور ان لوگوں پر جو خرچ کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خیر خواہی کرتے رہیں خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ لوگ آپؐ کے پاس آئے تاکہ آپؐ ان کیلئے سواریوں کا انتظام کریں۔ تو آپؐ نے کہا کہ میں تمہارے لئے سواریوں کا انتظام نہیں کرسکتا تو اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے اس غم کی وجہ سے آنسو جاری تھے کہ وہ خرچ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو آپؐ سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مالدار ہیں اور وہ راضی ہوگئے اس پر کہ وہ پیچھے رہیں خانہ نشین عورتوں کے ساتھ اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی بس وہ کچھ نہیں جانتے۔ جب آپ لوٹ کر ان کی طرف جائیں گے تو وہ آپؐ کے سامنے عذر پیش کریں گے۔ کہہ دیجئے کہ بہانے مت بناؤ ہم تمہارا اعتبار نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات کی خبر دے دی ہے۔ اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے عمل کو دیکھیں گے۔ پھر تم لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو ہر پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتلائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ منافقین تمہاری واپسی پر تمہارے

Marfat.com

سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے درگزر کرو پس تم ان سے اعراض کرو بیشک وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے۔ یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے خوش ہو جاؤ پس اگر تم ان سے خوش ہو بھی گئے تو ان بدعہد لوگوں سے راضی ہونے والا نہیں۔ بدو لوگ کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور زیادہ لائق ہیں اس بات کے کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے اس کی حدود سے بے خبر ہیں اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ ان اعراب میں سے ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہ تاوان ہے اور وہ تمہارے لئے گردشوں کے متمنی ہیں حقیقت میں، انہی پر ہے بری گردش اللہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ اور ان دیہاتیوں میں سے وہ بھی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور سمجھتے ہیں کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں قربِ الٰہی اور رسول پاک کی دعائیں لینے کا ذریعہ ہے۔ بیشک یہ ان کیلئے واسطۂ قربت ہی ہے اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا، بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ (۹۰ تا ۹۹) (رکوع: ۱۲)

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴿التوبة : ۹۰﴾

(بدوی عربوں میں سے بھی بہانہ باز لوگ آئے کہ انہیں رخصت دی جائے اور بیٹھ رہے وہ لوگ بھی جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے جھوٹ بولا ان میں جنہوں نے کفر کیا ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ (۹۰)

جنگ تبوک کے حوالے سے منافقین کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ فرما کر ان کے اعمال پر تنقید جاری ہے۔ انہیں گروہوں میں سے ایک گروہ اعراب بھی ہے یعنی وہ عرب بدو جو اطراف مدینہ میں رہتے تھے۔ یا بادیہ نشین تھے۔ ان میں سے دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک قسم تو وہ تھی جو نبی ﷺ کے خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ جنگ سے پیچھے رہنے کی اجازت حاصل کر لیں۔ انہوں نے آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آپ کے ساتھ نہ چلنے کے لیے عذر پیش کیے۔ لیکن ان اعذار کی نوعیت ایسی تھی جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان عذروں میں حقیقت نام کی کوئی چیز نہیں سراسر بہانہ سازی اور سخن سازی کی ایک کوشش تھی۔ کیونکہ مُعَذِّرُوْن، معذر کی جمع ہے۔ معذر کہتے ہیں جھوٹ موٹ عذر پیش کرنے اور بہانہ سازی والے کو معتذر بھی عذر پیش کرنے والے کو کہتے ہیں لیکن اس میں سچ اور جھوٹ دونوں باتوں کا احتمال ہوتا ہے لیکن معذر صرف جھوٹ موٹ عذر پیش کرنے والے کو کہتے ہیں جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ یہاں بیان کرنا یہ مقصود ہے کہ یہ لوگ حق سے اتنے دور ہیں کہ اللہ کے راستے میں نکلنا تو بڑی بات ہے ان کے لئے اس سے بچنے کی خاطر جھوٹ بولنے میں بھی کوئی عار نہیں۔ بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے ہیں۔

ان میں دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو پہلی قسم کے لوگوں سے ایک قدم آگے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگ تو بہانوں کا سہارا لے کر معرکہ حق و باطل سے پیچھے رہتے تھے لیکن یہ لوگ تو اس تکلف کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے سمع و اطاعت کا عہد کیا تو صرف زبان کی حد تک کیا بلکہ صاف صاف جھوٹ بولا یہ دیکھتے ہوئے کہ اسلامی ریاست ایک قوت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے اور عرب کی دوسری قوتیں اس کے مقابلے میں پسپا ہوتی جا رہی ہیں انہوں نے محسوس کیا کہ اب ان کے پاس اطاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تو انہوں نے مرعوب ہو کر اسلام کی اٹھتی ہوئی طاقت کے سامنے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے سر جھکا دیا۔ ان میں سے بیشتر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح قبائل کی لڑائیوں میں جو قبیلہ غالب آ جائے وہ دوسروں پر اپنی برتری نافذ کر دیتا ہے۔ اور دوسرے قبائل وقتی طور پر اس کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ لیکن جب وقت آتا ہے تو پہلی فرصت میں بغاوت کر دیتے ہیں۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ اسلام اللہ کا بھیجا ہوا ایک دین ہے اور نبی کریم ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ دین درحقیقت ایک روحانی قوت ہے جس کے نتیجے میں انسان میں انسانیت پیدا ہوتی۔ اور اللہ کی زمین پر ایسا انسانی معاشرہ آباد ہوتا ہے جو انسانی اقدار کا پیکر اور روحِ زمین پر بسنے والوں کے لیے اللہ کی طرف سے رحمت ہوتا ہے لیکن خیر و فلاح کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک ریاستی قوت بھی درکار ہوتی ہے۔ اور انسانوں کے جتھوں کو بکھیرنے کے لیے خدائی فوجداروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت کی خاطر اسلامی ریاست

Marfat.com

وجود میں آتی اور مسلمانوں کو جہاد کا حکم دیا جاتا ہے اور انسانی مفاسد کو کنٹرول کرنے کے لیے اسلامی ریاست کا سب سے بڑا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کو نافذ کرے۔ ظاہر بین نگاہیں اعراب کی طرح صرف ریاستی قوت کو دیکھتی ہیں تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہے کہ یہ بھی دنیا کی قوتوں میں سے ایک قوت ہے۔ اور اس کے پس پردہ حقیقی مقاصد ان کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ منافقین بھی اسی غلط فہمی کے باعث مدینے کی ریاست کے اطاعت گزار تو بن گئے اور اس کے لیے اللہ اور اس رسول ﷺ سے سمع و اطاعت کا عہد بھی کر لیا۔ لیکن اس کی حیثیت زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے جنگ تبوک کے لیے نکلنے پر نکلنے کا حکم ہوا تو بعض منافقین نے تو جھوٹ موٹ عذر پیش کیے اور بعض نے یہ تکلف بھی گوارا نہیں کیا اور بے جھجک گھروں میں بیٹھے رہے۔

اگلے رکوع میں بتایا جا رہا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اعراب کی اکثریت ایسے ہی منافقین پر مشتمل تھی۔ لیکن ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر مخلصانہ ایمان رکھتے تھے۔ اس لیے اس آیت کریمہ کے آخری حصے میں 'منہم' کا لفظ لا کر ان کا استثناء کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے منافقین کو دردناک عذاب پکڑے گا۔ دنیا میں بھی رسوائی سے دوچار ہونگے اور آخرت میں بدترین عذاب کا شکار ہونگے۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۙ وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ؕ

کوئی حرج نہیں جہاد سے پیچھے رہ جانے پر کمزوروں بیماروں اور ان لوگوں پر جو خرچ کرنے کی مقدرت نہیں رکھتے۔ جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خیر خواہی کرتے رہیں خوب کاروں پر کوئی الزام نہیں اور اللہ در گزر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور نہ ان لوگوں پر کوئی الزام ہے کہ جب وہ لوگ آپؐ کے پاس آئے تاکہ آپؐ ان کے لیے سواریوں کا انتظام کریں۔ تو آپؐ نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے اس غم کی وجہ سے آنسو جاری تھے کہ وہ خرچ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (۹۲،۹۱)

ان دو آیات کریمہ میں پروردگار نے (یہ واضح کرنے کے لیے کہ کون لوگ ایسے ہوتے ہیں جو جہاد فرض ہو جانے کے بعد بھی معذور کہے جا سکتے ہیں۔ اور ان کے عذر کے ساتھ ساتھ وہ کیا لازمی صفات ہیں جو کسی معذور کو اللہ کے ہاں معذور ثابت کرتی ہیں)۔ چند فیصلہ کن باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ اللہ کے ہاں شرکت جہاد سے معذور تین طرح کے لوگ ہیں کوئی چوتھی قسم انسانوں کی ایسی نہیں جو جہاد سے پیچھے رہنے سے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتی ہو۔ اور محض بہانہ سازی سے اپنے آپ کو معذور ثابت کرے۔ ان میں سے پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جنھیں ضعیف کہا جاتا ہے۔ ضعیف سے مراد ہر وہ شخص ہے جو بڑھاپے کا شکار ہے یا جسمانی طور پر کمزور پیدا ہوا اور عمر کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی کمزوری نے کبھی اسے نہیں چھوڑا یعنی جو شخص میدان جنگ میں دشمن کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اس کے بازوؤں میں اسلحہ جنگ استعمال کرنے کی ہمت نہیں یا وہ کسی ایسے نفسیاتی عارضہ میں مبتلا ہے کہ حرب و ضرب اس کے بس کی بات نہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنھیں مریض اور بیمار کہا جاتا ہے بیماری پیدائشی ہو یا زندگی کے کسی مرحلے پر لاحق ہو گئی ہو یا وہ ہاتھ یا پاؤں سے معذور ہو۔

تیسری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جو صحت مند اور توانا ہیں لیکن وہ اپنے پاس وسائل جنگ نہیں رکھتے اور نہ حکومت کے پاس وسائل کی ایسی فراوانی ہے کہ وہ ان کے لیے اسلحہ اور سواری کا انتظام کر سکے وہ ہر حال میں اللہ کے راستے میں نہ صرف کہ شرکت کرنے پر آمادہ ہیں بلکہ وہ دل و جان سے قربان ہونے کو تیار ہیں لیکن جب تک ان کے پاس وسائل جنگ مہیا نہ ہوں وہ نکلنے سے معذور ہیں جنگ تبوک کے موقع پر ایسا ہی منظر دیکھنے میں آیا کہ ملک کے گوشے گوشے سے والنفیر زکی ایک بڑی تعداد امڈ امڈ کر مدینے پہنچی۔ ان میں سے ایک ایک مجاہد آنحضرت ﷺ سے التجا کرتا کہ حضور

Marfat.com

میرے لیے سواری کا انتظام فرمائیے۔ مجھے اسلحہ جنگ دیجئے۔ میں اللہ کے راستے میں اپنا فرض انجام دینے کی لیے بے قرار ہوں۔ آنحضرت ﷺ جواب میں معذوری کا اظہار فرماتے کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں تو وہ اپنے شوقِ فراواں کے ہاتھوں روتے ہوئے واپس پلٹتے اور عدم شرکت کی محرومی کا غم ان کے دلوں کو غم سے بھر دیتا۔

یہ ہیں وہ تین طرح کے معذور لوگ۔ جو اپنے شرعی عذر کے باعث قیامت کے دن اس بات سے معذور سمجھے جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی احتیاطی تدابیر بھی ذکر فرمائی گئی ہیں جن کی عدم موجودگی کے باعث یہ معذور لوگ دنیا کی نگاہوں میں تو معذور سمجھے جاسکتے ہیں لیکن اللہ کی نگاہوں میں معذور نہیں ہوں گے۔ ان میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خیر خواہ ہوں یعنی ایک شخص ضعف یا بیماری یا وسائل کی عدم دستیابی کے باعث معذور ہے لیکن اپنی معذوری کو ایک بہت بڑی سعادت سے محرومی کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے جی ہی جی میں خوش ہوتا ہے کہ شکر ہے بڑے اچھے موقع پر یہ عذر لاحق ہوا اور اس طرح سے جنگ کی ہولناکیوں اور سفر کی صعوبتوں سے جان بچ گئی۔ اور اگر یہ معذوری نہ ہوتی تو یقیناً نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کے لیے نکلنا پڑتا تو ایسے شدید موسم میں کس طرح اس کا متحمل ہوسکتا بڑے اچھے موقعے پر معذوری لاحق ہوئی اور میں اس مصیبت سے بچ گیا۔ ان احساسات کے ساتھ چاہے معذوری کتنی بھی واقعی ہو اسے اللہ کے ہاں معذوری نہیں کہا جاسکتا۔ اس سے برعکس حقیقی اور قابل قبول معذوری وہ ہے کہ آدمی بیماری کی وجہ سے صاحب فراش ہو لیکن یہ سوچ کر اس کا بستر کانٹوں کا بستر بن جائے کہ ہائے میں کیا کروں کیسے وقت میں مجھے بیماری نے آ پکڑا ہے۔ جب کہ بہت بڑی قوت سے مقابلہ ہے ایک ایک سپاہی کی ضرورت ہے اسلام اور مسلمانوں کی اکیس سالہ جدوجہد ترازو میں ہے ایسے موقع پر بجائے اپنا کردار ادا کرنے کے میں بستر پر پڑا آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ اپنے تیمارداروں اور اپنی اولاد کو بار بار مجبور کرتا ہے کہ تم میری دیکھ بھال کے لیے میرے پاس رہنے کے لیے اصرار نہ کرو مجھے اللہ کے حوالے کرو گھر کی مستورات میری دیکھ بھال کے لیے کافی ہیں میدان جنگ تمہیں بلا رہا ہے تم وہاں جا کر اپنا فرض ادا کرو۔ وہ معذور ہونے کے باوجود اپنے گھر میں ایک ایسی فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں اسلامی جذبات ابلتے اور اسلامی شجاعت پروان چڑھتی ہے۔ فیصلہ کن بات یہ فرمائی کہ جب دین کے تحفظ اور اس کی سربلندی یا ملک کے دفاع کے لیے پکارا جاتا ہے تو اس وقت وہ شخص اللہ کے ہاں سرخرو ہوتا ہے جو دوسرے سے آگے بڑھ کر اس راستے میں اپنا فرض انجام دینے کی کوشش کرتا ہے وہ دوسروں کی کمزوریوں کو عذر نہیں بناتا بلکہ وہ اس کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہیں۔ وہ کسی مقام پر رکنے کی بجائے آگے بڑھ جانے کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ وہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر تسلیم جاں کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو محسنین سے تعبیر فرمایا یوں تو صحابہ کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے لیکن بطور خاص حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ ابن جحش کی دعائیں اس کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔ یہ ہیں وہ معذور جن کا عذر اللہ کے ہاں قابل پزیرائی ہے ایسے عذر رکھنے والے لوگ نہ صرف کہ قابل معافی سمجھے جاتے ہیں بلکہ ان کا حقیقی مقام و مرتبہ اللہ کے ہاں وہ ہے جس کا ذکر غزوہ تبوک سے واپسی پر اثنائے سفر میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ ان بالمدینۃ اقواما ماسرتم مسیرا ولا قطعتم وادیا الا کانوا معکم ○ مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے کوئی وادی طے نہیں کی اور کوئی کوچ نہیں کیا جس میں وہ تمہارے ساتھ ساتھ نہ رہے ہوں صحابہ نے تعجب سے پوچھا کیا مدینہ ہی میں رہتے ہوئے آپ نے فرمایا ہاں مدینہ ہی میں رہتے ہوئے کیونکہ مجبوری نے انہیں روک لیا تھا۔ ورنہ وہ خود رکنے والے نہ تھے۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

الزام تو بس ان لوگوں پر ہے جو آپ سے اجازت مانگتے ہیں حالانکہ وہ مالدار ہیں اور وہ راضی ہوگئے اس پر کہ وہ پیچھے رہیں خانہ نشین عورتوں کے ساتھ اور اللہ نے ان دلوں پر مہر لگا دی بس وہ کچھ نہیں جانتے۔ (۹۳)

منافقین چونکہ مختلف بہانوں اور چرب زبانی سے کام لے کر آنحضرت ﷺ سے جنگ سے پیچھے رہنے کی اجازت لینے کی کوشش کرتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی کریم النفسی کے باعث بعض کامیاب بھی ہو جاتے تھے پروردگار نے ایسے تمام اشتباہات کے مواقع کو ختم کرنے کے لیے گزشتہ دو آیات کریمہ میں تفصیل سے وضاحت فرما دی کہ اللہ کے نزدیک حقیقی معذورین کون ہیں۔

Marfat.com

اس آیت کریمہ میں فرمایا جارہا ہے کہ وہ لوگ جو کسی طرح بھی معذورین میں شامل نہیں اور جن کا پیچھے رہنا یا جنگ میں شرکت سے پیچھے رہنے کے لیے عذر پیش کرنا اللہ کے نزدیک سخت قابل اعتراض ہے اور قیامت کے دن عذاب کا باعث ہے۔ وہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس وسائل جنگ کی کوئی کمی نہیں یہ لوگ مالی لحاظ سے اغنیا یعنی مالداروں میں شامل ہیں۔ سواری بھی رکھتے ہیں اور اسلحۂ جنگ بھی، اس کے باوجود جیسے ہی اللہ کے راستے میں نکلنے کا اعلان ہوتا ہے وہ آپ کے پاس اجازت طلبی کے لیے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ان کے دل کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کسی طرح بھی جہاد فی سبیل اللہ میں شرکت پر آمادہ نہیں بلکہ اس کے برعکس وہ عرب کی عام خصوصیات سے بھی تہی دامن ہو چکے ہیں کوئی عرب جنگ کے موقع پر خانہ نشین عورتوں کے ساتھ گھر میں بیٹھ رہنے کو پسند نہیں کرتا۔ خوالف ان عورتوں کو کہتے ہیں جو گھروں کے کام کاج کے لیے گھروں میں رہتی ہیں عربوں میں چونکہ مردانگی کا احساس کچھ زیادہ ہی پایا جاتا تھا اس لیے جن اعمال کو عورتوں کی خصوصیت سمجھا جاتا تھا وہ انہیں اختیار کرنا اپنے لیے بے غیرتی کا باعث سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں نے پیچھے رہنے کی اجازت طلب کر کے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کیے ہوئے سمع و اطاعت کے عہد کو بھی توڑ ڈالا اور خانہ نشین عورتوں کے ساتھ گھر میں رہنا پسند کر کے بے غیرتی کو بھی پسند کر لیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہر طرح کی خیر کی صلاحیت سے محروم کر لیا۔ اس پر اللہ کا قانون حرکت میں آیا اور اس نے ان کے دلوں پر مہر کر دی جس کے نتیجے میں یہ ہر صحیح بات کی شناخت اور اس کی قبولیت کی صلاحیت سے محروم کر دیئے گئے۔ اب وہ ایک ایسی دیوار کی مانند ہیں جس کے ساتھ سر پٹخا تو جا سکتا ہے انہیں کوئی بات سمجھائی نہیں جا سکتی کیونکہ وہ ہر صحیح بات جاننے اور قبول کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ؕ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ؕ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ٥

جب آپ لوٹ کر ان کی طرف جائیں گے تو وہ آپ کے سامنے عذر پیش کریں گے۔ کہہ دیجئے کہ بہانے مت بناؤ ہم تمہارا اعتبار نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے حالات کی خبر دے دی ہے۔ اب اللہ اور اس کا رسول تمہارے عمل کو دیکھیں گے۔ پھر تم لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو ہر پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتلائے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔ (۹۴)

پیشتر ازیں متعدد آیات میں ان منافقین پر تنقید ہوئی ہے جو محض نفاق کی وجہ سے معرکۂ حق و باطل میں شرکت سے گریز کرتے تھے۔ اور ایسے کسی بھی نازک موقع سے بچ نکلنے کے لیے بہانے تراشتے تھے۔ جس میں انہیں مال خرچ کرنا پڑتا یا کسی بھی صعوبت سے واسطہ پڑنے کا اندیشہ ہوتا ان کی بہانہ جوئی کے مختلف پہلوؤں کو واضح فرمایا اور ان کی ایک ایک علامت کو آشکارا کیا۔ خصوصاً غزوۂ تبوک کے موقع پر ان کے طرزِ عمل کو مسلمانوں کے سامنے واشگاف کیا۔ تاکہ مسلمان نفاق کی شناخت پیدا کر سکیں۔ اب پیش نظر آیت کریمہ میں ان منافقین کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے جن سے غزوۂ تبوک سے واپسی پر آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو سابقہ پیش آنے والا ہے پیشتر اس کے کہ ہم اس آیت کریمہ میں فرمودات کی وضاحت کریں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں اسلام اور کفر کی کش مکش میں اور غزوۂ تبوک کے موقع پر جو کچھ بھی منافقین نے کیا اور جیسی کچھ حرکتیں ان سے سرزد ہوئیں وہ بہر حال تاریخ کا حصہ ہیں۔ جس سے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ جب کبھی اسلامی ریاست اور مسلمان معاشرہ کو ایسی صورتحال سے واسطہ پڑے تو تاریخ کے اس باب سے مسلمانوں کو راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ لیکن عام حالات میں ہم شاید اس سے زیادہ کوئی دلچسپی نہیں لے سکتے کہ یہ باتیں اسلامی تاریخ کا حصہ ہیں اور اللہ کی کتاب میں ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اگر گہری نظر سے کام کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت اس سے زیادہ کا تقاضا کر رہی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں یہ کتاب ہدایت ہے ایسی کتاب میں جہاد و قتال میں منافقین کے طرز عمل کی تفصیلات کو بیان کرنا تاریخ کے مقصد کے لیے نہیں ہو سکتا یقیناً اس کا مقصد ہدایت کے کسی پہلو کو اجاگر کرنا ہے۔

Marfat.com

معمولی غور وفکر سے چند باتیں دماغ کے افق پر روشن ہونے لگتی ہیں جن میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ یہ تصور دینا مقصود ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو غالب اور نافذ کرنا ہے اس مقصد کے حصول کے لیے ناگزیر ہے کہ حق و باطل میں کش مکش ہو کیونکہ کفر کی قوتیں ایک لمحے کے لیے بھی غلبۂ دین کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتیں۔ تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

اللہ کے دین کو غالب و نافذ کرنا ایک ایسا فریضہ ہے جس کا مکلف ہر دور کے مسلمان کو ٹھہرایا گیا ہے جس طرح یہ فریضہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں ادا کیا گیا اسی طرح قیامت تک ہر دور میں مسلمان اس کے ادا کرنے کے پابند ہیں۔ ان دونوں باتوں میں لزوم کا رشتہ ہے جہاں بھی مسلمانوں کو کوئی قطعۂ زمین ملے گا ان کی ریاست قائم ہوگی۔ وہ اللہ کے دین کو غالب و نافذ کرنے کے پابند ہونگے۔ اور جب بھی مسلمان اپنے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے کمربستہ ہونگے تو اسلامی قوتیں ان کا راستہ روکیں گی لا محالہ تصادم ہوگا۔ اس کا نتیجے میں دو حقیقتیں خود بخود منظر عام پر آئیں گی۔ مخلص مسلمان سرفروشی جاں سپاری اور استقامت کی تاریخ زندہ کریں گے۔ اور منافق بہانہ اور جوئی سخن سازی سے کام لے کر اپنے آپ کو اس پرخاش سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو ان آیات میں بیان ہو رہے ہیں۔ اور یہی اسلامی زندگی کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لازمی ذرائع ہیں۔ جن سے مسلمان کو کسی دور میں بھی مفر نہیں ان آیات کریمہ میں ان حقائق کو تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان ہر دور میں اپنے فرض کو پہچانیں اور ان آیات میں اس حقیقت کو پانے کی کوشش کریں کہ جہاد ہی میں مسلمانوں کی زندگی مسلمانوں کی سرفرازی اور مسلمانوں کی فلاح ہے۔ اور اس فرض کو انجام دیتے ہوئے وہ ہمیشہ اس بات کا جائزہ لیں کہ ان کی آستینوں میں کہیں سانپ تو موجود نہیں کہیں ان کے معاشرے میں عبداللہ بن ابی کی نسل تو نہیں پل رہی کہیں ان کے قلعوں کے محافظ ایسے لوگ تو نہیں جن کی ہمدردیاں دشمن کے ساتھ ہوں جو مفادات کے بندے اغراض کے پتلے اقتدار کے پجاری لیکن اسلام کے مستقبل اور مسلمانوں کے دشمن ہوں ایسے ہی لوگوں کو منافق کہا جاتا ہے جس قوم کی صفوں میں منافق موجود ہوں اس قوم کا کوئی قلعہ محفوظ نہیں ہوتا۔ انہیں حقائق کی طرف توجہ دلانے کے لیے یہاں تفصیل سے منافقین کو زیر بحث لایا گیا ہے

اس آیت کریمہ میں پہلے تو اشارۃً ایک ایسی خبر دی گئی ہے جو مسلمانوں کے لیے حیات بخش اور منافقین کے لیے موت کا سامان ہے منافقین یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ مسلمانوں کو مذہبی جنون نے جس فریب میں مبتلا کر رکھا ہے اس کے زیر اثر وہ قیصر جیسی قوت سے ٹکرانے کے لیے تبوک کا سفر کرنے کی جو غلطی کر چکے ہیں اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی یہ نوزائیدہ قوت کچل دی جائے گی ان کی چند ہزار فوج قیصر کی لاکھوں پر مشتمل فوج کا مقابلہ نہیں کر سکے گی عربوں کو کبھی کسی منظم فوج سے لڑنے کا تجربہ نہیں ہوا عرب قبائلی لڑائیوں سے واقف ہیں وہ ملکی لڑائیوں کو کیا جانیں۔ یہ تو پہلے ہی مرحلے میں ڈھیر ہو کر رہ جائیں گے۔ تم چند ہی دنوں میں مسلمانوں کے بارے میں سن لوگے کہ مسلمان فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور دشمن نے انہیں باندھ لیا ہے منافقین یہ ارادہ کر چکے تھے کہ جیسے ہی کوئی مسلمانوں کے بارے میں ناخوشگوار خبر پہنچی تو عبداللہ بن ابی کی حکومت کا اعلان کر دیں گے۔ یہ انہیں خوش کن خوابوں اور خیالوں میں شب و روز گزار رہے تھے نبی کریم ﷺ پر تبوک کے راستے میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس میں یہ خبر دی گئی کہ آپ اللہ کے فضل وکرم سے مظفر و منصور مدینہ میں تشریف لے جائیں گے۔ اور آپ کے پہنچتے ہی منافقین اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر غزوۂ تبوک میں عدم شرکت پر قسم قسم کے عذر پیش کرینگے۔ جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہم دل و جان سے آپ کے ساتھ نکلنے پر آمادہ تھے لیکن چند ایسے موانع پیش آئے کچھ ایسی مجبوریاں دامن گیر ہوئیں کہ ہم خواہش کے باوجود آپ کی ہم رکابی کے شرف سے محروم رہے آنحضرت ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اے پیغمبر ان سے کہہ دیجیے کہ تم کوئی عذر پیش نہ کرو ہمیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے حالات سے باخبر کر دیا ہے۔ تمہارا انفاق اور جھوٹ ہم پر کھول دیا گیا ہے ایسی صورت میں ہم تمہاری کسی بات کا اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ تم اپنی چرب زبانی سے ہمیں تو دھوکہ دے سکتے ہو لیکن اللہ جو ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے اسے تو تم دھوکہ نہیں دے سکتے اب تمہارے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ تم خود اپنی اصلاح کی کوشش کرو تم نے آج تک پردۂ اخفا کو اپنی بقا کا ذریعہ بنایا ھے لیکن اب یہ پردہ اٹھ چکا ھے اب عافیت اسی میں ھے کہ اندر سے اپنی اصلاح کرو اللہ اور

Marfat.com

اس کا رسول تمہارے طرزِ عمل کو دیکھیں گے اسی کے مطابق آئندہ تم سے سلوک ہوگا لیکن اگر آئندہ بھی تم نے اپنی موجودہ روش جاری رکھی تو پھر یاد رکھو تمہارا سابقہ ایک ایسی ذات سے پڑنے والا ہے جو ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے اور خفیہ اور اعلانیہ سے باخبر ہے جب تم اس کے سامنے جاؤ گے تو وہ تمہیں بتلائے گا کہ تم دنیا میں کیا کرتے رہے ہو۔

اس آیت کریمہ کے الفاظ کو ذرا غور سے دیکھیے ' قل ' سے آنحضرت ﷺ کو خطاب ہے حالانکہ اوپر والے ٹکڑے میں خطاب جمع سے ہے اور بعد کے جملوں میں جمع ہی کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اس میں بظاہر ایک ہی آیت میں خطاب کی نوعیت بدلنے سے خطاب میں عدم مناسبت کا شبہ ہونے لگتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شبہ کا خیال قلت تدبر کا نتیجہ ہے ذرا غور فرمائیے پہلے جملے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ مسلمانوں جب تم مدینے پہنچو گے تو منافقین اپنے طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے تمہارے پاس عذر لے کر آئیں گے اس سے فوری یہ سوال پیدا ہوگا کہ مسلمانوں کو اس کا کیا جواب دینا چاہیے جو آدمی بھی دین کی حقیقت کو سمجھتا ہے اسے خوب معلوم ہے کہ زندگی کے تمام ہدایت طلب معاملات میں ایک مومن ہمیشہ اللہ کی رسول کی طرف دیکھنے کا پابند ہے چنانچہ اس موقع پر بھی مسلمانوں نے راہنمائی کی طلب میں اللہ کے رسول کی طرف دیکھا رسول نے اللہ سے راہنمائی طلب کی ادھر سے حکم آیا کہ آپ مسلمانوں سے یہ کہیے کہ وہ منافقین کو یہ جواب دیں کیونکہ منافق اس قابل نہیں ہیں کہ آپ خود انہیں منہ لگائیں مسلمانوں کے جواب دینے کے بعد پھر سب مسلمانوں کا مجموعی طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم ہرگز تمہارے بہانوں پر اعتبار نہیں کرینگے کیونکہ تمہارے حالات سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں آگاہ کر دیا ہے اس تناظر میں اگر آپ اس آیت کریمہ کو پڑھیں تو خطاب کے صیغے بدلنے کے باوجود کہیں عدم مناسبت کا گمان نہیں ہوتا البتہ ایک بات ابھر کے سامنے آتی ہے کہ اللہ کا نبیؐ ہر وہ بات کہتا ہے جو اللہ کی طرف سے کہی جاتی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ اللہ کے نبی کی زبان سے نکلنے والی ہر بات جس کا تعلق دین سے ہو اللہ کی بات ہوتی ہے مولانا رومی نے ٹھیک کہا کہ:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مومن اور منافق کی پہچان یہ ہے کہ مومن کی ہدایت کا سرچشمہ اللہ کے رسول کی ذات ہے اس کی پوری زندگی اللہ کے رسول کے گرد گھومتی ہے پیغمبر کی زبان تمام مخلص مسلمانوں کے دلوں کی ترجمان ہے۔ پیغمبر اور امت کے درمیان ایسی کامل ہم آہنگی ہوتی ہے کہ جس میں کہیں رشتۂ فکر ٹوٹتا ہے اور نہ رشتۂ عمل مجروح ہوتا ہے جب تک ایمان روشنی دیتا ہے اس وقت تک اس رشتے میں کہیں دراڑیں نہیں آتیں اور جب ایمان میں نفاق نقب لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو فکری اور عملی رشتوں میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

(منافقین تمہاری واپسی پر تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھائیں گے تاکہ تم ان سے درگزر کرو پس تم ان سے اعراض کرو بیشک وہ ناپاک ہیں اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے بدلہ اس کا جو وہ کمایا کرتے تھے۔ (۹۵)

اس آیت کریمہ میں اعراض کا مادہ دو دفعہ استعمال ہوا ہے اور یہ دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے عام عربی زبان میں بھی اعراض کا ان دو معنوں میں استعمال شائع و ذائع ہے ایک معنی ہے کسی کا عذر قبول کر کے درگزر کرنا اور دوسرا معنی ہے منہ پھیر لینا اور قطع تعلق کر دینا آیت میں دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے

سابقہ آیت کریمہ کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مضمون ایک تدریج سے آگے بڑھ رہا ہے پہلی آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ منافقین مسلمانوں کے پاس آئیں گے اور آکر عذر پیش کرنے کی کوشش کریں گے تو تم ان کے عذر سننے سے انکار کر دینا اس آیت کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ تمہارا عذر سننے سے انکار منافقین کو آنے والے حالات کی خبر دے دے گا چنانچہ وہ موقع کی تلاش میں رہیں گے آنحضرت ﷺ کے پاس جانے کی تو ہمت

Marfat.com

نہیں کرینگے البتہ مسلمانوں میں اپنے ہمدرد پیدا کرنے کی کوشش کریں گے انہیں مختلف حوالوں سے اور مختلف مواقع پر درخواست کرینگے کہ ہم سے آج تک جو کچھ ہوا آپ اس سے درگزر کرنے کی کوشش کریں۔ آئندہ کے لیے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آپ ہم سے ایسی کسی کمزوری کا ارتکاب ہوتا نہیں دیکھیں گے لیکن پروردگار نے واشگاف انداز میں مسلمانوں سے فرمادیا کہ نو سال تک انہیں سنبھلنے کا موقع دیا گیا اور ان کے نفاق پر پردہ ڈالا گیا لیکن انہوں نے اپنی اصلاح کی بجائے مسلمانوں سے بدخواہی اور اسلام سے خفیہ دشمنی کا رویہ جاری رکھا اب وہ اس رویہ میں اتنے پختہ ہو چکے ہیں کہ ان کے اندر اصلاح کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ان کا وجود پوری طرح متعفن ہو چکا ھے اس لیے ان سے بالکل قطع تعلق کر دو حضورؐ سے فرمایا لا تجالسوھم ولا تکلموھم (نہ ان کے ساتھ بیٹھو نہ ان سے بات چیت کرو) کیونکہ یہ پلید ہیں اور ان کی فکری اور عملی گندگی تمہیں بھی آلودہ کر دے گی جس طرح گندگی کے ڈھیر سے دور رہنے ہی میں عافیت ہے اسی طرح ان سے قطع تعلق میں مسلمانوں کی بھلائی ہے یہ اگر اپنی اصلاح اب بھی نہیں کرتے تو بالآخر ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا یہ اپنے اعمال کی پاداش میں جہنم کی نذر کر دیئے جائیں گے۔

(يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○

یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھائیں گے تا کہ تم ان سے خوش ہو جاؤ پس اگر تم ان سے خوش ہو بھی گئے تو اللہ ان بدعہد لوگوں سے راضی ہونے والا نہیں۔ (۹۶)

اس آیت کریمہ میں ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا جا رہا ہے کہ پہلے تو وہ تمہیں درگزر کرنے پر مائل کرینگے تا کہ تم ان کے اعمال پر انہیں کوئی سزا نہ دو اور اگر تم میں سے کچھ لوگوں نے تھوڑا سا بھی مروت کا سلوک کیا تو وہ قسمیں کھا کھا کر کوشش کریں گے کہ تمہیں کسی حد تک راضی کر لیں اور شریف آدمی کی یہ کمزوری ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص بار بار عذر پیش کرتا ہے اور اپنی بے گناہی کا قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے تو بالآخر اس کی بات مان لیتا ہے منافقین چونکہ اس معاملے میں بڑے مشاق تھے اس لیے وہ خوب جانتے تھے کہ مسلمانوں کو کس طرح راضی کیا جا سکتا ہے اس لیے پروردگار نے صاف فرمایا کہ مسلمانو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو اللہ کبھی ان سے راضی نہیں ہوگا کیونکہ اس کے یہاں دل اور زبان کے فاصلے کو چھپایا نہیں جا سکتا وہ جانتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف جھوٹ بولتے ہیں بلکہ جھوٹی قسمیں بھی کھاتے ہیں ان کا حقیقی کردار ایک مومن کا نہیں بلکہ بدعہد اور بداطوار آدمی کا کردار ہے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

(بدو لوگ کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں اور زیادہ لائق ہیں اس بات کے کہ اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ اتارا ہے اس کی حدود سے بے خبر رہیں اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا بڑا دانا ہے۔ (۹۷)

اس سے پہلے زیادہ تر منافقین مدینہ کا تذکرہ ہوا اب ان منافقین کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے جو دیہات اور صحرا میں آباد تھے ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ مدینہ منورہ کے اطراف و صحرا میں جو لوگ آباد تھے انہیں اعراب اور بدو کہا جاتا تھا یہ لوگ اپنے معتقدات خیالات اور طور اطوار میں بڑے شدید اور جامد واقع ہوئے تھے آباؤ اجداد کی روایت کو اپنے لیے حرف آخر سمجھتے تھے ابتدائی سالوں میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جب اسلام اور کفر میں تصادم شدید ہو گیا تو ان کی ساری ہمدردیاں مشرکین کے ساتھ تھیں یہ درپردہ ان کی حمایت کرتے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ اسلام ایک غالب قوت میں تبدیل ہو گیا ہے اور مسلمانوں کی نوزائیدہ مملکت ایک مضبوط ریاست کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ تو انہوں نے شروع میں مسلمانوں کے ساتھ تعلقات پیدا کیے اور پھر رفتہ رفتہ بظاہر اسلام کے دائرے میں آ گئے لیکن ان کی اکثریت اپنے خیالات کے اعتبار سے کافر و مشرک ہی رہی جنگ تبوک میں نفیر عام ہونے کے باعث سب کے لیے نکلنا لازم ہو گیا ان کا نفاق اور کھل کر سامنے آیا سورہ توبہ میں چونکہ مسلمانوں کے مخالف تمام گروہوں سے متعلق پالیسی کا اعلان ہو رہا ہے۔ تو جہاں دوسرے منافقین کے حالات و اطوار اور علامات کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے وہیں ان اعراب کے بارے میں بھی مسلمانوں کو واضح طور پر بتایا جا رہا ہے کہ ان سے معاملہ کرتے ہوئے تمہارے سامنے یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ لوگ دیگر منافقین

Marfat.com

کی طرح صرف دو چہرے نہیں رکھتے اور صرف دھوکہ دہی پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کے اندر ایک جمود کی شدت پائی جاتی ہے یہ سیاسی طور پر تو مسلمانوں کے ماتحت رہ سکتے ہیں۔لیکن کفر اور نفاق سے یکسر لاتعلق ہو جانا ان کے لیے انتہائی مشکل ہے یہ اگرچہ دین سے وفاداری کا دم بھرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ دین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے چونکہ انہوں نے کبھی رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر یا مسلمانوں سے مل جل کر دین سیکھنے کی کوشش نہیں کی اگر ایسا کرتے تو ممکن ہے کہ ان کے اندر تبدیلی واقع ہوتی اور ان کے اکھڑپن میں تبدیلی آتی ان باتوں سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ان کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے اور ان کے طبعی خواص اور دین سے لاتعلقی سے پیش نظر رکھنا چاہیے ایسا لگتا ہے کہ خلافت صدیقی میں ارتداد اور منع زکوٰۃ کا جو فتنہ اٹھا اس کی طرف اشارہ کی جا رہا ہے کیونکہ اس فتنے میں اہم کردار انہی اعراب کا تھا لیکن یہ بات ریکارڈ پر رہنی چاہیے کہ بالآخر یہ لوگ اسلام کی قوت ثابت ہوئے آخر آیت میں علیم اور حکیم کی صفت لا کر شاید اسی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

(ان اعراب میں سے ایسے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہ تاوان ہے اور وہ تمہارے لیے گردشوں کے متمنی ہیں "حقیقت میں" انہی پر ہے بری گردش، اللہ سننے والا ہے، جاننے والا ہے۔(۹۸)

نفاق میں ان کی شدت کا عالم یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے سخت بدخواہ ہیں اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی ضرورتوں کے لیے ایک پیسہ خرچ کرنا بھی ان پر گراں تھا اور اگر کبھی ایسا ہو کہ حالات کے جبر یا نفاق کے اخفا کے لیے انہیں کچھ خرچ کرنا ہی پڑ جائے تو وہ اسے تاوان اور چٹی سمجھتے ہیں کیونکہ جس کام میں آدمی کی دلی رغبت شامل نہ ہو اور جن نظریات کو آدمی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو ایسے نظریات کے فروغ کے لیے بے دلی کے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے گا اسے یقیناً آدمی اپنے لیے تاوان سمجھتا ہے اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ کب حالات اس کے حسب حال اور سازگار ہوں تو فوراً اپنے کندھے سے اطاعت کا جوا اتار پھینکے یہ بدو لوگ بھی ایسے ہی حالات کے انتظار میں تھے اور خواہش رکھتے تھے کہ مسلمان کسی افتاد کا شکار ہوں اور ان کی قوت کمزوری میں بدلے تو ہم فوراً اطاعت کا قلادہ گلے سے اتار پھینکیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بظاہر اسلام قبول کر کے اسلامی شریعت اور اسلامی حکومت کی جو اطاعت قبول کر چکے تھے وہ اسے اپنے لیے غلامی سمجھتے تھے اور جس طرح ایک زبردستی آقا بن جانے والے کو غلام برے ارادوں کا ہدف بنا لیتا ہے اور ہر وقت اس کے لیے حالات کی گرفت میں آنے کی تمنا کرتا ہے ان لوگوں کا بھی مسلمانوں کے بارے میں ایسا ہی رویہ تھا پروردگار چونکہ ان کے ارادوں سے آگاہ ہے اس لیے وہ ان کے بارے میں فرما رہا ہے کہ یہ بدو تو مسلمانوں کے بارے میں گردش حالات کا انتظار کر رہے ہیں حالانکہ یہ خود اس کی گرفت میں آ چکے ہیں اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو مسلسل ترقی دیتا جا رہا ہے۔بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب اسلام عرب کی فیصلہ کن قوت بن جائے گا اس وقت یہ لوگ مسلمانوں کے رحم و کرم پر ہونگے اور قیامت کے دن ان کے اس نفاق کی وجہ سے ان کو وہ سزا ملے گی جو کافروں کی سزا سے بھی بدتر ہو گی آج یہ منافق جو کچھ اپنی مجلسوں میں کہتے اور منصوبہ بندیاں کرتے ہیں اللہ سب کچھ سنتا ہے اور مستقبل میں جو کچھ ان کے ساتھ ہونے والا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے وہ دیکھ رہا ہے انجام کا شکنجہ ان کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ بہت جلد اس کی گرفت میں آنے والے ہیں اور آخرت میں جہنم ان کے انتظار میں ہے۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِىْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(اور ان دیہاتیوں میں سے وہ بھی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور سمجھتے ہیں کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں قرب الٰہی اور رسول پاک کی دعائیں لینے کا ذریعہ ہے بیشک یہ ان کے لیے واسطۂ قربت ہی ہے اللہ ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا بیشک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔(۹۹)

Marfat.com

اس آیت کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اعراب سارے یکساں نہیں ہیں ان کی اکثریت اگرچہ ویسی ہی ہے جیسے سابقہ آیت میں ذکر ہوا ہے لیکن انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جو دوسرے اعراب کے برعکس اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں انہیں جب بھی موقع ملتا ہے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اسے تاوان سمجھنے کی بجائے اللہ کے قرب اور رسول اللہ ﷺ کی دعائیں لینے کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس سے پہلے ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ منافقین کے بارے میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ اب یہ لوگ آپ کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونے کے قابل نہیں رہے اب انہیں ہر طرح کی مصاحبت سے محروم کر دیجیے اور ان کے انفاق کو بھی قبول کرنے سے روک دیا گیا۔ کیونکہ وہ جو کچھ خرچ کرتے تھے اس میں دکھاوے اور ریاکاری کے سوا کچھ نہیں تھا بلکہ وہ اسے اپنے لئے تاوان سمجھتے تھے اب یہ فرمایا جارہا ہے کہ انہی منافقین کے عزیزوں اور تعلق داروں میں ایسے اعراب بھی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور وہ جو کچھ اللہ کے راستے پر خرچ کرتے ہیں وہ اس نیت سے کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے اللہ کا قرب حاصل ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ کی دعائیں ملیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اصل مقصود اللہ کا قرب ہے لیکن اس کے حصول کا سب سے موثر ذریعہ رسول پاک کی دعائیں ہیں صحابہ میں سے جب کوئی اللہ کے راستے میں خرچ کرتا تھا تو نبی کریمؐ اس کے لیے خیر و برکت کی دعا فرماتے تھے اس دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے عمل کو قبول فرماتا اور اپنے قرب سے نوازتا تھا ان کے بارے میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ چونکہ ایمان میں مخلص ہیں تو اللہ کے راستے میں ان کا انفاق اللہ کے رسول کی دعاؤں کا ذریعہ بنے گا اور پھر یہ دعائیں اللہ کے قرب کا باعث ہوں گی پھر یہی لوگ ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ

الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١٠٠﴾ وَ

مِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ڜ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ قف

مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ قف لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ

مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿١٠١﴾ ج وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا

بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ

يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٠٢﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

Marfat.com

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ
لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ
عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾
وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَ
سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾
وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا
وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ
لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ
اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى
مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا
جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ
اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع

Marfat.com

اور مہاجرین وانصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے ان کی خوبی کے ساتھ پیروی کی ہے اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اس نے تیار کر رکھے ہیں ان کیلئے ایسے باغات جن کے نیچے ندیاں رواں ہیں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور بڑی کامیابی یہی ہے۔ تمہارے گردوپیش بسنے والے دیہاتیوں میں سے کچھ منافق ہیں اور کچھ مدینے کے رہنے والوں میں سے جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں تم ان کو نہیں جانتے ہم انہیں جانتے ہیں ہم عنقریب ان کو عذاب دیں گے دو مرتبہ پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف۔ کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا ہے۔ انہوں نے ملے جلے عمل کئے کچھ اچھے کچھ برے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ آپ ان کے مالوں کا صدقہ قبول کریں اس سے آپ ان کو پاکیزہ بنائیں گے اور ان کا تزکیہ کریں گے اور ان کیلئے دعا کریں بیشک آپ کی دعا ان کیلئے تسکین کا سبب ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات کی پذیرائی فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور کہہ دیجئے تم عمل کرتے رہو عنقریب اللہ اور اس کا رسول اور مسلمان تمہارے طرز عمل کو دیکھیں گے پھر تم لوٹائے جاؤ گے اس کی طرف جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے بس وہ تم کو بتائے گا تم کیا کرتے رہے۔ اور کچھ دوسرے بھی ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک ملتوی کر دیا گیا ہے چاہے وہ انہیں عذاب دے اور چاہے تو توبہ قبول فرمائے اور اللہ علیم وحکیم ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد بنائی ہے اسلام کو نقصان پہنچانے، کفر کو تقویت دینے، اہل ایمان کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور ان لوگوں کے واسطے ایک اڈا فراہم کرنے کی غرض سے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے جنگ کر چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے یہ کام صرف بھلائی کی غرض سے کیا ہے اور اللہ شاہد ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ آپ اس میں کبھی کھڑے نہ ہوں وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر پڑی ہے وہ حق دار ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو عزیز رکھتے اور اللہ پاکیزہ رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ کیا جس نے اپنی تعمیر کی بنیاد رکھی اللہ کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی پر۔ وہ بہتر ہے یا وہ جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی ایک کھوکھلی گرتی ہوئی گگر پر پس وہ گر گئی اس کو لے کر جہنم میں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اور یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ان کے دلوں میں شک کی بنیاد بن کر جمی رہے گی مگر یہ کہ ان کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ جاننے والا اور حکم والا ہے۔ (۱۰۰ تا ۱۱۰) (رکوع: ۱۳)

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

(اور مہاجرین وانصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے ان کی خوبی کے ساتھ پیروی کی ہے اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اس نے تیار کر رکھے ہیں ان کے لیے ایسے باغات جن کے نیچے ندیاں رواں ہیں وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور بڑی کامیابی یہی ہے۔ (۱۰۰)

کفار مشرکین اور منافقین پر تنقید اور ان کی علامات کے بیان کے بعد اب ان لوگوں کا تذکرہ فرمایا جا رہا ہے جو اسلام کا اصل سرمایہ اور امت کے گلِ سرسبد ہیں نبی کریم ﷺ نے دعوت دین کا آغاز فرمایا تو آپ روئے زمین پر بالکل تنہا تھے مکہ کا جاہلی معاشرہ شرک کی دلدل میں سر تک دھنسا ہوا تھا۔ ان کے پیش نظر مادی زندگی اور عیش وعشرت کے علاوہ کوئی مقصد نہ تھا اخلاق نام کی کوئی چیز تلاش سے بھی ان میں نہیں ملتی تھی حقوق العباد کا دور دور تک کوئی تصور نہیں تھا بھلائی کی ہر بات سے انہیں چڑ تھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی کہ اپنے اعتقادات اپنے طرز زندگی اور طور اطوار میں اس حد تک جامد واقع ہوئے تھے کہ ان میں کسی طرح کی تبدیلی کا تو کیا سوال تھا اس پر تنقید سننا بھی انہیں گوارا نہ تھا ایک حیوانی زندگی تھی جس میں جنگل کا قانون کارفرما

Marfat.com

تھا اور اسے وہ چھوڑنے کے لیے کسی طرح بھی تیار نہ تھے آنحضرت ﷺ کی دعوت ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مکمل تبدیلی کا پیغام تھی جن آستانوں پر وہ جھکتے تھے اور جو انہوں نے طاقت وسطوت کے مراکز بنا رکھے تھے ان کے خلاف کھلی بغاوت تھی ظاہر ہے ایسی دعوت کو وہ کس طرح ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتے تھے چنانچہ جیسے ہی آنحضرت ﷺ نے کھلے عام ان کے باطل عقائد اور ان کی حیوانی زندگی پر تنقید شروع کی تو وہ اس دعوت کو روکنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اذیت کی بھٹیاں سلگنے لگیں ظلم کے نئے نئے طریقے ایجاد ہونے لگے انہوں نے اپنی پوری قوت اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے صرف کر ڈالی ایسی حالت میں اس دعوت کو قبول کرنا اور آنحضرت ﷺ کے دستِ حق پرست میں ہاتھ دینا قیامت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن اس حالت میں بھی یکے بعد دیگرے لوگ اسلام کی طرف بڑھتے گئے انہوں نے اس راہ کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا اس راہ میں مال بھی لٹا وطن چھوڑنا پڑا تو چھوڑ دیا جان کی ضرورت پڑی تو جان کا نذرانہ پیش کر دیا وہ لوگ جنہوں نے اس راہ پر سب سے پہلے قدم اٹھایا انہیں یہاں اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کہہ کر ذکر فرمایا گیا یہ وہ بارش کے پہلے قطرے ہیں جنہوں نے جلی ہوئی زمین پر گرنا برداشت کیا پھر ان کی جرأت واستقامت نے دوسروں کو حوصلہ بخشا پھر ایسا سماں بندھا کہ جل تھل ایک ہو گیا ان لوگوں کا راہِ حق میں قربانی وایثار ان کی جرأت وشجاعت ان کی پامردی واستقامت اور ان کی سرفروشی وجاں سپاری کی داد اللہ کے سوا اور کون دے سکتا ہے اس لئے اسی کریم ذات نے ان آیات میں ان کی تحسین فرمائی اور ان کے تذکرے کو اپنی لافانی کتاب میں جگہ عطا فرمائی۔

سوال یہ ہے کہ یہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کون لوگ ہیں جن اہل علم نے 'من المهاجرين' میں 'مِن' کو تبعیض کے لیے قرار دیا ہے انہوں نے صحابہ کے دو طبقے قائم کیے ایک اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا اور دوسرا باقی تمام صحابہ کرام کا پھر اس میں اختلاف پیدا ہوا کہ دونوں طبقوں میں کون لوگ شامل ہیں اس میں مختلف اقوال ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ وہ لوگ ہیں جو تحویل قبلہ سے پہلے مسلمان ہوئے دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وہ صحابہ ہیں جو غزوہ بدر میں شریک ہوئے ایک رائے یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو حدیبیہ کی بیعت رضوان میں شریک ہوئے ان میں مہاجر بھی شامل ہیں اور انصار بھی اس کے بعد جتنے ایمان لانے والے صحابہ ہیں چاہے وہ مہاجر ہوں یا انصار دوسرے درجے میں ہیں۔

بعض مفسرین کا خیال یہ ہے کہ 'من المهاجرين' میں حرف 'مِن' تبعیض کے لیے نہیں بلکہ بیان کے معنی میں ہے پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام صحابہ کرام باقی امت کی نسبت سے اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ ہیں اور باقی امت کے لوگ جنہوں نے اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا اتباع مکمل طریقے اور نہایت حسن وخوبی کے ساتھ کیا وہ دوسرے درجے پر ہیں اس تفسیر کی رو سے تمام صحابہ اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کے مصداق ہوں گے اور باقی امت کے صالحین جنہوں نے احسان کے ساتھ صحابہ کی پیروی کی وہ صحابہ کے بعد شمار ہوں گے۔

احسان کا معنی ہوتا ہے کسی کام کو کمال حسن وخوبی سے انجام دینا یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ امت کے جن لوگوں نے مکمل اخلاص اور راست روی کے ساتھ صحابہ کی پیروی کی صحابہ ہی کی طرح اپنا مال نچھاور کیا اللہ کی رضا کو اپنا مقصد بنایا کسی موقع پر کسی مصلحت کا شکار نہ ہوئے نازک سے نازک موقع پر بھی قدم پیچھے نہ ہٹایا ہر قربانی بے دریغ پیش کی ان کا مقام صحابہ کرام کے بعد ہے اللہ تعالیٰ دونوں کی تحسین فرما رہا ہے اور اپنی رضا کے سرٹیفکیٹ سے نواز رہا ہے۔

کوئی آقا جب اپنے غلام سے اور کوئی افسر اپنے ماتحت سے خوش ہو کر جو کلماتِ تحسین کہتا اور اظہارِ خوشنودی کرتا ہے اس کا تمام تر تعلق اس غلام یا ملازم کی ظاہری محنت سے ہوتا ہے غلام یا ملازم در پردہ کیا ہے یا اس کے احساسات اپنے آقا کے بارے میں کیا ہیں آقا اس سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ آقا اور افسر اپنے غلام اور ماتحت کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوں اور اس کے نفاق کو اس کی حقیقی زندگی قرار دے کر بیجا اظہارِ خوشنودی کر ڈالیں لیکن اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید جاننے والا ہے وہ نیتوں سے بھی واقف ہیں اور ان کے محرکات سے بھی وہ دل میں چھپے ہوئے خیالات کو بھی جانتا ہے اور ان کے اسباب کو بھی اس لیے جب وہ کسی کی تحسین فرماتا اور اظہارِ خوشنودی کرتا ہے تو وہ ایک ایسا اظہار ہے جس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں اس سے آپ صحابہ کرام اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے لوگوں کی بلند قسمت کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اظہارِ خوشنودی فرما کر انہیں کتنا بڑا اعزاز بخشا ہے۔

رضي الله عنهم ورضوا عنه 'اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے' اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس

Marfat.com

نے ان کے ایمان و اخلاص کو قبول فرمایا ان کی قربانیاں اور وفا شعاریاں صلہ حاصل کرنے میں کامیاب ٹھہریں ان کا جہاد و قتال اس کی بارگاہ میں شرف قبولیت پا گیا گویا ان کی پوری زندگی ایمان و عمل اور اخلاص کی ایسی سچی تصویر ہے جس پر ریاکاری کی کوئی پرچھائیں نہیں۔

اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے انہیں جس حال میں رکھا وہ صابر و شاکر رہے جو ذمہ داری ان پہ ڈالی نہایت جان فشانی سے محض اللہ کی خاطر اسے ادا کیا کوئی مصیبت آئی تو آزمائش جان کر خندہ پیشانی سے برداشت کیا وہ ہر حال میں اللہ کی حمد و ثنا میں مشغول رہے۔

آخر میں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے میں کامیاب رہے اور اللہ نے دنیا ہی میں اپنے کلام پاک میں ان کے لیے اظہار خوشنودی فرمایا اور خود بھی اللہ کے ہر فیصلے پر مطمئن اس کی ہر نعمت پر شکر گزار اس کی ہر آزمائش پر صابر اور ہر حال میں ان کا نفس 'نفسِ مطمئنہ' بنا رہا یہ وہ لوگ ہیں جو کامیاب و بامراد ہوئے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ۝

(تمہارے گرد و پیش بسنے والے دیہاتیوں میں سے کچھ منافق ہیں اور کچھ مدینے کے رہنے والوں میں سے جو نفاق میں طاق ہو گئے ہیں تم اُن کو نہیں جانتے ہم اُنہیں جانتے ہیں ہم عنقریب اُن کو عذاب دیں گے دو مرتبہ پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف۔ (۱۰۱)

''مَرَدَ'' کا معنی ہے پختہ ہو جانا طاق ہو جانا مشاق اور ماہر ہو جانا۔ سابقہ آیات میں اُن منافقین کا ذکر کیا گیا ہیں جو اپنے اقوال و افعال سے کسی حد تک پہچانے جاتے تھے اور نبی کریم ﷺ اپنے ذہانت سے اُن کو پہچان لیتے تھے اور مسلمان اُن کے معمولات کو دیکھ کر کھٹک جاتے تھے لیکن اَب اُن منافقین کا تذکرہ فرمایا جا رہا ہے جن کو مسلمان تو کیا پہچانتے نبی کریم ﷺ اپنے صفائے نفس اور بے نظیر ذہانت کے باوجود بھی اُنہیں پہچاننے پر قادر نہیں تھے وہ اپنے خبث نفس اور اسلام دشمنی کو اس کامیابی سے چھپاتے تھے کسی کو شبہ کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اُنہوں نے ایسی چابکدستی سے نقاب اوڑھ رکھا تھا کہ اُن کا اصل چہرہ کبھی دکھائی نہ دیتا تھا مسلمانوں کو ان مارِ آستین قسم کے لوگوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی جا رہی ہے اور منافقین کو دھمکی دی جا رہی ہے کہ تم نفاق میں مہارت کے باعث مسلمانوں اور اللہ کے رسول کو تو دھوکہ دے سکتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کو دھوکہ نہیں دے سکتے وہ تمہارے ایک ایک عمل کو جانتا اور تمہارے ہر فریب کو پہچانتا ہے تم ہزار پردوں میں چھپ کر بھی کسی خباثت کا ارتکاب کرو اللہ تعالیٰ ہر بات سے بخوبی واقف ہے اِس لیے تم کو اِس بات پر خوش نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان تمہارے نفاق سے واقف نہیں اَب وہ وقت قریب آ رہا ہے جب حضور ﷺ کو تمہاری حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے گا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم دنیا ہی میں دو طرح کے عذاب کا شکار ہو جاؤ گے ایک تو یہ کہ تم نے اَب تک مسلمانوں کو اپنے جھوٹے اخلاص کا یقین دلا کر اسلامی معاشرہ میں جو اپنا مقام بنا رکھا ہے جب تمہاری حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی تو پھر مسلمانوں کی نگاہوں میں جیسی کچھ تمہاری رسوائی ہوگی اُس کے بارے میں آج سوچنا بھی شاید تمہارے لیے مشکل ہو۔ چنانچہ بعض اہل تفسیر نے ذکر کیا ہے جن میں صاحب روح المعانی بھی شامل ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے جمعہ کے خطاب میں بعض منافقین کا نام لے کر حکم دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ تم منافق ہو۔ غور کیا جائے کہ ایک ایک منافق کا نام لے لے کر جب حضور مسجد سے نکال رہے تھے تو کیا وہ سوچ نہیں رہے ہوں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں دھنس جائیں۔ دوسری طرف اُن کے لیے یہ بات بھی سوہانِ روح بنتی جا رہی تھی کہ دین کے جس غلبے کو روکنے اور جس مشن کو ناکام کرنے کے لیے وہ درپردہ کاوشیں کرتے رہے تھے وہی مشن اَب عرب کا مقدر بنتا جا رہا تھا اور اُسی دین کے لیے لوگوں کے سینے کھلتے جا رہے تھے یعنی ایک طرف مسلمانوں کی سامنے اُن کی رسوائی اور دوسری طرف اپنی آرزوؤں کی ناکامی یہ ایسے دو عذاب تھے جن سے زندگی ہی میں اُن کو دو چار ہونا پڑا۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ آیت کریمہ میں جن دو عذابوں کا ذکر فرمایا گیا ہے اُن میں ایک عذاب وہی ہے جو اسلام کے غلبے اور اُن کی زندگی بھر کی ناکامیوں کی صورت میں اُن کو برداشت کرنا پڑ رہا تھا اور دوسرا عذاب وہ ہے جو اُن کو عذابِ قبر کی صورت میں ہوگا۔ اِس کے بعد ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اِس سے مراد وہ جہنم کا عذاب ہے قیامت کے بعد جس سے اُن کو واسطہ پڑے گا اور جس سے کبھی نجات نہ ہوگی۔

Marfat.com

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے۔ انہوں نے ملے جلے عمل کیے کچھ اچھے اور کچھ بُرے۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرمائے گا بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۱۰۲)

غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے والے ایک تو منافقین تھے جو اپنے نفاق کی وجہ سے شرکت سے گریزاں رہے لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کے اخلاص میں کوئی کمی نہ تھی وہ ہر لحاظ سے سچے مومن تھے اسلام لانے کے بعد اُن کی زندگی اخلاص کا نمونہ رہی دوسرے صحابہ کی طرح انہوں نے بھی قربانیاں پیش کیں مصائب پر استقامت دکھائی وفا شعاری کے ہر امتحان میں پورے اترے لیکن غزوۂ تبوک کے موقعہ پر نفس کی کمزوری کا شکار ہو گئے اِس آیت کریمہ میں ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

محدثین نے اِن آیات کا جو شانِ نزول بیان کیا ہے اس میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات ابولبابہ اور اُن کے ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئیں حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر بیعت عقبہ کے موقع پر ہجرت سے پہلے اِسلام لائے تھے جنگ بدر جنگ اُحد اور دوسرے معرکوں میں برابر شریک رہے اُن کی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق قربانی وایثار سے روشن ہے اُن کے ساتھی بھی ایسے ہی اَعمالِ حسنہ سے مزین لوگ تھے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر حالات کے دباؤ اور نفس کی کمزوری کا شکار ہو گئے اور کسی عذرِ شرعی کے بغیر بیٹھے رہ گئے نبی کریم ﷺ جب غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے اور اِن لوگوں کو معلوم ہوا کہ غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے والوں کے متعلق اللہ اور اُس کے رسول نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے تو اَب اُن کو اپنی کوتاہی پر سخت ندامت ہوئی یہ سوچ کر کہ اللہ اور رسول کی ناراضگی دنیا اور آخرت میں تباہی کے سواء کچھ نہیں اِس قدر پریشان ہوئے کہ یہ بھی حوصلہ نہ رہا کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور اُن سے استغفار کی استدعا کریں ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ دعا فرمائیں اور اللہ معاف فرما دے ندامت کے غلبے اور خوف کی گرفت میں آ کر حضرت ابولبابہ اور آپ کے سات ساتھیوں نے اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا اور قسم کھالی کہ جب تک ہم کو معافی نہ ملے ہم پر خواب وخور حرام ہے۔ چنانچہ کئی روز وہ اِسی طرح بے آب ودانہ اور بے خواب بندھے رہے حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے آخر یہ آیات نازل ہوئی جن میں اِن حضرات کی توبہ کی قبولیت کی نوید سنائی گئی لوگوں نے آ کر اُن کو خوش خبری سنائی اور اُن کو کھولنا چاہا تو حضرت ابولبابہ نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک خود حضور ﷺ راضی ہو کر اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے میں بندھا رہوں گا۔ چنانچہ صبح کی نماز میں جب آپ تشریف لائے تو دستِ مبارک سے اُن کو کھولا۔

اِس آیت کریمہ میں غور کرنے سے چند باتیں سمجھ میں آتی ہیں پہلی یہ بات کہ غلطی کا صدور جس طرح کافر اور منافق سے ہوتا ہے اُسی طرح مخلص مسلمان سے بھی اِس کا امکان ہے گناہوں اور غلطیوں سے معصوم ومبرا صرف اللہ کے رسول ہوتے ہیں اللہ جس پر اپنا فضل فرماتا ہے تو بعض دفعہ اُسے گناہوں سے محفوظ رکھتا ہے اور بعض دفعہ گناہوں پر توبہ کی توفیق عطا فرماتا ہے ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جن کو محفوظ کہا جاتا ہے اُمت کے بیشتر وہ افراد جنہیں ہم نہایت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جو ہمارے لیے نمونہ کے لوگ ہیں اُن کی اصل پہچان یہ ہے کہ وہ گناہ کرنے پر دلیر نہیں ہوتے ہمیشہ اپنے اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں لیکن اِس کا ہر وقت امکان ہوتا ہے کہ کبھی اُن سے گناہ کا صدور ہو جائے اُن کی عظمت اِس میں ہے کہ جیسے ہی انہیں متنبہ ہوتا کہ اُن سے غلطی ہو گئی ہے تو وہ فوراً اللہ کے سامنے توبہ کے لیے ہاتھ پھیلا دیتے ندامت سے اُن کی آنکھیں جھک جاتیں دل پگھلنے لگتا اور وہ اللہ کے سامنے اِس طرح گڑگڑاتے کہ بعض دفعہ اَصل نیکی سے بڑھ کر اَجر وثواب کے مستحق ٹھہرتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو اِس طرح نوازتا ہے کہ گناہ اور غلطی کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔

کافر اور منافق گناہ پر دلیر بھی ہوتے ہیں اور گناہ پر اصرار بھی جاری رکھتے ہیں اور اللہ کے نیک بندے گناہ ہو جانے کے بعد اُس وقت تک آہ وزاری جاری رکھتے ہیں جب تک اُن کو قبولیت کا یقین نہیں ہو جاتا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اِس دروازے کے علاوہ بخشش اور مغفرت کا اور کوئی دروازہ نہیں۔ حضرت ابولبابہ اور اُن کے ساتھیوں نے جب انتہائی خلوص اور عاجزی کے ساتھ اللہ کو پکارا اور مکمل طور پر اپنے آپ کو اس کے سامنے ڈھیر کر دیا تو اللہ کی طرف سے قبولیت کا پیغام آ گیا۔

Marfat.com

''عسیٰ'' اگرچہ اُمید دلانے کے لیے آتا ہے لیکن جب اِس کا تعلق پروردگار سے ہو اور وہ اپنے کسی عاجز بندے کو اِس لفظ کے ساتھ اُمید دلائے تو یہ بات حتمی ہے کہ اِس اُمید کا وقوع یقین سے بڑھ کر یقینی ہوتا ہے عام آدمی کے حتمی انداز پر بھی شبہ رہتا ہے لیکن اگر بادشاہ کسی کو اُمید دلا دے تو سائل خوشی سے شادیانے بجانے لگتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ اصل شان یہ ہے کہ وہ غفور اور رحیم ہے اُس کا غضب انسانوں کے گناہوں کے سبب بڑھکتا ہے جب یہ سبب دور کر دیا جائے تو اُس کی رحمت کی آغوش کھل جاتی ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوٰلِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

(آپ اِن کے مالوں کا صدقہ قبول کریں اِس سے آپ اِن کو پاکیزہ بنائیں گے اور اِن کا تزکیہ کریں گے اور اُن کے لیے دعا کریں بے شک آپ کی دعا اُن کے لیے تسکین کا سبب ہے اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے (۱۰۳)

حضرت ابولبابہ اور اُن کے ساتھیوں کی جب توبہ قبول ہوگئی اور اُن کو کھول دیا گیا تو جس مال کی محبت نے اُن کو نکلنے سے روکا تھا انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں پیشکش کی کہ ہم اپنا یہ سارا مال دولت اور باغات اللہ کے لیے صدقہ کرنے کے لیے تیار ہیں آپ اِن کو قبول فرمائیے جس مال نے ہم سے اتنی بڑی کوتاہی کروائی اور ہمارے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا وہ اِس قابل نہیں ہے ہم اُسے اپنے پاس رکھیں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھے منافقین کا مال قبول کرنے سے روک دیا گیا ہے اگرچہ تمہاری توبہ قبول ہو چکی ہے لیکن جب تک اللہ کی طرف سے حکم نہیں آتا نہ تو میں تمہارا مال قبول کر سکتا ہوں اور نہ میں تمہارے لیے دعا کر سکتا ہوں اِس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اِس میں آپ کو حکم دیا گیا کہ اِن کا سارا مال آپ قبول نہ کیجئے البتہ اِن کے مال کا کچھ حصہ قبول کر لیجئے کیونکہ آیت میں (مِن) کا لفظ آیا ہے جو تبعیض پر دلالت کرتا ہے اِس حکم کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے اُن سے تہائی مال قبول فرمایا۔

بعض لوگوں نے اِس آیت کریمہ سے بے جا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کہا ہے کہ صدقہ سے مراد زکوٰۃ ہے اور اِس کا قبول کرنا نبی کریم ﷺ کی خصوصیت ہے دوسرا کوئی خلیفہ یا اِسلامی ریاست کا سربراہ وصول نہیں کر سکتا غالباً یہی عذر حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانے میں مانعین زکوٰۃ نے پیش کرتے ہوئے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا لیکن حضرت ابوبکر نے اِسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے بالجبر اُن سے زکوٰۃ وصول کی آپ نے فرمایا کلمہ طیبہ کے بعد اِسلام کے چار بنیادی ارکان ہیں اگر اِن کے عذر کو تسلیم کر لیا جائے تو آج نماز کا رکن گریگا اور کل زکوٰۃ کا پھر آہستہ آہستہ اِسلام کا پورا محل نابود ہو کر رہ جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس آیت کریمہ میں زکوٰۃ کا حکم زیر بحث نہیں اگر اِس سے مراد زکوٰۃ ہوتی تو آنحضرت ﷺ اُن سے تہائی مال قبول نہ فرماتے اور اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے تو یہ بات قرآن وسنت اور اجماع اُمت سے ثابت ہے کہ ارکان اِسلام نہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ مخصوص ہیں اور نہ آپ کے زمانے تک محدود تمام انفرادی اور اجتماعی احکام اِسی طرح ارکان اِسلام کی بجا آوری قیامت تک کے لیے تمام اُمت کی ذمہ داری ہے۔

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ زکوٰۃ کی فرضیت کا ایک سبب اور فائدہ یہ ہے کہ اِس سے غریبوں کی پرورش اور اُن کی ضروریات کی ادائیگی کا انتظام ہو جاتا ہے امراء سے زکوٰۃ لی جاتی ہے اور غریبوں میں تقسیم کی جاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زکوٰۃ کا صرف یہی فائدہ نہیں بلکہ زکوٰۃ کا وہ فائدہ جو صاحب مال کو پہنچتا ہے اور جس کی اہمیت متذکرہ بالا فائدہ سے بڑھ کر ہے اُسی کا بطور خاص ذکر اِس آیت کریمہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ اِن سے مال وصول کریں اور اُس کے ذریعے اِن کی تطہیر کریں کیونکہ جس طرح غلط عقائد فرسودہ خیالات بے ہودہ رسم ورواج اور حد سے بڑھی ہوئی خواہشات انسانی کردار کو مسموم کر دیتی ہیں اِسی طرح حب دنیا اور مال سے متعلق افراط وتفریط انسانی دل ودماغ کو متاثر کرتی اور اِنسانی کردار کو بگاڑ کے راستے پر ڈال دیتی ہے اِس لیے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ مال ودولت کی آلائشوں سے دل ودماغ کو بچایا جائے اور صحیح بنیادوں پر اِس کی تربیت کی جائے۔ تطہیر اِنسان کو ظاہری اور باطنی رذائل سے پاک کرنے کے عمل کو کہتے ہے اور تزکیہ مکارم وفضائل کے ذریعے تربیت کرنے کو کہتے ہے۔ یہ دونوں عمل بیک وقت انفاق فی سبیل اللہ سے وجود میں آتے ہیں مال کے خرچ ہونے سے دل سے مال کی محبت کم ہوتی ہے اور اللہ کے راستے میں خرچ ہونے سے اللہ سے تعلق بڑھتا

Marfat.com

ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے طہارت فکر بھی پیدا ہوتی ہے اور عمل کو قوت بھی ملتی ہے زکوٰۃ اور صدقات سے اصل مطلوب یہی حقیقت صاحب مال میں اُتارنا ہے آنحضرت ﷺ کو اُن کی تربیت کے لیے اِسی بات کا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ اِسی میں کمزوری کے باعث وہ قباحتیں جنم لیتی ہیں جس کا شکار حضرت ابولبابہ اور اُن کے ساتھی ہوئے۔

مزید فرمایا آپ اِن کے لیے دعا کریں کیونکہ آپ کی دعا اِن کے لیے تسکین کا باعث ہے۔

ایک مسلمان کے عمل کو وجود میں آنے اور قبولیت کے مراحل طے کرنے میں دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ عمل کرنیوالے کے دل میں عمل کا احساس پیدا ہو۔ وہ عمل کو حکم سمجھ کر بروئے کار لانے کے لیے ہمہ وقت بے چینی محسوس کرے۔ اِس ضرورت کو پیدا کرنے کے لیے تطہیر تزکیہ اور توفیقِ خداوندی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور پھر اس کی قبولیت کے لیے اللہ سے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ بلاشبہ عمل کرنے والے کی دعا بھی قبولیت کے لیے ضروری ہے لیکن اُس کی خوش نصیبی کا کیا کہنا جسے اللہ کے رسول کی دعا میسر آجائے۔ اِس سے ایک طرف رحمت خداوندی متوجہ ہوگی اور دوسری طرف عمل کرنے والے کے دل و دماغ کو تسکین ملے گی اور ساتھ ہی ساتھ عمل کی قوت میں ایسا اضافہ ہوگا جس سے اعمال کی کمیت اور کیفیت دونوں میں افزائش ہوگی۔ آخر میں فرمایا اللہ سننے والا ہے۔ جاننے والا ہے۔ اِس میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ تسلی اِس بات کی کہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرکے تم سے جس بڑے جرم کا ارتکاب ہوا وہ اگرچہ ناقابلِ معافی تھا لیکن تم نے جس اخلاص اور جان فشانی سے توبہ کی۔ اُس سے اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور تمہاری توبہ قبول ہوگئی اَب اگر کوئی کمی باقی ہے۔ تو یقیناً آنحضرت ﷺ کی تربیت سے دور ہو جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھو اگر تمہارے دل و دماغ نے پھر ٹھوکر کھائی اور تمہارے عمل کی قوتیں پھر برگشتہ ہوئیں تو تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ دلوں کے بھید جانتا ہے اور احساسات تک سے واقف ہے۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

(کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور صدقات کی پذیرائی فرماتا ہے اور یہ کہ اللہ ہی توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (۱۰۴)

سابقہ آیت میں نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا تھا کہ چونکہ اِن لوگوں نے توبہ کر لی ہے اور اِن کو اپنے گناہوں کا اعتراف ہے۔ تو اَب آپ انہیں ازسرِ نو اپنی تربیت میں لے لیں۔ تاکہ آپ کی راہنمائی میں اُن کی مکمل اصلاح ہو سکے اِس آیت کریمہ میں براہ راست اُن مخلص اور خوش نصیب مسلمانوں سے خطاب کیا جا رہا ہے۔ جن کی توبہ قبول ہو چکی ہے۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو یقیناً اِس اُمید پر ستونوں سے باندھا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا اَب جبکہ تمہاری توبہ قبول ہو چکی تو تم کو یقین ہو گیا ہوگا کہ تمہاری اُمید علم کی شکل اختیار کر چکی ہے اور عملی طور پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی کہ صاحب ایمان شخص چاہے کیسی بھی ٹھوکر کھا جائے توبہ کا دروازہ اُس پر بند نہیں ہوتا وہ جب بھی اپنے اللہ کو درد میں ڈوب کر پکارے گا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا پائے گا۔ اگر وہ اس کی بارگاہ میں صدقات پیش کرے گا۔ تو وہ یقیناً پذیرائی بخشے گا۔ کیونکہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اِن تمام عنایات سے گراں بار فرما کر اگلی آیت میں ہلکی سی تنبیہ بھی فرمائی۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

(اور کہہ دیجئے تم عمل کرتے رہو عنقریب اللہ اور اُس کا رسول اور مسلمان تمہارے طرز عمل کو دیکھیں گے پھر تم لوٹائے جاؤ گے اُس کی طرف جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے بس وہ تم کو بتائے گا تم کیا کرتے رہے ہو۔ (۱۰۵)

Marfat.com

غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کر کے ابولبابہ اور اُن کے ساتھی جو ایک بڑی کوتاہی کر چکے تھے اُسے تو اللہ نے معاف فرمادیا اور اُن کے تطہیرِ عمل اور تزکیۂ نفس کے لیے اُن سے مال و دولت بھی قبول فرمایا تا کہ حبِ دنیا میں کمی ہو اور آنحضرت ﷺ نے توفیقِ ایزدی کے لیے اُن کے حق میں دعا بھی فرمائی اِس طرح سے اُن کے دلوں کی تسکین کا سامان کیا لیکن ابھی یہ دیکھنا باقی تھا کہ اِس توبہ سے اُن کے آئندہ اعمال پر کیا اثر پڑتا ہے اِس لیے حکم دیا کہ اُمت مسلمہ کے افراد کی حیثیت سے تم اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی اور اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے بہتر سے بہتر اعمال کی فکر کرو۔ مسلمان تمہارے رویہ سے اندازہ کریںگے کہ تم میں عمل کی تڑپ اور اخلاصِ عمل کہاں تک ہے اور رسول ﷺ بھی تمہاری اطاعت اور اتباع کو دیکھیں گے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کی حالت پر نظر رکھے گا اگر اِس طرح سے تمہارے اعمال درست رہے تو تم اللہ کے یہاں سرخرو ٹھہرو گے مسلمان اور آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی کا ردِعمل تو تم دنیا ہی میں دیکھ لو گے لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ دلوں کے احساسات جانتا ہے وہ قیامت کے دن بتائے گا کہ تمہارے اعمال مخلصانہ رہے یا اُن میں نفاق کی آمیزش رہی اِس میں روئے سخن اگرچہ متذکرہ بالا مسلمانوں کی طرف ہے لیکن حقیقت میں تمام مسلمان اِس کے مخاطب ہیں۔ کیونکہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں جو اطاعتِ رسول مسلمانوں کی ہم رکابی اور اللہ کی نگرانی اور مراقبے سے آزاد ہو۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

(اور کچھ دوسرے بھی ہیں جن کا معاملہ اللہ کا حکم آنے تک ملتوی کر دیا گیا ہے چاہے وہ انہیں عذاب دے اور چاہے تو توبہ قبول فرمائے اور اللہ علیم و حکیم ہے۔(۱۰۶)

گزشتہ آیات میں جن مخلص مسلمانوں کی توبہ قبول ہوئی اُن کے علاوہ بھی تین افراد ایسے تھے جن کے ایمان و اخلاص میں کوئی شبہ نہ تھا گذشتہ حق و باطل کی کشمکش میں وہ کبھی پیچھے نہ رہے تھے لیکن اَب کوئی ایسا الجھاؤ پڑا کہ وہ اندیشہ ہائے دور دراز کا شکار ہو کر گھر بیٹھ رہے تھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بجائے عذر کرنے کے صاف صاف اپنے جرم کا اعتراف کیا اور اپنے آپ کو اللہ کے فیصلے کے حوالے کر دیا، ان کے نام یہ ہیں کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع۔ رسول ﷺ نے بجائے کوئی فوری فیصلہ کرنے کے اللہ کے حکم کے آنے تک اِن کے فیصلے کو ملتوی کر دیا اور اُن کو انتظار کرنے کا حکم دیا چند آیتوں کے بعد ان کا تفصیلی تذکرہ آرہا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

(اور وہ لوگ جنہوں نے ایک مسجد بنائی ہے اِسلام کو نقصان پہنچانے کفر کو تقویت دینے اہلِ ایمان کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور اُن لوگوں کے واسطے ایک اڈا فراہم کرنے کی غرض سے جو اللہ اور اُس کے رسول سے پہلے جنگ کر چکے ہیں وہ ضرور قسمیں کھائیںگے کہ ہم نے یہ کام صرف بھلائی کی غرض سے کیا ہے اور اللہ شاہد ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔(۱۰۷)

اِس آیتِ کریمہ میں منافقین کے سب سے زیادہ شریر گروہ کی سازش کا ذکر کیا جارہا ہے جسے نہایت مقدس شکل و صورت دے کر اور بہ ظاہر نہایت مقدس ارادوں کے ساتھ وجود دیا گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اُن لوگوں کے شر سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا بلکہ اُس گروہ کی بھی قلعی کھول کر رکھ دی۔ اِس سازش کا پس منظر اور پیش منظر ہم تفہیم القرآن سے نقل کرتے ہیں۔

(نبی ﷺ کے مدینے تشریف لے جانے سے پہلے قبیلہ خزرج میں ایک شخص ابو عامر نامی تھا جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار علمائے اہلِ کتاب میں ہوتا تھا اور رہبانیت کی وجہ سے اس کے علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس کی درویشی کا سکہ بھی مدینے اور اطراف کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب نبی ﷺ مدینے پہنچے تو اس کی مشیخت وہاں خوب چل رہی تھی۔ مگر یہ علم اور یہ درویشی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کے بجائے اُلٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن گئی اور اس حجاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور کی تشریف آوری کے بعد وہ نعمتِ ایمان سے محروم رہا بلکہ آپ کو

Marfat.com

اپنی مشیخت کا حریف اور اپنے کاروبار درویشی کا دشمن سمجھ کر آپ کی اور آپ کے کام کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا۔ پہلے دو سال تک تو اسے یہ امید رہی کہ کفار قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹانے کے لیے کافی ثابت ہوگی۔ لیکن جنگ بدر میں جب قریش نے شکست فاش کھائی تو اسے یارائے ضبط نہ رہا۔

اسی سال وہ مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف تبلیغ شروع کر دی جنگ اُحد جن لوگوں کی سعی سے برپا ہوئی ان میں یہ بھی شامل تھا اور کہا جاتا ہے کہ احد کے میدان جنگ میں اسی نے وہ گڑھے کھدوائے تھے جن میں سے ایک میں نبی ﷺ گر کر زخمی ہوئے، پھر جنگ احزاب میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھ آئے تھے ان کو چڑھالانے میں بھی اس کا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد جنگ حنین تک جتنی لڑائیاں مشرکین عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئیں۔ ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سرگرم حامی رہا۔ آخر کار اسے اس بات سے مایوسی ہوگئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی۔ اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رُخ کیا تا کہ قیصر کو اس ''خطرے'' سے آگاہ کرے جو عرب سے اُٹھ رہا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب مدینہ میں یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے اور اسی کی روک تھام کے لیے نبی ﷺ کو تبوک کی مہم پر جانا پڑا

ابو عامر راہب کی ان تمام سرگرمیوں میں مدینہ کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ شریک سازش تھا اور اس آخری تجویز میں بھی یہ لوگ اس کے ہمنوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصر روم اور شمالی عرب کی عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کے اور ان منافقوں کے درمیان یہ قرار داد ہوئی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنالیں گے تا کہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی علیحدہ جتھ بندی اس طرح کی جاسکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا رہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہ نہ کیا جاسکے اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہو سکیں اور آئندہ کاروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں بلکہ ابو عامر کے پاس سے جو ایجنٹ خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی غیر مشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھہر سکیں۔ یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے تحت وہ مسجد تیار کی گئی تھی جس کا اِن آیات میں ذکر کیا گیا ہے۔

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجد قُبا جو شہر کے مضافات میں تھی دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور وہ زمانہ ایسی احمقانہ مذہبیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کارِثواب ہو قطع نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی علیحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں۔ چنانچہ انہوں نے نبی ﷺ کے سامنے اس تعمیر نو کے لیے یہ ضرورت پیش کی کہ بارش میں اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو جو ان دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لے یہ ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

اِن پاکیزہ ارادوں کی نمائش کے ساتھ جب یہ مسجد ضرار بن کر تیار ہوئی تو یہ اشرار نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرما دیں۔ مگر آپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ اس مہم سے واپس آکر دیکھوں گا۔ اس کے بعد آپ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے اور آپ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جتھ بندی اور سازش کرتے رہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ اُدھر رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہوا اور ادھر یہ فوراً ہی عبداللہ ابن اُبی کے سر پر تاج شاہی رکھ دیں۔ لیکن تبوک میں جو معاملہ پیش آیا اس نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی پر جب نبی ﷺ مدینہ کے قریب ذی اَذان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ نے اسی وقت چند آدمیوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا تا کہ آپ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے وہ اس مسجد ضرار کو مسمار کر دیں۔)

تفسیر مظہری میں ذکر کیا گیا ہے کہ جب رسول ﷺ قباء سے مدینہ منورہ پہنچ گئے تو مسجد ضرار کی جگہ خالی پڑی تھی آپ نے عاصم بن عدی کو اجازت دی کہ وہ اس جگہ اپنا گھر بنالے۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول ﷺ جس جگہ کے متعلق قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہو چکی ہیں

Marfat.com

میں تو اُس منحوس جگہ میں گھر بنانا پسند نہیں کرتا البتہ ثابت بن اقرم کے پاس کوئی گھر نہیں اُن کو اجازت دے دی جائے کہ وہ یہاں مکان بنالیں اُن کے مشورہ کے مطابق آپ نے یہ جگہ ثابت بن اقرم کو دے دی مگر ہوا یہ کہ جب سے ثابت اِس مکان میں مقیم ہوئے اُن کے کوئی بچہ نہیں ہوا یا زندہ نہیں رہا۔

مؤرخین نے لکھا ہے یہ جگہ ایسی منحوس ثابت ہوئی کہ کوئی انسان تو اس جگہ کیا پھلتا پھولتا کوئی مرغی بھی اِس جگہ انڈے بچے دینے کے قابل نہ رہی کوئی کبوتر اور جانور بھی یہاں با آور نہ ہو سکا۔

قرآن کریم نے اِس مسجد کو مسجد ضرار کا نام دیا ہے لفظ ضرر اور ضرار دونوں عربی زبان میں نقصان پہنچانے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں بعض حضرات نے یہ فرق بیان کیا ہے کہ ضرر اُس نقصان کو کہا جاتا ہے جس میں دوسرے کو نقصان پہنچے لیکن ضرر پہنچانے والے کا اِس میں اپنا فائدہ ہو۔لیکن ضرار اُس نقصان کو کہتے ہے جس میں پہنچانے والے کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا اِس مسجد کا انجام بھی یہی ہوا کہ مسلمانوں کو تو اللہ نے اِس نقصان سے محفوظ رکھا لیکن مسجد بنانے والے بھی اِس کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے بلکہ رسوائی اُن کا مقدر ٹھہری۔

اِس مسجد کی تعمیر کی جو اغراض فاسدہ قرآنِ کریم نے ذکر فرمائی ہیں۔اُن میں تقویت کفر اور کفر کے لیے کمین گاہ کی حیثیت سے کسی مسجد کا بنانا یقیناً کافروں کا ہی کام ہو سکتا ہے کسی مسلمان سے اِس کی توقع نہیں کی جا سکتی البتہ تفریق بین المومنین ضرور ہماری لیے قابلِ توجہ ہے ہمارے سادہ دل مسلمان بظاہر اسلام کی محبت میں مسجدیں بناتے ہیں لیکن عموماً اس طرف دھیان نہیں دیا جاتا کہ دوسری مساجد کی موجودگی میں اِس مسجد کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک فرمان جاری کیا تھا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ ایک مسجد کے قریب دوسری مسجد نہ بنائی جائے جس سے پہلی مسجد کی جماعت اور رونق متاثر ہو۔لیکن ہم جوشِ ایمان میں اِس کا بالکل خیال نہیں رکھتے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝

(آپ اِس میں کبھی کھڑے نہ ہوں وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر پڑی ہے وہ حق دار ہے کہ آپ اُس میں کھڑے ہوں اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو عزیز رکھتے ہیں اور اللہ پاکیزہ رہنے والوں سے محبت کرتا ہے(۱۰۸)

مسجد قبا اور اس کے نمازیوں کی تعریف:

منافقین نے مسجد تو بنالی لیکن وہ جانتے تھے کہ جب تک نبی کریم ﷺ اِس مسجد میں نماز نہ پڑھائیں یا اِس میں تشریف نہ لائیں اُس وقت تک نہ اِس مسجد کا اعتبار پیدا ہو سکتا ہے اور نہ مسلمانوں کا رجوع ہو سکتا ہے یہ سوچ کر منافقین نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ہماری مسجد میں ایک نماز پڑھا دیں تاکہ برکت ہو۔آپ نے فرمایا کہ میں اِس وقت غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں مصروف ہوں واپسی پر دیکھا جائے گا۔ واپسی پر راستے میں یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ کو اِس مسجد کی اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا اور حکم دیا گیا آپ اِس مسجد میں مت کھڑے ہوں۔ کیونکہ یہ مسجد اللہ کی عبادت اور اُس کا تقویٰ پیدا کرنے کے لیے بنائی نہیں گئی بلکہ اِس کے مقاصد تو وہ ہیں جن کا سابقہ آیت میں تذکرہ ہوا ہے۔آپ کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھانے کے لائق وہ مسجد ہو سکتی ہے جو حقیقی معنی میں مسجد ہو یعنی جس مسجد کو تقویٰ کی بنیاد پر اٹھایا گیا ہو۔جس مسجد میں اللہ سے لو لگانے اور اُس سے خشیت کی تعلیم دی جاتی ہو اور جس کے بنانے والے اور نماز پڑھنے والے ظاہر اور باطن میں پاکیزگی کو عزیز رکھتے ہوں۔ جس طرح اُن کے کپڑے گندگی کے ہر داغ سے محفوظ ہوں اُسی طرح اُن کا باطن بھی اُجلا ہو۔کیونکہ ظاہر کا اثر باطن پر اور باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اِس میں چند باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

1۔سنگ و خشت سے عمارت تو ضرور بن جاتی ہے لیکن وہ عمارت جسے مسجد اور اللہ کا گھر ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔اُس کا تعلق بنانے والوں کے احساسات اور خیالات سے ہوتا ہے۔بدکردار لوگوں کی بنائی ہوئی عمارت کلب بن سکتی ہے،مے خانہ کہلا سکتی ہے لیکن مسجد نہیں ہو سکتی۔مسجد

Marfat.com

زمین پر بعد میں دلوں میں پہلے تعمیر ہوتی ہے۔ اِس لیے جو تعمیر منافقین کے ہاتھوں ہوگی اور جس میں نفاق کی فصل بوئی جائے گی۔ وہ مسلمانوں کے لیے مسجد نہیں بلکہ مسجد ضرار ہے۔

2۔ منافقین کی یہ مسجد مسجد قباء سے قریب تھی۔ منافقین کی کوشش یہ تھی کہ مسجد قباء کی مرکزیت کو نقصان پہنچایا جائے۔ وہاں کے لوگوں کو اس مسجد میں لاکر آہستہ آہستہ اِسلام سے بدگمان کیا جائے۔ پروردگار نے نام لے بغیر اُس مسجد اور مسجد والوں کی تعریف فرما کر اگر ایک طرف مسجد کی عزت میں اضافہ فرمایا تو دوسری طرف اہل قباء کو حیاتِ جاوید عطا کردی اور یہ بات بھی واضح کردی کہ تقویٰ کا مرکز اور تقویٰ کی تربیت گاہ یہ مسجد ہے وہ نہیں اور یہ بھی اشارہ کردیا کہ اِس مسجد کے بنانے والے اور نماز پڑھنے والے سب پاکیزہ لوگ ہیں اور پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اہل قباء سے پوچھا کہ تمہاری پاکیزگی کیا ہے تو انہوں نے بتایا کہ ہم طہارت کے لیے پانی استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ طہارت وضو کا مقدمہ اور وضو نماز کا پیش خیمہ ہے اور یہ نماز کے اہتمام پر دلالت کرتا ہے۔ اِس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ظاہر کے اعتبار سے بھی نہایت مہذب اور پاکیزہ لوگ تھے اور صفائے نفس کے لیے بھی کوشاں رہنے والے تھے۔ کیونکہ اُن کی ظاہری صفائی سج دھج کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی عبادت کے لیے تھی۔ لیکن اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ظاہری صفائی اور پاکیزگی اِسلام میں کیا مقام رکھتی ہے۔ اِس لیے آنحضرت ﷺ نے طہارت کو نصف ایمان قرار دیا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے جس اُمت کو اِس درجہ صفائی کا حکم دیا گیا تھا وہ دنیا میں سب سے گندی قوم مشہور ہوکر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ عطا فرمائے۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

(کیا جس نے اپنی تعمیر کی بنیاد رکھی اللہ کے تقویٰ اور اُس کی خوشنودی پر۔ وہ بہتر ہے یا وہ جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی ایک کھوکھلی گرتی ہوئی کگر پر، پس وہ گر گئی اُس کو لے کر جہنم میں اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ (۱۰۹)

مسجد قبا اور مسجد ضرار کا فرق ایک مثال:

اِس آیت میں چند مشکل الفاظ ہیں۔ اِس لیے میں پہلے اُس کی تشریح کیے دیتا ہوں۔ ''شفا'' کسی چیز کے کنارے کو کہتے ہیں۔ ''جرف'' ندیوں نالوں اور وادیوں میں بعض اوقات پانی کا زور کنارے کے نیچے سے مٹی بہا کر لے جاتا ہے اور وہ کنارہ چھجے کی طرح لٹکا رہ جاتا ہے۔ اس لٹکنے والے کنارے کو عربی میں جُرف کہتے ہے۔ ''ہار'' کا معنی ہے گرنے والا۔

گزشتہ آیتِ کریمہ میں تقابل کیا گیا ہے مسجد قباء اور مسجد ضرار میں اَب اِن دونوں مسجدوں کی تعمیر کا فرق ایک مثال کے ذریعے سے واضح فرمایا جارہا ہے۔ ایک عمارت وہ ہے جسے اللہ کے تقویٰ کی مضبوط بنیاد پر اٹھایا گیا ہے۔ اُس کی عمارت دوسری عمارتوں کی طرح بظاہر زمین پر اٹھائی گئی ہے لیکن حقیقت میں اُس کی بنیاد تقویٰ پر ہے اُس کے بنانے والے اِس عمارت کی ایک ایک اینٹ رکھتے ہوئے اپنے دلوں میں اللہ کے خوف اُس کے احکام کی اطاعت کا جذبہ اور اُسی کے لیے وفاداری اور بندگی کے عہد کو استوار کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور اُس کی تعمیر کے لیے محنت اور مشقت کرتے ہوئے صرف اللہ کی رضا کا حصول اُن کے پیش نظر ہے وہ اِس عمارت کو اللہ کے بندوں کی تربیت اور اللہ کی عبادت کا مرکز بنانے کی فکر میں ہیں اور اِس کے مقابل ایک دوسری عمارت اٹھائی جارہی ہے۔ جس کے اٹھانے والے دل و دماغ کی پختگی اور استواری سے محروم ہیں۔ اُن کے دلوں میں ایمان کی بجائے نفاق کی فصل اُگتی ہے۔ وقت کا ہر حادثہ اُن کے دلوں کی موت ثابت ہوتا ہے۔ وہ مضبوط کردار کی بجائے کھوکھلے اور ہوا کے رخ پر اُڑنے والا کردار جنم دے رہے ہیں۔ وہ صاحب ایمان لوگوں کی مضبوط قوت کے سامنے ایسی کمزور زمین پر کھڑے ہیں جیسے دریا میں کنارے کی زمین کا وہ حصہ جس کے نیچے سے پانی گزرنے کے باعث مٹی نکل چکی ہے۔ اَب یہ کنارہ چھجے کی طرح فضاء میں معلق ہے۔ جس کے قیام و ثبات کا کوئی سہارا نہیں۔ اگر کوئی شخص اِس پر عمارت بنانے کی کوشش کرے۔ تو یہ کمزور زمین اُس کی عمارت سمیت دریا میں جا گرے گی۔ یہ دریا میں معلق کنارے کی زمین جس طرح ہر طرح کی مضبوطی سے

Marfat.com

محروم ہے۔ اِسی طرح نفاق سے بننے والی زمین اور مفادات کا اسیر عقیدہ اور ہوا کے رخ پر اڑنے والا مزاج اُس سے زیادہ کمزور ہے۔ اِس آیت کریم
میں یہی مثال دے کر دونوں مسجدوں کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ ایک مسجد تو تقوی اور خوشنودیِ حق کے مضبوط اور زندگی بخش حقائق پر بنائی جارہی ہے اور
دوسری مسجد نفاق کی کمزور زمین پر جس کے نیچے ایمان کی قوت کو بجائے اندیشہ ہائے دور دراز کے خلاء کے سواء کچھ نہیں۔ حوداث کا معمولی حملہ اُس کو
گرانے کے لیے کافی ہے۔ لیکن یہ مسجد چونکہ منافقین کی کمین گاہ ہے۔ اِس لیے جب وہ گرے گی تو اِن منافقین کو ساتھ لے کر جہنم میں جائے گی۔ اِس کے
بعد فرمایا اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ظلم کسی بھی چیز کے غلط استعمال کو کہتے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِن منافقین کو عقل وشعور سے بہرہ ور فرمایا۔ اِنہیں تما
مخلوقات پر اِنسان ہونے کی حیثیت سے عظمت بخشی۔ اِن کی تخلیق کا مقصد بطور انسان صرف اللہ کی بندگی کرنا تھا۔ لیکن جب انہوں نے اللہ کی بندگی او
اُس کا تقوی اختیار کرنے کی بجائے۔ مفادات کے حصول کو اپنا مقصد ٹھہرایا اور حق کا راستہ روکنے کے لیے ہر آستانے پر سر جھکایا اور بندوں کی بندگی کی او
اِس طرح سے انہوں نے اپنے اُوپر ظلم توڑا۔ تو ایسے ظالم ظاہر ہے اللہ کی ہدایت کے مستحق کیسے ہوسکتے ہیں۔

لَا یَزَالُ بُنْیَانُہُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِہِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُہُمْ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ ۝

(اور یہ عمارت جو انہوں نے بنائی اُن کے دلوں میں شک کی بنیاد بن کر جمی رہے گی۔ مگر یہ کہ اُن کے دل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو
جائیں اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ (۱۱۰)

قرآن پاک کا اسلوب یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے کافر اور منافق کو بھی آخر حد تک نصیحت کرتا اور ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ بہت کم ایسا ہو
ہے کہ وہ مخاطب کے بارے میں مایوسی کا اظہار کرے۔ ہاں البتہ کبھی کبھی آنحضرت ﷺ کی تسلی کے لیے بعض دلوں پر مہر لگائے جانے کی طرف اشار
کردیتا ہے۔ لیکن یہاں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ ممکن تھا کہ اِن کے نفاق کی اصلاح ہوجاتی لیکن انہوں نے مسجد کا مقدس نام لے کر جس طرح اِسلا
کے خلاف ایک اڈہ اور مرکز بنانے کی حرکت کی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اِن کا نفاق بڑھتے بڑھتے حق کے مقابلے میں آ کھڑا ہوا ہے۔ اَب اُن کے
دلوں میں قبولیتِ حق کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اِن کے دلوں کے ریشے ریشے میں نفاق اتر گیا ہے۔ اَب تو ایک ہی صورت ہے کہ اِن کے دلوں کو پاش
پاش کر کے نفاق کو نکالا جائے اور از سر نو دلوں میں قبولیتِ حق کا مادہ پیدا کیا جائے۔ یہ ایک ایسا محال اَمر ہے جس کا اللہ کے تکوینی اور تشریعی قانون میں
کوئی امکان نہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین ہمیشہ کے لیے ایمان سے محروم کردئے گئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی
مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّةَ ؕ
یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَیْہِ
حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَہْدِہٖ مِنَ
اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ ہُوَ الْفَوْزُ

Marfat.com

الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ
السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ
الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١١٢﴾ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِيْ قُرْبٰى
مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ
اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗۤ
اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿١١٤﴾ وَمَا كَانَ
اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١١٦﴾
لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ
مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١١٧﴾ ۙ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ
الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ
وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ

Marfat.com

اِلَیْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ لِیَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۱۸﴾

(بے شک اللہ نے خرید لئے ہیں مومنوں سے اُن کے جان و مال جنت کے بدلے میں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ ایک سچا وعدہ ہے۔ تورات، انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو۔ بس تم خوشیاں مناؤ اُس سودے پر جو تم نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ (۱۱۱) اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے عبادت گزار، اُس کی تعریف کے گن گانے والے، ریاض کرنے والے، رکوع اور سجدہ کرتے رہنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے (اصلی مومن ہیں) اور ان مومنوں کو خوش خبری دے دو۔ (۱۱۲) مناسب نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکین کے لیے اگر چہ وہ مشرک اُن کے قریبی رشتے دار ہوں جبکہ کھل چکا اُن پر کہ وہ دوزخی ہیں۔ (۱۱۳) (اور نہ تھی ابراہیم کی استغفار اپنے باپ کے لیے مگر اُس وعدے کی وجہ سے جو انہوں نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ مگر جب ابراہیم پر یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ تو وہ اُس سے بیزار ہو گئے۔ بے شک ابراہیم بڑے ہی نرم دل اور بردبار تھے۔ (۱۱۴) اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرئے جب تک اُن کو صاف صاف بتا نہ دے کہ اُنہیں کن چیزوں سے بچنا چاہیے۔ بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (۱۱۵) (بلا شبہ اللہ ہی ہے جس کی آسمانوں اور زمین پر بادشاہی ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا تمہارے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مدد گار۔ (۱۱۶) (اللہ نے رحمت کی نظر کی نبی پر اور اُن مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے نبی کی پیروی کی مشکل کی گھڑی میں اس کے بعد کہ قریب تھا کہ دل ٹیڑھے ہو جائیں اُن میں سے ایک گروہ کے۔ پھر اللہ نے اُن پر رحمت کی نگاہ کی۔ بیشک وہ اُن پر نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ (۱۱۷) اور اُن تینوں پر بھی (نظر رحمت فرمائی) جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب اُن پر زمین تنگ ہو گئی باوجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہو گئیں اُن پر اُن کی جانیں اور وہ سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اُسی کی طرف۔ پھر اللہ نے اُن پر عنایت کی نظر کی تا کہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے بہت توبہ قبول فرمانے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا۔ (۱۱۸) (۱۱۱ تا ۱۱۸) (رکوع:۱۴)

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِکَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

(بے شک اللہ نے خرید لئے ہیں مومنوں سے اُن کے جان و مال جنت کے بدلے میں وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ ایک سچا وعدہ ہے۔ تورات، انجیل اور قرآن میں اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو۔ بس تم خوشیاں مناؤ اُس سودے پر جو تم نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ (۱۱۱)

سورہ توبہ میں سب سے پہلے اُن لوگوں سے براءت کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو اللہ کی اصل حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں اور وہ اپنی حیوانی زندگی پر قانع رہ کر شرف انسانی کو پامال کر چکے ہیں۔ نہ انہیں اللہ کی الوہیت سمجھ آتی ہے اور نہ اپنی عبدیت کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کے بعد اُن لوگوں پر تنقید کی گئی ہے۔ جو اللہ کی الوہیت کو تسلیم کرتے اور اپنی بندگی کا اقرار کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں

Marfat.com

لیکن حقیقت میں وہ ایمان سے کوسوں دور ہیں۔اس تنقید میں اُن کی اصلاح کی بھی کوشش کی گئی ہے اور بصورت دیگر انہیں اُن کے انجام سے ڈرایا بھی گیا ہے۔پیش نظر آیت کریمہ میں اِن نام نہاد مومنوں یعنی منافقوں پر وہ اصل حقیقت واضح کی جارہی ہے۔جس سے تغافل کے باعث یہ لوگ حقیقی ایمان سے محروم ہیں۔منافق چونکہ ایمان اور اُس کے تقاضوں سے متعلق یکسو نہیں ہوتا اس لیے کبھی وہ مال کی محبت میں ڈوب کر کبھی اولاد کی محبت میں مبتلا ہو کر اور کبھی راہِ حق میں پیش آنے والی قربانیوں سے گھبرا کر نفاق میں پناہ لیتا ہے۔اس آیت میں اُس کے سامنے مومن کی اصل حقیقت واضح کی جارہی ہے اور یہ بتایا جارہا ہے کہ بندے اور اُس کے خدا کے درمیان وہ رشتہ کیا ہے جس کو ملحوظ خاطر رکھنے سے ایمان کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔وہ حقیقت اور وہ رشتہ یہ ہے کہ آدمی جب کلمہ پڑھ کر اللہ کے نبی کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے۔تو وہ دراصل اللہ سے معاہدہ کرتا ہے۔اُس کی حیثیت صرف ایک عقیدہ کی نہیں ہوتی بلکہ عہدو پیمان کی ہوتی ہے۔جس کی رو سے بندہ اپنا نفس اور اپنا مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے اور اُس کے معاوضے میں خدا کی طرف سے اس وعدے کو قبول کر لیتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں وہ اُسے جنت عطا کرے گا۔

شانِ نزول (حسب تصریح اکثر حضرات مفسرین، یہ آیات بیعتِ عقبہ کے شرکاء کے متعلق نازل ہوتی ہے جو ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں انصار مدینہ سے لی گئی تھی اسی لیے پوری سورت کے مدنی ہونے کے باوجود ان آیات کو مکی کہا گیا ہے،عقبہ پہاڑ کے حصہ کو کہا جاتا ہے اس جگہ وہ عقبہ مراد ہے جو منیٰ میں جمرۂ عقبہ کے ساتھ پہاڑ کا حصہ ہی (آجکل حجاج کی کثرت کے سبب پہاڑ کا یہ حصہ صاف کر کے میدان بنادیا گیا ہے صرف جمرہ رہ گیا ہی اس عقبہ پر مدینہ طیبہ کے حضرات سے تین مرتبہ بیعت لی گئی ہے پہلے بعثتِ نبوی سے گیارہویں سال میں ہوئی جس میں چھ حضرات مسلمان ہو کر بیعت کر کے مدینہ واپس ہوئے تو مدینہ کے گھر گھر میں رسول ﷺ اور اسلام کا چرچا ہونے لگا اگلے سال موسم حج میں بارہ حضرات اسی جگہ جمع ہوئے جن میں پانچ پہلے اور سات نئے تھے سب نے بیعت کی اب مدینہ میں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہو گی جو چالیس نفر سے زائد تھی،انہوں نے درخواست کی کہ ہمیں قرآن پڑھانے کے لیے کسی کو بھیج دیا جائے،رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیج دیا انہوں نے موجودہ مسلمانوں کو قرآن بھی پڑھایا اور اسلام کی تبلیغ بھی کی جس کے نتیجہ میں مدینہ کی بڑی جماعتیں اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئیں۔اس کے بعد بعثتِ نبویؐ کے تیرہویں سال میں ستر مرد و عورتیں اسی جگہ جمع ہوئے یہ تیسری بیعت عقبہ جو آخری ہے اور عموماً بیعت عقبہ سے یہی بیعت مراد ہوتی ہے یہ بیعت اسلام کے اصولی عقائد و اعمال کے ساتھ خصوصی طور پر کفار سے جہاد اور جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو آپ کی حفاظت و حمایت پر لی گئی اس میں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس وقت معاہدہ ہو رہا ہے۔آپ جو شرائط اپنے رب کے متعلق یا اپنے متعلق کرنا چاہیں وہ واضح کر دی جائیں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے لے تو یہ شرط رکھتا ہوں کہ آپ سب اس کی عبادت کریں گ اس کے سواء کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور اپنے لیے یہ شرط ہو کہ میری حفاظت اس طرح کریں گے جیسے اپنی جانوں اور اپنے اموال و اولاد کی حفاظت کرتے ہو،ان لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر ہم یہ دونوں شرطیں پوری کر دیں تو ہمیں اس کے بدلے میں کیا ملے گا؟ آپ ﷺ فرمایا جنت ملے گی،ان سب حضرات نے خوش ہو کر کہا کہ ہم اس سودے پر راضی ہیں اور ایسے راضی ہیں کہ اب اس کو نہ خود فسخ کرنے کی درخواست کریں گے نہ اس کے فسخ کرنیکو پسند کریں گے)۔

اللہ اور بندوں کے مابین بیع و شراء کی حقیقت اور مقتضیات:

بیع و شرا دراصل ایک معاہدہ ہے جس میں آدمی اپنی ایک چیز دیتا ہے اور دوسرے سے ایک چیز لیتا ہے۔لینے والا المشتری (خریدار) کہلاتا ہے اور دینے والا بائع (بیچنے والا) کہلاتا ہے۔چنانچہ جب یہ سودا مکمل ہو جاتا ہے۔تو بیچنے والے کو اپنی بیچی ہوئی چیز پر کوئی اختیار نہیں رہتا بلکہ اب اُس چیز پر خریدار کے حقوق تسلیم کیئے جاتے اور ثابت ہو جاتے ہیں اور بیچنے والے کو اُس کے بدلے میں جو چیز میسر آتی ہے۔اب اُس کے اختیارات اُس سے متعلق ہو جاتے ہیں۔

یہاں بیچنے والا انسان ہے۔وہ اپنی جان اور اپنا مال اور اپنے زیر ملکیت تمام چیزیں اور تمام اختیارات اللہ کے حوالے کر دیتا ہے اور یہ وعدہ کرتا ہے کہ آج سے میں اِن چیزوں پر اپنے اختیارات سے دستبردار ہوتا ہوں اور اللہ کے اختیارات کو تسلیم کرتا ہوں اور یہ بھی مانتا ہوں میں نے یہ سب کچھ جنت کے بدلے میں بیچ دیا ہے۔میری زندگی اور میرے اختیارات کی آخری حد چونکہ موت ہے۔اس لیے میں نے جو چیز بیچی ہے۔اُس کی سپردگی اور

Marfat.com

تفویض زندگی کے آخری سانس تک مکمل ہوگی۔ اِس کے بدلے میں مجھے جنت اُس وقت ملے گی۔ جب میری طرف سے تفویض کا عمل مکمل ہوجائے گا۔

اِس میں چند باتیں نہایت حیران کن بھی ہیں اور انسان کے لیے باعث شرف بھی۔ پہلی بات یہ کہ انسان ایک معمولی مخلوق ہے۔ مخلوقات میں بھی اُس سے بدرجہا عظیم اور جلیل چیزیں موجود ہیں۔ انسان کی حیثیت اُن کے مقابلے میں مشتِ خاک سے زیادہ نہیں۔ لیکن پھر بھی اُن کے مقابلے میں ایک اشتراک بھی ہے کہ دونوں مخلوق ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسے کسی اشتراک کا تصور بھی گناہ سے کم نہیں۔ وہ خالق کائنات ہے اور انسان ایک ادنی مخلوق، لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اُسے اپنے ساتھ ایک معاہدہ کا حق دیتا ہے اور مزید کہ جس طرح وہ اُس پر ایک ذمہ داری ڈالتا ہے اِسی طرح خود بھی ایک ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ دوسری یہ بات کہ انسان جو کچھ اللہ کے حوالے کر رہا ہے۔ وہ اُس کی اپنی ملکیت نہیں بلکہ اللہ کی عطا اور اُس کی دین ہے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے انسان سے جو کچھ لے رہا ہے۔ اُسے انسان کی ملکیت قرار دے رہا ہے تاکہ یہ معاہدہ ٹھیک ہوسکے کیونکہ جانبین میں سودا طے پانے کے لیے ضروری ہے کہ جن دو چیزوں کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ وہ دونوں کی ملکیت ہو اور زیر قبضہ ہو اور تیسری چیز جو انسان کے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں کہ انسان جو کچھ اِس سودے میں دے رہا ہے۔ وہ فانی ہے اور وہ کسی بھی وقت ختم ہوجانے والا ہے۔ لیکن اُس کے بدلے میں جو جنت لے رہا ہے۔ وہ باقی اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ اِن اعزازت کے ساتھ انسانی شرف کو ایسی سطح تک پہنچا دیا گیا ہے جس سطح تک کسی دوسری مخلوق کی رسائی نہیں۔

آیت کریمہ میں مبیع انسان کے نفس اور مال کو قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں لیکن حقیقت میں اِس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے جسم و جان اور اپنی زیر تصرف چیزوں میں اختیار عطا فرمایا ہے۔ یعنی اُس کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ یہ جسم بھی تمہارا ہے یہ جان بھی تمہاری ہے اور اِس سے متعلقات بھی تمہارے ہیں۔ تمہیں ہم نے اِن چیزوں میں اختیار عطا فرمایا ہے۔ تم اپنی مرضی کے مالک ہو۔ تم اپنے جسم اور اپنی جان کو جہاں چاہو اور جیسے چاہو استعمال کرو۔ دل و دماغ کی قوتوں کو جہاں چاہو صرف کرو۔ جس کے حق میں چاہو کھپا دو اور جس کے خلاف چاہو لڑا دو اپنے اقتدار اور رسوخ کی قوت سے جو چاہو عطا کردو اور جو چاہو چھین لو۔ اپنے حواس اور اپنی عقل کو جیسے چاہو استعمال کرو۔ اِسی طرح تم اپنے مال میں بھی آزادانہ تصرف کا حق رکھتے ہو۔ چاہے اِسے انسانیت کی خدمت میں صرف کرو اور چاہے اِسے بے دینی کے فروغ میں استعمال کرو اور چاہے اِسے سفلی جذبات کی نذر کردو۔ میں یہ تمہارا حق تسلیم کرتا ہوں۔ لیکن میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے تمام اختیارات سے میرے حق میں دستبردار ہوجاؤ۔ تم یہ تسلیم کرلو کہ آج کے بعد تم اپنے دل و دماغ کے مالک نہیں بلکہ امین ہو۔ تمہارا مال تمہارا نہیں بلکہ اللہ کا ہے اور تمہارے پاس امانت ہے۔ تم اپنے دل و دماغ اپنی قوتوں اور اپنے مال و دولت کو اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ کی ہدایت کے مطابق استعمال میں لاؤ گے۔ تم ہر وہ کام نہیں کرو گے۔ جس میں تمہاری مرضی اور تمہارے نفس کی رضا ہو۔ بلکہ تم ہر کام میں اللہ کی رضا چاہو گے۔ تم ہر قدم پر اللہ کے احکام کی پابندی کرو گے۔ جب تک تم زندہ ہو۔ تم اللہ کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارو گے اور اگر کبھی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ اور اُس کے دین کی طرف سے یہ مطالبہ ہو کہ زندگی اللہ کے راستے میں قربان کردو۔ تو تمہیں اپنی زندگی بچانے کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ بلکہ تم آرزو کرو گے کہ کب وہ وقت آتا ہے۔ جب میں اِس بارِ امانت سے فارغ ہوجاؤں۔ تمہیں اِس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائے گا۔ اگرچہ قرآن و سنت میں اچھی زندگی اور دنیا کی سرافرازیوں کے بھی وعدے کیے گئے ہیں لیکن حقیقی وعدہ جو اِس آیت میں کیا گیا ہے۔ وہ جنت عطا کرنے کا ہے اور یہ جنت آخرت میں دی جائے گی۔ کیونکہ جنت کا دیا جانا انسانی زندگی کے تمام اعمال اللہ کی رضا کے مطابق گزارنے پر موقوف ہے۔ زندگی کے اعمال کے خاتمہ کے ساتھ ہی زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ اَب اُس کے بدلے کا وصول کرنا چونکہ آخرت ہی میں ممکن ہے۔ اِس لیے اِسے آخرت پر اٹھا رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ مستقبل کے وعدوں پر کون بھروسہ کرے۔ انسان سے جو کچھ لیا جا رہا ہے۔ وہ نقد ہے اور جس کا وعدہ ہے وہ اِس دنیا میں بھی نہیں آخرت میں ہے۔ جس کا وجود بجائے خود ایمان کا امتحان ہے۔ اِس سلسلے میں دو باتیں ارشاد فرمائی گئیں۔ پہلی بات یہ کہ یوں تو افراد کی شہادتیں بھی قابل اعتبار ہوتی ہیں۔ لیکن اگر افراد کی بجائے مختلف اقوام اور مختلف مذاہب مختلف زمانوں میں کسی بات کی شہادت دیں۔ تو کوئی ثقہ آدمی اُس کی قبولیت سے انکار نہیں کرسکتا۔ اِس لیے فرمایا گیا یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ نے ہزاروں سال پہلے تورات میں کیا۔ پھر اُس کا ذکر انجیل میں آیا اور اَب اُس کو قرآن کریم میں دہرایا جا رہا

Marfat.com

ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو لوگ اللہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے اُن کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ البتہ جو لوگ اللہ کے وجود کو مانتے ہے۔ مذہب کو ایک حقیقت سمجھتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ تورات انجیل اور قرآن کریم میں سے کسی کو بھی تسلیم نہ کرتے ہو۔ اول تو ہر سلیم العقل آدمی اِن تمام کتابوں کو منزل من اللہ مانتا ہے۔ ورنہ تینوں میں سے کسی نہ کسی کتاب کو ضرور تسلیم کرتا ہے۔ جب اُسے یہ معلوم ہوگا کہ اِن تینوں کتابوں میں اللہ نے یہ وعدہ فرمایا ہے۔ تو اُس کے لیے یہ باور کرنا کوئی مشکل نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر وعدہ ایفا کرنے والا اور کوئی نہیں۔ اِس لیے انسانوں کو اِس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے اور اپنی قسمت پر ناز کرتے ہوئے خوشی سے جھوم اٹھنا چاہیے۔ ہم انسان جو اللہ کے مقابلے میں ایک پتنگے کی حیثیت بھی نہیں رکھتے انہیں اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے اعزاز سے نواز ہے کہ اگر وہ اپنا سب کچھ اللہ کے وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے اللہ کی امانت میں دے دیں اور اِس کا حق ادا کرتے ہوئے ساری زندگی گزار دیں۔ تو اللہ تعالیٰ یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں انہیں ایسی جنت عطا کروں گا جس کی نعمتوں کا تصور نہ کبھی اُن کے خیال میں گزرا ہوگا نہ کسی آنکھ نے ایسی نعمتیں دیکھی ہوں گی اور نہ کبھی کسی کان نے ایسی نعمتوں کا تذکرہ سنا ہوگا اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

یہ ہے اِسلامی زندگی کا وہ کم سے کم خاکہ جس میں اللہ سے وفا کے وہ مختلف رنگ بھرے جاتے ہیں۔ جنہیں تقویٰ، اطاعت، توکل، خشیت، قناعت، خدا خوفی، صبر، شکر اور شہادت جیسے فضائل کا نام دیا جاتا ہے۔ منافقین کے سامنے یہ خاکہ کھینچ کر بتایا جا رہا ہے کہ اِسلامی زندگی کی بنیاد اللہ سے کیا ہوا یہ سودا اور عہدو پیمان ہے۔ جس میں دوئی کا کوئی تصور نہیں۔ جس میں وفا کی کوئی تقسیم نہیں جس میں ایک آستانے کے سواء کوئی آستانہ نہیں۔ جس میں دل و دماغ کی یکسوائی میں کوئی دخل انداز ہونے والا نہیں جس میں کسی اور کی کبریائی اور کسی اور کی بندگی کا کوئی جواز نہیں تم جو ابھی تک نہ عقیدہ میں یکسو ہوسکے ہو نہ اطاعت میں۔ تمہارے دل و دماغ کے رشتے ابھی تک وفا کے مختلف آستانوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ تم ابھی تک اللہ کے سہارے کے سواء نہ جانے کن کن سہاروں سے ٹیک لگائے ہوئے ہو۔ تم ایمان کی اصل حقیقت کو سمجھو تا کہ تمہیں اپنے نفاق کو سمجھنے میں مدد ملے اور تم یکسوئی سے ایمان کی دولت پا سکو۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے عبادت گزار، اُس کی تعریف کے گن گانے والے، ریاض کرنے والے، رکوع اور سجدہ کرتے رہنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے (اصلی مومن ہیں) اور ان مومنوں کو خوش خبری دے دو۔ (۱۱۲)

سچے اہلِ ایمان کی صفات:

سابقہ آیت کریمہ میں ایمان کی اصل حقیقت بیان کرتے ہوئے یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنے جسم و جان اپنے مال و دولت اور اپنے متعلقات کا مالک نہیں اِس کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ اُس نے انسان سے جنت کے بدلے میں یہ سب کچھ خرید لیا ہے۔ اَب انسان اِس بات کی پابندی قبول کر چکا ہے کہ وہ جسم و جان مال و دولت اور اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور اُس کی رضا کا پابند ہے۔ لیکن اِدھر مشکل یہ ہے کہ انسان کا اپنے جسم و جان اور مال و دولت سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ اُسے بار بار اللہ سے کیا ہوا عہد بھول جاتا ہے۔ وہ بھول کر یا جذبات کا شکار ہو کر بہت سے مواقع پر اپنی مرضی کر گزرتا ہے۔ اگر وہ اپنے عہد میں واقعی مخلص ہے تو جیسے ہی اُسے اپنی غلطی پر تنبہ ہوتا ہے۔ تو وہ فوراً اللہ کی طرف پلٹتا ہے۔ اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کرتا ہے اور آئندہ غلطی سے بچنے کا عہد کرتا ہے اسی کا نام توبہ ہے۔ مومن کوشش کے باوجود بھی چونکہ معصوم نہیں اِس لیے اُسے ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ میں اللہ کے کسی حکم کو کوئی نافرمانی نہ کر بیٹھوں۔ اِس لیے وہ بار بار اپنا جائزہ لیتا ہے اور غلطی کی صورت میں بار بار اللہ کی طرف پلٹتا ہے۔ اِس لیے یہاں مومن کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف پلٹنے والا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں اِس غلط فہمی کا شکار نہیں ہوتا کہ میں چونکہ ہدایت کے راستے پر چل رہا ہوں۔ اِس لیے مجھ سے کسی گناہ کا صدور ممکن ہی نہیں۔ وہ اپنی نیکی کے پندار میں کبھی مبتلا نہیں ہوتا اور نہ وہ گناہ پر دلیر ہوتا ہے۔ ساری احتیاطوں کے باوجود وہ جانتا ہے کہ انسان لغزشوں سے محفوظ نہیں۔

چلے بچ کر کوئی کتنا وہ ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

Marfat.com

شیطان اپنی ٹھوکر اور گناہ پر اُڑ جاتا ہے۔ خدا سے غافل انسان گناہ کو دوہراتا ہے۔ لیکن ایک مومن اولین فرصت میں اپنے مالک کی طرف دوڑتا ہے اور اپنے گناہ پر ندامت کا اظہار کر کے توبہ کرتا ہے اور یہ عمل چونکہ اُس سے بار بار ہوتا ہے۔ اس لیے پروردگار نے مومنوں کے لیے (التَّآئبون) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کیونکہ اگر (یتوبون) ہوتا تو اِس کا مطلب یہ ہوتا کہ کبھی وہ توبہ بھی کر لیتے ہیں۔ لیکن (التَّآئبون) کا لفظ اِسم صفت ہونے کی وجہ سے استمرار اور دوام پر دلالت کرتا ہے اور فعل صرف وقوعِ فعل پر دلالت کرتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ مومن ایک چشمہ کی مانند ہے کہ جس سے غلطی صادر ہونے کے وقت ہمیشہ توبہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اِس پہلے چونکہ منافقین اور کچھ ایسے مخلص مسلمانوں کا تذکرہ ہوا ہے۔ جو غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کی کوتاہی کا شکار ہوئے۔ انہیں توجہ دلانے کے لیے صفاتِ مومنین میں سے سب سے پہلے توبہ کی صفت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ تاکہ جو لوگ اپنی غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہیں۔ وہ فوراً اللہ کی طرف رجوع کریں اور اپنی سابقہ کوتاہیوں پر توبہ کر کے اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں۔

اَلْعٰبِدُوْنَ : توبہ کے بعد عبادت کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ عبادت خدا کے حقوق میں سب سے بڑا حق ہے اور اگر اِس کو قرآن کریم کی اِصطلاح کے طور پر لیا جائے۔ پھر تو یہ تمام حقوق کا جامع لفظ ہے اور اطاعت کا مفہوم بھی اِس میں شامل ہے۔ عبادت غلامی اور بندگی کو کہتے ہیں۔ بندہ اپنے آقا کا ہمہ تن غلام ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر بھی اپنے آقا کی مرضی اور منشاء کے خلاف نہ سوچ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی کام کر سکتا ہے۔ وہ اپنے آقا کا اطاعت گزار اور اداشناس ہوتا ہے۔ اُسے ہر وقت اپنے آقا کی رضا کی فکر رہتی ہے۔ اُس کا آقا اُسے جس حال میں رکھے کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ اُس کے آقا کے فرامین کا مجموعہ اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ جس طرح کسی اور آستانے پر جھکتا نہیں اِسی طرح آئین اور قانون کے لیے کسی اور کی دریوزہ گری بھی نہیں کرتا اُس کی اُمید اور پناہ صرف اللہ کی ذات ہوتی ہے۔

اَلْحٰمِدُوْنَ : حمد جس طرح ثناءِ جمیل کو کہتے ہیں۔ اِسی طرح شکر گزاری کو بھی کہتے ہیں۔ بندے کا دل جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر سے سرشار ہو جاتا ہے۔ تو اُس کے لب اُسی کی حمد وثناء میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔ اُس کی نعمتوں کا اعتراف اُسی کی بندگی پر آمادہ کرتا ہے۔ اللہ سے کیا ہوا عہدِ وفا حمد کے جذبات سے محبت کی طلب اور محبت کا جواب بن جاتا ہے۔ پوری اِسلامی زندگی دل کی پکار بن جاتی ہے۔

اَلسّٰٓئِحُوْنَ : یہ لفظ ساح یسیح سے اِسم فاعل یا اِسم صفت ہے۔ سیاحت اِس کا مصدر ہے۔ اِس کے معنی ہے چلنا، سفر کرنا، گھومنا پھرنا۔ یہ چونکہ اِسلامی اصطلاح ہے۔ اِس لیے اسے محض سفر یا سیر سپاٹے کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ بلکہ اِس کا معنی ہوگا ایسے مقصد کے لیے سفر جو اِسلام کو مطلوب ہے۔ مثلاً اللہ کی راہ میں جہاد، اقامتِ دین کے لیے دوڑ بھاگ، دعوتِ دین، اصلاحِ خلق، حصولِ علم، تلاشِ رزقِ حلال اور مشاہدہ آیاتِ الٰہی کے لیے سفر یہ تمام اِس سیاحت کا حصہ ہیں۔ جو مومن ایسے پاکیزہ مقاصد کے لیے سفر کرتا ہے۔ وہ (السائحون) میں شامل ہے۔

بعض اہلِ علم نے یہ کہا ہے کہ قدیم زمانے سے سیاحت اہلِ دین کی اصطلاح رہی ہے۔ جس کا مفہوم صاحب لسان العرب نے یوں ادا کیا ہے (الذهاب فی الارض للعبادة دالترهب) عبادت وریاضت کے لیے کسی سمت کو نکل کھڑے ہونا۔ اسلام سے پہلے اکثر مذاہب میں عبادت کے پہلو سے اس بات کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے کہ آدمی گھر در، بیوی بچوں اور دنیا کے ہنگاموں سے الگ ہو کر جنگلوں، پہاڑوں اور سنسان جگہوں میں نکل جائے، اپنا سارا وقت دھیان گیان، ذکر و عبادت، چلہ کشی اور ریاضت میں گزارے۔ قوت لایموت پر قناعت کرے۔ بھوک پیاس ستائے تو جنگل کے پھل پھلاری اور ندیوں چشموں کے پانی پر گزارہ کرے عیسائیوں کے راہبوں، گوتم بدھ کے بھکشوؤں اور ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کا محبوب طریقۂ عبادت یہی رہا ہے۔ یہ لوگ اگر خلق کی طرف متوجہ بھی ہوتے تھے تو اس طرح کہ صبح کسی بستی میں اور شام کسی بستی میں۔ جہاں پہنچے نیکی اور پرہیزگاری کے چند کلمے لوگوں کے کانوں میں ڈالے اور وہاں سے چل کھڑے ہوئے۔ اسی درویشانہ اور راہبانہ زندگی کے لیے قدیم اصطلاح سیاحت کی رہی ہے۔

اس سیاحت کا جتنا حصہ رہبانیت کے حکم میں داخل ہے وہ تو اسلام میں ممنوع ہے اس لیے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور رہبانیت فطرت کے خلاف ہے لیکن اس کا جو حصہ زہد و توکل، ذکر و فکر، خلوت و تبتل، ریاضت و مجاہدہ، جستجوئے حقیقت، طلب علم اور دعوت الی اللہ و جہاد فی سبیل اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ اسلام میں بھی مطلوب و مقصود ہے اور اس کو اسلام نے روزہ، اعتکاف، عمرہ، حج اور جہاد میں سمو دیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں سیاحت کے باب میں نفی اور اثبات دونوں طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ ایک طرف یہ ارشاد ملتا ہے کہ (لا سیاحۃ فی الاسلام) اسلام میں سیاحت نہیں

Marfat.com

ہے۔دوسری طرف یہ چیز بھی ملتی ہے کہ ''سیاحة هذه الا مة الصیام و لز وم المساجد '' اس امت کے لیے سیاحت روزے اور مسجدوں کے ساتھ وابستگی ہے۔ابوداؤد میں روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے سیاحت اختیار کرنے کی اجازت مانگی۔آپ ﷺ نے فرمایا ''سیاحة امتی الجهاد فی سبیل الله'' (میری امت کی سیاحت اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلنا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ سیاحت کا جو حصہ رہبانیت کی تعریف میں آتا ہے وہ تو اسلام نے اپنے نصاب سے خارج کردیا ہے۔لیکن اصل اصل مقصد سیاحت اسلام میں بھی باقی ہے اور روزہ، اعتکاف، ہجرت، جہاد، دعوت وتبلیغ اور طلب علم وحصول تربیت کے لیے سفر، یہ سب چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔یہ سیاحت جس طرح مردوں کے لیے ہے اسی طرح جیسا کہ سورہ تحریم کے لفظ ''سائحات'' سے واضح ہے، عورتوں کے لیے بھی ہے۔البتہ عورتیں ان چیزوں سے مستثنیٰ رہیں گی جن سے شریعت نے ان کو مستثنیٰ رکھا ہے مثلاً قتال وغیرہ۔

عام طور پر ہمارے مترجموں نے اس کا ترجمہ روزہ رکھنے والے یا راہ خدا میں پھرنے والے یا بے تعلق رہنے والے کیا ہے لیکن ان ترجموں سے سیاحت کا صرف ایک ایک پہلو سامنے آتا ہے۔درآنحالیکہ اس کے متعدد پہلو ہیں۔میں نے ریاض کرنیوالے، ترجمہ کیا ہے۔اگرچہ میں اس پر پوری طرح مطمئن تو نہیں ہوں۔لیکن میرے نزدیک یہ ترجمہ نسبتاً لفظ کی روح سے قریب تر اور اس کے کل نہیں تو اکثر اطراف کا جامع ہے۔ (والعلم عنداللہ) (تدبر قرآن)۔

الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ: رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے۔قرآن کریم میں رکوع اور سجدہ کو جب اکٹھا ذکر کیا گیا ہے۔تو مراد اس سے عموماً نماز ہوتی ہے اور جب اِسے صفاتِ مومن کے ضمن میں بیان کیا جاتا ہے۔تو مراد اُس سے صرف فرض نمازیں نہیں ہوتیں بلکہ نفل اور خلوت کی نمازیں بھی مراد ہوتی ہیں۔ارشادِ خداوندی کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومن اپنے دوسری صفات سمیت سجدہ اور رکوع یعنی نماز کو صرف ایک فریضہ کے طور پر ادا نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے دل کی لگن اور ذوق کی تسکین بن جاتی ہے۔جب بھی اُن کو موقع ملتا ہے کثرت سے نوافل پڑھتے ہیں۔راتوں کا بیشتر حصہ اللہ کے سامنے رکوع وسجود میں گزارتا ہے۔نماز چونکہ اللہ سے عہدوفا کی پاسداری کا سب سے اہم ذریعہ ہے اور ایک مومن کے اندر عبدیت کے جذبات کو بسا دینے کی سب سے مؤثر کوشش ہے۔اِسی وجہ سے مومن میں اللہ سے گہری محبت کا ذوق اور داعیہ پیدا ہوجاتا ہے۔وہ ہزار مشاغل میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔ذکر اللہ میں اُسے سکون ملتا ہے اور دنیا بھر کے غموں کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا ہوجاتی ہے۔

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: ''نیکی کا حکم دینے والے بدی سے روکنے والے'' اُوپر جن صفات کا ذکر ہوا ہیں۔اُن کا بیشتر تعلق فرد کی اپنی اصلاح وتربیت سے ہے۔اَب جس صفت کا ذکر ہورہا ہے۔اس سے جہاں اُس کے اپنے ایمان وعمل کی حفاظت ہوتی ہے۔وہیں اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومن جس طرح اپنی اصلاح وتربیت کا ذمہ دار ہے۔اُسی طرح قوم اور جماعت کی اصلاح وتربیت بھی اُس کی ذمہ داری ہے۔اِس ذمہ داری کی ادائیگی کا ذریعہ اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔اُس کے اپنے گھر میں یا گھر سے باہر اپنے دائرہ کار کے اندر اپنے زیر اثر اداروں میں اور اپنے اثر ورسوخ کے مواقع میں تدبر وحکمت کے ساتھ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اس کے فرائض میں شامل ہے۔اگر وہ خود فرائض کا ادا کرنے والا ہے۔لیکن اُس کی بیوی اور بچے اور اُس کے زیر اثر لوگ برائی میں ملوث ہیں۔تو یہ اُن کی جواب دہی سے بچ نہیں سکتا۔ویسے بھی برائیوں کا حال بیماری اور وباء کی طرح ہوتا ہے۔جو آدمی صرف اپنی صحت کی حفاظت کرتا ہے۔لیکن اپنے گردوپیش میں بیماری کے پھیلنے کے اسباب کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کرتا وہ بیماری سے دیر تک محفوظ نہیں رہ سکتا۔برائیوں سے رواداری رکھنے والا بھی حلاوت ایمان سے رفتہ رفتہ محروم ہوجاتا ہے۔عبادت کا شوق ختم ہوجاتا ہے۔برائی کی نفرت دل سے نکل جاتی ہے۔بنا برین ضروری ہے کہ اگر اپنے ایمان وعمل کی فکر ہے اور اپنے مسلمان بھائیوں کے بگاڑ کو بھی روکنا ہے تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بغیر چارۂ کار نہیں۔

اَلْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ: ''اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے'' یہ ایک ایسی صفت ہے جو گزشتہ تمام صفات کی جامع ہے۔مومن گہری نظر سے اپنا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ اُوپر جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔اُن میں سے کوئی صفت ہماری زندگی سے نکلنے نہ پائے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت اور صلح وجنگ کے معاملات میں جو حدود مقرر کردی ہے۔وہ اِن کو پوری

Marfat.com

پابندی کے ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں۔ اپنے انفرادی و اجتماعی عمل کو انہیں حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں اور کبھی اِن سے تجاوز کر کے نہ تو من مانی کاروائیاں کرنے لگتے ہیں اور نہ خدائی قوانین کے بجائے خود ساختہ قوانین یا انسانی ساخت کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں۔ اِس کے علاوہ خدا کے حدود کی حفاظت میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اِن حدود کو قائم کیا جائے اور اِن کو ٹوٹنے نہ دیا جائے۔ لہٰذا سچے اہل ایمان کی تعریف صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ خود حدود اللہ کی پابندی کرتے رہیں بلکہ مزید برآں اُن کی یہ صفت بھی ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اُن کی نگہبانی کرتے ہیں۔

یہاں خبر محذوف ہے کہ مندرجہ بالا صفات کے جو حامل ہوتے ہیں وہی سچے مومن ہیں۔ ایسے مومنوں کو بشارت دے دو کہ دنیا بھی اُن کی ہے اور آخرت بھی اُن کی ہے۔

مَاكَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْكَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَاتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○

(مناسب نہیں ہے نبی کے لیے اور نہ ایمان والوں کے لیے کہ مغفرت طلب کریں مشرکین کے لیے اگر چہ وہ مشرک اُن کے قریبی رشتے دار ہوں جبکہ کھل چکا اُن پر کہ وہ دوزخی ہیں۔ (۱۱۳)

آیت کی تمہید:

سورہ توبہ اُس زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ جب اِسلامی انقلاب اپنے تکمیلی مراحل کی طرف بڑھ رہا تھا اور اُس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو عطا کیا جانے والا ضابطۂ حیات تعلیم و تربیت کی ضروریات کے لحاظ سے آخری ہدایات عطا کر رہا تھا۔ اِسلامی زندگی کی بنیاد عقیدۂ توحید پر اٹھائی گئی ہے اور اِسلام کے باقی تمام عقائد تمام احکام اور تمام حکم و آداب اِسی کو دل و دماغ میں پیوست کرنے کا ذریعہ ہیں۔ ایک مومن کو آہستہ آہستہ اِس قابل بنایا جاتا ہے کہ اُس کے دل و دماغ کے تمام رشتے اور اُس کی زندگی کی تمام ترجیحات اللہ کے تعلق کے تابع بلکہ اِسی تعلق کی خادم ہو کر رہ جائیں۔ سلوک اور مروت، ہمدردی اور نصرت، خیر خواہی اور تعاون نوعِ انسانی کے تمام افراد سے ہو، لیکن دل و دماغ کی آبادی اور سیرابی اور تمام رشتوں کا مبدا و معاد تعلق باللہ کے سوا اور کوئی نہ ہو۔ اخوت کا رشتہ اُن سے ہو جو اللہ سے تعلق میں شریک ہوں۔ محبت کی سرگرمی وہاں ہو جو محبت اللہ کی محبت کے تابع ہو اور اگر اللہ سے تعلق کی قیمت ادا کرنے کے لیے ساری دنیا سے بھی رشتہ توڑنا پڑے تو ایک مومن کے لیے گراں نہ ہو۔ یہی وہ توحید ہے جو تمام اِسلامی تعلیمات کا حاصل اور سورہ توبہ کا اصل موضوع ہے۔ اِس لیے اِس سورہ کی پہلی آیت نے مشرکین سے براءت اور بے زاری کا اعلان کیا ہے اور اُن تمام لوگوں سے قطع تعلق کا حکم دیا ہے جو اللہ کے دشمن یا اللہ کے دین کے بارے میں یکسو نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں سے خونی اور صہری رشتے بھی ممنوع قرار دے دیئے گئے۔ مختصر یہ کہ ہر مومن کو اِس عہد کا پابند اور اِس روایت کا خوگر بنا دیا گیا ہے۔

بہت سادہ سا ہے اپنا اصول دوستی کوثر
جو اُن سے بے تعلق ہے ہمارا ہو نہیں سکتا

پیشِ نظر آیات سورۃ کے خاتمہ کی آیات ہیں۔ اِن آیات میں توحید کے تصور کو تکمیلی شان دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ہر بات میں اللہ کا حوالہ اور ہر تعلق کے لیے اللہ کی سند اور ہر محبت کے لیے اللہ سے محبت کی ترجیح صرف ظاہری زندگی تک کافی نہیں بلکہ وہ قریبی عزیز زندگی میں جن سے سب سے قریبی رشتہ ہوتا ہے۔ اگر وفات پا جائیں تو موت کا صدمہ بھی اللہ سے تعلق کی نزاکتوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جس شخص کی موت اللہ کے دین کی بجائے کفر اور اللہ سے دشمنی پر آتی ہے۔ اُس کے لیے دعا کرنے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ اللہ کا نبی جس کے دل پر اللہ کی محبت کے سوا کسی اور محبت کی پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی اُسے بھی منع فرما دیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے زندگی میں اللہ سے تعلق قائم کرنا مناسب نہیں سمجھا اور وہ زندگی بھر اللہ سے دشمنی کرتے رہے یا دوسرے تعلقات کو اللہ پر ترجیح دی وہ اِس قابل نہیں ہیں کہ موت کے بعد اُن کے لیے اِستغفار کیا جائے۔

Marfat.com

آیت کا شانِ نزول:

صحیح بخاری و مسلم کی روایات کے مطابق اِس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے چچا ابو طالب جنہوں نے طویل عرصہ تک آنحضرت ﷺ کی حفاظت کی۔ آپ کے دشمنوں کے سامنے سینہ سپر رہے۔ برداری اور خاندان کی پرواہ تک نہ کی۔ آنحضرت ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ وہ ایمان لے آئیں۔ تاکہ میں قیامت کے دن اُن کی شفاعت کرسکوں۔ مرضِ وفات میں جب اُن کا آخری وقت آیا۔ تو آنحضرت ﷺ اُن کے پاس تشریف لے گئے اور آپ نے اصرار فرمایا کہ چچا آپ کلمہ پڑھ لیں۔ تاکہ میں قیامت میں اپنے اللہ سے آپ کی بخشش کے بارے میں عرض کر سکوں۔ ابو جہل اور عبداللہ بن امیہ جیسے لوگ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے آنحضرت کا اصرار دیکھ کر ابو طالب سے کہا کہ کیا آپ عبدالمطلب کا دین چھوڑ دیں گے۔ رسول ﷺ نے بار بار اپنی بات کو دہرایا۔ مگر ہر مرتبہ ابو جہل اپنی بات کہتا رہا یہاں تک کہ ابو طالب نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ میں عبدالمطلب کے دین پر مر رہا ہوں اور اِسی حالت میں وفات پائی۔ رسول ﷺ کو اِس پر شدید رنج ہوا۔ چنانچہ آپ نے قسم کھائی میں اُس وقت تک آپ کے لیے اللہ سے بخشش مانگتا رہوں گا۔ جب تک مجھے اِس سے روک نہ دیا جائے۔ اِس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

شانِ نزول اگرچہ ایک خاص واقعہ ہے۔ لیکن اِس کا حکم عام ہے۔ اِس لیے اِس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ دوسرے مومنین کو بھی شامل فرمایا گیا ہے۔ آیت کے دوسرے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کسی شخص کے بارے میں یقین نہیں ہو جاتا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے اور وہ اپنے کفر کو ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ اُس وقت تک اُس کے لیے نہ صرف دعا کرنا جائز ہے بلکہ محمود ہے۔ لیکن جب یقین ہو جائے تو اِس کے بعد استغفار کی اجازت نہیں۔ کیونکہ اِس کے بعد استغفار کا مطلب یہ ہے۔ آپ ایک ایسے شخص کے لیے اپنے دل میں محبت اور خیر خواہی کے جذبات رکھتے ہیں۔ جو اللہ کا کھلا باغی اور اُس کے دین سے دشمنی رکھتا ہے۔ اللہ سے تعلق کا کم سے کم تقاضہ یہ ہے کہ جو اللہ کا دشمن ہے وہ مومن کا دشمن ہے اور دشمن کے لیے استغفار کرنا چہ معنی دارد یا اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے نجات اور جنت کا مستحق اُس آدمی کو ٹھہرایا ہے جو اللہ پر ایمان لانے والا اور اُس کا اطاعت گزار ہے اور جو شخص اللہ کے دین کا کافر یا اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے والا ہے۔ اُس کے لیے پروردگار کا قطعی فیصلہ ہے کہ وہ اُسے کبھی نہیں بخشے گا۔ اگر کوئی شخص ایسے شخص کے لیے استغفار کرتا ہے۔ تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے ہاں اللہ کے قانون اور اُس کے فیصلے کی کوئی اہمیت نہیں۔ اللہ کی رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔ مخلوقِ خدا اللہ کا کنبہ ہے ایک ایک فرد کی بخشش اُسے ہر درجہ عزیز ہے۔ بااِیں ہمہ وہ کافر اور مشرک کی بخشش کبھی نہیں فرمائے گا یہ اُس کا اٹل فیصلہ ہے۔ جو شخص اپنی قرابت داری یا دوستی کی وجہ سے کسی مشرک یا کافر کے لیے بخشش کی دعا مانگتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ سے بڑھ کر رحیم و کریم سمجھتا ہے اور اللہ کی بارگاہ کے آداب کی بجائے اپنی قرابت کے احترام کو ترجیح دیتا ہے۔

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے اور وہ کبھی اِس سے تائب نہیں ہوگا۔ اِس کے معلوم ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے جو ہر زمانے میں ممکن ہے کہ کوئی شخص کفر کی حالت میں مرجائے تو اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کا دشمن اور ناقابلِ بخشش ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ بتا دیا جائے کہ یہ شخص ایمان نہیں لائے گا جیسے نبی کریم ﷺ کو اور آپ کے واسطے سے صحابہ کو بعض اشخاص کے بارے میں بتا دیا گیا۔ لیکن آج اِس کا کوئی امکان نہیں اس لیے ہم کسی کو اُس کی زندگی میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ شخص موت پر ہی جان دے گا۔ ایسے شخص کے بارے میں ہدایت اور مغفرت کی دعا مانگنے کی اجازت ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝

(اور نہ تھی ابراہیم کی استغفار اپنے باپ کے لیے مگر اُس وعدے کی وجہ سے جو انہوں نے اپنے باپ سے کیا تھا۔ مگر جب ابراہیم پر یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ تو وہ اُس سے بیزار ہو گئے۔ بے شک ابراہیم بڑے ہی نرم دل اور بردبار تھے۔ (۱۱۴)

Marfat.com

ایک اشتباہ کا ازالہ:

اِس آیت کریمہ میں ایک اشتباہ کو دور کیا گیا ہے۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرزِ عمل سے پیدا ہو سکتا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے باپ کو ایمان لانے کی دعوت دی اور انہیں بتوں کی بندگی سے روکا۔ تو باپ نے نہایت سختی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کو رد کر دیا اور ڈانٹتے ہوئے کہا کہ ابراہیم! (علیہ السلام) تم اپنی باتوں سے باز نہ آئے۔ تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور ساتھ ہی گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ تو ابراہیم علیہ السلام نے گھر چھوڑتے ہوئے اپنے باپ سے کہا کہ مجھے آپ کے رویے سے کوئی شکایت نہیں۔ میں اپنے رب سے آپ کے لیے مغفرت طلب کرتا رہوں گا۔ بے شک میرا رب مجھ پر بہت مہربان ہے اور سورہ الشعراء میں پروردگار نے حضرت ابراہیم کی وہ دعا ذکر کی ہے جس میں انہوں نے اپنے رب کے لیے اللہ سے بخشش چاہی ہے۔ اِس طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے یہ اشتباہ ہو سکتا ہے کہ پروردگار نبی آخر زماں ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو تو مشرکوں کے لیے استغفار کرنے سے منع فرما رہے ہیں۔ جبکہ حضرت ابراہیم اپنے والد کے لیے دعا کرتے رہے ہیں۔ اِس آیت میں اُس کا جواب دیا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا درحقیقت اُس وعدے کی پاسداری تھی جو آپ نے اپنے والد سے کیا تھا۔ لیکن جب ابراہیم علیہ السلام پر یہ بات واضح ہوگئی کہ میرا باپ اللہ کا دشمن ہے۔ آپ نے اپنے باپ کے لیے دعا مانگنا چھوڑ دی۔ رہی یہ بات کہ آپ پر یہ بات واضح کیسی ہوئی۔ اِس کے دو احتمال ہیں کہ یا تو آپ کو وحی کے ذریعہ بتا دیا گیا ہوگا کہ آپ کے والد ایمان نہیں لائیگے اور یا جب آپ نے دیکھا کہ آپ کے والد کی وفات حالتِ کفر میں ہوئی ہے اور اُس نے آخری دم تک کفر سے توبہ نہیں کی۔ تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔

آخر میں فرمایا کہ بیشک ابراہیم بڑے ہی نرم دل اور رقیق القلب اور بردبار آدمی تھے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے والد نے اگرچہ آپ کے ساتھ نہایت درشت رویہ اختیار کیا آپ کو ایذا پہنچائی۔ حتیٰ کہ آپ کو گھر سے نکال دیا لیکن آپ نے دل میلا کرنے یا ناراض ہونے کی بجائے جب یہ دیکھا کہ میرا باپ جہنم کی طرف بڑھ رہا ہے تو آپ نے رقتِ قلبی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے باپ کے لیے اللہ سے رو رو کے دعائیں مانگیں اور بردباری کا ثبوت دیتے ہوئے باپ کے رویے کی پرواہ نہ کی لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ میرا باپ کسی طرح بھی حق کی طرف پلٹنے والا نہیں تو انہوں نے فوراً باپ سے براءت کا اظہار کر دیا کیونکہ آپ ہر حال میں اللہ سے ڈرنے والے اور کسی حال میں بھی حد سے تجاوز نہ کرنے والے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دو خوبیوں کا ذکر فرما کر اِس مضمون پر مہرِ تکمیل ثبت کر دی ہے کہ ایک مومن کو ہر حال میں اللہ کی رضا سے وابستہ رہنا چاہیے۔ اُس کا دل اللہ اور اُسکے دین کی محبت سے لبریز ہونا چاہیے۔ اُسے دین کی خاطر اُن بندوں کے لیے جو اللہ کے دین سے باغی ہیں اور جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں ہمیشہ بے تاب، بے چین اور بے کل ہونا چاہیے۔ وہ اپنے دشمن کے لیے بھی اللہ سے ہدایت کی دعا مانگے۔ کیونکہ جس شخص کے دل میں اللہ کے دین کے حوالے سے اللہ کے بندوں کے لیے محبت اور تڑپ نہیں۔ وہ کبھی اُس کے راستے میں آنے والی تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت نہیں کر سکتا۔ جگر نے ٹھیک کہا:

جب تک کہ غمِ انساں سے جگر انسان کا دل معمور نہیں
جنت ہی سہی دنیا لیکن جنت سے جہنم دور نہیں

لیکن جب اُسے معلوم ہو جائے کہ میں جس کے لیے تڑپ رہا ہوں۔ وہ میرے اللہ اور اُس کے دین کا دشمن ہے۔ تو پھر اُس کی رقتِ قلبی حق کی حمیت اور صلابت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ ہر طرح کے حالات میں حدودِ اعتدال میں رہنے والا اور افراط و تفریط سے بچنے والا شخص ہوتا ہے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ۝

اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے لوگوں کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کرے جب تک اُن کو صاف صاف بتا نہ دے کہ اُنھیں کن چیزوں سے بچنا چاہیے۔ بے شک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (۱۱۵)

Marfat.com

ایک حقیقت کا افشاء:

اِس آیت کریمہ میں ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھایا جارہا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افراد اور اقوام کی نجات اور سرفرازی کا دورمدار اللہ کی ہدایت کی پیروی پر ہے اور یہ اُس کا قانون ایسا اٹل ہے کہ جس میں کسی کی بیشی کا سوال پیدا نہیں ہوسکتا حتیٰ کہ اُن لوگوں کے لیے استغفار سے بھی روک دیا گیا ہے۔ جو کفر اور شرک کی حالت میں مرتے ہیں۔ اِس معاملے کی سنگینی اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے۔ دل میں یہ خیال آتا ہے کہ انسان کے بناؤ اور بگاڑ کا نتیجہ اگر اتنا خوفناک ہے۔ تو پروردگار نے ایسے سخت امتحان میں انسان کو کیوں مبتلا کیا۔ جب کے اُس کی عقل کی نارسائی پر خود اُس کی عقل گواہ ہے اور اُس کا ارادہ کتنے منفی جذبات سے مقہور واقع ہوا ہے اور اُس کی خواہشات کی دنیا اپنے اندر ایسی بے پناہ اپیل رکھتی ہے کہ ہر قدم پر لڑکھڑا جانے کے اندیشے ہوتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ انسان کے دل و دماغ کو ایسا راست رو بنا دیا جاتا کہ اُس کے لیے غلطی کرنا اور گمراہی میں مبتلا ہونا آسان نہ ہوتا۔ اِس واہمے کو دور کرنے کے لیے فرمایا جارہا ہے کہ گمراہی کا عمل انسان کی ہدایت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی انسانی گروہ کو بھی گمراہی کے حوالے نہیں کرتا بلکہ اُس نے انسان کے اندر ایسی عقل پیدا فرمائی ہے کہ اگر اِس عقل کو بگاڑ نہ دیا جائے اور اُسے صحیح کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ تو وہ ہمیشہ صحیح راستہ اختیار کرتی ہے۔ رہی وہ چیزیں جو عقل کی رسائی سے باہر ہیں۔ اُن کی راہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی کتابوں کے ذریعہ انسان کو فکر صحیح عطا کرتا ہے پھر محسوس راہنمائی کے لیے اپنے رسول بھیجتا ہے جو قدم قدم پر نہ صرف اپنی فکر بلکہ اپنے عمل کے چراغ بھی روشن کرتے ہیں۔ انسان کو اگر ایک طرف فکر صحیح سے نوازا جاتا ہے تو دوسری طرف اُن منفی عوامل کی بھی خبر دی جاتی ہے جن سے بچنا انسان کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اِس طرح مثبت اور منفی دونوں طرح کے حقائق کو واضح کرنے کے بعد انسان کو مکلف بنایا گیا ہے کہ تم زندگی کی شاہراہ پر سفر شروع کرو اور یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے حق کی ہدایت کی پیروی کی تو ہم اُس کی آسانیاں تمہارے لیے پیدا کر دیں گے اور اگر تم نے مخالفت کی روش اپنائی اور گمراہی کا راستہ اختیار کیا تو ہم تمہارے لیے وہ راستہ آسان کر دیں گے۔ تاکہ تم آزادانہ مرضی سے جدھر جانا چاہو جاسکو۔ اِن دونوں امکانات کی موجودگی میں جو شخص برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ روشنی کو دیکھتے ہوئے اندھیرے کی طرف بڑھتا ہے۔ عافیت کو چھوڑ کر مصیبت کو اختیار کرتا ہے۔ ایسا شخص ظاہر ہے کسی رحم کا مستحق نہیں ہوسکتا۔ اِس اصول کو سمجھ لیا جائے تو قرآن کریم نے جہاں کہیں بھی ہدایت اور ضلالت کو اپنی طرف سے منسوب کیا ہے۔ اُس کا مفہوم دونوں طرف کے چلنے والوں کے لیے آسانیاں فراہم کرنا ہے۔ جو شخص نیکی اور برائی کی پوری طرح وضاحت کے بعد گمراہی کو اختیار کرتا ہے وہ خود اُس راستے پر پڑتا ہے جو جہنم کی طرف جاتا اور اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ہر شخص کے ارادوں اور اُس کے قلبی احساسات سے بھی واقف ہیں اِس لیے جب وہ کسی کو نوازتا ہے تو بے سبب نہیں نوازتا ہے اور جب کسی کو سزا دیتا ہے تو ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ اُس کے اعمال کا بدلہ دیتا ہے۔

اِس آیت کے نزول کے وقت اُمت مسلمہ اپنے شباب کو پہنچ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اِس اُمت سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ اللہ نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو تمام کر دیا ہے۔ راہنمائی کو ہر طرح مکمل کر دیا گیا ہے۔ اَب اگر تم نے بگاڑ، گمراہی یا کجروی اختیار کی تو اِس کا انجام تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ کیونکہ تم پر ایک ایک چیز واضح کر دی گئی ہے۔ اَب غلط راستہ اختیار کرنے کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ جس کا تم کو خمیازہ بھگتنا ہوگا۔ دنیا میں ذلت کے حوالے کر دئے جاؤ گے اور آخرت میں بدترین عذاب تمہارے انتظار میں ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

(بلاشبہ اللہ ہی ہے جس کی آسمانوں اور زمین پر بادشاہی ہے۔ وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا تمہارے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار۔ (۱۱۶)

Marfat.com

آیتِ توحید:

سابقہ تین آیاتِ کریمہ میں توحید کی تعلیم دیتے ہوئے اُن باتوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔ جن میں احتیاط نہ کرنے سے تصورِ توحید کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور اگر اِن میں احتیاط برتی جائے تو عقیدۂ توحید میں پختگی اور تکمیلِ توحید کے تصورات میں کوئی کمی باقی نہیں رہتی۔ درحقیقت توحید کے وہ پہلو جن کا تعلق اعمال سے ہے۔ اگر قوتِ عمل میں کمزوری نہ ہو تو اُن کا حق ادا کرنا ممکن ہے۔ لیکن توحید کا وہ پہلو جس کا تعلق دماغی تصورات قلبی احساسات اور دل میں اُٹھنے والی کیفیات سے ہے۔ اُس کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا۔ جب تک آدمی اللہ کی ذات کو اپنا ملجا و ماویٰ اور اُس کی رضا کو منتہائے مقصود نہیں بنا لیتا۔ چنانچہ سابقہ تین آیات میں اِسی پہلو پر زور دیتے ہوئے حکم دیا گیا کہ اگر تمہارا کسی سے نسبی رشتہ ہو یا رنگ و نسل کی گرہ میں بندھے ہوئے ہو یا تمہارا کسی سے مفادات کا اشتراک ہو۔ لیکن وہ شخص اللہ اور اُس کے دین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تو اُس سے نہ صرف تمہارا کوئی رشتہ نہیں بلکہ وہ تمہارے لیے ایک اجنبی شخص ہے۔ جس کی مغفرت کی دعا بھی نہیں کر سکتے۔ وہ تمہارا بھائی بھی ہو تو تم اُس کی سفارش بھی نہیں کر سکتے ہو تمہارے لیے بس یہ ایک بات کفایت کرتی ہے کہ:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

دل کی کیفیات اور احساسات کو مزید پاکیزہ بنانے کے لیے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ اپنے بندوں پر حد درجہ رحیم و کریم ہے۔ یہ اُس کی رحمت کا نتیجہ ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو آخرت کے عذاب سے بچانے اور جنت کا مستحق بنانے کے لیے پوری طرح یہ بات واضح فرما دی کہ میں نے انسان کو وہ سب کچھ عطا کر دیا ہے جس سے وہ اپنے اللہ کی رضا کے راستے کو آسانی سے پہچان سکتا ہے۔ میں نے اُسے عقلِ سلیم دی ہے۔ اُس پر اپنی کتابیں اُتاری ہیں اور اُس کی راہنمائی کے لیے رسول بھیجے ہیں اور اگر اِس کے بعد بھی کوئی شخص سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے اور اندھیروں کا مسافر بن جاتا ہے۔ تو ایسے شخص کا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ اَب نہ صرف وہ شخص راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے بلکہ جو شخص اُس کے ساتھ چلتا ہے اور اُس کی ہم نوائی کرتا ہے۔ وہ بھی اپنی قسمت پھوڑ لیتا ہے۔ یہ ساری باتیں کہنے اور توحید کو نقطۂ کمال تک پہنچانے کے بعد پیشِ نظر آیت میں (جسے آیتِ توحید کہنا چاہیے) یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم نے کمالِ توحید کو حاصل کرنے کے لیے جو پراسس دیکھا ہے اور جو تفصیلات پڑھی ہے۔ یہ اُس ذاتِ خداوندی کا فیصلہ ہے۔ جس کی حاکمیت اور بادشاہت زمین و آسمان پر حاوی ہے۔ زندگی اور موت جس کے قبضے میں ہیں وہی تنہا اِس کائنات کا مالک اور حاکم ہے۔ اُس کے فیصلوں کے سامنے چون و چرا کی گنجائش نہیں وہ ہی تمہارا حامی اور وہی مددگار ہے۔ اُسی کی ہدایت کو حرزِ جان اور وظیفۂ عمل بناؤ۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۟ۙ

(اللہ نے رحمت کی نظر کی نبی پر اور اُن مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے نبی کی پیروی کی مشکل کی گھڑی میں اِس کے بعد کہ قریب تھا کہ دل ٹیڑھے ہو جائیں اُن میں سے ایک گروہ کے۔ پھر اللہ نے اُن پر رحمت کی نگاہ کی۔ بیشک وہ اُن پر نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ (۱۱۷)

تاب کا معنی، ساعۃ العسرۃ کا مفہوم:

"تاب یتوب" توبہ کا معنی ہوتا ہے اللہ کی طرف رجوع کرنا لیکن جب اِس کی نسبت اللہ کی طرف ہو اور صلہ علیٰ کے ساتھ آئے تو اِس کا معنی ہوتا ہے رحمت کی نظر کرنا یا رحمت سے توجہ فرمانا" اِس کا مرادی معنی ہے توبہ قبول کرنا"۔ ساعۃ العسرۃ کا معنی ہے "مشکل گھڑی" مراد اِس سے غزوۂ تبوک ہے۔ اِس غزوہ کو مشکل گھڑی سے اِس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ جب یہ غزوہ پیش آیا ہے تو سخت گرمی کا موسم تھا سفر بڑا طویل اور کٹھن تھا۔ سواریوں کی انتہائی کمی تھی۔

Marfat.com

ایک ایک اونٹ پر باری باری کئی کئی آدمی سوار ہوتے تھے۔ راستے میں پانی کی کم یابی کا یہ حال تھا کہ بعض دفعہ مسلمانوں کو سواری کے اونٹ ذبح کر کے اُن کے پیٹ سے پانی نکال کر اپنی پیاس بجھانا پڑی۔ راشن کی کمی کا حال یہ تھا کہ ایسا وقت بھی آیا جب دو دو آدمیوں کو صرف ایک کھجور پر دن رات بسر کرنا پڑے اور اِدھر مدینے کا حال یہ تھا کہ فصلیں پکی کھڑی تھیں۔ کھجور کی فصل کے اُترنے کا وقت تھا تاخیر سے فصل کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اِس کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا کہ قحط پھیل جاتا مقابلہ ایسی قوت سے تھا جن کے پاس افرادی قوت اور وسائل کی کوئی کمی نہ تھی وہ لاکھوں کی فوج بڑی آسانی کے ساتھ میدان میں لا سکتے تھے۔ اِن حالات میں جب اِس طرح کی اطلاعات پہنچیں کہ قیصر نوزائیدہ اِسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے لیے فوجیں سرحد پر جمع کر رہا ہے۔ ایسے سخت موسم اور ناموافق حالات میں ایسے طاقت ور دشمن کے مقابلے میں نکلنے کا فیصلہ کرنا شائد کوہ کندن سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ایسے خطرناک وقت میں اللہ کی تائید و نصرت اور پیغمبر کا عزم اور اُس کی بصیرت کام آتی ہے اور اِن دونوں کا اِجتماع اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر ممکن نہیں۔ اِسی لیے اِس آیت کریمہ میں سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کا ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ فیصلہ آپ کو کرنا تھا، صحابہ کرام تو آپ کے متبعین تھے۔ حالات اور وسائل آپ کے سامنے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے کوئی بڑے سے بڑا اولوالعزم بھی جنگ کا فیصلہ کرنے کبھی جرأت نہ کرتا لیکن وحی الٰہی نے آپ کی راہنمائی فرمائی اور رحمت الٰہی نے آپ کو حوصلہ بخشا اِس طرح آپ نے ایک تاریخ ساز فیصلہ کر ڈالا۔ جیسے ہی آپ نے فیصلے کا اعلان فرمایا تو اُن دو طبقوں کی اکثریت جو اسلام کا اصل سرمایہ ہیں اور جنہیں مہاجرین اور انصار کہا جاتا ہے ایک لمحہ کے توقف کے بغیر آپ کی پیروی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حالات کی سنگینی بھی اُن کے سامنے تھی۔ لیکن وہ صرف ایک بات جانتے تھے کہ حالات کا بدلنا اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے گا تو حسب حال بھی بنا دے گا لیکن ہمارا کام صرف حکم کا اتباع کرنا ہے البتہ اِن میں ایک محدود اقلیت ایسی تھی۔ جنہوں نے حالات کا وقتی طور پر اثر لیا۔ منہ زور گرمی نے اُن کے ارادوں کو متزلزل کیا۔ کھجوروں کے لٹکتے ہوئے خوشے دامن گیر ہوئے باغ کا ٹھنڈا سایہ کسی حد تک طویل ہونے لگا۔ لیکن اللہ کی رحمت نے اُن کو تھاما۔ چنانچہ وہ فوراً اللہ کی طرف پلٹے اور توفیقِ الٰہی سے اپنی کمزوری پر قابو پا لیا۔ اِنہیں میں سے ایک ابوخیثمہ بھی تھے اپنی ذات میں مخلص اور مجاہد لیکن حالات نے غلبہ پا لیا اور آپ آنحضرت ﷺ کی ہم رکابی میں نکل نہ سکے۔ ایک روز جب دوپہر کے وقت گھر آئے اور دیکھا کہ اِن کی دونوں بیویوں نے اپنے اپنے چھپر کے نیچے چھڑکاؤ کیا ہوا ہے اور ٹھنڈے پانی کی صراحیاں رکھی ہوئی ہیں اور لذیذ کھانا تیار ہے کچھ سوچ کر دہلیز پر ہی رک گئے اور اپنے دل سے کہنے لگے صد حیف! اللہ تعالیٰ کا محبوب تو چلچلاتی دھوپ اور گرم لو میں سفر کی تکلیفیں برداشت کر رہا ہو اور ابوخیثمہ کے لیے ٹھنڈی چھاؤں میں پلنگ بچھا ہوا ہو۔ اُس کے پینے کے لیے ٹھنڈا پانی اور کھانے کے لیے لذیذ کھانا موجود ہو اور دو خوبرو بیویاں اُس کی خدمت گزاری میں مصروف ہوں بخدا یہ انصاف نہیں پھر اُنہوں نے اپنی بیویوں سے کہا کہ ابوخیثمہ جب تک اپنے حبیب کے ساتھ جا کر نہ ملے اُسے چین نہیں آئے گا۔ چنانچہ اُونٹنی پر سوار ہوئے اور تبوک کی راہ لی۔ جب لشکر کے کچھ قریب پہنچے تو صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ یہ سوار تو ہماری طرف آتا معلوم ہوتا ہے۔ حضور نے فرمایا کُن اَبَا خیثمہ۔ یہ ابوخیثمہ ہو گا۔ جب وہ قریب ہوئے اور صحابہ نے پہنچانا تو حضور ﷺ سے عرض کیا کہ واقعی یہ ابوخیثمہ ہی ہے انہوں نے حاضر خدمت ہو کر اپنا قصہ سنایا حضور بہت خوش ہوئے اور اُن کیلئے دعائے خیر فرمائی۔

ایسے ہی لوگ تھے جن میں وقتی تساہل پیدا ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُنہیں پلٹنے کی توفیق بخشی کیونکہ وہ اپنے بندوں کیلئے رؤف بھی ہے اور رحیم بھی۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

اور اُن تینوں پر بھی (نظرِ رحمت فرمائی) جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب اُن پر زمین تنگ ہو گئی باوجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہو گئیں اُن پر اُن کی جانیں اور وہ سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اُسی کی طرف۔ پھر اللہ نے اُن پر عنایت کی نظر کی تاکہ وہ توبہ کریں۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے بہت توبہ قبول فرمانے والا اور ہمیشہ رحم کرنے والا۔ (۱۱۸)

تین صحابہ کون ہیں:

یہ اُن تین مخلص صحابہ کا ذکر ہے۔ جن کے نام کعب بن مالک، مُرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ تھے۔ یہ تینوں مخلص اور سچے مومن تھے۔ بار بار

Marfat.com

اپنے اخلاص کا ثبوت دے چکے تھے۔ کبھی اِن سے ایسی کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ اِن میں سے آخر الذکر دو اصحاب غزوۂ بدر میں بھی شریک ہو چکے تھے جن کی صداقتِ ایمانی ہر شک وشبہ سے بالاتھی کعب بن مالک بھی جنگ بدر کے علاوہ ہر غزوہ میں دادِ شجاعت دے چکے تھے۔ لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر یہ تینوں بزرگ سستی کا شکار ہوئے اور آنحضرت کی ہم رکابی سے محروم ہو گئے۔ یہ ایک ایسی کوتاہی تھی۔ جو قابلِ درگزر نہ تھی چنانچہ اُن کی تمام خدمات کے باوجود سخت گرفت ہوئی۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کوئی اِن سے سلام کلام نہ کرے۔ چالیس دن کے بعد اُن کی بیویوں کو بھی اُن سے الگ رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ پچاس دن تک اُن کا یہ مقاطعہ جاری رہا اس دوران اِن پر جو گزری جس طرح انہوں نے اپنے مخلص ہونے کا ثبوت دیا اور جس کے نتیجہ میں اللہ نے اُن کی توبہ قبول فرمائی اُسے انہیں بزرگوں میں سے ایک بزرگ کعب بن مالک نے بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے صحیح بخاری اور مسلم اور اکثر کتب حدیث نے حضرت کعب کی اِس تفصیلی حدیث کو نقل کیا ہے۔ ہم تفسیر مظہری سے اِس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔

حضرت کعب بن مالکؓ کا بیان:

رسول ﷺ نے جتنے غزوات میں شرکت کی میں اُن سب میں بجز غزوۂ تبوک کے آپ کے ساتھ شریک رہا، البتہ غزوۂ بدر کا واقعہ چونکہ اچانک پیش آیا اور رسول ﷺ نے سب کو اس میں شریک ہونے کا حکم بھی نہیں دیا تھا اور شریک نہ ہونے والوں پر کوئی عتاب بھی نہیں فرمایا تھا اس میں بھی شریک نہ ہو سکا تھا اور میں لیلۃ العقبہ کی بیعت میں بھی حاضر تھا جس میں ہم نے اسلام کی حمایت وحفاظت کا معاہدہ کیا تھا اور مجھے یہ بیعت عقبہ کی حاضری غزوۂ بدر کی حاضری سے بھی زیادہ محبوب ہے اگرچہ غزوۂ بدر لوگوں میں زیادہ مشہور ہے اور میرا واقعہ غزوۂ تبوک میں غیر حاضری کا یہ ہے کہ میں کسی وقت بھی اُس وقت سے زیادہ خوش حال اور مال دار نہ تھا......... بخدا میرے پاس کبھی اس سے پہلے دو سواریاں جمع نہیں ہوئی تھیں جو اُس وقت موجود تھیں اور رسول ﷺ کی عادت شریفہ غزوات کے معاملہ میں یہ تھی کہ مدینہ سے نکلنے کے وقت اپنے ارادے کے اخفاء کے لیے ایسا کرتے تھے کہ جس سمت میں جا کر جہاد کرنا ہوتا مدینہ سے اس کے خلاف سمت کو نکلتے تھے، تا کہ منافقین مخبری کر کے فریقِ مقابل کو آگاہ نہ کر دیں اور فرمایا کرتے تھے کہ جنگ میں اس طرح کا دھوکہ جائز ہے،

یہاں تک کہ یہ غزوۂ تبوک کا واقعہ پیش آیا (یہ جہاد کئی وجہ سے ممتاز تھا) آپ ﷺ نے سخت گرمی اور تنگ دستی کی حالت میں اس جہاد کا قصد فرمایا اور سفر بھی بڑی دُور کا تھا، مقابلہ پر دشمن کی قوت اور تعداد بہت زیادہ تھی اس لیے رسول ﷺ نے اس جہاد کا کھل کر اعلان کر دیا تا کہ مسلمان اس جہاد کے لیے پوری تیاری کر سکیں۔

اس جہاد میں شریک ہونے والوں کی تعداد صحیح مسلم کی روایت کے مطابق دس ہزار سے زائد تھی اور حاکم کی روایت حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ ہے کہ ہم اس جہاد میں رسول ﷺ کے ساتھ نکلے تو ہماری تعداد تیس ہزار سے زائد تھی،

اور اس جہاد میں نکلنے والوں کی کوئی فہرست نہیں لکھی گئی تھی اس لیے جو لوگ جہاد میں جانا نہیں چاہتے تھے ان کو یہ موقع مل گیا کہ ہم نہ گئے تو کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔ جس وقت رسول ﷺ اس جہاد کے لیے نکلے تو یہ وہ وقت تھا کہ کھجوریں پک رہی تھیں۔ باغات والے ان میں مشغول تھے۔ اسی حالت میں رسول ﷺ اور عام مسلمانوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی اور جمعرات کے روز آپ ﷺ نے اس سفر کا آغاز کیا اور سفر کے لیے آنحضرت ﷺ کو جمعرات کا دن پسند تھا خواہ سفر جہاد کا ہو یا کسی دوسرے مقصد کا میرا حال یہ تھا کہ میں روز صبح کو ارادہ کرتا کہ جہاد کی تیاری کروں مگر بغیر کسی تیاری کے واپس آ جاتا، میں دل میں کہتا تھا کہ میں جہاد پر قادر ہوں مجھے نکلنا چاہیے۔ مگر یوں ہی امروز وفردا میں میرا ارادہ ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ رسول ﷺ اور عام مسلمان جہاد کے لیے روانہ ہو گئے پھر بھی میرے دل میں یہ آتا رہا کہ میں بھی روانہ ہو جاؤں اور کہیں راستہ میں مل جاؤں اور کاش! کہ میں ایسا کر لیتا مگر یہ کام (افسوس کہ) نہ ہو سکا۔

رسول ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب میں مدینہ میں کہیں جاتا تو یہ بات مجھے غمگین کرتی تھی کہ اس وقت پورے مدینہ میں یا تو وہ لوگ نظر پڑتے تھے جو نفاق میں ڈوبے ہوئے تھے یا پھر ایسے بیمار معذور جو قطعاً سفر کے قابل نہ تھے دوسری طرف پورے راستہ میں رسول ﷺ کو میرا خیال

Marfat.com

کہیں نہیں آیا یہاں تک کہ تبوک پہنچ گئے اس وقت آپ ﷺ نے ایک مجلس میں ذکر کیا کہ کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیا ہوا، وہ کہاں ہیں؟

بنو سلمہ کے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ رسول ﷺ واپس تشریف لا رہے ہیں تو مجھے بڑی فکر ہوئی اور قریب تھا کہ میں اپنی غیر حاضری کا کوئی عذر گھبرا کر تیار کر لیتا اور ایسی باتیں پیش کر دیتا جس کے ذریعہ رسول ﷺ کی ناراضگی سے نکل جاتا اور اس کے لیے اپنے اہل اور دوستوں سے بھی مدد لے لیتا۔ میرے دل میں یہ خیالات اور وسوسے گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ جب یہ خبر ملی کہ حضور ﷺ تشریف لے آئے ہیں تو خیالات فاسدہ میرے دل سے مٹ گئے اور میں نے سمجھ لیا کہ میں آپ ﷺ کی ناراضگی سے کسی ایسی بنیاد پر نہیں نکل سکتا جس میں جھوٹ ہو۔ چنانچہ میں نے بالکل سچ بولنے کا عزم کر لیا کہ مجھے صرف سچ ہی نجات دلا سکتا ہے۔

رسول ﷺ واپس تشریف لائے تو (حسب عادت) چاشت کے وقت یعنی صبح کو آفتاب کچھ بلند ہونے کے وقت مدینہ میں داخل ہوئے اور عادت شریفہ یہی تھی کہ سفر سے واپسی کا عموماً یہی وقت ہوا کرتا تھا اور عادت یہ تھی کہ پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے۔ دو رکعتیں پڑھتے۔ پھر حضرت فاطمہ کے پاس جاتے اس کے بعد ازواج مطہرات سے ملتے تھے۔

اسی عادت کے مطابق آپ ﷺ اول مسجد میں تشریف لے گئے۔ دو رکعت ادا کی پھر مسجد میں بیٹھ گئے جب لوگوں نے یہ دیکھا تو غزوۂ تبوک میں نہ جانے والے منافقین جن کی تعداد اسی سے کچھ اوپر تھی خدمت میں حاضر ہو کر جھوٹے عذر پیش کر کے اس پر جھوٹی قسمیں کھانے لگے۔ رسول ﷺ نے ان کے ظاہری قول و قرار اور قسموں کو قبول کر لیا اور ان کو بیعت کر لیا ان کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور ان کے باطنی حالات کو اللہ کے سپرد کیا۔

اسی حال میں بھی حاضرِ خدمت ہو گیا اور چلتے چلتے سامنے جا کر بیٹھ گیا جب میں نے سلام کیا تو رسول ﷺ نے ایسا تبسم فرمایا جیسے ناراض آدمی کبھی کیا کرتا ہے اور بعض روایات میں ہے کہ رسول ﷺ نے اپنا رخ پھیر لیا تو میں نے عرض کیا یا رسول ﷺ آپ مجھ سے چہرۂ مبارک کیوں پھیرتے ہیں خدا کی قسم! میں نے نفاق نہیں کیا نہ دین کے معاملہ میں کسی شبہ و شک میں مبتلا ہوا۔ نہ اس میں کوئی تبدیلی کی آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر جہاد میں کیوں نہیں گئے؟ کیا تم نے سواری نہیں خرید لی تھی؟

میں نے عرض کیا بیشک یا رسول اللہ ﷺ اگر میں آپ ﷺ کے سوا دنیا کے کسی دوسرے آدمی کے سامنے بیٹھتا تو مجھے یقین ہے کہ میں کوئی عذر گھڑ کر اس کی ناراضگی سے بچ جاتا کیونکہ مجھے جدال اور بات بنانے میں مہارت حاصل ہے۔ لیکن قسم ہے اللہ کی کہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اگر میں نے آپ ﷺ سے کوئی جھوٹی بات کہی جس سے آپ ﷺ وقتی طور پر راضی ہو جائیں تو کچھ دور نہیں کہ اللہ تعالیٰ حقیقتِ حال آپ ﷺ پر کھول کر مجھ سے ناراض کر دیں گے اور اگر میں نے سچی بات بتلا دی جس سے بالفعل آپ مجھ پر ناراض ہوں تو مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرما دیں گے۔ صحیح بات یہی کہ جہاد سے غائب رہنے میں میرا کوئی عذر نہیں تھا میں کسی وقت بھی مالی اور جسمانی طور پر اتنا قوی اور پیسے والا نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت تھا۔

رسول ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے سچ بولا ہے پھر فرمایا کہ اچھا جاؤ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق کوئی فیصلہ فرما دیں میں یہاں سے اُٹھ کر چلا تو بنی سلمہ کے چند آدمی میرے پیچھے لگے اور کہنے لگے کہ اس سے پہلے تو ہمارے علم میں تم نے کوئی گناہ نہیں کیا یہ تم نے کیا بے وقوفی کی اس وقت کوئی عذر پیش کر دیتے جیسا دوسرے مخلفین نے پیش کیا اور تمہارے گناہ کی معافی کے لیے رسول ﷺ کا استغفار کرنا کافی ہو جاتا۔ بخدا یہ لوگ مجھے بار بار ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ میرے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں لوٹ جاؤں اور پھر جا کر عرض کروں کہ میں نے جو بات پہلے کہی تھی وہ غلط تھی۔ میرا عذر صحیح موجود تھا۔

مگر پھر میں نے دل میں کہا کہ میں ایک گناہ کے دو گناہ نہ بناؤں۔ ایک گناہ تو تخلف کا سرزد ہو چکا ہے دوسرا گناہ جھوٹ بولنے کا کر گزروں پھر میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ مخلفین میں کوئی اور بھی میرے ساتھ ہے جس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہو ان لوگوں نے بتلایا کہ دو آدمی اور ہیں جنہوں نے تمہاری طرح اقرار جرم کر لیا اور ان کو بھی وہی جواب دیا گیا جو تمہیں کہا گیا ہے (کہ اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو) میں نے پوچھا کہ وہ دو کون ہیں انہوں نے بتلایا کہ ایک مرارہ ابن ربیع العمری دوسرے ہلال بن امیہ واقفی ہیں۔

Marfat.com

ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ ان میں سے پہلے (یعنی مرارہ) کے تخلف کا تو سبب یہ ہوا کہ ان کا ایک باغ تھا جس کا پھل اس وقت پک رہا تھا تو انہوں نے اپنے دل میں کہا کہ تم نے اس سے پہلے بہت سے غزوات میں حصہ لیا ہے اگر اس سال جہاد میں نہ جاؤ تو کیا جرم ہے۔ اس کے بعد جب انہیں اپنے گناہ پر تنبہ ہوا تو انہوں نے اللہ سے عہد کر لیا کہ یہ باغ میں نے اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔

اور دوسرے بزرگ حضرت ہلال بن امیہ کا یہ واقعہ ہوا کہ اُن کے اہل وعیال عرصہ سے متفرق تھے اس موقع پر سب جمع ہو گئے تو یہ خیال کیا کہ اس سال جہاد میں نہ جاؤں اپنی اہل وعیال میں بسر کروں۔ ان کو بھی جب اپنے گناہ کا خیال آیا تو انہوں نے یہ عہد کیا کہ اب میں اپنے اہل وعیال سے علیحدگی اختیار کر لوں گا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے ایسے دو بزرگوں کا ذکر کیا جو غزوۂ بدر کے مجاہدین میں سے ہیں تو میں نے کہا کہ بس میرے لیے انہی دونوں بزرگوں کا عمل قابلِ تقلید ہے۔ یہ کہہ کر میں اپنے گھر چلا گیا۔

ادھر رسول ﷺ نے صحابہ کرام کو ہم تینوں کے ساتھ کلام کرنے سے منع فرما دیا اس وقت ہم تو سب مسلمانوں سے بدستور محبت کرتے تھے مگر اُن سب کا رخ ہم سے پھر گیا تھا۔

ابن ابی شیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ اب ہمارا حال یہ ہو گیا کہ ہم لوگوں کے پاس جاتے تو کوئی ہم سے کلام نہ کرتا نہ سلام کا جواب دیتا۔

مسند عبدالرزاق میں ہے کہ اس وقت ہماری دنیا بالکل بدل گئی ایسا معلوم ہونے لگا کہ نہ وہ لوگ ہیں جو پہلے تھے نہ ہمارے باغ اور مکان وہ ہیں جو پہلے تھے سب اجنبی نظر آنے لگے مجھے سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر میں اس حال میں مر گیا تو رسول ﷺ میرے جنازہ کی نماز نہ پڑھیں گے یا خدانخواستہ اس عرصہ میں حضور ﷺ کی وفات ہو گئی تو میں عمر بھر اسی طرح سب لوگوں میں ذلیل وخوار پھرتا رہوں گا اس کی وجہ سے میرے لیے ساری زمین بیگانہ ویرانہ نظر آنے لگی۔ اسی حال میں ہم پر پچاس راتیں گذر گئیں اس زمانہ میں میرے دونوں ساتھی (مرارہ اور ہلال) تو شکستہ دل ہو کر گھر میں بیٹھ رہے اور رات دن روتے تھے لیکن میں جوان آدمی تھا باہر نکلتا اور چلتا پھرتا تھا اور نماز میں سب مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا اور بازار میں پھرتا تھا مگر نہ کوئی مجھ سے کلام کرتا نہ میرے سلام کا جواب دیتا رسول ﷺ کی مجلس میں نماز کے بعد حاضر ہوتا اور سلام کرتا تو یہ دیکھا کرتا تھا کہ رسول ﷺ کے لب مبارک کو جواب سلام کیلئے حرکت ہوئی یا نہیں پھر میں آپ کے قریب ہی نماز پڑھتا تو نظر چرا کر آپ کی طرف دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ جب میں نماز میں مشغول ہو جاتا ہوں تو آپ ﷺ میری طرف دیکھتے ہیں اور جب میں آپ کی طرف دیکھتا ہوں تو رُخ پھیر لیتے ہیں۔

جب لوگوں کی یہ بیوفائی دراز ہوئی تو ایک روز میں اپنے چچازاد بھائی حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا جو میرے سب سے زیادہ دوست تھے میں اُن کے باغ میں دیوار پھاند کر داخل ہوا اور ان کو سلام کیا خدا کی قسم انہوں نے بھی میرے سلام کا جواب نہ دیا میں نے پوچھا کہ اے قتادہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں۔ اس پر بھی قتادہ نے سکوت کیا کوئی جواب نہیں دیا جب میں نے بار بار یہ سوال دہرایا تو تیسری یا چوتھی مرتبہ میں انہوں نے صرف اتنا کہا کہ اللہ جانتا ہے اور اس کا رسول ﷺ میں رو پڑا اور اسی طرح دیوار پھاند کر باغ سے باہر آ گیا اسی زمانہ میں ایک روز میں مدینہ کے بازار میں چل رہا تھا کہ اچانک ملک شام کا ایک نبطی شخص جو غلہ فروخت کرنے کے لیے شام سے مدینہ میں آیا تھا اس کو دیکھا کہ لوگوں سے پوچھ رہا ہے کہ کیا کوئی مجھے کعب بن مالک کا پتہ بتا سکتا ہے؟ لوگوں نے مجھے دیکھ کر میری طرف اشارہ کیا وہ آدمی میرے پاس آ گیا اور مجھے شاہ غسان کا ایک خط دیا جو ایک ریشمی رومال پر لکھا ہوا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

"اما بعد! مجھے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے نبی نے آپ سے بیوفائی کی اور آپ کو دور کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلت اور ہلاکت کی جگہ میں نہیں رکھا ہے۔ تم اگر ہمارے یہاں آنا پسند کرو تو آ جاؤ ہم تمہاری مدد کریں گے"

میں نے جب یہ خط پڑھا تو کہا کہ یہ ایک اور امتحان اور آزمائش آئی کہ اہل کفر کو مجھ سے اس کی طمع اور توقع ہو گئی (کہ میں ان کے ساتھ مل جاؤں) میں یہ خط لے کر آگے بڑھا ایک دکان پر تنور لگا ہوا تھا اس میں جھونک دیا۔

Marfat.com

حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب پچاس میں سے چالیس راتیں گذر چکی تھیں تو اچانک دیکھا کہ آپ ﷺ کے ایک قاصد خزیمہ بن ثابت میرے پاس آرہے ہیں آکر یہ کہا کہ آپ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرلو میں نے پوچھا کہ کیا طلاق دیدوں انہوں نے بتلایا کہ نہیں عملاً اس سے الگ رہو قریب نہ جاؤ اسی طرح کا حکم میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی پہنچا میں نے بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے میں چلی جاؤ اور وہیں رہو جب تک اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ نہ فرمادیں۔

ہلال بن امیہ کی اہلیہ خولہ بنت عاصم یہ حکم سن کر رسول ﷺ کی خدمت حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ہلال بن امیہ ایک بوڑھے ضعیف آدمی ہیں اور کوئی ان کا خادم نہیں ابن ابی شیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت یہ بھی ہے کہ وہ ضعیف البصر بھی ہیں کیا آپ یہ پسند نہیں فرمائیں گے کہ میں ان کی خدمت کرتی رہوں فرمایا کہ خدمت کرنیکی ممانعت نہیں البتہ وہ تمہارے پاس نہ جائیں انہوں نے عرض کیا کہ وہ تو بڑھاپے کی وجہ سے ایسے ہوگئے ہیں کہ ان میں کوئی حرکت ہی نہیں اور واللہ اُن پر تو مسلسل گریہ طاری ہے رات دن روتے رہتے ہیں۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں مجھے بھی میرے بعض متعلقین نے مشورہ دیا کہ تم بھی آنحضرت ﷺ سے بیوی کو ساتھ رکھنے کی اجازت لے لو جیسا کہ آپ نے حضرت ہلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اجازت دیدی ہے میں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کروں گا۔ معلوم نہیں رسول ﷺ کیا جواب دیں اس کے علاوہ میں جوان آدمی ہوں (بیوی کو ساتھ رکھنا احتیاط کے خلاف ہے) چنانچہ اسی حال پر میں نے دس راتیں گذاریں یہاں تک کہ پچاس راتیں مکمل ہوگئیں۔ مسند عبدالرزاق کی روایت میں ہے کہ اس وقت ہماری توبہ رسول ﷺ پر ایک تہائی رات گزرنے کے وقت نازل ہوئی۔ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو اُس وقت حاضر تھیں انہوں نے عرض کیا اجازت ہو تو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسی وقت اس کی خبر کردی جائے۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا ہو تو ابھی لوگوں کا ہجوم ہوجائے گا، رات کی نیند مشکل ہوجائے گی۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ پچاسویں رات کے بعد صبح کی نماز پڑھ کر میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا تھا اور حالت وہ تھی جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کیا ہے کہ مجھ پر میری جان اور زمین باوجود وسعت کے تنگ ہوچکی تھی۔ اچانک میں نے سلع پہاڑ کے اوپر سے کسی چلانیوالے آدمی کی آواز سنی جو بلند آواز سے کہہ رہا تھا کہ اے کعب بن مالک بشارت ہو۔

محمد بن عمرو کی روایت میں ہے کہ یہ بلند آواز سے کہنے والے ابوبکر تھے جنہوں نے جبل سلع پر چڑھ کر یہ آواز دی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توبہ قبول فرمائی بشارت ہو اور عقبہ کی روایت میں یہ ہے کہ یہ خوشخبری کعب کو سنانے کے لیے دو آدمی دوڑے ان میں سے ایک آگے بڑھ گیا تو جو پیچھے رہ گیا تھا اس نے یہ کیا کہ سلع پہاڑ پر چڑھ کر آواز دیدی اور کہا جاتا ہے کہ یہ دوڑنے والے دو بزرگ حضرت صدیق اکبر اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہما تھے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آواز سن کر میں سجدے میں گرگیا اور انتہائی فرحت سے رونے لگا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اب کشادگی آگئی رسول ﷺ نے صبح کی نماز کے بعد صحابہ کرام کو ہماری توبہ قبول ہونیکی خبر دی تھی۔ اب سب طرف سے لوگ ہم تینوں کو مبارکباد دینے کیلئے دوڑ پڑے۔ بعض لوگ گھوڑے پر سوار ہوکر میرے پاس پہنچے مگر پہاڑ سے آواز دینے والے کی آواز سب سے پہلے پہنچ گئی۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لیے نکلا تو لوگ جوق در جوق مجھے مبارکباد دینے کیلئے آرہے تھے کعب فرماتے ہیں کہ میں مسجد نبوی ﷺ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں آپ کے گرد صحابہ کرام کا مجمع ہے مجھے دیکھ کر سب سے پہلے طلحہ بن عبیداللہ کھڑے ہوکر میری طرف لپکے اور مجھ سے مصافحہ کرکے قبول توبہ پر مبارکباد دی۔ حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولتا جب میں نے رسول ﷺ کو سلام کیا تو آپ ﷺ کا چہرہ مبارک خوشی کی وجہ سے چمک رہا تھا آپ نے فرمایا کہ اے کعب بشارت ہو تمہیں ایسے مبارک دن کی جو تمہاری عمر میں پیدائش سے لے کر اب تک سب سے زیادہ بہتر دن ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ حکم آپ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔ تم نے سچ بولا تھا اللہ تعالیٰ نے تمہاری سچائی کو ظاہر فرمادیا۔

جب میں آپ کے سامنے بیٹھا تو عرض کیا یا رسول ﷺ میری توبہ یہ ہے کہ میں اپنے سب مال ومتاع سے نکل جاؤں کہ سب کو اللہ کی راہ میں

Marfat.com

صدقہ کردوں آپ نے فرمایا نہیں کچھ مال اپنی ضرورت کیلئے رہنے دو یہ بہتر ہے میں نے عرض کیا کہ اچھا آدھا مال صدقہ کردوں آپ نے اس سے بھی انکار فرمایا میں نے پھر ایک تہائی مال کی اجازت مانگی۔ تو آپ نے اس کو قبول فرمالیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اللہ نے سچ بولنے کی وجہ سے نجات دی ہے اس لیے میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں کبھی سچ کے سوا کوئی کلمہ نہیں بولوں گا پھر فرمایا کہ جب سے میں نے رسول ﷺ سے یہ سچ بولنے کا عہد کیا تھا الحمد اللہ کہ آج تک کوئی کلمہ جھوٹ کا میری زبان پر نہیں آیا اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی زندگی میں بھی مجھے اس سے محفوظ رکھیں گے۔ کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اسلام کے بعد اس سے بڑی نعمت مجھے نہیں ملی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سچ بولا جھوٹ سے پرہیز کیا کیونکہ اگر میں جھوٹ بولتا تو اسی طرح ہلاکت میں پڑ جاتا جس طرح دوسرے جھوٹی قسمیں کھانیوالے ہلاک ہوئے جن کے بارے میں یہ نازل ہوا۔

سیحلفون با اللہ الکم اذا انقلبتم الیھم سے لے کر فان اللہ لا یرضی عن القوم الفسقین تک بعض حضرات نے فرمایا کہ ان تینوں حضرات سے مقاطعہ کا پچاس دن تک جاری رہنا شاید اس حکمت پر مبنی تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے غزوۂ تبوک میں پچاس دن ہی صرف ہوئے تھے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے ہم نے تفصیل سے وہ واقعات سنے ہیں۔ جو اِن تین بزرگوں کی توبہ کے حوالے سے پیش آئے۔ اِس میں ہمارے لیے نصیحت اور عبرت کے متعدد اسباق ہیں۔ جیسے جیسے اِن واقعات پر غور کیا جاتا ہے ویسے ویسے نئی نئی باتیں ذہنی افق پر روشن ہونے لگتی ہیں جن میں سے ہم چند ایک کا تذکرہ کریں گے۔

حصول نصیحت وعبرت کے مواقع:

(1) غور فرمائیے یہ تینوں بزرگ جنہیں پچاس دنوں تک مقاطعہ کی سزا دی گئی اور انہیں اِسلامی معاشرہ سے کاٹ کر رکھ دیا گیا اپنے گذشتہ اعمال اور قربانیوں کی ایک روشن تاریخ رکھتے تھے۔ اُن کا نامۂ عمل ہر طرح کی اجتماعی کوتاہی سے معرا تھا۔ اُن سے صرف یہ غلطی ہوئی کہ وہ غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہوئے۔ اِس پر انہیں یہ بتانے کے لیے سخت ترین سزا دی گئی کہ حق و باطل کی کشمکش میں شرکت سے پہلو تہی کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کفر اور اسلام کی آویزش میں مومن کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ اِسی میں اُس کے ذاتی جوہر جلا پاتے ہیں اور اِسی کے باعث حق کا قافلہ آگے بڑھتا ہے۔ کوئی شخص اپنی ذات میں کیسا ہی عبادت گزار اور متقی کیوں نہ ہو۔ حق و باطل کی کشمکش میں عدم شرکت کے باعث راندۂ درگاہ قرار پاتا ہے اور اگر وہ اپنی روش تبدیل نہیں کرتا تو اُسے اِسلامی قافلہ سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ:

ہر کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

(2) اِس واقعہ میں تین کردار ہمارے سامنے ہیں۔ نبی کریم ﷺ، کعب بن مالک اور اُن کے ساتھی اور اِسلامی معاشرہ۔ جہاں تک نبی کریم ﷺ کا تعلق ہے آپ باوجود اس کے کہ مہاجرین وانصار سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ لیکن آپ کی محبت اِسلام کی محبت کے زیر اثر تھی۔ آپ کے نزدیک ہر وہ شخص آپ کی توجہ کا اہل تھا۔ جو اللہ کی بندگی اور جہاد فی سبیل اللہ میں اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔ چاہے وہ شخص اپنی ذات میں بے نام و نسب، بے بس اور بے کس ہو اور جو شخص آپ کی نگاہ میں اپنی خدمات جلیلہ کے اعتبار سے نہایت عزت و وجاہت کا مالک ہے۔ لیکن وہ حق و باطل کی کشمکش میں شریک ہونے کی بجائے گھر بیٹھ رہتا ہے۔ تو وہ اپنی گزشتہ تمام خدمات کے باوجود سزا و عتاب کا مستحق ہوگا اور اگر اِس سزا کے دوران وہ شخص اپنے وفا و اطاعت میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہونے دیتا بلکہ وہ مسلسل معافی قبول کرنے کا خواستگار رہتا ہے تو سزا کے دوران بھی نبی کریم ﷺ کی نگاہیں اُس کی بلائیں لیتی ہیں اور اُس کی قبولیت توبہ کے لیے آپ دعا مانگتے ہیں۔ آپ کا رویہ اُس محبت کرنے والے باپ کی طرح ہے۔ جو اپنے بیٹے کو نافرمانی پر سزا دیتا ہے لیکن ساتھ ہی اُس کا سینہ ہر وقت منتظر رہتا ہے کہ کب اُس کا بیٹا معافی مانگ کر سینے سے چمٹ جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی رویہ آنحضرت ﷺ کا اِن تینوں بزرگوں کے ساتھ رہا۔

۲۔ حضرت کعب بن مالکؓ اور اُن کے ساتھی۔ یہ تینوں بزرگ اپنے معاشرے کے معزز افراد ہیں۔ انہیں اپنے دائرۂ کار میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ گزشتہ اِسلامی تاریخ میں اُن کی خدمات کسی سے کم نہیں۔ با ایں ہمہ انہیں مقاطعہ کی سخت سزا دی گئی۔ کوئی اُن سے کلام نہیں کرتا اور کوئی سلام کا

Marfat.com

جواب دینے کا روادار نہیں۔ ایک کوتاہی پر سالوں کی خدمات فراموش کردی گئی ہیں۔ عزت خاک میں ملادی گئی ہے۔ اِس کے ردِعمل میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اِن بزرگوں کے نفس پر چوٹ پڑتی وہ اِسے اپنی عزت نفس کا مسئلہ بناتے لوگوں میں دوڑ بھاگ کرتے اپنا ایک گروپ بنانے کی کوشش کرتے۔ قیادت کے بارے میں غلط فہمیوں کا طوفان کھڑا کردیتے۔ لیکن اِس کے برعکس تینوں بزرگ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اور اپنے آپ کو بڑی سے بڑی سزا کے لیے پیش کردیتے ہیں۔ شب روز کے بیشتر حصہ میں اللہ کے سامنے رو رو کر اپنی کوتاہی کی معافی چاہتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسول کی ناراضگی سے اللہ کے سوا کوئی نہیں بچاسکتا۔ کعب بن مالک کو غسان کا بادشاہ اپنے پاس آنے اور قدر و منزلت کے منصب پر فائز کرنے کی پیشکش کرتا ہے۔ لیکن کعب اُس کاریشم میں لپٹا ہوا مکتوب جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیتے ہیں۔ آپ اپنے قریبی دوستوں کو اللہ کا واسطہ دے کر بات کرنے کی کوشش کرتے ہے۔ لیکن کوئی اُن کو منہ لگانے کے لیے تیار نہیں۔ اِس طرح سے مدینہ کی سرزمین اپنی وسعتوں کے باوجود اُن پر تنگ ہو کر رہ گئی۔ حتیٰ کہ کے چالیسوں دن اِن کی بیویوں کو بھی علیحدہ ہونے کا حکم دے دیا گیا اَب وہ اپنی ذات میں بالکل یکہ و تنہا ہیں۔ لیکن اُن کا غرورِ نفس بھڑکنے کی بجائے جھکتا اور پگھلتا جارہا ہے۔ انہیں یقین ہو گیا ہے۔

جس نے دیا ہے درد وہی چارہ گر بھی ہے
کہنی ہے چارہ گر سے ہی خود چارہ گر کی بات

یہ ہے اِن بزرگوں کا کردار جس سے اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور اُس نے اِن کو اٹھا کر اپنی آغوش میں لے لیا۔

(3) اِسلامی معاشرہ۔ کسی بھی معاشرہ کی اصل قوت اُس کا نظم وڈسپلن ہوتا ہے۔ جن صداقتوں پر معاشرہ کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے اُن صداقتوں پر بے پناہ یقین معاشرے کے افراد کو ایک دوسرے سے جوڑ کر رکھتا ہے۔ قیادت کے ساتھ بے پناہ لگاؤ اور اطاعت کا جذبہ معاشرہ میں روح کی طرح کارفرما کر زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔ اِسلامی معاشرہ اِن تمام حقائق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جن بزرگوں کا سزادی گئی اِس معاشرے سے اُن کی قرابت داریاں ہیں۔ انہیں سے اُن کے وطنی ونسبی رشتے ہیں۔ نہ جانے اِن میں سے کتنے لوگوں کی اُن کے ساتھ دوستیاں اور کاروباری رشتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی قیادت کی طرف سے حکم آتا ہے کہ اِن کا بائیکاٹ کردو۔ تو معاشرے کا ایک ایک فرد اُن سے کٹ کر رہ جاتا ہے۔ کعب اپنے چچازاد بھائی قتادہ جو اُن کے بچپن کے دوست بھی ہیں سے پوچھتے ہیں کہ قتادہ تم میرے بھائی ہو میں تم کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا میں اللہ اور اُس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا۔ وہ جواب ہی نہیں دیتے تیسری دفعہ قسم دینے پر صرف اتنا کہا کہ اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ کعب مسجد میں جاتے ہیں۔ لوگوں کو سلام کرتے ہیں۔ کوئی سلام کا جواب نہیں دیتا۔ بازار میں نکلتے ہیں۔ کوئی منہ نہیں لگاتا۔ مدینے کا پورا معاشرہ ایک حکم کے ساتھ ایک راستے پر چل نکلا ہے۔ اِس راستے سے نہ انہیں قرابت روکتی ہے نہ دوستیاں کام دیتی ہیں نہ کوئی اور تعلق انہیں رویہ بدلنے پر مجبور کرتا ہے اُن کے لیے اللہ اور اُس کے رسول کا حکم سب کچھ ہے۔ وہ اُسی کے مطابق جینا اور مرنا جانتے ہیں۔

اِن تینوں کرداروں کو غور سے دیکھیے۔ آپ کو اِن کے اندر ایک ہی روح کارفرما دکھائی دے گی اور وہ ہے ایمان۔ یعنی اللہ پر ایمان اور اللہ کے رسول پر ایمان۔ آخرت پر ایمان وہ صرف اللہ کو اپنا مالک اور حاکم سمجھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو آئیڈیل اور راہنما جانتے ہیں اور آخرت میں جواب دہی کے لیے ہروقت فکرمند رہتے ہیں۔ اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت اُن کے لیے ضابطۂ حیات ہے۔ یہی وہ حقائق ہیں۔ جن سے اُن کی زندگی عبارت ہے اور اِسی نے اُن کو دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا مستحق بنایا ہیں۔

Marfat.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ مَا كَانَ
لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا
عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ
نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً
وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا
نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ
لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ع

اے ایمان والوں اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔(۱۱۹) (اہلِ مدینہ اور اُس کے اردگرد کے اعراب کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کے پیچھے بیٹھ رہتے اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اُس کی جان سے عزیز رکھتے یہ اِس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی اللہ کی راہ میں اُن کو لاحق ہوتی ہے اور جو قدم بھی وہ کفار کو رنج پہنچانے والا اٹھاتے ہیں اور جو چرکا بھی کسی دشمن کو لگاتے ہیں اِن سب کے بدلے میں اُن کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ بے شک اللہ نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (۱۲۰) اور جو کوئی چھوٹا یا بڑا خرچ اللہ کی راہ میں کرتے ہیں اور جو وادی بھی وہ طے کرتے ہیں سب اُن کے لیے لکھا جاتا ہے تا کہ اللہ اُن کو اُن کے اعمال کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔(۱۲۱) (ضروری نہ تھا کہ صاحبِ ایمان سارے کے سارے نکل کھڑے ہوتے پس کیوں نہ نکلے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ تا کہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کرتے جب اُن کی طرف لوٹ کر جاتے تا کہ وہ بھی بچتے رہیں۔ غیر مسلمانہ روش سے۔(۱۲۲) (۱۱۹ تا ۱۲۲) (رکوع: ۱۵)

Marfat.com

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ○

اے ایمان والوں اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔(۱۱۹)

اِس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو دو ایسی قیمتی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے ایک مومن اُس حادثے سے دوچار نہیں ہوتا جس حادثے سے وہ بزرگ دوچار ہوئے جن کا ذکر گزشتہ آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔

سب سے پہلی نصیحت یہ فرمائی کہ تقوی اختیار کرو۔ تقویٰ دل کی ایسی کیفیت کا نام ہے۔ جس میں اللہ کے خوف اور اُس کی محبت کے سوا کسی اور کا خوف اور محبت نہ ہو اور اس خوف کی وجہ سے دل کا میلان ہمیشہ نیکی کی طرف ہو اور برائی سے نفرت محسوس ہو۔ یہ وہ کیفیت ہے جو دل کی پاسبانی کرتی ہے۔ اُس میں بُرے خیالات کو داخل ہونے کا موقع نہیں دیتی۔ حبِ دنیا دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتی۔

دوسری نصیحت یہ فرمائی کہ سچوں اور راست بازوں کی صحبت اور معیت اختیار کرو۔ جس طرح تقوی اندر کے بگاڑ کو روکتا ہے۔ اِسی طرح راست بازوں کی صحبت باہر سے شیطان کے حملوں کی مدافعت کرتی ہے۔ انسان کی فطرت اللہ نے اِس طرح کی بنائی ہے کہ وہ دوسروں پر اثر انداز بھی ہوتا ہے اور دوسروں کا اثر قبول بھی کرتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے پاکیزہ صحبت پر بہت زور دیا ہے۔ انسان کا ماحول انسان کو متاثر کرتا ہے۔ اُس کے احباب اور ہر وقت ملنے والے لوگ خواہی نخواہی اُس پر اپنے خیالات کا اثر چھوڑتے ہیں۔ اچھی صحبت اِس طرح ہے۔ جیسے خوشبو کی دوکان جو آدمی اِس دوکان میں جاتا ہے وہ چاہے خوشبو نہ خریدے لیکن جب باہر نکلے گا تو اُس کے کپڑوں سے خوشبو آ رہی ہوگی اور بُری صحبت کوئلے کی دوکان کی طرح ہے۔ کوئی چاہے کوئلہ نہ خریدے لیکن دوکان پر جانے سے کہیں نہ کہیں اُس کے کپڑوں کو کالک ضرور لگ جائیگی۔ ایک کمزور دل اور بزدل آدمی بہادروں کی مجلس میں بیٹھتا ہے تو اُس کے اندر عزائم انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ ایک بُرا آدمی عبادت گزار اور خوش اطوار لوگوں کی صحبت میں بیٹھتا ہے۔ تو اُس کے دل میں نیکی چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ یہ دو وہ قیمتی نصیحتیں ہیں جن سے انسان کا ظاہر اور باطن محفوظ رہتا اور جلا پاتا ہے۔

اِس آیتِ کریمہ میں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ گزشتہ آیات میں جن مخلص مسلمانوں کی غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی وجہ سے گرفت ہوئی اور جن کو پچاس دنوں تک مسلمان معاشرہ سے مقاطعہ کی ایسی تکلیف دہ لیکن زندگی میں یکسوئی پیدا کرنے والی سزا دی گئی اور پھر اُن کی گریہ زاری اور در توبہ سے وابستگی اور استقامت کی وجہ سے توبہ قبول کی گئی۔ وہ لوگ اپنی گذشتہ تاریخ میں قربانی وایثار اور استقامت وقتال کے کئی امتحان پاس کر چکے تھے۔ انہوں نے نازک ترین دنوں میں بھی کبھی کمزوری نہیں دکھائی تھی۔ بااین ہمہ اُن سے اتنی بڑی کوتاہی کا صدور شائد اِس وجہ سے ہوا کہ صحبت نبوی علیٰ صاحبہا السلام اور مصاحبت صحابہ میں کہیں کمی آ گئی اور کئی ایسے لوگوں کے ساتھ بھی اٹھنا بیٹھنا شروع ہو گیا جن کے اندر نفاق کا مرض پایا جاتا تھا۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ اُن کے نفاق کی نحوست نے اِن کے دلوں پر اثر ڈالا جس سے اِن کے ایمان واخلاص کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا البتہ کسی مشکل فیصلے کی صلاحیت میں کمی واقع ہو گئی اور غزوۂ تبوک جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہو گئی۔ چنانچہ ایسی ہی کمزوریوں کے علاج کے لیے یہ ہدایات ارشاد فرمائی گئیں اور اگلی آیات میں بھی اُن گروہوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ جو صحبتِ نبوی اور مصاحبت صحابہ کے فقدان کا شکار ہوئے اور نفاق کے جراثیم اُن میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جو ایمان کی کمزوری کا باعث بنے۔

مَا کَانَ لِاَھْلِ الْمَدِیْنَۃِ وَمَنْ حَوْلَھُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ وَلَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِھِمْ عَنْ نَّفْسِہٖ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ لَا یُصِیْبُھُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَۃٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا یَطَئُوْنَ مَوْطِئًا یَّغِیْظُ الْکُفَّارَ وَلَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ بِہٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ○ وَلَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَۃً صَغِیْرَۃً وَّلَا کَبِیْرَۃً وَّلَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَھُمْ لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

(اہل مدینہ اور اُس کے اردگرد کے اعراب کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کے پیچھے بیٹھ رہتے اور نہ یہ کہ اپنی جان کو اُس کی جان سے عزیز رکھتے یہ اس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی اللہ کی راہ میں اُن کو لاحق ہوتی ہے اور جو قدم بھی وہ کفار کو رنج

Marfat.com

پہنچانے والا اٹھاتے ہیں اور جو جرکا بھی کسی دشمن کو لگاتے ہیں اِن سب کے بدلے میں اُن کے لیے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ بے شک اللہ نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (۱۲۰) اور جو کوئی چھوٹا یا بڑا خرچ اللہ کی راہ میں کرتے ہیں اور جو وادی بھی وہ طے کرتے ہیں سب اُن کے لیے لکھا جاتا ہے تا کہ اللہ اُن کو اُن کے اعمال کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ (۱۲۱)

اِس آیت کریمہ میں اُن لوگوں سے خطاب بھی ہے اور اُن کا تذکرہ بھی۔ جو صاحبِ ایمان تھے لیکن صحبتِ نبوی اور مصاحبتِ صحابہ میں کمی کے باعث ایمان کو برگ و بار لانے اور کمزوریوں پر قابو پانے کی صلاحیت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آنحضرت ﷺ سے محبت رکھتے تھے۔ لیکن محبت کے تقاضوں سے بے خبر تھے۔ اُن کے نازک جذبات کو انگیخت کر کے تربیت کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ اُن کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ تم نے غزوہ تبوک کی شرکت سے پہلو تہی کرتے ہوئے شاید غور کرنے کی زحمت نہیں کی کہ جنگ میں شرکت وہ بھی ایسے سخت موسم میں کیا معنی رکھتی ہے۔ غضب خدا کا تم تو ٹھنڈے باغوں کے گھنے سایوں میں کھجور کے لٹکتے ہوئے خوشوں کے نیچے اور انگور کے لہراتے ہوئے گچھوں کے سائے میں ٹھنڈی زمین کے فرش پر ٹھنڈے اور شیریں پانی کی صراحیاں ہاتھ میں لے کر رس بھرے پھلوں کا مزہ اٹھاؤ اور رسول ﷺ چلچلاتی ہوئی دھوپ اور جھلستے ہوئے موسم میں سینکڑے میل کا سفر اِس حال میں کریں کہ پانی کی کم یابی سے حلق میں کانٹے اُگ کھڑے ہوں۔ سواریوں کی کمی بار بار پیدل چلنے پر مجبور کرے۔ دشمن کی افرادی قوت اور رسد و کمک کی فروانی پتہ پانی کیے دے رہی ہو۔ لیکن اللہ کے دین کی سربلندی اور اللہ کی رضا کی طلب اِن تمام مصیبتوں اور تلخیوں کے باوجود اللہ کے رسول کو نکلنے پر تو مجبور کر دے اور تم آرام سے گھر میں بیٹھے آرام و راحت کے مزے لوٹتے رہو اور پھر بھی یہ دعوی ہو کہ ہمیں اللہ کے رسول سے محبت ہے اور ہم اللہ کی رضا کے چاہنے والے ہیں غور کرو تمہارے اِس رویے کا کیا جواز ہے کیا محبت اسی چیز کا نام ہے۔ اِس طرح سے اُن کے نازک جذبات کو چھیڑ کر اُن کو غیرت دلائی جارہی ہے تا کہ وہ اپنی حالت پر غور کریں اور اپنی کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کریں۔

(ذلک بانھم الخ) سے ایک دوسرے پہلو سے اُن کے قلبی جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ انسان اپنے قلبی احساسات میں سب سے مؤثر حیثیت دو ہی طرح کے احساسات کو دیتا ہے۔ ایک اُن احساسات کو جو محبت سے پھوٹتے ہیں اور دوسرے اُن احساسات کو جن سے اللہ کے یہاں اجر و ثواب کے حصول کی اُمید پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ پہلے محبت کے حوالے سے بات کی گئی اور اَب دوسرے حوالے سے یہ فرمایا جارہا ہے کہ تم نے محض راستے کی تلخیوں اور سفر کی صعوبتوں سے ڈر کر غزوۂ تبوک میں شریک ہونے کا حوصلہ نہیں کیا حالانکہ تم کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اِس راستے میں اگر تم کو پیاس لگی یا تمہیں تکان نے پریشان کیا یا تمہیں بھوک سے دوچار ہونا پڑا یا تمہیں ایسی وادی میں شجاعت کے جوہر دکھانے پڑے۔ جس میں کفر کو برہمی لاحق ہوتی ہو اور یا کسی دشمن سے نبرد آزما ہونا پڑا تو اِن میں سے کوئی مرحلہ ایسا نہیں جس کے معاوضے میں تمہیں اللہ کی طرف سے انعامات سے نوازا نہ جائے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ اللہ کے راستے میں جو تکلیف اٹھائی جاتی ہے پروردگار اُس پر کیا اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب آدمی اللہ کے راستے میں پیش آنے والی مصیبتوں کا صلہ اور انعام پائے گا۔ تو اُس قدر و منزلت اور بیش از گمان قیمت کو دیکھ کر اُس کا جی چاہے گا کہ کاش اللہ کے راستے میں میری کھال قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتی تا کہ آج مجھ کو اُس کا صلہ ملتا دنیا کے معمولی مصائب آنی و فانی حیثیت رکھتے ہیں اور اُس پر ملنے والا اجر لافانی حیثیت کا مالک ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اِس آیت کریمہ میں یہ بھی فرمایا گیا کہ تم اللہ کے راستے میں آنے والی ایک ایک تکلیف کو بے شک کمزوری بے دلی یا ناگواری سے برداشت کرو اور چاہے اُس کی حیثیت معمولی کیوں نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ اِن میں سے ہر ایک کو عملِ صالح کی حیثیت سے لکھے گا اور عمل صالح کہتے ہی اُسے ہیں جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول و منظور ہونے کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا میں وہ ہمیشہ ثمر آور ہوتا ہے اور پھر اِسی پر اتفاق نہیں فرمایا بلکہ اِس پر نوید جانفزا سنائی کہ اللہ تعالیٰ اپنے راستے میں تکلیف اٹھانے والوں کو محسنین کا مقام عطا فرماتا ہے اور محسن اُس کی نگاہ میں وہ شخص ہوتا ہے جو حسن عمل کا پیکر ہو اور جنت کے اعلیٰ ترین مقامات کا مستحق ہو۔

اللہ تعالیٰ جس طرح اپنے راستے میں تکلیفیں برداشت کرنے والوں کو نوازتا ہے۔ اِسی طرح اُن لوگوں کی بھی قدر کرتا ہے جو اُس کے راستے میں مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔ پھر وہ کمیت کو نہیں دیکھتا یعنی وہ یہ نہیں دیکھتا کہ خرچ کرنے والے نے کتنا خرچ کیا ہے اور کیا خرچ کیا ہے بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ اِس خرچ کے پیچھے کیا جذبہ کارفرما ہے اور خرچ کرنیوالے کے دل و دماغ کی کیفیت کیا ہے اگر ایک شخص کروڑوں روپے خرچ کر دیتا ہے لیکن اُس

Marfat.com

کے دل میں اخلاص اور فدائیت کا جذبہ نہیں وہ محض نام ونمود یا شہرت کی ہوس کے لیے خرچ کرتا ہے۔ یا کوئی اور منفی جذبہ کارفرما ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نہ ایسے عطیہ کو قبول فرماتے ہیں اور نہ عطیہ دینے والوں کی قدر افزائی فرماتے ہیں اُس کے یہاں صرف وہ شخص بار پاتا اور عزت حاصل کرتا ہے۔ جو اگر ایک طرف اپنی بساط سے بڑھ کر خرچ کرتا ہے۔ تو دوسری طرف اُسے دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے میرے آقا نے میرا عطیہ قبول فرمایا ہے یا نہیں۔ اُسے عطیہ سے زیادہ اپنے دل کی کیفیت کی فکر ہوتی ہے کہ اُس میں اللہ کی رضا کے حصول کے سوا اور کوئی خواہش پوشیدہ تو نہیں اگر ایسے پاکیزہ جذبے سے کھجوروں کی ایک پوٹلی بھی کوئی غریب آدمی اُس کے حضور پیش کرتا ہے تو اُسے نہ صرف قبول کیا جاتا ہے بلکہ بڑے بڑے سخیوں کے لیے اُسے نمونہ بنا دیا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ غزوۂ تبوک میں جب آپ نے مصارف جنگ کے لیے اپیل فرمائی تو لوگوں نے دل کھول کر عطیات پیش کیے اور مسجد کے صحن میں درہم و دینار دیگر اجناس کا ڈھیر لگ گیا۔ شام کو ایک شخص کھجوروں کی ایک پوٹلی لے کر حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ﷺ میرے گھر فاقوں کے سوا کچھ نہیں آپ نے اپیل فرمائی میں اپنی تہی دامنی پر روتا رہا آخر میں نے دن بھر مزدوری کی۔ اجرت میں جو کچھ مجھے ملا وہ گھر لے جانے کی بجائے میں آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں آپ اِسے قبول فرما کر میری غربت کی لاج رکھیں۔ آنحضرت ﷺ نہایت خوش ہوئے۔ نہایت عزت کے ساتھ وہ پوٹلی قبول فرمائی اور حکم دیا کہ اِسے عطیات کے ڈھیر پر بکھیر دیا جائے۔ تاکہ اِس کی اور اِس کے لانیوالے کے اخلاص کی برکت سے اللہ تعالیٰ باقی عطیات کو بھی قبول فرمالیں۔ چنانچہ اِس آیت کریمہ میں یہی فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ تھوڑا خرچ کریں یا زیادہ اور اللہ کے راستے میں کسی وادی کو قطع کرنے کی تکلیف اٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ اِن اعمال کو وہاں لکھے گا اور اُن اعمال میں جگہ دے گا جو اِس لیے محفوظ کر لیے جاتے ہیں کہ وقت آنے پر اُن کا بہتر سے بہتر بدلہ دیا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پروردگار کی شانِ رحمت نے یہ پسند نہیں فرمایا کہ ایسے اعمال کا صلہ عام قانون کے مطابق دیا جائے۔ بلکہ اُن اعمال میں شامل کیا گیا ہے جن کا صلہ اعمال کی حیثیت کے مطابق نہیں دیا جاتا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق عطا فرماتے ہیں اور ایسا صلہ یقیناً صرف اچھا نہیں ہوتا بلکہ بہت اچھا ہوتا ہے اور مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ کسی چیز یا کسی صلہ کا بہتر ہونا یا اچھا ہونا ایک تو ہمارے اپنے معیار کے مطابق ہونا ہے اور دوسرا وہ اچھا ہونا ہے جو اللہ کے معیار کے مطابق ہو۔ اب یہ بات جاننے کے لیے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں کہ انسانوں کے پیمانے مخلوق کی حیثیت کے مطابق اور اللہ کے داد و دہش کے پیمانے خالق کی شان کے لائق ہیں۔ انسانوں میں بھی حیثیتوں کا اختلاف انسانوں کے مراتب کے حوالے سے ہے۔ جس کا مرتبہ بڑا ہے اُس کی حیثیت بھی بڑی ہے اور جس کا مرتبہ چھوٹا ہے اُس کی حیثیت بھی فروتر ہے۔ اللہ جب کسی صلہ اور معاوضے کو احسن قرار دیتا ہے تو اُس کی قدر و منزلت چونکہ اللہ کی شان اور حیثیت کے مطابق ہے اس لیے اُس کی وسعت اور قیمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

نواب عبدالرحیم خان خاناں جہانگیر کے دور کا ایک نہایت نیک نام اور فیاض نواب تھا۔ جس کی داد و دہش کے قصے حیران کن اور زبان زدِ عام و خاص تھے۔ بادشاہ کی طرف سے شائد اسی فیاضی کے باعث اُسے منعم خان کا خطاب دیا جا چکا تھا ایک دفعہ آگرہ جانے کے ارادے سے وہ دہلی سے نکلا۔ آگرہ دہلی سے 15 منزل کے فاصلے پر ہے۔ اپنے خدم و حشم اور لاؤ لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔ پہلا پڑاؤ پہلی منزل پر ڈالا۔ ایک بستی بس گئی دربار آراستہ ہوا۔ امراء اپنی مسندوں پر بیٹھ گئے۔ نواب عصر کے بعد اپنی کرسی پر بیٹھا دربار کی کارروائی شروع ہوئی کہ اچانک ایک فقیر سامنے دروازے پر نمودار ہوا اور اُس نے ترنم سے ایک شعر پڑھا۔

منعم بہ کوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

نواب نے یہ پھڑکتا ہوا شعر سنا چونکہ حسب حال اور فرحت بخش تھا خوش ہو کر ایک لاکھ روپیہ دینے کا حکم دیا۔ دوسرے دن روانگی ہوئی پندرہ میل چل کر دوسری منزل پر پڑاؤ ڈالا۔ دربار آراستہ ہوا شام کو نواب اپنی مسند پر فروکش ہوا۔ وہی کل والا فقیر پھر آیا اور اُس نے دروازے پر کھڑے ہو کر وہی شعر پڑھا۔ نواب نے پھر خوش ہو کر ایک لاکھ انعام دینے کا حکم دیا وہ فقیر اسی طرح چند منزلوں تک آتا رہا اور ہر دفعہ شعر سنا کر ایک لاکھ روپیہ حاصل کرتا رہا آخر اُس کو خود ہی خیال آیا کہ آج تک کسی نواب نے کسی فقیر کو اتنا بڑا انعام نہیں دیا ایسا نہ ہو کہ میرے روز روز کے جانے سے نواب چڑ جائے اور پہلا عطا کیا ہوا بھی چھین لینے کا حکم دے دے۔ چنانچہ یہ سوچ کر آنا موقوف کر دیا۔ نواب حسب معمول عصر کے بعد اپنی مسند پر تشریف فرما ہوا۔ معمول سے دیر

Marfat.com

تک بیٹھا اور فقیر کا انتظار کرتا رہا۔ جب شام گہری ہونے لگی تو کہا آج ہمارا فقیر نہیں آیا۔ کم ظرف نکلا اُس نے یہ سمجھا آج تک اتنا بڑا انعام کسی نے نہیں دیا ممکن ہے نواب ناراض ہو کر دیا ہوا بھی چھین لے۔ حالانکہ ہم نے پہلے ہی دن اپنے خزانچی کو حکم دے دیا تھا کہ دہلی سے آگرہ پندرہ منزل ہے پندرہ لاکھ روپیہ اس فقیر کے لیے الگ نکال کر رکھ دو۔

اندازہ کیجئے کہ وہ عطیہ اور انعام جو فقیر کے نزدیک غیر معمولی تھا اور جس کے چھن جانے کا اندیشہ اُسے پیدا ہو گیا تھا وہ ہی انعام نواب کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ حالانکہ نواب اور فقیر دونوں انسان ہیں۔ لیکن دونوں میں حیثیتوں کا اتنا فرق ہے ایک جس چیز کو غیر معمولی سمجھتا ہے دوسرا اُس کو معمولی سمجھتا ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان تو خالق اور مخلوق کا فرق ہے۔ چنانچہ جس چیز کو خالق احسن اور بہترین قرار دیتا ہے۔ مخلوق اپنے علم و عقل کے تمام پیمانوں کے باوجود اُس کا کیا اندازہ کر سکتی ہے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝

(ضروری نہ تھا کہ صاحب ایمان سارے کے سارے نکل کھڑے ہوتے پس کیوں نہ نکلے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ تا کہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو خبردار کرتے جب اُن کی طرف لوٹ کر جاتے تا کہ وہ بھی بچتے رہیں۔ غیر مسلمانہ روش سے۔ (۱۲۲)

ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ سورہ توبہ نو ہجری کے اختتام پر نازل ہوئی ہے۔ ممکن ہے اِس کے کچھ احکام دس ہجری کے آغاز میں نازل ہوئے ہوں۔ اِس سورہ میں وہ تمام باتیں زیرِ بحث لائی گئی ہیں جو مسلمانوں کی قومی اور ملی زندگی کے لیے ناگزیر تھیں اور وہ ہدایات بھی دی گئی ہیں جو جزیرۂ عرب کو مرکزِ اسلام بنانے اور پھر اُس کے استحکام کے لیے لازمی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ نو اور دس ہجری میں جو بعض خاص ضرورتیں پیدا ہوئیں اُن سے بھی تعرض فرمایا گیا۔ اِن ضرورتوں میں ایک بڑی اہم ضرورت جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت مبارکہ کے آخری دو سالوں میں اِسلام کے دائرے میں اِسلام قبول کرنے والوں کا داخلہ تیز ہو گیا۔ فوج در فوج لوگ اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے۔ یہ بات اِسلام کی وسعت کے پہلو سے تو بڑی حوصلہ افزا تھی لیکن اِسلام کے دل و دماغ میں نفوذ کے اعتبار سے اور اِسلامی زندگی کی تعبیر کے حوالے سے متفکر کر دینے والی بھی تھی۔ لوگ کلمہ پڑھ کر اِسلام میں داخل تو ہو رہے تھے لیکن اُن کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اِس سے پہلے اعراب کی حد تک قرآن کریم آیت نمبر 97 میں اِس کی طرف اشارہ بھی کر چکا تھا۔ بلکہ حقیقت میں بہت بڑی آگاہی دے چکا تھا کہ اعراب میں نفاق کا مرض اور اِس کی شدت کا سبب اُن کی دین سے بے خبری اور مرکزِ اِسلام سے دوری ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیت کریمہ میں واضح انداز میں اِس ضرورت کو پورا کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے اور انداز یہ اختیار کیا گیا ہے کہ علم دین سے آگاہی احکام سے واقفیت اور حقوق آشنائی کی حد تک تو ہر مسلمان پر فرض ہے کیونکہ ہر مسلمان پر جو عبادات فرض کی گئی ہیں۔ جو فرائض عائد کیے گئے ہیں۔ جو اوامر و نواہی دیئے گئے ہیں اور زندگی گزارنے کے احکام دیئے گئے اور آداب سکھائے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک ایک چیز کا جاننا انفرادی زندگی میں بھی ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ اِس کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمام مسلمان تمام کاموں سے یکسو ہو کر اللہ کے دین کو سیکھنے میں لگ جائیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے زندگی کی اُن ذمہ داریوں کو جن کا تعلق بقائے حیات اور ضروریاتِ زندگی کے بہم پہنچانے سے ہے۔ اُن کو بھی دین سے خارج نہیں کیا۔ بعض کو مباح ٹھہرایا اور بعض کو فرضِ کفایہ قرار دیا۔ اُن کو یکسر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ انسان کے لیے غذا ضروری ہے۔ تو کاشت کاری اور زراعت سے متعلق تمام ضروری باتوں کا جاننا بھی ضروری ہے۔ جسم کو صحت مند رکھنے اور بیمار کی شفا کے لیے علاج ضروری ہے۔ تو میڈیکل سائنس بھی ضروری ہے۔ موسم کی شدت سے بچنے کے لیے ایک گھر کا ہونا ضروری ہے۔ تو انجینیرنگ کا علم بھی ضروری ہے۔ اسی کو فرض کفایہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ چند آدمیوں کے سیکھ لینے اور پڑھ لینے سے یہ ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں لیکن علم دین کی بیشتر باتوں کا تعلق انسان کے بنیادی فرائض سے ہے اگرچہ اُن میں بعض احکام کی حیثیت فرض کفایہ کی بھی ہے۔ بنابریں ہونا یہ چاہیے تھا کہ دیہات مدینے کے مضافات اور دور پار کے شہروں کے رہنے والے تمام لوگ

Marfat.com

یکبارگی مدینے پہنچ جاتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے اس آیت میں حکم دیا کہ مسلمانوں کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ غزوۂ تبوک میں شرکت کی طرح سب نکل کھڑے ہوں۔ اُن کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ہر بڑے گروہ میں سے چند افراد ایسے ضرور نکلیں جو اللہ کے دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لیے مدینہ منورہ پہنچیں یا کسی ایسے شہر میں جائیں جہاں علم دین کے حصول کی آسانیاں میسر ہوں اور پھر لوٹ کر اپنے لوگوں میں جائیں اور اُن تک دین کی وہ فکر اور فہم پہنچائیں جس کو انہوں نے خود حاصل کیا ہے۔ اِس سلسلے میں معارف القرآن کے مصنف محترم نے جو کچھ اپنی تفسیر میں لکھا ہے وہ یقیناً فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ ہم اُسے یہاں نقل کیے دیتے ہے۔

طلب علم دین کا فرض ہونا اور اُس کے آداب و فرائض

حضرت امام قرطبی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت طلبِ علمِ دین کی اصل اور بنیاد ہے اور غور کیا جائے تو اسی آیت میں علم دین کا اجمالی نصاب بھی بتلا دیا گیا ہے اور علم حاصل کرنیکے بعد عالم کے فرائض بھی اس لیے اس مضمون کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

علم دین کے فضائل

علمِ دین کے فضائل اور ثوابِ عظیم اور اس کے متعلقات پر علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں اس جگہ چند مختصر روایات نقل کی جاتی ہیں۔ ترمذی نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ”جو شخص کسی راستے پر چلے جس کا مقصد علم حاصل کرنا ہو اللہ تعالیٰ اس چلنے کے ثواب میں اس کا راستہ جنت کی طرف کر دینگے اور یہ کہ اللہ کے فرشتے طالب علم کیلئے اپنے پر بچھاتے ہیں اور یہ کہ عالم کے لئے تمام آسمانوں اور زمین کی مخلوقات اور پانی کی مچھلیاں دعا و استغفار کرتی ہیں اور یہ کہ عالم کی فضیلت کثرت سے نفلی عبادت کرنیوالے پر ایسی ہی جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت باقی سب ستاروں پر اور یہ کہ علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام سونے چاندی کی کوئی میراث نہیں چھوڑتے لیکن علم کی وراثت چھوڑتے ہیں تو جس شخص نے یہ وراثتِ علم حاصل کرلی اس نے بڑی دولت حاصل کرلی“ (از قرطبی)

اور دارمی نے اپنے مسند میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ ”رسول ﷺ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ بنی اسرائیل میں دو آدمی تھے ایک عالم تھا جو صرف نماز پڑھ لیتا اور پھر لوگوں کو دین کی تعلیم دینے میں مشغول ہو جاتا تھا دوسرا دن بھر روزہ رکھتا اور رات کو عبادت میں کھڑا رہتا تھا ان دونوں میں کون افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اس عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ آدمی پر“ (یہ روایت امام عبدالبر نے کتاب جامع بیان العلم میں سند کیساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کی ہے (قرطبی)

اور رسول ﷺ نے فرمایا کہ ایک فقیہ شیطان کے مقابلہ میں ایک ہزار عبادتگذاروں سے زیادہ قوی اور بھاری ہے (ترمذی عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ از مظہری) اور رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل ایسے ہیں جن کا ثواب انسان کو مرنے کے بعد بھی پہنچتا رہتا ہے ایک صدقہ جاریہ جیسے مسجد یا دینی تعلیم کی عمارت یا رفاہِ عام کے ادارے دوسرے وہ علم جس سے اس کے بعد بھی لوگ نفع اٹھاتے رہیں (مثلاً شاگرد عالم ہو گئے ان سے آگے لوگوں کو علم دین سکھانیکا سلسلہ چلتا رہا یا کوئی کتاب تصنیف کی جس سے اس کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھاتے رہے) تیسرے اولاد صالح جو اس کیلئے دعا اور ایصال ثواب کرتی رہے۔ (از قرطبی)

علم دین کے فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کی تفصیل

ابن عدی اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (از مظہری)

”یعنی علم حاصل کرنا فرض ہے ہر ایک مسلمان پر“ یہ ظاہر ہے کہ اس حدیث اور مذکورہ سابقہ احادیث میں علم سے مرادِ علمِ دین ہے دنیوی علوم و فنون عام دنیا کے کاروبار کی طرح انسان کے لیے ضروری ہیں مگر ان کے وہ فضائل نہیں جو احادیث مذکورہ میں آئے ہیں پھر علمِ دین ایک علم نہیں بہت سے

Marfat.com

علوم پر مشتمل ایک جامع نظام ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر مسلمان مرد و عورت اس پر قادر نہیں کہ ان سب علوم کو پورا حاصل کر سکے اس لیے حدیث......مذکور میں جو ہر مسلمان پر فرض فرمایا گیا ہے اس سے مرادِ علمِ دین کا صرف وہ حصہ ہے جس کے بغیر آدمی نہ فرائض ادا کر سکتا ہے نہ حرام چیزوں سے بچ سکتا ہے جو ایمان واسلام کیلئے ضروری ہے باقی علوم کی تفصیلات قرآن وحدیث کے تمام معارف ومسائل پھر اُن سے نکالے ہوئے احکام وشرائع کی پوری تفصیل یہ نہ ہر مسلمان کی قدرت میں ہے نہ ہر ایک پر فرضِ عین ہے البتہ پورے عالمِ اسلام کے ذمہ فرض کفایہ ہے ہر شہر میں ایک عالم ان تمام علوم وشرائع کا ماہر موجود ہو تو باقی مسلمان اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور جس شہر یا قصبہ میں ایک بھی عالم نہ ہو تو شہر والوں پر فرض ہے کہ اپنے میں سے کسی کو عالم بنائیں یا باہر سے کسی عالم کو بلا کر اپنے شہر میں رکھیں تا کہ ضرورت پیش آنے پر باریک مسائل کو اس عالم سے فتویٰ لے کر سمجھ سکیں اور عمل کر سکیں اس لیے علمِ دین میں فرضِ عین اور فرضِ کفایہ کی تفصیل یہ ہے کہ:۔

فرضِ عین

ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ اسلام کے عقائد کا علم حاصل کرے اور طہارت ونجاست کے احکام سیکھے۔ نماز، روزہ اور تمام عبادات جو شریعت نے فرض وواجب قرار دی ہیں ان کا علم حاصل کرے جن چیزوں کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہے ان کا علم حاصل کرے جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہو اس پر فرض ہے کہ زکوٰۃ کے مسائل واحکام معلوم کرے جس کو حج پر قدرت ہے اس کیلئے فرضِ عین ہے کہ حج کے احکام ومسائل معلوم کرے جس کو بیع وشراء کرنا پڑے یا تجارت وصنعت یا مزدوری واجرت کے کام کرنے پڑیں اس پر فرضِ عین ہے کہ بیع واجارہ وغیرہ کے مسائل واحکام سیکھے جب نکاح کرے تو نکاح کے احکام ومسائل اور طلاق کے احکام ومسائل معلوم کرے غرض جو کام شریعت نے ہر انسان کے ذمہ فرض وواجب کیا ہے ان کے احکام ومسائل کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

علمِ دین کا نصاب

قرآن حکیم نے اس جگہ علمِ دین کی حقیقت اور اس کا نصاب بھی ایک ہی لفظ میں بتلا دیا وہ ہے (لیتفقھو ا فی الدین) یہ موقع بظاہر اسکا تھا کہ یہاں (یتعلمون الدین) کہا جاتا یعنی علمِ دین حاصل کریں مگر قرآن نے اس جگہ تعلّم کا لفظ چھوڑ کر تفقہ کا لفظ اختیار فرما کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ علمِ دین کا محض پڑھ لینا کافی نہیں وہ تو بہت سے کافر یہودی نصرانی بھی پڑھتے ہیں اور شیطان کو سب سے زیادہ حاصل ہے بلکہ علمِ دین سے مراد دین کی سمجھ پیدا کرنا ہے یہی لفظ تفقہ کا ترجمہ ہے اور یہ فقہ سے مشتق ہے فقہ کے معنی سمجھ بوجھ ہی کے ہیں یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ مجرد کے صیغے سے (لیفقھوا الدین) یعنی تا کہ وہ دین کو سمجھ لیں نہیں فرمایا بلکہ (لیتفقھو ا فی الدین) فرمایا جو باب تفعّل سے ہے اس کے معنی میں محنت ومشقت کا مفہوم شامل ہے مراد یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں پوری محنت ومشقت اٹھا کر مہارت حاصل کریں یہ بھی ظاہر ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ صرف اتنی بات سے پیدا نہیں ہوتی کہ طہارت نجاست یا نماز روزے زکوٰۃ حج کے مسائل معلوم کرے بلکہ دین کی سمجھ بوجھ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے ہر قول وفعل اور حرکت وسکون کا آخرت میں اس سے حساب لیا جائے گا اس کو اس دنیا میں کس طرح رہنا چاہیے دراصل اسی فکر کا نام دین کی سمجھ بوجھ ہے اسی لیے امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ نے فقہ کی تعریف یہ کی ہے کہ انسان ان تمام کاموں کو سمجھ لے جن کا کرنا اس کے لیے ضروری ہے اور ان تمام کاموں کو بھی سمجھ لے جن سے بچنا اس کے لیے ضروری ہے آج کل جو علم فقہ مسائل جزئیہ کے علم کو کہا جاتا ہے یہ بعد کی اصطلاح ہے قرآن وسنت میں فقہ کی حقیقت وہی ہے جو امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ جس شخص نے دین کی کتابیں سب پڑھ ڈالیں مگر یہ سمجھ بوجھ پیدا نہ کی وہ قرآن و سنت کی اصطلاح میں عالم نہیں اس تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ علم دین حاصل کرنیکا مفہوم قرآن کی اصطلاح میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے وہ جن ذرائع سے حاصل ہو وہ ذرائع خواہ کتابیں ہوں یا اساتذہ کی صحبت سب اس نصاب کے اجزا ہیں۔

Marfat.com

علم دین حاصل کرنے کے بعد عالم کے فرائض

اس جگہ قرآن کریم نے اس کو بھی ایک ہی جملہ میں پورا بیان فرمادیا ہے وہ ہے (لینذ روا قومھم)یعنی تا کہ وہ اپنی قوم کواللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں یہاں بھی یہ بات قابلِ نظر ہے کہ اس جملہ میں عالم کا فرض انذارِقوم بتلایا ہے انذار کالفظی ترجمہ ہم اردو میں ڈرانے سے کرتے ہیں مگر یہ اس کا پورا ترجمہ نہیں اردوزبان کی تنگی کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے پورے ترجمہ کوادانہیں کرتا حقیقت یہ ہے کہ ڈرانا کئی طرح کا ہوتا ہے ایک ڈرانا دشمن چور، ڈاکو یا کسی درندے یا زہریلے جانور سے ہے ایک ڈرانا وہ ہے جو باپ اپنی شفقت سے اولاد کو تکلیف دہ چیزوں جیسے آگ، زہریلے جانور مضرغذا سے ڈراتا ہے جس کا منشاء شفقت ومحبت ہوتی ہے اس کا لب ولہجہ بھی کچھ اور ہی ہوتا ہے انذار اسی قسم کے ڈرانے کا نام ہے اسی لیے پیغمبروں اور رسولوں کو نذیر کا لقب دیا گیا ہے اور عالم کا یہ فریضۂ انذار درحقیقت وراثت نبوت ہی کا جز ہے جو بنص حدیث عالم کو حاصل ہوتی ہے ۔

مگر یہاں قابلِ غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دو لقب ہیں بشیر اور نذیر ۔نذیر کے معنی تو ابھی آپ معلوم کرچکے ہیں ۔بشیر کے معنی ہیں بشارت اور خوش خبری دینے والا ۔انبیاء علیہم السلام کا ایک کام یہ بھی ہے کہ نیک عمل کرنے والوں کو بشارت سنائیں اس جگہ بھی اگرچہ صراحتاً ذکر انذار کا کیا گیا ہے مگر دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا فرض یہ بھی ہے کہ نیک کام کرنیوالوں کو بشارت بھی سنائے لیکن اس جگہ صرف انذار کے ذکر پر اکتفاء کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ذمے دو کام ہیں ایک یہ کہ جو عمل اسکے لیے دنیا وآخرت میں مفید ہیں انکو اختیار کرے دوسرے یہ کہ جو عمل اس کے لیے مضر ہیں ان سے بچے باتفاق علماء وعقلاان دونوں کاموں میں سے دوسرا کام سب سے مقدم اور اہم ہے اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے دولفظوں سے تعبیر کرکے دفعِ مضرت کو جلبِ منفعت سے مقدم قرار دیا ہے اس کے علاوہ دفعِ مضرت میں ایک حیثیت سے جلبِ منفعت کا مقصد بھی پورا ہوجاتا ہے کیونکہ جو کام انسان کے لیے مفید اور ضروری ہیں ان کا ترک بڑی مضرت ہے تو جو شخص مضرتِ اعمال سے بچنے کا اہتمام کریگا وہ اعمال ضروریہ کے ترک سے بچنے کا بھی اہتمام کریگا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آجکل جو عموماً وعظ وتبلیغ بہت کم مؤثر ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار کے آداب نہیں ہوتے جس کے طرز بیان اور لب ولہجے سے شفقت ورحمت اور خیر خواہی مترشح ہے مخاطب کو یقین ہو کہ اس کے کلام کا مقصد نہ مجھے رسوا کرنا ہے نہ بدنام کرنا نہ اپنے دل کا غبار نکالنا بلکہ یہ جس چیز کو میرے لیے مفید اور ضروری سمجھتا ہے وہ محبت کی وجہ سے مجھے بتلا رہا ہے اگر آج ہماری تبلیغ اور خلاف شرع امور کے مرتکب لوگوں کو اصلاح کی دعوت کا یہ طرز ہوجائے تو اسکا ایک نتیجہ تو قطعالازم ہی ہے کہ مخاطب کو ہماری گفتگو سے ضد پیدانہیں ہوگی ۔وہ جواب دہی کی فکر میں پڑنیکے بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور انجام سوچنے کی طرف متوجہ ہوجائیگا اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کبھی نہ کبھی اسکو قبول بھی کریگا اور دوسرا نتیجہ یہ لازمی ہے کہ کم ازکم اس سے باہمی منافرت اور لڑائی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا جس میں آج کل ہماری پوری قوم مبتلا ہے ۔

آخر میں (لعلھم یحذرون) فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب سے ڈرا دیا بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہے کہ اس کی تبلیغ و دعوت کا اثر کتنا اور کیا ہوا ایک دفعہ مؤثر نہیں ہوئی تو بار بار کرتا ہے تاکہ اس کا نتیجہ یحذرون برآمد ہوسکے یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ

غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝١٢٣ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ

Marfat.com

فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا
وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً
اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ
سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ
انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ
حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا
فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ
الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۲۹﴾ ع

(اے ایمان والو جنگ کرو اُن کافروں سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی پائیں اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔ (۱۲۳) (جب کوئی نئی سورۃ نازل ہوتی ہے اُن میں سے بعض لوگ (شرارتاً) کہتے ہیں کہ تم میں سے کون ہے کہ زیادہ کر دیا ہو اِس سورۃ نے اُس کا ایمان۔ تو وہ (سن لیں) کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں تو اِس سورۃ نے اُن کے ایمان میں اضافہ کیا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں۔ (۱۲۴) رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے۔ تو اِس سورۃ نے اُن کی نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا ہے اور وہ کافر ہیں۔ (۱۲۵) (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔ (۱۲۶) (اور جب کوئی سورۃ نازل کی جاتی ہے۔ تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے پھر کھسک جاتے ہیں، اللہ نے اُن کے دلوں کو پھیر دیا ہے۔ اِس سبب سے کہ یہ سمجھ سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔ (۱۲۷) (آ چکا ہے تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول جس

Marfat.com

پر تمہارا ہلاکت میں پڑنا بہت شاق ہے وہ تمہارے ایمان کا حریص اور ایمان والوں کے لیے نہایت شفیق مہربان ہے۔(۱۲۸)
پس اگر وہ روگردانی کریں۔ تو اُن سے کہہ دو کہ مجھ کو اللہ کافی ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہے عرشِ عظیم کا۔(۱۲۹) (۱۲۳ تا ۱۲۹) (رکوع: ۱۶)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ○
(اے ایمان والو جنگ کرو اُن کافروں سے جو تم سے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تم میں سختی پائیں اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔(۱۲۳)

پیشِ نظر آیت کریمہ سورۃ التوبہ کے آخری رکوع کی پہلی آیت ہے۔ اِس میں جو باتیں اِرشاد فرمائی گئی ہیں۔ وہ سورۃ التوبہ کے تمام مضامین کا حاصل ہیں اور مزید برآں یہ کہ رکوع نمبر ۱۰ سے جو مضمون شروع ہوا تھا یہ آیت اُس مضمون کا اختتام ہے۔
سورۃ التوبہ ۹ ہجری میں اُس وقت نازل ہوئی ہے جب اِسلامی انقلاب اور اِسلامی دعوت فتح مکہ کے بعد جزیرۂ عرب کی حد تک اپنے اتمام کو پہنچ رہی ہے۔ جزیرہ عرب اِس دعوت اور انقلاب کا بیس اور مرکز بن چکا ہے۔ اِسلامی قوت اِس مرکز میں اپنی طاقت کی مضبوطی اور پاؤں جمانے کی فکر میں ہے۔ پروردگار یہ چاہتا ہے کہ جزیرہ عرب میں اِسلامی نظام اور اُمتِ مسلمہ کو ایسا استحکام مل جائے۔ جس کے بعد اِس انقلاب کو عرب سے باہر برآمد کرنا آسان ہو جائے اور خود مرکز کے اندر کمزوری کی کوئی تشویش باقی نہ رہے۔ اِس مقصد کے لیے سورۃ التوبہ میں اُن تمام قوتوں کو یکسو ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو ابھی تک اِسلام اور مسلمانوں کے خلاف تدبیریں کرنے میں مصروف تھیں۔ تمام کفار اور مشرکین کو حکم دے دیا گیا کہ وہ اِسلام قبول کریں یا جزیرہ عرب سے نکل جائیں۔ ورنہ اُن کو قتل کر دیا جائے گا۔ اُن کے لیے یہ رعایت بھی نہیں رکھی گئی کہ وہ ذمی بن کر اِسلامی حکومت کے شہری بن کر رہ سکیں۔ اہل کتاب کو اگر چہ ایک مدت تک اِسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت دی گئی۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے دنیا سے جاتے ہوئے وصیت فرمائی کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہونے پائیں۔

منافقین کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کریں۔ ایک مدت تک اُن کو نصیحت اور فہمائش سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی گئی۔ بالآخر رکوع نمبر ۱۰ میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اللہ کے اِس فیصلے کو مکمل طور پر نافذ کرنے کے لیے کفار اور منافقین سے جہاد کریں اور اِس کے ساتھ ساتھ منافقین کے بارے میں اپنا رویہ سخت کر لیں۔ آنحضرت ﷺ پر چونکہ رحمت کا غلبہ رہتا تھا۔ اِس لیے منافقین آپ کی رحمت اور شفقت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اِس لیے آپ کو حکم دیا گیا کہ یہ منافق لوگ آپ کی رحمت اور شفقت کے مستحق نہیں۔ جس طرح آپ کافروں سے جہاد کرتے ہیں۔ اُسی طرح منافقین سے بھی جہاد کریں اور آپ کا رویہ اور آپ کا سلوک نرمی کی بجائے سختی میں تبدیل ہو جانا چاہیے۔ اِس آیت میں کافروں کا الگ ذکر فرمایا اور مومنوں کا الگ۔ نیز رویہ کو سخت کرنے کا حکم صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا مسلمانوں کو نہیں اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ آپ کو ان کافروں اور منافقین سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو قتال سے وسیع معنی کا حامل ہے۔ جس میں دعوت، نصیحت اور فہمائش سب کچھ شامل ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ قتال تک بھی نوبت پہنچے۔ لیکن پیشِ نظر آیت کریمہ میں چند تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں۔
1۔ جہاد کی بجائے قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ منافقین اَب مزید دعوت اور نصیحت کے قابل نہیں رہے۔ اِن پر اتمامِ حجت ہو چکا۔ اِن کے نفاق نے بہت حد تک گھونگھٹ اُلٹ دیا ہے۔ اِس لیے اَب جہاد کی ابتدائی کوششوں کو چھوڑ کر اِس کی آخری صورت قتال پر عمل کیا جائیگا۔
2۔ اِس آیت میں کفار کے ساتھ منافقین کا ذکر ختم کر دیا گیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ منافق حقیقت میں تو کافر ہی ہوتے ہیں۔ لیکن انہیں چونکہ مومن کہلانے پر اصرار ہوتا ہے۔ اِس لیے پروردگار بھی اُنہیں کافر نہیں کہتا لیکن اَب جبکہ انہوں نے سارے نقاب اُٹھا دیے ہیں۔ اِس لیے اُنہیں صاف صاف کفار کے لفظ سے یاد فرمایا جا رہا ہے۔

Marfat.com

3۔ رکوع نمبر ۱۰ میں آنحضرت ﷺ کو اپنا رویہ سخت کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن اِس آیت میں تمام مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ تم منافقین کے ساتھ ایسا رویہ رکھو جس میں وہ سختی اور غلظت محسوس کریں۔ انہیں اندازہ ہوجائے کہ اَب مسلمانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اِن تبدیلیوں سے صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ ہدایات اِسلامی انقلاب اور مرکزِ اِسلام کو ایسی قوت اور وحدت دینے کے لیے عطا کی جارہی ہیں۔ جس میں فکری یکسوئی بھی ہو اور سیاسی توانائی بھی۔ جس میں مسلمانوں کو اجتماعی فیصلے کرنے میں کوئی دشواری پیدا نہ ہو۔ اِسلامی معاشرہ کا ایک ایک فرد اپنی سوچ اور عمل میں ایسی ہم آہنگی رکھتا ہو کہ نہ سوچ میں پراگندگی پیدا ہو اور نہ عمل میں ناتوانی۔ یہ ایک ایک فرد جب اجتماع کی شکل اختیار کرے تو اُس کی سوچ اور عمل کی قوتیں اجتماعی قوت کی بنیاد بن جائیں۔

اِن ابتدائی اور استعدادی قوتوں کی فراہمی کے بعد حکم دیا گیا کہ اَب اُن منافقین سے قتال کرو اور اُس میں ایک ترتیب رکھو مقصود چونکہ مرکزِ اِسلام کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانا ہے۔ اِس لیے اِس بات کی شدید ضرورت ہے کہ لڑائی کا دائرہ پھیلنے نہ پائے۔ جب تک ایک قدم مضبوطی سے رکھ نہ لیا جائے دوسرا قدم نہ اُٹھایا جائے۔ اِس لیے جو تمہارے قریب اور آس پاس کفار موجود ہیں سب سے پہلے اُن کے ساتھ قتال کرو۔ ویسے بھی دیکھا جائے کہ ایک نوزائیدہ مملکت جس کی حقیقی قوت صحیح فکر اور عملِ صالح ہے۔ وہ جس طرح اپنے اندر نفاق برداشت نہیں کرسکتی اِسی طرح وہ اپنے آس پاس کفر کی گندگی کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اگر اُن میں فکری کجروی ہوگی۔ تو مسلمانوں کے ساتھ میل جول سے اِس کا تدارک ہوسکے گا اور اگر اُن کے اِرادوں میں خرابی ہوگی۔ تو مسلمانوں کی قوت اور اُن کا مضبوط رویہ انہیں صحیح راستہ دکھانے کے لیے کافی ہوگا۔

اِسی سے اہل علم نے یہ سمجھا ہے کہ جس طرح کفار کی ہدایت کی سب سے پہلے ذمہ داری اُن لوگوں پر ہے۔ جو اُن کے ہمسایہ میں رہتے ہیں اور صاحبِ ایمان ہیں۔ اِسی طرح کفار کی سرکشی اور اُن کی قوت کے دفاع کی ذمہ داری بھی سب سے پہلے اُن مسلمانوں پر ہے جو اُن کے قریب رہتے ہیں یا جن کے ملک پر کافروں نے حملہ کردیا ہے اور اُس ملک کے رہنے والے اگر اپنی قوت کے بل بوتے پر دفاع کی طاقت نہ رکھتے ہوں۔ تو جو مسلمان اُن کے ہمسائے ہیں اُن پر جہاد وقتال فرض ہوجاتا ہے۔ اِسی طرح یہ ذمہ داری درجہ بہ درجہ پھیلتی جاتی ہے۔ اگر مسلمانوں کی ایک محدود تعداد یا کوئی ایک ملک مسلمانوں کی دفاعی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوجائے تو باقی مسلمان اِس ذمہ داری سے فارغ ہوجائیں گے اور اگر کسی نے بھی اِس ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش نہ کی تو قیامت کے دن سب مسلمان پکڑے جائیں گے۔ کیونکہ جہاد اور قتال ایسی صورتِ حال میں جب کہ تمام مسلمانوں کی شرکت اُس میں ضروری نہ ہو۔ اُسے فرضِ کفایہ کہتے ہیں۔ یہ فرض بقدرِ ضرورت مسلمانوں کے ادا کرنے سے سب کی طرف سے ادا ہوجاتا ہے۔ آج مسلمان مختلف ملکوں میں اِسی فرض کی ادائیگی کے لیے مسئول ہیں۔ کشمیر کی جنگ ہو یا افغانستان کی۔ چیچنیا کا معرکہ ہو یا فلسطین کا جہاں جہاں بھی ظالم قوتوں نے پنجے گاڑ رکھے ہیں اور مسلمانوں کا خون بہایا جارہا ہے۔ پوری اُمتِ مسلمہ اُن کی مدد کرنے کی ذمہ دار ہے۔ البتہ سب سے پہلے اُن لوگوں پر ذمہ داری ہے جو اُن کے ہمسائے میں رہتے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنی ذمہ داری ادا نہ کی تو پھر یہ درجہ بہ درجہ ایک ترتیب کے ساتھ آگے پھیلتی جائے گی اور پوری اُمت سے اِس کا حساب طلب کیا جائے گا۔

بعض اہل علم نے اِس آیت کا ایک اور مطلب سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اِس آیت میں خطاب عام مسلمانوں سے نہیں بلکہ منافقین سے ہے۔ اُن سے یہ کہا جارہا ہے کہ تمہارے نفاق کا اصل سبب یہ ہے کہ تم نے ہمیشہ اپنے کافر عزیزوں اور دوستوں کو اِسلام پر ترجیح دی ہے۔ تمہیں اُن کا تعلق اِسلامی رشتہ سے زیادہ عزیز ہے۔ اِس لیے تم کو حکم دیا جارہا ہے کہ تمہارے عزیزوں میں جو لوگ اَب تک کافر ہیں اُن سے قتال کرو۔ کیونکہ اللہ کے ساتھ اخلاص ثابت کرنے کے لیے اِس سے بڑا ذریعہ کوئی نہیں کہ وہ اپنی تمام قرابت داریوں اور رشتوں کو اللہ کے رشتہ پر قربان کردے۔ جنگ بدر اِسلامی تاریخ میں سب سے اہم غزوہ ہے اور اُس میں شریک ہونے والوں کو آنحضرت ﷺ نے نجات کی خوش خبری دی ہے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اِسلام کے رشتے پر تمام رشتے قربان کردیئے تھے۔ دونوں فوجیں جب آمنے سامنے ہوئیں تو مسلمانوں نے دیکھا کہ اُن کے اپنے جگر گوشے ہی اُن کی تلواروں کی زد میں ہیں۔ حضرت ابوبکر نے دیکھا کہ اُن کے صاحب زادے کافروں کی صف میں کھڑے ہیں۔ حضرت عمر فاروق کے ماموں دوسری طرف آمادۂ پیکار ہیں۔ حضرت حذیفہ کے والد، چچا، بھائی مبارزت طلب کررہے ہیں۔ اِس طرح سے اپنے خونی رشتے امتحان بن کر

Marfat.com

کھڑے تھے لیکن مسلمانوں نے ایک لمحہ توقف کیے بغیر تمام علائق توڑ ڈالے اور اپنے عمل سے ثابت کیا کہ ہمیں اللہ کے رشتے کے سواء کوئی رشتہ منظور نہیں۔ اِس آیت میں منافقین سے بھی یہ کہا جارہا ہے اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو اپنے عزیزوں کو جو کافروں کی صف میں کھڑے ہیں تہِ تیغ کر ڈالو۔ تا کہ معلوم ہو جائے کہ تم اللہ کی محبت اور اُس سے وفا میں سچے ہو اور تمہارے ایک ایک عمل سے اِس کا اظہار ہو کہ کافروں کے لیے چاہے وہ کتنے بھی قریبی کیوں نہ ہو تمہارے دل میں کوئی جگہ نہیں۔

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○

ترجمہ: اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔

اِس کے تین مفہوم ہیں: (۱) خطاب منافقین سے ہے اُن سے یہ کہا جارہا ہے کہ تمہیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت سے صرف وہ شخص سرفراز ہوتا ہے جس کے قلبی تعلقات صرف اللہ سے وابستہ ہوں۔ وہ ہر معاملے میں اللہ کو یاد رکھتا ہو اُسی کے احکام پر چلتا ہو۔ اُسی سے اپنے دل کو آباد رکھتا ہو اور اگر کسی اور محبت کا اللہ سے محبت کے ساتھ تصادم ہو جائے۔ تو وہ اللہ کی محبت کے مقابلے میں کسی اور کو پرِکاہ کے برابر بھی حیثیت دینے کے لیے تیار نہ ہو۔ تمہارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تم آج تک اللہ اُس کے رسول اور اُس کے دین کے حوالے سے یکسو نہیں ہو سکے تم نام اسلام کا لیتے ہو لیکن تمہاری ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری ترجیحات کچھ اور ہیں۔ تم دعویٰ اسلام کا کرتے ہو لیکن تمہارے دلوں کی دھڑکنیں دشمنانِ دین کے لیے مضطرب ہوتی ہیں۔ تمہارے لیے یہ معمولی بات سمجھنا مشکل ہو گیا ہے کہ اللہ اور اُس کے دشمنوں سے یکساں تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ اللہ کا رسول اُن کے خلاف مصروفِ جنگ ہے اور تم اُن سے پینگیں بڑھانے سے رُک نہیں سکتے۔ ایسی صورتِ حال میں تم خود دیکھو کہ تم کس دھڑے کے آدمی ہو۔ جب تک تم پوری طرح اللہ اور اُس کے دین سے وفاداری کا حق ادا نہیں کرتے اُس وقت تک تم متقی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ متقی اُسی شخص کو کہتے ہے جو ہر طرف سے اپنے قلبی احساسات اور رجحانات صرف اللہ اور اُس کے دین کے لیے وقف کر دے۔

۲۔ دوسرا مفہوم اِس جملے کا یہ ہے کہ اِس میں خطاب مخلص مسلمانوں سے ہے۔ اُن سے فرمایا جارہا ہے کہ اَب جب کہ اِسلامی ریاست قائم ہو چکی۔ اِسلامی معاشرہ بن چکا۔ تمہیں پوری نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے چن لیا گیا۔ اَب تمہارے سامنے دین کے دشمنوں کی ایک وسیع دنیا ہے۔ اِن میں سے ہر گروہ ہر قبیلہ اور ہر ملک تمہیں مٹا دینے کے لیے پر تول رہا ہے۔ تم ایک ایسے معرکہ میں کھڑے ہو جس میں تمام دنیا سے تمہیں مقابلہ ہے۔ اُن کی تعداد اور اُن کے وسائل کو دیکھ کر یقیناً تمہیں پریشانی ہوتی ہو گی لیکن یاد رکھو قوت کا سرچشمہ انسان نہیں بلکہ انسانوں کا خالق ہے۔ وہی ایک ذات ہے جسے قادرِ مطلق کہا جاتا ہے۔ تم اُسی کے فوج دار ہو۔ تم نے اپنی تمام تر صلاحیتیں آج تک اُسی کے لیے صرف کی ہیں تم نے ہر طرف سے منہ پھیر کر اُسی کو اپنا قبلۂ مقصود بنایا ہے۔ وہ تم کو خوش خبری سناتا ہے کہ اُس کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ وہ متقیوں کا ساتھ دیتا ہے۔ جو اُس کے ہو جاتے ہے وہ بھی اُن کا ہو جاتا ہے۔ آج بھی تمہاری کامیابیوں کی یہی ضمانت ہے۔ تم اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دو۔ اُس کا دین پوری طرح انفرادی اور اجتماعی زندگی پر نافذ کر دو۔ اُسی پر بھروسہ کرو اور اُسی سے مدد چاہو پھر تم دیکھو گے کہ وہ کس طرح تمہارا ساتھ دیتا ہے اور کیسے مایوسی میں تمہارے لیے اُمید کی شمع روشن کرتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا یہ قانون ہے کہ اُس کی معیت نام کی معیت نہیں ہوتی بلکہ وہ مدد اور نصرت کو مستلزم ہوتی ہے۔ ہر دور میں اُس کے چاہنے والوں کو عزتیں ملی ہیں۔ اور ناگفتہ بہ حالات میں اُن کی مدد کی گئی ہے اور آج بھی کوئی سننے والا ہو تو:

یثرب سے اب بھی گونجتی ہے یہ صدا سنو
وہ جو خدا کے ہو گئے اُن کا خدا ہوا

۳۔ تیسرا مفہوم اِس جملے کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہدایت کی جارہی ہے کہ تم اللہ کے حکم کے مطابق جب اپنے آس پاس کے کفار سے قتال کرو گے۔ تو اِن کینہ ور دشمنوں کی دشمنیوں کا انتقام تم کو مشتعل نہ کرے۔ تم نے آستین کے اِن سانپوں سے سالوں تکلیفیں اٹھائی ہیں اور انہوں نے ہمیشہ تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ دیکھو اِس سے تمہارے اندر کوئی ردِعمل پیدا نہیں ہونا چاہیے جس طرح امن کے دور میں زندگی گزارنے کی اِسلام نے

Marfat.com

ایک تہذیب دی ہے۔ اِسی طرح اُس نے جنگ کی بھی ایک تہذیب بخشی ہے۔ اِسلام سے پہلے دشمن اور مخالف سے ہر طرح کا رویہ اختیار کرنا اور ہر طرح کی سزا دینا جائز سمجھا جاتا تھا اور اِس معاملے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ لیکن اِسلام نے جنگ ہو یا امن ہر حال میں مسلمانوں کو اللہ کے احکام کا پابند اور اِسلامی تہذیب کی حدود میں رہنے کا حکم دیا ہے اور حدود میں محدود رہنا اور کبھی بھی اللہ کے کسی حکم میں افراط وتفریط کا شکار نہ ہونا اِسی کا نام تقویٰ ہے اور اِسی تقویٰ کے حامل لوگوں کو متقین کہا گیا ہے اور اُن کو یہ نوید سنائی جا رہی ہے کہ اللہ کی معیت اور اُس کی نصرت اُسی گروہ کے ساتھ ہوتی ہے جو تقویٰ کی دولت سے مزین رہتا ہے۔ اِس لیے یہاں بھی حکم دیا گیا ہے کہ دیکھنا، کفار سے لڑائی میں اِسلامی حدود میں سے کسی حد کو پار کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھانا جو مقابلے پر نہ آئیں اُنہیں قتل نہ کرنا۔ لاشوں کو مثلہ نہ کرنا۔ بچوں کو نقصان نہ پہنچانا۔ فصلیں نہ اُجاڑنا۔ شدید ضرورت کے بغیر پھل دار درخت نہ کاٹنا۔ لڑائی کو ایک ضرورت سمجھنا اور اِسے مقصد نہ بنانا۔ لڑائی جیسی ہیجان انگیز مصروفیت میں بھی انسانیت کا دامن تار تار نہ کرنا اگر تم نے اِس طرح تقویٰ کو ملحوظ رکھا تو یقین جانو کہ اللہ کی معیت اور نصرت تمہارے ساتھ ہوگی۔

وَاِذَامَآاُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○
وَاَمَّاالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ○ (۱۲۴ . ۱۲۵)

(جب کوئی نئی سورۃ نازل ہوتی ہے اُن میں سے بعض لوگ (شرارتاً) کہتے ہیں کہ تم میں سے کون ہے کہ زیادہ کر دیا ہو اِس سورۃ نے اُس کا ایمان۔ تو وہ (سن لیں) کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں تو اِس سورۃ نے اُن کے ایمان میں اضافہ کیا ہے اور وہ خوشیاں منا رہے ہیں۔ (۱۲۴) رہے وہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے۔ تو اِس سورۃ نے اُن کی نجاست پر ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا ہے اور وہ کافر ہیں۔ (۱۲۵)

اِن آیات میں منافقین کی بعض منافقانہ عادات اور علامات کو بیان فرمایا جا رہا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے سالوں تک ایسے بد باطن لوگوں کے ساتھ جس تحمل اور بردباری پر مبنی رویہ اختیار کیے رکھا وہ حیران کن تو ضرور ہے لیکن اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ منافقین کو زیادہ سے زیادہ راہِ راست پر آنے کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ اللہ کی ذات اِس قدر رحیم وکریم ہے کہ وہ انسانوں کو انسانوں کی توقع سے بھی بڑھ کر مہلت پر مہلت دیتی ہے۔ تا کہ اِن کے اندر اگر خیر کی کچھ بھی رمق ہے۔ تو اُسے بروئے کار آنے کا موقع دیا جائے۔
منافقین کی خصائل بد میں سے ایک خصلت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں پر اپنا اعتماد جمانے کے لیے آنحضرت ﷺ کی مجلس میں ضرور جاتے اور جب کبھی اُن کی موجودگی میں کوئی نئی آیت نئی سورۃ یا کوئی نیا حکم نازل ہوتا تو وہ بھی بظاہر سننے کی کوشش کرتے لیکن اُن کے دل ودماغ بجائے اُس کا اثر قبول کرنے کے اُس کے خلاف بغض میں کھولتے رہتے اور جیسے ہی اُنہیں اپنے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملتا یا کسی کمزور اور غریب مسلمانوں سے واسطہ پڑتا تو وہ قرآن کریم کا مذاق اُڑاتے۔ مذاق میں یوں تو جو اُن کا بس چلتا بکنے سے دریغ نہیں کرتے تھے لیکن خاص طور پر اُن باتوں کو نشانہ بناتے جس سے قرآن کریم کے اثرات کو زائل کرنے میں مدد ملتی مثلاً قرآن کریم نے سورۃ انفال کی دوسری آیت میں مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ جب اُن کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے۔ تو قرآن میں اُترنے والی ہر آیت اُن کے ایمان میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ چنانچہ اِسی بات کو نشانہ بنا کر وہ ایک دوسرے کو یا غریب مسلمانوں سے پوچھتے کہ صاحبو۔ اِبتاؤ کہ اِس سورۃ نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے ہم جیسے پہلے تھے ویسے ہی ہیں۔ ہمارے ایمان میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اِس طرح سے وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتے حالانکہ اِس بات کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ جو شخص حقیقی ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے اُس کے دل میں اللہ کی محبت ہر تعلق پر غالب آجاتی ہے۔ وہ اُس کی جانب سے آنے والے کسی بھی حکم کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہے۔ وہ ہر نئی سورۃ اور ہر نئی آیت کا اِس طرح استقبال کرتا ہے۔ جس طرح ایک عاشق نامہ محبوب کا استقبال کرتا ہے۔ جب تک محبوب کی طرف سے کوئی نامہ نہیں آتا تو اُس کی گھڑیاں انتظار میں گزرتی ہیں اور جب نامہ محبوب اُسے ملتا ہے تو وہ اُسے آنکھوں سے لگاتا اور بے قراری سے چومتا ہے اور اِس طرح سے ہر آنے والا مکتوب اُس کی محبت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ لیکن جس کے دل میں کسی کی محبت کا دیپ نہیں جلا

Marfat.com

۔وہ فراق کی شدت سے واقف نہیں۔وہ جانتا ہی نہیں کہ عشق و محبت کس سوز و گداز کا نام ہے۔اُس کے نزدیک نامۂ محبوب تو کیا وصلِ محبوب کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔منافقین نہ اللہ کے عشق سے بہرہ ور تھے نہ انہیں قرآن جیسے حیات بخش پیغام کی کوئی قدر تھی۔بلکہ وہ قرآن کریم کو اپنے نام نہاد دین کے لیے موت سمجھتے تھے۔اِس لیے اُنکا اِس طرح کی باتیں کرنا اور مذاق اُڑانا نا قابلِ فہم نہیں۔قرآن کریم نے اُن کی اِسی بیماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن کریم کی تاثیر اور قدر و منزلت میں تو کوئی شبہ نہیں۔سوال اُس زمین کا ہے جس پر قرآن کریم اُتر رہا ہے۔اگر وہ زمین قبولیت کی استعداد سے مالا مال ہے۔تو قرآن کریم کی ایک ایک آیت کا نزول اُس کی روئیدگی اور قبولیت میں اضافہ کا باعث ہوگا۔لیکن اگر وہ زمین بنیادی خصائص سے محروم ہے۔تو اُس کے لیے قرآن کریم کی تاثیر بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔سعدی نے ٹھیک کہا:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید در شورہ بوم خس

بارش کی طبیعت کی لطافت میں کوئی اختلاف نہیں لیکن اگر یہ بارش باغ میں برستی ہے۔تو لالہ اُگتا ہے اگر شورہ زمین میں برستی ہے تو بوم خس کا اضافہ ہوتا ہے۔ایک ہی بارش کے نزول سے دو مختلف نتائج کا برآمدہ ہونا۔زمین کی مختلف صلاحیت کی وجہ سے ہے۔جہاں اُس کی صلاحیت باقی اور بہتر ہے۔وہاں یقیناً لالہ جیسے پھول اُگیں گے اور اگر وہ زمین شورہ ہو چکی ہے تو بوم خس کے علاوہ کوئی چیز نہیں اُگ سکتی۔بلکہ قرآن کریم نے ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا کہ صالح زمین میں بارش کے برسنے سے مسلسل پھولوں میں اضافہ ہوگا اور ایک وقت آئے گا۔جب تمام باغ پھولوں کی خوشبو سے مہک اُٹھے گا۔لیکن شورہ زمین مسلسل بارشوں سے اور زیادہ ناکارہ ہوتی جائے گی اور اُس کی خرابی میں ہر بارش کے بعد اضافہ ہوتا جائے گا۔منافقین کا بھی یہی حال ہے کہ قرآن پاک کی کسی سورۃ کے اترنے سے صاحب ایمان لوگ تو خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں وہ اس پر ناز کرتے نہیں تھکتے کہ ہم جیسے زمین پر رہنے والے پتنگوں کو پروردگار نے یاد فرمایا ہے اور ہماری زندگی کی بھلائی کے لیے ایسا حیات بخش پیغام دیا ہے۔جس کی اثر آفرینی معنویت اور انقلاب انگیزی میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔لیکن یہی عظیم کتاب جب منافقین کے نفاق انگیز دل و دماغ پر اترتی ہے۔تو اُن کے اندر نفاق کی گندگی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔جس کا نتیجہ اِس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ اُن کا نفاق بڑھتے بڑھتے کفر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اَوَ لَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

(کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک بار یا دو بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔(۱۲۶)

مخاطب کو دلیل سے قائل کرنے کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ مخاطب کی حالت اور اُس کی کیفیت کو دلیل کے طور پر پیش کیا جائے اور یہ وہ طریقہ ہے جس کے پیش پا افتادہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔اگر مخاطب ایسی دلیل کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بات سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہے اور یا قصداً وہ معقولیت کی طرف آنے کے لیے تیار نہیں۔

منافقین سے فرمایا جا رہا ہے کہ وہ خود اپنی حالت پر غور کریں۔وہ اِس سے انکار نہیں کر سکتے کہ سال میں متعدد دفعہ اُنہیں مختلف ایسی آزمائشوں میں مبتلا کیا جاتا ہے۔جن کا مقصد اُن کے سامنے راہِ راست کھولنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔اگر وہ ذرا بھی اِس ابتلا پر غور کرنے کی زحمت اُٹھاتے۔تو اُن کے لیے حق کو سمجھنا دشوار نہ ہوتا۔وہ ابھی تک اللہ کے رسول کی رسالت قرآن کریم کی حقانیت اور دینِ اِسلام کی صداقت پر یکسو نہیں ہو سکے حالانکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ مسلسل اِسلام کا قافلہ قدم قدم آگے بڑھ رہا ہے۔ہر آنے والا دن اُس کی کامیابی کی نوید بن کر آتا ہے اور کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ وحی الٰہی کے ذریعہ اِن کے نفاق کا پردہ کھول دیا جاتا ہے اِن کی مجالس میں کہی ہوئی باتیں علیٰ رؤس الاشہاد بیان کر دی جاتی ہیں۔کبھی کسی جنگ پر نکلنے کا حکم آتا ہے۔تو اِن کا نفاق اِن کے لیے زنجیرِ پا بن جاتا ہے۔اِن کے مصنوعی عذر مسلمانوں کو اِن کے نفاق کی خبر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ کی عالی ظرفی اور کریم النفسی اِن کے لیے پناہ بن جاتی ہے۔تاکہ انہیں اپنی حالت کو سدھارنے کا موقع مل سکے۔

Marfat.com

دشمنانِ دین سے اِن کی وابستگی کوئی ایسا راز نہیں جس سے مسلمان واقف نہ ہوں۔ لیکن قرآن کریم اُن کے طرف اشارے کر کے چھوڑ دیتا ہے اور انہیں تلقین کرتا ہے کہ تم اپنی اصلاح کرلو۔ تو درِ توبہ ابھی بھی تمہارے لیے کھلا ہے۔ لیکن یہ اپنی اصلاح کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہوتے۔ ہر آزمائش انہیں سنوارنے کی بجائے اِن کے بگاڑ اور ناکامی کا سبب بنتی ہے۔ بجائے توبہ کی طرف آنے کے کفر کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ اَب اِن کا حال یہ ہے کہ اِن کے دلوں کی قساوت اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے اور اِن کی عقلیں ہر طرح کے تذکّر سے محروم ہوگئی ہیں اس لیے اِن کا مقدر محرومی کے سوا کچھ نہیں۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝

(اور جب کوئی سورۃ نازل کی جاتی ہے۔ تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے پھر کھسک جاتے ہیں، اللہ نے اُن کے دلوں کو پھیر دیا ہے۔ اس سبب سے کہ یہ سمجھ سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔ (۱۲۷)

پیغمبر کی شخصیت اور اللہ کا کلام اپنی معجز بیانی اور اثر آفرینی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جس کے دل میں معمولی سی بھی سلامتی ہے اور جس کی ذات میں تھوڑی سی بھی انسانیت ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ نبی کی مجلس اور قرآن پاک کی تلاوت کا اثر قبول نہ کرے۔ لیکن اِن کی بدنصیبی اور محرومی کا عالم یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کبھی قرآن کریم کی نئی نازل ہونے والی آیات سنانے کے لیے مسلمانوں کو جمع ہونے کا حکم دیتے اور یا کسی اہم معاملے کے اعلان کے لیے مسلمانوں کا اجتماع طلب فرماتے تو اِن کا حال وہ ہوتا جو پیشِ نظر آیت کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ حکم کی تعمیل کو اپنے لیے مفید سمجھ کر اجتماع میں حاضر تو ہو جاتے کیونکہ جانتے تھے کہ غیر حاضری کو مسلمان نفاق کی علامت سمجھ کر ہمیں منافق سمجھنے لگیں گے۔ لیکن اُن کی حالت اُس مریض جیسی ہوچکی تھی جس کے منہ کا مزہ بگڑ گیا ہو۔ تو لذیذ سے لذیذ چیز بھی اُس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ یا ملیریا میں مبتلا شخص جسے تپ محرقہ نے سردی کے جھٹکے دے کر بادِ بہاری کی لذت سے محروم کر دیا گیا ہو۔ انہیں مجلسِ نبوی میں تلاوت قرآن بھی بوجھ محسوس ہوتی ہے اور وہ اس سے خوف زدہ ہوتے ہیں کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ہمارے نفاق کا راز فاش نہ کردے۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے اشارے کرتے ہیں اور جب محسوس کرتے ہیں کہ مسلمان کے قرآن کریم کے اعجاز اور ذاتِ نبوت کے سحر میں ڈوب گئے ہیں۔ تو وہ ایک دوسرے کی آڑ لیتے ہوئے وہاں سے کھسک جاتے ہیں۔ لیکن ان بدنصیبوں کو معلوم نہیں اُن کا مسجدِ نبوی سے کھسکنا درحقیقت اپنی قسمت کھو دینا ہے۔ چنانچہ وہاں سے نکلتے ہی اِن کے دلوں پر مہر لگانے کا فیصلہ ہو جاتا ہے اَب وہ چاہیں بھی تو راہِ راست کی طرف نہیں آسکتے۔ سلامتی کی طرف ہر راستہ اُن کے لیے بند ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے لیے اسباب انہوں نے خود پیدا کیے ہیں۔ جیسے جیسے اِن کا نفاق بڑھتا گیا ویسے ویسے اِن کا دل داغ داغ ہوتا گیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ اِن داغوں نے آئینۂ دل کو بالکل سیاہ کر دیا۔ اس طرح سے وہ آئینہ ناکارہ ہو کر اپنی آب و تاب کھو بیٹھا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝

(آچکا ہے تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول جس پر تمہارا ہلاکت میں پڑنا بہت شاق ہے وہ تمہارے ایمان کا حریص اور ایمان والوں کے لیے نہایت شفیق مہربان ہے۔ (۱۲۸) پس اگر وہ روگردانی کریں۔ تو اُن سے کہہ دو کہ مجھ کو اللہ کافی ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہے عرشِ عظیم کا۔ (۱۲۹)

ربطِ آیات:

سورۃ التوبہ کی یہ آخری آیتیں ہیں۔ آخر سورۃ میں اِن آیات کو لانے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اِس پوری سورۃ میں تمام کفار سے براءت کا اظہار فرمایا گیا ہے اور منافقین پر شدید تنقید فرمائی گئی ہے اور پھر دونوں گروہوں سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو سخت رویہ اختیار کرنے اور جہاد و قتال کا

Marfat.com

حکم دیا گیا ہے۔ اِن تفصیلات کو پڑھتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے بارے میں یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ آپ اللہ کے ایسے رسول ہیں۔ جن پر ہیبت اور رعب کا غلبہ ہے۔ آپ کفار کو سختی سے سیدھا کر دینا چاہتے ہیں اور آپ کی خواہش ہے کہ اللہ کی زمین پر کفر کا نام نہ رہنے دیا جائے حالانکہ قرآن کریم میں آپ کا تعارف رحمت اللعالمین کے نام سے کرایا گیا ہے۔ چنانچہ اِس غلط فہمی کو دور کرنے اور آپ کی اصل حیثیت واضح کرنے کے لیے یہ دو آیتیں لائی گئی ہیں۔

اِن آیتوں میں سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ لوگو! تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ نے تمہاری طرف اپنا آخری رسول بھیج دیا ہے ("رسول'') پر تنوین عظمت کے لیے بھی ہے اور اُس آخری رسول کی طرف اشارے کے لیے بھی جسے پہلی آسمانی کتابوں میں آخری آنے والا کہہ کر ذکر فرمایا گیا ہے۔ آخری رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین پر بسنے والے انسانوں پر اپنا آخری رسول بھیج کر اتمام حجت کر دینا چاہتا ہے اور وہ آخری قانون اور ضابطۂ حیات عطا فرما کر انسانوں کو پابند کر دینا چاہتا ہے کہ وہ اِسے اپنا دین اپنی شریعت اپنا طرزِ حیات اور اپنا قانون سمجھ کر اِس کے مطابق زندگی گزاریں اور مزید یہ کہ وہ رسول بھی انہیں میں سے بھیجا تا کہ اُس کی بات سمجھ لیں اُس کی مراد جان لیں اور اُس پر اعتماد کرنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ وہ چونکہ پہلے سے اِس بات سے آگاہ ہیں کہ آنے والا رسول انہیں کے سب سے محترم قبیلے کا ایک فرد ہے۔ وہ اُن کے سردار کا پوتا ہے۔ اُس نے زندگی کی چالیس بہاریں انہیں میں گزاری ہیں۔ اُس کا ایک ایک لمحہ اِن کی آنکھوں کے سامنے گزرا ہے۔ اُس نے انہیں کے ساتھ مل کر کاروبار کیے ہیں۔ انہیں کے جانے پہچانے خاندان میں شادی کی ہے۔ وہ حصولِ علم کے لیے کہیں باہر نہیں گیا اُس کا بچپن، لڑکپن اور جوانی انہیں میں اور انہیں کے ساتھ گزری ہے۔ اُس کی تربیت انہیں میں رہ کر ہوئی ہے۔ بااین ہمہ وہ اِن پتھروں کے ڈھیر میں چمکتے ہوئے ہیرے کی مانند ہے۔ اِس کی پوری قوم میں اُس کے سوا کوئی صاحب کردار نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ شرم وحیا سے واقف بھی نہیں اور وہ کنواری لڑکیوں سے زیادہ حیاء دار ہے۔ اُس کی سچائی اور امانت کا ایک ایک شخص معترف ہے۔ وہ جو زبان بولتا ہے وہ اِن کی زبان سے کہیں زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ وہ انہیں میں سے ہو کر سب سے نرالا اور سب سے اُجلا ہے۔ اِس لیے جب اُس نے اِن کے سامنے اپنی رسالت کا اعلان کیا اور اللہ کا پیغام پہنچایا۔ تو اپنے اعتقادات پر لڑنے مرنے والی قوم اُس کی دشمنی پر ضرور تل گئی لیکن کسی کو اُس کے کردار پر انگلی رکھنے کی جرأت نہ ہوئی کوئی اُس پر جھوٹ کا الزام نہ لگا سکا۔ اُس کی دل آویزی اور اثر اندازی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اُس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ اُس کے راستے میں کانٹے بچھائے اذیتیں پہنچائیں یا وہ گوئی کی۔ لیکن اُس کی تبلیغ و دعوت اور ہدایت کے لیے اُس کی گرم جوشی، غایت درجہ نرمی اور ہمدردی کے ساتھ ایک ایک کا دامن پکڑ کر سمجھانے کی کوشش میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ گالیاں دیتے، یہ دعائیں دیتا۔ وہ دھمکیاں دیتے وہ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی زبان میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا۔ لوگ اُس کا رویہ دیکھ کر حیران ہوتے کہ وہ اِن اُجڈ گنوار لوگوں کی زندگیاں بنانے کے لیے اتنے دکھ کیوں اٹھاتا ہے۔ قرآن کریم نے اِس آیت کریمہ میں فرمایا کہ وہ یہ سب کچھ اِس لیے کرتا ہے کہ وہ تمہارے لیے کسی تکلیف اور کسی خطرے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہارا ایک ایک دکھ اُس کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ وہ جانتا ہے اگر تم نے اُس کی بات نہ مانی۔ تو تمہاری دنیا بھی برباد ہو جائے گی اور آخرت میں بھی جہنم کا ایندھن بنو گے۔ وہ تمہیں خونِ جگر پی پی کر جہنم کی آگ سے بچانا چاہتا ہے۔ جس طرح ایک باپ بچے کی تکلیف دیکھ کر اپنے دکھوں کو بھول جاتا ہے۔ اِسی طرح اُس کیلئے بھی تمہاری ہر گمراہی گراں ہو جاتی ہے اور وہ تم کو ہر ممکن طریقے سے اُس سے نکالنا چاہتا ہے۔ وہ اس کے لیے صرف نصیحت کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر تمہارے لیے دعائیں کرتا ہے۔ کیونکہ وہ تمہاری بھلائی اور منفعت کے لیے انتہائی حریص ہے۔ جس طرح دنیا کی حرص آدمی کو بے قرار رکھتی ہے اِسی طرح انسانوں کے لیے ہدایت کی حرص اُسے بے چین رکھتی ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ تمہیں دنیا و آخرت دونوں کی کلفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ اور دونوں کی سعادتوں سے بہرہ مند دیکھنا چاہتا ہے۔ اُس نے تمہاری بھلائی کے لیے اپنی ہر ضرورت اور ہر فائدے کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اُس کی صحت اِسی راستے میں صرف ہو رہی ہے اُس نے اپنا تمام تر سرمایہ اِسی کے لیے جھونک دیا ہے۔ اِس کے لیے اُس نے تیرہ سال تک حق نصیحت ادا کیا ہے اور جب تم نے اُس کے لیے مکہ میں زندگی دشوار کر دی۔ تو وہ اُسی دولتِ بے کراں کو لے کر مدینے ہجرت کر گیا۔ وہاں بھی اُس کے شب و روز اِسی کشمکش میں گزارے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اُس کی محنتوں اور قربانیوں کو مثمر کیا اور ایمان لانے والوں کی اتنی بڑی تعداد وجود میں آ گئی۔ جن کی قوت اور فدائیت پر بھروسہ کر کے وقت کی قوتوں کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے تم میں سے اُن گروہوں کو جو بھلائی کی ہر بات کے دشمن تھے۔ قوت کے ذریعے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر مکہ فتح ہوا۔ آہستہ آہستہ

Marfat.com

جزیرہ عرب کی سرکش قوتیں سرنگوں ہوگئیں۔ اَب ضرورت اِس بات کی پیدا ہوئی کہ اِن صاحب ایمان لوگوں کے لیے ایک ایسا مرکز اور بیس تشکیل دیا جائے۔ جس میں اللہ کا دین مکمل صورت میں نازل ہو کر انسانوں کے لیے برکت اور روشنی کا سامان بنے۔ جہاں مسلمانوں کی نسلیں مکمل اسلامی تربیت سے آراستہ ہوں۔ اور اللہ کے دین کا یہ مرکز منبع رشد وہدایت کی صورت اختیار کر سکے۔ چنانچہ اِسی مقصد کو بروئے کار لانے اور اللہ کی رحمت سے لوگوں کو پوری طرح نوازنے کے لیے حکم دیا گیا کہ جزیرۂ عرب میں کوئی کافر باقی نہ رہے۔ تا کہ یہاں کے رہنے والے مسلمان ایمان کی بہار کے لیے کوئی خطرہ محسوس نہ کریں اور ساتھ ہی ساتھ اُمتِ مسلمہ کا ہراول تیار ہو جو باقی نوع انسانی تک اللہ کا پیغام پہنچانے کی تدبیر کر سکے۔ اِس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے لیے رؤف ورحیم ہے۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں۔ کسی اور نبی کے لیے اِن دونوں ناموں کو استعمال نہیں کیا گیا۔ آنحضرت کو اِن دونوں صفات سے متصف ٹھہرانے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صفاتِ الٰہی کے مظہر ہیں۔ رؤف رأفت سے ہے جس کے معنی میں ازالۂ شر غالب ہوتا ہے اور رحیم رحمت سے ہے۔ جس میں عطائے خیر کا پہلو نمایاں ہے۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جزیرۂ عرب میں جو عناصر حق اور اہل حق کے لیے شر کا باعث ہو سکتے ہیں۔ انہیں نکال باہر کیا جائے اور جن پر اللہ کی رحمت قربان ہوتی ہے۔ انہیں تحفظ دیا جائے۔ بلکہ انہیں اللہ کی رحمت دین کا مبلغ ومناد بنا دیا جائے۔ شائد اِسی وجہ سے حریص علیکم اور بالمومنین میں عطف نہیں لایا گیا تا کہ معلوم ہو کہ اِن دونوں باتوں میں کامل اتصال ہے۔ جزیرہ عرب سے تمام کفار کا نکالا جانا اِسی صفت کا مظہر ہے اور ایمان اور اہل ایمان کے لیے جزیرۂ عرب کو مستقر بنا دینا اِسی سبب سے ہے۔ لوگوں نے چوں کہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت اور حیثیت کو پوری طرح نہیں جانا اِس لیے وہ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے کہ آپ تو رحمت للعالمین بن کر آئے تھے۔ آپ کے اقدامات نے سختی اور شدت کی صورت کیوں اختیار کر لی ہے۔

آپ کی حیثیت واضح کر دینے کے بعد فرمایا جا رہا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ آپ کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں یہ اپنے کفر اور نفاق سے تائب نہیں ہوتے تو آپ اِس کی ہرگز پرواہ نہ کریں بلکہ آپ کی زبان پر یہ جملہ رہنا چاہیے کہ میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔ میں نے اُسی پر بھروسہ کیا ہے۔ اُس پر بھروسہ کرنے کے بعد کسی اور طرف دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ عرشِ عظیم کا رب ہے۔ اُس کا آستانہ چھوڑ کر کسی اور آستانے کی طرف دیکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خیال ہے کہ یہ دو آیتیں قرآن کریم کی آخری آیتیں ہیں۔ اِن کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی اور آنحضرت ﷺ کی وفات ہوگئی۔

احادیث مبارکہ میں اِن آیتوں کے بہت فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ انہی میں سے ایک فضیلت یہ ہے کہ حضرت ابو الدردا رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہے کہ جو شخص صبح وشام یہ آیتیں سات مرتبہ پڑھ لیا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام کام آسان فرما دیتے ہیں۔ (قرطبی)

صدق الله العظيم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ يُوْنُسُ

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ یُوْنُس

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اس سورۃ کا نام سورۃ یونس ہے سابقہ سورتوں کی طرح یہ نام محض شناخت کیلئے ہے۔ یہ سورۃ کا عنوان نہیں۔ اس سورۃ کی آیت نمبر 98 میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ اس لئے ان کے نام سے اس سورۃ کو علامت کے طور پر موسوم کر دیا گیا ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ یعنی ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اس سورۃ کے 11 رکوع ہیں اور اس کی آیات کی تعداد 109 ہے۔ اس میں 1832 کلمے اور 9999 حروف ہیں۔ بعض اہل علم نے اس سورۃ کی 3 آیتوں کو مدنی گمان کیا ہے لیکن یہ محض ایک سطحی قیاس ہے۔ سورۃ کے مضامین اور اس کے اسلوب پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ مکمل سورۃ ایک مربوط سورۃ ہے۔ مختلف مواقع پر نازل شدہ اور مختلف تقریروں کا مجموعہ نہیں۔ یہ یقیناً ایک وقت میں نازل ہوئی ہے اور یہ مکی دور کی سورۃ ہے۔

زمانۂ نزول

زمانۂ نزول کے بارے میں کوئی متعین روایت ذخیرۂ حدیث میں دستیاب نہیں، لیکن مضامین پر غور کرنے سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ یہ سورۃ مکہ معظمہ میں اس وقت نازل ہوئی ہے جب نبی کریم ﷺ کا پیغام اہل مکہ کے گھر گھر تک پہنچ چکا تھا۔ ہر سال حجاج کی آمد کے باعث کوئی قبیلہ ایسا نہ رہا تھا جو اسلام کے نام اور اس کے مجمل تصور سے بے بہرہ ہو۔ آنحضرت ﷺ کی مثبت دعوت مشرکین عرب کی تمام اصناف شرک پر تنقید کا آغاز کر چکی تھی۔ آپ ﷺ ہر طرح دلائل سے اپنی دعوت کو لوگوں کے دلوں تک اتارنے میں پوری کوشش صرف فرما رہے تھے۔ دعوت کا فطری انداز آپ ﷺ کی دلآویز شخصیت، آپ ﷺ کی گفتگو کا معجزانہ اسلوب اور اپنے دعوتی حقائق پر انتہا درجے کا ایمان و یقین اور مخالفین کی طرف سے اذیتوں پر غیر معمولی صبر و استقامت اہل مکہ کیلئے ایک چیلنج بنتا جا رہا تھا۔ وہ آپ ﷺ کے دلائل کے سامنے بے بسی محسوس کرنے لگے تھے۔ اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ مخالفت اور اذیت رسانی کے تمام ذرائع اور آلات کو میدانِ عمل میں لے آئیں۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ غریب صحابہؓ مشقِ ستم بنائے جا رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو تمسخر سے اڑایا جانے لگا تھا۔ قدم قدم پر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کیلئے دشواریاں پیدا کی جا رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاہلیت قدیمہ دلائل میں بے بس ہو کر اور اسلامی اثرات کو روکنے میں ناکام ہو کر اس دعوت کو قوت اور زور سے ختم کر دینے پر تُل گئی ہے۔ چنانچہ اگر ایک طرف اذیت رسانی میں تیزی آ رہی تھی تو دوسری طرف شکوک و شبہات کی فصل اگائی جا رہی تھی۔ عجیب و غریب اعتراضات اٹھائے جا رہے تھے۔ یہ دور معلوم ہوتا ہے ہجرت حبشہ کے قریب کا دور ہے۔

چنانچہ اگر ایک طرف اس سورۃ میں مسلمانوں کو ان کے برسرِ حق ہونے کی وجہ سے آنے والے دنوں کی سرفرازیوں اور اخروی نعمتوں کی خوشخبریاں سنائی جا رہی تھیں تاکہ مسلمان ان ناگفتہ بہ حالات سے بددل نہ ہونے پائیں تو دوسری طرف مشرکین مکہ کو بتایا جا رہا ہے کہ تمہیں اپنی جس قوت اور امارت پر ناز ہے اور جس کی وجہ سے تم اسلامی دعوت کو خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم سے پہلے ایسی قومیں گزر چکی ہیں جو اپنی امارت میں بے مثل اور قوت میں بے پناہ تھیں۔ جب انہوں نے اللہ کی طرف سے آنے والے نبیوں کے ساتھ تمہاری طرح بدسلوکی کی اور ان کی

Marfat.com

دعوت قبول کرنے سے انکار کیا تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ قدرت نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ قومِ نوح علیہ السلام ایک ایسے سیل کا شکار ہوئی جس نے نہ صرف ان کی بلکہ اس وقت کی معلوم دنیا کی جڑ اکھاڑ کر رکھ دی۔ فرعون نے اپنی قوت اور حشمت پر ناز کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بے بسی کا تمسخر اڑایا لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب عذاب حرکت میں آیا تو اس کی حکومت اور اس کی فوجیں اسے بحرِ قلزم کی موجوں سے نہ بچا سکیں۔ تم اگر اپنا رویہ نہیں بدلو گے تو تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے۔ چنانچہ انہیں راہ راست دکھانے کیلئے کبھی دعوت کا انداز اختیار کیا گیا ہے، کبھی فہمائش کا اور کبھی تنبیہ کا۔ اسی سلسلے میں کبھی ان کے اعتراضات کا جواب دیا گیا، کبھی ان کے اشتباہات دور کئے گئے، کبھی ان کے الزامات کے جواب کے ساتھ ساتھ انہیں ملامت بھی کی گئی اور کبھی ان کے غلط عقائد پر نہایت ہمدردی کے ساتھ تنقید فرمائی گئی۔

ان کا وہ عقیدہ جس نے تمام عقائد کی صحت کو دیمک کی طرح چاٹ لیا تھا وہ عقیدۂ شرک تھا۔ یہ ایک ایسی مہلک بیماری ہے جو نہ صرف انسان کو اس کی حقیقی قدر و منزلت اور مقام و مرتبہ سے محروم کر دیتی ہے بلکہ اس کی تمام صلاحیتوں اور تمام فطری قوتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ اس کی بنیاد چونکہ سراسر کج فہمی اور جمودِ فکر پر ہے۔ اس لئے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اور ایسی قوم غور و فکر کے سرچشموں سے اپنا تعلق توڑ لیتی ہیں۔ ان کا مذہب عصبیت کی چادر میں لپٹ کر رہنے ہی میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنے مصنوعی عقائد کی کوئی توجیہ جب عقل و خرد اور فطرت کے قواعد و ضوابط کے ذریعے کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں تو اب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ اس آئینے کو توڑ دیں جو انہیں اصل شکل دکھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ اس مہلک بیماری سے انہیں نکالنے کیلئے مکی سورتوں میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ دلائل آفاق بھی پیش کئے گئے ہیں اور دلائل انفس بھی۔ براہ راست دل کے دروازے پر بھی دستک دی گئی ہے اور عقل و خرد کے مقدمات سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس لئے اگر ہم اس سورۃ کے مباحث کو سمجھنا چاہیں تو اسے ہم ایک ترتیب سے شمار کر سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل تو پیش نظر سورۃ کے مشمولات سے ہوگی۔ البتہ ہلکا سا تاثر پیدا کرنے کیلئے انہیں یوں گنا جا سکتا ہے:

(1) ان غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان غفلتوں پر تنبیہ جو لوگوں کو توحید اور آخرت کا عقیدہ تسلیم کرنے میں مانع ہو رہی تھیں۔

(2) رسالت کے تصور کو واضح کرنے کیلئے بشریت اور رسالت کے بارے میں مشرکین کے غلط تصورات کی اصلاح۔

(3) آخرت کے حوالے سے ان کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب اور دوسری زندگی سے متعلق ان شبہات کا ازالہ جن کی وجہ سے ان کی عقلیں مسموم ہوئی جا رہی تھیں۔

(4) قرآن کریم پر ان کے اعتراضات کا جواب اور قرآن کریم جیسی ایک سورۃ ہی لے آنے کا چیلنج۔

(5) دنیا کے بارے میں ان کے غلط تصورات کا ابطال اور دنیا کی صحیح حقیقت کی وضاحت۔

(6) اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح تعارف اور اس میں غلطیوں کے در آنے کے نقصانات۔ اللہ کے نبی کی حقیقی صفات اور اس کے پیغام کی صحیح حقیقت۔ اللہ کی مشیت اور رضا میں فرق اور ایسے ہی دوسرے موضوعات جو انسان کی اصلاح کیلئے ازبس ضروری ہیں۔ ایک خاص ترتیب سے حسب ضرورت بیان کے ساتھ ساتھ پھیلتے چلے گئے ہیں۔

حالات اگرچہ تبلیغ و دعوت کے حوالے سے نہایت ناموافق تھے۔ بایں ہمہ سورۃ کے آخر میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی جو ہدایت لے کر آیا ہے اس میں کسی طرح کی تبدیل ممکن نہیں جسے دنیا و آخرت کی بھلائی عزیز ہو اسے بہرصورت اسی ہدایت کو آویزۂ گوش اور وظیفۂ عمل بنانا ہوگا اور اسی کے سائے میں زندگی گزارنا ہوگی۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ١٠٩	سُوْرَةُ يُوْنُسَ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ١١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿١﴾ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ
اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ
اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٢﴾ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ
الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿٣﴾ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ
حَقًّا ؕ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ
حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٤﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ
الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ
السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٥﴾ اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا

Marfat.com

خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ﴿۶﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا
بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ
بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِيْ
جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۹﴾ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ
فِيْهَا سَلٰمٌ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾

(''الف۔لام۔را'' یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔کیا لوگوں کو اس بات پر حیرانی ہے کہ ہم نے وحی بھیجی انہیں میں سے ایک آدمی کی طرف کہ ڈراؤ لوگوں کو اور اہل ایمان کو بشارت پہنچا دو کہ ان کیلئے ان کے رب کے پاس مرتبہ بلند ہے۔کافروں نے کہا بلاشبہ یہ ایک کھلا ہوا جادوگر ہے۔بے شک تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔یہی اللہ تمہارا رب ہے، پس تم اسی کی بندگی کرو۔کیا تم غور و فکر نہیں کرتے۔اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے۔پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تا کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان کو پورے انصاف کے ساتھ بدلہ دے اور جنہوں نے کفر کیا ان کیلئے کھولتا پانی ہے اور دردناک عذاب ہے۔بسبب اس کے کہ وہ کفر کرتے تھے۔وہی ہے جس نے سورج کو درخشاں اور چاند کو نور بنایا اور اس کیلئے منزلیں مقرر کیں تا کہ تم جان لو سالوں کا شمار اور حساب۔اللہ تعالیٰ نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا۔وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے اپنی قدرت کی نشانیاں ان لوگوں کیلئے جو جاننا چاہیں۔بے شک گردش لیل و نہار میں اور جو کچھ پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں اس قوم کیلئے جو متقی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا نارِ جہنم ہے۔ان برائیوں کی پاداش میں جن کا وہ اکتساب کرتے تھے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اعمال کرتے رہے، انہیں ہدایت کرے گا ان کا رب، ان کے ایمان کی وجہ سے، بہتی ہیں ان کے نیچے سے نہریں وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ پاک ہے تو اے خدا اور ان کی دعا اس میں (یہ ہوگی) سلامتی ہو، اور اس کی دعا کا خاتمہ اس پر ہوگا کہ ساری تعریف اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔

Marfat.com

الٓرٰ قف تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْحَکِیْمِ ۝ اَکَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی رَجُلٍ مِّنْھُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَھُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّھِمْ ؕ قَالَ الْکٰفِرُوْنَ اِنَّ ھٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِیْنٌ ۝

(''الف۔لام۔را'' یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔کیا لوگوں کو اس بات پر حیرانی ہے کہ ہم نے وحی بھیجی انہیں میں سے ایک آدمی کی طرف کہ ڈراؤ لوگوں کو اور اہل ایمان کو بشارت پہنچا دو کہ ان کیلئے ان کے رب کے پاس مرتبہ بلند ہے۔کافروں نے کہا بلاشبہ یہ ایک کھلا ہوا جادوگر ہے۔) ﴿یونس:۲۔۱﴾

''الٓـر'' یہ حروف مقطعات میں سے ہے۔مختلف سورتوں کے شروع میں قرآن کریم نے یہ حروف استعمال کئے ہیں۔اس کا معنی اور مفہوم کیا ہے یا متکلم کی اس سے مراد کیا ہے۔ہم سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ کے آغاز میں اس پر ایک جامع بحث کر چکے ہیں۔بہتر ہے کہ اس بحث کو وہاں دیکھ لیا جائے۔اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ ایک حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔

ایک تنبیهه

یہ آیت دفع دخل مقدر کے طور پر ایک تنبیہ معلوم ہوتی ہے۔اس سورۃ کے نزول کے وقت مشرکین مکہ کی مخالفت جو رنگ اختیار کر چکی تھی اس کو دیکھتے ہوئے اس تنبیہ کو سمجھنا مشکل نہیں،لیکن اگر اس صورتحال کو سامنے نہ بھی رکھا جائے جب بھی اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر یہ تنبیہ نہ صرف سمجھ میں آنے والی بات ہے بلکہ نہایت ضروری بھی ہے۔مشرکین مکہ کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ اس کتاب کی آیات کو لوگوں تک پہنچنے نہ دیا جائے اور اگر کسی طرح پہنچ ہی جائیں تو دل و دماغ میں پہلے سے شک و ارتیاب کے ایسے کانٹے بو دیئے جائیں جو اس پر غور کرنے کی مہلت ہی نہ دیں۔ویسے بھی ہر وہ نظریہ اور اس پر مشتمل کتاب جو انقلاب کا پیغام لے کر آتی اور انسان کی فکری اصلاح کیلئے اٹھتی ہے۔اہل دنیا نے ہمیشہ اسے بدگمانیوں کے غبار میں چھپا دینے کی ناپاک کوششیں کی ہیں اور اس کیخلاف اتنی دھول اڑائی ہے کہ اس کتاب یا اس نظریئے کو پیش کرنے والا اپنی جدوجہد کا بیشتر حصہ اس غبار کو صاف کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔قرآن کریم چونکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس کا بھیجنے والا انسانی فطرت سے بھی واقف ہے اور انسانوں کے مخفی ارادوں کو بھی جانتا ہے۔اس لئے اس نے بجائے ان کے لایعنی خیالات اور اعتراضات کو دور کرنے کے آغاز گفتگو ہی میں دوٹوک بات فرمائی ہے اور اس کے بعد اٹھائے جانے والے اعتراضات کا ایک ایک کر کے جواب دیا ہے۔اس آیتِ کریمہ میں نہایت کانٹے دار جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم نے اس کتاب کے لانے والے کے بارے میں جو سوالات اٹھائے ہیں ہم ان کا جواب تو بعد میں دیں گے لیکن تم سب سے پہلے اس بات کو جانو کہ اس کتاب کی حیثیت کیا ہے۔یہ کتاب،کتابِ حکیم ہے۔اس کی ایک ایک آیت میں حکمت کے خزانے مخفی ہیں۔اس کا پیش کردہ نظام ہر طرح کے تضادات سے معرا ہے۔اس کی ایک ایک بات میں انسانی مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو ظن و گمان نہیں بلکہ یقین کی دولت عطا کرتی ہے۔اس کی ہر نصیحت اور اس کا ہر حکم اپنے پیچھے حقیقت کی قوت،حقانیت کا نور اور نتائج کی فطری واقعیت رکھتا ہے۔تم اس کے لانے والے کے بارے میں اگر یکسو نہیں ہو تو ابھی اس بحث کو اٹھائے رکھو۔اس وقت تم سب سے پہلے قرآن کریم کی آیات کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرو۔اگر تم نے ان آیات کے مضمر حقائق کو جان لیا اور اس کے دروبست کو سمجھ لیا تو تمہارے ذہن کا جھاڑ جھنکار خود بخود چھٹ جائے گا کیونکہ اس کے اندر حکمت و دانش کا جو خزانہ ہے وہ خود تمہیں اپنی طرف کھینچ لے گا۔

دین رحمت هے جس پر شکر واجب هے

دوسری آیتِ کریمہ میں مشرکین مکہ کے اظہار تعجب کا ذکر کیا جا رہا ہے جسے انہوں نے اعتراض کی صورت دے رکھی تھی۔ان کے اعتراض کے مختلف پہلو تھے۔اعتراض کا ایک پہلو یہ تھا کہ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ محمد ﷺ یہ کہتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے تاکہ میں لوگوں کو خبردار کر دوں اور ان پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دوں کہ تم نے جس طرح خودرو پودوں کی طرح زندگی گزارنا شروع کر رکھا ہے کہ نہ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد ہے اور نہ تمہاری زندگی کی کوئی منزل۔تم خود بخود وجود میں آئے ہو اور ایک دن خودرو پودے کی طرح مل دل کر ختم ہو جاؤ گے۔اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں اور زندگی میں کئے ہوئے اعمال کے بارے میں کہیں جوابدہی نہیں حالانکہ تم دیکھتے ہو کہ یہاں ہر مخلوق کی زندگی کا ایک مقصد ہے اور وہ

Marfat.com

مخلوق مقصد کے حصول میں ہمہ تن مشغول ہے۔ سورج کا کام روشنی دینا، سمندر کی بھاپ اٹھانا، ابر کی چادریں بچھانا، غلے کو پکانا اور موسموں کو وجود دینا ہے۔ چاند کا کام پھلوں میں مٹھاس پیدا کرنا اور غلے میں گداز پیدا کرنا ہے۔ زمین انسان کیلئے بستر بنادی گئی ہے اور اس کی قوت روئیدگی کے خزانے انسانی نفع رسانی کیلئے لٹائے جارہے ہیں۔ اسی طرح باقی مخلوقات بھی مقصد کی ادائیگی میں شب وروز کوشاں ہیں۔ کلی چٹکتی ہے، پھول مہکتا ہے، ستارے ٹمٹماتے ہیں، پانی سیرابی کا کام کرتا ہے، آگ چولہے جلاتی ہے، غلہ بھوک مٹاتا ہے۔ ہر مخلوق کی جبلت اور فطرت میں اس کے مقصد کا شعور ودیعت کردیا گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ تکوینی کے تحت اس کے بجالانے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح انسان کو بھی زندگی کے مقاصد دیئے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ان مقاصد کی ادائیگی کرے۔ جب وہ خواہشات اور غلط مزعومات کے دباؤ میں آکر زندگی کے مقاصد سے انحراف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے تو وہ اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کا ساز وسامان کرتا ہے۔ اللہ کی اس رحمت پر انسان جتنا بھی شکر بجالائے تھوڑا ہے لیکن اس کی بے بصیرتی کا کیا کہنا کہ بجائے شکر بجالانے کے اس پر اظہارِ تعجب کرنا اور اعتراض اٹھاتا ہے۔

مشرکین کا اعتراض اور اس کا جواب

مشرکین مکہ کے اعتراض کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اگر اللہ کو ہماری بھلائی منظور ہے اور وہ ہماری اصلاح چاہتا ہے تو اس کیلئے کسی فرشتے کو بھیجا جاتا یا کوئی اور غیر معمولی انتظام کیا جاتا جس کے غیر معمولی ہونے سے انسانوں کو یقین آجاتا کہ یہ واقعی اللہ کی جانب سے ہے لیکن اس پر جتنا بھی تعجب کیا جائے تھوڑا ہے کہ ہمارے اندر سے ہم جیسے ایک انسان کو رسول بنا کر کھڑا کردیا گیا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ انسان اپنے فکر وعمل کے اعتبار سے اپنے اندر کوئی خوبی نہیں رکھتا بلکہ مزید ستم یہ ہے کہ انسان خواہشات اور منفی جذبات کا جو طوفان اپنے جلو میں لئے پھرتا ہے اسے دیکھتے ہوئے کون تصور کرسکتا ہے کہ ہمارے جیسا ایک آدمی اللہ کا اتنا مقرب ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام اس کے دل پر اتارے اور اسے انسانوں کیلئے رسول بنادیا جائے۔ مشرکین مکہ کا تعجب درحقیقت دو باتوں کی وجہ سے تھا۔ ایک تو یہ بات کہ ان کے نزدیک انسان حقیقت میں نہایت فروتر چیز تھا۔ مخلوقات میں اس کا کوئی قابل قدر مقام و مرتبہ نہیں۔ جسم کے اعتبار سے اس سے بڑی بڑی مخلوقات موجود ہیں۔ صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کا کوئی خاص مقام نہیں۔ پاکیزگی اور تقدس کے اعتبار سے فرشتوں کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کہاں رسالت کا مقام اور کہاں بشریت کا مقام، ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ یہ خلجان صرف مشرکین مکہ کو ہی لاحق نہیں ہوا بلکہ بیشتر قومیں اس کی زد میں رہیں۔ بنائے فساد یہ بات رہی ہے کہ وہ رسالت کو اللہ کے قرب کے باعث نہایت عظیم اور بے حد مقدس مقام سمجھتے تھے اور اس میں وہ یقیناً حق بجانب تھے لیکن بشریت کے حوالے سے ان کے خیالات نہایت پست واقع ہوئے تھے۔ ان کے یہاں بشر ابوجہل اور ابولہب کا نام تھا اور ان کی دنیا ایسے ہی بشروں اور انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ رسالت کا بلند مقام اور بشریت کا یہ انحطاط آپس میں کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا اور یہی چیز ان کیلئے باعث تعجب تھی۔ قرآن کریم نے مختلف جگہ تاریخ میں گزرنے والی مختلف قوموں کے حوالے سے اس اعتراض کا ذکر کیا اور یہ بتایا ہے کہ یہ برائی اور گمراہی نئی نہیں، اس کی تاریخ بہت طویل ہے حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں ان میں چار مخلوقات سب سے اعلیٰ ہیں۔ (1) فرشتے، (2) حیوان، (3) انسان اور (4) جنات۔ حیوان تو غیر مکلف مخلوق ہے۔ اس لئے اس کا تو ذکر ہی کیا؟ جنات اور فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو مسجود بنا کر تمام مخلوقات سے برتر ہونے کا اعلان کردیا۔ اس سے بڑھ کر حماقت کی بات اور کیا ہوگی کہ وہ مخلوق جو تمام عزت والی مخلوقات میں افضل اور برتر ہے اسے چھوڑ کر کسی دوسری مخلوق کو نبوت دے دی جاتی۔ اب رہی یہ بات کہ انسان ہمیشہ ایسے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے اور ایسے کارنامے انجام دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عزت کا مستحق نہیں لیکن یہ نہایت سطحی سی بات ہے اس لئے کہ ایسے انسانوں کی کمی نہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے بھیجے ہوئے دین کی گواہی دیتے ہوئے اپنی جانیں دے دیں، اپنے بچے قربان کئے اور زندگی کی ہر راحت اس پر قربان کردی۔ محض اسی کے نام کی سربلندی کیلئے ایثار اور استقامت کے وہ چراغ روشن کئے جن کی روشنی آج بھی راستہ دکھا رہی ہے۔ انسان درحقیقت وہی ہیں۔ ویسے ہی انسان پیدا کرنا ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے پیشِ نظر رہا ہے۔ انسان جب بگڑ کر حیوان سے بھی بدتر سطح پر اتر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اپنی کتابیں بھیجتا ہے تاکہ بگڑے ہوئے انسانوں کی اصلاح کرکے انہیں حقیقی انسان بنایا جائے۔ عرب معاشرے سے بڑھ کر کوئی معاشرہ

Marfat.com

بھی بگڑا ہوا نہیں تھا لیکن آنحضرت ﷺ کی کوششوں سے ایسے انسان تیار ہوئے کہ فرشتے بھی ان کے دامن میں نماز پڑھنا فخر محسوس کرتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی نے بالکل ٹھیک کہا:

درفشانی نے تری قطروں کو دریا کردیا
دل کو روشن کردیا آنکھوں کو بینا کردیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کردیا

قرآن کریم نے ایک دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلاتے ہوئے دوسری جگہ فرمایا کہ اگر زمین میں بسنے والے فرشتے ہوتے تو ہم ان کی طرف یقیناً کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے لیکن زمین میں بسنے والے چونکہ فرشتے نہیں انسان ہیں اس لئے ان کی اصلاح کیلئے انسان ہی کا آنا ضروری تھا کیونکہ اصلاح کے عمل کیلئے جانبین میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ فرشتوں کو بھوک نہیں لگتی، انہیں پیاس پریشان نہیں کرتی۔ وہ کیسے سمجھ سکتے ہیں کہ روزے کی افادیت کیا ہے۔ فرشتے کبھی بیمار نہیں ہوتے، وہ کبھی زخمی نہیں ہوتے۔ انہیں کیا خبر کہ صبر کسے کہتے ہیں۔ ان کے اندر احساسات اور خواہشات نہیں رکھے گئے۔ وہ احساسات کی شدت اور خواہشات کی گرفت کو کیسے جان سکتے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ ان کی گرفت سے بچ نکلنے کا راستہ کیا ہے۔ اگر ان کے کسی فرد کو انسانوں کی اصلاح کیلئے بھیجا جاتا تو غور کیجئے کہ وہ انسان کی اصلاح کیسے کرتے اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں نوری مخلوق بنایا ہے، وہ گناہ سے معصوم رکھے گئے ہیں تو گناہوں سے بچنے اور خواہشات پر قابو رکھنے کیلئے وہ انسانوں کو کیا اسوہ اور نمونہ مہیا کرتے۔

ایک پہلودار بات

وہ ایک اور پہلودار بات بھی کہتے تھے کہ اگر کسی انسان ہی کو رسول بنا کر بھیجنا تھا تو ایسے انسان کو رسول بنایا جاتا جس کی حیثیت عرفی کو تسلیم کی سند حاصل ہوتی۔ وہ کوئی بڑا مالدار آدمی ہوتا یا کسی خاندان کا سردار ہوتا۔ وہ عموماً طائف کے سرداروں کی طرف انگلی اٹھاتے کہ اگر کسی کو رسالت مل سکتی تو یہ لوگ اس قابل تھے کہ ان کو رسالت دی جاتی۔ محمد ﷺ کو رسالت کیوں دی گئی؟ وہ یتیم پیدا ہوئے۔ لڑکپن ہی میں ہر سہارا چھوٹ گیا، بکریاں چرا کر آپ ﷺ نے اپنا معاش پیدا کیا۔ ان کے والد نے معمولی وراثت کے سوا کوئی مال نہیں چھوڑا۔ بڑے ہوئے تو دوسروں کا مال لے کر تجارت شروع کی۔ آخر ان میں ایسی کیا خوبی ہے کہ سب کو چھوڑ کر ان کو رسول بنایا گیا۔ "رسول" کو نکرہ لا کر ایک خاص بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ دولت مند ہونا یا کسی قبیلے کا سردار ہونا یہ ایسی صلاحیت نہیں جو نبوت کے بوجھ کو اٹھا سکے۔ نبوت اور رسالت کیلئے اللہ اسے چنتا ہے جو انسانی خصائص اور ملکوتی صفات کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتا ہے۔ انسانیت جس پر فخر کرتی ہے جو بگڑے ہوئے انسانی پتھروں کے ڈھیر میں ہیرے کی طرح چمکتا ہے، جو مشرکوں میں توحید کی مثال ہوتا ہے، جو اخلاق سے عاری معاشرے میں مکارمِ اخلاق کا نمونہ اور پاکیزگی کا مجسمہ ہوتا ہے۔ شرم وحیاء سے بے بہرہ انسانوں میں ایسا حیاء دار ہوتا ہے کہ کنواری لڑکیاں بھی اس کی پاکدامنی کی قسم کھاتی ہیں۔ جس معاشرے میں بداخلاقی کا تعفن پھیلا ہوا ہے اس میں بلند ترین صفات کی خوشبو کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ انسانیت کی ہر خوبی کیلئے اس کی مثال دی جاتی ہے۔ اگر یہی فضائل اور صفات ہیں جو کسی انسان کو حقیقی انسان بناتے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے قابل بناتے ہیں تو بتاؤ ان صفات کی حامل ذات محمد کریم ﷺ کے سوا اور کون ہے۔ تمہیں ان کے رسول ہونے پر کس لحاظ سے تعجب ہے بلکہ تمہارے لئے یہ بات باعث اطمینان ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کو اپنا رسول بنایا ہے جو تمہارے ہی ایک عظیم خاندان یعنی قریش کا چشم و چراغ ہے۔ تمہارے ہی رشتوں میں سے کسی نہ کسی رشتے سے اس کا تعلق ہے۔ تمہارے سامنے اس کے شب و روز گزرے ہیں۔ تم اس کی زندگی کے ایک ایک ورق سے واقف ہو۔ تمہارا ایک ایک فرد گواہی دیتا ہے کہ وہ الامین اور الصادق ہے۔ اس کی پوری زندگی امانت اور صداقت کی تصویر ہے۔ اگر تمہیں عصبیت نے اندھا نہ کردیا ہوتا تو تم آگے بڑھ کر اس کا علم اٹھاتے اور اس پر ایمان لانے اور اطاعت کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ یہ تمہاری کوتاہ فکری ہے کہ جو باتیں تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور آنحضرت ﷺ کے رسول ہونے کی دلیل تھی تم نے انہیں کو اعتراض بنا لیا۔

Marfat.com

آپ کی بعثت کا مقصد

"اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ" یہ ہے وہ مقصد جس کیلئے نبی کریم ﷺ دنیا میں تشریف لائے۔ اہل دنیا جب غفلت کے اندھیروں میں ڈوب جاتے ہیں اور ہوائے نفس کا اتباع ان کا چلن بن جاتا ہے، خواہشات کا حصول ان کی منزل ٹھہرتا ہے، بہیمانہ خصائص انسانی صفات کی جگہ لے لیتے ہیں تو پھر انسان ایک طرف اگر اللہ تعالیٰ سے کٹ جاتا ہے تو دوسری طرف باہمی انسانی تعلقات شکست و ریخت کا شکار ہو جاتے ہیں، حقوق و فرائض کی صف لپیٹ دی جاتی ہے، طاقت معاشرے کا قانون بن جاتی ہے، رشتے اپنا تقدس کھو دیتے ہیں، زندگی اپنے ہر حُسن سے محروم ہو کر تباہی کے راستے کی مسافر بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے تو انسانوں کی اصلاح اور بھلائی کیلئے اللہ تعالیٰ اپنا رسول بھیجتا ہے۔ وہ دوبارہ انسانوں کو اللہ کے آستانے کی طرف بلاتا ہے۔ وہ زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر انسان کی دنیا اور آخرت کو سنوارنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ انہیں انذار کرتا اور خبردار کرتا ہے کہ تم تباہی کے جس راستے پر بھاگتے جا رہے ہو، اگر تم نہ رکے اور تم نے پلٹنے کی کوشش نہ کی تو تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ ہر پیغمبر اسی مقصد کیلئے دنیا میں تشریف لاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ بھی اسی فرض کی ادائیگی کیلئے تشریف لائے تا کہ لوگوں کو آنے والے خطرات سے خبردار کر دیں کہ تم جس طرح اپنی من مرضی کی زندگی گزار رہے ہو اور تمہیں احساس ہی نہیں کہ تمہارا کوئی آقا اور اِلٰہ بھی ہے جس نے تمہیں زندگی گزارنے کا ایک ضابطہ عطا فرمایا ہے اور ایک دن وہ تم سب کو زندہ کرے گا اور تم میں سے ہر ایک سے پوچھے گا کہ بتاؤ تم زندگی کیسے گزار کے آئے ہو۔ اگر تم نے آج اپنی تیاری نہ کی تو سوچ لو تمہارا انجام کیا ہوگا۔ کیونکہ تم یہاں ہمیشہ تو نہیں رہو گے، ہر ایک کو ایک نہ ایک دن یہاں سے کوچ کرنا ہے کیونکہ:

کہ سب قافلہ یاں سے ہے جانے والا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

اور ساتھ ہی آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ مجھ پر ایمان لائیں گے اور اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ضابطہ حیات کے مطابق زندگی گزاریں گے میں انہیں بشارت دینے کیلئے آیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں بلند مرتبہ عطا فرمائے گا۔ "قَدَمَ صِدْقٍ" کا معنی ہوتا ہے بلند مرتبہ کیونکہ قدم تو قدم ہی کے معنی میں ہے یعنی مرتبہ، اور صدق رسوخ، استحکام اور تمکن پر دلیل ہے۔ یعنی ایمان لانے والوں کو اللہ تعالیٰ ایسے عزت کے مقام، بلند مرتبہ اور لازوال سرفرازی سے نوازے گا کیونکہ آنحضرت ﷺ پر ایمان، توحید کا اقرار، آخرت پر یقین اور شریعت کی پابندی جس طرح آخرت میں سرخروئی کا باعث ہے، اسی طرح دنیا میں بھی بہتر زندگی اور عزت کا مقام انہیں حقائق سے وابستہ ہے۔ تاریخ بھی شاہد ہے کہ جب بھی انسان نے اللہ تعالیٰ کے دین کو اپنایا، اس کے رسولوں کی اطاعت کی اور زندگی اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے گزاری تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جس طرح آخرت میں سرخرو فرمایا، اسی طرح دنیاوی سرفرازیاں بھی ان کے قدموں کی خاک بن گئیں۔

آپ کے کمالات کو سحر کہا گیا

"وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ۔" اور کافروں نے کہا کہ یہ شخص تو کھلا جادوگر ہے۔ کافروں کو ایک تو تعجب اس بات پر تھا کہ ایک بشر اور انسان اللہ کا رسول کیسے ہو گیا۔ رسالت ایک بہت بلند مرتبہ ہے اور بشریت نہایت فروتر چیز ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بشر جیسی فروتر مخلوق اللہ کی رسالت اور پیغام بری کی حامل ٹھہرے اور دوسرا تعجب انہیں اس بات پر تھا کہ ایک ایسا شخص جو انہیں میں پیدا ہوا، انہیں میں پلا بڑھا، انہیں کے ماحول میں اس نے تربیت پائی، انہیں کے معروفات اور منکرات سے آگاہی حاصل کی۔ اسی معاشرے کی اچھائیوں اور برائیوں کا وہ وارث بنا لیکن انتہائی تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کی خوبیاں، اس معاشرے میں ناپید دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے کردار کا اجلا پن کہیں اور نظر نہیں پڑتا۔ اس معاشرے کی برائیاں اسے چھو کر بھی نہیں گزریں۔ وہ معاشرہ اپنے اندر علم کی کوئی خوبی نہیں رکھتا اور یہ شخص اپنی زبان سے ایسے جواہر پارے اگل رہا ہے جس کی مثال کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ وہ ایسی علم و حکمت کی باتیں قرآن کی شکل میں لوگوں کے سامنے بیان کر رہا ہے جس کی خبر دنیا میں کسی ایک شخص کو بھی نہیں۔ اس کی زبان سے فصاحت و بلاغت کے پھول جھڑتے ہیں۔ حکمت کا سوتا پھوٹتا ہے۔ آنے والی دنیا کے بارے میں اس تیقن سے بات کہتا ہے۔ گویا وہ اس کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا موہ لینی والی بھی ہے اور حیران کر دینے والی بھی۔ ان تمام باتوں سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی بجائے

Marfat.com

ان کے نفس امارہ نے انہیں یہ سمجھایا کہ یہ کردار کی پاکیزگی غیر معمولی فصاحت و بلاغت بیان و دہن کی شیرینی عالم بالا اور عالم آخرت کی خبریں یہ اس شخص کے رسول ہونے کی دلیل نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک بہت بڑا جادوگر ہے۔ اس کا لاجواب کر دینے والا کلام درحقیقت ایک شعبدہ بازی ہے۔ اس کے غیر معمولی کمالات سحر کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح سے وہ درحقیقت لوگوں میں آنحضرت ﷺ کے کمالات اور آپ ﷺ کی تبلیغ و دعوت کی تاثیر اور آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کی اثر آفرینی کا توڑ کرنا چاہتے تھے۔ وہ جب دیکھتے کہ لوگ اس سے اثر قبول کرتے ہیں تو وہ اسے بے اثر کرنے کیلئے انہیں یقین دلاتے کہ ان میں کوئی بات بھی حقیقت نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک جادو ہے جو کسی بھی چیز کو کچھ سے کچھ بنا کے دکھا سکتا ہے۔ الفاظ کی شعبدہ بازی ہے جو وقتی طور پر سننے والے کو حیران کر دیتی ہے۔ اس طرح سے ان کی کوشش یہ ہوتی کہ اپنے عوام کو آنحضرت ﷺ اور قرآن کی تاثیر سے بچایا جائے حالانکہ ان کے شرفاء بھی یہ بات جانتے تھے کہ قرآن کریم ایک غیر معمولی کتاب ہے۔ اس کے الفاظ، اس کے جملے، جملوں کی ترکیب، اس کے محاورات، اس کا انداز بیان، اس کا دروبست، اس کی ضرب الامثال، اس کی تلمیحات، اس کے بیان کی ندرت، اس کے خطبات کی اثر آفرینی، ان میں سے ایک ایک بات زبان و بیان کے تیور شناس کو متاثر کر دینے کیلئے کافی تھی۔ عرب اپنی تمام برائیوں کے باوجود زبان و بیان کی خوبیوں سے واقف تھے۔ اس لئے کوئی بھی اچھا قصیدہ کوئی بھی نثری شہ پارہ یا کوئی فصیح و بلیغ خطبہ اس کیلئے جادو کا اثر رکھتا تھا۔ قرآن کریم چونکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اس لئے اس کے اندر زبان و بیان کی ایسی خوبیاں جمع تھیں جس نے اس کو معجز بنا دیا تھا۔ عرب اس کو سمجھتے تھے لیکن ان کی عصبیت اور جاہلیت پر ضد، انہیں ادھر آنے نہیں دیتی تھی۔ اس لئے جب بھی انہیں کوئی اس صورتحال سے نکلنے کا سہارا نظر آتا تو فوراً اسے قبول کر لیتے۔ چنانچہ ان کے گمراہ کرنے والے لیڈروں نے جیسے ہی ان کو یہ سہارا دیا کہ یہ سب کچھ شعبدہ بازی اور سحر کا کمال ہے تو انہوں نے اسے اپنے لئے کافی سمجھا۔

ساحر کی پھبتی آپ ﷺ پر چسپاں نہیں ہوتی

مشرکین مکہ نے آنحضرت ﷺ کو جادوگر قرار دے کر اپنے تئیں آپ ﷺ کی شخصیت اور آپ ﷺ کے پیغام کی اثر آفرینی کو بے اثر کر دیا تھا لیکن وہ یہ بات سمجھ نہ سکے کہ ساحر اور جادوگر کی پھبتی آنحضرت ﷺ پر کسی طرح بھی چسپاں نہیں ہوتی اور اگر کسی پر ایسی پھبتی کسی جائے جو اس کے حسب حال نہ ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کہنے والا نہایت نامناسب آدمی ہے۔ یہی حال مشرکین مکہ کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ ان میں اتنی عقل نہیں کہ وہ پھبتی کسنے سے پہلے تقابل و تطابق کر کے دیکھ لیں کہ کیا ہم جو کر رہے ہیں یہ جامہ آپ ﷺ پر راست بھی آتا ہے یا نہیں۔ مشرکین مکہ نے آپ کو جادوگر ان معنوں میں قرار دیا تھا کہ آپ ﷺ کی شخصیت دلوں میں اترتی جاتی ہے اور آپ ﷺ کا کلام دماغوں میں اپنی جگہ بنائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ غیر معمولی تاثیر یقیناً کسی جادو کا نتیجہ ہے حالانکہ وہ یہ بات بھول گئے کہ جادوگر محض دنیا بنانے اور اپنے مفادات کے حصول کیلئے جادو کا کھیل کھیلتے ہیں۔ ان کا ذاتی کردار نہایت قابل نفرت ہوتا ہے۔ ان کے دائیں بائیں رہنے والے لوگ برے طور اطوار کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اپنی دنیا بنانے کے سوا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کا نبی اپنی دعوت کے نتیجے میں دنیا بناتا نہیں بلکہ اپنی دنیا اجاڑتا ہے۔ وہ لوگوں سے منفعت حاصل نہیں کرتا بلکہ لوگوں کی سیرت و کردار کی تعمیر کرتا ہے۔ جو شخص اس کے جتنا قریب ہوتا ہے وہ اتنا ہی ارفع و اعلیٰ مقاصد کا حامل اور مصفا و مجلا سیرت و کردار کا پیکر ہوتا ہے۔ اس کی ذات ایثار و قربانی کی پیکر اور لوگوں کی بھلائی کی حریص ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی اذیت رسانیوں کو صرف اس لئے خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے تاکہ لوگ اس کے جذبۂ ہمدردی اور خیر خواہی سے متاثر ہو کر راہ راست اختیار کر لیں۔ وہ اپنا وقت، اپنا مال حتیٰ کہ بعض دفعہ پوری زندگی لوگوں کی ہدایت کیلئے صرف کر دیتا ہے۔ اس کے دن لوگوں کو سمجھاتے گزرتے اور راتیں ان کیلئے دعاؤں میں گزرتی ہیں۔ ایسی ذات عزیز کو جادوگروں سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کے کمالات شعبدہ بازی نہیں بلکہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم کا ظہور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جادو کا جواب ممکن ہوتا ہے اور اس کا توڑ کیا جا سکتا ہے لیکن پیغمبر کا معجزہ عاجز کر دینے والا ہوتا ہے اور اس کے کمالات حرف آخر ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں حجت بن کر آتا ہے۔ اس کی شخصیت اور اس کے پیغام سے دنیا پر اتمام حجت کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے اس کا وجود اہل دنیا کیلئے روح کی مانند ہوتا ہے کہ اسی سے ان کی زندگی وابستہ ہوتی ہے اور اگر خدانخواستہ لوگوں نے بدنصیبی کا راستہ اختیار کیا تو موت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ ان حقائق کو دیکھتے ہوئے جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے نبی پر ساحر کی پھبتی کستا ہے اس سے زیادہ کم عقل اور متعصب کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْ م بَعْدِ اِذْنِهٖ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۳﴾

(بے شک تمہارارب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو 6 دنوں میں پیدا فرمایا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے۔ اس کے ہاں اس کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے، پس تم اسی کی بندگی کرو۔ کیا تم غور وفکر نہیں کرتے۔)

گزشتہ آیت میں پروردگار نے آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ آپ لوگوں کو انذار کریں اور جو ایمان لے آئیں انہیں بشارت دیں۔ پیش نظر آیت کریمہ میں آنحضرت ﷺ کے فریضۂ منصبی کی دلیل دی جارہی ہے۔ جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو بے سبب نہیں بھیجا اور یہ آخری رسول بھی یونہی نہیں چلے آئے بلکہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس کے انجام دینے کیلئے اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے ہیں اور اسی کیلئے خاتم النبیین ﷺ تشریف لائے ہیں۔ اس حقیقت کو بیان کرنے سے پہلے تمہیدی طور پر دو باتیں عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

تمہید

(1) قرآن وسنت سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ انسانی زندگی کی اچھائی اور برائی اور اس کے حسن وقبح کا دارومدار انسانی افکار میں ان خیالات اور تصورات پر ہے جو دلوں میں ایسی جگہ بنالیتے ہیں کہ وہ نکالے بھی نہیں نکلتے۔ یعنی وہ انمٹ تصورات اور ناقابل تغیر خیالات جو انسان کو وراثت میں ملتے ہیں یا معاشرہ اس کے سپرد کرتا ہے یا تعلیم وتربیت سے دلوں میں راسخ ہوجاتے ہیں یا ہر آدمی کا اپنا مطالعہ بعض خیالات کو دل میں پیوست کردیتا ہے۔ چنانچہ یہی تصورات اور خیالات ہر انسان کی زندگی میں حکمرانی کرتے ہیں۔ وہ جب تک ان خیالات کے زیر اثر رہتا ہے اسی طرح کے اعمال اس سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص روڈ ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں سڑک پر بے ہوش پڑا ہے اور زخموں سے بری طرح گھائل ہے۔ اچانک ایک آدمی وہاں پہنچتا ہے، اس کی نازک حالت دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس کی جیب ٹٹولتا ہے۔ اس میں جو کچھ ہاتھ آتا ہے نکال لیتا ہے، پھر اس کی کلائی دیکھتا ہے اور اس کی گھڑی اتار لیتا ہے، پھر دائیں بائیں نظر ڈالتا ہے۔ جب مطمئن ہوجاتا ہے کسی نے اسے نہیں دیکھا تو وہ وہاں سے غائب ہوجاتا ہے۔ ایک دوسرا شخص آتا ہے۔ وہ بھی اس کو بے ہوش دیکھ کر اس کی طرف سرسری سا متوجہ ہوتا ہے، ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتا ہے اور اپنی راہ لیتا ہے۔ اس کے بعد ایک تیسرا شخص وہاں پہنچتا ہے۔ جیسے ہی اس کی نظر اس زخمی پر پڑتی ہے تو وہ اس کی تشویشناک حالت دیکھ کر پریشان ہوجاتا ہے۔ سب سے پہلے اس کی نبض ٹٹولتا ہے، پھر دل کی حرکت جاننے کی کوشش کرتا ہے، جب دیکھتا ہے کہ نبض بھی چل رہی ہے اور دل بھی حرکت میں ہے تو فوراً اسے اٹھا کر کندھے پر ڈالتا ہے یا اپنی گاڑی میں لٹاتا ہے اور سب سے قریب کسی کلینک پر لے کر اسے پہنچتا ہے تاکہ اسے فرسٹ ایڈ دی جائے اور اس کی جان بچائی جاسکے۔ غور فرمایئے کہ ان تین آدمیوں کے رکنے کا سبب زخمی کا سرِ راہ بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہونا ہے۔ سبب کی یکسانی میں تینوں برابر ہیں لیکن اعمال تینوں کے الگ الگ اور جدا جدا ہیں۔ ایک نے اس کی بے ہوشی سے فائدہ اٹھایا اور اس کی جیب میں جو کچھ تھا لے کر چلتا بنا۔ دوسرے نے نگاہ ضرور ڈالی لیکن کوئی اثر قبول نہیں کیا اور اپنا وقت ضائع کیے بغیر چلا گیا۔ تیسرے آدمی نے جب اس کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھی تو فوراً اس کی نبض اور دل کی کیفیت جاننے کی کوشش کی تاکہ معلوم ہو کہ وہ زندہ ہے یا مرگیا۔ چنانچہ جب اسے یقین ہوگیا کہ زخمی زندہ ہے تو اب اس نے اسے بچانے کیلئے اپنی تمام مساعی صرف کرڈالیں۔ سوال یہ ہے کہ سبب ایک ہونے کے باوجود تینوں کے اعمال مختلف کیوں ہیں؟ آپ اگر غور کریں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ جس آدمی کے دل ودماغ میں برے خیالات بسے ہوئے تھے اور اس کے اندر ایک چور بیٹھا تھا، اس نے بجائے اس کے زخموں سے متاثر ہونے کے اس کی جیب صاف کی۔ دوسرا شخص جس کے دل میں انسانیت کا درد تو کجا کوئی ہمدردی بھی ناپید تھی۔ اس نے جب زخمی کو بے ہوش حالت میں دیکھا تو اس نے کوئی تاثر لئے بغیر یہ خیال کیا کہ یہاں سڑک کے کنارے جانور مرتے ہی رہتے ہیں، یہ بھی ایک جاندار ہی ہے اس لئے اس نے ایک سرسری نظر ڈالی اور وہاں سے رفوچکر ہوگیا۔ تیسرا آدمی جس کے دل میں انسانیت کا درد اور غمگساری کا جذبہ تھا وہ تڑپ کر اپنی سواری سے نکلا اور اس زخمی کی جان بچانے کیلئے اپنے تمام وسائل جھونک دیئے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کس طرح انسانوں کے اعمال پہلے سے دلوں میں

Marfat.com

بیٹھے ہوئے خیالات کے تابع ہوتے ہیں۔ اسی لئے اقبال نے کہا:

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو اندازِ آفاقی

یہ انمٹ نقوش اور پختہ خیالات جو انسانی زندگی پر حکمرانی کرتے ہیں شریعت کی زبان میں انہیں عقائد کہا جاتا ہے۔ چونکہ عقائد کے زیر اثر اعمال کی تشکیل ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ نے انسانی تربیت کیلئے سب سے پہلے عقائد کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عرب کا وہ معاشرہ جس کا بگاڑ انتہا کو پہنچ چکا تھا، جس کی کوئی کل بھی سیدھی نہ تھی، جس میں ڈھونڈے سے بھی کوئی اچھائی نظر نہ آتی تھی، انسانیت سے کوسوں دور اور بہیمیت سے ملتی جلتی زندگی اس معاشرے کی زندگی بن چکی تھی۔ قانون کا تصور انہیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ خواہشات کی پیروی ان کا مقصودِ زندگی بن چکا تھا لیکن آنحضرت ﷺ کی تعلیم و تربیت کے نتیجے میں جب ان کے بنیادی خیالات یعنی عقائد میں انقلاب آیا تو دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں ایک ایسا انسانی معاشرہ، ایک ایسی امت تیار ہوئی جس کی نظیر نہ تاریخ میں پہلے موجود تھی نہ آج تک موجود ہے۔ چنانچہ اسی تشخیص کے تحت اس آیت کریمہ میں سب سے پہلے عقائد کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

(2) دوسری بات اس سلسلے میں قابل ذکر یہ ہے کہ بحث عقائد کی ہو یا کسی اور صنفِ علم کی۔ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنی بات کے اثبات کیلئے جب دلیل پیش کرتا ہے تو مقدمات کو ترتیب اس طرح دیتا ہے کہ سب سے پہلے مقدمۂ اولیٰ کے طور پر اس بات کا ذکر کرتا ہے جو جانبین کے نزدیک مسلّم ہو یعنی دونوں اسے تسلیم کرتے ہوں تاکہ اس کو بنیاد بنا کر بات کو آگے بڑھایا جاسکے۔ یہ وہ حکیمانہ اسلوب ہے جس سے کسی بھی بات کو سمجھانا اور منوانا آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہاں فرمایا گیا ہے کہ تمہارا رب وہ ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا، جو تمہارا خالق ہے، جو لوح و قلم اور عرش و کرسی کی تخلیق کرنے والا ہے اور تم اسے تسلیم کرتے ہو کہ کائنات کا خالق اور ہمارا خالق یقیناً اللہ ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں، پھر تم ایک بات کا جواب دو کہ اگر واقعی تمہارا بھی اور کائنات کا بھی خالق اللہ ہی ہے تو پھر تمہارا اور کائنات کا رب کسے ہونا چاہیے؟ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ پیدا تو تمہیں اللہ نے کیا، تمہارا آباؤ اجداد کو بھی اسی نے پیدا کیا، تمہارے لئے زمین سے غذا اسی نے پیدا کی، تمہارے لئے روشنی کا سامان کرنے کیلئے سورج اور چاند کو اس نے پیدا کیا، تمہاری اولاد کو بھی وہی پیدا کرتا ہے، تو پھر کیا یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ پیدا تو اللہ کرے اور ربوبیت کا منصب کسی اور کو دے دیا جائے۔ یہ ایک ایسی حماقت ہے جسے کوئی بھی عقل مند آدمی بقائمی ہوش و حواس تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوسکتا اور نہ وہ یہ تسلیم کرسکتا ہے کہ جب کائنات کا خالق ایک اللہ ہے تو تمہیں اولاد دینے میں دوسروں کا دخل کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ تخلیق کے کسی عمل میں بھی کسی اور کی شرکت کیسے گوارہ کرسکتا ہے اور مزید یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ کائنات کی تخلیق اس طرح وجود میں نہیں آئی کہ اللہ نے ایک ہی وقت میں تمام کائنات کو پیدا فرما دیا بلکہ ایک تدریج کے ساتھ تخلیق کا عمل مکمل ہوا۔ وہ اگر چاہتا تو کلمۂ کُن کے ذریعے سے ساری کائنات کو ایک لمحے میں وجود میں لے آتا لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ مختلف ادوار میں کائنات کو وجود دیا جائے۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے 6 دنوں میں زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا۔ سوال یہ ہے کہ 6 دنوں سے مراد کیا ہے؟ اس لئے کہ انسانوں میں طلوعِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب تک کے وقت کو ایک دن کہتے ہیں لیکن کائنات کے پیدا ہونے سے پہلے اس دن کے وجود کا تصور کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ اس وقت نہ سورج تھا نہ زمین۔ اس لئے معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہمارا دن نہیں بلکہ اس سے مراد کوئی بھی وقت ہے جس کے دورانیے کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے۔ قرآن کریم نے اپنا ایک دن ایک ہزار سال کا قرار دیا ہے۔ اگر وہ دن مراد لیں تو پھر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کائنات کی تخلیق 6 ہزار سال میں مکمل ہوئی اور یہ بھی ممکن ہے کہ دن سے مراد دور ہو۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ 6 ادوار میں کائنات کی تخلیق عمل میں آئی۔ کوئی سی بھی صورت ہو یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب انسان کتمِ عدم تھا۔ ابھی وقت کی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی، تصور کو وجود تک نہیں ملا تھا تو ایسے زمانے کی باتوں کو ہم اپنی عقل کے ترازو میں اگر تول کر کوئی تعبیر دینا چاہیں تو یہ سراسر اپنے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اسے متشابہات میں شامل سمجھ کر اس کا یقین رکھیں لیکن اس بات کو تسلیم کریں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ذات ابدی نہیں۔ مادہ قدیم نہیں وہ مخلوق اور حادث ہے۔ اس کا وجود بھی اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیاں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ نے یکبارگی کائنات کو پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا کہ اب وہ جیسے چاہے حرکت کرتی رہے اور اس میں جو تبدیلیاں ممکن ہوں آتی رہیں اور جو شکلیں بن سکتی ہوں بنتی

Marfat.com

رہیں۔اللہ علت العلل بن کر کائنات کے کسی گوشے میں خاموش بیٹھا ہے۔اس لئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ اس نے زمین اور آسمانوں کو 6 دنوں میں تخلیق فرمایا اور پھر عرش حکومت پر متمکن ہوا تا کہ دنیا کے معاملات کی تدبیر کرے اور انتظام چلائے۔اگر وہ صرف خالق ہوتا اور تخت سلطنت پر اور کوئی متمکن ہوتا یا تخت سلطنت خالی رہتا تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ اس نے کائنات کو پیدا ضرور کیا لیکن اس پہیئے کو حرکت دے کر آپ کہیں خاموشی کی چادر اوڑھ کر لیٹ گیا حالانکہ اس کی شان تو یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو تخلیق فرمایا پھر اس کی زمام کار سنبھالی، پھر ہر مخلوق کے انتظام کو سیدھا کیا۔چنانچہ آج بھی اس کائنات کا ایک ایک ادارہ اس کے احکام سے بندھا ہوا ہے۔اس کائنات کی کوئی حرکت اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوتی۔وہ برابر تدبیر امور میں لگا ہوا ہے۔وہ خود فرماتا ہے کہ صحرا میں کوئی پتہ بھی گرتا ہے تو وہ جانتا ہے، کوئی دانہ پھوٹتا ہے تو اس کے علم میں ہوتا ہے۔جس طرح وہ انسانی اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔اسی طرح وہ کائناتی نظام کو بھی اپنے حکم سے چلاتا ہے۔اس نظام سلطنت کی مضبوطی کا عالم یہ ہے کہ کائنات کا کوئی کرہ اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔مخلوقات میں سورج ایک بہت بڑی مخلوق ہے اور اس کی توانائیوں کی کوئی انتہا نہیں۔بایں ہمہ قانون کے سامنے اس کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ سورۃ یٰسین میں ارشاد فرمایا گیا ہے ''لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ'' سورج کی مجال نہیں کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ہر کرہ اپنے مدار میں گھوم رہا ہے۔ہر مخلوق اس کے حکم کی پابند ہے۔جس طرح سورج اور چانداس کے حکم کے تابع ہیں۔اسی طرح کائنات کے تمام کرے تمام ثوابت اور سیارے اسی کے احکام کی اطاعت کر رہے ہیں۔اسی طرح زمین کی حرکتیں بھی اسی کے تابع ہیں۔زمین میں زلزلے کائناتی فورسز کی مرضی سے نہیں آتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کائناتی فورسز اپنا کام کرتی ہیں۔سمندر میں جوار بھاٹا، دریاؤں کی طغیانی، پہاڑوں کا لاوا اگلنا، بادل کا کڑکنا اور بجلی کا کوندنا، ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کے احکام سے بندھی ہوئی ہے۔اسی طرح اس کا ایک اخلاقی نظام بھی ہے۔قوموں کا عروج و زوال اسی کے فیصلوں کا پابند ہے۔جس قوم پر بھی عذاب آیا، اس کی مرضی سے آیا۔بعض برخود غلط لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو قومیں تباہی کا شکار ہوئیں وہ زمین کے کسی تغیر کے نتیجہ میں ہوئیں حالانکہ قرآن کریم نے واضح طور پر فرمایا کہ ہم نے جسے بھی پکڑا اسے اس کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا اور اسے کسی کائناتی قوت نے نہیں بلکہ ہم نے پکڑا۔بعض قوموں کو پہلے وارننگ دی گئی کہ تین دنوں کے بعد تمہارا خاتمہ کر دیا جائے گا۔چنانچہ جب انہوں نے اس کی پروا نہ کی تو تین دن کے بعد اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا۔یہ تین دن کی وارننگ اور پھر اس کے مطابق عذاب آنا کیا یہ زمینی قوتوں کی طرف سے تھا۔یہ وہ تدبیر اور عمل ہے جس کا اظہار پوری کائنات میں ہو رہا ہے اور یہ نظام اس قدر مضبوط اور اس قدر بے لچک ہے کہ کسی شفاعت کرنے والے کی مجال نہیں کہ وہ سفارش کر سکے۔بادشاہوں کے یہاں بھی امراء اور وزراء کی سفارشیں چلتی ہیں، بعض دفعہ فیصلے تبدیل کرا دیئے جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی سفارش کی جرأت نہیں کر سکے گا۔(البتہ آخرت میں شفاعت کا مضمون وہ ایک الگ چیز ہے جس کی بحث اپنے مقام پر آئے گی) ذرا غور کیجئے کہ جب تمہارا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے، وجود دینے والا وہ ہے، رزق وہ عطا کرتا ہے، زندگی کی ہر ضرورت وہ پوری کرتا ہے اور کائنات کا نظام وہ چلا رہا ہے اور اس نے کائنات کو وجود مختلف ادوار میں نہایت حکمت کے ساتھ عطا کیا ہے اور اس کی حکومت کسی اور کے سپرد نہیں بلکہ وہ خود انجام دیتا ہے۔اس پوری صورتحال کو سامنے رکھ کر یہ بتائیے کہ کیا رب اس کے سوا کوئی اور ہوگا؟ رب وہ ہوتا ہے جو مخلوق کو پالتا ہے، وہی اس کا حاکم حقیقی ہوتا ہے اور وہی اس کا مالک اور آقا ہوتا ہے۔اس سے بڑھ کر حماقت کی بات اور کیا ہوگی کہ خلق کوئی کرے اور مالک اور آقا کوئی اور ہو۔زندگی کی ضروریات کوئی اور مہیا کرے اور فرمانروائی کوئی اور کرے۔نظام سلطنت وہ چلائے، دل و دماغ کو رعنائیاں وہ عطا کرے اور صلاحیتوں سے وہ نوازے اور غلامی کسی اور کی جائے۔ان فطری اور عقلی مقدمات کے ذریعے عربوں کی بے دینی اور مشرکانہ زندگی کو غلط ثابت کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ یہ ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا پروردگار ہے، پس تم اسی کی عبادت کرو۔

جس طرح ربوبیت میں فرمانروائی، حاکمیت اور آقائی کے مفاہیم شامل ہیں۔اسی طرح بندگی و عبودیت میں بھی یہ تینوں مضامین شامل ہیں کہ تم غلامی کرو تو صرف اس اللہ کی جو تمہارا رب ہے۔احکام پر چلو تو اس خدا کے جس نے تمہیں پیدا کیا اور آقائی تسلیم کرو اس مالک کی جس نے تمہیں زندگی عطا کی ہے لیکن یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ جسے تم خالق مانتے اور شب و روز جس کا رزق کھاتے ہو اور جس کی دی ہوئی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہو اسی کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہو، اس کی بندگی کرنے کی بجائے دوسروں کی بندگی بجا لاتے ہو، اسے آقا سمجھنے کی بجائے دوسروں کی آقائی کے سامنے سر جھکاتے ہو۔دنیا میں ایسا احمق شاید ہی کوئی ہوگا کہ وہ تنخواہ کسی سے لے اور ڈیوٹی کسی کی انجام دے۔زندگی کی تمام نعمتیں کسی اور سے حاصل کرے اور

Marfat.com

اطاعت اور غلامی کسی اور کی کرے۔ اگر دنیا میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ مشہور کہاوت ہے کہ جس کا کھایا جاتا ہے اسی کا گایا جاتا ہے۔ تو تم بھی جس کا کھاتے ہو، اسی کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرو۔ اسی بات کو ایک اور جگہ پروردگار نے فرمایا الا له الخلق و الامر خبردار جس کیلئے پیدا کرنا ہے اسی کیلئے حکم دینا بھی ہے۔ یعنی جو پیدا کرتا ہے حکم دینا بھی اسی کا حق ہے۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ کیا تم ان سامنے کی باتوں اور جانی پہچانی حقیقتوں سے نصیحت حاصل نہیں کرتے ہو۔

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۴﴾

(اسی کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے۔ یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے۔ پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا تاکہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کئے ان کو پورے انصاف کے ساتھ بدلہ دے اور جنہوں نے کفر کیا ان کیلئے کھولتا پانی ہے اور دردناک عذاب ہے۔ بسبب اس کے کہ وہ کفر کرتے تھے۔)

عقیدۂ آخرت کے اساسی حقائق

میں اس سے پہلے یہ عرض کر چکا ہوں کہ مکی سورتوں میں زیادہ تر عقائد کی اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیتوں میں عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت کو بیان کیا گیا ہے۔ اب پیشِ نظر آیت کریمہ میں اسلام کا تیسرا عقیدہ، عقیدۂ آخرت کو بیان فرمایا جا رہا ہے۔ عقیدۂ آخرت کی بنیاد چند حقائق پر ہے۔ (1) اس بات کو دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ انسان کو اس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہنا۔ وہ یہاں ایک محدود وقت کیلئے آیا ہے اور دنیا میں اس کے آنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ دوسری دنیا یعنی آخرت کیلئے تیاری کرے اور اپنی زندگی اس طریقے اور ان احکامات کے مطابق گزارے جن کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے حکم دیا ہے اور جسے اسلامی شریعت کہتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں کا شکر بجالائے اور ان تمام حقوق کو ادا کرے جو اسلامی شریعت نے اس پر عائد کئے ہیں اور وہ دنیا میں، دنیا کا بندہ بننے کی بجائے اللہ کا بندہ بن کر رہے۔ اس کا ہر فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہو اور اس کی سوچ اور اس کے اعمال پر اسلامی شریعت کا پہرا ہو۔ وہ زندگی کی ضروریات حاصل کرے لیکن ان کے حصول کا ذریعہ اسلامی شریعت سے پوچھے۔ وہ اپنی محنت اور اپنی ہمت کے مطابق اکتساب کرے لیکن اس کا طریقہ اور اس کا مقصد وہ ہو جو اسلام نے متعین کیا ہے۔ اپنی زندگی اور اپنی صلاحیتوں اور اپنے مال و دولت کو اللہ کی امانت جانے اور امانت کا حق ادا کرنے کی فکر کرے اور ہر لحہ اپنے ذہن میں اس بات کو متحضر رکھے کہ کسی وقت بھی موت کا پیغام آ سکتا ہے۔ اس کا آنا جس قدر ناگہانی ہے اسی طرح یقینی بھی ہے۔ یہ تصور جس قدر دل و دماغ میں پختہ ہوتا جاتا ہے زندگی ویسے ویسے پاکیزہ تر ہوتی جاتی ہے اور جیسے ہی اس تصور سے غفلت شروع ہوتی ہے۔ زندگی میں بگاڑ کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ اس لئے اللہ کے ہر نبی اور اس کی ہر کتاب نے سب سے زیادہ انسانوں کیلئے اس بات پر زور دیا کہ موت کو ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھو۔ تمہارے ہر کام میں مہلت ہو سکتی ہے لیکن موت کے وقت میں مہلت نہیں ہو سکتی۔ جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک لحہ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ امام رازیؒ نے سورۃ العصر کی تفسیر میں لکھا کہ میں بازار سے گزر رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک برف بیچنے والا برف کا بلاک سامنے رکھے دہائی دے رہا ہے کہ لوگو! رحم کھاؤ اس آدمی پر جس کا سرمایہ گھلتا جا رہا ہے، اگر تم اسے خرید لو گے تو اس کے دام کھرے ہو جائیں گے اور اگر خریدنے میں تاخیر کرو گے تو برف گھل جانے کے باعث اس کے دام ضائع ہو جائیں گے۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے معاً خیال آیا کہ برف کے گھلنے میں تو ایک وقت لگتا ہے، نہ وہ اس سے پہلے گھل سکتی ہے اور نہ بعد میں، لیکن عمر کی صورت میں جو سرمایہ میرے پاس ہے اس کے گھلنے میں تو ایک لحہ بھی صرف نہیں ہوتا۔ پانی کا بلبلہ بھی اتنی جلدی نہیں ٹوٹتا جتنی جلدی بعض دفعہ انسانی عمر ختم ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی مرحوم نے ٹھیک فرمایا کہ ہر سانس پر آدمی کے ذمے دو شکر واجب ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک سانس، سانس کے آنے اور واپس جانے سے مکمل ہوتا ہے۔ اگر سانس پیٹ کے اندر جا کر واپس نہ آئے تو موت واقع ہو جاتی ہے اور اگر باہر آ کر واپس نہ جائے تو تب بھی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے ایک سانس پر دو شکر لازم ہوئے۔ اس سے اندازہ فرمائیے کہ انسان کی زندگی کتنی بے ثبات اور ناپائیدار ہے۔ کتنی دفعہ دیکھا ہے کہ آدمی اچھا بھلا باتیں کر رہا ہے کہ اچانک سانس رکا اور چلتا بنا۔ اچھا بھلا سویا، اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جاں بلب مریض بعض دفعہ بچ

Marfat.com

جاتے ہیں اور تیمار دار دوسری دنیا کو سدھار جاتے ہیں۔ ڈوبنے والے کو بچالیا جاتا ہے اور بچانے والے بعض دفعہ ڈوب جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے زندگی کتنی بے اعتبار ہے اور یہ بے اعتباری انسان کیلئے کس قدر احتیاط کا تقاضہ کرتی ہے، لیکن یہاں تو ایک توجہ طلب بات اور بھی ہے کہ آدمی اگر ایسے کسی ناگہانی حادثے سے محفوظ بھی رہے تب بھی یہ ایسا سرمایہ ہے جو ہر وقت گھلتا رہتا ہے۔ آدمی کام کر رہا ہو یا سو رہا ہو، رو رہا ہو یا ہنس رہا ہو، دکھ میں ہو یا راحت میں، ظلم کر رہا ہو یا ظلم سہہ رہا ہو، حاکم ہو یا محکوم کوئی لحہ ایسا نہیں جب یہ سرمایہ گھلنے سے رک جاتا ہو۔ برف کو فریزر میں رکھ کر گھلنے سے بچایا جا سکتا ہے لیکن انسانی زندگی کو اس دنیا میں کہیں قرار نصیب نہیں۔ ہر وقت اس کا حال یہ ہے:

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
رفتہ رفتہ لحظہ دم بدم
سانس ہے اک رہ روِ ملکِ عدم
دفعۃً اک روز یہ جائے گا تھم

اندازہ کیجئے یہ زندگی کس قدر بے ثبات، بے قرار اور ناپائیدار ہے اور کس قدر تلخ ہے یہ حقیقت کہ انسان اس کی ناپائیداری اور بے ثباتی کو کبھی یاد رکھنے کیلئے تیار نہیں۔ اس کے سامنے جنازے اٹھتے ہیں، حادثے ہوتے ہیں، چھوٹے بھی مرتے ہیں اور بڑے بھی اور کتنی دفعہ جنازے کو کندھا دینے کا موقع ملتا ہے اور بعض دفعہ تو آدمی اپنے عزیزوں کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارتا ہے لیکن قبر سے نکلنے کے بعد یہ سمجھتا ہے کہ جسے مرنا تھا وہ مر گیا ہے مجھے موت نہیں آئے گی۔ کس قدر حیرت انگیز ہے یہ بات کہ موت اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور انسان سب سے زیادہ اسی سے بے خبر نہیں تو بے نیاز ضرور ہے بلکہ کسی کو اگر موت کی یاد دلائی جائے تو اسے برا لگتا ہے اور وہ قبرستان میں جا کر بھی اس طرح دندانہ وار گھومتا ہے کہ اسے خیال ہی نہیں ہوتا کہ ایک دن مجھے یہیں آنا ہے اور یہی شہرِ خموشاں میری اصل منزل ہے۔ ''سودا'' نے ایسے ہی لحہ کو محفوظ کرتے ہوئے کہا ہے:

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو جا پڑا
ہر چند وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کر چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پرغرور تھا

چنانچہ آخرت کی یاد دہانی کیلئے اسلام سب سے پہلے موت کو یاد رکھنے پر زور دیتا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ موت ہی وہ چیز ہے جو خواہشات اور غفلت کو توڑ دینے والی ہے۔

(2) آخرت کے بارے میں دوسرے جس تصور پر زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تم زندگی میں جو کچھ کرتے ہو چاہے لوگوں کے سامنے کرو یا تنہائی میں، چاہے روشنی میں کرو یا تاریکی میں ہر حال میں اللہ اسے جاننے والا ہے۔ اس کی نگاہ برابر تمہارے تعاقب میں رہتی ہے۔ اس کے دو فرشتے ہر وقت تمہارے دونوں کندھوں پر رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت تمہارے اعمال کو محفوظ کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ تم اپنے اعمال اور خیالات کو بھول سکتے ہو لیکن اللہ کے علم میں اور تمہارے نامۂ اعمال میں وہ ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں۔ چنانچہ یہی تمہارا نامۂ اعمال تمہارے خلاف یا تمہارے حق میں قیامت کے دن حجت بنے گا۔ وہ جب تمہاری ایک ایک بات کو تمہارے سامنے کھول کر رکھ دے گا تو تم حیران ہو کر کہو گے کہ ہائے میری شامتِ اعمال یہ رجسٹر کیسا ہے جس نے میری کسی چھوٹی بڑی بات کو چھوڑا نہیں۔ اسی کو گواہ بنا کر اللہ تعالیٰ ہر شخص کا حساب لے گا۔ نیکیاں بھی تلیں گی اور برائیاں بھی۔ اسی کے مطابق جزاء اور سزا کا فیصلہ ہوگا۔ اس لئے جس طرح موت کو یاد رکھنا ضروری ہے اسی طرح اس حقیقت کو بھی مستحضر رکھنا ضروری ہے کہ میرا اصل سرمایہ ایمان اور حسنِ عمل ہے۔ یہی وہ سکہ ہے جو قیامت میں کام آئے گا۔ اس کے علاوہ کوئی رشتہ کام آئے گا اور نہ کوئی نسبت۔ مال و دولت اور عہدہ و منصب سب یہیں دھرے رہ جائیں گے۔

(3) جس طرح ہر شخص کا مرنا ضروری ہے کیونکہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں جسے موت سے رستگاری ہو'' امیر مینائی'' نے ٹھیک کہا:

جو زندہ ہے وہ موت کی تکلیف سہے گا
جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا

Marfat.com

اسی طرح یہ دنیا بھی ہمیشہ نہیں رہے گی۔ ایک دن آئے گا جب اس کائنات کی صف لپیٹ دی جائے گی۔ ہر زندہ موت کی نذر ہو جائے گا۔ ہر چیز ہلاکت کے گھاٹ اتر جائے گی۔ پھر اک وقت آئے گا جب قبریں پھٹیں گی اور لوگ زندہ ہو کر اپنی قبروں سے نکلیں گے اور جس کسی کی قبر کا نشان بھی نہیں ہو گا اسے بھی اللہ تعالیٰ اٹھا کھڑا کریں گے۔ ایک محشر بپا ہو گا، سب لوگ محشر میں جمع ہوں گے۔ خداوند ذوالجلال کی عدالت سجے گی، ہر انسان وہاں اپنے حساب کتاب کیلئے پیش ہو گا۔ نیک لوگ جنت میں جائیں گے اور برے لوگ جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

عمل کی آمادگی کے دو سبب

ان تین بنیادی تصورات کے مجموعے کو آخرت کہتے ہیں۔ یہ کیونکہ دنیا کے بعد آنے والی دنیا ہے اس لئے اس کو آخرت کا نام دیا گیا ہے۔

قرآن کریم اس عقیدے پر اس لئے زور دیتا ہے کہ اگر یہ عقیدہ ذہنوں سے محو ہو جاتا ہے تو پھر انسان کو راہ راست پر رکھنے والی کوئی چیز نہیں کیونکہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ صرف دو سبب سے، آمادۂ عمل ہوتا ہے یا عمل میں اصلاح کی فکر کرتا ہے۔ وہ دو سبب ترغیب اور ترہیب کہلاتے ہیں۔ ترغیب کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی انسان کو یہ یقین دلا دیا جائے اور رغبت پیدا کر دی جائے کہ تم اگر یہ کام کرو گے تو اس کے بدلے میں تمہیں فلاں فلاں چیزیں مل سکتی ہیں تو اگر وہ چیزیں اس کی نگاہ میں قدر و قیمت کی حامل ہوں تو وہ ضرور اس کے حصول کیلئے محنت کرتا بلکہ جان مارتا ہے۔ راتوں کو جاگ کر چراغوں کی لو پر آنکھوں کو سینک کر جو لوگ حصول علم کیلئے محنت کرتے ہیں ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو اسے عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ بیشتر لوگ ایسے ہیں جو اس لئے محنت کا عذاب جھیلتے ہیں تاکہ اس کے نتیجے میں ان کو کوئی ڈگری ملے اور ڈگری اس لئے حاصل کرتے ہیں تاکہ کسی بہتر نوکری کو حاصل کر سکیں۔ کوئی بہتر تنخواہ پا سکیں اور اس طرح آسودہ زندگی گزار سکیں۔ دن بھر چلچلاتی دھوپ میں ایک مزدور محنت کرتا ہے صرف اس لئے تاکہ وہ اجرت حاصل کر سکے۔ کاروباری لوگ شب و روز محنت کرتے ہیں، سونا بھی نصیب نہیں ہوتا صرف اس لئے تاکہ بیش از بیش دولت حاصل کر سکیں۔ اسلام نے بھی آخرت کیلئے ترغیب سے کام لیا۔ اس نے کہا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کیلئے محنت کرو گے اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کرو گے اور شریعت کی پابندی کرو گے تو یقین جانو تمہیں قیامت کے دن جنت عطا ہو گی جس کی نعمتوں کو نہ تمہاری آنکھوں نے دیکھا نہ تمہارے کانوں نے سنا اور نہ کبھی تمہارے دل میں ان نعمتوں کا تصور گزرا اور پھر قرآن و سنت نے بعض دفعہ ان نعمتوں کی تفصیلات بھی بیان فرمائیں تاکہ ترغیب کا عمل مکمل ہو۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان نہ صرف شریعت کی پابندی کیلئے محنت کرتے تھے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلمے کی بلندی کیلئے دنیا کا ہر دکھ اٹھاتے تھے اور اگر اس راستے میں شہادت نصیب ہوتی تھی تو زخمی ہو کر گرتے ہوئے بھی بجائے چیخنے چلانے کے ان کی زبان پر یہ جملہ ہوتا تھا فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جنت کی بیش بہا نعمتوں کے حصول کیلئے جان دینا بھی کوئی بڑی قیمت نہیں۔ ٹھیک کہا کسی شاعر نے:

بہر غفلت یہ تری ہستی نہیں
دیکھ جنت اس قدر سستی نہیں

دوسری چیز ہے ترہیب، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو یہ آگاہی دی جائے کہ اگر تم نے دنیا میں اللہ کی اطاعت کی بجائے شیطان کی اطاعت کی اور اگر تم نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع کی بجائے خواہشات نفس کا اتباع کیا یا طاغوت کی بندگی کی تو پھر یاد رکھو ممکن ہے کہ دنیا میں تم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچے رہو لیکن قیامت میں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور جہنم کے عذاب سے نہیں بچ سکو گے اور یہ عذاب ایسا سخت ہے کہ اس کا تصور بھی تمہیں ہلا ڈالنے والا ہے۔ چنانچہ ہم جو صحابہ کرامؓ کو راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کے دربار میں روتا ہوا دیکھتے ہیں اور بڑے سے بڑا اللہ کا ولی عمر بھر اس کے عذاب اور اس کے غضب سے لرزاں اور ترساں رہتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز پانچویں خلیفہ راشد ہیں اور حضرت حسن بصری تابعین کے سرخیل ہیں لیکن وہ اللہ کے غضب اور جہنم سے ڈر کر اس طرح روتے کہ دیکھنے والے کہتے کہ ایسا لگتا تھا جیسے جہنم ان دونوں کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ انسان یا ترغیب سے کام کرتا ہے یا ترہیب سے۔ آخرت کے تصور میں یہ دونوں محرک شامل ہیں۔ اس لئے یہاں قرآن کریم نے خاص طور پر فرمایا کہ تمہیں اسی کی طرف پلٹنا اور لوٹنا ہے یعنی ایک دن سب انسانوں کو اسی کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہے۔ اگلے جملے میں قیامت کے وقوع پر عقلی دلیل دی گئی ہے کیونکہ مشرکین عرب کو عقلی طور پر قیامت کے آنے سے انکار تھا۔ وہ اس کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہر زندہ چیز موت کا شکار ہو جائے گی اور کائنات کا ایک ایک کرہ شکست و ریخت کی نذر ہو جائے گا اور پھر ایک طویل وقفے کے بعد دوبارہ زندگی آئے گی اور تمام

Marfat.com

انسانوں کو زندہ کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر کیا جائے گا۔ وہاں حساب کتاب ہوگا اور اسی کے مطابق جزاء سزا ہوگی۔ انہیں چونکہ اصل انکار دوبارہ زندہ ہونے سے تھا اس لئے سب سے پہلے عقلی طور پر اسی کا جواب دیا گیا۔ ارشاد فرمایا:

اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ''بے شک وہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا۔'' اس سے پہلے ارشاد فرمایا گیا کہ تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا پکا اور سچا وعدہ ہے۔ ہر پیغمبر اور اس کی امت نے اس کی سچائی پر گواہی دی ہے لیکن تمہیں نہ جانے کیوں قیامت کے آنے میں شبہ ہے حالانکہ قیامت کا آنا بعض مسلمات کا جواب بھی ہے اور عقل کا تقاضہ بھی۔ تم جس طرح اللہ کو خالق مانتے ہو اور اس کی قوتِ تخلیق میں کسی اور کو شریک نہیں سمجھتے اسی طرح تم اس بات کو بھی مانتے ہو کہ اللہ کی ذات قادرِ مطلق ہے۔ اس کیلئے کسی چیز کی تخلیق ناممکن تو دور کی بات ہے مشکل بھی نہیں ہے۔ جب تم اس کو کائنات کا اور خود اپنا خالق تسلیم کرتے ہو تو پھر یہ کس قدر بے عقلی کی بات ہے کہ تم یہ کہنے لگو کہ اللہ تعالیٰ ایک دفعہ تو کائنات کو پیدا کر چکا وہ دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ وہ ایک دفعہ پیدا کرنے کے بعد اپنی صفت تخلیق اور صفت قدرت سے محروم ہو گیا حالانکہ جو شخص بھی اللہ کی صفات کا معمولی فہم بھی رکھتا ہے وہ اس بے ہودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ کسی حالت میں اپنی صفات سے محروم ہو سکتا ہے اور یا اس کی کسی صفت میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ وہ اگر ایک دفعہ پیدا کرنے پر قادر ہے تو دوبارہ اسے پیدا کرنے میں کس طرح دشواری پیش آ سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت قدرت کو دلیل بنا کر مشرکین کی اس غلطی کو بار بار واضح فرمایا۔

سورۃ نازعات آیت ۲۷ تا ۳۳ میں فرمایا:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ۝ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا ۝ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ۝ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۝ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

(تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی؟ اللہ نے آسمان کو پیدا کیا اور اس نے چھت کو بلند کرنے کے بعد اس کو استحکام بخشا۔ رات کو تاریک اور دن کو روشن بنایا۔ اس کے بعد زمین کو بچھایا، ان میں سے پانی نکالا، چارہ پیدا کیا اور پہاڑوں کو اس پر کھڑا کر دیا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے مویشیوں کیلئے متاع ہے۔ یعنی جو خالق و مالک ان تمام باتوں پر قدرت رکھتا ہے آخر وہ تمہاری ہمہ گیر موت اور دوبارہ زندگی پر قدرت کیوں نہیں رکھتا۔)

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا:

''وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا'' (بنی اسرائیل : ۴۹)

(اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو پھر کیسے نئے اٹھا کر بنائے جائیں گے۔ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا وہ ان جیسے لوگوں کو دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔)

سورۃ روم میں فرمایا کہ خدا وہی ہے جو خلق کو آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا اور یہ دوبارہ خلق کرنا اس کیلئے آسان ہے۔

سورۃ یٰسین میں فرمایا:

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۝ (یٰسین : ۷۸ تا ۷۹)

''وہ بولے کون ان کھوکھلی وسڑی ہڈیوں کو زندہ کرے گا۔ آپ کہہ دیجئے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔''

سورۃ قیامہ میں ارشاد فرمایا:

''اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ''

(کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو پھر جمع نہ کر سکیں گے۔ ہم تو اس بات پر بھی قادر ہیں کہ چھوٹی ہڈیوں، ریشوں اور رگوں سے اس کی انگلیوں کے پورے بنا ڈالیں)

یعنی جس پروردگار نے چھوٹی ہڈیوں، ریشوں اور رگوں سے ایسے پوروں کو ترتیب دیا ہے کہ جو آج بھی دستاویزی ثبوت کے طور پر استعمال

Marfat.com

ہوتے ہیں اربوں کھربوں انسانوں کی تخلیق کے باوجود کسی ایک انسان کے انگوٹھے کا نشان دوسرے انسان سے نہیں ملتا۔ جو خالق کائنات اس بات پر قادر ہے کیا وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے؟

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ○

(تاکہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے عدل کے ساتھ اور جنہوں نے کفر کیا ان کیلئے کھولتا پانی ہے اور دردناک عذاب ہے، ان کے کفر کی پاداش میں)۔

قیامت کا وقوع عدل کا تقاضا ہے

آیت کا یہ جملہ قیامت کے آنے پر دلیل بھی ہے اور قیامت کے وقوع کا مقصد بھی۔ یعنی قیامت محض شکست و ریخت کا نام نہیں۔ نہ از سر نو نئی دنیا بسانے کا نام ہے بلکہ اس کے لانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ نیکوں کو نیکی کا بدلہ ملے اور بروں کو برائی کی سزا ملے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک اہم ترین صفت، صفتِ عدل بھی ہے۔ انسانوں کو شریعت کا پابند کرنا اور زمین پر خلافت کا قیام اور خلافت کو حکومت کے ساتھ قوت فراہم کرنا اور اللہ اور رسول کے بعد عادل حکمرانوں کی اطاعت کا حکم، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا اظہار ہے اور دنیا میں چونکہ اس صفت کو پوری طرح بروئے کار نہیں لایا جاسکتا اس لئے قیامت کا آنا عدل کا تقاضہ بھی ہے اور عقل کی اپیل بھی۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کو تسلیم کرتا ہے اور پھر بھی وہ قیامت کے آنے سے انکار کرتا ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ وہ یا تو عدل کے تقاضوں کو نہیں سمجھتا اور یا وہ عقل سے تہی دامن ہے۔

عدل کا ایک معنی ہے تلافی مافات۔ یعنی نقصان کو پورا کرنا۔ اس عدل کے بے شمار مناظر ہمارے سامنے ہیں۔ جب ہم کسی درخت کی شاخوں کو کاٹ دیتے ہیں تو نئی شاخیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ جب ہم کسی جنگل کا کوئی ٹکڑا درختوں سے صاف کر دیتے ہیں تو وہاں نئے پودے اور نئی بوٹیاں اگ آتی ہیں۔ جب تلوار وغیرہ سے کسی حصۂ جسم کا گوشت کٹ جاتا ہے تو قدرت نیا گوشت پیدا کر دیتی ہے۔ ہم کنویں سے کتنا ہی پانی نکالیں، زمین کی رگوں سے اتنا ہی پانی اس میں آ جاتا ہے۔ یہ حقیقتِ عدل ہے جو حیات کی ہر سطح میں پائی جاتی ہے اور جس پر ارض و سما کا نظام قائم ہے اس عدل کا تقاضا ہے کہ جب ہم سے یہ دنیا چھن جائے تو ہمیں ایک اور ایسی دنیا ملنی چاہئے جہاں اس زندگی کی تمام ناانصافیوں کی تلافی ہو۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں جو لوگ انسانیت کے سب سے بڑے محسن رہے ہیں ان میں انبیاء بھی ہیں اور مصلحین امت بھی۔ وہ سب سے زیادہ ستائے گئے۔ انہوں نے انسان کو راہ راست دکھانے اور پنجۂ استبداد سے چھڑانے کیلئے بے اندازہ مصائب اٹھائے لیکن اس کے بدلے میں جن پر انہوں نے احسان کیا ان کی طرف سے انہیں کیا ملا؟ کوئی سپردِ دار ہوا اور کوئی سپردِ نار۔ کسی کو قتل کیا گیا تو کسی کو زندہ دیوار میں چن دیا گیا۔ انہیں اس زندگی میں سوائے مصیبتوں اور تکلیفوں کے کچھ نہیں ملا۔ بقول شاعر:

زمانہ یونہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ جنہوں نے انسانیت کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی وہ دنیا میں ظلم و استبداد کی علامت بن کر رہے اور جنہوں نے خالق کائنات کے مقابلے میں اپنی ربوبیت کا صور پھونکا، وہ ہمیشہ عیش و عشرت کی زندگی گزارتے اور زندگی کی نعمتوں سے فیضاب ہوتے رہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ جب چنگیز کے پوتے ہلاکو خان نے 1258ء میں بغداد پر حملہ کیا تھا تو وہاں 7 دن میں 19 لاکھ شہری موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ہلاکو اور اسی نوع کے دیگر قزاقوں اور قاتلوں کو ان جرائم کی سزا کیا ملی؟ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بیوہ کا اکلوتا بیٹا جو اس کے بڑھاپے کا سہارا تھا کسی قاتل کی گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ باقی زندگی پولیس کے چکر کاٹتی، دربدر ٹھوکریں کھاتی اور شب و روز آنسو بہاتی گزار دیتی ہے۔ اولاً تو اس کے قاتل پکڑے نہیں جاتے اور پکڑے بھی جائیں تو انہیں سزا نہیں ملتی۔ وہ رات دن یہ کہہ کہہ کر تختِ الٰہی کو ہلاتی رہتی ہے۔

Marfat.com

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مظلوم کے اوقات

اور پھر کتنے لوگ ایسے ہیں جو تخت اقتدار پر بیٹھ کر لاکھوں آدمیوں کی محرومیوں کا باعث بنتے ہیں یا ان کے قتل کا سبب ٹھہرتے ہیں اور کتنے ایسے تخریب کار ہیں جو گاڑی کی پٹڑی اکھاڑ کر یا بم پھینک کر سینکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو لقمۂ اجل بنا دیتے ہیں۔ اولاً تو ان کو سزا نہیں ملتی اور اگر ملتی بھی ہے تو ان کی ایک جان سینکڑوں اور ہزاروں جانوں کا عوض تو نہیں بن سکتی۔ ایک جان تو ایک جان کا بدلہ ہو سکتی ہے، باقیوں کا بدلہ کون دے گا؟ اگر اللہ عادل ہے اور عدل اس کی صفت ہے تو اسی صفت عدل کا تقاضہ ہے کہ ایسی دنیا ہونی چاہئے اور ایک ایسی عدالت قائم ہونی چاہئے جہاں انسانیت کے محسنوں اور قاتلوں کو اپنے اپنے کیئے کا بدلہ ملے۔ محسن لافانی مسرتوں سے ہمکنار ہوں اور مجرم قہر و عذاب کا شکار ہوں۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ؕ مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (یونس : ۵)

(وہی ہے جس نے سورج کو درخشاں اور چاند کو نور بنایا اور اس کیلئے منزلیں مقرر کیں تا کہ تم جان لو سالوں کا شمار اور حساب۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں بنایا۔ وہ تفصیل سے بیان کرتا ہے اپنی قدرت کی نشانیاں ان لوگوں کیلئے جو جاننا چاہیں۔)

گزشتہ مضمون کی مزید تسہیل

گزشتہ آیتِ کریمہ میں قیامت کے وقوع اور اللہ کی صفتِ عدل کے اظہار پر مسکت اور شافی دلائل دیئے گئے۔ اب اس آیتِ کریمہ میں اسی بات کی مزید تسہیل اور وضاحت کیلئے کچھ ایسی باتیں ارشاد فرمائی جا رہی ہیں جسے ہر روز ہماری آنکھیں دیکھتیں اور ہر رات ہمارے دل محسوس کرتے ہیں جن کے ساتھ ہماری سرگرمیاں وابستہ اور ہماری خاموشیاں پیوستہ ہیں جن کی اہمیت، افادیت اور عظمت کو دیکھتے ہوئے دل و دماغ سرنگوں ہو جاتے ہیں اور جن کی ہمہ گیری اور وسعتوں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جس شخص کو بھی اللہ نے دو آنکھیں دے رکھی ہیں اور اس کے اندر حواس پوری طرح کارفرما ہیں۔ وہ جب آفتابِ عالم تاب کو افقِ مشرق پر جلوہ افروز ہوتے دیکھتا ہے اور پھر اس کی کرنوں کو ضیاء کے جام لنڈھاتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور پھر جس کی تاثیر کبھی سمندروں سے بھاپ اٹھاتی اور کبھی غلے اور پھلوں کو پکاتی ہوئی نظر آتی ہے اور جس کی گرمی سے ہر گھر کا چولہا جل رہا ہے اور جس کی حدت اور تمازت سے انسانی زندگی کا انجن رواں دواں ہے۔ وہ جب مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو اس کی ایک ایک کرن تاریکی کے آخری حصے تک کا تعاقب کرتی ہے اور پھر جب وہ اپنی مقررہ راہ سے گزرتے ہوئے شام کے وقت پردۂ شب میں محجوب ہو جاتا ہے تو کون ہوش و خرد رکھنے والا شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اس کے سحر میں ڈوب نہیں جاتا اور پھر کون ہے کہ جو اس کی عظمت اور افادیت کے سامنے مبہوت ہو کر نہیں رہ جاتا اور سوچنے پر مجبور نہیں ہو جاتا کہ جس مخلوق کی قد و قامت، وسعت، عظمت، ہیبت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے، اس کا خالق کیسا ہوگا۔ جس نے اس کرہ کی گرمی میں کروڑوں ایٹم بموں کی طاقت بھر دی ہے جو وہ ہر وقت اگلنے میں مصروف ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ زمین کی مخلوقات کو بھسم کر کے رکھ دے۔ انہیں زندگی کی نوید دیتا اور ان کیلئے زندگی بخش ثابت ہوتا ہے۔ جب شام ہوتی ہے تو چاند آہستہ آہستہ افق سے ابھرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی روشنی ذاتی نہیں بلکہ سورج سے حاصل کرتا ہے۔ اسی لئے اس کی روشنی کو نور اور سورج کی روشنی کو ضیاء کہا گیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سورج کی روشنی جس میں ایک تپش ہے اور حدت ہے اور آنکھیں جس کا سامنا نہیں کر سکتیں اور وہ اپنے اندر پارے سے بڑھ کر چمک اور سفیدی رکھتی ہے لیکن وہی روشنی جب چاند کے پیمانہ سے ہو کر گزرتی ہے تو اس کا رنگ روپہلی ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سورج اگر چاندی بکھیرتا ہے تو یہ سونا بکھیر رہا ہے۔ اس کی روشنی بجائے گرمی کے ٹھنڈک اور سکون دیتی ہے۔ غلے میں گداز اور پھلوں میں مٹھاس پیدا کرتی ہے۔ یہ دونوں اپنے اپنے سفر پر آگے پیچھے رواں دواں رہتے ہیں لیکن کیا مجال جو سورج چاند کو جا پکڑے یا رات دن سے آگے نکل جائے۔ اس نے ہر ایک کی منزلیں مقرر کر دی ہیں، لیکن اس آیتِ کریمہ میں صرف چاند کی منزلوں کے تعین اور تقرر کا ذکر فرمایا اور اس کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ تم اس کی مدد سے دنوں اور سالوں کا حساب کر سکتے ہو۔ اسلامی شریعت میں شمسی کیلنڈر ممنوع نہیں۔ سورۃ بنی اسرائیل میں اس کی اجازت دی گئی ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں پسندیدہ قمری کیلنڈر ہے کیونکہ یہ ایسا کیلنڈر ہے جس سے ہر

Marfat.com

دور میں ہر سطح کا آدمی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اسے جاننا کوئی مشکل نہیں کیونکہ چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے اور اپنی گردش کے فلک کو 27 دن، 7 گھنٹوں اور 43 منٹوں میں طے کرتا ہے لیکن اسے اس جگہ پر پہنچنے کیلئے جہاں وہ سورج سے نور حاصل کر سکے مزید اڑھائی دن لگتے ہیں۔ اس لئے نیا چاند 29/30 دن کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ علماء فلک نے چاند کیلئے 28 منزلیں مقرر کی ہیں اور ہر منزل کو اس کے ستارے یا ستاروں کے مجموعہ سے موسوم کیا ہے جہاں وہ ہر رات پہنچ جاتا ہے۔ جب تک چاند ان منزلوں میں ہوتا ہے وہ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے پھر اگر مہینہ 29 دن کا ہو تو ایک رات اور اگر 30 کا ہو تو 2 رات نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور پھر از سر نو منزل اول سے گردش شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح سے انسانوں کیلئے سالوں کی گنتی، دن رات کا تعین اور مہینوں کا تقرر آسان ہو گیا۔ ہر شخص بڑی آسانی سے ہر علاقے میں چاہے میدانی ہو یا پہاڑی، اپنے اوقات معلوم کر سکتا ہے۔ اسلام میں عبادات کا نظام قمری حساب سے رکھا ہے اور باقی زندگی کے معاملات کو ہماری مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ شمسی حساب سے رکھو یا قمری حساب سے، لیکن یہ یاد رہے کہ قمری حساب چونکہ ہجرت سے متعلق ہے اس لئے اس کی اسلامی اور تاریخی حیثیت بھی ہے۔ بنا بریں یہ از بس ضروری ہے کہ ہجری تقویم کی عظمت و افادیت نظر انداز نہ ہونے پائے۔ شمسی تقویم سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن ہجری تقویم متروک نہ ہونے پائے۔

جس پروردگار نے ہماری زندگی کو آسان اور رواں دواں کرنے کیلئے شمس و قمر کو تخلیق فرمایا اس کی روشنی سے ہماری زندگی آسان کی اور ان کی گردش سے ہمیں تقویم عطا فرمائی۔ اس کے بارے میں یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ کائنات کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ وہ ایک دفعہ مخلوق کو پیدا کر کے اپنی قوت کھو چکا ہے۔ اب کائنات کا نظام ایسے اتفاق اور مفروضوں سے چل رہا ہے جنہیں عقل کیلئے تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اس نظام کو دیکھ کر کون باور کر سکتا ہے کہ یہ از خود وجود میں آنے والا نظام ہے اور اس کے پیچھے کوئی حکمت نہیں۔ گویا یہ کسی کباڑیئے کا مال گودام ہے حالانکہ اس کا ایک ایک گوشہ اس کے خالق کی عظیم قدرت اور اس کی بے پایاں رحمت و ربوبیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کی ہر مخلوق کی تخلیق میں نہایت اعلیٰ درجہ کا اہتمام، بینظیر ترتیب اور نظم دکھائی دیتا ہے۔ اللہ نے اس کی ہر چیز کو ایک مقصد دے کر پیدا فرمایا ہے۔ پانی کے ایک قطرے، ریت کے ایک ذرے اور پھول کی ایک پنکھڑی اور درخت سے پھوٹنے والی ایک کونپل سے لے کر آسمان کے ستاروں، سیاروں اور ثوابت پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک ایسے خالق کی تخلیق ہے جس کی قدرت و حکمت کی کوئی انتہاء نہیں۔ جس نے ہر چیز کو با مقصد اور با غایت بنایا۔ نہ یہاں پھول بے مقصد کھلتا ہے اور نہ بے سبب کانٹے کی نوک تیز ہوتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے انسان جیسے گلِ سرسبد کو بے مقصد زندگی دے کر پیدا کر دیا ہے۔ اسے عقل جیسی نعمت کھیل تماشے کیلئے عطا کی گئی ہے۔ اس پر وحی الٰہی اس لئے اترتی رہی ہے کہ وہ گھروندے بناتا ہے اور توڑتا رہے۔ اس لئے فرمایا کہ اللہ نے ان میں سے کوئی چیز بھی بے مقصد نہیں بنائی اور وہ اپنی بعض مخلوقات کی طرف توجہ دلا کر تمہارے سامنے اپنی نشانیاں کھولتا ہے تاکہ تمہیں حقیقت شناسی میں آسانی ہو۔

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۞ ﴿یونس ٦﴾

(بے شک گردش لیل و نہار میں اور جو کچھ پیدا فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین میں نشانیاں ہیں اس قوم کیلئے جو متقی ہے۔)

دلائل آفاق نہایت سہل انداز میں

قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ وہ دلائل میں فلسفیانہ انداز اختیار نہیں کرتا اور ایسی بات کو دلیل میں پیش نہیں کرتا جس کا سمجھنا عام انسانی عقل کیلئے دشوار ہو۔ وہ بالکل سامنے کی بات کرتا ہے اور براہِ راست انسان کی فطرت اور اس کے دل پر دستک دیتا ہے۔ وہ ایسے بدیہیات سے حقائق کو استنباط کرتا ہے جو انسان کے معمول کا حصہ اور اس کی جانی پہچانی چیزیں ہیں۔ لیل و نہار کی گردش ہمارا روزمرہ ہے۔ کون زندہ شخص ہے جسے دن کے اجالے اور رات کی تاریکی سے واسطہ نہیں پڑتا۔ ہر آدمی دیکھتا ہے کہ سورج کے طلوع ہونے سے دن نکلتا ہے اور سورج کی گرمی اور روشنی ہماری معیشت کا سامان کرتی ہے۔ زندگی کی ساری ہما ہمی اسی سبب سے ہے اور رات کی خاموشی اور اس میں چاند کی لوریاں دیتی ہوئی روشنی آرام اور راحت کا بستر بچھا دیتی ہیں لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سورج نے نکلنے سے انکار کر دیا ہو یا اس نے چاند کو روشنی بہم پہنچانے سے تخلف کیا ہو یا شب و روز کی گردش میں کبھی فرق آیا ہو، اگر ایسا ہوتا تو کبھی موسم وجود میں نہ آتے۔ اگر زمین کا رخ سیدھا سورج کی طرف ہوتا تو ہم بہار اور خزاں سے محروم ہو جاتے۔ اگر زمین کی گردش میں تبدیلی آجاتی تو جون کا طویل دن ہمیں بھسم کر دیتا اور دسمبر اور جنوری کی طویل رات ہر چیز کو جما دیتی۔ گردش کے معمولی تغیر سے ہماری تمام جنتریاں غلط ہو جاتیں

Marfat.com

سورج جیسا کرہ اپنے بے پناہ حجم اور اپنی بے پناہ قوت کے باعث کچھ بھی کر سکتا ہے اور زمین کی گردش میں کبھی بھی تغیر واقع ہو سکتا ہے لیکن حیرانی ہے کہ ہزار ہا سال سے جب سے ان کی تخلیق ہوئی ہے کبھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ زمین اور آسمان آپس میں تخالف کی نسبت رکھتے ہیں اور رات اور دن کا نظام ایک دوسرے سے یکسر متضاد ہے۔ زمین کے پہلو میں سمندر اور دریا ہیں اور سورج آگ برساتا ہے۔ کبھی اس کا خطرہ پیدا نہیں ہوا کہ وہ پانی کو خشک کر دے گا بلکہ حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس کی کرنیں سمندر سے ڈول بھر بھر کر فضاء میں ابر کی چادریں بچھا دیتی ہیں اور جب زمین آبیاری کی درخواست کرتی ہے تو یہی بادل اس کے جواب میں پانی برساتا ہے۔ زمین نہ تو پانی کو نگلتی ہے کہ دلدل بن جائے اور نہ اگلتی ہے کہ آبیاری نہ ہو سکے۔ زمین سے نکلنے والی ہر کونپل کو سورج کی گرمی جلانے کی بجائے پالتی اور پختہ کرتی ہے۔ غور کیجئے کہ کس طرح سورج اور چاند زمین اور آسمان اور ان کی گردشوں میں قدم قدم پر تضاد اور تخالف ہے لیکن بجائے اس تخالف کے اظہار کے ہمیں توافق نظر آتا ہے جس کے نتیجے میں انسانی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں۔ یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اگر تخالف عناصر رکھنے والے کرے اپنی مرضی میں آزاد ہوتے اور کسی بالادست قوت کے قانون نے انہیں باندھ نہ رکھا ہوتا تو زمین پر ایک تباہی اور ہلاکت کی حکومت ہوتی۔ بجائے انسانی ضرورتیں پوری ہونے کے انسانی زندگی ناممکن ہو جاتی۔ اسی حیران کن حکمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اس گردش لیل و نہار اور آسمانوں اور زمین کی مخلوق میں نشانیاں ہیں لیکن ان لوگوں کیلئے نہیں جو نشانیوں کو دیکھ کر وہیں مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں کائنات کا حُسن و جمال دنگ کر دیتا ہے۔ اس جہاں کی وسعتیں، فراخیاں، بلندیاں اور پستیاں ان کی چشمِ ہوش کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ وہ ہر چیز کے ظاہر تک پہنچ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی تحقیق کی معراج تک پہنچ گئے ہیں۔ وہ پھول کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس کے رنگ و بو اور اس کی خوشبو سے اس طرح فائدہ اٹھانا ہے جس سے ہمارا مشامِ جاں معطر ہو جائے یا زیادہ سے زیادہ ہم اس سے گل قند بنا سکیں لیکن وہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ اگر مقصود صرف خوشبو ہوتی تو پھر یہ خوبصورت رنگ و روپ جو پھول کو عطا کیا گیا ہے اس کی کیا ضرورت تھی اور اگر صرف اس سے گل قند ہی بنانا تھی تو خوشبو کی بھی کیا حاجت تھی۔ یہ چیزیں بھی اس سے مقصود تھیں لیکن اصل مقصود اس خالق کی معرفت تھی جس کی صفتِ تخلیق نے ایسی حیرت انگیز مخلوقات کو وجود بخشا۔ لیکن یہ حکمت و دانش ان کو نصیب ہوتی ہے جن کی نگاہیں دنیا کی رعنائی اور زیبائی، قوت و تاثیر اور خوبی و کمال میں اٹک کر نہیں رہ جاتیں بلکہ وہ ان کے واسطے سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتے اور اس کے دیدار سے مشرف ہوتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی دولت عطا کی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴿یونس ۷۔۸﴾

(حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور وہ دنیا کی زندگی ہی پر راضی اور مطمئن ہو گئے اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا نارِ جہنم ہے۔ ان برائیوں کی پاداش میں جن کا وہ اکتساب کرتے تھے۔)

انسان کا اصل روگ اور اس کا صحیح علاج

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں پروردگار آخرت کے ثبوت اور حقیقتِ نفس الامری کیلئے ایک تجرباتی دلیل پیش فرما رہے ہیں جس کی صداقت کی تائید انسانوں کا عمل کرتا ہے اور یہ ایک ایسی پختہ دلیل ہے جو تاریخ کے ہر دور میں موجود رہی ہے اور کوئی قوم بھی اس کے اظہار میں پیچھے نہیں رہی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے اعمال کے اعتبار سے دو طرح کے رہے ہیں، اچھے اور برے۔ معاشرے کیلئے مفید اور نقصان دہ۔ انسانیت کی دلیل اور انسانیت کیلئے تہمت۔ قابلِ فکر اور قابلِ تقلید اور قابلِ شرم اور قابلِ نفرت۔ تاریخ کے ہر دور میں آپ کو ایسے انسان ملیں گے اور آج بھی دنیا ان دونوں طرح کے انسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسانوں کی یہ تقسیم ہر دور کی ایک حقیقت رہی ہے اور کسی دور کو آپ اس سے خالی نہیں پاتے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

بہتر انسانوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اچھے انسان پیدا ہوں اور انسانوں کو اچھائی اور بھلائی کی طرف مائل کیا جائے تاکہ انسانیت کی قسمت میں پتھر نہ پڑیں اور انسانی زندگی الجھنوں کی شکار نہ ہو۔ چنانچہ ہر دور کی طرح اس دور میں بھی جب سنجیدہ فکر لوگوں نے اس پر غور کیا تو ان کی سوچ کا نتیجہ

Marfat.com

مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آیا۔ اگر ہم اسے لپیٹ کر بیان کریں تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے انسانوں کے بگاڑ کا ذمہ دار چند عوارض کو ٹھہرایا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر یہ عوارض دور کردیئے جائیں تو انسان کو انسانیت کے جامہ میں لایا جاسکتا ہے۔ وہ عوارض کم وبیش ہوسکتے ہیں لیکن عموماً مندرجہ ذیل عوارض پر سمجھدار لوگوں کا اتفاق رہا۔ (1) جہالت، (2) ضروریات زندگی کا فراہم نہ ہونا یعنی غربت کا عام ہوجانا (3) قانون سے بے خبری، (4) قانون کی بالادستی کا فقدان، (5) احتسابی اداروں کا کمزور پڑجانا یا کرپٹ ہوجانا، (6) حکومت کا عدم استحکام اور اس کے نتیجے میں عوام میں انارکی۔ یہ وہ اسباب ہیں جن پر ہمیشہ اہل دانش کا اتفاق رہا کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی سبب انسانی بگاڑ کا باعث ہوتا ہے اور اگر ان اسباب کو دور کردیا جائے تو انسانی اخلاق اور انسانی رویوں میں بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔ تاریخ کے گزشتہ ادوار کو تو چھوڑیئے لیکن آج کا انسان جن حالات سے گزر رہا ہے انہیں ہم دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ آج کی دنیا تین حصوں میں تقسیم ہے۔ (1) ترقی یافتہ، (2) ترقی پذیر، (3) پسماندہ۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کی بحث کو تو چھوڑیئے لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں سے بیشتر کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم نے اپنے معاشروں، اپنے سماج اور اپنے ملکوں میں مندرجہ بالا خرابی کے اسباب میں سے کوئی سبب باقی نہیں رہنے دیا۔ علم کی اشاعت کیلئے تعلیمی اداروں کا جال بچھا دیا گیا۔ غربت کے علاج کیلئے گزارہ الاؤنس مقرر کردیا گیا اور حکومتوں کو رفاہی شکل دے دی گئی۔ جابجا قانونی ادارے کھول دیئے گئے اور وکلاء کی سہولت ہر شخص کو مہیا کردی گئی۔ قانون کی بالادستی کو یقینی بنادیا گیا اور انصاف کو گھروں کی دہلیز تک پہنچادیا گیا۔ احتسابی ادارے اس قدر مضبوط ہوگئے کہ جرم کرنے والا ان کی نگاہوں سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ کیمرے کی آنکھ ہر وقت ان کے تعاقب میں رہتی ہے۔ حکومتیں اس قدر مستحکم کردی گئیں کہ وہاں کبھی بحران سر نہیں اٹھاتا۔ اس طرح سے ان اسباب میں سے ایک ایک سبب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا۔ اس کے بعد ہونا تو یہ چاہئے کہ ایسے ممالک جنت کا نمونہ بن جائیں اور وہاں کسی شخص کے جان و مال و عزت کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو، لیکن نہایت دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ان ملکوں کے سنٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن کی طرف سے جو سالانہ رپورٹیں چھپتی ہیں انہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ رپورٹیں انہیں ملکوں کی ہیں۔ وہاں تو جرائم کی شرح پسماندہ ملکوں کو بھی شرماتی ہے۔ وہاں بھی جان مال اور عزت اسی طرح خطرے میں ہے جیسے پسماندہ ممالک میں، بلکہ انتہائی ترقی یافتہ ممالک جو دنیا پر خدائی کے دعویدار ہیں ان کی خودسری، ظالمانہ روش، انسان دشمنی، انسانوں کی تقسیم اور اپنے ملکی اور قومی مفادات کیلئے دوسرے ملکوں کو ادھیڑ ڈالنا اور ظلم کی داستانیں رقم کردینا جیسی حرکتوں میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے اور ان کی قوت اور تباہی کے وسائل کی وسعت کے سامنے انسانیت کا مستقبل روز بروز تاریک تر ہوتا جارہا ہے۔ ایسی صورتحال کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان اسباب کے دور کردینے سے انسان میں بہتری آسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے آج تک انسان کے جن عوارض کو حقیقت میں عوارض سمجھا ہے وہ انسانیت کے عوارض ضرور ہیں لیکن وہ حقیقی نہیں۔ انسان کا مرض کچھ اور ہے اور یہ اسباب صرف اس کے مظاہر ہیں۔ قرآن کریم نے ان آیاتِ کریمہ کو انسان کے اصل روگ کی نشاندہی کی ہے اور پھر اس کا اصل علاج بتایا ہے اور اس کیلئے محض مفروضوں پر گفتگو نہیں کی اور نہ الفاظ کی طلسم آرائی سے کام لیا اور بلکہ اس کے ثبوت کیلئے تاریخ سے گواہی دلوائی ہے۔ پیشتر اس کے کہ میں اس حقیقی روگ کا ذکر کروں جس نے ہمیشہ انسانی زندگی کو تاراج کیا ہے اور اس کا حقیقی علاج آپ کے سامنے لاؤں۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ اس علاج پر مبنی ایک تجربہ جو کہ 1400 سال پہلے کیا گیا تھا اس کا آپ سے ذکر کروں۔ اس سے آپ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ جب ہمارے سامنے ایک کامیاب تجربہ موجود ہے۔ اور جبکہ ہم بار بار کے تجربات سے ناکامی کے زخم اٹھا چکے ہیں تو ہمیں اسے اختیار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔ اس تجربہ کے حوالہ سے یہ بات چیت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ جن لوگوں میں اس کا تجربہ کیا گیا ایسا نہیں تھا کہ ان کا بگاڑ معمولی نوعیت کا تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ جزیرۂ عرب جس کو سب سے پہلے اس تجربہ کیلئے چنا گیا اور پھر اسے بیس (Base) بنا کر باقی پوری نوع انسانی کو وہ نسخۂ کیمیا مہیا کیا گیا، وہ نفرتوں، عداوتوں اور جرائم کا جہنم بنا ہوا تھا۔ قدم قدم پر قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ لوٹ مار کو بہادری اور دلاوری سمجھا جاتا تھا۔ گھر کے باہر انسان کی جان اور گھر کے اندر اس کی عزت و عصمت ہر لحظہ خطرے میں تھی۔ خود اپنے جگر کے ٹکڑوں کو زندہ درگور کرتے ہوئے انہیں کبھی رحم نہیں آتا تھا۔ ماں، باپ اور بہن کے رشتے پامال ہوچکے تھے۔ راہ چلتے قافلے بھی لٹنے سے محفوظ نہیں رہتے تھے۔ انسان اپنی شقاوت اور بدبختی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا لیکن تجربہ کرنے والے نے انسانی اصلاح کا جب آغاز کیا تو اس نے نہایت اعتماد کے ساتھ یہ کہا کہ لوگو! آج جب تم اپنے جزیرے کو جہنم بنا چکے ہو ایک وقت ایسا آنے والا ہے کہ ایک عورت تن تنہا مکہ سے حیرہ تک اکیلی سفر کرے گی اور اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا اور پھر دنیا نے دیکھا کہ جیسے جیسے یہ تجربہ آگے بڑھتا گیا وہ جزیرۂ عرب جہاں کبھی نفرتوں اور عداوتوں کے کانٹے اگتے تھے اور جہاں کسی کی جان و مال اور

Marfat.com

آبرو کو کوئی پناہ نہیں تھی اسی جزیرے میں محبت والفت اور امن وآشتی کے پھول کھلنے لگے۔ حتیٰ کہ صرف 23 سال کے عرصہ میں 12 لاکھ مربع میل علاقے میں ایک ایسا کوثر وتسنیم میں دھلا ہوا معاشرہ پروان چڑھا جس کی نظیر چشم فلک نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تجربہ اور اس کے نتیجے میں پیش آمدہ انقلاب وہ تھا جسے آج سے 1400 سال پہلے سرکار دوعالم ﷺ نے برپا فرمایا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس انقلاب میں علم کی طاقت بھی تھی اور انسانی احتیاج کے دور کرنے کو بھی مناسب جگہ دی گئی تھی۔ اس میں قانون کو بالادست بھی بنایا گیا تھا، اس میں کسی حد تک احتسابی ادارے بھی اپنا کام کر رہے تھے لیکن اس میں سب سے زیادہ جس بات پر زور دیا گیا تھا وہ اس حقیقی مرض کو دور کرنا تھا جس کی وجہ سے ہمیشہ انسان بگڑتا ہے اور پھر اس بگاڑ سے نہ اسے تعلیم روکتی ہے اور نہ دولت مندی اس کا ہاتھ روکتی ہے۔ ہندوستان کا آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن جو شاہی خاندان کا فرد اور اپنے ملک میں وزیر دفاع بھی رہا اور پھر لارڈ ہونے کی وجہ سے مالی استحکام بھی رکھتا تھا۔ بایں ہمہ یہ چیزیں اس کو جرم کرنے سے نہ روک سکیں اور وہ اپنے ڈیری فارم میں دودھ میں پانی ملاتے ہوئے پکڑا گیا اور عدالت نے اسے جرمانہ کی سزا بھی دی۔ اس کے پاس دولت تھی، علم تھا وہ سب کچھ تھا جو انسان کو بظاہر انسان بننے کیلئے کافی ہے لیکن چونکہ اس کے حقیقی مرض کا علاج نہیں کیا گیا تھا تو وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک صالح انسان نہ بن سکا۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا تھا:

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ

اسلام نے یہی سوزِ جگر دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ جرائم کا اصل سبب نہ فقر وافلاس ہے نہ ناخواندگی نہ احتسابی محکموں کی قلت اور نہ قانون سے بے شعوری بلکہ ان جرائم کا اصل سبب وہ بیمار ذہنیت ہے جس نے افق سے افق تک پھیلی ہوئی اس دنیا کو اپنا سب کچھ سمجھ رکھا ہے۔ جو اس مادی دنیا کے اس طرف جھانکنے کی صلاحیت سے محروم ہے اور جس کے نزدیک صرف چند روزہ زندگی کے مادی منافع اور نفسانی لذتیں ہی انسان کی معراج ہیں۔

انسان کے ذہن میں جرم کا بیج دراصل اس وقت پڑتا ہے جب وہ یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ میرے نفع وضرر کی ساری کائنات صرف اسی دنیاوی زندگی میں سمٹی ہوئی ہے اور میری لذت وراحت اور رنج وتکلیف کی انتہا قبر کے کنارے ہونے والی ہے۔ لہٰذا اگر میں نے یہاں زیادہ سے زیادہ دولت زیادہ سے زیادہ شہرت اور زیادہ سے زیادہ لذت وآسائش حاصل نہ کی تو گویا اپنی ساری عمر برباد کر دی اور ہمیشہ کیلئے محروم ہو گیا۔ محرومی کا یہ خوف ہی دراصل سارے جرائم کی بنیاد ہے اور یہ خوف اس آخرت ناآشنا ذہنیت سے پیدا ہوتا ہے جو مرنے کے بعد کسی ابدی زندگی کی قائل نہیں۔ جو یہ سمجھتی ہے کہ جب موت میری آنکھیں بند کر دے گی تو پھر وہ کبھی نہیں دیکھ سکیں گی۔ جسے آخرت کی پیش گوئیاں معاذ اللہ محض افسانہ معلوم ہوتی ہیں یہی خیالات ہیں جو انسان کی ہوس کو بھڑکا بھڑکا کر ایک نہ مٹنے والی بھوک اور نہ بجھنے والی پیاس میں تبدیل کر دیتے ہیں پھر انسان کو لذت وراحت کی کسی منزل پر قرار نہیں آتا۔ وہ عیش وآرام کے کسی درجے پر قانع نہیں ہوتا۔ دنیاوی محرومی کا خوف ایک بھوت کی طرح اس کے اعصاب پر مسلط ہو جاتا ہے اور اسے دنیا طلبی کے جنون میں مبتلا کر کے اس مقام پر لے آتا ہے جہاں اپنی اور صرف اپنی ہوس کے تسکین کے سوا زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہتا اور اس مقصد کی تکمیل کیلئے اسے بدتر سے بدتر راستہ اختیار کرتے ہوئے بھی کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔ لہٰذا جب تک یہ بیمار ذہنیت ختم نہ ہو اس وقت تک انسانوں کی کوئی تہذیب جرائم کو ختم نہیں کر سکتی۔ قانون اور اس کی تنفیذ کے ادارے خواہ کتنے ترقی یافتہ ہو جائیں لیکن اگر انسان میں یہ آخرت فراموش ذہنیت باقی ہے تو وہ ان کی ہر چال کا جواب اور ہر تدبیر کا توڑ ایجاد کرتی رہے گی۔ موجودہ دنیا کا تجربہ شاہد ہے کہ جو انسانی ذہانت جرائم کی تحقیق وتفتیش کے ترقی یافتہ طریقے دریافت کر سکتی ہے وہ ارتکاب جرائم کے نئے نئے ڈھنگ نکالنے پر بھی قادر ہے اور جب آگے بڑھنے کی رفتار دونوں طرف برابر ہو تو مجرم اور اس کا تعاقب کرنے والے کے درمیان ہمیشہ ایک ہی فاصلہ برقرار رہے گا اور اس میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔ مختصر یہ کہ انسانی سیرت وکردار کی اصلاح کیلئے اگر کوئی نسخہ کامیاب ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان کے دل ودماغ میں آخرت کا تصور راسخ کیا جائے اور اسے یقین دلا دیا جائے کہ یہاں کی دنیا اصل دنیا نہیں، یہاں کا رنج وراحت ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں۔ ایک ابدی اور پائیدار زندگی آگے آنے والی ہے جسے آخرت کہتے ہیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیشی ہوگی اور دنیا میں کئے ہوئے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ اگر آج اس حقیقت کا ادراک نہ کیا گیا اور زندگی من مرضی سے گزاری اور خواہشات نفس کے اتباع کو اپنا معمول بنائے رکھا تو یہ زندگی بھی دکھوں اور مصیبتوں میں گزرے گی اور آخرت میں جہنم ٹھکانا ہوگا۔

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝
دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(یہ بھی حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اعمال کرتے رہے، انہیں ہدایت کرے گا ان کا رب، ان کے ایمان کی وجہ سے، بہتی ہیں ان کے نیچے سے نہریں وہاں ان کی صدا یہ ہوگی کہ پاک ہے تو اے خدا اور ان کی دعا اس میں (یہ ہوگی) سلامتی ہو، اور اس کی دعا کا خاتمہ اس پر ہوگا کہ ساری تعریف اللہ رب العالمین کیلئے ہے۔) ﴿یونس ۹-۱۰﴾

آخرت کی فکر کا انجام

سابقہ آیت میں ان انسانوں کا انجام بتایا گیا ہے جو آخرت سے غافل اور دنیا کی زندگی سے جی لگا کے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر نشانی انہیں آخرت کی یاد دلاتی ہے لیکن وہ غفلت کے مارے کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے بلکہ دنیا ہی کی زندگی کو اپنا سب کچھ سمجھتے ہیں بالآخران کا انجام یہ ہوگا کہ جہنم ان کا ٹھکانا ہوگا۔ اب پیشِ نظر آیت کریمہ میں دوسری طرح کے لوگوں کا انجام بیان کیا جارہا ہے جنہوں نے اللہ کے نبی کی دعوت کو قبول کیا اور اس بات پر یقین لے آئے کہ یہاں کی زندگی حقیقی زندگی نہیں بلکہ یہ آخرت کی زندگی کی تیاری کیلئے ایک مہلتِ عمل ہے۔ یہاں رہ کر قدم قدم پر آزمائشیں ہیں جن کے ذریعے انسانوں کا امتحان لیا جاتا ہے کہ تم دنیا ہی کو اپنی منزل سمجھتے ہو یا اس دنیا کو اس طرح برتو گے اور اس طرح اس میں زندگی گزارو گے کہ جس سے تم آخرت میں سرخرو ہوسکو۔ چنانچہ جن لوگوں نے اللہ کے نبی کی ہدایت پر آخرت کو اپنی منزل بنالیا اور اپنے اعمال کو اس قالب میں ڈھال لیا جس کی ہدایت لے کر اللہ کے نبی آئے تھے اور زندگی کا ہر عمل اللہ اور رسول کے احکام کے مطابق انجام دیا۔ مرتے دم تک اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت کی۔ اعلائے کلمۃ الحق کو اپنا مقصد سمجھا اور ہر قدم اس طرح اٹھایا جس کا آخرت میں جواب دیا جاسکے۔ چنانچہ یہ لوگ ایمان اور عمل صالح لے کر جب دنیا سے گزر جائیں گے تو اللہ انہیں جنت کا راستہ دکھائے گا۔ یہاں اس آیت میں ہدایت دینے سے مراد جنت تک پہنچانا ہے کیونکہ ہدایت کبھی راستہ دکھانے کو کہتے ہیں اور کبھی مطلوب تک پہنچانے کو کہتے ہیں۔ اللہ کے نبی نے جو راستہ دکھایا، یہ اس راستے پر چلتے رہے اور اسی پر زندگی گزاری۔ آخر ایک وقت آیا کہ اللہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور انہیں جنت تک پہنچادیا۔ پھر اس جنت کا شوق تیز کرنے کیلئے فرمایا کہ تمہیں جو جنت دی جائے گی اس کے نیچے سے ندیاں رواں ہوں گی جس کے باغات میں نعمتوں کی بہار لہلہائے گی اور ایسی ایسی نعمتیں میسر آئیں گی جو انسان کے ادراک سے بھی بالاتر ہے۔ چنانچہ مومن اپنی آنکھوں سے اللہ کے رسول کے وعدوں اور قرآن کریم کی بشارتوں کا مصداق چاروں طرف پھیلی ہوئی نعمتوں کی شکل میں دیکھیں گے تو بے ساختہ زبان سے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کے الفاظ نکلیں گے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یا اللہ تو پاک ہے اس بات سے کہ تیرا کوئی وعدہ غلط ثابت ہو۔ ہم نے جو سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ ہم نے جو گمان کیا تھا وہ سچا ثابت ہوا۔ پھر اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں پر اہل جنت ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے۔ مبارک سلامت کا ایک شور ہوگا جو چاروں طرف گونج رہا ہوگا۔ تَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ اسی کی تعبیر ہے۔ بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں دعویٰ کا معنی دعا ہے لیکن جنت میں پہنچنے کے بعد کوئی ایسی نعمت نہیں ہوگی جس کیلئے اہل جنت دعا کرسکیں۔ جو کچھ ان کے سامنے ہوگا وہ ان کے تصور سے بھی فزوں تر ہوگا۔ اس لئے ان کی زبان سے دعا کی بجائے بار بار سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ نکلے گا۔ گویا یہی ان کی دعا ہوگی اور یہی ان کی تسبیح ہوگی۔ اور اس کلمہ تسبیح میں وہ ایسی لذت محسوس کریں گے کہ یہ بجائے خود ان کیلئے سب سے بڑی نعمت بن جائے گی۔ اور اگر ایک حدیث کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر تو اس نعمت کا کیا کہنا! حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بندہ میری حمد وثنا میں ہر وقت لگا رہے یہاں تک کہ اس کو اپنے مطلب کی دعا مانگنے کی بھی فرصت نہ رہے تو میں اس کو تمام مانگنے والوں سے بہتر عطا کروں گا۔ یعنی بے مانگے سب کچھ دے دوں گا۔ اس حیثیت سے سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ کے دعا ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے صحیح بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول کریم ﷺ کو جب کوئی تکلیف اور بے چینی پیش آتی تو آپ یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِیْمُ الْحَلِیْمُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَرَبُّ الْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِیْمِ۔

اللہ کی طرف سے برستی ہوئی نعمتوں اور چاروں طرف پھوٹتے ہوئے خوشیوں کے فواروں اور اہل جنت کے چہروں سے ابلتی ہوئی مسرتوں اور فرشتوں کی زبانوں سے تہنیت اور خوش آمدید کے کلموں سے فضاء میں ایک ایسی روحانیت کا ارتعاش پیدا ہوگا جس سے ہر جنتی کے دل میں اہتزاز کی لہر اٹھے گی وہ بے ساختہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پکارے۔

Marfat.com

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ
أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١١﴾
وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا ۚ
فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَنْ لَمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَسَّهُ ۚ كَذَٰلِكَ
زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ
قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا ۙ وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا
لِيُؤْمِنُوا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ﴿١٣﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ
خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾ وَإِذَا
تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ
بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ
تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ
عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٥﴾ قُلْ لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهُ
عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ قَبْلِهِ ۚ
أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا أَوْ
كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُونَ ﴿١٧﴾ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ
اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا

Marfat.com

عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى
الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَمَا كَانَ النَّاسُ
اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ
لَقُضِىَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ
عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّىْ مَعَكُمْ
مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾ ع

(اگر اللہ تعالیٰ جلدی کرتا لوگوں کو عذاب پہنچانے میں جتنی وہ دنیا کی بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مہلتِ عمل کبھی کی ختم کردی گئی ہوتی۔ ہم چھوڑے رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے تاکہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ جب انسان کو کوئی سخت تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ لیٹا ہوا یا بیٹھا ہوا یا کھڑا ہوا۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کردیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے جیسے اس نے کسی تکلیف میں جو اسے پہنچی تھی کبھی ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح حدود سے تجاوز کرنے والوں کی نگاہوں میں ان کے کرتوت خوشنما بنادیئے گئے ہیں۔ بیشک ہم نے تم سے پہلے کئی عظیم قوموں کو ہلاک کیا جب وہ زیادتیاں کرنے لگے اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ ایسے نہیں تھے کہ ایمان لاتے۔ اسی طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں۔ اب ہم نے تمہیں ان کے بعد زمین میں ان کا جانشین بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ردوبدل کرو۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کچھ ترمیم کردوں۔ میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں یہ قرآن تم کو کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس سے کبھی باخبر نہ کرتا۔ میں اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ بیشک مجرم فلاح پانے والے نہیں بنیں گے۔ اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچا سکیں اور نہ نفع۔ اور کہتے ہیں یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے کیا تم اللہ کو خبر دیتے ہو ایسی بات کی جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں۔ وہ پاک اور بالا و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور نہیں تھے

Marfat.com

لوگ مگر ایک ہی امت۔ پھر انہوں نے اختلاف کیا اور اگر تیرے رب کی جانب سے ایک بات پہلے سے طے نہ پا چکی ہوتی تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان۔ جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی تو آپ کہہ دیجئے کہ غیب کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے۔ تو تم لوگ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔)

وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰہُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَھُمْ بِالْخَیْرِ لَقُضِیَ اِلَیْھِمْ اَجَلُھُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ ﴿۱۱﴾ ﴿یونس : ۱۱﴾

(اگر اللہ تعالیٰ جلدی کرتا لوگوں کو عذاب پہنچانے میں جتنی وہ دنیا کی بھلائی مانگنے میں جلدی کرتے ہیں تو ان کی مہلتِ عمل کبھی کی ختم کر دی گئی ہوتی۔ ہم چھوڑے رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہم سے ملاقات کی توقع نہیں رکھتے تاکہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔)

سابقہ رکوع میں پروردگارِ عالم نے اسلام کے تین بنیادی عقائد کو بیان فرمایا ہے اور بطورِ خاص آخرت کے عقیدے پر زور دیا گیا ہے کیونکہ توحید اور رسالت کے عقائد کو تسلیم کر لینا بے معنی رہتا ہے اگر آخرت کو تسلیم نہ کیا جائے کیونکہ جو آدمی اس بات سے بے خبر یا بے نیاز ہے کہ ایک دن ہم سب کو دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہماری حاضری ہوگی۔ وہاں اس زندگی میں کیے ہوئے ایک ایک عمل سے متعلق سوال کیا جائے گا اور پھر اسی پر ہماری جزاء وسزا کا انحصار ہوگا۔ ایسے شخص کی زندگی میں کسی تبدیلی کی توقع نہیں کی جاسکتی لیکن جب کسی آدمی کو اس جوابدہی کا یقین ہو جاتا ہے اور وہ حتمی انداز میں یہ جان لیتا ہے کہ قیامت کے بعد اگلی زندگی شروع ہوگی اور اس کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی پر ہے تو اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی ہر سوچ اور ہر عمل سے بچتا ہے جو آخرت کی کامیابیوں کو گدلا سکتا ہے اور ایسے ہر تصور اور ہر عمل کی طرف مشتاقانہ لپکتا ہوا جاتا ہے جو اس کی آخرت کی زندگی کو سنوار سکتا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مستحق بنا سکتا ہے۔

اب اس آیتِ کریمہ میں چند ایسی باتوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جن کی وجہ سے آخرت کے تصور کو نقصان پہنچتا ہے اور آدمی بڑھتے بڑھتے اس انتہا تک پہنچ جاتا ہے جس میں مشرکینِ عرب پہنچ چکے تھے۔

آخرت کے عقیدہ کو نقصان پہنچانے والے تصورات

مشرکین کی بُری عادتوں یا ان کے بُرے رویوں میں سے ایک بات یہ تھی کہ وہ بداعمالیوں اور فکر ونظر کی کوتاہیوں سے ایسے بے پروا ہو گئے تھے کہ بڑی سے بڑی کوتاہیِ فکر اور بدترین بداعمالی بھی انہیں بری محسوس نہیں ہوتی تھی۔ خیر وشر میں امتیاز کا ذوق بالکل مٹ چکا تھا۔ انہیں ان کی کسی کوتاہی یا گمراہی پر اگر توجہ دلائی جاتی تو بجائے اس پر غور کرنے کے وہ کہنے والے کا منہ نوچنے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ البتہ اپنی خواہشات کا ذوق اور انہیں پورا کرنے کی ہوس وہ روز افزوں تھی۔ زندگی کی ضروریات سے لے کر تعیشات تک ہر چیز ان کی نگاہوں میں رہتی تھی اور رات دن ان کے حصول میں لگے رہتے تھے اور جن چیزوں کو اپنی وسعت وامکان سے دور سمجھتے تھے ان کیلئے کبھی اپنی شرکاء کے سامنے اور کبھی اللہ کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے تھے اور پھر ایسی لجاجت اور بے صبری سے دعائیں مانگی جاتی تھیں کہ ہر روز اس بے قراری میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پروردگار اس آیتِ کریمہ میں یہ فرما رہے ہیں کہ تم رات دن اپنی خواہشات کے حصول میں دیوانہ ہوئے جاتے ہو اور تمہاری یہ خواہشیں بے قراریوں میں ڈھلتی جاتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اگر تمہیں منہ مانگی چیزیں نہ ملیں تو تم شاید زندہ نہ رہ سکو۔ لیکن تمہیں کبھی بھول کر بھی اس کا خیال نہیں آتا کہ جس اللہ سے تم اس قدر الحاح وزاری سے دعائیں مانگتے ہو شب وروز اس کی کس قدر نافرمانی کرتے ہو۔ اس کی صفات اور حقوق میں تم نے کتنی قوتوں کو شریک کر رکھا ہے اور تمہارے اعمال اور اخلاق قدم قدم پر تمہاری نافرمانیوں کی داستان سناتے ہیں۔ تم جس طرح خواہشات کی طلب میں حریص واقع ہوئے ہو کبھی اس کا تھوڑا سا اظہار اپنے اعمال واخلاق کی اصلاح کیلئے بھی کر سکو تو تمہاری زندگی سنور سکتی ہے۔ تمہیں دیوانگی تو اپنی خواہشات کو بروئے کار لانے کی ہے حالانکہ تمہاری بداعمالیاں وہ بار بار غضبِ الٰہی کو دعوت دیتی ہیں۔ جیسے تم اپنی طلب میں جلدی مچاتے ہو اگر اللہ تعالیٰ بھی تمہاری بداعمالیوں پر گرفت کرنے میں ایسی ہی جلدی کرتا تو اندازہ کرو کہ

Marfat.com

کس مصیبت میں مبتلا ہو جاتے بلکہ اندیشہ ہے کہ تمہارا نام ونشان مٹ جاتا لیکن ہماری رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ تم بیشک اپنی جھوٹی آرزوؤں کو پورا کرنے میں اندھے ہو جاؤ لیکن ہماری رحمت ضرور تمہیں مہلت دیتی رہے گی۔

دوسرا مطلب اس آیتِ کریمہ کا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں قیامت کے دن کی باز پرس اور جوابدہی سے متنبہ کیا اور انہیں آگاہی دیتے ہوئے یہ بھی بتلایا کہ جس طرح قیامت کا آنا یقینی ہے اور اس دن ایک ایک پل اور ایک ایک عمل کا حساب ناگزیر ہے اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر تم نے اللہ کے نبی پر ایمان لانے میں کوتاہی کی تو کسی وقت بھی اللہ کا عذاب نازل ہو سکتا ہے تو ان لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی بار بار تنبیہ کے بعد کہنا شروع کر دیا کہ آپ ﷺ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہیں ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں بلکہ ہم محض اس کو ایک ڈھکوسلا سمجھتے ہیں، لیکن اگر آپ کو اس پر اصرار ہے تو پھر تم یہ عذاب لے کیوں نہیں آتے۔ آخر اس میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ یہ ایسا بحری جہاز ہے جو کہ راستے میں لنگرانداز ہو گیا ہے کہ ہم تک پہنچ ہی نہیں پا رہا۔ قرآن کریم اس کے جواب میں انہیں ایک اصولی حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ زمین اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور تم بھی اسی کی مخلوق ہو۔ جس طرح زمین اور باقی کائنات اس کے احکام سے کبھی سرتابی کرنے کی جرأت نہیں کرتے اس طرح تمہیں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام سے سرتابی کی مجال نہیں ہونی چاہئے۔ اس نے تمہیں ایک محدود آزادی اس لئے دے رکھی ہے اور اس کی وجہ سے تم رد یا قبول سے کام لے سکتے ہو لیکن حقیقت میں تمہاری بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ تم کبھی اس کے احکام سے انحراف نہ کرو اور اگر تم اس انحراف سے باز نہ آؤ تو زمین اور اس کا گردوپیش تقاضا کرنے لگتے ہیں کہ ہم جبکہ اس کی ہر ضرورت پورا کرنے کیلئے اللہ کے حکم کے مطابق اس کے احکام کی تعمیل میں کوشاں رہتے ہیں بلکہ ہم نے اپنے آپ کو اس کا مسخر بنا رکھا ہے لیکن جب یہ اس حاکمِ حقیقی کے احکام کی پابندی نہیں کرتا تو حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے اس کی فوری سزا ملنی چاہئے لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت چونکہ ہر چیز پر حاوی ہے اس لئے پروردگار کبھی انسانوں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا جس طرح انسان اپنے مطلوبات کی طلب میں جلد بازی دکھاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ اللہ کے احکام سے انحراف کی سزا میں بھی جلدی کی جائے لیکن پروردگار بجائے جلدی کرنے کے وہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے تا کہ انسان اگر سنبھلنا چاہے تو سنبھل جائے کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ بعض دفعہ ایک چیز کو نہیں سمجھتا لیکن وقت گزرنے ساتھ ساتھ اس کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ بعض دفعہ حالات کا دباؤ، حوادث کا جبر یا رسول کریم ﷺ کی دعوت اسے بدلنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ ایسی کسی تبدیلی کی امید پر پروردگار انسان کو مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے اور یہ اس کی ایسی رحمت ہے کہ اگر یہ نہ ہوتی تو انسان انتہائی بدنصیب واقع ہوتا کیونکہ غلطی کر جانا اور پھر اس پر اڑ جانا یہ اس کا مزاج ہے۔ اگر اس کی ہر غلطی پر پروردگار فوری پکڑنے لگتا تو قرآن کریم کہتا ہے کہ زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا باقی نہ رہتا کیونکہ یہ بہت مشکل ہے کہ انسان غلطی سے محفوظ رہے۔ اس لئے پروردگار نے اسے سنبھل جانے کا موقع فراہم کیا لیکن جب کوئی شخص اپنے بگاڑ میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اس کے واپس پلٹنے کے امکانات کمزور سے کمزورتر ہوتے چلے جاتے ہیں تو ایسی صورتحال میں اللہ تعالیٰ کی مہلت کا مفہوم دوسرا ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بداعمالیاں کرنے والا اور گمراہیوں میں ڈوب جانے والا اگر واپس پلٹنا اور توبہ کرنا نہیں چاہتا تو ٹھیک ہے اسے اپنی روش پر بڑھنے دیا جائے تا کہ اسے کوئی ارمان نہ رہے اور ساتھ ہی اس کی فائل بھاری ہوتی چلی جائے اور جب اس کو اس کے جرائم کی پاداش میں پکڑا جائے تو یہ خود یا کوئی اس کا جاننے والا یہ نہ کہہ سکے کہ اسے کیوں پکڑا گیا، اسے مہلت کیوں نہ دی گئی اور اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیوں نہ کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اس کی کسی گمراہی یا سرکشی کے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کرتے تا کہ وہ یہ شکوہ نہ کر سکے:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اور نہ کائنات کی کوئی مخلوق ان کی گرفت پر تأسف کا اظہار کر سکے کیونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ کے کسی عظیم بندے کی موت کا وقت آتا ہے تو بعض دفعہ آسمان حرکت میں آتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے نافرمان بندوں پر اللہ کی گرفت آتی ہے تو کائنات کا ایک ذرہ بھی اس سے متاثر نہیں ہوتا۔ اس لئے بعض قوموں پر عذاب کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے:

”فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ“ پس نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین روئی۔

اللہ جب کسی قوم کو ڈھیل دیتا ہے تو قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ان کے ساتھ رحمت کا سلوک پیش نظر ہوتا ہے تو انہیں مختلف قسم کی

Marfat.com

تکلیفوں اور آزمائشوں میں مبتلا کیا جاتا ہے تا کہ وہ پریشان ہوکر اللہ کی طرف رجوع کریں لیکن جب وہ اس پر بھی اللہ کی طرف رجوع کرنے کی بجائے نافرمانیوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں تو پھر اللہ کا غضب حرکت میں آتا ہے تو ان لوگوں کیلئے رزق کشادہ کر دیا جاتا ہے، آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، خوب بارشیں برستی ہیں، زمین کی قوت روئیدگی زمین کو سبزے کا لباس پہنا دیتی ہے۔ ہر طرف فصلیں لہلہانے لگتی ہیں، کاروبار میں ترقی ہو جاتی ہے، خوشحالی میں اضافہ ہو جاتا ہے تو گمراہ لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے طور اطوار سے خوش ہے۔ اس لئے ہم پر نعمتوں کی بارش کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ بجائے توبہ کی طرف پلٹنے کے معصیت میں اور دلیر ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا غضب عذاب کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایسے لوگوں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ مصائب اور تکالیف میں عام طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے لیکن خوشحالی اور عیش و عشرت میں انسان ہر نیکی کے کام سے دور، اللہ تعالیٰ سے بے نیاز اور شیطانی قوتوں کا دوست بن جاتا ہے۔ مشرکین مکہ کو بھی ایسی ہی صورتحال سے واسطہ تھا۔ کچھ ہی مدت پہلے ان پر قحط مسلط کیا گیا تھا۔ اس میں ان کا ہر چھوٹا بڑا چیخ اٹھا تھا اور بجائے اپنے شریکوں سے دعائیں کرنے کے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگے تھے حتیٰ کہ ان کے بعض سرداروں نے نبی کریم ﷺ سے دعا کرنے کیلئے کہا تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی دعا سے ان کا قحط دور کر دیا اور خوشحالی پلٹ آئی تو انہوں نے پھر وہی شرک شروع کر دیا جو پہلے کرتے تھے اور ان کی سابقہ غفلتیں پھر لوٹ آئیں۔ شاید اس صورتحال کی طرف بھی اشارہ کیا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مزید مہلت دے دی ہے لیکن یہ مہلت ان کیلئے انتہائی عبرت خیز ثابت ہوگی۔

اس آیت کریمہ میں دو باتیں تو بہت واضح ہیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ سختی کرنے کی بجائے ہمیشہ نرمی فرماتا ہے، انہیں عذاب دینے کی بجائے رحمت کا سلوک کرنا پسند فرماتا ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی رہتی ہے لیکن جب انسان اپنی بندگی کی حدود کو پامال کرتا ہوا سرکشی کی انتہا کو چھونے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل کا ظہور ہوتا ہے جس سے نیک اور بد الگ الگ کر دیئے جاتے ہیں۔ نیکوں کو جزاء ملتی ہے اور بروں کو سزا دی جاتی ہے۔

اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر ذمہ داریاں ڈالتا ہے تو اس کی کوتاہیوں پر فوراً انہیں پکڑتا بلکہ اس کی توقعات سے بڑھ کر مہلتِ عمل دیتا اور سنبھلنے کا موقع دیتا ہے۔ اصلاح کی قوتیں برابر اپنا کام جاری رکھتی ہیں لیکن جب بدنصیب لوگ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے تو پھر وہ انہیں خوشحالیاں دے کر آزمائش میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ مرحلہ قوموں کیلئے ہمیشہ گراں ہوتا ہے۔ وہ مچھلی کی طرح یہ سمجھتی رہتی ہیں کہ ہم پر یہ نعمتوں کی بارش اللہ کی رضامندی کا ظہور ہے لیکن حقیقت میں اس ذریعے سے ان کی گرفت کا انتظام کیا جاتا ہے:

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پر شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ۭ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢﴾ ﴿یونس : ۱۲﴾

جب انسان کو کوئی سخت تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ لیٹا ہوا یا بیٹھا ہوا یا کھڑا ہوا۔ پھر جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو اس طرح چل دیتا ہے جیسے اس نے کسی تکلیف میں جو اسے پہنچی تھی کبھی ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ اسی طرح حدود سے تجاوز کرنے والوں کی نگاہوں میں ان کے کرتوت خوشنما بنا دیئے گئے ہیں۔

مشرکین مکہ کے کردار کی بنیادی خرابی

آیتِ کریمہ میں اگرچہ خطاب مشرکین مکہ سے ہے لیکن ان کی نخوت اور تمرد پر چوٹ لگانے کیلئے انہیں خطاب کے قابل نہیں سمجھا گیا اور بجائے ان کا ذکر کرنے کے انسان کے لفظ سے وہ بات فرمائی گئی ہے جس کی وہ چلتی پھرتی تصویر ہیں اور مزید اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ بار بار عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں یا بعض من چاہی نشانیاں مانگتے ہیں لیکن جب پروردگار ان کے ان مطالبات کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا تو آنحضرت ﷺ پر طنز کرنے لگتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ انہیں منہ مانگی نشانیاں اس لئے نہیں دکھائی جا رہیں کہ ان میں ایک خاص بیماری ہے جس نے

Marfat.com

انہیں حسن کردار سے محروم کردیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جس قوم کا کردار کسی اعتبار سے بھی بھروسے کے لائق نہ ہو اس قوم کے نہ مطالبے لائق اعتنا ہوتے ہیں اور نہ اس کے وعدوں پر اعتبار کیا جاتا ہے اور کسی بھی قوم کے کھوکھلا اور کردار سے عاری ہونے کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ جب اس کو خوشی ملے تو خوشی میں بے قابو ہو جائے اور حقائق کے انکار پر اتر آئے اور ہلکی حرکتیں کرنے لگے اور جب اسے کوئی صدمہ پہنچے تو شکایتوں کے انبار لگادے اور بے صبری کی انتہا کردے۔ مشرکینِ مکہ کی بھی سیرت وکردار کی خرابیوں نے انہیں اس طرح کا بنا دیا تھا کہ جب انہیں کوئی بڑی مشکل پیش آتی تھی اور وہ یقین کر لیتے تھے کہ ہم جن قوتوں کو اللہ کی قدرتوں میں شریک سمجھتے ہیں اس مشکل میں مدد کرنا ان کے بس میں نہیں تو ایسے موقع پر وہ صرف اللہ کو پکارتے تھے اور ان کی پکار کا عالم یہ ہوتا تھا کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں کی برکھا برساتیں اور ان کا انگ انگ سراپا نیاز بن جاتا۔ آہ وزاری ان کا معمول بن جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم کھا کر ان کی مشکل دور کردیتا۔ ان آیات کے نزول سے کچھ پہلے یہ لوگ قحط کی گرفت میں آئے۔ بارشیں رک گئیں، بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا تک بھی آسمان پر نظر نہ آتا تھا۔ ہر طرف فضاء میں دھول چھائی ہوئی دکھائی دیتی، کھیتیاں اجڑ گئیں، سبزے کی ایک ایک پتی مرجھا گئی، پانی کے جوہڑ خشک ہوگئے، جانوروں کے ریوڑ بھوک اور پیاس سے مرنے لگے تو ان کے کردار کی یہی کمزوری سامنے آئی۔ انہوں نے نہ صرف اللہ کے سامنے گڑگڑانا شروع کیا بلکہ ابوسفیان نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ آپؐ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ آپ کی قوم پر رحم کھائے ورنہ یہ قوم تباہ ہو جائے گی۔ چنانچہ آپؐ کی دعا سے جب یہ قحط ٹل گیا تو ان کے کردار کی دوسری کمزوری نے رنگ دکھانا شروع کردیا۔ وہ بہت جلد اس بات کو بھول گئے کہ ہم ایک خطرناک صورتحال سے اللہ کے سامنے آہ وزاری اور اپنی حالت کو بہتر بنانے کے وعدوں کے باعث نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں اور اللہ کے رسولؐ نے ہمارے لئے دعائیں کی ہیں تو تب یہ قحط کا عذاب ہم سے ٹلا ہے لیکن اس آیتِ کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ یہ پہلا واقعہ نہیں، یہ ان کے کردار کی مستقل کمزوری ہے کہ جب ان کی مصیبت ٹل جاتی ہے جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا تو وہ اس طرح بدل جاتے ہیں جیسے انہوں نے کبھی اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر رو رو کر دعائیں نہیں کی تھیں اور کبھی کسی مصیبت کی گرفت میں نہیں آئے تھے اور انہوں نے اس سے نکلنے کیلئے کبھی اللہ تعالیٰ سے وعدے نہیں کئے تھے۔ اخلاق وکردار کی یہ کمزوری صرف اس لئے ان میں پیدا ہوئی ہے اور اب ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی ہے کہ وہ حد سے گزر جانے والے لوگ ہیں۔ اللہ کی ایک ایک حد کو پامال کرچکے ہیں۔ انسانی خصائص اور کریمانہ اخلاق سے تہی دامن ہوچکے ہیں۔ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا قوم اللہ کی حدود کو پامال کرنے میں جری ہو جاتی ہے اور کوئی سا جرم اور کوئی سی گھٹیا حرکت کرتے ہوئے انہیں نہ اللہ کا خوف آتا ہے نہ انسانیت کی شرم مانع ہوتی ہے تو ایسی قوم پر اللہ تعالیٰ شیطان مسلط کردیتے ہیں۔ وہ ان کی بداعمالیوں کو بنا سنوار کر اس طرح ان کے سامنے پیش کرتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ بداعمالیوں کو نیک عمل سمجھنے لگتے ہیں۔ خیر وشر کے امتیاز سے محروم ہوجاتے ہیں۔ حسن وقبح کی پہچان ان کی نگاہوں سے نکل جاتی ہے۔ وہ ہر چیز کو شیطان کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور وہ نہایت چابکدستی سے بدترین اعمال واخلاق کو خوبصورت ترین اعمال کی صورت میں ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ شیطان کا کام انسان کو بہکانا ہے اور وہ کبھی بھی اس میں کوتاہی نہیں کرتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر جو احسانات فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انہیں عقل کی دولت سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ اگر عقل خواہشاتِ نفس کی پیروکار نہیں بنتی اور اس کا میزان خواہشات سے آلودہ نہیں ہوتا تو وہ عموماً انسان کو صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور جو معاملات انسانی عقل سے بالا ہوتے ہیں پروردگارِ عالم ایسے معاملات میں اپنے فرشتوں کے ذریعے انسان کو رہنمائی بھی دیتا ہے اور حفاظت بھی فرماتا ہے لیکن جب آدمی خواہشِ نفس کی پیروی میں اندھا ہو جاتا ہے اور بجائے اقدارِ انسانی سے محبت کرنے کے درہم و دینار، عہدہ ومنصب اور شہرت کی ہوس کا شکار ہو جاتا ہے اور یہی چیزیں اس کا محبوب بن جاتی ہیں تو پھر وہ اللہ کی حفاظت سے نکل جاتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب شیطان کو اس پر حملہ کرنے کا موقع ملتا ہے اور پروردگار نہ صرف اسے اپنی حفاظت سے محروم کردیتا ہے بلکہ شیطان کے حملوں کے امکانات پیدا فرما دیتا ہے۔ اسی بات کی خبر دیتے ہوئے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ○ اور جو شخص اللہ کے ذکر سے اعراض کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کردیتے ہیں۔ وہ اس کا مستقل ساتھی بنا رہتا ہے۔

وہ ہر گمراہی میں نہ صرف اس کا ساتھ دیتا ہے بلکہ اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ برے سے برے عمل کو اسے خوشنما بنا کے دکھاتا ہے۔ چار یاری، شراب کی مجلسیں اور عیاشیاں اس کے وسائل کو چاٹتی چلی جاتی ہیں لیکن شیطان اسے اس طرح ان چیزوں کا خوگر بنا دیتا ہے کہ وہ ان سے الگ ہونا اپنی موت سمجھتا ہے۔ ایسا فرد یا ایسی قوم اس سوار کی مانند ہو جاتے ہیں جو اپنے گھوڑے کے قابو آ گیا ہو۔ وہ اس وقت تک اس کی پشت سے چمٹا رہتا ہے جب

Marfat.com

تک وہ اسے کسی کھائی میں پھینک نہیں دیتا۔ مشرکینِ مکہ اسراف کا شکار ہو کر اسی صورتحال سے دوچار تھے۔ شیطان ان کا ساتھی بن چکا تھا۔ وہ نہ صرف اس کی محبت کے اسیر تھے بلکہ شیطان کی غلامی ان کا سرمایہ حیات بن چکی تھی۔ جس طرح سیاسی اور تہذیبی غلامی انسان کے ضمیر کی آواز کو خاموش کر دیتی ہے اور ایسے غلاموں کی بصیرت پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح وہ لوگ جو شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور اس کی غلامی ان کا طرۂ امتیاز بن جاتی ہے۔ وہ بھی سیرت و کردار کی ہر خصوصیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

آج امتِ مسلمہ بالعموم اور پاکستان میں بسنے والی مسلمان قوم بالخصوص ایسے ہی آزار کا شکار ہے۔ اللہ نے پاکستان جیسا عظیم ملک دے کر ہم پر احسان بھی فرمایا تھا اور ذمہ داریوں سے گراں بار بھی کیا تھا۔ ہمیں صرف اس ملک کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کی آزادی ہی نہیں بخشی تھی بلکہ اس ملک کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانا بھی ہماری ذمہ داری تھی۔ ریاست مدینہ کے بعد یہ پہلی ریاست تھی جو اسلام کے نام پر بنی تھی لیکن ہم نے آہستہ آہستہ اس کے مقاصد کو نظر انداز کر دیا اور اپنی زندگی الاٹمنٹوں اور دولت کے حصول، عہدہ و منصب کی پرستش اور جنگِ زرگری کیلئے وقف کر دی۔ ہم نے اسلامی شریعت کی حدود کو اس طرح پامال کیا کہ اس کا احساس بھی مٹ گیا۔ چنانچہ اسی اسراف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے شیطانی قوتوں کو ہم پر مسلط کر دیا۔ آج ہم ان سے نجات کیلئے اگر کوشش کرتے ہیں تو شیطانی وسائل اور قوتیں ہمارے راستے میں حائل ہو جاتی ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں اور اپنی بدحالی کا شکوہ کرتے ہیں تو ادھر سے ایک ہی آواز آتی ہے:

جب میں کہتا ہوں کہ یا اللہ میرا حال دیکھ
حکم ہوتا ہے کہ اپنا نامۂ اعمال دیکھ

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا لا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ ﴿یونس : ۱۳﴾

(بیشک ہم نے تم سے پہلے کئی عظیم قوموں کو ہلاک کیا جب وہ زیادتیاں کرنے لگے اور ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے اور وہ ایسے نہیں تھے کہ ایمان لاتے۔ اسی طرح ہم مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دیا کرتے ہیں)۔

اس آیتِ کریمہ میں ''قرن'' کا لفظ آیا ہے۔ اس کا معنی عموماً (ایک عہد کے لوگ یا صدی) ہوتا ہے لیکن قرآن کریم اسے عام طور پر ایسی قوم کے معنی میں استعمال کرتا ہے جو اپنے دور میں غیر معمولی عروج کی مالک رہی ہو۔

سابقہ امتوں کی ہلاکت سے عبرت دلائی جارہی ہے

روئے سخن مشرکینِ مکہ کی طرف ہی ہے۔ انہیں توجہ دلائی جارہی ہے کہ تم منہ پھاڑ کر اللہ کے نبی سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو اور جب عذاب نہیں آتا تو تم سمجھتے ہو کہ یہ محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں حالانکہ عذاب میں تاخیر اللہ کی طرف سے رحمت ہے۔ کوئی شخص یا کوئی قوم اپنی نادانی سے اگر اللہ کے عذاب کو دعوت دیتی ہے تو وہ اگرچہ عذاب کی مستحق بھی ہو چکی ہو جب بھی اللہ کی رحمت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اسے سنبھلنے کا موقع دیتی ہے۔ عذاب کے آنے میں تاخیر دراصل ایک موقع ہوتا ہے کہ شاید یہ نادان سنبھل جائے لیکن جس کی نادانی حد سے بڑھ جاتی ہے وہ سنبھلنے کی بجائے اور دلیر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو یہاں خطاب فرمایا جارہا ہے کہ تم سے پہلے بھی بڑی بڑی قومیں گزر چکی ہیں۔ تمہیں ان سے کوئی نسبت نہیں۔ وہ وسیع حکومتوں کی مالک تھیں، ان کی حکومتوں کا پھریرا وسیع خطہ ارض پر لہراتا تھا، ان کی طاقت اور قوت کی دھاک دنیا پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے وسائل کا کوئی شمار نہ تھا، ان کی فوجی قوت لاجواب تھی، زمین سے دھاتوں کی صورت میں ان کیلئے دولت اگلی جارہی تھی لیکن جب انہوں نے اللہ کے نبیوں کے سامنے تمرد اور انکار کا شیوہ اختیار کیا حتیٰ کہ وہ اللہ کے رسولوں کو قتل کرنے پر تل گئے تو بالآخر ان پر خدا کا عذاب ٹوٹا۔ ان میں سے کتنی قومیں ہیں جن سے تم بھی واقف ہو۔ تمہارے تجارتی قافلے ان کے کھنڈرات سے گزرتے ہیں۔ ان کی تاریخ سینہ بہ سینہ تم تک پہنچی ہے۔ تم اگر کسی نصیحت سے اثر قبول کرنے کے قابل نہیں رہے تو ان قوموں کی تاریخ سے سبق سیکھو۔ قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون اور قوم لوط کی تاریخ سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ آج ان کے کھنڈرات ان

Marfat.com

کی ہلاکت اور تباہی پر نوحہ کناں ہیں۔ ان کے تراشے ہوئے محلات جہاں ان کی ترقی کی علامت ہیں وہیں ان کی بدنصیبی کے گواہ بھی ہیں۔ تم آخر ان کی تاریخ کے وارث کیوں بننا چاہتے ہو۔ تم حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے وارث ہو۔ قومِ بنی اسرائیل جو حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد تھی کتنی دفعہ عذاب کا شکار ہوئی۔ تم بجائے ان کے راستے پر چلنے کے اپنا حقِ وراثت ادا کرو اور جن قوموں پر اللہ کا عذاب آیا ان کی تاریخ سے عبرت پکڑو اور اچھی طرح یقین کرلو کہ ان پر عذاب صرف اس لئے آیا کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں پر ایمان لانے سے انکار کردیا حالانکہ وہ ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ہر لحاظ سے ان پر اتمامِ حجت کیا لیکن جب ان کا انکار جرم کی صورت اختیار کرگیا اور ان کے ظلم کا ہاتھ اللہ کے نبیوں اور ایمان لانے والوں تک دراز ہوتا چلا گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کا غضب حرکت میں آیا اور ان پر وہ عذاب ٹوٹا جو ہمیشہ مجرموں پر آتا رہا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۱۴﴾

(اب ہم نے تمہیں ان کے بعد زمین میں ان کا جانشین بنایا ہے تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔)

عرب کی کتنی قومیں تباہ کردی گئیں اور بنی اسرائیل اپنی بداعمالیوں اور بداطواریوں کے باعث دنیا کی امامت کے منصب سے معزول کردیئے گئے۔ (اب تمہیں اے عرب کے لوگو) اس سرزمین میں ان کا جانشین بنایا گیا ہے اس لئے نہیں کہ تم عرب کے وسائل سے فائدہ اٹھاؤ، تم ان کے کھنڈرات پر حکومت کرو اور جیسے انہوں نے اپنی من مرضی کی زندگی گزاری تم بھی ویسی ہی زندگی گزارو بلکہ تمہیں اس لئے ان کے بعد اس سرزمین میں اٹھایا گیا ہے اور تمہاری طرف اللہ کے آخری رسول کو مبعوث کیا گیا ہے اور زندگی کے ضابطے کے طور پر تمہاری طرف آخری کتاب بھیجی گئی ہے تاکہ ہم یہ دیکھیں کہ تم اس سرزمین میں کیسے زندگی گزارتے ہو۔ تم ان کی تاریخ سے عبرت حاصل کرتے ہو یا ان جیسا بن کر رہنے کو کافی سمجھتے ہو۔ تم اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کی رہنمائی میں زندگی گزارتے اور اپنی فرائض ادا کرتے ہو یا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ ہمیں حیوانوں کی طرح اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی ہے۔ ہم میں کامیاب وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ کلغیاں سر پر سجائے، جو دولت کے انبار اکٹھے کرے، جس کے شب و روز نفس کے عیش میں گزرتے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو پھر تمہاری منزل وہی ہے جہاں وہ قومیں پہنچی ہیں جن پر اللہ کا عذاب آیا اور اگر تم اس انجام تک پہنچنا نہیں چاہتے ہو تو پھر اس بات کو دل و دماغ میں بٹھالو کہ تم ہر وقت اللہ کی نگاہ میں ہو۔ اس نے تمہیں زندگی عیش کرنے کیلئے نہیں دی بلکہ اس لئے دی ہے تا کہ وہ تمہارے اعمال کا جائزہ لے۔ وہ دیکھے کہ تم نے اس کی عطا کردہ زندگی جیسی نعمت کو کس طرح گزارا، تمہاری جوانی کیسے گزری، تمہارا مال کہاں سے آیا اور کہاں خرچ ہوا، لیکن یہ سوچ اسی صورت نصیب ہوسکتی ہے کہ تم اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ، ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاؤ، ان پر جو کتاب اتری ہے اسے آویزۂ گوش بھی بناؤ اور وظیفۂ عمل بھی۔ یہ وہ راستہ ہے جس کے نتیجے میں تم دنیا میں بھی سرخرو ہوسکتے ہو اور آخرت میں بھی کامیاب ہوسکتے ہو۔

اے کاش! قرآن کریم کی اس ہدایت کی روشنی میں پاکستان میں بسنے والے لوگ بھی کبھی اپنا جائزہ لے سکیں۔ ہم ہندوستانی آبادی کا ایک حصہ تھے۔ یہاں انسانوں کے وسیع جنگل میں ہماری ایک محدود تعداد تھی۔ یہاں کی خونخوار اکثریت نہ صرف ہمارا خون نچوڑتی تھی بلکہ ہمارا دین بھی ان کے ہاتھوں خطرے میں تھا اور آئندہ بننے والی جمہوری حکومت میں ہمارے حقوق کی بازیافت کی کوئی امید نہ تھی۔ فاتح اور حکمران قوم کفر میں ہم آہنگی کی وجہ سے اکثریت کے ساتھ تھی۔ اللہ نے محض اپنے فضل و کرم سے پاکستان جیسی نعمت ہمیں عطا فرمائی، اپنا ملک ملا، اپنا وطن ملا، اپنی خوشیاں اور اپنے غم ملے، ہمیں اپنی زندگی بنانے کا موقع ملا، ہمیں آزادی ملی جس میں ہم اپنے دین کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزار سکتے تھے۔ یہاں سے جانے والوں کا ہمیں جانشین بنایا گیا اور یہ سب کچھ اس لئے عطا ہوا تا کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ برابر ہماری نگران رہے کہ ہم اس امانت کا حق ادا کرتے ہیں یا نہیں اور جن وعدوں پر ہم نے یہ ملک حاصل کیا، کیا وہ وعدے ایفا کرتے ہیں یا نہیں لیکن اس کا کیا، کیا جائے:

ہم کو لازم تھا بدلتے نظمِ میخانہ تمام
ہم نے بدلا ہے مگر بس ایک میخانے کا نام

Marfat.com

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾

(جب ہماری کھلی ہوئی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ردوبدل کرو۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے مجھے یہ اختیار نہیں ہے کہ میں اس میں اپنی طرف سے کچھ ترمیم کردوں۔ میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔) ﴿یونس:۱۵﴾

مشرکین مکہ کی جانب سے قرآن میں ترمیم کا مطالبہ

گزشتہ آیات کریمہ میں ہم نے دیکھا ہے کہ پروردگار نے ان کی کمزوریوں کو کھول کر بیان کیا ہے اور انہیں سمجھایا ہے کہ تمہاری قومی اور اخلاقی زندگی اس لئے تباہی کا شکار ہوئی ہے کہ تم میں یہ یہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ تم برسوں سے اس راستے پر چل رہے ہو جو ان قوموں کا راستہ ہے جو اللہ کے عذاب کا شکار ہوئیں۔ تم ان کے کھنڈرات سے گزرتے ہو، تمہیں ان کی تباہی کے اسباب سے پوری طرح آگاہی ہے۔ تمہارے لئے عافیت اسی میں ہے کہ یہ تباہی کا راستہ چھوڑ کر اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہیں ان قوموں کا جانشین بنایا گیا ہے تو یقیناً تم سے اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ تم اپنے اندر وہ صفات پیدا کرو گے جس کی تعلیم اللہ کے رسول نے دی ہے اور کتابِ خداوندی جن کی رہنما ہے اور ان برائیوں اور ضلالتوں سے بچو گے جس کے نتیجے میں پہلی قومیں تباہ ہوئیں لیکن جب قوموں کا زوال اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان میں قبولیت کی استعداد یا تو مرجاتی ہے اور یا نہ ہونے کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ مشرکینِ مکہ کا بھی یہی حال تھا کہ اتنی واضح تنقید اور توضیح کے بعد بھی بجائے اس کے کہ اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کرتے الٹا یہ مطالبہ کرنے لگے کہ یہ قرآن جو ہمیں سنایا جارہا ہے اگرچہ اس کی آیات بالکل واضح اور اپنے مفہوم میں قطعی ہیں لیکن ہمارے لئے قابل قبول نہیں کیونکہ ان میں وہ باتیں کہی جاتی ہیں جنہیں تسلیم کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ اگر وہ باتیں آپ اس قرآن کریم سے نکال دیں یا اس قرآن کی بجائے اور قرآن لے آئیں جس میں اس طرح کی باتیں نہ ہوں تو پھر شاید ہم آپ پر ایمان لے آئیں لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ ہمارے بتوں پر تنقید کریں اور شریعت کے وہ احکام لائیں جو ہمارے رسم ورواج کے خلاف ہوں۔ حلال وحرام کی ایسی پابندیاں لگائیں جس سے ہماری معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے۔ ایسے مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیں جس میں ہماری خواہشاتِ نفس کیلئے کوئی جگہ نہ ہو۔ اگر آپ واقعی اس بات پر مصر ہیں کہ ہم آپ پر ضرور ایمان لائیں تو اولاً تو قرآن دوسرا بدل کرلائیے لیکن اگر یہ منظور نہیں تو ایسی ترمیمات تو ضرور کردیجئے جس میں ہمارے طرزِ زندگی کیلئے بھی گنجائش نکل سکے۔ آپ شوق سے خداپرستی کی تعلیم دیجئے لیکن ہماری نفس پرستی اور دنیاپرستی کیلئے تو گنجائش ہونی چاہئے۔

مشرکین کی اصل گمراھیاں

مشرکینِ مکہ دراصل یہ سمجھتے تھے کہ یہ کتاب یقیناً محمد ﷺ نے خود لکھی ہے۔ وہ اللہ کی طرف اسے نازل کردہ نہیں مانتے تھے۔ اس لئے وہ آپ پر زور دیتے تھے کہ آپ اسے واپس لے لیجئے یا اس میں کچھ ترمیمیں کرنا گوارا کرلیجئے اور دوسری خرابی ان کی یہ تھی کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے ان کیلئے ہر وہ کام جائز تھا جس سے دنیا میں معاملات کو سلجھایا جاسکے یا کسی طرح کام چلایا جاسکے۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ کل کو اللہ کے یہاں اس کی جوابدہی ہوسکے گی یا نہیں۔ اس لئے نبی کریم ﷺ سے آیت کے دوسرے حصے میں جو جواب دلوایا گیا ہے اس میں دونوں باتیں نمایاں ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ میں اس کتاب میں اپنی طرف سے کسی تبدیل کرنے کا مجاز نہیں کیونکہ یہ کتاب اللہ کا کلام ہے، میری تصنیف نہیں۔ تم نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے اور کانوں میں ڈاٹ لگالی ہے تو اور بات ہے ورنہ تم بھی جانتے ہو کہ وہ کلام کسی انسان کے کلام کے مشابہ نہیں۔

جس طرح اللہ کی ذات بے مثال ہے اسی طرح اس کا کلام بھی بے مثال ہے۔ اس کے الفاظ، اس کی تراکیب، اس کے جملے، اس کے محاورے، اس کی تلمیحات، اس کی ضرب الامثال، اس کی پیشگوئیاں، اس کے علمی محاکے، اس کی تبشیر، اس کا انذار، اس کے وعدے، اس کی وعید کوئی چیز ایسی نہیں جس کی نظیر لانا انسان کے بس میں ہو۔ اس کلام کی شیرینی، اس کی بندش اور چستی، اس کی تاثیر اور قوت، اس کا ابلاغ اور اس کی گہرائی، اس کا اجمال اور اس کی

Marfat.com

وسعت کوئی چیز بھی انسان کی طاقت میں آنے والی نہیں۔اس کے باوجود تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے وہ کلام لکھا ہے اس لئے مجھے اس میں ترمیم کرنے کا اختیار ہے تو اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمہاری عقلوں پر ماتم کیا جائے۔تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ میں جس زبان میں بات کرتا ہوں اور جس اسلوب میں نصیحت کرتا ہوں اور جس سطح سے خطاب کرتا ہوں اور جس طرح حالات سے متاثر ہوتا ہوں ان میں سے کوئی چیز بھی اللہ کے کلام میں نظر نہیں آتی۔اس کی ہر ادا انسانی اداؤں سے ماورا ہے اور اس کا ہر انداز انسانی انداز سے جدا ہے تو پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا ہے کہ وہ کلام میرا ہے اور میں اس میں تبدیلی کا مجاز ہوں اور پھر تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ چونکہ وہ اللہ کا کلام ہے اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں تو میرا کام اس کا امین بن کر دکھانا ہے۔میں اس کا ایسا پیروکار ہوں جو باقی سب کیلئے نمونہ اور اسوہ ہے۔مجھے ہر صورت میں اور ہر طرح کے حالات میں اس کی کتاب کی پیروی بھی کرنی ہے اور اس کی حفاظت بھی کرنی ہے اور اگر خدانہ کرے میں اس کے کسی لفظ کو بدلنے کی کوشش کروں یا اس کی کسی بات کو تبدیل کر دوں یا کوئی نئی چیز اپنی طرف سے داخل کر دوں تو باوجود اس کے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور مجھے اللہ نے ساری کائنات پر فضیلت دی ہے۔میں اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔تم قیامت کو تسلیم نہ کرو لیکن قیامت کا آنا یقینی ہے جس طرح تمہیں حساب دینا ہے اسی طرح مجھے بھی حساب دینا ہے۔میں اس آنے والے دن کے عذاب سے خوفزدہ ہوں۔میں جانتا ہوں وہاں صرف اللہ کا فضل کام آئے گا اور یہ اسی کو شاملِ حال ہوگا جس نے اس کی فرمانبرداری کی ہوگی۔قرآن کریم میں ایک دوسری جگہ اسی بات کا ذکر فرمایا گیا ہے اور وہاں تیور اور بھی تیکھے ہیں وہاں فرمایا گیا ہے وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ اگر (ہمارا رسول) اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کے ہماری طرف منسوب کردے، ہم اسے دائیں ہاتھ سے گرفتار کرلیں، پھر ہم اس کی شہ رگ کاٹ دیں۔اندازہ کیجئے کہ نبی کریم ﷺ معصوم ہیں۔آپ ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔آپ قرآن کریم کے امین ہیں، قرآن آپ کے دل پر نازل ہوا، آپ کسی طرح بھی نہ اس میں کوئی تحریف کرسکتے ہیں اور نہ ترمیم کرسکتے ہیں لیکن انسانوں کو سمجھانے کیلئے یہ فرمایا جارہا ہے کہ قرآن کریم کی حفاظت اور اس کی حقانیت اس قدر حتمی اور لازمی ہے کہ اگر ہمارا رسول بھی اس میں کسی کمی بیشی کی جرأت کرے تو ہم اسے بھی گرفتار کرلیں گے۔تو تم نے کس امید پر یہ بات کہہ دی کہ آپ کوئی اور قرآن لے آئیں یا اس میں کوئی ترمیم کردیں۔حضور ﷺ فرماتے ہیں میرا کام اللہ کے کلام کو بدلنا نہیں بلکہ اس کا اتباع کرنا ہے۔اگر تم واقعی راہ راست اختیار کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں بھی اس کا بلا کم و کاست اس کتاب کا اور میرا اتباع کرنا ہوگا۔ورنہ اس کے سوا نجات کی کوئی صورت نہیں۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ⑯
(اے پیغمبر کہہ دیجئے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں یہ قرآن تم کو کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس سے کبھی باخبر نہ کرتا۔میں اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں۔کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔) ﴿یونس:۱۶﴾

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکینِ مکہ آنحضرت ﷺ سے مطالبہ کررہے تھے۔کہ اگر آپ اس کتاب کو جو بقول آپ کے اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے قابلِ قبول بنانا چاہتے ہیں تو یا تو نیا قرآن لائیے اور یا اس میں ہماری خواہش کے مطابق تبدیلیاں کردیجئے۔یہ مطالبہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قرآن پاک کو اللہ کی طرف سے ''منزل'' نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے آنحضرت ﷺ کی تصنیف خیال کرتے تھے۔آپ نے گزشتہ آیتِ کریمہ میں بھی اس کا جواب پڑھا۔اب اس آیتِ کریمہ میں ایک نہایت واضح اور ناقابلِ تردید دلیل دی جارہی ہے جو چند مقدمات پر مشتمل ہے جسے ہم ایک ترتیب سے عرض کرتے ہیں۔

1- پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اے مکے کے رہنے والو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کہیں باہر سے نہیں آیا بلکہ تمہارے اسی شہر اور اس شہر کے سربراہ قبیلے قریش کا ایک فرد ہوں۔میرے قرابت داروں سے یہ شہر بھرا ہوا ہے۔میرے دادا قبیلہ قریش کے سردار تھے۔آج بھی میرا خاندان عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔میرے والد میرے پیدا ہونے سے پہلے دنیا سے چلے گئے۔میں یتیمی کا داغ لے کر پیدا ہوا۔دادا کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد اگرچہ شفیق چچا نے سہارا دیا لیکن وہ چونکہ قلیل المال اور کثیر العیال تھے۔ان کی مالی مجبوریوں کے پیشِ نظر مجھے بکریاں چرانی پڑیں، انہیں کے دودھ پر میری گزر بسر تھی اور اسی دودھ سے میں اپنے چچا کے اہلِ خانہ کی بھی خدمت بجالاتا تھا۔شعور کی عمر آئی تو کاروبار میں ہاتھ ڈالا۔اللہ تعالیٰ نے اس کے امکانات

Marfat.com

پیدا کیئے تو کاروبار میری ضرورت کی کفایت کیلئے کافی ہو گیا۔ پھر مکے ہی کے معزز خاندان میں میری شادی ہوئی۔ اللہ نے بچیاں دیں، ان کے رشتے بھی اپنے ہی قبیلے میں طے پائے۔ اپنی اور اپنے اہل خانہ کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں شب و روز گزرتے رہے۔ مکے کا باسی ہوتے ہوئے جن حالات سے وہاں کے رہنے والوں کا واسطہ تھا انہیں سے میں بھی گزرتا رہا۔ دوسرے قبیلوں سے اگر تلخیاں پیدا ہوئیں تو انہیں سلجھانے میں میرا ناخن تدبیر بھی کام کرتا رہا۔ کوئی مشاورت ہوتی میں بھی اس میں اپنا فرض ادا کرتا۔ شہر کی معاشرت اور معیشت کا کوئی تقاضا ایسا نہیں جسے پورا کرنے میں، میں نے دلچسپی نہ لی ہو۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے کہ میری تمام مصروفیات کا دائرہ یہی شہر اور یہیں کے حالات تھے۔ میرے تمام تعلقات اسی شہر کے رہنے والوں سے تھے۔ میری تمام قرابت داریاں اسی شہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں چونکہ ایک فعال زندگی گزار رہا تھا۔ اس لئے ہر وقت اس شہر کے لوگوں سے میرا ملنا جلنا تھا۔ ان تمام باتوں سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ میری شخصیت کا تانا بانا اسی شہر سے تیار ہوا اور میرے مزاج اور میرے رویئے کی تشکیل میں اسی شہر کے حالات نے بنیادی کردار ادا کیا۔

2- سرزمین مکہ باوجود اس کے کہ اللہ کے گھر کی وجہ سے حرم بھی تھا اور محترم بھی۔ اللہ کے گھر کی نسبت سے اسے ایک مرکزیت حاصل تھی اور پاکیزگی بھی۔ پورے عرب کیلئے یہ شہر مرکزِ عقیدت بھی تھا اور مرکزِ اعصاب بھی۔ حج و عمرہ کی ادائیگی کیلئے ہر طرف سے آنے والوں اور عبادت کرنے والوں کا سجدہ گاہ بھی تھا اور دارالامان اور پناہ گاہ بھی۔ بایں ہمہ یہاں کے رہنے والے اسی سیرت و کردار اور اسی تہذیب کے پیکر تھے جس کا چلن پورے عرب میں دکھائی دیتا تھا۔ یہاں ہر طرح کی اخلاقی گراوٹ پائی جاتی تھی اور ہر طرح کا شرک پورے زوروں پر تھا۔ دیانت و امانت اور عدالت و رحمت کا دور دور تک نشان نہ تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر برافروختہ ہو کر لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جانا ان کا روز کا کھیل تھا۔ شرم و حیاء عفت اور پاکدامنی ان کے نزدیک قابل تعریف تو تھی لیکن اجتماعی عمل میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا۔ عقیدے اور عمل، اخلاق اور معاملات کی خرابیاں ہوا اور پانی کی مانند تمام عرب کی طرح اس بلد امین میں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔

3- اس شہر کی بنیاد اگرچہ اللہ کے عظیم رسولوں نے رکھی۔ انہیں کے ہاتھوں اس زمین پر اللہ کا پہلا گھر تعمیر ہوا۔ انہیں کی دعاؤں سے اس گھر کو مرکزیت ملی۔ انہیں کی التجاؤں سے اس شہر کے رہنے والوں کیلئے رزق کا سامان ہوا۔ بایں ہمہ ان عظیم رسولوں کا علم اس شہر سے اٹھ چکا تھا۔ ان کی شریعت یا ان کی شخصیت کا کوئی شعبہ بھی باقی نہ رہا تھا۔ یہاں کے لوگ بھی باقی لوگوں کی طرح فطری سادگی پر زندگی گزار رہے تھے۔ نوشت و خواند کی حد تک بھی کوئی پڑھا لکھا آدمی بمشکل دستیاب ہوتا تھا۔ علم و تہذیب کی کوئی خوبی، شرافت کی کوئی قدر، تہذیب انسانی کا کوئی پرتو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔ جہالت اور امیت پر فخر کیا جاتا تھا۔ شرک ان کیلئے باعث ندامت ہونے کی بجائے باعث فخر بن چکا تھا۔ ایک حیوانی زندگی تھی جس میں کسی کو بھی تبدیلی گوارا نہ تھی۔ صلاحیتوں کی کمی نہ تھی لیکن جہالت کی مٹی میں مل کر وہ مٹی ہو چکی تھیں۔

مندرجہ بالا تین مقدمات یا تین نکات کو ذہن میں رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ اس ماحول میں آنکھیں کھولنے والے اور تربیت پانے والے بچے کے بارے میں آپ کیا امید قائم کر سکتے ہیں۔ کیا ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والا نوجوان شرم و حیاء کا پیکر ہو سکتا ہے۔ کیا جہالت پر جان دینے والے ماحول میں اس بات کی امید کی جا سکتی ہے کہ اچانک کسی کے منہ سے فصاحت و بلاغت اور علم و حکمت کے چشمے ابلنے لگیں گے۔ کیا ایک محدود ماحول اور امیت کے سائے میں عمر گزارنے والے شخص سے توقع کی جا سکتی ہے کہ کبھی وہ دنیا کا امام اور رہنما بن کر اٹھے گا کہ دنیا اس سے علم بھی سیکھے گی، تہذیب بھی حاصل کرے گی اور اخلاق کی دولت بھی پائے گی۔ وہ ایک ایسی زندگی کا منادی بن کر اٹھے گا جس کا ایک سرا اگر اس دنیا میں ہو گا تو دوسرا سرا آخرت میں ہو گا اور دونوں میں اس طرح کا مضبوط تعلق ہو گا جس میں علم کی روشنی بھی ہو گی اور زہد و پارسائی کی پاکیزگی بھی، جس میں نفس کی پیروی کی بجائے نفس کو قابو رکھنے کی تعلیم بھی ہو گی اور تربیت بھی، جس کے نتیجے میں شرک سے معمور سرزمین کلمۂ توحید سے منور ہو جائے گی۔ ڈنگروں کی طرح زندگی گزارنے والے لوگ اخلاق کے معلم بن کر اٹھیں گے۔ اگر علم و عقل کی بارگاہ سے اس کا جواب مانگا جائے تو یقیناً نفی میں ہو گا۔ اس لئے کہ کوئی عقلمند آدمی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ جھلستے ہوئے ریگستان سے کبھی حباب بھی اٹھ سکتے ہیں اور کبھی خزاں رسیدہ چمن میں پھول بھی کھل سکتے ہیں اور کبھی کانٹوں کی باڑ پر کلیاں بھی چٹک سکتی ہیں اور کبھی درندہ صفت انسانوں میں رحمت و مودت کے پیکر بھی سر اٹھا سکتے ہیں۔ اگر عقل کے نزدیک یہ سب کچھ واقعی ناممکن ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ محمد ﷺ اگر اللہ کے رسول نہیں تھے تو جاہل معاشرے میں پل کر وہ سب سے بڑے عالم کیسے ہو گئے جنہوں نے کبھی کسی مکتب کا منہ نہ دیکھا تھا اور کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا ان کی زبان سے علم کے سوتے کیسے پھوٹنے لگے۔ انہوں نے پتھر دل انسانوں میں زندگی گزاری تھی۔ تو ان کی زبان

Marfat.com

سے محبت کے پھول کیسے جھڑنے لگے اور ان کی ذات ہیروں سے بڑھ کر تابانی کا پیکر کیسے بن گئی۔ انہوں نے کبھی کسی مذہبی رہنما کی صحبت نہیں اٹھائی تھی تو وہ دنیا کیلئے ہدایت کا استعارہ کیسے ٹھہرے۔ وہ اسی زبان میں گفتگو کرتے تھے جو قریش اور بنو سعد کی زبان تھی لیکن اچانک ان کی زبان سے ایسی کتاب کی آیات کیسے سنائی دینے لگیں کہ جس کتاب کی ایک آیت کا مقابلہ بھی دنیا بھر کے فصیح و بلیغ انسان نہ کر سکے۔

اگر کسی آدمی میں غور و فکر کی تمام صلاحیتیں اور غیر جانبداری کی تمام مروتیں اور علم کے تمام تقاضے مر نہیں گئے تو وہ یقیناً اس سے ہٹ کر اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ایسے ماحول میں پلنے والا نوجوان نہ شرم و حیاء کا پیکر ہو سکتا ہے اور علم و معرفت کا سرچشمہ۔ اس کی زبان سے ایسا شعر تو سنا جا سکتا ہے جو امرؤ القیس کے اشعار سے بھی بہتر ہو لیکن ایسے کلام کی امید نہیں کی جا سکتی جس کی مثال لانے سے پوری دنیا عاجز ہو۔ ایسے ماحول میں اٹھنے والا کوئی شخص کسی بھی قبیلے کا کامیاب سردار تو ہو سکتا ہے لیکن صرف دنیا کا نہیں بلکہ قیامت تک آنے والی دنیا کا رہنما نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو پھر اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ صاف اس بات کو تسلیم کر لیجئے کہ محمد ﷺ اپنی ذات میں سب کچھ ہو سکتے تھے لیکن وہ، وہ نہیں ہو سکتے تھے جیسا تم انہیں دیکھتے ہو۔ ان کے اندر قصی، عبد مناف یا عبد المطلب کی ذہانت تو ہو سکتی تھی لیکن وہ رحمت اللعالمین نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ مکے والوں سے حُسنِ اخلاق کے سرٹیفکیٹ تو لے سکتے تھے لیکن وہ کبھی سید المرسلین نہیں کہلا سکتے تھے۔ اس لئے ان کی شخصیت، ان کی سیرت اور ان کے کمالات کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ کی یہ مشیت تھی کہ وہ دنیا پر احسان کرے اور ایسی ذات والا تبار کو دنیا کی رہنمائی کیلئے بھیجے اور اس کے اندر وہ تمام کمالات اور خوبیاں پیدا کر دے جو آج تک کسی میں جمع نہ ہو سکیں اور قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کیلئے ان کی ذات کو مینارۂ نور بنا دے۔ عقلِ سلیم اس کے سوا کوئی اور فیصلہ دینے سے عاجز ہے:

حُسنِ یوسف دمِ عیسیٰ یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰیٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۱۷﴾

(اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اس کی آیات کو جھٹلائے۔ بیشک مجرم فلاح پانے والے نہیں بنیں گے۔)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں اللہ کے رسول کی صداقت اور قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے پر جو واقعی اور مشاہداتی دلائل دیئے گئے ہیں جو شخص ان دلائل کو بھی تسلیم نہیں کرتا یا ان دلائل سے لاجواب ہونے کے بعد اس کے نتیجے کو قبول نہیں کرتا تو اس سے دو ہی باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کا نبی، نبی ہو کر بھی اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے اور ایک جھوٹی بات اس کی طرف منسوب کرتا ہے اور اگر یہ بات نہیں تو پھر دوسری بات یہ کہ قرآن کریم کو منزل من اللہ ماننے سے انکار کرنے والا خود اللہ پر جھوٹ باندھ رہا ہے اور اس کی آیات اور اس کے احکام کا انکار کر رہا ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے کوئی سی بات بھی ہو ہر شخص اسے تسلیم کرے گا کہ اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ظلم سے مراد ایک ایسی بات ہے جو سراسر فطرت اور عقل کے خلاف ہو اور کوئی بھی سلیم الفطرت اور صحیح العقل آدمی کبھی اسے تسلیم نہ کر سکے بلکہ وہ محسوس کرے کہ یہ ایک ایسی بات کہی جا رہی ہے جو قابلِ تسلیم حقائق کے بالکل خلاف اور الٹ ہے اور اگر اس لحاظ سے اس آیتِ کریمہ پر غور کیا جائے تو اس بات کی تائید کئے بغیر چارا نہیں کیونکہ ایک ایسی پاکیزہ ذات جس نے چالیس سال تک بگڑے ہوئے انسانوں میں زندگی گزاری لیکن اس کے باوجود اس کی سیرت، ہر طرح کے عیوب اور نقائص سے پاک رہی۔ اس کی قوم کے جاننے والے لوگ بالاتفاق اسے صادق اور امین کہتے بھی رہے اور مانتے بھی رہے۔ ایسی ذاتِ بابرکات سے کوئی عقل والا آدمی کبھی یہ توقع نہیں کر سکتا کہ اس نے بندوں کے ساتھ تو کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور اللہ کی طرف جھوٹ منسوب کرنا شروع کر دے۔ اس لئے کہ معمولی کردار کا آدمی بھی اللہ کریم کے بارے میں بات کہتا ہوا جھجکتا ہے۔ وہ ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہے، بہتان باندھ سکتا ہے لیکن اللہ کے بارے میں ایسی جسارت کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ چہ جائیکہ اس ذات کے بارے میں ایسا تصور کیا جائے جس نے انسانوں کے ساتھ بھی کبھی جھوٹ نہ بولا ہو اور کبھی افترا نہ کیا ہو۔ ان سب باتوں کا ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اللہ کے رسول کی طرف جھوٹ کا انتساب خلافِ دیانت بھی ہے اور خلافِ عقل بھی۔ البتہ دوسری بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ منکرین اللہ کی آیات کی تکذیب کر رہے ہوں۔ اس لئے ان کو اپنی حالت پر غور کرنا چاہئے لیکن اگر وہ ایسا کرنے کیلئے تیار نہیں تو پھر اس کا کون

Marfat.com

فیصلہ کرے گا کہ ظالم اللہ کے رسول تھے یا ان کا انکار کرنے والے۔ لیکن یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مجرم کبھی فلاح نہیں پاتے۔ اللہ کے رسول اور اس کے مخالفین کے درمیان جب حق و باطل کی کشمکش ہوتی ہے تو فلاح اور غلبہ ہمیشہ اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو ملتا ہے۔ دنیا میں بھی بتدریج حق کو ہی غلبہ ملتا ہے اور آخرت میں تو ان کی کامیابی میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔

بعض لوگ جب کبھی جھوٹی نبوت کے دعویٰ کرنے والوں یا اہل باطل کو پھلتا پھولتا دیکھتے ہیں تو انہیں یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اللہ تو فرماتا ہے کہ مجرم کبھی فلاح نہیں پاتے۔ جھوٹی نبوت کا دعویٰ یا حق کے ساتھ آویزش سے بڑا جرم اور کیا ہو سکتا ہے تو پھر ایسے لوگ کس طرح کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

درحقیقت ایسا کہنے والے تین باتوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ پہلی یہ بات کہ یہ آیت کریمہ نبی کریم ﷺ اور مخالفین کی مخالفت اور آویزش کے تناظر میں آئی ہے اس سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو اگر قوم اس کی دعوت کو قبول کر لیتی ہے تو وہ فلاح یاب ہو جاتی ہے لیکن اگر اس کا انکار کر دیتی ہے تو حق و باطل کی کشمکش کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اہل باطل اہل حق کو نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن رسول اور اس پر ایمان لانے والے برابر دین کے غلبے کیلئے کوشاں رہتے ہیں۔ بالآخر ایک وقت آتا ہے جب دین غالب آ جاتا ہے۔ کبھی تو رسول کی زندگی میں ہو اور کبھی اس کے بعد ہو۔ لیکن اگر وہ قوم بالاجماع رسول کی دعوت ماننے سے انکار کر دیتی ہے تو اللہ اپنے رسول اور اس کے متبعین کو وہاں سے نکال لیتا ہے اور مخالفین پر عذاب کا کوڑا برستا ہے اور انہیں مٹا دیا جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ رسول تو دنیا میں موجود نہیں لیکن اہل حق کی کشمکش اہل باطل سے جاری ہے۔ اسی صورت میں جب تک اہل حق تقویٰ، اخلاص اور جہاد کی مطلوب قوت میدان میں نہیں لے آتے اس وقت تک اہل باطل کو ڈھیل ملتی رہتی ہے۔ پروردگار ان کی رسی دراز کرتا چلا جاتا ہے اور اس کشمکش میں اہل حق بھی کام آتے ہیں لیکن ان کی فلاح و کامیابی پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حقیقی فلاح قیامت کے دن ہمارے انتظار میں ہے۔ یہاں کی فلاح یہ ہے کہ اللہ کے دین کے غلبے کیلئے آدمی سب کچھ قربان کر دے۔ اور قیامت کی فلاح یہ ہے کہ وہاں اس کا ایسا بدلا ملے جس کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تیسری بات یہ کہ ''فلاح'' طویل عمر، دنیاوی خوشحالی یا دنیاوی فروغ کو نہیں کہتے۔ اسلام کی اصطلاح میں حقیقی فلاح وہ ہے جس پر کسی خسران کا سایہ نہ پڑے۔ دین کی جو بنیادی صداقتیں ہیں ان پر یقین اور عمل میں کوئی کمی نہ آئے۔ حق کے راستے پر چلنے والا ہمیشہ حق کی پہچان بنا رہے۔ دنیاوی پریشانیاں آئیں تو ان پر صبر و استقامت کی تصویر بن جائے اور یہ یقین رکھے کہ آج کی ایک ایک مصیبت کل کے ایسے اجر و ثواب کی ضامن بنے گی جس کے سامنے داد و دہش اور انعام و اکرام کے تمام پیمانے ٹوٹ جائیں گے۔ ایسی فلاح اور کامیابی یقیناً صرف اللہ اور رسول کے فرمانبرداروں کو ہی نصیب ہوتی ہے، مجرموں کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۱۸﴾

(اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نقصان پہنچا سکیں اور نہ نفع۔ اور کہتے ہیں یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے کیا تم اللہ کو خبر دیتے ہو ایسی بات کی جسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے اور نہ زمین میں۔ وہ پاک اور بالا و برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں)۔

گزشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکین مکہ نہ تو آنحضرت ﷺ کو اللہ کا نبی مانتے تھے اور نہ قرآن کریم کو اللہ کی کتاب تسلیم کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے مطالبہ کرتے کہ آپ اس قرآن کو بدل ڈالئے اور اس کی جگہ ایسا قرآن لائیے جو ہمارے لئے قابل قبول ہو سکے اور یا اس میں ایسی ترامیم کیجئے کہ یہی قرآن ہمارے لئے قبول کرنا آسان ہو جائے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی باتوں کے پس منظر میں یہ تصور کارفرما ہے کہ آپ ہرگز اللہ کے رسول نہیں کیونکہ اگر آپ کو وہ اللہ کے رسول مانتے تو اس طرح کے مطالبات کی جرأت کبھی نہ کرتے۔ اس آیت

Marfat.com

کریمہ میں اس پس منظر پر دلیل پیش کی جارہی ہے۔

پس منظر اور دلیل

تصور کیجئے کہ جو لوگ پتھر کی گھڑی ہوئی مورتیوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ پتھر نہ انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ انہیں نقصان دے سکتے ہیں اور نہ زندگی کے معاملات میں ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں لیکن ان تمام سامنے کی باتوں کے باوجود وہ یہ افترا کرنے سے باز نہیں آتے کہ یہی وہ بت ہیں جو اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، یہ بھی صحیح ہے کہ وہ روزی رساں نہیں ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ وہ اللہ جیسی قدرتوں کے مالک نہیں۔ بایں ہمہ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ اختیارات دے رکھے ہیں۔ وہ دنیا کے بہت سے کاموں میں ہماری سفارش کرتے ہیں اور آخرت میں بھی وہ ہمارے لئے سفارشی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ پوری کائنات کا مالک ہے، کائنات کے دور دراز گوشوں کی نہ اسے خبر ہوسکتی ہے اور نہ ان گوشوں میں رہنے والوں کی مدد کر سکتا ہے۔ چنانچہ یہ بت اور یہ مجسمے جو بظاہر پتھر کے ہیں حقیقت میں اس کی مقرب شخصیتوں کی شبیہیں ہیں۔ یہ جہاں جہاں پائے جاتے ہیں وہاں اپنے پجاریوں کے حالات اللہ کو بھی بہم پہنچاتے ہیں اور سفارش بھی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی ساری عظمتوں کے باوجود ان کی سفارش سنتا ہے۔ غور کیجئے کہ وہ لوگ اپنے ٹھہرائے ہوئے شرکاء کو خالق و مالک نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ انہیں اللہ کے چہیتے جانتے تھے اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اس کے یہ چہیتے ہماری مشکلات میں ہمارے کام آتے ہیں اور سفارش کرتے ہیں۔ قرآن کریم توجہ دلاتا ہے کہ جو شخص اللہ کے بارے میں ایسے لغو اور لایعنی خیالات رکھے اور اللہ پر افترا کرے اس سے یہ کوئی بعید نہیں کہ وہ اللہ کے رسول اور اس پر اترنے والی کتاب کے بارے میں بھی اللہ پر جھوٹ باندھے اور افترا کرے۔ اس پس منظر کی طرف توجہ دلانے کے بعد قرآن کریم نے ایک نہایت مسکت، سادہ اور دل کو لگنے والی دلیل دی ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ فلاں فلاں کو اللہ نے اپنا شریک بنا رکھا ہے اور وہ دنیا و آخرت میں ہمارے سفارشی ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ تم ایک ایسی بات کہتے ہو اور ایسے لوگوں کو اللہ کے سامنے سفارشی ٹھہراتے ہو جنہیں اللہ نے اپنا سفارشی مقرر نہیں کیا۔ وہ اگر بت ہیں تو پتھروں کا ڈھیر ہیں۔ شخصیت ہیں تو اس کے عاجز بندے ہیں۔ اگر وہ جنات ہیں تو تمہاری طرح کی ایک مخلوق ہیں اور اگر وہ فرشتے ہیں تو وہ اللہ کے نہایت فرمانبردار اور معزز غلام ہیں۔ ان میں سے تو کوئی بھی اس کے سامنے سفارشی کی حیثیت نہیں رکھتا اور اس کی مرضی کے بغیر شفاعت نہیں کر سکتا۔ تو آخر جن کو تم شفاعت کرنے والا کہتے ہو، وہ کون ہیں۔ اللہ تو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا حالانکہ زمین و آسمان اور ساری کائنات اس کے سامنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح موجود اور معلوم ہے لیکن اس پوری کائنات میں اللہ کے علم میں ان کا تو کوئی وجود نہیں۔ کیا یہ مان لیا جائے کہ اللہ کا علم ناقص ہے۔ وہ کچھ جانتا ہے اور کچھ نہیں جانتا حالانکہ ایسی بات تو شاید تم بھی کہنے کی جرأت نہ کرسکو تو پھر اس کا نتیجہ ایک ہی ہوسکتا ہے کہ تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو اور تم جن قوتوں کو اس کا شریک سمجھتے ہو وہ اس سے نہایت بالا اور برتر ہے اور ایسے ہر شرک سے پاک ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

(اور نہیں تھے لوگ مگر ایک ہی امت۔ پھر انہوں نے اختلاف کیا اور اگر تیرے رب کی جانب سے ایک بات پہلے سے طے نہ پا چکی ہوتی تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان، جس چیز میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے)۔ ﴿یونس:19﴾

قرآن کریم نے اس آیتِ کریمہ کے ذریعے انسانوں کی متعدد گمراہیوں اور غلط تصورات کی اصلاح کی ہے جسے ہم ایک ترتیب سے عرض کرتے ہیں۔

متعدد گمراہیوں کی اصلاح

1- آج کا فلسفی یہ سمجھتا ہے اور تاریخ انسان کا مؤرخ بھی یہ لکھتا ہے کہ انسان کی زندگی کا روئے زمین پر جب آغاز ہوا تو جس طرح انسان اپنی معاشرت میں حیوانوں کی سطح پر تھا اسی طرح اپنے مذہبی خیالات میں بھی بالکل ابتدائی حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا آغاز غاروں سے کیا۔ موسم کی شدت سے بچنے کیلئے اس نے غاروں میں پناہ لی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے جھونپڑا بنانا سیکھا۔ پھر اس کے اندر ایک گھر کا خیال پیدا ہوا۔ مختلف گھروں سے آبادی کے تصور نے جنم لیا جو بڑھتے بڑھتے گاؤں اور شہر کی صورت اختیار کر گیا۔ حتیٰ کہ ملک اور ریاست کی صورت میں اجتماعی نظم نے

Marfat.com

ظہور کیا۔اسی طرح انسانی تصورات میں بھی رفتہ رفتہ ترقی آئی۔شروع شروع میں انسان نے ہر اس قوت کی پوجا کی جہاں اسے منفعت دکھائی دی۔ہر اس چیز کے سامنے جھکا جہاں اسے طاقت نظر آئی یا جسے وہ سرنہ کر سکا۔ہر بلند قامت چیز اس کا معبود بن گئی اور آسمانوں پر چمکنے والے مظاہر قدرت اس کے معبود ٹھہرے لیکن جیسے جیسے اس کے مذہبی خیالات میں اصلاح ہوتی گئی ویسے ویسے وہ نقطۂ حق کی طرف بڑھتا گیا تو آخر ایک دن اس نے نقطۂ توحید کو اپنی منزل بنالیا۔اس طرح سے جہالت سے علم کی طرف، گمراہی سے ہدایت کی طرف، بے خبری سے خبر کی طرف اور بے علمی سے علم کی طرف اور افتراق سے اجتماع کی طرف انسان کا سفر جاری رہا۔تاریکی میں آنکھیں کھولنے والے انسان نے آہستہ آہستہ روشن زندگی کا راستہ پایا۔لیکن قرآن کریم اس سے بالکل برعکس بات کہتا ہے۔اس نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ انسان کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام جیسی شخصیت سے ہوا۔نفسِ واحدہ سے انسانی مخلوق وجود میں آئی اور پھیلتی چلی گئی۔جس طرح پہلا انسان مکمل باپ اور باشعور شوہر تھا اسی طرح وہ اپنے خالق و مالک کے بارے میں بھی مکمل شعور سے بہرہ ور تھا۔قدرت نے اسے اپنی ضروریات کے حصول کیلئے زمین پر محنت کرنے اور تلاش و جستجو اور تحقیق و تفتیش کو رہنما بنانے کا حکم دیا تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی صفات اور بندگی کے تقاضوں کا علم اسے وحی الٰہی کے ذریعے عطا کیا گیا۔اس لئے اس میں کسی خطا، کسی ابتدا اور کسی نارسائی کا کوئی گزر ہو سکتا تھا۔انسانوں کو پہلے دن سے ایک خدا کی بندگی کا حکم دیا گیا۔اسی سے ڈرنے، اسی کے سامنے جھکنے اور اسی سے مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا۔اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ انسان کتنی صدیوں تک اس ہدایت پر قائم رہے۔لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چونکہ ابلیس بھی حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ہی زمین پر اترا تھا اور اسے انسانوں کو گمراہ کرنے کی نہ صرف اجازت دی گئی تھی بلکہ امکانات بھی دیئے گئے تھے۔اس نے بھی اپنا کام جاری رکھا اور آہستہ آہستہ انسانوں میں مختلف قسم کے تصورات اور اختلافات کا بیج بونے میں کامیاب ہو گیا۔تب اللہ تعالیٰ نے انسانی اصلاح کیلئے اپنے نبی اور رسول بھیجنے شروع کئے۔ان گزارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی گمراہی بعد کی چیز ہے وہ پہلے دن اپنے ساتھ ہدایت لے کے آیا تھا اور وہ اس وقت تک ہدایت پر رہا جب تک اسے شیطان گمراہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا اور دوسری یہ بات کہ جیسے ہی انسانوں میں گمراہی کی صورتیں پیدا ہوئیں تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان اور پہلے نبی کے ذریعے انسانوں کو ہدایت عطا فرمائی تھی اسی طرح ہر دور میں انبیاء اور کتابوں کے ذریعے انسانوں کو ہدایت عطا کی جاتی رہی۔نبی کریم ﷺ اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔

2- مشرکین مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ تم گمراہی کے جس دلدل میں اترتے جا رہے ہو اور تمہارے اندر بہت سے اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اس کا سبب شیطان کی پیروی ہے کیونکہ ان اختلافات کا آغاز شیطان کی پیروی سے ہوا تھا اور ہر دور میں اس کی اصلاح اللہ تعالیٰ کے نبیوں پر ایمان لانے اور ان کی پیروی کرنے سے ہوئی ہے۔آج بھی اگر تم اصلاح چاہتے ہو اور تمہیں اپنی نجات کی فکر ہے تو اس کا راستہ نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان اور آپ کے اتباع کے سوا اور کوئی نہیں۔

3- تم یہ سمجھتے ہو کہ ان اختلافات کو دور کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی ایسے غیر معمولی طریقے کو اختیار کیا جانا چاہیے جس کو دیکھ کر کوئی شخص ایمان لائے بغیر نہ رہے۔لیکن یہ بات خلافِ عقل بھی ہے اور خلافِ تاریخ بھی۔تم سے پہلے ایسی امتیں گزری ہیں جن کی تاریخ سے تم واقف ہو کہ ان کی گمراہی کے علاج کیلئے اللہ تعالیٰ نے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں لیکن انہوں نے ایمان کیلئے معجزات کو شرط رکھا اور قسم قسم کی نشانیاں مانگیں حالانکہ عقل کی بات یہ ہے کہ انہیں ضرورت ہدایت کی ہے جو پیغمبر لے کر آتا ہے اور پیغمبر کی شخصیت اور اس کی وجاہت اس کی دلیل کے طور پر کافی ہوتی ہے۔بایں ہمہ وہ ایک سے ایک بڑی نشانی مانگتے ہیں اور بعض دفعہ جب ان کی مطلوب نشانی انہیں دکھا دی جاتی ہے تو تب بھی وہ ایمان لانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے اونٹنی کا معجزہ طلب کیا۔ان کی آنکھوں کے سامنے اونٹنی پہاڑ سے نکلی جس کے پیچھے ایک بچہ بھی تھا اور اونٹنی اپنی ذات میں بجائے خود ایک معجزہ تھی۔ساری بستی کا پانی وہ ایک وقت میں اکیلی پی جاتی تھی۔حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں بتایا کہ تمہاری بقاء اب اس بات کے ساتھ معلق ہو گئی ہے کہ تم اس اونٹنی کو کوئی آزار نہ پہنچانا۔لیکن ان بدبختوں نے آخر اس اونٹنی کو بھی قتل کر ڈالا۔اسی کی پاداش میں خدا کا عذاب آیا اور ان کی جڑ کاٹ دی گئی۔اس لئے یہاں بتایا جا رہا ہے کہ ہر دور میں پیغمبر ہی اصلاح کا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔اگر تمہیں اصلاح عزیز ہے تو آنحضرت ﷺ پر ایمان لاؤ۔غیر معمولی نشانیوں کی طلب نہ پہلے ایمان کا ذریعہ بنی ہے اور نہ اب بنے گی۔پروردگار کیلئے کسی بڑی سے بڑی نشانی کو دکھا دینا کوئی مشکل نہیں۔لیکن یہ اس کی سنت کے خلاف ہے۔اس نے انسان کی نجات اور جزاء و سزا کا دارومدار اس بات پر رکھا ہے کہ حقیقت کو انسانوں کے حواس

Marfat.com

سے پوشیدہ رکھ کران کی عقل وفہم اور ضمیر ووجدان کو آزمائش میں ڈالا جائے۔ جواس آزمائش میں پورا اترے وہ نجات کا مستحق ٹھہرے اور جواس آزمائش میں ناکام ثابت ہووہ آخرت میں ناکام ٹھہرے اور اگر کسی بہت بڑی نشانی کو دکھا کر کسی کو ایمان لانے پر مجبور کیا جائے تو یہ اس کی اس سنت کے خلاف ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ کسی جماعت کو ایک متعین نصاب بتادیا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ اتنے عرصے بعد اس نصاب کا امتحان ہوگا جو اس میں پاس ہوگا وہ سرخرو ٹھہرے گا اور جو فیل ہوگا وہ ہر طرح کی رسوائی اور ناکامی کا مستحق ہوگا۔ لیکن وہ جماعت اس کے مقابلے میں یہ کہے کہ ہم تو اس صورت میں امتحان میں بیٹھنے کیلئے تیار ہیں کہ ہمیں قبل از وقت تمام سوالات بتادیئے جائیں تاکہ ہم اپنی صلاحیت کے امتحان سے بچ جائیں اور محنت بھی نہ کرنی پڑے۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ کون اس مطالبے کو قبول کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کسی ایسی نشانی کا ظہور جو صاف صاف اللہ کی الوہیت، پیغمبر کی رسالت اور دین کی حقانیت کو کھول کر رکھ دے۔ اس کے بعد ایمان کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے کیونکہ حقیقت کھل جانے کے بعد تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سورج نکلنے سے پہلے سورج نکلنے کا یقین عقل کا امتحان ہے لیکن سورج نکلنے کے بعد سورج نکلنے کا اقرار کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ اب اس اقرار کے سوا کوئی چارا ہی نہیں۔ یہی انسان کا امتحان ہے۔ اللہ اور اس کی صفات، وحی الٰہی اور نبوت کی حقیقت، عالم برزخ اور قیامت کے آنے کے بعد تمام کائنات کا فنا ہو جانا اور پھر ایک وقت تمام انسانوں کا از سر نو زندہ ہونا اور محشر میں حساب کتاب کیلئے پیش ہونا اور زندگی کے ایک ایک لمحہ کا حساب دینا یہ وہ حقائق ہیں جنہیں تسلیم کرنا ہمارے عقل وشعور پر چھوڑ دیا گیا ہے اور حواس پر ان کی حقیقت کھولی نہیں گئی۔ آج جو بھی ان پر ایمان لاتا ہے وہ اللہ کے نبی کے اعتماد پر ایمان لاتا ہے اور اسی کی قدر و قیمت ہے۔ جس کے نتیجہ میں نجات کی امید کی جاسکتی ہے۔

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ الخ ہر دور کے مشرکین کی طرح مشرکین مکہ بھی نبی کریم ﷺ سے مطالبہ کرتے تھے کہ دنیا اور آخرت کے بارے میں ایک نقطہ نگاہ ہمارا ہے اور ایک تمہارا۔ زندگی کے بارے میں ایک طریقہ اور رویہ ہمارا ہے اور ایک تم ہمیں دینا چاہتے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ ان میں سے صحیح کون سا ہے۔ آخر اس کا فیصلہ کون کرے گا اور اس اختلاف کو اتفاق میں بدلنے کی سند کس کے پاس ہے۔ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو پھر اپنے اللہ سے کہو کہ وہ کسی غیر معمولی طریقے سے تمہارا رسول ہونا ثابت کردے اور تم جو کچھ کہتے ہو اس کا حق اور صحیح ہونا ہمارے سامنے مبرہن ہو جائے کیونکہ جب تک ہمارے درمیان فکر و نظر اور جادۂ عمل کا اختلاف باقی رہتا ہے ہم تمہاری بات ماننے سے معذور ہیں۔ قرآن کریم اس کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے دن سے ایک فیصلہ کر رکھا ہے کہ حق و باطل اور صحیح اور غلط کا فیصلہ ہم دنیا میں نہیں، آخرت میں کریں گے۔ دنیا میں ہم نے حق و باطل میں امتیاز کیلئے تمہیں عقل دی ہے، پھر مزید آسانی کیلئے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ ان کا ذاتی سیرت و کردار اور ان کا حسنِ اخلاق یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے بڑھ کر سچے لوگ ہیں۔ پھر ان پر جو کتاب اترتی ہے اس کی ایک ایک بات اپنے اندر دلیل کی ایسی قوت رکھتی ہے جس پر شک وارتیاب کا سایہ نہیں پڑ سکتا۔ رسولوں کی زندگی اور کتاب کی صداقت اور جامعیت سلیم الطبع لوگوں کیلئے ہدایت دینے کیلئے کافی ہوتی ہے۔ جہاں کہیں ان کی عقل ٹھوکر کھاتی ہے پیغمبر کی تعلیم انہیں سہارا دیتی ہے لیکن اگر اس تمام انتظام کے باوجود بھی کوئی شخص راہِ ہدایت اختیار نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ہوائے نفس کا پرستار ہے۔ اس کی زندگی خواہشات کے اتباع سے عبارت ہے۔ وہ پیغمبر پر ایمان لانے سے اس لئے انکار نہیں کرتا کہ اس کے سمجھنے کیلئے اسے دلائل میسر نہیں آئے یا بات اس کے سامنے واضح نہیں ہوسکی بلکہ اس کا انکار صرف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ خواہشات کی آزادی چھوڑ کر شریعت کی پابندیاں قبول کرنے کیلئے تیار نہیں۔ حقوق و فرائض اسے زنجیر معلوم ہوتے ہیں اور اس کے پیشِ نظر ایسی زندگی ہے جس میں کھل کھیلنے کے امکانات ہر وقت موجود ہوں۔ ایسے شخص کیلئے اختلافات کا فیصلہ اور حق و باطل میں امتیاز اس دنیا میں نہیں، آخرت میں ہوگا جہاں ہر چیز کھل کر سامنے آجائے گی۔ پروردگار کا انکار کرنے والے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھیں گے۔ جنت وجہنم کا مذاق اڑانے والے بچشم سر ہر چیز کا نظارہ کریں گے۔ یہ وہ فیصلہ ہے جو پروردگار انسانوں کو دنیا میں بھیجنے سے پہلے فرما چکے ہیں۔ اب دنیا میں اس سے مختلف بات نہیں ہوسکتی۔ اگر اللہ کی جانب سے یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا تو پھر مشرکین مکہ کے سامنے ایسی باتیں کھول کر رکھ دی جاتیں لیکن پھر وہ اللہ کے عذاب سے نہ بچ سکتے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝

(اور وہ کہتے ہیں کہ اس نبی پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی تو آپ کہہ دیجئے کہ غیب کا علم تو بس اللہ

Marfat.com

ہی کو ہے۔ تو تم لوگ انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔) ﴿یونس:۲۰﴾

اللہ کے نبیوں کی تاریخ یہ ہے کہ انہیں جس عظیم منصب یعنی انسانوں کی ہدایت پر مامور کیا جاتا ہے وہ اس کی ادائیگی کیلئے ہمت سے بڑھ کر جان لڑاتے ہیں۔ زبان کی پوری قوت، ذہن کی تمام تر رعنائی اور قلب کا سارا سوز و گداز اس راستے میں جھونک دیتے ہیں۔ دن بھر لوگوں کو دعوت دیتے، مخالفت برداشت کرتے اور سمجھاتے گزرتا ہے اور رات کو مخالفین کی ہدایت کیلئے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ ان کی قوم ان پر مظالم توڑتی ہے لیکن وہ ان کے ساتھ انتہائی مربیانہ سلوک کرتے ہیں۔ وہ ہر ممکن طریقے سے ان کا جینا مشکل کردیتے ہیں لیکن یہ ان کی زندگی کی آسانیوں کیلئے صبح و شام انہیں دعوت دیتے ہیں۔ اپنی شخصیت کی ساری دلآویزیاں جب ان پر نچھاور کردینے کے بعد بھی ان کی طرف سے قبولیت کا امکان پیدا نہیں ہوتا تو پھر انہیں دنیا میں اللہ کے عذاب سے اور قیامت میں آخرت کے عذاب سے اس طرح ڈراتے ہیں کہ ان کے دل اس سے کانپیں لیکن وہ اسے اپنی مخالفت نہ سمجھیں۔ کیونکہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ نصیحت کو نصیحت سمجھ کر بہت کم قبول کرتا ہے۔ اس پر وہ چیز اثر انداز ہوتی ہے جس میں ترغیب ہو یا ترہیب ہو۔ یعنی اسے اس کا یقین دلا دیا جائے کہ تم اگر اس بات کو قبول کرلو تو تمہیں اس کے نتیجے میں یہ اور یہ کامرانیاں ملیں گی۔ اور اگر تم نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا تو اس کے نتیجے میں تمہیں یہ اور یہ نعمتیں ملیں گی اور ایسی اور ایسی ناکامیوں سے واسطہ پڑے گا۔ چنانچہ اللہ کے نبی اپنی دعوت کو ہمیشہ ان دونوں باتوں سے مؤثر بناتے ہیں اور اللہ کی کتاب بھی ہمیشہ وعد اور وعید کو اہمیت دیتی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے بھی دعوت اسلامی کی قبولیت کے نتیجے میں اچھی اور آسودہ زندگی، دنیا کی حکمرانی اور آخرت کی سرخروئی کی نہ صرف نوید سنائی بلکہ وعدہ بھی فرمایا اور عدم قبولیت کی صورت میں دو عذابوں سے ڈرایا کہ اگر تم نے اللہ کے نبی کی دعوت کو اجتماعی طور پر مسترد کردیا اور نبی کو ہجرت پر مجبور کردیا تو پھر اندیشہ ہے کہ تم پر دنیا ہی میں اللہ کا ایسا عذاب ٹوٹے جس سے تمہاری جڑ کٹ جائے اور اگر مشیت الٰہی کی مصلحتوں سے دنیا میں اللہ کا عذاب نہ آئے تو آخرت میں ابدی سزا سے تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا اور وہ سزا ایسی ہے جسے قرآن کریم نے عذاب اکبر کے نام سے یاد فرمایا ہے۔

مشرکین مکہ اپنے نخوت اور تکبر کے باعث اس دھمکی اور وعید پر بہت برہم ہوتے اور بجائے اس سے مثبت اثر لینے کے آنحضرت ﷺ کا منہ چڑاتے اور بار بار عذاب کا مطالبہ کرتے اور بعض دفعہ تو ان کا یہ مطالبہ استہزاء کی شکل اختیار کرجاتا۔ اس آیتِ کریمہ میں "آیت" سے دنیا کا عذاب ہی مراد ہے اور مشرکین مکہ اس کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ آخر وہ عذاب کہاں رک گیا ہے۔ اگر اسے آنا ہوتا تو اب تک آچکا ہوتا۔ ہمارے رویئے میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم نے تمہاری دعوت کا تمسخر اڑانے میں اور تمہاری ذات اور مسلمانوں کو اذیت پہنچانے میں تو کوئی کوتاہی نہیں کی تو پھر آخر تمہارا عذاب کیوں نہیں آرہا؟ قرآن کریم نے ان کا مطالبہ نقل کرنے کے بعد اس کا نہایت مختصر جواب دیا ہے، لیکن اس کے الفاظ مختصر ضرور ہیں معنی اور مفہوم مختصر نہیں۔ مقصود کہنے کا یہ ہے کہ میں تمہاری طرف ہدایت لے کر آیا ہوں تم بجائے مجھ سے ہدایت مانگنے کے عذاب کا مطالبہ کررہے ہو۔ اللہ کے رسول، اللہ کی رحمت بن کر آتے ہیں، عذاب بن کر نہیں آتے۔ ان کی ساری کوشش تو قوم کو عذاب سے بچانے کیلئے ہوتی ہے۔ ہدایت کیلئے سعی و کاوش میں، میں نے کوئی کمی نہیں کی اور میں ہر ممکن طریقے سے تمہیں عذاب سے بچانے کی کوشش کررہا ہوں لیکن تمہاری طرف سے بار بار یہ مطالبہ ہورہا ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ عذاب کا سررشتہ میرے ہاتھ میں نہیں، وہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے مجھے تمہیں آگاہ کرنے کا حکم دیا۔ میں نے تمہیں اس سے آگاہ کردیا۔ اب رہی یہ بات کہ وہ عذاب کیوں نہیں آیا تو یہ سراسر ایسی بات ہے جس کا تعلق غیب سے ہے تو مجھے اللہ نے پیغمبر بنا کے بھیجا ہے، غیب دان بنا کر نہیں بھیجا۔ عالمِ غیب کی ہر وہ بات جتنی اللہ تعالیٰ مجھے بتاتا ہے اور جس کا تعلق ہدایت سے ہوتا ہے، میں اسے تم تک پہنچا دیتا ہوں، لیکن جس بات کو مجھ پر اتارا نہیں جاتا اسے میں نہیں جانتا۔ اتنی بات یقینی ہے کہ تم نے اگر پہلی قوموں جیسا رویہ اختیار کیا تو جس طرح پہلی قوموں پر عذاب آیا، تم پر بھی آئے گا، لیکن وہ کب آئے گا، اس کی شکل کیا ہوگی، میں اسے نہیں جانتا۔ کیونکہ غیب کا خزانہ اللہ کے پاس ہے۔ تمہیں اگر عذاب سے ڈرنے کی بجائے اس کے آنے کا انتظار ہے تو انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ البتہ میرے انتظار اور تمہارے انتظار میں فرق ہے۔ میرا انتظار اس شخص کی مانند ہے جو ایک جاں بلب مریض کو دیکھتا ہے اور اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اسے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ مریض کا آخری وقت دور نہیں۔ وہ اس کے آخری وقت کے انتظار میں رہتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ نہایت بے کلی اور بے چینی سے اس کی صحت کیلئے دعائیں بھی مانگتا ہے۔ لیکن تمہارا انتظار ایک تمسخر ہے لیکن تمہیں اندازہ نہیں کہ جتنی قومیں بھی عذاب کا شکار ہوئیں وہ اسے تمسخر ہی سمجھتی تھیں لیکن آخر کار اس عذاب نے انہیں تباہ و برباد کردیا اور وہ دنیا کی تاریخ میں عبرت بن کر رہ گئیں۔ اللہ نہ کرے تمہارا انجام بھی ان جیسا ہو۔

Marfat.com

وَإِذَآ أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ
مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِىٓ اٰيَاتِنَا ۚ قُلِ اللّٰهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ
رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿٢١﴾ هُوَ الَّذِىْ يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ
حَتّٰىٓ إِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا
جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا
أَنَّهُمْ أُحِيْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا
مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّآ أَنْجٰهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ
فِى الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى أَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٣﴾
إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ
نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ ۗ حَتّٰىٓ إِذَآ أَخَذَتِ
الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ
أَتٰىهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ
بِالْأَمْسِ ۗ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٤﴾ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا
إِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۚ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢٥﴾ لِلَّذِيْنَ

Marfat.com

أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٦﴾ وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ
جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ
عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٧﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ
نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ
وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو
كُلُّ نَفْسٍ مَا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ
مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾

(اور جب ہم لوگوں کو کسی تکلیف کے بعد "جوان کو پہنچ چکی ہے" اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ فوراً ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چالیں چلنے لگتے ہیں۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ اپنی تدبیر میں کہیں زیادہ تیز ہے۔ بیشک ہمارے فرشتے لکھ رہے ہیں جو چالیں تم چل رہے ہو۔ وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور کشتیاں ان کو لے کر بادِ موافق کے سہارے چل رہی ہوتی ہیں اور وہ ان کشتیوں میں شاداں و فرحاں ہوتے ہیں کہ دفعۃً ایک بادِ تند آتی ہے اور ہر طرف سے موجیں ان سے ٹکرانے لگتی ہیں اور مسافر گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ گھیر لئے گئے ہیں۔ اس وقت وہ اللہ کو پکارتے ہیں۔ اسی کیلئے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس

Marfat.com

مصیبت سے نجات دے دی تو ہم شکر گزار بندے بنیں گے۔ پھر جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو پھر اچانک وہی لوگ بغیر کسی حق کے زمین میں سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہارے ہی نفسوں پر پڑنے والی ہے۔ تم دنیا کی زندگی کا نفع اٹھالو پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے۔ تب ہم تمہیں بتادیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ پس مثال حیاتِ دنیا کی ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی اتارا۔ پس اس سے زمین کی نباتات خوب گھنی ہوگئی جس سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی۔ یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگھار اور وہ خوب آراستہ ہوگئی اور اہلِ زمین نے یقین کرلیا کہ وہ اس پر قادر ہیں تو دفعۃً اس پر ہمارا قہر رات کو یا دن کو آدھمکا۔ پس ہم نے اسے کاٹ کر رکھ دیا، گویا کل وہ یہاں تھی ہی نہیں۔ ہم وضاحت سے بیان کرتے ہیں اپنی قدرت کی نشانیاں اس قوم کیلئے جو غور وفکر کرتی ہے۔ اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دے دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اچھے کام کئے ان کیلئے اچھا بدلہ ہے بلکہ اس پر مزید بھی۔ اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت۔ یہی لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنہوں نے برے کام کئے تو برائی کی سزا اس جیسی ہوگی۔ اور ان پر ذلت چھا رہی ہوگی۔ اللہ سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا ڈھانپ دیئے گئے ہیں ان کے چہرے کالی رات کے ٹکڑوں سے۔ یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم جمع کریں گے سب کو، پھر ہم شرک کرنے والوں کو حکم دیں گے کہ ٹھہر جاؤ اپنی جگہوں پر تم اور تمہارے شرکاء، پھر ہم ان کے درمیان تفریق کردیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ پس کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ ہمارے اور تمہارے درمیان کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بے خبر تھے۔ اس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دوچار ہوگا جو اس نے آگے بھیجا تھا اور وہ سب لوگ اپنے مولیٰ حقیقی کی طرف لوٹائے جائیں گے اور گم ہوجائے گا ان سے جو وہ افتراء باندھا کرتے تھے۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِیْٓ اٰيَاتِنَا ۭ قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ۭ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۲۱﴾

(اور جب ہم لوگوں کو کسی تکلیف کے بعد "جو ان کو پہنچ چکی ہے" اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ فوراً ہماری نشانیوں کے معاملہ میں چالیں چلنے لگتے ہیں۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ اپنی تدبیر میں کہیں زیادہ تیز ہے۔ بیشک ہمارے فرشتے لکھ رہے ہیں جو چالیں تم چل رہے ہو۔)

اس آیتِ کریمہ میں روئے سخن مشرکینِ مکہ ہی کی طرف ہے، لیکن بات ان سے خطاب کرنے کی بجائے عام اسلوب میں کہی گئی ہے تاکہ انہیں اندازہ ہوجائے کہ وہ لوگ اللہ کی نگاہ میں اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے خطاب کیا جائے بلکہ وہ بے التفاتی کے سزاوار ہیں۔

عام اسلوب اختیار کرنے کا ممکن ہے یہ بھی سبب ہو کہ جس بیماری اور کوتاہی کا یہاں ذکر فرمایا جارہا ہے وہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ جب بھی قومیں علوم وفنون میں ترقی کرتی ہیں یا خوشحالیوں میں آگے بڑھ جاتی ہیں تو عموماً ان کی سوچ اور عمل کا انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔ پہلی معذب قوموں کی تاریخ بھی اس پر گواہ ہے اور ہر دور کے گمراہ لوگ اسی گمراہی کا ارتکاب کرتے چلے آئے ہیں۔

مشرکین کی اصل گمراهی

سابقہ آیتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ کی جانب سے شکایت کی گئی تھی کہ آنحضرت ﷺ کی طرف سے کوئی ایسی نشانی کیوں نہیں دکھائی جاتی جو انہیں ایمان لانے پر مجبور کردے۔ تو اس آیت میں ان کے اس مطالبے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان کی اصل فکری اور عملی کمزوری کی طرف متوجہ کیا

Marfat.com

گیا ہے۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے اللہ کی طرف سے قحط تم پر مسلط کیا گیا تھا اور وہ ایک ایسی ہی نشانی تھی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی تائید میں اہلِ مصر پر قحط کا عذاب بھیجا گیا تھا۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ لوگوں کے دل نرم پڑیں، اللہ کی پکڑ سے ڈریں اور پیغمبر کی دعوت کو تسلیم کریں اور اسی مقصد کیلئے اہلِ مکہ پر بھی قحط بھیجا گیا لیکن جب نبی کریم ﷺ کی دعا سے قحط ٹال دیا گیا اور جا بجا رحمت کی بارشیں برسنے لگیں، سبزہ اگنے اور کھیتیاں بار آور ہونے کی وجہ سے جب کھانے پینے کے وسائل عام ہونے لگے تو اس بیماری نے ان کے اندر سر اٹھانا شروع کیا جو ہر دور کے گمراہ لوگوں میں سر اٹھاتی رہی ہے۔ جیسے ہی آسودگی نصیب ہوئی اور مصیبت کے بعد رحمت دیکھنے کو ملی، حالات تبدیل ہوئے، اچھے دن آئے تو بجائے اللہ کی طرف راغب ہونے کے ان کی گردنیں اکڑنے لگیں، پرانے دن پھر عود کر آئے۔ ناؤ نوش کی محفلیں جمنے لگیں، بے حیائی عام ہونے لگی اور جب کسی نے توجہ دلائی کہ ابھی جو تم پر مصیبت گزری ہے تو بہت جلد اسے بھولے ہو تو ان کے پڑھے لکھے لوگوں اور زبان آور مقرروں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس میں کیا تعجب کی بات ہے ہر قوم پر نرم اور گرم حالات آتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی مصیبت اور کبھی راحت، ایسے ہی ہے جیسے کبھی بہار اور کبھی خزاں۔ یہ تو اس دھرتی کی ریت ہے کہ حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، پلٹ پلٹ کر آتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اس طرح چال بازیوں سے اپنی قوم کو خیر کی طرف آنے سے روکا حالانکہ اگر وہ معمولی سے بھی غور و فکر سے کام لیتے یا ان کی عقل مسموم نہ ہو چکی ہوتی تو یہ بات سمجھنا ان کیلئے مشکل نہ تھا کہ ہم نے قحط دور کرنے کیلئے کیسے کیسے نذرانے بتوں کے سامنے پیش کیے، کیسے کیسے چڑھاوے آستانوں پر چڑھائے اور کیسی کیسی منتیں ہر اس جگہ جا کے مانیں جس جگہ کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہاں انسانوں کی سنی جاتی ہے، لیکن کسی طرف سے بھی اس سختی کے ٹلنے اور عذاب کے دور ہونے کی امید پیدا نہ ہوئی، لیکن جب نبی کریم ﷺ نے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اس عذاب کو دور کرنے کی دعا کی تو اللہ نے اس کو قبول کرتے ہوئے اس مصیبت کو اہلِ مکہ سے دور کر دیا۔ یہ دلیل ان کے اطمینان کیلئے کافی ہونی چاہیے تھی لیکن ان کے دانشوروں نے ان کو نئی چال بازیوں میں الجھا دیا کہ قوموں کا مصیبت میں مبتلا ہونا اور پھر مصیبتوں سے نکل آنا یہ تو تاریخ کی ایک ایسی روایت ہے جو ہمیشہ سے چلی آئی ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے اثر قبول کرنے کی بجائے دنیا کا ایک معمول سمجھ کر اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: قُلِ اللّٰہُ اَسۡرَعُ مَکۡرًا کہہ دیجئے اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے یعنی تم نے اپنی سخن سازیوں سے جس طرح ایک حقیقت کو روایت کہہ کر پامال کیا ہے اور اللہ کی قدرت کو مخلوق کے معمولات کی نذر کر دیا ہے تمہیں اس کی سزا یہ ملے گی کہ تمہاری ان چال بازیوں کے جواب میں اللہ کی خفیہ تدبیر حرکت میں آئے گی اور وہ ایسی دھیمی اور خفیہ تدبیر ہو گی کہ بہت مشکل سے کوئی قوم اس کی گرفت سے نکلتی ہے۔ وہ تدبیر یہ ہے کہ جب لوگ خوشحالیوں کی وجہ سے عیش و عشرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اللہ کی طرف سے آنے والی تنبیہات کو نذر انداز کر جاتے ہیں تو قدرت کی طرف سے ایک تدبیر ان کیلئے سزا بن کے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کی خوشحالیوں کو دراز کر دیا جاتا ہے، ان کے اعمال ان کیلئے مزین کر دیئے جاتے ہیں، ان کا عیش و عشرت ان کی ترقی کی علامت بنا دیا جاتا ہے۔ وہ صرف مادی ترقی پر اکتفا کر کے اپنی قومی ترقی کے پیمانے بدلتے رہتے ہیں۔ ان کا اخلاقی زوال، ان کے انسانی رشتوں کی تباہی، ان کے عائلی نظام کی ناکامی اور ان کے اندر بڑھتے ہوئے جرائم ان کو جگانے کی بجائے اور سلانے کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ ان کو ڈھیل پہ ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس ڈھیل کے نتیجے میں اپنے معمولات میں مست رہتے ہیں اور ادھر قدرت کے بندوبست کا حال یہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے: اِنَّ رُسُلَنَا یَکۡتُبُوۡنَ مَا تَمۡکُرُوۡنَ ○ بیشک ہمارے فرشتے لکھتے رہتے ہیں جو کچھ وہ چال بازیاں کرتے ہیں اللہ کی طرف سے ڈھیل انہیں سلائے رکھتی ہے اور وہ اپنی گمراہیوں میں بڑھتے چلے جاتے ہیں لیکن کارکنانِ قضاء و قدر برابر اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں لگے رہتے ہیں۔ وہ ان کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک عمل کو نوٹ کرتے ہیں۔ چنانچہ جب انہیں پکڑنے کا وقت آتا ہے تو یہی ان کا نامۂ عمل ان کیخلاف شہادت بن جاتا ہے اور یہی شہادت یہاں بھی اور وہاں بھی ان کیلئے زنجیر ثابت ہو گی۔

Marfat.com

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ ۚ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا
رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۚ۬ لَىِٕنْ
اَنْجَیْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّاۤ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا
بَغْیُكُمْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ ۙ مَّتَاعَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؗ ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۳﴾

(وہی ہے جو تمہیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے۔ چنانچہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور کشتیاں ان کو لے کر بادِ موافق کے سہارے چل رہی ہوتی ہیں اور وہ ان کشتیوں میں شاداں وفرحاں ہوتے ہیں کہ دفعۃً ایک بادِ تند آتی ہے اور ہر طرف سے موجیں ان سے ٹکرانے لگتی ہیں اور مسافر گمان کرنے لگتے ہیں کہ وہ گھیر لئے گئے ہیں۔ اس وقت وہ اللہ کو پکارتے ہیں۔ اسی کیلئے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ہم شکرگزار بندے بنیں گے۔ (پھر جب وہ ان کو نجات دے دیتا ہے تو پھر اچانک وہی لوگ بغیر کسی حق کے زمین میں سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہارے ہی نفسوں پر پڑنے والی ہے۔ تم دنیا کی زندگی کا نفع اٹھا لو پھر ہماری طرف تمہیں پلٹ کر آنا ہے۔ تب ہم تمہیں بتا دیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔) ﴿یونس: ۲۲: ۲۳﴾

ان دو آیتوں میں توحید کی ایک ایسی دلیل بیان کی گئی ہے جو ہر انسان کے نفس میں موجود ہے اور انسان کی گمراہی کی بھی ایک ایسی سند بیان کی گئی ہے جو تمام بگڑی ہوئی قوموں کی کہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے انسان کو اپنا بندہ بنایا اور خلافت کا شرف بخشا لیکن انسان اپنی بندگی کو مختلف عوارض کے باعث بار بار بھولتا ہے۔ پروردگار کا مزید احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کو اس بھول سے بچانے کیلئے ایسے انتظامات کئے ہیں کہ اگر انسان واقعی ان سے فائدہ اٹھا کر صحیح راستے پر چلنا چاہے تو اس کیلئے کبھی دشواری پیش نہ آئے۔ پہلا انتظام تو پروردگار نے یہ فرمایا کہ انسانوں کے دنیا میں آنے سے پہلے عالمِ ارواح میں ان سے ایک عہد لیا گیا جسے عہدِ الست کہتے ہیں۔ اس نے اپنی توحید کا بیج ہر شخص کی روح میں بو دیا۔ دنیا میں آنے کے بعد جب مختلف عوارض نے اس بیج کو بڑھنے سے روکا بلکہ اس کے مرجانے کے امکانات پیدا کر دیئے تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے گردوپیش میں ایسی نشانیاں اٹھا دیں کہ اگر ہم کھلی آنکھوں سے ان کا نظارہ کریں تو وہ ہمیں اس عہد کی یاد دلانے کیلئے کافی ہیں۔ سورج چمکتا ہے، چاند دمکتا ہے، ستارے ٹمٹماتے ہیں، پھول مہکتا ہے، کلیاں چٹکتی ہیں، بہاریں مسکراتی ہیں، سبزہ مخمل کی طرح ہمارے قدم چومتا ہے، درختوں کی چھتریاں ہمیں سایہ دیتی ہیں، گرتی ہوئی آبشاریں، ابلتے ہوئے چشمے ہمارے سامنے حُسن کی آغوش وا کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ خود ہمارے اندر احساسات اور انفعالات کی ایک دنیا ہے جو دل کی دھڑکنوں سے وجود میں آتی ہے اور دماغ کی رعنائیاں ہیں جو کبھی اسے عشق کی بے تابیاں بخشتی ہیں اور کبھی حُسن کا زیور پہنا دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک چیز ہمیں نہ صرف اللہ کے وجود کی طرف بلاتی ہے بلکہ اس کے جمال کی رعنائیاں بھی دکھاتی ہے۔ اسی طرح جب گھنگھور گھٹائیں جھوم کے اٹھتی ہیں اور پربت پر چھاؤنی چھا جاتی ہے پھر بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج، پہاڑوں کی سربفلک ایستادگی، لاوا ابلتے ہوئے پہاڑوں کی آتش فشانی، جنگل میں شیر کی دھاڑ اور چیتے جیسے درندوں کی برق رفتار تیزی جیسے مناظر ہیں جن میں سے ایک ایک چیز اللہ کے جلال کا ظہور ہے۔ جب بھی کوئی شخص کائنات کی ان چیزوں کو غور سے دیکھتا ہے تو اگر اس کی عقل نارسا واقع نہیں ہوئی تو وہ یقیناً پسِ پردہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی ہر کوشش جو اپنے پہلو میں اخلاص بھی رکھتی ہو کبھی نہیں ہو سکتا کہ دیکھنے والے کو خالق کی طرف رہنمائی نہ کرے۔ وہ پھول کی ایک پنکھڑی کو لے کر بیٹھ جائے تو اس کی نزاکت، خوشبو اور رنگ و آہنگ اسے خالق کا پتہ دیتے ہیں لیکن اگر انسانوں نے اپنے ہی اڑائے ہوئے غبار میں اپنے عقل و شعور کو بری طرح کند کر لیا ہو تو پھر اللہ کا مزید احسان یہ ہے کہ اس نے وحی الٰہی کے ذریعے اپنے پاکیزہ انسانوں کو رسول بنا کر ان پر کتابیں نازل کر کے انسان کی ضرورت کو نہایت آسان کر دیا، لیکن پروردگار کے انہیں فیوض و عنایات کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ اس نے بعض دلیلیں انسان کی فطرت میں اتاری ہیں جس سے کام لے کر انسان بڑی آسانی سے اپنے اللہ کو پہچان سکتا ہے۔ چنانچہ انہیں فطری دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے جس کو مثال کے طور پر اس آیتِ کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے لیکن اس کو بیان کرنے سے پہلے ایک لفظ سے ان پردوں کو ہٹانے کی کوشش فرمائی ہے جو انسان کیلئے ایسی رہنمائی کے راستے میں موانع بن جاتے

Marfat.com

ہیں۔ مثلاً آدمی برو بحر میں سفر کرتا ہے، ہواؤں میں اڑتا ہے تو وہ کبھی اس پر توجہ نہیں کرتا کہ وہ جن وسائل سے کام لے رہا ہے کیا یہ وسائل اس نے پیدا کئے ہیں۔ وہ جن صلاحیتوں اور قوتوں سے کام لے کر وسائل کو خدمت کرنے پر مجبور کرتا ہے ان کے بارے میں کبھی سوچنے کی زحمت نہیں کرتا کہ کیا وہ ان کا خالق ہے۔ اس لئے اس کمزوری کی طرف توجہ دلانے کیلئے فرمایا: هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ اللہ وہ ذات ہے جو تمہیں بر و بحر میں سفر کراتا ہے ورنہ تم خود اس قابل نہیں تھے۔ جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں سے پیدا ہوئے تھے "لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا" تم کچھ نہیں جانتے تھے، پرندوں اور حیوانوں کے بچے پیدا ہوتے ہی اپنی ماں کو پہچانتے اور اپنی غذا کو تلاش کر لیتے ہیں لیکن انسان کا بچہ کئی مہینوں تک نہ اپنی ماں کو پہچانتا ہے نہ باپ کو۔ اسے صرف بھوک کا احساس دیا گیا ہے۔ اس لئے وہ بھوک لگنے پر روتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ میری غذا کا مرکز کہاں ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ پھر میں نے ضرورت کے مطابق قوتِ سماعت سے نوازا، قوتِ مشاہدہ عطا کی، دل و دماغ کی قوتیں بخشیں، حتیٰ کہ ان علوم اور حقائق کیلئے جہاں حواس و عقل کافی نہیں تھے وحی الٰہی کا نور روشن کیا، جس نے تمہیں زندگی کے سفر میں درجہ بدرجہ رہنمائی عطا کی۔ اس لئے تمہیں پہلے اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ تمہاری زندگی میں جولانیاں، تگ و تاز اور ہمہ ہمی یہ تمہاری ہمت سے نہیں بلکہ اللہ کی عطا سے ہے۔ تمہاری ایجادات بھی، تمہارے غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ اچانک اس کی طرف سے الہام سے ہے۔ نیوٹن ہر روز باغ سے سیب گرتے دیکھتا تھا لیکن کبھی اس پر کششِ زمین کا عقدہ نہیں کھلا اور یہ اس وقت کھلا جب اللہ نے اس کے دماغ میں اسے الہام کیا۔ اگر آدمی اس نقطے ہی کو سمجھ لے تو وہ زندگی کے سفر میں روانہ ہونے اور کشتیوں پر سوار ہونے سے پہلے اللہ کی توحید سے ہم آغوش ہو جائے، لیکن اس کے پیشگی تغافل کو دیکھتے ہوئے اللہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے مزید دلائل کا باب کھول دیا جس سے ہمیں فطرت کی رہنمائی کی طرف رہنمائی ملی اور یہ ایک ایسی رہنمائی ہے جس میں فطرت، حواس اور عقل ہم آغوش ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ پس منظر اس کا یہ ہے کہ عرب اپنی ہر ضرورت اور اپنی ہر مشکل میں ان قوتوں کو پکارتے تھے جنہیں وہ اللہ کا شریک سمجھتے تھے۔ چنانچہ کبھی بتوں کی جے پکاری جاتی، کبھی ان کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جاتا، کبھی ان کے نام کے چڑھاوے چڑھائے جاتے۔ اسی طرح کبھی جنات اور کبھی فرشتوں سے استمداد کی جاتی۔ عام زندگی میں ان کا یہی معمول تھا۔ اسی طرح جب وہ سفر پر روانہ ہوتے تو روانہ ہونے سے پہلے وہ انہیں قوتوں سے مدد طلب کرتے ہوئے سفر کا آغاز کرتے، لیکن بحری سفر میں جب کبھی ان کی کشتیاں یا بحری جہاز سمندری طوفان کی زد میں آجاتے جس کا حوالہ اس آیتِ کریمہ میں دیا گیا ہے۔ ہواؤں کے تھپیڑے اور سمندر میں اٹھتی ہوئی موجیں ان کی کشتیوں کو ٹوٹے ہوئے تختوں کی طرح ادھر ادھر پھینکنا شروع کر دیتیں تو اب وہ سمجھ جاتے کہ اس ہولناک طغیانی اور منہ زور طوفان میں وہ قوتیں ہمارے کام نہیں آسکتیں جنہیں ہم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے۔ چنانچہ ایسی حالت میں وہ صرف اللہ کو پکارتے اور یہ سمجھتے کہ وہ ایک ہی ذات ہے جو اس مصیبت سے ہمیں نجات دے سکتی ہے۔

عکرمہ بن ابی جہل جسے اسلام دشمنی اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی۔ فتحِ مکہ تک کوئی جنگ ایسی نہیں جس میں وہ شریک نہ ہوا ہو اور فتحِ مکہ میں بھی اس نے ہر ممکن طریقے سے راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن جب کوئی صورت کامیاب نہ ہوئی اور اپنے اعمال کے آئینے میں اسے اپنی موت یقینی دکھائی دی تو اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ مکے سے بھاگ جائے۔ چنانچہ وہ موقع ملتے ہی یمن بھاگ گیا۔ اس کی بیوی مسلمان ہو گئی۔ اس کو جب معلوم ہوا کہ اس کا شوہر یمن چلا گیا ہے تو وہ بھی کوشش کر کے اس کے پیچھے یمن پہنچی اور اسے سمجھا کر اپنے ساتھ مکہ معظمہ لے آئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی واپسی میں جس چیز نے سب سے اہم کردار ادا کیا وہ یہ تھی کہ جب وہ ایک کشتی پر یمن جا رہا تھا تو راستے میں سمندری طوفان نے ان کی کشتی کو گھیر لیا۔ اہلِ کشتی نے اپنی روایت کے مطابق شروع شروع میں اپنے بتوں سے مدد طلب کی، جنات کو پکارا اور فرشتوں کی دہائی دی، لیکن جب دیکھا کہ یہ طوفان ٹلتا نظر نہیں آتا اور ہلاکت یقینی ہے تو آپس میں کہنے لگے کہ ایسے ہولناک طوفان سے اللہ کے سوا ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ اگر واقعی بچنا چاہتے ہو تو اللہ ہی کو مدد کیلئے پکارو۔ چنانچہ جب انہوں نے اللہ کو مدد کیلئے پکارنا شروع کیا تو ایک خیال عکرمہ کے دل میں بجلی کی طرح کوندا کہ محمد ﷺ گزشتہ 21 سال سے ہمیں یہی بات سمجھاتے رہے کہ لوگو! اللہ کے سوا کوئی نفع و ضرر کا مالک نہیں۔ تمام قوتیں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ جب بھی مانگو اسی سے مانگو۔ انسان کو اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے۔ تمام مخلوقات اس کیلئے مسخر کی گئی ہیں۔ وہ ان سے خدمت لینے کا حق رکھتا ہے۔ وہ ان کا مسجود بھی ہے اور مخدوم بھی۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ مخدوم اٹھ کر خادم کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ ہاتھ پھیلانا صرف اللہ کے سامنے روا ہے، جس طرح اس کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا، کسی کے

Marfat.com

سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا نہیں ہوا جاسکتا، اسی طرح مدد کیلئے کسی اور سے فریاد بھی نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے 21 سال تک ہمیں سمجھایا گیا، لیکن ہم نے بجائے ان کی بات ماننے کے، ان سے لڑائیاں لڑیں اور زندگی کا ہر دکھ پہنچایا۔ اور آج میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم خود اسی خدا کو پکارنے پر مجبور ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہی بات فطرت کی آواز ہے اور یہی ایک حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا تو پھر میں کس قدر بیوقوف ہوں کہ جس نے آج تک ہمیں یہ روشنی دکھائی، میں اسی کی دشمنی کو سینے سے لگائے مکہ سے بھاگ آیا اور اب سایوں کا تعاقب کر رہا ہوں اور نئی سے نئی پناہ کی امید رکھتا ہوں۔ مجھے واپس جانا چاہئے۔ ہدایت کا سرچشمہ اسی عظیم رسول کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں جب ان سے معافی مانگوں گا اور اپنے گناہوں کا اقرار کروں گا تو وہ کریم ابن کریم ضرور میرے گناہوں سے درگزر کرے گا۔ چنانچہ یہی وہ دلیل تھی جس نے عکرمہ کو بدلا اور ان کی زوجہ محترمہ کو انہیں ساتھ لانے میں آسانی ہوئی۔ مؤرخین کہتے ہیں کہ عکرمہ جیسے ہی یمن سے واپس آ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے جرائم اگرچہ اس کے قتل کیلئے کافی تھے لیکن بار بار آنحضرت ﷺ کا عفو و درگزر اس کی ہمت بندھاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے جیسے ہی اسے دیکھا بے ساختہ اس کے استقبال کیلئے یہ کہتے ہوئے اٹھے مَرْحَبًا بِالرَّاكِبِ الْمُهَاجِرِ (مہاجر سوار کیلئے خوش آمدید) آپ ﷺ نے خوشی سے اس کا اسلام قبول کیا اور اس کی سالہا سال کی عداوت اور دشمنی کا بھول کر بھی تذکرہ نہ فرمایا۔ یہ واقعہ ہمیں بتانے کیلئے کافی ہے کہ انسان کی فطرت میں توحید کے برحق ہونے کی دلیل موجود ہے بشرطیکہ کوئی اس پر غور کرنے کی زحمت کرے۔

اس آیت میں اللہ کریم فرما رہا ہے کہ اسی فطرت سے مجبور ہو کر یہ لوگ طوفان میں گھر کر جب اللہ کو پکارتے ہیں تو اس وقت یہ وعدہ کرتے ہیں کہ یا اللہ اگر تو نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو ہم تیرے ہی لئے اطاعت کو خالص رکھیں گے اور تیرے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے لیکن عجیب بات یہ ہے جس کا تذکرہ دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ انہیں نجات دے دیتا ہے اور وہ عافیت سے اپنے ٹھکانے پہنچ جاتے ہیں اور ہر طرح کے خطرے سے محفوظ ہو جاتے ہیں تو پھر ان میں اللہ سے سرکشی اپنا رنگ دکھاتی ہے اور وہ اللہ کی زمین میں پھر بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ ان کی اطاعت کا رشتہ پھر غیر اللہ سے استوار ہو جاتا ہے۔ حق سے منحرف ہو کر ناحق کے پرستار بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نہایت بردباری اور محبت کے ساتھ لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ" اے لوگو! تمہاری سرکشی تمہیں پر پڑے گی۔ روئے سخن اگرچہ قریشِ مکہ کی طرف ہے لیکن الناس سے پوری نوعِ انسانی کو خطاب ہے۔ کیونکہ ہدایت صرف قریشِ مکہ کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کا ہے۔ اور جس گمراہی میں قریشِ مکہ مبتلا ہیں انسان من حیث الانسان عموماً اسی مرض میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جب بھی مصیبتوں اور دکھوں کے بعد آسانی ملتی ہیں، خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے، دولت کی ریل پیل ہوتی ہے، حالات ہر طرح سے موافق ہوتے ہیں تو انسان عموماً یہ بات بھول جاتا ہے کہ میرا کوئی خالق بھی ہے۔ مجھے کسی نے زندگی گزارنے کا طریقہ بھی دیا، اس کے کچھ اوامر و نواہی بھی ہیں۔ میں یہاں آزادروی کیلئے نہیں بھیجا گیا اور نہ من مرضی مجھے زیب دیتی ہے۔ میں جس کی مخلوق ہوں اسی کا بندہ ہوں اور اسی کی بندگی ہی میرا فریضۂ حیات ہے۔ لیکن انسان میں عجیب کمزوری ہے کہ جب اسے ڈھیل ملتی ہے اور اس پر نعمتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ہر طرح کی آسائشیں اس کا مقدر بن جاتی ہیں تو بجائے اس کہ وہ پہلے سے بڑھ کر اللہ کا شکر گزار ہو۔ وہ اللہ کو بھولنے لگتا ہے بلکہ اس کے احکام سے انکار اس کی روش بن جاتی ہے۔ وہ اللہ کی زمین پر رہتا ہے، اسی کا دیا ہوا رزق کھاتا ہے اور اسی کی نعمتوں سے شادکام ہوتا ہے لیکن اسی کیخلاف سرکشی کرتا ہے اور اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھتا ہے۔ یہاں پروردگار فرما رہے ہیں کہ لوگو! تم نے جو سرکشی کا رویہ اختیار کر لیا ہے تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ یہ رویہ تمہیں لے بیٹھے گا۔ یہی نعمتیں تمہارے لئے وبالِ جان بن جائیں گی۔ تمہارا زندگی کا چلن زندگی کیلئے عذاب بن جائے گا۔ جب اس زمین پر بسنے والی ہر قوم انسانیت کا جامہ تار تار کر دے گی اور دوسری قوموں پر اپنی برتری جتانے کیلئے تباہ کن ہتھیار ایجاد کرے گی اور حقوق و فرائض سے لاتعلقی کے باعث جس طرح گھر اجڑیں گے اور معاشرہ تباہ ہوگا اسی طرح جب قومیں قوموں کے حقوق کو پہچاننے سے انکار کر دیں گی تو ہر قومی وحدت دوسری قومی وحدت سے ٹکرائے گی۔ ملک، ملکوں سے دست و گریباں ہوں گے۔ یہی زمین جو آغوشِ مادر کی طرح انسان کو راحت دیتی ہے، پناہ دینے سے انکار کر دے گی۔ جس طرح امریکہ کا دماغ خراب ہوا اس نے جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم پھینک کر قیامت برپا کر دی۔ اب پھر اسے دنیا کا خدا بننے کا سودا ہوا ہے تو وہ ملک اجاڑنے پر تل گیا ہے اور ہر قوم سے اپنا کلمہ پڑھوانا چاہتا ہے۔ کمزور اور مظلوم ملکوں میں تو آج بھی ظلم کا بسیرا ہے۔ لیکن ایک نہ

Marfat.com

ایک دن ردعمل شدید ہوگا اور کوئی مقابل طاقت اٹھے گی تو پھر اس زمین پر سرکشی ہر ملک اور ہر گھر کی تباہی کا باعث بنے گی۔ پروردگار ان ظالموں سے خطاب کر کے فرما رہے ہیں کہ آج اگر تمہارا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں اور تمہاری قوتوں کا جواب کسی کے پاس نہیں تو یہ مت بھولو کہ کائنات کو پیدا کرنے والے نے کائنات کو انسانوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا ہے۔ تم ایک حد تک ظلم کی رسی دراز کر سکتے ہو لیکن اس کا پیدا کرنے والا دیر تک اس کی مہلت نہیں دیتا۔ ایک وقت آئے گا جب افراد کی طرح قومیں بھی اللہ کی طرف لوٹنے پر مجبور ہوں گی۔ جو پیدا ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن اللہ کے سامنے حاضری دینی ہے۔ اس کائنات کا سفر اسی کی ذات کی طرف ہے، وہی اس کا منتہا ہے اور وہی اس کا مرجع ہے۔ اس کی بارگاہ میں سب بے بس اور بے کس ہوں گے۔ آج پراپیگنڈے اور ذرائع ابلاغ کے زور سے غلط کو صحیح بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور سادہ لوح لوگ بعض دفعہ اس پر یقین کر لیتے ہیں لیکن اللہ کی عدالت میں نہ سخن سازی کام آئے گی، نہ ڈپلومیسی چلے گی سب کر وفر یہیں پڑا رہ جائے گا۔ تباہ کن ہتھیار بھی تباہ ہو جائیں گے۔ قوتوں کا بھرم کھل جائے گا۔ آج کے تیمور اور چنگیز وہاں نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے سامنے ظالموں کا ظلم مبرہن کر کے رکھ دے گا۔ نہایت پردوں میں کی ہوئی سازشیں سرِ عام بولیں گی جس طرح انسان کا جسم اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گا اسی طرح ہر وہ جگہ بولے گی جہاں ظلم ہوا۔ ہر مظلوم کو انصاف ملے گا، جن آلات سے ظلم توڑا گیا اور ناانصافیاں کی گئیں وہ آلات اپنے کرنے والوں کے خلاف گواہی دیں گے۔ ہر طرف سے آواز آئے گی:

یہاں لٹی تھی کسی کی عصمت وہاں گرا تھا لہو کسی کا
یہاں جلائے گئے تھے انسان ہر ایک شے کا حساب ہوگا

کاش ہر دور کا انسان یہ بات سمجھ لے:

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

سب چھوٹے بڑے انسان جب اپنا نامۂ عمل دیکھیں گے تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی کہ کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں جو اس میں درج ہونے سے رہ گیا ہو۔ انسان چیختا ہوا کہے گا مَالِهٰذَا الْكِتَابُ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً اِلَّآ اَحْصَاهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا "یہ نوشتہ کیسا ہے نہ اس میں کوئی چھوٹی بات چھوٹنے پائی ہے نہ کوئی بڑی بات۔ مگر اس نے سب کچھ شمار کر ڈالا ہے اور سب لوگ جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس میں موجود پائیں گے۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰۤى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۲۴﴾

(پس مثال حیاتِ دنیا کی ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی اتارا۔ پس اس سے زمین کی نباتات خوب گھنی ہوگئی جس سے انسان بھی کھاتے ہیں اور حیوان بھی۔ یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگھار اور وہ خوب آراستہ ہوگئی اور اہلِ زمین نے یقین کر لیا کہ وہ اس پر قادر ہیں تو دفعۃً اس پر ہمارا قہر رات کو یا دن کو آ دھمکا۔ پس ہم نے اسے کاٹ کر رکھ دیا، گویا کل وہ یہاں تھی ہی نہیں۔ ہم وضاحت سے بیان کرتے ہیں اپنی قدرت کی نشانیاں اس قوم کیلئے جو غور و فکر کرتی ہے۔)

حیاتِ دنیا کی تمثیل

اس آیتِ کریمہ میں اس حیاتِ دنیا کی تمثیل بیان کی گئی ہے جس کا ذکر گزشتہ آیتِ کریمہ میں مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ تمثیل میں زمین کی زرعی کیفیت کو پیش کیا گیا ہے کیونکہ اس وقت کی مخاطب دنیا کیلئے یہ مثال سامنے کی بھی تھی اور آسان بھی لیکن مقصود اس سے دنیا کا ہر وہ سامان، ہر وہ نعمت اور ہر وہ صنعت ہے جس پر اہلِ دنیا فریفتہ ہوتے ہیں اور زندگی کو اس کیلئے وقف کر دیتے ہیں۔ تمثیل کو یوں سمجھئے کہ ایک آبادی ہے جس کی زمین مدتوں سے بارش کو ترس رہی ہے۔ بارش نہ ہونے سے زمین جھلس کر رہ گئی ہے۔ کھیتوں میں ویرانی کا دور دورہ ہے، ہر طرف قحط کا سا سماں ہے۔

Marfat.com

اچانک اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے۔ آسمان سے بارش برستی ہے۔ چند دنوں کے بعد سبزے کی چادریں بچھ جاتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے زمین نے مخملی لباس پہن لیا ہے۔ فصلیں لہلہانے لگتی ہیں۔ پانی کے جانور جن کا کہیں نشان تک نہ تھا جوہڑوں میں پانی بھر جانے کے باعث ہر جگہ پھدکتے اور ٹراتے پھرتے ہیں۔ نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں، سایہ گہرا ہو گیا ہے، ہر طرف حُسن جھلکتا دکھائی دیتا ہے، پرندوں کی آوازوں سے موسیقی کی دھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ فضاء پردۂ رنگ میں مستور ہوتی جا رہی ہے۔ پتھر کی رگوں میں بھی خون رواں معلوم ہوتا ہے۔ کھیتوں اور باغوں کے مالک خوشیوں سے مخمور ہیں۔ ان کی محنتوں کا پھل ان کے سامنے تیار کھڑا ہے۔ فصلیں کٹیں گی، کھلیان لگ جائیں گے، پھل اتریں گے ڈھیر سج جائیں گے۔ چند ہی دنوں میں دولت کی ریل پیل ہو جائے گی۔ وہ انہیں خوشیوں میں مست اپنے گھروں میں فصلوں کے اترنے کا انتظار کر رہے ہیں کہ اچانک اللہ کی طرف سے گھٹا اٹھتی ہے، طوفان سر اٹھاتا ہے، ہوا بے قابو ہو جاتی ہے، ژالہ باری میں تیزی آ جاتی ہے، کبھی طوفان سائیکلون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اللہ کے قہر کے مختلف رنگ ہیں۔ ہوا کبھی بادِ صرصر بن جاتی ہے اور کبھی بادِ سموم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی آگ برستی ہے اور کبھی برف برستی ہے۔ کبھی اس کا قہر رات کو ٹوٹتا ہے اور کبھی دن کو کیونکہ ہر وقت اس کا وقت ہے، وہ کسی وقت کا پابند نہیں۔ چند گھنٹوں کے بعد جیسے ہی موسم کھلتا ہے تو دیکھنے والے یہ دیکھ کے دنگ رہ جاتے ہیں کہ جہاں فصلیں سنہری قبائیں پہنے کھڑی تھیں وہاں کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ نہ صرف غلہ برباد کر دیا گیا ہے بلکہ غلہ کا بوجھ اٹھانے والے پودے اپنی وجود سے محروم ہو گئے ہیں، درخت جڑوں سے اکھڑ گئے ہیں۔ ہر چیز اس طرح کاٹ کے رکھ دی گئی ہے معلوم ہوتا ہے یہاں کبھی اس کا نشان ہی نہ تھا۔ یہ قہرِ الٰہی کی ایک مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پروردگار غضب پر آتا ہے تو اس کے لشکر ہر چیز کا تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے عذاب سے صرف فصلیں ہی تباہ ہوتی ہیں۔ اس کے عذاب سے انسان کی عظمت کا تمام سرمایہ ایک لمحے میں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ انسان کو یہی بتلانا مقصود ہے کہ تم آج زمین میں جس ترقی پر نازاں ہو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ انسان کے علم و فکر نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اس نے زمین پر سر بفلک عمارتیں اٹھائی ہیں۔ اس نے ایسے برقی طاقتور قمقمے ایجاد کئے ہیں جو ستاروں کو شرما دے رہے ہیں۔ اس نے دریاؤں کی سرکش موجوں کو ڈیموں میں پابند کر دیا ہے۔ سمندر سے مختلف شاخیں نکال کر شہروں کے اندر سے گزار دی ہیں۔ سمندر کو پیچھے دھکیلا جا رہا ہے۔ اس کے اندر سے مختلف دھاتیں نکالی جا رہی ہیں۔ اس کی تحقیق اور تجسس کے نتیجے میں فضاء کی وسعتیں سکڑ گئی ہیں۔ اس کے جذبۂ تسخیر نے نہ جانے کس کس قوت کو زنجیر پہنا دی ہے۔ اس نے لوہے میں قوتِ پرواز پیدا کی ہے۔ اس نے چند آلات کو جوڑ کر انسانی دماغ کا متبادل پیدا کر دیا ہے۔ آج کی دنیا عجوبوں کی دنیا ہے اور ایک ایک عجوبہ انسان کی ذہانت و فطانت کا گن گا رہا ہے۔ بایں ہمہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ ہے:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا وہ ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

انسان اگر ایک طرف رنگ و بو کے گلستان سجاتا ہے تو دوسری طرف ایٹمی تباہ کاریوں سے بستے شہروں کو ویرانوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اگر وہ ایک طرف پرندوں اور حیوانوں کی زندگی کے ذرائع پیدا کرتا اور ان کے غم میں گھلتا ہے تو دوسری طرف انسانوں کی زندگی اجیرن کرتا ہے اور ان کے رزق کے سوتوں پر قبضہ جماتا ہے۔ اس لئے اسے کہا جا رہا ہے کہ تم حیاتِ دنیا کے سامان سے استفادہ ضرور کرو لیکن اس بات کو کبھی نہ بھولو کہ:

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

اسے بتانِ وہم و گماں کو چھوڑ کر لا الٰہ الا اللہ کا شعور پیدا کرنا ہے اور اپنے خالق و مالک کو پہچاننا ہے۔ اسے اپنے مقاصدِ حیات کو جاننا اور اس پر عمل کرنا ہے ورنہ اس کے بغیر دنیا کی ترقی خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ انسان یہ کوشش تو کرتا ہے کہ میں تیز رفتار سواریاں ایجاد کروں لیکن یہ وہ کبھی نہیں سوچتا کہ مجھے چلنا کیسے چاہئے۔ وہ کمپیوٹر تو ایجاد کرتا ہے لیکن اپنی زبان اور دل پر پہرے نہیں بٹھاتا اور اللہ سے کئے ہوئے عہد کو یاد رکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس رویہ سے زندگی میں چکا چوند تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن وہ راست فکری اور راست روی نہیں آ سکتی جو انسانی زندگی کی اصل ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں حقائق کی طرف تفصیل سے انسانوں کو دعوت دیتا ہے تاکہ انسان اپنی عظمتِ رفتہ کو حاصل کریں اور اپنے حقیقی مقصد کو پہچانیں۔

Marfat.com

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۲۵، ۲۶، ۲۷﴾

(اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دے دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اچھے کام کئے ان کیلئے اچھا بدلہ ہے بلکہ اس پر مزید بھی۔ اور ان کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی اور نہ ذلت۔ یہی لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور جنہوں نے برے کام کئے تو برائی کی سزا اس جیسی ہوگی۔ اور ان پر ذلت چھا رہی ہوگی۔ اللہ سے ان کو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔ گویا ڈھانپ دیئے گئے ہیں ان کے چہرے کالی رات کے ٹکڑوں سے۔ یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔)

گزشتہ آیات میں حیاتِ دنیا کے بارے میں کفار کے طرزِ عمل پر تنقید فرمائی ہے اور ایک مثال کے ذریعے واضح فرمایا کہ تمہارے زندگی ہر وقت معرضِ خطر میں ہے۔ تم جس ترقی اور عروج پر نازاں ہو، وہی تمہارے لئے ایک دن تباہی کا سامان بننے والا ہے۔ تم جن چیزوں سے آسودگی، عزت و وجاہت اور ہیبت و عظمت محسوس کرتے ہو وہی تمہارے لئے ہلاکت اور بربادی کا سبب بننے والی ہیں کیونکہ جب تک انسان اپنی زندگی کے اصل مقصد کو نہیں پہچانتا اور اپنے اور کائنات اور خالق کے باہمی رشتوں کو نہیں سمجھتا اس وقت تک وہ جو بھی ترقی کرے گا اور جتنی بھی تیز رفتاری دکھائے گا وہ اتنا ہی منزل سے دور ہوتا جائے گا کیونکہ:

تیز رفتاری ہے لیکن جانبِ منزل نہیں

لیکن اللہ تعالیٰ انسانوں کو جس چیز کی طرف بلاتا ہے اور پیغمبر جس کی طرف دعوت دیتے ہیں وہ دارالسلام ہے یعنی امن اور سلامتی کا گھر۔ اس سے مراد جنت ہے۔ وہ حقیقت میں امن اور سلامتی کا گھر ہے جس میں کسی خطرے کو داخل ہونے کی اجازت نہیں جس میں سلامتی پر کبھی خراش تک نہیں آسکتی۔ وہاں کسی انسان کو کسی سے شکایت نہیں ہوگی۔ وہاں کوئی کسی کے خلاف کبھی سوچنے کی بھی غلطی نہیں کرے گا۔ وہاں محبت کے چشمے ابلتے ہوں گے اور بغض و نفاق، حسد اور کینہ وہاں کبھی راہ نہ پاسکیں گے۔ لیکن جنت کا یہ گھر اسے ملے گا جس نے یہ دنیا اس کی طرف چلتے ہوئے گزاری ہو۔ اس راستے کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے جس میں غور و فکر سے لے کر اعمال و آداب کے آخری حصے تک کہیں کج روی کا شائبہ نہیں، جس میں ہر وقت برائیوں سے اجتناب کی کوشش اور نیکیوں سے محبت کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ اس راستے پہ چلنے والوں کیلئے ہر نیکی کا ایک صلہ ہے اور وہ صلہ ایک نیکی تک محدود نہیں بلکہ اس میں اللہ کی جود و سخا کا بھی ہر وقت امکان ہے۔ وہ عام طور پر ایک کے بدلے میں دس نیکیاں عطا فرماتا ہے لیکن اگر اخلاص و تقویٰ میں اضافہ ہوتا جائے تو وہ سات سو گنا اور اس سے زیادہ تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ اس کے راستے میں چلنے والے چونکہ اس صلے سے ہمیشہ نوازے جاتے ہیں اس لئے کبھی بھی نہ ان کے چہروں پر مایوسی کی سیاہی پھیلتی ہے اور نہ کبھی وہ اپنے مرتبے میں ذلت آشنا ہوتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اصحاب الجنۃ کہا گیا ہے اور یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اللہ کی اس بے پایاں عنایت کے باوجود جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اللہ تعالیٰ جلدی ان کو سزا نہیں دیتا۔ ان کی برائیوں کے معاملے میں بھی ان کے ساتھ رویہ نرمی اور مہربانی کا رکھتا ہے تاکہ وہ جب بھی پلٹنا چاہیں تو ان کیلئے پلٹنے کا سامان موجود ہو۔ وہ ایک برائی کرتے ہیں تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے اور اگر برائی کا ارادہ کر کے عمل سے اجتناب کرتے ہیں تو ان کے نامۂ اعمال میں کچھ نہیں لکھا جاتا۔ اس قدر آسانیوں اور ہدایت کی کوششوں کے باوجود وہ لوگ اگر ہدایت کی طرف آنا پسند نہیں کرتے تو پھر ان کا مقدر ذلت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ وہ ترقی کے نام سے ہزاروں کوششیں کر دیکھیں لیکن وہ کبھی بھی نامرادی اور مایوسی کی رسوائی سے بچ نہیں سکتے۔ ان کی عقل و خرد ان کو اس دلدل سے نکالنے سے ہمیشہ عاجز رہتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اہلِ جہنم کہا گیا ہے۔ اور یہ لوگ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

Marfat.com

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۲۸﴾

(اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم جمع کریں گے سب کو، پھر ہم شرک کرنے والوں کو حکم دیں گے کہ ٹھہر جاؤ اپنی جگہوں پر تم اور تمہارے شرکاء، پھر ہم ان کے درمیان تفریق کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے کہ تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔)

مشرکین اور ان کے شرکاء آخرت میں

گزشتہ آیات کریمہ میں شرک کے ابطال پر مختلف قسم کے دلائل دیئے گئے ہیں جن میں عقلی بھی ہیں، تاریخی بھی، واقعاتی بھی ہیں اور نفسی بھی اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ترہیب کے انداز میں مشرکین کے سامنے قیامت میں گزرنے والے احوال کے حوالے سے منظر کشی کی گئی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر تم ذہنی طور پر اتنے بانجھ ہو گئے ہو کہ تم پر کوئی دلیل اثر نہیں کرتی اور یا شاید اتنے بلید ہو گئے ہو کہ دلائل کو سمجھنے سے قاصر ہو تو ہم محض ہمدردی کے طور پر تمہارے سامنے آخرت کا وہ منظر پیش کرتے ہیں جس میں تم نہایت ناخوشگوار اور ناقابل برداشت صورتحال سے دوچار ہو جاؤ گے۔ آج جبکہ تمہارے سامنے تمہارے انجام کی بات ہوتی ہے تو تم اس لئے زیادہ پرواہ نہیں کرتے کیونکہ تمہیں اپنے ان شرکاء پر بھروسہ ہے جنہیں تم نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک کر رکھا ہے اور تمہارا گمان یہ ہے کہ وہ قیامت کے روز تمہیں اللہ کی گرفت سے بچالیں گے جیسے دنیا میں تمہارے زعم کے مطابق تمہاری مدد کرتے رہے ہیں اور تمہاری خوشحالیوں کا باعث بنے رہے ہیں۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی تمہیں جہنم کے عذاب سے بچالیں گے، لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قیامت کے دن جب تم پر اللہ کا غضب برس رہا ہو گا اور نہایت ہولناک انجام تمہارے سامنے ہو گا اس وقت تم تنہا نہیں ہو گے بلکہ جن کو تم نے اللہ کا شریک بنایا وہ سب تمہارے ساتھ ہوں گے۔ "جمیعاً" کا لفظ بول کر بطورِ خاص اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جن قوتوں کے سہارے تم نے اپنے انجام کو بگاڑا، اپنی دنیا بھی برباد کی اور پیغمبر کی کسی بات پر تم نے کان نہ دھرا۔ قیامت کے دن وہ تمام سہارے تمہارے ساتھ محشر میں موجود ہوں گے اور عبرت کی بات یہ ہے کہ جس صورتحال سے وہاں تمہیں گزارا جائے گا وہی صورتحال انہیں بھی درپیش ہو گی۔

شرکاء کون ھیں

اس آیتِ کریمہ کے الفاظ پر غور کیجئے اور آگے جو مکالمہ مشرکین اور شرکاء کے درمیان نقل کیا جا رہا ہے اسے غور سے پڑھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ جن لوگوں کو اس آیتِ کریمہ میں شرکاء کہہ کر ذکر کیا جا رہا ہے وہ پتھر کے بت نہیں ہوں گے بلکہ وہ جیتی جاگتی شخصیتیں ہوں گی کیونکہ قرآن کریم نے بار بار مشرکین سے یہ کہا کہ جن بتوں کے سامنے تم سر جھکاتے ہو وہ نہ بول سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں، تمہاری دعاؤں کو کیسے قبول کریں گے اور کس طرح تمہاری مدد کریں گے۔ ظاہر ہے کہ جو بت دنیا میں بولنے سے عاجز تھے وہ قیامت میں بھی بولنے سے عاجز ہوں گے۔ ان بتوں کو جہنم میں ضرور پھینکا جائے گا تا کہ ان سے ایندھن کا کام لیا جائے لیکن ان سے پوجنے والوں کا مکالمہ کہیں نہیں ہو گا بلکہ مکالمہ ان شخصیتوں سے ہو گا جن کے بت بنائے گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کا انسان بھی اور آج کے دور کا بھی اگر کہیں مجسموں کی پوجا کرتا ہے یا مجسموں کا احترام بجالاتا ہے یا انہیں کسی نہ کسی طرح باقی رکھنے پر اصرار کرتا ہے تو وہ اس لئے نہیں کہ وہ مجسمے ہیں بلکہ ان کا احترام اس لئے ہے کہ وہ بعض زندہ شخصیتوں کے مجسمے ہیں۔ اپنے دور میں یہ شخصیتیں مرجع خلائق رہیں۔ ان کے کارناموں کی شہرت اور ان کی نیکیوں کے تذکرے نے انہیں دلوں میں اتارا اور دنیا سے گزر جانے کے بعد لوگوں نے ان کی یاد باقی رکھنے کیلئے ان کے مجسمے بنالئے۔ جہاں مجسمہ سازی کا فن ابتدائی درجے میں تھا وہاں بت گھڑے گئے اور جہاں مجسمہ سازی کا فن عروج پر تھا وہاں خوبصورت مجسمے آراستہ کئے گئے لیکن مقصود نہ مجسمے تھے نہ بت، مقصود ان کے پیچھے وہ زندہ، متحرک اور نیک نام شخصیات تھیں جن کی وجہ سے لوگ ان کا احترام کرتے تھے اور ان سے عقیدت رکھتے تھے۔ لات و منات اور عزیٰ و ہبل وغیرہ، سب کے پیچھے زندہ شخصیات تھیں جن کی عقیدت میں یہ بت تراشے گئے تھے۔

آیتِ کریمہ کے الفاظ پر اگر ہم مزید غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد صرف نیک نام شخصیات ہی نہیں بلکہ ایسے لوگ بھی مراد ہیں جن کے افکار کی دنیا میں پیروی کی گئی جنہوں نے زندگی گزارنے کیلئے وضعی قوانین دیئے۔ کہیں معیشت، کہیں سیاست، کہیں تہذیب و تمدن، کہیں معاشرت،

Marfat.com

کہیں مرد وعورت کی حقیقت اور کہیں کائنات اور خالق کے تعلق کے حوالے سے مخصوص تصورات دیئے جس کے نتیجے میں کہیں شرم وحیاء کو نقصان پہنچا، کہیں خاندانی نظام ادھڑ گیا، کہیں انسان کی اصل حیثیت گم ہوگئی اور اسے معاشی حیوان میں تبدیل کر دیا گیا، کہیں علم اور اخلاق کی حیثیت اور ترتیب کو بگاڑ دیا گیا اور ان کے پیچھے چلنے والوں نے انہیں رہنما اور مقتداء کی حیثیت دے کر اپنے اوپر ان کی پیروی لازم کر لی۔ یہ سب لوگ قیامت کے دن اپنے پیچھے چلنے والوں کے ساتھ اللہ کے حضور کھڑے ہوں گے۔ جب مجرموں کو قیامت کی طرف جانے کا حکم ہوگا تو ان لوگوں کو الگ روک لیا جائے گا اور فرمایا جائے گا۔

مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ (تم اور تمہارے شرکاء اپنی جگہ ٹھہرے رہو) مَكَانَكُمْ۔ سے امکثوا یا قفوا یا اس کا کوئی ہم معنی لفظ یہاں محذوف ہے اور عربی کا طریقہ یہ ہے کہ جہاں کسی فوری اور واجب التعمیل حکم کا موقع ہو تو ظرف یا مفعول سے پہلے فعل کو حذف کر دیتے ہیں تاکہ مخاطب کی ساری توجہ اصل بات پر مرتکز رہے۔ یہاں بھی اسی مقصد کیلئے فعل کو حذف کر دیا گیا ہے لیکن وہ معنی میں باقی ہے۔ یعنی ان لوگوں کو قدم آگے بڑھانے سے روک دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ پیروی کرنے والے اور جن کی پیروی کی جاتی رہی دونوں ایک طرف ہو کر کھڑے ہو جائیں اور دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کریں، ممکن ہے بعدِ زمان و مکان یا قیامت کے ہولناک منظر کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکیں تو پروردگار فرماتے ہیں فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ پھر ہم ان کے درمیان تفریق کر دیں گے یعنی ان پر جو اجنبیت کا پردہ پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو پہچان نہیں پا رہے تھے اور ممکن ہے کہ گھلے ملے ہوں۔ اب اجنبیت کا پردہ اٹھ جانے سے اور دونوں کے درمیان تفریق ہو جانے سے دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے لگیں گے۔ وہ لوگ جو اپنے رہنماؤں سے عقیدت کے باعث ان کی ہر بات مانتے رہے اور وہ لوگ جو نیک نام لوگوں کے بت پوجتے رہے جب ان لوگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کو زندگی بھر ہم نے اس لئے پوجا کہ یہ قیامت میں ہمارے کام آئیں گے۔ آج یہ خود ہماری طرح پکڑے ہوئے ہیں تو ان کی پریشانیوں میں انتہا درجے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اسی طرح وہ لوگ جو اپنے سامنے ان لوگوں کو پائیں گے جن کی فکری رہنمائی کو انہوں نے ہمیشہ زندگی کا سرمایہ سمجھا اور ہر بات میں ان کی اطاعت کرتے رہے لیکن آج یہی اطاعت جب انہیں جہنم تک پہنچا رہی ہوگی تو وہ چیخیں گے کہ یا اللہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں دنیا میں گمراہ کیا۔ ہمارا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم نے ان کی پیروی کی یا ان کے سامنے سر جھکایا۔ ان میں سے کتنے ایسے ہیں جنہوں نے ہمیں یقین دلایا کہ قیامت کے دن ہم تمہیں پار لگائیں گے، ہمارا دامن گرفتہ کوئی شخص اس دن پکڑا نہیں جائے گا۔ ہم نے ان پر اعتماد کیا اور اس حال کو پہنچے۔ اس لئے سزا ہمیں نہیں انہیں ملنی چاہئے کیونکہ انہوں نے ہمیں گمراہ کیا اور رہے وہ فکری رہنما انہوں نے ہمیں اسلام کے تصور ہی سے دور رکھا۔ کچھ لوگوں نے مذہب کو افیون قرار دیا ہم نے ان کے کہنے کی وجہ سے مذہب سے تعلق توڑ لیا۔ کچھ لوگوں نے خدائی کا انکار کر دیا اور انسان کو ایک معاشی حیوان ٹھہرایا۔ ہم ان کے دلائل کے سامنے جھک گئے اور کولہو کے بیل کی طرح ساری زندگی معاش کی چکی پستے رہے۔ کچھ لوگوں نے اللہ کو کائنات کا خالق و مالک تو مانا لیکن دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ اس کا دنیا میں نظام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ہمیں عقل دے کر آزادی دے دی گئی ہے کہ جیسے چاہو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نظام وضع کرو۔ چنانچہ ان کی پیروی میں ہم نے قرآن کو صرف ایک حصول ثواب کی کتاب جانا اور اس کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مذہب کو بھی ایک انفرادی معاملہ سمجھا جس کا تعلق بندے اور اللہ سے ہے، کسی اور ادارے سے نہیں۔ چنانچہ ہم نے نماز روزے کو مذہب کی ضرورت کے طور پر باقی رکھا، باقی ہر چیز سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا۔ یہ مختلف قسم کے رہنما اور لیڈر حضرات ہمارے سامنے کھڑے ہیں ہم نے جو کچھ بھی کیا انہیں کی رہنمائی میں کیا۔ اس لئے آج اگر عذاب کے مستحق ہیں تو یہ لوگ ہیں۔ ہمیں تو ہماری سادگی کی وجہ سے معافی مل جانی چاہئے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ دنیا میں بھی قانون سے بے خبری کبھی عذر تسلیم نہیں کی گئی۔ ignorence of law is no excuse قانون کا ایک مسلمہ اصول ہے اللہ کے یہاں بھی دین سے بے خبری اور جہالت بھی عذر نہیں بن سکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دین کے بنیادی علم کو سیکھنا فرض قرار دیا ہے جو آدمی اس میں کوتاہی کرتا ہے اور پھر اس کو بنیاد بنا کر بدعملی یا بے عملی کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت دوہرا جرم کرتا ہے۔ اس لئے قیامت کے دن بھی لوگ مختلف حوالوں سے جان چھڑانے کی کوشش کریں گے لیکن جان نہیں چھوٹے گی بلکہ قدرت کی طرف سے ان کی جگ ہنسائی اور رسوائی کا انتظام اس طرح ہوگا کہ جب یہ لوگ اپنے مقتداؤں اور رہنماؤں پر سارا ملبہ ڈال رہے ہوں گے تو ان کے مقتداء اور رہنما یہ کہہ کر ان سے ہر تعلق کا انکار کر دیں گے۔

Marfat.com

شرکاء کا اعلانِ براءت

وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ (اوران کے شرکاء کہیں گے کہ تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔) یہاں رک کر اندازہ کیجئے کہ یہ کیسا منظر ہوگا کہ جن کے بھروسے پر زندگی گزاری اور اللہ کے رسولوں کی دعوت کو اس لئے درخورِ اعتنا نہ سمجھا کہ ہمیں جو بار بار اللہ کی گرفت سے ڈرایا جارہا ہے ہمیں اس کی کیا پرواہ کیونکہ جن کے ہم دامن گرفتہ ہیں یا جن سے ہمارا روحانی رشتہ ہے اور جنہیں ہم نے ان امیدوں سے ہمیشہ پکارا کہ وہ ہمیں اللہ کی پکڑ سے بچائیں گے اور ہم پر وہاں آنچ بھی نہیں آنے پائے گی اور آج وہ ساری دنیا کے سامنے صاف انکار کر رہے ہیں کہ ہمیں تو معلوم بھی نہیں کہ تم کب ہماری بندگی کرتے رہے ہو اور کب تم نے ہمارے اعتماد پر اللہ کے رسول کی دعوت کو نظر انداز کیا۔ ہم آج تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں تو آج خود اپنی جان بچانے کی فکر ہے۔ ہمیں اپنا برا انجام سامنے نظر آرہا ہے اور ہم جو کچھ تم سے کہہ رہے ہیں یہ کوئی فرضی بات نہیں بلکہ:

فَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًاۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝ ﴿یونس : ۲۹﴾
(پس کافی ہے اللہ تعالیٰ گواہ ہمارے اور تمہارے درمیان کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بے خبر تھے۔)

ہم اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتے ہیں یعنی ہم اس کی قسم کھا کر یہ بات کہتے ہیں (کیونکہ یہاں گواہی قسم کے معنی میں ہے) کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بے خبر تھے۔ یہاں ''اِنْ، اِنَّ'' کا مخففہ ہے۔ لَغٰفِلِيْنَ پر لام اس کا قرینہ ہے۔ یہ دونوں قسم کی تاکید کیلئے آئے ہیں کہ ہم تمہیں بار بار نہایت تاکید سے حلفاً یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمہاری پرستش، تمہاری اطاعت اور تمہاری بندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اگر تم نے واقعی ایسا کیا ہے تو اس کی ذمہ داری تم پر ہے۔ ہم تو خود اس جرم میں پکڑے گئے ہیں کہ ہم نے اللہ کی بندگی سے انحراف کیا اور تم اپنی بندگی کا بار بھی ہم پر ڈال رہے ہو۔ اب غیر اللہ کی پوجا کرنے والے حیران کھڑے سوچیں گے کہ جن کے بھروسے اور اعتماد پر ہم نے اپنی آخرت تباہ کی وہ تو ہم سے بھی زیادہ برے انجام کی گرفت میں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ:

توقع تھی وہ جن سے خستگی میں داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝
(اس وقت ہر شخص اپنے اس عمل سے دوچار ہوگا جو اس نے آگے بھیجا تھا اور وہ سب لوگ اپنے مولیٰ حقیقی کی طرف لوٹائے جائیں گے اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افتراء باندھا کرتے تھے۔) ﴿یونس:۳۰﴾

سب کی پیشی اللہ کے سامنے

اس رسوائی اور جگ ہنسائی کے بعد دونوں کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ہم نے جو سہارے دنیا میں تراش رکھے تھے وہ فریب نظر کے سوا کچھ نہ تھا۔ آج یہاں نہ کوئی سہارا کام آئے گا نہ کوئی معاوضہ۔ یہاں تو عدل کی حکومت ہے اور یہاں سکہ صرف ایمان و عمل کا چلتا ہے۔ ہر طرف سے آواز آتی ہوئی سنائی دے گی:

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اب انہیں اپنے اعمال کی فکر ہوگی۔ جن لوگوں کو وہ اپنا ملجا اور ماویٰ سمجھتے تھے اور جن کے تقرب کے زعم سے وہ ہر طرح کی کامیابی کا یقین رکھتے تھے۔ آج وہ دیکھیں گے کہ جس طرح یہاں عمل کے سوا کوئی چیز کارآمد نہیں اسی طرح یہاں آقائے حقیقی کے سوا کوئی آقا نہیں۔ وہاں ایک ہی آستانہ ہے جو صرف پروردگار کا ہے۔ ایک ہی مرجع ہے جو پروردگار کی ذات ہے اور ایک ہی ملجا و ماویٰ ہے جو خداوند قدوس ہے اور ایک ہی سایہ ہے جو اس کے عرشِ معلیٰ کا ہے۔ جو کچھ ہم نے اپنے خیالوں میں بسا رکھا تھا وہ سب کچھ جاتا رہا اب تو چھوٹے بڑے سب لوگ اسی کے حضور کھڑے ہیں جسے اللہ کہا جاتا ہے اور جس کے ہزاروں صفاتی نام ہیں۔ آج کے دن وہ صفتِ عدل کے ساتھ تختِ عدالت پر متمکن ہے۔ اس لئے آج اس کی حکومت کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ وہ جو فیصلہ کرے گا وہی حقیقی فیصلہ ہوگا۔

Marfat.com

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ
يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ
الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ
اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا
الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى
الَّذِيْنَ فَسَقُوْۤا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ
مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ
فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ
قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ
اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾
وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ
اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ
يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ
وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ
افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ

Marfat.com

دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا
بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ
وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۴۰﴾

(اے پیغمبران سے پوچھئے کہ تمہیں آسمان اورزمین سے رزق کون دیتا ہے؟ یا کون ہے جو کان اور آنکھوں کا مالک ہے اورکون ہے جوزندہ کومردہ سے اور مردہ کوزندہ سے نکالتا ہےاورکون ہے جوساری کائنات کاانتظام فرماتا ہے، تووہ جواب دیں گے، اللہ۔ تو ان سے کہئے کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ جوتمہارا حقیقی رب ہے۔ تو حق کے بعد گمراہی کے سوااور کیا ہے، تو کہاں تمہاری عقل الٹ جاتی ہے۔ اسی طرح پوری ہوچکی ہے تیرے رب کی بات ان لوگوں پر جوحدود سے نکل گئے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اے پیغمبر! ان سے پوچھئے تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہواور پھراس کااعادہ بھی کرے۔ کہہ دیجئے وہ صرف اللہ ہی ہے جو تخلیق کا آغاز بھی کرتا ہے پھراس کا اعادہ بھی کرے گا۔ تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔ اے پیغمبر! ان سے پوچھئے کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ایسا بھی ہے جوحق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دیجئے وہ اللہ ہی ہے جوحق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ تو کیا جوحق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جوخود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے تو تمہیں کیا ہوگیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔ ان میں سے اکثر پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی، حالانکہ گمان حق کا بدل ذرا بھی نہیں ہوسکتا۔ بیشک اللہ جاننے والا ہے جو کچھ یہ کررہے ہیں۔ اور یہ قرآن ایسی چیز نہیں جسے گھڑ لیا گیا ہو اللہ سے پرے پرے بلکہ یہ تو تصدیق ہے اس کی جو اس سے پہلے نازل ہوچکی ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس کے رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شک نہیں۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے گھڑ لیا ہے۔ ان سے کہئے تم اس کی مانند کوئی سورت لاؤ اور بلالو اللہ کے سوا جن کو تم بلاسکو، اگر تم سچے ہو۔ بلکہ یہ لوگ جھٹلا رہے ہیں اس چیز کو جو ان کے علم کے احاطے میں نہیں آئی اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے۔ پس دیکھئے کیسا ہوا انجام ظالموں کا۔ اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جوایمان نہیں لاتے۔ اور تیرا پروردگار فساد پھیلانے والوں کوخوب پہچاننے والا ہے۔)

Marfat.com

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿یونس : ۳۱﴾

(اے پیغمبران سے پوچھئے کہ تمہیں آسمان اور زمین سے رزق کون دیتا ہے؟ یا کون ہے جو کان اور آنکھوں کا مالک ہے اور کون ہے جو زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو ساری کائنات کا انتظام فرماتا ہے، تو وہ جواب دیں گے، اللہ۔ تو ان سے کہئے کیا تم اس اللہ سے ڈرتے نہیں۔)

مشرکین کا فکری تضاد

انسان بھی عجیب واقع ہوا ہے کہ جب اکڑنے اور انکار کرنے پر آتا ہے تو خالقِ کائنات کا انکار کردیتا ہے اور جب ماننے اور تسلیم کرنے پر آتا ہے تو انسانوں، جنات، ملائکہ، حکمرانوں اور مظاہر قدرت وفطرت کے سامنے جھک جاتا ہے اور پتھروں کو سجدہ کرنا شروع کردیتا ہے اور جن قوتوں کو اللہ نے اس کیلئے مسخر کیا ہے ان کی بندگی بجالانا شروع کردیتا ہے۔ انسان کی اسی غیر متوازن سوچ سے قسم قسم کا شرک پیدا ہوا اور جس کے نتیجے میں انسان اللہ کی توحید سے دور ہوتا چلا گیا۔ اللہ کے نبی اور رسول جب انسانوں کی اصلاح کیلئے مبعوث ہوتے ہیں تو وہ انسان کی اسی فکری ناہمواری اور عملی بے اعتدالی کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ توحید جس طرح پورے دین کی بنیاد ہے اسی طرح شرک انسان کی فکری کج روی اور عملی بے اعتدالی کا حقیقی سبب ہے۔ جب تک اس کا سدِ باب نہیں ہوتا اس وقت تک نہ اللہ کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ انسان کے فکر وعمل میں راست روی آسکتی ہے۔ اسی لئے ہم مکی سورتوں میں دیکھتے ہیں کہ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پیشِ نظر آیت کریمہ میں بھی بالکل سامنے کی مثالیں دے کر جن کا تعلق ہمارے گردوپیش سے بھی ہے اور ہماری واقعاتی زندگی سے بھی۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ انسان کی سب سے پہلی ضرورت غذا ہے جس کا تعلق کھانے سے بھی ہے اور پینے سے بھی اور باقی ضرورتوں سے بھی۔ ان سب چیزوں کی طرف رزق کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ انسان جس طرح سب سے زیادہ غذا کی احتیاج رکھتا ہے اسی طرح زندگی کی بیشتر صلاحیتوں کو اسی کے حصول میں صرف کرتا ہے اور جب اس میں کہیں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے تو پھر وہیں سے شرک کا آغاز ہوجاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو نوکری سے نکال دیا گیا، روزگار ٹھپ ہو کر رہ گیا، صحت جواب دینے لگی، کاروبار زندگی میں پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں، آدمی جب ادھر ادھر ہاتھ مارنے سے مایوس ہونے لگتا ہے تو پھر بعض دفعہ وہ غیر مرئی قوتوں کو پکارنے لگتا ہے۔ اپنی بے بصیرتی سے شیطانی اثرات کے نتیجے میں مختلف آستانوں پر دریوزہ گری کرنے لگتا ہے۔ یہیں سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے ازالے کی آسان ترین کوشش یہی ہے کہ انسان کو توجہ دلائی جائے کہ تیری بنیادی ضرورتوں کا خالق کون ہے۔ اگر تم اس بات کو بھول گئے ہو کہ تم خود کس کی تخلیق ہو تو یہ بات تو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ تمہیں رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل رہا ہے۔ رزق کے سروسامان یا وسائل کا حقیقی سرچشمہ زمین ہے۔ ہماری جن ضرورتوں کا تعلق نباتات سے ہے وہ ہمیں زمین مہیا کرتی ہے، لیکن زمین اس خدمت میں بجالانے میں نہ خود مختار ہے نہ خود کفیل ہے۔ جس طرح تمہیں اور تمہاری صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اسی طرح زمین اور اس کی قوتِ روئیدگی کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا۔ تم جب اس میں کاشت کیلئے غلے کا بیج ڈالتے ہو اور اس پر سہاگہ پھیر کر اسے دفن کردیتے ہو تو ہونا تو یہ چاہئے کہ بویا جانے والا بیج مرجائے کیونکہ جو چیز زمین میں دفن کردی جاتی ہے وہ زندہ ہو تو مرجاتی ہے، مردہ ہو تو گل جاتی ہے۔ لیکن دو دن کے بعد حیرت زدہ نگاہ دیکھتی ہے کہ زمین میں دراڑیں پڑتی ہیں اور ان دراڑوں میں سے ہر دانے میں سے نکلنے والی سوئی باہر آنا شروع کردیتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس تنہائی اور تاریکی میں دانے کو کس نے پھاڑا اور کس نے اس کی سوئی باہر نکالی۔ پھر یہ سوئی باہر نکل کر آہستہ آہستہ بڑھنا شروع کردیتی ہے۔ ہوا اس کو لوریاں دیتی ہے، موسم کی آغوش اس کو آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کی آبیاری کا سامان کیا جائے تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ دریا اور سمندروں سے سورج کی کرنیں ڈول بھر بھر کے کھینچتی ہیں اور فضاء میں ابر کی چادریں بچھا دیتی ہیں اور انہیں ہانکتی ہوئی وہاں لے جاتی ہیں جہاں آبیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ چھم چھم بارش برستی ہے لیکن زمین صرف اتنا چوستی ہے جتنی آبیاری کیلئے ضرورت ہے۔ اگر وہ سارا پانی نگل لیتی تو دلدل بن جاتی اور ہرا گنے والی چیز مرجاتی اور اگر وہ پانی کی ایک ایک بوند اگل دیتی تو آبیاری کی ضرورت پوری نہ ہوتی۔ یہ پودا جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے موسم اس کی افزائش میں اپنا رول ادا کرتا ہے۔ زمین میں پھیلی ہوئی مختلف گیسیں اپنا کام کرتی ہیں، سورج اپنی

Marfat.com

گرمی پہنچاتا ہے تاکہ اسے پکنے میں مدد دے اور چاند اس میں گداز پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ معمول ہے جس سے ہر کاشتکار کی نگاہ واقف ہے اور عام انسانی زندگی سے آگاہ آدمی بھی اس سے غافل نہیں۔ سب کو مخاطب کر کے پوچھا جا رہا ہے کہ تم بتاؤ کہ یہ تمہارے غلے پکنے اور تمہارے پھلوں کے بار آور ہونے کا جو ایک سلسلہ ہے یہ کس کے ہاتھ میں ہے۔ کیا زمین کی قوت روئیدگی کو تم نے پیدا کیا، دانے کو تم نے پھاڑا اور اس سے کونپل نکالی۔ قدم قدم اگنے والے پودے کی تم نے حفاظت کی۔ اس کی آبیاری کا سامان تم نے کیا۔ اس میں سختی اور نرمی تم نے پیدا کی۔ تم جانتے ہو یہ سب کچھ اللہ نے کیا ہے اور اسی کی قدرت سے غلے کا کھلیان تمہارے گھر میں پہنچتا ہے۔ اسی کی رحمت سے قسم قسم کے پھل، طرح طرح کی سبزیاں انسانوں کے کام و دہن کی لذت کیلئے مہیا کی جاتی ہیں۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی انداز میں سوالات کئے:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب

یہ تو وہ چند نعمتیں ہیں جن کا تعلق انسانی غذا سے ہے اور یہ چونکہ ہر وقت انسان کے سامنے رہتی ہیں اس لئے پروردگار نے اس کا ذکر فرمایا۔

اگلے جملے میں ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جن کا تعلق انسان کے جسم اور اس کے احساسات سے ہے۔ اگر انسان کے چاروں طرف نعمتوں کے انبار لگا دیئے جاتے جو ایک سے ایک بڑھ کر لطف و لذت کا مرقع ہوتیں۔ ہر طرف رنگوں کی بہار برس رہی ہوتی اور موسیقی کی دھنیں فضاء میں بکھر رہی ہوتیں لیکن اس سے محظوظ ہونے اور فائدہ اٹھانے کیلئے انسان کو حواس نہ دیئے جاتے، وہ نہ سن سکتا نہ دیکھ سکتا نہ محسوس کر سکتا۔ اندازہ فرمایئے اس کیلئے رنگ و حسن کی بہار کیا معنی رکھتی اور اس کی زندگی کس قدر بوجھل ہوتی۔ اس لئے اب ان چند نعمتوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جو اس پہلو سے انسان کی سب سے بڑی دولت ہے اور سوال کے انداز میں پوچھا جا رہا ہے کہ بتاؤ سمع اور بصر کا مالک کون ہے، کس کے قبضے میں ہیں یہ نعمتیں کہ وہ جسے چاہے دے اور جسے چاہے نہ دے۔ ان میں سے ایک نعمت کان ہیں یعنی قوت سماعت کا آلہ۔ حصول علم کے جتنے ذرائع ہیں ان میں سے ایک معتبر ذریعہ اور ہدایت کے جتنے امکانات ہیں ان میں سے ایک نہایت قیمتی امکان انسان کے دائیں بائیں سماعت کے دو پرزے لگا دیئے گئے ہیں۔ سائنسدان یہ کہتے ہیں کہ اگر سننے کا یہ آلہ ناکارہ ہو جائے تو دنیا بھر کے سائنسدان مل کر بھی ایک کان نہیں بنا سکتے کیونکہ وہ ایک کان جیسا کان تو تراش سکتے ہیں لیکن اس میں قوت سماعت پیدا نہیں کر سکتے۔ ایک سائنسدان کا قول مشہور ہے کہ جس پروردگار نے سماعت کا یہ حیرت انگیز آلہ پیدا کیا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود نہ سنتا ہو کیونکہ سماعت ایک ایسی قوت ہے جو اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ جس طرح اس کی تخلیق پر کوئی قادر نہیں اسی طرح اس کی تنقیح پر بھی کوئی قادر نہیں۔ سماعت کے بعد دوسری بیش بہا نعمت وہ دیکھنے کی قوت ہے۔ آنکھ کی خوبصورتی بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ اس کے اندر قوتِ بصارت معجزے سے بڑھ کر معجزہ ہے۔ سائنسدانوں نے مکھی کی آنکھ پر تحقیق کے جو نتائج مرتب کئے ہیں انہیں پڑھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے اور انسان کی آنکھ تو تمام مخلوقات کی آنکھوں سے قوت بصارت میں بہتر اور خوبصورت ہے۔ سمع اور بصر ہی دو بنیادی ذریعے ہیں اسی سے ترقی کرتا ہوا انسان دور تک علم کی وادیوں میں پہنچ گیا ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک تیسری نعمت کو بیان فرمایا جو سب نعمتوں سے بڑھ کر ایک نعمت ہے وہ زندگی اور موت ہے۔ دنیا کی ساری ہما ہمی زندگی کے دم قدم سے ہے اور زندگی کی ساری مایوسیوں، محرومیوں اور تلخیوں کی انتہا موت سے ہوتی ہے۔ بظاہر موت ایک دکھ ہے لیکن حقیقت میں ایک نعمت ہے جس سے زندگی کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ غالب نے ٹھیک کہا:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمتیں ہیں کہ انسان ایجاد و دریافت کے ہزاروں دعوؤں کے باوجود اس کی حقیقت کو نہ پا سکا۔ زندگی کیا ہے، اس کی

Marfat.com

حقیقت کیا ہے اور موت کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے۔ آج تک اس کی کنہ کو کوئی معلوم نہ کر سکا۔ انسان کے اندر سے زندگی نکل جاتی ہے تو انسان بیکار ہو جاتا ہے لیکن انسان ساری کوشش کے باوجود یہ نہیں جان سکا کہ انسان کے اندر سے کیا نکل جاتا ہے اور بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ڈاکٹروں نے کسی مریض کی موت کا اعلان کر دیا لیکن اس کی زندگیعود کر آئی اور ڈاکٹر کچھ نہ سمجھ سکے کہ وہ کیا چیز ہے جو واپس آگئی ہے اور مزید عجیب بات یہ ہے کہ زندگی کا سفر صرف زندگی ہی سے آگے نہیں بڑھتا بلکہ نہایت حیرت کی بات یہ ہے کہ موت سے زندگی پھوٹتی ہے اور زندگی سے موت نکلتی ہے۔ نطفہ ایک پانی کی بوند ہے لیکن اس سے انسان اور حیوان پیدا ہو رہے ہیں یعنی ایک مردہ سے زندہ انسان پیدا کیے جا رہے ہیں اور انسان زندہ ہے اور اس کے اندر سے مردہ نطفہ پیدا کیا جا رہا ہے اور زندہ مرغی سے مردہ انڈہ نکالا جا رہا ہے۔ پروردگار پوچھتا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس قوتِ تخلیق کا خالق اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تو پھر تم کہاں بہک جاتے ہو۔

مزید فرمایا کہ اس نے صرف زندگی پیدا نہیں فرمائی یا اس نے زندہ انسان ہی پیدا نہیں فرمائے اور پھر اس نے زندگی کی بقا کیلئے وسائلِ زندگی ہی فراہم نہیں کیے بلکہ اپنی بے شمار مخلوقات میں اس نے حیرت انگیز نظم و ترتیب بھی پیدا کی۔ ایک ڈسپلن پیدا کیا۔ ہر مخلوق کی ڈیوٹیاں مقرر کیں اور ڈیوٹیوں کی ادائیگی کیلئے علم عطا کیا۔ جس طرح کسی کو بنایا ویسا اسے جسم عطا کیا اور جیسا جسم دیا ویسا ماحول مہیا کیا۔ زمین پر بسنے والا انسان کائنات کا گلِ سرسبد ہے لیکن جس کُرے پر یہ رہتا ہے وہ شاید کائنات کا سب سے چھوٹا کرہ ہے۔ ایسے ہی اور اس سے بہت بڑے بے شمار کُرے ہیں لیکن انسانی نگاہ آج تک ان کا علم حاصل نہ کر سکی۔ سائنسدان خود کہتے ہیں کہ یہ کائنات اتنی وسیع و عریض ہے کہ اس کے بعض ستارے ایسے ہیں کہ جب سے وہ پیدا ہوئے ہیں اس وقت سے ان کی روشنی زمین کی طرف سفر کر رہی ہے لیکن آج تک زمین تک پہنچ نہیں سکی۔ اتنی بڑی کائنات اور اس میں بے شمار کُرے اور لاتعداد مخلوقات ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان سب کے معاملات کی تدبیر کون کرتا ہے، کس نے ان کو پیدا کیا، کس نے ان کی حرکتیں مقرر کیں، کس نے ان کے مدار مقرر کیے، کس نے ان میں کشش اور جذب کی قوت رکھی اور کس نے انہیں بغیر ستونوں کے ثبات و قیام بخشا۔ ان کو جو فرائض دیئے گئے ہیں ان کی ادائیگی کی نگرانی کون کرتا ہے، سورج اور چاند ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہیں، چاند سورج سے کیوں نہیں جا ٹکراتا اور رات دن سے آگے کیوں نہیں بڑھ جاتی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مدار میں گردش کرنے پر کیوں مجبور ہے۔ ان کی گردش اور رفتار پر اہلِ زمین کے کیلنڈرز کا دارومدار ہے۔ اگر ان کی رفتار میں معمولی کمی بیشی ہو جاتی تو ہماری تمام جنتریاں اور ہمارے تمام کیلنڈر غلط ہو جاتے اور ہمارا کمپیوٹر ماضی کے تخمینے لگانے سے عاجز ہو جاتا لیکن خداوند ذوالجلال کی حیرت انگیز تدبیر کارفرما ہے کہ اتنی بڑی کائنات کہ جس کے اور چھور کا کوئی اندازہ نہیں اس میں کہیں غلطی کا امکان تک پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم ہمیں آسمانوں کی طرف توجہ دلاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا تم نے رحمٰن کی تخلیق میں کہیں تفاوت دیکھا ہے۔ تم بار بار اس تخلیق کو دیکھو، تمہیں کہیں کوئی فتور اور کہیں کوئی دراڑ نظر آتی ہے۔ تم اس کے حیرت انگیز نظم و ترتیب کو دیکھو، کہیں تمہیں شکست و ریخت کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار اس آیتِ کریمہ میں پوچھتا ہے کہ لوگو! بتاؤ تم نے جو اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں انہیں آسمانوں اور زمین میں رزق کون دیتا ہے، تمہارے حواس اور احساسات کا مالک کون ہے، تمہیں مشاہدات اور مسموعات کی دولت سے کس نے گراں بار کیا ہے۔ زندگی اور موت کس کے ہاتھ میں ہے، کون زندہ سے مردہ کو اور مردہ کو زندہ سے نکال رہا ہے، کون ہے جس نے مادہ کو حیات سے نوازا اور پھر جب وہ چاہتا ہے مادہ کو حیات سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ کون ہے جس نے بیجان چیزوں میں فکری حقیقتیں رکھی ہیں اور فکری قوتوں سے حُسنِ معنی کی دنیا وجود پذیر ہوئی ہے اور پھر اس عظیم کائنات جس کی وسعتوں کا کسی کو اندازہ نہیں کی تدبیر کون کرتا ہے۔ کون اس کے نظام کو چلاتا ہے اور کس نے حیرت انگیز طریقے سے ہر مخلوق کو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا ہے اور اس کی تمام مخلوقات اس کی دی ہوئی رہنمائی کے مطابق نہایت کامیابی سے زندگی گزار رہی ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ یہ نادان لوگ شاید جواب نہ دیں لیکن اگر وہ جواب دیں تو یقیناً یہی ہوگا کہ سب کچھ کرنے والی اللہ کی ذات ہے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان سے کہئے کہ اگر پوری کائنات سررشتہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور تم اسی کی ربوبیت سے فیض یاب ہو رہے ہو، ہر چیز کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اور سب کو پالنے والا، ضرورتیں مہیا کرنے والا اور عطا کرنے والا بھی وہی ہے تو پھر تم اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہوئے اس سے ڈرتے نہیں ہو؟

Marfat.com

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَأَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿یونس : ۳۲﴾

(یہ ہے اللہ تعالیٰ جو تمہارا حقیقی رب ہے۔ تو حق کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہے، تو کہاں تمہاری عقل الٹ جاتی ہے۔)

مشرکینِ عرب کے مذہب کی تاریخ جو ہم تک پہنچی ہے اور جس کی طرف قرآن کریم بھی جا بجا اشارے کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نہ صرف خالق و رازق، سمع و بصر کا مالک اور زندگی اور موت کا منبع مانتے تھے بلکہ کائنات کا مدبر اور منتظم بھی اسی کو تصور کرتے تھے۔ وہ اپنے بتوں اور دوسرے شرکاء کو اللہ تعالیٰ کی ان صفات میں شریک نہیں سمجھتے تھے اور نہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا معبود جانتے تھے۔ البتہ ان کے ذہن میں جو فکری خرابی پیدا ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ ساری کائنات کا انتظام و انصرام تنہا ایک ذات کیسے کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو عرشِ معلیٰ پر رونق افروز ہے، اسے ساری کائنات اور اہل زمین کے ایک ایک فرد کے بارے میں ہر وقت تفصیل کیسے معلوم ہو سکتی ہے، اس نے یقیناً ایک بادشاہ کی طرح اپنے مقربین کو کچھ اختیارات دے رکھے ہیں اور ان کے ذمہ کچھ فرائض لگا رکھے ہیں مثلاً کسی کو اولاد دینے کا حق دے دیا ہے، کسی کو رزق میں اضافہ کرنے کا اور کسی کو مصیبتوں سے نجات دینے کا۔ یہ اگر چہ اپنے اختیارات میں اللہ تعالیٰ کے ماتحت بھی ہیں اور محکوم بھی، لیکن چونکہ انہیں ایک تقرب حاصل ہے اس لئے پروردگار ان سے باز پرس نہیں کرتا۔ وہ ایک طرح سے اپنے کاموں میں آزاد ہیں۔ یہ ایک جاہلانہ تصور تھا جس نے ان میں شرک کی چند در چند شکلیں پیدا کر دی تھیں۔

ایک اور غلط فہمی جو ہمیشہ مشرک قوموں میں موجود رہی ہے اور مشرکینِ مکہ میں بھی تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اصل بنائے فساد ہی یہ تھی تو غلط نہیں ہوگا۔ وہ غلط فہمی یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک، منتظم اور مدبر تو مانتے تھے لیکن اسے حاکمِ حقیقی اور آقائے کل تسلیم نہیں کرتے تھے۔ قرآن کریم سب سے زیادہ جس بات پر زور دیتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ جو تمہارا خالق ہے وہی تمہارا رزق رساں بھی ہے اسی نے زندگی کی تمام ضرورتیں تمہیں مہیا کی ہیں۔ زندگی کے مختلف ادوار میں کوئی دور ایسا نہیں جس میں اس نے بدلتی ہوئی ضرورتوں کا لحاظ نہ فرمایا ہو اور پھر ضرورتوں کے اعتبار سے اس کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ وہ جس طرح دودھ پیتے بچے کیلئے ماں کے سینے میں دودھ اتارتا ہے اور جب وہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اسے کھانا بھی دیتا ہے اور اسے ہضم کرنے کیلئے معدہ میں قوت بھی عطا کرتا ہے اور بچے کی عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کی غذا میں تنوع پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کیلئے نئی سے نئی معنوی نعمتوں کو بھی عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ جب تک بچہ حواس سے عاری تھا تو ماں نے اسے گود میں اٹھایا اور اس کی ہر ضرورت کی کفالت کی اور جب وہ بڑا ہوا تو اسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تو قدرت نے بھی اس کے اندر حواس کا نور روشن کر دیا اور جب وہ سکول کی عمر کو پہنچا تو آہستہ آہستہ اس کے اندر عقل کا چراغ جلنے لگا۔ جسم کی جیسے جیسے ضرورتیں بڑھتی گئیں ویسے ویسے حواس بھی پختہ ہوتے گئے اور عقل بھی تیز ہوتی گئی لیکن جب بلوغ کے بعد وقت آیا خیر و شر میں امتیاز کا، حسن قبح کی معرفت کا، کائنات کی حقیقت کے ادراک کا، اخلاقی مسلمات کے جاننے کا، کائناتی اور فطری اصولوں کی شناخت کا اور قوموں کی زندگی میں اجتماعی اخلاق کی تاثیر کے علم کا تو اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی سے انسان کو نوازا۔ پاکیزہ صفت، پاکیزہ شعار، پاکیزہ اخلاق اور ولآویز شخصیتوں کے مالک اور نمونے کے لوگ رسول بنا کر اٹھائے، کتابیں اتاریں۔ اس طرح سے اس نے انسان کی ہمہ نوعی ضرورتوں کو پورا فرما کر یہ تصور دیا کہ وہ تمہارا خالق و مالک جو تمہاری جسمانی ضرورتوں کیلئے فیضانِ ربوبیت رکھتا ہے وہ تمہاری معنوی اور روحانی ضرورتوں کیلئے بھی ایسی ہی رحمت کی نظر رکھتا ہے۔ اس لئے اس نے اس معنوی اور روحانی فیضان سے انسان کو کبھی محروم نہیں رکھا۔ بنابریں ضروری ہے کہ جس طرح تم اپنے وجود کو دیکھ کر اللہ کے خالق ہونے کا یقین رکھتے ہو اور جس طرح کائنات کے نظام میں نظم و ترتیب کو دیکھ کر اللہ کے مدبر ہونے کو تسلیم کرتے ہو، اسی طرح تمہیں یہ اقرار کرنا چاہئے کہ جس نے تمہاری روحانی اور معنوی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے سلسلۂ رسالت چلایا ہے اور وحی الٰہی کا نور روشن کیا ہے وہ تمہارا اس حوالے سے بھی رب ہے اور یہی وہ رب ہے جو تمہارا حاکمِ حقیقی ہے کیونکہ ایک حاکمِ حقیقی ہی تمام ضرورتوں کو مہیا کرنے والا اور اس کو بروئے کار لانے والا ہو سکتا ہے۔ وہ تمہارا آقائے حقیقی بھی ہے کیونکہ تم اسی کے بندے اور غلام ہو جس طرح تم اس کا کھاتے اور پیتے ہو، اس کی نعمتوں سے حظ اٹھاتے ہو اور اس کی عطا کردہ زندگی سے متمتع ہوتے ہو اسی طرح تم پر لازم ہے کہ اس کے احکام کو مانو، اس کی حکومت کو تسلیم کرو، اس کے نازل کردہ آئین و قوانین کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرو اور اگر تم کھاتے تو اس کا ہو لیکن گاتے کسی اور کا ہو، شاد کام تو اس کی نعمتوں سے ہوتے ہو لیکن زندگی کسی اور کی مرضی سے گزارتے اور تمہارے

Marfat.com

دل ودماغ اور تمہاری صلاحیتوں پر حکمرانی کسی اور کی ہے تو یہ وہ شرک اور دوئی کا تصور ہے جسے پروردگار قبول نہیں کرتا کیونکہ:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

تم اسی کے بندے ہو، تو بندگی میں تقسیم نہیں ہوسکتی اور وہ تمہارا آقا ہے تو اس کی آقائی میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔ جب تک تم اس حقیقت کو نہیں سمجھو گے اس وقت تک تمہاری زندگی سے شرک نکل نہیں سکے گا اور تم کہیں نہ کہیں شرک میں ملوث ہوتے رہو گے۔

اس کا کیا کیا جائے کہ قرآن کریم مشرکین کے جس رویئے پر جابجا تنقید کرتا ہے اور ان کے شرک کی مختلف اقسام پر نہایت برہمی کا اظہار کرتا ہے۔ ان میں سے بیشتر شرک کی صورتیں ایسی ہیں جن میں آج مسلمان بھی ملوث ہیں لیکن دکھ یہ ہے کہ بیشتر مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں۔ انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم چونکہ آخری امت ہیں اور ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے ہم چاہے کیسے بھی شرک میں مبتلا ہوجائیں ہمارے ایمان اور اسلام کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس سلسلے میں خود کچھ عرض کرنے کی بجائے مولانا الطاف حسین حالی کے اشعار نقل کرتا ہوں جس سے شاید ہمیں اپنے بارے میں سوچنے کا موقع ملے۔

کرے غیر گر بت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
کرشمہ جو کوکب میں مانے تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدہ تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے

كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْٓا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۳۳﴾

(اسی طرح پوری ہوچکی ہے تیرے رب کی بات ان لوگوں پر جو حدود سے نکل گئے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔)

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں قرآنِ کریم نے زوردار دلائل کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ جس اللہ کو تم اپنا خالق تسلیم کرتے ہو وہی تمہاری زندگی اور موت کا مالک ہے۔ اسی کے ہاتھ میں پوری کائنات کا انتظام وانصرام ہے اور وہی کائنات کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے تمہیں پیدا کرکے چھوڑ نہیں دیا بلکہ تمہاری تمام زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور جس کائنات میں تم رہتے ہو اس کے معاملات کا انتظام کرنا اور تمہیں اس دنیا میں رہتے ہوئے جس ظاہری، معنوی، ذہنی اور روحانی رہنمائی کی ضرورت ہے اسے پوری طرح روبہ کار لانا اور تمہیں اس سے آراستہ کرنا یہ بھی اس نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اس لحاظ سے جہاں وہ خالق اور مدبر ہے وہاں وہ تمہارا رب یعنی حاکمِ حقیقی، آقائے حقیقی اور معبودِ حقیقی بھی ہے۔ یہ تینوں صفتیں ربوبیت کا تقاضا بھی ہیں اور لازمہ بھی۔ جب تک تم انہیں بہمہ وجوہ تسلیم نہیں کرو گے اس وقت تک تم شرک کی گندگی سے پاک نہیں ہوسکتے۔ یہ تمام باتیں دلائل سے ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ اب تمہیں اس بات کا یقین ہوگیا ہوگا کہ یہی اللہ تمہارا رب حقیقی ہے اور کائنات کا سب سے بڑا حق اور سب سے بڑی سچائی

Marfat.com

ہے۔اسے اگر اچھی طرح سمجھ گئے ہو تو اب حق کے قبول کرنے میں کوئی دیر نہیں ہونی چاہئے کیونکہ حق واضح ہو جانے کے بعد گمراہی کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ جو آدمی اب بھی حق سے انحراف کرے گا وہ یقیناً گمراہی میں مبتلا ہوگا۔ ایسے آدمی کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے اور اس نے دراصل اپنے آپ کو شیطانی قوتوں کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ نجانے اسے کن وادیوں میں لئے پھرتے ہیں۔

اللہ کا قانونِ ہدایت و ضلالت

اس تمام صورتحال کے واضح ہو جانے کے بعد جب ایک مخاطب یہ دیکھتا ہے کہ اب جبکہ حق کھل کے سامنے آ گیا ہے تو آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اب بھی کچھ لوگ ایمان لا کے نہیں دیتے بلکہ وہ اپنی جہالت اور ضلالت پر قائم رہنے ہی کو دانشمندی سمجھتے ہیں۔ اس شبے کے ازالے کیلئے پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم جس صورتحال کو دیکھ کر تعجب کا اظہار کر رہے ہو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ سنت اللہ کے عین مطابق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت وضلالت جو اس دنیا میں انسانوں میں نافذ ہے اس کا لازمی تقاضا یہی ہے۔ آپ شاید اسے نہ سمجھے ہوں میں آسانی پیدا کرنے کیلئے اس کی وضاحت کئے دیتا ہوں۔ اللہ کا طریقہ اور اس کی سنت یہ ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کیلئے چند اسباب پیدا کئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو جب تک اس کی فطرت اور اس کی قلبی کیفیت کو ماحول کے اثرات سے بگاڑ نہیں دیا جاتا اس وقت تک اس کا قلبی میلان اور فطری رجحان اللہ کی معرفت اور اس کی بندگی کی طرف رہتا ہے۔ لیکن جب وہ مخالف ماحول، مخالف تعلیم اور بگڑے ہوئے احباب میں رہ کر اپنی سلامت روی کو بگاڑ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے حواس اور عقل عطا کرتے ہیں۔ حق اور باطل میں امتیاز کرنے کیلئے اسے قوتِ تمیز عطا کی جاتی ہے اور آسمانوں سے کتابیں اترتی ہیں۔ ہر قوم میں سے ایک ایسا فرد جو ہر لحاظ سے بھروسے کے لائق ہو اور جس کے سیرت و کردار میں کوئی عیب نہ ہو اس پر اللہ کی وحی اترتی ہے اور وہ انسانوں کو اپنی ہمت سے بڑھ کر اپنی پوری شخصیت کو داؤ پر لگا کر اور زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر نہایت ہمدردی اور جانفشانی سے قوم کو اللہ کی ہدایت کی طرف بلاتا ہے اور دعوت کا کوئی اسلوب ایسا باقی نہیں رہتا جس سے وہ کام نہیں لیتا لیکن ان تمام مساعی اور ہمدردی و جانسپاری کے باوجود جو شخص ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر ممکن طریق سے اللہ کے نبی کا راستہ روکتا ہے تو پھر اللہ کی ایک مخصوص سنت اور ایک خاص قانون حرکت میں آتا ہے جسے ہدایت وضلالت کا قانون کہنا چاہئے۔ ایسا شخص اس قانون کی زد میں آ جاتا ہے اور قدرت کی جانب سے اس کے دل و دماغ پر ہدایت سے محرومی کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ اب وہ اس قابل نہیں رہتا کہ وہ ہدایت قبول کر سکے۔

اس آیتِ کریمہ میں اسی قانون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے قرآن کریم کے تمام دلائل اور آنحضرت ﷺ کی تمام دعوتی کوششوں کو نظر انداز کر کے شرک پر اصرار جاری رکھا اور وہ اپنی گمراہی کے راستے پر جمے رہے اور ہدایت کی ہر بات کو جھٹلاتے ہوئے پامال کر گئے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں پر شیاطین کو مسلط کر دیتا ہے جو انہیں اپنا مصاحب اور ساتھی بنا لیتے ہیں اور پھر ہر وقت اسے اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں پھر ایک وقت آتا ہے جب اسے گمراہی کی کھائیوں کی نذر کر دیتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ O

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ قُلِ اللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۞

(اے پیغمبر! ان سے پوچھئے تمہارے شریکوں میں سے کوئی ہے جو تخلیق کی ابتداء کرتا ہو اور پھر اس کا اعادہ بھی کرے۔ کہہ دیجئے وہ صرف اللہ ہی ہے جو تخلیق کا آغاز بھی کرتا ہے پھر اس کا اعادہ بھی کرے گا۔ تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو۔) ﴿یونس: ۳۴﴾

مشرکین کی ایک اور گمراہی

اس سے پہلے آیت نمبر 31 میں پروردگار نے کچھ سوالات مشرکینِ مکہ کے سامنے پیش کئے اور پھر خود ہی ان کا وہ جواب دیا جو ان کے نزدیک مسلم تھا۔ لیکن زبان سے اس کا اظہار انہیں اس وقت کرنا پسند نہ تھا۔ اگرچہ ان کے دل اس کی گواہی دیتے تھے۔ اس سوال و جواب کے نتیجے میں دو باتیں ان سے فرمائی گئیں۔ پہلی بات یہ کہ جب تم تسلیم کرتے ہو کہ یہ ساری صفات اللہ ہی کی ہیں اور وہی ان قدرتوں کا مالک ہے تو پھر اس کی عطاء کردہ زندگی

Marfat.com

میں اپنی مرضی کرتے اور اس کی نافرمانی کرتے ہوئے تم اس کے غضب سے ڈرتے نہیں ہو۔ یہ ایک ایسا مطالبہ تھا جس کے حق اور امرِ واقع ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ دوسری بات ان سے یہ فرمائی گئی کہ جب تم اللہ کو خالق، رازق، حواس اور عقل کا عطاء کرنے والا اور کائنات کے نظام کی تدبیر کرنے والا تسلیم کرتے ہو تو پھر اس کی موجودگی میں دوسروں کو رب کیونکر تسلیم کرتے ہو کیونکہ سروری، آقائی اور عبادت کا حق صرف اسی کو دیا جا سکتا ہے جس کے اندر یہ تمام صفات پائی جاتی ہوں اور یہی تینوں صفات ہیں جن کے مجموعہ کو ربوبیت کہتے ہیں تو دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا رہا ہے کہ تم اللہ کے سوا کسی اور کو رب کیسے مانتے ہو جبکہ ربوبیت کیلئے بنیادی صفات وہی ہیں جن کا ابھی تذکرہ ہوا اور ان صفات سے متصف اللہ کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں، لیکن تم نے بجائے اس کو ربِ واحد تسلیم کرنے کے اس کے شرکاء بنا رکھے ہیں۔ ان کی اس بنیادی گمراہی کے ابطال کے بعد پیشِ نظر آیت کریمہ میں ان کی ایک اور بڑی گمراہی کا ازالہ سوال ہی کے انداز میں کیا جا رہا ہے۔ وہ گمراہی یہ تھی کہ ان میں سے ایک بڑی تعداد کو قیامت کے نہ آنے کا یا تو یقین تھا یا اس کے آنے میں شبہ تھا اور شبہ کی بنیاد یہ تھی کہ تمام انسانوں اور زمین و آسمان کا بیک لحظہ فنا ہو جانا اور پھر ایک مدت کے بعد از سرِ نو معرضِ وجود میں آ جانے کا انہیں یقین نہیں آتا تھا۔ یہ بات ان کی عقل کسی طرح تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ اتنی بڑی کائنات اچانک تباہ ہو سکتی ہے اور پھر اسی طرح دوبارہ وجود میں بھی آ سکتی ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں ان کی اس بنیادی گمراہی کا ازالہ فرمایا گیا ہے کیونکہ جس طرح اللہ کی ربوبیت کا انکار اللہ کو نہ ماننے کے مترادف ہے جس کے نتیجہ میں ایمان اپنے بیخ و بن سے اکھڑ جاتا ہے اسی طرح قیامت کا انکار انسان کو ایک ایسا غیر ذمہ دار اور لاابالی حیوان بنا دیتا ہے جس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے اسی زور اور اصرار کے ساتھ سوال کیا گیا ہے کہ بتاؤ اس کائنات کا خالق کون ہے۔ کائنات کی تخلیق کی ابتداء کس نے کی؟ مادۂ تخلیق کو کس نے پیدا کیا؟ پھر ہر مخلوق کے سلسلہ توالد و تناسل کو کس نے وجود عطا فرمایا؟ آج ہر مخلوق جس طرح پھیلتی چلی جا رہی ہے یہ کس کا فیضان اور کس کی عطا ہے اور اگر تم مانتے ہو اور یقیناً مانتے ہو کہ اللہ ہی کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اسی نے ہر چیز کی تخلیق کا آغاز کیا ہے اور وہی اس سلسلے کو باقی رکھے ہوئے ہے اور پھر یہ بھی تو تم تسلیم کرتے ہو کہ جس طرح وہ زندگی عطا فرماتا ہے اسی طرح موت بھی اسی کے قبضے میں ہے۔ وہ جس طرح کائنات کو زندگی دے سکتا ہے اسی طرح موت سے بھی ہمکنار کر سکتا ہے اور یہ عقل عام کی بات ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ جو ذات کسی چیز کے بنانے اور اس کی تخلیق کرنے پر ایک دفعہ قادر ہے وہ دوبارہ بھی اسے پیدا کرنے پر قادر ہے۔ جو معمار ایک عمارت تعمیر کر سکتا ہے وہ اسے مسمار بھی کر سکتا ہے اور اگر دوبارہ اسے بنانے کیلئے کہا جائے تو وہ دوبارہ بنا بھی سکتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تاج محل کے معمار اگر آج زندہ ہوتے تو وہ دوبارہ اسے تعمیر نہیں کر سکتے تھے اور جن ہنرمندوں کے ہنر کا شاہکار اہرامِ مصر ہیں ان کے بارے میں کوئی عقل مند آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دوبارہ اہرام مصر بنانے پر قادر نہیں تھے کیونکہ اگر وہ دوبارہ بنانے پر قادر نہ ہوتے تو ایک اہرام بنانے کے بعد دوسرا اہرام کبھی نہ بنا سکتے۔ اگر یہ واقعی عقل کا فتویٰ ہے کہ کوئی بھی تخلیق دوباہ ناممکن نہیں ہوتی اور کوئی بھی تخلیق کو وجود میں لانے والا دوبارہ اس سے تہی دامن نہیں ہو جاتا تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ تم اللہ کو بہمہ وجوہ خالق تو مانتے ہو لیکن کائنات کے فنا ہو جانے کے بعد اس کے اعادہ کرنے پر تم اسے قادر نہیں سمجھتے۔ یہ تو ایک طرح کی فکری شکست اور عقل و دانش کے اوندھے منہ گر جانے والی بات ہے اور یہ وہ حماقت کی انتہاء ہے جس نے تمہیں قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں آج تک یکسو ہونے سے محروم رکھا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ تمہاری فکر اور تمہارے اعمال میں بہتری کے آثار پیدا نہیں ہوتے کیونکہ قیامت کا آنا بجائے خود مقصد نہیں بلکہ ایک مقصد کے بروئے کار لانے کا سبب ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ میں اس دنیا میں رہتے ہوئے جس ظلم، بے اعتدالی، حق تلفی، حق شکنی اور جس گمراہی کا ارتکاب کروں گا قیامت کے دن اس کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ زندگی کا ایک ایک عمل عدالت کے سامنے ہوگا۔ وہاں ہر نیکی کا بدلہ ملے گا اور ہر برائی کی سزا ملے گی۔ عدل اپنی وسعتوں سمیت بروئے کار لایا جائے گا۔ ظلم کی ایک ایک شکل کھول کر سامنے رکھ دی جائے گی۔ کوئی قربانی دینے والا بے پایاں اعزاز سے محروم نہیں رہے گا اور کوئی بڑے سے بڑا جرم کرنے والا وسیع تر سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ یہ تمام تصورات قیامت کے ایک تصور میں رچے بسے ہیں۔ انہیں تصورات کو قبول کرنے سے انسانی زندگی میں حقیقی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور وہ ہر بات سوچنے سے پہلے، ہر فیصلہ کرنے سے پہلے اور ہر عمل کرنے سے پہلے سوچتا ہے کہ میں اللہ کے سامنے جا کر کیا جواب دوں گا۔ جب یہ فکر انسان میں پیدا ہو جاتی ہے تو پھر کوئی فکری اور عملی خرابی باقی رہنے کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بنیادی تصور اور عقیدے کیلئے سوالات کی صورت میں ایک ایسی مضبوط دلیل فراہم کی گئی ہے جس کی گرفت سے صرف وہی آدمی آزاد رہتا ہے جو زندگی کے معاملات میں سنجیدہ نہ ہو اور یہ بات واضح ہے کہ ایسے آدمی کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔

Marfat.com

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ لَّا يَهِدِّيْٓ اِلَّآ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ ﴿یونس : ۳۵﴾

(اے پیغمبر! ان سے پوچھئے کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو، کہہ دیجئے وہ اللہ ہی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔تو کیا جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے وہ زیادہ مستحق ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا الا یہ کہ اس کی رہنمائی کی جائے تو تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔)

رہنمائی کے حوالے سے اصولی بات

اس آیت کی تشریح میں صاحب تفہیم القرآن نے ایک قابلِ قدر نوٹ لکھا ہے، ہم اس سے استفادہ کرتے ہیں۔(یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کو ذرا تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہئے۔دنیا میں انسان کی ضرورتوں کا دائرہ صرف اسی حد تک محدود نہیں ہے کہ اس کو کھانے پینے، پہننے اور زندگی بسر کرنے کا سامان بہم پہنچے اور آفات، مصائب اور نقصانات سے وہ محفوظ رہے بلکہ اس کی ایک ضرورت (اور در حقیقت سب سے بڑی ضرورت) یہ بھی ہے کہ اسے دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو اور وہ جانے کہ اپنی ذات کے ساتھ، اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ، اس سرو سامان کے ساتھ جو روئے زمین پر اس کے تصرف میں ہے، ان بے شمار انسانوں کے ساتھ جن سے مختلف حیثیتوں میں اس کو سابقہ پیش آتا ہے اور مجموعی طور پر اس نظام کائنات کے ساتھ جس کے ماتحت رہ کر ہی بہر حال اس کو کام کرنا ہے، وہ کیا اور کس طرح معاملہ کرے جس سے اس کی زندگی بحیثیت مجموعی کامیاب ہو اور اس کی کوششیں اور محنتیں غلط راہوں میں صرف ہو کر تباہی و بربادی پر منتج نہ ہوں۔اسی صحیح طریقہ کا نام "حق" ہے اور جو رہنمائی اس طریقہ کی طرف انسان کو لے جائے وہی "ہدایت حق" ہے۔اب قرآن تمام مشرکین سے اور ان سب لوگوں سے جو پیغمبر کی تعلیم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔یہ پوچھتا ہے کہ تم خدا کے سوا جن جن کی بندگی کرتے ہو ان میں کوئی ہے جو تمہارے لئے "ہدایت حق" حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہو یا بن سکتا ہو؟......ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔اس لئے کہ انسان خدا کے سوا جن کی بندگی کرتا ہے وہ دو بڑی اقسام پر منقسم ہیں۔

ایک وہ دیویاں، دیوتا اور زندہ یا مردہ انسان جن کی پرستش کی جاتی ہے۔سو ان کی طرف تو انسان کا رجوع صرف اس غرض کیلئے ہوتا ہے کہ فوق الفطری طریقے سے وہ اس کی حاجتیں پوری کریں اور اس کو آفات سے بچائیں۔رہی ہدایتِ حق تو وہ نہ کبھی ان کی طرف سے آئی، نہ کبھی کسی مشرک نے اس کیلئے ان کی طرف رجوع کیا اور نہ کوئی مشرک یہ کہتا ہے کہ اس کے یہ معبود اسے اخلاق، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، قانون، عدالت وغیرہ کے اصول سکھاتے ہیں۔

دوسرے وہ انسان جن کے بنائے ہوئے اصولوں اور قوانین کی پیروی و اطاعت کی جاتی ہے۔سو وہ رہنما تو ضرور ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع وہ "رہنمائے حق" بھی ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں سے کسی کا علم بھی ان تمام حقائق پر حاوی ہے جن کو جاننا انسانی زندگی کے صحیح اصول وضع کرنے کیلئے ضروری ہے؟ کیا ان میں سے کسی کی نظر بھی اس پورے دائرے پر پھیلتی ہے جس میں انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پھیلے ہوئے ہیں؟ کیا ان میں سے کوئی بھی ان کمزوریوں سے، ان تعصبات سے، ان شخصی یا گروہی دلچسپیوں سے، ان اغراض و خواہشات سے اور ان رجحانات و میلانات سے بالاتر ہے جو انسانی معاشرے کیلئے منصفانہ قوانین بنانے میں مانع ہوتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا، تو آخر یہ لوگ "ہدایت حق" کا سر چشمہ کیسے ہو سکتے ہیں؟

اسی بنا پر قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ لوگو! تمہارے ان مذہبی معبودوں اور تمدنی خداؤں میں کوئی ایسا بھی ہے جو راہ راست کی طرف تمہاری رہنمائی کرنے والا ہو؟ اوپر کے سوالات کے ساتھ مل کر یہ آخری سوال دین و مذہب کے پورے مسئلے کا فیصلہ کر دیتا ہے۔انسان کی ساری ضرورتیں دو ہی نوعیت کی ہیں۔ایک نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی اس کا پروردگار ہو، کوئی ملجا و ماویٰ ہو، کوئی دعاؤں کا سننے والا اور حاجتوں کا پورا کرنے والا ہو جس کا مستقل سہارا اس عالمِ اسباب کے بے ثبات سہاروں کے درمیان رہتے ہوئے وہ تھام سکے۔سو اوپر کے سوالات نے فیصلہ کر دیا کہ اس ضرورت کو پورا کرنے والا خدا کے سوا کوئی نہیں ہے۔دوسری نوعیت کی ضروریات یہ ہیں کہ کوئی ایسا رہنما ہو جو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے صحیح اصول

Marfat.com

بتائے اور جس کے دیئے ہوئے قوانین حیات کی پیروی پورے اعتماد واطمینان کے ساتھ کی جاسکے۔ سو اس آخری سوال نے اس کا فیصلہ بھی کردیا کہ وہ بھی صرف خدا ہی ہے۔ اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی جس کی بنا پر انسان مشرکانہ مذاہب اور لادینی (Secular) اصولِ تمدن واخلاق وسیاست سے چمٹا رہے۔

وَمَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۳۶﴾

(ان میں سے اکثر پیروی نہیں کرتے مگر گمان کی، حالانکہ گمان حق کا بدل ذرا بھی نہیں ہوسکتا۔ بیشک اللہ جاننے والا ہے جو کچھ یہ کررہے ہیں۔)

حق کے مقابلے میں ظن کی پیروی

قیامت پر عقیدہ نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ زندگی میں سنجیدگی اور فکرمندی پیدا نہیں ہوتی اور آدمی اپنے آپ کو ہر طرح کی داروگیر اور جواب طلبی سے آزاد سمجھتا ہے۔ خواہشاتِ نفس اسے جس طرف کھینچ لے جاتی ہیں اسی طرف چل دیتا ہے۔ ہر طرح کی ہوس مقصدِ زندگی بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی سا فیصلہ کرنے سے پہلے یہ سوچنے کی زحمت ہی نہیں کی جاتی کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے۔ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جو قیامت کے انکار سے خودبخود جنم لیتا ہے۔ چنانچہ یہی رویہ مشرکینِ مکہ میں بھی جنم لے چکا تھا اور ان کے بنیادی عقائد سے انکار کے نتیجے میں اس سے مختلف کسی نتیجے کے ظاہر ہونے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسی طرف توجہ دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی زندگی کی روش اور ان کے دماغی فیصلوں کی رہنمائی حق کے ہاتھ میں نہیں کیونکہ اسے تو وہ ماننے سے انکار کردیتے ہیں کیونکہ جس طرح وہ قیامت سے انکار کرچکے ہیں اسی طرح وہ اللہ کی طرف سے آنے والی ہدایت کو قبول کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں۔ تو نہ ان کے پاس جزاءِ ابدی کی سنجیدگی باقی رہی اور نہ حق کی رہنمائی تو اس کا نتیجہ اس کا سوا اور کیا ہوگا کہ وہ انکل پچو سے زندگی گزاریں کہ جو جی میں آئے کر گزریں۔ جدھر لوگ چلنے لگیں وہ بھی چلنے لگیں۔ یہاں "ظن"، علم، یقین اور حق تینوں کی ضد کے طور پر آیا ہے۔ یعنی انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ علم کے تقاضے کیا ہیں، یقین کس طرف ہے اور حق کہاں ہے۔ وہ اپنے لئے جو شرعی احکام تجویز کرچکے ہیں انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ ان کی کوئی علمی سند بھی ہے یا نہیں۔ جن روایات پر وہ جان دیتے ہیں ان کیلئے ان کے پاس باپ دادا کے سوا کوئی دلیل نہیں۔ ظاہر ہے کہ باپ دادا ہونا تو کوئی دلیل کی بات نہیں۔ دنیا نے حماقتیں پہلے بھی کی ہیں اور آج بھی کررہی ہے۔ انہوں نے جن قوتوں کو اللہ کے شریک بنا رکھا ہے ان کے حوالے سے انہوں نے حق بات کو تلاش کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ہر معاملے میں ظن اور گمان سے رہنمائی لیتے ہیں حالانکہ ظن اور گمان تو حق کے مقابلے میں کسی طرح بھی زندگی کی رہنمائی کیلئے کافی نہیں۔ یہ تو اپنے آپ کو تاریکیوں میں ڈبو دینے کی ایک کوشش ہے جس کا نتیجہ معلوم ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِىْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴿یونس : ۳۷﴾

(اور یہ قرآن ایسی چیز نہیں جسے گھڑ لیا گیا ہو اللہ سے پرے پرے بلکہ یہ تو تصدیق ہے اس کی جو اس سے پہلے نازل ہوچکی ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس کے رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شک نہیں۔)

قرآنِ کریم سابق پیشگوئیوں کی تصدیق ہے

مشرکینِ مکہ کے مزعوماتِ فاسدہ اور اعتقاداتِ باطلہ کا رد کرتے ہوئے پروردگار نے گزشتہ آیات میں ان کی بے عقلی اور جہالت کو بھی نمایاں کیا ہے اور ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن کا اگر ایک طرف جواب دینا ممکن نہیں تو دوسری طرف یہ مانے بغیر چارا نہیں کہ مشرکین نہ صرف اعتقادات کے فساد کا شکار ہیں بلکہ جہالت اور تعصب نے ان کی عقلوں کو بھی ماؤف کرکے رکھ دیا ہے۔ جن قوتوں کو انہوں نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے ان کے بارے میں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ کائنات کی تخلیق اور مخلوقات کی ہدایت کے عمل میں کسی حد تک بھی شریک نہیں۔ وہ جس طرح قوت وقدرت سے تہی دامن ہیں اسی طرح ہدایت کے علم سے بالکل کورے ہیں۔ وہ بالکل نہیں جانتے کہ ہر مخلوق کیلئے اسبابِ معیشت کیا ہیں، معیشت کا راستہ کیا ہے۔ ان کی

Marfat.com

زندگی کے طبعی اور جبلی مقاصد کیا ہیں اور ان کی ادائیگی کا طریقہ کیا ہے۔ انسان کائنات کا گلِ سرسبد ہے۔ اس کی حقیقت کو جاننا اور اس کیلئے زندگی کے اسباب فراہم کرنا اور مقاصدِ زندگی متعین کرنا تو بجائے ایک خود لاینحل مسئلہ ہے۔ جو قوتیں باقی مخلوقات کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں وہ انسانوں کی رہنمائی کا فرض کیسے انجام دے سکتی ہیں، لیکن انتہائی دکھ کی بات یہ ہے کہ عرب کے جاہلوں نے ایسی ہی قوتوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا تھا۔ پھر اس پر مزید ستم یہ ہے کہ انسان کی معنوی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے ہر دور کی طرح اس دور میں بھی اپنا آخری رسول اور اپنی آخری کتاب نازل فرمائی ہے جس میں قیامت تک آنے والے انسانوں کیلئے انفرادی اور اجتماعی رہنمائی مہیا کی گئی ہے لیکن ان جاہلوں کا حال یہ ہے کہ یہ مسلسل اپنی جہالت اور حماقت میں اضافے کا ثبوت دیتے ہوئے اسے تسلیم کرنے سے بھی انکار کر رہے ہیں اور اس پر مزید ستم یہ ہے کہ ایک طرف قرآن کریم کا انکار کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کی اہمیت اور عظمت کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔ اس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی حیرت انگیز تاثیر ان کو مبہوت کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس میں بیان کردہ ایک مربوط نظامِ زندگی ان کیلئے ایک چیلنج بن جاتا ہے۔ اس میں بیان کی جانے والی پیشگوئیاں انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں، لیکن ان کا تعصب اور ان کی جہالت اور ان کا فکری جمود اور ان کے آباؤ اجداد کی تقلید کا نہ ٹوٹنے والا طلسم انہیں قرآن کریم کو تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے کبھی وہ اسے شعر قرار دیتے ہیں، کبھی جادو کہتے ہیں، کبھی اسے کہانت کا نام دیتے ہیں۔ ان کی حالت دیکھ کر ان کی اندرونی کشمکش کا اندازہ کرنا مشکل نہیں رہتا۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑے ہیں، اقرار کرتے ہیں تو ان کے تئیں صدیوں کا سرمایہ لٹ جاتا ہے اور انکار کرتے ہیں تو کوئی معقول جواب بن نہیں پڑتا۔ اس لئے وہ بلا دلیل ایک ہی بات دوہراتے چلے جا رہے ہیں کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب نہیں، اللہ کا کلام نہیں، اسے خود گھڑ لیا گیا ہے، پھر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ضمیر اس پر ملامت کرتا ہے کہ محمد ﷺ تمہیں میں پلے بڑھے اور جوان ہوئے اور اب ان کی عمر ڈھلنے لگی ہے۔ وہ وہی زبان بولتے ہیں جو تم بولتے ہو، ان کے پاس سیکھنے کے وہی ذرائع ہیں جو تمہارے پاس ہیں۔ ماحول نے ان کو وہی کچھ دیا ہے جو تمہیں دیا ہے۔ انہوں نے اگر تجارت کی ہے تو تم میں تاجروں کی کیا کمی ہے۔ انہوں نے اگر ایک دو بیرونی سفر کئے ہیں تو تم ان سے بہت زیادہ کر چکے ہو۔ اس کے باوجود جو قرآن وہ پیش کر رہے ہیں اس کا ایک ایک لفظ، ایک ایک بات، ایک ایک مضمون، ایک ایک پیش گوئی، ایک ایک حقیقت اپنے اندر ایک ایسی معجزانہ شان رکھتی ہے کہ تم خود اس کی عظمت کا انکار نہیں کر سکتے۔ خود سوچو کہ تم سب مل کر جس کتاب کا مقابلہ کرنا تو دور کی بات ہے اس کی ابجد تک سے واقف نہیں ہو تو آخر اس ماحول میں پروان چڑھنے والی ایک ذاتِ عزیز نے اسے کیسے لکھ لیا۔ اس پر لاجواب ہو کر وہ یہ کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کوئی لکھ کر دیتا ہے۔ لیکن ان سے اس بات کا جواب بن نہیں پڑتا تھا کہ آخر اس مکہ میں ایسا پڑھا لکھا آدمی کون ہے جو ایسی حیرت انگیز باتیں کہتا ہے جس سے تمام روئے زمین والے بھی بے خبر ہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے اس آیت کے آغاز ہی میں فرمایا کہ یہ قرآن کریم کوئی ایسی کتاب نہیں جسے اللہ سے پرے پرے گھڑ لیا جائے۔ یعنی اس کی باتیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اس کے حقائق اللہ ہی کے عطا کردہ ہیں۔ اس کے الفاظ سے لے کر اس کی عجز بیانی تک، اس کی نصیحتوں اور پیشگوئیوں سے لے کر اس کے عطا کردہ مربوط نظامِ زندگی تک ایک ایک چیز اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ اس کی مثال انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کا رشتہ اللہ کے علم سے ہے جو ہر غلطی سے پاک ہے۔ ایسی کتاب اللہ کے علاوہ اور اس سے ہٹ کر کیسے وجود میں آ سکتی ہے۔ پھر اس کی تسہیل کیلئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تین صفات بیان فرمائیں جس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم کیوں غیر معمولی کتاب ہے اور کیوں اس کی مثال لانا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اس کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ پہلی آسمانی کتابوں میں بیان کردہ پیشگوئیوں کا مصداق بن کے آئی ہے۔ یعنی اس نے اپنے الفاظ و معنی اور حکم و عبر سے ایک ایک بات کی تصدیق کر دی ہے جو اس قرآن اور اس رسول کے بارے میں جس پر قرآن اترنے والا تھا پہلی آسمانی کتابوں میں بیان کی گئی تھیں۔ یہ کتاب اسی شان سے نازل ہوئی ہے جس کا ذکر تورات، انجیل اور زبور کر چکی تھیں۔ اس نے اس کتاب کی جن امتیازی خوبیوں اور غیر معمولی صداقتوں اور اس میں بیان کردہ انقلاب کی کامیابیوں کا جیسے جیسے ذکر کیا تھا یہ کتاب ان میں سے ایک ایک بات کا مصداق بن کر آئی ہے۔ اسی طرح جس رسول پر یہ کتاب نازل ہوئی اس کے بارے میں جو کچھ پہلی کتابوں نے کہا یعنی اس کا نام بتایا گیا، اس کے وطن کی خبر دی گئی، اس کی قوم کے سلوک کا ذکر کیا گیا، اس کی ہجرت کے احوال بیان کئے گئے، دارالہجرت کی علامات بیان کی گئیں، اس کی فتح و کامرانی کی تفصیلات نمایاں کی گئیں، اس کے بعض معجزات کا ذکر کیا گیا، اس کی شریعت کی بعض صفات کو بیان کیا گیا اور پھر ایک کامیاب انقلاب کے بعد دشمنوں سے آپ کے سلوک کا ذکر فرمایا گیا۔ اسی طرح اس کی اس صفت کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ الکتاب کی تفصیل بن کر آئے گی۔ الکتاب سے مراد ''تورات'' ہے کیونکہ حقیقت میں تورات ہی کتاب کہلانے کی مستحق ہے باقی کتابیں اس کے اجزاء معلوم ہوتی ہیں۔ تورات نے جن

Marfat.com

احکام کو مجمل بیان کیا تھا اس کتاب نے ان کی تفصیل بیان فرمائی۔ اس نے جن پیشگوئیوں کا ذکر کیا تھا اس کتاب نے ان پیشگوئیوں کو کھول کر بیان کیا۔ قرآن کریم سے پہلے آنے والی تمام کتابیں ایک ایسی شریعت اور دین لے کر آئی تھی جس کی تکمیل ابھی ہونے والی تھی۔ قرآن کریم نے اس دین کو تکمیل تک پہنچایا، اس نعمت کو اتمام کیا اور اس انقلاب کو دنیا کے سامنے ایک ایسی قوت کے ساتھ پیش فرمایا جس کا جواب دینا دنیا کیلئے ممکن نہ رہا۔ بنیادی اعتقادات، توحید و رسالت اور آخرت ان تمام کے مجملات کو کھولا۔ ان میں رعائتوں کو واپس لے کر مکمل شان عطا فرمائی۔ تیسری صفت یہ بیان کی گئی کہ اس کتاب کے رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ کیونکہ کتاب کا نزول لوگوں کے سامنے ہوتا رہا۔ کاتبانِ وحی جانے پہچانے لوگ رہے۔ جہری نمازوں میں روزانہ بلند آواز سے تلاوت ہوتی رہی اور نماز میں شرکت کرنے والے سنتے رہے اور اس میں پیش کردہ پیشگوئیاں لوگ اپنی آنکھوں سے پوری ہوتی دیکھتے رہے۔ اس کی ایک ایک حقیقت لوگوں کے سامنے جلوہ فرما ہوتی رہی۔ اللہ کی طرف سے اس کے نزول کی جتنی شہادتیں ممکن ہوسکتی تھیں وہ ایک ایک کر کے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے بعد آخر کیا شبہ رہ سکتا ہے کہ وہ لاریب اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب ہے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾ ﴿یونس : ۳۸﴾

(کیا وہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے گھڑ لیا ہے۔ ان سے کہئے تم اس کی مانند کوئی سورت لاؤ اور بلا لو اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکو، اگر تم سچے ہو۔)

قرآنِ کریم کا چیلنج

گزشتہ آیتِ کریمہ میں جیسا کہ ہم نے عرض کیا پروردگار نے قرآن کریم کی تین صفات بیان فرمائی ہیں۔ (۱) وہ پہلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کا مصداق بن کر آئی ہے۔ یعنی پہلی آسمانی کتابوں نے آنحضرت ﷺ کی جتنی علامتیں بیان فرمائی ہیں اور قرآن کریم کی جتنی صفات بیان کی ہیں ان سے اہل کتاب خوب واقف ہیں۔ وہ ان صفات اور علامات کو اپنے سامنے رکھیں اور پھر آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور قرآن کریم سے ایک ایک علامت اور ایک ایک صفت کا تقابل کر کے دیکھ لیں۔ انہیں ان دونوں میں کہیں سرِ مو فرق محسوس نہیں ہوگا۔ (۲) قرآن کریم تورات کی تفصیل ہے۔ قرآن کریم میں بیان کردہ عقائد، اخلاق، اعمال، گزشتہ امتوں کے حالات، آنے والے دنوں کے بارے میں پیشگوئیاں ان میں سے ایک ایک چیز کی قرآن کریم تفصیل بیان کرتا ہے۔ پہلی امتوں کو ان کی ذہنی حالت اور ان کے معاشروں کی سماجی ضرورت کے مطابق جو عقائد اور احکام دیئے گئے اس میں ان کی ذہنی اور سماجی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اتمام اور تکمیل سے گریز فرمایا گیا، لیکن نبی آخر الزمان ؑ پر نازل ہونے والی کتاب چونکہ انسان کی بلوغتِ فکر کے بعد نازل ہوئی ہے اس لئے اس میں عقائد کی بھی تکمیل کی گئی اور احکام میں بھی اتمامی شان پیدا کرنے کیلئے پوری تفصیل سے کام لیا گیا۔ (۳) قرآن کریم کو اس شان سے نازل کیا گیا اور اس کے الفاظ و معنی اور اس کے احکام و آداب کو اس اعجاز کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم کے منزل من اللہ ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ ان تین صفات کو بیان کرنے کے بعد پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں تعجب کے انداز میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ایسی جامع الصفات اور اعجاز نما کتاب کے بارے میں کیا اب بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ اسے محمد ﷺ نے گھڑ لیا ہے۔ یہ بات اس قدر لغو، بے سروپا اور خلافِ عقل ہے کہ اس کا جواب دینا حماقت سے کم نہیں۔ اس لئے ایسے آدمی یا ایسے لوگوں کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی دلیل تمہارے ذہن میں نہیں اترتی اور کوئی معقولیت تمہیں اپیل نہیں کرتی تو پھر تم اس کتاب کی مانند کوئی ایک سورت بنا کے لے آؤ جو کم از کم متذکرہ بالا تین صفات سے متصف ہو اور ہم تم میں سے کسی ایک کو اس کا مکلف نہیں ٹھہراتے کہ وہ تنہا اس کام کو کرے بلکہ ہم تمہیں دعوت دیتے ہیں کہ تم جن جن لوگوں کو اپنی مدد کیلئے بلا سکتے ہو، بلا لو۔ تم نے آج تک جن کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے اور جن سے تم مرادیں مانگتے ہو اور جن کی شفاعت پر اعتماد کی وجہ سے تمہیں اللہ کے دین کی طرف آنا گوارہ نہیں بلکہ اسی اعتماد کے باعث تم آخرت کو بھی خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں ہو۔ ایک طرف یہ کام تمہارے لئے نہایت سہل ہونا چاہئے کیونکہ اگر بقول تمہارے اس قرآن کریم کو محمد ﷺ نے خود لکھ لیا ہے تو وہ بھی تمہاری طرح ایک عرب ہیں، قریشی ہیں، مکے کے رہنے والے ہیں، تمہاری طرح انہیں بھی کہیں حصول علم کے مواقع میسر نہیں آئے۔ ماحول نے تمہیں بھی اور انہیں بھی ایک جیسا معلومات کا خزانہ بہم پہنچایا ہے۔ اگر وہ تنہا ایسی حیرت انگیز کتاب لکھ سکتے ہیں تو تم ہزاروں مل کر اور پھر تمام غیبی قوتوں کو ساتھ ملا کر ایسی کتاب نہیں اس جیسی ایک سورت بنانے سے کیسے عاجز رہ سکتے ہو اور دوسری یہ بات کہ قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کی تنقید نے تمہیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ تمہارے پاس ان کے دلائل کا کوئی جواب نہیں۔ لے دے کے یہ ایک دلیل ہے جسے تم الزام کے طور پر

Marfat.com

استعمال کرتے ہو اور اسی پر تمہارے تمام تر انکار اور کفر کی عمارت کھڑی ہے اور اللہ کے علاوہ جن جن کو تم نے خدائی کے منصب پر فائز کر رکھا ہے ان کی خدائیاں بھی اسی پر قائم ہیں۔ تم اپنے موروثی دین کو سچا ثابت کرنے کیلئے زندگی کا ہر دکھ اٹھانے کیلئے تیار ہو جبکہ یہ بات ایسی ہے جس میں نہ تمہارے لئے کوئی خطرہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔ ایک سورت تین جملوں سے تشکیل پا جاتی ہے۔ جیسے سورۃ الکوثر۔ تو تین جملے فصیح عربی میں ڈھال لینا اور قرآنی خصوصیات کا حامل بنا دینا تمہارے لئے کیا مشکل ہے۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کر سکو تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ تم اس بات میں سچے نہیں ہو کہ اس کتاب کو محمد ﷺ نے خود لکھا ہے اور یہ انسانی کاوشوں سے وجود میں آئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک ایسی قوم جس نے آنحضرت ﷺ کی نبوت اور قرآن کریم کی حقانیت کو اپنے لئے ایک چیلنج سمجھ لیا ہے اور وہ اس کیلئے ہر انتہا تک جانے کا فیصلہ کر چکی ہے اور اس کیلئے اس نے متعدد دفعہ نہایت خطرناک جنگوں کو بھی دعوت دی ہے لیکن جب اسے کہا جاتا ہے کہ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ یہ قرآن منزل من اللہ نہیں تو تم اس جیسی کتاب نہیں ایک سورت ہی بنا لاؤ لیکن تم اس کی بھی ہمت نہیں کرتے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ اگلی آیتِ کریمہ میں قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝

﴿یونس : ۳۹﴾

(بلکہ یہ لوگ جھٹلا رہے ہیں اس چیز کو جو ان کے علم کے احاطے میں نہیں آئی اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی۔ اسی طرح ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے۔ پس دیکھئے کیسا ہوا انجام ظالموں کا۔)

انکار کا اصل سبب

اس آیتِ کریمہ میں ان کے انکار کا سبب بیان فرمایا گیا ہے۔ آیتِ کریمہ کے الفاظ سے جو بات مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ جب ان سے یہ فرماتے ہیں کہ میں تمہاری طرف اللہ کا نبی ہو کے آیا ہوں اور اللہ نے اپنا کلام مجھ پر قرآن کریم کی شکل میں اتارا ہے اور فرشتہ میرے دل پر قرآن کریم لے کر اترتا ہے اور مزید یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ تنہا تمام کائنات کا خالق و مالک بھی ہے اور مدبر بھی۔ کائنات کا پورا نظام اس کے ہاتھ میں ہے وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ کارکنان قضاء وقدر اس کے احکام سے سرتابی نہیں کرتے۔ زندگی اور موت اسی کے قبضے میں ہے۔ جس طرح تم ایک دن موت کا شکار ہو جاؤ گے اسی طرح کائنات پر بھی ایک دن موت طاری ہوگی۔ پھر ایک طویل عرصہ کے بعد سب کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور انہیں ایک میدان میں لے جایا جائے گا جہاں اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہوگی۔ وہاں انہیں زندگی کے ایک ایک لمحے اور ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ اس کے نتیجے میں جنت یا جہنم سے واسطہ پڑے گا۔ اسی طرح وہ تمام امور جن کا تعلق عالمِ غیب سے ہے، وہ تمام اخلاقی مسلمات جو قوموں کے عروج و زوال میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں ایسے ہی اور امور جب ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو چونکہ یہ باتیں ان کے علم سے ماوراء، ان کی ذہنی سطح سے بلند اور ان کی قوت ادراک سے باہر ہیں تو وہ انہیں ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ ہمیں یہ باتیں سمجھ نہیں آتیں، یہ تم کیسی خلافِ عقل باتیں کرتے ہو۔ اس طرح سے ان کا انکار جب آہستہ آہستہ مخالفت اور مقاومت سے ہوتے ہوئے شقاوت تک جا پہنچا تو پھر ترغیب نے ترہیب کی صورت اختیار کر لی اور آنحضرت ﷺ نے انہیں انذار کرتے ہوئے فرمایا: کہ اگر تم نے حق سے انحراف اور اللہ کے رسول کی مخالفت کا رویہ ترک نہ کیا تو تم پر بھی پہلی قوموں کی طرح اللہ کا عذاب آ سکتا ہے اور اگر کچھ لوگ اس عذاب آنے سے پہلے موت کا شکار ہو جائیں گے تو قیامت کے عذاب سے بہر حال انہیں واسطہ پڑے گا۔ یہ بات چونکہ ان کے ہر چھوٹے بڑے پر گراں گزرتی ہے اور ان کا طبقۂ امراء بطور خاص اسے اپنے لئے چیلنج سمجھتا ہے تو وہ بار بار نبی کریم ﷺ سے الجھتا ہے کہ تم جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو، آخر وہ ہم پر آ کیوں نہیں جاتا۔ ہم نے تمہاری مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ آخر وہ عذاب ہم پر وارد کیوں نہیں ہو جاتا اور جہاں تک قیامت کے عذاب کا تعلق ہے وہ تو ہمارے لئے اس لئے قابل قبول نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قیامت کبھی نہیں آئے گی اور یہ کائنات اسی طرح محوِ سفر رہے گی۔ اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے فرمایا: کہ اللہ کے دین کو قبول کرنے میں ان کیلئے جو چیز رکاوٹ بن گئی ہے وہ یہ ہے کہ دین کی بیشتر باتیں ان کی گرفت میں نہیں آتیں۔ اللہ کی شریعت کے احکام اگرچہ عقل کے عین مطابق ہیں لیکن خود اللہ کی ذات، اس کی صفات، وحی الٰہی کی حقیقت، روح کی کارفرمائی، فرشتوں کا وجود، اخلاقی مسلمات، قوموں کے عروج و زوال کے اخلاقی اسباب، قیامت اور اس کی تفصیلات، عالمِ بالا اور عالمِ غیب کی خبریں ان میں سے کوئی چیز بھی عقل کے تابع نہیں۔ ان پر ایمان لانا اللہ کے نبی پر ایمان

Marfat.com

لانے کا نتیجہ ہے۔ اور جہاں تک تعلق ہے ان پر عذاب آنے کا اس کا دارومدار بھی اس بات پر ہے کہ پہلے اللہ کی صفات پر ایمان لایا جائے اور مزید یہ بات کہ یہ لوگ چونکہ خوگرِ پیکرِ محسوس بن چکے ہیں۔ یہ جب تک کسی چیز کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ لیتے اس وقت تک ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتے۔ اس لئے عذاب کے بارے میں بھی وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک اس کا نزول ہو نہیں جاتا یا اس کا کوئی حصہ نازل نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس پر یقین کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ لیکن یہ عقل کے پرستار اتنی بات نہیں سمجھتے کہ جب اللہ کا عذاب نازل ہو جائے گا اس کے بعد اس کے ماننے کا کیا فائدہ۔ کیونکہ عذاب کوئی ایسی چیز نہیں جسے آدمی چھو سکے یا اس سے محظوظ ہو سکے۔ وہ تو ایک تباہی ہے جس کے بعد سنبھل جانے کا کوئی موقع نہیں۔ پہلی قوموں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ انبیاء کرام نے بار بار انہیں وارننگ دی لیکن انہوں نے عذاب کی ہر دھمکی کو مذاق میں اڑا دیا۔ نتیجۃً اس کا بالآخر یہ ہوا کہ وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ ان کا حوالہ دے کر فرمایا جا رہا ہے کہ وہ لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں جو ان حقائق کو جاننے کی بجائے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس بات پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے کہ اللہ کے نبی دنیا میں ہدایت دینے کیلئے آتے ہیں، عذاب کیلئے نہیں آتے۔ عذاب تو ہدایت کو رد کر دینے اور اللہ کے نبی کو قتل کرنے کے منصوبے باندھنے پر آتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ وہ اپنے اعمال پر غور کریں اور ان اعمال سے توبہ کریں جو عذاب کا سبب بن سکتے ہیں۔ لیکن پہلی قوموں نے بھی یہی حماقت کی اور بالآخر تباہ ہو گئیں اور مشرکینِ مکہ بھی اسی حماقت پر تلے ہوئے تھے لیکن پروردگار ایک طرف سے انہیں عذاب سے ڈراتا ہے اور دوسری طرف امم سابقہ کے انجام کا حوالہ دے کر انہیں اپنی اصلاح کی دعوت دیتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿یونس : ۴۰﴾

(اور ان میں سے وہ بھی ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔ اور تیرا پروردگار فساد پھیلانے والوں کو خوب پہچاننے والا ہے۔)

عذاب لانے سے متعلق اللہ کا قانون

گزشتہ آیتِ کریمہ پڑھنے کے بعد ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو ستانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ ایمان کی دھمکیاں بھی ان کیلئے تمسخر کا سامان بن کے رہ گئی تھیں۔ اس ذاتِ گرامی کی بے ادبی کرتے ہوئے انہیں کبھی تامل نہیں ہوتا تھا جس کے قدموں کی دھول بھی کائنات سے زیادہ قیمتی تھی۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی تمام بداطواریوں کے باوجود ان پر عذاب نازل نہیں کیا گیا۔ تاریخ یہ بھی جانتی ہے کہ مشرکینِ مکہ نے نبی کریم ﷺ کے قتل کے نہ صرف منصوبے باندھے بلکہ اسے عمل کی صورت دینے میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہجرت کی رات آپ ؐ کے گھر کا گھیراؤ ہو چکا تھا۔ اگر اللہ کو منظور نہ ہوتا تو بظاہر آپ ؐ کے بچ نکلنے کے اسباب صفر کے درجے میں تھے۔ غارِ ثور تک آپ کا کھوج لگایا گیا اور مکہ سے میلوں باہر تک آپ ؐ کا تعاقب کیا گیا۔ مکے کے اندر بھی بارہا آپ کی جان لینے کی کوشش کی گئی۔ ان کی ایک ایک بات ان کی جان کو مباحکر دینے کیلئے کافی تھی۔ لیکن پروردگار نے ان سے رحمت کا سلوک فرمایا اور ان کے مستحق ہونے کے باوجود ان پر عذاب نازل نہیں فرمایا۔ اس آیتِ کریمہ میں اس کی وجہ بیان فرمائی گئی ہے جس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کے بارے میں اللہ کا قانون کیا ہے۔ وجہ یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ مکہ معظمہ میں اگرچہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو بے حد ستایا گیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ ؐ پر ایمان لانے کا سلسلہ یکسر مسدود کبھی نہیں ہوا۔ اس کی رفتار کبھی مدھم رہی، کبھی تیز اور کبھی نہ ہونے کے برابر، لیکن مکمل انقطاع کبھی نہ ہو سکا اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ جس قوم کی طرف اللہ کا رسول مبعوث ہوتا ہے اگر وہ قوم مکمل طور پر ایمان لانے سے انکار کر دے اور اللہ کے نبی کے قتل کے درپے ہو جائے تو تب اس پر عذاب آ جاتا ہے۔ مشرکینِ مکہ نے آپ کے قتل کے منصوبے ضرور باندھے اور ان کے بڑے بڑے لوگوں نے عام لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے بہت حد تک روکا بھی۔ لیکن اس کے باوجود دھیرے دھیرے یہ سلسلہ جاری رہا۔ نبی کریم ﷺ کے ہجرت فرمانے کے بعد بھی اندر ہی اندر خفیہ طریقے سے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ معاہدہ حدیبیہ کے بعد 70 نوجوان ساحلِ سمندر پر اپنے ایمان کی حفاظت کیلئے جا بیٹھے اور انہوں نے قریش کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس آیتِ کریمہ میں اسی خاموش ایمان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ ان پر عذاب نہ بھیجنے کا سبب یہ ہے کہ ان میں اگر ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو کسی طور بھی ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہیں ایسے لوگ بھی ہیں جو آپ ؐ پر ایمان لاتے ہیں، چاہے خفیہ طریقے سے لاتے ہیں۔ اور تیرا رب چونکہ مفسدین کو زیادہ جانتا ہے اس کے علم میں ہے کہ انہی مفسدین میں سے مومنین نکلیں گے، جس طرح دودھ بلونے والا اس وقت تک دودھ بلوتا رہتا ہے جب تک مکھن کی آخری پھٹکی بھی نکالنے میں کامیاب نہیں ہو جاتا۔ اس طرح پروردگار بھی کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں بھیجتا جب تک اس قوم کے آخری آدمی سے بھی مایوسی یقینی نہیں ہو جاتی۔

Marfat.com

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ
فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ
وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ
تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ
اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ
النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ
كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ؕ قَدْ
خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَاِمَّا
نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ
ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا
جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ
يَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ
لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ
اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ
اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ

Marfat.com

الْمُجْرِمُونَ ﴿٥٠﴾ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنتُم بِهِ ۚ آلْآنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِ
تَسْتَعْجِلُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ
هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَنبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ
قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿٥٣﴾

(اگر وہ آپؐ کو جھٹلاتے ہیں تو آپؐ کہہ دیجئے کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل۔ تم بری الذمہ ہو میرے عمل سے۔ اور میں بری الذمہ ہوں تمہارے عمل سے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو آپؐ کی بات کان لگا کر سنتے ہیں تو کیا آپؐ بہروں کو سنائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں۔ اور ان میں ایسے بھی ہیں جو آپؐ کی طرف دیکھتے ہیں تو کیا آپؐ اندھوں کو راہ دکھائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور جس روز اللہ انہیں جمع کرے گا (اس دن وہ محسوس کریں گے) کہ گویا وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر دن کی ایک گھڑی۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانیں گے (تب حقیقت کھلے گی) کہ نامراد ہوئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت حاصل کرنے والے نہ بنے۔ یا ہم آپؐ کو اس کا کچھ حصہ دکھا دیں گے جس کا ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا ہم آپؐ کو اٹھا لیں گے۔ ہر حالت میں ان کا لوٹنا ہماری ہی طرف ہوگا۔ پھر اللہ گواہ ہے اس پر جو وہ کرتے ہیں۔ ہر امت کیلئے ایک رسول ہے، پس جب آ جاتا ہے ان کا رسول تو ان کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ چکا دیا جاتا ہے اور وہ ظلم نہیں کئے جاتے۔ وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ عذاب کا وعدہ، اگر تم سچے ہو۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے میں مالک نہیں ہوں اپنے آپ کیلئے، نقصان کا نہ نفع کا۔ مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کیلئے میعاد مقرر ہے۔ جب ان کی مقرر میعاد آ جائے گی تو نہ وہ ایک لحہ پیچھے رہ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔ اے پیغمبر کہہ دیجئے ذرا غور تو کرو کہ اگر آ جائے تمہارے پاس اس کا عذاب راتوں رات یا دن دیہاڑے (تو تم کیا کر لو گے) وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے مجرم جلدی مچا رہے ہیں۔ کیا جب عذاب نازل ہو جائے گا، تب اس پر ایمان لاؤ گے (فرشتے انہیں کہیں گے) اب تم تو اس عذاب کیلئے بڑی جلدی مچایا کرتے تھے۔ پھر ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ چکھو دائمی عذاب کا مزہ۔ تمہیں اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کمایا کرتے تھے۔ اور وہ آپؐ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ بات واقعی سچ ہے۔ کہہ دیجئے ہاں، میرے رب کی قسم۔ بیشک وہ حق (اور ہو کے رہنے والی) ہے۔ اور تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔)

Marfat.com

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾
(اگروہ آپؐ کو جھٹلاتے ہیں تو آپؐ کہہ دیجئے کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل۔ تم بری الذمہ ہو میرے عمل سے۔ اور میں بری الذمہ ہوں تمہارے عمل سے۔) ﴿یونس:۴۱﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

یہ آیتِ کریمہ اپنے اندر شعلہ و شبنم کا امتزاج رکھتی ہے۔ اس آیت میں ایک طرف نبی کریم ﷺ سے براہ راست خطاب ہے اور دوسری طرف آپؐ کی تکذیب کرنے والوں سے بالواسطہ خطاب ہے۔ نبی کریم ﷺ سے خطاب فرماتے ہوئے آپؐ کے دردمند قلبِ مبارک پر رحمت کی شبنم ٹپکائی جارہی ہے۔ یعنی آپؐ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپؐ نے ہمت سے بڑھ کر اللہ کے دین کی دعوت ان کافروں تک پہنچائی ہے۔ اس راستے میں ہر طرح کے دکھ اٹھائے، دل و دماغ پر کیسی کیسی تکلیف دہ باتوں کے زخم لگے۔ آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپؐ کے فرقِ مبارک پر نعوذ باللہ راکھ پھینکی گئی۔ بایں ہمہ آپؐ نے دعوتِ الی اللہ میں کبھی کمی نہ آنے دی۔ اس کے باوجود اگر انکار کرنے والے اپنے انکار پر اڑے ہوئے ہیں اور تکذیب کرنے والے اپنے رویے پر شرمانے کیلئے تیار نہیں ہیں تو آپؐ کو ہرگز دل گرفتہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آپؐ کے سپرد جو کام کیا گیا تھا اس میں آپؐ نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ رہا ان کا ہدایت قبول نہ کرنا تو اس کی جوابدہی انہیں کرنا ہوگی۔ اس لئے آپؐ کو ہرگز کوئی تشویش نہیں ہونی چاہئے۔

مشرکین کو تنبیھہ

البتہ آپؐ کو ان تکذیب کرنے والوں سے صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ تم جو میری مخالفت پر کمربستہ ہوگئے ہو اور میری ہمدردی میں ڈوبی ہوئی دعوت بھی تمہارے دلوں میں اترنے کا نام نہیں لیتی اور تم مجھے دیکھتے ہو کہ تمہارا ہدایت قبول نہ کرنا مجھے ہر درجہ مغموم کردیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تمہارے ہدایت قبول نہ کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تمہارے اعمال کی بازپرس پروردگار مجھ سے نہیں فرمائے گا اور میرے اعمال کی جوابدہی تمہیں کرنے کیلئے نہیں کہا جائے گا۔ تم اپنے اعمال کے جوابدہ ہو اور میں اپنے اعمال کا جوابدہ ہوں۔ بظاہر ان الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جو تسلی دی جارہی ہے، شاید یہ بھی اسی کا حصہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں آنحضرت ﷺ کی تسلی کا کوئی پہلو نہیں۔ اس کا مضمون تو پہلے جملے میں مکمل ہوگیا۔ اس میں درحقیقت کافروں سے ایک ایسی بات کہی جارہی ہے جو شعلہ سے بھی بڑھ کر بھسم کردینے والی ہے اور یہ بات ہمیشہ قوموں کیلئے عذاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ہے۔ اسے قرآن کریم کی زبان میں براءت کہا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو جب اپنی قوم کو سمجھاتے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر جاتا ہے اور قوم اس کی دعوت کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتی بلکہ ان کے انکار کی شدت اور اذیت رسانی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے تو پھر ایک وقت آتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے قوم کیلئے آخری تنبیہات شروع ہوجاتی ہیں اور اگر اس پر بھی قوم کان نہیں دھرتی تو پھر عموماً اللہ کا عذاب آجاتا ہے۔ یہاں بھی ایسی ہی تنبیہ کی جارہی ہے کہ میں تمہارے لئے ہدایت و رحمت کا پیغمبر بن کر آیا ہوں۔ میں جس طرح تمہارے لئے سرچشمۂ ہدایت اور منارۂ نور ہوں جس سے تمہیں اپنی تاریکی روشن کرنے کیلئے روشنی میسر آسکتی ہے۔ اسی طرح میری ذات تمہارے لئے امان اور سپر بھی ہے۔ جب تک تمہارے اندر ہوں اور تمہیں اللہ کے دین کی طرف بلا رہا ہوں تمہارے انکار کے باوجود اللہ کا عذاب تم سے رکا ہوا ہے لیکن میری طرف سے اعلانِ براءت کے بعد اللہ کی طرف سے عذاب کے آنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اب آخری وقت شاید دور نہیں۔ کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کو ہجرت کا حکم دے سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کا قانون یہ ہے کہ جب اس کا پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے اپنے دعوتی مستقر اور امتِ دعوت کو چھوڑ کر کسی نئی بستی اور نئی سرزمین کی طرف ہجرت کرجاتے ہیں تو پھر عموماً اللہ کی طرف سے عذاب آجاتا ہے۔ جیسے کہ مہذب قوموں کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے۔ یہاں بھی اسی آخری حادثے کی طرف توجہ دلا کر کافر قوم کو اپنا رویہ بدلنے پر آمادہ کیا جارہا ہے۔

Marfat.com

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۴۲، ۴۳﴾

(ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو آپ ؐ کی بات کان لگا کر سنتے ہیں تو کیا آپ ؐ بہروں کو سنائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوں۔ اوران میں ایسے بھی ہیں جو آپ ؐ کی طرف دیکھتے ہیں تو کیا آپ ؐ اندھوں کو راہ دکھائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ دیکھتے ہوں۔)

دو مفہوم

ان دونوں آیتوں کے مفسرین کرام نے دو مختلف مفہوم بیان کئے ہیں اور آیات کے الفاظ میں دونوں کیلئے گنجائش ہے۔ پہلا مفہوم یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں دو قسم کے انسانوں کا تذکرہ ہے اور اس سے مقصود آنحضرت ﷺ کو تسلی دینا بھی ہے اور اللہ کی سنت کا ذکر کرنا بھی۔ وضاحت اس کی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ مشرکینِ مکہ کے تیزی سے اسلام قبول نہ کرنے بلکہ ہر طرح کی مخالفت پر تل جانے سے آپ ؐ کو دل گرفتہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ آپ ؐ دیکھ رہے ہیں کہ اہلِ مکہ نے مکمل طور سے آپ ؐ کی دعوت کا بائیکاٹ نہیں کیا بلکہ ان میں ایک معقول تعداد ایمان لانے والوں کی بھی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی طبیعت میں نیکی کا میلان اور سلامتیِ فکر دوسروں کی نسبت زیادہ تھی۔ ان کے دل و دماغ کی زمین ایسی بنجر نہیں ہوئی تھی کہ اس میں ہدایت و نصیحت کا کوئی پودا جڑ نہ پکڑ سکتا۔ چنانچہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسی نے جلدی اور کسی نے دیر سے اسلام کی دعوت کو قبول کرلیا۔ رہے معاندین اور مخالفین تو ان کے بارے میں آپ ؐ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قبولیتِ حق کی استعداد ان کے اندر مرچکی ہے۔ وہ بظاہر سنتے ہیں لیکن سماعِ قبول سے محروم ہیں۔ حواس کے بعد عقل کا مقام ہے جو کسی چیز کے قبول یا عدمِ قبول کا فیصلہ کرتی ہے لیکن جس شخص کے حواس عقل کے سپرد معلومات کرنے سے عاجز ہو جاتیں اور یا وہ معلومات سپرد کرنے میں قدم قدم پر غلطی کریں تو ان کی عقل بھی بیکار ہو کے رہ جاتی ہے۔ ان لوگوں کا حال ایسا ہی ہے کہ وہ سماعت سے اس طرح محروم ہوئے ہیں کہ ان کی عقل نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔

اسی طرح ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو قوتِ سماعت کے ساتھ ساتھ بصیرت و بصارت سے بھی بہرہ مند ہیں۔ چنانچہ یہی وہ لوگ ہیں جو آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو بصارت سے بھی محروم ہیں اور بصیرت سے بھی۔ تو آپ ؐ ایسے اندھے لوگوں کو کس طرح ہدایت کا راستہ دکھا سکتے ہیں اس لئے جو لوگ حقیقی سماعت اور حقیقی بصیرت رکھتے تھے وہ آپ ؐ پر ایمان لانے سے دور نہیں رہے، اللہ نے ان کو ایمان کی دولت دی اور آج وہ آپ ؐ کے دائیں بائیں اسلام کی خدمت بجا لا رہے ہیں اور یہ بات آپ ؐ کے اطمینان کیلئے کافی ہونی چاہئے۔ رہے وہ لوگ جو سماعِ قبول سے بھی محروم ہیں اور دل کی بصیرت سے بھی۔ وہ بیشک آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان کے دل کا نور بجھ چکا ہے۔ تو وہ اگر ایمان نہیں لاتے تو ان کا ایمان نہ لانا اللہ کے قانون کا عین تقاضا ہے۔ اور ایسے لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ ہدایت کا راستہ اختیار کریں گے یہ تو اس دیئے سے روشنی کی امید رکھنے کے برابر ہے جس کا تیل ختم ہو چکا ہو۔

دوسرا مفہوم ان آیات کا بعض مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ آپ ؐ پر ایمان نہ لانے والوں میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو آپ کی مجلسوں میں حاضر ہوتے ہیں اور جب آپ ؐ کوئی بات فرماتے ہیں تو وہ آگے بڑھ بڑھ کر بڑی توجہ سے اسے سنتے ہیں اور جب آپ ؐ گفتگو فرماتے ہیں تو آپ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہیں۔ ان کی ان حرکتوں سے بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سن بھی رہے ہیں اور غور و فکر بھی کر رہے ہیں حالانکہ وہ سماعِ قبول سے بھی محروم ہیں اور بصیرت سے بھی عاری ہیں چونکہ وہ ان دونوں صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہیں اس لئے ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ آپ کی دعوت کو قبول کر کے ایمان لے آئیں گے کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ان لوگوں کے اس رویئے سے آپ ؐ کو دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ لوگ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اللہ کے قانون کی گرفت میں آچکے ہیں۔ چنانچہ اگلی آیتِ کریمہ میں پروردگار نے اپنا وہ قانون بیان فرمایا ہے۔

Marfat.com

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْــًٔا وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۴۴﴾

(یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں۔)

اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت

اللہ کا قانون یہ ہے (جس کا پہلے بھی تذکرہ ہو چکا ہے) کہ وہ نہ زبردستی کسی کو راہ راست پر چلاتا ہے اور نہ زبردستی کسی کو گمراہ کرتا ہے۔ اس نے انسان کو معمولاتِ زندگی کی ادائیگی کیلئے حواس عطا فرمائے اور صحیح اور غلط اور اچھائی اور برائی میں امتیاز کیلئے عقل کا جوہر عطا فرمایا۔ اور اچھائی اور برائی کے معاملے میں جن چیزوں کا تعلق عقل سے ماورا حقائق کے ساتھ تھا ان میں وحیِ الٰہی کی رہنمائی عطا فرمائی، پیغمبر مبعوث فرمائے اور کتابیں نازل فرمائیں۔ اور اللہ کے پیغمبروں کو باطنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایسی ظاہری خوبیوں سے بھی نوازا اور اللہ سے تعلق کی گہرائی کے ساتھ ساتھ بندوں سے تعلقات میں بھی ایسی حیرت انگیز نظافتِ فکر، طہارتِ عمل، ایثارِ طبیعت اور قناعت وکفایت سیبمرہ مند فرمایا جنہیں دیکھ اور سمجھ کر عقل بڑی آسانی سے فیصلہ کرسکتی ہے کہ رسالت کا دعویٰ کرنے والا اپنے دعویٰ میں کہاں تک سچا ہے کیونکہ انسان میں جس طرح معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح انسانوں کو پرکھنے کی بھی ذہانت اور بصیرت موجود ہے۔ چنانچہ ان بنیادی صلاحیتوں کے عطا کرنے کے بعد اسے آزاد چھوڑ دیا گیا کہ حق کو اختیار کرو یا باطل کو۔ خیر کے راستے پر چلو یا شر کے راستے پر۔ اس دنیا میں تم پر کسی طرح کا جبر نہیں کیا جائے گا بلکہ جو راستہ بھی اختیار کرو گے ہم اس کیلئے آسانیاں مہیا کرتے رہیں گے۔ چنانچہ جو آدمی حق کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اللہ سے توفیق کا طالب ہوتا ہے تو اللہ کی توفیق اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔ وہ جیسے جیسے نیکی کی طرف بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے وہ اس کیلئے راستہ کھولتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اسے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتی ہے۔ اسی طرح جو شخص باطل کے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو اللہ کے نبی اور ان کے پیروکار اہل حق اپنی تبلیغ و دعوت سے ہر چند انہیں راہ راست کی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اس پر کسی طرح کی زبردستی نہیں کرتا۔ اگر وہ سب کی اصلاحی کوششوں کو رد کر کے باطل ہی کے راستے پر بڑھنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو پروردگار اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتا ہے جو اس کیلئے باطل کے راستوں پر رہنمائی دیتا ہے اور ہر غلط راستے اور ہر بری جگہ پر اسے کھینچے لئے پھرتا ہے اور اس وقت تک اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا جب تک اس کی عاقبت پوری طرح تباہ نہیں کر دیتا۔

یہ ہے وہ اللہ کا قانون جس سے انسانوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ نیک لوگوں کو بھی اور برے لوگوں کو بھی۔ لیکن جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، تو اسے یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ خود ہی گمراہ کرنا اور پھر اس پر سزا دینا اور آخرت میں جہنم رسید کر دینا یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔ لیکن اگر پیشِ نظر اللہ کا یہ قانون رہے کہ اس نے راہِ راست اختیار کرنے کیلئے اپنے بندوں کو عقل سے بھی نوازا اور وحیِ الٰہی سے بھی۔ لیکن جو شخص ان قوتوں سے کام لینے کی بجائے نفس کی پیروی اور شیطان کے اتباع پر اصرار کرتا ہے تو پھر ظلم یہ نہیں کہ اسے گمراہ ہونے کیلئے کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے یہ تو اس کے فیصلے کا عین تقاضا ہے۔ البتہ جب اس کے فیصلے اور اس کی مرضی کے خلاف اسے نیکی کے راستے پر چلنے کیلئے مجبور کیا جاتا تو یہ یقیناً اس پر ظلم ہوتا اور اللہ اپنے بندوں پر چونکہ ظالم نہیں اس لئے نہ وہ نیکی کیلئے جبر کرتا ہے اور نہ وہ برائی کیلئے مجبور کرتا ہے۔ انسان کے سامنے دونوں راستے کھلے ہیں۔ وہ جس کو چاہے اختیار کرے۔ کارکنانِ قضاء وقدر اس کیلئے ویسے ہی آسانیاں مہیا کرتے چلے جائیں گے۔

وَیَوْمَ یَحْشُرُھُمْ کَاَنْ لَّمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَۃً مِّنَ النَّھَارِ یَتَعَارَفُوْنَ بَیْنَھُمْ ؕ قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰہِ وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ ۝ ﴿یونس : ۴۵﴾

(اور جس روز اللہ انہیں جمع کرے گا (اس دن وہ محسوس کریں گے) کہ گویا وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر دن کی ایک گھڑی۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو پہچانیں گے (تب حقیقت کھلے گی) کہ نامراد ہوئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا اور وہ ہدایت حاصل کرنے والے نہ بنے۔)

مشرکینِ مکہ کی ایک اور فکری گمراہی

مشرکینِ مکہ کے افکارِ فاسدہ پر تنقید ہو رہی ہے۔ ان کی ایک اور فکری گمراہی اور کج روی کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جسے ہم دو پہلوؤں سے زیرِ بحث لا

Marfat.com

سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس دور کا بگڑا ہوا انسان اولاً تو قیامت کا انکار کرتا تھا اور اگر کبھی بے دلی سے اقرار کرتا تو اس سے متاثر ہونے کی بجائے یہ کہتا کہ ہم ابھی سے اس آخرت کو اپنے دماغوں پر سوار کرلیں جس کے بارے میں معلوم ہی نہیں کہ اس کے آنے میں کتنی صدیوں کا فاصلہ حائل ہے۔ انسانی سفر پر صدیاں بیت گئیں اور قیامت کے آثار کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مزید کتنی صدیاں انتظار کرنا ہوگا۔ آخر اس کے انتظار میں کون بیٹھا رہے۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ تھا کہ قیامت کے دن کی جوابدہی ایک مذاق بن کے رہ گئی تھی۔ اعمال کا تول ایک افسانہ معلوم ہوتا تھا۔ جنت جہنم کے واقعات لوگوں کی عقلوں پر گراں گزرتے تھے۔ لوگ عموماً جھلا کر یہ بات کہتے کہ:

جب حشر کا دن آئے گا
اس وقت دیکھا جائے گا

اور مسلمانوں میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس طرح کا تصور رکھتے ہیں۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت بھی اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو زندگی کے معاملے میں ہرگز سنجیدہ نہیں۔ ایسی باتیں ان کی سوچ پر گراں گزرتی ہیں کہ کبھی یہ عیش و عشرت کا زمانہ سمٹنے والا بھی ہے۔ وہ دنیا کی لذتوں میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ اس کی بے ثباتی کی طرف کبھی ان کا دھیان نہیں جاتا۔ جنازے ان کے سامنے اٹھتے ہیں، ایک سے ایک بڑا حادثہ ہوتا ہے، ہر سو عبرت کے نمونے بکھرے ہوئے ہیں لیکن رنگ و بو نے انہیں اس طرح اندھا کر رکھا ہے کہ وہ کبھی یہ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کرتے کہ جس فریبِ نظر پر ہم ریجھے ہوئے ہیں اس کی عمر چند روز سے زیادہ نہیں۔

ان دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کیلئے یہ فرمایا جارہا ہے کہ جس دن میدانِ حشر میں اللہ لوگوں کو جمع کرے گا اور پھر وہ پیچھے پلٹ کر دنیا میں گزری ہوئی زندگی پر ایک نظر ڈالیں گے اور اپنے سامنے آخرت کی بے پایاں زندگی دکھائی دے گی تو جس زندگی کو وہ اس قدر دراز سمجھتے تھے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی گوارا نہ تھا اور جس کے عیش و عشرت پر اس قدر مفتون تھے کہ کبھی انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ عیش و عشرت کا یہ زمانہ کبھی ہم سے چھوٹ بھی سکتا ہے یا ہم اس زمانے سے بھی الگ کئے جاسکتے ہیں۔ اب میدانِ حشر میں دنیا میں گزاری ہوئی زندگی اور وہاں کی عشوہ طرازیاں انہیں ایک فریب دکھائی دیں گی۔ سالہا سال میں گزرنے والی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک لمحہ محسوس ہوگی اور وہ اپنے دائیں بائیں پھیلی ہوئی خلقِ خدا کو دیکھیں گے تو ہر چہرہ شناسا دکھائی دے گا۔

قرآن کریم نے ان حقائق کو بعض مثالوں سے اسی لئے واضح فرمایا ہے تاکہ قیامت سے پہلے آدمی زندگی کی حقیقت کو سمجھ لے اور قیامت کی حقیقت کا بھی ادراک کرلے۔ اصحابِ کہف کا قصہ بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے ہمیں بتایا کہ جب تقریباً تین صدیاں گزرنے کے بعد غار والے جاگے تو ایک دوسرے سے پوچھا کہ ہم کتنی دیر سوئے رہے تو سب کا خیال تھا کہ ایک دوپہر گزری ہے یا ایک پورا دن گزر گیا، لیکن وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے کہ ہم تین صدیاں گزار چکے ہیں۔ دنیا میں گزری ہوئی تین صدیاں انہیں چند لمحے محسوس ہو رہے تھے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ بھی اسی حقیقت کو واشگاف کرنے کیلئے بیان کیا گیا ہے کہ ایک تباہ شدہ بستی پر جب وہ گزرے تو اللہ نے وہاں ان پر موت طاری کردی۔ سو سال کے بعد انہیں زندہ کیا گیا۔ پوچھا ''كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ'' یہاں کتنی دیر ٹھہرے ہو۔ کہا ایک دن رہا ہوں یا دن کا ایک حصہ۔ اللہ نے فرمایا تم یہاں سو سال گزار چکے ہو۔

ان واقعات سے بتانا یہ مقصود تھا کہ جس آخرت کو تم دور سمجھتے ہو کیونکہ درمیان میں ایک لمبی زندگی حائل ہے جب وہ آخرت آئے گی تو تمہیں دنیا کی زندگی چند لمحوں سے زیادہ محسوس نہیں ہوگی اور دنیا کی جس عیش و عشرت پر آج تم مفتون ہو اور اس سے نکلنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے جب آخرت کی نعمتوں یا اس کی سزاؤں کو دیکھو گے تو تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم کس فریبِ نظر کا شکار تھے۔ تب تم چیختے ہوئے کہو گے کہ وہ لوگ برباد ہوگئے جن لوگوں نے اللہ کی ملاقات یعنی قیامت کو جھٹلایا کیونکہ اصل حقیقت تو قیامت ہی تھی وہی انسان کی حقیقی منزل تھی۔ وہی دنیا میں گزاری ہوئی زندگی کا انعام تھی یا سزا تھی اس کا انکار کرکے یا اسے بھلا کر ہم نے اپنا سب کچھ برباد کردیا اور اس بربادی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ ہم اپنی منزل کا سراغ نہ پاسکے۔

Marfat.com

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۝

(یا ہم آپ کو اس کا کچھ حصہ دکھا دیں گے جس کا ان سے وعدہ کر رہے ہیں یا ہم آپ کو اٹھا لیں گے۔ ہر حالت میں ان کا لوٹنا ہماری ہی طرف ہوگا۔ پھر اللہ گواہ ہے اس پر جو وہ کرتے ہیں۔) ﴿یونس:۴۶﴾

عذاب سے متعلق مشرکین کی غلط فہمی

مشرکینِ مکہ کو قیامت کے آنے سے انکار تھا یا وہ اس کے بارے میں شبہ میں مبتلا تھے اور اگر انہیں اقرار تھا بھی تو ان کے بعض احساسات نے اس اقرار کو بے معنی کر رکھا تھا۔ قرآن کریم میں گزشتہ آیتِ کریمہ میں اسی کی تردید فرمائی ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان کا رویہ قیامت ہی کے بارے میں غلط نہیں بلکہ آپ انہیں جس عذاب سے ڈراتے ہیں انہیں اس عذاب کے آنے میں بھی شبہ ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انکار ہے۔ عذاب کیوں آتا ہے اور کس طرح آتا ہے اس کا ذکر گزشتہ آیات میں ہو چکا ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مشرکینِ مکہ پر ابھی تک عذاب نہ آنے کا سبب یہ تھا کہ وہ اگرچہ اسلام کی مخالفت اور آنحضرت ﷺ کو اذیت دینے میں تمام حدود سے تجاوز کر چکے تھے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں ایمان کی قبولیت کا سلسلہ بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ خاموشی سے گھروں میں بعض لوگ اسلام قبول کر چکے تھے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے تھے اور یہ مخفی قبولیتِ ایمان کا سلسلہ برابر وقفے وقفے سے جاری رہا ہے اور اسی نے اہل مکہ کو اللہ کے عذاب سے بچائے رکھا۔ ان کے قتل کے منصوبوں نے اگرچہ نبی کریم ﷺ کو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا اور ہجرت کے بعد حق و باطل کے معرکے میں بھی وسعت آ گئی۔ پہلے صرف اذیت رسانی تھی اور اسلام کو روکنے کی کوششیں تھیں لیکن اب کفر اجتماعی طور پر اسلام پر یلغار کرنے لگا اور اسلام کو مٹانے کی تدبیریں بروئے کار آنے لگیں۔ لیکن جہاں تک قبولیتِ ایمان کا تعلق ہے اس میں ان حالات کے باوجود مکمل انقطاع نہیں ہوا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ مکہ مکمل عذاب سے کیونکر محفوظ رہے۔ البتہ اس بات کا امکان بہرحال باقی تھا کہ انہیں دنیا میں عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھایا جائے اور مکمل عذاب قیامت پر اٹھا رکھا جائے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں یہی فرمایا گیا ہے کہ یہ بدنصیب لوگ مکمل عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں بلکہ انہوں نے اسے مذاق سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اللہ کی مشیت اپنی سنت کے مطابق اس بڑے عذاب سے تو انہیں محفوظ رکھے گی البتہ عذاب کا ایک آدھ جھٹکا آپ کی زندگی میں ہی انہیں ضرور دیا جائے گا۔ چنانچہ جنگِ بدر اہلِ مکہ کیلئے عذاب کا ایک جھٹکا تھا جس سے انہیں ہوا کا رخ پہچاننے یعنی اللہ کی مشیت کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی تھی۔ جہاں تک بڑے عذاب کا تعلق ہے وہ دنیا میں نہیں آتا بلکہ اس سے واسطہ قیامت کے دن پڑے گا۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ لوگ اگر چھوٹے عذاب سے بچ بھی گئے تو قیامت کے دن انہیں بہرصورت اللہ ہی کے حضور حاضر ہونا ہے۔ وہاں انہیں اس عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا اور تب انہیں اندازہ ہوگا کہ ہم دنیا میں جو کچھ کرتے رہے ہیں اس کا انجام کتنا بھیانک نکلا ہے۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۴۷﴾

(ہر امت کیلئے ایک رسول ہے، پس جب آ جاتا ہے ان کا رسول تو ان کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ چکا دیا جاتا ہے اور وہ ظلم نہیں کئے جاتے۔)

اتمامِ حجت کے بعد فیصلہ کر دیا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کا کام جس طرح اپنے ذمہ لے رکھا ہے اس کو بطور اصول کے ذکر فرمانے کے بعد اہلِ مکہ کو بات سمجھانے کی کوشش فرمائی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ اس نے جہاں جہاں بھی کوئی مخلوق پیدا فرمائی ہے وہاں وہاں اس کی ضرورتوں کا انتظام بھی فرمایا ہے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر مخلوق کی ضرورتیں دو طرح کی ہیں۔ ایک یہ کہ اسے زندگی گزارنے اور زندگی کی بقا کیلئے اسباب دستیاب ہونے چاہئیں۔ اسے غذا ملنی چاہئے، موسم کی شدت سے بچاؤ کا سامان ہونا چاہئے، حوادث سے رکاوٹ کیلئے کوئی پناہ ہونی چاہئے، بیماری کی صورت میں علاج معالجہ کا سامان ہونا چاہئے اور اگر اس مخلوق کے سلسلے کو باقی رکھنا ہے تو توالد و تناسل کی سہولت ہونی چاہئے اور دوسرا یہ کہ ان تمام چیزوں

Marfat.com

کو مہیا کرنے اور اس سے محظوظ ہونے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بھی معلوم ہونا چاہئے۔ یعنی زندگی میں جو جو ضرورتیں پیش آتی ہیں انہیں حاصل کرنے اور پھر ان سے مستفید ہونے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے۔ چنانچہ یہی وہ بات ہے جسے قرآن کریم نے ہدایت سے تعبیر کیا۔ چنانچہ فرعون کے سوال کرنے پر کہ اے موسیٰ تمہارا رب کون ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارا رب وہ اللہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اسے ہدایت عطا فرمائی۔ پرندوں کو اڑنا سکھایا، مچھلیوں کو تیرنا سکھایا، چرند اور درند کو جنگلوں میں دوڑنا اور شکار کرنا سکھایا۔ کلی کو چٹکنا اور پھول کو مہکنا سکھایا، پہاڑوں کو ایستادگی سکھائی اور پودوں کو لہلہانا سکھایا، پانی کو بہنا اور آگ کو بھڑکنا سکھایا، آبشار کو گرنا اور چشمے کو ابلنا سکھایا، غرضیکہ ہر مخلوق کو پیدا کر کے ہی نہیں چھوڑ دیا گیا بلکہ اسے ضروریات مہیا کی گئیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ سکھایا۔ اس کیلئے کہیں جبلت کو رہنما بنایا اور کہیں فطرت سے یہ کام لیا گیا اور کہیں حواس کی کارفرمائی سے تمام ضرورتیں پوری کی گئیں لیکن انسان چونکہ اس کائنات کا گلِ سرسبد، مسجودِ ملائکہ، اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو اس کی ربوبیت کیلئے جہاں باقی حیوانوں کی طرح ضروریات بہم پہنچائیں، اسی طرح ان سے فائدہ اٹھانے کی رہنمائی بھی عطا فرمائی۔ انسان کی زندگی کا تعلق چونکہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت سے بھی ہے اس لئے اگر اسے دنیا کی رہنمائی کیلئے حواس دیئے گئے اور عقل عطا کی گئی تو آخرت کی رہنمائی کیلئے وحیِ الٰہی کا نور بخشا گیا۔ اللہ کے رسول دنیا میں آئے، اللہ نے ان پر کتابیں نازل فرمائیں کیونکہ پروردگار نے دونوں طرح کی رہنمائی اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى بیشک زندگی گزارنے کیلئے رہنمائی دینا ہمارے ذمہ ہے اور بیشک ہمارے لئے آخرت بھی ہے اور دنیا بھی۔ چنانچہ اسی ذمہ داری کی ادائیگی کے تحت اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر علاقے میں اپنے نبی اور رسول بھیجے۔ اس طرح سے انسانوں کی ضرورت کو پورا فرمایا تاکہ قیامت کے دن کوئی آدمی یہ نہ کہہ سکے کہ آپ جن باتوں کو مجھ سے جواب طلب کر رہے ہیں مجھے تو کسی نے ان کی تعلیم نہیں دی تھی۔ آج ہم تفصیل سے نہیں جانتے کہ دنیا کے کس کس خطے میں رسول آئے لیکن قرآن کریم جابجا اس کا ذکر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ہر گروہ میں اپنے رسول بھیجے اور ان پر اتمامِ حجت کیا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت مکہ معظمہ میں نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ نے مسلسل فریضۂ رسالت انجام دے کر ان پر اتمامِ حجت کر دیا۔ اب وہ قیامت کے دن یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔ لیکن اس بات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب کسی قوم میں اللہ کا رسول آ کر اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت کر دیتا ہے یعنی اللہ نے جو ہدایت دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے اسے احسن طریق انجام دے کر اللہ کی طرف سے ہدایت کا حق ادا کر دیا جاتا ہے تو اسے اتمامِ حجت کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس امت کیلئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ پیغمبر کی دعوت کو قبول کرے۔ ایمان لائے اور شریعت کی پابندی کا عہد کرے۔ اب اگر وہ اس میں کوتاہی کرتی ہے یا انکار کر دیتی ہے تو پھر کبھی تو اللہ کی طرف سے دنیا ہی میں ان پر عذاب آ جاتا ہے اور یا قیامت کے دن ان کیمعاملات کا پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا جائے گا۔ یہاں اسی اصول کو بیان فرما کر اہلِ مکہ کو جھنجوڑا گیا ہے کہ تم بار بار عذاب نہ آنے کا سوال کرتے ہو لیکن تمہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں کہ تمہارے اس رویئے کا انجام کیا ہونا ہے۔ اللہ کے رسول کے آ جانے کے بعد تم پر اتمامِ حجت ہو چکا ہے۔ اس کے بعد تو صرف فیصلے کا وقت باقی رہ جاتا ہے اور اللہ کا فیصلہ جتنی دیر اور جتنی طویل مہلت کے بعد آتا ہے اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے ٹھیک کہا:

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ ﴿یونس : ۴۸﴾

(وہ کہتے ہیں کب پورا ہوگا یہ عذاب کا وعدہ، اگر تم سچے ہو۔)

ھدایت سے انکار انسان کو فھم و شعور سے عاری کر دیتا ھے

اس آیتِ کریمہ سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلی یہ بات کہ انسان بھی عجیب واقع ہوا ہے۔ جب یہ بگاڑ کا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اپنے حالات، اپنے احباب اور اپنے گرد و پیش کی دنیا میں اس طرح سمٹ کر رہ جاتا ہے کہ نہ اس پر نصیحت اثر کرتی ہے اور نہ کوئی دلیل اس کے دماغ میں اترتی ہے۔ اللہ کے رسول کی شخصیت سے بڑھ کر کوئی دلآویز شخصیت نہیں ہوتی۔ اس کی گفتگو سے زیادہ کوئی آواز موثر نہیں ہوتی، کسی کی زبان سے اس کی زبان سے بڑھ کر پھول نہیں جھڑتے اور کسی کا کردار اتنا اجلا، اتنا مصفا اور اتنا دل موہ لینے والا نہیں ہوتا جتنا رسول کا ہوتا ہے۔ بایں ہمہ انسانوں کا بگاڑ جب شدت اختیار

Marfat.com

کر جاتا ہے تو وہ ایسی ہمہ گیر کاوشوں سے بھی کوئی تأثر قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ اہلِ مکہ کا بھی حال ایسا ہی ابتر معلوم ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا معجزانہ انداز بھی ان پر مؤثر ہوتا نظر نہیں آتا۔ قرآن کریم کے دلائل بھی ان کے سامنے اپنی تمام اثر آفرینی کھو دیتے ہیں اور وہ بجائے اثر قبول کرنے کے اپنی ہٹ دھرمی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی زبان درازیاں صرف نبی کریم ﷺ تک محدود نہیں تھیں بلکہ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ کے جمع کے صیغے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام صحابہ کرامؓ سے بھی نہ صرف الجھتے تھے بلکہ ان کا مذاق اور تمسخر اڑاتے تھے اور انہوں نے ان کی یہ چھیڑ بنا رکھی تھی کہ تم جو قیامت کے آنے اور کبھی عذاب کے آنے سے ڈراتے رہتے ہو؟ آخر وہ عدہ تمہارا کہاں رک گیا ہے، وہ آنے کا نام کیوں نہیں لیتا۔

ان کا رویہ دیکھ کر بعض دفعہ حیرت ہونے لگتی ہے کہ وہ گوشت پوست کے انسان تھے یا پتھر کے، کہ ان پر نہ نبوت کا جلال اثر کرتا تھا نہ جمال۔ ایک نبی کی بے نفسی، بے لوثی، خیر خواہی، ہمدردی اور غمگساری دشمنوں کے، یہاں بھی ہمیشہ مُسلّم رہی ہے لیکن یہ ایسے ناہنجار تھے کہ یہ انسانیت کا پورا سرمایہ بھی ان پر اثر اندازی سے عاجز رہ جاتا تھا۔ مزید برآں یہ کہ وہ اس بات سے اچھی طرح باخبر تھے کہ اللہ کے رسول دنیا میں ہدایت لے کر آتے ہیں اور رحمت کی نوید سناتے ہیں۔ وہ دنیا کو عذاب دینے کیلئے نہیں بلکہ عذاب سے بچانے کیلئے آتے ہیں۔ لیکن جب کوئی قوم اللہ کی ناراضی کا راستہ اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ انہیں عذاب سے بچانے کیلئے عذاب والے کاموں سے ڈراتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے بارے میں کیا کہیے کہ جو عذاب ہی کو اپنا مطالبہ بنا لیتے ہیں اور وہ اتنی بات نہیں سمجھتے کہ اگر واقعی عذاب آ گیا تو ان کی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی عیش و عشرت کا خرمن بھی نذرِ آتش ہو جائے گا تو اس کے بعد ان کی زندگی کے امکانات کیا ہیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ؕ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ (يونس : ۴۹)

(اے پیغمبر کہہ دیجئے میں مالک نہیں ہوں اپنے آپ کیلئے، نقصان کا نہ نفع کا۔ مگر جو اللہ چاہے۔ ہر امت کیلئے میعاد مقرر ہے۔ جب ان کی مقرر میعاد آ جائے گی تو نہ وہ ایک لمحہ پیچھے رہ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔)

قریش کے مطالبۂ عذاب کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں پروردگار نے قریش کے مطالبۂ عذاب کا نبی کریم ﷺ کو جواب دینے کا حکم فرمایا۔ اور آپؐ نے جس طرح اللہ کی ہدایت کے مطابق جواب ارشاد فرمایا، اس سے اگر ایک طرف عقیدۂ توحید کو جلا ملتی ہے تو دوسری طرف ذاتِ رسالت مآب ﷺ کی حقانیت بھی واضح ہوتی ہے۔ اندازہ فرمائیے کہ قریش مکہ بار بار آپؐ سے عذاب لانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ آپؐ نے انہیں عذاب سے اس لئے ڈرایا تا کہ وہ اللہ کے عذاب کا مستحق نہ بنیں بلکہ ایمان لا کر اس کی رحمتوں کے مستحق بن جائیں لیکن ان نادانوں نے عذاب کو ایک کھیل سمجھا اور اسی کا مطالبہ آپؐ سے بار بار کرنا شروع کر دیا۔ اگر خدانخواستہ کوئی جعلی نبی ہوتا تو وہ ہزار پردوں اور سینکڑوں تاویلوں سے عذاب کی تاویل کی کوشش کرتا اور انداز ایسا اختیار کرتا جس سے اس کی ذاتی عظمت میں اور اضافہ ہو جاتا اور لوگ براہ راست اس سے ڈرنے لگتے اور یہاں حال یہ ہے کہ آپؐ صاف صاف اپنی بے بسی کا اظہار فرما رہے ہیں۔ اپنی تمام شخصی وجاہتوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے صاف اعتراف فرما رہے ہیں کہ میری ذات تو سراسر اللہ کے قبضے میں ہے۔ میں اپنی ذات کیلئے بھی کسی نفع نقصان کا مالک نہیں ہوں کیونکہ اللہ والوں کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی قدرتوں اور عظمتوں کے سامنے اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں اور یہاں تو معاملہ ہی ایسا ہے جس کا سر رشتہ سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ عذاب آنے یا نہ آنے میں اللہ کے رسول کی دعا کا تو ایک تعلق ہوتا ہے لیکن عذاب کا حتمی فیصلہ، اس کے نزول کا وقت اور اس کی تباہی کا دائرہ یہ سب باتیں اللہ کی قدرت اور اس کی مشیت سے متعلق ہیں۔ اس لئے آپؐ نے صاف صاف فرمایا کہ نفع و ضرر کا مالک صرف اللہ ہے۔ میں تو اپنی ذات کیلئے بھی اسی کا محتاج ہوں۔ میرے پاس کسی چیز کا کوئی اختیار نہیں۔ بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کوئی اختیار دے دے یا کوئی ذمہ داری تفویض فرما دے۔ پیغمبر کے ہاتھ سے بعض دفعہ معجزات کا ظہور ہوتا ہے تو اس میں بھی قرآن کریم نے واضح کیا ہے کہ اس میں ہاتھ اللہ کے نبی کا ہوتا ہے لیکن قدرت اللہ کی ہوتی ہے۔ تو جب حقیقت یہ ہے تو پھر تم مجھ سے بار بار مطالبہ کیوں کرتے ہو۔ تمہیں مطالبہ کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو براہ راست اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ۔

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ میں تمہیں اللہ کی طرف سے جب یہ کہتا ہوں کہ ایمان لاؤ اور اپنی حالت کو درست کرو،

Marfat.com

ورنہ تم پر اللہ کا عذاب بھی آ سکتا ہے، جیسے پہلی امتوں پر آیا۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عذاب آنے کا کوئی قاعدہ قانون نہیں۔ اللہ کی سلطنت میں میں کوئی کام بھی بغیر کسی قانون کے نہیں ہوتا۔ جس طرح انسانوں کی زندگی اور موت کے وقت مقرر ہیں۔ کوئی شخص وقت سے پہلے دنیا میں آ نہیں سکتا اور وقت کے بعد دنیا میں رہ نہیں سکتا۔ اسی طرح قوموں کی بھی عمریں ہیں جنہیں اجل کہا گیا ہے اور اس اجل کے پورا ہونے کا دارومدار ان کے اعمال پر ہے، جس طرح ہر پھل کے پکنے کا ایک وقت ہے اور ہر کلی کے چٹکنے کا ایک موقع ہے اور ہر پھول کے مرجھانے کی ایک عمر ہے اور ہمارے اپنے معمولات میں ہر کام کے نتیجہ خیز ہونے کا ایک مقرر وقت ہے۔ آپ دیگچی میں پانی ڈال کر چولہے پر رکھ دیں اور نیچے آگ جلا دیں اس پانی کے گرم ہونے کا ایک وقت ہے اور وہ یہ ہے کہ جتنی حرارت سے پانی کے کھولنے کا قدرت نے قانون مقرر کر دیا ہے جب وہ مطلوب مقدار حرارت پانی کو پہنچ جائے گی تو پانی کھول اٹھے گا اور یہ اس کے کھولنے کا وقت ہے۔ اسی طرح قوموں کیلئے بھی تباہی کا ایک وقت مقرر ہے۔ لیکن وہ ان کے اعمال کے اصلاح و فساد سے کم و بیش ہوتا رہتا ہے۔ تمہارے لئے عذاب کا بھی اللہ کے یہاں ایک وقت مقرر ہے جسے اس آیتِ کریمہ میں اجل سے تعبیر کیا گیا اور اس کا علم صرف اللہ کو ہے مجھے نہیں۔ جب تک وہ وقت نہیں آتا تم پر عذاب نہیں آ سکتا اور جب وہ وقت آ جائے گا تو پھر تم اس میں ایک لمحے کی بھی بیشی نہیں کر سکتے۔ تمہیں جلدی عذاب کی نہیں ہونی چاہئے، فکر اعمال کی ہونی چاہئے۔ اگر تم نے ایمان لا کر اپنے اعمال درست کر لئے تو بجائے عذاب کے اللہ کی رحمت کے مستحق ٹھہرو گے لیکن اگر تم نے ایمان و عمل کی طرف توجہ نہ کی اور انہیں عیاشیوں میں پڑے رہے تو پھر یاد رکھو کہ زندگی کا کوئی لمحہ بھی اس کے عذاب کو روک نہیں سکتا۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۵۰﴾

(اے پیغمبر کہہ دیجئے ذرا غور تو کرو کہ اگر آ جائے تمہارے پاس اس کا عذاب راتوں رات یا دن دیہاڑے (تو تم کیا کر لو گے) وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے مجرم جلدی مچا رہے ہیں۔)

جلد بازوں سے ایک سوال

اس آیت کا اندازِ بیان نہایت سادہ ہونے کے باوجود نہایت طرحدار بھی ہے۔ انسانی نفسیات میں ڈوب کر پوچھا جا رہا ہے کہ تمہاری زندگی شب و روز کی آمد و رفت کا نام ہی تو ہے۔ اسی آمد و رفت میں تمہاری زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہ تمہیں دن پر قدرت ہے نہ رات پر۔ البتہ لیل و نہار کی تمام گردشیں اور اس کے تمام اوقات اللہ کی گرفت میں ہیں۔ وہ جب چاہے ان سے کوئی سا کام لے سکتا ہے۔ وہ اپنا عذاب رات کو بھیجنا چاہے یا دن کو، کسی کو روکنے کا یارا نہیں۔ البتہ تم یہ بتاؤ کہ تم جو عذاب کے آنے کا شور مچاتے ہو اور جلدی کرتے ہو اگر وہ واقعی آ گیا تو تم نے اس سے بچنے کے کیا انتظامات کر رکھے ہیں اور اس میں طرحدار بات یہ ہے کہ جن سے یہ سوال کیا گیا ہے ان کو مجرم کہہ کر پکارا گیا ہے تاکہ وہ کچھ کہنے سے پہلے اپنی حیثیت کا ادراک کر لیں۔ بے گناہ آدمی تو اگر کسی سزا میں پکڑا جائے تو عام طور پر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جس شخص کو معلوم ہو کہ قانون کی نگاہ میں میں مجرم ثابت ہو چکا ہوں، اس کا تو سایہ بھی اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں سے مدد لینے کی بجائے دوسروں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ؕ آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۵۱﴾

(کیا جب عذاب نازل ہو جائے گا، تب اس پر ایمان لاؤ گے (فرشتے انہیں کہیں گے) اب تم تو اس عذاب کیلئے بڑی جلدی مچایا کرتے تھے۔)

اس آیت میں ان کی بے عقلی اور بدنصیبی پر افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ جیسے ہی عذاب کا وقوع شروع ہو تو اس وقت ہم ایمان لے آئیں گے۔ تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ایمان کا وقت تو اس وقت تک ہے جب تک موت کی علامتیں ظاہر نہیں ہوتیں اور موت کے فرشتے نظر نہیں آتے اور آنے والی دنیا کے آثار دکھائی نہیں دیتے، لیکن جب موت کا آنا یقینی طور پر معلوم ہو جائے اس وقت کا لایا ہوا ایمان قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے کہ فرعون جب ڈوبنے لگا تو اس نے کہا اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْۤ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْۤا اِسْرَآءِیْلَ تو حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تمہیں ایمان یاد آیا جب کہ موت سامنے نظر آ رہی ہے۔ اس سے پہلے تو تم مفسدین میں سے تھے۔ یہاں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ اگر تم عذاب کے وقوع کے وقت ایمان لانا چاہو گے تو تمہارا ایمان قبول نہیں ہوگا اور ساتھ ہی ان کے حوصلے کی بھی داد دی گئی ہے کہ تم تو عذاب کیلئے بڑی جلدی مچاتے تھے اب اس کی ایک ہی جھلک نے تمہارے حواس کیوں بدل ڈالے۔ اب مردانگی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا سامنا کرو۔

Marfat.com

ثُمَّ قِيلَ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ﴿يونس : ۵۲﴾
(پھران ظالموں سے کہا جائے گا کہ چکھو دائمی عذاب کا مزہ۔ تمہیں اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کمایا کرتے تھے۔)

عذاب کا شکار ہو کر جب تم موت کے منہ میں پہنچ جاؤ گے پھر تم سے کہا جائے گا کہ تم عذاب کا بار بار مطالبہ کرتے تھے نہ جانے تم نے اسے کیا سمجھ رکھا تھا۔ اب اس کے بعد قیامت کا عذاب تمہارے انتظار میں ہے۔ تمہاری مہلتِ عمل ختم ہو چکی۔ اب جس عذاب سے تمہیں واسطہ پڑنے والا ہے وہ دائمی عذاب ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت ممکن نہیں اور اس میں ایسا بھی نہیں کہ بلاوجہ تمہیں سزا دی جائے گی بلکہ تمہیں انہیں اعمال کی سزا دی جائے گی جو تم نے دنیا میں کیے تھے۔

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ﴿يونس : ۵۳﴾
(اور وہ آپؐ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا یہ بات واقعی سچ ہے۔ کہہ دیجئے ہاں، میرے رب کی قسم۔ بیشک وہ حق (اور ہو کے رہنے والی) ہے۔ اور تم اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔)

عذاب کا مذاق اڑانے والوں کو جواب

قرآن کریم نے مشرکینِ مکہ کی جانب سے عذاب اور قیامت کے آنے کے حوالے سے متعدد مواقع پر سوالات ذکر فرمائے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ جس قدر انہیں عذاب سے بچانے کیلئے عذاب سے ڈراتے تھے اور انہیں اس انذار کے ذریعے ایمان لانے کی ترغیب دیتے تھے۔ مشرکینِ مکہ میں سے بیشتر لوگ اسی قدر اس سے ڈرنے کی بجائے اور زیادہ دلیر ہوتے اور بہانے بہانے سے کبھی عذاب کے بارے میں اور کبھی قیامت کے حوالے سے الٹے سیدھے سوالات کرتے۔ ابھی اسی رکوع میں مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ کے الفاظ سے ان کا سوال نقل کیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سوال کرنے والے اگر نسبتاً سنجیدہ لوگ ہوتے تو وہ مناسب الفاظ میں ذرا رکھ رکھاؤ کے ساتھ سوال کرتے۔ لیکن جب وہی سوال عام لوگوں کی زبانوں پر بے چڑھ جاتا جنہیں اخلاق سے زیادہ حصہ نہیں ملا ہوتا اور وہ مجلسی آداب سے بھی واقف نہیں ہوتے تو ان کے سوال کا انداز یقیناً غیر مہذب ہوتا ہے۔ پیشِ نظر سوال بھی ایسے ہی غیر مہذب لوگوں کی طرف سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کے سوال کا مفہوم یہ ہے کہ آپؐ جو ہمیں بار بار عذاب آنے سے ڈراتے ہیں کیا اس میں کوئی حقیقت بھی ہے یا نہیں، یا محض دھونس جمانے اور اپنی شخصیت کا رعب بٹھانے کیلئے آپ اس طرح کی بے تکی باتیں کرتے ہیں۔ اس سوال کا ایک ایک لفظ بازاری انداز لئے ہوئے ہے۔ اب ہونا یہ چاہیے تھا کہ آنحضور ﷺ اس کے جواب میں سخت لب ولہجہ اختیار فرماتے جس سے انہیں اپنے سوال کی بے ہودگی کا اندازہ ہوتا۔ لیکن ایسے ہی تو مواقع ہیں جن سے اللہ کے نبی کی عظمت اور حقانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ جس طرح پھول کا رنگ وروپ جگہ کی نامناسبت سے تبدیل نہیں ہوتا۔ جس طرح نکہتوں کا قافلہ نامناسب ماحول میں کبھی اپنی اثر آفرینی کھو نہیں دیتا اور جس طرح روشنی محل اور جھونپڑے میں فرق نہیں کرتی ایسے ہی پیغمبر کا اخلاق اور اس کی حکمتِ دعوت نامناسب لوگوں سے بھی اپنا دامن سمیٹنا گوارا نہیں کرتی۔ مشرکین کا سوال کیسا ہی نازیبا سہی آنحضرت ﷺ نے اس کے جواب میں نہ صرف کہ برہمی اختیار نہیں کی بلکہ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ قطعیت کے انداز میں اس کا جواب دیا۔ سوال کرنے والوں نے پوچھا تھا کہ کیا عذاب کا آنا واقعی حتمی اور اٹل ہے یا محض آپ دھونس جما رہے ہیں۔ تو آپؐ نے نہایت سنجیدگی سے فرمایا اِیْ وَرَبِّیْ ہاں اللہ کی قسم، اِیْ نَعَمْ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس کے بعد قسم آتی ہے۔ آپؐ نے ان کی غیر سنجیدگی اور استہزاء کا طلسم توڑنے کیلئے سادہ جواب دینے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ قسم کے ساتھ اسے مؤکد کر دیا۔ اور ساتھ ہی فرمایا کہ یہ بات حق ہے یعنی یہ ایسی بات ہے جو شدنی ہے جسے بہرصورت ہو کے رہنا ہے۔ تم مذاق اڑاؤ یا سنجیدگی سے سوال کرو اس کے واقع ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اگر یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے نامناسب رویئے اور رعونت آمیز طرزِ عمل سے عذاب رک سکتا ہے یا تم اس سے بچ کے نکل سکتے ہو تو یاد رکھو تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور نہ اس عذاب کی ہولناکی کو کند کر سکتے ہو۔ اس کے عذاب کا کوڑا جب برستا ہے تو پھر اس کے سامنے کوئی چیز سلامت نہیں رہتی۔ معذب قوموں کی تاریخ تمہارے سامنے ہے۔ آج بھی ان علاقوں پر نحوست برستی ہے۔ صدیاں گزر گئیں لیکن عذاب کے ہولناک اثرات ابھی تک ان علاقوں کا مقدر بنے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

وَلَوْ اَنَّ

لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ۗ وَاَسَرُّوا
النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ
لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٥٤﴾ اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ اَلَآ اِنَّ
وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٥٥﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٦﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ
رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾
قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۗ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا
يَجْمَعُوْنَ ﴿٥٨﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ
مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ۗ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَ
مَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اِنَّ
اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٦٠﴾

(اور اگر ہر شخص جس نے ظلم کا ارتکاب کیا اگر اس کو مل جائے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے تو وہ اس کو فدیہ میں دے دے اور وہ ظالم ندامت کو چھپائیں گے جب عذاب کو دیکھیں گے۔ اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے۔ سن لو بیشک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سنو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ وہی زندگی دیتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اور اسی کی طرف

Marfat.com

تم لوٹائے جاؤ گے۔اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی نصیحت اور سینے کے امراض کی شفاء اور اہل ایمان کیلئے ہدایت و رحمت۔ کہہ دیجئے یہ کتاب نازل ہوئی ہے محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے، پس چاہئے کہ اس پر خوشی منائیں۔ یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔اے پیغمبرؑ ان سے کہئے کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہارے لئے اتارا ہے اس میں سے تم نے کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرا لیا ہے۔اے پیغمبرؑ ان سے پوچھئے کہ کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو اللہ پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان پر کیا گزرے گی۔ بیشک اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے۔لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔

وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَافِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۵۴﴾ ﴿یونس : ۵۴﴾

(اور اگر ہر شخص جس نے ظلم کا ارتکاب کیا اگر اس کو مل جائے وہ سب کچھ جو زمین میں ہے تو وہ اس کو فدیہ میں دے دے اور وہ ظالم ندامت کو چھپائیں گے جب عذاب کو دیکھیں گے۔اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دیا جائے گا۔اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے۔)

متکبرین کی اصل حیثیت

ہم نے گزشتہ آیت میں دیکھا کہ سوال کرنے والوں میں ایک رعونت ہے جو انہیں بدتمیزی پر اکساتی ہے۔وہ مسلمانوں کی کم مائیگی اور اسلام کی غربت کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتے ہیں۔ پورا ماحول چونکہ انہیں اپنے اندر سے اکھاڑ دینا چاہتا ہے اس لئے مغرور لوگ حالات کو حسب حال پاتے ہوئے برے سے برا رویہ اختیار کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں سب سے پہلے ان کے غرور اور تکبر پر ایک چوٹ لگائی گئی ہے۔اور ان کے سامنے قیامت کا منظر پیش کیا گیا ہے جس سے انہیں بہر حال دوچار ہونا ہے۔اس دن انہیں اندازہ ہوگا کہ ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔آج وہ اپنے تئیں کچھ بھی سمجھتے رہیں لیکن انہیں احساس ہونا چاہئے کہ زمین ان کے پاؤں تلے سے سرک رہی ہے۔ آخرت کا انجام تو قطعی اور یقینی ہے اس میں تو کسی قسم کی تبدیلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔البتہ دنیا میں بھی ان کی یہ حالت دیر تک رہنے والی نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آخرت کے انجام سے دوچار ہونے سے پہلے اپنی دنیا ہی کی فکر کر لیں اور اگر یہ نصیب میں نہیں تو پھر آخرت میں تو ان کی اصل حیثیت ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائے گی۔اس روز ان کی بے بسی کا عالم یہ ہوگا کہ ان میں سے ایک ایک شخص اپنی بے اعتدالیوں کو نگاہوں میں سمیٹے اپنی بداعمالیوں کا انبار سامنے دیکھ رہا ہوگا جس سے انہیں یہ اندازہ کر لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ انہوں نے قدم قدم پر اپنے اوپر ظلم کئے۔انہیں اس بات کا اعتراف تھا کہ اللہ ہی ان کا خالق ہے۔اس کے بعد یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا کہ جب وہ ان کا خالق ہے تو وہ ان کی صلاحیتوں کا بھی خالق ہے۔ان کے دل و دماغ کی رعنائیاں بھی اسی کی دین ہیں۔اس کے اعضاء و جوارح کی فعلی قوتیں بھی اسی کی عطا کردہ ہیں۔اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس نے یہ سب کچھ عطا کیا ہے اسی کے خلاف اور اس کی نافرمانی میں انہیں استعمال کیا جائے۔ دماغ اسی کے خلاف منہ و بے باندھیں، دل اس کے دشمنوں کی محبت سے آباد ہوں، اعضاء و جوارح کی قوتیں شیطانی اور طاغوتی منصوبوں کی بجا آوری میں صرف ہوں۔ جب ان میں سے ایک ایک چیز پر پروردگار گرفت فرمائے گا اور ان کا جواب طلب کرے گا اس وقت ایک ایک ظالم تمنا کرے گا کاش میرے پاس زمین کی ساری دولت ہوتی اور میں آج اسے فدیہ میں دے کر اپنی جان چھڑا لیتا۔ایک طرف تو عذاب کی ہولنا کی دل ہلا دینے کیلئے کافی ہوگی اور دوسری طرف جب ہر شخص اپنی آنکھوں کے سامنے جہنم کو ابلتا ہوا دیکھے گا تو اسے بار بار یہ خیال آئے گا کہ جس عذاب سے ہمیں ڈرایا جاتا تھا اور جس قیامت کے آنے کا ہمیں یقین دلایا جاتا تھا لیکن ہم ان میں سے ہر بات کو ایک افسانہ سمجھتے تھے آج وہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔اس سے ان کے اندر ایک ندامت کا لاوا اٹھے گا۔لیکن اپنے گزشتہ

Marfat.com

کرتوت انہیں مجبور کریں گے کہ اس ندامت کو دل میں چھپا کے رکھو۔ سورۂ انعام ایت نمبر 31 میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ''یہاں تک کہ جب وہ گھڑی ان پر آ دھمکے گی وہ کہیں گے ہائے افسوس اس کوتاہی پر جو اس معاملے میں ہم نے کی۔'' اب جبکہ یہ اسی ندا اور شرمندگی میں گڑے جارہے ہوں گے تو اسی دوران ان کے زندگی بھر کے کرتوتوں کا پشتارہ ان کے سامنے لا رکھا جائے گا اور پھر ایک ایک بات کا فیصلہ عین انصاف کے مطابق چکایا جائے گا۔ انہوں نے اگرچہ زندگی میں ظلم ہی کی فصل بوئی ہوگی اور آج اسی کو کاٹیں گے لیکن ان پر کوئی ظلم نہیں کی جائے گا۔ ہر جرم کی وہی سزا ملے گی جو اس کا جائز حق ہوگا۔ اور آج تک انہوں نے اپنے جن مزعومہ شرکاء اور شفعاء سے امیدیں باندھ رکھی تھیں وہ سب پادر ہوا ہو جائیں گی اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ آج ان کے سہارے کس قدر بودے ثابت ہوئے ہیں جن کے سہارے انہوں نے اپنی زندگی برباد کی۔ آج ان کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہوگا۔ ایک اللہ کی حکومت ہوگی اور دنیا کے تمام چھوٹے بڑے حکمران اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے۔ اس کے انبیاء تک نفسی نفسی پکارتے ہوں گے۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْم ''آج کس کی حکومت ہے'' کی پکار ہر طرف گونج رہی ہوگی۔ انسان کو اپنی بے ثباتی اور بے بسی کا صحیح ادراک میدانِ حشر ہی میں ہوگا۔ لیکن اس وقت یہ ادراک کام نہیں آئے گا۔ چنانچہ اسی ادراک اور احساس کو مزید گہرا کرنے کیلئے فرمایا:

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۵۶﴾ ﴿یونس : ۵۵، ۵۶﴾

(سن لو بیشک اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سنو! یقیناً اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ وہی زندگی دیتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔)

اس آیتِ کریمہ میں جس کلمۂ جامعہ اور حقیقت ثابتہ کا اعلان فرمایا گیا ہے وہی دراصل اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اسی حقیقت سے منسلک ہو جانے میں انسان کی عافیت بھی ہے اور عظمت بھی۔ اور اسی سے محروم ہو جانے میں تباہی بھی ہے اور ہلاکت بھی۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر آغاز میں کلمۂ تنبیہ لایا گیا۔ الا سنو! یعنی اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کیلئے ہے۔ یعنی ایک ایک چیز اسی کی ملکیت ہے، اسی کی مملوک ہے، اسی کی بندہ ہے، اسی کی غلام ہے، اسی کی فرمانبردار ہے۔ اس کی مخلوقات میں جمادات بھی ہیں اور نباتات بھی۔ حیوانات بھی ہیں اور پرندے بھی۔ حشرات بھی ہیں اور انسان بھی۔ فرشتے بھی ہیں اور ملاءِ اعلیٰ کے مقربین بھی۔ ان میں سے کوئی بھی اس کی بندگی، غلامی اور ملکیت سے باہر نہیں۔ مقربین بارگاہ بھی اسی سے لرزاں و ترساں ہیں۔ اس کے عظیم فرشتے بھی اس کے معزز غلام ہیں۔ اس کے انبیاء و رُسل بھی اسی کے فرمانبردار بندے ہیں۔ اس کے بڑے بڑے پہاڑ بھی اسی کیلئے قیام میں ہیں۔ دریا اور سمندر اسی کی چاکری میں ہیں، ہوا اسی کے حکم سے چلتی ہے، زمین اسی کے حکم سے گردش میں ہے، سورج و چاند، سیارے اور ثوابت سب اس کے احکام کے پابند ہیں۔ خامہ اسی کے سامنے گردن جھکائے ہوئے ہے۔ جب سب کچھ اس کا ہے اور اسی کا فرمانبردار ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی مکلف مخلوق سے جواب طلبی کیلئے ایک دن سب کو اکٹھا نہ کرے اور سب کو زندہ کر کے وہ نہ پوچھے کہ بتلاؤ تم زندگی کیسے گزار کے آئے ہو۔ میں نے تمہیں عقل دی، تمہارے طرف اپنے پیغمبر بھیجے، اپنی کتابیں اتاریں، تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ جس طرح یہ بات حق ہے کہ وہی سب کا خالق و مالک ہے اور سب اس کی ملکیت ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی حق ہے کہ وہ ایک دن سب کو زندہ کرے گا اور ایک میدان میں جمع کر کے ان کی گزری ہوئی زندگی کا حساب لے گا۔ ان دونوں باتوں میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے جس کی حاکمیت کا اقرار کیا جائے اس کے اس حق کا بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے محکوموں سے جواب طلبی کا حق رکھتا ہے۔ یہی بات اس آیت کے دوسرے جملے میں فرمائی گئی ہے کہ اللہ کا وعدہ جسے قیامت کہا جاتا ہے وہ حق ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔ نہ جاننے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا علم کوئی پہیلی اور چیستان ہے۔ البتہ ان کے نہ جاننے کا سبب ان کی خواہشات کی پیروی ہے۔ ہوائے نفس نے ان کی زندگی کو ایسا ویران کیا ہے کہ اتباعِ نفس کے سوا ان کی ہر صلاحیت نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خواہشات کی دنیا کو ساری دنیا سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ اور کچھ نہیں تو یہ بات تو ایک معمولی آدمی بھی جانتا ہے کہ اللہ ہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور وہی ہے جو مارتا ہے۔ زندگی بھی اسی کے قبضے میں ہے اور موت بھی اسی کے قبضے میں۔ جس نے زندگی اور موت کو تخلیق کیا ہے اور پھر وہ جسے چاہتا ہے زندگی دیتا ہے اور جب چاہتا زندگی چھین لیتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے زندگی کی جہتِ سفر اور منزلِ سفر مقرر نہ کی ہو۔ یہاں اسی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تم

Marfat.com

سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ کہ تمہاری اصل منزل اللہ کی ذات کے حضور حاضری ہے۔ تمہارا حاصلِ عمر اسی کے قرب کا حصول ہے۔ تمہارا مقصد اسی کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ اور اسی حوالے سے وہ تم سے قیامت کے دن باز پرس کرے گا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿یونس:۵۷﴾

(اے لوگو! آ گئی ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی نصیحت اور سینے کے امراض کی شفاء اور اہل ایمان کیلئے ہدایت و رحمت۔)

قرآن کی چار صفات

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم نے یہ پڑھا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔ اس لئے اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ قیامت برپا کرے اور انسانوں اور جنات سے ان کی زندگی کا حساب لے۔ اس سے خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کا حساب اسی صورت میں لیا جا سکتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو بتا دیا جائے کہ وہ زندگی گزارنے کا کون سا طریقہ ہے جسے میں نے بھیجا ہے اور جس کے مطابق زندگی گزارنے والوں سے میں خوش ہوتا ہوں۔ چنانچہ اسی سوال کا جواب پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دیا گیا ہے۔ اس میں خطاب صرف مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی سے ہے۔ کیونکہ قیامت کے دن تمام نسلِ انسانی کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اس لئے ہر دور میں انسانوں کی رہنمائی کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول بھیجے تا کہ قیامت کے دن کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ مجھے تو معلوم نہ تھا کہ میرا اللہ کن باتوں میں راضی ہے۔ قرآنِ کریم اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے جس میں اس ضرورت کو بتمام وکمال پورا کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت و افادیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی چند صفات بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ سب سے پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ لوگو! تمہارے رب کی جانب سے آخری نصیحت آ گئی ہے جس کے بعد کبھی آسمان زمین سے ہمکلام نہیں ہوگا اور اہلِ زمین پر کبھی اللہ کا کلام نہیں اترے گا۔ اس کیلئے مَوْعِظَةٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا معنی عام طور پر نصیحت اور خیر خواہی کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کے دو پہلو ہیں ایک وہ پہلو ہے جس کا تعلق مراد سے ہے اور ایک وہ پہلو ہے جس کا تعلق طریقِ نصیحت سے ہے۔ جہاں تک مرادِ نصیحت کا تعلق ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کیلئے جو امور خطرات کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے انہیں بہر صورت بچنا چاہئے ان سے آگاہی اور وہ امور جو انسانی زندگی کیلئے قوت اور بھلائی کا باعث ہیں لیکن عموماً انسانی مزاج ان کی طرف میلان نہیں رکھتا۔ ان کی طرف راغب کرنے کی کوشش۔ قرآن کریم کے اوامر و نواہی عموماً ان دونوں باتوں پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ اوامر و نواہی سے آگاہی اور طبیعتوں میں انہیں راسخ کرنے کیلئے ترغیب اور ترہیب، کہنا چاہئے کہ یہ موعظت کا حاصل ہے۔ دوسرا پہلو اس کے طریقے سے متعلق ہے۔ موعظت وعظ سے ہے اس لئے اس کا مقصد انسان کے دل میں نرمی پیدا کرنا ہے تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے، دنیا کی غفلت کا پردہ چاک ہو اور آخرت کی فکر دل میں جاگزیں ہو جائے۔ اس لئے پیرایۂ بیان ایسا اثر انگیز اور اخلاص میں ڈوبا ہوا ہونا چاہئے جس سے سننے والا اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ اس لحاظ سے جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو ہر آیت خیر خواہی اور خیر اندیشی کا مرقع معلوم ہوتی ہے اور اسلوب ایسا دلکش کہ کہیں وعدہ ہے تو ساتھ وعید بھی ہے۔ ثواب ہے تو اس کے ساتھ ذکر عذاب کا بھی ہے۔ دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی کے ساتھ ساتھ ناکامی اور گمراہی کی طرف اشارے بھی ہیں۔ چنانچہ اسی اسلوب کا نتیجہ تھا کہ عربوں جیسے پتھر دل لوگ اس نصیحت کے سامنے موم ہو گئے اور غفلت میں مدہوش قومیں بیداری کا پیغام بن کر اٹھیں۔

دوسری صفت قرآن کریم کی جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہے وہ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ہے یعنی یہ قرآن کریم شفاء ہے ان امراض کی جو دلوں کو لاحق ہوتے ہیں۔ عمومی طور پر دیکھا جائے تو انسان کے اعمال اس کے احساسات کے تابع ہیں اور انسانی احساسات کا مصدر و منبع انسانی دل ہے۔ اسی کے اندر احساسات مختلف تصورات کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ انہیں کے زیرِ اثر اعمال وقوع پذیر ہوتے ہیں اور خیر و شر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس عمومی کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دل و دماغ چونکہ صلاح و فلاح کے سرچشمے کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے قرآن کریم براہ راست اس سرچشمے کی ہدایت کا کام کرتا ہے۔ اس کے اندر اٹھنے والے احساسات میں جو بیماریاں پیدا ہوتی ہیں ان کیلئے شفاء کا باعث بنتا ہے اور اگر خصوصی طور پر دیکھا جائے تو کئی ایسے اخلاقِ ذمیمہ ہیں جو دلوں میں پیدا ہوتے اور دلوں ہی میں سلگتے رہتے ہیں مثلاً حسد، بغض، کینہ، شہرت کی ہوس، حب

Marfat.com

دنیا، حب جاہ وغیرہ۔ یہ دل کے امراض ہیں۔ قرآن کریم خاص طور پر ان امراض کو اپنا ہدف بناتا ہے اور طریقے طریقے سے ان کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور جو لوگ فی الواقع قرآن کریم سے اپنا تعلق جوڑ لیتے ہیں قرآن کریم کی برکت سے ان کے اندر یہ امراض صفر کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت عہدِ نبوت اور قرونِ اولیٰ ہیں کہ جن میں ہم یہ بیماریاں کم سے کم دیکھتے ہیں۔ اس آیت کے اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ قرآن کریم خاص طور پر دلوں کی بیماریوں کیلئے شفاء ہے لیکن جسمانی بیماریوں کے علاج سے اس کا کوئی تعلق نہیں لیکن بعض دوسرے اہلِ علم حضرات کا خیال یہ ہے کہ قرآن کریم روحانی بیماریوں کے ساتھ ساتھ جسمانی بیماریوں کا بھی علاج ہے۔ روحانی بیماریاں چونکہ جسمانی بیماریوں سے زیادہ شدید ہیں اور اس کا علاج بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لئے بطور خاص اس کا ذکر فرمایا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن کریم جسمانی بیماریوں کیلئے شفاء نہیں۔ چنانچہ بعض احادیث سے بھی اس پر استدلال کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے سینے میں تکلیف ہے۔ آپؐ نے فرمایا قرآن پڑھا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ قرآن سینوں کی بیماریوں کیلئے شفاء ہے۔ اسی طرح حضرت واثلہؓ بن اسقع کی روایت ہے کہ ایک شخص رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیان کیا کہ میرے حلق میں تکلیف ہے۔ آپؐ نے اس کو بھی یہی فرمایا کہ قرآن پڑھا کرو۔ چنانچہ ایسی ہی روایات اور اپنے تجربات سے بعض بزرگوں نے آیاتِ قرآنی کے خواص وفوائد پر مستقل کتابیں مرتب کی ہیں جن میں امام غزالیؒ کی کتاب "خواصِ قرآنی" بہت مشہور ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کے نزول کا اصل مقصد انسانوں کی ہدایت اور اصلاح ہے، ان کا جسمانی علاج نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ قرآن کریم کے اصل مقصد کی طرف توجہ رکھی جائے۔ البتہ ضمنی طور پر جسمانی علاج کے فوائد بھی میسر آ جائیں تو اسے اللہ کی رحمت سمجھنا چاہئے۔

قرآن کریم کی تیسری صفت اس کا ہدایت ہونا ہے۔ یعنی یہ انسانی زندگی کیلئے رہنمائی ہے۔ بلاشبہ قرآن کریم ایک ایسی رہنما کتاب ہے جس نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کی ہے۔ اس نے معاشرت کی ترتیب کیلئے اصولِ معاشرت دیئے ہیں، معیشت کی بہتری کیلئے نظامِ معیشت فراہم کیا ہے، سیاست کی اصلاح کیلئے سیاسی ہدایات دی ہیں، حکومت بنانے کیلئے حکومت کے طریقے بتائے ہیں اور اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ کیلئے آئین اور قانون بخشا ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان رشتوں کو مضبوط کرنے کیلئے عقائد وعبادات کا ایک نظام دیا ہے۔ غرضیکہ ایک فرد سے لے کر امت کے آخری حصے تک جس قدر ضرورتیں پیش آ سکتی ہیں ان کیلئے مکمل رہنمائی قرآن کریم نے عطا کی ہے۔

اس کی چوتھی صفت رحمت ہے۔ یوں تو قرآن کریم اور اس کی ایک ایک آیت نبی کریم ﷺ کا وجود گرامی اور امتِ مسلمہ کا وجود ان میں سے کون سی چیز ہے جو بجائے خود اللہ کی رحمت سے کم ہو۔ بالخصوص قرآن کریم اور آنحضرت ﷺ کی ذات والا صفات یہ تو اللہ کی ایسی رحمتیں ہیں جن کا اللہ نے انسانوں پر احسان جتلایا ہے۔ لیکن قرآن کریم کی صفت کے طور پر اس کا تذکرہ شاید اس لئے فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت سے لے کر اس کے مکمل عطا کردہ نظام کے نفاذ تک جتنے راستے کے مراحل ہیں ان میں ہر ہر مرحلے پر اللہ کی رحمت شاملِ حال ہوتی ہے اور جیسے جیسے اس کا نظام امتِ مسلمہ میں مستحکم ہوتا جاتا ہے اور دین بن کر دل ودماغ میں اترتا جاتا ہے ویسے ویسے اللہ کی رحمت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ رزق میں فراوانی آ جاتی ہے، زمین پر یہ امت اللہ کی دلیل بن جاتی ہے، اس کا لوہا ہر لوہے کو کاٹنے لگتا ہے۔ آخر ایک وقت آتا ہے کہ پوری دنیا اسی امت کے دروازے سے اللہ کی رحمت کی بھیک مانگتی ہے اور اس امت کا ایک ایک فرد دنیا کے ہر فرد کیلئے سرتاپا رحمت بن جاتا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے:

قدم قدم پہ رحمتیں نفس نفس پہ برکتیں
جہاں جہاں سے وہ شفیعِ عاصیاں گزر گیا
جہاں نظر نہیں پڑی وہاں ہے رات آج تک
وہیں وہیں سحر ہوئی جہاں جہاں گزر گیا

Marfat.com

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿٥٨﴾ ﴿یونس : ۵۸﴾

(کہہ دیجئے یہ کتاب نازل ہوئی ہے محض اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے، پس چاہئے کہ اس پر خوشی منائیں۔ یہ بہتر ہے ان تمام چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔)

قرآنِ کریم عظیم نعمت

اس سے پہلے قرآن کریم کی چار صفات بیان کی گئی ہیں جن کی کسی حد تک تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں۔ اسی سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ کتاب یقیناً نصیحت ہے دلوں کے امراض کیلئے شفاء ہے، ہدایت ہے اور رحمت ہے۔ لیکن ان لوگوں کیلئے جو اس پر ایمان لائے۔ اور اس میں مندرج ہدایات کو نہ صرف آویزہ گوش بنایا بلکہ اسے زندگی کی رہنما، دلوں کی حرارت اور عمل کا اسلوب بھی بنایا۔ زندگی پر اسی کی چھاپ رہی اور یہی ایمان لانے والے کی شناخت بن گئی۔ اس سورت میں جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ فی الواقع اپنا رنگ دکھائیں گی۔ لیکن پیش نظر آیت کریمہ میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ صرف ایمان لانے والوں کو نہیں سب جن وانس کو معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن کریم وہ عظیم نعمت ہے جو اپنے جلو میں اللہ کے فضل اور رحمت کو لے کر اتری ہے۔ اور مزید یہ بات کہ اس کا اترنا بجائے خود اللہ کے فضل اور رحمت کا نتیجہ ہے وہ چونکہ اپنے بندوں پر رحیم وکریم ہے اس نے جب انسانی کشتی کو ڈوبنے کے قریب دیکھا اور انسانی زندگی کو تباہی کے کنارے محسوس کیا تو اس کا فضل اور رحمت جوش میں آئے۔ تو جس طرح اس کی رحمت کا ظہور اللہ کے رسول کی صورت میں ہوا اسی طرح قرآن کی صورت میں بھی ہوا۔ انسان کی کوتاہ فہمی ہے کہ وہ ہمیشہ دنیا اور اموال دنیا کو اپنا مقصد بناتا ہے۔ اسی کیلئے محنت کرتا ہے، اسی کے حصول پر فخر کرتا ہے، اسی کی کثرت پر خوشیاں مناتا ہے۔ لیکن حقیقت سے بے خبر انسان کو یہ معلوم نہیں کہ دولت اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ اور اس آزمائش پر پورا اترنے اور اس نعمت کو اپنے اور خلقِ خدا کیلئے اللہ کا فضل بنانے کیلئے جس رہنمائی کی ضرورت ہے وہ قرآن کریم میں ہے۔ اس لئے انسانوں کو چاہئے کہ بجائے ان خزف ریزوں پر جان دینے کے قرآنِ کریم اور اس کی تعلیمات کو سینے سے لگائیں۔ اپنی زندگی کو اس کی رہنمائی میں دے دیں اور پھر اللہ کی اس نعمت پر جس قدر بھی خوشیاں منائیں، کم ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں یہی وہ نعمت ہے جس کے واسطے سے انسان اللہ سے اپنا رشتہ جوڑ سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ آسمان اور زمین کے درمیان اللہ کی ایک رسی لٹک رہی ہے جس نے اسے تھام لیا وہ اللہ سے وابستہ ہو گیا اور جس نے اسے چھوڑ دیا اس کی تباہی اور بربادی میں کوئی کلام نہیں۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا حضورؐ وہ اللہ کی رسی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: وہ قرآن کریم ہے۔ اس سے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ قرآن کریم دنیا اور آخرت کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اہلِ دنیا کو اس کا عطا ہو جانا یقیناً اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ﴿٥٩﴾

(اے پیغمبرؐ ان سے کہئے کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ اللہ نے جو رزق تمہارے لئے اتارا ہے اس میں سے تم نے کسی کو حرام اور کسی کو حلال ٹھہرا لیا ہے۔ اے پیغمبرؐ ان سے پوچھئے کہ کیا اللہ نے تم کو اس کا حکم دیا یا تم اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہو۔) ﴿یونس: ۵۹﴾

توحید کا ایک پہلو

توحید اور آخرت کا مضمون جاری تھا کہ درمیان میں قرآن کریم کے حوالے سے التفات کی آیات آگئیں۔ اب پھر توحید اور آخرت کے مضامین کو لیا جارہا ہے۔ توحید کی تین قسمیں ہیں۔ (1) توحید فی الذات یعنی اللہ اپنی ذات میں یکہ وتنہا اور وحدہ لاشریک ہے۔ کوئی دوسرا اس کائنات کا خدا نہیں۔ (2) توحید فی الصفات یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخصوص صفات میں بے مثال و بے نظیر ہے۔ اس کی صفات میں کوئی شریک نہیں اور کسی میں اس جیسی صفات نہیں۔ وہ خالق ہے تو اس کی صفتِ تخلیق میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ قادر ہے تو اس کی قدرتِ کاملہ میں کوئی حریف نہیں۔ وہ غنی و بے نیاز ہے اس کی بے نیازی میں کوئی ہمسر نہیں۔ وہ ہر طرح کی احتیاج سے پاک ہے اور باقی سب اس کے محتاج ہیں۔ (3) وہ اپنے حقوق میں بھی بے مثال اور لاشریک ہے۔ اس کے تکوینی اور تشریعی احکام میں کوئی ہمسر نہیں۔ چونکہ وہی سب کا خالق ہے اور اس میں کسی کا حصہ نہیں تو اس سے خود بخود یہ حق نکلتا ہے

Marfat.com

کہ سب پر اسی کا حکم چلے گا اور وہ غیر مشروط اطاعت کا حق رکھتا ہے۔ اس کی تمام مخلوق چونکہ اس کی مملوک اور محکوم ہے اس لئے بجا طور پر وہ اس کا مستحق ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو جیسا چاہے اور جو چاہے حکم دے یہ اس کا خصوصی حق ہے جس میں کوئی اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اسی حق کے حوالے سے اس آیتِ کریمہ میں مشرکینِ مکہ سے سوال کیا جا رہا ہے کہ اللہ نے جو رزق تم پر اتارا ہے اس کے اتارنے اور عطا کرنے میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس سے خود بخود یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب وہ رزق اتارنے میں تنہا ہے تو اس رزق کی تحلیل و تحریم میں بھی کسی کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ عقلِ عام اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ آقا اپنے مملوک کو اور حاکم اپنے محکوم کو اور خالق اپنی مخلوق کو جو بھی حکم دے وہ جائز طور پر اس کا حق رکھتا ہے۔۔ وہ اس کے زیرِ تصرف چیزوں میں جسے چاہے حرام کر دے، جسے چاہے حلال کر دے۔ کسی دوسرے کیلئے اعتراض کا کوئی موقع نہیں۔ تم نے جو اللہ کے رزق میں اپنے طور پر تحلیل و تحریم کا حق استعمال کیا ہے تمہیں آخر یہ حق کس نے دیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن و سنت میں رزق کا لفظ صرف دسترخوان کی چیزوں کیلئے استعمال نہیں ہوتا جیسا ہم عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جو چیزیں کھائی جاتی ہیں یا پی جاتی ہیں یعنی جن کا تعلق ماکولات و مشروبات سے ہے وہی چیزیں رزق کہلانے کی مستحق ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں۔ رزق کا معنی عربی زبان میں اللہ کی عطا یا اس کی بخشش ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہم اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت کی نعمتیں مانگتے ہیں اور نعمتیں بھی ایسی جن کا تعلق زندگی کے متنوع شعبوں سے ہے اور اس کیلئے عموماً ہم اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس کا معنی ہوتا ہے اے اللہ ہمیں رزق عطا فرما، ایمانِ کامل کا، قلبِ خاشع کا اور علمِ نافع کا وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ ان میں سے کسی چیز کا تعلق ماکولات و مشروبات سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے رزق ایک وسیع لفظ ہے جو اللہ کی عطا اور اس کی دَین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چاہے اس کا تعلق اشیائے خوردنی سے ہو یا تہذیب و تمدن سے یا شعبہ ہائے علم سے، سب کو رزق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی مقصود یہ کہنا ہے کہ تم نے انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات، تہذیبی روایات اور تمدنی اقدامات میں تحلیل و تحریم کا حق اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے حالانکہ جو ذات ان تمام امکانات اور اداروں کی مالک ہے اس کی حلت و حرمت کا فیصلہ کرنے کا حق بھی اسی کو ہے کسی اور کو نہیں کیونکہ کسی بھی صاحبِ امر اور صاحبِ حکومت کے اختیارات کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ اس کو اشیاء سے لے کر انسانوں تک اور گھروں سے لے کر پارلیمانی اداروں تک فیصلہ کرنے کا اختیار کہاں تک ہے۔ اگر صورتحال یہ ہو کہ حکومت اس کی طرف منسوب کی جائے لیکن حکم کسی اور کا چلے تو ایسی حکومت کو آزاد و خودمختار حکومت تسلیم کرنا کسی کیلئے بھی ممکن نہیں۔ ہم سورۂ مائدہ کے آغاز ہی میں اس پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ جب انگریز نے ہندوستان کی حکومت پر قبضہ کیا تو اس وقت بادشاہِ وقت کے ساتھ جو سب سے بڑا مذاق کیا جاتا تھا وہ یہی تھا کہ بازاروں اور چوراہوں میں جب بھی کسی حکم کا اعلان کیا جاتا تو ان الفاظ میں کیا جاتا ''کہ لوگو! زمین اللہ کی، ملک بادشاہ کا اور حکم ایسٹ انڈیا کمپنی کا۔'' ہر سننے والا سمجھتا تھا کہ بادشاہ کی حیثیت محض ایک مہرے کی ہے جسے کسی وقت بھی اٹھا کر پھینکا جا سکتا ہے کیونکہ اصل بادشاہ وہ ہوتا ہے جس کا حکم چلے۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی مشرکینِ مکہ سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم یہ بات تسلیم کرتے ہو کہ اس کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے اور تمہارا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ جتنی نعمتیں تمہارے زیرِ تصرف ہیں وہ سب اس نے عطا کی ہیں لیکن ان میں تصرف کرتے ہوئے یہ دیکھنا کہ ان کی حیثیت کیا ہے، ان میں کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے، کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے۔ اس کا حق یقیناً اسی ذات کے پاس ہے جو ان کا خالق و مالک ہے لیکن تم نے انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہر سطح پر یہ حق اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ اشیائے خورد و نوش ہوں یا عبادات نظام، افراد کے باہم رشتے ہوں یا تہذیبی و تمدنی معاملات، ان کے جائز اور ناجائز ہونے اور حلال و حرام کے فیصلے تم اپنی آزادانہ مرضی سے کرتے ہو اور اگر تمہیں کوئی اس سے روکنے کی کوشش کرتا ہے تو تم اس کے دشمن ہو جاتے ہو۔ سوال یہ ہے کہ تمہیں یہ تحلیل و تحریم کا حق کس نے دیا ہے۔ اگر تو تم اللہ کو خالق و مالک نہ مانتے تو بات سمجھنا آسان ہو جاتا کہ تم اللہ کی حاکمیت سے باغی ہو۔ اس لئے تم جو بھی رویہ اختیار کرو اس سے متعلق کوئی بحث نہیں ہو سکتی لیکن حیران کن بات تو یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں صحیح تصور رکھتے ہوئے بھی تحلیل و تحریم کا اختیار تم اپنے پاس رکھنے پر مُصر ہو۔ تمہارے نزدیک اللہ کی حکومت بہادر شاہ ظفر کی حکومت کی طرح ہے۔ اس میں جس کا جی چاہے ریاست کے اندر ریاست قائم کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب تم اللہ کی حاکمیت مطلقہ کو تسلیم کرتے ہو تو پھر تمہیں یہ تحلیل و تحریم کا حق کس نے دیا۔ کیا اس کی اجازت تمہیں اللہ نے عطا فرمائی ہے اور اگر ایسا ہے (جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ ہماری یہ شریعت خود ساختہ نہیں بلکہ ہمیں آباؤ اجداد سے ملی ہے اور انہیں یقیناً حضرت اسماعیل علیہ السلام سے ملی ہوگی۔) تو پھر اس پر کوئی سند پیش کیجئے کوئی دستاویزی ثبوت، کوئی ایسا صحیفہ جو بجائے خود دلیل ہو اور اگر ایسی کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ تمہاری شریعت واقعی من

Marfat.com

من اللہ ہے اور اس کے باوجود تم اللہ کی طرف اس کا انتساب کرتے ہو تو پھر اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو، افتراء کرتے ہو اور ایک ایسی بے سروپا بات کرتے ہو جو کسی انسان کے بارے میں بھی کہنا مناسب نہیں۔ چہ جائیکہ اللہ کریم کے بارے میں۔

وَمَا ظَنُّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝
﴿یونس : ۶۰﴾

(اور کیا گمان ہے ان لوگوں کا جو اللہ پر جھوٹ افتراء کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ان پر کیا گزرے گی۔ بیشک اللہ لوگوں پر بڑے فضل والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکر ادا نہیں کرتے۔)

گرفت میں تاخیر اللہ کی رحمت ہے

اس آیتِ کریمہ میں گزشتہ آیتِ کریمہ میں بیان کردہ مشرکینِ مکہ کے کرتوتوں کے حوالے سے ایک سوال اٹھایا ہے کہ تمہارے طرزِ عمل نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ تم جو کچھ کہتے اور کرتے ہو اس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں بلکہ تم سراسر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہو کہ اس نے ہمیں ایسا کرنے کا اختیار دیا ہے۔ تم ہی بتاؤ ہم تمہیں ہی تمہارے معاملات کا منصف بناتے ہیں کہ جو لوگ اللہ پر افتراء کریں اور جھوٹ باندھیں ان کے بارے میں کیا گمان ہے کہ قیامت کے دن اللہ ان سے کیا سلوک کرے گا۔ جب وہ اپنے اعمال اور اپنے اعتقادات کا پشتارہ اٹھائے اللہ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور انہیں برملا اس بات کا اعتراف ہوگا کہ ہم نے جو کچھ کیا اور جو کچھ کہا اور جو کچھ ہم اللہ کی طرف منسوب کرتے رہے وہ جھوٹ کا پلندہ تھا۔ ان میں سے ایک ایک بات ایجاد بندہ تھی۔ اللہ نے ان میں سے کسی بات کی ہمیں اجازت نہ دی تھی۔ اس دن اللہ کی صفتِ عدالت انہیں ان کے اعمال کے حوالے کر دے گی اور ان کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو ان کے اعمال کا تقاضا ہوگا۔ یہاں پہنچ کر ذہن میں ایک خلجان سا اٹھتا ہے کہ جو لوگ اس قدر اللہ کریم کے بارے میں دلیر واقع ہوئے ہیں کہ انہیں اس کے عذاب کی بھی پرواہ نہیں، انہیں فوراً سزا کیوں نہیں دی جاتی۔ اللہ کے رسول کی معرفت جب ان پر اتمامِ حجت کر دیا گیا تو اب وہ بجا طور پر اس کے مستحق ہیں کہ عذاب کا کوڑا ان پر برسے اور ان کی گردنیں دبوچ لی جائیں۔ اس آیتِ کریمہ کے دوسرے جملے میں اسی بات کا جواب دیا گیا ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے طور اطوار ہر طرح سے انہیں عذاب کا مستحق بناتے ہیں اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انہیں اللہ کی زمین پر زندہ چھوڑا جائے لیکن اللہ کی ذات اپنی ایک شان رکھتی ہے، اس کے اپنے قوانین ہیں۔ وہ اگر انسانوں کی نافرمانیوں پر انسانوں ہی کی طرح پکڑنے میں جلدی کرتا تو زمین میں کوئی شخص چلتا پھرتا نظر نہ آتا کیونکہ انسانوں میں کون ایسا ہے جس سے کبھی غلطی کا صدور نہیں ہوتا۔ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے وہ ہمیشہ اپنے بندوں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتا ہے۔ معافی مانگنے والوں کو بے دریغ بخشتا ہے اور اپنی بداعمالیوں پر اصرار کرنے والوں کو بھی جلدی پکڑنے کی بجائے مہلت پر مہلت دیتا چلا جاتا ہے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ لوگ اپنی حالت پر غور کریں اور اپنی اصلاح کر لیں۔ ان کی بداعمالیاں انہیں تباہی کا مستحق ثابت کرتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ تباہی کے فیصلے کو ٹالتا رہتا ہے اور ان کیلئے سنبھل جانے کے مواقع کو دراز کرتا چلا جاتا ہے۔ اللہ کی رحمت پر مبنی اس رویئے کو دیکھتے ہوئے ہر سلیم الفطرت آدمی یہ تسلیم کرے گا کہ اللہ کی دوسری بے شمار عنایات اپنی جگہ، اس کی یہی عنایت کہ وہ مہلت پہ مہلت دیتا چلا جاتا ہے اتنی بڑی نعمت ہے کہ جس پر بندوں کو اس کا شکرگزار ہونا چاہیے۔ لیکن یہ انسان کی کوتاہ فکری ہے کہ وہ بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کے اور گمراہی پر دلیر ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت اپنے اندر ابدیت کی شان رکھتی ہے۔ اس کا کوئی لفظ بھی فنا ہو جانے والا نہیں۔ اس میں بیان کردہ ہر مضمون ہمیشہ کیلئے اپنے اندر تازگی اور شادابی رکھتا ہے۔ اس میں جو بات اس دور کے لوگوں کیلئے کہی گئی ہے جب قرآن کریم نازل ہو رہا تھا وہ آج بھی حقیقتِ ثابتہ اور قیامت تک کیلئے واجب العمل ہے۔

متذکرہ بالا آیاتِ کریمہ میں جو بات نہایت برہمی سے مشرکینِ مکہ سے کہی گئی ہے ہر دور کی اسلامی دنیا ہمیشہ اس کی مخاطب رہے گی۔ اگر اس دور میں اللہ کی عطا کردہ نعمتوں اور زندگی کے معاملات میں تحلیل و تحریم یعنی قانون سازی کا حق اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں تھا تو آج بھی نہیں ہے اور قیامت تک نہیں ہوگا۔ اس آئینہ میں عالمِ اسلام کو بالعموم اور اہلِ پاکستان کو بالخصوص یہ سوچنا چاہیے کہ ہم نے یہ ملک اللہ سے اسلام کے نام پر لیا تھا۔ ہم نے اسے

Marfat.com

اسلامی تجربہ گاہ بنانے کا عہد کیا تھا اور پھر قراردادِ مقاصد کی منظوری سے اس اقرار و اعتراف کو قانونی شکل دی تھی اور 1973ء کے آئین میں اللہ سے اور اہل پاکستان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ 7 سال کے عرصے میں کوئی ایسا قانون جو غیر اسلامی ہو باقی نہیں رہ سکے گا اور ملک کے گوشے گوشے میں ہم اسلامی زندگی کے احیاء اور آسانی کیلئے امکانات بلکہ محرکات پیدا کریں گے۔ لیکن ہم نے آج تک جو کچھ کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم ہر قدم پر اسلام سے دور اور کفر کے قریب ہوتے چلے گئے ہیں۔ کل تک وہ غیر اسلامی باتیں جنہیں کبھی زبان پر لانے کی جرأت نہیں ہوتی تھی آج زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ آج تحلیل و تحریم کا حق ہم پوری طرح اپنے قبضے میں لے چکے ہیں۔ جسے چاہتے ہیں حلال کرتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں حرام ٹھہراتے ہیں۔ ایمان و استقامت کو ہم نے بنیاد پرستی کا نام دے دیا ہے اور اخلاص و للّٰہیت کو انتہا پسندی کا۔ اللہ کے راستے میں قربانی و ایثار اب قدامت پرستی ہے اور اعلائے کلمۃ الحق اور غیرت و خودداری کو ہم نے دہشت گردی سے تعبیر کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

لیکن قرآنِ کریم مشرکینِ مکہ کی طرح ہم سے بھی پوچھ رہا ہے کہ کیا تمہیں اس طرح کے اختیارات اللہ نے دیئے ہیں کہ تم الفاظ کے طوطے مینا اڑاتے ہوئے اور دشمن قوتوں کا ہوّا دکھاتے ہوئے جائز کو ناجائز کر دو اور ناجائز کو جائز۔ حُسن و قبح کے پیمانے بدل ڈالو، اسلامی روایات کو پامال کر دو، ملک کے استقلال اور آزادی کو سوالیہ نشان بنا دو، آخر ان باتوں کا جواب اللہ کے سامنے جا کر کیا دو گے۔ اور تم نے کبھی سوچا ہے کہ قیامت میں اس کے عدل میں تم پر کیا گزرے گی۔ یہ قدرت کا فضل و احسان ہے کہ اس نے ڈھیل دے رکھی ہے کہ ہم اپنے اعمال کا احتساب کر سکیں اور ساتھ ہی زلزلے کی صورت میں ایک بڑا دھچکا بھی دیا ہے لیکن اگر ہم نے اپنا احتساب نہ کیا اور اپنے آپ کو بدلنے کی کوشش نہ کی تو پھر اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے:

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیرگیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ

وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُونَ مِنْ
عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ
عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ
اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٦١﴾ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ
اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا

Marfat.com

يَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ؕ لَا
تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؕ ﴿۶۴﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ
قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ؕ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۵﴾ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ
مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا
يَخْرُصُوْنَ ﴿۶۶﴾ هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ
مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ
وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِىُّ ؕ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ اِنْ
عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾
قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ ﴿۶۹﴾
مَتَاعٌ فِى الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ
الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع

(اور آپؐ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور قرآن سے جو بھی آپ پڑھ کر سناتے ہیں اور (اے مسلمانو!) تم جو کام بھی کرتے ہو ہم تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں، زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی۔ مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔ یاد رکھو

Marfat.com

بے شک جولوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ان پر کوئی ڈر ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جولوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔ ان کیلئے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔ اللہ کی باتیں تبدیل نہیں ہوتیں یہی وہ بڑی کامیابی ہے۔ اور آپ کو غمزدہ نہ کریں ان کی باتیں، یقیناً ساری عزت اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز جاننے والا ہے۔ آگاہ رہو! کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اور جولوگ اللہ کے ماسوا کو پکارتے ہیں یہ شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے بلکہ وہ نرے وہم و گمان کے پیرو ہیں۔ اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔ وہی ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا (تا کہ تم اس میں معاش کیلئے جدوجہد کرو) بیشک اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو بات کو سنتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے۔ وہ ایسی باتوں سے پاک ہے، وہ بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جس کا تم کو علم نہیں۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے کہ بیشک جولوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ ان کیلئے بس دنیا میں چند روز فائدہ اٹھالینا ہے۔ پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے۔ پھر ہم انہیں عذابِ شدید چکھائیں گے کیونکہ یہ کفر کیا کرتے تھے۔ اور پڑھ کر سناؤ انہیں حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم کے لوگو! اگر گراں ہوگیا ہے تم پر تمہارے درمیان میرا رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں میرا نصیحت کرنا تو میں نے تو بس اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔ تم اپنی رائے مجتمع کرلو اور اپنے شریکوں کو بھی بلالو پھر تمہارے فیصلہ میں کوئی تذبذب باقی نہ رہے پھر کر گزرو میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے بنوں۔)

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ ۚ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝

(اور آپؐ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اور قرآن سے جو بھی آپؐ پڑھ کر سناتے ہیں اور (اے مسلمانو!) تم جو کام بھی کرتے ہو ہم تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں جس وقت تم اس میں مشغول ہوتے ہو۔ اور تیرے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں، زمین میں نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی۔ مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔) ﴿یونس: ٦١﴾

مخالفتوں کے ہجوم میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی

اگر ہم مکہ معظمہ کا وہ منظر ذہن میں رکھیں جب قرآن کریم آنحضرت ﷺ پر نازل ہو رہا تھا اور آپؐ اس امانت کو مکہ کے رہنے والوں تک پہنچانے کی سعی بلیغ فرما رہے تھے۔ شروع میں تو ایک مدت تک آپؐ یہ عظیم فریضہ تنہا انجام دیتے رہے پھر جیسے جیسے لوگ اسلام قبول کرتے گئے ویسے ویسے دعوت کے معاونین میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب اللہ کے دین کو پہنچانے کا کام جس طرح نبی کریم ﷺ ادا کر رہے تھے اسی طرح صحابہ کرامؓ بھی کبھی آپؐ کے ساتھ مل کر اور کبھی الگ اس فریضۂ الٰہی سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کے جواب میں مشرکین مکہ کی طرف سے جو سلوک ہو رہا تھا وہ بھی تاریخ کے کسی طالب علم سے مخفی نہیں۔ زندگی کا کوئی دکھ ایسا نہیں جو مشرکین کی جانب سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو پہنچایا نہ ہو۔ اس کی وسعت کا اندازہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشادِ مبارک سے ہوتا ہے کہ آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے ایک دفعہ فرمایا کہ میں اس راستے میں جو ستایا گیا ہوں، کوئی پیغمبر اس قدر ستایا نہیں گیا۔ حالانکہ کئی پیغمبر اس راستے میں شہید بھی ہوئے لیکن شہادت بہت بڑی قربانی ہونے کے باوجود ایک تکلیف ہے۔ شہ رگ کٹ جانے کے بعد اس تکلیف کا احساس جاتا رہتا ہے۔ لیکن وہ تکلیفیں اور اذیتیں جو مسلسل دی جاتیں اور پھر جن کی چوٹ دل

Marfat.com

گہرائیوں تک اتر جاتی ہے اس کی شدت اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں نے سالہاسال تک جسمانی اذیتیں بھی برداشت کیں اور دل و دماغ کے چرکے بھی سہے۔ آپؐ کے راستے میں صرف کانٹے نہیں بچھائے گئے، آپؐ کے سر مبارک پر صرف خاک نہیں ڈالی گئی، آپؐ کے مبارک گلے میں صرف پٹکا نہیں ڈالا گیا بلکہ آپ کو بیٹیوں کے صدمے سے بھی دوچار کیا گیا۔ آپؐ کی دو بیٹیاں ابولہب کے بیٹوں سے منسوب تھیں۔ انہوں نے باپ کے کہنے پر نہ صرف آپؐ کے سامنے آپؐ کی بیٹیوں کو طلاقیں دیں بلکہ آپؐ کے روئے مبارک پر ان میں سے ایک بدبخت نہیں تھوکنے کی کوشش بھی کی، جس پر برہم ہو کر آپؐ نے فرمایا: یااللہ اس پر اپنا کتا مسلط فرما۔ چنانچہ وہ ایک تجارتی سفر میں اپنے ہمسفروں کے ساتھ تمام احتیاطی تدابیر بروئے کار لا کے سو رہا تھا کہ رات کے کسی حصے میں شیر آیا تو دوسروں کے اوپر سے گزرتا ہوا اس تک پہنچا اور اسے اٹھا کر لے گیا اور صبح اس کے ساتھیوں نے اس کی لاش اس طرح دیکھی کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ محفوظ نہیں تھا۔

آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والے بھی اپنی اپنی جگہ ایسی ہی اذیتوں کا سامنا کر رہے تھے۔ ان کو مارا پیٹا بھی جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ طعن و تشنیع کے ذریعے ان کے سینوں کو بھی چھلنی کیا جا رہا تھا۔ وہ جب اس بات کی دعوت دیتے کہ لوگو! اس کلمے کو قبول کرو جس کے نتیجے میں تمہیں دنیا کی سرفرازی بھی ملے گی اور آخرت کی سرخروئی بھی۔ اور اگر تم نے اس کلمے سے وفاداری کا حق ادا کیا تو ایک وقت آئے گا جب قیصر و کسریٰ تمہارے قدموں میں پڑے ہوں گے۔ تمہارے گھروں میں رزق کی فراوانی ہو گی۔ مخالفین یہ باتیں سن کر یا تو اور برہم ہو جاتے اور یا ان کا تمسخر اڑاتے کہ ذرا ان کنگلوں کو دیکھو، نہ انہیں کھانے کو ملتا ہے اور نہ پہننے کو۔ جوتے تک نصیب نہیں، لیکن دعوے ہیں قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے۔ رہنے کو جھونپڑا میسر نہیں اور خواب محلوں کے دیکھے جا رہے ہیں۔ اس طرح راہ چلتے ان کا مذاق اڑایا جاتا۔ لیکن قربان جایئے ان کی استقامت پر کہ آنحضرت ﷺ کی تربیت نے نہ جانے ان میں کیا بجلیاں بھر دی تھیں کہ دشمن ہر ممکن طریقے سے انہیں ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور زندگی ان کیلئے دشوار بنا دی گئی تھی لیکن قرآن کریم ان کی محنت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ۔ اَفَاضَ کا صلہ جب فِیْ کے ساتھ آتا ہے تو اس کا معنی کسی چیز میں غایت درجہ انہماک کے ہوتے ہیں تو آیت کے اس جملے کا معنی یہ ہو گا کہ تم ساری مخالفتوں کے باوجود جب دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتے ہو تو تمہارے انہماک میں کوئی کمی نہیں آتی۔ دشمن اپنا کام کرتا ہے اور تم اپنا کام کرتے ہو۔ نبی کریم ﷺ تو اس معاملے میں اسوۂ کاملہ ہیں ہی لیکن حیرانی تو ان کے متبعین پر ہے کہ ان میں اکثریت بھوکے ننگے غریب لوگوں کی ہے۔ لیکن نہ جانے آنحضرت ﷺ کی تربیت نے ان میں اتنا وقار، اتنی سربلندی، اتنی استقامت اور اتنا استقلال کیسے بھر دیا تھا کہ وہ کسی مخالفت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے سینوں پر پتھر کی سلیں رکھ دی جاتیں تاکہ وہ دب کے مر جائیں، لیکن ان کی زبان سے اللہ احد کی صدائیں گونجتی تھیں۔ جب یہ ایمان افروز منظر مکہ کی وادیوں میں جگہ جگہ بہار دے رہا تھا تو اللہ فرماتا ہے کہ اے پیغمبر اور اے مسلمانو! یہ مت سمجھنا کہ ہم نے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہاری یہ ساری قربانیاں اللہ کی رضا کے حصول کیلئے ہیں۔ تم جان دے کر بھی صرف اس کی رضا کے طلبگار ہو اس لئے ہم دنیا ہی میں تمہیں اس کا یہ صلہ دے رہے ہیں کہ ظالم تو تمہیں ادھیڑنے کھدیڑنے میں لگے ہوتے ہیں لیکن ہم تمہیں نہایت پیار بھری نگاہ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی دشمنیاں تو وقتی چیز ہیں، بہت جلد ان کا اختتام ہونے والا ہے۔ لیکن اللہ کی نگاہ سے نہ جانے کیسے کیسے مدارج پیدا ہونے والے ہیں اور ویسے بھی ایک محب اور عاشق کیلئے اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ میرا محبوب مجھے محبت سے دیکھ رہا ہے۔ چاہنے والے تو اس وارفتگی میں زندگی گزار دیتے ہیں کہ محبت سے نہ سہی کوئی ہمیں سرسری نگاہ سے تو دیکھ رہا ہے، ہمارے لئے اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے۔ ٹھیک کہا کسی نے:

گو سرسری ہی دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں
ہم خوش ہیں کہ ہیں کسی کی نگاہ میں

اس طرح سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے کہ تم ہر وقت ہماری نگاہوں میں ہو اور ہم ہر وقت تمہارے ساتھ موجود ہیں۔ قریش مکہ کا بڑے سے بڑا فیصلہ بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ چنانچہ حالات نے ثابت کر دیا کہ وہ جیسے جیسے درندگی پر اترتے گئے ویسے ویسے زمین ان کیلئے سمٹتی گئی اور مسلمانوں کیلئے ہجرت کے راستے آسان ہوتے گئے۔ انہوں نے دعوت کے اس عمل کو روکنے کیلئے آخری فیصلہ آنحضرت ﷺ کے قتل کا کیا لیکن اس میں بھی انہیں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ آپؐ وہاں سے بخیریت تمام نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اہل مکہ کو اگرچہ اپنی ناکامی کا دکھ ہوا لیکن ساتھ ہی

Marfat.com

ایک اطمینان بھی ہوا کہ چلئے ہماری جان چھوٹ گئی، اب اجنبی وطن خود انہیں تباہ کر دے گا۔ لیکن 8 ہی سالوں میں اللہ نے اس طرح مدد فرمائی کہ قریش مکہ جو اپنے آپ کو قوت کا سرچشمہ سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ کے سامنے جان کی بھیک مانگتے ہوئے نظر آئے اور مکہ کی قوت ہمیشہ کیلئے اسلام کے سامنے سرنگوں ہوگئی اور اللہ کا گھر، اللہ کی بندگی کیلئے آزاد ہوگیا۔

مسلمانوں کو تسلی کے ساتھ ساتھ قریش مکہ کو اس آیت میں تنبیہ بھی کی جارہی ہے کہ تم یہ مت سمجھو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ اللہ کی نگاہ سے مخفی ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی ذرہ برابر چیز بھی اس سے مخفی نہیں رہ سکتی بلکہ ذرہ سے چھوٹی چیزیں جنہیں غیر مسلح نگاہ نہیں دیکھ سکتی وہ بھی اللہ سے مخفی نہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ہر چیز اللہ کی نگاہ میں ہے بلکہ وہ کتابِ مبین جو مخلوقاتِ الٰہیہ کے حالات وحوادث کا مخزن و منبع ہے، اس میں بھی ایک ایک چیز محفوظ ہے۔ اس حفاظت اور شہادت سے جس طرح مسلمانوں کے اجر و ثواب اور رفع درجات میں اضافہ ہوگا اسی طرح کافروں کا ایک ایک جہنم کے انگاروں میں تبدیل ہوتا جائے گا جس کے نتیجے میں اللہ کا گروہ سرفراز ہوگا اور دشمنوں کے گروہ خائب و خاسر ہوں گے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ﴿یونس : ۶۲، ۶۳، ۶۴﴾

(یاد رکھو بے شک جو لوگ اللہ کے دوست ہیں نہ ان پر کوئی ڈر ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جو لوگ ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔ ان کیلئے خوشخبری ہے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں۔ اللہ کی باتیں تبدیل نہیں ہوتیں یہی وہ بڑی کامیابی ہے۔)

محولہ بالا لوگ ھی اولیاء اللہ ھیں

گزشتہ آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے اللہ کے راستے میں ان کی سرگرمیوں کا اعتراف فرمایا گیا تھا اور ضمناً یہ بات کہی گئی تھی کہ جو لوگ ایمان لانے کے بعد اللہ کے راستے میں سرفروشی اور جانسپاری دکھاتے ہیں دنیا انہیں ایمان کے حوالے سے کچھ بھی کہے اور کیسی بھی اذیتیں پہنچائے ان کے ایمان و عمل اور ان کی سرگرمی اور استقامت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا یہ بجا طور پر اس قابل ہیں کہ اللہ کی نظرِ عنایت کے مستحق ٹھہریں۔ چنانچہ اب اس کے فوراً بعد اولیاء اللہ کا ذکر فرما کر شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ درحقیقت یہی لوگ ہیں جو اولیاء اللہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ دنیا نے نفع و ضرر کے کیسے کیسے پیمانے بنا رکھے ہیں۔ اسی طرح دنیا کی نعمتوں کے حوالے سے انہوں نے خوف و حزن کے کیسے کیسے بت دلوں میں سجا رکھے ہیں۔ لیکن اللہ کے ولیوں کا حال یہ ہے کہ بڑے سے بڑا خطرہ ان کے اندر خوف کی لہر پیدا نہیں کرتا اور بڑی سے بڑی قربانی ان کیلئے پچھتاوا نہیں بنتی۔ وہ چونکہ اللہ کے قرب کو اپنی منزل بنا کر اللہ کے ولی بن چکے ہیں اس لئے ان کے خوف و حزن کے سابقے اور لاحقے دنیا سے بالکل الگ ہیں۔ اہل دنیا ان سے سب کچھ چھین کر یہ سمجھتی ہے کہ ہم نے شاید انہیں پریشان کر دیا اور انہیں محرومیوں کے حوالے کر دیا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتے کہ ان کی خوشیاں ان چیزوں میں نہیں جو ان سے چھینی جارہی ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کو کیا خبر کہ ہماری جنت ہمارے دل میں ہے۔ وہ اسے ہم سے کس طرح چھین سکتے ہیں۔ بعض اہل اللہ کے بارے میں مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے کہ دنیا کو اگر پتہ چل جائے کہ ہم جس بوریئے پر بیٹھتے ہیں اور جس جائے نماز پر نماز پڑھتے ہیں ہمیں اس سے کیا ملتا ہے۔ تو وہ ہم سے یہ بھی چھین کر لے جائیں اور ہمارے اطمینان اور آسودگی کو دیکھ کر وہ ہمارے بوریئے کے نیچے سے زمین کھودنا شروع کر دیں کہ شاید اس کے نیچے کوئی خزانہ نکلے گا۔ وہ دنیا میں بھی خدا مستی کی وجہ سے نہایت بے خوفی کی زندگی گزارتے ہیں اور آخرت میں تو یقیناً دوسرے اہل جنت کی طرح ایک ایسی زندگی گزاریں گے جس میں خوف و حزن کا گزر تک نہیں ہوگا۔ اس سے اگلی آیت میں ایک غلط فہمی کو دور فرمایا گیا کہ لوگ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ اللہ کا ولی ہونا ایک ایسا مرتبہ ہے جو نبوت کی طرح اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ اللہ کے ولی بننے کیلئے محنت درکار ہے۔ یہ ایک اکتسابی صفت ہے جو اللہ کی توفیق سے آدمی محنت سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے دو کنارے ہیں۔ پہلا کنارہ ایمان ہے اور دوسرا تقویٰ ہے۔ ان دونوں میں بے شمار مدارج ہیں جو آدمی اللہ کی توفیق اور مدد سے ان میں بڑھتا چلا جاتا ہے وہ اللہ کی ولایت کا مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ ابتدائی بات سمجھنے کیلئے تو اس قدر گزارشات بھی کافی ہیں لیکن مزید کچھ جاننے کیلئے ہم معارف القرآن سے استفادہ کرتے ہیں۔ مفتی صاحب محترم اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

Marfat.com

اولیاء کی تحقیق

(اولیاء ولی کی جمع ہے، لفظ ولی عربی زبان میں قریب کے معنی میں بھی آتا ہے اور دوست و محب کے معنی میں بھی، اللہ تعالیٰ کے قرب و محبت کا ایک عام درجہ تو ایسا ہے کہ اس سے دنیا کا کوئی انسان وحیوان بلکہ کوئی چیز بھی مستثنیٰ نہیں، اگر یہ قرب نہ ہو تو سارے عالم میں کوئی چیز وجود ہی میں نہیں آ سکتی، تمام عالم کے وجود کی اصل علت وہی خاص رابطہ ہے جو اس کو حق تعالیٰ شانہٗ سے حاصل ہے گو اس رابطہ کی حقیقت کو نہ کسی نے سمجھا اور نہ سمجھ سکتا ہے، مگر ایک بے کیف رابطہ کا ہونا یقینی ہے، مگر لفظ اولیاء اللہ میں یہ درجہ ولایت کا مراد نہیں بلکہ ولایت و محبت اور قرب کا ایک دوسرا درجہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے ساتھ خاص ہے، یہ قرب محبت کہلاتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ قرب خاص حاصل ہو وہ اولیاء اللہ کہلاتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ نفلی عبادات کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں۔ وہ جو کچھ سنتا ہے میرے ذریعہ سنتا ہے، میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، وہ جو کچھ دیکھتا ہے مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں ہی اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں وہ جو کچھ کرتا ہے مجھ سے کرتا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کی کوئی حرکت وسکون اور کوئی کام میری رضا کے خلاف نہیں ہوتا۔

اور اس ولایت خاصہ کے درجات بے شمار اور غیر متناہی ہیں، اس کا اعلیٰ درجہ انبیاء علیہم السلام کا حصہ ہے کیونکہ ہر نبی کا ولی اللہ ہونا لازمی ہے اور اس میں سب سے اونچا مقام سید الانبیاء نبی کریم ﷺ کا ہے اور ادنیٰ درجہ اس ولایت کا وہ ہے جس کو صوفیائے کرام کی اصطلاح میں درجہ فناء کہا جاتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں ایسا مستغرق ہو کہ دنیا میں کسی کی محبت اس پر غالب نہ آئے، وہ جس سے محبت کرتا ہے تو اللہ کیلئے کرتا ہے جس سے نفرت کرتا ہے تو اللہ کیلئے کرتا ہے اس کے حب و بغض اور محبت و عداوت میں اپنی ذات کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں مشغول رہتا ہے اور وہ ہر ایسی چیز سے پرہیز کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند ہو۔ اسی حالت کی علامت ہے کثرت ذکر اور دوام طاعت یعنی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا اور ہمیشہ ہر حال میں اس کے احکام کی اطاعت کرنا، یہ دو وصف جس شخص میں موجود ہوں وہ ولی اللہ کہلاتا ہے جس میں ان دونوں میں سے کوئی ایک نہ ہو وہ اس فہرست میں داخل نہیں، پھر جس میں یہ دونوں موجود ہوں اس کے درجات ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی حد نہیں، انہیں درجات کے اعتبار سے اولیاء اللہ کے درجات متفاضل اور کم و بیش ہوتے ہیں۔

ایک حدیث میں بروایت حضرت ابو ہریرہؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ اس آیت میں اولیاء اللہ سے کون لوگ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ لوگ جو خالص اللہ کیلئے آپس میں محبت کرتے ہیں، کوئی دنیاوی غرض درمیان میں نہیں ہوتی (مظہری از ابن مردویہ) اور ظاہر ہے کہ یہ حالت انہیں لوگوں کی ہو سکتی ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔

یہاں ایک سوال اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس درجۂ ولایت کے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں فرمایا کہ امت کے افراد کو یہ درجہ ولایت رسول کریم ﷺ ہی کے فیض صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ کا وہ رنگ جو آنحضرت ﷺ کو حاصل تھا اپنے حوصلہ کے مطابق اس کا کوئی حصہ امت کے اولیاء کو ملتا ہے پھر یہ فیض صحبت صحابہ کرامؓ کو بلا واسطہ حاصل تھا، اسی وجہ سے ان کا درجۂ ولایت تمام امت کے اولیاء و اقطاب سے بالاتر تھا، بعد کے لوگوں کو یہی فیض ایک واسطہ یا چند واسطوں سے حاصل ہوتا ہے جتنے وسائط بڑھتے جاتے ہیں اتنا ہی اس میں فرق پڑتا جاتا ہے، یہ واسطہ صرف وہی لوگ بن سکتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے رنگ میں رنگے ہوئے آپ کی سنت کے پیرو ہیں۔ ایسے لوگوں کی کثرت سے مجالست اور صحبت جبکہ اس کے ساتھ ان کے ارشادات کی پیروی اور اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت بھی ہو، یہی نسخہ ہے درجۂ ولایت حاصل کرنے کا جو تین جزء سے مرکب ہے، کسی ولی اللہ کی صحبت، اس کی اطاعت اور ذکر اللہ کی کثرت۔ بشرطیکہ یہ کثرت ذکر مسنون طریقہ پر ہو کیونکہ کثرت ذکر سے آئینہ قلب کو جلا ہوتی ہے تو وہ نور ولایت کے انعکاس کے قابل بن جاتا ہے، حدیث میں ہے کہ ہر چیز کیلئے صیقل اور صفائی کا کوئی طریقہ ہوتا ہے، قلب کی صیقل ذکر اللہ سے ہوتی ہے، اس کو بیہقی نے بروایت ابن عمرؓ نقل فرمایا، (مظہری)

اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو کسی قوم سے محبت کرتا ہے مگر عمل کے اعتبار سے ان کے درجہ تک نہیں پہنچتا؟ آپ نے فرمایا اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ یعنی ہر شخص اسی کے ساتھ ہوگا جس سے

Marfat.com

اس کو محبت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی محبت وصحبت انسان کیلئے حصول ولایت کا ذریعہ ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت زرینؓ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے حضرت زرینؓ سے فرمایا کہ میں تمہیں دین کا ایسا اصول بتلاتا ہوں جس سے تم دنیا وآخرت کی فلاح وکامیابی حاصل کر سکتے ہو، وہ یہ ہے کہ اہل ذکر کی مجلس وصحبت کو لازم پکڑو اور جب تنہائی میں جاؤ تو جتنا زیادہ ہو سکے اللہ کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت دو جس سے محبت کرو اللہ کیلئے کرو جس سے نفرت کرو اللہ کیلئے کرو۔ (مظہری)

مگر یہ صحبت ومجالست انہیں لوگوں کی مفید ہے جو خود ولی اللہ متبع سنت ہوں اور جو رسول کریم ﷺ کی سنت کے تابع نہیں وہ خود درجۂ ولایت سے محروم ہیں، چاہے کشف وکرامات ان سے کتنے ہی صادر ہوں اور جو شخص مذکورہ صفات کے اعتبار سے ولی ہو اگرچہ اس سے کبھی کوئی کشف وکرامت ظاہر نہ ہوئی ہو وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہے۔ (مظہری)

اولیاء اللہ کی علامت اور پہچان تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے اولیاء میرے بندوں میں سے وہ لوگ ہیں جو میری یاد کے ساتھ یاد آئیں اور جن کی یاد کے ساتھ میں یاد آؤں۔ اور ابن ماجہ میں بروایت حضرت اسماءؓ بنت یزید مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اولیاء اللہ کی یہ پہچان بتلائی اَلَّذِيْنَ اِذَا رُءُوْا ذُكِرَ اللّٰهُ یعنی جن کو دیکھ کر خدا یاد آئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر انسان کو اللہ کے ذکر کی توفیق اور دنیاوی فکروں کی کمی محسوس ہو، یہ علامت اس کے ولی اللہ ہونے کی ہے۔

تفسیر مظہری میں فرمایا کہ عوام نے جو اولیاء اللہ کی علامت کشف وکرامت یا غیب کی چیزیں معلوم ہونے کو سمجھ رکھا ہے یہ غلط اور دھوکہ ہے، ہزاروں اولیاء اللہ ہیں جن سے اس طرح کی کوئی چیز ثابت نہیں اور اس کے خلاف ایسے لوگوں سے کشف اور غیب کی خبریں منقول ہیں جن کا ایمان بھی درست نہیں۔

آخرِ آیت میں جو یہ فرمایا گیا کہ اولیاء کیلئے دنیا میں بھی خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی، آخرت کی خوشخبری تو یہ ہے کہ موت کے وقت جب اس کی روح کو اللہ کے پاس لے جایا جائے گا اس وقت اس کو خوشخبری جنت کی ملے گی پھر قیامت کے روز قبر سے اٹھنے کے وقت جنت کی خوشخبری دی جائے گی جیسا کہ طبرانی نے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہل لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو نہ موت کے وقت کوئی وحشت ہوگی نہ قبر میں اور نہ قبر سے اٹھنے کے وقت، گویا میری آنکھیں اس وقت کا حال دیکھ رہی ہیں جب یہ لوگ اپنی قبروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اٹھیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارا غم دور کر دیا۔

اور دنیا کی بشارت کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ سچی خوابیں جو انسان خود دیکھے یا اس کیلئے کوئی دوسرا دیکھے جن میں ان کیلئے خوشخبری ہو۔ (رواہ البخاری عن ابی ہریرۃؓ)

اور دنیا کی دوسری بشارت یہ ہے کہ عام مسلمان بغیر کسی غرض کے اس سے محبت کریں اور اچھا سمجھیں، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ یعنی عام مسلمانوں کا اچھا سمجھنا اور تعریف کرنا مومن کیلئے نقد خوشخبری ہے۔ (مسلم وبغوی)

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۭ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٥﴾ ﴿یونس : ٦٥﴾

(اور آپ کو غمزدہ نہ کریں ان کی باتیں، یقیناً ساری عزت اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ وہ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز جاننے والا ہے۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

گزشتہ چار آیات التفات کی آیات ہیں جن میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ آپ جن حالات سے گزر رہے ہیں آپ کا خالق ومالک ان سے بے خبر نہیں۔ آپ جس حال میں بھی ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہوتا ہے، آپ کو دیکھتا ہے، آپ کے مراتب بلند فرماتا ہے اور آپ کیلئے آسانیاں مہیا کرتا ہے۔ لیکن تسلی کی ان آیات میں چونکہ پروردگار نے مسلمانوں کو مزید کامیابیوں کی خوشخبریاں بھی دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تک نبی کریم ﷺ کامیاب مستقبل کی جو نوید سناتے رہے ہیں اس کے ظہور کا وقت قریب آرہا ہے۔ قربانیاں دینے والوں کی قربانیاں رنگ لانے والی ہیں۔ جہاد وغزا کی فصل اب پکنے والی ہے۔ ایسی صورتحال میں یہ کیسے ممکن تھا کہ دین کے جو دشمن مسلمانوں پر پھبتیاں کستے رہے ہیں اور

Marfat.com

مستقبل میں اللہ کی تائید ونصرت کے وعدوں کا تمسخراڑاتے رہے ہیں وہ ان آیات کے نزول کے بعد خاموش رہیں اور مسلمانوں کی دلآزاری کو ترک کردیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قریش مکہ نے ان آیات کے نزول کے بعد اپنے معمولات شنیعہ میں اور شدت پیدا کردی اور مسلمانوں کی دلآزاری کو اپنا معمول بنالیا۔ چنانچہ پیش نظر آیت کریمہ میں اس صورتحال کا نوٹس لیتے ہوئے پروردگار نے آنحضرت ﷺ کو مزید تسلی دی ہے۔ کہ قریش مکہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اور انہوں نے جس طرح کا وطیرہ بنالیا ہے، آپ ہرگز اس سے اثر قبول نہ کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ بار بار آپ کی عظمتوں کا تمسخراڑاتے ہیں۔ وہ بہانے بہانے سے آپ کی شخصیت کو نشانہ بناتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے، آپ سے بڑھ کر کون جانتا ہے کہ عزت کے خزانے اللہ کے پاس ہیں۔ خرافات بکنے، دوسروں کی عزتوں پر حملہ کرنے اور اپنی بڑائی کا دعویٰ کرنے سے عزت نہیں مل جاتی۔ اور اگر بظاہر عزت ملے بھی تو وہ دیرپا نہیں ہوتی۔ حقیقی عزت صرف اللہ کی عطا سے ملتی ہے۔ اس نے آپ کو دنیا وآخرت میں عزتیں دینے اور مقامات بلند کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آپ کے دشمن بھی آپ کی دشمنی کی وجہ سے جانے جائیں گے۔ اور آپ کے چاہنے والے تو آپ کی چاہتوں کو اپنا سرمایہ سمجھیں گے۔ پوری کائنات میں جہاں اللہ کا نام بلند ہوگا وہاں آپ کا بھی نام بلند ہوگا۔ اس لئے آپ ان کی یاوہ گوئی سے متاثر نہ ہوں۔ رقیبوں کا غوغا بھی کسی کی منزل کھوٹی نہیں کرتا۔ آپ تو انسانیت کا گل سرسبد ہیں۔ آپ کے رنگ وبو کو کون ماند کرسکتا ہے۔ مخالفین جو کچھ کہہ رہے ہیں اللہ اسے سن رہا ہے۔ اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں اللہ اسے جانتا ہے۔ اس لئے وہ ان کے ہر شر سے آپ کو محفوظ رکھے گا۔

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ؕ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ ﴿یونس : ٦٦﴾

(آگاہ رہو! کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے ماسوا کو پکارتے ہیں یہ شریکوں کی پیروی نہیں کررہے بلکہ وہ نرے وہم وگمان کے پیرو ہیں۔ اور اٹکل کے تیر تکے چلاتے ہیں۔)

انسان فریبِ نظر کا شکار ھے

گزشتہ آیت کریمہ میں ہم عرض کرچکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف التفات فرماتے ہوئے تسلی دی گئی ہے اور آپ کے مخالفین کو تنبیہ کی گئی ہے اور مخالفین جس بنیاد پر مسلمانوں اور آنحضرت ﷺ کا تمسخراڑاتے تھے اور اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھے اس کی تردید فرمائی گئی ہے۔ اب پیش نظر آیت کریمہ میں اس تردید پر دلیل ارشاد فرمائی جارہی ہے۔ کہ اے مشرکین مکہ تم اپنے آپ کو سرزمین عرب کی تمام عزتوں کا مالک سمجھتے ہو۔ بنابریں تم آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کا تمسخراڑاتے ہو اور دلیل تمہارے پاس یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا دین اللہ کا پسندیدہ دین ہوتا تو دنیاوی مال ودولت اور جاہ ومرتبہ ان کے پاس ہوتا کیونکہ یہی چیزیں دنیا میں عزت کی علامت سمجھی جاتی ہیں لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کل تک انتہائی فارغ البال اور ایک کامیاب تاجر تھے اور آپ پر ایمان لانے والوں میں حضرت ابوبکر صدیق ؓ اور ان جیسے دوسرے جلیل القدر صحابہ ؓ بھی اپنا وسیع کاروبار رکھتے تھے۔ لیکن اب اسلامی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے باعث اور قریش کی مخالفت کے سبب سے وہ سب نانِ شبینہ کے محتاج ہوکر رہ گئے ہیں اور دنیاوی عزت و وجاہت کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی پہلی حالت اللہ کے یہاں پسندیدہ حالت تھی اور اب وہ اللہ کی طرف سے راندۂ درگاہ لوگ ہیں اور ہم ان کے مقابلے میں دنیاوی جاہ وجلال کے مالک اور اللہ کے پسندیدہ لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مزعومات فاسدہ کے جواب میں صرف یہ فرماتے ہیں کہ دنیاوی مال ودولت اور جاہ واقتدار کبھی بھی عزت کی علامت نہیں رہے اور ان سے تہی دامن ہونا کبھی ذلت کا سبب نہیں رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بجائے آذر اور نمرود کو معزز ہونا چاہئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں فرعون کی قدر ومنزلت ہونی چاہئے۔ حقیقی قدر ومنزلت اللہ کی نگاہ میں ایمان کی پختگی اور کردار کی سربلندی سے ہے۔ اور یہی دونوں چیزیں حق وباطل میں کشمکش کے بعد کھرا سونا ثابت ہوتی اور عزت ومنقبت کے تخت پر فائز ہوتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں مال ودولت ہو یا اقتدار، وہ پانی پر اٹھتے ہوئے جھاگ کی مانند ہیں جن کی اٹھان دیکھ کر آدمی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا لیکن جلد ہی یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ انسان ہمیشہ فریبِ نظر کا شکار ہوتا ہے۔ اس کائنات کی اصل حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اللہ کی مخلوق اور اس کی مملوک ہے۔ وہی ایک آقا ہے باقی سب اس کے غلام ہیں۔ آقا کی عزت و

Marfat.com

حرمت سے وابستگی کیلئے ضروری ہے کہ آقا سے رشتہ باندھا جائے۔ اپنی ذات کو اس سے منسوب کیا جائے۔ اپنی بندگی کو اسی ایک آقا کے آستانے کی امانت بنا دیا جائے۔ اسی کے احکام انسانی زندگی کا طرزِ عمل بن جائیں۔ جس انسان یا جس گروہ نے اس آقا کا دامن تھام لیا اور اپنے آپ کو اس سے وابستہ کرلیا وہی درحقیقت عزت وافتخار کا سزاوار ٹھہرا۔ اس کے آقا کی عنایتیں اس کیلئے مخصوص ہوگئیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کا آستانہ چھوڑ کر دوسروں کے آستانوں پر جھکتے ہیں اور انہیں اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ درحقیقت جھوٹ بولتے ہیں کیونکہ کائنات میں کسی کا یہ درجہ نہیں کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک وسہیم ہو۔ اس لئے جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اللہ کے فلاں شریک کو پکار کر اس کی بندگی بجالاتا ہوں وہ ایک ایسا دعویٰ کرتا ہے جس کی حیثیت وہم وگمان کے سوا کچھ نہیں۔ جب کائنات میں اس کا کوئی شریک ممکن ہی نہیں کیونکہ مشرک قوتوں نے جن جن قوتوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے وہ سب اللہ کی مخلوق اور اللہ کے غلام ہیں۔ فرشتے اسی کی غلامی میں شب وروز بندھے ہوئے ہیں۔ جنات اس کے احکام سے سرتابی نہیں کرسکتے اور اگر کریں گے تو جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ عناصرِ فطرت اور عناصرِ قدرت سب اللہ کے احکام میں جکڑے ہوئے اور رات دن اس کی بندگی بجالا رہے ہیں۔ شمس وقمر کو دیوتا ماننے والے ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ وہ کس قدر اپنی ڈیوٹی میں بندھے ہوئے ہیں۔ کیا مجال ہے جو اپنے سفر میں راستہ بدل لیں یا اپنی منزل سے پس وپیش کرجائیں۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اللہ کے احکام کے مطابق اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہے تو جو شخص ان کو شریک ٹھہراتا ہے وہ درحقیقت جھوٹ بولتا ہے۔ وہ نام شرکاء کا لیتا ہے لیکن پیروی درحقیقت اپنے وہم وگمان کی کرتا ہے کیونکہ اس نے اپنے وہم وگمان میں کچھ لوگوں کو شریک بنا لیا ہے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں۔ اس لحاظ سے ان لوگوں کی زندگی پر وہم وگمان اور ظن وتخمین کی حکومت ہے۔ انسانی زندگی میں یہ حادثہ کسی ایک دور میں نہیں گزرا بلکہ شرک اور اہل شرک کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ جب بھی ان لوگوں نے ظاہر کے اس پردے کے پیچھے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی ہے، اور اس پوشیدہ حقیقت کا سراغ لگانا چاہا ہے جو انسان کی ہمیشہ مقصود رہی ہے تو انہوں نے فلسفیانہ تجسس سے اس کا آغاز کیا لیکن کبھی وہم وگمان سے آگے نہ بڑھ سکے۔ مشرکین تو توہم پرستی سے آگے سوچ ہی نہ سکے لیکن اشراقیوں اور جوگیوں نے اگرچہ بظاہر مراقبہ کو اس کا ذریعہ بنایا اور اس کے ذریعہ سے باطن کو دیکھنے کا دعویٰ کیا لیکن حقیقت میں وہ بھی وہم وگمان کی دلدل سے نہ نکل سکے۔ اصطلاحی فلسفیوں کا حال بھی ان سے مختلف نہیں۔ انہوں نے اگرچہ منطق استدلال اور مصنوعی تعقل کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ انہیں اپنی ناکامی پر ملال ہوتا اور وہ قرآنی فکر پر غور کرنے کی کوشش کرتے، انہوں نے اپنے اوہام اور خرافات پر تعصب کا ایسا پردہ تانا کہ دوسرے کی بات سننے اور غور کرنے سے محروم ہوگئے۔ اس کے برعکس قرآن کریم ہمارے سامنے غور وفکر کی ایک نئی بنیاد فراہم کرتا ہے جس کے کئی راستے ہیں۔ کبھی وہ خالصتاً عقل سے کام لیتا ہے اور مقدمات کو ترتیب دے کر بات کو واضح کرتا ہے۔ کبھی دلائلِ آفاق سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی دلائل انفس سے کام لے کر براہ راست دلوں پر دستک دیتا ہے اور کبھی کائنات کے فطری اصولوں کا حوالہ دے کر انسانی فطرت کو متوجہ کرتا ہے۔ غرضیکہ اس کے استدلال کے کئی رنگ ہیں جن میں آسان ترین وہ ہے جسے ہم استدلال فطری کہہ سکتے ہیں اور جن میں دلائلِ آفاق سے کام لیا جاتا ہے۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ؀

(وہی ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا (تاکہ تم اس میں معاش کیلئے جدوجہد کرو) بیشک اس میں ان لوگوں کیلئے نشانیاں ہیں جو بات کو سنتے ہیں۔) ﴿یونس: ٦٧﴾

قرآن کریم کا طریق استدلال

اس آیتِ کریمہ میں ظن وگمان پر استدلال کی بنیاد رکھنے کی بجائے ایسے حقائق سے استدلال کیا جارہا ہے جو ہمارے گردوپیش میں پھیلے ہوئے ہیں جنہیں ہم آفاق کے نام سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ زمین وآسمان دو ایسی حقیقتیں ہیں جن سے کوئی شخص بھی غافل نہیں ہوسکتا۔ ہر چلنے والا زمین پر چلتا ہے، زمین کی آغوش میں رہتا ہے اور آسمان کی چھت اس کے سر پر چھائی رہتی ہے۔ اس کی کتنی نعمتیں ہیں جو آسمان سے اترتی ہیں اور کتنی نعمتیں ہیں جو زمین سے مہیا ہوتی ہیں۔ انسانی زندگی کا رات دن ان دونوں سے واسطہ ہے۔ اس لئے سب سے پہلے دلائلِ آفاق میں سے ان دونوں کو دلیل کے طور پر پیش

Marfat.com

فرمایا ہے اوران کے اندر جو نشانیاں مستور ہیں ان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ان نشانیوں کا اگرچہ ذکر نہیں فرمایا لیکن غور کرنے سے بہت ساری چیزیں کھل کر سامنے آجاتی ہیں۔زمین وآسمان کے فیضان کو اگر ایک طرف بھی رکھ دیا جائے جس سے انسان کا دامن پوری طرح گراں بار ہے تب بھی کتنی چیزیں ہیں جو نگاہ کا دامن تھام لیتی ہیں۔مثلاً آدمی حیرت سے دیکھتا ہے کہ زمین اور آسمان اور اس میں کام کرنے والی قوتیں اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے درمیان اگر غور کیا جائے تو قدم قدم پر تخالف کا اندازہ ہوتا ہے۔کہیں بھی توافق نظر نہیں آتا۔دونوں کے درمیان ضدین کی نسبت ہے۔رات انسان کیلئے آرام وراحت کا بستر بچھاتی ہے تو دن اس کیلئے سرگرمیوں اور محنت ومشقت کا دروازہ کھولتا ہے۔لیکن ان دونوں ضدوں سے انسان کو قدم قدم پر وہ چیز میسر آتی ہے جو انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے۔آسمان کا سورج بظاہر آگ برساتا ہے اور جھلسی ہوئی زمین پانی مانگتی ہے۔پانی اور آگ کے درمیان تخالف کا رشتہ ہے۔دونوں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے۔لیکن ہم حیرانی سے دیکھتے ہیں کہ سورج کی کرنیں سمندر سے پانی کے ڈول بھر بھر کر کھینچتی ہیں اور فضاء میں ابر کی چادریں بچھا دیتی ہیں۔ہوا بظاہر ہر چیز کو اڑا دینے کی استعداد رکھتی ہے لیکن وہ ابر کو اڑانے کی بجائے کھینچ کر وہاں لے جاتی ہے جہاں پیاسی زمین منہ کھولے پکار رہی ہوتی ہے۔آسمان سے پانی برستا ہے،زمین اور آسمان میں مخالفت کا تعلق ہے۔ہونا یہ چاہئے کہ جب پانی برسے تو زمین اسے لینے سے انکار کر دے۔تو زمین کی آبیاری کا سامان نہ ہو سکے یا اس کو پورا نگل لے تو دلدل بن جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا،ضرورت کے مطابق اسے پی لیتی ہے اور باقی ندی نالوں میں بہہ کے ذخیرۂ آب میں جا شامل ہوتا ہے۔ہر بوئی ہوئی چیز سے زندگی کی سوئی نکلتی ہے۔سورج اسے جلانے کی بجائے اس کی پرورش کرتا ہے،ہوا اسے لوریاں دیتی ہے،موسم کے تغیرات اسے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں،بادل اس کی آبیاری کا سامان کرتے ہیں غرضیکہ بظاہر متخالف عناصر کسی کے حکم سے انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور ان سے ہر وہ کام بروئے کار آرہا ہے جس کی زمینی زندگی کیلئے انتہائی ضرورت ہے۔اس سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ کائنات نہ از خود پیدا ہوئی ہے اور نہ اس کا کوئی کرہ اپنے طور سے من مرضی کا اختیار رکھتا ہے بلکہ اس پر ایک بالاتر قوت حاکم ہے جو پورے نظام پر حاوی ہے اور وہ اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط وتعلق پیدا کر کے اس کو اپنی حکمت کے مطابق چلا رہی ہے۔قرآن کریم نے اسی طرزِ استدلال سے جابجا کام لیا ہے اور مخلوق سے خالق پر مربوب سے رب پر اور محتاج سے صمد پر استدلال فرما کر بات کو سمجھنا آسان فرما دیا ہے۔چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد صحابہ ؓ میں ان کے استدلال کا یہی طریقہ تھا اور ہر دور کے سلف صالحین اسی طریقہ پر استدلال کرتے رہے۔حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا گیا کہ آپ ؓ نے اپنے خالق کے وجود کو کیسے جانا؟ جواب دیا،شہتوت کے پتے سے۔سائل نے حیران ہو کر پوچھا کہ وہ کیسے؟ فرمایا:شہتوت کے پتے کو ریشم کا کیڑا کھاتا ہے تو ریشم بنتا ہے،ختن کا آہو کھاتا ہے تو اس کے ناف سے کستوری نکلتی ہے اور اگر کوئی اور جانور کھاتا ہے تو گوبر کر دیتا ہے۔شہتوت کے پتے میں کوئی خصوصیت ہوتی تو ہر جگہ اس کا اظہار ایک ہی صورت میں ہوتا۔یہ اظہار کی مختلف صورتیں اور مختلف چیزوں کا وجود میں آنا خود بولتا ہے کہ شہتوت کے پتے کے پیچھے کوئی ہاتھ کارفرما ہے اور یہ اسی کی کارفرمائیاں ہیں جسے ہم مختلف صورتوں میں دیکھ رہے ہیں۔پس وہ ہاتھ میرے خالق کا ہے۔قرآن کہتا ہے:

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ

(کیا وہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کو کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمان کو کیسے بنایا گیا؟ پہاڑوں کو کیسے میخوں کی طرح گاڑ دیا گیا؟ اور زمین کو کیسے بچھونے کی طرح بچھا دیا گیا؟)

یعنی ایک عرب چاہے وہ مالی لحاظ سے کتنا بھی گیا گزرا کیوں نہ ہو وہ جب آنکھ کھولتا تو اس کی نگاہ ان چار چیزوں پر ضرور پڑتی تھی۔وہ اونٹ پر سواری کرتا تھا۔آسمان پر بادل بہت کم آتے تھے۔اس لئے وہ کھلے آسمان کو ہمیشہ دیکھتا تھا،پہاڑ ہر وقت نظروں کے سامنے گڑے رہتے تھے،زمین پر وہ چلتا پھرتا تھا۔انہیں چار چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے کم سے کم عقل رکھنے والا آدمی بھی ان چار چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ کیا سوچتا نہیں کہ آخر یہ چار چیزیں کیسے وجود میں آئیں؟ اور اگر گہری نظر رکھنے والا اور علم وبصیرت کا حامل آدمی ان چار چیزوں کو دیکھے تو اس کے سامنے علم ودانش کی وہ حیرت انگیز دنیا واشگاف ہوتی ہے کہ سوائے اس آدمی کے جس کی عقل پر پتھر پڑ جائیں کوئی بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ یقیناً اس زمین،آسمان اور ان پہاڑوں اور اونٹوں کا کوئی خالق ہے،جس نے ان میں ہمارے لئے منفعت کی ایک دنیا بسا دی ہے اور حقائق کا ایک جہاں سمو دیا ہے۔یہی وجہ ہے

Marfat.com

کہ جب بھی کسی نے مخلوق پر اس لحاظ سے نظر ڈالی ہے تو وہ اپنے خالق کو پہچانے بغیر نہیں رہ سکا۔عرب کے ایک بدو سے جب پوچھا گیا کہ تم نے اپنے خالق کو کیسے پہچانا؟ تو اس نے انتہائی سادگی سے کہا کہ ریگستان میں پڑی ہوئی اونٹ کی لید سے۔سائل نے حیران ہو کر کہا وہ کیسے؟ کہا اونٹ کی لید یقیناً کسی گزرنے والے اونٹ کی خبر دیتی ہے اور اونٹ ریگستان میں بغیر سوار کے نہیں گزرتا اور کوئی سوار اس بدامنی کے دور میں تنہا سفر نہیں کرتا یقیناً کسی قافلے کے ہمراہ گزرتا ہے تو اونٹ کی لید دیکھ کر میں یقین کر لیتا ہوں کہ کوئی قافلہ گزرا ہوگا۔بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا کہ اگر اونٹ کی لید سے میں ایک قافلے کا یقین کر سکتا ہوں تو کیا اس وسیع وعریض کائنات کو دیکھ کر میں اس کے خالق کا یقین نہیں کر سکتا۔اسی لئے پروردگار نے فرمایا:

مَاغَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّاشَآءَ رَکَّبَکَ

(کس نے تجھے اپنے رب کریم سے غفلت میں ڈالا ہے جس نے تجھے پیدا کیا اور پھر ہر لحاظ سے درست کیا اور پھر جس شکل و صورت میں تجھے چاہا بنا دیا۔)

اس آیت پر غور فرمایئے! پروردگار انسان کو اس کے وجود کی طرف توجہ دلا کر یہ بتا رہا ہے کہ تم اگر اپنے آپ کو غور سے دیکھو تو یقیناً تمہیں تمہارے ایک ایک ریشے، ایک ایک بال، ایک ایک عضو، ایک ایک احساس، ایک ایک صلاحیت اور استعداد کے پیچھے اپنے خالق و مالک کی قوتِ تخلیق دکھائی دے گی۔آخر اتنی واضح شہادت کے بعد وہ کون سی چیز ہے جس نے تجھے اپنے اللہ سے غافل کر دیا؟

انسان کا وجود ہی نہیں بلکہ جب آدمی اس کی صلاحیتوں، اس کے دل و دماغ کی قوتوں اس کے تجسس اور شعور اور اعضاء کی مختلف حالتوں پر غور کرتا ہے تو حیرت میں ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ایک سائنسدان نے اپنی لیبارٹری میں اپنی نواسی کے کان کو دیکھ کر کہا یہ سماعت کا حیرت انگیز پرزہ ایسا ہے جس کی مثال لانے سے انسان عاجز ہے اور پھر سراپا حیرت بن کر کہا جس خالق نے اس کان کو پیدا کیا، کیا وہ خود سنتا نہیں ہوگا؟ پورے جسم کے ایک ایک ریشے پر غور کیا جائے تو حیرت انگیز چیزیں سامنے آتی ہیں بالخصوص ایک انگوٹھے کو دیکھ لیجئے جو کس قدر چھوٹا ہے لیکن اس کی پور پر کھنچے ہوئے خطوط جن کی تعداد ہزاروں میں ہوگی ان میں یہ عجیب و غریب بات ہے کہ ایک انگوٹھے کے خطوط دوسرے انگوٹھے سے کبھی نہیں ملتے۔اسی وجہ سے انسان کے انگوٹھے کو دستاویزات میں قابلِ اعتبار سمجھا گیا ہے۔انسانی چہرہ جو ایک بڑی محدود جگہ ہے جس میں آنکھیں ہیں، ناک ہے، منہ ہے، پیشانی ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی اربوں انسان پیدا ہوئے مگر ایک دوسرے سے ملتی دکھائی نہیں دیتی۔آپ جب غور کریں گے تو ضرور ایک دوسرے سے فرق محسوس کریں گے۔اسی لئے یورپ کے فلسفی نے کہا تھا کہ کائنات میں سب سے بڑا معمہ یہ انسان ہے اور اس سے بڑا معمہ اس کا دماغ جو ذہانت، تجسس، شعور، حافظہ اور فکر اور کے اوصاف سے آراستہ ہے۔سوال یہ ہے کہ ان اوصاف کا خالق کون ہے؟ جواب یہ ہے، وہ جسے دل نے تو ہمیشہ پہچانا لیکن خرد ضرور اس سے غافل رہی۔پھر قرآن نے اسی دلیل کو آگے بڑھاتے ہوئے انسانی ضروریات ہی نہیں بلکہ تمام مخلوق کی ضروریات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ احساس دلایا ہے کہ خالق کائنات صرف خالق ہی نہیں بلکہ تمہاری زندگی کی بقاء کا سروسامان کرنے والا بھی ہے۔تم اس کی عطا کردہ نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتے ہو مگر عطا کرنے والے کو بھول جاتے ہو حالانکہ انسان اپنے کھانے پر ہی غور کرے تو اسے سوچنا چاہئے کہ یہ آخر کہاں سے آیا، انسان اپنی غذا کیلئے دانۂ گندم زمین میں کاشت کر کے اسے دفن کر کے آجاتا ہے۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ دانہ مرجائے مگر بجائے مرنے کے اس میں زندگی کی سوئی پھوٹتی ہے جو بڑھتے بڑھتے تنا بنتی ہے، پھر اسے خوشے لگتے ہیں، خوشوں میں دانوں کے موتی بھر دیئے جاتے ہیں، سورج کی کرنیں پانی کے ڈول بھر بھر کر فضاء میں برکی چادریں پھیلا دیتی ہیں۔ابر پانی برسا کر کھیتی کی آبیاری کا سامان کرتا ہے، سورج اسے گرمی پہنچاتا ہے، چاند اسے حلاوت دیتا ہے۔ہوا اسے لوریاں دیتی ہے، زمین اپنی قوت نمو بروئے کار لاتی ہے اور پھر قدرت نہ جانے کیسی کیسی قوتوں کو کام میں لا کر انسان کیلئے غذا فراہم کرتی ہے۔سائنسدان کہتا ہے کہ نائٹروجن حیوانی و نباتاتی حیات کا لازمی جزو ہے۔یہ دو طریقوں سے زمین میں داخل ہوتی ہے۔اول خوردبینی اجرام یا بیکٹیریا کے ذریعے جو زمین کی بالائی تہہ میں رہتے ہیں اور کھاد وغیرہ کھا کر ایک ایسا رس خارج کرتے ہیں جن میں نائٹروجن بہت زیادہ ہوتی ہے۔نصف چھٹانک زمین میں ان کی تعداد ایک کھرب، 35 ارب کے قریب ہوتی ہے اور زمین کے ہر ایکڑ میں ان کا کام 12 آدمیوں کے برابر ہوتا ہے۔اگر 100 ایکڑ کھیت میں 10 کسان ہل چلا رہے ہیں تو 1200 مزدوروں کا ایک مخفی لشکر بھی وہاں کام کر رہا ہوتا ہے۔غور فرمایئے! اس غذا کو مہیا کرنے اور اسے پروان چڑھانے میں انسان کا حصہ کتنا ہے اور اللہ کا کتنا؟ پروردگار فرماتے ہیں:

Marfat.com

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ
(کیا تم نے اپنی کھیتی پر کبھی غور کیا زراعت کون کرتا ہے تم یا ہم)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:
فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰی طَعَامِہٖٓ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْبَتْنَا فِیْھَا حَبًّا وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا وَّزَیْتُوْنًا وَّنَخْلًا وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا وَّفَاکِھَۃً وَّاَبًّا مَّتَاعًا لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ
(انسان ذرا اپنی غذا پر نظر ڈالے (کہ کہاں سے آئی) ہم نے مینہ برسا کر زمین کا سینہ چیرا، اس سے غلے، انگور، ترکاری، زیتون، کھجوریں، گھنے باغ، میوے اور چارہ پیدا کیا۔ یہ سب تمہارا اور مویشوں کا متاع ہے۔
اسے اقبال مرحوم نے اپنے انداز میں نظم کیا:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار
خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی یہ خوئے انقلاب

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا سُبْحٰنَہٗ ؕ ھُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۢ بِھٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ ﴿یونس : ۶۸﴾
(یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی اولاد ہے۔ وہ ایسی باتوں سے پاک ہے، وہ بے نیاز ہے، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جس کا تم کو علم نہیں۔)

''ولد'' کا معنی

آیت کی تشریح سے پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ عربی زبان میں جس طرح ''ولد'' کا لفظ لڑکے یا بیٹے کیلئے استعمال ہوتا ہے اسی طرح یہ مذکر، مونث اور واحد تثنیہ اور جمع سب کیلئے استعمال ہوتا ہے یعنی جس طرح اس کا معنی بیٹا یا لڑکا ہوسکتا ہے اسی طرح اس کا معنی بیٹے اور بیٹیاں بھی ہوسکتا ہے۔ یہ چونکہ مکی صورت ہے اور اس میں براہ راست خطاب مشرکین مکہ سے ہے اس لئے قرین قیاس بات یہ ہے کہ اس سے مراد بیٹا لینے کی بجائے بیٹیاں لی جائیں۔ کیونکہ مشرکینِ عرب کے جو عقائد، تاریخ مذہب کی روشنی میں ہم تک پہنچے ہیں ان میں یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہود کا ایک گروہ حضرت عزیر علیہ السلام کو اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے، لیکن مکی سورتوں میں عموماً ان کے خیالات زیر بحث نہیں آتے، تو جب تک کوئی دلیل نہ ہو یہ خیال کرنا کہ یہاں ان کے عقائد کی تردید کی جا رہی ہے، صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں لفظِ ''ولد'' کو بیٹیوں کے معنی میں لیا جائے۔

مشرکین کے عقائد کا رد

گزشتہ آیات کی تشریح میں ہم یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ جن لوگوں نے وحی الٰہی کی روشنی قبول نہیں کی وہ ہمیشہ موت کے بعد کی زندگی، اس میں

Marfat.com

پیش آنے والے حقائق اور کائنات کے پس پردہ مستور حقیقت کا سراغ لگانے کیلئے ہمیشہ ظن وگمان سے کام لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ ان کے طرزِ فکر کا ایک نمونہ اس آیتِ کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے کہ مشرکینِ عرب کے پاس مذہب کے حوالے سے ظن وگمان اور توہمات کے سوا کچھ نہیں۔ چنانچہ اسی جہالت اور کج فکری کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ دنیا میں ہر ایک کو بقا کی خواہش ہے، ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ میرے بعد میرا کوئی نام لیوا ہو جس سے میری نسل چلے اور بڑھاپے میں میرا سہارا بنے۔ اس لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے لئے کچھ سہارے بنا رکھے ہیں۔ ان نادانوں نے اللہ کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہوئے یہ گمان کرلیا کہ شاید اسے بھی بڑھاپا آئے گا، اسے بھی کمزوری لاحق ہوگی، وہ بھی کبھی نہ کبھی دوسروں کی مدد کا محتاج ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مشرکانہ خیالات کا رد فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: سبحانہ، وہ اس طرح کی کمزوریوں سے پاک ہے۔ احتیاج جسم کا تقاضا ہے، اللہ جسم سے ماورا ہے۔ مخلوق کی کوئی کمزوری اس کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی۔ وہ بے مثل ہے، اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ ھوالغنی، وہ بے نیاز ہے، ساری کائنات اس کی محتاج ہے لیکن وہ ہر احتیاج سے بے نیاز ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت اور سب اس کے غلام ہیں۔ بڑھاپا فنا کی علامت ہے۔ اس پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ کائنات کی ہر مخلوق اپنے وجود و بقاء کیلئے اس کی محتاج ہے۔ وہ ازلی اور ابدی ہے، زمان و مکان سے مستغنی ہے۔ کائنات کا وجود اس کی صفتِ تخلیق کا مرہونِ منت ہے۔ اور جب تک اسے منظور ہے یہ کائنات باقی رہے گی۔ اور جب اسے منظور نہیں ہوگا اس کا ایک حکم کائنات کو فنا کردے گا اور ایک ہی حکم از سرِ نو زندگی عطا کردے گا۔ اسی کے حکم نے تمام مخلوقات کو عارضی زندگی بخشی۔ اسی کا حکم جسے چاہے گا ابدی زندگی عطا فرمائے گا۔

قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿٦٩﴾ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿٧٠﴾ ﴿یونس: ۶۹، ۷۰﴾

(اے پیغمبر ان سے کہہ دیجئے کہ بیشک جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ ان کیلئے بس دنیا میں چند روز فائدہ اٹھالینا ہے۔ پھر ہماری ہی طرف ان کا لوٹنا ہے۔ پھر ہم انہیں عذابِ شدید چکھائیں گے کیونکہ یہ کفر کیا کرتے تھے۔)

مشرکین کو وارننگ

ان آیات میں مشرکین کو وارننگ دی جارہی ہے کہ تم اللہ پر افترا کرکے ایک ایسے جرم کا ارتکاب کررہے ہو جس سے بڑا جرم کوئی نہیں ہوسکتا۔ ایسا جرم کرنے والے کبھی آخرت کی فلاح کو نہیں پاسکتے۔ تم نے جو راستہ اختیار کیا ہے ناکامی اور رسوائی اس کا مقدر ہے۔ تمہیں غلط فہمی یہ ہے کہ تم بڑے آرام سے زندگی گزار رہے ہو۔ لیکن تمہیں اندازہ نہیں کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کے متاع کی کیا حیثیت ہے۔ جس طرح مچھلی کے شکار کیلئے کنڈی کے سرے پر گوشت کا چھوٹا سا ٹکڑا لگایا جاتا ہے تاکہ وہ اسے خوراک سمجھ کر اسے کھانے کیلئے لپکے اور اس طرح کنڈی کا کانٹا اس کے حلق میں اتر جائے۔ لیکن مچھلی بجائے اس کے کہ گوشت کے ٹکڑے کو اپنے لئے موت کا پیغام سمجھے وہ اسے زندگی کا سامان سمجھتی ہے۔ بڑے شوق سے اسے کھاتی ہے لیکن اسے پتہ اس وقت چلتا ہے جب وہ اس کے حلق میں اتر کر اس کیلئے موت کا سبب بنتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے مچھلی ایک بے سمجھ مخلوق ہے۔ اس کے عمل کا کیا افسوس، افسوس تو انسانوں پر ہے جو فہم و شعور رکھتے ہوئے بھی اپنے نفع و ضرر کا احساس نہیں رکھتے اور تباہی کے راستے پر یہ سمجھ کر بڑھتے چلے جاتے ہیں کہ ہم کامیابی کے راستے پر جارہے ہیں۔

اس موج کی قسمت پر روتی ہے بھنور کی آنکھ
طوفاں سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

Marfat.com

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ
لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ
اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٧١﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ
اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٧٢﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي
الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓىِٕفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ
رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا
كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٧٤﴾
ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰي وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ
بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿٧٥﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ
مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٦﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ
لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿٧٧﴾ قَالُوْٓا
اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ
فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿٧٨﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ

Marfat.com

بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿٧٩﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا
مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿٨٠﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ
السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٨١﴾
وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨٢﴾

(اور پڑھ کر سناؤ انہیں حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم کے لوگو! اگر گراں ہو گیا ہے تم پر تمہارے درمیان میرا رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں میرا نصیحت کرنا تو میں نے تو بس اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔ تم اپنی رائے مجتمع کرلو اور اپنے شریکوں کو بھی بلالو پھر تمہارے فیصلہ میں کوئی تذبذب باقی نہ رہے پھر کر گزرو میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے بنوں۔ پس انہوں نے اسے جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دے دی۔ اور انہیں کو زمین میں جانشین بنایا اور ان لوگوں کو غرق کردیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ پس دیکھئے کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جن کو متنبہ کیا گیا تھا۔ پھر بھیجے ہم نے اس کے بعد کئی رسول، ان کی اپنی قوموں کی طرف، تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ لیکن وہ اس چیز پر ایمان لانے والے نہ بنے، جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم مہر کر دیتے ہیں حق سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر۔ پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا تو انہوں نے گھمنڈ کیا اور وہ تھے ہی مجرم لوگ۔ اور جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آ گیا تو بولے یہ یقیناً ایک کھلا کھلا جادو ہے۔ موسیٰ نے کہا کہ کیا تم حق کو جادو کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آ گیا۔ کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ انہوں نے کہا کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو تاکہ تم ہمیں ہٹا دو اس طریقہ سے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور ملک میں سیادت تم دونوں کو حاصل ہو جائے۔ اور ہم تم دونوں پر کبھی ایمان لانے والے نہیں۔ اور فرعون نے حکم دیا کہ میرے پاس سارے ماہر جادوگروں کو حاضر کرو۔ جب جادوگر آئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا، پیش کرو جو کچھ تمہیں پیش کرنا ہے۔ جب انہوں نے پیش کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ جو کچھ تم لائے ہو یہ جادو ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اس کو باطل کر دے گا۔ اللہ فساد برپا کرنے والوں کے عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیتا۔ اور اللہ بول بالا کرتا ہے، حق کا اپنے کلمات کے ذریعے۔ اگرچہ مجرموں کو برا لگے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿٧١﴾ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٧٢﴾ ﴿یونس: ۷۱، ۷۲﴾

(اور پڑھ کر سناؤ انہیں حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت جبکہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم کے لوگو! اگر گراں ہو گیا ہے تم پر تمہارے درمیان میرا رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں میرا نصیحت کرنا تو میں نے تو بس اللہ پر بھروسہ کیا ہے۔ تم اپنی

Marfat.com

رائے مجتمع کرلو اور اپنے شریکوں کو بھی بلالو پھر تمہارے فیصلہ میں کوئی تذبذب باقی نہ رہے پھر کر گزرو میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو میں نے تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے بنوں۔)

مشرکین کی اصلاح کیلئے حضرت نوح کی سرگزشت سے استشهاد

آپ جانتے ہیں یہ مکی سورت ہے، اس میں دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ بنیادی طور پر مشرک قوم کے عقائدِ فاسدہ پر تنقید کی جاتی ہے۔ عقیدہ چونکہ اعمال کی بنیاد ہے اس لئے عقیدہ کی خرابی تمام اعمال کی خرابی پر منتج ہوتی ہے۔ بنابریں قرآن کریم کی سورتوں میں اسلامی عقائد کو نہ صرف پوری طرح کھول کر بیان کرتا ہے بلکہ دلائل سے انہیں مرصع بھی کرتا ہے اور غلط عقائد کی ایک ایک غلطی کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اصلاح کے تمام ذرائع کو بروئے کار لاتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ آیات میں مشرکینِ مکہ کے عقائد پر تنقید بھی فرمائی گئی اور ان کی اصلاح کیلئے موقع کے مطابق ترغیب اور ترہیب سے کام بھی لیا گیا ہے۔ کبھی دل دہلا دینے والا اندازِ بیان اختیار کیا گیا اور کبھی دل کو موہ لینے والی نصیحتوں سے سمجھانے کی کوشش فرمائی گئی ہے۔ لیکن مشرکین نے اپنے رویئے میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا قبول نہ کیا۔ جن کی قسمت میں ایمان قدرت نے ودیعت کیا تھا وہ ایمان سے بہرہ ور ہوئے لیکن دوسرے لوگ مخالفت میں شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے۔ مکے کی سرزمین عقوبت خانہ میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ مسلمانوں کو ایذا پہنچاتے ہوئے مشرکین کو نہ کبھی قرابت یاد آتی، نہ ہمسائیگی کا خیال آتا، نہ کوئی اور حوالہ ان پر اثرانداز ہوتا۔ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ جس ذاتِ عزیز نے ان کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا ہے اور جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے وہ اپنی صداقت اور سیرت و کردار کے بے عیب ہونے میں ہر طرح کے شک وشبہ سے بالا ہے۔ ہزار مخالفتوں کے باوجود بداخلاقی کا کوئی چھینٹا اس پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ سیرت و کردار کی کسی معمولی خرابی کا بھی طعنہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی دلآویز شخصیت اس کی زبان سے پھوٹنے والا علم وحکمت کا سرچشمہ بجائے خود اپنی دلیل تھا لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود مشرکینِ مکہ کا وطیرہ بن گیا تھا کہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی ہر دلیل کے جواب میں وہ گالی دیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کی ہر دعا سن کر وہ پتھر برساتے تھے۔ ان کیلئے یہ بات سخت ناگوار تھی کہ ہم اندھوں میں ایک بینا کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ پتھروں میں یہ ہیرا کیوں چمکنے لگا ہے۔ بدکاروں میں مکارمِ اخلاق کا یہ نمونہ کیوں پیدا ہو گیا ہے۔ اگر اس کی بینائی ختم نہ کی گئی تو یہ ہمارے عیوب ہمیں بتاتا رہے گا۔ اس کی روشنی ہماری ظلمتوں کا مذاق اڑاتی رہے گی۔ اس کی بے نفسی اور پاکبازی ہمارے لئے ایک سوالیہ نشان بنی رہے گی اور ہم اس کے سامنے کبھی سر نہ اٹھا سکیں گے۔ ظاہر ہے یہ صورتحال ہم کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ ہمارے عزت سے جینے کیلئے ضروری ہے کہ یہ شمع بجھ جائے، یہ روشنی گل ہو جائے اور اس کی بے نفسی اور معصومیت کے چرچے ہمیشہ کیلئے ختم کر دیئے جائیں۔ قرآن کریم نے ان کے عزائم کا راستہ روکنے کیلئے بجائے مزید نصیحتیں کرنے کے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ انہیں حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ پڑھ کر سنائیں۔ اس قصے کے آئینہ میں اگر ان کی بصارت بالکل جواب نہیں دے گئی تو یہ خود اپنی شکل دیکھ سکیں گے اور یہ بھی اندازہ کر سکیں گے کہ اگر انہوں نے اپنا رویہ نہ بدلا تو کیسا بھیانک انجام ان کے انتظار میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں عموماً اور قرآن کریم میں خصوصاً جب ان قوموں کا ذکر فرمایا ہے جن کے حد سے بڑھے ہوئے فساد کی اصلاح کیلئے جب اللہ نے انبیاء اور رسل بھیجے اور انہوں نے مقدور بھر ان کی اصلاح کی کوشش کی لیکن قوم نے جب کسی طرح بھی ان کی دعوت کو قبول نہ کیا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کی اذیت رسانی میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ جب قوم نے فیصلہ کر لیا کہ اب ہم ہدایت کی اس روشنی کو ہمیشہ کیلئے گل کر کے چھوڑیں گے۔ جس کی دعوت نے ہماری من مرضی کی زندگی ہمارے لئے مشکل کر دی ہے تب اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آیا اور اپنے رسول اور ایمان لانے والوں کو ہجرت کا حکم دے کر بچا لیا گیا اور باقی قوم کو ان کی بداعمالیوں اور کفر کے باعث ہمیشہ کیلئے تباہ کر دیا گیا۔ چنانچہ ایسی قوموں کی ایک تاریخ ہے جو جا بجا آسمانی کتابوں میں مرقوم ہے۔ چنانچہ جب ہم اس تاریخ کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلا عذاب جس قوم پر آیا وہ، وہ قوم تھی جس کی طرف حضرت نوح علیہ السلام مبعوث کیے گئے تھے۔ عام تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے اور قرآن کریم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کے اشارات اور بائبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج

Marfat.com

ہم ''عراق'' کے نام سے جانتے ہیں۔ بابل کے آثارِ قدیمہ میں بائبل سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

نباءِ نوح کا مفہوم

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے قصے کو ''نبأ نُوحٍ'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''نباء'' عرب زبان میں کسی اہم واقعہ یا اہم خبر کو کہتے ہیں۔ عام خبر پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کے تیسویں پارے کی دوسری آیت میں قیامت کو ''نبا'' کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے قیامت سے بڑی خبر کیا ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قصہ نوح سنانے سے مقصد قصہ سنانا نہیں بلکہ اس کے ضمن میں کسی اہم بات کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کے ہر طرح کے بگاڑ کی اصلاح کیلئے بھیجے گئے۔ ان کی قوم کا بگاڑیوں تو ایک وسیع مضمون کا تقاضا کرتا ہے لیکن اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قوم اللہ تعالیٰ کے وجود کی منکر نہ تھی، نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی شرک کی گمراہی تھی۔ یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو خدائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے دیا تھا۔ پھر اس بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں رونما ہوتی چلی گئیں۔ جو خود ساختہ معبود خدائی میں شریک ٹھہرا لئے گئے تھے ان کی نمائندگی کرنے کیلئے قوم میں خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو تمام مذہبی و سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا۔ اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ کی تقسیم پیدا کر دی۔ اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جب ان کے رویئے پر انہیں ٹوکا، ان کی گمراہیوں پر تنقید کی، انہیں اللہ کی طرف بلایا اور شرک کی تمام صورتوں کو ان کیلئے تباہ کن قرار دیا تو ملک کا اقتدار اور ان کا مذہبی طبقہ جو باہمی ملی بھگت کر چکا تھا اور عوام جو رسم و رواج کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہونے کی وجہ سے مذہبی طبقے کی گرفت میں تھے۔ سب نے مل کر آپ کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا، لیکن اس کے باوجود حضرت نوح علیہ السلام کی ہمت، استقامت اور اللہ پر بے پناہ اعتماد کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ آپ نے ساڑھے نو سو سال تک شب و روز اپنی قوم کو اللہ کے دین کی طرف بلایا، ان کی ایک ایک گمراہی کی اصلاح فرمائی، انہیں ان کے برے انجام سے بار بار ڈرایا اور جب یہ دیکھا کہ یہ قوم اب شاید مجھے مزید برداشت نہ کر سکے۔ کیونکہ آپ یقیناً ان کے منصوبوں سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ آپ نے محسوس کیا کہ قوم میرے قتل کے منصوبے باندھنے لگی ہے تو آپ نے ان سے دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک تو یہ فرمایا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی ذاتی جھگڑا یا قبیلے کی جنگ نہیں۔ میں سینکڑوں سال سے تمہیں صرف اللہ کی طرف بلا رہا ہوں اور ہر طرح کے دلائل سے تم پر تمہاری گمراہیاں کو واضح کر رہا ہوں اور میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں یہ کام اللہ کے حکم سے کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے رسالت عطا کی ہے اور اس عظیم منصب پر فائز کر کے ایک عظیم ترین ذمہ داری میرے سپرد فرمائی ہے۔ اگر میں نے از خود یہ کام شروع کیا ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ اس میں میری نفسانیت کا شائبہ ہوتا یا اس میں میرے لئے دو راستے ہوتے کہ چاہے کروں یا نہ کروں۔ یہ تو احکم الحاکمین کا عائد کردہ فریضہ ہے جس کی بجا آوری زندگی کا سانس لینے سے بھی زیادہ ضروری ہے اور اس کام کی انجام دہی کی اصل قوت صرف اللہ پر توکل ہے۔ آج تک میں نے تمہاری ہر مخالفت کا سامنا کیا اور تمہاری ہر اذیت برداشت کی۔ تو میرے پاس تمہارے مقابلے کیلئے اللہ پر توکل کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا اور اب اگر تم نے مجھے ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ تم اپنے فیصلے پر اچھی طرح غور و فکر کر لو۔ اللہ کی صفات میں تم نے جنہیں شریک کر رکھا ہے ان کو بھی بلا لو۔ اور پھر سر جوڑ کر بیٹھو تا کہ کل کو یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں یہ فیصلہ کرتے ہوئے سوچنے کا موقع نہ ملا تھا اور سوچنے کے بعد اگر میرے قتل ہی کا فیصلہ کرو تو میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا کیونکہ اللہ کے رسول ایسا نہیں کیا کرتے۔ تم یکبارگی مجھ پر حملہ کرو اور مجھے سنبھلنے کیلئے بالکل مہلت نہ دو۔ اس ناچیز کا گمان یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی موت سے بے نیازی اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ اور دشمن سے بے التفاتی بجائے خود آپ کے دعوے اور مؤقف کی بہت محکم دلیل ہے۔ ہر سوچنے والا دماغ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو شخص ایک امرِ حق کیلئے جان قربان کرنے کیلئے تیار ہے وہ یقیناً اس امرِ حق کو اپنی جان سے قیمتی سمجھتا ہے جبکہ جان سے زیادہ دنیا میں کوئی قیمتی چیز نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے اس امرِ حق کے حق ہونے میں ذرہ برابر شبہ نہیں ورنہ وہ اس کیلئے زندگی کو داؤ پر نہ لگاتا اور کسی بھی صداقت اور حقیقت کیلئے اس سے بڑی اور کوئی دلیل نہیں ہو سکتی کہ اس کی حقانیت کو واضح کرنے کیلئے جان دے دی جائے۔

اگر تم غور و فکر کے بعد میری نصیحت سے روگردانی اور میری نبوت سے انکار اور میری دعوت کو رد کر دینے کا فیصلہ کر لو تو پھر یاد رکھو کہ تمہارے اس

Marfat.com

اعراض اور انکار سے میری دنیا اجڑ نہیں جائے گی۔ کیونکہ میں جو تمہیں تبلیغ وتذکیر کر رہا تھا تو میں اس کام سے کوئی معاوضہ نہیں لے رہا کہ مجھے اس سے محروم ہو جانے کا غم ہو۔ نبوت قربانی اور ایثار کا کام ہے، کوئی دکانداری نہیں۔ یہ سر کٹوانے کا عمل ہے، سر پر کلغی سجانے کا نہیں۔ تو تمہارا انکار تمہاری عاقبت تباہ کر دے گا بلکہ تمہاری زندگی تمہارے عذاب کو دعوت دے گی۔ میرا تو اس سے کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں نے آج تک جو کچھ کیا اور آئندہ جو کچھ کروں گا اس کا اجر سراسر اللہ مجھے دے گا۔ وہ یقیناً مجھے محروم نہیں فرمائے گا۔ اور مزید یہ بات بھی یاد رکھو کہ تم نے اگر میری دعوت کو قبول نہیں کیا تو شاید تم یہ سمجھتے ہو کہ مجھے اس کی جوابدہی کرنا پڑے گی، یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ مجھے جس بات کا حکم دیا گیا تھا وہ بات صرف یہ تھی کہ میں ہر حال میں اللہ کا فرمانبردار رہوں۔ قوم ایمان لے آئے تو تب بھی میری فرمانبرداری میں فرق نہ آئے اور اگر مجھے قتل کرنے پر تل جائے تو تب بھی میری فرمانبرداری مجھے مقتل تک جانے کی ہمت دے۔ سو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں نے اپنی فرمانبرداری میں کمی نہیں کی۔ البتہ تم نے قدم قدم پر اس کی مخالفت کر کے اپنی بندگی کو ضرور رسوا کیا ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ ﴿یونس: ۷۳﴾

(پس انہوں نے اسے جھٹلا دیا تو ہم نے اس کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دے دی۔ اور انہیں کو زمین میں جانشین بنایا اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ پس دیکھئے کیا انجام ہوا ان لوگوں کا جن کو متنبہ کیا گیا تھا۔)

قریش کو انذار

اس آیتِ کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا انجام بھی ذکر فرمایا گیا ہے اور اس کا سبب بھی۔ انجام ذکر کرنے سے پہلے سبب کا ذکر فرمایا، تاکہ مشرکینِ مکہ اس بات پر اچھی طرح غور کر لیں کہ جس سبب کی وجہ سے سب سے پہلی قوم پر اللہ کا عذاب آیا، آخری پیغمبر کی قوم پر بھی اسی سبب سے عذاب آ سکتا ہے کیونکہ اللہ کی سنت کبھی نہیں بدلتی اور انسانوں سے اس کے معاملات میں کبھی تبدیلی نہیں آتی اور مزید یہ بات بھی کہ اگر حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کی تکذیب کے نتیجے میں طوفانِ نوح آ سکتا ہے جبکہ آپ کے بعد ابھی مزید انبیاء ورسل کو آنا تھا تو نبی آخر الزماں ﷺ کے بعد تو سلسلۂ نبوت ختم کیا جا رہا ہے تو جو قوم اس عظیم پیغمبر کی دعوت کو رد کر دے جس پر ہدایت اپنے منطقی اختتام کو پہنچ رہی ہے تو یہ جرم ایسا ہوگا جو سب سے شدید سمجھا جائے گا۔ نہ جانے مشرکینِ مکہ ان سامنے کی باتوں کو سمجھنے کی زحمت کیوں نہیں کر رہے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ کا اسلوب عجیب ہے کہ قومِ نوح پر عذاب کا سبب تو ذکر فرما دیا لیکن عذاب کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ عذاب سے پہلے ان لوگوں کو نجات دینے کا ذکر فرمایا جو اللہ کے دین سے وابستہ تھے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والے۔ یہ دراصل سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ جب کسی قوم پر عذاب بھیجتا ہے تو ایسا نہیں ہوتا کہ نافرمان اور فرمانبردار سب سے یکساں سلوک ہو بلکہ اس کی رحمت جوش میں ہوتی ہے اس لئے وہ سب سے پہلے اپنے پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو اس سرزمین سے نکال کر کسی قطعۂ عافیت میں پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد اللہ کا غضب بھڑکتا ہے کیونکہ پیغمبر کی حیثیت قوم کے اندر روح کی ہوتی ہے۔ جب تک وہ اپنی قوم کے اندر ہے، قوم اپنی تمام نافرمانیوں کے باوجود زندہ رہتی اور عذاب سے محفوظ رہتی ہے لیکن جب اللہ کا پیغمبر وہاں سے ہجرت کر جاتا ہے تو پھر یہ قوم بے روح جسم کی طرح ہو جاتی ہے جسے کسی وقت بھی اٹھا کر پھینکا جا سکتا ہے۔

آیت میں مزید یہ بھی فرمایا کہ ہم نے انہیں لوگوں کو پھر اس زمین پر جانشین بنایا کیونکہ جو لوگ آخری حد تک اللہ کی نافرمانی پر تلے رہتے ہیں۔ وہ اللہ کی زمین پر رہنے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کی حیثیت جھاڑ جھنکاڑ کی ہوتی ہے۔ قدرت ان سے زمین کو صاف کراتی ہے اور پھر اپنے محبوب بندوں کو ان کی جگہ ٹھکانہ دیتی ہے۔

عذاب کی تفصیل کے ضمن میں قرآنِ کریم نے جو اشارات کیے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کی ابتدا ایک خاص تنور سے ہوئی جس کے نیچے سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ پھر ایک طرف آسمان سے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور دوسری طرف زمین میں جگہ جگہ سے چشمے پھوٹنے لگے۔ سورۂ ہود میں صرف تنور کے ابل پڑنے کا ذکر ہے اور آگے چل کر بارش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ مگر سورۂ قمر میں اس کی تفصیل دی گئی ہے کہ "فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ" (ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیئے جن سے لگاتار

Marfat.com

بارش برسنے لگی اور زمین کو پھاڑ دیا کہ ہر طرف چشمے ہی چشمے پھوٹ نکلے اور یہ دونوں طرح کے پانی اس کام کو پورا کرنے کیلئے مل گئے جو مقدر کر دیا گیا تھا۔) نیز لفظ تنور پر الف لام داخل کرنے کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص تنور کو اس کام کی ابتدا کیلئے نامزد فرمادیا تھا جو اشارہ پاتے ہی ٹھیک اپنے وقت پر ابل پڑا اور بعد میں طوفان والے تنور کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔

طوفان عالمگیر تھا یا نہیں

یہ طوفان عالمگیر تھا یا اس خاص علاقے میں آیا تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اسرائیلی روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا تھا۔ (پیدائش 7:18-24) مگر قرآن میں یہ بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن کے اشارات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی انسانی نسلیں انہی لوگوں کی اولاد سے ہیں جو طوفان نوح سے بچالئے گئے تھے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا ہو کیونکہ یہ بات اس طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک بنی آدم کی آبادی اسی خطہ تک محدود رہی ہو جہاں طوفان آیا تھا اور طوفان کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئی ہوں وہ بتدریج تمام دنیا میں پھیل گئی ہوں۔ اس نظریہ کی تائید دو چیزوں سے ہوتی ہے ایک یہ کہ دجلہ و فرات کی سرزمین میں تو ایک زبردست طوفان کا ثبوت تاریخی روایات سے، آثار قدیمہ سے اور طبقات الارض سے ملتا ہے لیکن روئے زمین کے تمام خطوں میں ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے کسی عالمگیر طوفان کا یقین کیا جاسکے۔ دوسرے یہ کہ روئے زمین کی اکثر و بیشتر قوموں میں ایک طوفان عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں حتیٰ کہ آسٹریلیا، امریکہ اور نیوگنی جیسے دور دراز علاقوں کی پرانی روایات میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ کسی وقت ان سب قوموں کے آباؤ اجداد ایک ہی خطہ میں آباد ہوں گے جہاں یہ طوفان آیا تھا اور پھر جب ان کی نسلیں زمین کے مختلف حصوں میں پھیلیں تو یہ روایات ان کے ساتھ گئیں۔

قرآن کریم سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ جب طوفان آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے جانوروں کا جوڑا جوڑا اور ضرورت کی اشیاء اور تمام ایمان لانے والے اپنے اہل و عیال سمیت کشتی میں سوار کر لئے گئے۔ جگہ جگہ سے زمین چشموں کی صورت میں ابلنے لگی اور آسمان نے بھی اپنے دروازے کھول دیئے۔ پانی کی تیزی اور وسعت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے آبادیاں پانی کی نذر ہو گئیں اور کشتی اپنے سواروں کو لے کر پانی پر تیرتی ہوئی پہاڑوں سے بھی بلند ہو گئی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے دنوں تک یہی کیفیت رہی بالآخر بارشیں رکیں، پانی اترنا شروع ہوا اور کشتی جودی پہاڑی کی چوٹی پر ٹک گئی۔ ابن جریرؒ نے قتادہؓ کی یہ روایت کی ہے کہ عہد صحابہ میں جب مسلمان الجزیرہ کے علاقے میں گئے ہیں تو انہوں نے کوہ جودی پر (اور ایک روایت کی رو سے باقردیٰ نامی بستی کے قریب) اس کشتی کو دیکھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی وقتاً فوقتاً یہ اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتی نوح کو تلاش کرنے کیلئے مہمات بھیجی جارہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستان اراراط پر سے گزرے ہیں تو ایک چوٹی پر انہوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو کشتی سے مشابہ ہے۔

امام بخاریؒ، ابن ابی حاتم، عبدالرزاق اور ابن جریر نے قتادہ سے یہ روایات نقل کی ہیں کہ مسلمانوں کی فتح عراق والجزیرہ کے زمانے میں یہ کشتی جودی پر موجود تھی اور ابتدائی دور کے اہل اسلام نے اس کو دیکھا تھا۔

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ

پس غور کیجئے کیسے ہوا انجام ان لوگوں کا جنہیں ڈرایا گیا تھا یہی وہ بات ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر آنے والے عذاب کے حوالے سے بتانا مقصود تھی اس میں بہ یک وقت نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا بھی مقصود ہے کہ آپ حالات کی سنگینی سے دل گرفتہ نہ ہوں انبیاء کرام کو ایسے حالات سے واسطہ پڑا ہی کرتا ہے اور مشرکین مکہ کو تنبیہ بھی ہے کہ تم اس واقعہ پر غور کرو اور پھر سوچو کہ تمہاری اور قوم نوح کی پوزیشن میں کیا فرق ہے۔ محمد کریم ﷺ کی حیثیت وہی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی تھی۔ آپ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی طرح اپنی ہمت اور توانائی کا آخری قطرہ بھی نچوڑ دینا چاہتے ہیں تا کہ تم کسی طرح راہ راست اختیار کر لو لیکن تم نے وہی رویہ اختیار کیا ہے جو قوم نوح نے کیا تھا جس طرح وقت کے ساتھ ساتھ ان کی مخالفت بڑھتی چلی گئی اسی طرح تمہاری اذیت رسانیوں میں بھی رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جارہا ہے تمہیں بتانا صرف یہ ہے کہ جس طرز عمل کے نتیجے میں قوم نوح تباہ ہو گئی اسی طرز عمل کو اختیار کرنے کے بعد آخر تم کیسے بچ جاؤ گے۔ انذار کا حق انہوں نے بھی ادا کیا تھا اور آنحضرت بھی ادا کر چکے اب صرف آخری فیصلہ آنے کا انتظار ہے۔ تمہارے پاس اب بھی موقع ہے کہ ان انتظار کے لمحوں کو اپنے لیے عذاب کا ذریعہ مت بناؤ۔

Marfat.com

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿یونس : ۷۴﴾

(پھر بھیجے ہم نے اس کے بعد کئی رسول، ان کی اپنی قوموں کی طرف، تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔ لیکن وہ اس چیز پر ایمان لانے والے نہ بنے، جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح ہم مہر کر دیتے ہیں حق سے تجاوز کرنے والوں کے دلوں پر۔)

بعد کے رسولوں کی طرف ایک اجمالی اشارہ

طوفانِ نوح کے بعد جب حضرت نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کی اولاد کو از سرِ نو زمین پر بسایا گیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ صاحب ایمان لوگ کب تک زندہ رہے اور ان کی اولادوں میں کب تک ایمان و عمل زندہ رہا۔ رفتہ رفتہ شیطان کو کام کرنے کا موقع ملا تو اس نے پھر انسانوں میں بگاڑ پیدا کیا۔ شرک کے نئے طریقے ایجاد کئے، کچھ پرانی چیزوں کو زندہ کیا، معاملات میں حبِ دنیا اور نفس پرستی کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں انہیں شیطانی اثرات نے مقدور بھر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں راسخ کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح سے عقائد بھی مجروح ہوئے اور معاملات بھی ابتر ہوئے۔ انسان اصلاح کے بعد پھر بگاڑ کے راستے پر چل پڑا۔ اب ضرورت پیدا ہوئی کہ عقیدہ و عمل کی اصلاح کیلئے انبیاءِ کرام اور رسولانِ عظام کو بھیجا جائے۔ چنانچہ مختلف وقتوں میں مختلف نبی اور رسول تشریف لائے۔ انہوں نے اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ادا فرمایا۔ ہم سب آنے والوں کے اسمائے گرامی اور حالات سے تو واقف نہیں ہیں البتہ قرآنِ کریم نے مختلف مواقع پر حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے بعض انبیاء و رُسل کا تذکرہ کیا ہے۔ یہاں صرف اجمالی اشارہ فرمایا ہے۔ البتہ سورۂ ہود میں جو اس سورت کے ثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے میں حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کا تفصیلی ذکر فرمایا گیا ہے۔ ہم بھی ان شاء اللہ تفصیل وہیں پڑھیں گے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ انسانی بگاڑ جب انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آتی ہے تو وہ انسانوں کی اصلاح کیلئے اپنے پیغمبر بھیجتا ہے تاکہ وہ دنیا و عقبیٰ کی تباہی سے بچ جائیں۔ ہر دور میں اس کا یہی معمول رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو رد کر کے دنیا نے تباہی مول لی اور ایسا عذاب آیا جس نے اس وقت کی معلوم دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد پھر بگاڑ کا دور آیا تو اللہ کی سنت کے مطابق پھر نبی اور رسول آئے۔ ان کی قوموں نے اپنی روایت کے مطابق انہیں ماننے سے انکار کیا اور ہر ممکن طریقے سے انہیں ناکام کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نبوت اور رسالت کی سنت کے مطابق اللہ کی طرف سے واضح آیات لے کر آئے۔ آیات سے مراد ہر رسول پر نازل ہونے والی کتاب کی آیات بھی ہیں اور ہر پیغمبر کو دیئے جانے والے معجزات بھی۔ انہوں نے معجزات دکھا کر یہ ثابت کیا کہ ہم از خود اٹھ کر نہیں آ گئے بلکہ ہم مامور من اللہ ہیں۔ ہم نے زندگی کا ایک حصہ نہایت راست بازی، دیانتداری اور معصومیت کے ساتھ تمہارے اندر گزارا۔ ہم نے کبھی کسی غیر معمولی بات کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن اب اگر ہم نبوت کا دعویٰ لے کر آئے ہیں تو یہ اللہ کے حکم کی تعمیل ہے اور اس کی نشانی اور علامت یہ معجزات ہیں۔ اس کے بعد وہ کتاب اللہ کی آیات پڑھ کر ان کی زندگی میں رہنمائی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں اونچ نیچ سمجھاتے، زندگی کی الجھنوں سے نکالتے ہیں، ان کی اپنی زندگی اور ان پر نازل ہونے والی کتاب بجائے خود غیر معمولی دلیل ہوتی ہے۔ لیکن ان کی قومیں اس سب کچھ کے باوجود ایمان لانے کی طرف نہیں آتیں۔ ان کا حال بدکے ہوئے گدھوں کی طرح ہوتا ہے کہ وہ جتنا سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اتنا دور بھاگتے ہیں۔

توفیق کے معاملے اللہ کا قانون

یہاں پہنچ کر پروردگار نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ نبی جیسا داعی اور کتاب اللہ جیسی کتاب معجزات اور حقائق سے مرصع ہو کر جب قوم کے سامنے آتے ہیں تو وہ انہیں قبول کرنے سے انکار کیسے کر دیتے ہیں۔ بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ انہیں فوراً سر جھکا دینا چاہئے لیکن امتوں کی تاریخ اس کے بالکل برعکس کہانی سناتی ہے تو اس کی وجہ وہ ہے جو یہاں بیان کی گئی ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ اس نے انسان کو وجدان کی دولت دی ہے۔ اسے حواس اور عقل سے نوازا ہے، پھر وحی الٰہی کے ذریعے اس کیلئے ہدایت کا راستہ آسان کر دیا تاکہ وہ زندگی کے اس اہم فیصلے میں غلطی نہ کرے۔ اس کے بعد انہیں آزادی دے دی گئی ہے کہ تم چاہو تو اللہ کے نبی کی دعوت کو قبول کرو اور چاہو تو رد کر دو۔ قبول کرنا چاہو گے تو ہم اس کے امکانات روشن کر دیں گے اور رد کرنا چاہو گے تو ہم ان کیلئے راستے کھول دیں گے۔ چنانچہ اب انسان اپنی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو بھی فیصلہ کرتا ہے کارکنانِ قضاء و قدر اس کیلئے

Marfat.com

سہولتیں بہم پہنچانا شروع کر دیتے ہیں۔ جو آدمی نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے اس کیلئے نیکی کے راستے پر چلنا آسان کر دیا جاتا ہے اور جو آدمی سمجھانے کے باوجود برائی کے راستے پر اصرار کرتا ہے تو اس پر ایک شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے جو اسے برائی کے راستوں پر کھینچے لئے پھرتا ہے۔ چنانچہ پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے دل و دماغ کی صلاحیتیں قبولیت حق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اسی کو دلوں پر مہر لگنا کہا گیا ہے۔

انبیاء کی آمد اور قوموں کے رویئے پر مشتمل تاریخ کا ضمنی تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ مشرکینِ مکہ اس آئینہ میں اپنی شکل پہچاننے کی کوشش کریں۔ وہ آنحضرت ﷺ کی حیثیت کو سمجھیں اور اپنے رویئے کو دیکھتے ہوئے اپنے انجام کی فکر کرنے کی کوشش کریں۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾

(پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا تو انہوں نے گھمنڈ کیا اور وہ تھے ہی مجرم لوگ۔) ﴿یونس:۷۵﴾

حضرت موسیٰؑ کے حالات سے استشہاد

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں انبیاء اور رُسل کی طویل تاریخ سے حضرت موسیٰ، حضرت ہارون علیہما السلام کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ قرآن کریم میں آنحضرت ﷺ کی دعوت کی تائید و وضاحت اور آپؐ کی تسلی اور اطمینان کیلئے سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالاتِ زندگی اور نبوت کے بعد آپ کو پیش آنے والے حالات سے استشہاد کیا گیا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں بہت حد تک موافقت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں ان کے واقعات کی طرف اشارہ کر کے مشرکینِ مکہ کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور ان کا انجام دکھا کر انہیں متنبہ کیا گیا ہے۔

ان آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور فرعون اور آل فرعون کے ردِعمل کی تفصیلات تو بیان نہیں کی گئیں لیکن اشاروں میں بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے جس سے یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ پیغمبروں کو کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے اور قوم اگر اپنی سیرت و کردار کے بگاڑ میں بہت دور تک پہنچ جاتی ہے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے یہ بات فرمائی کہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے سرداروں کی ہدایت کیلئے بھیجا۔ اور اس طرح بھیجا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس کا کوئی تصور تک نہ تھا۔ آپ کی زندگی قدم قدم پر حیرتوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ آپ کے ولادت اس حال میں ہوتی ہے کہ ان کا پورا خاندان اپنے نوزائیدہ بچوں کے حوالے سے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ بنی اسرائیل میں جو بچہ پیدا ہوتا فرعونی حکومت کے کارندے اسے اٹھا کے لے جاتے اور موت کی نذر کر دیتے۔ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی افرادی قوت نے فرعونی حکومت کیلئے ایک ایسا خطرہ پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے اس خطرے سے عہدہ برا ہونے کیلئے یہ ظالمانہ قانون نافذ کیا کہ بنی اسرائیل کے گھر کسی پیدا ہونے والے بچے کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو آپ کی ماں زچگی کی تکلیف کو بھول کر آپ کو بچانے کی فکر میں تھی۔ ایک تابوت میں ڈال کر آپ کو دریائے نیل کے سپرد کر دیا گیا۔ اللہ کی قدرت کا کیا کہنا کہ جس فرعون کیلئے ان بچوں کا وجود ناقابل برداشت تھا اسی کے گھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اس طرح پہنچے کہ فرعون کی اہلیہ نے انہیں اپنی گود میں لے لیا اور آپ شہزادوں کی طرح محل میں پلنے لگے۔ بڑے ہوئے تو ایسے رعنا جوان نکلے کہ مصر اور قرب و جوار میں آپ کی جوانی اور رعنائی کے تذکرے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بات کھل گئی کہ آپ بنی اسرائیل ہی میں سے ہیں۔ اس لئے آپ کو بھی قدرتی طور پر بنی اسرائیل کی زبوں حالی کو دیکھ کر ان سے ہمدردی ہونے لگی۔ ایسے ہی ایک موقع پر ایک اسرائیلی کو ایک قبطی سے بچانے کیلئے قبطی کو مکا مارا تو وہ جہنم رسید ہو گیا۔ دوسرے ہی دن جس کی ہمدردی میں یہ واقع پیش آیا تھا اس نے یہ بات اگل دی کہ مرنے والے کے قاتل موسیٰ ہیں۔ محل میں جو لوگ آپ کو نقصان پہنچانے کیلئے موقع کی تلاش میں تھے انہوں نے آپ کے قتل کی سازش کی، آپ کو بروقت اطلاع ہو گئی اور آپ مدین چلے گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک شریف گھرانے میں پناہ دی۔ دس سال وہاں گزار کر بے سروسامانی اور گمنامی کی حالت میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ واپس مصر تشریف لا رہے تھے کہ راستہ بھول کر کوہ طور پر جا پہنچے۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت دستگیر ہوئی اور آپ کو نبوت عطا کی گئی اور ساتھ ہی دو معجزات دیئے گئے۔ آپ کے ہاتھ کی وہ لاٹھی جس کی مدد سے آپ بکریاں چرایا کرتے تھے وہ سانپ بن گئی اور آپ کا ہاتھ جب بغل سے نکلتا تو وہ سورج کی طرح چمکنے لگتا۔ اس طرح

Marfat.com

عصائے موسیٰ اور یدِ بیضا دو معجزات آپ کو دیئے گئے۔ یہ گویا آپ کیلئے نشانِ ماموریت تھے جن کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ آپ اللہ کی طرف سے ایک عظیم منصب پر فائز کئے گئے ہیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کو آپ کی تائید و نصرت کیلئے آپ کی دعا پر نبوت عطا کی اور دونوں کو حکم دیا گیا کہ فرعون کی طرف جاؤ، وہ عبدیت کی حدود سے گزر گیا ہے اور اسے کہو کہ ہم تیرے پاس اس لئے آئے ہیں تا کہ تجھے اللہ کے راستے کی ہدایت دیں۔ ہوسکتا ہے تیرے دل میں اس کا ڈر پیدا ہو اور تو اپنی زندگی اور عاقبت بچالے اور تو اگر چاہے تو ہم تیری پاکیزگی نفس اور پاکیزگی افکار کا بھی انتظام کرنے کو تیار ہیں۔ یہ یاد رہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس فرعون کے گھر میں پلے تھے اب وہ برسر اقتدار نہیں تھا بلکہ وہ مر چکا تھا اور تاریخ اسے رعمسیس کے نام سے جانتی ہے اور اب تخت فرعونی پر فائز اس کا بیٹا تھا جس کا نام منفتاح تھا۔ یہ یقیناً آپ کے ساتھ ہی پلا بڑھا ہوگا۔ چنانچہ آپ اس کے پاس پہنچے تو قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے اس نے تکبر اور بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے سب سے پہلے آپ کو طعنہ دیا کہ تم وہی ہو جو ہمارے گھر میں پلتے رہے اور ہمارا ہی کھا کر ہمیں سمجھانے کیلئے آگئے ہو اور مزید یہ کہ ہم نے تو تم پر احسانات کئے اور تم نے احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ ہمارا ایک آدمی قتل کر کے بھاگ گئے اور اب ہمارے پاس نبوت کا دعویٰ لے کر آ گئے ہو۔ اور اس کے دائیں بائیں بیٹھنے والوں نے بھی تکبر کی زبان سے نجانے کیسے کیسے پھنکارے مارے اور کیسی کیسی زہر میں ڈوبی ہوئی باتیں کیں۔ بجائے اس کے کہ وہ آپ کے دعویٰ نبوت پر غور کرتے، آپ کی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے، آپ کے معجزات کو دیکھتے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ان کیلئے توجہ کے قابل نہ بن سکی۔ اس کیلئے سب سے بڑی یہ بات تھی کہ بنی اسرائیل جن کو وہ غلام بنا چکے تھے، موسیٰ اور ہارون ان غلاموں سے رشتہ رکھتے ہیں اور ہم جوان کے آقا ہیں اور جن کی عنایات سے یہ مصر کی زمین پر چلتے پھرتے اور زندگی گزارتے ہیں ایسے کنگلے اور نادار اٹھ کر ہمیں کو سمجھانے کیلئے چلے آئے ہیں۔ جس طرح ایک بدمعاش اور جرائم پیشہ آدمی کسی شریف آدمی کی بات سننے کا روادار نہیں ہوتا اسی طرح انہوں نے بھی موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو اہمیت دینے سے انکار کر دیا۔ البتہ ان کو ایک مشکل پیش آئی کہ کہاں تو یہ دعویٰ کہ وہ مصر کے رب ہیں اور کہاں یہ حال کہ عصائے موسیٰ جب اژدھا بن کر ان کے سامنے نمودار ہوا تو وہ اس کا سدباب کرنے سے عاجز رہے اور جب حضرت ہارون نے اللہ کی وحدانیت اور ربوبیت کے دلائل پیش کئے تو یہ رب صاحب اپنی ساری شیخی بھول گئے اور ان کے سوا کوئی چارا کار نہ رہا کہ وہ کچھ کہیں کہ جس کا اگلی آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿یونس : ۷۶﴾
(اور جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آ گیا تو بولے یہ یقیناً ایک کھلا جادو ہے۔)

ہر دور کے منکرین کی طرح پیغمبر کے معجزات کو رد کرنے کا انہوں نے یہ آسان طریقہ نکالا، کہ یہ جادو کے سوا اور کچھ نہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ موسیٰ ایک ایسی دعوت لے کر آئے تھے جس کے حق ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا کیونکہ معجزات کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی قوت ہے اور اس کی تائید کیلئے پروردگار نے مزید فرمایا کہ حق ہماری طرف سے آیا۔ ظاہر ہے کہ جو چیز اللہ کی طرف سے آئے گی اس کے حق ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿یونس : ۷۷﴾
(موسیٰ نے کہا کہ کیا تم حق کو جادو کہتے ہو جب وہ تمہارے پاس آ گیا۔ کیا یہ جادو ہے؟ اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔)

حق اور سحر میں فرق

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی جانب سے جو حق آیا ہے کیا تم اسے جادو کہتے ہو، تمہیں یہ جادو دکھائی دیتا ہے، کیا جادو ایسا ہوتا ہے کہ اس کے پیش کرنے والے دنیا کے صالح ترین افراد ہوں جو نادار اور فقیر ہو کر بھی اقتدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کریں۔ جن کے سیرت و کردار میں کوئی عیب نہ ہو اور جو چیز بطور معجزہ پیش کریں ساری دنیا مل کر بھی اس کا توڑ کرنے سے عاجز ہو۔ جس طرح سحر ایک جانی پہچانی چیز ہے اسی طرح ساحر بھی معاشرے کے جانے پہچانے لوگ ہیں۔ انہیں کون نہیں جانتا کہ سحر ان کا پیشہ ہے۔ حق وہ باطل کے معرکے

Marfat.com

کی دلیل نہیں۔ انہیں اصحابِ اقتدار کے یہاں معقول معاوضہ مل جائے اور کوئی مقتدر آدمی ان کو اپنے پاس عزت سے بٹھا لے یہی ان کی کامیابی ہے۔ لیکن موسیٰ اور ہارون جنہیں تم جادوگر قرار دے رہے ہو وہ تو زندگیاں تبدیل کرنے کیلئے آئے ہیں۔ ان کی دعوت کے نتیجے میں صرف زندگی کا چلن ہی نہیں بدلے گا، تخت و تاج بھی بدلیں گے۔ افکار و عمل سے لے کر آقائی اور غلامی تک ہر چیز تبدیل ہوگی۔ فلاح و کامرانی کے معیارات میں بھی تغیر آئے گا۔ کیا ایسی تعلیم اور ایسی دعوت کو تم سحر اور جادو کہتے ہو اور جو اللہ کی دعوت لے کر ایک صالح تبدیلی کا پیغام بن کر آئے ہیں انہیں جادوگر قرار دیتے ہو۔ تاریخ کا انتظار کرو، تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ کون کامیاب ہوتا ہے اور کون ناکام ہوتا ہے۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۞ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِىْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ۞ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۞ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَاجِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۞ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۞ ﴿یونس: ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲﴾

(انہوں نے کہا کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو تا کہ تم ہمیں ہٹا دو اُس طریقہ سے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اور ملک میں سیادت تم دونوں کو حاصل ہو جائے۔ اور ہم تم دونوں پر بھی ایمان لانے والے نہیں۔ اور فرعون نے حکم دیا کہ میرے پاس سارے ماہر جادوگروں کو حاضر کرو۔ جب جادوگر آئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا، پیش کرو جو کچھ تمہیں پیش کرنا ہے۔ جب انہوں نے پیش کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا یہ جو کچھ تم لائے ہو یہ جادو ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اس کو باطل کردے گا۔ اللہ فساد برپا کرنے والوں کے عمل کو نتیجہ خیز نہیں ہونے دیتا۔ اور اللہ بول بالا کرتا ہے، حق کا اپنے کلمات کے ذریعے۔ اگرچہ مجرموں کو برا لگے۔)

حضرت موسیٰؑ پر سیاسی الزام

پہلی آیتِ کریمہ میں فرعونیوں نے ایسی دو باتیں کہیں جس سے عوام کو غصہ دلانا مقصود تھا۔ کمزور حکومتوں کا ہمیشہ یہ رویہ رہا ہے کہ جب بھی عوام میں شعور پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ ایسے مسائل چھیڑتے ہیں جس میں اصل بات الجھ کر رہ جاتی ہے۔

نیند سے بیدار ہوتا ہے کوئی محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

اس وقت اصل مسئلہ تو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی نبوت اور ان کی دعوت ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں فرعونی یہ کہہ رہے ہیں کہ تم دراصل ہمیں ہمارے آباؤ اجداد کے طریقے سے کاٹ پھینکنے کی سازش کر رہے ہو۔ تمہارے نزدیک ہم بھی گمراہ ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد بھی گمراہ تھے۔ عوام کالانعام ہوتے ہیں، تو ایسی باتوں پر بھڑک اٹھتے ہیں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد کو گالی دی گئی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہی گئی کہ تم دراصل کسی اصلاح کے ارادے سے نہیں آئے ہو بلکہ تمہارے کچھ سیاسی عزائم ہیں اور تم حکومت پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ باقی سب کا ابطال تمہارا راستہ صاف کردے گا اور اہل مصر تمہاری سیادت کو تسلیم کرلیں گے۔ پہلی بات خالصتاً آباؤ اجداد کے احترام کے حوالے سے اپنے اندر جذباتی اکساہٹ رکھتی تھی اور دوسری بات نبوت کو ایک سیاسی مسئلہ بنائے دے رہی تھی۔ فرعونیوں نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی طرف سے جواب کا انتظار کئے بغیر اعلان کردیا کہ تمہارے ارادے ہمیں معلوم ہوگئے ہیں اس لئے ہم تم پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ عصائے موسیٰ اور ید بیضا نے اہلِ مصر میں ایک عجیب کیفیت پیدا کردی ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کے سامنے یہ بات واضح کردی جائے کہ ان دونوں باتوں کی حیثیت جادو کے سوا اور کچھ نہیں۔ چنانچہ آیت نمبر 79 میں فرعون نے اپنے امراء کو حکم دیا کہ وہ اپنے ملک کے تمام پڑھے لکھے اور بڑے بڑے جادوگروں کو میرے دربار میں اکٹھا کریں۔ سورۂ اعراف میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ آیت نمبر 80 میں بتایا کہ جب وہ جادوگر پہنچ گئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہایت اعتماد علی اللہ اور بے نیازی کے ساتھ جادوگروں سے فرمایا کہ تم جو اپنا کرتب دکھانا چاہتے ہو، دکھاؤ۔ ان کو پہل کرنے کا موقع دیا تاکہ کسی کے دل میں حسرت نہ رہے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنا کرتب پیش کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم عصائے موسیٰ کو جادو قرار دیتے ہو، جادو وہ نہیں، جادو یہ ہے جو تم نے پیش

Marfat.com

کیا۔اور عنقریب تم دونوں کا فرق دیکھ لو گے۔تمہارے جادو کو اللہ تعالیٰ ابھی سب کے سامنے باطل کر کے رکھ دے گا۔اندازہ کیجئے کہ اللہ کے پیغمبر کو اللہ پر کس قدر اعتماد ہوتا ہے۔وہ دشمنوں میں گھر کر بھی کبھی کمزوری کا شکار نہیں ہوتا۔انہوں نے صاف صاف فرمایا کہ عنقریب تمہارا جادو اپنے انجام کو پہنچے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کبھی مفسدین کی کوشش کو حق و باطل کے معرکہ میں بار آور نہیں ہونے دیتا۔وہ حق کا حق ہونا اس طرح ثابت کر دیتا ہے کہ اندھے کے سوا ہر کوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے اور جن کے دلوں میں اللہ نے کچھ بھی بصیرت رکھی ہے وہ اسے اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں لیکن جن کی سرشت بگڑ جاتی ہے اور فطرت بدرنگ ہو جاتی ہے اور خرد کا دامن تنگ، ہو جاتا ہے یہ ہیں وہ جرائم پیشہ لوگ جنہیں حق کا حق ہونا کبھی راس نہیں آتا۔چنانچہ اس معرکہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کامیابی عطا فرمائی اور جادوگر سب کی موجودگی میں اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔اس کی تفصیل اس سے پہلے ہم سورۂ اعراف میں پڑھ چکے ہیں اور مزید آگے پڑھیں گے۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰۤى

اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ مَلَا۟ئِهِمْ
اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ
الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ
فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ
رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ
مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ
لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ؕ
وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَاۤ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَ
مَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ
سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ

Marfat.com

دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨٩﴾
وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ
بَغْيًا وَّعَدْوًا ؕ حَتّٰىٓ اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٩٠﴾
آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿٩١﴾ فَالْيَوْمَ
نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ
النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿٩٢﴾

پس بات نہ مانی موسیٰ علیہ السلام کی مگر اس کی قوم کے تھوڑے سے لوگوں نے ڈرتے ہوئے فرعون اور خود اپنی قوم کے سربر آوردہ لوگوں کے ڈر سے۔ ایسا نہ ہو کہ فرعون ان کو کسی فتنہ میں ڈال دے اور بیشک فرعون زمین میں غالب تھا اور وہ حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو پھر اسی پر بھروسہ کرو اگر تم مسلمان ہو۔ پس انہوں نے جواب دیا ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا اے ہمارے رب ہمیں ظالم قوم کے لیے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے دے۔ اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی کی کہ مہیا کرو اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر اور اپنے گھروں کو قبلہ بنا دو اور نماز قائم کرو اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو۔ اور موسیٰ نے دعا کی اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان وشوکت اور مال ودولت سے بہرہ مند کر رکھا ہے اے ہمارے رب (کیا یہ اس لیے ہے) کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بے راہ کریں۔ اے ہمارے رب ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا تم دونوں کی دُعا قبول کی گئی تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو ان کا پیچھا کیا فرعون اور اس کے فوجیوں نے سرکشی اور زیادتی سے یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے کی لپیٹ میں آ گیا تو بولا میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں بنتا ہوں۔ جواب دیا گیا اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا پس آج ہم تیری لاش کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنا رہے بے شک بہت سے انسان ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔

Marfat.com

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓی اِلَّا ذُرِّیَّۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِہِمْ اَنْ یَّفْتِنَہُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِی الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّہٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِیْنَ ﴿یونس :۸۳﴾

(پس بات نہ مانی موسیٰ علیہ السلام کی مگر اس کی قوم کے تھوڑے سے لوگوں نے ڈرتے ہوئے فرعون اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے۔ ایسا نہ ہو کہ فرعون ان کو کسی فتنہ میں ڈال دے اور بیشک فرعون زمین میں غالب تھا اور وہ حد سے بڑھ جانے والوں میں سے تھا۔)

اس آیت کریمہ میں سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے چند ایسے اشارات فرمائے گئے ہیں جو اگر ایک طرف نبی کریم ﷺ اور آپ کے متبعین میں سے دعوت الی اللہ کا فرض انجام دینے والوں کے لیے ایک ایسی ہدایت اور روشنی کا سامان ہیں جس سے ہٹ کر کبھی سوچا بھی نہیں جا سکتا اور دوسری طرف مشرکین مکہ میں سے جو لوگ آنحضرت ﷺ کی دعوت پر ایمان لائے تھے ان کے لیے ایک ایسی تائید ہے جو ان کے لیے باعث فخر بھی ہے اور حوصلہ کا سامان بھی اور تیسری طرف وقت کی غالب اور جابر حکومت کیلئے غور و فکر کا سامان ہے جس کے نتیجے میں وہ بڑی آسانی سے اپنا انجام دیکھ سکتے ہیں۔ اب ہم ان تینوں باتوں کی ایک ترتیب سے وضاحت کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ ؑ کے ابتدائی ساتھی

سب سے پہلی بات نبی کریم ﷺ کو اور قیامت تک آنے والے مصلحین اور داعیوں کیلئے تسلی اور اطمینان کا باعث ہے کہ آپ کی شب و روز محنت اور آپ کا بےلوث دعوتی انداز اور اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات پر آپ کی استقامت یقیناً ایک ایسا نخلِ رحمت ہے جسے برگ و بار لانے اور جس کے سائے کو گھنا ہونے اور جسے مثمر ہونے میں کسی تاخیر سے سابقہ پیش نہیں آنا چاہیے بلکہ جس طرح ہر صالح بیج صالح زمین میں صالح اور محنتی کسان کے ہاتھوں جڑ پکڑتا اور تیزی سے برگ و بار لاتا ہے یہی حال اس نخلِ تمنا کا بھی ہونا چاہیے چنانچہ اس اشتباہ کو دور فرماتے ہوئے تسلی کے انداز میں فرمایا جا رہا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے راستے کی بھی کچھ لازمی سنتیں ہیں اس کے اپنے موسم اور اس کا اپنا ماحول ہے ہر دور میں جب بھی اللہ کے نبی اس عظیم ذمہ داری کیلئے اٹھائے گئے ہیں انہیں ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے ایمان لانے والوں کی تعداد ہمیشہ کم رہی ہے اور ایمان بھی وہ لوگ لاتے رہے ہیں جو قوم کے کمسن اور نوجوان افراد تھے اس لئے اگر آپ کو اس صورت حال سے گزرنا پڑ رہا ہے تو یہ اس راستے کی لازمی سنت ہے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو اگر ایک طرف قبطیوں سے واسطہ تھا تو دوسری طرف بنی اسرائیل سے۔ بنی اسرائیل ان کی اپنی قوم تھی ان کے آباؤ اجداد ایک تھے بایں ہمہ ایمان لانے والوں میں ان کی قوم کے گنے چنے نوجوان تھے اور یہ صورت حال ایسی ہے جو ہر دور میں اہلِ دعوت کو پیش آتی ہے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے والوں میں سن رسیدہ اور معمر لوگ نہیں تھے بلکہ بالکل نوخیز۔ بھرپور جوانیوں والے یا ڈھلتی ہوئی جوانیوں کے لوگ تھے مثلاً بالکل نوخیز لوگوں میں حضرت علی ابن ابی طالب، جعفر طیار، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، موسیٰ بن عمیر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے نوخیز نوجوان تھے جن کی عمریں قبول اسلام کے وقت ابھی بیسویں سال کو بھی نہ پہنچی تھیں۔ عبدالرحمٰن بن عوف، بلال اور صہیب رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عمریں بیس اور تیس سال کے درمیان تھیں۔ حضرت عبیدہ بن الجراح، زید بن حارثہ، عثمان بن عفان، عمر فاروق تیس اور پینتیس سال کی عمر کے درمیان تھے۔ سب سے پہلے ایمان لانے حضرت ابوبکر صدیق تھے جن کی عمر آنحضرت ﷺ سے دو سال کم تھی اور یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا لیکن حضرت صدیق اکبر سے اس سے مختلف بات کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی ابتدائی مسلمانوں میں صرف ایک صحابی ہیں جن کی عمر نبی کریم ﷺ سے زیادہ تھی یعنی حضرت عبیدہ بن حارث مطلبی اور یا پھر حضرت عمار بن یاسر تھے جو تمام صحابہ میں آنحضرت ﷺ کے ہم عمر تھے۔ اس پوری صورت حال پر غور کرنے سے جو بات سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی اللہ کے دین کی دعوت انسانوں کے سامنے پیش کی جائے گی اس کا فطری انداز یہی ہوگا کہ اسے قبول کرنے والے تجربہ کار اور عمر رسیدہ لوگوں کی بجائے نوجوان ہوں گے کیونکہ ہر نبی کی دعوت زندگی کے رویے کو یکسر بدلنے کی دعوت ہے اس میں اگر ایک طرف اللہ کے آستانے کے سواء تمام آستانے چھوٹ جاتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے تمام معاملات میں اللہ کی شریعت کے سوا ہر قانون بےکار ہو جاتا ہے اس دعوت کو ماننے والا کسی بڑی سے بڑی قوت کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کسی سے خوف نہیں کھاتا اور کسی سے امیدیں نہیں باندھتا اور زندگی کا ہر فیصلہ کرنے سے پہلے صرف اللہ کی شریعت کو دیکھتا ہے نہ برادری کی طرف آنکھ اٹھاتا ہے اور نہ معاشرے کے رسم و رواج کی طرف اور نہ ملک کے وضعی قوانین کی طرف اور نہ جعلی

Marfat.com

تقدس و مشیخیت کے دعوے داروں کی طرف اس کے نتیجے میں زندگی میں ایک ایسی تبدیلی آتی ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ ایک نئی جہت ایک نئی امنگ اور ایک نیا راستہ اختیار کر لیتا ہے اتنی بڑی تبدیلی قبول کرنے اور اس کا بوجھ اٹھانے کیلئے جس ہمت تو انائی اولوالعزمی، جرأت، اقدامی قوت اور استقامت کی ضرورت ہے وہ سن رسیدہ لوگوں میں کبھی نہیں ہو سکتی۔ ان کے ساتھ تو مفادات کے سینکڑوں پتھر بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ مصلحتوں کی طویل زنجیریں ان کا مقدر بن چکی ہوتی ہیں۔ وہ اس دعوت کی طرف بڑھنے سے پہلے سو دفعہ نفع و نقصان کے دہی کھاتے کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور بالآخر یہ سوچ کر واپس پلٹ جاتے ہیں۔

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

یہ اس راستہ کا پہلا سبق بھی ہے اور اس راستہ پر چلنے والوں کیلئے تسکین کا باعث بھی۔

مشرکین مکہ کو توجہ دلانا بھی مقصود ہے کہ ہر پیغمبر کی دعوت کے نتیجے میں معمر اور تجربہ کار لوگوں نے اپنی مصلحتوں اور اپنے مفادات کی دنیا کو بچا کر ہمیشہ اپنی عاقبت برباد کی۔ نتیجہ آخر یہ ہوا کہ جب اللہ کا عذاب آیا تو نہ وہ مفادات باقی رہے جسے ہاتھ سے چھوڑنا گوارا نہ تھا اور نہ عذاب سے بچاؤ کی کوئی صورت ہو سکی۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم باوجود اس کے کہ آپ سے نسلی تعلق رکھتی تھی اور فرعون اور آلِ فرعون بنی اسرائیل کو غیر قوم ہونے کی مسلسل سزا بھی دے رہے تھے کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ جس تیزی سے بنی اسرائیل کی افرادی قوت بڑھ رہی ہے ایسا نہ ہو کہ مصر میں دوسرے قبائل کو ساتھ لے کر یہ دوبارہ ہم پر غالب آ جائیں اور ہماری حکومت چھین لی جائے۔ عرصہ دراز سے نسلی برتری اور سیاسی اندیشوں کی وجہ سے بنی اسرائیل ناگفتہ بہ صورتحال سے دوچار تھے۔ ایسی حالت میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اب موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی شکل میں جو انہیں مضبوط قیادت میسر آ رہی تھی آگے بڑھ کر ان کا دامن تھامتے اور اپنے لیے ایک نئی تاریخ رقم کرتے۔ لیکن تاریخ کی وہ حقیقت جو عمرانیات کے ماہرین کے نزدیک کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ بنی اسرائیل اس کی گرفت میں تھے غلامی کی طویل رات نے ان کی آنکھوں کے سپنے چھین لیے تھے ان کے دلوں میں ولولوں کی بجائے محدود آرزوئیں جنم لیتی تھیں۔ مقاصد زندگی سے تہی دامن ہو کر ضروریات زندگی اوڑھنا بچھونا بن چکے تھے اور مزید ستم یہ کہ انہیں واسطہ ایک ایسے حکمران سے پڑا تھا کہ جو صرف حکمرانی ہی نہیں خدائی کے پندار میں بھی مبتلا تھا۔ چنانچہ مذہبی طبقہ کی ملی بھگت کے ساتھ پورے ملک پر اس نے اپنا قاہرانہ تسلط قائم کر رکھا تھا اور اب ایک طویل عرصے سے نجومیوں کے کہنے پر وہ مستقبل کے اندیشوں میں بھی مبتلا تھا اب جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کا پیغام لے کر اس کے پاس پہنچے تو اس نے محسوس کیا کہ خطرہ میرے قریب پہنچ گیا ہے چنانچہ اس کا پورا جسم اور دل و دماغ کا ایک ایک ریشہ دشمنی میں ڈھل کر پھنکارنے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر اپنے ہی اندیشوں نے اسے روک دیا لیکن بنی اسرائیل کے ساتھ اس کا معاملہ اب زیادہ ظالمانہ رویہ اختیار کر چکا تھا یوں تو بادشاہ بھی کسی اصول وضابطہ کے پابند نہیں ہوتے وہ جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں لیکن ایسا بادشاہ جو رب ہونے کا دعویٰ بھی رکھتا ہو اس کیلئے تو یقیناً کوئی روک ٹوک نہیں ہو سکتی اس لیے قرآن کریم کہتا ہے کہ اسے اپنی سلطنت میں پوری طرح غلبہ حاصل تھا اور اپنے مخالفین کو سزائیں دینے میں وہ ایسا بے دریغ واقع ہوا تھا کوئی ضابطہ کوئی لحاظ کوئی مروت کوئی رحم اور کوئی انصاف اس کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیت کریمہ میں یہ پڑھ کر کہ موسیٰ علیہ السلام پر ان کی قوم میں سے چند نوجوان ایمان لائے تھے۔ بعض لوگ غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی قوم بنی اسرائیل تمام کی تمام کافر تھی ان میں سے صرف چند نوجوانوں نے ایمان قبول کرنے کیلئے ہمت کی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ فرعون کے مصائب کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے لیکن اگر آیت کے الفاظ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے اس غلط فہمی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ قرآن کریم نے ''اٰمن'' کا لفظ کبھی لام کے صلہ کے ساتھ استعمال کیا ہے اور کبھی با کے ساتھ۔ صلہ بدلنے سے ''اٰمن'' کے معنی میں تبدیلی آ جاتی ہے'' اٰمن لہ'' کا معنی ہے تسلیم و انقیاد اور غیر مشروط اطاعت اور اٰمن بہ کا معنی ہے دل میں کسی کو تسلیم کر لینا چاہے اس کے احکام سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس آیت کریمہ میں ''اٰمن لموسیٰ'' کہہ کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ساری قوم آپ کو اور ہارون علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتی تھی

Marfat.com

آپ کی حقانیت کی قائل تھی لیکن زندگی کے معاملات نے ان کی رہنمائی کو قبول کر کے ان کی اطاعت کرنے کے لیے تیار نہ تھی ان کی زندگی فرعون کے اقتدار میں اسکے احکام کی اطاعت میں گزر رہی تھی۔ دل میں وہ موسیٰ کو مانتے تھے لیکن زندگی کے معاملات فرعون کے قانون کے مطابق سرانجام پا رہے تھے۔ نمازیں چھپ چھپ کر اپنے اللہ کے لیے پڑھتے تھے لیکن گردن ہمیشہ فرعون کے سامنے جھکتی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر چند نوجوانوں نے حقیقی ایمان کا راستہ اختیار کیا انہوں نے اس بات کو سمجھا کہ جس کو ہم نے اپنے دل سے مانا ہے اطاعت بھی اسی کی کی جائے۔ احکام بھی اسی کے مانے جائیں اللہ پر ایمان دوعملی کو پسند نہیں کرتا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اس صورتحال کو سمجھنے کے لیے آج امت مسلمہ کے مجموعی طرز عمل کو دیکھ لینا کافی ہے۔ مسجدوں میں نمازیں بھی پڑھی جا رہی ہیں رمضان آتا ہے تو روزے بھی رکھے جاتے ہیں اور اللہ کا قرآن بھی مسجدوں میں سنا جاتا ہے۔ عیدین میں پوری امت اللہ کے سامنے جھکتی ہے کوئی مسلمان ملک ایسا نہیں ہے جس میں خوبصورت مسجدیں تعمیر نہ کی جاتی ہوں۔ لیکن اُمت کا مجموعی طرزِ عمل یکسر اللہ سے بغاوت پر مشتمل ہے کسی ملک میں اللہ کی حاکمیت قائم نہیں ہے۔ شعائر اسلام کی توہین جا بجا ہو رہی ہے اسلام کی سطوت قصہ پارینہ بنتی جا رہی ہے۔ اللہ اور اس کے دین کے ساتھ اخلاص اللہ کے رسول کے ساتھ محبت اس کی سنت کی اتباع کا جذبہ بنیاد پرستی کا نام اختیار کر چکا ہے۔ دین کی سربلندی کیلئے کی جانے والی کوششیں دہشت گردی بن چکی ہیں لیکن ان تمام خرابیوں کے باوجود ہم مسلمان ہیں اور ہمارے اسلام کو کوئی ہدف نہیں بنا سکتا۔ اگلی آیت کریم میں موسیٰ علیہ السلام نے اسی بنیادی خرابی کے ازالے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ﴿۸۴﴾ ﴿یونس : ۸۴﴾

(اور موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میری قوم اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو پھر اسی پر بھروسہ کرو اگر تم مسلمان ہو۔)

ایمان کی حقیقت

گزشتہ آیت کی تشریح میں ہم نے پڑھا ہے کہ بنی اسرائیل مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایمان کی حقیقت سے آشنا نہ تھے یا یوں کہہ لیجئے کہ صدیوں سے کفر کی غلامی میں رہنے کے باوجود وہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایمان کی رُوح سے بے بہرہ ہو چکے تھے۔ ان کے نزدیک اللہ کو دل میں ماننا اور تنہائی میں اس سے مناجات کرنا اور جب بھی موقع ملے تو چھپ کر اس کی بندگی بجا لانا ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کافی تھا۔ طاغوت کی فرمانروائی میں زندگی گزارنا اللہ کی نافرمانی میں غیر اللہ کی اطاعت کرنا یہ ان کے نزدیک ایسی باتیں نہ تھیں جن سے ایمان کو نقصان پہنچتا ہو۔ انسان کو حالات کے مطابق ہوا کے رخ پر چلنا چاہیے اللہ کی بندگی کو بجا لانے کیلئے حالات جتنی اجازت دیں اس کے مطابق بندگی کے تقاضوں کو پورا کرنا ان کے نزدیک ایک مسلمان کے لیے ضروری تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے مقابلے میں اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے اور اسی کی غیر مشروط اطاعت کرنے پر زور دیا تو ان کی اکثریت نے موسیٰ علیہ السلام کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ صرف چند نوجوانوں کو ہمت ہوئی اور ان کے گرم خون نے فیصلہ کیا کہ نتیجہ کچھ بھی ہو ہمیں بہرحال ہوا کے مقابل رخ پر چلنا اور اللہ ہی کی ہمہ وجوہ عبادت واطاعت بجا لانا ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی قوم پر ایمان باللہ کی حقیقت واضح کرنا ضروری سمجھا۔ آپ نے انہیں سمجھایا کہ اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو کہ تم اسی کی کبریائی کے قائل ہو اس کا کسی کو شریک تسلیم نہیں کرتے ہو اور اس کی بے پایاں صفات کا تمہیں ادراک ہے تو پھر تمہارے ایمان کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ تم فرعون سے ڈرنے کی بجائے اللہ پر توکل کرو۔ غیر اللہ کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کی بجائے اللہ ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ اسے اپنا خالق و مالک ماننے کے ساتھ ساتھ رب اور الٰہ بھی تسلیم کرو یہ صحیح ہے کہ فرعون کی قہرمانی تو تمہارے لیے مشکلات پیدا کریں گی وہ تمہارے لیے زندگی دشوار کر دے گا لیکن جب تم اپنے اللہ کو اس کی صفات سمیت مان چکے ہو تو اب تمہیں بھروسہ صرف اسی کی ذات پر کرنا چاہیے۔ اس پر ایمان لانے والے اس کے سوا کسی سے ڈرا

Marfat.com

نہیں کرتے وہ بڑے سے بڑے حادثے کے وقت بھی اسی پر بھروسہ کیا کرتے ہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ جو اس پر بھروسہ کرتے ہیں وہ صرف بھروسہ ہی نہیں کرتے بلکہ اس سے استعانت بھی کرتے ہیں۔ انہیں اگر ایک طرف تعلق باللہ کی عظمت کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف وہ ذاتی طور پر اپنی عبدیت سے بھی آشنا ہوتے ہیں وہ اللہ کے بھروسہ پر فرعونوں سے ٹکرا جاتے ہیں تو اپنی بندگی کے احساس سے ہر وقت اپنے اللہ کے سامنے استعانت کا ہاتھ پھیلائے رکھتے ہیں ان کا طرزِ عمل کچھ اس طرح کا ہوتا ہے۔

کیا فائدہ فکرِ بیش وکم سے ہو گا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو ہو گا تیرے کرم سے ہو گا

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی اسی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں ان کے ساتھیوں میں یہ تبدیلی آئی کہاں تو یہ حال کہ وہ فرعون اور اس کے سرداروں کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے اور کہاں اب یہ حال کہ ان کے ساتھی پکار اٹھے۔

فَقَالُوْا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۶﴾

(پس انہوں نے جواب دیا ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا اے ہمارے رب ہمیں ظالم قوم کے لیے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہم کو کافروں سے نجات دے دے۔) ﴿یونس:۸۵،۸۶﴾

توکل کی حقیقت

آیت کریمہ میں "فـقـالـوا" کا جو لفظ آیا ہے اس کا فاعل کون ہے عام بنی اسرائیل ہیں یا ان کی اولاد میں وہ نوجوان ہیں جن کا ذکر اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔ یہ ناچیز اس بارے میں کوئی حتمی رائے نہیں رکھتا دونوں میں سے کوئی بھی ہو وہ بہ ہر صورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی اور بنی اسرائیل کے افراد ہیں آپ کی تعلیم وتربیت نے جب ان میں زندگی کی امنگ پیدا کی اور وہ اسلامی زندگی کی حقیقت سے آگاہ ہوئے تو انہیں احساس ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا مفہوم تنہائی میں اللہ کو یاد کرنا نہیں بلکہ یہ ایک اصلاحی عمل ہے جس میں اپنی زندگی کو بھی بدلنا ہے اور باہر کی زندگی کے ہر دائرے اور ہر شعبہ میں ایک انقلاب برپا کرنا ہے۔ اب کوئی مخلوق چاہے وہ فرعون اور آلِ فرعون ہی کیوں نہ ہو نہ ربوبیت کا دعویٰ کر سکے گی نہ انسانوں کو غلام بنا سکے گی نہ امتیازات پیدا کر سکے گی نہ طبقات کو جنم دے سکے گی۔ عبادت بھی ایک ہی کی ہوگی اور اطاعت بھی ایک ہی کی ہوگی۔ ملک کے ہر شہری پر ایک ہی قانون نافذ ہوگا سب کی منزل آخرت ہوگی اور ہر شخص جواب دہی کے احساس سے گراں بار ہوگا۔ ایسی تبدیلی کیلئے جس طرح ایک جانگسل محنت سے گزرنا پڑے گا اسی طرح قدم قدم پر قربانی اور ایثار کی شمعیں بھی روشن کرنی پڑیں گی۔ ایسی صورتحال سے عہدہ برآ ہونے کیلئے از بس ضروری ہے کہ اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔ مخالفتیں طوفان بن کر اٹھیں لیکن سامنا کرنے والے مسکرا کر ٹال دیں۔ چنانچہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو یقین دلایا کہ آپ انشاء اللہ ہمیں ایسے ہی توکل اور بھروسہ سے مسلح دیکھیں گے۔ اور ہم ہر حال میں اللہ کے دامن سے وابستہ رہیں گے۔ لیکن ساتھ ہی اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے جو ایک مومنِ قانت کی اصل علامت ہے۔ چنانچہ پروردگار سے دعا مانگی کہ الٰہی ہمیں ظالم قوم کے لیے فتنہ نہ بنانا ہم کمزور لوگ ہیں تیرے سہارے اور تیرے بھروسہ پر ہم وقت کی قہرمانی قوتوں سے ٹکرانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں لیکن ہمارے حوصلوں کا امتحان نہ لینا۔ فتنہ مخالفین کی طرف سے اذیت رسانی کے ایسے عمل کو کہتے ہیں جو اللہ والوں کیلئے بہت بڑا امتحان بن جائے۔ اور مخالفین تل جائیں کہ ہم مسلمانوں کو صرف اس صورت میں زندہ چھوڑیں گے کہ وہ پرانے دین پر واپس آجائیں ورنہ ہم ان میں سے ایک ایک کو اذیت دے دے کر ہلاک کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ جب اہلِ حق پر اپنا خاص فضل وکرم فرماتا ہے تو وہ مخالفین کو اُس انتہا تک نہیں جانے دیتا کہ وہ اہلِ حق کیلئے دین کی تبدیلی کا باعث بن جائیں۔ یا تو وہ انہیں مرعوب کیے رکھتا ہے اور یا اہلِ حق کو ہجرت کا حکم دے کر اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح اپنی حفاظت میں لیا اور ان کے لیے زندگی کے فرائض آسان کر دیئے۔

Marfat.com

فتنہ کامفہوم

صاحب تفہیم القرآن نے اپنی تفسیر میں فتنہ کا ایک اور معنی مراد لیا ہے۔معروضی حالات میں مسلمانوں کے لیے اس میں بڑی عبرت ونصیحت پائی جاتی ہے اس لیے ہم اسے یہاں نقل کرر ہے ہیں۔

ان صادق الایمان نوجوانوں کی دعا کہ ''ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا'' بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے۔گمراہی کے عام غلبہ وتسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیام حق کے لیے اُٹھتے ہیں، تو انہیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ایک طرف باطل کے اصلی علمبردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے ان داعیان حق کو کچل دینا چاہتے ہیں۔دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہوتا ہے جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی قاہرانہ فرماں روائی کے مقابلہ میں اقامت حق کی سعی کو غیر واجب، لاحاصل، یا حماقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کررہا ہے کسی نہ کسی طرح درست ثابت کردے اور ان لوگوں کو اُلٹا برسر باطل ثابت کر کے اپنے ضمیر کی اُس خلش کو مٹائے جواُن کی دعوت اقامتِ دین حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا خفی طور پر پیدا ہوتی ہے۔تیسری طرف عامۃ الناس ہوتے ہیں جو الگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا ووٹ آخر کار اُسی طاقت کے حق میں پڑا کرتا ہے جس کا پلہ بھاری رہے، خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔اس صورت حال میں ان داعیان حق کی ہر ناکامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی ان مختلف گروہوں کے لیے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے۔وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا نہ کہ ان بے وقوفوں کے ساتھ جو ناکام ہوگئے۔دوسرا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا، اور آخر کار اس تہلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلف ہی کب کیا تھا، دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو اُن عقائد واعمال سے پورے ہو ہی رہے تھے جن کی اجازت فراعنہء وقت نے دے رکھی تھی۔تیسرا گروہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ حق وہی ہے جو غالب رہا۔اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں، یا مصائب ومشکلات کی سہار نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں، یا ان سے، بلکہ ان کے کسی ایک فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا صدور ہو جائے، تو بہت سے لوگوں کے لیے باطل سے چمٹے رہنے کے ہزار بہانے نکل آتے ہیں اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدتہائے دراز تک کسی دوسری دعوت حق کے اُٹھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔پس یہ بڑی معنی خیز دعا تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں نے مانگی تھی کہ خدایا ہم پر ایسا فضل فرما کہ ہم ظالموں کے لیے فتنہ بن کر نہ رہ جائیں۔یعنی ہم کو غلطیوں سے، خامیوں سے، کمزوریوں سے بچا، اور ہماری سعی کو دنیا میں بارآور کردے، تا کہ ہمارا وجود تیری خلق کے لیے سبب خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیے وسیلہء شر)

اس آیت کریمہ میں ایک اور دُعا بھی مانگی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ الٰہی ہمیں اپنی رحمت سے کافر قوم سے نجات عطا فرما۔اس دُعا میں کافر قوم سے مراد فرعون اور آلِ فرعون ہیں اور دُعا مانگنے والے بنی اسرائیل ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون علیہ السلام اور ہم سب کے پیشِ نظر تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مصر میں اسلام کو غلبہ عطا فرمائے۔فرعون اور آلِ فرعون مسلمان ہو جائیں اور یا مغلوب ہو جائیں اور مصر ایک اسلامی ریاست کی شکل اختیار کرلے جس میں صرف اللہ کی حاکمیت ہو لیکن اگر اللہ کی مشیت اس کے موافق نہ ہو تو پھر ہماری دُعا ہے کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے نکلنے کی آسانی پیدا فرما۔کوئی ایسی صورت پیدا فرما کہ ہم ان ظالموں کے چنگل سے نکل سکیں۔ہم ہجرت کر کے کسی آزاد سرزمین پر پہنچ جائیں جہاں ہم موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی رہنمائی میں ان پر نازل ہونے والی شریعت کے مطابق زندگی گزار سکیں۔اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بعض لوگ جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام اللہ کے نبی نہیں بلکہ ایک قومی لیڈر تھے وہ صرف بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے آئے تھے اس لیے انہوں نے بار بار فرعون سے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت چاہی۔لیکن جس شخص کو اللہ نے علم اور بصیرت عطا فرمائی ہے اور اس نے قرآن پاک میں تفصیل سے موسیٰ علیہ السلام کے حالات پڑھے ہیں وہ کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وادی طور میں پہنچنا اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا، اللہ تعالیٰ کا انہیں نبوت عطا فرمانا، معجزات دینا اور پھر یہیں سے فرعون کی ہدایت کیلئے جانے کا حکم دینا اس کا مقصد سورۃ والنازعات کے بیان کے مطابق تزکیہء نفس اور رب کی طرف ہدایت کو قرار دینا اور پھر دربار میں انسانوں کی ہدایت کی

Marfat.com

بحث کا چھیڑنا اور اللہ کی ربوبیت کو زیرِ بحث لانا اور بالکل باقی انبیاء ورسل کی طرح قدم قدم پر اس تحریک کا برگ وبار لانا اور مشکلات کا حائل ہونا اور اللہ کی طرف سے تائید ونصرت کا اترنا ان میں سے کونسی بات ہے جو قومی لیڈروں کی علامت کہی جاسکے۔ان میں سے تو ایک ایک بات نبوت ورسالت کی علامت اور دلیل دکھائی دیتی ہے اور یہی اس کی اصل حقیقت ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

﴿یونس :۸۷﴾

(اور ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کی طرف وحی کی کہ مہیا کرو اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر اور اپنے گھروں کو قبلہ بنادو اور نماز قائم کرو اور ایمان لانے والوں کو خوشخبری دے دو۔)

تربیت کا ذریعہ

گزشتہ آیات کریمہ میں ہم یہ تو جان گئے ہیں کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم وتربیت کے نتیجہ میں ایک بیداری کا عمل شروع ہوگیا ہے قوم کے نوجوان کچھ کرگزرنا چاہتے ہیں ان کے بزرگ بھی اپنی قومی صورتحال سے مطمئن نہیں ہیں لیکن ایک ایسی قوم کو آمادۂ عمل کرنا اور اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات سے ٹکرانے کے لیے اُٹھا کھڑا کرنا جو صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہو اور جو اپنے قابلِ فخر ماضی سے بالکل کٹ چکی ہو اس قوم میں اگرچہ ایک قابلِ ذکر نوجوانوں کی تعداد بھی ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اُٹھ کھڑی ہو تب بھی ان سے کسی بڑے معرکے کی امید نہیں کی جاسکتی۔غلام قوم افراد کا ایک ایسا انبوہ ہوتی ہیں جن کے نزدیک زندگی صبح وشام کی آمد ورفت کا نام ہوتا ہے۔ان کے نزدیک زندگی کا سب سے بڑا مقصد زندگی کی ضروریات کو بہتر طریقے سے حاصل کرلینا ہے۔ضروریات کو کسی مقصد پر قربان کرنا،خطرات کو انگیخت کرنا،ایثار وقربانی کی سنت کو زندہ کرنا اور دلوں میں جذبۂ یقین کو ابھارنا ایسی باتوں کا ان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔بنی اسرائیل اگرچہ انبیاء کی اولاد ہیں لیکن اب حالات نے انہیں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا ہے۔اب ان میں از سرِ نو سے چنگاریاں اٹھانا ایک معجزہ سے کم نہیں اور معجزات ہمیشہ پیغمبروں کے ہاتھوں ظہور میں آتے ہیں۔لیکن پیغمبر اللہ کی رہنمائی میں قومی بیداری کے لیے ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو ان کی امتیں آنے والے حالات میں ہمیشہ اختیار کرسکیں وہ طریقہ چونکہ من جانب اللہ ہوتا ہے اس لیے اپنے نتائج کے اعتبار سے معجزہ سے کم نہیں ہوتا۔چنانچہ پیش نظر آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کے اندر از سرِ نو تعلق باللہ کی جوت جگانے اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا شدید احساس پیدا کرنے کیلئے نماز کا اہتمام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں گزری جو اللہ کے کسی رسول پر ایمان لائی ہو اور اللہ نے اس پر نماز فرض نہ فرمائی ہو۔اس اصول کے تحت بنی اسرائیل پر بھی یقیناً نماز فرض رہی ہوگی لیکن مرورِ زمانہ سے جہاں بنی اسرائیل دیگر دینی خصوصیات سے محروم ہوگئے اسی طرح نماز کی پابندی بھی ان کی زندگی سے نکل گئی اور اگر کہیں کچھ تھوڑا بہت احساس رہا بھی تو اس کی حقیقت اور روحانیت تو بالکل ایک قصۂ پارینہ بن گئی۔اسی لیے یہاں آپ کو حکم دیا گیا کہ تم اپنی شریعت کی رُو سے چونکہ نماز صرف مساجد ہی میں ادا کرنے کے پابند ہو اور مسجدیں فرعون اور آلِ فرعون نے تمہارے لیے باقی نہیں چھوڑیں اس لیے تم کچھ ایسے گھروں کا انتظام کرو جو مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہوں تاکہ ہر علاقہ کے لوگ فرعونیوں کی نظر سے بچ کر نماز کا اہتمام کرسکیں۔اور جن گھروں میں حضرت موسیٰ، حضرت ہارون اور دوسرے ان کے جلیل القدر صحابہ رہائش پذیر ہیں انہیں قبلہ کا درجہ دے دیا جائے تاکہ شہر میں بکھرے ہوئے بنی اسرائیل کے لوگ اس طرف منہ کرکے نماز پڑھیں گے تو انہیں ایک وحدت اور اجتماعیت کا احساس ہوگا۔اس طرح جب مساجد اور جہتِ صلوٰۃ کا انتظام ہوگیا تو پھر اقامت صلوٰۃ کا حکم دے کر نماز کی ایک عملی صورت کا اہتمام کردیا اور اس طرح سے بنی اسرائیل کی تعلیم وتربیت کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی۔

اللہ کے دین کی بنیاد اللہ کی کبریائی پر ہے اللہ اکبر اس کا ماٹو ہے دنیا میں رنگا رنگ فساد کا سبب مختلف قسم کی بڑائیوں کے دعوے ہیں کہیں اس کا نام بادشاہت ہے اور کہیں آمریت۔کہیں طاقت ہے اور کہیں دولت۔کہیں غیب دانی کے دعوے ہیں اور کہیں تقدس کے آستانے۔اسی سے شرک وجود میں آتا ہے اور اسی سے غلامی جنم لیتی ہے اسی سے خدشات پیدا ہوتے اور معاشی استحصال ہوتا ہے اور اسی سے من مرضی کے قوانین کی اطاعت کے لیے راستہ کھلتا ہے ہر دور میں اللہ کے دین نے سب سے پہلے اس بنیادی اصول کو صاف کیا کہ بڑائی اور کبریائی کا مالک کون ہے۔اسلام نے بھی سب سے زیادہ اسی کو اہمیت دی۔

Marfat.com

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

بڑائی اور کبریائی کا سب سے زیادہ تکرار اور دل و دماغ میں اس کا رسوخ سب سے زیادہ نماز کے ذریعے ہوتا ہے اور دنیا کے ہر آستانے اور ہر جھوٹے تقدس سے نفور اقتدار کی ہر صورت اور نفع و ضرر کے ہر واہمے کا استیصال جس طرح نماز کرتی ہے دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی معنوی اور روحانی قوت نہیں کر سکتی۔ اس میں ہاتھ اٹھانے سے لے کر آخری قعود تک، اگر ایک طرف بندگی کا ایک حسین امتزاج نظر آتا ہے تو دوسری طرف اللہ کی عظمت اور اس کا جلال کھل کر سامنے آجاتا ہے چنانچہ جو شخص بھی اپنی زندگی کو نماز کی حقیقت میں ڈھال لیتا ہے اس کی زندگی میں کوئی ایسی کمزوری باقی نہیں رہ جاتی جو اعلائے کلمۃ اللہ کے راستے کی رکاوٹ بن سکتی ہو۔ چنانچہ یہی وہ طریقہ ہے جو اسلامی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور جب تک نماز کی یہ حقیقت زندگی میں جاری وساری رہتی ہے تو آدمی نہ تو گناہ کی آلودگی میں مبتلا ہوتا ہے اور نہ حب دنیا اور ہوسِ اقتدار جیسی کوئی بیماری اس کے دامن کو چھونے کی کوشش کرتی ہے اس لیے پروردگار نے فرمایا ایسے صاحب ایمان لوگوں کو بشارت دے دیجئے کہ اگر ان لوگوں نے نماز سے کماحقہ فائدہ اٹھایا اور اسے صحیح معنی میں اللہ کی یاد کا ذریعہ بنایا اور اس کے نتیجے میں اللہ کی ذات و صفات کا استحضار ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا تو آج جو اجتماعی بے بسی کا احساس مایوسی مرعوبیت اور پژمردگی پیدا کر رہا ہے اور جس کی وجہ سے بنی اسرائیل میں زندگی کی حرارت پیدا نہیں ہو رہی یہ یکسر ختم ہو جائے گا تم انشاء اللہ ایک درخشاں مستقبل کے علم بردار بنو گے اور اللہ کی زمین پر اللہ کی کبریائی کی ایک نئی تاریخ رقم کرو گے۔

وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٨٨﴾ ﴿یونس: ۸۸﴾

(اور موسیٰ نے دعا کی اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں شان وشوکت اور مال و دولت سے بہرہ مند کر رکھا ہے اے ہمارے رب (کیا یہ اس لیے ہے) کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بے راہ کریں۔ اے ہمارے رب ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔)

حضرت موسیٰ ؑ کی بددعا

اس آیت کریمہ میں موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور آلِ فرعون کے خلاف بددعا فرمائی ہے۔ بدُعا کا ایک ایک لفظ خود بول رہا ہے کہ یہ یقیناً اس وقت فرمائی ہوگی جب فرعون اور آلِ فرعون پر اللہ کی جانب سے اتمامِ حجت ہو چکا ہوگا۔ اللہ کا رسول دنیا میں اس لیے آتا ہے کہ وہ اپنی اس قوم پر جس کی طرف وہ ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے ہدایت کے ایک ایک گوشہ کو مکمل کر دے۔ دعوت ہدایت اور افہام و تفہیم کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہ رہے جس میں اللہ کا رسول اللہ کے دین کی ایک ایک بات کو پوری طرح واضح اور ثابت نہ کر دے۔ قوم کے اشتباہات کو ختم کیا جاتا ہے ان کے سوالات کا جواب دیا جاتا ہے ان کے احساسات کی تسکین کا سامان کیا جاتا ہے اور پیغمبر کی دلیل ماموریت کے طور پر معجزات دکھائے جاتے ہیں۔ پیغمبر کی دل آویز شخصیت اور اس کی زبان سے ابلتے ہوئے علم کے سوتے اور اس کا حیران اور خاموش کر دینے والا معصوم سیرت و کردار بجائے خود دلیل بن کر لوگوں کے دلوں میں اُتر جاتا ہے۔ افہام و تفہیم اور دلیل و برہان کے اس پورے پراسس کو اتمام حجت سے تعبیر کیا گیا ہے جب تک یہ اتمامِ حجت نہیں ہوتا اللہ کے نبی کبھی عذاب کی دھمکی نہیں دیتے اور کبھی اپنی قوم کے لیے اللہ سے بدُعا نہیں کرتے۔ پیغمبر کی زبان پر بدُعا کا جاری ہونا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دعوت کا زمانہ اپنی انتہاء کو پہنچ رہا ہے اور اب اس قوم کی زندگی کے دن گنے جا رہے ہیں اس لیے میں نے عرض کیا کہ اس آیت کا ایک ایک لفظ بتا رہا ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوتی زندگی کے آخری زمانے کی دعا ہے۔

دُعا کا انداز

اس دعا کا انداز عجیب ہے جس میں اگر ایک طرف اللہ سے التجا ہے تو دوسری طرف اللہ کے سامنے ایک ایسی دلیل پیش کی جا رہی ہے جو پیغمبر کی

Marfat.com

امت کے لیے فردِ جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں دیکھئے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب سے عرض کر رہے ہیں کہ الٰہی تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو سامانِ زینت عطا فرمایا ٹھاٹھ باٹھ، شان وشوکت اور تمدن وتہذیب کی وہ خوشنمائی عطا فرمائی جس سے بڑھ کر اس دور میں تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا اور مزید یہ کہ آپ نے کثرت سے ان کو مال ودولت عطا فرمایا یعنی ذرائع اور وسائل کی وہ فراوانی عطا فرمائی جس سے ان کی زندگیوں میں ہر طرح کی آسانیاں پیدا ہوگئیں لیکن ان بدبختوں نے بجائے اس پر شکر ادا کرنے اور اللہ کی نعمتوں کا حق ادا کرنے کے اسی کے پیغمبر اور اسی کی دعوت سے ماتھا لگا لیا اور ہر ممکن کوشش کی کہ اللہ کی دعوت لوگوں تک پہنچنے نہ پائے اور اگر پہنچ بھی جائے تو کوئی اسے قبول کرنے کی جرأت نہ کرے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو وہ بھی غلط نہیں ہوگا کہ انہیں سامان زینت اور وسائلِ دنیا تو اس لیے عطا فرمائے تھے کہ وہ اللہ کی بندگی کا حق ادا کریں لیکن انہوں نے اس کے برعکس اپنے ہی وسائل سے اللہ کے بندوں کو تیرے راستہ سے برگشتہ کرنا شروع کردیا۔ قدم قدم پر تیرے دین اور تیرے بندوں کے درمیان رکاوٹیں کھڑی کیں۔ اہل حق کی زندگی مشکل بنادی گئی اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی ہر بات کو توڑ مروڑ کر بے اثر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کی بے جا جسارتوں کو دیکھ کر جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے انہیں تنبیہ کی کہ تم اگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو یاد رکھو تم پر خدا کا عذاب بھی ٹوٹ سکتا ہے تم سے پہلے کتنی امتیں اللہ کے عذاب کا نشانہ بن چکی ہیں لیکن تمہاری بدنصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے کہ تم بجائے اس تنبیہ سے خوف زدہ ہونے کے تم نے بار بار اللہ کے نبیوں سے عذاب کا مطالبہ شروع کردیا اور تمہارے مطالبات سے یُوں محسوس ہوتا تھا کہ تم نے عذاب کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے انسان کو اللہ نے اس کائنات کا گلِ سرسبد بنایا ہے اسے عقل اور شعور کی دولت دی لیکن حیرت کی انتہا ہے کہ جب یہ بگڑ جاتا ہے تو وہ حرکتیں کرتا ہے جو تم کر رہے ہو۔ چنانچہ ان کے اس مطالبہ عذاب کے حوالہ سے اللہ کے حضور عرض کیا جارہا ہے کہ الٰہی اب یہ لوگ مزید ڈھیل دیئے جانے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ اب ان کا بگاڑ ایک متعفن لاش کی صورت اختیار کرچکا ہے یہ جب تک زندہ رہیں گے شرک اور گمراہی کا تعفن پھیلائیں گے ان کے وسائل بھی گمراہی کے کام آئیں گے اس لیے عرض ہے کہ ان کے مالوں کو غارت فرما اور ان کے دلوں پر وہ پٹی باندھ دے جو صرف تیرا عذاب ہی کھول سکے انہیں ایمان کی دولت سے محروم کردے اب اگر ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائیں بھی تو عذاب الیم کا مزا چکھنے کے بعد لائیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ عذاب کیا ہوتا ہے۔

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿يونس : ٨٩﴾

(اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا تم دونوں کی دُعا قبول کی گئی تم دونوں ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔)

قبولیتِ دُعا

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جب دعوت وتبلیغ اور انذار وتبشیر کا حق پوری طرح ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تو پروردگار نے دُعا فوراً قبول فرمالی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب دعا کے پیچھے بندگی اور ادائے فرض کا پورا سرمایہ موجود ہو تو پروردگار دعا قبول کرنے میں کبھی تاخیر سے کام نہیں لیتے البتہ اس کا وقوع اسوقت ہوتا ہے جب اس کا ٹھیک وقت آجاتا ہے اور اس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ قبولیت اور وقوع کے درمیان جو فاصلہ حائل ہوتا ہے وہ فاصلہ چونکہ فیصلہ کن بننے والا ہوتا ہے کیونکہ:

آخری مرحلہ کشتی پہ گراں ہوتا ہے

اس لیے نہایت ضروری ہوتا ہے کہ اس کے لیے ہدایات دی جائیں کیونکہ فیصلہ کا انتظار بعض دفعہ بے صبری میں ڈھل جاتا ہے اور یہیں سے غلطی کا امکان پیدا ہوتا ہے چنانچہ یہاں بھی قبولیت دعا کی نوید سنانے کے بعد ہدایات دیتے ہوئے فرمایا کہ دیکھنا کسی مرحلہ پر بے صبر نہ ہونا اور کہیں بھی اپنی حدود سے آگے نکلنے کی کوشش نہ کرنا اپنی بندگی پر قانع رہنا اور اللہ کے فیصلوں میں دخیل ہونے کی جرأت نہ کرنا جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کو جب کشتی بنانے کا حکم دیا تو ساتھ ہی فرمایا کہ طوفان کے آجانے کے بعد جب لوگ ڈوبنے لگیں تو ان پر رحم کھا کر مجھ سے ان کی سفارش مت کرنا یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ فرعون اور آلِ فرعون پر جب عذاب آئے تو ان میں سے کسی پر رحم کھا کر اللہ کے سامنے دستِ دُعا نہ پھیلانا اور جب تک عذاب نہیں آتا اس وقت تک وہ لوگ عذاب کا تمسخر اڑائیں گے حضورِ حق میں گستاخیاں کریں گے تمہارے ساتھیوں کو بہکانے کی کوششیں کریں گے۔ دنیوی شان وشوکت کے حوالہ سے کمزور مسلمانوں کو آخرت سے بدگمان کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے تم ایک طرف ثابت قدم رہنا اور اپنے ریوڑ کی بھیڑوں

Marfat.com

ریوڑ کے حصار میں رکھنا کہیں کسی شیطان کے ہتھے نہ چڑھ جائیں چنانچہ جب اس دعا کے پورے ہونے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اسباب فراہم کردیئے۔ قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر موقع کی مناسبت سے اس کی تفصیلات بیان فرمائی گئیں ان میں کچھ ہم پڑھ چکے ہیں اور کچھ ہم اگلی سورت میں پڑھیں گے۔ انشاء اللہ! قرآن کریم اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام جب فرعون اور آلِ فرعون سے مایوس ہوگئے تو آپ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے ارادہ یہ تھا کہ ڈیلٹائی علاقے سے گزرتے ہوئے صحراء سینہ میں داخل ہوں اور وہاں سے فلسطین کا راستہ لیں۔ لیکن رات کی تاریکی کے باعث راستہ غلط کر گئے جب صبح کی روشنی پھیلی تو آپ نے اپنے آپ کو بحرِ قلزم کے قریب پایا اسی اثناء میں اطلاع ملی کہ فرعون اپنی فوجوں سمیت تعاقب میں چلا آرہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھا کہ ہم بحرِ قلزم اور فرعون کی فوجوں کے درمیان پھنس کر رہ گئے ہیں اور بنی اسرائیل نے بھی اس پر چیخ وپکار شروع کی تو آپ نے اللہ سے دعا مانگی ادھر سے حکم ملنے پر آپ نے سمندر میں عصا مارا تو اللہ تعالیٰ نے پانی کی روانی کو روک دیا اور بنی اسرائیل کو گزرنے کیلئے راستے بنا دیئے۔ فرعون نے یہ دیکھ کر کہ بنی اسرائیل سمندر میں سے گزر رہے ہیں اس نے سمندر کی خشکی کو مدوجزر کا نتیجہ سمجھا اس نے بھی اپنی فوجیں سمندر میں داخل کر دیں۔ اگلی آیت کریمہ میں اسی کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَھُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ ﴿یونس : ۹۰﴾

(اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا تو ان کا پیچھا کیا فرعون اور اس کے فوجیوں نے سرکشی اور زیادتی سے یہاں تک کہ جب وہ ڈوبنے کی لپیٹ میں آگیا تو بولا میں ایمان لایا کہ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں اس کے فرمانبرداروں میں بنتا ہوں۔)

بنی اسرائیل کی نجات اور فرعون پر عذاب

اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب فرعون پر اتمام حجت ہو جانے کی وجہ سے اللہ کے عذاب کا وقت آیا تو اللہ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل کو مصر سے ہجرت کرنے کا حکم دیا تا کہ ان کے بحفاظت نکل جانے کے بعد فرعون اور آلِ فرعون پر عذاب کا کوڑا برسایا جائے لیکن بنی اسرائیل ابھی راستے میں تھے کہ فرعون اور آلِ فرعون نے ان کا تعاقب شروع کر دیا حالانکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل فرعون کی اجازت سے مصر سے نکل رہے تھے۔ اجازت واپس لئے بغیر اور بدون اطلاع فرعون کا تعاقب کے لیے نکلنا سرکشی اور دشمنی کی انتہا تھی اور کسی بھی مہذب حکمران سے اس کی امید نہیں کی جاسکتی یوں تو وہ پہلے ہی عذاب کا مستحق ہو چکا تھا لیکن اس حرکت سے اس پر مزید اللہ کا غضب بھڑکا۔ اللہ کی قدرتوں کی کیا انتہاء ہے کہ جس سمندر نے بنی اسرائیل کو گزرنے کے لیے راستہ دیا اُسی نے فرعون اور اس کی فوجوں کو پکڑ لیا اور ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکا۔

فرعون کے انجام کے حوالہ سے ایک عجیب حقیقت واشگاف ہوتی دکھائی دیتی ہے کہ توحید کی جس دعوت کو فرعون اور آلِ فرعون نے مدتوں جھٹلایا اور اسی کے انکار پر اس نے اپنی دشمنی کی بنیاد رکھی لیکن جب پکڑا گیا تو کس بے بسی کے ساتھ اس نے توحید کا اعلان کیا کہ میں اس ذات پر ایمان لاتا ہوں کہ جس کے سواء کوئی الٰہ نہیں اور جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں آج سے اس کے فرمانبرداروں میں سے ہوں جو لوگ مصنوعی عظمتوں کے سہارے عظیم ہوتے ہیں اور جنہیں صرف اقتدار سربلند کرتا ہے اور جن کے سیرت وکردار میں کوئی حقیقی توانائی نہیں ہوتی اور جن کے پیچھے کوئی مضبوط عقیدہ سہارا دینے والا نہیں ہوتا وہ جب خدا کی پکڑ میں آتے ہیں تو وہ ایسے ہی بے بس ثابت ہوتے ہیں۔

اٰۗلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۹۱﴾ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ﴿۹۲﴾ ﴿یونس : ۹۱، ۹۲﴾

Marfat.com

(جواب دیا گیا اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا ہے اور تو فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا پس آج ہم تیری لاش کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشان عبرت بنا رہے بے شک بہت سے انسان ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔)

اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب موت کا وقت قریب آجاتا ہے اور اس کے آثار طاری ہونے لگتے ہیں تو اس وقت ایمان قبول نہیں کیا جاتا۔ فرعون جب سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگا اور یقین آگیا کہ اب موت سر پر پہنچ گئی ہے اسوقت اس نے ایمان لانے کا اعلان کیا اللہ کے قانون کے مطابق اس وقت اس کے ایمان کو قبول نہیں کیا گیا۔ بائبل میں اگرچہ اس واقعہ کا ذکر نہیں لیکن تلمود میں تصریح ہے کہ ڈوبتے وقت فرعون نے کہا (میں تجھ پر ایمان لاتا ہوں اے خداوند تیرے سواء کوئی خدا نہیں)

نشانِ عبرت

قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ فرعون کی لاش کو بچالیا گیا مدتوں پہلے پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے آج بھی وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی پائی گئی اس کو موجودہ زمانے میں جبلِ فرعون کہتے ہیں اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمامِ فرعون کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ اسکی جائے وقوع ابوذیمہ سے چند میل اوپر شمال کی جانب ہے اور علاقہ کے باشندے اسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی ملی تھی۔

اگر یہ ڈوبنے والا وہی فرعون منفتہ ہے جس کو زمانہ حال کی تحقیق نے فرعونِ موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ 1907ء میں سرگرافٹن الیٹ سمتھ نے اس کی ممی پر سے جب پٹیاں کھولیں تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہہ جمی ہوئی پائی گئی تھی جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی ایک کھلی علامت تھی اور کھاری پانی میں چونکہ صرف ایک فرعون غرق ہوا تھا جسے فرعون موسیٰ کہتے ہیں اور باقی تمام فراعنہ اپنی طبعی موت مرے اور معمول کے مطابق ان کی لاشیں مومیائی گئیں اس لیے کسی کی لاش پر سے بھی ایسی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی چنانچہ ایک ہی لاش پر اس علامت کا ظاہر ہونا بجائے خود اس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہی وہ فرعون ہے جس کے سمندر میں غرق ہونے کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ
صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ
الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا
فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾ فَاِنْ كُنْتَ فِیْ شَكٍّ مِّمَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ فَسْـَٔلِ
الَّذِیْنَ یَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ
رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِیْنَ
كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ

Marfat.com

عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ
حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٩٧﴾ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ
فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ
عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٩٨﴾
وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ
تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٩﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ
تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ
لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٠﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا
تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠١﴾ فَهَلْ
يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ
فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿١٠٢﴾ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ ع

(اور ہم نے ٹھکانہ دیا بنی اسرائیل کو عزت کا ٹھکانہ اور انہیں پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا پس انہوں نے اختلاف برپا نہیں کیا مگر اس وقت جب ان کے پاس علم آ گیا بے شک تیرا رب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ پس اگر آپ شک میں ہیں اس چیز میں جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تو پھر ان لوگوں سے پوچھئے جو آپ سے پہلے سے کتاب پڑھتے آ رہے ہیں۔ بے شک آپ کے پاس حق آ گیا آپ کے رب کی طرف سے پس آپ شک کرنے والوں سے نہ ہوں اور نہ آپ ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی کہ آپ بھی نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں۔ بے شک جن لوگوں پر پوری ہو چکی ہے تیرے رب کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے خواہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آ جائیں جب تک وہ دردناک عذاب

Marfat.com

نہ دیکھ لیں۔ پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اس کا ایمان اس کو نفع دیتا بجز یونس علیہ السلام کی قوم کے جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دور کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگی میں، اور ایک وقت تک ان کو زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں سب ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ مؤمن بن جائیں۔ اور کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ایمان لاسکے مگر اللہ کے اذن سے۔ (اور اللہ کا طریقہ یہ ہے) کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیا کرتا ہے۔ اے پیغمبر! ان سے کہیے کہ دیکھو کہ کیا ہے آسمانوں اور زمین میں؟ اور نہیں کام آتیں نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو جو ایمان لانا نہیں چاہتے۔ پس وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان جیسے لوگوں کے حالات کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں آپ کہہ دیجئے اچھا انتظار کرو بے شک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ پھر ہم نجات دے دیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو۔ ایسے ہی ہم پر حق ہے ہم مؤمنوں کو نجات دیں گے۔)

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّ رَزَقْنٰھُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَھُمُ الْعِلْمُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۳﴾ ﴿یونس: ۹۳﴾

(اور ہم نے ٹھکانہ دیا بنی اسرائیل کو عزت کا ٹھکانہ اور انہیں پاکیزہ نعمتوں کا رزق بخشا پس انہوں نے اختلاف برپا نہیں کیا مگر اس وقت جب ان کے پاس علم آگیا بے شک تیرا رب ان کے درمیان فیصلہ کرے گا قیامت کے دن ان چیزوں کے باب میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔)

بنی اسرائیل پر اللہ کا انعام اور ان کی ناشکری

اس سے پہلے ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ فرعون اور آلِ فرعون اور موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اور بنی اسرائیل کے درمیان برپا حق و باطل کی آویزش کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور آلِ فرعون کو غرق کر دیا فرعون کی فوج غرقِ آب ہو کر ہمیشہ کیلئے نابود ہو گئی البتہ فرعون کے جسم کو مزید رسوائی اور لوگوں کیلئے عبرت کے طور پر سمندر کے پانی نے باہر اگل دیا اس کی قوم کے لوگ جو غم واندوہ کی تصویر بنے ساحل سمندر پر گھوم رہے ہوں گے کہ شاید کسی لاش کا سراغ ملے انہوں نے اس کے مردہ جسم کو اٹھایا اور مختلف مرحلوں کے بعد معمول کے مطابق اس کی لاش کو مومیا کر شاہی قبرستان میں دفن کر دیا گیا اللہ کی شان دیکھئے آج وہی فرعون جو کبھی اپنے آپ کو مصر کا ربِ اعلیٰ کہتا تھا عبرت کی مکروہ تصویر بنے قاہرہ کے عجائب گھر میں پڑا ہے۔ اور پوری دنیا اس کی بے بسی کو دیکھ رہی ہے لیکن تاریخ کا دوسرا باب یہ ہے جسے قرآن کی اس آیت میں الٹا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل جنہیں مدت دراز سے فرعون اور آلِ فرعون نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور ذلت اور حقارت کا کوئی ایسا طریقہ نہ تھا جو ان پر آزمایا نہ جا رہا تھا ان کے بیٹوں کو قتل اور بیٹیوں کو زندہ رکھ کر ان کی بے غیرتی کا سامان کیا گیا تھا اور دنیا کا کوئی مؤرخ بھی یہ پیش گوئی کرنے سے عاجز تھا کہ کبھی فرعون اور آلِ فرعون اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچیں گے اور بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ غیر معمولی عزت و احترام کے ساتھ صحرائے سینا میں پہنچا دے گا۔ اور انہیں صاف صاف بتا دیا جائے گا کہ ہم نے تمہارے لیے عزت کا ٹھکانہ تیار کر رکھا ہے یعنی اردن اور فلسطین کی سرزمین تمہارے لیے لکھ دی گئی ہے البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ تم صحرائے سینا میں رہ کر اپنی وہ قومی کمزوریاں دور کرنے کی کوشش کرو جو غلامی کی تاریک رات نے تمہارے اندر پیدا کر رکھی ہیں تم ایک زندہ قوم کے اوصاف سے بری طرح محروم ہو چکے ہو۔ اولوا العزمی، اندازِ آفاقی، جذبہ یقین اور اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر و استقامت اور جان سپاری جیسی صفات جو زندہ قوموں کی علامات ہوتی ہیں تم ان سے کلیتاً بے بہرہ ہو۔ مستقبل میں تم سے جو توقعات وابستہ ہیں انہیں بروئے کار لانے کے لئے یہی صلاحیتیں تمہارا اصل اثاثہ ہوں گی اس لئے ضروری ہے کہ تمہیں اس صحرائی اور کہستانی زندگی کی صعوبتوں میں مبتلا رکھ کر تمہارے اندر سخت کوشی پیدا کی جائے۔

یہ بات بہت آسان تھی کہ تمہیں دوبارہ مصر میں بھیج دیا جاتا تم وہاں فرعون کے تخت و تاج کے وارث ٹھہرتے اور زندگی کی آسائشیں تمہارے

Marfat.com

قدموں میں ہوتیں لیکن قدرت تم سے جو کام لینا چاہتی ہے اس کے لیے جس سخت کوشی عزائم کی بلندی اور صبر و استقامت ضروری ہے وہ تمہیں مصر میں کبھی میسر نہ آسکتی۔ وہاں آلِ فرعون کے بچے ہوئے لوگوں کے ساتھ رہ کر تمہاری وہی حالت ہوتی جو اس مریض کی ہوسکتی ہے جس کی صحت کی امید کی جا رہی ہو لیکن اچانک اسے ان لوگوں میں بھیج دیا جائے جو وبائی امراض کا شکار ہوں اور جن کی بیماریوں نے پورے ماحول کو متعفن کر رکھا ہو اس لئے قدرت نے بنی اسرائیل کو دوبارہ مصر جانے کی اجازت نہیں دی بلکہ انہیں اس انتظار میں رکھا کہ وہ خود اپنی اصلاح کی کوشش کریں اور بنی اسرائیل کے مبلغین ان کی بہتری کے لئے کوشاں رہیں چنانچہ جیسے ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں برپا کیے جانے والا انقلاب اردن اور فلسطین میں اپنے پاؤں جمالے گا تو مصر بھی اس سے محروم نہیں رہے گا لیکن اگر آج ان کی تربیت کیلئے صحرائی اور کوہستانی زندگی سے انہیں نہ گزارا گیا تو یہ کبھی مستقبل کی تعمیر کے قابل نہ ہوسکیں گے کیونکہ

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی

قرآن کریم نے بنی اسرائیل کو دیئے جانے والے ٹھکانے کا اگرچہ نام نہیں لیا لیکن اس کے لئے جو تعریفی کلمات استعمال کئے ہیں وہ خود اس کی مراد کو واضح کرتے ہیں۔ ٹھکانے کی پہلی صفت ''صدق'' کے لفظ سے تعبیر فرمائی ہے۔ ''صدق'' کا لفظ جب بطور صفت استعمال ہوتا ہے تو اس سے سچائی، عمدگی، خوبی، خوبصورتی، استحکام، بلند مرتبت جیسی صفات مراد ہوتی ہیں۔ ایسی صفات کا حامل کوئی ملک یا شہر اگر تلاش کیا جائے تو فلسطین اور اُردن کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا یہی وہ علاقہ ہے جسے قرآن کریم نے ارضِ مقدسہ قرار دیا ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام سے پہلے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حق و باطل کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ یہاں کئی نبیوں اور رسولوں کی اعلائے کلمۃ الحق کیلئے کی جانے والی کاوشوں کے نقوش زندہ ہیں۔ کتنے ہی انبیاء کرام وہاں دفن ہیں کتنے رسول ہیں جن کی روحوں کی خوشبو ابھی تک اس ماحول میں مہک رہی ہے اس لئے یہی وہ سرزمین ہے جسے بجا طور پر ''صدق'' سے یاد کیا جانا چاہئے تھا۔

بنی اسرائیل کو عطا کئے جانے والے ٹھکانے کی دوسری صفت جو قرآن کریم نے استعمال کی ہے وہ ہے ''ورزقناھم من الطیبات'' ہم نے ان کو طیبات کا رزق عطا کیا یہ اس علاقے کی سرسبزی اور شادابی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اردن اور فلسطین کا علاقہ انتہائی سرسبز اور نہایت بارآور ہے۔ زمین سے نکلنے والی کوئی نعمت ایسی نہیں ہے جو وہاں پیدا نہیں ہوتی۔ قسم قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں، خوش رنگ پودے اور مشامِ جان کو معطر کرنے والے خوشبو دار پھولوں کی وہ بہتات ہے کہ اللہ کی قدرت یاد آتی ہے۔ بہار کے دنوں میں زمین مخملی لباس پہن لیتی ہے اور رنگ و نور کا سیلاب پھیلتا ہوا دکھائی دیتا ہے مصر بھی ایک سرسبز علاقہ ہے لیکن فلسطین اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ بنی اسرائیل نے ہمیشہ اسی علاقہ کی تمنا کی تھی چنانچہ انہی کی آرزو کے مطابق یہ علاقہ ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ اب مقصود انہیں ایک زندہ قوم میں تبدیل کرنا تھا اور مستقبل کی قیادت اور توحید کا علم ان کے ہاتھ میں دینا تھا اس کے لئے مشیت کا فیصلہ یہ ٹھہرا کہ اب معجزاتی طور پر یہ شہر ان کے حوالہ نہیں کئے جائیں گے بلکہ قوت بازو سے انہیں فتح کرنے کی کوشش کرنا ہوگی البتہ اللہ کی تائید و نصرت یقیناً ان کے ہم رکاب ہوگی۔ لیکن بنی اسرائیل نے ان شہروں کے حصول کے لئے کیا کیا اور کس کس طرح صحرائے سینا کی خاک چھانی۔ اللہ کی شریعت میں کس طرح چور دروازے نکالے۔ راہِ حق میں سرفروشی سے کس طرح جان چرائی اور پھر کس طرح اللہ کے عتاب کے مورد بنے۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔

قرآنِ کریم چونکہ اللہ کی کتاب ہے اور اس کا نازل کرنے والا اپنے بے پایاں علم میں زمانے کی تقسیم نہیں رکھتا اس کے ہاں ماضی، حال اور مستقبل سب برابر ہیں اور روشن ہیں اس لئے وہ بعض دفعہ ایک ہی آیت میں صدیوں کی کہانی سمیٹ لیتا ہے ہمارے لئے یہ فاصلے طے کرنا ممکن ہے دشوار ہوں لیکن ایک بے پایاں بے کراں اور ازلی اور ابدی علم کے مالک کے لئے معمول کی بات ہے۔ اس لئے صدیوں کا سفر لپیٹتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ باوجود اس کے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو علمِ وحی سے نوازا انہیں کتاب عطا کی سالوں تک دو عظیم رسولوں کی تربیت ان کے شاملِ حال رہی۔ قدم قدم پر اللہ کی رہنمائی بارش کی طرح ان پر برستی رہی اور معجزات ایسے ایسے عطا کئے گئے کہ اس امت پر سب سے زیادہ نازپروردہ امت ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس اُمت نے اللہ کے دین میں اختلافات کے راستے نکال لئے۔ احکام میں تبدیلیاں پیدا کیں نئی نئی باتیں

Marfat.com

شریعت میں داخل کی گئیں اللہ کی کتاب کو اپنی خواہشات کے حصول کا ذریعہ بنالیا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ان کی ہدایت کے لئے اللہ نے نبی اور رسول بھیجے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں اللہ نے ان کو وہ شان وشوکت عطا فرمائی کہ دنیا کی بیشتر حکومتیں انہیں خراج ادا کرنے پر مجبور ہوئیں۔ لیکن اس کے بعد ان کا زوال تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں بتایا گیا ہے کہ یہ کس طرح بار بار اللہ کے عذاب کی گرفت میں آتے رہے کبھی اہلِ بابل نے انہیں پامال کیا اور کبھی رومیوں نے ان کی اجتماعی زندگی پارہ پارہ کردی۔ عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت یہود کے لئے ایک بہت بڑی رحمت تھی لیکن یہود نے انہیں اپنے لئے زحمت سمجھا اور بجائے ان کی قدر کرنے کے ان کے درپئے آزار ہوگئے۔ اپنے تئیں انہیں صلیب تک لے گئے۔ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری ان کے لئے سنبھلنے کا آخری موقع تھا وہ اگر چاہتے تو اپنی قسمت سنوار سکتے تھے لیکن اپنے تاریخی عوارض سے وہ جان نہ چھڑا سکے اور صدیوں نے ان میں جو خصائل بدپختہ کردیئے تھے ان میں سے ایک ایک کا ظہور ہونے لگا۔ قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ نے ان کی ایک ایک خیانت کو پکڑا، ان کی ایک ایک خباثت کا علاج کیا، ان کے اشتباہات کو دور کرنے اور ان کے اعتراضات کو رفع کرنے کی ہر ممکن کوشش فرمائی۔ لیکن یہ اپنی تاریخ سے ہٹ کر کوئی نیا کردار انجام دینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ انہیں ہر ممکن طریقے سے ملی زندگی کے دھارے میں لانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ کسی قیمت پر بدلنے کے لئے تیار نہ ہوئے تو پروردگار نے فیصلہ کن ارشاد فرمایا اے پیغمبر آپ ان کی طرف سے پریشان نہ ہوں اب ان کی قسمت کا فیصلہ اور ان کے اُٹھائے ہوئے فتنوں کا فیصلہ قیامت کے دن پروردگار خود فرمائیں گے۔ لیکن اس دن کا فیصلہ ان کے کسی کام آنے کی بجائے ان کی سزا کا موجب ہوگا اور ہمیشہ کے لئے ان کی قسمت میں پتھر پڑ جائیں گے۔

فَاِنْ كُنْتَ فِىْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۹۴) وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ٥

(پس اگر آپ شک میں ہیں اس چیز میں جو ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تو پھر ان لوگوں سے پوچھیے جو آپ سے پہلے سے کتاب پڑھتے آرہے ہیں۔ بے شک آپ کے پاس حق آگیا آپ کے رب کی طرف سے پس آپ شک کرنے والوں سے نہ ہوں اور نہ آپ ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی کہ آپ بھی نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجائیں۔ ﴿یونس: ۹۴،۹۵﴾

اس آیتِ کریمہ کو سمجھنے کا دارومدار چند باتوں کو سمجھنے پر ہے۔

آیت کی تفہیم کیلئے تین باتوں کی وضاحت

١. اس آیت میں خطاب کس سے ہے۔؟

٢. شک کا تعلق کس بات سے ہے۔

٣. پہلے سے کتاب پڑھنے والوں سے کون مراد ہیں۔

١) اب اسی ترتیب سے ہم اس آیت کریمہ پر غور کرتے ہیں سب سے پہلے خطاب کے مسئلے کو لیجیے اس میں امکان دونوں ہی ہوسکتے ہیں کہ خطاب نبی کریم ﷺ سے ہو یا کسی بھی انسان سے اگر ہم اس کا مخاطب کسی بھی انسان کو قرار دیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا جو شخص بھی قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب مانتا ہے اور وہ مؤمن ہے تو اولاً اس کے لئے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ قرآن کریم میں نازل ہونے والی بات کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کرے یا دل میں کوئی شک محسوس کرے کیونکہ ایمان درحقیقت زبان کے اقرار، دل کی تصدیق اور مکمل یقین کا نام ہے۔ اور جو شخص قرآن پاک میں اترنے والی کسی بات میں شک محسوس کرتا ہے اسے اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس آیت میں مخاطب نبی کریم ﷺ کو بنایا جائے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کا نبی جو کئی سالوں سے دنیا کو حق کی طرف بلا رہا ہے اور اس کے لئے ہر تکلیف برداشت کررہا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے اوپر نازل ہونے والے احکام میں کسی شک اور تردد کا شکار ہو یقیناً ایسا نہیں ہوسکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خطاب تو آنحضرت ﷺ سے ہی ہے لیکن اس میں شک وشبہ کی نسبت اور اس پر جو عتاب فرمایا جا

Marfat.com

رہا ہےاس کا خطاب آپ سے نہیں بلکہ انکار کرنے والوں سے ہے۔ قرآنِ کریم کا ایک خاص اسلوب ہے۔ جس کی جابجا مثالیں مل جائیں گی وہ یہ ہے کہ پروردگار جب انکار کرنے والوں یا تکذیب کرنے والوں کی روش سے انتہائی ناخوش ہوتے ہیں تو ان سے رحمت کی نظر پھیر لیتے ہیں لیکن چونکہ ابھی تک ان کی محرومی کا فیصلہ نہیں کیا ہوتا اس لیے انہیں سمجھانا بجھانا یکسر ترک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ سمجھانے بجھانے کی ضرورت تقاضا کرتی ہے کہ ان سے خطاب کیا جائے اور اللہ کی ناراضگی کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں منہ نہ لگایا جائے۔ ایسی صورت حال میں پروردگار خطاب تو اپنے پیغمبر سے فرماتے ہیں لیکن عتاب کا رخ ان مکذبین کی طرف ہوتا ہے اور نتیجے کی بات بھی انہیں سے کی جارہی ہے کہ اگر تم شک اور تردد کی فضا سے نہیں نکلو گے تو حق کے ثبات میں تو کوئی فرق نہیں آئے گا البتہ تمہارا شمار نامرادوں میں ہو جائے گا۔

۲) جہاں تک ما انزل اللہ میں شک کا تعلق ہے۔ اس سے مفسرین کرام نے دو مطلب مراد لئے ہیں ایک تو یہ کہ نبی کریم ﷺ پر جو اللہ کی وحی اتر رہی ہے اور قرآن کریم نازل ہو رہا ہے یہی مراد ہے۔ ظاہر ہے جو شخص بھی اس میں شبہ کرے گا تو اللہ کے دین سے اس کا کیا تعلق باقی رہ سکتا ہے اور دوسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل کے وہ حالات ہیں جن کا تعلق فرعون اور آلِ فرعون سے ہے اور جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی حفاظت میں بحرِ قلزم سے پار پہنچایا اور فرعون اور آلِ فرعون کو بحرِ قلزم میں غرق کر دیا۔ نزولِ قرآن کے وقت ایسے لوگ ہوں گے جو ان واقعات میں شبہات کا اظہار کرتے ہوں گے انہیں بنی اسرائیل کا معجزاتی طور پر سمندر کا عبور کر جانا قابلِ تسلیم نہ تھا ان سے کہا جارہا ہے کہ تمہیں اگر بنی اسرائیل کی تاریخ میں شبہ ہے کہ شاید قرآن کریم اسے صحیح صورت میں پیش نہیں کر رہا تو تم مؤرخین یہود سے پوچھو جو تاریخ سے بھی واقف ہیں اور پہلی آسمانی کتابوں سے بھی۔ تورات بجائے خود اللہ کی کتاب ہی نہیں بلکہ یہود کی تاریخ بھی ہے پھر تلمود مستقل اپنا ایک مقام رکھتی ہے ان کی شہادتوں کی روشنی میں بڑی آسانی سے فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآنِ کریم کا بیان صحیح ہے یا غلط۔

۳) پہلے سے کتاب پڑھنے والوں سے مراد یہود ہیں کیونکہ وہ اس سے پہلے تورات اور زبور کے پڑھنے والے تھے تورات موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اور درمیان میں متعدد آسمانی صحائف نازل ہوتے رہے ان کتابوں کو پڑھنے والا آہستہ آہستہ آسمانی کتابوں کا مزاج شناس ہو جاتا ہے وہ بڑی آسانی سے پہچان جاتا ہے کہ میں جس کتاب کو پڑھ رہا ہوں وہ اللہ کی کتاب ہے یا نہیں۔ مزید برآں یہ بات بھی کہ پہلی آسمانی کتابوں میں نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور قرآن پاک جب ان کا مصداق بن کر تشریف لائے تو یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے اور آپ اللہ کے رسول۔ اتنے بڑے ثبوت کے بعد بھی جو آدمی حق کے حق ہونے کے بارے میں یکسو نہیں ہوتا اور مسلسل اس میں شبہات کا اظہار کرتا ہے تو اسے اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ وہ انتہائی نامراد شخص ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۹۷﴾

(بے شک جن لوگوں پر پوری ہو چکی ہے تیرے رب کی بات وہ ایمان نہیں لائیں گے خواہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آ جائیں جب تک وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔) ﴿یونس ۹۶،۹۷﴾

سُنتِ الٰھی

اللہ کے نبیوں کو دعوت و تبلیغ کی کٹھن ذمہ داری سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کشمکش میں جو انسانی تجربات پیش آتے ہیں ان میں اتنا تنوع ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی کی ذہنی کیفیتیں عجیب و غریب تغیرات سے دوچار رہتی ہیں وہ جس اخلاص و توانائی سے انذار و تبشیر کرتا ہے اور اپنے ایک ایک مخاطب کی باتوں کو جس حوصلہ سے سنتا ہے اور ان کے ذہنی اشتباہات کو جس دلجمعی سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کے احساسات کو جس طرح سلجھانے کی سعی کرتا ہے اس کی وجہ سے ہر لحہ اس کے اندر ایک نئی امید پیدا ہوتی ہے اور وہ ہر لحہ معاشرے میں ایک نئی تبدیلی کی آرزو لئے ہوئے آگے بڑھتا ہے لیکن جب قدم قدم پر اس کی آرزوؤں کا خون ہوتا ہے اور اس کی امیدیں ٹوٹتی ہیں اور جس طرح سے اس کے ارادے شکست ہوتے ہیں اس سے بعض دفعہ وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے اور کبھی اس پر دل گرفتگی طاری ہوتی ہے اس پر قرآن کریم کبھی مرہم رکھتا ہے کبھی شبنم بن کر برستا ہے کبھی انسانی

Marfat.com

فطرت کا در کھولتا ہے اور کبھی سنت اللہ کی خبر دیتا ہے چنانچہ پیشِ نظر آیت کریمہ میں اللہ کی ایک سنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ آپ کی ساری مخلصانہ کوششیں جس طرح سے بعض لوگوں میں ناکام ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور ان کے دل کے کسی گوشے سے کوئی خیر کی کرن پھوٹتی دکھائی نہیں دیتی اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ کی تبلیغی مساعی میں کوئی کمی ہے بلکہ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے قانون کی گرفت میں آچکے ہیں۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ہر انسان کو صحیح راستہ اختیار کرنے کے تمام ممکن ذرائع سے بہرہ مند فرماتا ہے اسے حواس کے بعد عقل کا میزان اور شعور کا نور عطا کیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی تائید میں اللہ کے نبی کی دل آویز شخصیت اس کا مضبوط کردار اس کی اپنے مخالفین کیلئے گہری ہمدردی اور قرآن کریم کے ٹھوس دلائل وبراہین مہیا ہوتے ہیں تاکہ اسے زندگی کے اس اہم موڑ پر فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو لیکن جب وہ ان تمام دلائل وبراہین کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ آنحضرت ﷺ کی صورت میں جلتی ہوئی شمع سے اکتساب نور کرنا نہیں چاہتا۔ اور فطرت کے عطا کردہ رہنمائی کے ذرائع کو ایک طرف لپیٹ کے رکھ دیتا ہے اور وہ اپنے دل پر ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی کے قفل چڑھا دیتا ہے اور دنیا کے عشق میں مدہوش ہو کر آخرت کے تصور کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے تو ایسے شخص کیلئے اللہ کا قانون حرکت میں آتا ہے جسے محرومی اور مہر لگانے کا قانون کہتے ہیں۔ اس نے جس طرح دعوت وہدایت کے ہر راستے سے منہ پھیر لیا اور رہنمائی کی جتنی فطری عقلی اور آسمانی صورتیں ممکن تھیں سب سے لاتعلقی اختیار کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی ناقدری کو حقیقت بنا کر اس پر چسپاں کر دیا اس کے دل کا نور چھین لیا گیا اور اس سے عقل کی سلامتی واپس لے لی گئی۔ اب اسے خواہشات نفس کے حوالے کر کے اس کی لگام کسی شیطان کے ہاتھ میں دے دی گئی اب وہ بظاہر اپنی ہدایت کے لئے کبھی کسی نشانی کو دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے اور کبھی کسی معجزے کی طلب کرتا ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک مفلوج اور محروم آدمی ہے جسے ساری نشانیاں بھی دکھا دی جائیں تو وہ راہِ راست اختیار نہیں کر سکتا البتہ اس کی فطرت اس کی جبلت اور اس کی حقیقت کو اگر کوئی چیز وقتی طور پر بیدار کر سکتی ہے تو وہ صرف اللہ کے عذاب کا ایک جھٹکا ہے جب وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے یا اس کی شدت اس کے جسم کو چھوتی ہے تو تب اسے حقیقت کا شعور ہونے لگتا ہے اور پھر وہ پکار اٹھتا ہے کہ میں اللہ پر ایمان لاتا ہوں لیکن ایسی حالت میں ایمان قابلِ قبول نہیں ہوتا کیونکہ جیسے ہی عذاب کا نزول شروع ہوتا ہے انسان پر بہت سی غیبی حقیقتیں منکشف ہونے لگتی ہیں وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اللہ کی قدرت اسے صاف صاف دکھائی دیتی ہے اسے ایمان بالغیب نہیں کہا جا سکتا جو انسانوں سے مطلوب ہے بلکہ یہ ایمان بالشہادۃ ہے۔ جو اس دنیا میں قابلِ قبول نہیں ہے یہی وہ ایمان ہے جس کا فرعون نے دعویٰ کیا لیکن اللہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا ویسے اگر ایک دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عذاب کا نزول انسانی زندگی کے خاتمہ کا اعلان ہے تو جب زندگی ہی نہ رہی تو ایمان کی بحث کا کیا فائدہ؟ عذاب تو جس قوم پہ آتا ہے اس کے ایک ایک فرد کو نگل جاتا ہے اور وہ قوم دنیا میں عبرت کے طور پر ایک کہانی بن کر رہ جاتی ہے البتہ اس عذاب سے اگر کوئی قوم بچ سکی تو وہ صرف ایک قوم تھی جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آرہا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ؕ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۹۸﴾

﴿یونس: ۹۸﴾

(پس کیوں نہ ہوا کہ کوئی بستی ایمان لاتی کہ اس کا ایمان اس کو نفع دیتا بجز یونس علیہ السلام کی قوم کے جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے دور کر دیا ان سے رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگی میں، اور ایک وقت تک ان کو زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دیا۔)

قریش کو تربیت

اس آیت کریمہ میں معلوم ہوتا ہے بالواسطہ مشرکین مکہ کو توجہ دلائی جارہی ہے کہ تم بھی گمراہ قوموں کی طرح ہمیشہ نبی کریم ﷺ سے معجزات طلب کرتے ہو اور جب تمہیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو تم برافروختہ ہو کر آپ سے عذاب کا مطالبہ کرنے لگتے ہو حالانکہ اللہ کے نبی دنیا میں ہدایت لے کر آتے ہیں عذاب لے کر نہیں آتے آنحضرت ﷺ رسولِ رحمت ہیں رسولِ عذاب نہیں۔ آپ جس عذاب سے ڈراتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے کھلونا سمجھ کر مانگنا شروع کر دو بلکہ وہ ایک تنبیہ ہے کہ تم جس حد تک اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہو بچو ورنہ وہ عذاب ایسی ہولناک چیز ہے

Marfat.com

جس قوم پر بھی آتا ہے اس قوم کی جڑ تک باقی نہیں رہتی۔ اس کے آجانے کے بعد کسی ہدایت کی امید نہیں کی جاسکتی البتہ صرف ایک مثال ہے قوم یونس علیہ السلام کی کہ ان کی طرف خدا کا عذاب آیا لیکن وہ قوم اللہ کے عذاب سے بچ گئی لیکن تم یقین رکھو کہ اگر وہ عذاب آ گیا تم اس کی تباہی سے بچ نہ سکو گے اس لئے بہتر ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی طرح عذاب اترنے سے پہلے اللہ کی بارگاہ میں جھک جاؤ جزع وفزع تضرع اور عاجزی سے جس طرح انہوں نے اپنے آپ کو عذاب سے محفوظ کرلیا تھا تم بھی وہی راستہ اختیار کرو۔

حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے سچے پیغمبر گزرے ہیں قرآن کریم انہیں یونس سے یاد کرتا ہے اور تورات میں ان کا نام ''یونا'' لیا گیا ہے ان کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط کا زمانہ ہے۔ ان کا معاصر اسرائیلی بادشاہ یربعام تھا آپ اگرچہ اسرائیلی نبی تھے مگر آپ کو اسیریا والوں کی ہدایت کے لئے عراق بھیجا گیا تھا آپ شہر نینویٰ کے رہنے والے تھے جو اپنے زمانے میں اسیریا کی نہایت طاقتور سلطنت کا پایۂ تخت تھا اور آج تک عراق میں جہاں موصل ہے اس کے مقابل دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس قوم کے عروج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کا دارالسلطنت تقریباً ساٹھ میل کے دور میں پھیلا ہوا تھا۔

حضرت یونسؑ کا واقعہ

قرآن کریم نے اس قصہ کی طرف تین جگہ اشارے کئے ہیں لیکن تفصیل بیان نہیں فرمائی۔ بائبل میں یونا کے نام سے جو مختصر سا صحیفہ ہے اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ قابل اعتماد نہیں ان کی زندگی میں چونکہ بعض حیرت انگیز واقعات پیش آئے ہیں اور خاص طور پر یہ سوال کہ عذاب آجانے کے بعد ان کی قوم عذاب سے کیسے بچ گئی ہم اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے سے پہلے مناسب سمجھتے ہیں کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں ایک تفصیلی نوٹ لکھا ہے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ جس کا کچھ حصہ تو خود قرآن میں مذکور ہے اور کچھ روایات حدیث وتاریخ سے ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت یُونس علیہ السلام کی قوم عراق میں موصل کے مشہور مقام نینویٰ میں بستی تھی، ان کی تعداد قرآن کریم میں ایک لاکھ سے زیادہ بتلائی ہے ان کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو بھیجا، انہوں نے ایمان لانے سے انکار کیا، حق تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو آگاہ کردو کہ تین دن کے اندر اندر تم پر عذاب آنے والا ہے، حضرت یونس علیہ السلام نے قوم میں اس کا اعلان کردیا، قوم یونس علیہ السلام نے آپس میں مشورہ کیا تو اس پر سب کا اتفاق ہوا کہ ہم نے کبھی یونس علیہ السلام کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا اس لئے ان کی بات نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، مشورہ میں یہ طے ہوا کہ یہ دیکھا جائے کہ یونس علیہ السلام رات کو ہمارے اندر اپنی جگہ مقیم رہتے ہیں تو سمجھ لو کہ کچھ نہیں ہوگا اور اگر وہ یہاں سے کہیں چلے گئے تو یقین کرلو کہ صبح کو ہم پر عذاب آئے گا، حضرت یونس علیہ السلام بارشادِ خداوندی رات کو اس بستی سے نکل گئے، صبح ہوئی تو عذابِ الٰہی ایک سیاہ دھوئیں اور بادل کی شکل میں ان کے سروں پر منڈلانے لگا اور فضاءِ آسمانی سے نیچے ان کے قریب ہونے لگا تو ان کو یقین ہوگیا کہ اب ہم سب ہلاک ہونے والے ہیں، یہ دیکھ کر حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کیا کہ ان کے ہاتھ پر مشرف بہ ایمان ہوجائیں اور پچھلے انکار سے توبہ کرلیں مگر یُونس علیہ السلام کو نہ پایا تو خود ہی اخلاصِ نیت کے ساتھ توبہ واستغفار میں لگ گئے بستی سے ایک میدان میں نکل آئے، عورتیں بچے اور جانور سب اس میدان میں جمع کردیئے گئے، ٹاٹ کے کپڑے پہن کر عجز وزاری کے ساتھ اس میدان میں توبہ کرنے اور عذاب سے پناہ مانگنے میں اس طرح مشغول ہوئے کہ پورا میدان آہ وپکار سے گونجنے لگا، اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی اور عذاب ان سے ہٹادیا جیسا کہ اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے، روایات میں ہے کہ یہ عاشوراء یعنی دسویں محرم کا دن تھا،

ادھر حضرت یونس علیہ السلام بستی سے باہر اس انتظار میں تھے کہ اب اس قوم پر عذاب نازل ہوگا، ان کے توبہ واستغفار کا حال ان کو معلوم نہ تھا، جب عذاب ٹل گیا تو ان کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دیا جائے گا کیونکہ میں نے اعلان کیا تھا کہ تین دن کے اندر عذاب آجائے گا، اس قوم میں قانون یہ تھا کہ جس شخص کا جھوٹ معلوم ہو اور وہ اپنے کلام پر کوئی شہادت نہ پیش کرے تو اس کو قتل کردیا جاتا تھا، یُونس علیہ السلام کو فکر ہوئی کہ مجھے جھوٹا قرار دے کر قتل کردیا جائے گا:

انبیاء علیہم السلام ہر گناہ ومعصیت سے معصوم ہوتے ہیں مگر انسانی فطرت وطبیعت سے جدا نہیں ہوتے، اس وقت یونس علیہ السلام کو طبعی طور پر یہ

Marfat.com

ملال ہوا کہ میں نے بحکم الٰہی اعلان کیا تھا اور اب میں اعلان کی وجہ سے جھوٹا قرار دیا جاؤں گا، اپنی جگہ واپس جاؤں تو کس منہ سے جاؤں اور قوم کے قانون کے مطابق گردن زدنی بنوں، اس رنج وغم اور پریشانی کے عالم میں اس شہر سے نکل جانے کا ارادہ کر کے چل دیئے یہاں تک کہ بحرِ روم کے کنارہ پر پہنچ گئے وہاں ایک کشتی دیکھی جس میں لوگ سوار ہو رہے تھے، یونس علیہ السلام کو ان لوگوں نے پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا، کشتی روانہ ہو کر جب وسطِ دریا میں پہنچ گئی تو دفعۃً ٹھہر گئی، نہ آگے بڑھتی ہے نہ پیچھے چلتی ہے، کشتی والوں نے منادی کی کہ ہماری اس کشتی کی من جانب اللہ یہی شان ہے کہ جب اس میں کوئی ظالم گناہگار یا بھاگا ہوا غلام سوار ہو جاتا ہے تو یہ کشتی خود بخود رک جاتی ہے، اس آدمی کو ظاہر کر دینا چاہیئے تا کہ ایک آدمی کی وجہ سے سب پر مصیبت نہ آئے:

حضرت یونس علیہ السلام بول اُٹھے کہ وہ بھاگا ہوا غلام گناہگار میں ہوں، کیونکہ اپنے شہر سے غائب ہو کر کشتی میں سوار ہونا ایک طبعی خوف کی وجہ سے تھا باذنِ الٰہی نہ تھا، اس بغیر اذن کے اس طرف آنے کو حضرت یونس علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان نے ایک گناہ قرار دیا کہ پیغمبر کی کوئی نقل وحرکت بلا اذن کے نہ ہونی چاہیئے تھی اس لئے فرمایا کہ مجھے دریا میں ڈال دو تو تم سب اس عذاب سے بچ جاؤ گے، کشتی والے اس پر تیار نہ ہوئے بلکہ انہوں نے قرعہ اندازی کی تا کہ قرعہ میں جسکا نام نکل آئے اس کو دریا میں ڈال جائے، اتفاقاً قرعہ میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام نکل آیا، ان لوگوں کو اس پر تعجب ہوا تو کئی مرتبہ قرعہ اندازی کی ہر مرتبہ بحکمِ قضاء وقدر حضرت یونس علیہ السلام کا ہی نام آتا رہا، قرآنِ کریم میں اس قرعہ اندازی اور اس میں یونس علیہ السلام کا نام نکلنے کا ذکر موجود ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِيْنَ،

یُونس علیہ السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ معاملہ ان کے مخصوص پیغمبرانہ مقام کی وجہ سے تھا کہ اگرچہ انہوں نے اللہ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی جس کو گناہ اور معصیت کہا جاتا اور کسی پیغمبر سے اسکا امکان نہیں، کیونکہ وہ معصوم ہوتے ہیں لیکن پیغمبر کے مقامِ بلند کے مناسب نہ تھا کہ محض خوفِ طبعی سے کسی جگہ بغیر اذن خداوندی منتقل ہو جاویں، اس خلاف شان عمل پر بطورِ عتاب یہ معاملہ کیا گیا،

اس طرف قرعہ میں نام نکل کر دریا میں ڈالے جانے کا سامان ہو رہا تھا دوسری طرف ایک بہت بڑی مچھلی بحکمِ خداوندی کشتی کے قریب منہ پھیلائے ہوئے لگی ہوئی تھی کہ یہ دریا میں آئیں تو ان کو اپنے پیٹ میں جگہ دے، جس کو حق تعالیٰ نے پہلے سے حکم دے رکھا تھا کہ یونس علیہ السلام کا جسم جو تیرے پیٹ کے اندر رکھا جائے گا یہ تیری غذا نہیں بلکہ ہم نے تیرے پیٹ کو ان کا مسکن بنایا ہے، یونس علیہ السلام دریا میں گئے تو فوراً اس مچھلی نے منہ میں لے لیا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ یونس علیہ السلام اس مچھلی کے پیٹ میں چالیس روز رہے یہ ان کو زمین کی تہ تک لے جاتی اور دُور دراز کی مسافتوں میں پھراتی رہی، بعض حضرات نے سات، بعض نے پانچ دن اور بعض نے ایک دن کے چند گھنٹے مچھلی کے پیٹ میں رہنے کی مدت بتلائی ہے (مظہری) حقیقتِ حال حق تعالیٰ کو معلوم ہے، اس حالت میں حضرت یونس علیہ السلام نے یہ دُعا کی لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ، اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو قبول فرمالیا اور بالکل صحیح وسالم حضرت یونس علیہ السلام کو دریا کے کنارے پر ڈال دیا،

مچھلی کے پیٹ کی گرمی سے ان کے بدن پر کوئی بال نہ رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کے قریب ایک کدو (لوکی) کا درخت اگا دیا، جس کے پتوں کا سایہ بھی حضرت یونس علیہ السلام کیلئے ایک راحت بن گئی، اور ایک جنگلی بکری کو اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمادیا کہ وہ صبح وشام ان کے پاس آ کھڑی ہوتی اور وہ اس کا دودھ پی لیتے تھے،

اس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو اس لغزش پر تنبیہ بھی ہوگئی، اور بعد میں ان کی قوم کو بھی پُورا حال معلوم ہوگیا،

اس قصہ میں جتنے اجزاء قرآن میں مذکور یا مستند روایاتِ حدیث سے ثابت ہیں وہ تو یقینی ہیں باقی اجزاء تاریخی روایات کے ہیں جن پر کسی شرعی مسئلہ کا مدار نہیں رکھا جاسکتا)

پیشِ نظر آیت کریمہ اور حضرت یونس علیہ السلام کو پیش آنے والے حالات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو دو باتیں توجہ کا دامن کھینچتی ہیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم پر وقت کے پیغمبر کی دعوت کو قبول نہ کرنے پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو پھر اس وقت ایمان قبول نہیں ہوتا جیسے فرعون کا ایمان قبول نہیں کیا گیا لیکن اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم یونس پر اللہ کا عذاب آیا لیکن وہ ٹل گیا اور قوم عذاب سے بچ گئی۔ دوسری یہ بات کہ حضرت یونس علیہ السلام جس ابتلا سے گزرے اور غیر معمولی حوادث کا شکار ہوئے اس کا سبب کیا تھا؟ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس میں بعض جدید

Marfat.com

محققین کا خیال یہ ہے کہ اللہ کا یہ بھی قانون ہے کہ وہ کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں بھیجتا جب تک اپنی حجت تمام نہیں کر لیتا اور حجت تمام اس وقت ہوتی ہے جب پیغمبر کو ہجرت کا حکم ملتا ہے اور جیسے ہی پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے خطرے کی زد سے نکل جاتے ہیں تب اس قوم پر اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔ قوم یونس اس لئے عذاب سے بچ گئی کہ حضرت یونس علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو یہ خبر دی کہ تین دن کے بعد تم پر اللہ کا عذاب آنے والا ہے تو پھر عذاب کا انتظار کئے بغیر وہاں سے تشریف لے گئے جب کہ اللہ کی طرف سے ابھی آپ کو ہجرت کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔﴿وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِباً الخ﴾ سے اسی بات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کے ہجرت کا حکم آنے سے پہلے اپنے مستقر سے روانہ ہو جانے کا مطلب جدید محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اس قوم پر اتمام حجت میں کمی رہ گئی اور اللہ تعالیٰ کا انصاف چونکہ بے لاگ ہے اس لئے اس کا فائدہ اس قوم کو پہنچا اور وہ عذاب سے بچ گئے جبکہ ہمارے قدیم مفسرین کا خیال یہ ہے کہ ان کے عذاب سے بچ جانے کی وجہ یہ ہے کہ ابھی عذاب ان تک پہنچا نہیں تھا بلکہ فضاءِ آسمانی کی وسعتوں میں ابھی تک معلق تھا اور تین دن کی مدت ابھی ختم ہونے میں نہیں آئی تھی لیکن جب یونس علیہ السلام کی قوم نے عذاب کو محسوس کرتے ہوئے اس کے نزول سے پہلے اللہ کی بارگاہ میں تمام لوازمات سمیت توبہ کی اور اپنے آنسوؤں سے زمین کو نہلا دیا تو اللہ کی رحمت جوش میں آئی تو عذاب ان سے واپس بلا لیا گیا۔

جہاں تک حضرت یونس کا ابتلا میں مبتلا ہونے کا تعلق ہے اس کے بارے میں جدید محققین کا کہنا یہ ہے کہ اس کا سبب حضرت یونس علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ہوئی وہ یہ سمجھے کہ چونکہ اب تین دن کی مدت طے ہوگئی ہے تو اس مدت میں اللہ کا عذاب یقیناً آئے گا۔ اب مزید کسی انتظار کی ضرورت نہیں چنانچہ آپ نے اجازت کا انتظار کئے بغیر وہاں سے ہجرت فرمائی یہ وہ آپ کی اجتہادی غلطی ہے جو آپ کی گرفت کا سبب بنی لیکن ہمارے قدیم مفسرین یہ کہتے ہیں کہ آپ سے یقیناً یہ فروگزاشت ہوئی کہ آپ اجازت سے پہلے سفرِ ہجرت پر روانہ ہوگئے لیکن وہ ہجرت یہ نہیں تھی جس کا جدید محققین ذکر کر رہے ہیں بلکہ وہ ہجرت یہ تھی کہ جب آپ اپنے شہر سے چلے گئے اور دور کسی علاقے میں عذاب کا انتظار کرتے رہے تو وقت موعود گزرنے کے بعد آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کی قوم پر اللہ کا عذاب نہیں آیا بلکہ وہ اس سے بچ گئے ہیں تو آپ نے سوچا کہ اب اگر میں اپنی قوم کے پاس واپس جاتا ہوں تو میری قوم یہ سمجھے گی کہ میں نے ان سے جھوٹ بولا ہے اور ان کے یہاں جھوٹ کی سزا قتل ہے تو مجھے اس جھوٹ کی وجہ سے لوگ قتل کر دیں گے چنانچہ آپ نے اس قتل سے بچنے کے لئے ہجرت کا ارادہ فرما لیا اور وہاں سے نکل کھڑے ہوئے اس پوری صورت حال پر غور کرنے سے یہ بات بہر حال واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سے تسامح ہوا اور آپ اجتہادی غلطی کا شکار ہوئے لیکن یہ غلطی وہ نہیں جسے انبیاء کرام کی عصمت کے خلاف کہا جا سکے البتہ اس بات کا فیصلہ کرنا ہمارے لئے آسان نہیں کہ اس کوتاہی کی وجہ سے کیا فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوئی کمی ہوئی یا نہیں! واللہ اعلم والحکم بالصواب۔

آیت کے آخری حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ قوم ایمان لے آئی تو اس کی مہلتِ عمر میں اضافہ کر دیا گیا ایک مدت تک وہ ایمان و عمل میں کوتاہیوں سے محفوظ زندگی گزارتے رہے لیکن پھر رفتہ رفتہ ان میں خیال و عمل کی گمراہیاں پیدا ہوئیں اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کیلئے مختلف وقتوں میں مختلف انبیاء کرام کو بھیجا۔ 720 تا 698 قبل مسیح ناحوم نبی نے ان کی اصلاح کی کوشش کی مگر کوئی اثر نہ ہوا پھر صفنیاہ نبی 640 - 609 قبل مسیح نے انہیں آخری تنبیہ کی وہ بھی کارگر نہ ہوئی آخر کار 612 قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں اللہ تعالیٰ نے میڈیا والوں کو اس پر مسلط کر دیا۔ میڈیا کا بادشاہ بابل والوں کی مدد سے اشور کے علاقہ پر چڑھ آیا۔ اشوری فوج شکست کھا کر نینوئ میں محصور ہوگئی۔ کچھ مدت تک اس نے سخت مقابلہ کیا پھر دجلہ کی طغیانی نے فصیل شہر توڑ دی اور حملہ آور اندر گھس گئے اور پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ گرد و پیش کے علاقے کا بھی یہی حشر ہوا اشور کا بادشاہ خود اپنے محل میں آگ لگا کر جل مرا۔ اور اس کے ساتھ ہی اشوری سلطنت اور تہذیب بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی زمانہ حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں ان میں آتش زدگی کے نشانات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعاً ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ ﴿یونس: ۹۹، ۱۰۰﴾

(اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں سب ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ مومن بن جائیں۔

Marfat.com

اور کسی شخص کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ایمان لا سکے مگر اللہ کے اذن سے۔ (اور اللہ کا طریقہ یہ ہے) کہ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ ان پر گندگی ڈال دیا کرتا ہے۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی دی گئی ہے اور ایمان کے حوالہ سے حقیقت حال بھی واضح کی گئی ہے۔ اللہ کے نبی لوگوں کی ہدایت کے لئے جس طرح بے چین رہتے ہیں وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ لوگ ان کے ساتھ کیسا ہی ظالمانہ سلوک کریں اور ان کو کیسی کیسی اذیتیں پہنچائیں لیکن وہ ان کے لئے ہمیشہ دل و جان سے دُعائیں مانگتے رہتے ہیں اور انہیں سمجھانے بجھانے میں اپنی ہمت کا آخری قطرہ تک نچوڑ دیتے ہیں اس کے باوجود جب لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ راہِ راست کی طرف آنے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ ان کا انحراف اور روگردانی بڑھتی چلی جاتی ہے تو پھر اللہ کے نبی کا دھیان اللہ کی قدرت کی طرف جاتا ہے کہ اللہ کی قدرت سے تو کوئی بات بعید نہیں وہ چاہے تو رگِ سنگ سے لہو بہنے لگے اور صحراء سے حباب اُٹھنے لگیں۔ انسانوں کے دل اس کے قبضے میں ہیں جب چاہے انہیں ایمان کی طرف پھیر دے۔ اور ایسے ہی خیالات مسلمانوں کے دلوں میں بھی پیدا ہوتے ہیں جب وہ اپنی عددی کمی کو دیکھتے ہیں اور دنیا بھر کے کفر کے جتھوں کی سرکشی دکھائی دیتی ہے تو بے ساختہ ان کی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں اور ہر ایک دل سے یہ تمنا اُٹھتی ہے کہ اللہ کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کو اسلام کا سپاہی بنا دے اور انہیں ایمان لانے کی توفیق دے دے۔ اللہ فرماتا ہے کہ تمہاری خواہشیں بھی اچھی ہیں اور تمہاری کاوشیں بھی صحیح۔ لیکن اللہ کی مشیت یہ نہیں چاہتی کہ کسی کو زبردستی مؤمن بنایا جائے اور تکوینی یا تخلیقی طور پر دلوں میں ایمان کو راسخ کر دیا جائے اور ہر جوان ہونے والا بچہ طبعی طور پر ایمان کا حامل ہو کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو پھر اللہ نے جس مقصد کے تحت انسانوں کو زمین پر اُٹھایا اور انہیں خلافت عطا فرمائی ہے اس مقصد کا کیا بنے گا۔ زمین پر انسان کا آنا اللہ سے اس کی وفاداری کا امتحان ہے۔ اسے شعور عطا کیا اور عقل مرحمت فرمائی تا کہ وہ اللہ کی قدرتوں اور صفات کو جاننے کی کوشش کرے۔ اور وحی الٰہی کا نور روشن کیا تا کہ اس کی رہنمائی میں زندگی کی حدود کو متعین کرے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کو شریعت اسلامی کے نام سے ایک منظم قانون دیا تا کہ ہر انسان اور انسانوں کا ہر گروہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزار سکے۔ اللہ کی بنیادی حیثیت اس کا اقتدار اعلیٰ اس کی طرف سے آنے والے پیغمبر اور نازل ہونے والی کتابوں کو دل و جان سے ماننا اور ان کی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارنا یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اب اگر ایک شخص اپنی مرضی سے اسے قبول کرتا ہے تو وہ اس مقصد سے وفا کا عہد کرتا ہے اور اگر کوئی شخص اسے ماننے سے انکار کرتا ہے تو اس سے اپنا تعلق توڑ لیتا ہے۔ اور وہ شیطان کے دھڑے میں جا کھڑا ہوتا ہے۔ ماننے والے نے مان کر اور اس کے مطابق زندگی گزار کر اس امتحان کو پاس کیا اور قیامت کے دن اس کی کامیابی یا ناکامی پر مہر تصدیق ثبت ہو جائے گی۔ اور انکار کرنے والے نے اپنے خالق و مالک سے بغاوت کر کے اپنی اصل حیثیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح سے باغیوں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ اگر پروردگار سب کو زبردستی ایمان کی دولت سے بہرہ مند کر دیتا اور ہر شخص پیدائشی طور صاحب ایمان اور صاحب عمل ہوتا تو وفادار اور بے وفا کی تقسیم ختم ہو جاتی۔ فرمانبردار اور نافرمان سب برابر ہوتے، جزا و سزا کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ حق و باطل کی کشمکش ایک فضول بات ہوتی۔ روئے زمین پر سب اللہ پر ایمان لانے والے اور اس کے فرمانبردار ہوتے نتیجتاً کوئی امتیاز نہ ہوتا کہ ان میں اللہ والے کون ہیں اور شیطان والے کون ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زمین حق و باطل کی ستیزہ گاہ ہے جس میں رہنے والے انسان اپنی عقل اور اپنے فیصلے کے مطابق حق و باطل سے نسبت اختیار کرتے ہیں۔ اور اسی سے ان کے انجام کا فیصلہ ہوتا ہے۔ نبیوں کا آنا اور کتابوں کا نازل ہونا انسانوں کے فیصلے کے لئے ایک ترغیب اور تعاون کی حیثیت رکھتا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ نے اپنا فرض انجام دینے کے لئے اپنی ہمت سے بڑھ کر جان لڑائی ہے اور اس راہ میں آنے والی مشکلات کو آپ نے جس استقامت اور خندہ پیشانی سے برداشت کیا ہے وہ تاریخ کی ایک روشن مثال ہے۔ اس کے بعد کسی کا ایمان لانا یا نہ لانا اس کی اپنی ذمہ داری ہے آپ نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ آپ کا جذبہ اور لوگوں کے حق میں آپ کی رحمت اپنی جگہ۔ لیکن اللہ کا قانون اور اس کی سنت میں اس بات کی ہرگز گنجائش نہیں کہ کسی کو زبردستی ایمان لانے پر مجبور کیا جائے۔ نبی کی سنت چونکہ اللہ کی سنت کے تابع ہوتی ہے اس لئے کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ لوگوں کو زبردستی ایمان لانے پر مجبور کریں۔ ویسے بھی

Marfat.com

ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ دماغ کا ایک فیصلہ ہے اور زندگی کا ایک رویہ ہے جس پر زندگی کے تمام اعمال کا دارومدار ہے۔ اتنے بڑے فیصلے کا اختیار اور آزادی اگرچہ انسان کو دی گئی ہے لیکن مکمل طور پر انسان اس میں آزاد نہیں ہے۔ آدمی کو آزادی صرف اس حد تک دی گئی ہے کہ وہ کسی بھی فیصلے یا کسی بھی عمل کی خواہش کرتا یا ارادہ کرتا ہے۔ اور پھر اسے بروئے کار لانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کام کے وجود میں آنے کے لئے جو حقیقی اسباب، وسائل اور محرکات ہونے چاہییں وہ انسان کے بس میں نہیں۔ مثلاً انسان اگر بازو کو حرکت دینا چاہتا ہے تو حرکت دینے کا ارادہ کرنا یہ تو انسان کے بس میں ہے لیکن بازو میں حرکت کی طاقت کا ہونا اس میں اعصاب کا اپنا فرض انجام دینا یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو آدمی ایمان لانے کا ارادہ بھی رکھتا ہے وہ جب تک اللہ سے اس کے لئے توفیق نہیں مانگتا یعنی اسباب کی فراہمی کی دعا نہیں کرتا اور اللہ کی طرف سے اس کی قبولیت نہیں آجاتی اس وقت تک وہ چاہتے ہوئے بھی ایمان لانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لئے پروردگار نے فرمایا کہ کسی نفس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ اللہ کی توفیق کے بغیر ایمان لے آئے۔ اور جو شخص سرے سے ایمان کا ارادہ ہی نہیں رکھتا اور کائنات کے جن حقائق کو جاننا اور ماننا ایمان کا تقاضا ہے اس کے لئے حواس، عقل اور شعور جو اللہ کے عطا کردہ ذرائع ہیں ان سے کام لینے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ وہ شخص ایمان سے رفتہ رفتہ اور دور ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ خواہشاتِ نفس کے اتباع میں جیسے کچھ اعمال جمع کرتا رہتا ہے ان تمام اعمال کی گندگی اُٹھا کر پروردگار اس پر لاد دیتا ہے۔ یہی گندگی کا ڈھیر اس کے رستے کی ایک ایسی رکاوٹ بن جاتا ہے جس سے زندگی بھر وہ عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔

قُلِ انْظُرُوْا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴿یونس : ۱۰۱﴾
(اے پیغمبر! ان سے کہیے کہ دیکھو کہ کیا ہے آسمانوں اور زمین میں؟ اور نہیں کام آتیں نشانیاں اور ڈراوے ان لوگوں کو جو ایمان لانا نہیں چاہتے۔)

مطالبۂ معجزات کا جواب

مشرکین مکہ معذب قوموں کی طرح نبی کریم ﷺ سے بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ آپ ہمارے سامنے ایسی بڑی بڑی نشانیاں لائیں جنہیں دیکھ کر ہم یقین کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں، اور یا ہمارے سامنے کوئی ایسا ہولناک منظر لائیں یا دل ہلا دینے والی مصیبتیں ہم پر مسلط کر دیں جس سے ہمارے دل دہل جائیں اور ہم یہ تسلیم کرنے پر تیار ہو جائیں کہ اگر ہم نے آپ کی دعوت کو قبول نہ کیا تو ہم تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ ایسی بڑی بڑی نشانیاں جو صرف اللہ کی دسترس میں ہیں انہیں دیکھ کر ایمان نہ لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کے نمائندے کی توہین کر رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں ایمان قبول کرنا ہمارے لئے لازمی ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ نشانی ایک نشان راہ ہوتی ہے جس سے منزل کی خبر ملتی ہے اور ڈراوا ایک نقصان سے بچنے کا الارم ہوتا ہے۔ جس کے پیچھے ایک بہت بڑا خطرہ چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کے لئے حضرت انسان کو کسی خاص تردد کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ اپنے گرد و پیش میں آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے زمین کے فرش سے لے کر فضائے نیلگوں تک اور پھر آسمان کی بلندیوں میں ایک سے ایک بڑھ کر نشانی دکھائی دیتی ہے جس سے اللہ کی وحدانیت اور اس کی بے پناہ قدرتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ گھاس کی پتی سے لے کر زمین میں پھیلی ہوئی مختلف قسم کی فصلیں پانی کے اُبلتے ہوئے چشمے، بلندی سے گرتی ہوئی آبشاریں، برق و رعد کے ہنگامے، باد و باراں کے طلسماتی جلوے، زمین پر پھولی ہوئی سرسوں اور گرد و پیش میں مسکراتے ہوئے زعفرانی پھول اور رنگ و روپ کے مسحور کن منظر نامے زمین کی قوت روئیدگی کی معجزاتی کیفیتیں سورج کی روشنی اور چاند کی ٹھنڈک سے پیدا ہونے والے خیرہ کن اثرات غرضیکہ نشانیوں کی ایک دنیا ہے جو زمین سے امنڈتی ہوئی اور آسمان سے برستی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان کو دیکھنے والی نگاہوں میں بصیرت کی روشنی موجود ہو۔ حقیقت یہ ہے

جہاں میں ہیں عبرت کے ہر سو نمونے
مگر تم کو اندھا کیا رنگ و بُو نے

جس آنکھ میں بصیرت ہے اور دل میں قبولیت کا مادہ ہے اس کے لئے کائنات کا ایک ایک ورق درسِ نصیحت اور درسِ عبرت ہے۔ لیکن جن

Marfat.com

دلوں میں نور نہیں اور جن کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں ان کے لئے دنیا کی کوئی چیز بھی روشنی کا سامان نہیں بن سکتی۔

فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ ثُمَّ نُنَجِّيْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴿یونس: ۱۰۲، ۱۰۳﴾

(پس وہ انتظار نہیں کر رہے مگر ان جیسے لوگوں کے حالات کا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں آپ کہہ دیجئے اچھا انتظار کرو بے شک میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ پھر ہم نجات دے دیتے ہیں اپنے رسولوں کو اور ان پر ایمان لانے والوں کو۔ ایسے ہی ہم پر حق ہے ہم مومنوں کو نجات دیں گے۔)

جو لوگ اپنے رویے سے اپنے آپ کو فطری صلاحیتوں سے محروم کر لیتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ آفاق وانفس کے اندر پھیلی ہوئی نشانیوں سے استفادہ کرنے سے تہی دامن ہو جاتے ہیں بلکہ ان کی صلاحیتیں معکوس راستے پر چل نکلتی ہیں وہ بجائے اس کے کہ اپنی صلاحیتوں سے اور کائنات میں پھیلی ہوئی اور بولتی ہوئی نصیحت اور عبرت کی باتوں سے کوئی سبق سیکھیں وہ ہر صحیح بات کا منہ چڑاتے اور ہر غلط بات کی طرف لپکتے ہوئے جاتے ہیں۔ تاریخ بھی ایک درسِ عبرت ہے لیکن ایسے لوگ اس سے بھی سبق سیکھنے کی بجائے اُن لوگوں کے نقوشِ راہ ڈھونڈتے ہیں جو اپنے پیچھے تباہی کی داستانیں چھوڑ گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ ان کی تاریخ سے سبق سیکھ کر ان راہوں سے بچتے جن پر چلنے سے وہ تباہ ہوئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیر وشر کے پیمانوں میں کوئی ایسی تبدیلی واقع ہوتی ہے کہ ان کو یہی راستے اچھے لگتے اور یہی تباہ ہونے والے لوگ ان کی دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جس فرعون کی لاش عبرت بنی ہوئی قاہرہ کے میوزیم میں پڑی ہوئی ہے اسی قاہرہ کے حکمران قریبی تاریخ تک اس فرعون کے مجسمے شاہراہوں پر نصب کر کے اپنے آپ کو اس کی اولاد کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ ایران کا بادشاہ پرانے دورِ جاہلیت سے اپنی نسبتوں پر فخر کرتا تھا اور ہمارے ملک میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے آپ کو راجہ داہر کا وارث قرار دیتے ہیں انہیں اس عظیم تاریخی انقلاب سے کوئی دلچسپی نہیں جسے نبی کریم ﷺ کے مبارک ہاتھوں نے سرزمینِ عرب پر برپا کیا اور جس کے اثرات آج تک دنیا کے کونے کونے میں اپنا رنگ دکھا رہے ہیں لیکن انہیں دلچسپی ہے تو موہنجوڈارو کے کھنڈرات سے جہاں شب وروز کی کھدائی سے چند ٹوٹے ہوئے ظروف تلاش کر کے وہ ایک پوری تہذیب کا تانا بانا تیار کرنے میں مصروف ہیں اور اس مصنوعی کلچر پر انہیں فخر ہے۔ کسی شاعر نے نہایت تاسف سے نہایت کام کی بات کہی ہے۔

عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

قرآنِ کریم اپنے مخاطبین کا نوحہ پڑھتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ انہیں کائنات کی کسی نشانی سے غرض نہیں البتہ یہ انتظار کر رہے ہیں اسی قسم کے فیصلہ کن عذاب کا جو عاد وثمود کو تاریخ کی دھول بنا چکا ہے۔ فرمایا کہ اگر تمہیں ایسے ہی حالات اور ایسے ہی عذاب کا انتظار ہے تو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں کیونکہ تمہارے کرتوت اسی راستے پر جانے کی خبر دیتے ہیں البتہ میں تمہیں کوئی متعین تاریخ نہیں دے سکتا کیونکہ عذاب لانا میرا کام نہیں بلکہ یہ پروردگار کا کام ہے۔ میں تو تمہارے پاس وہ دین لے کر آیا ہوں جسے قبول کر کے تم اللہ کے عذاب سے بچ سکتے ہو۔ لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب ایسا عذاب نازل ہوتا ہے تو اس سے ہمیشہ اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والے بچا لئے جاتے ہیں تو اے مشرکینِ مکہ! اگر تم نے اپنی بداعمالیوں اور بداطواریوں سے اللہ کے عذاب کو دعوت دے دی تو پھر یہ مت سمجھو کہ اس کا نقصان کسی اور کو پہنچے گا نہیں، اس کا کوڑا تمہاری کمر پر برسے گا اور تمہاری جڑ اکھاڑ دی جائے گی۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ
اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ

Marfat.com

تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚۖ
وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ
لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَلَا تَدْعُ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ
يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ
وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ
رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ
فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۱۰۸﴾ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى
اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ ع

(اے پیغمبر! کہہ دیجئے۔ اے لوگو اگر تمہیں شک ہو میرے دین کے بارے میں تو سن لو کہ تم اللہ کے سواء جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو بندگی کرتا ہوں اُس اللہ کی جو تمہیں مارتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ نیز (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنے آپ کو جما کر رکھ اس دین پر ہر طرف سے یکسو ہو کر اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو جا اور نہ پکار اللہ تعالیٰ کے سواء کسی ایسی ہستی کو جو نہ تجھے نفع دے سکے اور نہ نقصان پہنچا سکے۔ اگر تو ایسا کرے گا تو پھر تیرا شمار ظالموں میں سے ہوگا۔ اور اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سواء اُسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔ اور اگر وہ ارادہ فرمائے تیرے حق میں کسی بھلائی کا تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے سرفراز فرماتا ہے۔ وہ درگزر کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دیجئے! اے لوگو آ گیا تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے تو جو ہدایت قبول کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے کرتا ہے اور جو بھٹکتا ہے اس کا وبال اسی پر آئے گا اور میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اے پیغمبر! آپ پیروی کیجئے اس چیز کی جو تم پر وحی کی جاتی ہے اور ثابت قدم رہئے یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دیں اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔)

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ

Marfat.com

يَتَوَفّٰكُمْ ۚ ۖ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝

﴿یونس: ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷﴾

(اے پیغمبر! کہہ دیجئے۔ اے لوگو اگر تمہیں شک ہو میرے دین کے بارے میں تو سن لو کہ تم اللہ کے سواء جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو بندگی کرتا ہوں اُس اللہ کی جو تمہیں مارتا ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ نیز (مجھے حکم دیا گیا ہے کہ) اپنے آپ کو جما کر رکھ اس دین پر ہر طرف سے یکسو ہو کر اور ہرگز ہرگز مشرکوں میں سے نہ ہو جا اور نہ پکار اللہ تعالیٰ کے سواء کسی ایسی ہستی کو جو نہ تجھے نفع دے سکے اور نہ نقصان پہنچا سکے۔ اگر تو ایسا کرے گا تو پھر تیرا شمار ظالموں میں سے ہوگا۔ اور اگر اللہ تجھے کسی مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سواء اُسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔ اور اگر وہ ارادہ فرمائے تیرے حق میں کسی بھلائی کا تو اس کے فضل کو پھیرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے سرفراز فرماتا ہے۔ وہ درگزر کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔)

آیت کے فہم کیلئے چند امور کی وضاحت

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں توحید کے مختلف گوشوں کو اس طرح کھولا گیا ہے کہ آدمی تفکر اور تدبر سے مقدور بھر جتنا گہرا اترتا جاتا ہے اُتنا ہی اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ کتابِ خداوندی کی کسی بھی آیت کے مفہوم کی پاتال تک پہنچ سکے۔ ہم اپنی حقیر کاوشوں سے کام لے کر کچھ عرض کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

سب سے پہلی جو چیز سامنے آتی ہے وہ سورۃ یونس کا اسلوب ہے آپ پہلا رکوع پڑھ کر دیکھ لیجئے اس میں مشرکین کے بعض اعتراضات کا جواب اور ان کی بعض حماقتوں کا ذکر فرمانے کے بعد انہیں اللہ کی خالص بندگی کی دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ ان آیات کو دیکھ لیجئے یہ سورۃ کی آخری آیات ہیں جن پر سورۃ ختم ہو جاتی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان آیات کا مرکزی مضمون بھی توحید اور اللہ کی بندگی اور اطاعت ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ تمام عقائد کے لئے توحید کو بنیاد بنانے اور اس پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے اور پیدا ہونے والے بعض گوشوں کا تذکرہ فرمانے کے بعد ان آیات میں اب ان تمام مضامین اور تمام بحث کو Some Of کیا جا رہا ہے۔

دوسری بات جو محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے ان آیات کے تیور زیادہ تیکھے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اللہ کی بردباری اور حلم کے بندھن ٹوٹنے والے ہیں۔ اگرچہ وہ آخری وقت جس میں کسی قوم کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے وہ تو نہیں آیا تاہم اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برأت کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ ہر رسول کی دعوتی زندگی میں ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اُسے اپنی قوم کا ردِ عمل اور رویہ ناقابلِ برداشت معلوم ہونے لگتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ میری تمام مثبت کوششوں کے جواب میں قوم کے منفی طرزِ عمل میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ بھلائی کے بدلے میں بھلائی اور احسان کے بدلے میں احسان کرتا ہے۔ مسکراہٹ کا جواب ہمیشہ مسکراہٹ ہوتا ہے لیکن دعوتی زندگی کا یہ حادثہ ہے کہ اللہ کا رسول جو اپنے اندر اپنی قوم کے لئے ہمدردی اور خیر خواہی کا ایک سمندر موجزن رکھتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ ان کی گالیاں سُن کر دعائیں دیتا ہے۔ ان کے پتھر کھا کر حسنِ سلوک کے موتی برساتا ہے۔ ان کے مظالم پر بددعا کرنے کی بجائے ان کی ہدایت کے لئے دُعا مانگتا ہے لیکن قوم ان احسانات کا اثر قبول کئے بغیر جب اذیت اور عداوت میں حد سے بڑھ جاتی ہے تو اللہ کے رسول کو خیال ہونے لگتا ہے کہ اس قوم میں ہدایت کی قبولیت کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ یہ رفتہ رفتہ لطیف جذبات سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ اب وہ اپنی قوم سے اللہ کے دین کے حوالے سے فیصلہ کُن باتیں کرنے لگتا ہے۔ اور ان کی ہدایت کی جانب سے برأت کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ یہ وہ آخری مرحلہ ہوتا ہے کہ یا قوم سدھر جاتی ہے یا ایک مدت کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور ایمان لانے والوں کو ہجرت کا حکم دے کر کسی محفوظ جگہ منتقل کر دیتا ہے۔ اور وہ نابکار قوم اللہ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان آیات کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ

Marfat.com

آنحضرت ﷺ ایسے ہی احساسات سے بہرہ ور ہیں اور وہ اپنی قوم کو بچانے کے لئے آخری باتیں کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔
آنحضرت ﷺ اللہ کے حکم سے اپنی قوم سے فرما رہے ہیں کہ میں اللہ کی طرف سے جو دین لے کر آیا ہوں اُسے سمجھانے، آسان کرنے اور دلوں میں اُتارنے میں میں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تم نے ہر ممکن طریقے سے میری دعوت کو روکنے کی کوشش کی لیکن میں کبھی حالات سے متاثر نہیں ہوا تمہاری اذیتوں اور مخالفتوں نے مجھے تمہاری طرف سے کبھی لاتعلقی پر مجبور نہیں کیا لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ برسوں کی محنت وریاضت کے باوجود تم اب تک میرے دین کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہو اور تم اب تک یہ امید لگائے بیٹھے ہو کہ ممکن ہے کہ میں اپنے دین میں کوئی تبدیلیاں پیدا کردوں۔ کسی پتھر پر بھی بوند بوند گرتی رہے تو اس میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے لیکن تمہارے دل تو معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں۔ تمہارے دلوں کی سنگینی نے ہر سنگینی کو مات کر دیا ہے۔ تم اب تک وہی پرانی باتیں دہراتے نظر آتے ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں تم سے صاف صاف کچھ باتیں کہوں۔ تمہیں پہلی بات تو یہ معلوم ہونی چاہیے کہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ کسی نہ کسی بڑائی کے سامنے جھکتا ہے، کوئی نہ کوئی عظمت اسے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرتی ہے۔ انسان بنیادی طور پر بندہ ہے۔ بندگی اس کی فطرت اور جبلت ہے۔

بحث طلب دو باتیں ہیں پہلی بات یہ ہے کہ عبادت، عبودیت اور عبدیت جس کا ترجمہ عام طور پر بندگی کیا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ قرآن کریم نے ہمیں جو اس کا مفہوم سمجھایا ہے وہ چار مفاہیم کا مرکب ہے۔ یعنی عبدیت یا عبادت اس بندگی کو کہتے ہیں جو عاجزانہ فرمانبرداری سے شروع ہوتی ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے کبھی غیر مشروط اطاعت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر غلامی میں ڈھل جاتی ہے۔ اور اگر اسے مذہبی تقدس حاصل ہو جائے تو یہی غلامی پرستش کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بندگی کی یہی وہ چاروں صورتیں ہیں جس نے انسانوں کو پہلے عزت نفس سے محروم کیا پھر اسے اس کے اپنے مقام ومرتبہ سے بے خبر بنایا حتی کہ ایک وقت آیا جب وہ پوری طرح اپنے آپ کو گم کر بیٹھا اور انسانی غلامی اور انسانوں کی پرستش کی زنجیروں میں جکڑا گیا چنانچہ اس آیت کریمہ میں سب سے پہلی بات جس کا آنحضرت ﷺ انکار فرما رہے ہیں وہ یہی ہے کہ اے مشرکین مکہ تم نے جس طرح اپنی

فرمانبرداری اور غیر مشروط اطاعت کے جس طرح بعض آستانے یا طاقت وقوت کے بعض مراکز چن لئے ہیں اور جس طرح تم نے ہر تخت وتاج کے مالک اور ہر بے پناہ قوت کے علمبردار کے سامنے غلامی کی روش اختیار کی ہے اور جہاں کہیں تمہیں مشیخیت اور تقدس کی جھلک نظر آئی ہے تو تم نے اپنا سرمایہ پرستش جس طرح اس کے سامنے ڈھیر کر دیا ہے میں یہ کام ہرگز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ مال ودولت، قوت وطاقت، تخت وتاج اور سلطنت ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کے سامنے انسانیت کو بطور خراج پیش کر دیا جائے۔ آج جو لوگ ان قوتوں کے مالک ہیں ضروری نہیں کل بھی وہی مالک رہیں۔ یہ آنی جانی چیزیں ہیں، یہ انسانی ضرورتیں ہیں اور انسان کے جہد وعمل کا حاصل اور سرمایہ ہیں۔ یہ نہ خود انسان ہیں نہ انسانیت سے عبارت ہیں۔ اصل قابلِ ذکر چیز اور قابلِ افتخار مخلوق جس کے سر پر اللہ نے عظمت کا تاج سجایا ہے وہ حضرتِ انسان ہے اور اس کی انسانیت ہے جو شخص خود انسان اور انسانیت کو ان مصنوعی قوتوں کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے اسے اندازہ ہی نہیں کہ وہ اس کائنات پر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے اور اللہ کے فیصلوں پر کیسی بے اعتمادی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ انسان کہ کائنات کی بے شمار مخلوقات جس کی خادم بنائی گئی ہیں اور بے شمار عناصر جس کی تسخیر میں دے دیئے گئے ہیں اور جس کے مرتبہ ومقام کا حال یہ ہے کہ:

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی اپنی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

غیر اللہ کی بندگی کرنے والے اس مرتبہ ومقام سے گر کر نہ جانے اپنے لئے کیا مقام تجویز کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ نے صاف صاف فرمایا کہ تم نے اپنے سے کہتر اور کمتر مخلوقات کے سامنے یا اپنی جیسی مخلوقات کے سامنے جس طرح بندگی کا سرمایہ ڈھیر کیا ہے میں یہ کام ہرگز نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں یہ ایک ایسا نقطہ ہے جس سے پاؤں پھسل جائیں تو انسان ذلتوں کی اتھاہ وادی میں جا گرتا ہے کیونکہ انسان کی کہانی صرف یہ ہے۔

گرے اگر تو بس ایک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

Marfat.com

دوسری بحث طلب بات یہ ہے کہ بندگی کا مستحق کون ہے۔ وہ کون ذات ہے جس کے سامنے انسان کو جھکنا چاہیے، جس کے سامنے دستِ سوال دراز ہونا چاہئے۔ حاضر وغائب جس سے محبت کرنی چاہئے اور جس کی ناراضگی سے ڈرنا چاہئے اور جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ ہر وقت مجھے دیکھتا ہے۔ میرا ہر عمل اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ کمزوریوں میں وہی میرا سہارا ہے اور توانائیوں میں وہی میرا آستانہ ہے۔ نہ وہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ آتی ہے۔ موت وحیات جس کے قبضے میں ہے وہی ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور راہِ معیشت اس پر کھولی۔ اور زندگی گزارنے کے ڈھب سکھائے جس ذات بالا قدر میں یہ صفات ہوں گی وہی میری بندگی کا مستحق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ صفات میرے جیسے انسانوں میں ہوسکتی ہیں۔ کیا یہ قدرتیں مخلوقات میں ممکن ہیں چنانچہ اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروردگار نے رسول ﷺ کو یہ کہنے کا حکم دیا کہ میں بندگی اس اللہ کی کروں گا اور اس کی غلامی کا دم بھروں گا اور اس کی غیر مشروط اطاعت کروں گا اور اس کی پرستش کروں گا جس کے قبضے میں، اے مشرکین مکہ تمہاری اور تمام انسانوں کی جان ہے۔ اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور وہ جب چاہے تمہاری جان قبض کرسکتا ہے۔ تم جن قوتوں کے سامنے جھکتے ہو اور جن کو تم نے خدائی کے منصب پر فائز کر رکھا ہے اور جن سے تم مرادیں مانگتے ہو اور جنہیں تم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے بتاؤ ان میں کون ہے جو زندگی اور موت کا مالک ہو۔ بڑے بڑے فراعنہ ونمارد ہ ربوبیت کے دعوے دار بن کر اُٹھے لیکن بالآخر موت کی ایک پھونک کے سامنے ڈھیر ہوگئے۔ جن کی ہیبت وجبروت سے زمین کانپتی تھی اور اہلِ زمین لرزہ براندام رہتے تھے۔ ان میں سے کون ہے جو موت کے چنگل سے بچ سکا ہے جنہیں یہ غلط فہمی رہی کہ ناممکن کا لفظ ان کی ڈکشنری میں نہیں۔ وہ بھی ذلت کے ساتھ موت کی وادیوں میں اُتر گئے۔ آدمی کی ساری عظمتیں اس کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں اور زندگی ہی میں وہ قسم قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنے بارے میں اسے صحیح اندازہ نہیں ہو پاتا اس لئے خاص طور پر موت کا حوالہ دے کر بتایا گیا ہے کہ تم اگر حقیقت آشنا بننا چاہتے ہو تو اس آئینہ میں اپنے آپ کو اور عظمت کے دعوے داروں کو دیکھنے کی کوشش کرو۔ جس سے تمہیں یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ کائنات کی حقیقی قوت مخلوق نہیں بلکہ اس کا خالق ہے۔ مخلوق کے تمام دعوے فریبِ نظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اقبال نے ٹھیک کہا

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زمان نہ مکاں لا إلٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دُنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا إلٰہ الا اللہ

کائنات کی سب سے بڑی حقیقت اور صداقت یہی ہے کہ اللہ ہی وہ ذات ہے جو انسانوں اور دیگر مخلوقات کی بھی بندگی کی مستحق ہے۔ اللہ کا آخری رسول چونکہ ان صداقتوں کا آخری اعلان کرنے والا بن کر آیا ہے اس لئے انتہائی ضروری ہے کہ ان بنیادی صداقتوں کے اعلان اور انطباق میں کوئی کمی اور کوئی خلا باقی نہ رہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ ان کے شریکوں کی بندگی سے انکار کرنے کے بعد اس مثبت حقیقت کا اعلان فرمارہے ہیں کہ میں اس اللہ کی بندگی کروں گا جو تمہاری زندگیوں کا مالک ہے۔ وہ جب چاہتا ہے تم سے زندگی چھیننے کی قدرت رکھتا ہے۔ تمہارے سارے دعوے اور تمہاری قوت وہیبت کا سارا طمطراق تمہاری زندگی کے ساتھ وابستہ ہے یہی وہ روشنی ہے جس نے تمہیں چکا چوند میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کس قدر بے وقوفی کی بات ہوگی اگر ان قوتوں کے سامنے سر جھکایا جائے جو اس چکا چوند میں مبتلا ہیں۔ اور جن کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ جب آخری وقت آتا ہے تو ایک لمحہ کے لئے کمی بیشی نہیں کرسکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے غیر معمولی اقتدار کا دعویٰ کرنے والے نہ اپنی زندگی پر قدرت رکھتے ہیں اور نہ موت پر۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دوسروں کو زندگیاں دے سکیں یا کسی اور کو موت سے بچا سکیں۔ حضور فرماتے ہیں میں تو اس اللہ کے سامنے بندگی کے لئے جھکوں گا جو تمہیں موت دیتا ہے اور تمہاری موت جس کے قبضے میں ہے۔ اس لئے اس کے سامنے صرف مجھے ہی نہیں جھکنا چاہئے بلکہ تمہیں بھی جھکنا چاہئے کیونکہ تمہیں بھی زندگی وموت دینے والا وہی ہے۔ اور مزید فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اتنی بڑی حقیقت کو صرف ایک علمی امانت نہ سمجھوں بلکہ میں اس کا مؤمن بن رہوں۔ مجھے ہر صورت اس بات کا یقین ہو کہ کائنات کی سب سے بڑی ذات جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا ہے وہ اللہ کی ذات ہے اور اسی کے قبضے

Marfat.com

ساری کائنات کی زندگی ہے وہ جب چاہے گا اس کو فنا کے گھاٹ اتار دے گا۔ انسان اسی کی قدرت سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کی قدرت سے مرتے ہیں۔ جس طرح ایک غریب کی جان نکلتی ہے اسی طرح تخت وتاج کا مالک بھی موت کا شکار ہوتا ہے۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس حقیقت کا یقین اپنے اندر پیدا کروں۔ اللہ کا نبی تو سرتاپا یقین وایمان ہوتا ہے۔ یہاں دراصل انسانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تمہیں اس حقیقت پر یقین ہونا چاہئے جب تک تم اس حقیقت سے یقین کی حد تک بہرہ ور نہیں ہوتے اس وقت تک تمہارے اندر سے گمراہی کا خناس نہیں نکل سکتا۔ ہر زندہ شخص جس نے سر پر کوئی کلغی سجالی ہے وہ دماغی فتور سے کبھی نہیں نکل سکتا تاوقتیکہ اسے موت کا یقین نہ ہو اور موت کے مالک وخالق کو حاضر وناظر نہ سمجھے۔ ورنہ انسان کمزور ہوتے ہوئے بھی مصنوعی قوت کے طلسم سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ سوداء نے ٹھیک منظر کشی کی:

کل پاؤں اک کاسۂ سر پر جو جا پڑا
ہر چند وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کر چل راہ بے خبر
میں بھی کبھی کسی کا سرِ پرغرور تھا

اگلی آیت کریمہ میں پروردگار نے توحید کی اساس کو مزید مستحکم کرنے اور اس کی عمارت کے دروبست کو مزید محفوظ کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک کے حوالے سے امت کو مزید ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ خطاب اگرچہ مشرکین سے ہے لیکن جس بات کی طرف انہیں دعوت دی جارہی ہے وہ درحقیقت ایمان لانے والوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے بالواسطہ توحید کا وہ پیراہن پیش کیا جارہا ہے جو صرف ان لوگوں کو راست آئے گا جو اس دعوت کے نتیجے میں کشمکش کے جانگسل مراحل سے گزر کر وجود میں آئیں گے۔ اس میں بطورِ خاص جس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جب ایک شخص غیر اللہ کی غلامی سے نکل کر اللہ کی غلامی میں داخل ہوتا ہے تو وہ اس غلامی کو بھی ابتداء میں ایک ڈھیلا ڈھالا پیراہن سمجھتا ہے۔ جس میں مختلف قسم کی غلامیوں کی گنجائش موجود ہے۔ اس لئے ان تمام راستوں کا بند کرنا جس میں شرک کا کوئی واہمہ بھی داخل ہوسکتا ہو ازبس ضروری ہے۔ اسی طرح دل ودماغ میں یہ بات اتارنا بھی بےحد لازمی ہے کہ اللہ کی بندگی میں جس طرح کسی اور کے لئے کوئی گنجائش نہیں اسی طرح اس میں شخصی کمزوریوں کے لئے بھی کوئی امکان نہیں۔ جس طرح آدمی نماز کی نیت باندھ کر جہتِ قبلہ سے رخ نہیں پھیر سکتا بلکہ تکبیر تحریمہ سے لے کر آخری سلام تک اس کی جہت اور اس کے ارتکاز میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ وہ ناک کی سیدھ پر کھڑا ہوتا ہے اور اسی سیدھ پر مختلف اعمال بجالا کر نماز کو مکمل کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح آنحضرت ﷺ کی زبان سے یہ فرمایا جارہا ہے کہ مجھے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ اسلامی زندگی کا یہ سفر اللہ کی بندگی کے سواء کسی اور کی بندگی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ زندگی کے کسی مرحلے میں بھی کسی اور طرف رخ نہیں پھیرا جاسکتا۔ زندگی میں ہزاروں ماؤف لمحے آتے ہیں، مختلف حوالوں سے آدمی ذہنی تحفظات کا شکار ہوتا ہے۔ اولاد کی محبت بہت سی کمزوریوں کا باعث بنتی ہے ان میں سے ہر موقع آدمی کو اپنی جہت بدلنے پر مجبور کرتا ہے کسی نہ کسی تاویل کے بہانے آدمی حالات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ یہ آیتِ کریمہ سیدھا خط کھینچ کر یہ بتارہی ہے کہ دیکھنا اپنی ذات کو سمیٹ کر رکھنا، اپنا رخ بدلنے کی کوشش نہ کرنا، کوئی دنیوی فائدہ اگر شرعی احکام کو ڈھیلا کر کے ملتا نظر آتا ہو تو کبھی اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔ خوشیوں کے موقع پر شیطانی بہکاوے غیر اسلامی حرکات پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے کبھی ان بہلاووں کی طرف متوجہ نہ ہونا اور اس روش کو مزید مستحکم کرنے کے لئے فرمایا کہ حنیف بن کر زندگی گزارو۔ تمہیں اپنے رفقاءِ کار میں رشوت کے نتیجے میں کار، کوٹھی اور بنگلہ کی سہولتوں سے بہرہ ور دوست ملیں گے ان کی عیش وعشرت سے معمور زندگی تمہارے بچوں کو اُکسائے گی اور تمہیں اپنے گھر سے عجیب وغریب لیکچر سننے پڑیں گے۔ دیکھنا ہر طرف سے کٹ کر رہ جانا اور یکسو ہو کر اسی رُخ پر زندگی گزارتے چلے جانا جسے نبی کریم ﷺ نے اپنا راستہ قرار دیا ہے۔ حق وباطل کی آمیزش کے مختلف مواقع آئیں گے اپنی عافیت کے لئے نفس دلیلیں بھی گھڑے گا۔ احباب بھی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ بار بار تمہارے کانوں میں یہ بات ڈالی جائے گی کہ ہمیں دنیا میں رہنا ہے تو دنیا سے لڑائی مول لے کر اور بالکل اس سے کٹ کر تو نہیں رہا جاسکتا اس طرح سو مقامات ہیں جس میں صحیح اور غلط کی شرکت کے امکانات کھل کر سامنے آئیں گے۔ ایسے حال میں حق کو رہنما بنا کر باطل سے منہ پھیر لینا یہ وہ حقیقی رویہ ہے جس کا یہاں حکم دیا گیا ہے بقول اقبال:

Marfat.com

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اسی رویہ سے توحید کے حقیقی تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اس میں جس طرح شخصیت کی تمام کمزوریوں کا علاج ہو جاتا ہے اسی طرح اُس وسعت کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے جو توحید کا حقیقی تقاضا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ توحید کا صرف یہ تقاضا نہیں ہے کہ توحید خالص کا راستہ پوری استقامت کے ساتھ چلتے رہو بلکہ اس کا مطالبہ یہ بھی ہے کہ ان لوگوں سے بھی الگ ہو جاؤ جو کسی بھی شکل اور ڈھنگ کا شرک کرتے ہوں۔ عقیدے ہی میں نہیں عمل میں بھی انفرادی طرز زندگی میں ہی نہیں، اجتماعی نظام حیات میں بھی۔ معبدوں اور پرستش گاہوں ہی میں نہیں، درسگاہوں میں بھی، عدالتوں میں بھی، قانون سازی کی مجلسوں میں بھی، سیاست کے ایوانوں میں بھی، معیشت کے بازاروں میں بھی۔ غرض ہر جگہ ان لوگوں کے طریقوں سے اپنا طریقہ الگ کرلو جنہوں نے اپنے افکار و اعمال کا پورا نظام خدا پرستی اور ناخدا پرستی کی آمیزش پر قائم کر رکھا ہے۔

شرک کے بطلان پر دلیل

"وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ" الخ اس آیت کریمہ میں شرک کے بطلان پر دلیل دی جا رہی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکین بھی اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ اسباب کی دنیا میں انسان انسانوں کے کام آتے ہیں بلکہ بہت سی دوسری مخلوقات ہیں جن سے انسان اپنی ضروریات میں مدد لیتا ہے۔ باربرداری کے جانور بوجھ اُٹھانے میں مدد دیتے ہیں۔ دودھ دینے والے جانور دودھ کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ کتنے جانوروں سے انسان گوشت خوری کی ضرورت پوری کرتا ہے اسی طرح کتنے پرندے ہیں جو انسان کے دسترخوان کی زینت ہیں۔ اسی طرح ہوا، پانی، آگ اور مٹی سے ہم اپنی کتنی ضرورتوں میں مدد لیتے ہیں۔ بجلی نے ہماری زندگی کو کس طرح آسان کر دیا ہے۔ مختلف دھاتوں سے ہم نے جو سواریاں تیار کی ہیں وہ ہمیں کس طرح اُڑائے لئے پھرتی ہیں۔ اسی طرح انسان انسانوں کے کام آتا ہے کوئی جسمانی قوت کے ذریعے، کوئی دماغی صلاحیت کے باعث، کوئی اپنے اثر و رسوخ کے واسطے سے، کوئی اپنی ایجادات کی صورت میں، غرضیکہ اسباب کی ایک دنیا ہے جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں اور زندگی اسی طرح گزر رہی ہے کسی کو ہم فائدہ پہنچا رہے ہیں اور کوئی ہمیں فائدہ پہنچا رہا ہے کسی کا نفع و ضرر ہمارے ہاتھ میں ہے اور ہمارا نفع و ضرر کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر کسی کے کام نہیں آسکتا۔ مختلف اشیاء اور مختلف دھاتیں جس طرح انسان کی خدمت کر رہی ہیں یہ کبھی ممکن نہ ہوتا اگر اللہ تعالیٰ ان میں خدمت کا جذبہ پیدا نہ کرتا اور ہمارے اندر قوت تسخیر نہ ہوتی اور کتنے ایسے جانور ہیں جو جسمانی قوت اور قامت میں وسعت کے باوجود انسان کے سامنے سر جھکائے رکھتے ہیں۔ وہ ان سے خدمت لیتا ہے اور وہ کبھی انکار نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کئے رکھتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے انہیں ان کے مقصد تخلیق سے آگاہی عطا فرمائی ہے اور یہی چیز اس کا اذن ہے۔ اسی طرح ایجادات کی صورت میں انسان نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ یقیناً اللہ کی توفیق سے ہیں کیونکہ وہی ذہنوں کو اس طرف لگاتا ہے اور وہی مطلوبہ اشیاء کو مسخر کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ انسان اسباب کی دنیا میں اگرچہ مختلف مخلوقات سے مدد لیتا اور ضروریات پوری کرتا ہے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے اذن الٰہی کام کر رہا ہے ورنہ انسان کے لئے یہ کبھی ممکن نہ ہوتا۔ البتہ جو چیزیں اور جو قوتیں اسباب سے ماوراء ہیں اور جن تک انسان کی رسائی براہِ راست نہیں ہوسکتی ان میں تو سراسر انسان اللہ ہی کا محتاج ہے کوئی اور قوت اس کے کام نہیں آسکتی۔ اور درحقیقت یہی زندگی کا وہ دائرہ ہے جس میں انسان غیر اللہ کو اللہ کا شریک بناتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ جس کو بھی شریک بناتا ہے وہ یقیناً اللہ کی مخلوق ہے اور ہر مخلوق اپنی بقاء اور بقاء کے امکانات اور اپنی طبعی ضرورتوں کے لئے اللہ کی محتاج ہے تو کس قدر حماقت کی بات ہے کہ ایک محتاج کو اللہ کا شریک سمجھ کر اس کے سامنے دستِ سوال دراز کیا جائے۔ اس لئے یہاں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر بلکہ اس کے مقابلے میں ان قوتوں کو ہرگز مت پکارو جو نہ نفع دے سکتی ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اسباب کی دنیا میں وہ اللہ کے اذن اور اس کی طرف سے قوت کی فراہمی کے محتاج ہیں۔ اور بالائے اسباب وہ سراسر اللہ کی محتاج ہیں کیونکہ وہاں کسی اور کے لئے ہرگز دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔ اور اگر اتنی واضح دلیل کے بعد بھی

Marfat.com

(آنحضرت ﷺ کو خطاب فرما کر دیگر نوعِ انسانی کو سنایا جا رہا ہے) کوئی غیر اللہ کو پکارتا اور نفع وضرر میں مدد طلب کرتا ہے۔ تو وہ درحقیقت اپنے اوپر ظلم کرتا ہے کیونکہ اللہ نے جو اسے مقام ومرتبہ عطا فرمایا ہے اور مخلوقات میں جو اس کی حیثیت ہے اور جس طرح اس کو مسجودِ ملائک بنایا گیا ہے وہ جیسے ہی دوسروں کے سامنے جھکتا اور دستِ سوال دراز کرتا ہے تو وہ اپنی تمام حیثیتوں کو گم کر دیتا ہے۔ اسے مخدوم بنایا گیا ہے وہ خادم بن جاتا ہے۔ اسے مسجود بنایا گیا ہے وہ ساجد بن جاتا ہے۔ اپنی اصل حیثیت کھو دینا اور برعکس حیثیت کو قبول کر لینا یہی وہ ظلم ہے جس کا اس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا گیا ہے۔ جس سے انسانوں کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔

"وَاِنْ یَّمْسَسْکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ" الخ اگر انسان کے اندر ایمان کی قوت نہ ہو تو وہ ہمیشہ ایک خلا میں رہتا ہے اور یہی خلاء بھرنا اس کے لئے ایک مشکل مرحلہ بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی کا معمول یہ ہے کہ کبھی اسے کسی نقصان سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ نقصان سے بچنے کے لئے کوئی نہ کوئی آستانہ تلاش کرتا ہے یا کوئی مددگار ڈھونڈتا ہے اور کبھی اسے کہیں سے فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی ہے تو اسے اندیشے پریشان کرنے لگتے ہیں کہ ممکن ہے کہ راستے کے موانع اس فائدہ کو مجھ تک نہ پہنچنے دیں چنانچہ اس کے تحفظ کے لئے کسی بڑی ذات کی پناہ تلاش کرتا ہے تو یہیں سے شرک کو غذا ملتی ہے اور شرک کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ حالانکہ ہر غور وفکر کرنے والا آدمی یہ جانتا ہے کہ نفع وضرر کا حقیقی مالک صرف اللہ ہے اگر وہ کسی کو ضرر پہنچانا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور اگر وہ کسی کو فائدہ پہنچانا چاہے تو راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

مزید برآں ایک حقیقت اور بھی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے بندوں کے لئے غفور بھی ہے رحیم بھی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے بندوں سے رحمت کا معاملہ کرتا ہے کوئی اور کسی کو اگر فائدہ پہنچاتا ہے تو اس کا بدلہ بھی چاہتا ہے اور نقصان پہنچاتا ہے تو سرتاپا انتقام بن جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کا کسی سے معاوضہ نہیں چاہتا اور کوئی اگر معاوضہ دینا چاہے بھی تو دے نہیں سکتا کیونکہ خالق کے فضل وکرم کا مخلوق کیا معاوضہ دے سکتی ہے اور اگر وہ کسی کو نقصان پہنچاتا ہے تو وہ بھی اس کے عدل کا تقاضا ہوتا ہے ورنہ نقصان برائے نقصان اس کے یہاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس ذات کے رحم وکرم اور عدل واحسان کا یہ عالم ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی قوتیں بھی بے پناہ ہوں اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا اس کی صفات یا اس کے حقوق میں کسی کو دخیل ماننا حماقت بھی ہے اور دناءت بھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ۚ وَمَآ اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ﴿۱۰۸﴾

﴿یونس: ۱۰۸﴾

(کہہ دیجئے! اے لوگو آ گیا تمہارے پاس حق تمہارے رب کی طرف سے تو جو ہدایت قبول کرتا ہے وہ اپنے ہی لئے کرتا ہے اور جو بھٹکتا ہے اس کا وبال اسی پر آئے گا اور میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں۔)

آخری تنبیہ

اس آیتِ کریمہ میں خطاب اگرچہ پوری نوعِ انسانی کو ہے لیکن روئے سخن قریش ہی کی طرف ہے۔ کیونکہ سابقہ آیات میں بھی انہی سے خطاب تھا اور یہی لوگ چونکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کے اولین مخاطب ہیں اور انہی میں سے ایمان لانے والے اسلامی قوت کا ہراول دستہ بنیں گے۔ اس لئے ان کی ہدایت کے لئے بطورِ خاص زور دیا جا رہا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں بظاہر تو ایک بہت بڑی خبر دی گئی ہے بلکہ نوید سنائی گئی ہے لیکن حقیقت میں شاید آخری تنبیہ کی جا رہی ہے کہ قریش کے لوگو! اللہ نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے جو سرمایہ نازل کیا ہے اور جو حق اتارا ہے وہ تمہارے پاس آ چکا ہے۔ کسی معمولی حکمران کی طرف سے آنے والا حکم اپنی ایک اہمیت رکھتا ہے اگر بجا طور پر اس کا احترام نہ کیا جائے اور اسے تسلیم کرنے سے پس وپیش کیا جائے تو وہ حکمران حتی المقدور سزا دیتا ہے۔ یہ قرآن کریم جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ یہ خالق کائنات کا اہلِ زمین کے نام آخری پیغام ہے اس پیغام کی قبولیت اس پر ایمان اور اس پر عمل کے نتیجے میں اہلِ زمین فلاح وکامرانی کے مستحق ٹھہریں گے۔ بصورتِ دیگر وہ دنیا میں بھی عذاب کا شکار ہو

Marfat.com

سکتے ہیں اور آخرت میں بھی جہنم کا ایندھن بن سکتے ہیں۔اس لئے تمہیں سوچنا چاہئے کہ تمہاری زندگیاں اب اسی پیغام سے وابستہ ہیں تمہاری قسمت کے فیصلے اسی سے ہوں گے۔تم میں سے جو شخص اس ہدایت کو قبول کرلے گا وہ اپنی زندگی بنالے گا اور جو اس سے روگردانی کرے گا وہ اپنی قسمت بگاڑ لے گا۔ ایک منارۂ نور ہے جس کی روشنی راہ چلنے والوں کو راستہ بھی دکھا سکتی ہے اور آنکھیں بند کرنے والوں کو محرومی کا شکار بھی کرسکتی ہے۔یہ ایسا آبِ حیات ہے جس کے نتیجے میں ہمیشہ کی زندگی بھی نصیب ہوسکتی ہے اور جس سے انکار کی صورت میں محرومی مقدر بھی بن سکتی ہے۔یاد رکھو میں نے تمہاری طرف سے ہر طرح کی مخالفت برداشت کی اور ہر طرح کا دکھ اٹھایا اور آج بھی تمہاری ہمدردی اور غم گساری میں شب و روز جل رہا ہوں لیکن اس تمام جدوجہد کا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہیں اللہ کا پیغام پہنچا دوں اور بقدرِ ہمت تمہیں اس کی ترغیب دے کر ایمان کے لئے راستہ صاف کردوں۔لیکن اگر تم میری کاوشوں سے کوئی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے ہو تو پھر یاد رکھو کہ میں تم پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا ہوں۔تمہاری اس روش کے نتیجے میں تم پر کیا گزرتی ہے میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں اور نہ میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں گا۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ ﴿یونس: ۱۰۹﴾

(اے پیغمبر! آپ پیروی کیجئے اس چیز کی جو تم پر وحی کی جاتی ہے اور ثابت قدم رہئے یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کردیں اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔)

آنحضرت ﷺ کو ہدایت اور تسلی

قریش کو آخری تنبیہ کے بعد نبی کریم ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ مخالفین کے رویے کی پرواہ نہ کریں اللہ کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا جارہا ہے اس کی پیروی کریں اور حالات سے کبھی متاثر نہ ہوں۔بعض دفعہ حالات کی شدت آدمی کو رکنے پر مجبور بھی کردیتی ہے لیکن آپ اللہ کے نبی ہیں ان کی مخالفتیں آپ کا راستہ نہیں روک سکتیں آپ کی پشت پر اللہ کی تائید و نصرت ہے۔آپ کی استقامت اور ثابت قدمی مخالفین کے لئے یا تو ہدایت کا راستہ کھول دے گی یا اللہ کا فیصلہ قریب آجائے گا۔اور فیصلہ جس کے ہاتھ میں ہے وہ قریش کی کاروائیوں کو بھی دیکھ رہا ہے اور آپ کی مساعی کریمہ بھی اس کے سامنے ہیں اس لئے آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ یہ لوگ اپنے انجام سے ضرور دوچار ہوکر رہیں گے۔کیونکہ ہمیشہ سے سنۃ اللہ یہی ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاس

سُوْرَةُ هُوْد

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

سُوْرَةُ هُوْدٍ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام

اس سورۃ کا نام "ہود" ہے۔ "ہود" اللہ کے ایک عظیم پیغمبر کا نام ہے چونکہ اس سورۃ میں ان کا تذکرہ ہوا ہے اس لئے شناخت کے طور پر اس سورۃ کا نام ان کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سورۃ میں بطور خاص حضرت ہود علیہ السلام کے زندگی کے واقعات بیان کئے جائیں گے۔ یہ سورت ۱۲۳ آیات پر مشتمل ہے اس کے کلمات کی تعداد ایک ہزار ۶ صد اور حروف کی تعداد (۹۵۶۷) ہے۔

زمانہء نزول

یہ سورۃ گزشتہ سورۃ یونس کی طرح مکی ہے یعنی اس کا نزول ہجرت سے پہلے ہوا ہے۔ اس کے انداز بیان سے گمان ہوتا ہے کہ اس کا زمانہء نزول سورۃ یونس کے فوراً بعد کا زمانہ ہے۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ یہ سورۃ یونس کے فوراً بعد نازل ہوئی ہو۔ اس وقت کے حالات کا اندازہ کرنے کے لئے یوں تو اس سورۃ کے مندرجات خود بولتے ہیں کہ وہ زمانہء آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھا اور اذیت اور مخالفت کی چکی پورے زور سے چل رہی تھی لیکن آنحضرت ﷺ بطور خاص جس کرب سے گزر رہے تھے اور آپ اندر ہی اندر جس پریشانی میں گھلتے جا رہے تھے اس کا اندازہ حدیث میں مذکور اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کے بالوں میں چاندی اُبھرنے لگی ہے اور آپ کی انتہائی مضبوط صحت روبہ زوال محسوس ہونے لگی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا مجھے سورۃ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نزول کا زمانہ آنحضرت ﷺ کے لئے کتنا گراں تھا۔ ایک طرف تو آپ دیکھ رہے تھے کہ قریش مخالفت میں اپنے ترکش کا ہر تیر آزمانے پر تل گئے ہیں۔ قرابت داری، ہمسائیگی، قومیت، شہریت، دوست داری کسی بات کا بھی لحاظ ان کے اندر باقی نہیں رہ گیا۔ اسلام دشمنی نے انہیں بالکل اندھا کر دیا ہے ان کی اکثریت آنحضرت ﷺ کی بات سننے کی بھی روادار نہیں۔ ان کا رویہ ٹھیک ٹھیک ان قوموں جیسا ہو رہا تھا جن پر اس سے پہلے اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے اور دوسری طرف آپ دیکھ رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے پے در پے تنبیہات نازل ہو رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخری ساعت بہت جلد قریب آ رہی ہے جب نافرمان قوم کی زندگی کی صف لپیٹ دی جاتی ہے اور انہیں دی ہوئی مہلت ختم کر دی جاتی ہے۔ خطرے کو سر پر دیکھتے ہوئے ایک دردِ دل رکھنے والا اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے کہ جو لوگ خطرے کی زد میں ہوں انہیں آگاہ کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ خطرے سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیں لیکن جب معاملہ ایسے لوگوں سے آ پڑے جو خطرہ سر پر دیکھ کر بھی اس کا یقین کرنے کو تیار نہ ہوں تو پھر آپ اس ہمدرد و غمگسار کی بے چینی، بے کلی اور بے بسی محسوس کر سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کچھ ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہیں آپ کسی طرح یہ نہیں چاہتے کہ جس قوم کی ہدایت کے لئے انہیں بھیجا گیا ہے وہ ہدایت سے محروی کے باعث اللہ کے عذاب کا شکار ہو۔ اور دوسری طرف اللہ کے عذاب کو ٹال دینا آپ کے بس میں نہیں کیونکہ قوم اپنا رویہ بدلنے کے لئے بالکل تیار نہیں۔

Marfat.com

مضامین اور مباحث

یہ سورۃ چونکہ سورۃ یونس کی طرح مکی بھی ہے اور اس کی مثنیٰ بھی۔ اس لئے دونوں کے مضامین اور مباحث بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ فرق اگر ہے تو اختصار اور تفصیل کا ہے یا اندازِ بیان کا۔ مکی سورتوں میں عام طور پر اور گزشتہ سورت میں خاص طور پر تین باتوں پر زور دیا گیا ہے اور وہی اس سورۃ میں بھی دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے بڑے زور اور صراحت کے ساتھ وہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لئے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے ہیں۔ پھر اس دعوت کے بنیادی نکات کو دلائل سے مرصع کیا گیا ہے۔ مخالفین کی طرف سے قسم قسم کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جب مخالفین کی طرف سے اذیت رسانی ناقابلِ برداشت ہونے لگی ہے تو اللہ کریم کی جانب سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے۔

انسانی مزاج چونکہ یکساں نہیں ہوتے اور طبیعتوں میں تنوع ایک فطری حقیقت ہے۔ پروردگار اپنی دعوت کو دلائل سے واضح کرتے ہوئے کبھی کبھی پند و نصیحت کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ بعض طبیعتیں عقلی انداز سے اتنا استفادہ نہیں کرتیں جتنا وہ ناصحانہ انداز سے متاثر ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم اس سورۃ میں وعظ و نصیحت پر زیادہ زور دیکھتے ہیں۔ سورۃ یونس میں دلائل پر زور تھا اور اس سورۃ میں نصیحت کی فراوانی ہے تاکہ جو لوگ دلِ گداز رکھتے ہیں وہ اس طریقے سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہوتی جو نہ دلائل پر توجہ دیتے ہیں اور نہ کسی نصیحت کو سننا گوارا کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں لااُبالی پن کا غلبہ ہوتا ہے وہ ہر کام کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ زندگی بھی ان کے نزدیک کھیل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ایسے لوگوں کے لئے صرف ایک ہی ذریعہ ہے جو ان پر کسی حد تک اثر انداز ہوتا ہے یہ وہ ذریعہ ہے جسے ہم تنبیہ یا انذار کہتے ہیں چنانچہ اس سورۃ میں تنبیہ کے انداز کو اختیار کرتے ہوئے براہِ راست بات کہنے کی بجائے تاریخی حوالوں سے بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ غیر سنجیدہ طبیعتیں بعض دفعہ براہ راست بات کہنے سے مشتعل ہو جاتی ہیں انہیں ہمیشہ درحدیثِ دیگراں سمجھانے کی کوشش کرنا سودمند ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی قومِ نوح، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط، اصحابِ مدین اور قومِ فرعون کے قصے بیان کئے گئے ہیں۔ جن میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کی زندگیوں کے حالات دیکھو۔ ان میں بعض قومیں تم سے کہیں زیادہ طاقتور، دنیوی ٹھاٹھ رکھنے والی، دولت مند، بے پناہ افرادی قوت کی مالک اور بڑی بڑی حکومتوں کے جاہ و جلال سے بہرہ مند تھیں لیکن ان کی اسی روش نے جسے تم نے اپنا رکھا ہے جب اللہ کے عذاب کو دعوت دی تو پھر انہیں اس عذاب سے کوئی نہ بچا سکا۔ آج ان کے تاریخی آثار ان کی تباہی کی یادگار رہ گئے ہیں لیکن ان کا کوئی نام لیوا باقی نہیں۔ تم نے بھی اگر اپنی روش نہ بدلی تو جو قیامت ان پر گزر چکی ہے وہی تمہاری انتظار میں ہے۔ اور اللہ کا قانونِ عدل اس حد تک بے لاگ ہے کہ وہاں کسی کے لئے کوئی رورعایت نہیں۔

انہیں بنیادی مباحث کو بعض ضمنی مضامین سمیت اس سورۃ میں مناسب اطناب و تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اس سورۃ کے آخر میں آنحضرت ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو ایسے بگڑے ہوئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مناسب ہدایات دی گئی ہیں۔

Marfat.com

اٰيَاتُهَا ۱۲۳	سُوْرَةُ هُوْدٍ مَكِّيَّةٌ	رُكُوْعَاتُهَا ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝۱
اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝۲ وَّاَنِ
اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا
اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳ اِلَى اللّٰهِ
مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ
صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ
يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۵
وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ
مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۶ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ
لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ
بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷
وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا

Marfat.com

يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۸

الٓرٰ - یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر ان کی وضاحت کی گئی خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے۔ کہ تم عبادت نہ کرو مگر اللہ کی۔ بے شک میں تمہیں اس کی طرف سے ہوشیار کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور یہ کہ تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ وہ تم کو ایک مدت معین تک زندگی کی راحتوں سے لطف اندوز کرے گا اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ اور اگر تم روگرداں رہے تو میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ سنو! وہ اپنے سینے موڑتے ہیں تا کہ اس سے چھپ جائیں۔ آگاہ رہو جس وقت وہ خوب اوڑھ لیتے ہیں اپنے کپڑے تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تو سینوں کے بھیدوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو، ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے چھ دنوں میں اور اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں عمل میں کون اچھا ہے۔ اے پیغمبر! اگر آپ کہتے ہیں کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو یہ کافر کہتے ہیں یہ تو بس کھلا کھلا جادو ہے۔ اگر ہم ان سے عذاب کو کچھ مدت کے لئے ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے۔ سنو! جس دن وہ ان پر آدھمکے گا تو ان سے ٹالا نہ جاسکے گا اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۱ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۲ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۳ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۴

الٓرٰ - یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر ان کی وضاحت کی گئی خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے۔ کہ تم عبادت نہ کرو مگر اللہ کی۔ بے شک میں تمہیں اس کی طرف سے ہوشیار کرنے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں اور یہ کہ تم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ وہ تم کو ایک مدت معین تک زندگی کی راحتوں سے لطف اندوز کرے گا اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ اور اگر تم روگرداں رہے تو میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ﴿ھود: ۱-۴﴾

"الٓرٰ" حروف مقطعات میں سے ہے اور حروف مقطعات کی بحث ہم سورۃ البقرۃ کے آغاز میں کر چکے ہیں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

'کتاب' خبر ہے اور اس کا مبتدا (ہٰذا) محذوف ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کتاب ہے آگے جس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

Marfat.com

أُحْكِمَتْ اور فُصِّلَتْ کا مفہوم اور مراد

"اُحْکِمَتْ" اِحکام سے ہے۔ اِحکام کا معنٰی کسی چیز کو گانٹھنا، مضبوط کرنا اور اس طرح پختہ اور استوار کرنا ہے کہ اس میں کسی خلل اور نقص کا گمان تک نہ رہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ایک ایسی کتاب ہے جس کی ایک ایک آیت کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان کا تعلق اس کے الفاظ سے ہے اور دوسری شان کا تعلق اس کے معنٰی و مفہوم سے ہے۔ اسی لئے ابن کثیر نے لکھا هِيَ مُحْكَمَةٌ فِي لَفْظِهَا مُفَصَّلَةٌ فِي مَعْنَاهَا فَهُوَ كَامِلٌ صُوْرَةً وَمَعْنًا قرآن کریم کی کوئی آیت بھی آپ پڑھ کر دیکھ لیجئے اس میں الفاظ کا انتخاب، الفاظ کا باہمی ارتباط، الفاظ کا دروبست، الفاظ کی ترکیب، الفاظ کی معنویت، الفاظ کی چستی اور الفاظ اور معنٰی میں ہم آہنگی میں کہیں بھی آپ کو تشنگی محسوس نہیں ہوگی۔ اس کا ٹھیک اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اسی بات کو کوئی عربی ادیب اپنے الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کرے پھر وہ خود محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت اپنے اندر معجزانہ شان رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حیران کن بات یہ ہے کہ الفاظ کا یہ حسن محض الفاظ کی مینا کاری نہیں، خطابت کی ساحری اور تخیل کی شاعری نہیں بلکہ الفاظ کا یہ معجزہ اپنے اندر معنویت کا بھی اعجاز رکھتا ہے جو بات کہی گئی ہے اس میں کہیں الجھاؤ اور پیچ نظر نہیں آتا۔ معنٰی و مراد کے سمجھنے میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اس لحاظ سے فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم کی آیات اپنے الفاظ میں محکم اور اپنے معنٰی و مراد میں نہایت مفصل و واضح ہیں۔ یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے یہ اس صورت میں ہے کہ پیشِ نظر آیت کریمہ میں مذکور آیات کے لفظ سے مراد قرآن کریم کی تمام آیتیں ہوں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آیات کی جو شان یہاں بیان کی گئی ہے اس کا مصداق قرآن کریم کی ایک ایک آیت ہے۔ لیکن اگر اس سے یہ مراد لیا جائے کہ قرآن کریم کی تعلیمات دو طرح کی آیات میں بیان فرمائی گئی ہیں ان میں سے ایک تو آیات وہ ہیں جو مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئیں اور دوسری وہ ہیں جو اس کے بعد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں۔ دونوں کو دیکھنے اور پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی بعثت کے ابتدائی چند سالوں میں جو سورتیں نازل ہوئی ہیں ان کے جملے نہایت مختصر لیکن ان کے معنی و مفہوم میں نہایت جامعیت پائی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اعجاز بیان کا ایک ایسا کامل نمونہ ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی آیت بھی دریا بہ کوزہ کی مثال معلوم ہوتی ہے۔ بعد میں آہستہ آہستہ ان پر تفصیل کا رنگ آیا حتیٰ کہ جب مدنی دور شروع ہوا تو وہی بنیادی باتیں جو مختصر جملوں میں کہی جاتی تھیں ایک جامع اور ہمہ گیر نظام کی شکل اختیار کر گئیں۔ آنحضرت ﷺ کو واسطہ ان عربوں سے پڑا تھا جو عربی زبان پر قدرت اور طلاقتِ لسانی میں بے مثال تھے۔ وہ بڑی سے بڑی بات کو گنے چنے الفاظ میں ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے ان کا ہر لفظ چنیدہ اور ہر جملہ پھڑکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ضرب الامثال اور تلمیحات ان کی گفتگو کا حسن ہوتا تھا۔ فصاحت و بلاغت ان کے گھر کی لونڈی سمجھی جاتی تھی وہ اپنے اس کمال پر چونکہ انتہائی نازاں تھے اس لئے قرآن کریم ایک ایسی زبان میں نازل ہوا جس نے ان کے تمام دعوے خاک میں ملا دیئے ان کا بڑے سے بڑا شاعر اور ادیب قرآن کریم کے ایک ایک جملہ پر انگشت بدنداں رہ گیا۔ انہیں زندگی کے گہرے حقائق ایسے مختصر الفاظ میں بتائے گئے کہ وہ ان کے روزمرہ بن گئے نہ انہیں یاد کرنے میں دشواری ہوئی اور نہ سمجھنے میں۔ چھوٹی چھوٹی آیتیں ان کے رگ و پے میں اُترتی چلی گئیں لیکن جب بنیادی صداقتوں پر کئے جانے والے بعض اعتراضات کو دور کرنے کا وقت آیا، پند و نصیحت میں طوالت کی ضرورت پڑی۔ ایمان لانے والوں کے لئے احکام کا نزول شروع ہوا تو اب کلام میں تفصیل آنا شروع ہوئی لیکن جس طرح اعجاز تک پہنچا ہوا اختصار فہم مطالب میں رکاوٹ نہ تھا اسی طرح تفصیل و وضاحت کلام کے حسن کے لئے نقصان کا باعث نہ تھیں۔ اختصار میں اپنا حسن تھا اور تفصیل کی اپنی شان تھی جس طرح کلی کی نیم بازی میں اللہ نے حسن رکھا ہے اسی طرح کھلے ہوئے پھول میں بھی بلا کی رنگینی اور جاذبیت رکھی ہے۔ یہ مثالیں محض تفہیم کے لئے ہے ورنہ قرآن کریم کا حسن ان سے کہیں بالا ہے اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہم تو محض اسے اندازِ بیان یا اسلوبِ کلام کا اعجاز سمجھتے ہیں لیکن اس کی ایک شان اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ پروردگار نے جو اپنے کلام میں پہلے اختصار اور پھر تفصیل کا اہتمامِ خاص فرمایا ہے یہ دراصل لوگوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا ہے جو ان کی تعلیم و تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں ملحوظ رکھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تورات میں پروردگار نے ترتیب و تدریج اور احکام و تفصیل کا یہ اہتمام نہیں فرمایا بلکہ اس کا بیشتر حصہ ایک ہی دفعہ نازل ہو گیا لیکن قرآن کریم کا آہستہ آہستہ نازل ہونا اور ہر طرح کی ضرورت کے مطابق نازل ہونا پھر نہ صرف حالات کی ترتیب کو ملحوظ رکھنا بلکہ انسانی طبائع کا بھی لحاظ رکھنا اور تثبیت

Marfat.com

احکام کو بھی حکمت سے بروئے کار لانا اس کا اظہار صرف قرآن کریم میں ہوا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ یہ قرآن کریم ایسی ذات عزیز نے نازل کیا ہے جو حکیم اور خبیر ہے۔ جب اس کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ وہ حکمت کے خزانوں کو مختصر لفظوں میں بند کر کے پیش کرے تو اس نے مختصر لفظوں میں پیش کیا اور جب اس کے علم و خبر نے محسوس کیا کہ اب انسانی ضرورت تقاضا کرتی ہے کہ وہ ان حقائق کو کھول کر بیان کرے تو اس نے ان کی تفصیل نازل کرنا شروع کر دی اور کوزوں میں بند دریاؤں کے سوتے پھوٹ نکلے۔

قرآن کریم کا پیغام

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ یہ اس کتاب کا اساسی پیغام ہے اور یہی نبی کریم ﷺ کی دعوت کی اصل روح، دعوت کا عنوان اور دعوت کا نچوڑ ہے۔ دنیا میں جو پیغمبر بھی اصلاح خلق کے لئے آیا ہے اس نے اپنی دعوت کا آغاز انہی الفاظ سے کیا ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ لوگو اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ عبادت کا معنیٰ یوں تو بندگی کیا جاتا ہے لیکن اس میں غیر مشروط اطاعت، غلامی اور پرستش بھی شامل ہے۔ یعنی ایک ایسی بندگی جس میں اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہیں ہے۔ اور یہ اطاعت احکام تک محدود نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کی غلامی ہے۔ جس میں آقائی کا منصب صرف اللہ کو حاصل ہے۔ بندہ جب اس کی بندگی کرتا ہے تو یہ سمجھ کر کرتا ہے کہ میرا جسم، میرے جسم کے تمام اعضاء، میرے دماغ کی رعنائیاں، میری عقل و خرد کی بلند پروازیاں، میرا عہدہ و منصب، میرا مال و دولت، میری اولاد اور میرے علاقات سب اللہ کی ملکیت ہیں۔ یہ اس کے سوا نہ کسی اور کے سامنے جھک سکتے ہیں نہ کسی کی اطاعت کر سکتے ہیں۔ پرستش بھی اسی کی اور غلامی بھی اسی کی۔ اس سے وہ بندگی اور عبادت کا وسیع تر تصور وجود میں آتا ہے جو اس آیت کا اصل مطلوب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کا بندہ جس طرح مسجد میں اس کی نماز پڑھ کر بندگی بجالاتا ہے اسی طرح اس کی زمین کے ایک ایک حصے پر زندگی کے تمام فرائض اسی کے احکام، اسی کے قوانین اور اسی کی رضاء کے مطابق انجام دے کر بندگی کا حق ادا کرتا ہے۔ اس بندگی میں نہ کوئی انسان اس کا ہمسر ہے کیونکہ عبد معبود کی برابری نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اور مخلوق (زمین کی ہو یا آسمان کی) اس کی عبادت میں دخیل ہو سکتی ہے کیونکہ کوئی مخلوق خالق کے برابر نہیں ہو سکتی۔ مشرک قوموں نے جن کو بھی اللہ کا شریک بنایا ہے وہ اگر انسان ہیں تو وہ اللہ کے عبد ہیں اور اگر وہ ان کے علاوہ کوئی اور مخلوق ہیں چاہے وہ اپنی ذات میں کیسے ہی عظیم کیوں نہ ہوں وہ بہرحال مخلوق ہیں۔ معمولی عقل کا آدمی بھی اتنی بات سمجھتا ہے کہ عبد اور معبود اور مخلوق اور خالق میں برابری کا کوئی تصور نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود دنیا نے ہمیشہ اسی معاملہ میں ٹھوکر کھائی ہے۔ کہیں بت پرستی ہوئی ہے اور کہیں اوتار پرستی، کہیں دیوتا پوجے گئے ہیں اور کہیں تخت و تاج کے مالک انسان۔ کہیں طاقت کے سامنے انسان جھکا ہے اور کہیں دولت کے سامنے۔ اسلام نے اپنے زوردار دلائل سے جب شرک کے لئے جینا مشکل کر دیا تو مشرک قوتوں نے اس کے مختلف لبادے اختیار کئے۔ کہیں اللہ کی شریعت کے مقابلے میں مختلف ازموں کی اطاعت کی گئی۔ مختلف رہنماؤں کے مجسمے ہیروز کے نام سے پوجے گئے۔ انسانوں کو فریب دے کر انہیں کو سرچشمہ اقتدار بنا دیا گیا اور انہی میں سے چند لوگوں کو چن کر اللہ کے قوانین کے توڑ پر ان کے ہاتھوں قوانین وضع کرائے گئے۔ اور اس طرح سے اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو چیلنج کیا گیا اس کی تحلیل و تحریم کی اتھارٹی کو انسانوں کے سپرد کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے مسجد میں اللہ کے سامنے سر جھکایا اور مسجد سے باہر ہر جگہ اور ہر ادارے میں اپنے جیسے انسانوں کی پوجا کی۔ انہی کے احکام کی اطاعت کی، انہی کے دیئے ہوئے تصورات کی غلامی کی۔ کل اگر ملوکیت کے نام سے انسان کی پوجا کی جاتی تھی تو آج من مرضی کی جمہوریت کے نام پر انسانوں کی بندگی کی جا رہی ہے۔ یہ وہ ہمہ پہلو شرک ہے جس کی اصلاح کے لئے اللہ کے پیغمبر تشریف لاتے ہیں اور یہ کتاب بھی اور نبی کریم ﷺ بھی اسی مقصد کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے اس کتاب کے بنیادی پیغام کو پیش کیا گیا ہے

آنحضرت ﷺ اسی پیغام کیلئے بشیر و نذیر بن کر آئے

اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری کسی اور مقصد کے لئے نہیں بلکہ آپ اسی پیغام کے بشیر و نذیر بن کر آئے ہیں۔ بشیر کا معنیٰ ہے بشارت دینے والا اور نذیر کا معنیٰ ہے ڈرانے والا اور خبردار کرنے والا۔ آپ ہر اس آدمی اور اس قوم کے لئے بشارت دینے کے لیے تشریف لائے ہیں جو اللہ کے رسول اور اس کتاب کے بنیادی پیغام کو تسلیم کر کے آپ پر ایمان لے آئے اور زندگی کے تمام

Marfat.com

شعبوں میں اللہ کی بندگی بجالانے کا عہد کرے اور عملاً اس کا پیکر بن جائے۔اس پر ایمان لانے والوں میں سے ہر شخص کا گھر ایک ایسا گھر ہو جس میں صرف اللہ کی بندگی ہوتی ہو۔ان کے بازار ایسے ہوں جن میں کاروبار اللہ کی شریعت کے مطابق کیا جاتا ہو۔ان کے عبادت خانے صرف اللہ کی عبادت کے لئے مخصوص ہوں۔ان کی عدالتوں سے اللہ کا قانون بولتا ہو،ان کے ایوان ہائے حکومت میں حکمران وہ ہوں جو اللہ کے بندے اور اس سے ڈرنے والے ہوں۔اور ان کی پارلیمنٹ اللہ کے آئین اور قانون کی پاسدار ہو۔ایسا ملک اور معاشرہ اسلامی ملک اور اسلامی معاشرہ کہلاتا ہے اور ایسے لوگوں کے لئے اللہ کے رسول بشیر بن کر آئے ہیں وہ ان کو دنیا میں بھی حیات طیبہ کی بشارت دیتے ہیں اور تمام قوموں پر غلبہ کی امید دلاتے ہیں اور آخرت میں سرخروئی اور ہمیشہ کی کامیابی کی خوشخبری سناتے ہیں۔

نذیر کا معنی ہے خبردار کرنے والا اور ڈرانے والا۔جو لوگ اللہ کے رسول پر ایمان نہیں لاتے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی کی دعوت کو ہر ممکن طریقے سے روک دیا جائے۔قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والوں کی زندگی دشوار کر دیتے ہیں۔ایسے لوگوں کے لئے نبی کریم ﷺ نذیر بن کر آئے وہ انہیں آگاہ کرتے ہیں کہ تم اپنا رویہ بدلو اور اللہ کے نبی کی دعوت کو قبول کر کے اللہ کی ناراضگی سے بچو۔اور اگر تم نے اپنے رویے پر اصرار جاری رکھا تو پھر یاد رکھو دنیا میں بھی اللہ کا عذاب آسکتا ہے اور اگر اللہ کی مشیت کو ایسا منظور نہ ہوا تو آخرت میں تو تم کسی طرح اس کے عذاب سے بچ نہ سکو گے۔ایمان لانے والوں کے لئے پیغمبر کی بشارتیں تقویت کا باعث بنتی ہیں۔کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی وہ ان بشارتوں پر ایمان کی وجہ سے استقامت اور ثابت قدمی دکھاتے ہیں اور پیغمبر کا انذار ایمان سے انکار کرنے والوں کو ہمیشہ خطرات سے آگاہ کرتا اور طوفان آنے سے پہلے اپنی حفاظت کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پیغمبر کی ذمہ داری کے یہ دو پہلو ہیں جس پر پیغمبر کی دعوت کا اور اُمت دعوت کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔اس لئے پیغمبر مشکل سے مشکل حالات میں بھی ان کی بجا آوری سے پہلو تہی نہیں کرتا۔

ایمان کے بعد اعمال کی اصلاح

وَّ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۔ انسانی زندگی دو چیزوں سے عبارت ہے۔

(۱) احساسات وتصورات جنہیں ہم اعتقادات بھی کہتے ہیں۔

(۲) اعمال۔

اللہ کے نبی کی دعوت کا پہلا جزو یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے احساسات اور تصورات کو درست کرنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کی ہدایت کے مطابق سب سے پہلے اللہ کی عبادت کا حکم دے کر بنیادی تصورات کو درست فرمایا کیونکہ انسانوں میں خرابی کی بنیاد ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر نہ جانے کس کس کو اپنا الٰہ مان لیتے ہیں۔پھر نہ جانے کہاں کہاں سر جھکاتے ہیں فکر وخیال کی دریوزہ گری کرتے ہیں اور دنیا بھر کے وضعی قوانین کی اطاعت کرتے ہیں چنانچہ آپ نے سب سے پہلے اسی تصور کو درست کیا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اس لئے اسی کی بندگی بجالاؤ۔اب اعمال کی درستگی کے لئے دو باتوں کا حکم دیا جا رہا ہے ایک تو یہ کہ اب تک تم نے جیسی زندگی بھی گزاری ہے وہ یقیناً اللہ کی بندگی کے بالکل برعکس تھی کیونکہ وہ بجائے اللہ کی عبادت کے غیر اللہ کی عبادت پر مشتمل تھی۔پھر نہ جانے کس کس آستانے پر تم نے انسانیت کو رسوا کیا ہے۔اس لئے پہلا کام یہ کرو کہ اپنے رب سے گزشتہ زندگی کی معافی مانگو۔اپنی ایک ایک نافرمانی کا تصور کرو اور دوبارہ اس کے قریب نہ جانے کا عہد کرو اور دوسرا کام یہ کرو کہ ہر طرف سے کٹ کر اللہ کی طرف لوٹ جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بعد اصلاح کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ایک اپنی گزشتہ زندگی پر ندامت اور استغفار اور دوسرا پوری طرح اپنے اللہ کی طرف لوٹ جانا۔اس کے سوا ہر آستانے سے سر اُٹھالینا،ہر تعلق سے منہ موڑ لینا،ہر رسم بندگی سے مقاطعہ کر دینا۔زندگی کے تمام شعبوں کو اسی کی ہدایت اور اطاعت میں دے دینا،جو آدمی یا جو قوم اس طرح ایمان وعمل کو ہر آلودگی سے پاک کرلے اور اپنے احساسات،اپنے معاملات،اپنے معاہدات اور اپنے اخلاق کو اللہ کی شریعت کے مطابق ڈھال لے اس کے لئے اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو متاع حسن سے نوازے گا۔متاع حسن سے مراد یہ ہے کہ وہ انہیں زندگی کی آسودگی عطا کرے گا۔ان کے کاروبار میں برکت دے گا۔ان کے کھیتوں میں وقت پر بارشیں برسیں گی اور فصلیں لہلہائیں گی۔زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہو جائے گا۔زندگی کی ہر ضرورت فراوانی سے عطا ہو گی انہیں باقی قوموں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ دلوں میں یہ احساس بجھنے نہیں پائے گا کہ ہمارے کاروبار کی وسعت،ہمارے غلوں کی فراوانی اور ہماری زندگی کی آسودگی سراسر اللہ کی نعمت ہے اور یہ اس کی شریعت پر

Marfat.com

عمل کرنے کا نتیجہ ہے اگر ہم اس کی نعمتوں پر بیش از بیش شکر بجالائیں گے تو وہ اپنی نعمتوں میں اضافہ فرمائے گا۔ اس احساس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ انہیں متاعِ غرور کے ابتلاء میں مبتلا نہیں کرتا بلکہ متاعِ حسن سے نوازتا ہے۔ یہی وہ متاعِ حسن ہے جسے قرآن کریم نے ایمان اور تقویٰ سے مشروط کیا ہے۔ جب کسی قوم میں ایمان وتقویٰ کی بہار آتی ہے تو اللہ تعالیٰ آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں شاید اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا بھی مقصود ہے جو لوگوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص ایمان اور تقویٰ کا راستہ اختیار کرتا ہے اور شریعت کی پابندی کرتا ہے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے آخرت کی نعمتیں عطا فرمائے لیکن دنیا کی نعمتیں تو صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو عموماً ایمان وتقویٰ کی زندگی سے بیزار ہیں۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ایسا ملک جس میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی تھی اور جس میں صدیوں سے افلاس کا دور دورہ چلا آرہا تھا۔ وہاں جیسے ہی اسلامی انقلاب برپا ہوا وہاں صرف ایمان وعمل اور اخلاق ہی کی بہار نہیں آئی بلکہ رزق میں بھی فراوانی آگئی۔ لوگ زکوٰۃ دینے کے لئے مستحقین کو تلاش کرتے تھے اور زکوٰۃ لینے والے نہیں ملتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں جو دوسری صدی کے آغاز کا زمانہ ہے اللہ کی طرف سے نزول برکت کا عالم یہ تھا کہ دو سالوں میں تمام ٹیکسز ختم کر دیئے گئے۔ باغوں میں ایک انار کا رس گلاس بھر دینے کے لئے کافی تھا۔ کھجوروں کے باغوں کے باغ ایسی کھجوروں سے لدے ہوئے تھے کہ جن میں سے ایک ایک کھجور غیر معمولی لمبائی رکھتی تھی۔ لوگوں نے ان کی گٹھلیاں کئی صدیوں تک سنبھال کر رکھیں۔ صرف دو سالوں میں اللہ کی بندگی کی برکت سے ایسا انقلاب آیا کہ نہ کوئی بھوکا باقی رہا اور نہ قومی مسائل باقی رہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا وصال ہوا تو جس طرح اہلِ کعبہ آپ کی موت پر دل گرفتہ تھے اسی طرح عیسائیوں کا حکمران بھی کئی دنوں تک سوگ کے لباس میں رہا اور وہ بار بار یہ کہتا تھا کہ آج دنیا کا نور بجھ گیا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جب بھی کبھی کوئی معاشرہ مکمل طور پر اللہ کی شریعت کا اطاعت گزار ہوا ہے تو اللہ نے ہمیشہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائی ہے لیکن جب مسلمان کہلانے والا معاشرہ اپنے آپ کو اسلامی شریعت سے آزاد کر لیتا ہے تو اس کی زندگی کافر سے بھی بدتر ہو جاتی ہے کیونکہ کفر کے بھی کچھ فوائد ہیں جو دنیا میں بہرحال ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن نفاق کی قسمت میں اللہ نے مستقل رسوائی لکھی ہے اور اس سے بڑھ کر اور نفاق کیا ہوگا کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول ﷺ کی سنت ہے لیکن ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بیشتر ادارے شریعت کی پابندی سے آزاد ہیں اور قومی سطح پر اسلامی قانون کی سرپرستی اور برتری کو صدیوں سے مسلمانوں نے ترک کر دیا ہے اور آج مسلمان اسی کی سزا برداشت کر رہے ہیں۔ اور شاید یہی وہ بات ہے جس کا اس آیت کے آخر میں تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تم اللہ کی کتاب سے انکار کرو گے اور اللہ کے پیغمبر کی دعوت کو درخور اعتناء نہیں سمجھو گے تو پھر مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر اللہ کا عذاب آئے گا۔ یہاں اگرچہ مراد وہ عذاب ہے جو ہمیشہ اس قوم پر آتا ہے جو اللہ کے رسول پر ایمان لانے سے یکسر انکار کر دیتی ہے لیکن وہ مسلمان قوم جو شریعت کے اقرار کے باوجود اس پر عمل کرنے سے انکار کر دیتی ہے سورۃ بقرہ میں اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ایسی قوم کو اللہ دنیا میں رسوائی کا عذاب دیتا ہے۔

عذاب آخرت

اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ گزشتہ آیت میں مشرکین مکہ کو جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے وہ وہ عذاب ہے جو دنیا میں رسول کا انکار اور تکذیب کرنے والوں پر آیا کرتا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں عذاب آخرت کا ذکر ہے۔ کہنا یہ ہے کہ دنیا میں اتمام حجت کے بعد اللہ کی طرف سے جو عذاب آتا ہے اس کا شکار وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس وقت دنیا میں موجود ہوتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے پہلے رسول کی زندگی میں مرجانے والے اللہ کے عذاب سے بچ گئے کیونکہ دنیا میں آنے والا عذاب اگرچہ اپنے ہولناکی اور ہلاکت میں بے مثال ہوتا ہے لیکن وہ اصل عذاب نہیں ہوتا بلکہ اصل عذاب اور وہ عذاب جسے عذاب اکبر کہا گیا ہے وہ تو آخرت کا عذاب ہے جو لوگ دنیا میں بچ گئے وہ بھی آخرت میں پکڑے جائیں گے اور جو دنیا میں عذاب کا شکار ہوئے وہ بھی عذاب آخرت میں مبتلا ہوں گے اس لئے اے مشرکین مکہ! تم بیشک نبی کریم ﷺ کی دعوت کا مذاق اڑاؤ اور آپ کے انذار سے تمسخر کرو لیکن یہ مت بھولو کہ تم میں سے ایک ایک شخص کو اپنے اپنے وقت پر موت کا شکار ہو کر اللہ کے حضور حاضر ہونا ہے۔ اس حاضری سے کسی کو استثناء نہیں وہاں چھوٹوں

Marfat.com

کو بھی جانا ہے اور بڑوں کو بھی۔ بادشاہ بھی بے بسی سے کھڑے ہوں گے اور رعایا بھی۔ تم ہر صداقت کا انکار کر دو لیکن موت کا انکار نہیں کر سکتے بیشک قیامت کا بھی انکار کر و لیکن تمہارے انکار سے حقیقت نہیں ٹل سکتی۔ تم قیامت کے وقوع اور اعمال کی جزا و سزا پر کیسے ہی عقلی شبہات وارد کر و لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اللہ کی قدرت کاملہ کے لئے قیامت کا لانا اور اعمال کا حساب کرنا اور پھر اس پر جزا و سزا دینا کوئی مشکل نہیں۔ اس لئے تمہارے لئے عافیت اسی میں ہے کہ تم آج عقل کے ناخن لو اور اپنے آپ کو آنے والی رسوائی سے بچالو۔

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ ﴿سورۃ ھود : ۵﴾

(سنو! وہ اپنے سینے موڑتے ہیں تا کہ اس سے چھپ جائیں۔ آگاہ رہو جس وقت وہ خوب اوڑھ لیتے ہیں اپنے کپڑے تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تو سینوں کے بھیدوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔)

یثنون اور یستغشون کا مفہوم اور مراد

یَثْنُوْنَ - ثَنْیٌ سے ہے۔ ثَنْیٌ کا معنی ہے پھیرنا، موڑنا، طے کرنا، دہرا کرنا اور لپیٹنا۔ جب کسی شخص کے تکبر اور انکار پر مبنی رویے کی منظر کشی کی جاتی ہے تو اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ شخص فلاں بات کے حوالے سے اس قدر بے رخی، انکار اور تکبر پر تلا ہوا ہے کہ اس کا دماغ تو اس بات کو ماننے سے انکار کرتا ہی ہے اس کی جسمانی کیفیت بھی یہ ہوتی ہے کہ وہ پہلو بدلتا ہے، سینہ موڑتا ہے اور بل کھاتا ہوا چل نکلتا ہے۔ قرآن کریم نے سورۃ حج آیت نمبر ۹ میں اسی حالت کو ثانی عطفہ سے تعبیر فرمایا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے مخالفین مختلف طور اطوار کے حامل تھے ان کی مخالفت کے انداز بھی جدا جدا تھے۔ انہی میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ابھی تک خاندانی وضع داری اور معاشرتی آداب پر قائم تھے لیکن نبی کریم ﷺ کی دعوت کے انکار اور تکذیب میں کسی سے کم نہ تھے وہ بجائے رودررو ناگوار کلمات کہنے کے آپ کے سامنے آنے سے احتیاط کرتے تھے جب کبھی کسی مجلس میں ان کی موجودگی میں آنحضرت ﷺ قرآن کریم پڑھ کر سناتے یا کوئی نصیحت فرماتے تو وہ سر جھکا کر اور سینہ سمیٹ کر اپنے آپ میں گم ہو جاتے۔ اور اگر کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تو رخ پھیر کر اور منہ چھپا کر نکل جاتے۔ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ سے ان کی اسی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور کبھی ایسا ہوتا کہ آنحضرت ﷺ انہیں اپنی دعوت کا مخاطب بنانے کی کوشش کرتے تو وہ اپنی چادر کو جو عربوں کے لباس کا مستقل حصہ تھی پٹھانوں کی طرح اپنے سر پر ڈال کر اپنے گرد لپیٹ لیتے اور وہاں سے چل دیتے۔ اس طرح وہ یہ سمجھتے کہ ہم نے اپنے آپ کو نبی کریم ﷺ کی دعوت اور آپ کے انذار سے محفوظ کر لیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کی شکایت کرتے ہوئے ان کے اسی رویہ کا ذکر کیا ہے جس سے بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ سورۃ نوح آیت نمبر ۷ میں ہے۔ " وَاِنِّىْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَ اَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا " (اور میں نے جب جب ان کو دعوت دی کہ تو ان کی مغفرت فرمائے انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنی چادریں لپیٹ لیں اور ضد کی اور نہایت گھمنڈ کیا)۔ زیر بحث آیت کریمہ میں بھی اسی رویہ کو استغشاء ثیاب سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

اللہ کے نبیوں کا کام کس قدر کٹھن کام ہے کہ انہیں ایسے ایسے چرکے برداشت کرنے پڑتے ہیں جس سے بعض دفعہ احساسات بھی چیخنے لگتے ہیں۔ یہی اذیت کیا کم ہے کہ لوگ قسم قسم کے اعتراضات کریں، مذاق اڑائیں، تمسخر کریں، زندگی دشوار کر دیں، جسمانی اذیتوں تک نوبت پہنچے، بعض دفعہ بائیکاٹ تک کر دیں لیکن ان سب سے بڑی تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ان کے قابل ذکر لوگ بات سننے کے روادار نہ ہوں اور آپ کے انذار سے بچنے کے لئے کبھی پہلو بدل کر نکل جائیں اور کبھی اپنے آپ کو کپڑوں میں لپیٹ لیں اور یہ سمجھیں کہ ہم نے اپنے آپ کو ان کے انذار سے محفوظ کر لیا ہے۔ یہ رویہ ایک طرف پیغمبر کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہے تو دوسری طرف نہایت احمقانہ بھی ہے کہ یہ عقل و دانش کے دعوے دار کیسی حماقتوں پر اتر آئے ہیں کہ ان کے سامنے زندگی کی صداقتیں ہیں جن کے رد و قبول کا مسئلہ درپیش ہے اور یہ پہلو بدل کر سینہ موڑ کر اور کپڑوں میں لپٹ کر شتر مرغ کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ

Marfat.com

انہوں نے اپنے آپ کو طوفان سے محفوظ کر لیا ہے۔ جس طرح شتر مرغ ریت میں سر چھپا کر طوفان سے محفوظ نہیں ہو جاتا اسی طرح یہ بھی اپنے آپ کو پیغمبر کے انذار اور اس کے نتیجے میں اللہ کے عذاب سے بچا نہیں سکتے۔ ان کی ایک ایک بات اللہ کے سامنے ہے یہ آنحضرت ﷺ سے تو چھپ سکتے ہیں اللہ سے نہیں چھپ سکتے اس لئے اس آیت کریمہ میں فرمایا گیا کہ جب یہ لوگ اپنے کپڑوں میں لپٹ رہے ہوتے ہیں تو اللہ ان کی ان باتوں کو بھی جانتا ہے جن کو یہ چھپاتے ہیں اور جن کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ اللہ کی ذات تو سینوں کے بھیدوں سے واقف ہے اس سے کون چھپ سکتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَ مُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝

(اور زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہ جانتا ہے اس کے ٹھہرنے کی جگہ کو اور اس کے امانت رکھے جانے کی جگہ کو، ہر چیز ایک واضح رجسٹر میں درج ہے۔) ﴿سورۃ هود : ۶﴾

آیت کی تشریح سے پہلے بعض الفاظ کا مفہوم سمجھنا چاہئے۔ مستقر اسم ظرف ہے اس کا معنی ہے قرار پکڑنے کی جگہ۔ مراد اس سے ہر مخلوق کی اس دنیا میں ٹھہرنے اور رہنے کی جگہ ہے۔ مستودع بھی اسم ظرف ہے۔ اس کا معنی ہے ودیعت کیے جانے اور سپرد کیے جانے کی جگہ۔ مراد اس سے قبر ہے یعنی ہر انسان کو مرنے کے بعد جس زمین کے سپرد کیا جاتا ہے وہ اس کا مستودع ہے۔ کتاب مبین سے مراد لوح محفوظ ہے۔

علم الٰہی کی وسعت

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ بعض لوگ پہلو بدل کر یا اپنے کپڑوں میں لپٹ کر آنحضرت ﷺ سے روگردانی کرتے تھے اور اس طرح وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کا نبی جو اللہ کی طرف سے ہمیں انذار کر رہا ہے اور آنے والے دنوں میں ہمارے لئے جو اندیشے ہو سکتے ہیں ان کا اظہار کر رہا ہے۔ ان سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم ان سے روگردانی کا عمل جاری رکھیں اس طرح سے گویا ہم اندیشوں سے بچ جائیں گے۔ قرآن کریم نے اس پر گرفت کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ نادانوں اللہ کا رسول تو نہایت خیر خواہی سے تمہیں ہر خطرے سے بچانا چاہتا ہے وہ تمہاری دنیا بھی سنوارنا چاہتا ہے اور آخرت بھی اُجالنا چاہتا ہے۔ اس لئے اُس سے روگردانی کرنا تو اپنی قسم پھوڑنے والی بات ہے اور پھر تم اتنا نہیں سوچتے کہ معاملہ تمہارا اللہ سے ہے۔ اللہ کا رسول تو ایک واسطہ خیر ہے تم اس واسطے کی اگر قدر نہ بھی کرو تب بھی اللہ سے دور کیسے ہو سکتے ہو تم ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہو وہ تمہارے ایک ایک عمل کا نگران ہے اس کے دو فرشتے تمہارے دونوں کندھوں پر تمہارے اعمال کو منضبط کر رہے ہیں۔ تم ہزار کوشش کرو اللہ سے چھپ نہیں سکتے وہ نہ صرف تمہیں جانتا ہے بلکہ تمہارے سینوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ تم بھی اور تمہاری طرح دوسری مخلوقات بھی زندگی کی بقا کے لئے خورد و نوش کی محتاج ہیں۔ بچہ ماں کے پیٹ میں بھی غذا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور پیدا ہونے کے بعد تو یہ احتیاج اور بھی بڑھ جاتی ہے اور تم یہ جانتے ہو کہ رزق کے خزانے اللہ کے سواء کسی اور کے پاس نہیں ہیں۔ وہ اگر پانی کے سوتوں کو خشک کر دے تو تمہارے سمیت تمام مخلوقات پیاس سے مر جائیں اور اگر وہ زمین کی قوت روئیدگی کو معطل کر دے اور عناصرِ قدرت اور فطرت کو اپنے فرائض بجالانے سے روک دے تو تمام مخلوقات بھوک سے مر جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رزق کا سر رشتہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اسی کی قدرت میں ہے کہ مخلوقات کون کون سی اور کہاں کہاں ہیں ان کی غذا کی نوعیت کیا ہے انہیں یہ غذا کس طرح پہنچائی جائے۔ کائنات اتنی وسیع و عریض ہے کہ اللہ کے سواء اس کی وسعتوں کو کوئی نہیں جانتا اور اس کی وسعتوں میں کہاں کہاں اس کی مخلوقات پھیلی ہوئی ہیں اور وہ کیسی کیسی غذا کی محتاج ہیں اسے بھی اللہ کے سواء کوئی نہیں جانتا۔ اس کا علم اتنا کامل اور اتنا جامع ہے کہ سمندر کی گہرائیوں میں کون سی مخلوق کس کھائی میں، کس جزیرے میں، کس پودے کی اوٹ میں موجود ہے اللہ اسے جانتا ہے اور اُسے یہ بھی معلوم ہے کہ اسے کس قسم کی غذا چاہئے اور وہ غذا اسے کیسے پہنچ سکتی ہے۔ آسمان کی وسعتوں میں ان گنت پھیلی ہوئی مخلوق سے بھی صرف وہ واقف ہے اور وہی ان کی تربیت کا سامان کر رہا ہے۔ زمین پر بسنے والے انسان ہی نہیں جنات بھی ہیں حیوانات بھی ہیں چرند اور پرند بھی ہیں، درندے بھی ہیں، کوڑے کرکٹ میں ملے ہوئے حقیر جانور بھی ہیں، زمین کی سلوٹوں میں چھپے ہوئے حشرات الارض کی کمی نہیں، پہاڑوں کی بلندیوں پر بسنے والی مخلوق کا بھی کوئی شمار نہیں لیکن قربان جائیے کہ اللہ کی وسعت علم سے کہ وہ جس طرح صحراؤں کی پہنائیوں سے آگاہ ہے اسی طرح غاروں کی تنہائیوں

Marfat.com

بھی واقف ہے۔وہ ایک ایک درندے کے بھٹ کو جانتا ہے، چیونٹیوں کے بلوں کو بھی دیکھتا ہے، شیر کا کچھار بھی اس کی نگاہوں میں ہے، پرندوں کے آشیانوں میں پھڑ پھڑاتے بچوں کی پھڑ پھڑاہٹ کو بھی سنتا ہے اپنے اس علمِ کامل کی وجہ سے وہ سب کو روزی پہنچا رہا ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ جس ذات کا علم اتنا وسیع ہے تم اس کی نگاہوں سے کیسے چھپ سکتے ہو۔تم اپنی معیشت کی ضروریات کے سلسلے میں نجانے کہاں کہاں جاتے ہو، کہاں کہاں تمہارا اٹھنا رہتا ہے اور پھر زمین کا ایک ایک آدمی کہاں کہاں اپنا قیام رکھتا ہے ان میں سے کوئی بات بھی اللہ کے علم سے مخفی نہیں ہے۔ اسی پر بس نہیں وہ تو یہ بھی جانتا ہے کہ مرنے کے بعد تمہیں کس کے سپرد کیا جائے گا، تمہاری قبر کہاں بنے گی، تمہیں زمین جگہ دے گی یا نہیں دے گی۔ ہوسکتا ہے تمہاری لاش سمندر کے سپرد کردی جائے، کسی درندے کا پیٹ تمہارا مدفن بن جائے اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ تمہاری ابھی تخلیق بھی نہیں ہوئی تھی تم نے زمین پر قدم بھی نہیں رکھا تھا تم نے کسی جگہ کو اپنا مستقر نہیں بنایا تھا اور کسی جگہ تمہاری لاش سپرد نہیں کی گئی تھی لیکن اللہ کے علم میں اس وقت بھی یہ ساری باتیں محفوظ تھیں اور اس نے ازل ہی میں اسے کتاب محفوظ اور کتاب مبین کی زینت بنا دیا تھا جسے ہم خود قیامت میں پڑھیں گے اور ہمیں اپنی بے بصیرتی کا اندازہ ہوگا۔ آج تو اس پر افسوس ہی کیا جاسکتا ہے کہ انسان کا گردوپیش اس کی ایک ایک ضرورت اس کے وجود اور اس کے حضور کی شہادت دے رہی ہے لیکن انسان کی جہالت کا کیا ٹھکانا ہے کہ وہ اپنے آپ میں چھپ کر یہ سمجھتا ہے کہ میں اللہ سے چھپ گیا ہوں۔

مشرکین کے لئے تعریض

اس آیت میں مشرکین مکہ پر تعریض بھی ہے کہ تم جس پروردگار سے اپنے آپ کو چھپا رہے ہو اور اس کے رسول کی دعوت پر کان دھرنے کے لئے تیار نہیں ہو اور روز بروز تمہاری جسارتیں بڑھتی جارہی ہیں باقی تمام حقائق سے قطع نظر بھی، کاش کبھی تم اس بات پر غور کرو کہ تم اپنی جس امارت پر فخر کرتے ہو اور جن نعمتوں پر اتراتے ہو اور جس عیش وعشرت نے تمہیں اندھا کررکھا ہے۔ آخر یہ سب کچھ تمہیں کس نے دیا ہے یہ نعمتیں تمہیں کون عطا کرتا ہے اور پھر لذت کام ودہن سے تمہیں کس نے بہرہ ور کررکھا ہے آدمی جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے اور جس کے احسانات سے فیض یاب ہوتا ہے ہمیشہ اسی کے سامنے سر جھکاتا ہے لیکن تمہیں نہ اللہ کی رزق رسانی یاد آتی ہے نہ اس کے احسانات ربوبیت، کبھی تمہیں جھکنے پر مجبور کرتے ہیں۔تم اپنے اس رویہ پر اگر کبھی غور کرو تو تمہیں خود ہی اس پر شرم آنی چاہیے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ ﴿سورة هود :٧﴾

(اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے چھ دنوں میں اور اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں عمل میں کون اچھا ہے۔ اے پیغمبر! اگر آپ کہتے ہیں کہ تم موت کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو یہ کافر کہتے ہیں یہ تو بس کھلا کھلا جادو ہے۔)

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ

اللہ کے علمِ کامل کو بیان کرنے کے بعد اس آیت کریمہ میں اس کی قدرت کاملہ کو بیان کیا جارہا ہے کہ جس طرح وہ کائنات کی ایک ایک بات سے باخبر ہے اسی طرح اس کائنات کی تخلیق بھی اسی کی قدرت کاملہ کا نتیجہ ہے۔ اس کی قدرت کاملہ کے لئے تو یہ بھی ممکن تھا کہ وہ تمام کائنات کو ایک ہی لمحے میں یا ایک ہی مرحلے میں پیدا فرما دیتا لیکن جس طرح اس کی صفات میں قدرت کاملہ ایک بہت اہم صفت ہے اسی طرح حکمت بھی اس کی اہم تر صفت ہے چنانچہ اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اسے ایک ہی لمحے میں یا ایک مرحلے میں پیدا نہ کیا جائے بلکہ مختلف مراحل میں اس کی تخلیق کو مکمل کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ کائنات کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اس کے خالق نے ارادہ، اسکیم، ترتیب اور حکمت کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بے غایت وبے مقصد کارخانہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم غایت ہے جس کا ظہور میں آنا لازمی ہے۔

ایام سے کیا مراد ہے

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اسے ستة ایـــــام میں پیدا فرمایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس سے مراد کیا ہے؟ یوم کا لفظ عام طور پر

Marfat.com

طلوعِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب کی مدت کے لئے استعمال ہوتا ہے لیکن زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے جبکہ نہ سورج تھا اور نہ اس کا طلوع وغروب نتیجتاً نہ دن تھا نہ رات۔ اس لئے یہاں یوم کو اس تنگی میں لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اہلِ زبان کہتے ہیں کہ یوم کا لفظ مطلق وقت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہ مطلق وقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس سے عام طور پر یہ مراد لیا گیا ہے کہ آسمان وزمین کی تخلیق چھ ادوار میں پایہ تکمیل تک پہنچی۔ ہر دور کی مقدار کتنی تھی اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کی وضاحت نہ قرآن کریم نے کی ہے اور نہ سنت نبوی میں اس کا ذکر ہے۔ اس قسم کی آیات درحقیقت آیاتِ متشابہات میں سے ہیں جس کی مراد متعین کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہئے اگر کوئی بات سیاقِ کلام یا فحوائے کلام سے خود بخود واضح ہوتی ہے تو اسے لے لینے میں کوئی حرج نہیں بہتر یہی ہے کہ اس کی مراد اللہ کے حوالے کی جائے۔ ویسے بھی انسانی ہدایت کا کوئی معاملہ اس طرح کی باتوں پر اٹکا ہوا نہیں قرآن کریم کتابِ ہدایت ہے وہ ہدایت کے ضمن میں ایسی کسی بات کا تذکرہ صرف اس لئے کر جاتا ہے تاکہ اس کی قدرتِ کاملہ اور اس کی حکمتِ بالغہ پر یقین پیدا ہو اور حقیقت نہ سمجھنے پر دل میں عجز کی کیفیت پیدا ہو جس سے بندگی کو جلا ملتی ہے اور اللہ کی کبریائی کا یقین بڑھ جاتا ہے۔

زمین و آسمان کی تخلیق کے ذکر کے بعد ممکن ہے یہ سوال پوچھا گیا ہو کہ جب کچھ بھی نہ تھا تو اللہ کا عرش کہاں تھا اس کا جواب دیا گیا کہ اس کا عرش پانی پر تھا لیکن یہ بات بجائے خود ہمارے ادراک سے باہر ہے کہ پانی سے کیا مراد ہے؟ کیا اس سے یہی پانی مراد ہے یا یہ لفظ محض استعارے کے طور پر مادے کی اس مائع (Fluide) حالت کے لئے استعمال کیا گیا ہے جو موجودہ صورت میں ڈھالے جانے سے پہلے تھی۔ رہا یہ ارشاد کہ خدا کا عرش پہلے پانی پر تھا تو اس کا مفہوم عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اللہ کی سلطنت پانی پر تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کرہ ارض کی خشکی نمودار ہونے سے پہلے پہلے یہ سارا کرہ مائی تھا اور اللہ کی حکومت اس پر تھی پھر پانی سے خشکی نمودار ہوئی اور زندگی کی مختلف النوع انواع ظہور میں آئیں اور درجہ بدرجہ یہ پورا عالمِ ہستی آباد ہوا۔

کائنات کا مقصدِ تخلیق

لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا - تخلیق ارض وسما اور کائنات کے بےشمار کروں میں حیرت انگیز نظم و ترتیب اور ہر مخلوق کے پیچھے ایک محسوس کی جانے والی حکمت و دانش دیکھ کر دل میں یہ سوال پیدا ہونے لگتا ہے کہ قدرت نے یہ سارا انتظام و انصرام کس مقصد کے لئے کیا ہے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کائنات کا پیدا کرنا ہی اس کا مقصدِ تخلیق ہو۔ اللہ کی ذات جو سرتاپا حکیم ہے اور جس کی پیدا کردہ کائنات میں قدم قدم پر حکمت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ خیال کرنا بجائے خود حماقت ہے کہ اس نے اس کائنات کی تخلیق محض کھیل تماشے یا دفع الوقتی کے لئے کی ہے۔ اور اس کا کوئی مقصد نہیں۔ آدمی اپنے طور پر ہزار کوشش کرے مگر اس کے لئے ایک متعین جواب تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اس لئے اللہ نے کرم فرمایا اور انسانوں پر اس کا بوجھ ڈالنے کی بجائے خود اس کا ایک متعین جواب عطا فرمایا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے کہ اللہ نے یہ کائنات اس لئے پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے حسنِ عمل کا پیکر کون ہے۔ اس جواب میں تھوڑی سی تفصیل مخفی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اس کائنات کو اس لئے پیدا کیا تاکہ ہم انسان کو پیدا کریں کیونکہ انسان ہی اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے۔ زمین کی ایک ایک چیز اسی کی منفعت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ عناصرِ قدرت کو اسی کی خدمت پر لگایا گیا ہے۔ اللہ کی نوری مخلوق ملائکہ کو اس کے ارادوں کی تعمیل کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ وہ کبھی اس کی حفاظت پر لگے ہوئے ہیں کبھی اس کی ضروریات پوری کر رہے ہیں، کبھی اس کے اعمال کو منضبط کر رہے ہیں اور کبھی اس کی نیکی اور برائی کو اتمام تک پہنچانے میں لگے ہوئے ہیں۔ غرضیکہ زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کسی نہ کسی طرح اسی سے متعلق ہیں۔ اسے زندگی دے کر اور زندگی کی تمام سہولتیں دے کر اور تمام کائنات کو اس کی منفعت اور خدمت میں دے کر اسے ارادے کی آزادی بخشی گئی۔ عقل وشعور اور خیر وشر کا امتیاز دے کر اسے ایک ذمہ داری سونپی گئی کہ باقی ساری مخلوقات کو انسان کی قوت تسخیر کو بروئے کار لانے اور ارادوں کی تکمیل کے لئے وقف کی گئی ہے اور جن چیزوں کا تعلق انسانی غذا سے ہے انہیں اس کی غذا بنا دیا گیا ہے اور ہر مخلوق نے اپنے اس مخدوم کو پہچان کر اپنا آپ اس کے سپرد کر دیا ہے لیکن خود اسے عقل وشعور، قوت ارادی اور خیر وشر کا امتیاز دے کر اسے امتحان میں ڈالا گیا کہ تم اپنے مخدوم، اپنے آقا اور اپنے مالک کو پہچانتے ہو یا نہیں اور تم اپنی زندگی اس کی امانت سمجھ کر اس کی اطاعت میں اور اس کی رضا کے لئے گزارنے اور قربان کرنے کے لئے تیار ہو یا نہیں۔ اسی حوالے سے یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کی اصل غرض وغایت انسان کو پیدا کرنا اور اس کا امتحان لینا ہے کہ اس کا جو فرض اور ڈیوٹی اللہ کی جانب سے عائد کی گئی

Marfat.com

ہے جس کو عمل سے تعبیر کیا گیا ہے اس نے اسے کہاں تک ادا کیا ہے اور اس کے فیصلے کے لئے وہ ایک دن اہلِ زمین کی صف لپیٹ دے گا اور پھر انہیں نئی زندگی دے کر ایک میدانِ حشر میں جمع کرے گا جہاں ان کے دنیاوی زندگی کے اعمال کی بازپرس ہوگی اور اگر انہیں اس امتحان میں کامیابی ہوئی تو انہیں جزا میں جنت کی نعمتیں ملیں گی اور اگر ناکامی ہوئی تو جہنم کے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۔ ہماری گزشتہ معروضات سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کائنات کا مقصدِ تخلیق انسان کو پیدا کرنا اور اسے چند خصوصیات دے کر اس کا امتحان کرنا ہے کہ وہ اپنی اخلاقی ذمہ داری کو پورا کرتا ہے یا نہیں اور پھر اسی امتحان کے حوالے سے قیامت کے روز اس سے بازپرس ہوگی لیکن جب یہی بدیہی بات نبی کریم ﷺ مشرکین مکہ سے کہتے تھے کہ تم مرنے کے بعد اُٹھائے جاؤ گے اور تم سے تمہارے مقصدِ حیات کے بارے میں بازپرس ہوگی کہ تم نے زندگی اس مقصد کے مطابق گزاری یا اس کے خلاف۔ تو مشرکین مکہ بجائے اس بات کو سمجھنے اور فکر کرنے کے الٹا نبی کریم ﷺ کا مذاق اڑانے لگتے اور ان کے نہایت مؤثر اور دل نشین پیرایۂ بیان کو جادو کہہ کر اس کی تاثیر کو ہوا میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہوں نے درحقیقت کائنات کو کسی کھلنڈرے کا کھیل سمجھ رکھا ہے اور اپنے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اس کھلونے سے جی بہلانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور اس احمقانہ تصور میں اتنے مگن ہیں کہ آنحضرت ﷺ کا دل نشین طرزِ بیان انہیں جادو محسوس ہوتا ہے اور یہ قیامت کے وقوع کا دعویٰ انہیں شعبدہ بازی اور سحرِ مبین لگتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں اور اپنی عوام کو بھی مسلسل دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۸

﴿سورة هود : ۸﴾

(اگر ہم ان سے عذاب کو کچھ مدت کے لئے ٹالتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے۔ سنو! جس دن وہ ان پر آدھمکے گا تو ان سے ٹالا نہ جاسکے گا اور وہی چیز ان کو آگھیرے گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔)

(امة معدودة) کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے وہ اپنے ٹھیٹ لغوی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ یوسف میں بھی اسی معنیٰ میں یہ لفظ بولا گیا ہے۔ عام طور پر ''امت'' کا لفظ قوم یا گروہ کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے لیکن یہاں اس کا معنی مدت ہے اور معدودہ کا معنی ہے کچھ اور گنی چنی، تو امت معدودہ کا معنی ہوگا ایک محدود گنی چنی مدت۔

گزشتہ آیت میں ہم نے مشرکین مکہ کا رویہ دیکھا کہ قرآنِ کریم نے مقصدِ زندگی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ وہ بالکل بدیہی بات معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی بلادت کا کیا کہنا کہ وہ اتنی بدیہی بات کو بھی سمجھنے سے قاصر ہیں اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب اس آیت کریمہ میں ان کے اسی غیر سنجیدہ رویے کا ذکر ایک اور مسلّم حقیقت کے بارے میں بیان کیا جارہا ہے جس طرح قیامت کا آنا یقینی ہے اور اس میں جزا و سزا کا وقوع لازمی ہے اسی طرح قوموں کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ جب کسی قوم نے اتمامِ حجت کے بعد بھی اللہ کے رسول پر ایمان لانے سے انکار کیا بلکہ اس حد تک اس کے درپے آزار ہوئے کہ اسے ہجرت پر مجبور کر دیا گیا تو اس کے بعد اللہ کا عذاب ضرور آیا۔ قوم عاد اور قوم ثمود کے کھنڈرات ان کے تجارتی قافلوں کی گزرگاہ ہیں اور ان کی تاریخ سینہ بسینہ جزیرۂ عرب میں پھیلی ہوئی ہے یہ جانتے ہیں کہ وہ کس طرح اللہ کے عذاب کا شکار ہوئے۔ بااین ہمہ یہ اس حد تک انتہائی سنجیدہ معاملات میں بھی غیر سنجیدہ ثابت ہوئے ہیں کہ ہر بات کا مذاق اڑاتے ہیں جو قوم انگاروں پر لیٹ کر فقرہ بازی کرتی یا تمسخر اڑاتی ہے آپ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرسکتے ہیں۔ عذاب ان کے سر پر تلا کھڑا ہے اور ان کی حرکتیں اس کو دعوت دینے کے لئے کافی ہیں اس کے باوجود یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے انہیں مہلتِ عمل دے رکھی ہے کہ شاید یہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ بجائے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے وہ اس کے رسول کا مذاق اڑاتے ہیں کہ تم جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو آخر کس چیز نے اسے روک رکھا ہے وہ کہیں راستے میں لنگرانداز تو نہیں ہوگیا، کہیں اسے راستہ تو نہیں بھول گیا۔ پروردگار وارننگ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نادانو! سنو! تم اپنی قسمت کے دشمن ہوئے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ جس دن وہ عذاب آگیا وہ تمہارے ٹالے سے ٹلے گا نہیں اور وہ تمہیں اس طرح اپنے گرداب میں لے لے گا کہ تم اس سے باہر نہیں نکل سکو گے۔

Marfat.com

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ
نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ
مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ
صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾
فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ
يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ
وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا
بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ
اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ
فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي
الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾
اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ
قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ
مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ

Marfat.com

مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ
عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ
أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٨﴾ الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ
اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ﴿١٩﴾ أُولَٰئِكَ لَمْ
يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ
أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَ
مَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ
عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢١﴾ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ
الْأَخْسَرُونَ ﴿٢٢﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَخْبَتُوا
إِلَىٰ رَبِّهِمْ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٣﴾ مَثَلُ
الْفَرِيقَيْنِ كَالْأَعْمَىٰ وَالْأَصَمِّ وَالْبَصِيرِ وَالسَّمِيعِ ۚ هَلْ يَسْتَوِيَانِ
مَثَلًا ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٤﴾

(اگر ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں اور پھر اس کو اس سے محروم کردیتے تو وہ مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔
اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی اس کو نعمت سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے میری مصیبتیں جاتی رہیں اور وہ اکڑنے والا

Marfat.com

اور شیخی بگھارنے والا بن جاتا ہے۔ مگر (وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں) جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں انہی کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔ شاید آپ چھوڑ دینے والے ہیں اس چیز کا کچھ حصہ جو آپ پر وحی کی جاتی ہے۔ اور تنگ ہو رہا ہے اس سے آپ کا سینہ اس اندیشہ سے کہ وہ کہیں گے کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہہ دیجئے کہ تم لے آؤ اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں اور بلا لو جن کو تم بلا سکتے ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ پس اگر وہ تمہاری بات کو قبول نہ کریں تو پھر خوب جان لو کہ یہ قرآن اللہ کے علم ہی سے اترا ہے اور یہ کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں ہے تو کیا تم اسلام لاتے ہو۔ جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کے اعمال کا بدلہ یہیں چکا دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا کرایا سب ضائع ہو جائے گا اور باطل ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک بینہ پر ہے پھر اس کے بعد اس کی طرف سے ایک گواہ بھی آجاتا ہے اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود ہے اور (وہ جو نورِ بصیرت سے محروم ہیں دونوں یکساں ہو جائیں گے؟) یہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں گے جماعتوں میں سے ان کا موعود ٹھکانہ بس دوزخ ہے۔ پس اے مخاطب! تم اس کے باب میں کسی شک میں نہ پڑو۔ یہی حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں مانتے۔ اور کون زیادہ ظالم ہے ان لوگوں سے جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ یہی لوگ پیش کئے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور گواہ گواہی دیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے۔ آگاہ رہو کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہی لوگ آخرت کے منکر تھے۔ یہ زمین میں خدا کے قابو سے باہر نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے۔ ان کا دگنا عذاب دیا جائے گا۔ یہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے سب ہوا ہو جائیں گے۔ لازماً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خسارے میں ہوں گے۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور عجز و نیاز سے اپنے پروردگار کی طرف جھک گئے یہی لوگ جنتی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ مثال ان دونوں فریقوں کی ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرہ ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا۔ کیا یکساں ہے ان دونوں کا حال؟ کیا تم اس مثال میں غور و فکر نہیں کرتے؟)

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿٩﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿١٠﴾ ﴿سورۃ ھود: ۹، ۱۰﴾

(اگر ہم انسان کو اپنے کسی فضل سے نوازتے ہیں اور پھر اس کو اس سے محروم کر دیتے تو وہ مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی اس کو نعمت سے نوازتے ہیں تو کہتا ہے میری مصیبتیں جاتی رہیں اور وہ اکڑنے والا اور شیخی بگھارنے والا بن جاتا ہے۔)

آیات کی تشریح سے پہلے چند مشکل الفاظ کی وضاحت۔ یہاں "رحمت" سے مراد صحت، امن و عافیت، خوشحالی، فارغ البالی اور موافق حالات کے ہیں۔ "یَئُوْس" مبالغہ کا صیغہ ہے اس سے مراد ایسا شخص ہے جو حالات کا ایک جھٹکا برداشت نہ کر سکے حالات کی دگرگونی سے بالکل مایوس

Marfat.com

ہوجائے۔''کـفـور'' یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے بہت ناشکری کرنے والا۔ اسے ہزار نعمتوں سے نوازا جائے کبھی بھول کر شکر ادا نہ کرے اور معمولی تکلیف پر ناشکری پر اتر آئے۔''فـخـور'' مبالغے کا صیغہ ہے اس کا معنی ہے بہت اترانے والا۔ حالات اچھے ہوں کاروبار چمک اٹھے، قسمت یاوری کرنے لگے تو اترانا شروع کردے۔

انسان کا ذکر کرنے کا فائدہ

پہلی آیت کریمہ میں کسی خاص طبقے کا ذکر کرنے کے بجائے انسان کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ روئے سخن اگرچہ انہی لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر سابقہ آیات میں کیا گیا ہے لیکن ان کا نام لئے بغیر انسان کے لفظ سے بات کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے اس قابل نہیں رہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے مخاطب ہو۔ اس لئے بجائے انہیں خطاب کرنے کے انسان کا لفظ بول کر اجتماعی اسلوب میں بات فرمائی۔ اس سے اعراض کا مقصد بھی پورا ہو گیا اور جو بات کہنا تھی اس کا حق بھی ادا ہو گیا۔ امر واقعہ یہ ہے کسی ایک طبقے کی بات کو ایک کلیہ کی شکل میں کہنا ہمیشہ زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ یہاں بھی ہم اسی تاثیر کو دیکھ رہے ہیں۔ اور مزید یہ بات بھی کہ اس سے انسانی نفسیات کا ایسا حقیقت پسندانہ تجزیہ بھی سامنے آیا ہے جس سے انسان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ مہذب اور شائستہ انسان خاص صفات کے حامل ہوتے ہیں لیکن وہ لوگ جو انسانیت کے جامہ کو تار تار کر دیتے ہیں اور ان کے اندر چھچھورا پن آجاتا ہے ان کے انداز بالکل مختلف ہوتے ہیں یہاں اسی انداز کی بعض جہتوں کا تذکرہ فرمایا جارہا ہے ان کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں اپنی طرف سے خوشحالی عطا فرماتا اور عہدہ و منصب سے نوازتا ہے یا اثر و رسوخ میں اضافہ فرماتا ہے تو بجائے اس کے کہ اسے اللہ کی دین سمجھیں اور اس پر اللہ کا شکر ادا کریں اور انہی نعمتوں کو خدمت خلق کے لئے کام میں لائیں اور ان کے رویے کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھیں کہ اللہ نے انہیں جیسے ہی نعمتوں سے گراں بار کیا ہے تو یہ پھل دار درخت کی طرح پہلے سے زیادہ متواضع ہو گئے ہیں اور ان کا سایہ پہلے سے بھی گھنا ہو گیا ہے لیکن ان میں ایسے کسی رویہ کی دور دور تک بھی نشان دہی نہیں ہوتی۔ اس کے بعد اگر اللہ تعالیٰ ان سے یہ نعمتیں چھین لیتا ہے ان کے حالات دگرگوں ہو جاتے ہیں تو اب بھی وہ صبر کرنے کی بجائے مایوس اور ناشکرے ہو جاتے ہیں۔ وہ بالکل اس بات پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ کل اگر ہمارے حالات اچھے تھے تو وہ اللہ کی عطا تھی اور ہماری محنتوں کا ثمر تھا اور آج اگر حالات بگڑ گئے ہیں تو یقیناً اس میں ہماری کوتاہیوں کا دخل ہو گا۔ ہمیں اپنی کوتاہیاں دور کر کے ازسر نو جدوجہد کا آغاز کرنا چاہئے اور اللہ سے مدد مانگنی چاہئے کوئی بڑی بات نہیں کہ اگر پہلے حالات میں انقلاب آیا ہے تو اب انقلاب کیوں نہ آئے۔

دوسری آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم ان مایوس اور ناشکرے لوگوں کو سزا دینے کی بجائے ان کو مزید آزمائش میں ڈالنے کے لئے ایک دفعہ پھر ان کے حالات کو بدل دیتے ہیں ان کی مصیبتیں ہٹا دی جاتی ہیں، کاروبار کے لئے بہتر حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہمارے دن اس طرح پھر گئے ہیں کہ مصیبتوں کا کوئی اثر ہم پر نہیں رہا لیکن اب بھی وہ یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ اگر سب کچھ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم کبھی اپنے حالات خراب نہ ہونے دیتے اور کبھی بھی اپنی خوشحالی کو بدحالی میں تبدیل نہ ہونے دیتے اس میں یقیناً اس خالق کائنات کا ہاتھ ہے جو جب چاہتا ہے خوشیاں عطا فرماتا ہے اور جب چاہتا ہے غموں میں ڈبو دیتا ہے۔ لیکن اس کی یہ مشیت حکمت سے خالی نہیں ہوتی حالات کی ہر طرح کی تبدیلی کے پیچھے یقیناً اس کی حکمت کارفرما ہوتی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ بے بصیرت اور چھچھورے لوگ جس طرح ناموافق حالات میں مایوس اور ناشکرے ہو گئے اسی طرح موافق حالات میں اترانے لگتے اور شیخیاں بگھارنے لگتے ہیں۔

اندازہ فرمایئے جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ خوشحالی اور فارغ البالی ملے اور عہدہ و منصب نصیب ہو تو لوگوں کے لئے عذاب بن جائیں اور بنیادی انسانی خصائص سے بھی تہی دامن ہو جائیں اور اگر انہیں سخت حالات سے واسطہ پڑے تو انتہائی کمزور اور بودے ثابت ہوں تو ایسے لوگوں سے کسی بھی خیر کی امید کرنا مشکل ہے یہ اگر پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں اور انہیں اگر اللہ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو تمسخر اڑاتے ہیں تو ان سے اس سے مختلف بات کی توقع کرنا ہی عبث ہے۔ اس لئے کہ پیغمبر کی دعوت کی قبولیت کے لئے چند بنیادی انسانی صفات کا ہونا ضروری ہے اور اللہ کے نبی کے انذار کے ادراک کے لئے بھی شرافتِ نفس کا وجود ضروری ہے لیکن جو لوگ انتہائی پست سطح تک اتر چکے ہوں ان کا رویہ اگر اپنے رویہ سے مختلف ہو تو یہ حیرانی کی بات ہے جس کی طرف یہاں اشارہ کیا جارہا ہے۔

Marfat.com

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾ ﴿سورۃ ھود : ۱۱﴾

(مگر (وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں) جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں انہی کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔)

سابقہ دو آیتوں میں ہم نے ان کم ظرف لوگوں کا تذکرہ پڑھا ہے جو بنیادی انسانی صفات سے عاری ہونے کی وجہ سے انسانی وقار سے بھی تہی دامن ہو گئے ہیں ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو مایوس اور ناشکرے ہو جاتے ہیں کسی مصیبت کو برداشت کرنا اور ہمت سے اس کا سامنا کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے اور اگر انہیں نعمتوں سے نواز دیا جاتا ہے تو وہ دوسرے انسانوں کے لئے مصیبت بن جاتے ہیں۔ شیخیاں بگھارتے ہیں اور اتراتے پھرتے ہیں۔ اس آیت کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے مختلف بھی کچھ لوگ ہیں جو انسانیت کے لئے باعث فخر ہیں یہ وہ لوگ ہیں جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے اور کسی آزمائش میں مبتلا ہوتے ہیں تو اللہ سے مایوس اور دل شکستہ ہونے کی بجائے اس کی رحمت کی امید پر صابر و مطمئن رہتے ہیں وہ مشکل سے مشکل حالات میں ذہنی توازن کو بگڑنے نہیں دیتے۔ وقت کی ہر گردش ان کے مزاج کے لئے ایک نیا پیغام لے کے آتی ہے ہر آنے والی مصیبت ان کی صبر کی صفت کو مستحکم کرتی ہے ان کی شخصیت میں استقامت و استقلال کی کیفیت جنم لینے لگتی ہے وہ جانتے ہیں حالات سے گھبرا کر آدمی حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے بلکہ اس کی گرفت میں آ جاتے ہیں لیکن جب ناگفتہ بہ حالات میں بھی آدمی اللہ پر بھروسہ اور توکل شکست نہیں ہونے دیتا۔ اور اس کی تگ و دو میں کوئی اضمحلال پیدا نہیں ہوتا اور اگر اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل و رحمت سے نوازتا ہے تو اکڑنے اور مغرور ہونے کی بجائے اس کا شکر گزار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ شکر گزار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اعمال اس سے ظہور پذیر ہوتے ہیں جس سے صفتِ شکر کا اظہار ہوتا ہے۔ جن سے اگر ایک طرف اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ بندہ اللہ کی نعمتوں کو اللہ کی دین اور اس کی امانت سمجھتا ہے تو دوسری طرف وہ غریبوں کی خدمت، رفاہ عامہ کے کام اور اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد میں اپنا بھرپور فرض سرانجام دیتا ہے۔ اور سلیمان علیہ السلام کی طرح اللہ سے دعا مانگتا ہے کہ یا اللہ تو نے جو میرے والدِ گرامی اور مجھ پر احسانات کئے ہیں مجھے توفیق دے کہ میں ان کے شکر کے لئے ایسے اعمال کروں جس سے تو راضی ہو۔ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرح خلافت جیسی نعمت بھی ملے تو اسے اللہ کی طرف سے ایک ذمہ داری سمجھ کر اس طرح ادا کرے کہ دن کا چین رخصت ہو جائے اور راتوں کی نیندیں اُچاٹ ہو جائیں۔ رات دن ایک ہی بات کی لگن ہو کہ میرے ملک میں کوئی غریب غریب نہ رہے کوئی جانور بھی بھوکا نہ رہے اور میرے گھر میں اس وقت تک خوشحالی نہ آئے جب تک ہر مسلمان گھر خوشحالی سے مالا مال نہ ہو جائے اور جب لوگ میٹھی نیند سوئیں تو وہ اس طرح راتوں کو اٹھ کر روئے کہ لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ ایسا لگتا ہے کہ جہنم کی آگ صرف حسن بصریؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں اس آیت میں فرمایا گیا کہ ان کے لئے ہی اللہ کے ہاں مغفرت اور اجر عظیم ہے کیونکہ یہی انسانیت کے گل سرسبد ہیں جن پر ہمیشہ انسانیت فخر کرتی رہے گی۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۲﴾ ﴿سورۃ ھود: ۱۲﴾

(شاید آپ چھوڑ دینے والے ہیں اس چیز کا کچھ حصہ جو آپ پر وحی کی جاتی ہے۔ اور تنگ ہو رہا ہے اس سے آپ کا سینہ اس اندیشہ سے کہ وہ کہیں گے کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا نگہبان ہے۔)

اس آیت کریمہ پر سرسری نگاہ ڈالنے سے جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اے پیغمبر! آپ ان لوگوں کی مخالفت سے تنگ آ کر ایسا لگتا ہے کہ جس وحی کے پہنچانے کی ذمہ داری آپ پر عائد کی گئی ہے اس میں سے شاید وہ حصہ جسے مخالفین برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں اس کے ابلاغ اور تبلیغ سے رک جانے والے ہیں اور ان کے تحقیر آمیز رویے کی وجہ سے آپ نفسیاتی طور پر اتنے متاثر ہو رہے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ آپ کا سینہ تنگ ہوتا اور بھنچتا جا رہا ہے اور آپ پورے انشراح قلب سے شاید بات کہنے کی ہمت نہیں پا رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مفہوم کو قبول کرنا وہ بھی اللہ کے آخری رسول سے متعلق ایمان سے کوسوں دور ہے۔ اللہ کا رسول انسان ہونے کے ناطے یقیناً حالات سے متاثر ہوتا ہے لیکن قدرت جس طرح اس کی تربیت کرتی ہے اور روح القدس جس طرح اس کی تائید کرتے ہیں اور اللہ سے براہِ راست تعلق جس طرح اس کو توانائی بخشتا ہے اور اللہ کی قدرت جس طرح

Marfat.com

اس کی حفاظت کرتی ہے اسے دیکھ کر یہ وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ کبھی حالات سے اس طرح متاثر ہوسکتا ہے۔ ایک مؤمن بھی اظہار حق میں بے باک ہوتا ہے پیغمبر تو اس راستے کی ایک ایسی روشن مثال ہے جسے دیکھ کر امتیں حوصلہ پاتی ہیں اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے ابتدائی جملوں کا مفہوم وہ نہیں جو سرسری طور پر سمجھا جاتا ہے۔

چند تمہیدی باتیں

اس آیت کو سمجھنے کے لئے تمہیدی طور چند باتوں کو سمجھنا ضروری ہے ان کا ادراک کئے بغیر آیت کا مفہوم متعین کرنا ممکن نہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کے اپنے مخصوص اسالیب ہیں انہیں میں سے ایک اسلوب یہ ہے کہ قرآن کریم بعض دفعہ اپنے مخاطب سے جو بات کہتا ہے وہ درحقیقت مخاطب سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ ان سے متعلق ہوتی ہے جن کی طرف روئے سخن ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں بظاہر تو آنحضرت ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ وحی الٰہی کے کچھ حصے کے ابلاغ کو آپ شاید چھوڑ دینا چاہتے ہیں کیونکہ حالات اس کا تحمل نہیں کرسکتے اور آپ کا سینہ ان کی بعض تمسخر انگیز اور تحقیر پرمبنی باتوں سے اس قدر تنگ پڑ گیا ہے کہ آپ کے لئے ان کے سامنے کلمہ حق کہنا مشکل ہو رہا ہے لیکن حقیقت میں یہ بات مشرکین مکہ سے کہی جارہی ہے وہ لوگ اپنے کرتوتوں سے چونکہ اپنے آپ کو غضب الٰہی کا مستحق بنا چکے ہیں اس لئے وہ اس قابل نہیں رہے کہ اللہ انہیں خطاب سے عزت بخشے۔ اس لئے جو بات انہیں سنانی ہے وہ بھی ان سے رخ پھیر کر آنحضرت ﷺ سے کہی جارہی ہے لیکن وہ سخن شناس ہونے کے باعث سمجھ سکتے ہیں کہ بات کس سے کہی جارہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''لعل'' اچھی یا بری امید کے اظہار کے لئے آتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ امید کا تعلق لعل کے اسم کے ساتھ ہی ہو۔ اس آیت میں بھی امید کا دائرہ اسم سے زیادہ وسیع معلوم ہوتا ہے کہنا شاید یہ ہے کہ مشرکین مکہ کو عرب کی سرزمین پر مرکزی حیثیت حاصل ہے وہ ایک ایسے شہر کے باسی ہیں جو قریش کا صدر مقام ہے اور یہ قبیلہ اپنے مذہبی اقتدار، اپنی دولت و تجارت اور اپنے سیاسی دبدبے کی وجہ سے سارے عرب پر چھایا ہوا ہے۔ ان کی تائید اور مخالفت دونوں پورے عرب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی نبوت و رسالت اور دعوت کی مخالفت قریش نے جس قوت کے ساتھ کی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مکہ ہی نہیں بلکہ اس کا گرد و پیش بھی دور دور تک آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں اندھا ہو رہا ہے۔ قریش کے لئے پیغمبر کی دعوت کو قبول کرنا اس لئے مشکل ہو رہا ہے کہ وہ اس میں اپنی مرکزیت اور قیادت کی موت دیکھ رہے تھے۔ وہ جس طرح کی زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے تھے اس کو یکسر ترک کر دینا ان کے لئے ممکن نہ تھا اور اللہ کا نبی انہیں بار بار اس بات کی وارننگ دے رہا تھا کہ اگر تم نے اپنے رویے میں کوئی صالح تبدیلی پیدا نہ کی تو اللہ کا عذاب تمہارے سر پر تلا کھڑا ہے وہ ان کے اعتقادات، ان کے طور اطوار اور ان کے تہذیب و تمدن میں سے ایک ایک بات پر تنقید کر کے یہ بتا رہا تھا کہ تمہاری بنیادیں بیٹھ چکی ہیں، تمہارا تمدن بری طرح سڑ چکا ہے اگر اللہ کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس مذہب حق اور اس نظام صالح کو قبول کرو جسے میں خدا کی طرف سے لے کے آیا ہوں یہ تنقید جیسے جیسے بڑھتی جارہی تھی اور دعوت میں تیزی آتی جارہی تھی ویسے ویسے قریش کے اعراض میں شدت اور مخالفت میں جارحیت پیدا ہوتی جارہی تھی اور وہ فیصلہ کر رہے تھے کہ اس دعوت کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے چنانچہ ان حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمایا جارہا ہے کہ مشرکین مکہ اپنی مخالفت کو دیکھتے ہوئے اور ہر دوسرا شخص حالات کے تیوروں کو دیکھ یہ اندازہ کر رہا تھا کہ اب اللہ کے نبی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ دعوت الی اللہ کی ان باتوں کو سرعام کہہ سکے جنہیں سننا قریش کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جارہا ہے چنانچہ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ بعض تفسیری روایات میں کہا گیا ہے کہ بعض کفار نے آپ سے کہا کہ یہ قرآن جو آپ ہمیں پڑھ کر سناتے ہیں اس میں تو ہمارے خداؤں کو بہت برا بھلا کہا گیا ہے اس لئے ہم اس قرآن کو ماننا تو دور کی بات ہے سننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں ہاں اگر آپ ایسا قرآن لے آئیں جس میں ہمارے خداؤں (بتوں) سے تعرض نہ کیا گیا ہو تو ہم آپ پر ایمان لا سکتے ہیں۔ اس مطالبے کے بعد ان کو یہ امید ہونے لگی کہ شاید نبی کریم ﷺ وحی الٰہی کی بعض باتوں کو کہنے میں تامل کریں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں جس رکنے کی بات کی گئی ہے اس کا ارادہ نبی کریم ﷺ نے نہیں فرمایا تھا البتہ مخالفین اپنی مخالفت کی شدت کو دیکھ کر اس بات کی امید کر رہے تھے اسی طرح حالات کے تیوروں کو پہچاننے والے محسوس کر رہے تھے کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی دعوت میں تبدیلی پیدا کریں۔

Marfat.com

جہاں تک دل کے تنگ اور طبیعت کے بھنچنے کا تعلق ہے اس کا منشاء بھی آنحضرت ﷺ کا قلبِ مبارک نہیں بلکہ مخالفین کی ہرزہ سرائی تھی وہ جس طرح آپ کی غربت اور فقر کا مذاق اڑاتے تھے اور آپ پر ایمان لانے والوں کی توہین کرتے تھے اور بار بار یہ بات کہتے کہ کسی معمولی حاکم کا نمائندہ بھی ایسا بے سروسامان نہیں ہوتا جیسے تم ہو۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ تم احکم الحاکمین کے رسول ہو اس نے تمہیں انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے اور حال یہ ہے کہ تم نانِ شبینہ تک کے محتاج ہو۔ تمہاری حفاظت کے لئے تو فرشتے تمہارے ساتھ رہنے چاہئیں کہ جو کوئی تمہاری شان میں گستاخی کرے تو وہ اسے اسی وقت سزا دیں اور لوگوں کو بتائیں کہ یہ شخص اللہ کا رسول ہے اگر تم نے ایمان لانے میں تامل کیا تو تم پر اللہ کا غضب ٹوٹ سکتا ہے۔ لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ فرشتہ ہونا تو دور کی بات ہے کوئی معمولی محافظ بھی تمہارے ساتھ نہیں۔ لوگ تمہارے راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں، سر مبارک پر راکھ پھینکتے ہیں بڑھ بڑھ کے گستاخیاں کی جاتی ہیں لیکن کوئی روکنے کے لئے آسمان سے نہیں اترتا تو کیا رسول ایسے ہوتے ہیں یہ باتیں کہنے والے اور سننے والے یہ سمجھتے تھے کہ آنحضرت ﷺ کی طبیعت پر نجانے ان باتوں سے کتنے زخم لگتے ہوں گے۔ آپ نجانے کس طرح ان جھڑکوں کو برداشت کرتے ہوں گے اس لئے امید کی جاسکتی ہے کہ آپ جس جرأت و جسارت کے ساتھ اپنی دعوت پیش کرتے تھے اس میں کمی آ جائے گی اللہ نے اپنے رسول کو تسلی دیتے ہوئے اور بالواسطہ کفار کو متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے پیغمبر! آپ کو اللہ نے نذیر بنا کے بھیجا ہے۔ دنیا میں اس سے پہلے بھی اللہ کی طرف سے نذیر آتے رہے ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ اہلِ دنیا نے کبھی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا انہوں نے خونِ جگر پی پی کر نہ صرف لوگوں کو سمجھایا بلکہ آنے والے خطرات سے انہیں آگاہ کیا انہیں اللہ کی ناراضگی سے ڈرایا ان کے بوسیدہ تمدن کی ناکامیوں سے انہیں خبردار کیا انہیں ان کے انجام کا آئینہ دکھاتے ہوئے ہوشیار کیا کہ اگر تم نے اپنا نظام نہ بدلا اور بنیادی اعتقادات تبدیل نہ کئے تو خود تمہارے اپنے اختلافات تمہارے لئے تباہی کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن ان کی امتوں نے بجائے ان کی قدر کرنے اور ان پر ایمان لانے کے انہیں قتل تک کرنے سے گریز نہیں کیا لیکن انہوں نے کبھی بھی اللہ کی دعوت اور وحی الٰہی کے پیغام میں کمی بیشی کرنے کا تصور بھی نہ کیا۔ آپ اگر مخالفت کا شکار ہو رہے ہیں تو یہ اس راستے کی سنت ہے اور یہ اس دنیا کی ریت ہے ٹھیک کہا کسی نے۔

زمانہ یوں ہی اپنے محسنوں کو تنگ کرتا ہے
وہ درسِ صلح دیتے ہیں یہ ان سے جنگ کرتا ہے

اور جہاں تک تعلق ہے مخالفین کے اندازوں اور گمانوں کا کہ شاید اللہ کا نبیؐ ان کی مخالفتوں سے تنگ آ کر اور ان کے تمسخر سے زچ ہو کر اپنی بات کہنے میں تامل کرے انہیں شاید اندازہ نہیں کہ اہلِ دنیا عیش و عشرت میں پل کر فوجوں کے جھرمٹ میں رہ کر اور تخت پر متمکن ہو کر اس قدر جرأت اور بے خوفی سے بات نہیں کرتے جس طرح اللہ کا نبی کرتا ہے۔ اللہ کے نبیؐ کے لہجے میں مسکینی اور عاجزی نہیں ہوتی وہ اللہ کی طرف بلاتا ہے تو اس کے لئے التماس نہیں کرتا بلکہ وہ بے نوا ہو کر بھی بادشاہوں کی سطوتوں کو اچھالتا ہے۔ وہ بادشاہوں کے دربار میں بھی بظاہر بے سروسامان اور قوت و حشمت سے تہی دامن ہوتا ہے لیکن اس کے لہجے میں وہ اعتماد اور تمکنت ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا فرستادہ ہے وہ بظاہر تنہا ہوتا ہے لیکن اللہ کے حصار میں ہوتا ہے۔ وہ بظاہر بے سہارا ہوتا ہے لیکن عناصرِ قدرت اس کے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام انتہائی بے سروسامان ہو کر بھی فرعون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے تھے اور فرعون ان سے مرعوب ہو ہو جاتا تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام درویشی اور مسکینی کی ایک نادر مثال تھے لیکن آپ نے حکمرانوں کے گریبانوں کو کھینچا بڑے سے بڑے حکمران کی برائیوں پر سرِ دربار نکیر فرمائی۔ اسی راستے میں اپنا سر کٹوایا لیکن آپ کے لہجے میں کبھی کمزوری نہ آئی۔ نبی کریم ﷺ چونکہ خاتم النبیین ہیں آپ کی بے خوفی اور جلالت شان کا تو پورا مکہ معترف تھا۔ اشرارِ قریش صحنِ حرم میں منڈلی جمائے بیٹھے ہوتے آپ ان کے سامنے نماز ادا فرماتے اور بارہا ان کے سامنے قرآن مجید پڑھتے اور انہیں نصیحت فرماتے۔ اور اگر کبھی کسی سرکش نے آپ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اللہ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔ ابوجہل نے ایک دن قسم کھالی کہ اب اگر محمدؐ نے میرے سامنے اگر اللہ کو سجدہ کیا تو میں اس کا سر کچل ڈالوں گا۔ دوسرے ہی روز آپ اپنے معمول کے مطابق آئے اور آپ نے اس کے سامنے نماز پڑھی ابوجہل یہ دیکھ کر بھڑک اٹھا چنانچہ جیسے ہی آپ سجدے میں گئے اس نے آگے بڑھ کر آپ پر حملہ کر دیا لیکن جیسے ہی آپ کے قریب پہنچا فوراً ہاتھ مارتا اور چیختا ہوا پیچھے ہٹا لوگوں نے حیران ہو کر پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا ہے اس نے کہا میں جیسے ہی محمدؐ کے پاس پہنچا تو میں نے آگ کے شعلے اور ہر طرف اور برچھے دیکھے جو میری طرف بڑھ رہے تھے پھر ایک اونٹ کو میں نے دیکھا جو منہ کھولے مجھے نگلنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ شخص مجھ پر حملہ کرتا تو فرشتے اس کے

Marfat.com

پرزے اڑا دیتے۔ پیغمبر کا طنطنہ اور لہجے کی قوت کبھی ماند نہیں پڑتی وہ مخالفتوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ نے اسے نذیر کے منصب پر فائز کیا ہے۔ نذیر کا کام ہے انذار کرنا، ڈرانا، ہوشیار کرنا، وارننگ دینا۔ یہ کام ظاہر ہے کہ مخالفین کے سامنے خوف زدہ لہجے میں نہیں کیے جا سکتے۔ اس امت کے اولیاء، صلحاء اور مصلحین پر آنحضرت ﷺ کا فیضان ہے کہ ان کا لہجہ کبھی سراسیمہ نہیں ہوتا۔ جہانگیر کے دربار میں بھی ان کی گردن نہیں جھکتی کیونکہ اللہ تعالیٰ انہیں ملت کے سرمائے کی حفاظت کے لئے اٹھاتا ہے۔ اقبال نے مجدد صاحب کے بارے میں اظہار عقیدت کرتے ہوئے ٹھیک کہا۔

وہ ہند میں سرمایہء ملت کا نگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

جن علماء کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ حق کی حفاظت کی بجائے باطل کے ساتھ سازگاری رکھتے ہیں اور ہر کرسی نشین کے سامنے ان کا سر جھکنے لگتا اور لہجے میں لکنت آ جاتی ہے اور اس کا علم و دانش باطل کی ترجمانی کرنا زیادہ پسند کرتا ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس صاحبِ علم کا تعلق علماء حق سے نہیں بلکہ اکبر کے نورتنوں سے ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَّكِيْلٌ - ''اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے'' اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ نے دعوت الی اللہ کے کام میں جو جانفشانیاں دکھائی ہیں وہ بھی اللہ کی نگاہ میں ہیں اور جو کچھ مخالفین نے کیا ہے اور کر رہے ہیں اللہ اس سے بھی واقف ہے۔ آپ نے اپنی ہمت سے بڑھ کر اس مقصد کے لئے جان کھپائی ہے اس لئے آپ اللہ کے یہاں سرخرو ہیں۔ رہی یہ بات کہ لوگ ایمان لانے میں کیوں پس و پیش کر رہے ہیں تو آپ کو اس پر پریشان نہیں ہونا چاہیئے لوگوں کو ایمان دینا یہ آپ کی ذمہ داری نہیں ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ مکہ کی مخالفت روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے بلکہ اب تو یہ مخالفت جارحیت کی شکل اختیار کر رہی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ان لوگوں نے حق کے مقابلے میں اپنے سینے بند کر لئے ہیں۔ اور دعوت ایک بند گلی میں پہنچ گئی ہے۔ پروردگار فرماتا ہے کہ حالات کیسے بھی ہوں آپ کو ان سے اثر قبول نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اللہ سب کا کارساز ہے وہ آپ کے لئے راستے کھولے گا اور آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ⑬

(کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ کہہ دیجئے کہ تم لے آؤ اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں اور بلا لو جن کو تم بلا سکتے ہو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔)

﴿سورۃ ھود: ۱۳﴾

مخالفین قرآن کو متبادل کلام پیش کرنیکا چیلنج

''ام'' حرف استفہام ہے۔ یہ جس طرح کسی بات کو پوچھنے کے لئے آتا ہے اُسی طرح اظہارِ تعجب کے لئے بھی آتا ہے یہاں اسی مقصد کے لئے آیا ہے۔ پروردگار تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عجیب بات ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کو نبی کریم ﷺ نے خود لکھ لیا ہے (گھڑ لیا ہے) کوئی اجنبی شخص یہ بات کہتا تو چنداں تعجب نہ ہوتا کوئی ایسا شخص یہ الزام لگاتا جو عربی زبان سے واقف نہ ہوتا تب بھی تعجب کی بات نہ ہوتی کیونکہ اجنبی آدمی آنحضرت ﷺ سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے آپ کے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر جو بھی کہتا اسے سنا جا سکتا تھا اسی طرح عربی سے نابلد آدمی قرآن کریم کو سننے کے بعد اپنی جہالت کے باعث اگر اس طرح کی بات کرتا تو کسی حد تک حق بجانب تھا لیکن مکہ کے رہنے والے عربی کے اداشناس اور آنحضرت ﷺ کی سیرت و کردار سے واقف آپ کے حالات سے آشنا جب یہ بات کہتے ہیں تو صرف تعجب ہی نہیں ہوتا بلکہ کہنے والوں کی بدنیتی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ مکہ میں رہنے والے بھی بالعموم ایک دوسرے سے واقف تھے اور نبی کریم ﷺ تو اس لحاظ سے بھی جانے پہچانے تھے کہ آپ عبدالمطلب کے پوتے تھے جو قبیلہ قریش کے سردار رہ چکے تھے پھر آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ چند دنوں کے بیرونی سفر کے سوا ان کے سامنے گزرا تھا۔ آپ کا بچپن، آپ کا لڑکپن، آپ کی جوانی اور آپ کی ڈھلتی ہوئی عمر سے سب اہلِ مکہ پوری طرح آشنا تھے۔ اور ساتھ ہی اس بات کے گواہ تھے کہ

Marfat.com

آپ کا بچپن دوسرے بچوں سے زیادہ پیارا آپ کا لڑکپن دوسرے لڑکوں سے زیادہ دل آویز اور آپ کی جوانی سب جوانوں سے زیادہ پاکیزہ اور آپ کی ڈھلتی ہوئی عمر دانش اور تجربے کی کسوٹی تھی۔ لیکن ان تمام ادوار میں کوئی دور بھی ایسا نہیں جسے آپ نے مکہ سے باہر گزارا ہو، آپ کی معاشرت مکہ کی معاشرت تھی، آپ کی زبان اہلِ مکہ کی زبان تھی، آپ کا علم اہلِ مکہ کی طرح سینہ بسینہ پھیلنے والی معلومات تک محدود تھا آپ اگرچہ سیرت و کردار میں ان سے بالکل مختلف اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک تھے لیکن جہاں تک علم و آگہی اور زبان دانی کا تعلق ہے آپ ان سے بالکل مختلف نہیں تھے لیکن پھر یہ کیا ہوا کہ چالیس سال پورے ہوتے ہی غارِ حرا کی تنہائی میں آپ پر اللہ کا پیغام اترا اور پھر دھیرے دھیرے نازل ہوتا چلا گیا اس کی ایک ایک سورت آپ نے لوگوں کے سامنے پڑھ کر سنانا شروع کی۔ جیسے جیسے قرآن اترتا گیا ویسے ویسے لوگوں کی حیرت بڑھتی گئی کہ اس کی زبان ان کی بولی جانے والی زبان سے بدرجہا فائق اس فصاحت و بلاغت ان کے بلغا اور فصحاء کو دنگ کر دینے والے اس کا ایک ایک جملہ دل میں ترازو ہو جانے والا، اس میں پیش کی جانے والی تعلیم انسانیت کا اعلیٰ ترین سرمایہ، اس کی دل آویزی اور چاشنی دلوں کو موہ لینے والی جبکہ ان کا ایک ایک فرد جانتا ہے کہ جس پیغمبر کی زبان سے یہ کتاب پڑھ کے سنائی جارہی ہے اس کی زبان سے چالیس سال کی عمر تک اس طرح کا کبھی ایک جملہ تک نہ سنا گیا، اس میں بیان کی جانے والی علمی باتوں کی کبھی اس پیغمبر کو ہوا تک نہ لگی تھی۔ اس میں جن تاریخی واقعات پر تبصرے کئے گئے ہیں ان کو عرب بھر میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ان لوگوں نے یہ کیسے کہہ دیا کہ اس قرآن کو محمد ﷺ نے گھڑ لیا ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ ان کی اس بات سے جس طرح تعجب ہوتا ہے اسی طرح ان کی بدنیتی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے اتری ہے اس کے باوجود اس کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔ مزید فرمایا کہ چلئے اگر تمہیں اپنی بات پر اصرار ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل نہیں ہوئی تو پھر اے پیغمبر ان سے کہے کہ اگر یہ کتاب واقعی میں نے لکھی ہے اور تمہیں اس پر یقین ہے تو تم بھی تو میری طرح عرب ہو تمہارے اندر بڑے بڑے شعراء موجود ہیں، خطباء کی کوئی کمی نہیں، زبان کے تیور شناس ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں۔ ان سب کو ایک جگہ بٹھاؤ اور انہیں پابند کرو کہ وہ اس کتاب جیسی ہی دس سورتیں گھڑ کر لے آئیں جس طرح تم کہتے ہو کہ محمد نے یہ قرآن گھڑ لیا ہے۔ پھر انہی میں ایک کمیٹی بنا دو جو قرآن کریم اور تمہاری گھڑی ہوئی سورتوں میں تقابل کر کے دیکھے۔

قرآن کریم نے یہ چیلنج پہلے بھی مختلف جگہ دیا۔ پہلے انہیں قرآن جیسی ایک کتاب لکھ کر لانے کو کہا گیا پھر انہیں قرآن جیسی دس سورتیں بنانے کا چیلنج دیا گیا پھر آخر میں قرآن جیسی ایک آیت لانے کو کہا گیا لیکن ہر چیلنج کے جواب میں عرب سورماؤں کی طرف سے مکمل خاموشی رہی جبکہ انہوں نے اسلامی دعوت کو روکنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کئے۔ مکہ معظمہ میں آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ کی زندگی اجیرن بنا دی گئی نہ انہیں قرابت کا لحاظ رہا نہ ہم قوم ہونے کا۔ ہمسائیگی کے رشتے بھی توڑ دیئے گئے کوئی قابلِ ذکر تعلق بھی انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ روانہ رکھا حتی کہ ان کا معاشرتی بائیکاٹ کر کے تین سال تک انہیں پتے کھانے اور چمڑے چبانے پر مجبور کر دیا گیا جب مسلمان اپنی جان بچا کر مدینہ منورہ آنے میں کامیاب ہو گئے تو انہوں نے اسی دین کو ناکام کرنے کے لئے پے در پے مدینہ پر حملے کئے۔ تقریباً نواسی لڑائیوں میں مسلمانوں کو ہر طرح کی ہزیمت پہنچانے کی کوشش کی۔ اسلام کے خلاف ان کے عزائم کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ خود انہوں نے اس کی مخالفت میں ہر طرح کا دکھ برداشت کیا کتنے لوگ ان کے مارے گئے، کتنے بیٹے ذبح ہوئے، کتنا مال برباد ہوا حتی کہ فتح مکہ کے بعد اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔ جن لوگوں نے مخالفت میں اس قدر جان ماری ہو ان سے اگر ممکن ہوتا تو وہ اس چیلنج کا جواب دینے سے کیوں گریز کرتے کیونکہ یہ ان کے لئے سب سے آسان کام تھا وہ عربی زبان کے پوری طرح شناور تھے، اس کی نوک پلک سے آگاہ تھے اس کے تیور شناس تھے ان میں سے ایک سے ایک بڑا زبان کا ماہر موجود تھا لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ پھبتیاں کسنا، الزامات لگانا اور تمسخر اڑانا آسان ہے۔ لیکن قرآن کریم کا جواب لکھنا ناممکن ہے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔

اس چیلنج میں ایک اور بات بھی شامل تھی کہ تم نے آج تک جن جن قوتوں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے جن میں تمہارے بت بھی ہیں اور جنات بھی۔ فرشتے بھی ہیں اور مختلف دیوتا بھی۔ تمہارا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تمہاری مدد کو آتے ہیں تو انہیں آج خصوصیت سے اپنی مدد کے لئے بلاؤ اور ان سے کہو یہ ہمارے اور تمہارے لئے انتہائی نازک موقع ہے اگر ہم اس میں ناکام ہوتے ہیں تو جس طرح ہمارا قومی تفاخر اور ہمارے دین کی صداقت تباہ ہو جاتی ہے اسی طرح تمہاری خدائیاں بھی باقی نہیں رہتیں۔ اگر ہمارے لئے نہیں تو اپنی خدائیاں باقی رکھنے کے لئے ہماری مدد کرو۔ آخر میں فرمایا کہ اگر تم اپنے ان دعوؤں میں سچے ہو کہ یہ قرآن کریم اللہ کی کتاب نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کی تصنیف ہے اور اللہ وحدہ لاشریک نہیں بلکہ اس کی خدائی میں اور بھی شریک ہیں جو ہمیشہ ہماری مدد کرتے ہیں تو پھر تمہارے لئے یہ نادر موقع ہے کہ قرآن کریم کے اس چیلنج کو قبول کرو اور اس طرح سے اپنی صداقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دو۔

Marfat.com

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۞

(پس اگر وہ تمہاری بات کو قبول نہ کریں تو پھر خوب جان لو کہ یہ قرآن اللہ کے علم ہی سے اترا ہے اور یہ کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں ہے تو کیا تم اسلام لاتے ہو۔)

﴿سورة هود : ١٤﴾

مخالفین قرآن پر اتمام حجت

اس آیت کریمہ میں معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ مضمون ہی کو آگے بڑھایا جا رہا ہے لیکن اس میں خطاب مسلمانوں سے نہیں مشرکین سے ہے۔ مشرکین سے براہ راست خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر یہ تمہارے شفعاء و شرکاء ایسے نازک موقع پر بھی تمہاری مدد کے لئے نہیں اُٹھتے جبکہ اب تمہارا ایک ہی سہارا ہے کہ جن کو تم نے اللہ کا شریک ٹھہرا رکھا ہے وہ تمہاری مدد کے لئے آئیں اور قرآن کریم کے چیلنج کو مؤثر جواب کے ساتھ ناکام کر دیں لیکن اگر ادھر سے خاموشی رہتی ہے اور تمہاری درخواست کا کوئی جواب نہیں آتا تو پھر اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اسے کسی انسان نے نہیں لکھا بلکہ یہ اللہ کے علم کا فیضان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکا جواب لانا کسی مخلوق کے بس کی بات نہیں کیونکہ مخلوق دوسری مخلوق کے علم کا مقابلہ تو کر سکتی ہے لیکن خالق کے علم کا مقابلہ سراسر جسارت اور حماقت کے سوا کچھ نہیں اور دوسری اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر تمہارے عقیدے کے مطابق تمہارے شفعاء اور شرکاء کی کوئی حقیقت ہوتی تو آج وہ اس نازک وقت میں تمہارے پشت پناہ ہوتے۔ تمہاری ہر طرح کی مدد کے لئے کھڑے ہوتے وہ کبھی بھی تم پر ناکامی کا داغ نہ لگنے دیتے۔ لیکن ان کی طرف سے جواب نہ ملنا ایک ہی معنیٰ رکھتا ہے کہ ان کا کوئی وجود نہیں یہ سراسر تمہارا وہم ہے تم نے بلاوجہ اللہ کے شریک بنا رکھے ہیں جبکہ کائنات میں وہ اپنی ذات اور صفات میں وحدہ لاشریک ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ تمہارے دونوں دعوؤں کی ناکامی کے بعد عقل اور دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ تم قرآن کریم کی صداقت پر ایمان لے آؤ۔ اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کر لو اس لئے پوچھا گیا ہے کیا تم اب بھی اسلام قبول کرتے ہو کہ نہیں۔ اس میں تشویق و ترغیب کا پہلو بھی ہے اور زجر و ملامت کا بھی۔ تمہاری طبیعتوں میں اگر ذرا بھی سلامتی ہے تو آگے بڑھ کر اسلام کی رسی کو پکڑ لو اور اگر تمہیں اب بھی انکار ہے تو پھر سوچ لو کہ غلط بات پر قائم رہنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۞

(جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کے اعمال کا بدلہ یہیں چکا دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے دنیا میں کیا کرایا سب ضائع ہو جائے گا اور باطل ہے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔)

﴿سورة هود ١٥، ١٦﴾

قرآن کریم کی معجز بیانی اور آنحضرت ﷺ کی دلوں میں اتر جانے والی دعوت و نصیحت کے باوجود جب آدمی مشرکین مکہ کی کفر پر استقامت اپنی جہالت پر ہٹ دھرمی آپ کی انتہائی مؤثر دعوت کے مقابلے میں ہرزہ سرائی اور طغیانِ جاہلیت کو دیکھتا ہے تو حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔ پتھر پر بھی پانی کی بوند بوند بھی گرتی رہے تو سوراخ بن جاتا ہے۔ قرآن کریم کی وضاحت کے مطابق بعض پتھر تو اللہ کے خوف سے لڑھک جاتے اور پھٹ جاتے ہیں تو کیا انسانوں کے دلوں کی سنگینی پتھروں سے بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے انسانی دلوں اور دماغوں میں قبولیت کا مادہ رکھا ہے اور وہ کبھی نہ کبھی اثر ضرور قبول کرتا ہے۔ پیش نظر آیت کریمہ میں اسی حیرت کا جواب دیا گیا ہے اور اسی عقدہ کی مشکل کشائی کی گئی ہے۔

دنیا سے متعلق اسلامی تصور

انسان کا تعلق دو دنیاؤں سے ہے ایک یہ دنیا جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اور ایک وہ دنیا جو برزخی زندگی گزارنے کے بعد اس دنیا کی تباہی اور پھر بحالی کے بعد وجود میں آئے گی یہ دونوں دنیا ایک ہی خالق کی تخلیق ہیں اور دونوں سے انسان کا واسطہ اختیاری نہیں لازمی ہے اور اگر دونوں

Marfat.com

کے صحیح تصورات کو قبول کرلیا جائے تو ایک دنیا دوسری دنیا کا پیش خیمہ بن جاتی ہے لیکن اگر اس پہلی دنیا کو اس کی قباحتوں سمیت قبول کرلیا جائے تو پھر اس دنیا میں رہتے ہوئے اور اس دنیا کو قبول کر لینے کے بعد دوسری دنیا کا کوئی تصور باقی نہیں رہتا دونوں کے درمیان ایسا بُعد پیدا ہوتا ہے کہ اس دنیا میں رہنے والا دوسری دنیا کا تصور کرتے ہوئے بھی گرانی محسوس کرتا ہے۔

مزید برآں یہ بات بھی ہے کہ دونوں کے تصورات کے نتائج بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں برعکس بھی ہیں۔ اقبالؒ نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

من کی دنیا مَن کی دنیا سوزو مستی جذب و شوق
تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دنیا ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تَن کی دُنیا چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

جو شخص حیاتِ دنیا کو اپنی منزل بنالیتا ہے اور حیاتِ آخرت کو محض خواب وخیال یا ایک فرسودہ کہانی سمجھتا ہے اس کے تصورات میں رفتہ رفتہ ایسی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں ایک وقت آتا ہے کہ نہ صرف اخروی زندگی دم توڑ جاتی ہے بلکہ انسانیت بھی اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہے اسے وہ چیزیں اپیل کرتی ہیں اور وہ تصورات اسے قابلِ قبول معلوم ہوتے ہیں جس سے اس کی حیوانیت کو غذا ملتی ہے۔ وہ ایک حیوان کی طرح ہر وقت اپنے معدے کے طواف میں لگا رہتا ہے۔ کھانا پینا اس کی زندگی بن جاتا ہے بہتر سے بہتر غذا، بہتر سے بہتر مشروبات، بہتر سے بہتر لباس، بہتر سے بہتر سواری اور بہتر سے بہتر منصب اور بہتر سے بہتر رہائش علی ہذا القیاس دنیا کی تمام ضرورتیں، سہولتیں، آسائشیں حتیٰ کہ تعیشات اس کی زندگی بن جاتے ہیں۔ اسے موت بھی یاد نہیں آتی موت کے بعد کیا ہوگا یہ بات بھی اس کی سوچ کا حصہ نہیں بنتی جو لوگ مرنے کے بعد کی باتیں کرتے ہیں وہ انہیں دقیانوسی خیال کرتا ہے۔ اس کے لئے انسانی رشتے بھی ایک بوجھ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مروت وخیر خواہی، ہمدردی اور اعانت یہ اس کے نزدیک فرسودہ باتیں معلوم ہوتی ہیں اس کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی حقیقت عملیت پسندی ہے۔ عقل انسان کی حقیقی رہنما ہے خواہشات عقل کو راستہ دکھاتی ہیں اخلاقیات پرانے وقتوں کی باتیں ہیں اب انسان انسان کے اتنا قریب آ گیا ہے کہ درمیان میں رشتوں کو اور اخلاقی بندھنوں کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ آج کا کام لوگوں کی مشکلات شمار کرنا نہیں کیونکہ اس سے خواہ مخواہ صحت پر اثر پڑتا ہے۔ آج کا کام دولت شمار کرنا ہے یہ وہ تن کی دنیا ہے جس میں سود و سودا اور مکر و فن کی مکمل اجازت ہے۔

مشرکینِ مکہ حیاتِ دنیا کے باسی تھے یہی ان کا ہدف اور یہی ان کی منزل تھی اسی کی کامرانیاں ان کی کامرانیاں تھیں اسی کے دکھ ان کے دُکھ تھے۔ وہ اس دنیا کی ایک ایک خصوصیت کو اپنا چکے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں دین و ایمان کی باتیں موت اور اس کے بعد کی زندگی کے تصورات پھر زندگی بھر کے اعمال کی جوابدہی اور اس پر جزاء وسزا کا ترتب ایسی باتیں تھیں جو نہ ان کے دماغ میں اترتی تھیں نہ حلق سے نیچے جاتی تھیں۔ جس طرح مردار خور جانور کو مردار سے نفرت نہیں سکھائی جاسکتی، درندے کو درندگی کی برائی نہیں سمجھائی جاسکتی، اسی طرح دنیا کو منزل بنالینے والے کو دنیا کی بے ثباتی، ناپائیداری سے آگاہ کرنا آسان نہیں جو شخص دنیا میں سب کچھ حاصل کر لینا اپنا فرض سمجھتا ہے اور اس راستے میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری سمجھتا ہے چاہے وہ رکاوٹیں انسانیت کا سرمایہ کیوں نہ ہوں، غریب کی زندگی بھر کی کمائی کیوں نہ ہوں، قوم کی عزت وافتخار اور غیرت وحمیت کا اثاثہ کیوں نہ ہو ایسے شخص کا راستہ بدلنا اور اسے اخلاقی اطوار کا پابند بنانا ناممکن بات ہے۔ کیا ہم دیکھتے نہیں کہ جب بھی دنیا کی پرستار غالب قوتوں نے مظلوم ومقہور انسانی بستیوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اگر وہ قوتیں علم وفن سے ناآشنا ہیں تو انہوں نے انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنانے سے دریغ نہیں کیا اور اگر وہ قوتیں سائنس اور ٹیکنالوجی کی قوت سے مالا مال ہیں تو انہوں نے لمحوں میں انسانی بستیاں تاراج کی ہیں، چشم زدن میں ہزاروں انسان پھونک ڈالے ہیں۔ انسانی وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے ملک اجاڑ دیئے ہیں نہ ان کی جارحیت کے سامنے وہ ملیں اور کارخانے ٹھہر سکے ہیں جہاں سے انسانوں کو وسائل رزق میسر آتے تھے اور نہ کشتِ دہقاں کا وجود باقی رہا ہے۔ مشرکین اپنے حالات کے مطابق اسی دنیا کی کشتی پر سوار تھے ان کے نزدیک آخرت ایک بہلاوے کی بات تھی۔ عذاب وعقاب کی باتیں ان کے لئے مذاق کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں گے اور قرآن کریم کو اللہ کی کتاب مان کر اپنی زندگیوں میں تبدیلی پیدا کریں گے خود فریبی کے سوا کچھ نہیں چنانچہ جو سعید روحیں تھیں جنہیں دنیا کی محبت نے بالکل اندھا نہیں کیا تھا

Marfat.com

رفتہ رفتہ ایمان لے آئیں لیکن جو قبولیت حق کے جذبے سے بالکل محروم ہو چکے تھے وہ رفتہ رفتہ یا تحلیل ہو گئے یا اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

ایک وضاحت

قرآن کریم حیات دنیا کے ایسے ہی پرستاروں کا نقشہ کھینچ کرتا ہے کہ یہ لوگ دین کے کام کے تو کبھی نہیں بنتے البتہ ان میں بعض ایسے لوگ ہوتے ہیں جو دنیا میں ڈوب کر بھی بعض رفاہی کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض دفعہ لوگوں کے کام بھی آتے ہیں ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں ہم ان کی محنتوں کا پورا صلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں۔ انہوں نے جن مقاصد کی خاطر کچھ بھلے کام کئے ہوتے ہیں ہم ان مقاصد کو پورا کر دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے کاموں کی شہرت ہو ہمیں نیکی سے یاد کیا جائے مرنے کے بعد بھی ہمارا نام زندہ رہے ہماری اولادیں ہم پر فخر کرتی رہیں ہم ان کے ان تمام مقاصد کو پورا کر دیتے ہیں ان کا نام تاریخ کا حصہ بنا دیا جاتا ہے لیکن انہوں نے چونکہ یہ کام اللہ کی رضا کے لئے نہیں کئے اور ان کے کسی کام میں آخرت کا کوئی تصور نہیں رہا بلکہ ہر خواہش اور مقصد کے پیچھے دنیا ہی رہی تو ہم بھی ان کی ہر خواہش دنیا ہی میں پوری کر دیتے ہیں اور آخرت میں انہیں مکمل طور سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ آخرت میں انہیں کسی عمل کا صلہ نہیں ملے گا انہیں نے دنیا میں جو کچھ کیا چونکہ دنیا کے لئے کیا اس لئے دنیا ہی میں اس کا تذکرہ رہ گیا اور آخرت میں ان کا ہر کام ملیامیٹ کر دیا گیا ان کی نیت چونکہ ہمیشہ باطل رہی اور کبھی بھی انہوں نے حق کا راستہ نہ دیکھا اس لئے جو کچھ وہ کرتے رہے وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ سنا ہے کہ ابو جدعان نے بہت سے بھلائی کے کام کئے تھے تو کیا اللہ اس کی مغفرت نہیں فرمائے گا؟ تو آپؐ نے فرمایا نہیں۔ اس لئے کہ اس نے زندگی بھر کبھی نہیں کہا تھا کہ (یا اللہ تو مجھے بخش دے) یعنی اس کا ہر کام دنیا کے لئے تھا اور اللہ کی حاکمیت اور اس کی اصل حیثیت کو اس نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا ورنہ وہ کبھی نہ کبھی اسے ضرور پکارتا۔ ایسی صورتحال میں اگر اس کی مغفرت ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کے کارناموں کا اسے وہ صلہ دیا جا رہا ہے جس کا اس نے کبھی مطالبہ نہیں کیا تھا۔

(معارف القرآن کے محترم مصنف کے خیال میں یہ زیادہ راجح اور واضح بات ہے کہ یہ آیت ان لوگوں سے متعلق ہے جو اپنے اعمال صالحہ کو صرف دنیا کے فوائد دولت، عزت، صحت وغیرہ کی نیت سے کرتے ہیں خواہ ایسا کرنے والے کافر ہوں جو آخرت کے قائل ہی نہیں، یا مسلمان ہوں جو زبان سے آخرت کے قائل ہیں مگر عمل میں اُن کی فکر نہیں رکھتے، بلکہ ساری فکر دنیا ہی کے فوائد سے وابستہ رکھتے ہیں، حضرات مفسرین میں سے مجاہد، میمون بن مہران، معاویہ رضی اللہ عنہم نے اسی کو اختیار فرمایا ہے،

رسول کریم ﷺ کی مشہور حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں جس چیز کی نیت کرتا ہے، اس کو وہی ملتی ہے، جو دنیا کی نیت کرتا ہے اس کو دنیا ملتی ہے، جو آخرت کی نیت کرتا ہے آخرت ملتی ہے، جو دونوں کی نیت کرتا ہے اس کو دونوں ملتی ہیں، تمام اعمال کا مدار نیت پر ہونا ایک ایسا اصول ہے جو ہر ملت و مذہب میں تسلیم کیا گیا ہے، (قرطبی)

اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ان لوگوں کو لایا جائے گا جو دنیا میں عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ لوگوں کی نظر میں ان کی عزت ہو، ان سے کہا جائے گا کہ تم نے نماز پڑھی، صدقہ خیرات کیا، جہاد کیا، قرآن کی تلاوت کی مگر یہ سب اس نیت سے کیا کہ تم نمازی اور سخی اور غازی اور قاری کہلاؤ تو جو تم چاہتے تھے وہ تمہیں مل گیا، دنیا میں تمہیں یہ خطابات مل چکے اب یہاں تمہارے ان اعمال کا کوئی بدلہ نہیں اور سب سے پہلے جہنم میں ان لوگوں کو ڈالا جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہؓ یہ حدیث نقل کر کے رو پڑے اور فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا سے اس حدیث کی تصدیق ہوتی ہے۔

صحیح مسلم میں بروایت انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے، مؤمن جو نیک کام کرتا ہے اُس کو دنیا میں بھی کچھ بدلہ ملتا ہے اور آخرت میں ثواب ملتا ہے، اور کافر (چونکہ آخرت کی فکر ہی نہیں رکھتا اس لئے اُس کا حساب دنیا ہی میں بھگتا دیا جاتا ہے، اس کے نیک اعمال کے بدلہ میں دنیا کی دولت، عزت، صحت، راحت اس کو دیدی جاتی ہے یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا جس کا معاوضہ وہاں پائے۔

Marfat.com

تفسیر مظہری میں ہے کہ مؤمن اگر چہ دنیا کی فلاح کا بھی خواہش مند ہوتا ہے مگر آخرت کا ارادہ غالب رہتا ہے اس لئے اس کو دنیا میں بقدر ضرورت ہی ملتا ہے اور بڑا معاوضہ آخرت میں پاتا ہے۔

حضرت فاروقِ اعظمؓ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے مکان پر حاضر ہوئے تو سارے گھر میں چند گنی چُنی چیزوں کے سوا کچھ نہ دیکھا تو آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ دُعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو بھی دنیا کی وسعت عطا فرماویں، کیونکہ ہم فارس و رُوم کو دیکھتے ہیں وہ دُنیا میں بڑی وسعت اور فراخی میں ہیں حالانکہ وہ خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے، آنحضرت ﷺ تکیہ سے کمر لگائے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ کے یہ الفاظ سن کر سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا، اے عمر! تم اب تک اسی خیال میں پڑے ہو، یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی نیکیوں کا بدلہ اُنہیں دُنیا ہی میں دے دیا گیا ہے، (مظہری)

جامع ترمذی اور مسند احمد میں بروایتِ انسؓ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کی نیت اپنے اعمال میں طلب آخرت کی ہوتی ہے اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کے دِل کو غنی کر دیتا ہے اور اس کی ضروریات کو پورا فرما دیتے ہیں اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے، اور جس شخص کی نیت طلب دنیا کی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ محتاجی اس کے سامنے کر دیتے ہیں کہ اس کی حاجت کبھی پوری ہی نہیں ہوتی کیونکہ ہوسِ دُنیا اس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ ایک حاجت پوری ہونے سے پہلے دوسری حاجت سامنے آجاتی ہے اور بے شمار فکریں اس کو لگ جاتی ہیں اور ملتا صرف وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے لکھ دیا ہے،

آیت مذکورہ میں جو یہ ارشاد ہوا ہے کہ دنیا کا ارادہ کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دنیا ہی میں پورا دیدیا جاتا ہے، اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ باوجود دنیا کا ارادہ کرنے اور کوشش کرنے کے دنیا میں بھی ان کا مطلب پورا نہیں ہوتا اور بعض دفعہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیت میں اس جگہ اجمال ہے اس کی پوری تفصیل سورۂ اِسراء کی اس آیت میں ہے، جس میں فرمایا، مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ، یعنی جو شخص دنیا ہی کا ارادہ کرتا رہتا ہے ہم اس کو دنیا ہی میں نقد دے دیتے ہیں، مگر یہ دینا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، اوّل یہ کہ جس قدر دینا چاہیں اُتنا ہی دیتے ہیں ان کی مانگ اور طلب کے برابر دینا ضروری نہیں، دوسرے یہ کہ صرف اُسی شخص کو دیتے ہیں جس کو دینا بتقاضائے حکمت مناسب سمجھتے ہیں ہر ایک کو دینا ضروری نہیں)

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۚ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٧﴾ ﴿سورۃ ھود: ١٧﴾

(کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک بینہ پر ہے پھر اس کے بعد اس کی طرف سے ایک گواہ بھی آجاتا ہے اور اس کے پہلے سے موسیٰ کی کتاب رہنما اور رحمت کی حیثیت سے موجود ہے اور (وہ جو نورِ بصیرت سے محروم ہیں دونوں یکساں ہو جائیں گے؟) یہی لوگ ہیں جو اس پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں گے جماعتوں میں سے ان کا موعود ٹھکانہ بس دوزخ ہے۔ پس اے مخاطب! تم اس کے باب میں کسی شک میں نہ پڑو۔ یہی حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لیکن اکثر لوگ اس کو نہیں مانتے۔)

تنبیھہ سے مراد بات

گزشتہ آیت کریمہ میں قرآن کریم نے ایک نہایت حکیمانہ بات سے پردہ اُٹھایا تھا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسی کے دوسرے پہلو کو بیان فرما کر اس حکمت کو مکمل فرمایا گیا ہے۔ گزشتہ آیت کریمہ میں ہمیں یہ زریں ہدایت عطا فرمائی ہے کہ اللہ کی کتاب سے تعلق اور اس سے استفادہ اور اللہ کے قرب کی خواہش ایسی پاکیزہ خواہشیں ہیں جو ہر دل میں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ انسان کے دل و دماغ کو اللہ نے نہایت صالح، نہایت دور رس اور نہایت پاکیزہ بنایا ہے۔ اگر ان کی پاکیزگی کی حفاظت کی جائے تو یہ اس آنکھ کی طرح جو ہر طرح کے غبار اور ہر طرح کی آلودگی سے محفوظ ہو نہایت آسانی سے راہ ثواب کو پہچانتے اور اپنے اندر اس کی تڑپ محسوس کرتے ہیں لیکن اگر دل میں حبِ دنیا کا زہر اتر جائے اور عقل اسی کی تعمیل میں رات دن تانا بننے لگے اور اس کی صلاحیتیں دنیا طلبی اور اس کے لئے نئے نئے مواقع پیدا کرنے کے لئے ہمہ تن مصروف رہیں تو ایسے دل و دماغ میں اللہ کا تصور تو بہت دور کی بات

Marfat.com

صلاحیتوں کو بروئے کار لانا اور عناصرِ قدرت کا اس کا ہم رکاب ہونا ان میں سے ایک ایک بات حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کی خبر دے رہی ہے کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی خالق ہے اس کی تخلیق بے مقصد نہیں اس نے یہ کارخانہ محض کھیل کود کے لئے نہیں پیدا کیا۔ انسان کی خلافت ارضی محض ایک اعزاز نہیں ایک ذمہ داری ہے۔ انسان کو عقل و شعور اور قوت امتیاز دے کر اس ذمہ داری کے منصب پر فائز کرنا بے سبب نہیں۔ ان میں سے ہر بات کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کو زندگی گزارنے کا اللہ کی طرف سے ایک طریقہ عطا فرمایا جائے اسے ایک آئین و قانون دیا جائے اسے آداب زندگی سکھائے جائیں اور انکار کرنے والوں اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کے لئے حدود و تعزیرات کا ایک قانون نافذ کیا جائے یہ وہ باتیں ہیں جن کی طرف ضمیر خود بخود رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کی تائید کسی بات سے نہ ہوتی تو آہستہ آہستہ یہ نور مایوسیوں میں ڈوب جاتا چنانچہ اللہ کی طرف سے ایک گواہ آیا وہ گواہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی، قرآن کریم، جبرائیل امین اور وحی الٰہی کے مجموعے کا نام بھی ہے اور ان میں سے ہر ایک کا نام بھی۔ کیونکہ ان سب کا کام انسان کے سامنے وہ گواہی پیش کرنا ہے جو اس کے قلب و ضمیر کے لئے رہنمائی کا فریضہ ادا کرے۔ چنانچہ جبریل امین وحی الٰہی کی صورت میں قرآن کریم لے کر آئے جو قیامت تک آنے والے انسانوں کی گمراہیوں کا مکمل علاج اور تاریکیوں میں روشنی کا سامان ہے اور نبی کریم ﷺ نے اپنی شبانہ روز محنت سے قرآن کریم کی ایک ایک بات کو اللہ کے بندوں تک پہنچایا اس کے حقائق واضح کئے، دلائل سے ان کو ثابت کیا اور پھر جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بعد ایک قطعہ زمین مہیا فرمایا آپ نے اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی اور ایک بہت بڑے علاقے پر اللہ کے قانون کو نافذ کر دیا۔

ہر دور میں حق پر گواہی

اسی آیت میں مزید فرمایا گیا کہ جس طرح اس دور کے لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے قرآن اور صاحب قرآن کو گواہ بنا کے بھیجا ہے اسی طرح کئی صدیاں پیشتر اس وقت بھی مخلوق کے سامنے اللہ تعالیٰ نے اسی طرح ایک گواہ بھیجا تھا جسے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ اس دور کی دنیا کے لئے امام اور رحمت بن کے آئی تھی۔ امام ہدایت اور ہادی کا ہم معنیٰ ہے۔ یعنی جس طرح تورات اہلِ کتاب کے لئے رہنما بن کے آئی اسی طرح مسلمانوں کے لئے قرآن کریم بھی امام اور رحمت بن کے آیا۔ اللہ کی رحمت نے ہر دور کے انسانوں پر یہ کرم فرمایا کہ انہیں عقل و شعور اور قوت امتیاز دے کر اس کے سپرد نہیں چھوڑ دیا بلکہ ہر دور میں اس کے کتابیں اور پیغمبر بھی آئے اور انہوں نے گواہی کا فرض ادا کیا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے انسانوں کے لئے اللہ نے جس طرح قرآن اور صاحب قرآن کو گواہ بنایا ہے اسی طرح ان کے سامنے پہلے سے ایک گواہی تورات اور موسیٰ علیہ السلام کی شکل میں موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے جس طرح افراد افراد پر گواہ ہوتے ہیں اسی طرح تاریخ میں قومیں قوموں پر گواہی دیتی ہیں اور یہ گواہی ایسی ہے جس کا انکار اہلِ علم و دانش کے لئے ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ کیونکہ افراد تو اپنی گواہی میں ممکن ہے کہ کوئی سمجھوتہ کر لیں لیکن قومیں کبھی بھی اس طرح کی کسی کمزوری کا ارتکاب نہیں کر سکتیں اور نہ ان کے لئے ان کا امکان ہوتا ہے۔ اس لئے قوموں کی گواہی سب سے اہمیت کی حامل چیز سمجھی جاتی ہے چنانچہ اس گواہی کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ اندازہ کرو کہ کچھ لوگ تو وہ ہیں کہ جن کا نورِ فطرت زندہ ہے، ضمیر کی آواز مردہ نہیں ہوئی۔ قرآن کریم کی گواہی نے انہیں مزید قوت عطا فرمائی ہے اور اہلِ کتاب کی گواہی بھی ان کی پشت پر ہے اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جن کا نورِ فطرت بجھ چکا ہے اس لئے وہ کسی روحانی اور آسمانی گواہی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تو کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ دیانت کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے ایمان صرف ان کا مقدر ہوگا جن کا ضمیر زندہ ہے اور جن کا نورِ فطرت سلامت ہے اس لئے اس آیت میں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اپنے انکار پر قائم رہے اور جنہوں نے کسی بات سے فائدہ نہیں اٹھایا چاہے وہ چند افراد ہوں چاہے دنیا کی بڑی بڑی قومیں۔ اہلِ دنیا کو کان کھول کر سن لینا چاہئے کہ آگ ان کا ٹھکانہ ہے۔ اور اس میں کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہئے یہ وہ حق ہے جو اللہ کی جانب سے آ چکا ہے اگر دنیا کی اکثریت بھی اس حق کو قبول کرنے سے انکار کرے تو ان کے افراد کی تعداد نہیں دیکھی جائے گی کہ اتنی بڑی تعداد کو کیسے جہنم میں جھونک دیا جائے بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ انہوں نے کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یعنی اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور اس عزیز ذات کی عزت کو چیلنج کیا ہے جس نے سب کو عزتیں عطا فرمائی ہیں اور اس کی قدرت کا مذاق اڑایا ہے۔ جس کے لشکروں کی تعداد کو کوئی نہیں جانتا اور جس کی کوئی معمولی مخلوق اگر اس کے حکم سے سزا دینے پر آ جائے تو کبھی سونامی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کبھی پاکستان میں زلزلے کی۔

Marfat.com

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ؕ اُولٰٓئِكَ یُعْرَضُوْنَ عَلٰی رَبِّهِمْ وَیَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ كَذَبُوْا عَلٰی رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ ﴿سورة هود:۱۸۔۱۹﴾

(اور کون زیادہ ظالم ہے ان لوگوں سے جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا۔ یہی لوگ پیش کئے جائیں گے اپنے رب کے سامنے اور گواہ گواہی دیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے۔ آگاہ رہو کہ اللہ کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہی لوگ آخرت کے منکر تھے۔)

گزشتہ آیت کریمہ سے ہمیں یہ روشنی ملی ہے کہ انسان کو اللہ نے جس سعادت پر پیدا فرمایا ہے وہ اس کی فطرت کا نور اور اس کا زندہ ضمیر ہے۔ جس نے اسے باقی رکھا اسے زندگی کے سفر میں کسی دشواری یا گمراہی سے اولاً تو واسطہ نہیں پڑتا اور اگر پڑے بھی تو اللہ کا دیا ہوا یہ نور اس کے راستوں کو روشن رکھتا ہے۔

نورِ فطرت کی حفاظت

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گمراہیوں کے ہجوم اور شیطان کے حملوں میں اس بات کا زیادہ امکان نہیں رہتا کہ فطرت کا نور علیٰ حالہ قائم رہے گا۔ اس لئے پروردگار نے انسانوں پر کرم فرمایا کہ اس نے یکے بعد دیگرے رسول بھیجے اور کتابیں اتاریں۔ ان میں سے ہر رسول اپنی دلآویز شخصیت، اپنے بے عیب کردار اور اللہ کی تائید و نصرت سے حجت اللہ کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر رسول اپنے بعد کے آنے والے کیلئے گواہ کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اس کی دعوت آنے والے رسول کی دعوت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس کی شخصیت کے طور اطوار آنے والے رسول کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس طرح سے دعوت الی اللہ کا کام اپنے مدعوین کیلئے ایک جانی پہچانی حقیقت بن جاتا ہے۔ اس کے قبول کرنے سے صرف وہ لوگ محروم رہتے ہیں جو نہ صرف نورِ فطرت سے محروم ہوتے ہیں بلکہ اس کے اندر ہر انسانی قدر موت کا شکار ہو چکی ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کے نمایاں اوصاف پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بیان کئے جا رہے ہیں۔

افترا کی نوعیت

ان اوصاف میں سے سب سے پہلا وصف جو ان بدنصیبوں کا بیان کیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے یعنی اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے تھے جن کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض تو توں کو اللہ کا شریک بنا رکھا تھا اور دعویٰ یہ تھا کہ اللہ نے خود انہیں اپنے اختیارات میں شریک کیا ہے اور ہمیں ان کی بندگی بجا لانے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے ایک خانہ ساز شریعت تیار کر رکھی تھی اور اسے بھی وہ اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ تحلیل و تحریم جو سراسر اللہ کی صفت اور اس کا حق ہے وہ انہوں نے نہ جانے کس کس کے سپرد کر رکھی تھی اور اس میں کسی تبدیلی کیلئے تیار نہیں تھے۔ شعائر اسلام کے بارے میں انہوں نے خود سے کچھ آداب بنا رکھے تھے اور ان کا بجا لانا دین کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔ جب انہیں اس پر ٹوکا جاتا تو وہ اسے بھی اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ بعض ظالموں نے آج کے روشن خیالوں کی طرح نہایت خطرناک مؤقف اختیار کر رکھا تھا کہ اللہ نے انسان کو زندگی کے فیصلے کرنے میں مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ مذہب کا تعلق صرف اللہ کو یاد کر لینے کی حد تک محدود ہے۔ اس سے ہٹ کر انسانی زندگی پر انسان کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کے سوا اور کسی کی حاکمیت نہیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی مکمل طور پر اللہ کی شریعت سے آزاد تھی۔ کبھی کوئی پریشانی ہوتی، کوئی بیمار پڑ جاتا، کوئی حادثہ ہو جاتا، کسی الجھن میں گرفتار ہو جاتے تو اللہ کو یاد کرتے۔ اس سے زیادہ اللہ کے ساتھ تعلق کا کوئی حوالہ نہ تھا۔ آج جس چیز کو سیکولرازم کہا جاتا ہے وہی ان کا رویہ تھا جسے وہ اللہ کی طرف منسوب کر کے اپنے تئیں مطمئن تھے۔ ان کی ایسی ہی باتوں اور ایسے ہی رویوں کو یہاں افتراء سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور درحقیقت یہی وہ رویہ ہے جس سے باقی تمام گمراہیاں جنم لیتی ہیں۔ اس لئے تمام برائیوں کی بنیاد کو ذکر فرمانے کے بعد ان کے انجام کو ذکر فرمایا گیا ہے۔ البتہ یہ بھی ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان کی چند خصوصی گمراہیوں کو ذکر کر دیا جائے تاکہ دوسرے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ان کے انجام کے حوالے سے یہ فرمایا گیا کہ ان کیلئے وہ کیسی بدنصیبی کا وقت ہوگا جب یہ اپنے رب کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ کسی بڑی عدالت میں پیشی بجائے خود دل ہلا دینے والا حادثہ ہوتی ہے اور اگر وہ عدالت ایسی ہو جس کے سامنے کوئی دم نہ مار سکے، کوئی بغیر اذن کے سفارش نہ

Marfat.com

کر سکے، کوئی معاوضہ کام نہ آسکے، سخن سازیاں دھری رہ جائیں، نیتوں کا فتور بھی سامنے آکھڑا ہو، آدمی کا جی چاہے کہ بعض بداعمالیوں پر اخفاء کا پردہ تان دیا جائے لیکن اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہے جب اس کا جوڑ جوڑ اس کے خلاف گواہی دینے لگے۔ زمان و مکان اس کیخلاف گواہ بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان گواہوں میں نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی بھی شامل ہو۔ ان میں سے ہر گواہ جن میں کندھوں پر بیٹھنے والے کراماً کاتبین بھی شامل ہوں گے یہ گواہی دے گا کہ الٰہی یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیشہ دین و شریعت کے حوالے سے جھوٹ بولے اور ہر صحیح بات کے مقابلے میں جھوٹی بات کو کھڑا کرنے کی کوشش کی اور اللہ کا نام لے کر اللہ ہی کے دین کیخلاف کذب اور افتراء کا طومار کھڑا کیا۔ جب گواہیاں مکمل ہو جائیں گی اور یہ لوگ بسی کی تصویر بنے اللہ سے رحم کے طالب ہوں گے، لیکن ادھر سے فیصلہ سنا دیا جائے گا کہ خبردار دنیا والو گواہ رہو کہ ایسے لوگ جنہوں نے قدم قدم پر ظلم کا رویہ اختیار کیا ہے اور ہر چیز کو اور ہر حقیقت کو اس کی اصل جگہ سے ہٹا کر اسے غلط جگہ دینے کی کوشش کی۔ اللہ کی عظمتیں دوسروں کو سونپ دیں۔ اس کی توحید میں شرک کے دروازے کھولے، اس کی صفات کو دوسروں کی طرف منسوب کر کے شرک کے کاروبار کو فروغ دیا ان کیلئے رحم کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ وہ اللہ کی لعنت کے سزاوار ٹھہرے ہیں۔ لعنت کا معنی ہوتا ہے رحمت سے دوری۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آج اللہ کی رحمت سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

مشرکین کے جرائم

اور یہ ظالم لوگ رحمت کے سزاوار ہو بھی کیسے سکتے ہیں، ان بدبختوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اللہ کی بندگی سے دور رکھا بلکہ دوسروں کو بھی وہ اللہ کے راستے سے روکتے رہے۔ انہیں جب بھی موقع ملا انہوں نے شیطانی قوتوں کی بالادستی کیلئے کام کیا۔ نیکی کے ہر راستے پر پتھر رکھے اور برائی کا ہر راستہ آسان کر دیا۔ اور اگر کسی کے بارے میں یہ شبہ بھی ہوا کہ اس کی طبیعت میں سلامتی باقی ہے اور اس کیلئے اللہ کے دین سے انکار یا اس کے راستے سے انحراف آسان نہیں ہوگا تو ایسے لوگوں کیلئے دین کا نام لے کر اس کا تصور بگاڑ کر دکھانے کی کوشش کی۔ اس کے احکام میں نوع بہ نوع الجھنیں کھڑی کیں۔ اسلامی شریعت کا بظاہر اعتراف کیا لیکن اس کے قابلِ عمل ہونے میں شکوک و شبہات پیدا کئے۔ الفاظ کے وہ طوطے مینا اڑائے اور تاویلات کی وہ دیواریں کھڑی کیں کہ سیدھا سادھا ذہن یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ اسلام اللہ کا سچا دین ہے، لیکن اس دور میں قابلِ عمل نہیں۔ ان کا یہ رویہ دراصل اس بات کا غماز ہے کہ انہیں آخرت کے آنے کا یقین نہیں۔ یہ لوگ آخرت کے بارے میں کافروں جیسا رویہ اختیار کر چکے ہیں۔ یہ اولاً تو اقرار نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں تو وہ صرف زبانی جمع خرچ ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ آخرت کے منکر اور کافر ہیں۔

اُولٰٓئِکَ لَمْ یَکُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَمَا کَانَ لَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَآءَ یُضٰعَفُ لَھُمُ الْعَذَابُ مَا کَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا کَانُوْا یُبْصِرُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ وَضَلَّ عَنْھُمْ مَّا کَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ ھُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ۝ ﴿سورۃ ھود: ۲۰،۲۱،۲۲﴾

(یہ زمین میں خدا کے قابو سے باہر نہیں اور نہ اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہے۔ ان کا دگنا عذاب دیا جائے گا۔ یہ نہ سن سکتے تھے اور نہ دیکھتے تھے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اور جو انہوں نے گھڑ رکھے تھے سب ہوا ہو جائیں گے۔ لازماً یہی لوگ ہیں جو آخرت میں خسارے میں ہوں گے۔)

گزشتہ آیات میں جن کفار کے اوصاف اور ان کی خباثتوں کی تفصیل پڑھی ہے اس سے فوراً ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے دین کے اتنے کھلے دشمن تھے اور جنہوں نے امکان بھر لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، آخر پروردگار نے ان کی گرفت کیوں نہ فرمائی، کیا وہ ایسے ہی طاقتور لوگ تھے کہ جن کا گرفت میں لانا مشکل ہو رہا تھا۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی گروہ بھی ایسا نہیں جو اللہ کی گرفت سے بچ سکے۔ ساری کائنات اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جب چاہے تباہی اور ہلاکت مسلط کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کا نہ پکڑنا اس وجہ سے نہیں کہ یہ کوئی طاقتور لوگ تھے بلکہ ان کی گرفت میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ہر شخص اور ہر قوم کو مہلت دیتا ہے اور جب تک یہ مہلت مکمل نہیں ہوتی ان کی گرفت نہیں فرماتا۔ مہلت کا تعین سراسر اللہ کی حکمت و مشیت سے ہے اور اس بات سے بھی کہ اللہ کے نبی کی دعوت کے نتیجے میں ایمان لانے کے کچھ آثار باقی ہیں یا نہیں، جس طرح مکھن کی چند باقیات موجود ہوں تو دودھ بلونے والا اپنی کوششیں ترک نہیں

Marfat.com

کرتا۔لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اب پیچھے خالص چھاچھ رہ گئی ہے تو پھر وہ اپنا کام ختم کر دیتا ہے۔اللہ کے نبی جس قوم کی طرف آتے ہیں جب تک ان کی طرف سے مایوسی مکمل نہیں ہو جاتی اس وقت تک مہلتِ عمل ختم نہیں ہوتی اور اس کے نتیجے میں کافر قوم کو بھی زندگی کا سانس لینے کا موقع ملتا رہتا ہے لیکن جب اللہ کی جانب سے ان کی رسی کھینچنے کا وقت آ جاتا ہے تو پھر اس گرفت میں تاخیر نہیں ہوتی لیکن بیوقوف لوگ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ انہیں شاید ان کے شریکوں کی مدد حاصل ہے، حالانکہ جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو دنیا کی کوئی قوت اس سے بچانے پر قادر نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان پر بھی جب اللہ کی گرفت آئے گی تو ان کے نام نہاد شریک ان کے کسی کام نہیں آئیں گے بلکہ ان کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ انہیں دگنا عذاب دیا جائے گا کیونکہ ان کے جرم کی نوعیت دو چند تھی۔ ایک تو یہ خود دین کے منکر تھے اور دوسرا یہ کہ یہ دوسرے لوگوں کو بھی دین کی طرف آنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ ان جرائم کی حوالے سے انہیں دگنا عذاب دیا جائے گا۔ مزید احقاق حق فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ آخر انہیں سزا دگنا کیوں نہ دی جائے جبکہ ان کا حال یہ تھا کہ یہ اللہ کے دین سے اس حد تک بیزار تھے کہ یہ دین کی کسی بات کو سننے کے بھی متحمل نہیں ہوتے تھے اور دنیا کی محبت کا پردہ اس حد تک ان کے دلوں پر تنا ہوا تھا کہ وہ اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے کیلئے قوت بصارت کو بھی زحمت دینے کیلئے تیار نہ تھے۔ آیت نمبر 21 اور 22 میں فرمایا کہ ایسے ہی لوگ اپنے کرتوتوں کے باعث اپنی بربادی کا سامان کرتے ہیں اور جن نام نہاد معبودوں کے سہارے وہ گمراہیوں میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ان سے اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ معمولی عقل کا آدمی بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ جس شخص کی اپنی سرگرمیاں اس کی تباہی کا باعث بنیں اور اس کے سہارے اس کا ساتھ چھوڑ دیں وہ نامراد اور ناکام نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

(بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور عجز و نیاز سے اپنے پروردگار کی طرف جھک گئے یہی لوگ جنتی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔) (سورة هود : ۲۳)

اھل ایمان کے فضائل

گزشتہ آیات میں ان لوگوں کا تذکرہ ہوا جنہوں نے اللہ کے نبی پر ایمان لانے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ ہر قدم پر ان کیلئے مشکلات پیدا کیں۔ لوگوں کو اللہ کی طرف آنے سے روکا۔ اللہ کے پیغمبر کی دعوت میں قسم قسم کی پیچیدگیاں پیدا کیں۔ دین کی سیدھی راہ کو بھی اپنے فتورِ عقل اور زورِ بیان سے الجھانے کی کوشش کی۔ دنیا کی محبت میں ایسے ڈوبے کہ آخرت ان کیلئے ناقابلِ یقین ہو کر رہ گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کرتوتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کے انجام کا بھی ذکر فرمایا۔ اب ان کے مقابل میں ان لوگوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو اپنے دل و دماغ کی رعنائیوں سے لے کر جسم و جان کی تمام توانائیاں اللہ کے راستے میں جھونک چکے۔ وہ ہر طرف سے کٹ کر پوری دل جمعی اور کامل یکسوئی کے ساتھ اللہ کی بندگی اور رسول کی اطاعت کے راستے پر چل پڑے۔ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ کا معنی ہے کہ وہ ہر ایک سے کٹ کر اپنے رب کی طرف نہایت دل جمعی اور کامل یکسوئی کے ساتھ اس طرح مائل ہوئے کہ ان کے دل و دماغ میں کسی اور کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی اور ان کی زندگی کی سرگرمیوں میں کوئی اور نقطۂ ماسکہ باقی نہیں رہا۔ ان کی عبادت صرف اللہ تعالیٰ کیلئے، ان کی ریاضت صرف اس کی خوشنودی کے حصول کیلئے، ان کی انسانیت کا آئیڈیل صرف اللہ کا رسولؐ اور ان کی منزل صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے اللہ کی جنت۔ یہ وہ لوگ ہیں جو متذکرہ بالا کفار کے مقابلے میں دنیا کی زینت اور آخرت کا سرمایہ ہیں۔ ایسے ہی معاشرے کا پیدا کرنا اور ایسے انسانوں کو وجود دینا اللہ کے نبی کی کاوشوں کا حاصل ہے۔

مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

(مثال ان دونوں فریقوں کی ایسی ہے جیسے ایک اندھا اور بہرہ ہو اور دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا۔ کیا یکساں ہے ان دونوں کا حال؟ کیا تم اس مثال میں غور و فکر نہیں کرتے؟) (سورة هود : ۲۴)

سابقہ آیاتِ کریمہ میں کفار کے اعتقادات اور ان کی بداعمالیوں کا ذکر ہوا اور اس کے نتیجے میں ان کی ناکامی اور محرومی کا بھی تذکرہ ہوا۔ ان کی

Marfat.com

پوری زندگی کے احوال کو سمیٹتے ہوئے پروردگار نے فرمایا مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ (نہ وہ حق کی آواز کو سن سکتے تھے اور نہ وہ حق کے نور کو دیکھ سکتے تھے۔) اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ایمان وعمل کی خرابی سے اپنی جس محرومی کو دعوت دی اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ہوش کے کان سلب کر لئے اور ان کی بصیرت کی آنکھیں چھین لیں۔ انہوں نے زندگی اس طرح گزاری کہ جس میں بصیرت کا کوئی موقع نہ تھا اور حق کی قبولیت کا کوئی اثر نہ تھا۔ دنیا میں حیوانوں کی طرح کھانے پینے اور ضروریات کے حصول کو زندگی کا مقصد سمجھا۔ انسانیت کی ایک ایک قدر ان سے رخصت ہوتی چلی گئی۔ اس لئے کہ حیوانوں اور انسانوں میں بنیادی طور پر دو ہی باتوں میں فرق ہے۔ حیوان صرف پیٹ کی آواز سنتا اور معدے کا طواف کرتا ہے اور انسان ہر معاملے کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھتا اور ہر نصیحت کو سماعِ قبول سے سنتا ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں کافروں اور مسلمانوں کو دو گروہوں کے طور پر اور ان میں بنیادی فرق کو ایک تشبیہ کی صورت میں واضح فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ دنیا میں دو گروہ ہیں، ایک گروہ اندھوں اور بہروں کا ہے اور دوسرا گروہ سننے والوں اور دیکھنے والوں کا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں گروہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے تمام رسولوں کی دعوت بالخصوص آنحضرت ﷺ کی سرتاسر عقل وبصیرت پر مبنی ہے۔ اس پر وہی لوگ ایمان لائیں گے جن کے کان اور دل کھلے ہوں اور جنہوں نے اپنی فطری صلاحیتوں کو برباد نہ کیا ہو۔ رہے وہ لوگ جن کے پاس بصیرت ہو اور نہ نصیحت سننے کی طاقت۔ ان کو پہلے لوگوں سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ پھر تمام لوگوں کو اس حقیقت پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ
نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۵﴾ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ
يَوْمٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۶﴾ فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا
بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ
الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿۲۷﴾
قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ
رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا
كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى
اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ
اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ

Marfat.com

طَرَدتُّهُمْ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٣٠﴾ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ
اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ
تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ لَن يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي
أَنفُسِهِمْ ۖ إِنِّي إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٣١﴾ قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا
فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٣٢﴾
قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُم بِهِ اللَّهُ إِن شَاءَ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿٣٣﴾ وَ
لَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللَّهُ
يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ ۚ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٣٤﴾ أَمْ يَقُولُونَ
افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا
تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾

(ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ (انہوں نے کہا بیشک میں تمہارے لئے کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ تو کہنے لگے ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر کیا تھا، اے نوح ہم نہیں دیکھتے تمہیں مگر اپنے جیسا انسان اور نہیں دیکھتے تمہیں کہ پیروی کرتے ہوں تمہاری بجز ان لوگوں کے جو ہم میں حقیر و ذلیل ہیں بلا سوچے سمجھے اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت حاصل ہے بلکہ ہم تو تجھے جھوٹا خیال کرتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا، اے میرے ہم قومو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی نوازا ہے اور وہ تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہے تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا دیں جبکہ تم اس سے بیزار بھی ہو۔ اور اے میرے ہم قومو! میں اس خدمت پر تم سے کسی مال کا سوال نہیں کرتا، میرا اجر تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے اور میں ان لوگوں کو ہرگز دھتکارنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یہ اپنے

Marfat.com

رب سے ملاقات کرنے والے ہیں بلکہ میں تو تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت میں مبتلا ہو۔ اور اے میری قوم! کون مدد کر سکتا ہے میری اللہ کے مقابلے میں، اگر میں انہیں نکال دوں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر جانتی ہیں انہیں اللہ تعالیٰ ہرگز کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ (اگر میں ایسا کروں تو) میں بھی ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔ وہ بولے اے نوح تم نے ہم سے بحث کر لی اور بہت بحث کر لی۔ پس اب لے آؤ ہمارے پاس اس عذاب کو جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے تھے اگر تم سچے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ ہی لے آئے گا اسے تمہارے پاس، اگر چاہے گا اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور نہیں نفع دے گی تمہیں میری خیر خواہی۔ اگرچہ میں ارادہ کروں تمہاری خیر خواہی کا۔ اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہتا ہے، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہو گا اور جو جرم تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖٓ ۡ اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ ؕ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝

(ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ (انہوں نے کہا بیشک میں تمہارے لئے کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔) (سورۃ ھود : ۲۵۔۲۶)

چند ابتدائی باتیں

پیشِ نظر آیتِ کریمہ اور اس کے بعد کی بھی کئی آیات کو پڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم چند ابتدائی باتوں کو ذہن نشین کر لیں۔

1- جب بھی اللہ کی طرف سے کوئی نبی یا رسول مبعوث ہوتا ہے تو اس کی بگڑی ہوئی قوم مخالفتوں کا ایک طوفان کھڑا کر دیتی ہے۔ وہ اس دعوت کو بے اثر کرنے کیلئے جو مختلف قسم کے سوالات کرتی ہیں ان میں سے ایک بہت اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اللہ نے حواس بخشے ہیں، عقل عطاء کی ہے، قوت امتیاز بخشی ہے، ہم زندگی کا تجربہ رکھتے ہیں، ہمارے لئے کیا ضروری ہے کہ کوئی سمجھانے والا اٹھے اور ہمارے معتقدات سے لے کر ہماری عادات و اطوار تک کو تنقید کا نشانہ بنا لے۔ ہمیں ایک سے ایک بڑھ کر سمجھدار اور تجربہ کار آدمی موجود ہے۔ ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہم اپنے جیسے ایک آدمی کو یہ حیثیت دے دیں کہ اس کی ہر بات کو ماننا ضروری ہے اور وہ زندگی کے بارے میں جو تصور دے اسے قبول کرنا لازمی ٹھہرے۔ یہ تو بلاوجہ کا ایک خرخشہ ہے جو پیدا کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں ایک ترتیب کے ساتھ کئی انبیاء اکرام کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ لوگو! تم اپنے خیالات، اعتقادات، معاملات اور زندگی کے رویوں میں بری طرح گمراہیوں کا شکار ہو چکے ہو۔ تمہاری بہتری اور فلاح و کامرانی صرف اس بات میں ہے کہ تم اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی رہنمائی میں زندگی گزارو، اسی میں تمہاری دنیا کی سلامتی ہے اور اسی میں آخرت کی سرخروئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کا دنیا کی ہدایت کیلئے تشریف لانا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں اس سے پہلے ایک لاکھ سے بھی زائد نبی اور رسول مختلف علاقوں میں تشریف لاتے رہے اور انہوں نے آ کر ہمیشہ انسانوں کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ انسان اپنے طور پر اپنے آپ کو کچھ بھی سمجھے لیکن زندگی کی بنیادی اقدار اور اجتماعی مسائل میں وہ قدم قدم پر اللہ کی ہدایت کا محتاج ہے۔ چنانچہ ہر رسول اسی مقصد کیلئے مبعوث ہوتا رہا اور آنحضرت ﷺ اسی مقصد کیلئے تشریف لائے۔ اس لئے مشرکینِ مکہ کا یہ اعتراض کرنا کہ آپ کی بعثت نے بلاوجہ ایک پرسکون معاشرے کو اختلافات کا جہنم بنا دیا ہے کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

Marfat.com

2- نبی کریم ﷺ نے جب اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا شروع کیا اور لوگوں کو توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی تو ابتداء میں سمجھدار لوگوں نے اس سے تغافل برتا اور اسے یہ سمجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی کہ چند لڑکے بالے ہیں جو محمد ﷺ پر ایمان لائے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ جوش وخروش مدھم پڑ جائے گا اور زندگی اپنی ڈگر پر چلنے لگے گی، لیکن جیسے جیسے آنحضرت ﷺ کی دعوت میں وسعت آتی گئی اور ایمان لانے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا ویسے ویسے اشرافِ قریش نے سنجیدگی سے اس کا نوٹس لینا شروع کر دیا۔ چند ہی سالوں میں یہ مخالفت معاندت تک پہنچ گئی۔ دلیل کے سامنے بے بسی کے بعد ان کے ردِعمل میں شدت آ گئی۔ اب ان کا ہر چھوٹا بڑا اس طرح غضب کی تصویر بن گیا کہ ان کی زبانیں زہر اگلنے لگیں اور ان کے ہاتھ غریب مسلمانوں پر مشقِ ستم ڈھانے لگے۔ معاملہ اتنا سنگین ہو گیا کہ مسلمانوں کی جانیں بھی خطرے میں پڑ گئیں۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے انبیاءِ کرام کے حالات پر مشتمل یہ چند رکوع نازل فرمائے، جس سے نبی کریم ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے اور آپ کے سامنے ایک سے ایک بڑھ کر اخلاص، استقامت اور جسارت کا نمونہ پیش کرنا ہے تاکہ آپؐ کے دل کو قوت ملے کہ یہ جو کچھ آپ اور صاحبِ ایمان لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے یہ پہلا موقع نہیں بلکہ جب کبھی بھی کسی نے اللہ تعالیٰ کی طرف بلانا شروع کیا ہے تو اس کی رات آرام کی کبھی نہیں کٹی، اس کا دن خیریت سے کبھی نہیں گزرا، اس کی دعوت کو کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا گیا، حق و باطل کی یہ پرخاش اور یہ کشمکش نئی نہیں بلکہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا ہے ان میں سے کوئی بات نئی نہیں، یہ تو اس راستے کی سنتیں ہیں جنہیں بہر حال پورا کرنا پڑتا ہے۔ آپؐ کو نہایت استقامت اور جانسپاری کے ساتھ اس کام کو جاری رکھنا ہے اور اس راستے میں آنے والی تکلیفوں کو اسی عزیمت سے برداشت کرنا ہے جس طرح اولوالعزم رسول برداشت کرتے رہے۔ آپؐ کو اسی طرح صبر دکھانا ہے جیسے آپؐ سے پہلے تمام رسول صبر کے پیکر بنے رہے لیکن وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ آپؐ کی عزیمت، آپؐ کے اخلاص اور آپؐ کے صبر کو قبول فرمائے گا اور غلبۂ دین کا فیصلہ ہو جائے گا۔

3- ان واقعات کو بیان کرنے سے مقصود مشرکینِ مکہ کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تم غور سے ان واقعات کو پڑھو، تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ نبی کریم ﷺ اس مقام پر کھڑے ہیں جس مقام پر اولوالعزم رسول فائز رہ چکے ہیں اور تم بالکل اسی ڈگر پر چل رہے ہو جس ڈگر پر ان کی قومیں چلتی رہیں۔ ان کا انجام تمہارے سامنے ہے کہ ان کو ایک خاص وقت تک مہلت دی گئی، لیکن جب ان کے انکار اور تمرد میں کوئی فرق نہ آیا تو بالآخر اللہ کے عذاب نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی اور تاریخ نے ان کو عبرت کا نشانہ بنا دیا۔

حضرت نوحؑ کی سرگزشت

انبیاءِ کرام کے تذکرے کے سلسلے میں سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی سرگزشت شروع کی جا رہی ہے۔ اس کا اجمالی تذکرہ گزشتہ سورت میں بھی ہو چکا اور کسی حد تک تفصیل سورۂ اعراف میں بھی آ چکی ہے۔ اس لئے آپ کے تعارف کیلئے ان باتوں کو دہرانا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت آدم علیہ السلام سے 2262 سال بعد تشریف لائے، لیکن یہ تورات کا بیان ہے، قرآن و سنت میں اس طرح کی باتیں عام طور پر بیان نہیں کی جاتیں۔ قرآن کا بیان اس حد تک محدود رہتا ہے جس کا اصل موضوع سے تعلق ہو۔ حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپؐ سے پہلے گزرنے والے رسول حضرت آدم ہوں یا کوئی اور انہیں گزرے ہوئے یقیناً اتنی طویل مدت گزر چکی تھی کہ جس مدت میں قومیں عام طور پر بگاڑ کا شکار ہو جاتی ہیں۔ آپؑ نے جس طرح اپنی قوم کے خیالات پر تنقید فرمائی ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی تھی۔۔ وہ اللہ کی توحید میں مختلف قسم کا شرک داخل کر چکے تھے۔ ایک معتدبہ تعداد ایسے نام نہاد بتوں کی بھی جنہیں وہ اللہ کے ساتھ شریک بنا چکے تھے۔ ان کے سامنے سر جھکاتے، ان کے ڈنڈوت بجالاتے، ان سے مرادیں مانگتے، انہیں کائنات کے نظام میں دخیل سمجھتے اور صاحبِ اختیار جانتے تھے۔ تحلیل و تحریم کا حق اللہ سے چھین کر مختلف قوتوں کو دے چکے تھے۔ ایک خانہ ساز شریعت ان کی زندگی کا قانون بن چکا تھا۔ اخلاقی بگاڑ اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ باہمی تعلقات کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حبِ دنیا نے آخرت کا تصور گہنا کر رکھ دیا تھا۔ اللہ کے سامنے جوابدہی خواب و خیال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی برائی کا ارتکاب کرتے ہوئے بھی ان کے سامنے کوئی روک نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے آپؑ نے اپنی دعوت کے آغاز ہی

Marfat.com

میں انہیں وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ تم اپنے معاملات کو اس حد تک بگاڑ چکے ہو اور اللہ تعالیٰ سے تمہارا رشتہ اس طرح شکست و ریخت کا شکار ہوا ہے کہ اگر تم نے اس میں اصلاح کی کوشش نہ کی اور مجھ پر ایمان لا کر زندگی کے نئے سفر کا آغاز نہ کیا تو میں تمہارے لئے ایک عذاب عظیم کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

نذیر مبینؑ کا مفہوم

اس میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ تمہارے حالات دیکھتے ہوئے میں صرف نصیحت پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ صاف صاف کہوں گا کہ میں تمہارے لئے نذیر مبین بن کر آیا ہوں، ممکن ہے اس سے اشارہ عربوں کی ایک خاص روایت کی طرف ہو، کیونکہ مقصود کو مشرکین مکہ کو سمجھانا ہے۔ عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی آبادی کی حفاظت کیلئے کسی بلند ٹیلہ یا پہاڑی پر ایک دیدبان بناتے تھے جہاں ہر وقت ایک نگران مقرر رہتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ آبادی کے چاروں طرف دور دور تک نگاہ رکھے کہ کوئی قبیلہ بے خبری میں ان پر حملہ آور ہونے کی کوشش تو نہیں کر رہا۔ چنانچہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے وہ کئی میل کے فاصلے پر آنے والے حملہ آوروں کو دیکھ سکتا تھا۔ پہاڑی سلسلوں میں بہت دور تک گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے جاتی تھی اور گھوڑوں کے پاؤں سے اڑنے والا غبار خطرے کی خبر دے دیتا تھا۔ چنانچہ جب وہ یہ دیکھتا کہ کسی طرف سے حملہ آوروں کی کوئی جماعت اس کی قوم پر حملہ کیا چاہتی ہے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر ننگا ہو جاتا اور واصباحا! کا نعرہ لگاتا۔ یہ پوری قوم کیلئے خطرے کی گھنٹی ہوتی اور لوگ یہ سنتے ہی تلواریں سونت سونت کر مدافعت کیلئے باہر نکل آتے۔ ایسا شخص جو بروقت خطرے کی خبر دیتا تھا اس کو "نذیر عریاں" کہتے تھے۔ اللہ کے رسول بھی اپنی قوم کو اسی طرح آنے والے عذاب سے خبردار کرنے کیلئے آتے ہیں، لیکن وحی الٰہی کی زبان چونکہ نہایت مہذب زبان ہوتی ہے اس لئے انہیں نذیر عریاں نہیں کہا گیا بلکہ نذیر مبین کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بھی کوہ صفا پر چڑھ کر اسی طرح اپنی قوم کو آنے والے خطرے کی خبر دی تھی اور اپنی رسالت کا اعلان فرمایا تھا۔

پیغمبر صرف خطرے کا اعلان ہی نہیں کرتا بلکہ اس سے بچنے کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو زندگی کا وہ نسخۂ شفاء دیتا ہے جس سے انسان اللہ کے عذاب سے بچ سکے۔ چنانچہ اسی لئے یہاں اسی نسخۂ شفاء کے حوالے سے فرمایا: "اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ" یہ ہر پیغمبر کی دعوت کا نقطۂ آغاز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اسی بات سے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تھا، کیونکہ انسانی زندگی میں تمام خرابیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اللہ کی بندگی کو چھوڑ کر غیر اللہ کی بندگی کو اختیار کر لیتا ہے۔ اسی سے اعتقادات میں خرابی آتی ہے، اسی سے اطاعت اور عقیدت کے حوالے بدلتے ہیں، اسی سے اخلاق کے پیمانوں میں تبدیلی آتی ہے، اسی سے انسان کی منزل نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس لئے جب تک اس رشتۂ اول کو سیدھا نہ کیا جائے اس وقت تک انسان کی اصلاح و فلاح کی کوئی ضمانت نہیں۔ چنانچہ نوح علیہ السلام نے جب اس بنیادی حقیقت سے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو ان کی قوم کے بگڑے ہوئے سرداروں نے آپ پر وہی اعتراضات کیے جو ہر قوم اپنے پیغمبر پر کرتی رہی اور نبی کریم ﷺ بھی اپنی قوم کی جانب سے انہیں اعتراضات کا ہدف تھے۔

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿سورۃ ھود : ۲۷﴾

(تو کہنے لگے ان کی قوم کے سردار جنہوں نے کفر کیا تھا، اے نوح ہم نہیں دیکھتے تمہیں مگر اپنے جیسا انسان اور نہیں دیکھتے تمہیں کہ پیروی کرتے ہوں تمہاری بجز ان لوگوں کے جو ہم میں حقیر و ذلیل ہیں بلا سوچے سمجھے اور ہم نہیں دیکھتے کہ تمہیں ہم پر کوئی فضیلت حاصل ہے بلکہ ہم تو تجھے جھوٹا خیال کرتے ہیں۔)

اس آیت کریمہ میں ایک لفظ آیا ہے "بَادِيَ الرَّاْيِ" "بادی" کا ماخذ بَدَا ہے یا بدو پہلی صورت میں اس کا معنی ہوگا کسی چیز کو دیکھتے ہی اس میں غور و فکر کئے بغیر رائے قائم کر لینا اور دوسری صورت میں اس کا معنی ہوگا ظاہر بینی سے رائے قائم کرنے والے۔

تین اعتراضات

حضرت نوح علیہ السلام کی بگڑی ہوئی قوم کے سرداروں نے اپنی قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے آپ پر جو اعتراضات کئے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مختلف رہے ہوں گے لیکن ان میں سے اس آیت میں تین کا ذکر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

1- پہلا اعتراض یہ ہے کہ آپؐ کو رسول ہونے کا دعویٰ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ رسالت ایک عظیم منصب ہے جو کسی بہت بڑے آدمی کو ملتا ہے اور یا انسانوں کے علاوہ اور کسی کو اس منصب پر فائز کیا جاتا ہے لیکن آپؐ تو ہماری طرح ایک عام انسان ہیں، ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں، بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور مزید یہ کہ آپؐ کے مالی حالات ہم سے بھی فروتر ہیں تو پھر آخر آپؐ میں ایسی کیا بات ہے کہ آپؐ کو اس عظیم منصب کا اہل سمجھ لیا جائے۔ رسالت جس قدر پاکیزہ ذمہ داری ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کیلئے کسی فرشتے کا انتخاب کیا جائے اور انسانوں میں ہی سے کسی کو بھیجنا ہو تو فرشتے اس کے دائیں بائیں اترنے چاہئیں لیکن تمہارے ساتھ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر تمہیں آخر کس طرح اللہ کا رسول باور کر لیا جائے۔

2- ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جو لوگ تم پر ایمان لائے ہیں اور جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے وہ ہمارے معاشرے کے گرے پڑے لوگ ہیں۔ لوگوں کی نگاہ میں جن کی کوئی عزت نہیں۔ ان میں یہ صلاحیت بھی نہیں کہ وہ کسی بات کو اس کے حقیقی پس منظر میں دیکھ سکیں۔ انہوں نے بلا سوچے سمجھے تمہاری پیروی شروع کر دی ہے لیکن ان کی پیروی سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ اگر تمہاری دعوت میں کوئی جان ہوتی، فکری قوت ہوتی، زندگی کے مسائل کا حل ہوتا، خیالات کی بلندی ہوتی، دلوں میں اتر جانے والی باتیں ہوتیں تو یقیناً ہماری سوسائٹی کے بالا قامت لوگ اس طرف رجوع کرتے، ذہین طبقہ اس طرف متوجہ ہوتا، معاشرے کے ذمہ دار لوگوں میں اس کی پذیرائی ہوتی، لیکن جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو معاملہ اس سے بالکل برعکس ہے۔ یہ گویا اس بات کی دلیل ہے کہ تمہاری دعوت کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں اور اس میں کوئی علو فکر نہیں۔

3- تیسری بات یہ ہے کہ تمہیں اور تم پر ایمان لانے والوں کو ہم پر کسی قسم کی کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ تمہاری اکثریت نادار لوگوں پر مشتمل ہے، تمہارا انتساب کسی بڑے قبیلے کی طرف نہیں، سوسائٹی میں بڑائی اور عزت کے جتنے حوالے ہیں تم سب سے تہی دامن ہو، تو پھر کیسے مان لیا جائے کہ تمہیں اللہ نے اتنے بڑے منصب کیلئے انتخاب کیا ہے۔

کسی کی عظمت کے اگر یہی معیارات ہیں جو یہاں مذکور ہوئے ہیں تو پھر اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ تم اپنے دعویٰ میں بالکل جھوٹے ہو۔ تم نے اپنے دل سے چند باتیں گھڑ لی ہیں انہیں اللہ کی طرف منسوب کر کے ہمیں سناتے رہتے ہو۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ؕ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ﴿۲۸﴾

﴿سورۃ ھود : ۲۸﴾

(حضرت نوح علیہ السلام نے کہا، اے میرے ہم قومو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی نوازا ہے اور وہ تم سے پوشیدہ رکھی گئی ہے تو کیا ہم اس کو تم پر چپکا دیں جبکہ تم اس سے بیزار بھی ہو۔)

اعتراضات کا جواب

پیشِ نظر آیتِ کریمہ اور اس کے بعد آنے والی چند آیات میں اللہ تعالیٰ نے خلافِ ترتیب متذکرہ بالا اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ سب سے پہلے اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ مجھے تم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ نادانو! تم یہ سمجھتے ہو کہ فضیلت، عہدہ و منصب میں برتری اور مال و دولت میں کثرت کا نام ہے۔ چاہے ان دونوں کا حامل اپنے تئیں کیسا ہی انسانیت کیلئے عار کیوں نہ ہو۔ جس گھر میں بھی تمہیں دولت کی ریل پیل نظر آتی ہے تم سمجھتے ہو اس گھر میں اشراف رہتے ہیں اور جس شخص کو بھی ورثے میں عزت و وجاہت ملی ہے تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کا بڑا آدمی ہے۔ حالانکہ مال و دولت اور عہدہ و منصب آنی جانی چیزیں ہیں۔ آج ایک کے پاس ہیں کل دوسروں کے پاس۔ نہ ان کے آنے سے انسانیت میں اضافہ ہوتا ہے نہ ان کے جانے سے کمی ہوتی ہے۔ فرعون تخت پر بیٹھ کر بھی بے وقار ہوتا ہے اور موسیٰ کمبل میں ملبوس عصا بدست اور دربار میں بے یار و مددگار کھڑا بھی عظیم ہوتا ہے۔ مجھے اللہ نے تم پر مال و دولت میں کوئی فضیلت نہیں دی۔ البتہ دو باتیں مجھے ایسی عطاء فرمائی ہیں تمہیں جن کا شعور بھی نہیں۔ ان میں پہلی بات جسے بینۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہ فطرت کا نور، دل کی روشنی اور ضمیر کی زندگی ہے جس سے میں نوازا گیا ہوں۔ میرے دل کا آئینہ اپنی آب و تاب رکھتا ہے، میرا ضمیر پوری طرح زندہ ہے، میں انہیں کی مدد سے اللہ کی قدرت کے آثار دیکھتا ہوں، کائنات میں پھیلے ہوئے اس کے حسن کی بہار دیکھتا ہوں، مجھے اس کی

Marfat.com

صفات آشکارا دکھائی دیتی ہیں، چمکتا ہوں سورج، دمکتا ہوا چاند، ٹمٹماتے ہوئے ستارے، کھلتی ہوئی کلیاں، مسکراتے ہوئے پھول، گاتے ہوئے چشمے، شور مچاتی ہوئی آبشاریں، زمین پر بہتے ہوئے دریا اور فضاء میں اٹھتی ہوئی گھٹائیں، میں ان سب کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی ذات کا ظہور دیکھتا ہوں۔ مزید اس نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ میرے اندر میرے دل کی روشنی نے اللہ کی مرضیات معلوم کرنے اور اس کے راستے کی تفصیلات جاننے کی جو تڑپ پیدا کی تھی، وحی الٰہی کی شکل میں اس کا جواب دیا گیا ہے۔ اس نے مجھے ایک ایک سوال کا جواب مہیا کیا ہے۔ میرے لئے عمل کے راستے کھولے۔ زندگی الجھنیں دور کیں اور آخرت کی تیاری کو آسان کیا ہے لیکن تمہاری بدنصیبی کے باعث اللہ نے تمہیں اس رحمت سے محروم رکھا۔ تمہاری آنکھوں پر اندھیرا چھایا رہا، تمہاری ناشکریوں اور بداعمالیوں نے تمہاری فطرت کے نور کو گل کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم اللہ کے قانون کی گرفت میں آ گئے جس نے تمہارے دلوں کی روشنی بجھا دی۔ ان سے قبولیت کی استعداد سلب کر لی اور تمہیں اللہ کی ہدایت سے محروم کر دیا۔ تم نے جن حقائق سے آنکھیں بند رکھیں اب یہ کیسے ممکن ہے کہ میں زبردستی انہیں تم پر چپکا دوں جبکہ تمہاری مزید بدنصیبی کا عالم یہ ہے کہ کہ تم ان کے نام سے بھی بیزار ہو۔

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ ﴿سورۃ ھود : ۲۹﴾

(اور اے میرے ہم قومو! میں اس خدمت پر تم سے کسی مال کا سوال نہیں کرتا، میرا اجر تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے اور میں ان لوگوں کو ہرگز دھتکارنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں بلکہ میں تو تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت میں مبتلا ہو۔)

قوم کی نخوت پر چوٹ

بگڑی ہوئی قوموں کا تمام تر انحصار مال و دولت پر ہوتا ہے، وہ اسی میں اپنی زندگی خیال کرتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی خواہشات نفس کو تسکین صرف مال و دولت سے ملتی ہے۔ مال و دولت کی کثرت ہی ان کے غرور و تکبر اور ان کے نفس کے پندار کی غذا بنتی ہے۔ چنانچہ اسی پندار پر چوٹ لگانے کیلئے حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے میری قوم کے لوگو! تم چونکہ کاروباری ذہنیت رکھتے ہو اس لئے تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ میں بھی شاید اسی ذہنیت کا حامل ہوں۔ میں جو جان جوکھوں میں ڈال کر اور خونِ جگر پی پی کر تمہیں اللہ کے دین کی دعوت دیتا ہوں وہ شاید میرا کوئی کاروبار ہے اور گر تم نے اس کی طرف توجہ نہ کی تو میرے کاروبار کے بیٹھ جانے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ میں تو تمہاری بہتری اور بھلائی کیلئے جان کھپاتا ہوں اور تم اسے مال و دولت کا کھیل سمجھتے ہو۔ یاد رکھو میری محنتوں کا صلہ میرے اللہ کے ذمہ ہے۔ تم سے میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ تم ایمان لے آؤ۔ رہی یہ بات کہ جو لوگ مجھ پر ایمان لائے ہیں وہ گرے پڑے لوگ ہیں اور معاشرے میں ان کی کوئی عزت نہیں۔ یاد رکھو اس طرح کی باتوں سے ممکن ہے تمہاری انا کو تسکین ملتی ہو لیکن اگر تم غور کرو گے تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ ہر دور میں اللہ کے نبیوں پر ایمان لانے والے شروع میں ہمیشہ غریب لوگ ہی رہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دکھوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کے اندر کے احساسات زندہ ہوتے ہیں۔ عہدہ و منصب کی ہوس اور مال و دولت کی کثرت نے ان کی انسانیت کو موت کے گھاٹ اتارا نہیں ہوتا۔ جب وہ سنتے ہیں کہ پکارنے والا ہمیں انسانیت کی طرف پکار رہا ہے اور ہمیں خالق کے راستے کی طرف بلایا جا رہا ہے تو وہ اپنے غم بھول کر جنت گم گشتہ کے حصول کیلئے اس آواز کی طرف لپکتے ہوئے آتے ہیں۔ انہیں اس دعوت میں اپنے دکھوں کا مداوا اور اپنے دل کی تسکین کا سامان نظر آتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے خالق و مالک نے ہمارے لئے قرب کے راستے کھول دیئے ہیں۔ وہ اپنی بے بضاعتی کے باوجود بلندیوں کے مسافر ہیں۔ تم انہیں ہزار ذلیل سمجھو، لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ہیرے ہیں اس لئے میں انہیں اپنے پاس سے کیسے دور کرنے کی غلطی کر سکتا ہوں۔ تم تو آخرت کی جوابدہی سے بے نیاز ہو۔ لیکن انہیں یقین ہے کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں۔ اس لئے انہیں شب و روز اللہ کے سامنے جوابدہی کی فکر رہتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک ایسا سرمایہ اور اثاثہ ہیں جن کی جتنی بھی قدر کی جائے تھوڑی ہے۔ البتہ تمہاری بے حسی اور بے نیازی تمہاری جہالت کی آئینہ دار ہے اور تم ان کے خصائص کو دیکھنے کی بجائے ان کے ظاہر پر جس طرح حملہ آور ہو رہے ہو وہ سراسر ایک جاہلانہ حرکت ہے۔ اس لئے میں انہیں اپنے پاس سے ہٹانے کی بجائے تم سے کہتا ہوں کہ تم جاہل ہو اور اپنی اس جہالت کے باعث جہنم کے مسافر بن گئے ہو۔

Marfat.com

وَ يٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ ﴿سورۃ ھود : ۳۰﴾

(اور اے میری قوم! کون مدد کر سکتا ہے میری اللہ کے مقابلے میں، اگر میں انہیں نکال دوں۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔)

گزشتہ مضمون کی تائید و توثیق

گزشتہ آیت کے مضمون کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں ان صاحبِ ایمان لوگوں کے مقام و مرتبہ کا حقیقی ادراک نہیں۔ تم کیا جانو کہ یہ اللہ کے یہاں کس عظمت کے مالک ہیں۔ پروردگار کے یہاں ان کی ناز برداریوں کا حال یہ ہے کہ اگر میں انہیں اپنے پاس سے نکلنے کا حکم دے دوں تو باوجود اس کے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، لیکن میں اللہ کی طرف سے گرفت کا خطرہ محسوس کرتا ہوں اور وہ گرفت ایسی ہوگی جس سے بچانے کیلئے میری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ اللہ کا یہ غضب محض اس لئے بھڑکے گا کہ میں نے بظاہر ان غریبوں کی عزت افزائی کی بجائے ان کو اپنے پاس سے کیوں نکالا۔ تو جن کی قدر و منزلت کا یہ حال ہو تم ان کا طعنہ دے کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں اتنی عقل بھی نہیں کہ تم ان باتوں کو سمجھ سکو۔

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴿سورۃ ھود : ۳۱﴾

(اور میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ ہی یہ کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تمہاری نگاہیں حقیر جانتی ہیں انہیں اللہ تعالیٰ ہرگز کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جو ان کے دلوں میں ہے۔ (اگر میں ایسا کروں تو) میں بھی ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔)

باقی اعتراضات کا جواب

اس آیتِ کریمہ میں مخالفین کے باقی اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ مخالفین کا کہنا یہ تھا کہ ہم تو تمہیں اپنا جیسا بشر دیکھتے ہیں اور ان کے نزدیک بشریت اور نبوت میں تضاد تھا۔ ان کے جواب میں کہا گیا ہے کہ تم جن باتوں کو بطور اعتراض مجھ پر وارد کر رہے ہو، میں نے ان کا دعویٰ کب کیا ہے۔ میں کب کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں بلکہ میں تو دنیا کو یہ بات سمجھانے کیلئے آیا ہوں کہ کائنات کے ہر طرح کے وسائل کا مالک صرف اللہ ہے۔ اللہ کے رسول بھی اللہ ہی سے مانگتے ہیں۔ کسی کو اس کے خزانوں پر دسترس حاصل نہیں۔ اسی طرح تم مجھ سے عجیب و غریب سوالات کرتے ہو۔ کبھی ماضی کے حالات کے بارے میں، کبھی مستقبل کے بارے میں حالانکہ اللہ کا پیغمبر انسانوں کی ہدایت کیلئے آتا ہے، پہیلیاں بجھوانے کیلئے تو نہیں آتا۔ وہ کبھی بھی غیب دان ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا اور میں نے بھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ میں وہی بات جانتا ہوں جو میرا اللہ مجھے بتاتا ہے۔ علم غیب بغیر کسی واسطے کے از خود ان دیکھی باتوں کو جاننے کا نام ہے۔ اللہ کے سوا یہ شان کسی اور کی نہیں۔ اللہ کے نبی بعض دفعہ ایسی باتوں کی خبر دیتے ہیں جنہیں اور کوئی نہیں جانتا لیکن ان کا واسطہ اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ وہ دنیا کو مابعد الطبیعات کی خبر دیتے ہیں۔ عالمِ غیب کی باتیں بتاتے ہیں، عالمِ آخرت کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہیں۔ اللہ کی ذات و صفات کے بارے میں ان حقائق کا علم دیتے ہیں جنہیں صرف وہی بتا سکتے ہیں۔ بایں ہمہ وہ عالم الغیب نہیں ہوتے کیونکہ وہ کوئی بات اللہ کے بتائے بغیر نہیں کہتے۔ اس آیت میں مزید فرمایا گیا کہ مجھ پر جو غریب لوگ ایمان لائے ہیں اور تم جنہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہو اور تمہارا خیال یہ ہے کہ اگر اس چیز میں کوئی بھلائی ہوتی جسے میں لے کے آیا ہوں تو اس بھلائی کے مستحق تم تھے نہ کہ یہ غریب لوگ۔ میں نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کوئی بھلائی نہیں دے گا۔ کیونکہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ وہ سینوں کے بھیدوں سے واقف ہے۔ وہ ظاہر کو بھی جانتا ہے اور باطن کو بھی، اس کے مطابق وہ ہر ایک سے سلوک کرتا ہے۔ ان غریب لوگوں سے بھی وہ اپنے علم کے مطابق سلوک کرے گا۔ میں چونکہ کسی کے قلبی احساسات سے آگاہ نہیں ہوں اس لئے بلا جانے بوجھے اگر میں تمہاری تائید کرنا شروع کر دوں تو میرا شمار ظالموں میں سے ہوگا کہ میں نے اپنی حیثیت کا غلط اندازہ لگایا۔ میرا کام اللہ کے دین کی دعوت دینا تھا۔ میں نے لوگوں کے اسرارِ غیب پر محاکمہ کب سے شروع کر دیا۔ میں اس سے اللہ کی

Marfat.com

پناہ چاہتا ہوں اور اللہ کے علم پر بھروسہ کرتا ہوں۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞ قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۞ ﴿سورۃ ہود : ۳۲، ۳۳﴾

(وہ بولے اے نوح تم نے ہم سے بحث کر لی اور بہت بحث کر لی۔ پس اب لے آؤ ہمارے پاس اس عذاب کو جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے تھے اگر تم سچے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ ہی لے آئے گا اسے تمہارے پاس، اگر چاہے گا اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو۔)

قوم نوحؑ کا مطالبۂ عذاب

مخالفین کے تمام اعتراضات کے جب نوح علیہ السلام نے مسکت جواب دیئے اور قوم کے عمائدین بے بسی سے بغلیں جھانکنے لگے۔ اب ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنے ہر اعتراض کا جواب ملنے پر اللہ کے نبی پر ایمان لے آتے۔ لیکن ان کی بدنصیبی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بجائے ایمان لانے کے نوح علیہ السلام کے جوابات کو جدال قرار دے کر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ نوح تم نے ہم سے بہت جھگڑا کیا۔ تمہاری بحث اب طول کھینچ گئی ہے۔ تمہاری ہر بات کا جواب ہمارے لئے ممکن نہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ایمان نہ لانے کی صورت میں اللہ کی طرف سے جس عذاب کی تم ہمیں دھمکی دیتے رہتے ہو اسے لے آؤ تاکہ روز روز کا ٹنٹا ختم ہو جائے تو حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا کہ میں رسول ہدایت ہوں، عذاب لانا میرا کام نہیں۔ البتہ میں تم سے جو ہمدردی اور خیر خواہی رکھتا ہوں اس کے پیش نظر میں تمہیں آگاہ کرتا رہتا ہوں کہ اگر تم نے کفر سے توبہ نہ کی اور ایمان کا راستہ اختیار نہ کیا تو اللہ کا عذاب کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ تو تم بجائے اس کے کہ مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرو، تمہیں اپنا جائزہ لینا چاہئے۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ تم جس بے نیازی بلکہ طنطنہ کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تمہیں اندازہ نہیں کہ عذاب آنے کے بعد ہوتا کیا ہے۔ مجرموں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ تم اپنے تمام تر تکبر اور غرور کے باوجود عذاب کو روک نہیں سکو گے۔ کیونکہ اللہ کا عذاب اس کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے۔ انسانوں کے وسائل اس کے سامنے عاجز آ جاتے ہیں۔

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۞

(اور نہیں نفع دے گی تمہیں میری خیر خواہی۔ اگرچہ میں ارادہ کروں تمہاری خیر خواہی کا۔ اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہتا ہے، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا ہے۔) ﴿سورۃ ہود : ۳۴﴾

گزشتہ آیت کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے اپنے تمام اعتراضات کا جواب پا کر نصیحت حاصل کرنے کی بجائے جو معاندانہ اور مخاصمانہ رویہ اختیار کیا اسے دیکھتے ہوئے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام ان کی طرف سے مایوس ہو کر یہ کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری خیر خواہی تمہارے لئے کارآمد نہیں۔ میں ہزار کوشش کروں تم اس انجام سے نہیں بچ سکو گے جس کا فیصلہ پروردگار فرما چکے ہیں۔

بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام نے درحقیقت اللہ کے قانون کا اعلان فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ دعوت و نصیحت اور تذکیر و موعظت جب بیکار ہو جاتی ہے تو پھر پیغمبر کی جانب سے اپنی سبکدوشی کا اعلان ہوتا ہے۔ اس سے امت کی بدنصیبی پر مہر لگ جاتی ہے اور مخالفین کو ان کے اس انجام کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو ان کیلئے مقدر ہو چکا ہوتا ہے۔ اس آیت میں بھی درحقیقت یہی بات فرمائی گئی ہے۔

Marfat.com

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تُجْرِمُونَ ﴿٣٥﴾ ﴿سورۃ ھود : ۳۵﴾

(کیا یہ کہتے ہیں کہ اس نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہوگا اور جو جرم تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔)

مفسرین میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں مخاطب کون ہے؟ آنحضرت ﷺ یا حضرت نوح علیہ السلام۔ اگر مخاطب آنحضرت ﷺ کو سمجھا جائے تو پھر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مشرکینِ مکہ نے یہ کہا کہ یہ جو آپ قرآن کریم کا نام لے کر ایسی آیات ہمیں سناتے ہیں جو واقعی ہم پر منطبق ہوتی ہیں تو یہ سراسر آپؐ کی اپنی گھڑی ہوئی ہیں اور اگر خطاب حضرت نوح علیہ السلام کو ہو تو پھر یہ التفات کی آیت نہیں ہوگی بلکہ اسی سیاق کلام سے وابستہ ہوگی جو پیچھے سے چلا آ رہا ہے۔ قوم نے نوح علیہ السلام پر الزام لگایا کہ آپؑ خود ان باتوں کو گھڑتے ہیں اور اللہ کی طرف منسوب کر کے ہمیں سناتے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا: کہ حقیقت کچھ بھی ہو تم اب یہ بحث بند کرو۔ اگر یہ سب کچھ میرا افتراء ہے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اگر یہ حق ہے اور تم جان بوجھ کر اس سے بغاوت کر رہے ہو تو میں تمہارے اس جرم کی ذمہ داری سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کی جانب سے جب اس طرح اعلانِ برأت ہوتا ہے تو پھر قوم کیلئے فیصلہ کن گھڑی آ جاتی ہے۔

وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ
إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ وَاصْنَعِ
الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ
إِنَّهُمْ مُغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِنْ
قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِنْ تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ
كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿٣٨﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ
وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُقِيمٌ ﴿٣٩﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ
التَّنُّورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ
إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ ۚ وَمَا آمَنَ مَعَهُ
إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٤٠﴾ وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا

Marfat.com

إِنَّ رَبِّي لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٤١﴾ وَهِيَ تَجْرِي بِهِمْ فِي مَوْجٍ كَالْجِبَالِ
وَنَادَىٰ نُوحٌ ابْنَهُ وَكَانَ فِي مَعْزِلٍ يَا بُنَيَّ ارْكَب مَّعَنَا
وَلَا تَكُن مَّعَ الْكَافِرِينَ ﴿٤٢﴾ قَالَ سَآوِي إِلَىٰ جَبَلٍ يَعْصِمُنِي
مِنَ الْمَاءِ ۚ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَن رَّحِمَ ۚ
وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِينَ ﴿٤٣﴾ وَقِيلَ يَا أَرْضُ
ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ
وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ ۖ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿٤٤﴾ وَ
نَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ
الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ﴿٤٥﴾ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ
إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ
إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٤٦﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ
أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ
الْخَاسِرِينَ ﴿٤٧﴾ قِيلَ يَا نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ أُمَمٍ
مِّمَّن مَّعَكَ ۚ وَأُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٤٨﴾ تِلْكَ
مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ ۖ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ
مِن قَبْلِ هَٰذَا ۖ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿٤٩﴾

Marfat.com

(اورنوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی۔ یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ کی قوم میں سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے ہیں تو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں آپ اس سے آزردہ خاطر نہ ہوں۔ آپ ہماری نگرانی میں کشتی بنایئے اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں مجھ سے کچھ نہ کہئے۔ بیشک وہ غرق ہو کر رہیں گے۔ اور نوح کشتی بنانے لگے۔ اور جب بھی گزرتے ان پر ان کی قوم کے سردار تو آپ کا مذاق اڑاتے۔ حضرت نوح علیہ السلام جواب میں کہتے: اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ایک دن ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے، جس طرح تم مذاق اڑاتے ہو۔ سو تم عنقریب جان لو گے کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اسے رسوا کردے گا اور کس پر آتا ہے وہ عذاب جو ٹالے نہ ٹلے گا۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلو اور اپنے گھر والوں کو بھی بجز ان لوگوں کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے اور ان لوگوں کو بھی بٹھالو جو ایمان لائے اور نوح علیہ اسلام کے ساتھ ایمان لانے والوں کی تعداد بس تھوڑی ہی تھی۔ اور نوح نے کہا سوار ہو جاؤ اس کشتی میں۔ اللہ تعالیٰ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا۔ بیشک میرا رب غفور رحیم ہے۔ وہ کشتی انہیں لے کر چلنے لگی، ایسی موجوں میں جو پہاڑ کی مانند ہیں اور پکارا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو ان سے الگ تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور ان کافروں کا ساتھ نہ دے۔ بیٹے نے کہا (مجھے کشتی کی ضرورت نہیں) میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا اور وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی جس پر رحم فرمائے اور حائل ہو گئی ان کے درمیان موج۔ پس وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا۔ اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے، اور اے آسمان تھم جا، اور پانی اتار دیا گیا، اور معاملے کا فیصلہ ہو گیا، اور کشتی جودی پہاڑ پر جا لگی، اور اعلان کر دیا گیا، رحمت سے دوری ہے ظالموں کی قوم کیلئے۔ اور نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا۔ پس کہا اے میرے رب بیشک میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بہتر حکم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں، وہ نہایت نابکار ہے۔ مجھ سے اس چیز کیلئے درخواست نہ کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔ نوح علیہ السلام نے فوراً عرض کیا، اے میرے رب، میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اس سے کہ اس بات کا تجھ سے سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔ ارشاد ہوا اے نوح، اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ۔ اپنے اوپر بھی اور ان امتوں پر بھی جو ان سے ظہور میں آئیں جو تمہارے ساتھ ہیں، اور ایسی امتیں بھی اٹھیں گی جن کو ہم بہرہ مند کریں گے۔ پھر ان کو ہماری طرف سے ایک عذاب دردناک پکڑے گا۔ یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کو وحی کے ذریعہ سے سنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ آپ اس کو جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔ پس صبر کیجئے، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔)

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ (سورة هود : ۳۶،۳۷)

(اورنوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی۔ یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ کی قوم میں سے بجز ان کے جو ایمان لا چکے ہیں تو جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں آپ اس سے آزردہ خاطر نہ ہوں۔ آپ ہماری نگرانی میں کشتی بنایئے اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں مجھ سے کچھ نہ کہئے۔ بیشک وہ غرق ہو کر رہیں گے۔)

Marfat.com

فیصلۂ الٰہی کا وقت آپہنچا

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اعلان براءت کر دیا تھا، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اب اس قوم کے دن گنے جاچکے ہیں۔ قدرت انہیں اب مزید مہلت نہیں دے گی۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہی خدشہ واقعہ کی صورت میں سامنے آ گیا ہے۔ اعلانِ براءت کے بعد نوح علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ آپ یقیناً باقی انبیاء کرام کی طرح ایک ایک شخص کے ایمان کے متمنی رہے ہیں اور آپ کی آرزو میں اب تک کوئی کمی نہیں آئی۔ آپ کی قوم نے اگرچہ آپ کو آزردہ اور دکھی کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ دنیا کا کوئی صدمہ ایسا نہیں جس سے آپ کو دوچار نہیں کیا۔ آپ نے ایک ایک کے ایمان کیلئے اللہ سے دعائیں مانگیں لیکن اب آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آپ کی قوم کے جن لوگوں کی قسمت میں ایمان لکھا تھا وہ ایمان لا چکے۔ اب کسی اور کے ایمان لانے کی کوئی امید نہیں۔ آپ کی تمام تر مساعی اپنی انتہاء کو پہنچ گئیں۔ آپ کی دعاؤں نے آخری اثر دکھا لیا۔ ان ظالموں نے اپنی قسمت پھوڑنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اس لئے اب آپ کو مزید آزردہ خاطر نہیں ہونا چاہئے۔ فیصلہ الٰہی کا وقت آپہنچا۔ اب انہیں اس فیصلے سے دوچار ہونا ہے۔ عذاب ان کا مقدر ہو چکا ہے۔ اب اس میں تاخیر کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تبلیغ و دعوت اور تذکیر و موعظت کا کام اپنے اتمام کو پہنچ گیا اور آپ کی قوم کے انکار و تمرد نے فیصلہ الٰہی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اب صرف ایک کام باقی ہے کہ عذاب آنے سے پہلے آپ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو عذاب کی تباہیوں سے بچا کر کسی عافیت کدہ اور دارالامان میں پہنچانا ہے۔ اس کے بعد ان ظالموں کو مکمل تباہ کر دینا ہے۔ عذاب چونکہ طوفان کی شکل میں آ رہا ہے اس لئے اس سے بچاؤ کیلئے ضروری ہے کہ آپ ایسی کشتی تیار کریں جو اس عذاب کے ہولناک تلاطم میں آپ کے تحفظ کا ذریعہ بن سکے۔ اس لئے آپ کشتی تیار کرنا شروع کر دیجئے۔ لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک یہ کہ یہ سارا کام ہماری نگرانی میں ہوگا اور دوسرا یہ کہ ہماری رہنمائی میں ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ نوح علیہ السلام پہلے سے کشتیاں بنانے میں ماہر تھے۔ اس لئے یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر اپنی مرضی کی کشتی بنائیں گے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ اس کام سے واقف نہیں اور ہم اس بھی آگاہ ہیں کہ اس کام کے شروع کرنے سے پہلے اپنی قوم کی طرف سے آپ کے دل میں قسم قسم کے اندیشے ہوں گے کہ وہ شاید آپ کو یہ کام کرنے نہ دیں، رکاوٹیں کھڑی کریں اور تعمیر کا سامان اٹھا کر لے جائیں۔ اس لئے فرمایا کہ آپ سب کے سامنے اس کام کا آغاز کریں اور اپنے دل سے اندیشوں کو نکال دیں کیونکہ آپ پر ہماری نگرانی ہوگی۔ آپ کی ہر چیز ہماری نگرانی میں ہوگی۔ کسی اور کیلئے دخل اندازی کا کوئی موقع نہیں ہوگا۔ گزرنے والے تمسخر ضرور اڑائیں گے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکیں گے۔ رہی یہ بات کہ آپ اس صنعت سے واقف نہیں ہیں تو اس کی بھی فکر نہ کیجئے جس خدا نے داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہا موم کر دیا تھا وہ آپ کے ہاتھوں میں اس صنعت کا کمال پیدا کرے گا۔ آپ کے دماغ میں اس کا نقشہ اترتا چلا جائے گا۔ چنانچہ کشتی کا طول کیا ہو؟ عرض کیا ہو؟ درجات کتنے ہوں؟ میٹریل کیسا استعمال ہو؟ جو پانی کی خوفناک موجوں کا مقابلہ کر سکے۔ ان میں سے ایک ایک بات اللہ کی طرف سے بتائی جائے گی۔ رہا گزرنے والوں کا رویہ تو آپ ان کو منہ نہ لگائیے بلکہ وہ تو رحم کے قابل لوگ ہیں کیونکہ آپ کو پوری طرح یقین ہے کہ وہ عنقریب غرق کئے جائیں گے تو موت جس کے سر پر کھڑی ہو، اس کی باتوں کا کیا برا ماننا۔ وہ کچھ بھی کہیں، آپ نظر انداز فرمائیں۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ ۗ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ ؕ قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ۝ (سورۃ ہود : ۳۸)

(اور نوح کشتی بنانے لگے۔ اور جب بھی گزرتے ان پر ان کی قوم کے سردار تو آپ کا مذاق اڑاتے۔ حضرت نوح علیہ السلام جواب میں کہتے: اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو ایک دن ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے، جس طرح تم مذاق اڑاتے ہو۔)

قومِ نوحؑ کا استہزا

"وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ" اس کے ترجے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ عربی زبان کے معروف اسلوب کے مطابق یَصْنَعُ سے پہلے جَعَلَ محذوف ہے۔ اس کا معنی ہوگا کہ نوح علیہ السلام نے کشتی بنانا شروع کر دی۔ ترجے کی دوسری شکل یہ ہے کہ نوح کشتی بناتے ہیں۔ گویا ایک منظر کشی کی جا رہی ہے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ جیسے ہی اللہ نے اپنے اس بندے کو کشتی بنانے کا

Marfat.com

حکم دیا جس کا کام زندگی بھر تعلیم وتربیت اور تذکیر ودعوت رہا ہے۔ جس نے ساری زندگی لوگوں کی زندگیوں کی تعمیر کی ہے اور دل ودماغ کی الجھی ہوئی کلیں سیدھی کی ہیں۔ آج اچانک وہ بڑھئی کا کام شروع کر رہا ہے۔ اس نے ایک لمحے کو نہیں سوچا کہ یہ کام میرا تو نہیں۔ میں تو اس کام کے کبھی قریب بھی نہیں پھٹکا، مجھے اس کام سے کیا سروکار۔ بس حکم ملتے ہی تعمیل کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ اسباب فراہم ہونا شروع ہو گئے اور تعمیر کیلئے جن امور کا سرانجام دینا ضروری تھا۔ ان میں سے ایک ایک کو سرانجام دیا جانے لگا۔ نگرانی چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہے اس لئے کسی کی مداخلت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ نوح علیہ السلام مخالف ماحول میں بھی نہایت اطمینان سے اپنا کام شروع کر چکے ہیں۔ البتہ مخالفین کے استہزاء سے ہر وقت کا واسطہ ہے۔ وہ جب بھی وہاں سے گزرتے ہیں انہیں خود بھی حیرت ہوتی ہے اور اس کا اظہار بھی برہنہ اور جارحانہ انداز میں کرتے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں بھی مخالفین کا انداز نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا اور اب تو انہیں بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ اس طرح کی باتیں کرتے کہ تمہارے دماغ میں خلل کا تو ہمیں پہلے ہی اندیشہ تھا کیونکہ لگتا تھا کہ بڑھاپے سے تم سٹھیا گئے ہو، لیکن اب تو یقین ہو گیا ہے کہ تم دماغی عارضہ کا شکار ہو گئے ہو۔ تم بتاؤ ہمارے قریب قریب کوئی دریا نہیں، یہ تمہاری کشتی آخر کہاں چلے گی؟ کیا یہ خشکی پر دوڑے گی؟ آخر اسے کس مقصد کیلئے تم بنا رہے ہو؟ ایسی ہی باتوں سے وہ مذاق اڑاتے، تمسخر کرتے اور ایک تماشا بنائے رکھتے۔ لیکن نوح علیہ السلام چونکہ اللہ کے تربیت یافتہ تھے۔ آپ کے اللہ کے اخلاق سے تخلق کیا تھا اس لئے آپ ان کے ناگوار لہجے کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت فرما رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ کچھ کہا تو صرف یہ کہ آج تم ہم پر ہنس رہے ہو، وہ وقت دور نہیں جب ہم تم پر ہنسیں گے، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم اسی طرح کی پھبتیاں تم پر چست کریں گے جس طرح کی تم کر رہے ہو بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح ہمارا یہ فعل تمہاری نگاہوں میں ہنسی اور مذاق کا سبب ہے اسی طرح کل ہم جب تمہیں ایک ہولناک انجام سے دوچار ہوتا دیکھیں گے تو ہمیں تمہارے انجام سے دکھ تو ہو گا لیکن ساتھ ہی اللہ کی تائید ونصرت اور اس کے وعدوں کے وفا کرنے پر ایک طرح کی خوشی بھی ہو گی اور ہم اس پر انتہائی شکر بجا لائیں گے۔ عربی زبان میں بعض دفعہ صوتی ہم آہنگی کیلئے بعض الفاظ کو دہرا دیا جاتا ہے لیکن اس کا معنی وہ مقصود نہیں ہوتا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا برائی کا بدلہ اس جیسی برائی ہے، لیکن حقیقت میں اسلام کی تعلیم برائی کا بدلہ برائی نہیں بلکہ انصاف ہے، لیکن یہاں صرف ملتے جلتے الفاظ کا تکرار ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی الفاظ کے تکرار سے جو بات سمجھ میں آ رہی ہے وہ مقصود نہیں بلکہ مقصود وہ ہے جس کا ہم نے ذکر کیا۔

حضرت نوحؑ کے جواب کا مفہوم

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی کی موت یا کسی کی بربادی اظہارِ خوشی کا موقع نہیں۔ لیکن اگر آپ اسے ایک دوسرے پہلو سے دیکھیں تو پھر شاید آپ بھی اسے دوسرا معنی دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ مثلاً آپ دیکھتے ہیں کہ ایک باغ کو خودرو پودوں اور جھاڑیوں نے جنگلی جڑی بوٹیوں اور جا بجا اٹھے ہوئے ٹیلوں نے بالکل ویران کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوبارہ پھر یہاں باغ لہلہائے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ ان تمام خودرو اور جنگلی بوٹیوں سے اس باغ کا چپہ چپہ خالی کرایا جائے اور تمام ٹیلے اٹھا کر زمین ہموار کی جائے۔ تخریب کا یہ عمل بظاہر ایک بربادی ہے لیکن اس کے بعد باغ کی صورت میں سامنے آنے والا نتیجہ جب دل ودماغ پر ابھرتا ہے تو یہی تخریب خوشی کا پیغام بن جاتی ہے۔ کسی انسان کی لاش دیکھنا کسی انسان کیلئے کبھی خوشی کا باعث نہیں ہو سکتا لیکن اگر ایک ڈاکو جس نے پوری آبادی کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں اور کتنے لوگ اس کے ہاتھوں زندگی کھو چکے ہوں اور کتنی عزتوں کے فانوس اس ظالم کے ہاتھوں بجھ چکے ہوں اگر وہ کسی مقابلہ میں مارا جائے اور اس کی لاش چوراہے میں لا کے پھینک دی جائے تو یقیناً ہر دیکھنے والا اسے دیکھ کر خوشی محسوس کرے گا۔ اللہ کی زمین پر نیکیوں کا باغ اجاڑ کر برائیوں کے جان لیوا پودوں کو اگانا ظلم وفساد سے زمین کو بھر دینا اور مفادات کے اندھے کنویں کھود کر زندگی کیلئے خطرات پیدا کرنا اور جو اللہ کی زمین پر از سر نو نیکیوں کی بہار پیدا کرنا چاہیں ان کے قتل کے درپے ہو جانا جو لوگ اس صورتحال کو بروئے کار لانا کا ذریعہ بنتے ہیں اور زمین پر انسانوں کا جینا مشکل کر دیتے ہیں ان لوگوں کو جب اللہ کے عذاب سے ختم کر کے زمین کے فساد کو ختم کیا جاتا ہے تو یقیناً یہ بھی ایک خوشی کا موقع ہے جس پر اہل ایمان کو مسرور ہونا چاہئے۔

Marfat.com

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ (سورۃ ھود : ۳۹)

(سوتم عنقریب جان لوگے کہ کس پر آتا ہے وہ عذاب جو اسے رسوا کردے گا اور کس پر آتا ہے وہ عذاب جو ٹالے نہ ٹلے گا۔)

تمسخر کا مزید جواب

حضرت نوح علیہ السلام نے کفار کے تمسخر کے جواب میں مزید یہ فرمایا کہ تم میرے بارے میں جو چاہو سو کہو مجھے خللِ دماغ کا شکار کہہ کر جتنی چاہو میری توہین کرو لیکن ایک بات یاد رکھو کہ تمہارے اس تمسخر کا جو انجام ہونے والا ہے وہ اب زیادہ دنوں کی بات نہیں۔ تم عنقریب دیکھ لوگے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔ حیرت کی بات ہے کہ نوح علیہ السلام کفار کی کسی بات سے متاثر دکھائی نہیں دیتے۔ انہیں اللہ کے وعدوں پر اس حد تک یقین تھا کہ اس کی قوت میں کوئی بات بھی مخل نہیں ہوسکتی تھی۔ البتہ نہایت دلسوزی سے زیادہ سے زیادہ جو بات ان سے کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ عذاب کا تو فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ وہ عذاب کس پر اترے گا، کسے رسوا کرے گا اور کون تاریخ میں صرف اور صرف عبرت کے طور پر یاد کیا جائے گا لیکن اس سب کے باوجود آپ صرف اشاروں میں انہیں جواب دے رہے ہیں۔ براہ راست بات کہنے سے چونکہ دلآزاری ہوتی تھی آپ نے اسے بھی پسند نہیں فرمایا۔ صرف یہ کہا کہ عنقریب تم جان لوگے کہ کس پر عذاب اترتا ہے، پھر عذاب کی دو قسمیں بیان فرمائیں۔ ایک وہ عذاب ہے جو صرف جھنجھوڑنے کیلئے آتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں میں بھلائی کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو یہ ایمان کی طرف آ جائیں کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ عموماً تکلیف میں مبتلا ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرتی ہے اور اسے صحیح بات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے لیکن جب اس طرح کے جھٹکے بھی کسی قوم کو راہ راست کی طرف نہیں لاتے تو پھر آخران پر وہ عذاب آتا ہے جو ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ اور یہ عذاب پہلے عذاب کی طرح واپس نہیں جاتا بلکہ یہ جس بستی پر نازل ہوتا ہے وہیں ڈیرے ڈال دیتا ہے اور اس کی عبرت انگیز سرگزشت آثار اور کھنڈروں کی شکل میں بھی اور تاریخ کے صفحات میں بھی محفوظ ہو جاتی ہے تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے انجام سے سبق سیکھیں۔ اس طرح سے ان مذاق اڑانے والوں کو ان کے اصل انجام کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش فرمائی لیکن جب وہ کسی طرح بھی اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ ان کی سرکشی میں اور اضافہ ہو گیا تو تب اللہ کا حکم آ پہنچا۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ (سورۃ ھود : ۴۰)

(یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور ابل پڑا تو ہم نے کہا ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کرلو اور اپنے گھر والوں کو بھی بجز ان لوگوں کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے اور ان لوگوں کو بھی بٹھالو جو ایمان لائے اور نوح علیہ اسلام کے ساتھ ایمان لانے والوں کی تعداد بس تھوڑی ہی تھی۔)

عذاب ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے

کشتی بن کے تیار ہوگئی۔ مخالفین کی زبان درازیاں اپنی انتہاء کو پہنچ گئیں۔ مخالفین انتظار میں ہیں کہ دیکھئے یہ کشتی کس کام آتی ہے۔ نوح علیہ السلام جانتے ہیں کہ اب عذاب آیا ہی چاہتا ہے، لیکن وہ خود بخود تو نہیں آئے گا وہ بھی ہماری طرح اللہ کے حکم کا پابند ہے۔ چنانچہ پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ عذاب اس وقت آیا جب ہمارا حکم آ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی قوم پر جب عذاب آتا ہے تو وہ اللہ کے حکم سے آتا ہے۔ جس طرح ہمارے بعض نام نہاد دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ کائناتی قوتیں اپنا کام کرنے میں آزاد ہیں، وہ جب چاہتی ہیں زمین میں زلزلہ لے آتی ہیں، جب چاہتی ہیں سمندروں میں طوفان آ جاتا ہے، یہ ایک ایسا تباہ کن نظریہ ہے جسے اختیار کر لینے سے ایمان تو خیر جاتا ہی ہے قرآن کریم جیسی علمی کتاب کی تصریحات کا بھی کوئی جواب بن نہیں آتا۔ معذب قوموں پر جب بھی عذاب آئے ہیں قرآن کریم کی گواہی کے مطابق اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا ہے۔ مخلوقات میں چاہے وہ زمین و آسمان ہی کیوں نہ ہوں کسی میں یہ ہمت نہیں کہ وہ اپنے طور سے کسی تبدیلی کا سبب بن سکے۔ تشریعی قانون میں اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو آزادی دی ہے لیکن کائنات کا وہ نظام جو تکوینی قانون کے تحت چل رہا ہے۔ اس میں جہاں تہاں کوئی قوت اپنا فرض انجام

Marfat.com

دے رہی ہے وہ اللہ کے قانون کی پابند ہے۔ اپنی آزادانہ مرضی سے کچھ نہیں کرسکتی۔ اس لئے طوفانِ نوح کا ذکر کرنے سے پہلے فرمایا کہ جب ہمارا حکم آگیا کہ اب عذاب کو طوفان کی شکل میں آنا چاہیے تو تب اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک تنور پھٹا۔ بعض اہل علم نے اسے استعارہ سمجھ کر اس سے سائیکلونی طوفان مراد لیا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک صحیح وہی ہے جو قرآن کے صریح الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ طوفان کی ابتداء ایک خاص تنور سے ہوئی جس کے نیچے سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ اس کے بعد سورۂ قمر کی تصریح کے مطابق آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے، موسلادھار بارش شروع ہوگئی، زمین میں جگہ جگہ چشمے ابل پڑے، اور یہ دونوں طرح کے پانی اس کام کو پورا کرنے کیلئے مل گئے جو مقدر کر دیا گیا تھا۔

طوفان کا آغاز ہوتے ہی یا اس سے پہلے نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ ہر طرح کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو۔ اپنے گھر والوں کو بھی سوار کرلو۔ ہاں ان میں سے جن کے بارے میں اللہ کا فیصلہ پہلے صادر ہوچکا ہے انہیں سوار کرنے کی اجازت نہیں۔ اس سے مراد یہ تھی کہ اس کشتی میں وہ لوگ سوار ہوں گے جو صاحبِ ایمان ہوں اور جس کے پاس ایمان و عمل کا سرمایہ نہ ہو اس کیلئے اس کشتی میں کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ نوح علیہ السلام کی بیوی کو کشتی میں سوار نہیں کیا گیا۔

قرآنِ کریم کی اس وضاحت سے کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ صرف صاحبِ ایمان لوگ کشتی پر سوار ہوئے ہیں اور انہیں کو اس طوفان سے بچایا گیا ہے۔ مؤرخین اور علماء انساب کی ایک بہت بڑی غلطی کی اصلاح ہوتی ہے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ تمام انسانی نسلوں کا شجرۂ نسب حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں تک پہنچتا ہے۔ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح کی ہے کہ اس کشتی میں صرف حضرت نوح کا خاندان ہی سوار نہیں تھا بلکہ ایک معتدبہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو نوح علیہ السلام پر ایمان لاچکے تھے اور سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ مریم میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ موجودہ دنیا میں بسنے والے انسان ان لوگوں کی اولاد ہیں جو نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے جن میں آپ کی اولاد بھی تھی اور آپ پر ایمان لانے والے بھی لیکن قرآنِ کریم آپ کے تین بیٹوں کا ذکر کہیں نہیں کرتا۔ یہ صرف اسرائیلی روایات کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی ہے جس پر مؤرخین نے اپنی تحقیقات کا مدار رکھا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام جب کشتی کو روانگی کیلئے تیار کرچکے تو تب اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے اپنے ساتھیوں کو کشتی پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ قرآنِ کریم اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ (سورۃ ھود : ۴۱)

(اور نوح نے کہا سوار ہو جاؤ اس کشتی میں۔ اللہ تعالیٰ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا لنگر انداز ہونا۔ بیشک میرا رب غفور رحیم ہے۔)

مومن کا اصل سہارا

اس آیت کو پڑھیے اور غور فرمائیے کہ نوح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے لوگوں کے سوا سب لوگ طوفان کی نذر ہو رہے ہیں۔ کوئی ادھر ڈوب رہا ہے کوئی ادھر ڈوب رہا ہے۔ اپنی ساری کوششوں کے باوجود کسی کیلئے کوئی پناہ نہیں۔ ان کے بڑے بڑے متمردین لہروں کی نذر ہو چکے ہیں۔ ایک نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھی ہیں جنہیں پانی سے بچاؤ کے وسائل میسر ہیں۔ ایک محفوظ پناہ گاہ ان کے پاس ہے۔ ضرورت کی ساری چیزیں ہمراہ ہیں۔ اسباب کی دنیا میں کسی چیز کی ان کے یہاں کمی نہیں۔ بایں ہمہ وہ اپنے ساتھیوں کو ہدایت فرماتے ہیں کہ اس میں سوار ہونے سے پہلے یہ مت سمجھنا کہ تم اپنے وسائل کی مدد سے اس طوفان سے بچ جاؤ گے یا یہ کشتی تمہیں بچالے گی۔ ایک مومن کا اصل بھروسہ اسباب پر نہیں مسبب الاسباب پر ہوتا ہے۔ ہم اسی کے بھروسے پر کشتی میں قدم رکھیں گے۔ ہمارے لئے اصل سہارا وہی ہے۔ اس کے چاہنے سے کشتی تیر سکتی ہے اور وہ اگر نہ چاہے تو اس کے تیرنے کی کوئی ضمانت نہیں۔ بڑے بڑے بحری جہاز ڈوب جاتے ہیں اور اگر اللہ بچانا چاہے تو کشتی کا ایک ٹوٹا ہوا تختہ اپنے اوپر سوار مسافروں کو بچالیتا ہے۔ یہی عقیدہ ایک مومن کی حقیقی قوت ہے۔ چنانچہ اسی کا نام لے کر وہ اس کشتی میں سوار ہوئے کہ اللہ ہی کے نام سے اس کشتی کا چلنا ہے اور لنگر انداز ہونا ہے۔ یہ اس کی بے پایاں رحمت ہے کہ آج اس نے ہمیں ایمان کی توفیق بخشی اور اس عذاب سے ہمیں محفوظ فرمایا۔

Marfat.com

وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰى نُوْحُ ۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۲﴾ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ﴿۴۳﴾ (سورۃ ہود : ۴۲۔۴۳)

(وہ کشتی انہیں لے کر چلنے لگی، ایسی موجوں میں جو پہاڑ کی مانند ہیں اور پکارا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جوان سے الگ تھا۔ اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہوجا اور ان کافروں کا ساتھ نہ دے۔ بیٹے نے کہا (مجھے کشتی کی ضرورت نہیں) میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا اور وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کہا آج اللہ کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وُہی جس پر رحم فرمائے اور حائل ہوگئی ان کے درمیان موج۔ پس وہ ڈوبنے والوں میں سے ہوگیا۔)

عذاب تو عظیم تھا ہی بچانے والا عظیم تر تھا

اب وہ کشتی حضرت نوح علیہ السلام، آپ کے اہل خانہ اور آپ پر ایمان لانے والوں کو اس شان سے لے کر چلی کہ جس سے قدم قدم پر اللہ کی قدرت اور بندوں پر اس کی رحمت کا اظہار ہوتا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے چشمے ابلے اور آسمان سے موسلا دھار بارش برسی جس سے جل تھل ایک ہوگیا۔ ہر نشیبی علاقے میں پانی بھر گیا۔ ہوتے ہوتے بلندیاں بھی پانی میں چھپ گئیں اور کشتی پانی کی سطح پر دھیرے دھیرے بہنے لگی۔ قرآن کریم کا بیان اس سے مختلف صورتحال بتاتا ہے۔ یہ صورتحال بھی دل ہلا دینے کیلئے کافی ہے۔ لیکن وہاں تو حال یہ تھا کہ صرف پانی ہی نے ہر چیز کو چھپا نہیں دیا تھا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ سمندر بھی ساتھ شامل ہوگیا تھا اور اس کے سیلاب نے جب زمین کا رخ کیا تو ہر طرف پہاڑوں کی طرح موجیں اٹھنے لگیں جس نے کبھی کنارے پر کھڑے ہو کر سمندر میں اٹھتی ہوئی موجیں دیکھی ہوں وہ ان کی سطوت ورفعت کا کچھ اندازہ کرسکتا ہے۔ لیکن حقیقی اندازہ اسے ہوسکتا ہے جس نے سونامی جیسے طوفان دیکھے ہوں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ کشتی پانی کی سطح پر بہہ رہی تھی لیکن اس کے دائیں بائیں ایسے موجیں اٹھ رہی تھیں جیسے بلند وبالا پہاڑ ہوں۔ ایسی منہ زور طغیانی میں بڑے بڑے بحری جہاز اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں لیکن اندازہ لگایئے کہ یہ کشتی کس کے سہارے پانی پر رواں دواں تھی۔ دھاڑتی ہوئی موجیں اور تند و تیز پانی کے دھارے کشتی کے دائیں بائیں سے گزرتے تھے لیکن کشتی سب کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ اس کشتی میں نہ کوئی بادبان تھا اور نہ مشینی قوت۔ اسے محفوظ رکھنے والی اور اپنی منزل کی طرف لے جانے والی وہ ذات تھی جس کے حکم سے یہ طوفان اٹھا تھا۔ عین اس حالت میں جبکہ قوم کے بیشتر لوگ ڈوب چکے تھے کہ اچانک حضرت نوح علیہ السلام کو الگ تھلگ پہاڑ کے دامن میں اپنا فرزند کھڑا نظر آیا۔ آپ جانتے تھے کہ میرا یہ بیٹا کافر ہے۔ اس لئے اللہ کی رحمت سے محروم ہے لیکن پدری محبت نے جوش مارا اور کچھ اس خیال نے سہارا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ فرمایا تھا، شاید میرے بیٹے کے بچاؤ کی بھی کوئی صورت نکل آئے۔ آپ نے بیٹے کو پکارا کہ بیٹا دیکھ ایک طرف قوم کے متمردین اور بڑے بڑے کافر ہیں جو اس طوفان کی نذر ہوگئے ہیں اور دوسری طرف یہ کشتی ہے جو آج عافیت کی جگہ اور اللہ کی رحمت کا مرکز ہے تو کافروں کا ساتھ چھوڑ دے اور تائب ہو کر ایمان کا دامن تھام کر میرے ساتھ کشتی میں سوار ہوجا۔ کچھ بعید نہیں کہ اس آخری وقت کا ایمان اللہ قبول فرمالے۔ لیکن بگڑے ہوئے بیٹے نے بڑی رعونت سے کہا: کہ میں آپ کے ساتھ کشتی پر سوار نہیں ہوں گا۔ یہ سامنے بلند و بالا پہاڑ کھڑے ہیں، میں جوان آدمی ہوں، میں ان میں سے کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا اور وہ مجھے غرق ہونے سے بچالے گا۔ نوح علیہ السلام نے اس کا جواب سن کر بڑی دردمندی سے فرمایا: کہ اصل طاقت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جب چاہتا ہے اپنے بندوں کو نوازتا ہے اور جب بے نیازی پر آتا ہے یا عذاب دینے کا فیصلہ کرلیتا ہے تو پھر سب اس سے عافیت مانگتے ہیں اور نفسی نفسی پکارتے ہیں۔ یہ طوفان اللہ کا عذاب ہے جسے امر اللہ کہا گیا ہے۔ آج اس عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں۔ صرف وہ بچے گا جس پر اللہ رحم فرمائے گا اور رحم اس پر ہوگا جو اللہ کی بندگی اور رسول کی رسالت اور آخرت کا اقرار کرے گا اور اپنے آپ کو اللہ کے دامنِ رحمت میں دے دے گا۔ اللہ کا قانون ہے کہ وہ عذاب آجانے کے بعد پھر کسی کی نہیں سنتا۔ اس لئے ایک موج اٹھی اور باپ بیٹے کے درمیان حائل ہوگئی اور وہ مغرور بیٹا چشم زدن میں پانی کی لہروں کی نذر ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس ہولناک ٹریجڈی کا آخری منظر تھا۔ اس کے بعد اللہ کے عذاب کا مقصد پورا ہوگیا۔ نافرمان قوم اپنے انجام کو پہنچی۔ فرمانبردار بچالئے گئے، زمین نافرمانی کے کانٹوں سے صاف کردی گئی۔ اس کے بعد کی تعمیر کیلئے آسمان وزمین کو احکام دے دیئے گئے۔

Marfat.com

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (سورۃ ھود : ۴۴)

(اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے، اور اے آسمان تھم جا، اور پانی اتار دیا گیا، اور معاملے کا فیصلہ ہو گیا، اور کشتی جودی پہاڑ پر جا لگی، اور اعلان کر دیا گیا، رحمت سے دوری ہے ظالموں کی قوم کیلئے۔)

ارض و سما کو احکام

زمین کو حکم دیا گیا کہ اپنا پانی نگل جا اور آسمان سے کہا گیا کہ تھم جا اور بارش کو روک دے۔ بارش کے رک جانے، زمین کے ابلنے والے چشموں کے ٹھہر جانے اور زمین کے پانی کو نگل جانے سے بھی زمین کی خشکی کا سامان نہیں ہو سکتا تھا اور مقصود یہ تھا کہ زمین پوری طرح خشک ہو جائے تاکہ رہائش کے قابل ہو سکے اور انسانی اور حیوانی غذاؤں کے حصول کیلئے پیداوار دینے کی صلاحیت پیدا کر سکے جبکہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ پانی کو اسی قدر نگلتی ہے جو اس کی آبیاری کیلئے ضروری ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ پانی ضرورت سے زیادہ نگل لے تو دلدل بن جائے جہاں نہ انسانی آبادی ممکن ہو اور نہ کاشتکاری کے قابل رہے۔ اس لئے تیسرے جملے میں فرمایا کہ زمین خشک کر دی گئی، اس کا پانی ختم کر دیا گیا۔ یقیناً اس کی یہی صورت رہی ہوگی کہ ضرورت کے مطابق زمین نے اس کو اپنے اندر جذب اور باقی ندی نالوں کے ذریعے دریاؤں اور سمندروں میں پہنچا دیا گیا۔ اس طرح سے دونوں کام مکمل ہو گئے۔ عذاب کے ذریعے کافروں کی جڑ کاٹ دی گئی اور زمین کو خشک کر کے اہلِ ایمان کے بسنے کا امکان پیدا کر دیا گیا۔

کیا طوفان عالمگیر تھا؟

یہاں عام طور پر اہلِ علم نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ طوفانِ نوح کیا صرف اس علاقے میں آیا تھا جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی قوم آباد تھی یا ساری زمین اس کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ باتیں دونوں طرح کی کہی گئی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوری زمین پر طوفان کے پھیل جانے کا کوئی ثبوت تاریخ کے پاس نہیں۔ ہمارے پاس ایسے واقعات کو جاننے کیلئے تین ہی ذرائع ہیں۔ (1) تاریخ، (2) آثارِ قدیمہ اور (3) طبقات الارض کا علم۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے۔ یہ زمانہ اگرچہ قبل از تاریخ کا ہے لیکن آسمانی کتابوں نے کم از کم انبیاء کی تاریخ کو کسی نہ کسی حد تک ضرور بیان کیا ہے۔ چنانچہ بعض آسمانی کتابوں میں طوفانِ نوح کا تذکرہ مختلف حوالوں سے ملتا ہے لیکن کسی جگہ بھی اس کا ذکر نہیں کیا گیا کہ یہ طوفان پوری زمین پر آیا تھا۔ البتہ قرآنِ کریم کے اشاروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مرکز وہی علاقہ ہے جہاں قومِ نوح آباد تھی اور وہ دجلہ اور فرات کا دوآبہ ہے اور دوبارہ اسی سرزمین پر انسانوں کی آبادی ہوئی کیونکہ جودی پہاڑ اسی علاقے میں آباد ہے۔ جہاں تک آثارِ قدیمہ کا تعلق ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں طوفان کے آثار جابجا ملتے ہیں اور جب بھی کہیں کھدائی ہوئی ہے، کچھ نہ کچھ ایسے نوادرات ضرور ملے ہیں جس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن دنیا کے دوسرے علاقوں میں کہیں بھی ایسے طوفان کی علامات نہیں ملتیں جسے عالمگیر کہا جا سکتا۔ اسی طرح طبقات الارض کے ماہرین نے ہمیشہ اسی علاقے میں ایک عظیم طوفان کی خبر دی ہے اور دوسرے کسی علاقے میں اس کے شواہد آج تک میسر نہیں آ سکے۔ اس لئے یہ بات گمانِ غالب سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ طوفان عالمگیر طوفان نہ تھا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت کی تمام انسانی آبادی اس کا ہدف تھی۔ اس لئے اسے عالمگیر بھی کہا جا سکتا ہے۔

کشتی کہاں رکی؟

تورات کی شہادت کے مطابق کشتی کوہ ارارات پر رکی جبکہ قرآنِ کریم نے متعین طور پر جودی پہاڑ کا نام دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ارارات جس طرح پہاڑ کا نام ہے اسی طرح ایک سلسلۂ کوہستان کا نام بھی ہے جو آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی سلسلۂ کوہستان کا ایک پہاڑ جودی بھی ہے جو موصل اور جزیرۂ ابنِ عمر کے پاس ہے اور اس پر نزولِ قرآنِ کریم سے پہلے کی بعض تاریخی کتب شہادت دیتی ہیں۔ ارسطو کے ایک شاگرد نے اپنی تاریخ میں اس کی تائید کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری سے تقریباً اڑھائی سو سال پہلے لکھی جانے والی ایک کتاب میں بھی اسی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ موصل اور اس

Marfat.com

کے اڑوس پڑوس میں رہنے والے لوگ اب تک اپنے پاس اس کشتی کے ٹوٹے ہوئے کچھ ٹکڑے رکھتے ہیں اور جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو ان ٹکڑوں کو پانی میں بھگو کر تبرک کے طور پر پلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بیماروں کو شفا دیتے ہیں۔

بعض اسرائیلی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دس مہینے تک یہ کشتی پانی کی لہروں پر تیرتی رہی۔ اس کے بعد طوفان رکا، پانی اترا اور کشتی جودی پہاڑ پر رکنے کے قابل ہو سکی۔ یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کشتی کتنا عرصہ پانی کی سطح پر رہی لیکن یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی بلندی اس قدر تھی کہ آبادیوں کا تو کیا ذکر پہاڑ بھی پانی میں چھپ گئے تھے۔ پانی کچھ کم ہوا تو کشتی جودی پہاڑ پر رک سکی۔

بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ کا مفہوم

اس طرح سے جب طوفانِ نوح کا مقصد پورا ہو گیا، کفر اپنے برے انجام کو پہنچا اور اہلِ ایمان بچا لئے گئے تو تب فرمایا: دوری ہو ظالموں کی قوم کیلئے، یہ اظہار نفرت و لعنت کا جملہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا گیا "خس کم جہاں پاک!" یہاں "بُعد" کا لفظ لعنت کے معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ لعنت اللہ کی رحمت سے دوری کو کہتے ہیں۔ اتنا بڑا حادثہ کہ لاکھوں انسان لقمۂ آب ہو گئے، نسلیں برباد کر دی گئیں۔ بجائے اس کے کہ ان کی ہلاکت پر تأسف کا اظہار کیا جاتا، اظہار نفرت و لعنت کیا جا رہا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی علاقے میں انسانیت کے قاتل جمع ہو جائیں جن سے ہر وقت انسانوں کی جانوں کو خطرہ ہو اور جب بھی ان کا بس چلے تو وہ زمین کو فساد سے بھر دیتے ہوں تو اگر کبھی حکومت کو ان پر قابو مل جاتا ہے یا وہ ان پر قابو پانے کیلئے طاقت استعمال کرتی ہے تو اس میں وہ تمام مارے جاتے ہیں تو انتہائی رحم دل اور سنجیدہ جرنیل بھی ان کی لاشوں پر کھڑے ہو کر یہی کہتا ہے، خس کم جہاں پاک!۔ اللہ کی نگاہ میں سب سے قابلِ نفرت چیز کفر اور شرک ہے۔ یعنی اللہ سے بغاوت اور اس کی نافرمانی۔ جو قوم ان دونوں جرائم میں تمام حدود سے تجاوز کر جاتی ہے وہ زمین پر رہنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس کا وجود ایک متعفن لاش کی طرح ہے جسے کسی بھی گڑھے یا بند کنوئیں میں پھینک دیا جاتا ہے۔

ایک اہم حقیقت

ایک نظر پلٹ کر اس آیت سے سابقہ آیت پر دوبارہ ڈال لیجئے جس میں یہ منظر دکھایا گیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جیسا عظیم باپ اپنے ناہنجار بیٹے کو ایک پہاڑ کے دامن میں کھڑا دیکھ کر شفقت پدری سے مجبور ہو کر کہتا ہے کہ بیٹا آؤ ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ، لیکن وہ ناہنجار بیٹا تباہی و بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اپنی سرکشی سے باز نہ آیا اور کہا کہ میں آپ کے ساتھ سوار ہونا نہیں چاہتا اور مجھے اس طوفان کی بھی کوئی پرواہ نہیں، میں ان پہاڑوں میں سے بھی کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا اور وہ مجھے بچا لے گا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ گفتگو پسند نہیں آئی، چنانچہ ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور بیٹا چشم زدن میں موجوں کی نذر ہو گیا۔ بیٹا کیسا بھی ناہنجار ہو اس کی موت باپ کیلئے قابلِ برداشت نہیں ہوتی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے دل پر نہ جانے کیسی قیامت گزری ہو گی۔ چنانچہ انہوں نے اسے بچانے کیلئے آخری کوشش کے طور پر اللہ سے شکایت بھی کی اور التجا بھی۔ لیکن ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام کی شکایت اور التجا کا ذکر بعد میں کیا، لیکن زمین و آسمان کو جو احکام دیئے گئے اور جس طرح دوبارہ انسانی آبادی کے امکانات پیدا کیئے گئے اور اس معذب قوم پر جس طرح نفرت و لعنت کا اظہار فرمایا گیا یہ سب باتیں پہلے کہی گئیں۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایک پیغمبر کے جوان بیٹے کا غرقِ آب ہو جانا ایک حادثہ سہی لیکن وہ ایسا بڑا حادثہ نہیں کہ اسے بطور خاص ذکر کیا جائے۔ اگر وہ بیٹا صاحب ایمان ہوتا تو اولاً تو ایسے حادثے کا کوئی امکان نہ تھا اور اگر کبھی کسی حکمت کے تحت یہ حادثہ وجود میں آ ہی جاتا تو اس کو جس ہمدردی اور دکھ کے ساتھ ذکر کیا جاتا اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں اس کے ذکر کو روک کر سلسلۂ سخن میں دوسری باتوں کا لے آنا یہ اشارہ کر دینے کیلئے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اصل قدر و قیمت ایمان کی ہے۔ وہ بلالِ حبشی کو نصیب ہو جائے تو اس کی سرفرازی اسے کعبہ کی چھت پر کھڑا کر دیتی ہے لیکن وہ شخص یا وہ قوم جو اللہ سے بغاوت کرتی ہے ان میں چاہے پیغمبر کا بیٹا کیوں نہ ہو اس کی قدر و قیمت اتنی بھی نہیں کہ سلسلۂ بیان میں اسے مناسب جگہ دی جائے۔ یہ تو ظالموں کا گروہ ہے جنہوں نے نہ صرف اپنے اوپر ظلم ڈھایا بلکہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو بھی ظلم کی نذر کر دیا۔ اس لئے ان سے اظہار نفرت کرتے ہوئے فرمایا کہ لعنت ہے ایسی ظالموں کی قوم کیلئے۔ ظلم کا مفہوم ہے ہر چیز جس مقصد کیلئے پیدا کی گئی ہے اسے اس کے مصرف سے ہٹا کر دوسرے مصرف میں صرف کر دینا اور اس کا جو مقصد متعین کیا گیا ہے اسے اس مقصد سے دور کر دینا۔ اللہ نے انسان کو سر اس لئے دیا ہے کہ وہ اللہ کے سامنے جھکے۔ جب اسے غیر خدا کے سامنے جھکایا

Marfat.com

جاتا ہے تو سراس قلم پر چھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں اس لئے دی ہیں کہ وہ اس کے دین کی سربلندی میں کام آئیں۔ گردن اس لئے دی ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے خم ہو اور بوقتِ ضرورت اسی کے راستے میں کٹے۔ پسینہ اس لئے ہے کہ وہ اللہ کے متعین راستوں میں بہے۔ نعمتیں اس لئے دی گئی ہیں کہ ان کا شکر بجالا کر ان کا صحیح حق دیا جائے۔ جب بھی ان جگھوں سے انحراف ہوتا ہے تو ظلم کا راستہ کھل جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی عظمت کھو دیتا ہے۔ وہ اپنی حیثیت گم کر کے وہاں جا کھڑا ہوتا ہے جو اس کے دشمنوں اور اس کے چاکروں کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی۔ اقبال نے شاید ایسے ہی تاثر کے تحت کہا تھا:

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے تو تن تیرا نہ من

وَنَادٰی نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَهْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِیْنَ ۝ قَالَ یٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۝ (سورۃ ھود : ۴۵،۴۶)

(اور نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا۔ پس کہا اے میرے رب بیشک میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب حاکموں سے بہتر حکم کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نوح! وہ تیرے اہل میں سے نہیں، وہ نہایت نابکار ہے۔ مجھ سے اس چیز کیلئے درخواست نہ کرو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم جاہلوں میں سے نہ بنو۔)

حضرت نوحؑ کی شفقت پدری

بیٹے کے ڈوب جانے کے بعد نوح علیہ السلام نے فرطِ جذبات اور محبت پدری سے مغلوب ہو کر اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے پروردگار! یہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا اور تیرا وعدہ تھا کہ تو میرے اہل کو بچائے گا تو پھر میرا بیٹا کیسے ڈوب گیا۔ اس پر بعض لوگوں کو اشکال پیدا ہوا ہے کہ نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ آپ ان لوگوں کو کشتی پر سوار کریں جو آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ لیکن جن پر اللہ کا یہ فیصلہ پہلے آ چکا ہے کہ شیطان کے راستے پر چلنے والوں سے وہ جہنم بھرے گا، ان لوگوں کو کشتی میں سوار نہ کرنا اور مزید یہ بات بھی کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کافروں کی جڑ کاٹنے کیلئے آتا ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تو کافروں کی بربادی کیلئے عذاب نازل فرمائے اور اللہ کا رسول کسی کافر کو بچانے کی سعی کرے۔ آپ کا بیٹا کنعان کافر تھا۔ آپ نے اسے بچانے کی کوشش کیوں کی اور جب اسے ڈبو دیا گیا تو آپ نے اللہ سے شکایت کیوں کی؟ بعض اہلِ علم کا گمان تو یہ ہے کہ آپ پدری محبت سے مجبور ہو کر ایسا کر گزرے تھے اور یہ کوئی خلاف تعجب بات نہیں کیونکہ پیغمبر بھی بہر حال انسان ہوتے ہیں۔ لیکن بعض دیگر اہل علم کا خیال ہے کہ آپ کو واضح طور پر اس بات کا علم نہیں تھا کہ ان کا بیٹا کافر ہے۔ وہ درحقیقت منافق تھا اور اپنے عظیم باپ کے سامنے مسلمان بنا رہتا تھا۔ اس لئے آپ نے اپنے حسن ظن کے مطابق اسے مسلمان سمجھ کر اللہ سے شکایت کی۔ بعض مفسرین ایک تیسری رائے رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جب تنور ابل پڑا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا کہ جانوروں کا جوڑا جوڑا کشتی پر سوار کر لیجئے اور اپنے اہلخانہ کو بھی اور ان لوگوں کو بھی جو لوگ آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اس طرح سے کشتی پر سوار ہونے والوں کی تین اقسام ہو گئیں جن میں دوسری قسم آپ کے اہل خانہ کی تھی۔ چنانچہ آپ نے اس اہل کے لفظ سے یہ سمجھا کہ میرا بیٹا کافر بھی ہو تو وہ میرے اہل میں سے تو تھا، اس لئے اس کو ڈوبنا نہیں چاہئے تھا۔ پروردگار نے اس پر اصلاح بھی فرمائی اور تنبیہ بھی۔ اصلاح یہ فرمائی کہ تیرا بیٹا، تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔ تم اہل کا مفہوم یہ سمجھتے ہو کہ وہ بچے جو باپ کے صلب سے پیدا ہوتے ہیں وہ باپ کے اہل میں سے ہوتے ہیں۔ جسمانی طور پر تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن پیغمبر دنیا میں قرابت اور خاندان کا نیا تصور لے کر آتے ہیں۔ ان کے یہاں ایمان کا رشتہ صلبی رشتوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ رنگ اور نسل کی بھی ایک اہمیت ہے لیکن اس وقت جب ایمان کا اشتراک پایا جاتا ہو لیکن عدم ایمان کی صورت میں ایک مومن کا کافر سے کوئی رشتہ نہیں۔ جنگِ بدر میں مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے قریبی عزیزوں کو ختم کیا اور علمبردار اسلام حضرت مصعب بن عمیر نے اپنے بھائی سے فرمایا کہ تم میرے بھائی نہیں ہو، میرا بھائی وہ ہے جو تمہاری مشکیں کس رہا ہے۔ یہ اہلیت اور اخوت کا ایک نیا تصور ہے جو اللہ کے نبی لوگوں میں راسخ کرنے کیلئے

Marfat.com

آتے ہیں۔ اس لحاظ سے فرمایا کہ آپ نے محض صلبی رشتے کو دیکھتے ہوئے بیٹے کو اپنے اہل خانہ میں شمار کرلیا حالانکہ وہ کافر ہونے کی وجہ سے آپ کے اہل بیت میں شمار ہونے کے لائق نہیں تھا کیونکہ وہ شخص غیر صالح عمل رکھتا تھا۔ نا ہنجار اور کندہ ناتراش تھا۔ اسے آپ سے کیا نسبت ہوسکتی تھی۔ ایک نبی سے نسبت، نبی پر ایمان اور اس کے اتباع سے پیدا ہوتی ہے۔

ایک تنبیهه

اصلاح کے بعد ایک تنبیہہ فرمائی گئی کہ آپ مجھ سے کوئی ایسی بات مت پوچھیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ نزول عذاب کے بعد ایک نئی حقیقت کھل کر دنیا کے سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی زمین پر رہنے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے جو اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہیں اور اس کے نبی کی دعوت کو قبول کر کے اس کے راستے کے مسافر بن جاتے ہیں۔ جو لوگ اس راستے پر چلنے سے انکار کر دیتے ہیں انہیں خاص حد تک مہلت تو دی جاتی ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب اس جھاڑ جھنکاڑ کو ختم کر دیا جاتا ہے تاکہ اللہ کی زمین پر نیکی پھلے پھولے، اسی کے احکام کی اطاعت کی جائے، اسی کے احکام کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ ان کی بالا دستی اور نفاذ کو عام ہونے کا موقع ملے۔ اس راستے پر چلنے والے لوگوں کے ساتھ وہ لوگ نہیں چل سکتے جو نفسانیت کے پرستار اور شیطان کے بندے ہیں۔ ان کی حیثیت تو اعضاء انسانی میں سڑے ہوئے عضو کی ہے جسے کاٹ دینا ڈاکٹر اپنا فرض سمجھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر اس کو کاٹا نہیں جائے گا تو یہ باقی اعضاء کو بھی مسموم کر دے گا۔ ایسے عضو کو کاٹتے ہوئے ڈاکٹر یقیناً مریض سے یہ کہتا ہے کہ یہ عضو یقیناً آپ کے جسم کا حصہ ہے لیکن اب آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اگر اس تعلق کی نوعیت کو سمجھا نہیں جائے گا تو پھر باقی جسم کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ انسانی قرابت کا یہ وہ نیا تصور تھا جس کی بنیاد شاید حضرت نوح علیہ السلام کے ہاتھوں رکھوائی گئی اور جس نے مستقلاً انسان کو تمام تقسیموں سے بے نیاز کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک اہل حق کا گروہ اور دوسرا اہل باطل کا۔ اسی امتیاز و شعور پر آج تک حق و باطل کی شناخت قائم ہے اور یہی وہ علم ہے جس کا لحاظ کرنے کی نوح علیہ السلام کو تاکید فرمائی گئی اور اس سے پہلے شاید یہ عقدہ اس طرح کھولا نہیں گیا تھا، اس لئے حضرت نوح علیہ السلام کی نگاہوں سے اس کا ذہول ہو گیا اور آپ نے اپنے بیٹے کے بارے میں شکایت کرنے کی جسارت کر ڈالی، لیکن جب اس پر توجہ دلا دی گئی تو اللہ کا رسول فوراً بارگاہ حق میں جھک گیا۔

جاهل کا مفهوم

یہاں ایک بات ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ پروردگار حضرت نوح علیہ السلام سے فرما رہے ہیں کہ آپ ایسی کوئی بات مجھ سے مت پوچھیں جس کے بارے میں آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ جاہلوں میں سے ہو جائیں۔ یہ جاہل کا لفظ بہت کھٹکنے والا ہے۔ ایک پیغمبر کی ذات والا قدر پر اس لفظ کا اطلاق کیسے ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان میں جس طرح جہالت کا لفظ علم کے مقابلوں میں بولا جاتا ہے۔ اسی طرح حلم کے مقابلے میں بھی بولا جاتا ہے۔ ہم ان پڑھ اور نہ جاننے والے کو جاہل کہتے ہیں لیکن قرآن کریم کی زبان میں اس شخص کو بھی جاہل کہا جاتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور حلم کا رشتہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا ہے نوح علیہ السلام سے فرمایا جا رہا ہے کہ شفقت پدری ایک محمود جذبہ ہے، اسلام اس کی قدر کرتا ہے لیکن اس سے اس طرح مغلوب ہو جانا کہ اسلامی جذبات نظر انداز ہو جائیں۔ یہ جہالت ہے اور اللہ کا نبی چونکہ اپنی امت کیلئے مکمل اسوۂ حسنہ ہوتا ہے۔ وہ جس طرح کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اسی طرح نیکیوں میں بھی فرق مراتب کا نگران ہوتا ہے۔ اس خیر کا کون سا مقام ہے اور کس نیکی کو کہاں رکھنا ہے اور کون سا جذبہ کہاں تک ساتھ چل سکتا ہے یہ وہ ذوق ہے جو اللہ کے رسول کو دیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کے جذبات خیر میں سے کوئی جذبہ اگر غالب آ کر دوسرے جذبات کیلئے باعث نقصان ہوتا ہے تو پروردگار فوراً اس پر تنبیہہ فرماتا ہے اور اس جذبہ کو جہالت کا نام دیتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْلِیْ وَتَرْحَمْنِیْٓ اَکُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ۝

(نوح علیہ السلام نے فوراً عرض کیا، اے میرے رب، میں تیری پناہ مانگتا ہوں، اس سے کہ اس بات کا تجھ سے سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔) (سورۃ ہود : ۴۷)

حضرت نوحؑ کی عظمت

اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم پیغمبر کو جیسے ہی تنبیہہ فرمائی تو انہوں نے اس پر جو رویہ اختیار کیا اس نے انہیں عظیم سے عظیم تر بنا دیا کیونکہ اللہ کے نبی

Marfat.com

انسانوں کیلئے تو عظمت ورفعت کا نمونہ ہوتے ہیں لیکن اپنے مالک کے سامنے ان کی عاجزی اور بندگی اسلامی تعلیمات کا ایسا سرمایہ ہوتی ہے جس سے نسلیں راہ پاتی ہیں۔ آپ نے فوراً اس تنبیہ کے سامنے سر جھکا دیا اور پکار اٹھے، یا اللہ میں اس سے پناہ چاہتا ہوں کہ میں ایسی بات آپ سے پوچھوں جس کا مجھے علم نہ ہو۔ باپ کے دل میں بیٹے کی محبت بھی تو ہی ڈالنے والا ہے، تو نے ہی ان نازک احساسات کو انسانی رشتوں کی بقاء کیلئے پیدا فرمایا ہے اور انسان کا شدتِ احساسات سے مغلوب ہو جانا ایک سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اس بات کی خبر نہ تھی کہ اسلامی رشتہ باپ بیٹے کے رشتے سے بھی بڑھ کر ہے۔ اگر بیٹا اللہ کی رسی کو تھامنے کیلئے تیار نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے رشتۂ اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا بیٹا بیشک اپنے باپ کا بیٹا ہے لیکن حقیقت میں اسے ایک مسلمان باپ سے کوئی نسبت نہیں۔ چہ جائیکہ وہ پیغمبر کا بیٹا ہو۔ پیغمبر رشتۂ اسلام کی مضبوطی کے سب سے بڑے مناد ہوتے ہیں۔ انہیں کی مثالوں سے اس رشتے کی بقاء اور برتری کا احساس باقی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اگر اللہ کے حکم سے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ نہ کیا ہوتا تو دنیا پر کون اس راز کو کھولتا کہ اللہ کا حکم بیٹے کی زندگی سے برتر ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے کیا گیا۔ آپ وقتی طور پر پدری محبت سے مغلوب ہو کر اللہ سے شکایت کر بیٹھے تو اس پر تنبیہ فرمائی گئی کہ قیامت تک کیلئے جو عظیم انسان اس عظیم حقیقت کے نگران بنائے گئے ہیں وہ انبیاء کرام کا گروہ ہے اس لئے آپ سے ایسی کسی بات کا صدور انسانیت کیلئے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حقیقت کو سمجھا اور اللہ کی بارگاہ میں جھکتے ہوئے التجا کی یا اللہ مجھ سے جو کوتاہی ہوئی ہے آپ اسے معاف فرما دیں اور مجھ پر اپنی رحمت کا سایہ تان دیں۔ اگر آپ نے مجھے معاف نہ فرمایا اور مجھے اپنی رحمت کا مستحق نہ جانا تو میں تو برباد ہو کر رہ جاؤں گا کیونکہ میرا سرمایہ صرف آپ کی نوازشات ہیں۔ میرا سہارا صرف آپ کی رحمت ہے۔ میری قوم اور وطن والوں نے صدیوں تک میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے لیکن یہ صرف آپ کا سہارا تھا جس نے مجھے کھڑا رکھا۔ اس ہولناک عذاب سے بھی صرف تیری دستگیری نے بچائے رکھا۔ دنیا ساری ڈوب گئی مگر تیری رحمت نے ہمیں نہ صرف ڈوبنے سے بچایا بلکہ نئی دنیا کی ہمیں امید بنا دیا۔ آئندہ بھی تیری رحمت ہی کا سہارا ہے۔ اس لئے میں تیری رحمت ہی کا طلب گار ہوں۔ اس آستانے کے سوا مجھے کسی اور آستانے سے غرض نہیں۔

سلسلۂ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا قبول کی گئی اور آپ کو ان مقامات سے نوازا گیا جس کے اس وقت صرف آپ ہی مستحق تھے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا گیا:

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۴۸﴾ (سورۃ ھود : ۴۸)

(ارشاد ہوا اے نوح، اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ۔ اپنے اوپر بھی اور ان امتوں پر بھی جو ان سے ظہور میں آئیں جو تمہارے ساتھ ہیں، اور ایسی امتیں بھی اٹھیں گی جن کو ہم بہرہ مند کریں گے۔ پھر ان کو ہماری طرف سے ایک عذاب دردناک پکڑے گا۔)

تعمیرِ نو کا آغاز

طوفان گزر گیا، زمین خشک ہو گئی، ہر طرف سے پانی سمیٹ لیا گیا، کشتی جودی پہاڑ پر ٹکی ہوئی تھی معلوم ہوتا ہے جودی پہاڑ سے نیچے اتر کر زمین پر آباد ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ بظاہر تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایک ایسا تباہ کن طوفان جس نے اس وقت کی آباد دنیا کو نیست و نابود کر دیا ہے اور نوح علیہ السلام اور آپ کے ساتھ چند خوش نصیب صاحب ایمان لوگ اس طوفان سے بچ سکے۔ ان کیلئے زمین پر اترنا یقیناً مسرت کی بات ہے لیکن ساتھ ہی اترنے والوں کے دلوں میں کتنے اندیشے ہوں گے کہ نہ جانے اب یہ نئی زندگی کیسی ہو۔ وطن چھوٹ گیا، گھر برباد ہو گئے، کوئی شہر باقی نہ رہا، تباہ شدہ کھنڈرات اور بے آباد زمین پر ایک نئی آبادی بسانا بڑے حوصلے کی بات ہے۔ اس میں محنت بھی درکار ہو گی، موسموں کی شدت بھی رکاوٹ بنے گی، وسائل کی کمی بھی آڑے آئے گی۔ نہ جانے معمول کی زندگی شروع کرنے میں کتنی دشواریاں ہوں گی۔ ایسے ہی اندیشوں سے گراں بار لوگوں کو اترنے کا حکم دینے کے ساتھ ہی ایسی دو خوشخبریاں سنائی گئیں جن کی وجہ سے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تمام اندیشے یادر ہوا ہو گئے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ

Marfat.com

انہیں اترنے کا حکم اس طرح نہیں دیا گیا ہے جیسے کسی کو جگہ کی الاٹ منٹ دے کر اور چند وسائل مہیا کر کے حالات کے حوالے کر دیا جائے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ تم اترو ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ جس کا مفہوم یہ ہے کہ تمہیں اب کسی قسم کا اندیشہ پریشان نہیں کرے گا۔ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات تمہارے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کریں گی۔ تم جہاں بھی ٹھہرو گے سلامتی تمہارے دائیں بائیں ہوگی۔ قدرت کی حفاظت کے ہاتھ تمہارے ساتھ ہوں گے۔ عناصر قدرت تمہارے ہم رکاب چلیں گے۔ مزید فرمایا کہ اے پیغمبر آپ پر بھی برکتیں ہوں گی اور ان لوگوں پر بھی جو آپ کے ساتھ کشتی پر سوار تھے۔ تم جہاں بھی ٹھہرو گے اللہ کی برکتیں تم پر بارش کی طرح برسیں گی۔ سلامتی حفاظت کا ذریعہ ہے اور برکت اسباب میں افزائش کی نوید ہے اور یہ دو خوشخبریاں اس ذات بابرکات کی طرف سے دی جارہی ہیں جس کی ربوبیت مہد سے لحد تک انسان کی دستگیری کرتی ہیں۔ مزید فرمایا کہ اللہ کی طرف سے سلامتی اور برکتیں جس طرح نوح علیہ السلام پر برسیں گی کیونکہ وہ اللہ کے رسول ہیں اسی طرح آپ کے ساتھ نجات پانے والے لوگوں کو بھی نصیب ہوں گی۔ وہ اگرچہ چند لوگ ہیں ممکن ہے ان کی تعداد سینکڑوں میں ہو لیکن امم کا لفظ بول کر یقین دلا دیا گیا ہے کہ یہ چند لوگ مستقبل میں امتوں کی صورت میں روئے زمین پر پھیل جائیں گی۔ اللہ ان کی اولاد میں برکت دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین کی آبادی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں یہ نوح علیہ السلام کی اولاد اور آپ پر ایمان لانے والوں سے معرض وجود میں آئی ہے۔ اہل مغرب کا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ نوح علیہ السلام کی اولاد ہی آج کی دنیا کے انسانوں کے آباؤ اجداد ہیں اور بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی تعداد تین ہے اور الگ الگ براعظم ان تینوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ حضرت نوح کی اولاد سے نوع انسانی پھیلی لیکن یہ بات کہ صرف نوع انسانی انہیں کی اولاد کی اولاد ہے یہ صحیح نہیں۔ قرآن کریم کی شہادت کے مطابق آپ پر ایمان لانے والے بھی نوع انسانی کے اجداد میں شامل ہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ آج کی دنیا کے جد امجد آدم علیہ السلام کے بعد جس طرح حضرت نوح علیہ السلام ہیں اسی طرح آپ پر ایمان لانے والے بھی ہیں۔

مزید فرمایا کہ افراد سے امتیں بنیں گی۔ آگے امتوں سے مزید امتیں وجود میں آئیں گی لیکن ہدایت کا سلسلہ تمام امتوں تک دراز نہیں ہوگا۔ ایک وقت آئے گا جب پھر بگاڑ پیدا ہوگا۔ ان کی اصلاح کیلئے پھر پیغمبر آئیں گے، حق و باطل کی کشمکش پھر برپا ہوگی، اللہ انہیں مہلت سے بھی نوازے گا، لیکن ان میں جو لوگ پیغمبر کی مخالفت اور اپنے کفر پر اڑ جائیں گے وہ آخر عذاب کا شکار ہوں گے۔ آج کی یہ کشمکش جو مشرکین مکہ نے برپا کر رکھی ہے یہ تاریخ ہدایت کا ایک تسلسل ہے جو آخر کار ہدایت کی صورت میں عافیت سے ہمکنار ہوتا ہے اور انکار اور تمرد کی صورت میں طوفان نوح کی طرح عذاب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهَاۤ اِلَیْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛؕ فَاصْبِرْ ۛؕ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِیْنَ ۟ (سورۃ ھود : ۴۹)

(یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کو وحی کے ذریعہ سے سنا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ آپ اس کو جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔ پس صبر کیجئے، انجام کار کی کامیابی خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔)

آنحضرت کی طرف التفات

اس آیت کریمہ میں نبی کریم ﷺ کی طرف التفات ہے جس سے آپ پر خصوصی عنایات کا اظہار بھی ہے اور آپ کی رسالت پر دلیل بھی۔ خصوصی عنایت کا اظہار اس طرح ہے کہ آپ ایک ایسے شہر سے اٹھے اور ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے ہیں جو علم سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتی۔ ان کی اپنی تاریخ سینہ بہ سینہ چلنے والے واقعات پر مشتمل ہے۔ جہاں تک دوسری قوموں کا تعلق ہے وہ ان کی تاریخ قدیم سے تو کیا واقف ہوں گے وہ ان کے ضروری کوائف سے بھی آگاہ نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام تاریخ مذاہب کا ایک نمایاں ستون ہیں اور پھر یہ بات بھی کہ دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں ان کی خدمات سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ اس دنیا کیلئے آدم ثانی کہے جاتے ہیں۔ اللہ کے راستے میں آپ کی استقامت اور جانفشانی ایک ضرب المثل ہے، لیکن اہل مکہ ان کی تاریخ کے کسی ورق سے آگاہ نہیں۔ آپ پر کس قدر اللہ کی عنایت ہے کہ صدیوں پہلے کی تاریخ جس سے اہل تاریخ بھی بے خبر ہیں اور تورات میں اگر اسے بیان کیا بھی ہے تو ایسی پراگندہ اور مسخ شدہ شکل میں کہ جس سے کسی عبرت و نصیحت کے حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

ایسی صورتحال میں آپ پر حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کی قوم کے حوالے سے صحیح حالات کا نزول جہاں اللہ تعالیٰ کی آپ پر بے پایاں رحمت کا ثبوت ہے وہیں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپ پر اترنے والی کتاب اللہ کی کتاب ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان واقعات کا آپ کی زبان پر جاری ہو جانا ایک ناممکن بات تھی۔ لیکن آپ نے جس طرح ایک ترتیب کے ساتھ ان واقعات کو بیان فرمایا اور تاریخ کے ان اوراق کو الٹا جن کا جاننے کا انسانوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا اور عبرت و نصیحت کے ان عقدوں کی نقاب کشائی کی جو صرف اللہ تعالیٰ کے علم کا حصہ ہیں۔ ان میں سے ایک ایک بات جس طرح آپ کیلئے عزت و افتخار کا باعث ہے اسی طرح آپ کی نبوت اور رسالت کے برحق ہونے کی حجت بالغہ بھی ہے۔ رہی یہ بات کہ مشرکین مکہ آپ پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں اور وہ قدم قدم پر آپ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر رہے ہیں اور ان کی طرف سے اذیت رسانی نے نہایت ناگوار صورت پیدا کر دی ہے، آپ اس کی پرواہ نہ کریں۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے واقعات آپ کے سامنے ہیں۔ انہوں نے صدیوں تک ان مصیبتوں پر صبر کیا۔ آپ بھی صبر کریں۔ نتیجہ وہی ہوگا جو آپ نوح علیہ السلام کے واقعات میں دیکھ چکے ہیں، جس طرح ان کے صبر نے انہیں اللہ کی رحمت کا مستحق بنایا اور ان کے مخالفین تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ اسی طرح آپ پر اللہ تعالیٰ کی مزید عنایات ہوں گی۔ آپ کیلئے کامیابی کے راستے کھول دیئے جائیں گے اور مخالفین کا وہی انجام ہوگا جو ہر پیغمبر کی مخالفت کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو اس سے ڈر کر زندگی گزارتا ہے، اچھا انجام اسے نصیب ہوتا ہے اور جو اس سے سرکشی اختیار کرتا ہے وہ طوفانِ نوح جیسے کسی عذاب کا شکار ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا عدل بے لاگ ہے۔ وہ جب عدل کرنے پر آتا ہے تو کوئی اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اس کا قانون ہے کہ اس کا انکار کرنے والے عذاب کا شکار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب اس کا عذاب اترتا ہے تو پھر اس کی زد میں پیغمبر کا بیٹا بھی آ جائے تو اس کا عدل صرف اس لئے اسے چھوڑ نہیں دیتا کہ وہ پیغمبر کا بیٹا ہے بلکہ اسے بھی وہی سزا ملتی ہے جو کافروں کو ملتی ہے اور سلامتی صرف اس کیلئے ہے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ

هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ
اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ یٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی
الَّذِیْ فَطَرَنِیْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ
تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰی
قُوَّتِكُمْ وَ لَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۵۲﴾ قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّ مَا
نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَ مَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۳﴾
اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ

Marfat.com

اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّىْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِيْدُوْنِىْ
جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّىْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّىْ وَرَبِّكُمْ ؕ
مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّىْ
قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ رَبِّىْ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ
حَفِيْظٌ ﴿۵۷﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ
بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا
بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿۵۹﴾
وَاُتْبِعُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا
كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ﴿۶۰﴾ ع

(اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ آپ نے کہا اے میری قوم! اس اللہ کی عبادت کرو، نہیں ہے تمہارا کوئی
معبود اس کے سوا، نہیں ہو تم مگر افترا پرداز۔ اے میری قوم کے لوگو! میں اس پر تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں۔ میرا
اجر تو بس اسی کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم سمجھتے نہیں۔ اے میری قوم! اپنے رب سے مغفرت طلب
کرو، پھر اسی کی طرف لوٹو، وہ آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش اتارے گا اور تمہیں بڑھا دے گا قوت میں تمہاری پہلی
قوت سے۔ اور اللہ تعالیٰ سے منہ نہ موڑو جرم کرتے ہوئے۔ انہوں نے کہا اے ہود تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت
لے کر نہیں آیا اور نہ ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں اور نہ تجھ پر ہم ایمان لانے والے ہیں۔ ہم تو
یہ کہتے ہیں کہ بتلا کر دیا ہے تجھے ہمارے کسی اِلٰہ نے دماغی خلل میں۔ (یعنی تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی
مار پڑ گئی ہے) حضرت ہود نے کہا میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بیزار ہوں ان تمام قوتوں سے
جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو اس کے سوا۔ پس تم سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو، پھر مجھے مہلت نہ دو۔ بیشک میں نے
بھروسہ کیا ہے اس اللہ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارے بھی رب ہے۔ کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے
پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔ بیشک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔ پس اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تو

Marfat.com

پہنچا دیا ہے تمہیں وہ پیغام جسے دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے اور جانشین بنا دے گا میرا رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو اور تم اس کا کوئی نقصان نہ کر سکو گے۔ بیشک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔ اور جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دے دی ہود کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت کے سبب سے۔ اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے نجات دے دی۔ اور یہ ہے قومِ عاد جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر متکبر دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی۔ اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں لعنت، اور قیامت کے دن بھی۔ سنو! عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔ سنو! ہلاکت و بربادی ہے عاد کیلئے جو ہود کی قوم تھی۔)

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝

(اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ آپؑ نے کہا اے میری قوم! اس اللہ کی عبادت کرو، نہیں ہے تمہارا کوئی معبود اس کے سوا، نہیں ہو تم مگر افترا پرداز۔) (سورۃ ھود : ۵۰)

حضرت ہود علیہ السلام قومِ عاد کی طرف مبعوث ہوگئے۔ یہ قوم جزیرۂ عرب میں جانی پہچانی تھی۔ یہ اپنے کسی جدِ اعلیٰ عاد کی طرف منسوب تھی۔ ان کا وطن حضرموت اور یمن کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ سورۃ الاعراف میں ہم ان کی تاریخ کے ضروری عنوانات پر گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا تذکرہ صرف اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ مشرکینِ مکہ کو بتایا جائے کہ جس طرح تم ایک قوم ہو، تمہارے پاس ایک طاقت ہے، تمہاری ایک افرادی قوت ہے، تم ایک وسیع سرزمین پر آباد ہو اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف تمہاری ہدایت کیلئے ایک رسول بھیجا ہے۔ اسی طرح قومِ عاد بھی ایک بڑی افرادی قوت کی مالک قوم تھی۔ وہ ملک کے اہم ترین حصے پر آباد تھی۔ وہ اپنی قوت، صنعت اور بعض فنی کمالات میں تم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھے لیکن جب ان کا بگاڑ انتہاء کو پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کیلئے حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت ہودؑ نے ان کے سامنے وہی دعوت پیش کی جو آنحضرت ﷺ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اور انہوں نے وہی رویہ اختیار کیا اور اسی طرح مخالفتوں پر کمر باندھی جو رویہ تم اختیار کر چکے ہو۔ حضرت ہود علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کی طرح اپنی ہمت سے بڑھ کر ان کی اصلاح و ہدایت کیلئے کوششیں کیں لیکن جب قوم نے مکمل طور پر ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا تو بالآخر اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر ٹوٹا۔ تم بھی قومِ عاد کے راستے پر بڑھتے جا رہے ہو۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ اپنی تمام تر مساعی تمہاری ہدایت کیلئے بروئے کار لا رہے ہیں لیکن تم کسی طرح بھی راہِ راست اختیار کرنے کیلئے تیار نہیں ہو۔ قومِ عاد کی تاریخ تمہارے لئے ایک آئینہ ہے جس میں تم اپنا انجام دیکھ سکتے ہو اور ساتھ ہی ساتھ نبی کریم ﷺ کو تسلی بھی دی جا رہی ہے کہ آپؐ ان لوگوں کی مخالفتوں سے دل چھوٹا نہ کریں۔ آپؐ کا ہر قدم کامیابی و کامرانی کی طرف بڑھ رہا ہے اور ان لوگوں نے اگر آپؐ کی دعوت کو قبول نہ کیا تو ان کا انجام نہایت اندوہناک ہوگا۔

دعوت کی پہلی ضرورت اجنبیت کے احساس کا خاتمہ ہے

گفتگو کے آغاز میں سب سے پہلے وہ بات فرمائی گئی ہے جو کسی قوم کی ہدایت اور تعلیم و تربیت کیلئے انتہائی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی رسول کو کسی قوم کی طرف مبعوث فرمایا ہے تو اس کی سب سے پہلی ضرورت یہ رہی ہے کہ اس کے اور اس کی قوم کے درمیان اجنبیت کی کوئی ایسی دیوار حائل نہ رہے جس سے افہام و تفہیم اور ابلاغ و تبلیغ میں رکاوٹ پیدا ہو۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ آدمی اس شخص کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتا ہے اور اس سے اکتسابِ فیض کی کوشش کرتا ہے جس کی شخصیت سے وہ پوری طرح آگاہ ہو اور اس کی بات سمجھنے پر پوری طرح قادر ہو۔ کوئی معلم یا مربی اگر اجنبیت کے پردوں میں لپٹا ہوا ہو اس کی ذات، اس کا خاندان، اس کا ماحول اور اس کی شخصیت کے ضروری اوصاف پردۂ اخفاء میں ہوں۔ اسی طرح اس کی زبان شاگرد اور مخاطب کی زبان سے اجنبی ہو۔ وہ جو کہے اسے شاگرد نہ سمجھے اور جو شاگرد پوچھے وہ استاد کے پلے نہ پڑے تو تعلم و تربیت کا کوئی مرحلہ بھی طے نہیں ہو سکتا۔ زبان کی یکسانی استاد اور شاگرد کے درمیان تعلیم و تربیت کا پہلا زینہ ہے اور استاد اور مربی کی شخصیت سے بہت حد تک آگاہی جو اس کی ذات پر اعتماد پیدا کر سکے دوسرا زینہ ہے اور ان دونوں زینوں کے مہیا ہو جانے کے بعد ہی کسب و اکتساب اور تعلیم و تعلم کے مراحل طے ہو سکتے ہیں۔

Marfat.com

چنانچہ خالق فطرت سے بڑھ کر ان حقائق کو جاننے والا اور کون ہوسکتا ہے؟ اس نے ہر رسول بھیجنے سے پہلے ان بنیادی ضرورتوں کا لحاظ فرمایا اور اجنبیت اور بیگانگی کو ممکن حد تک ختم کرنے کا انتظام فرمایا۔ چنانچہ اس نے جب بھی کسی قوم میں رسول بھیجا ہے تو ایسی ذات عزیز کو بھیجا ہے جس کا اپنی قوم کے ساتھ اخوت کا رشتہ تھا۔ وہ اسی قوم کا ایک فرد تھا۔ انہیں کے اعلیٰ خاندان میں جنم لینے والا، انہیں کا بھائی بند، انہیں میں زندگی گزارنے والا، انہیں میں رہ کر کاروبار کرنے والا، انہیں میں سے کسی کا داماد اور انہیں میں سے کسی سے مختلف نسبتیں رکھنے والا۔ چنانچہ ایسی محترم شخصیت جس نے بچپن سے لے کر ڈھلتی عمر تک تمام ادوار اپنی قوم میں گزارے ہوں اور وہ اپنی قوم کی بولی بولتا ہو۔ انہیں کی روایات کا پاسدار اور انہیں کی قومی خصوصیات کا حامل ہو۔ جب وہ اچانک ایک دن اٹھ کر یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کی طرف سے رسول ہو کر آیا ہوں تاکہ تمہیں آنے والے خطرات سے آگاہ کروں اور تمہارا اللہ سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑ دوں تو وہ قوم اسے یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم جس زبان میں بات کرتے ہو ہمیں تمہاری بات سمجھ میں نہیں آتی اور تم جن مکارم اخلاق کی طرف دعوت دیتے ہو اور جن انسانی قدروں کا احیاء چاہتے ہو وہ ہمیں تمہارے اندر تو دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ زبان کی یکسانی کی وجہ سے اس کی بات کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور اس کی زندگی سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باعث اس پر بے سروپا الزامات کی دھول اڑانے سے عاجز رہتے ہیں اور اگر کوئی غیر ذمہ دار شخص اس قسم کی بات کرتا بھی ہے تو خود انہیں میں سے کئی لوگ اسے جھٹلانے کیلئے موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام بھی اپنی قوم کیلئے ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ انہیں کی زبان بولتے تھے اور انہیں کے معروفات کے نمائندہ تھے اور ان سے اخوت کے رشتے میں منسلک تھے۔ زبان کی یکسانی چونکہ تبلیغ کی جان ہے اس لئے قرآن کریم نے ایک اور جگہ اسے کھول کر بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ہم نے کسی قوم کی طرف رسول نہیں بھیجا، مگر اس کی زبان میں تاکہ وہ انہیں سمجھا سکے اور بیان کر سکے۔)

پیغمبر کی دعوت

پیشِ نظر آیت کے دوسرے جملے میں حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے وہ دعوت پیش کی ہے جس کیلئے آپ کو مبعوث فرمایا گیا تھا کہ لوگو! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ یہی وہ دعوت ہے جو ہر پیغمبر اپنی قوم کی طرف لے کر آیا۔ اسی سورت کے آغاز میں بھی نبی کریم ﷺ کی طرف سے انہیں الفاظ میں آپ کی دعوت پیش کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے جتنے انبیاء کرام کا تذکرہ کیا ہے ان سب کی دعوت کا عنوان بھی جملہ رہا ہے اور اس جملے میں جو کچھ کہا گیا ہے تمام انبیاء کرام زندگی بھر اسی کی تفصیلات بیان کرتے رہے ہیں کیونکہ انسان کا اصل مسئلہ یہ ہے اور اسی سے بے خبری یا انکار اس کی زندگی کے ہر طرح کے بگاڑ کا سبب ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون سی ذات ہے جو میری بندگی کا استحقاق رکھتی ہے۔ مجھے اپنے دل کی آبادی کیلئے کس سے محبت کرنی چاہئے، کون ہے جو میرے دل کے بھیدوں سے واقف ہے اور میری تنہائیاں بھی میری جلوتوں کی طرح اس کے سامنے آشکارہ ہیں۔ وہ کون ہے جو خود ہر طرح کی احتیاج سے پاک ہے لیکن تمام دنیا کا حاجت روا ہے۔ وہ کون ہے جس کی قوتیں اور قدرتیں بے پناہ ہیں جس کا سہارا ہر سہارے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ وہ کون ہے جس کا علم و دانش ہر طرح کی نارسائی سے پاک ہے۔ وہ کون ہے جو انسانی فطرت سے بتمام و کمال آگاہ ہے۔ اس لئے جب بھی وہ فیصلہ کرتا ہے تو انسانی فطرت کی ضرورتوں کے مطابق کرتا ہے۔ وہ کون ذات ہے جس نے جس طرح تمام مخلوقات کے رزق کی کفالت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اسی طرح اس نے انسانوں کی ہدایت بھی اپنے ذمہ لے رکھی ہے کیونکہ دنیا بھی اسی کی ہے اور آخرت بھی اسی کی ہے۔ وہ جس طرح دنیوی ضرورتوں کا کفیل ہے اسی طرح اخروی ضرورتوں کی رہنمائی اور خوشنودئ حق کے طریقوں کی ہدایت بھی اس نے اپنی ذمہ داری ٹھہرائی ہے۔ وہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہی رسول بھیجتا ہے اور وہی کتابیں نازل کرتا ہے اور وہ سب کچھ اس لئے کرتا ہے کہ وہ پوری کائنات کا الٰہ ہے۔ الٰہ جس طرح معبود، مسجود اور مطلوب ہوتا ہے اسی طرح وہ حاکم حقیقی بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ کائنات کا رب بھی ہوتا ہے۔ اس کی ربوبیت کا فیضان ہے کہ جس طرح ہماری غذائی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اسی طرح احساسات کی آسودگی، عقل و خرد کی بالیدگی اور دل کی سرمستی اور وارفتگی کا سامان بھی اسی بارگاہ سے میسر آتا ہے۔ اس ذات کی بندگی اور غلامی کو چھوڑ کر کسی اور آستانے پر جھکنا اور کسی اور سے رہنمائی لینا، کسی اور کو غیر مشروط طور پر قانون سازی کا حق دینا اور مطاع مطلق ماننا انسان کو کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ اللہ کے رسول انسانوں کی اسی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے

Marfat.com

آتے ہیں۔ وہ ان کے اسی الجھی ہوئی گتھی کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ وہ انسان کو اس کے حقیقی مقام ومرتبہ پر اس طرح فائز کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے آستانے کے سوا اسے ہر آستانے سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سہارے کے سوا ہر سہارا اس کیلئے بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسانوں نے اتنی واضح اور بدیہی حقیقت کو نظر انداز کر کے ہمیشہ اللہ کے شریک بنائے۔ اس کی صفات میں نہ جانے کس کس کو شریک کیا۔ جن قوتوں کو اللہ نے اس کی خدمت پر لگایا تھا اور جن کی حیثیت اس کے چاکروں کی تھی یہ انہیں کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ چنانچہ ایسے بے بصیرت لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا کر افترا پردازی کا جرم کیا ہے۔ تم نے صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرا کر شرک کے جرم کا ہی ارتکاب نہیں کیا بلکہ تم نے اس جرم کی اللہ کی طرف نسبت کر کے ایک ایسا جھوٹ باندھا ہے جس کی نزاکتوں کا خیال کر کے انسان شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔

یٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○

(اے میری قوم کے لوگو! میں اس پر تم سے کسی معاوضے کا طالب نہیں۔ میرا اجر تو بس اسی کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا تو کیا تم سمجھتے نہیں۔) (سورۃ ھود : ۵۱)

آیت کے دو مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں ایک ایسی بات فرمائی گئی ہے جس کو سمجھنے کیلئے عقل کا استعمال ضروری ہے۔ اس لئے آیت کے آخر میں عقل کا حوالہ دیا گیا ہے۔ عام روا روی میں اس آیت کا مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ میں جو عظیم الشان کام سرانجام دے رہا ہوں اس کیلئے میں تم سے کسی اجر کا متمنی نہیں ہوں حالانکہ دنیا میں کوئی کام آدمی معاوضے کے بغیر نہیں کرتا۔ لیکن میں یہ کام چونکہ تمہاری چاہت سے نہیں کرتا بلکہ اللہ کے حکم سے کر رہا ہوں۔ اس لئے میرا اجر اس کے ذمہ ہے۔ اس مفہوم کی اپنی ایک معنویت ہے اور اپنا ایک اثر ہے لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ قوموں کی اصلاح کا کام دنیا میں سب سے کٹھن اور نازک کام ہے۔ اس کیلئے صرف محنت ہی درکار نہیں بلکہ خطرات سے کھیلنا اور گزرنا بھی پڑتا ہے۔ اپنے بیگانہ ہو جاتے ہیں، دوست دشمن بن جاتے ہیں۔ عزت ذلت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ زندگی مستقل خطرے کا شکار رہتی ہے۔ کوئی لمحہ آرام کا نصیب نہیں ہوتا۔ دن گالیاں سنتے اور طعنے برداشت کرتے گزر جاتا ہے اور راتیں اللہ کی بارگاہ کی نذر ہو جاتی ہیں۔ ایسا کٹھن اور جانگسل کام جس کی اور کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی بغیر کسی لالچ اور معاوضے کے ایک آدمی سرانجام دے رہا ہے۔ وہ ایک ایک دروازے پہ دستک دیتا ہے اور اسے نامناسب رویئے سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ ایک ایک شخص سے ہمکلام ہونا چاہتا ہے تاکہ اسے جہنم سے بچا سکے لیکن وہ اسے منہ لگانے کو تیار نہیں۔ وہ اپنے بدترین دشمنوں کو دعاؤں میں یاد رکھتا ہے۔ مخالفین اس کی جان لینے کے درپے ہوتے ہیں اور وہ ان کی عاقبت سنوارنے کے فکر میں رہتا ہے۔ یہ طرزِ عمل، یہ ہمدردی، یہ خیر خواہی، یہ جان پر کھیل کر دوسرے کی عاقبت بنانے کی فکر کیا تمہاری عقل کو اپیل نہیں کرتی کہ اگر اس شخص کی فکر میں کوئی کجی ہوتی یا اس کی نیت میں کوئی فتور ہوتا یا یہ کسی لالچ کا شکار ہوتا تو اس کا ضرور کہیں نہ کہیں اظہار ہوتا۔ اسے اس خدمت کے عوض مسلسل فاقوں اور دکھوں کے سوا اور کیا ملا ہے۔ اس کا یہ طرزِ عمل بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ یقیناً اس کے پیچھے ایک سچائی ہے جو اسے مسلسل آمادہ کاوش رکھتی ہے۔ وہ جن خطرات سے انہیں آگاہ کرتا ہے ان کے واقع ہونے کا اسے پوری طرح یقین ہے۔ وہ آنے والے حالات کو معلوم ہوتا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ جہنم اس کے سامنے دہک رہا ہے اور مخالفین اندھوں کی طرح اس کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ وہ جان پر کھیل کر انہیں اس آگ سے بچانا چاہتا ہے۔ تعجب ہے کہ لوگ اس کے یقین، ایقان، فکرمندی، ہمدردی اور خیر خواہی سے اس کی دعوت کی حقانیت کو کیوں نہیں اخذ کرتے اور کیوں ایمان نہیں لاتے۔ آخر ان کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے۔ اگر یہ ذرا بھی عقل سے کام لیتے تو جس طرح چمکتے ہوئے سورج سے روشنی کا ادراک ایک بدیہی بات ہے اسی طرح پیغمبر کے اس رویئے سے اس کی دعوت کا یقین اس سے بڑھ کر بدیہی اور یقینی بات ہے۔

Marfat.com

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ (سورۃ ھود : ۵۲)

(اے میری قوم! اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر اسی کی طرف لوٹو، وہ آسمان سے تم پر موسلا دھار بارش اتارے گا اور تمہیں بڑھادے گا قوت میں تمہاری پہلی قوت سے، اور اللہ تعالیٰ سے منہ نہ موڑو جرم کرتے ہوئے۔)

استغفار و توبہ کی ترغیب

حضرت ہود نے اللہ کی الوہیت کی دعوت دینے اور عقلی دلیل کے ذریعے سے ثابت کرنے کے بعد قوم کو استغفار کرنے اور پھر اسی کی طرف لوٹ جانے کی ترغیب دی۔ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی دعوت کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ وہ انسانی احساسات سے بالا ہوتی ہے۔ پیغمبر جب کسی بگڑی ہوئی قوم کی طرف مبعوث ہوتے ہیں تو ان کے بگاڑ کا تقاضا تو یہ ہوتا ہے کہ انہیں آتے ہی وارننگ دے دی کہ تم اپنی گمراہیوں میں جس حد تک پہنچ چکے ہو اب اس کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ تم فوراً اس سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ آؤ۔ اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو پھر عذاب تمہارے سر پر تلا کھڑا ہے لیکن اللہ کے نبی ہمیشہ نہایت ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ ترغیب کے انداز میں اپنی دعوت پیش کرتے ہیں۔ نہ انہیں اشتعال دلاتے ہیں، نہ انہیں مایوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی امید دلا کر آخری حد تک انہیں مائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنے کی ترغیب دی اور اس کے بعد توبہ کا حکم دیا۔ استغفار اور توبہ ایک ہی سفر کے دو مقام ہیں۔ ایک منفی ہے، دوسرا مثبت ہے۔ استغفار سے مراد یہ ہے کہ آدمی نے جو غلط عقائد و اعمال اختیار کر رکھے ہیں ان سے دستبردار ہو جائے اور توبہ یہ ہے کہ ان کی جگہ صحیح عقائد و اعمال اختیار کرے۔ آدمی سب سے پہلے اپنی خطاؤں اور غلط عقائد کا احساس پیدا کرے۔ جب تک کسی گمراہی اور خطا سے نفرت پیدا نہیں ہوتی اور دل میں یہ بات نہیں اتر جاتی کہ میں اب تک جو کچھ کرتا رہا ہوں وہ واقعی غلط اور قابل نفرت تھا اس وقت تک انسان ان برائیوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ جیسے جیسے بری باتوں کی نفرت بڑھتی جائے گی ویسے ویسے آدمی ان کے چھوڑنے پر قادر ہوتا جائے گا۔ لیکن برائیوں کا چھوڑ دینا اصلاح کے عمل کیلئے کافی نہیں۔ یہ اس کا پہلا مرحلہ ہے۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ انسان ان تمام منکرات اور برائیوں سے نکل کر اس صراط مستقیم پر چل پڑے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے نبی دعوت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول منزل قرار پائے۔ چنانچہ ہر وہ بات اور ہر وہ احساس جو اس منزل کی طرف لے جانے میں معاون ہو آدمی اس کی طرف لپکتا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے اس آستانے سے ایسا والہانہ تعلق پیدا ہو جائے کہ کسی طرح بھی اس کی رغبت دل میں مدھم نہ ہونے پائے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ نے ایک شخص کو دیکھا جسے مسجد حرام میں یہ آواز سنائی دے رہی تھی کہ تم یہاں سے نکل جاؤ، ہمیں تمہارا آنا منظور نہیں۔ حضرت شیخ ؒ نے اس سے فرمایا کہ بھائی جب آپ کو یہ حکم دیا جا رہا ہے تو آپ نکل کیوں نہیں جاتے۔ اس نے نہایت تعجب سے شیخ کی طرف دیکھا اور کہا کہ آپ ہی مجھے بتا دیں کہ میں اس دروازے سے نکل کر کہاں جاؤں۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور دروازہ ہوتا تو میں ضرور چلا جاتا، لیکن جب دروازہ ہی ایک ہی تو پھر جو کچھ بھی ہو زندگی اسی آستانے پر گزرے گی۔ امید ہے ایک نہ ایک دن اللہ کی رحمت کا مستحق سمجھا جاؤں گا۔

قسم آستاں کی نہ اٹھیں گے ہرگز
یہیں دن چڑھے گا یہیں رات ہوگی

ایک غلط فہمی کا ازالہ

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ چند دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر رحم فرمایا۔ اسے نہ صرف معافی مل گئی بلکہ اسے کھوئے ہوئے مقامات پر بھی فائز کر دیا گیا۔ یہ استغفار اور توبہ ہر نبی کی دعوت کا لازمی حصہ رہا ہے۔ چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی سب سے پہلے اسی کی طرف توجہ دلائی اور ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا کہ یہ مت سمجھو کہ تم اگر اللہ تعالیٰ کے راستے پر آ جاؤ گے اور شیطان کا اتباع چھوڑ کر نیکی کی زندگی اختیار کر لو تو تمہاری دنیوی خوشحالی میں کوئی فرق آ جائے گا، یہ سراسر غلط فہمی ہے جو ہمیشہ شیطان پیدا کیا کرتا ہے اور اسی سے ڈرتے ہوئے لوگ اسلام

Marfat.com

شریعت سے دور رہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ اور اس کی رسول کی اطاعت کرنے سے آخرت تو مل سکتی ہے لیکن دنیا میں آسائش کی زندگی نصیب نہیں ہوسکتی۔ اس غلط فہمی نے نہ جانے کتنے لوگوں کو اسلامی زندگی سے محروم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زندگی جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے وجود میں آتی اسے اختیار کرنے سے صرف آخرت ہی میں سرخروئی نہیں ہوگی بلکہ دنیا میں بھی ہر طرح کی عزت، وجاہت اور خوشحالی نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے اس آیت کریمہ میں صاف صاف فرمایا گیا کہ اگر تم ایمان لے آؤ اور اس طرح زندگی گزارو جس طرح اللہ تعالیٰ کا رسول تمہیں تعلیم دے رہا ہے تو اللہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش نازل فرمائے گا جس سے بنجر زمین سیراب ہوکر سونا اگلنے لگے گی۔ ہر طرف سرسبز کھیت لہلہانے لگیں گے۔ یہ بجائے خود معاشی خوشحالی کی طرف اشارہ ہے لیکن قرآن کریم کے یہ الفاظ ہر طرح کے رزق وفضل میں زیادتی کی تعبیر ہیں۔ اس سے مراد صرف زرعی خوشحالی نہیں بلکہ خوشحالی کے جتنے شعبے ہیں ان تمام میں اللہ کی طرف سے ایک بہتری اور افزودگی پیدا ہونے لگتی ہے کیونکہ رزق وفضل میں برکت دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہ وسائل کی فراہمی میں اضافہ فرمادے اور دوسرے انسانوں کی طرف سے کہ کام کرنے والے ہاتھ محنت کرنے لگیں اور سوچنے والے دماغ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے لگیں اور ہر جگہ ہر کام کرنے والا دیانت وامانت کا پیکر بن جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ملوں اور کارخانوں کی پیداوار دنوں میں کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ جب قدم قدم پر بددیانت لوگ موجود ہوں اور مزدوری کرنے والا طبقہ مالک کے ساتھ ہمدردی سے محروم ہو اور ہر شخص کو صرف اپنا مفاد عزیز ہو تو چلتے ہوئے کام بھی رک جاتے ہیں اور ہر چیز میں بے برکتی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اسلامی زندگی آنے کے بعد دونوں طرف سے برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں اور مزید یہ فرمایا کہ ہم تمہیں صرف معاشی خوشحالی عطا نہیں کریں گے بلکہ تمہاری سیاسی قوت میں بھی اضافہ کردیں گے۔ اس کے جو جو اسباب بھی ضروری ہوتے ہیں سب بروئے کار آنا شروع ہوجائیں گے۔ ملک کی آبادی ذہنی یکسوئی میں مبتلا ہونے کے بعد اتفاق اور اتحاد کی دولت سے مالا مال ہوجائے گی۔ اس طرح سے قوم کو ایک ہمہ گیر ترقی وخوشحالی کا موقع ملے گا لیکن شرط یہ ہے کہ تم اللہ سے منہ موڑنے کی بجائے اس کے سامنے سر ڈال دو۔

قَالُوْا یٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَیِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝۵۳

(انہوں نے کہا اے ہود تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا اور نہ ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں اور نہ تجھ پر ہم ایمان لانے والے ہیں۔)

(سورۃ ہود : ۵۳)

بَیِّنَۃ کا مطالبہ

حضرت ہود علیہ السلام نے گزشتہ آیات میں اللہ کی الوہیت کو دلائل سے ثابت کیا اور پھر اپنے رویئے اور اخلاص کو بطور دلیل کے ان کے سامنے پیش کیا جس سے ایک طرف آپ کی دعوت کا اثبات ہوتا تھا اور دوسری طرف آپ کی رسالت کا یقین پیدا ہوتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے ترغیب دیتے ہوئے اپنی قوم سے کہا کہ تم اگرچہ بہت بگڑ چکے ہو اور تمہارے اندر بے شمار خرابیاں پیدا ہوچکی ہیں اس کے باوجود میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم اللہ سے استغفار کرو اور ہر طرف سے کٹ کر اس کے احکام کی طرف پلٹ آؤ تو تم دیکھو گے کہ کس طرح وہ تمہیں خوشحالیوں سے نوازتا اور کس طرح تمہاری سیاسی قوت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس قدر مثبت اور مؤثر تبلیغ ودعوت کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ یا تو اس دعوت کو قبول کرلیتے اور یا اس کے جواب میں اپنے موقف کے اثبات کیلئے مضبوط دلائل دیتے، لیکن وہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی مسلسل گمراہیوں اور عیاشیوں کے باعث روحانی تقاضے تو ایک طرف رہے دل ودماغ کی شائستگی سے بھی محروم ہوچکے تھے۔ اس لئے بالکل جاہل لوگوں یا بچوں کی طرح ایک ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی کسی بھی عقلمند اور شائستہ مزاج قوم سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے کہا کہ اے ہود! تم ہم سے بہت سے تبدیلیوں کا مطالبہ کررہے ہو۔ تم چاہتے ہو ہم اپنے خداؤں کو چھوڑ دیں اور ایک خدا پر ایمان لے آئیں۔ اپنی زندگی کے طور اطوار کو یکسر تبدیل کرلیں۔ بنیادی نظریات سے لے کر آداب زندگی تک ہر چیز کا فیصلہ تمہاری رہنمائی میں کریں۔ اپنے تمام بڑوں کو رد کرکے تمہاری بڑائی کے سامنے جھک جائیں۔ اتنی بڑی تبدیلیوں کیلئے چند دلائل کافی نہیں، کوئی بہت بڑی بات ہونی چاہیئے۔ ایک ایسی شہادت جو ہمیں تمہاری ہر بات ماننے پر مجبور کردے۔ دلیل کی کاٹ تو دلیل سے ممکن ہے اور یہ ایسی چیز نہیں جو اپنے آپ کو ماننے پر مجبور کردے۔ ہمیں تو کوئی ایسی نشانی دکھایئے، کوئی ایسی حیران کن غیر معمولی چیز ہمارے سامنے لایئے جسے دیکھ کر ماننے بغیر چارہ نہ ہو۔

Marfat.com

یہ مسئلہ صرف قوم ہود کا نہیں، جب تک انسان فکری طور پر بالغ نہیں ہو جاتا اور اس کے مفادات کی زنجیریں ٹوٹ نہیں جاتیں، تعصبات سے نکلنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو جاتی اور اس کی نظر پیکرِ محسوس کے دائرے سے آزاد ہونے میں کامیاب نہیں ہوتی، اس وقت تک ہر داعی الی الحق سے ایسے ہی مطالبات کئے جائیں گے۔ چنانچہ قوم ہود بھی اپنے تاریخ کی آواز تھی۔ اس نے اپنی سطح کے مطابق نہ صرف بینہ کا مطالبہ کیا بلکہ حضرت ہود کو ڈراتے اور دھمکاتے ہوئے یہ کہا:

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَ اشْهَدُوْۤا اَنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ فَكِیْدُوْنِیْ جَمِیْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ (سورۃ ھود : ۵۴، ۵۵)

(ہم تو یہ کہتے ہیں کہ بتلا کر دیا ہے تجھے ہمارے کسی اِلٰہ نے دماغی خلل میں۔ (یعنی تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے) حضرت ہود نے کہا میں گواہ بناتا ہوں اللہ تعالیٰ کو اور تم بھی گواہ رہو کہ میں بیزار ہوں ان تمام قوتوں سے جنہیں تم شریک ٹھہراتے ہو اس کے سوا۔ پس تم سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو، پھر مجھے مہلت نہ دو۔)

قوم ھود کی ھرزہ سرائی اور اس کا جواب

ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، یہ تمہاری دماغی خرابی کا نتیجہ ہے کیونکہ آج تک ہم نے ایسی کوئی بات تمہارے منہ سے نہیں سنی۔ تم نے زندگی کا ایک بڑا حصہ ہمارے درمیان گزارہ ہے، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو تم اس سے پہلے بھی کبھی اظہار کرتے، ہمیں تو یوں لگتا ہے کہ تم نے جو ہمارے معبودوں کے خلاف کہنا شروع کر رکھا ہے ان پر نہ صرف تنقید کرتے ہو بلکہ تنقیص بھی کرتے ہو۔ انہیں میں سے کسی کی تمہیں مار پڑی ہے۔ یہ بڑی کرنی والے لوگ ہیں۔ تم انہیں پتھروں کا مجسمہ سمجھتے ہو، لیکن ان کے اندر جو قوتیں ہیں تم ان سے ناواقف ہو۔ یہ کسی بڑی قوت کے اوتار ہیں۔ اسی طرح تم نے ہمارے دیوتاؤں کے خلاف بھی مختلف باتیں کہی ہیں۔ تمہیں اپنے ایک خدا کے سوا کوئی اور برداشت ہی نہیں ہوتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا چاہئے تھا کہ تم اپنی شامتِ اعمال میں پکڑے گئے ہو۔ دماغ کی خرابی کے باعث الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو جن کی وجہ سے تم نے اپنی عزت تو گنوائی ہے ،اپنی قوم کو بھی انتشار میں بتلا کر دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب قوم ہود نے اپنے معبودوں سے آپ کو ڈرایا اور ان کی مار پڑنے کی بات کی تو حضرت ہود علیہ السلام کا عقیدۂ توحید غیرتِ توحید میں تبدیل ہو کر بھڑک اٹھا اور آپ نے ان کی بات کاٹ کر فرمایا کہ تم مجھے اپنے معبودوں سے ڈراتے ہو، میں اپنے اللہ کو گواہ کر کے کہتا ہوں اور تم بھی اس بات کے گواہ رہنا کہ تم جن قوتوں کو اللہ کا شریک بنا چکے ہو، میں ان سب سے بری اور بیزار ہوں۔ میں ان بتوں کو پتھروں کا ڈھیر سمجھتا ہوں اور ان مظاہرِ فطرت کو اللہ کی کائنات میں اللہ کا معمولی چاکر سمجھتا ہوں جو انسان کی خدمت پر لگا دیئے گئے ہیں۔ تم جن قوتوں سے خوفزدہ ہو میں انہیں اپنی طرح مخلوق سمجھتا ہوں۔ وہ بھی میری طرح اللہ کی قدرتوں کے سامنے بے بس اور اس کے سامنے جواب دہ ہیں اور اگر تمہیں اپنے معبودوں پر ایسا ہی یقین ہے کہ یہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو اپنے ان معبودوں کی مدد سے میرے خلاف جو تدبیر بھی کر سکتے ہو، جو منصوبہ بنا سکتے ہو، جو داؤ گھات کر سکتے ہو سب کر کے دیکھ لو۔ میں تم سے کسی مہلت کا طلبگار نہیں ہوں، مجھے ایک لمحہ مہلت نہ دو۔ تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ تم میرا کیا بگاڑ سکتے ہو۔ باوجود اس کے کہ میں ایک کمزور انسان ہوں، ایک کمزور قبیلے کا فرد ہوں، میرے پاس بظاہر کوئی طاقت نہیں، لیکن ذرا سوچو کہ میں تنہا ہو کر تم سب کو چیلنج کر رہا ہوں۔

اِنِّیْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّیْ وَ رَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِیَتِهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۵۶﴾

(بیشک میں نے بھروسہ کیا ہے اس اللہ پر جو میرا بھی رب ہے اور تمہارے بھی رب ہے۔ کوئی جاندار بھی ایسا نہیں ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے پکڑا ہوا ہے اسے پیشانی کے بالوں سے۔ بیشک میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔) (سورۃ ھود : ۵۶)

مومن کا اصل سھارا

میں جس طرح بے خوف ہو کر تمہارے سامنے اللہ کا دین پیش کر رہا ہوں اور تمہاری دھمکیوں کے مقابلے میں استقامت کا ثبوت دے رہا ہوں اور نہ میں تمہاری طاقت کو خاطر میں لاتا ہوں اور نہ تمہارے معبودوں کو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں اس اللہ پر بھروسہ رکھتا ہوں جو میرا بھی رب ہے اور

Marfat.com

تمہارا بھی رب ہے۔ اس نے جب مجھے تمہاری اصلاح کیلئے بھیجا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مجھے بے سہارا چھوڑ دے۔ میں اپنی ذات میں کوئی قوت نہیں رکھتا، لیکن جس ذات کی مجھے پشت پناہی حاصل ہے اس کی قوتیں بے پناہ ہیں۔ کوئی جانور اور کوئی زندہ شخص دنیا میں ایسا نہیں جسے اللہ نے اس کی پیشانی کے بالوں سے نہ پکڑ رکھا ہو۔ یعنی وہ اس کے سامنے بالکل بے بس اور بے کس نہ ہو۔ دنیا کے تمام چھوٹے بڑے تمام غریب وامیر اور تمام حاکم ومحکوم اس کے سامنے یکساں طور پر بے بس ہیں۔ تم اگر سارے مل کر بھی میرا کچھ بگاڑنا چاہو اور وہ نہ چاہے تو وہ تمہیں پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر سیدھا کر سکتا ہے۔ یعنی تمہاری تمام قوتوں کو بے اثر کر سکتا ہے اور تمہاری تمام تدبیروں کو ناکام کر سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھو کہ میرا رب سیدھے راستے پر ہے۔ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس طرح تمہارے طاقتوروں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزوروں کو جھکا رکھا ہے اور تمہارے تخت وتاج کے مالکوں نے آزاد انسانوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے اور طاقت اور دولت کے زور سے اللہ کی زمین پر ظلم کا کاروبار چل رہا ہے، یہ سب کچھ تمہارے بگاڑ کا نتیجہ ہے اور غلط نظریات کا شاخسانہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتیں بے حدو بے شمار ہیں۔ اس کی گرفت بے امان ہے، لیکن اس کی طاقت اس کے عدل کی پاسدار ہے۔ اس کی گرفت صرف مجرمین کیلئے ہے۔ اس کا ہر فیصلہ صحیح نتائج کا آئینہ دار ہے جو اس کے حصار میں آجاتا ہے اور اس سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے وہ ہر ظلم سے بچ جاتا ہے۔ عدل کا سایہ ہمیشہ اس کے سر پر جلوہ فگن رہتا ہے۔ اس کے فیصلوں کی جہت ایک ایسا صراطِ مستقیم ہے جس میں کوئی موڑ نہیں، کوئی الجھن نہیں۔ ہر عمل صحیح نتیجہ سے پیوست ہوتا ہے اور اس کے راستے پر چلنے والا جزاء وسزا کے صحیح ترتیب سے نوازا جاتا ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہو سکتا ہے کہ ہر انسان کے اندر ایک خواہش مضمر ہے کہ میں کسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکوں۔ میرے تمام اعمال اس کے یہاں قبولیت کا مقام پا سکیں۔ میری منزل اسی کا قرب واتصال ہو۔ لیکن اس خواہش کے حصول کیلئے انسانوں نے ہمیشہ دھوکے کھائے۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو بادشاہوں پر قیاس کیا ہے انہیں یہ بدگمانی ہوئی ہے کہ جس طرح بادشاہوں تک کسی شخص کی رسائی بغیر واسطوں کے ممکن نہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قرب بھی براہ راست حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک سمجھا کہ وہ ذات اتنی عظیم اور اتنی بلند ہے کہ انسان کی رسائی وہاں تک ممکن ہی نہیں۔ اس لئے اس کے قرب اور اس کی خوشنودی کے حصول کیلئے صرف یہی کافی ہے کہ درمیان کے واسطوں کو خوش رکھا جائے۔ انہیں کی خوشنودی کیلئے قربانیوں کا درجہ بہ درجہ سلسلہ وجود میں آیا۔ ان لوگوں کا گمان یہ ہے کہ ان درمیانی واسطوں کے خوش ہونے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔ مشرکینِ مکہ بھی یہی کہتے تھے کہ ہم اپنے بتوں یا دیوتاؤں کی اس لئے پوجا کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں۔ حضرت ہود علیہ السلام نے ان لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کیلئے ارشاد فرمایا: کہ مجھے اپنے رب تک رسائی اور اس کا قرب حاصل کرنے کیلئے کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جس طرح ان واسطوں میں پڑ کر اپنی منزل کھوٹی کی ہے اور مختلف پگڈنڈیوں میں سرگرداں پھر رہے ہو، میں! فضلہ تعالیٰ اس گمراہی اور سرگشتگی سے دور ہوں۔ میں صدقِ دل اور اخلاص سے اگر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤں اور اپنی عقل اور اپنی فطرت کو اس کے راستے کا مسافر بنا لوں تو مجھے اپنے رب تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ وہ بالکل سیدھی راہ پر میرے سامنے ہے۔ وہ میری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ میں جب پکارتا ہوں تو وہ سنتا اور جواب دیتا ہے۔ جب کوئی مجھے سہارا دینے والا نہیں ہوتا تو وہی سہارا دیتا ہے۔ میں تمہیں اسی ربِ کائنات کی طرف دعوت دیتا ہوں، اسی کے راستے پر تمہیں چلانا چاہتا ہوں، اسی کی خوشنودی کو تمہارے لئے آسان کر رہا ہوں اور تم نہ جانے کہاں سرگرداں پھر رہے ہو۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ؕ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ وَلَا تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ؕ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ﴿٥٧﴾
(سورۃ ھود : ۵۷)

(پس اگر تم روگردانی کرو تو میں نے تو پہنچا دیا ہے تمہیں وہ پیغام جسے دے کر مجھے تمہاری طرف بھیجا گیا ہے اور جانشین بنا دے گا میرا رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو اور تم اس کا کوئی نقصان نہ کر سکو گے۔ بیشک میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔)

حضرت ہود علیہ السلام کی آخری تنبیہ

اس رکوع کی سابقہ آیات کو ایک ترتیب سے پڑھیئے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنے اصولی مؤقف پر ہر طرح کے دلائل بھی دیئے اور ان کی غیر معقول باتوں کا جواب بھی دیا۔ انہوں نے نفسیاتی حربے استعمال کرتے ہوئے آپ کو ہراساں کرنا چاہا تو آپ نے

Marfat.com

اپنے مضبوط عقیدے اور غیرت کے حوالے سے انہیں مبہوت کر کے رکھ دیا۔ اب کہنے اور دعوت دینے کی حد تک کوئی بات باقی نہیں رہی، لیکن ان کا رویہ دیکھتے ہوئے آپ نے انہیں آخری وارننگ دی کہ اگر تم لاجواب ہونے کے باوجود بھی اپنا رویہ بدلنے کیلئے تیار نہیں ہو اور اپنے اعراض کی روش پر اڑے رہنے کا فیصلہ کر چکے ہو تو پھر میں تم سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں، مجھے جو پیغام دے کر بھیجا گیا تھا میں نے اس کے ابلاغ کا حق ادا کر دیا ہے، اب نتائج کی ذمہ داری سراسر تمہارے سر ہے۔ اب مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ کے قانون کے مطابق تم پر عذاب آئے گا اور تمہاری جڑ کاٹ دی جائے گی۔

ہر دور کے برخود غلط لوگ اس طرح کی خوش فہمیوں میں ڈوبے رہتے ہیں کہ عذاب اور تباہی کی دھمکیاں محض بچگانہ باتیں ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک رہتی بستی قوم اجاڑ دی جائے اور ایک علاقہ بے آباد کر دیا جائے۔ ایسا ہونے لگے تو اس زمین پر رہنے والا کوئی نہ ملے۔ قدرت کبھی بھی تباہی کے عمل کو بے ہنگم نہیں چھوڑتی۔ یہ آباد اور سیراب خطہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہے گا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا کی آبادی تمہارے دم قدم سے نہیں۔ اس گلشنِ ہستی کی آبادی کیلئے قدرت تمہاری محتاج نہیں۔ جس طرح تمہیں آباد کیا گیا تھا اسی طرح تمہاری تباہی کے بعد ایک نئی قوم یہاں آباد کر دی جائے گی، لیکن تمہارے جانشین تم جیسے نہیں ہوں گے۔ وہ یہاں حسنِ عمل کے پھول کھلائیں گے۔ اپنی محنت و کاوش سے علم و حکمت کے چشمے جاری کر دیں گے۔ ان کا وجود اس دھرتی کیلئے مسعود ثابت ہو گا، لیکن تم اپنی تباہی پر اللہ تعالیٰ کا کچھ بگاڑ نہیں سکو گے۔ آنے والی نسلیں تم سے عبرت حاصل کریں گی اور نئے آباد ہونے والے اپنی محنتوں کا پھل کھائیں گے۔ میرا رب ہر چیز پر نگہبان ہے۔ تمہیں تمہاری بداعمالیوں کے سبب تباہ کیا جائے گا تو تمہارے جانشینوں کو ان کے حسنِ عمل کی وجہ سے نوازا جائے گا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۸﴾

(اور جب آ گیا ہمارا حکم تو ہم نے نجات دے دی ہود کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت کے سبب سے۔ اور ہم نے انہیں سخت عذاب سے نجات دے دی۔) (سورة هود : ۵۸)

اللہ تعالیٰ کا عذاب

حضرت ہود علیہ السلام کی آخری تنبیہ بھی جب انہیں عقل کے ناخن لینے پر آمادہ نہ کر سکی تو آخر اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق اپنے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو اس عذاب سے محفوظ رکھا اور باقی پوری قوم کو تباہ کر دیا گیا۔ یہ تو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح حضرت ہود اور آپ پر ایمان لانے والوں کو عذاب سے بچایا۔ لیکن اس آیت سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کی شدت اور اس کی وسعت کو دیکھتے ہوئے بچ جانے کا کوئی امکان نہ تھا، لیکن یہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی جس نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ آیت کے آخری جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب اپنی ہولناکیوں اور تباہیوں میں اپنی مثال آپ تھا کیونکہ جس عذاب کو خود پروردگار عذابِ غلیظ قرار دے اس کی شدت کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور ایسے ہولناک عذاب سے جنہیں محفوظ رکھا گیا ہے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور ان پر اس کی رحمت کا کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں عذاب کی نوعیت کا ذکر نہیں کیا گیا اور اس کی کوئی تفصیل بھی بیان نہیں کی گئی۔ مولانا فراہیؒ نے سورۃ ذاریات کی تفسیر میں اس عذاب کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے ہم اسے یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

(قرآن مجید میں قوم عاد کی ہلاکت کی جو تفصیلات بیان ہوئی ہیں ان پر جو شخص غور کرے گا اس سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ وہ تند ہوا کے ذریعے سے ہلاک کیے گئے جس کے ساتھ سرما کے وہ بادل بھی تھے جو ہمیشہ رعد و برق کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ قرآن میں جہاں ان کی تباہی کا ذکر ہوا ہے ہوا کے ساتھ پانی سے خالی بادلوں اور صاعقہ کا بھی ذکر ہے۔ سورۂ احقاف میں ہے فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا (پس جب انہوں نے اس کو (عذاب کو) دیکھا ابر کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے، بولے یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسنے والا ہے بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کیلئے تم جلدی مچائے ہوئے تھے، باد تند جس کے اندر ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ اکھاڑ پھینکے گی ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے۔)

Marfat.com

ظاہر ہے یہ تمام خصوصیات موسم سرما کی بادِ تند کی ہیں۔اس زمانے میں، عرب میں بادِ شمال صرصر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے اور قحط و خشکی کی ایک عام نحوست اور تباہی ہر طرف پھیل جاتی ہے۔سورۂ قمر میں اس چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡ يَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ (اور ہم نے ان پر بادِ صرصر چلا دی قائم رہنے والی نحوست کے زمانے میں) اسی طرح حٰم السجدہ میں ہے فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ (پس ہم نے ان پر بادِ صرصر چلا دی نحوست کے زمانے میں) بادِ صرصر کے یہ طوفان، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، عرب میں جاڑوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہی زمانہ ان کے ہاں نحوست اور فاقہ کا سمجھا جاتا ہے۔)

ہمارے قدیم مفسرین بھی بعض روایات کی مدد سے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ قومِ عاد پر بادِ تند کی صورت میں عذاب آیا تھا اور اس کی تندی اور تیزی کا عالم یہ تھا کہ کوئی درخت اس کے سامنے نہ ٹھہر سکا، درخت جڑوں سے اکھڑ گئے، عمارتیں ڈھے گئیں، زندہ انسانوں اور حیوانوں کو ہوا اس طرح اچھالتی تھی کہ وہ فضائے آسمانی میں چیخ کر چیختے ہوئے زمین پر گرتے تھے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔اس طرح سے ایک ایسی ہولناک تباہی مچی جس کو دیکھ کر بھی پتہ پانی ہوتا تھا۔

وَتِلۡكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَعَصَوۡا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ ۝ وَاُتۡبِعُوۡا فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا لَعۡنَةً وَّيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ عَادًا كَفَرُوۡا رَبَّهُمۡ ؕ اَلَا بُعۡدًا لِّعَادٍ قَوۡمِ هُوۡدٍ ۝ (سورۃ ھود : ۵۹.۶۰)

(اور یہ ہے قومِ عاد جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر متکبر دشمنِ حق کے حکم کی پیروی کی۔اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں لعنت، اور قیامت کے دن بھی۔سنو! عاد نے اپنے رب کا انکار کیا۔سنو! ہلاکت و بربادی ہے عاد کیلئے جو ہود کی قوم تھی۔)

قومِ عاد کے بڑے بڑے جرائم

قومِ عاد کے انجامِ بد کا ذکر فرمانے کے بعد مشرکینِ مکہ کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ یہ قومِ عاد جو تمہاری ہی طرح ایک مضبوط قوم تھی ان کا یہ حسرت ناک انجام اس لئے ہوا کہ ان کی داغدار زندگی میں چند جرائم ان کی زندگی کا عنوان بن کر رہ گئے تھے۔ان میں پہلا جرم یہ تھا کہ انہوں نے ہر معاملے میں اپنے رب کی آیات یعنی اس کے احکام کا انکار کیا۔''جحد'' اس بات کے انکار کو کہتے ہیں جس کا دل میں اقرار موجود ہو۔دل مانتا ہو کہ پیغمبر جس بات کی دعوت دے رہا ہے وہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے، لیکن اپنے مفادات، غلط ترجیحات، اندھے تعصبات اور نفسانی خواہشات کے ساتھ وابستگی اور وفاداری اللہ کے دین کے راستے میں حائل ہو جائے۔قومِ ہود کا یہی حال تھا۔وہ حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کی تاثیر کے قائل تھے۔ان کے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ان کی بے عیب زندگی دلوں میں اتر جانے والی تھی۔ان تمام باتوں کے باوجود وہ کسی طور بھی ایمان لانے کیلئے تیار نہ تھے۔زندگی کی ناکامیوں کو انہوں نے قبول کیا لیکن حق سے عناد کی وجہ سے وہ کامرانیوں کا راستہ اختیار نہ کر سکے۔

جب کسی قوم میں عیش پرستی اور حبِ دنیا جڑ پکڑ لیتی ہے تو پھر اس کے دل و دماغ میں فاصلے حائل ہو جاتے ہیں۔ان کے قلبی اعتقادات کچھ اور ہوتے ہیں اور دماغی فیصلے کسی اور سمت میں جاتے ہیں۔عیش پرستی کے باعث ان میں جہد و عمل کی خواہش کمزور پڑ جاتی ہے۔وہ زندگی کے حقائق سے گریز کرتے ہیں اور خوابوں کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔ایسے لوگ ہمیشہ دھرتی کا بوجھ ہوتے ہیں۔

ان کا دوسرا جرم یہ تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی نافرمانی کی۔قرآنِ کریم میں کہیں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ کوئی اور پیغمبر بھی مبعوث ہوئے تھے۔اس کے باوجود رُسل جو رسول کی جمع ہے کا استعمال معلوم ہوتا ہے ایک خاص حقیقت کی طرف اشارے کیلئے ہوا ہے۔وہ یہ کہ رسول تو قومِ عاد کی طرف ایک ہی آیا تھا لیکن رُسل کا لفظ لا کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ تمام رسولوں کی دعوت ایک ہے۔ان کے بنیادی اعتقادات یکساں ہیں۔ان کی ہدایت ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے پھوٹی ہے۔وہ ایک ہی ذات کے نمائندہ ہو کر آتے۔اس لئے کسی ایک رسول کا انکار درحقیقت تمام رسولوں کا انکار ہے۔قومِ عاد نے ایک رسول کا انکار ہی نہیں بلکہ تمام رسولوں کا انکار کیا کیونکہ حضرت ہود علیہ السلام تمام رسولوں کے نمائندہ تھے اور ان کی صفات کی ایک جامع شخصیت تھے۔انہوں نے اس طرح دلسوزی اور جانسپاری سے اپنی قوم تک اللہ کا پیغام پہنچایا کہ اگر ایک سے زیادہ

Marfat.com

رسول بھی ہوتے تو شاید اس سے زیادہ جانفشانی کا عمل وجود میں نہ آتا لیکن قوم نے ہر قدم پر ان کی نافرمانی کی۔ ان کے پاکیزہ اطوار کو جھٹلایا، ان کی سچائیوں کا مذاق اڑایا اور اللہ کی وہ تمام آیات جو آپ کے عمل میں آ کر دلیل و برہان کی شکل اختیار کر گئی تھیں، ان کی پیروی کرنے سے انکار کر دیا۔

ان دو جرائم میں معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم شریک تھی۔ ان کا عام آدمی بھی اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان تھا اور اس کے خواص بھی اپنے علم و دانش کے باوجود اللہ کی آیات اور اس کے احکام کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ ان کے دل جس بات کو قبول کرتے تھے ان کی زبانیں ان کے خلاف زہر اگلتی تھیں اور ان کے دماغ ان کے خلاف منصوبہ بندی کرتے تھے۔ اس طرح سے وہ ایک طاغوت کی شکل اختیار کر چکے تھے، لیکن جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے ان کی اصل کمزوری اور گمراہی جس نے ان کے کردار کی خصوصیات کو بالکل تباہ کر کے رکھ دیا تھا وہ یہ تھی کہ وہ نہ تو کسی حق کی پیروی کرنے کیلئے تیار تھے نہ اللہ تعالیٰ کی آیات ان کیلئے اپیل رکھتی تھیں، نہ اللہ کے رسول کی شخصیت ان کیلئے کسی کشش کا باعث تھی۔ وہ اگر اتباع کرتے تھے تو صرف اس شخص یا اس طبقے کی جسے جبار اور عنید کہا گیا ہے۔ یعنی ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے، جس کے پاس قوت ہے جو طاقت کے زور سے اپنی بات منوا سکتا ہے، جو لوگوں کے ضمیر خرید سکتا ہے، عہدہ و منصب کی چابیاں جس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ وہ جبار ہے جس کی اطاعت اور اتباع کرنے کیلئے وہ ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ ایسا جبار ناممکن ہے کہ کسی حق کا اتباع کرے۔ اس لئے اس کی صفت کے طور پر عنید کا لفظ لایا گیا ہے کہ جو شخص صرف اپنی ذات کی پوجا کرواتا ہے اور اپنے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو قانون کا درجہ دیتا ہے اس سے بڑھ کر دشمنِ حق اور کون ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قوم عاد کا وہ طبقہ جسے عوام کہا جاتا ہے اور وہ طبقہ جو ذاتی مفادات اور خواہشات کے حصول کیلئے ارباب اقتدار کا طواف کرتا ہے، وہ ایسے ہی جابر اور دشمنِ حق کی پیروی کرتا ہے تاکہ اس کے مفادات محفوظ رہیں اور اس کے جبر اور ظلم کے سائے میں ان کی اپنی دنیا آباد رہے۔ وہ ہر جائز و ناجائز کے حصول کیلئے اسی قوت کے مرکز کو استعمال کرتے ہیں۔ قوم عاد کے یہی وہ جرائم تھے جنہوں نے انہیں ہر طرح کی خوبی سے تہی دامن کر دیا تھا۔ اللہ کا دین ان کیلئے ایک اجنبی چیز تھی کیونکہ ان کی زندگی کے طور اطوار اس سے بالکل میل نہیں کھاتے تھے۔ اللہ کو اپنی زمین پر چونکہ ایسے لوگ گوارہ نہیں، اس لئے جب بھی کوئی قوم اس سطح تک پہنچتی ہے تو اسے فنا کر دیا جاتا ہے اور ان کی تباہی کی داستان اس طرح عبرت انگیز بنا دی جاتی ہے کہ لعنت ان کے دائیں بائیں چلتی ہے اور قیامت کے دن تو لعنت کا مرکز جہنم ان کی جگہ ہوگا۔ آخر میں فرمایا کہ اے مشرکینِ مکہ اور اے دنیا کے لوگو! کان کھول کے سن لو کہ جس قوم عاد کا انجام تم نے سنا اور جن کے کھنڈرات تمہیں ہمیشہ دعوتِ نظارہ دیتے ہیں انہوں نے بھی تمہاری طرح اپنے رب کا کفر کیا تھا اور اللہ ان سے اس حد تک ناراض ہے کہ ان کے بارے میں صاف فرما دیا گیا کہ دور ہو قوم عاد، اللہ کی رحمت سے، اور بربادی ہو ان کیلئے جو ہود کی قوم تھی۔ تو اگر کسی میں گوشِ حق نیوش ہے اور دیدۂ عبرت نگاہ ہے تو اس قوم کے انجام سے سبق سیکھنا چاہیے۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ

صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ
مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ
اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿٦١﴾ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ
هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ

Marfat.com

إِلَيْهِ مُرِيبٍ ﴿٦٢﴾ قَالَ يَٰقَوْمِ أَرَءَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن
رَّبِّي وَءَاتَىٰنِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَن يَنصُرُنِي مِنَ ٱللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُۥ
فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ﴿٦٣﴾ وَيَٰقَوْمِ هَٰذِهِۦ نَاقَةُ ٱللَّهِ لَكُمْ ءَايَةً
فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِيٓ أَرْضِ ٱللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوٓءٍ فَيَأْخُذَكُمْ
عَذَابٌ قَرِيبٌ ﴿٦٤﴾ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا۟ فِي دَارِكُمْ ثَلَٰثَةَ
أَيَّامٍ ذَٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ﴿٦٥﴾ فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَٰلِحًا
وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ مَعَهُۥ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ إِنَّ
رَبَّكَ هُوَ ٱلْقَوِيُّ ٱلْعَزِيزُ ﴿٦٦﴾ وَأَخَذَ ٱلَّذِينَ ظَلَمُوا۟ ٱلصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا۟
فِي دِيَٰرِهِمْ جَٰثِمِينَ ﴿٦٧﴾ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا۟ فِيهَآ أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا۟
كَفَرُوا۟ رَبَّهُمْ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ﴿٦٨﴾

(اور ہم نے بھیجا) قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی (حضرت صالح علیہ السلام) کو۔ (حضرت صالح نے) کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اس نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا اور پھر اس زمین میں تمہیں بسا دیا۔ پس اس سے مغفرت طلب کرو، پھر لوٹ جاؤ اس کی طرف۔ بیشک میرا رب قریب ہے اور (التجائیں) قبول کرنے والا ہے۔ انہوں نے کہا: اے صالح! تم اس سے پہلے ہم میں امیدوں کا مرکز تھے۔ کیا تم ہمیں اس بات سے روکتے ہو کہ ہم عبادت کرتے ہیں ان کی جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ بیشک ہم اس عمل کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے ایک بے چین کر دینے والے شک میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے رحمت خاص سے بھی مجھے نوازا ہے تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ کے وقت کون میرا مددگار ہوگا۔ سو تم میری بربادی ہی میں اضافہ کرو گے۔ اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمہارے لئے نشانی ہے۔ پس اسے چھوڑ دو تا کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور کسی برائی کے ارادے سے اسے ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ تمہیں بہت جلد عذاب آ پکڑے گا۔ پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا لطف اٹھاؤ اپنے گھروں میں تین دن تک۔ یہ اللہ کا وعدہ

Marfat.com

ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ پس جب ہمارا حکم صادر ہوا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنے خاص فضل سے اس عذاب اور اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی، بیشک تمہارا رب ہی قوی اور غالب ہے۔ اور ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا خدا کی ڈانٹ نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں زمین میں چمٹے پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سن لو ثمود نے اپنے رب کی ناشکری کی۔ سن لو کہ ہلاکی ہے ثمود کیلئے۔)

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾ (سورۃ ھود : ۶۱)

(اور ہم نے بھیجا) قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی (حضرت صالح علیہ السلام) کو۔ (حضرت صالح نے) کہا اے میری قوم! عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اس نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا اور پھر اس زمین میں تمہیں بسا دیا۔ پس اس سے مغفرت طلب کرو، پھر لوٹ جاؤ اس کی طرف۔ بیشک میرا رب قریب ہے اور (التجائیں) قبول کرنے والا ہے۔)

قومِ ثمود کی سرگزشت بھی گزشتہ واقعات کی کڑی ہے

اس سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ہود علیہ السلام کا تذکرہ ہو چکا ہے اور ان کی دعوت کے انکار کے نتیجے میں ان کی قوموں پر عذاب آنے کے واقعات بیان ہو چکے ہیں۔ مقصود مشرکینِ مکہ کو یہ بتانا ہے کہ نبی کریم ﷺ کوئی پہلے رسول نہیں ہیں جو تمہاری طرف مبعوث ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف وقتوں میں ہر قوم کی طرف کوئی نہ کوئی رسول بھیجا ہے۔ رسول کے آنے کے بعد قوم ایک امتحان میں مبتلا ہو جاتی ہے، اگر وہ رسول کی دعوت کو قبول کرتی ہے تو دنیاوی اور اخروی کامیابیوں کا راستہ اس کیلئے کھل جاتا ہے لیکن اگر وہ انکار کرتی ہے تو اتمامِ حجت کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کر دیتا ہے۔ چنانچہ جن قوموں کا تذکرہ ہو رہا ہے یہ بھی اسی قانون کے تحت عذاب کا شکار ہوئیں، تو اب اگر مشرکینِ مکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کریں گے تو وہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی دی جا رہی ہے کہ آپ ان کی مخالفتوں کا زیادہ اثر نہ لیں۔ ہر قوم نے اپنے پیغمبر کے ساتھ ایسا ہی کیا، لیکن کامیابی بالآخر اللہ کے رسول اور ان پر ایمان لانے والوں کو ملتی ہے اور انکار کرنے والے فنا کر دیئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اب اسی سلسلۂ واقعات میں قومِ ثمود اور حضرت صالح علیہ السلام کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ قومِ ثمود کا مسکن حجاز اور شام کا درمیانی خطہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم حضرت ہود پر ایمان لانے والوں کی اولاد تھی۔ جب قومِ عاد پر عذاب آیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود اور ان پر ایمان لانے والوں کو بچا لیا، اور وہ یہاں آ کر آباد ہو گئے۔ یہاں ان کی اولاد خوب پھیلی۔ انہوں نے محنت سے اس علاقے کو آباد کیا۔ کھیتی باڑی کے ہنر سے واقف تھے، اس لئے یہاں لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور سرسبز و شاداب باغات کے باعث یہ علاقہ رشکِ ارم بن گیا۔ فنِ تعمیر میں بھی انہوں نے خوب ترقی کی تھی۔ اس لئے زراعت کے ساتھ ساتھ انہوں نے پہاڑوں میں ایسے حیرت انگیز طریقے سے کھدائی کر کے مکانات بنائے جو آج تک ان کی یادگار کے طور پر اس تباہ شدہ علاقے میں کھڑے ہیں۔ علوم و فنون میں ترقی کے باعث ان میں خود پسندی اور تکبر و نخوت ان کے کردار کا لازمی حصہ بن گئے تھے۔ دولت کی فراوانی نے انہیں خواہشات کا اسیر کر دیا تھا۔ اس لئے ان کے اندر وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جو دولت پر جان دینے والوں اور اپنی ترقی پر ناز کرنے والوں میں بالعموم پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی ہدایت کیلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو بھیجا۔ حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں سب سے پہلے وہی بات فرمائی جو پروردگار نے اکثر پیغمبروں کے بارے میں فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت صالح اور ان کے قوم کے درمیان اخوت کا رشتہ تھا۔ کیونکہ گزشتہ رکوع میں ہم یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ ہر پیغمبر کی بعثت کا مقصدِ اولیں لوگوں کی اصلاح ہوتا ہے۔ وہ ان کیلئے معلم اور مربی بن کے آتے۔ اس لئے یہ بات از بس ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہونی چاہئے۔ اخوت دراصل اس بات کی ضمانت ہے کہ تمہاری طرف جو معلم اور مربی بھیجا گیا ہے اس کے اور تمہارے درمیان کوئی اجنبیت کا پردہ نہیں۔ تم پورے اعتماد کے ساتھ اس کی ہر بات کو قبول کر سکتے ہو۔

Marfat.com

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت اور دلائل

دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں فرمائی گئی ہے وہ حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت ہے جس کی طرف آپ نے اپنی قوم کو بلایا ہے۔ ہم گزشتہ رکوع میں عرض کر چکے ہیں کہ دنیا میں جو رسول بھی آیا اس نے آ کر اپنی قوم کے سامنے سب سے پہلے یہی نسخۂ شفا پیش کیا۔ کیونکہ انسان کے بگاڑ کا کوئی بنیادی سبب ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ کون سا آستانہ ہے جس پر اس کا سر جھکنا چاہیے۔ وہ کون سی ذات ہے جس کی اسے غیر مشروط اطاعت کرنی چاہیے۔ کون سا قادرِ مطلق ہے جس کے سامنے دستِ سوال دراز ہونا چاہیے، وہ کون سا محبوب حقیقی ہے جس سے دلوں کی دنیا آباد ہونی چاہیے، وہ کون سا حاکمِ حقیقی ہے جسے غیر مشروط طور پر آئین سازی کا حق حاصل ہے اور جس کی نافرمانی سے ہر حال میں ڈرنا چاہیے۔ وہ کون سا لاانتہا علم و دانش کا مالک ہے۔ جس کی ہر حال میں رہنمائی حاصل کرنی چاہیے اور وہ کون ہے جو دنیا کا بھی مالک ہے اور آخرت کا بھی۔ اس لئے اس نے دونوں کی ہدایت اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ اور وہ کون ہے جو بے پناہ علم و آگہی رکھتا ہے کہ وہ عالم الغیب بھی ہے اور عالم الشہادہ بھی۔ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن کے صحیح جواب پر انسان کی فلاح و بقا کا دارومدار ہے۔ اس لئے ہر نبی نے سب سے پہلے اسی بنیادی گرہ کو کھولا ہے اور یہ بتایا ہے کہ تم اللہ کے بندے اور اس کے غلام ہو اس لئے تمہیں ہر صورت اسی کی بندگی اور غلامی کرنی ہے اور غلامی کا تعلق صرف پوجا پاٹ سے نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔ اسی طرح وہ یہ بات بھی بتاتے ہیں کہ تمہارا اس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں اور اِلٰہ وہ ہوتا ہے جس میں متذکرہ بالا تمام صفات پائی جائیں۔

چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کے سامنے تمام انبیاء کرام کی طرح یہی دعوت پیش کی اور پھر اللہ کو اِلٰہ ثابت کرنے کیلئے دو دلیلیں بھی ارشاد فرمائیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ تمہارا اِلٰہ اور حاکمِ حقیقی اس وجہ سے صرف اللہ ہی ہونا چاہیے کیونکہ اس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور پھر اس کی صفت تخلیق کی ہمہ گیری اور اس کی قدرت بالغہ کا حال یہ ہے کہ تمہیں پیدا بھی زمین کے جوہر سے کیا ہے۔ تمہارے جدِ امجد حضرت آدم علیہ السلام کو تو اس نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا لیکن اُن کا ست بھی مٹی سے تیار ہوا اور ان کے بعد ان کی اولاد میں نسلِ انسانی کا طریقہ یہ ٹھہرا کہ اسی زمین سے پیدا ہونے والی غذا انسان کے اندر مادۂ تولید پیدا کرے گی اور یہی مادہ بقائے نسلِ انسانی کا ضامن ہوگا۔ چونکہ یہ مادہ زمین سے پیدا ہونے والی غذا سے بنتا ہے اس لئے ارشاد فرمایا کہ تمہارا اِلٰہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا۔ اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انسان کا مادۂ تخلیق تو پانی کا گندا قطرہ ہے جو زمین کی پیدا کردہ غذا سے تیار ہوا۔ لیکن پستی کی امین اس مٹی سے اور نجاست کی علامت اس مادے سے جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے اس کے کمالات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس کی من موہنی اور دلآویز شکل و صورت، اس کا سڈول جسم، اس کے متناسب اعضاء، تمام مخلوقات میں سے، سب سے زیادہ جاذبِ نظر اس کی شخصیت، اس کے دل و دماغ کی رعنائیاں، اس کے احساسات کی بلندی، اس کے تخیل کی پرواز، اس کا جمالیاتی ذوق، اس کے عزائم کی وسعت، اس کی حیرت انگیز قوتِ ایجاد جس نے لوہے میں قوتِ پرواز پیدا کر دی، جس نے تاریکیوں میں روشنی کے قمقمے آویزاں کر دیئے جس نے کمپیوٹر کی شکل میں ایک متبادل دماغ کو وجود دیا۔ جب انسان کی اس حیران کر دینے والی شخصیت کو ہم دیکھتے ہیں اور پھر اس کے مادۂ تخلیق کی بے بضاعتی پر نظر ڈالتے ہیں تو بے ساختہ اللہ کی صفتِ تخلیق کے سامنے آدمی کا سر جھک جاتا ہے کیونکہ عقل یہ باور کرنے سے عاجز ہے کہ مٹی کی کچی اینٹوں سے تاج محل کھڑا ہو جائے اور بے جان مادے سے جاندار چیز وجود میں آ جائے۔ ساکت و صامت مادہ سے دیکھنے والا، بولنے والا اپنے صلاحیتوں سے حیران کر دینے والا اور دنیا کو اپنی قوت سے تسخیر کرنے والا انسان وجود میں آ جائے لیکن ہم یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ارشاد فرمائی کہ پھر اللہ تعالیٰ نے اسی زمین میں تمہیں آباد فرمایا۔ مخلوق کو کسی جگہ آباد کرنے کا مطلب اس کی ضروریات کا مہیا کرنا اور گرد و پیش کو اس کے مناسب بنانا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان پر زمین کی آبادی کا فیصلہ فرمایا تو زمین میں قوتِ روئیدگی رکھی تاکہ انسان کی غذائی ضرورتیں زمین ہی سے اگائی جا سکیں۔ زمین ہی پر پانی کے ذخیرے جمع کر دیئے۔ زمین کے نیچے بھی پانی کے سوتے رواں کر دیئے۔ کہیں چشمے ابل رہے ہیں، کہیں آبشاریں گر رہی ہیں، کہیں دریا بہہ رہے ہیں۔ سورج کی کرنوں کو حکم دیا کہ وہ سمندر سے اپنی کرنوں کے ڈول بھر بھر کر کھینچے اور فضاء میں ابر کی چادریں بچھا دے اور ہوا کو اس کام پر لگا دیا ہے کہ جہاں زمین کو آبیاری کی ضرورت ہو وہاں وہ بادلوں کو کھینچ کر لے جائے اور پانی برسا دے۔ سورج، چاند، ہوا اور آگ ہر چیز کو زمین کے اس باسی کی خدمت پر لگا دیا تاکہ اس کی آبادی کا سامان ہو سکے۔ جو شخص بھی سرسری نظر سے بھی آبادی کے ان

Marfat.com

اسباب پر غور کرے گا وہ اللہ کی صفتِ تخلیق کے بعد اس کی صفتِ ربوبیت کو دیکھ کر سر سجدے میں ڈال دے گا۔ بعض اہلِ علم نے اِسْتَعْمَرَكُمْ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اس نے تمہیں زمین کی آبادی کا حکم دیا ہے اور زمین کی آبادی پر لگا دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری تہذیبی اور تمدنی ضرورتوں کیلئے (جو آبادی ہی کا حصہ ہیں) تمہارے اندر اس کی صلاحیت پیدا کر دی۔ آبادی کیلئے مکانوں کی ضرورت تھی۔ تمہیں فنِ تعمیر سے آگاہ فرمایا۔ زمین سے غذا کے حصول کیلئے تمہیں فنِ زراعت دیا گیا۔ تن پوشی کیلئے تمہیں کپاس کے اگانے اور پھر اس سے کپڑا بنانے کا ہنر سکھایا گیا اور یہ حقیقت ہے کہ ایک طرف تو ان تمام علوم وفنون کے سیکھنے کی صلاحیت انسان کے دماغ میں پیدا کی اور دوسری طرف انبیاء کرام کی معرفت ان چیزوں کی تعلیم کا بندوبست فرمایا۔ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کے علم کی وسعت، اس کی صفتِ تخلیق کا کمال، اس کی صفتِ ربوبیت کی ہمہ گیری اور اس کی صفتِ رحمت کا ظہور قدم قدم پر انسان کو احساس دلاتا ہے کہ تم اس کا آستانہ چھوڑ کر کدھر سرگرداں پھر رہے ہو۔ تمہیں تو اللہ تعالیٰ کے احسانات کا شکر گزار ہونا چاہئے اور شکر گزاری کا ادنیٰ تقاضا یہ ہے کہ اس کی نافرمانی نہ ہونے پائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے، اس کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہونے پائے لیکن تم نے ان میں سے کون سی بات ہے جس کا ارتکاب نہیں کیا۔ اس کی ذات وصفات میں نجانے کس کس کو شریک ٹھہرایا۔ قدم قدم پر اس کی نافرمانیاں کیں۔ حتیٰ کہ تم نے زمین کو فساد سے بھر دیا۔ اب بھی اگر تمہیں کچھ احساس ہو جائے تو پھر سب سے پہلے اس سے استغفار کرو۔ یعنی اب تک جو نافرمانیاں کی ہیں اور غلط تصورات بنا رکھے ہیں ان سب سے ہاتھ اٹھا لو۔ ایک ایک گناہ کو یاد کرو اور اسے حرفِ غلط کی طرح مٹا دو۔ اس طرح جب تمہارا دامن آلودگیوں سے صاف ہو جائے اور گندگی کا کوئی داغ اور دھبہ باقی نہ رہے تو پھر پوری طرح اللہ کی طرف پلٹ جاؤ۔ اس کے سامنے سر ڈال دو اور اس سے یہ عہد کرو کہ آئندہ میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے اللہ اور اس کے رسول نے روکا ہے اور ہر وہ کام کرنے کی کوشش کروں گا جسے اللہ نے کرنے کا حکم دیا ہے۔ تمام غلط باتوں کو چھوڑ دینا اور اس پر ندامت کا اظہار کرنا استغفار ہے۔ اور آئندہ کیلئے ہمہ جہت اطاعت کا عہد کرنا اور دل ودماغ کو اسی کی محبت سے آباد کرنا یہ توبہ ہے۔ اس کے بعد مزید ایک حیرت انگیز بات فرمائی جس نے انسانی مایوسیوں کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اسے ایک صالح زندگی اختیار کرنے کا حوصلہ ملا جس نے سالہا سال گناہوں کے دلدل میں گزارے تھے اور اسے دور سے تاریکی کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا اس کیلئے بھی نجات کا ایک راستہ کھل گیا۔ اسے تاریکی میں ایک روشنی جس سے اگر وہ چاہے تو ایک نئی صالح زندگی استوار کر سکتا ہے۔

اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ میں ایک جہانِ معنی مضمر ہے

ارشاد فرمایا: ان اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ بیشک میرا رب قریب بھی ہے اور دعاؤں اور التجاؤں کو قبول کرنے والا بھی ہے۔ ان چند لفظوں میں ایک جہانِ معنی مضمر ہے۔ مشرک قوموں کو جن غلط تصورات نے اللہ سے دور رکھا ہے بلکہ جس نے شرک کے راستے کھولے وہ ان کی یہ حماقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بادشاہوں راجوں مہاراجوں پر قیاس کرتے تھے۔ ان کا گمان یہ ہے جس طرح بادشاہ اپنے محل میں رہتا ہے، دربار لگاتا ہے لیکن اس تک رسائی صرف ان لوگوں کی ہوتی ہے جو اس کے مقربانِ بارگاہ ہوتے ہیں جبکہ اس کا ملک دور دراز علاقوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ملک کے مختلف گوشوں میں رہنے والے ہزار کوشش کے باوجود اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس نے لوگوں کی بھلائی کیلئے جابجا اپنے کارندے مقرر کر رکھے ہیں اور انہیں اپنے اختیارات میں سے کچھ اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ اس لئے جو آدمی بادشاہ کی رعیت ہوتے ہوئے اس سے وفاداری کا اظہار کرنا چاہتا ہے یا اپنے کسی کام کیلئے اس سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ جو اس نے درمیان میں واسطے مقرر کر رکھے ہیں وہ ان واسطوں سے تعلق پیدا کرے۔ چنانچہ اس کی درخواست انہیں واسطوں سے ہوتی ہوئی ممکن ہے بادشاہ تک پہنچ جائے ورنہ براہ راست اس کی درخواست کا بادشاہ تک پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔ بادشاہ تو بہت بلند ذات ہے۔ ایک شخص محکمہ مال کے سربراہ سے ملنا چاہتا ہے یا اس سے کوئی کام کرانا چاہتا ہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے پٹواری سے ملے، پھر قانونگو سے، پھر نائب تحصیلدار سے اور پھر تحصیلدار سے اس سے درجہ بدرجہ اوپر چڑھے گا تو اس کی فریاد کی شنوائی کا کوئی انتظام ہو سکے گا۔ بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ تک رسائی بھی اور اس سے التجا بھی واسطوں کی محتاج ہے۔ براہ راست اس سے رابطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس جملے میں اس تصور کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔ دلیل اتنی براہ راست ہے جو دل کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ اس کے الفاظ بولتے ہوئے اور کہتے ہوئے سنائی دیتے

Marfat.com

ہیں کہ نادانو! ذرا غور کرو کہ جو تمہارے قریب ہو اور قریب بھی اتنا کہ شہ رگ بھی اس سے زیادہ دور ہو۔ کیا اسے پکارنے یا اس سے رابطے کیلئے درمیان میں واسطے کی ضرورت پڑے گی۔ اسی طرح جو ہر وقت سنتا اور جواب دیتا اور التجاؤں کو قبول بھی کرتا ہو، اسے بجائے خود عرض کرنے کے کسی اور سے کہا جائے گا کہ آپ میری بات ان تک پہنچا دیں۔ عقلِ عام کا فیصلہ یہ ہے کہ جو خود قریب ہے اس میں فاصلے دے کر اسے دور مت کرو اور جو التجائیں سننے کیلئے ہر وقت مستعد ہو اسے التجائیں روک کر ناراض مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات نا مکان میں سمٹی ہوئی ہے اور نہ زمان میں۔ وہ ہر شخص کے اتنا قریب ہے کہ خود ارشاد فرماتا ہے کہ میں شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔ اور سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ میں ہر پکارنے والے کی آواز سنتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے اور اسے قبول کرتا ہوں۔ عیسائیت نے یہ تصور دے کر کہ انسان پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوا ہے انسان کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اور ہندوازم کے آواگون اور تناسخ نے انسانی مستقبل کو مکمل طور پر مایوسی کے اندھیروں میں دھکیل دیا ہے۔ صرف اسلام نے انسانیت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سطح سمندر پر لا کر ازسرنو زندگی کا امکان مہیا کیا۔ آنحضور ﷺ نے توبہ و استغفار پر اس قدر زور دیا کہ آپ کو رسول التوبہ کہا گیا ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کیلئے اتنا حوصلہ دیا ہے کہ وہ براہ راست اپنے اللہ سے بات کرسکتا ہے۔ وہ ہر گنہگار کی بھی سنتا ہے اور نیک کی بھی۔ برسوں کا نیکیاں کرنے والا اگر نیکی کے پندار میں مبتلا ہو جائے تو وہ محروم ہو جاتا ہے اور زندگی بھر کا پاپی اگر اخلاص سے اس کے دروازے پر آجائے تو وہ درِ کرم اس کیلئے کھل جاتا ہے۔ اقبال نے اس احساس کی ترجمانی کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾

(سورة هود : ٦٢)

(انہوں نے کہا: اے صالح! تم اس سے پہلے ہم میں امیدوں کا مرکز تھے۔ کیا تم ہمیں اس بات سے روکتے ہو کہ ہم عبادت کرتے ہیں ان کی جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ بیشک ہم اس عمل کے بارے میں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے ایک بے چین کر دینے والے شک میں مبتلا ہو گئے۔)

انسان جلدی تبدیلی قبول نہیں کرتا

حضرت صالح علیہ السلام کی اتنی مؤثر تقریر کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان کی قوم ان کی دعوت کو قبول کر لیتی اور آپ پر ایمان لے آتی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انسان اپنے غلط سے غلط تصورات اور بد سے بدتر اعمال پر بھی اس طرح اڑ جاتا ہے کہ حتی الامکان اس میں تبدیلی لانے کیلئے تیار نہیں ہوتا۔ جن اعتقادات کے ساتھ زندگی گزاری ہو وہ چاہے کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں انسان ان سے ایسا وابستہ ہو جاتا ہے کہ کسی طرح بھی ان سے دامن چھڑانا نہیں چاہتا حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کو ہمیشہ اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہئے اور جب بھی اسے غلطی کا احساس دلایا جائے اسے سوچنا چاہئے کہ کیونکہ اس بات کے امکان کو تو بہرحال رد نہیں کیا جاسکتا کہ عقل مند سے عقل مند آدمی بھی غلطی کرسکتا ہے تو پھر اندھوں اور بہروں کی طرح اپنی بات پر اڑ جانا ایک بے جوازسی بات ہے لیکن بگڑی ہوئی قوموں کا حال جو تاریخ نے ہمارے سپرد کیا ہے وہ یکسر اس سے مختلف ہے۔ وہ کبھی بھی تبدیلی کے خواہشمند نہیں ہوتے، جس ڈگر پر چل رہے ہوں اس میں کسی طرح کی کوئی کمی بیشی انہیں گوارا نہیں ہوتی۔ چنانچہ قوم ثمود نے بھی بجائے اپنی غلطیوں پر غور کرنے کے حضرت صالح علیہ السلام کو مطعون کرنا شروع کر دیا کہ تم نے یہ کیا الٹی سیدھی باتیں ہانکنا شروع کر دیں۔ ہم تو تمہارے بارے میں بہت بلند امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ تمہارا بچپن، تمہارا لڑکپن نہایت دل موہ لینے والا تھا۔ تمہاری جوانی پر رعنائیاں قربان ہوتی تھیں، لیکن کیا مجال ہے جو کبھی تمہارے کردار پر حرف آیا ہو۔ تمہاری زبان ہمیشہ شبنم برساتی رہی۔ تمہارے طور اطوار شرافت کی منہ بولتی تصویر رہے۔ پورے قبیلے میں کوئی تم جیسا نہ تھا تم بڑے ہوئے اور عملی زندگی میں آئے تو تمہاری اصابتِ رائے نے سب کو متاثر کیا۔ اب سب یہ توقع لگائے بیٹھے تھے کہ وہ دن دور نہیں جب تم اس قوم کی رہنمائی سنبھالو گے اور ان کی

Marfat.com

الجھی ہوئی گتھیاں حل کرو گے لیکن یہ نہ جانے تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم بجائے اپنے آباؤ اجداد کا نام روشن کرنے کے ان کا نام ڈبونے پر تل گئے ہو۔ ہمیں اس راستے سے روکنا چاہتے ہو جس پر ہمارے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں۔ تم چاہتے ہو کہ ہم ان معبودوں سے تعلق توڑ لیں جو ہمارے اباؤ اجداد کے معبود تھے اور صرف ایک خدا کو لے کر بیٹھ جائیں۔ تمہاری اس روش نے تو ہمیں عجیب الجھن میں مبتلا کر دیا ہے کیونکہ جب ہم تمہاری مسحور کن شخصیت کو دیکھتے ہیں اور تمہارے عمدہ طور اطوار کو دیکھتے ہیں تو تمہاری باتیں ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ لیکن جب ہم اپنے آباؤ اجداد کی روایت کو دیکھتے ہیں جن کی تعداد نہ جانے کتنی ہے تو ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کیا وہ سارے ہی گمراہ تھے۔ اس صورتحال نے ہمیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا۔ کبھی تو ہم یہ سوچتے ہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ بالکل غلط ہے اور ہمیں تمہاری دیانت میں بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب تمہاری سابقہ زندگی کو دیکھتے ہیں تو پھر اس شبے میں بھی دراڑیں پڑنے لگتی ہیں۔ چنانچہ اس صورتحال کی تعبیر کیلئے اس آیتِ کریمہ میں "شک" کے ساتھ "مریب" کی صفت لائی گئی ہے۔ اَرَابَہٗ کے لغت میں معنی ہیں اَزْعَجَهٗ وَاَقْلَقَهٗ اس نے اس کو اضطراب اور الجھن میں مبتلا کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ نبی کی دعوت بے اثر نہیں رہتی۔ بیشک اسے قبول نہ کیا جائے لیکن وہ دلوں میں اضطراب ضرور پیدا کر دیتی ہے۔ سنجیدہ فکر لوگ بالآخر ایمان لے آتے ہیں لیکن دنیا کے پرستار اور خواہش نفس کے اندھے اس اضطراب کو دبانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہی حال قوم ثمود کا بھی ہو رہا تھا۔ وہ آپ کی دعوت کی تاثیر کی گرفت کو محسوس کر رہے تھے۔ آپ کی غیر معمولی زندگی اور آپ کے سیرت و کردار کی بلندی ان کیلئے لمحۂ فکریہ بن کر رہ گئی تھی اور دوسری طرف آباؤ اجداد کی روایت اور دلوں میں بیٹھے ہوئے اعتقادات راستے کا ایسا پتھر بن گئے تھے جو ہلائے نہیں ہل رہے تھے۔ اس مرحلے سے گزرنا قوموں کیلئے آسان نہیں ہوتا۔ اس سے صرف وہ گزرتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان کا نور روشن ہو جاتا ہے۔ اقبال نے اسی مشکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّىْ وَاٰتٰىنِىْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِىْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۗ فَمَا تَزِيْدُوْنَنِىْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾ (سورۃ ھود : ۶۳)

(حضرت صالح علیہ السلام نے کہا اے میری قوم! بھلا یہ تو بتاؤ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے اپنی جانب سے رحمت خاص سے بھی مجھے نوازا ہے تو اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی پکڑ کے وقت کون میرا مددگار ہوگا۔ سو تم میری بربادی ہی میں اضافہ کرو گے۔)

حضرت صالح علیہ السلام کا جواب سوال کی صورت میں

گزشتہ آیتِ کریمہ میں حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں قوم نے توقعات پورا نہ ہونے پر جس طرح تاسف کا اظہار کیا اس کے بعد حضرت صالح اور آپ کی قوم کے درمیان ایک کشمکش شروع ہو گئی۔ قوم کی یقینی خواہش ہو گی کہ حضرت صالح جس راستے پر چل نکلے ہیں وہ ان کی اپنی شخصیت اور قوم دونوں کیلئے تباہ کن ہے۔ ہمیں یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ ہم اپنی قوم کے ایک ہونہار سپوت کو ضائع کر دیں۔ اس لئے انہوں نے شروع میں تو آپ کو سمجھانے کی کوشش کی ہو گی، بڑوں نے آپ پر اپنا اثر ڈالا ہو گا، بڑی بوڑھیوں نے طعنے دیئے ہوں گے لیکن جب دیکھا کہ وہ کسی کی بھی بات سن کے نہیں دیتے تو پھر یقیناً انہیں ڈرایا دھمکایا ہو گا، انہیں اونچ نیچ سمجھائی ہو گی اور ان کی روش کا انجام ان پر واضح کیا ہو گا۔ ان تمام باتوں پر حضرت صالح علیہ السلام نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان کے سامنے ایک سوال رکھا کہ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے بینہ پر ہوں یعنی اللہ نے مجھے جس نورِ فطرت اور دل کی جس روشنی کے ساتھ پیدا فرمایا ہے اور میں نے آج تک اپنے اس پیدائشی نور کو بجھنے نہیں دیا وہ برابر مجھے وہ باتیں دکھاتا اور سمجھاتا ہے جو تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ بس یوں سمجھو،

Marfat.com

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

پھر اس وقت مزید اللہ کی بے پایاں رحمت یہ ہے کہ اللہ نے میرے دل پر وحی اتاری ہے، فرشتہ مجھ پر اس کا کلام لے کر اترتا ہے، میں اس فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں، اس کے کلام کو اپنے کانوں سے سنتا ہوں۔ زندگی کے بیشتر حقائق اس طرح میرے سامنے کھولے جاتے ہیں جیسے وہ پیش پاافتادہ حقیقتیں ہیں۔ اس کے بعد تمہاری میرے ساتھ تکرار اور اپنی بات منوانے کیلئے میرے درپے آزار ہونا اور میرے انکار کی صورت میں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ اندھے اگر اکٹھے ہو کر آنکھوں والوں کو ڈرانے لگیں کہ تم چمکتے ہوئے سورج کو دیکھ کر بھی سورج کا انکار کرو، ورنہ ہم تمہارے ساتھ بدترین سلوک کریں گے تو کیا آنکھوں والوں کو اندھوں کی بات مان لینی چاہئے۔ ظاہر ہے کہ اس بات کو مانا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح میری حیثیت تم میں چشمِ بینا رکھنے والے کی ہے اور تم اس اہم خصوصیت سے محروم ہو۔ اس کے باوجود تم دباؤ کے ذریعے مجھ سے اپنی بات منوانا چاہتے ہو۔

روحانی، معنوی اور علمی زندگی میں بعض دفعہ ایسے مراحل آتے ہیں کہ ایک شخص یقین کے ساتھ ایک سچائی پر قائم ہے اور دوسرا گروہ جو اس سچائی کو سمجھنے سے قاصر ہے وہ اسے اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہے۔ ایسی کشمکش تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف نتائج پیدا کرچکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور سائنس دان گلیلیو نے بھی جب اپنی سائنسی تحقیق کی بنیاد پر زمین کے بارے میں یہ دعویٰ کیا کہ وہ حرکت کرتی ہے تو کلیسا نے اسے عدالت میں طلب کرلیا۔ اس نے جب اپنی بات پر اصرار کیا تو اسے کہا گیا یہ زہر کا پیالہ تمہارے سامنے پڑا ہے اپنی تحقیق واپس لے لو یا زہر کا پیالہ پی لو۔ اس نے پہلے تو اپنی تحقیق واپس لے لی، جب عدالت سے باہر آیا تو پھر عدالت کی طرف پلٹ گیا اور جا کر جج کے سامنے کہنے لگا کہ میں کیا کروں، میں تو اب بھی زمین کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے میں اس کا کیسے انکار کرسکتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے زہر کا پیالہ پی لیا اور اپنی تحقیق پر جان دے دی۔ سائنسدانوں کے پاس یقین کی وہ قوت نہیں ہوتی، نہ ان کے پاس فطرت کا نور ہوتا ہے اور نہ وحی الٰہی کی روشنی۔ اس کے باوجود وہ اگر اپنی تحقیق پر جان دے سکتے ہیں تو پیغمبر کا معاملہ تو اس سے بہت بالا واعلیٰ ہے۔ اس لئے یہ چبھتا ہوا سوال حضرت صالح نے اپنی قوم کے سامنے رکھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں جانتے بوجھتے اگر اس صداقت کا انکار کردوں جس کی طرف میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں تو یقیناً اس پر اللہ کی گرفت آئے گی۔ تو بتاؤ تم میں سے کون ہے جو مجھے اس کی گرفت سے بچا سکتا ہے۔ اس کی گرفت سے تو کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تم میری بربادی اور ہلاکت میں اضافے کا سبب بن سکتے ہو۔ تم نے اگر اپنی تباہی کا فیصلہ کرلیا ہے تو میں تمہیں زبردستی تو نہیں روک سکتا لیکن تمہاری وجہ سے میں اللہ کی نافرمانی کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر زندگی کیلئے تباہی اور کوئی نہیں۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ۝

(اور اے میری قوم! یہ اللہ کی اونٹنی ہے، تمہارے لئے نشانی ہے۔ پس اسے چھوڑ دو تا کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور کسی برائی کے ارادے سے اسے ہاتھ بھی نہ لگانا ورنہ تمہیں بہت جلد عذاب آ پکڑے گا۔) (سورۃ ہود : ٦٤)

قوم کا مطالبہ اور اس کا جواب

قوم نے جب حضرت صالح علیہ السلام کی استقامت اور استقلال کو دیکھا اور سمجھ گئے کہ یہ اپنی دعوت سے پیچھے ہٹنے والے نہیں البتہ یہ ممکن ہے کہ آہستہ آہستہ لوگ ان کی دعوت سے متاثر ہو کر ایمان لانا شروع کردیں۔ انہوں نے آپ کا امتحان لینے یا آپ کو زچ کرنے کیلئے ایک بہت بڑا مطالبہ کردیا کہ اگر آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے تو اس سامنے کی چٹان سے ایک اونٹنی نکال کر دکھاؤ۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ عید کا دن تھا اور مطالبہ کرنے والے یہ سمجھتے تھے کہ حضرت صالح علیہ السلام یہ مطالبہ پورا نہ کرسکیں گے اور اس طرح سے لوگوں کے جمِ غفیر کے سامنے ان کے جھوٹا ہونا ثابت ہوجائے گا۔ لیکن حضرت صالح علیہ السلام کو اپنے مؤقف پر یقین تھا اور اپنے اللہ پر بھروسہ تھا۔ انہوں نے اپنے رب کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ نہایت عاجزی سے دعا کی یا اللہ اس قوم پر دلیل اثرانداز نہیں ہورہی۔ وہ کوئی ایسی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں جو نہایت حیران کن ہو۔ تو ان کا مطالبہ پورا فرمادے، شاید یہ ایمان لے آئیں۔ چنانچہ اس جمِ غفیر کے سامنے چٹان پھٹی اور اس میں سے ایک حاملہ اونٹنی برآمد ہوئی۔ اس اونٹنی کی طرف

Marfat.com

اشارہ کر کے پروردگار نے حضرت صالح علیہ السلام کی معرفت حکم دیا کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے۔ کیونکہ معجزانہ طور پر محض اس کی قدرت سے ایک چٹان سے برآمد ہوئی اور تمہارے لئے نشانی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس نشانی کو دیکھ کر اپنا وعدہ پورا کرو اور ایمان لاؤ۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے اس لئے تم پر اس کا احترام ضروری ہے۔ اسے اللہ کی زمین میں چھوڑ دو۔ جہاں چاہے کھاتی پھرے۔ اس سے تعرض نہ کرنا اور روکنے کی کوشش نہ کرنا۔ اور بعض روایات کے مطابق اس کی پانی کی باری مقرر کر دی گئی۔ بستی کے کنویں سے ایک دن وہ پانی پیتی تھی اور ایک دن بستی کے جانور پانی پیتے تھے۔ وہ چونکہ پورے کنویں کا پانی پی جاتی تھی اور چارہ بھی اسی مقدار سے کھاتی ہوگی اس لئے اس بات کا اندیشہ تھا کہ اس قوم کے بگڑے ہوئے لوگ تنگ آ کر کہیں اسے مار نہ ڈالیں۔ اس لئے حکم دیا کہ کسی برائی کے ارادے سے اسے چھونے کی بھی کوشش نہ کرنا ورنہ تمہیں فوری اللہ کا عذاب آ پکڑے گا۔

فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِیْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَیْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ (سورۃ ھود : ۶۵)

(پس انہوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں تو حضرت صالح علیہ السلام نے کہا لطف اٹھاؤ اپنے گھروں میں تین دن تک۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔)

سرکشی کی انتہاء

گزشتہ آیتِ کریمہ میں قومِ ثمود سے کہا گیا تھا کہ اللہ کی اس اونٹنی کو نقصان نہ پہنچانا ورنہ تمہیں عذاب آ پکڑے گا لیکن حیرانی کی بات ہے کہ جس قوم نے اپنی آنکھوں سے اتنے بڑے معجزے کو بروئے کار آتے دیکھا بغیر کسی ظاہری سبب کے چٹان پھٹی اور اونٹنی برآمد ہوئی اور پھر اس کا حاملہ ہونا اور خورد ونوش کا غیر معمولی ہونا ایک ایک چیز بتانے کیلئے کافی تھی کہ یہ اونٹنی اللہ کی اونٹنی ہے۔ یہ اس کی طرف سے نشانی ہے۔ تمہیں صرف یہ سمجھانا ہے کہ اللہ کے رسول پر ایمان لاؤ جس کے دعا کرنے پر اللہ نے اتنا بڑا معجزہ دکھایا۔ لیکن بجائے اس کے کہ وہ قوم ایمان لاتی اور اپنے وعدہ کو پورا کرتی انہیں میں چند اوباش اٹھے (جیسے کہ سورۃ الاعراف میں وضاحت ہو چکی ہے۔) اور انہوں نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔ اونٹنی کا قتل درحقیقت اللہ کی الوہیت کیلئے ایک چیلنج تھا اور دوسرے لفظوں میں یہ کہنا تھا کہ ہم کائنات کے کسی خدا کو نہیں مانتے۔ تم جس خدا سے ڈراتے ہو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چنانچہ اس پر اللہ کا غذاب بھڑکا اور صالح علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ اپنی قوم سے کہہ دیجئے کہ اب تمہارے لئے صرف تین دن کی مہلت ہے۔ اس کے بعد اللہ کے حکم سے تم تباہ کر دیئے جاؤ گے۔ یہاں رک کر ذرا غور فرمایئے کہ اس قوم پر عذاب کیوں آ رہا ہے؟ صرف اس لئے کہ انہوں نے اللہ کی نافرمانی میں انتہا کر دی اور وہ کسی طرح بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کیلئے تیار نہیں۔ اس پر کائناتی قوتیں حرکت میں نہیں آئیں بلکہ اللہ کا حکم آیا کہ انہیں تین دن کی مہلت دی جا رہی ہے اور اس کے بعد ان پر خدا کا عذاب آ جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر انسانوں پر مصیبتیں اور زمین اور فضاء میں تبدیلیاں محض چند طبعی امور کے جمع ہو جانے کی وجہ سے وقوع پذیر ہوتی ہیں تو پھر یہ تین دنوں کی قید کیوں لگائی گئی اور کیا ان تین دنوں میں طبعی عوامل نے باہم مل کر کوئی فیصلہ کیا تھا کہ ہم اس کے بعد ان پر حملہ آور ہوں گے۔ یہاں تو صاف صاف کہا گیا ہے کہ اللہ نے انہیں تین دن کی مہلت دی اور عذاب ان پر ان کی سرکشی کے سبب سے آیا اور جب بھی کوئی عذاب آتا ہے تو طبعی تبدیلیوں سے نہیں آتا۔ البتہ طبعی تبدیلیاں اللہ تعالیٰ کے حکم سے آتی ہیں اور اس کائنات کا ہر پتا اسی کے حکم سے حرکت میں آتا ہے۔ ان واقعات پر جتنا بھی غور کیا جائے یہ دو باتیں پہلو بہ پہلو کھل کر سامنے آتی ہیں کہ اللہ جب بھی کسی کو پکڑتا ہے سرکشی اور نافرمانی کی پاداش میں پکڑتا ہے اور جب بھی دنیا میں کوئی مصیبت آتی ہے وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی تبدیلی اپنے طور پر وقوع پذیر نہیں ہو سکتی۔ زلزلہ آتا ہے تو یقیناً زمین کے نیچے کائناتی قوتیں اپنا عمل دکھاتی ہیں لیکن گمراہی کی بات یہ ہے کہ ان قوتوں کے بجائے اللہ کا محکوم سمجھنے کے خود مختار سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمارے دانشوروں کے خیال میں پہاڑوں میں آتش فشانی پہاڑوں کی مرضی سے ہوتی ہے۔ زمین میں زلزلہ کائناتی قوتوں کی مرضی سے آتا ہے۔ مون سون خود بخود بنتا ہے اور بارشیں اپنے آپ برستی ہیں لیکن قرآن کی فکر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کام بھی اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں ہوتا۔ بعض چیزوں کیلئے اس نے طبعی قوانین بنا رکھے ہیں لیکن ان میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ لیکن انسانی سزاؤں کیلئے طبعی قوانین نہیں اخلاقی قوانین کارفرما ہیں اور ان کا تعلق اللہ کے دین اور اللہ کی رضا سے ہے۔ ان کے درمیان ایک رشتہ ہے جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

Marfat.com

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۟ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

(سورة هود : ٦٦.٦٧.٦٨)

(پس جب ہمارا حکم صادر ہوا تو ہم نے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنے خاص فضل سے اس عذاب اور اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی، بیشک تمہارا رب ہی قوی اور غالب ہے۔ اور ان لوگوں کو جنھوں نے ظلم کیا خدا کی ڈانٹ نے آ پکڑا اور وہ اپنے گھروں میں زمین میں چپٹے پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی ان میں بسے ہی نہیں۔ سن لو! ثمود نے اپنے رب کی ناشکری کی۔ سن لو! کہ ہلاکی ہے ثمود کیلئے۔)

حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان لانیوالوں کو عذاب سے نجات

تین دن کی مقررہ مدت گزرنے کے بعد اللہ کے عذاب نے انہیں آ پکڑا۔ لیکن اس عذاب سے پہلے اللہ نے حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو اس عذاب سے بچانے کا سامان کیا۔ یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان کو کیسے بچایا گیا۔ کیونکہ عذاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہوئے کسی بھی آدمی کا بچنا ناممکن تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں صرف عذاب ہی سے نہیں بچایا گیا بلکہ اس دن کی رسوائی سے بھی محفوظ رکھا گیا۔ رسوائی کی نوعیت کیا تھی، اس سے کس طرح بچایا گیا، یہ تو اسرار الٰہی ہیں جنہیں کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ قوم ثمود نے جس طرح سرکشی اور تمرد کا اظہار کیا اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو چیلنج کیا اس کی سزا کے طور پر انہیں صرف مارا ہی نہیں گیا ہوگا بلکہ ان کے دماغ کے خناس کا علاج کرنے کیلئے رسوا بھی کیا گیا ہوگا۔ عذاب سے پہلے تین دن کی مہلت کوئی تعجب نہیں کہ صرف ان کی رسوائی کیلئے رکھی گئی ہو۔ انہیں دھیرے دھیرے عذاب کی آہٹ بھی پہنچ گئی ہو اور پھر وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر اس طرح روتے ہوں گے جیسے پھانسی کے سزایافتہ اور ایک ہی جرم میں شریک آپس میں بیٹھ کر روتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایک دوسرے کو الزام بھی دیتے ہیں کہ تم نے ہمیں اس برے راستے پر ڈالا ورنہ ہمارا یہ انجام نہ ہوتا۔

اس آیت کے پہلے جملے میں آپ نے غور کیا کہ سب سے پہلی بات یہ فرمائی گئی ہے کہ عذاب اس وقت آیا جب ہمارا حکم آ گیا۔ یعنی حکم اور عذاب میں کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ اس فاصلہ نہ ہونے کے باوجود حکم کے بغیر عذاب نہیں آتا اور حکم آنے کے بعد عذاب میں تاخیر نہیں ہوتی۔

حضرت صالح علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو کہاں پناہ دی گئی، یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن آج تک کوہ طور کا وہ حصہ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اعتکاف کیا کرتے تھے اور وہیں آپ کو تورات دی گئی۔ اس کے قریب ایک پہاڑ ہے جسے نبی صالح کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مقامی لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت صالح علیہ السلام نے آ کر پناہ لی تھی۔

عذاب کی نوعیت

قوم ثمود پر اللہ کا عذاب الصَّيْحَةُ کی شکل میں آیا۔ الصیحہ دھاڑ، چنگھاڑ اور خوفناک دھماکے کو کہتے ہیں۔ لیکن سورۃ الاعراف میں یہ کہا گیا ہے کہ اس قوم پر عذاب الرجفۃ کی شکل میں آیا تھا۔ اس کا معنی ہے زلزلہ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں تضاد ہے۔ لیکن حقیقت میں کوئی تضاد نہیں۔ بعض اہل علم کی رائے تو یہ ہے کہ بادتند اور طوفان باراں کے ساتھ ساتھ زلزلہ بھی آیا جس میں خوفناک آوازیں تھیں۔ اور اگر بعض روایات کے مطابق یہ کہا جائے کہ یہ فرشتے کی آواز تھی جو اس قدر مہیب اور خوفناک تھی کہ جس سے تمام قوم ثمود کے جگر پھٹ گئے اور وہ اوندھے منہ اپنے گھروں میں گر گئے۔ اسی آواز کے ارتعاش سے یقیناً زمین پھٹی اور زلزلہ آیا ہوگا جس سے ان کی ساری بستیاں تباہ ہوگئی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فرمایا گیا کہ ان کی بستیاں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بستیوں کے مکین یہاں کبھی رہے ہی نہ تھے۔ ان پر یہ تباہی صرف اس لئے آئی کہ انہوں نے اپنے رب سے کفر کیا جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ اللہ کی رحمت سے دور کر دیئے گئے اور آج تک اللہ سے ڈرنے والوں کیلئے عبرت کا سامان بنے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ
بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۖ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ
حَنِيْذٍ ﴿٦٩﴾ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ
مِنْهُمْ خِيْفَةً ۚ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴿٧٠﴾ وَامْرَاَتُهٗ
قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴿٧١﴾
قَالَتْ يٰوَيْلَتٰىٓ ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۖ اِنَّ هٰذَا
لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿٧٢﴾ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ
بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ۚ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿٧٣﴾ فَلَمَّا ذَهَبَ
عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ
لُوْطٍ ﴿٧٤﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿٧٥﴾ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ
عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ
غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿٧٦﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ
بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿٧٧﴾ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ
اِلَيْهِ ۖ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۖ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ
بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ۖ
اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿٧٨﴾ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ

Marfat.com

بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝٧٩ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ
قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝٨٠ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ
لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ
اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ۭ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ۭ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ
الصُّبْحُ ۭ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝٨١ فَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا
سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ڏ مَّنْضُوْدٍ ۝٨٢ مُّسَوَّمَةً
عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝٨٣

(بلاشبہ ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کے آئے۔ انہوں نے کہا (اے ابراہیم) آپ پر سلام ہو، (آپ نے فرمایا) آپ پر بھی سلام ہو۔ دیر نہیں گزری کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھنا ہوا بچھڑا لے کر آ گئے۔ اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھ نہیں رہے تو انہیں اجنبی خیال کیا اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے۔ (مہمانوں) نے کہا آپ خوف نہ کھائیں ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور ان کی اہلیہ (سارہ) کھڑی تھیں، وہ ہنس پڑیں۔ پھر ہم نے سارہ کو خوشخبری دی، اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی۔ سارہ نے کہا ہائے حیرانی، کیا میں بچہ جنوں گی، حالانکہ میں خود ایک بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بوڑھے ہیں۔ یقیناً یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر، اے ابراہیم کے گھر والو! بیشک وہ سزاوار حمد ہے اور بڑی شان والا ہے۔ پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خوف دور ہو گیا اور انھیں بشارت مل گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ بیشک ابراہیم بڑے بردبار، دردمند اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرنے والے تھے۔ اے ابراہیم! اس بات کو رہنے دیجئے، اب تمہارے رب کا حکم آ چکا اور ان پر ایک ایسا عذاب آ کر رہے گا جو ٹالے نہ ٹالا جا سکے۔ جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے لوط (علیہ السلام) کے پاس، وہ ان کے آنے سے غمگین ہوئے اور ان کی وجہ سے ان کا دل تنگ پڑا اور کہنے لگے کہ یہ تو بہت ہی کٹھن دن ہے۔ اور اس کی قوم کے لوگ جھپٹتے ہوئے اس کے پاس پہنچے اور یہ پہلے سے ہی بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ (حضرت) لوط (علیہ السلام) نے کہا: اے میری قوم یہ میری بیٹیاں ہیں، وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ پس اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے معاملہ میں رسواہ نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی سمجھدار آدمی نہیں۔ وہ کہنے لگے تم خوب

Marfat.com

جانتے ہو، ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں اور تم خوب جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔ حضرت لوط نے کہا، کاش میرے پاس تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں کسی طاقتور سہارے کی پناہ لے سکتا۔ فرشتوں نے کہا، اے لوط! ہم تمہارے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ ہرگز آپ تک پہنچ نہیں سکتے۔ پس آپ اپنے اہل وعیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جایئے اور تم میں سے کوئی مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جایئے۔ اس پر بھی وہی آفت آنی ہے جو ان پر مقدر ہو چکی ہے۔ اُن پر عذاب آنے کا مقررہ وقت صبح کا وقت ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟ پس جب آ پہنچا ہمارا عذاب تو ہم نے اس کی بلندی کو اس کی پستی کر دیا اور اس پر سنگِ گل کی بارش کی، تہ بہ تہ جن پر تمہارے رب کے پاس سے نشان لگے ہوئے تھے اور لوط کی بستی ظالموں سے کچھ دور نہیں۔)

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾

(بلاشبہ ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کے آئے۔ انہوں نے کہا (اے ابراہیم) آپ پر سلام ہو، (آپ نے فرمایا) آپ پر بھی سلام ہو۔ دیر نہیں گزری کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھنا ہوا بچھڑا لے کر آگئے۔) (سورة هود : ٦٩)

گزشتہ واقعات کے تسلسل میں اور دعوت وتبلیغ کی حکمت کے ضمن میں یہاں قومِ لوط کے احوال اور ان کا انجام بیان کرنا مقصود ہے، لیکن حضرت لوط کی سرگزشت کی تمہید کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت بیان کی جارہی ہے کیونکہ حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ آپ نہ صرف آپ کے چچازاد بھائی تھے بلکہ وہی ایک جانثار تھے جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لانے کی جرأت کی اور ہجرت کے سفر میں آپ کا ساتھ دیا۔ برسوں آپ کے زیر تربیت رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت اور رسالت سے نوازا۔ اور اس علاقہ میں آپ کی بعثت ہوئی جو دریائے اردن کی ترائی میں واقع ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے قریبی تعلق قائم رکھنے کیلئے کنعان میں رہائش رکھنے کا فیصلہ کیا۔ دریائے اردن کی ترائی کا علاقہ اپنی زرخیزی اور شادابی میں اپنی مثال آپ تھا۔ یہاں سدوم، عموراہ، ادما اور زبولیم کی بستیاں آباد تھیں۔ اس علاقہ کے بسنے والوں کو خوشحالی اور خوش عیشی نے ایسی بداخلاقیوں میں مبتلا کر دیا تھا جس کی نظیر اس وقت بھی روئے زمین پر موجود نہ تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی تبلیغ ودعوت جب اپنا اثر دکھانے سے عاجز رہی اور ان کی قوم نے نہ صرف ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا بلکہ وہ شرافتِ انسانی کی تمام قدروں کو پامال کرنے پر تل گئے اور حضرت لوطؑ کے جانی دشمن ہو گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا قانون حرکت میں آیا اور ان بستیوں کو تباہ کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے تین فرشتوں کو بھیجا اور ساتھ ہی ان کو یہ حکم دیا کہ وہ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر انہیں بیٹے اور پوتے کی خوشخبری سنائیں۔ چنانچہ وہ اسی حکم کی تعمیل میں پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ یہاں رُسُل سے مراد وہی فرشتے ہیں جن کی تعداد تین تھی۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے تو خوشخبری لے کر لیکن اس کے سنانے کی نوبت ذرا دیر سے آئی۔ اس سے پہلے جو واقعات پیش آئے ہماری نفع رسانی کیلئے انہیں ذکر فرمایا جارہا ہے۔

قومِ لوط کی سرگزشت کیلئے تمهید

فرشتے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچے تو وہ انسانی شکل میں تھے۔ اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں پہچاننے سے قاصر رہے۔ انہوں نے شائستہ اطوار لوگوں کی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کہا اور آپ نے بھی جواب میں سلام کہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت محمدی کی طرح ملت ابراہیمی میں بھی سلام کہنے کا یہی انداز تھا جو ہمیں سکھایا گیا ہے بلکہ قرآنِ کریم سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اہل جنت کا بھی یہی انداز ہوگا کہ آنے والا پہلے سے موجود فرد یا افراد کو سلام کہے گا اور سلام کا طریقہ یہی ہوگا کہ آپ پر سلام ہو اور سننے والا پلٹ کر اسی طرح سلام کا جواب دے گا اور آج مسلمان اسی طریقے پر عمل کرنے کے پابند ہیں کہ آنے والا موجود لوگوں کو سلام کہے۔ چلنے والا بیٹھنے والوں کو۔ سوار پیدل چلنے والوں کو اور بڑی حیثیت کا مالک غریب کو سلام کہنے میں پہل کرے۔ البتہ جہاں احترام کا رشتہ ہو وہاں چھوٹے کو چاہئے کہ بڑے کو سلام کرے۔ مثلاً بیٹا باپ کو، شاگرد استاد کو اور مرید اپنے شیخ کو، اور نوجوان اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں کو سلام کہنے میں پہل کرے۔

Marfat.com

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی میزبانی

دوسری بات اس آیتِ کریمہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے تین مہمانوں کو بٹھا کر جنھیں وہ جانتے تک نہ تھے مہمانی کے انتظام میں لگ گئے اور کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آپ نے ایک صحت مند بھنا ہوا بچھڑا ان کے سامنے لا کر پیش کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نظامِ اخلاق میں مہمانوں کا اکرام اور ان کی ضیافت بہت اہمیت رکھتی تھی اور اس امت کو بھی آنحضرت ﷺ نے حکم دیا ہے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ ان کی ضروریات کا خیال کرے اور ان کے آرام و آسائش کا اہتمام کرے۔ چنانچہ علماء کرام نے تصریح کی ہے کہ ایسے دیہات جہاں باہر سے آنے والے مسافروں کیلئے قیام و طعام کا کوئی انتظام نہ ہو تو وہاں لوگوں پر لازم ہے کہ وہ مہمان کے قیام و طعام کا انتظام کریں۔ البتہ جہاں ہوٹل اور سرائے موجود ہوں اور مہمان ان میں ٹھہرنے کی استطاعت بھی رکھتا ہو تو وہاں آنے والوں کی مہمانی کرنا ضروری تو نہیں البتہ مکارمِ اخلاق میں ضرور شامل ہے۔

ایک شبہے کا ازالہ

آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مُسلّم بھنا ہوا بچھڑا مہمانوں کے کھانے کیلئے پیش کیا جبکہ نظر بظاہر یہ تین آدمیوں کیلئے بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے مہمانی کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ آپ جوشِ میزبانی میں اسراف کی حد کو چھونے لگیں لیکن یہ خیال قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ گھر میں جب مہمان آتا ہے تو خوشحال گھرانوں میں جو کچھ مہمان کیلئے پکتا ہے اس میں سارے اہلِ خانہ شریک ہوتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں اولاد تو نہ تھی لیکن قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے ساتھ رہنے والوں کی ایک معقول تعداد تھی۔ ان سب کی ضرورت کیلئے ایک بچھڑا یقیناً زیادہ نہ تھا اور دوسری یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ عربی زبان کا یہ معروف اسلوب ہے کہ بعض دفعہ کُل بول کر جز مراد لیتے ہیں۔ یہاں بھی یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ بچھڑا کا لفظ بول کر بچھڑے کا گوشت مراد ہو۔ اس صورت میں اچنبھے کی کوئی بات باقی نہیں رہتی۔ البتہ قرآنِ کریم نے اسے جس طرح بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمانوں کیلئے کس قدر فیاض واقع ہوئے تھے جبکہ مہمان بھی ایسے تھے جن سے کوئی جان پہچان نہ تھی۔ یہی رویہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نبی کریم ﷺ کا تھا کہ آپ چاہے خود فاقے سے ہوتے لیکن مہمان کیلئے مقدور سے بڑھ کر آپ مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں میں مہمانی کیلئے کچھ نہ ملا تو آپ کی پریشانی کو دیکھ کر کوئی ایک صحابی اٹھے اور آپ کے مہمانوں کو اپنے ساتھ گھر لے گئے اور وہاں اس طرح حقِ مہمانی ادا کیا کہ بچوں کو بھوکا سلا دیا، خود میاں بیوی بھوکے رہے لیکن مہمانوں کو سیر کر کے کھلایا۔

فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَھُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَھُمْ وَاَوْجَسَ مِنْھُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝

(اور جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھ نہیں رہے تو انہیں اجنبی خیال کیا اور دل ہی دل میں ان سے اندیشہ کرنے لگے۔ (مہمانوں) نے کہا آپ خوف نہ کھائیں ہم قومِ لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔) (سورۃ ہود: ۷۰)

حضرت ابراہیمؑ کی تشویش اور اس کا سبب

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ میں نے اپنے نامعلوم اور اجنبی مہمانوں کیلئے جس محبت اور اخلاص سے ضیافت پیش کی ہے وہ اس کی طرف ہاتھ ہی نہیں بڑھا رہے یعنی اسے کھانا نہیں چاہتے تو ان کے دل میں کھٹکا سا پیدا ہوا اور وہ اپنے جی ہی جی میں ان سے ڈرنے لگے کہ اللہ نہ کرے یہ شریفوں کے لباس میں کہیں کوئی ایسے ویسے لوگ نہ ہوں اور مہمانوں کے بھیس میں کہیں میرے دشمن نہ ہوں کیونکہ اگر یہ میرے اپنے ہوتے یا مجھ سے محبت کرنے والے ہوتے تو شوق سے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے۔ کھانا بھی کھاتے اور شکریہ بھی ادا کرتے کیونکہ اس زمانے کی یہ ریت تھی کہ جب کوئی شخص برے ارادے سے اپنے دشمن کے گھر جاتا تھا تو اس کے گھر کا کھانا نہیں کھاتا تھا کیونکہ اسے نہایت ذلت کی بات سمجھا جاتا تھا کہ کسی کے گھر کا کھانا بھی کھایا جائے اور پھر اس سے دشمنی بھی کی جائے لیکن بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ اور وہ خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگلی آیتِ کریمہ سے

Marfat.com

اس کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندیشوں کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ مہمانوں کو اپنا دشمن سمجھے تھے بلکہ ان کے اندیشوں کی وجہ یہ تھی کہ وہ جنہیں انسان سمجھ رہے ہیں کہیں وہ فرشتے نہ ہوں کیونکہ فرشتے کھاتے پیتے نہیں اور محض فرشتہ ہونا بھی کوئی ڈرنے کی وجہ نہ تھی بلکہ خدشے کا سبب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ سوچ تھی کہ اس طرح سے فرشتوں کا انسانی لباس میں آنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ فرشتے کسی غیر معمولی فرض کی انجام دہی کیلئے آئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سے کوئی قصور سرزد ہو گیا ہو یا ہمارے گرد و پیش رہنے والوں میں کوئی ایسی نافرمانی کے آثار ہوں جس پر سزا دینا ضروری ہو اور فرشتے سزا دہی کیلئے آئے ہوں۔ یہ سوچ کر نہایت پریشان ہو گئے کیونکہ آپ غایت درجہ اللہ سے ڈرنے والے اور نہایت نرم دل واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ فرشتوں نے آپ کے خدشوں کو محسوس کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ ہم آپ کے دشمن نہیں، آپ ہم سے خوف مت کھائیں اور نہ یہ کہا ہم تو فرشتے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ فرشتے کھایا نہیں کرتے بلکہ اس کی بجائے یہ کہا ہم فرشتے ضرور ہیں اور فرشتوں کا اس طرح سے آنا یقیناً فکرمندی کا سبب ہے لیکن آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے، ہمیں آپ کی طرف نہیں بھیجا گیا، ہمیں تو قومِ لوط کی طرف بھیجا گیا ہے۔

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۞ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَ اَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۞ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۞ (سورۃ ھود: ۷۱، ۷۲، ۷۳)

(اور ان کی اہلیہ (سارہ) کھڑی تھیں، وہ ہنس پڑیں۔ پھر ہم نے سارہ کو خوشخبری دی، اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی۔ سارہ نے کہا ہائے حیرانی، کیا میں بچہ جنوں گی، حالانکہ میں خود ایک بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بوڑھے ہیں۔ یقیناً یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ فرشتے کہنے لگے کیا آپ اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہوں تم پر، اے ابراہیم کے گھر والو! بیشک وہ سزاوار حمد ہے اور بڑی شان والا ہے۔)

حضرت سارہ کی مسرت اور حیرت

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب مہمانوں کے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے کی وجہ سے پریشان ہوئے اور آپ کو یہ گمان ہوا کہ یہ میرے مہمان انسان نہیں فرشتے ہیں اور یہ یقیناً کسی خاص مہم پر آئے ہیں اور اللہ نہ کرے کہیں ہم ہی اس کے نشانہ ہوں تو وہ یقیناً اس پریشانی میں اپنے اہل خانہ میں بھی اٹھ کر گئے ہوں گے اور انہیں بھی اپنی پریشانی سے آگاہ کیا ہوگا۔ اہل خانہ میں حضرت سارہ کے سوا اور تو کوئی نہ تھا۔ چنانچہ وہ بھی اس پریشانی میں اس خیمے یا کمرے کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئیں جہاں مہمانوں کو بٹھایا گیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی مہمانوں نے یہ بتایا کہ ہم فرشتے ہیں لیکن ہم آپ کی طرف نہیں بھیجے گئے بلکہ ہمیں قوم لوط کی طرف بھیجا گیا۔ یہ بات سن کر یقیناً انہیں بے حد خوشی ہوئی۔ اس پر بے ساختہ ان کے چہرے پر ہنسی پھیل گئی۔ چنانچہ ان کی خوشی میں مزید اضافہ کرنے کیلئے پروردگار کی رحمت جوش میں آئی اور وہ براہ راست حضرت سارہ کی طرف متوجہ ہوئی اور متوجہ ہونے کا سبب یہ تھا کہ کئی سال پہلے اللہ نے حضرت ہاجرہ کو حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسا عظیم فرزند عطا فرمایا تھا جنہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کے جوار میں آباد کیا تھا اور وہاں وہ اپنی والدہ کی تربیت میں جوانی کی حدود سے گزر رہے تھے لیکن حضرت سارہ دعاؤں اور آرزوؤں میں اولاد کی عمر گزار چکی تھیں۔ آج تک ان کی گود میں وہ پھول نہ کھلا تھا جس کی انہیں آرزو تھی اور اب وہ نوے سال کی ہو رہی تھیں اور ان کے شوہر نامدار سو سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہوئی تاکہ ان کی گزشتہ کلفتوں کا ازالہ ہو سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت اسحاق علیہ السلام جیسے عظیم فرزند کی بشارت دی اور اس خوشی کو مزید اس خوشخبری سے دوبالا کر دیا گیا کہ حضرت اسحاق اللہ تعالیٰ کے فضل سے لمبی عمر پائیں گے اور انہیں حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے فرزند سے نوازا جائے گا جن کے صلب سے بنی اسرائیل جیسی عظیم قوم اٹھائی جائے گی جو صدیوں تک ہدایت کی مشعل کو فروزاں رکھے گی۔ خوشخبریوں کی اس آبشار نے حضرت سارہ کو نہال کر دیا اور وہ بے خودی اور تعجب میں پکار اٹھیں، ہائے میری حیرانی کہ میں اس عمر میں بچہ جنوں گی کہ میں خود نوے سال کی بڑھیا ہوں اور میرے میاں سو سال کے بوڑھے ہیں۔ حضرت سارہ کے لہجے میں تعجب، مسرت، حیرانی اور خوشی کا ملا جلا اظہار تھا۔ اس پر ان کا یٰوَیْلَتٰٓی کہنا اپنے لغوی معنی میں نہیں بلکہ اس معنی میں ہے جس میں خواتین اسے استعمال کرتی ہیں۔ ہر

Marfat.com

پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ ایک ہی لفظ مردوں کے استعمال میں اور معنی دیتا ہے اور عورتوں کے استعمال میں اور۔ یہی حال اس لفظ کا بھی ہے۔ وَیْلَتٰی اصل میں وَیْلَتِی تھا۔ تخفیف کیلئے ی کو الف سے بدل دیا۔ وَیْل کا لغوی معنی ہلاکت ہے۔ یہاں اس سے مراد اپنے لئے بددعا کرنا نہیں محض اظہار حیرت وتعجب مقصود ہے اور عورتیں عام طور پر اظہار تعجب کیلئے ایسے الفاظ ہی استعمال کرتی ہیں۔ (قرطبی)

اظہار تعجب میں انکار مقصود نہیں ہوتا بلکہ ایک دبی دبی خوشی اپنی آرزوؤں کے برآنے میں جو موانع دیکھتی ہے ان کے ذکر سے اپنی خوشیوں کو یقینی بنانا چاہتی ہے۔ تعجب اس بات پر نہیں ہوتا کہ دینے والا کیسے دے گا بلکہ اس پر ہوتا ہے کہ دینے والا یقیناً ہر حال میں دینے کی طاقت رکھتا ہے لیکن لینے والے کے ہاتھوں میں نہ سکت ہو نہ کشکول، تو اس کی اپنی بے بضاعتی تھوڑا سا متردد ضرور کر دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ شاید انسان کی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ذکریا علیہ السلام کو بیٹے کی خوشخبری دی گئی تو انہوں نے بھی ایسے ہی تعجب کا اظہار کیا اور جب حضرت مریم کو بیٹے کی امانت سپرد کرنے کی بات ہوئی تو ان کی طرف سے بھی ایسے ہی تعجب کا اظہار ہوا، حالانکہ تمام مثالوں میں نہ انکار پایا جاتا ہے نہ استبعاد۔ یہی کیفیت یہاں بھی ہے۔ فرشتوں نے حضرت سارہ کی بات سن کر ان کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھا اور ٹھیک تعبیر اختیار کی۔ کہا کہ کیا آپ اللہ کے حکم پر تعجب کا اظہار کرتی ہیں جبکہ آپ جانتی ہیں۔ اے اہل بیت نبی! کہ خدا کے کسی کام اور اس کے کسی ارادے میں تعجب کی گنجائش نہیں ہوتی اور پھر آپ کی شان ہی الگ ہے۔ آپ پر تو اللہ کی خاص رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ آپ کا گھرانہ تو ہمیشہ سے اس کی برکتوں کا مورد رہا ہے اور پھر اس میں علیکم میں جمع مذکر کی ضمیر لاکر یہ اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے آپ کے بیت اور اہل بیت کو اپنی رحمتوں کیلئے منتخب کر لیا ہے۔ آپ تو اس پر جس قدر اللہ کی تعریف کریں وہ اس کا سزاوار ہے۔

اہل بیت کون ہیں؟

اس آیت میں غور فرمایئے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ کو اہل بیت کہا گیا ہے اور دنیا بھر کے معاشرتی دستور میں اہل خانہ میں سب سے پہلے بیویاں داخل ہوتی ہیں لیکن اس پر کس طرح دکھ کا اظہار کیا جائے کہ ہمارے کچھ دوستوں نے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کو اہل بیت سے خارج کر دیا ہے حالانکہ عقل اور نقل اس بات پر شاہد ہے کہ سورۃ الاحزاب میں اہل بیت کو جو بشارت دی گئی ہے اس میں اولاً اور اصلاً آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات داخل ہیں اور ثانیاً دوسرے حضرات قدسی رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ﴿۷۵﴾

(پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خوف دور ہو گیا اور انھیں بشارت مل گئی تو وہ ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ بیشک ابراہیم بڑے بردبار، دردمند اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرنے والے تھے۔) (سورۃ هود: ۷۴، ۷۵)

حضرت ابراہیمؑ کے اللہ سے جدال کا مفہوم

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے آنے والے معزز مہمانوں کی اجنبیت کے باعث پریشانی کا سامنا کرنا پڑا اور جب تک مہمانوں نے حقیقتِ حال واضح نہیں کی، آپ اور آپ کے اہل خانہ برابر اس پریشانی میں گھلتے رہے۔ حقیقتِ حال کی وضاحت کے ساتھ ہی مہمانوں نے آپ کو بیٹے اور پوتے کا مژدہ سنا کر خورسند کر دیا۔ تب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی پریشانی سے نکلنے میں کامیاب ہوئے اور اس قابل ہوئے کہ فرشتے جس اصل مقصد کیلئے قوم لوط کی طرف جا رہے تھے اس پر توجہ دے سکیں۔ چنانچہ جیسے ہی آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مہمان دراصل فرشتے ہیں جو قوم لوط پر عذاب لے کر جا رہے ہیں تو آپ چونکہ طبعی طور پر نہایت حلیم اور بردبار تھے جو کسی دشمن سے بھی انتقام لینا پسند نہیں کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ نہایت دردمند دل رکھتے تھے کیونکہ اَوَّاہٌ آہ سے مبالغہ ہے جس کا لغوی معنی ہے کثرت سے آہ آہ کرنے والا۔ یہ وصف اسی میں ہو سکتا ہے جسے اللہ نے دلِ دردمند عطا کیا ہو۔ آپ اپنی طبیعت کی بردباری اور دل کی دردمندی کے باعث اس بات کو برداشت نہ کر سکے کہ قوم لوط پر اللہ کا عذاب نازل ہو۔ ایک ایسی قوم جس میں بچے بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ وہ اپنے کفر اور نافرمانی کے باعث ہلاک کر دیئے جائیں۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے گداز دل رکھنے والے کیلئے ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ آپ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دنیا آپ کی نگاہوں میں اندھیر ہو گئی۔ آپ سوچنے

Marfat.com

لگے کہ قومِ عاد کو اللہ کے غضب سے کس طرح بچایا جاسکتا ہے۔ آپ کی فطرت میں چونکہ اللہ نے انابت کا ملکہ رکھا تھا اسی لئے اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو انیب قرار دیا ہے کہ آپ کثرت سے اللہ کی طرف لوٹنے والے تھے۔ ہر بات میں اور ہر تکلیف کے وقت آپ کا رجوع اللہ کی ذات کی طرف ہوتا تھا۔ چنانچہ آپ اس مشکل وقت میں بھی اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور بار بار اللہ کی رحمت کو پکارا، اور بار بار التجا کی کہ یا اللہ، یہ لوگ برے سہی، ان میں کچھ اچھے لوگ بھی تو ہوں گے، ان کی برکت سے انھیں معاف فرمادے۔ انھیں مزید مہلت عطا فرما اور یہ بات اس اصرار اور تکرار کے ساتھ کہی کہ اسے قرآنِ کریم نے جدال اور جھگڑے سے تعبیر کیا، حالانکہ اللہ سے جھگڑنے کی جرأت کون کرسکتا ہے اور پھر اللہ کا خلیل جو اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنے والا اور جان دینے والا ہے اس سے اس کی امید کیسے ہوسکتی ہے۔ درحقیقت یہ ایک مقام ہے جو بعض دفعہ اہلِ محبت کے یہاں کسی کو نصیب ہوجاتا ہے۔ جیسے ماں باپ بچے کی ضد کو برداشت کرتے ہیں اور محبوب اپنے عاشقِ ناشاد کو بعض دفعہ اصرار کی اجازت دے دیتا ہے۔ حضرت ابراہیم کو بھی ایسا ہی مقام حاصل تھا ورنہ وہ اللہ کے مقام کی عظمت سے سب سے زیادہ آگاہ تھے۔ قرآنِ کریم نے جدال کا لفظ بول کر آپ کی آہ وزاری اور اصرار اور تکرار کی ایک تصویر کھینچ دی ہے جس کے اندر ایک جہانِ معنی مضمر ہے۔ البتہ تورات نے اسے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کہاں تک محفوظ ہے، لیکن اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوجاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہر طرح سے قومِ لوط کو بچانے کی کوشش کی، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی رحیمی اور کریمی کے باوجود حضرت ابراہیم کی درخواست کو قبول کرنے کیلئے تیار نہ ہوئے۔ تورات میں منقول ہے:

پر ابراہام خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا۔ تب ابراہام نے نزدیک جاکر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راست بازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہوجائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔

تب ابراہام نے جواب دیا، کہا کہ دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں راکھ اور خاک ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کردے گا؟ اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا، پھر اس نے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا کہ میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا، پھر اس نے کہا کہ خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا، پھر اس نے کہا دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا، خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں، شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ (پیدائش باب ۱۸: ۲۳-۳۲)

يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾ (سورۃ ھود : ۷۶)

(اے ابراہیم! اس بات کو رہنے دیجئے، اب تمہارے رب کا حکم آچکا اور ان پر ایک ایسا عذاب آکر رہے گا جو ٹالے نہ ٹالا جاسکے۔)

حضرت ابراھیمؑ کو سفارش سے روک دیا گیا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام تر الحاح وزاری اور اصرار کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کہ اے ابراہیم اب اس اصرار کو چھوڑو۔ تمہاری دردمندی اور اللہ کی طرف انابت اپنی جگہ لیکن قومِ لوط نے جس طرح اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کے نبی کی تکذیب کی اور ایک ایک اخلاقی قدر کو پامال کیا، اپنی ان بداعمالیوں اور اللہ کے رسول کی جانب سے اتمامِ حجت ہوجانے کے بعد اب یہ لوگ کسی رحم کے مستحق نہیں رہے۔ اللہ کی طرف سے عذاب کا فیصلہ ہوچکا اور یہ عذاب وہ نہیں جو چونکانے اور ہدایت کی طرف راغب کرنے کیلئے آیا کرتا ہے بلکہ یہ عذاب وہ ہے جو کسی قوم کی جڑ کاٹنے کیلئے آتا ہے اور پھر یہ عذاب کبھی ٹالے سے بھی ٹلتا نہیں۔ قومِ لوط اب اسی عذاب کی مستحق ہوچکی ہے۔

Marfat.com

مشرکین مکہ کیلئے لمحہ فکریہ

غور فرمائیے! یہ آیات مکہ معظمہ میں نازل ہو رہی ہیں اور مشرکین مکہ کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں۔ مقصود اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین مکہ کی تمام تر گمراہیوں کی بنیاد یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سمجھتے تھے، ملت ابراہیم کا اپنے تئیں وارث گردانتے تھے اور اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ اولاً تو ہم پر گرفت نہیں ہوگی اور اگر ہوئی بھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا اللہ کا خلیل ہماری شفاعت کیلئے کافی ہے، وہ ہمیں اللہ کے غضب سے بچالے گا۔ شفاعت کے اس غلط تصور نے ان کی دینی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ ان آیات میں انھیں بتایا جا رہا ہے کہ اگر کفر میں کسی کی شفاعت کام آتی تو حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کبھی نہ ڈوبتا اور اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی کافر قوم کو بچا سکتے تو قوم لوط کبھی عذاب کا شکار نہ ہوتی کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو بچانے کیلئے اپنی بندگی کا سارا سرمایہ جھونک دیا۔ تو اے مشرکینِ مکہ تمہیں غور کرنا چاہئے کہ تم کس مصنوعی سہارے پر اپنی عاقبت تباہ کر رہے ہو۔ اللہ کے نبیوں کا مقام و مرتبہ برحق، وہ اللہ کے یہاں بہت اعزازات اور امتیازات سے نوازے جائیں گے لیکن وہ کبھی کسی کافر کی سفارش نہیں کریں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کافر کے بارے میں سفارش اللہ کے یہاں قبول نہیں ہوتی۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝ (سورۃ هود : ۷۷)

(جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے لوط (علیہ السلام) کے پاس، وہ ان کے آنے سے غمگین ہوئے اور ان کی وجہ سے ان کا دل تنگ پڑا اور کہنے لگے کہ یہ تو بہت ہی کٹھن دن ہے۔)

سِيْٓءَ بِهِمْ کا معنی کیا گیا ہے سَاءَ مَجِيْئُهُمْ لُوْطًا ان کے آنے نے لوط کو پریشان اور غمگین کر دیا۔

ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ الفاظ دل کی پریشانی اور انقباض کے بیان کیلئے بطور کنایہ اس وقت انسان کہتا ہے جب وہ کسی تکلیف کو دور کرنے سے بالکل عاجز ہو جائے۔

حضرت لوطؑ کی پریشانی

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس سے اٹھ کر وہ تین فرشتے جو انسانی بھیس میں تھے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قوم لوط کی آزمائش کیلئے نہایت حسین و جمیل شکلوں میں حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے جیسے انہیں دیکھا تو وہ انتہائی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ وہ اپنی قوم کے بے حیائی پر مبنی رویئے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ ان میں ہم جنس پرستی کی برائی وباء کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ چونکہ اس میں پوری قوم ملوث ہے اس لئے کسی کو کسی سے بھی جھجک باقی نہیں رہی۔ وہ بالکل حیوانوں کی طرح اس برائی کا کھلم کھلا ارتکاب کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو خوب معلوم تھا کہ جیسے ہی میری قوم کے لوگوں نے ان خوبصورت نوجوانوں کو دیکھا تو وہ اپنے اوپر ضبط نہیں کر پائیں گے۔ وہ یقیناً اپنے برے ارادے کی بجا آوری کیلئے میرے گھر پر حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ یہ سوچ کر ان کا دل غم سے بھر گیا اور نہایت پریشانی میں ان کی زبان سے نکلا کہ آج کا دن تو بڑا کٹھن دن ہے کہ ایک طرف میرے مہمان ہیں جن کی عزت کی حفاظت میری ذمہ داری ہے اور دوسری طرف میری قوم ہے جو شرم و حیاء کا لبادہ اتار چکی ہے۔ ایسی صورتحال میں، میں کیا کروں۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ان کے اندیشوں کی عملی تعبیر سامنے آ گئی۔

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ (سورۃ هود : ۷۸، ۷۹، ۸۰)

(اور اس کی قوم کے لوگ جھپٹے ہوئے اس کے پاس پہنچے اور یہ پہلے سے ہی بدکاریوں میں مبتلا تھے۔ (حضرت) لوط (علیہ السلام) نے کہا: اے میری قوم یہ میری بیٹیاں ہیں، وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ پس اللہ سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے معاملہ میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی سمجھدار آدمی نہیں۔ وہ کہنے لگے تم خوب جانتے ہو، ہمیں تمہاری بیٹیوں سے کوئی سروکار نہیں اور تم خوب جانتے ہو جو کچھ ہم چاہتے ہیں۔ حضرت لوط نے کہا، کاش میرے پاس تم سے مقابلہ کی قوت ہوتی یا میں کسی طاقتور سہارے کی پناہ لے سکتا۔)

Marfat.com

حضرت لوطؑ کی پیشکش کا مفہوم

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کو جب معلوم ہوا کہ حضرت لوط کے گھر خوبصورت مہمان آئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی اطلاع حضرت لوط کی بیوی نے لوگوں کو دی تھی تو وہ دوڑتے اور جھپٹتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر پہنچے اور آتے ہی مطالبہ کیا کہ ان مہمانوں کو ہمارے سپرد کردو۔ حضرت لوط چونکہ ان کے اعمال بد اور عادات شنیعہ سے واقف تھے اور انہیں خوب معلوم تھا کہ وہ خوبصورت لڑکوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں تو آپ نہایت پریشان ہوگئے، تاہم آپ نے انہیں یقیناً سمجھایا، مہمانوں کے اکرام کی نصیحت کی، ان کے برے ارادوں پر انہیں ملامت بھی کی لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ لوگ برائی کرنے میں بے حیا ہی واقعہ نہیں ہوئے تھے بلکہ انتہائی دلیر اور جری بھی تھے۔ زبردستی اس برائی کیلئے کسی کو پکڑ لینا ان کے نزدیک کوئی بری بات نہ تھی۔ جب حضرت لوط نے محسوس کیا کہ میں نے مہمانوں کو اندر بٹھا رکھا ہے اور یہ لوگ زبردستی اندر جانا چاہتے ہیں اور میں دیر تک ان کا راستہ نہیں روک سکتا تو آپ نے انتہائی پریشان ہوکر ان سے کہا کہ تم اپنی جنسی آسودگی کیلئے یہ حرکت کرنا چاہتے ہو تو اس کیلئے بہتر یہ ہے کہ بجائے خلافِ فطرت حرکت کرنے کے تم عورتوں کی طرف رجوع کرو۔ قوم کی ساری بیٹیاں میری بیٹیاں ہیں کیونکہ پیغمبر اپنی اُمت کیلئے باپ کی حیثیت رکھتا ہے تو میں باپ کے طور پر تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ جو بچیاں تمہارے نکاح میں ہیں یعنی تم نے ان کو نکاح کی زنجیر تو پہنا رکھی ہے لیکن تم ان سے ازدواجی تعلق قائم کرنے سے گریزاں ہو اور اس کیلئے تم نے وہ راستہ اختیار کر رکھا ہے جو نہ صرف غیر شریفانہ بلکہ خلافِ فطرت بھی ہے تو تم اپنی بیویوں سے خواہش نفس پوری کرو۔ یہی تمہارے لئے احسن طریقہ ہے۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب مراد لیا ہے کہ یہاں بَنَاتِیْ سے حضرت لوط کی اپنی حقیقی بیٹیاں مراد ہیں۔ آپ کی پیشکش کا مطلب یہ تھا کہ جن رئیسوں نے میری بیٹیوں کے رشتے طلب کئے تھے اور میں نے ان کے فسق وفجور کو دیکھ کر رشتے دینے سے انکار کر دیا تھا، میں اب انہیں اپنی بیٹیوں کے رشتے دینے کیلئے تیار ہوں۔ وہ براہ کرم اس غولِ شیطانی کو میرے دروازے سے دور کریں، لیکن تورات کا کہنا یہ ہے کہ حضرت لوط کی تمام بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ اس لحاظ سے اس دوسری تعبیر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

بعض اہلِ علم نے اس جملے کی ایک اور توجیہ کی ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں درحقیقت یہ کوئی پیشکش نہیں تھی بلکہ یہ اپنی قوم کے ضمیر کو جگانے اور جھنجوڑنے کی آخری کوشش تھی کہ شاید وہ لوگ اس طرح سوچنے پر آمادہ ہوجائیں اور ان کے دل میں یہ خیال آجائے کہ مہمان کی عزت اگر کوئی معمولی بات ہوتی تو یہ اللہ کا بندہ اس عزت بچانے کیلئے اپنی سب سے قیمتی متاع کو یوں پیش کرنے کیلئے تیار نہ ہوتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم میں ضمیر نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ انہوں نے صاف کہا کہ اے لوط تم جانتے ہو ہمارا عورتوں کی طرف کوئی رجحان نہیں، ہماری دلچسپیاں لڑکوں سے ہیں۔ اس لئے بات کو بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں تم اسے خوب جانتے ہو۔ حضرت لوط نے جب یہ دیکھا کہ نہ ان پر نصیحت اثر کر رہی ہے اور نہ منت سماجت۔ یہ بظاہر انسان ہیں لیکن حقیقت میں یہ برائیوں کی پوٹ ہیں۔ تب ان کی زبان سے نہایت حسرت آمیز لہجے میں یہ جملہ نکلا: کہ کاش میرے پاس کوئی طاقت ہوتی تو میں طاقت کے ذریعے تمہیں روک دیتا۔ یا مجھے کوئی مضبوط پناہ مل جاتی تو میں اس کے ذریعے سے تمہارا مقابلہ کرسکتا۔ اب تو میں یکہ اور تنہا ایک فرد ہوں جس میں تمہارے مقابلے کی کوئی طاقت نہیں۔

جاہلیتِ جدیدہ قوم لوط کی راہ پر

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ قرآن کریم نے مختلف جگہوں میں قوم لوط کی خلاف فطرت برائی جسے لواطت کہتے ہیں کا جس نفرت سے ذکر کیا ہے اور عقیدہ کی خرابی کے ساتھ ساتھ اس برائی نے جس طرح ان کے کردار کو تباہ کیا اور پھر یہی دونوں چیزیں ان پر ہولناک عذاب کا باعث بنیں۔ آخر آج ان چیزوں کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قرآن کریم جو قیامت تک ہدایت کا ذریعہ بن کے آیا ہے اس میں اس برائی کو عبرت انگیز انداز میں بیان کرنا تا کہ آئندہ قومیں بھی اس سے فائدہ اٹھائیں، آخر اس کا سبب کیا ہے جبکہ اس میں مبتلا قومیں تباہ ہوگئیں اور یہ داستان قصہ پارینہ بن گئیں، اب ان کو دوہرانے سے کیا فائدہ، لیکن کاش ایسا ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت انسان کی خواہشات نے جن برائیوں کو جنم دیا تھا، وہ برائیاں تو بڑی وسیع سطح پر موجود تھیں اور وہ قومیں بری طرح

Marfat.com

ان کی گرفت میں تھیں، لیکن انھوں نے ان برائیوں کے جواز میں کوئی فلسفہ ایجاد نہیں کیا تھا۔ ان میں مختلف وقتوں میں ایسی آوازیں ضرور اٹھتی رہتی تھیں جس نے ان برائیوں کا برائی ہونے کا تصور ختم نہیں ہونے دیا تھا، لیکن آج امریکہ اور مغرب نے دیگر برائیوں کے ساتھ ساتھ اس خلافِ فطرت اور قابلِ نفرت برائی کے جواز میں نہ صرف فلسفہ ایجاد کیا ہے بلکہ مسلسل پراپیگنڈے اور ذرائع ابلاغ سے کام لے کر ذہنوں کو اس کیلئے ہموار بھی کیا ہے۔ ان کے پارلیمانی ادارے جن میں ان کی پوری کریم موجود ہوتی ہے وہ خود اس پراپیگنڈے سے اس حد تک متاثر ہیں کہ ان میں سے بعض ملکوں نے اس برائی کے حق میں قانون سازی بھی کی ہے اور وہاں کھلے عام ایسے کلب موجود ہیں جن میں اس برائی کے ارتکاب کے تمام امکانات مہیا ہیں۔

لائبریریاں جو کسی قوم کی ذہنی ارتقا کی علامت ہوتی ہیں اور جن میں قوم کا اجتماعی کردار جھلکتا ہے ان میں ایسے مستقل شعبے کھول دیئے گئے ہیں جن پر جلی حروف میں لکھا ہے (گے سٹائل آف لائف) اور اس شعبے میں تمام وہ کتابیں آپ کو ملیں گی جو اس برائی کے حق میں لکھی گئی ہیں۔ غضب خدا کا یہ ہے کہ اس برائی کو فطرتِ انسانی کا استحقاق قرار دیا گیا ہے اور ''ہیومن ارج'' کے نام سے عدالتوں کو اس کا ہمنوا بنایا جا رہا ہے اور اگر کوئی ادارہ ایسی برائی میں مبتلا شخص کی حوصلہ شکنی کرتا ہے تو وہاں کے ذرائع ابلاغ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ اللہ سے بڑھ کر مستقبل کو جاننے والا اور کون ہے۔ اس لئے اس کتاب میں قومِ لوط اور اس کے انجام کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ جاہلیتِ جدیدہ کے معمار اور ان کے پیروکار اس کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ سکیں۔

قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ فَاَسْرِ بِاَھْلِکَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْکُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَکَ ؕ اِنَّہٗ مُصِیْبُھَا مَآ اَصَابَھُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَھُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ﴿۸۱﴾ (سورۃ ھود : ۸۱)

(فرشتوں نے کہا، اے لوط! ہم تمہارے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، یہ ہرگز آپ تک پہنچ نہیں سکتے۔ پس آپ اپنے اہل و عیال کو لے کر کچھ رات رہے نکل جایئے اور تم میں سے کوئی مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ مگر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جایئے۔ اس پر بھی وہی آفت آنی ہے جو ان پر مقدر ہو چکی ہے۔ اُن پر عذاب آنے کا مقررہ وقت صبح کا وقت ہے۔ کیا صبح قریب نہیں؟)

فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو تسلی دی

اب تک تو یہ فرشتے جو نوجوان لڑکوں کے روپ میں تھے خاموشی سے حضرت لوط اور ان کی قوم کے درمیان کشمکش دیکھتے رہے لیکن جب حضرت لوط بے بسی تک جا پہنچے تو تب انھوں نے کہا کہ حضرت آپ پریشان نہ ہوں، ہم لڑکے نہیں ہیں، ہم فرشتے ہیں اور ہمیں آپ کی قوم پر عذاب کیلئے بھیجا گیا ہے۔ یہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام بھی اس وقت موجود تھے۔ انھوں نے اپنا ہاتھ بلند کیا، جتنے لوگ اس وقت موجود تھے، وہ سب اندھے ہو گئے اور چیختے ہوئے باہر کو دوڑے کہ لوگو! اپنی جانیں بچاؤ، یہ لوط کے مہمان بہت بڑے جادوگر ہیں۔

فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے مزید عرض کیا کہ آپ ان بدمعاشوں کی پرواہ نہ کریں، یہ آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ البتہ آپ یہ کیجئے کہ اپنے اہل خانہ کو ساتھ لے کر راتوں رات اس بستی سے نکل جایئے اور احتیاطاً یہ کیجئے کہ آپ میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے۔ اس میں حکمت کیا تھی، یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور مزید یہ کہ آپ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر نہ جایئے، وہ آپ کی بیوی ضرور ہے لیکن ایمان سے محروم ہے۔ نجات ہمیشہ ایمان والوں کا مقدر رہی ہے۔ اب جس عذاب کا شکار آپ کی قوم ہونے والی ہے اسی عذاب کا شکار آپ کی بیوی بھی ہو گی۔ یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ایک کافر خاتون اللہ کے نبی کے نکاح میں کیسے رہی۔ یاد رہے کہ پہلی شریعتوں میں مسلم اور کافر کا نکاح جائز تھا۔ مذہب کی بنیاد پر مکمل تفریق اس آخری مذہب نے کی ہے کیونکہ اس مذہب نے ہر تفریق اور تقسیم سے انکار کر کے صرف ایک ہی تقسیم قبول کی ہے، وہ ہے مسلم اور کافر۔ باقی سب انتسابات ختم ہو گئے۔ صرف یہی ایک نسبت قیامت تک باقی رہے گی اور اسی کے مطابق قیامت میں فیصلہ ہو گا۔

مزید کہا کہ اس قوم کو عذاب کیلئے اب انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ جیسے ہی آپ رات کے آخری حصے میں طلوعِ سحر کے وقت خطرے کی حد سے نکل جائیں گے تو صبح ہوتے ہی اللہ کا عذاب ان پر آدھمکے گا اور آپ جانتے ہیں کہ صبح اب دور نہیں۔ اس لحاظ سے اب ان کا انجام بھی دور نہیں۔

Marfat.com

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ﴿٨٢﴾ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٣﴾

(سورۃ ھود : ۸۲، ۸۳)

(پس جب آ پہنچا ہمارا عذاب تو ہم نے اس کی بلندی کو اس کی پستی کر دیا اور اس پر سنگِ گِل کی بارش کی، تہ بہ تہ جن پر تمہارے رب کے پاس سے نشان لگے ہوئے تھے اور لوط کی بستی ظالموں سے کچھ دور نہیں۔)

قوم لوط پر عذاب

صبح ہوتے ہی قوم لوط پر اللہ کا عذاب ٹوٹ پڑا۔ اس عذاب کی صورت کیا تھی؟ حقیقت تو اللہ جانتا ہے، لیکن آیت کے الفاظ یہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ان کی زمین کو شق کیا گیا جس سے پستیاں بلندیوں میں اور بلندیاں پستیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ممکن ہے شدید زلزلہ آیا ہو اور ممکن ہے آتش فشاں پہاڑ پھٹے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی تیز آندھی اٹھی جو اس قدر شدید ہو گئی کہ اس نے ان بستیوں پر پتھروں کی بارش کی۔ عمارتیں پہلے ہی تباہ ہو چکی تھیں، پتھروں کی بارش نے ان کا حلیہ تک بگاڑ دیا۔ بعض اہل علم کے نزدیک سجیل کی بارش سے مراد وہ مٹی کے ڈھیلے ہیں جسے آگ نے پتھروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک سجیل سنگِ گِل کا معرب ہے اور یہ پتھروں کی بارش اس تسلسل سے ہوئی کہ اس کے تہ بہ تہ ڈھیر لگ گئے۔ مَنْضُوْدٍ سے مراد یا تو یہی پتھروں کے ڈھیر ہیں اور یا اس بارش کا پے در پے اور لگاتار ہونا ہے۔ مُسَوَّمَةً کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ ان پر ایسی مہریں لگی ہوئی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ اللہ کی جانب سے کسی الٰہی ٹکسال میں ڈھل کے نکلے ہیں۔ اور دوسرا مطلب اس کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے ہر پتھر پر ہر اس کافر اور فاسق کا نام کندہ تھا جس پر اس پتھر کو گرنا تھا۔ قوم لوط کی بستیاں اس طرح تباہ کی گئیں کہ وہاں خاکِ سیاہ کے سوا کچھ نہ بچا۔ یہ بستیاں اس جگہ آباد تھیں جہاں آج کل بحرِ مردار یا بحرِ لوط ہے۔ کہتے ہیں اب بھی بحرِ لوط سے دھویں کے بادل اٹھتے رہتے ہیں اور کثرت سے زلزلے آتے رہتے ہیں۔ آخر میں مشرکینِ مکہ کو توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ تم نے جس قوم لوط کی ہولناک داستان سنی ہے، اس قوم کے نشانات تم سے دور نہیں۔ تم اپنے تجارتی اسفار میں وہاں سے گزرتے ہو۔ تم بڑی آسانی سے اس تباہ شدہ قوم کے آثار دیکھ سکتے ہو اور اس کے گرد و پیش میں بسنے والی قوموں سے معلوم کر سکتے ہو کہ یہاں واقعی قوم لوط آباد تھی۔

وَاِلٰی مَدْيَنَ اَخَاهُمْ

شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا تَنْقُصُوا

الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ﴿٨٤﴾ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٨٥﴾

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ

Marfat.com

بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ
اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ
الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ
وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ
اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ
اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿٨٨﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ
شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ
اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿٨٩﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ
ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿٩٠﴾ قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ
كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ
لَرَجَمْنٰكَ ؗ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿٩١﴾ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ
مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿٩٢﴾
وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ
يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ
رَقِيْبٌ ﴿٩٣﴾ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ
مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ

Marfat.com

جٰثِمِیْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾

(اور اہلِ مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ آپ نے کہا: اے برادرانِ قوم عبادت کرو اس اللہ کی جس کے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ نہیں اور کمی نہ کیا کرو، ناپ اور تول میں۔ میں تمہیں خوشحال دیکھتا ہوں اور میں ڈرتا ہوں، تم پر ایسے دن کے عذاب سے جو ہر چیز کو گھیر لینے والا ہے۔ اور اے میری قوم پورا کیا کرو ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ، اور نہ گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے۔ اللہ کا بخشا ہوا منافع تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم صاحبِ ایمان ہو اور میں تم پر نگران نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے یا ہم اپنے مالوں میں تصرف نہ کریں جیسے ہم چاہیں۔ بیشک تم ہی ایک دانا اور راست رو رہ گئے ہو۔ حضرت شعیب نے کہا، اے میری قوم! تمہارا کیا خیال ہے اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے عمدہ روزی بھی عطا کی ہے اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس امر میں تمہاری مخالفت کروں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں۔ میں تو صرف تمہاری اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرا بس ہے۔ اور نہیں ہے میرا راہ پانا مگر اللہ تعالیٰ کی امداد سے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور اے میری قوم کہیں میری ضد تمہارے لئے اس امر کا باعث نہ بن جائے کہ تم پر بھی اس طرح کی آفت نازل ہو جس طرح کی آفت قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر نازل ہوئی اور قومِ لوط تو تم سے کچھ دور بھی نہیں۔ اور اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر اسی کی طرف رجوع کرو۔ بیشک میرا رب بڑا مہربان اور بہت پیار کرنے والا ہے۔ وہ بولے اے شعیب! ہم نہیں سمجھتے بہت سی باتیں جو تو کہتا ہے، بلاشبہ ہم تجھے دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے۔ اگر تیرے خاندان کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم نے تمہیں سنگسار کر دیا ہوتا۔ اور تم ہم پر کوئی بھاری نہیں۔ حضرت شعیب نے فرمایا: اے میری قوم! کیا میرا کنبہ زیادہ بھاری ہے تم پر اللہ تعالیٰ سے، اور اس کو تو تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔ میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اور اے میری قوم تم اپنی جگہ پر عمل کئے جاؤ اور میں اپنی جگہ پر عمل کروں گا۔ تم عنقریب جان لو گے کس پر آتا ہے وہ عذاب، جو اسے رسوا کر دے گا اور کون جھوٹا ہے اور تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔ اور جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے بچا لیا شعیب کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے، آپ کے ساتھ، اپنی خاص رحمت سے۔ اور پکڑ لیا ظالموں کو خوفناک کڑک نے، تو انہوں نے صبح کی اپنے گھروں میں اس حال میں کہ وہ اوندھے منہ گرے ہوئے تھے۔ گویا وہ کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے، خبردار دوری ہے مدین کیلئے جیسے دوری ہے ثمود کیلئے۔)

وَاِلٰى مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ وَّاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ ﴿۸۴﴾ (سورۃ ہود : ۸۴)

(اور اہلِ مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ آپ نے کہا: اے برادرانِ قوم عبادت کرو اس اللہ کی جس کے سوا تمہارا کوئی اِلٰہ نہیں اور کمی نہ کیا کرو، ناپ اور تول میں۔ میں تمہیں خوشحال دیکھتا ہوں اور میں ڈرتا ہوں، تم پر ایسے دن کے عذاب سے جو ہر چیز کو گھیر لینے والا ہے۔)

Marfat.com

اہل مدین کا محل وقوع اور ان کی حقیقت

مشرکینِ مکہ کو اللہ کے نبی کی دعوت سے انکار کے نتیجے میں ان کا انجام یاد دلانے کیلئے مختلف امتوں کی سرگزشتیں سنائی جارہی ہیں۔اس سے پہلے قوم نوح، قوم عاد، قوم صالح اور قوم لوط کے حالات گزر چکے۔اب اسی سلسلے کی ایک کڑی اہلِ مدین یعنی قوم شعیب کی سرگزشت بھی ہے جو اب بیان کی جارہی ہے۔اس کا اساسی موضوع بھی وہی ہے جو متذکرہ بالا سرگزشتوں کا ہے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت بھی وہی ہے جو متذکرہ بالا امتوں کی طرف آنے والے رسولوں کی تھی۔ یہ قوم مدین اور اس کے نواحی علاقوں میں آباد تھی۔ یہ شہر بحر احمر کے اس مقام پر آباد تھا جہاں جزیرہ نمائے عرب کی دو تجارتی شاہراہیں آکر ملتی تھیں۔یمن وشام اور عراق ومصر کے قافلے یہیں سے گزرتے تھے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایسے علاقے میں آباد تھے جو تجارتی قافلوں کی گزرگاہ ہونے کے باعث ایک بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اہلِ مدین درحقیقت مدیان کی اولاد ہیں۔ مدیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔یہ دنیوی حیثیت سے کیسے ہی سربرآوردہ رہے ہوں لیکن ان کو اللہ نے نبوت عطا نہیں کی۔ان کے بھائیوں میں حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام عظیم رسول ہونے کے باعث شہرت کے آسمان پر درخشندہ ہیں۔حضرت اسحاق علیہ السلام کے حقیقی وارث تو مسلمان ہیں لیکن نسلی طور پر بنی اسرائیل ان کے نام لیوا ہیں۔ان کی اولاد میں سے اٹھنے والی یہ امت صدیوں تک دنیا کی امامت کے منصب پر فائز رہی ہے۔حضرت اسماعیل علیہ السلام ملت ابراہیم کے رسول تھے اور اللہ کے گھر کے متولی اور آپ کی اولاد اس تولیت میں آپ کی وارث رہی، پھر آپ کی ہی اولاد میں نبی آخرالزماں ﷺ تشریف لائے اور آپ کی عظمت کہیں پہنچ گئی۔حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت سارہؓ کے فرزند ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہؓ کے۔اور مدیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی قطوراء کے بطن سے ہیں۔مدین کے علاقے میں ان کی اولاد پھیلی، ممکن ہے اس میں کچھ حلیف قبائل بھی شامل ہوں جنہوں نے اپنے آپ کو مدیان کی اولاد میں ضم کردیا ہو کیونکہ عرب میں یہ طریقہ موجود رہا ہے کہ جب بعض قبائل کا کسی بڑے بڑے قبیلے یا کسی بڑے آدمی کی اولاد سے حلیفانہ تعلق قائم ہوجاتا تھا تو وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ کو اسی میں ضم کردیتا تھا۔

اگر یہ بات واقعی صحیح ہے کہ اہلِ مدین مدیان کی اولاد ہیں تو پھر یہ بات بھی قرینِ قیاس ہے کہ وہ کافر نہیں بگڑے ہوئے مسلمان تھے کیونکہ مدیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹا ہونے کی وجہ سے یقیناً مسلمان ہوں گے اور ان کی اولاد بھی مسلمان رہی ہوگی۔آہستہ آہستہ ان میں خرابیاں پیدا ہوئیں جس نے ان کے عقیدے پر بھی اثر کیا اور ان کے کاروباری معاملات پر بھی۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی دعوت کی بنیاد اسی اساسی حقیقت کو بنایا ہے جو تمام انبیاء کرام کی دعوت کی بنیاد رہی ہے اور یہ وہی حقیقت ہے جسے ہم توحید کے نام سے جانتے ہیں۔جب بھی انسانوں میں عقیدے کی خرابیاں شروع ہوئی ہیں تو اس کا آغاز ہمیشہ عقیدۂ توحید میں بگاڑ سے ہوا ہے۔چنانچہ ہر پیغمبر نے اپنی امت کو سب سے پہلے یہ بات کہی کہ لوگو! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم نے الوہیت میں نہ جانے کس کس کو شریک کررکھا ہے۔اس طرح سے تم نے شرک کے اتنے دروازے کھول دیئے ہیں کہ جنہیں بند کرنا مشکل ہورہا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات کو ماننے کے باوجود تمہاری عملی زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں۔تم اسے ایک ایسی ذات سمجھتے ہو جو کائنات کو پیدا کرنے کے بعد کہیں چھپ کے بیٹھ گیا ہے اور اس نے اپنے تمام اختیارات کہیں دیوتاؤں کو، کہیں اوتاروں کو، کہیں مظاہرِ قدرت کو، کہیں فرشتوں اور جنات کو اور کہیں انسانوں ہی میں سے مختلف انسانی شخصیات کو جن سے تمہاری عقیدت کا رشتہ قائم ہوگیا ہے کے سپرد کردیئے ہیں۔جب تک تم ان تمام آستانوں سے سر اٹھا کر صرف ایک اللہ کے آستانہ پر نہیں جھکاؤ گے اور اپنے دلوں کی دنیا کو ان تمام مصنوعی خداؤں سے پاک کر کے صرف ایک اللہ سے آباد نہیں کروگے اس وقت تک تمہارے کردار کی تعمیر ناممکن ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے دوسری بات اپنی امت سے یہ فرمائی کہ تم ناپ تول میں کمی مت کرو۔تمہیں یقیناً یہ سہولت حاصل ہے کہ تم تجارتی شاہراہوں کے سنگم پر آباد ہو۔تمہارا علاقہ ایک بڑی تجارتی مارکیٹ بن گیا ہے۔اس میں تمہارے لئے جائز کمائی کے بہت امکانات موجود ہیں۔ اس کے باوجود تم نے ناپ تول میں کمی کیلئے ایسے ایسے ذرائع ایجاد کیے ہیں کہ لوگوں کی ذہانت وفطانت تمہاری دھوکہ دہی کی وارداتوں کو سمجھنے سے قاصر

Marfat.com

رہتی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ آخر تم ایسا کیوں کرتے ہو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ نے خوشحالی اور رفاہیت عطا کی ہے۔ زندگی کی تمام آسانی تمہیں میسر ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ تم اس خوشحالی پر اللہ کا شکر بجالاؤ اور تم اپنی زندگی کے معمولات کو ان طریقوں کے مطابق ڈھالو جو اللہ کی شریعت کے مطابق ہوں، لیکن تم نے اس کے برعکس لوگوں کو لوٹنا اور ان کو نقصان پہنچانا اپنا معمول بنالیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ کی ناشکری کے نتیجے میں ہمیشہ ایسا عذاب آیا کرتا ہے۔ اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو مجھے اندیشہ ہے کہ ایسا ہی کوئی عذاب تم پر نہ بھیج دیا جائے۔

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

(اور اے میری قوم پورا کیا کرو ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ، اور نہ گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور نہ پھرو زمین میں فساد برپا کرتے ہوئے۔) (سورۃ ہود: ۸۵)

سابقہ آیت کا مضمون ایک دوسرے پہلو سے

وہ بات جو پہلی آیت میں کہی گئی ہے اسے دوسرے پہلو سے ارشاد فرمایا جارہا ہے۔ پہلے صرف ناپ تول میں کمی سے روکا گیا، اب یہ فرمایا جارہا ہے کہ زندگی کی اصل ضرورت قسط کا قائم کرنا ہے۔ اس کی ضرورت صرف ناپ تول میں نہیں، زندگی کے ہر شعبے میں ہے۔ جہاں کہیں قسط کو نقصان پہنچتا ہے وہاں اعتدال رخصت ہوجاتا ہے جبکہ یہی وہ حقیقتِ قائمہ ہے جس پر زندگی کی عمارت استوار ہے۔ آپ جسم کی ضرورتوں کو دیکھ لیجئے، اس کے تناسب کو دیکھ لیجئے، اس کے حُسن جمال کو دیکھ لیجئے، اس کی صحت پر غور کر کے دیکھ لیجئے، اس کی احساسات کی دنیا کو دیکھ لیجئے، اس کے انفعالات کا جائزہ لیجئے، اس کی دماغی رعنائیوں اور عملی قوتوں کو دیکھئے، ان تمام میں وہ حقیقت جو انہیں قابلِ عمل رکھتی ہے اور کارآمد بناتی ہے وہ صرف حقیقتِ اعتدال ہے۔ اسی کو عدل اور قسط کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ترازو کے دونوں پلڑوں کا برابر ہونا یہی عدل بھی ہے اور قسط بھی۔

لوگوں کے ساتھ معاملات میں جہاں بھی کمی بیشی ہوتی ہے چاہے وہ لین دین میں ہو، میل جول میں ہو، تعلقات اور قرابت داری میں ہو، زندگی کے کسی بھی معاملے میں ہو، وہیں اعتدال رخصت ہوجاتا ہے اور وہیں سے فساد کو راستہ ملتا ہے۔ زندگی میں ہمیں جہاں جہاں بھی ناہمواریاں نظر آتی ہیں چاہے وہ انفرادی زندگی میں ہوں یا اجتماعی زندگی میں، اس کا دائرہ معاشرتی ہو یا معاشی، اس کا رشتہ حکومت سے وابستہ ہو یا عدالت سے وہ اسی حقیقت کے گم ہوجانے کے سبب سے ہیں۔ ہر جگہ جو حقیقت، استحکام اور نمو پر دلالت کرتی ہے اور جو فساد اور خرابی سے بچاتی ہے وہ ان تعلقات کی یکسانی اور اس کے پلڑوں کا برابر ہونا ہے۔

انسانی تعلقات میں حاکم اور محکوم، آمر اور مامور کا رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دفاتر سے لے کر کارخانوں اور ملوں تک اسی رشتے کی صحت پر تمام امور کی استواری کا دارومدار ہے اور جہاں اس چیز کا فقدان ہوتا ہے اس سے فساد جنم لیتا ہے۔ مالک جب اپنے مزدوروں کو صحیح حقوق نہیں دیتا تو ان کے اندر ایک اشتعال اور ایک نفرت پیدا ہوتی ہے اور مزدور اور محکوم جب اپنے مالک سے ہمدردی اور خیرخواہی کا رشتہ توڑ دیتے ہیں تو مالک کے دل میں ان کی طرف سے ایک بغض پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح تجارتی تعلقات میں بھی ایک شخص بیچتا ہے اور دوسرا خریدتا ہے، دونوں کے درمیان اگر عدل کا رشتہ قائم ہے تو کاروبار میں ترقی ہوگی اور اگر یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر نہ صرف کاروبار تباہ ہوتا ہے بلکہ کاروبار کرنے والے بھی تباہی کا شکار ہوجاتے ہیں۔

جن ملکوں میں بھی معاشی انقلاب کے نام سے حالات تلپٹ ہوئے ہیں ان کے اگر آپ اسباب تلاش کریں گے تو ان ہی بنیادی تعلقات کی ناہمواری اور عدل و قسط کی پامالی کو بنیادی سبب کے طور پر محسوس کریں گے۔ سمجھا تو یہ جاتا ہے کہ ہمیشہ مالک اپنے مزدوروں پر ظلم کرتا ہے، لیکن جب کہیں مزدور انقلاب کیلئے تحریکیں چلتی ہیں اور معاملہ خانہ جنگی تک پہنچ جاتا ہے تو مزدوروں کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ سب سے پہلے اپنے مالکوں کو ذبح کرتے ہیں اور اگر انہیں ملوں اور کارخانوں پر انتظامیہ کی حیثیت دے کر بٹھا دیا جائے تو یہ سابقہ مالکوں سے بھی زیادہ ظالم ثابت ہوتے ہیں۔ اس لئے اقبال نے کہا تھا:

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

Marfat.com

آیت کے آخر میں خطاب انہیں لوگوں سے ہیں جو تجارتی معاملات کو اپنی خیانتوں کے باعث غیر متوازن اور ناہموار کرنے کے ذمہ دار تھے۔ ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم ان خیانتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہو اور اس طرح سے اپنی امارت اور رفاہیت میں اضافہ کر سکتے ہو حالانکہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ تم فساد کا دروازہ کھول رہے ہو۔ جن لوگوں کے ساتھ تم زیادتی کر رہے ہو وہ شاید زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکیں۔ ایک وقت آئے گا ان کی غربت ان کے اندر اشتعال پیدا کرے گی اور اس اشتعال کا رخ تمہاری جانب ہوگا کیونکہ وہ بجا طور پر یہ سمجھیں گے کہ تم ان کی محرومیوں کا باعث ہو۔ جہاں کہیں بھی غریبوں میں انقلاب اٹھا ہے اس کا نتیجہ اس سے مختلف کبھی بھی نہیں رہا کہ وہ امراء جو ان کا خون چوستے تھے، غریب پھر ان کا لہو پیتے ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا:

غریبوں میں جو انقلاب آرہا ہے
امیروں کا یوم حساب آ رہا ہے

اس لئے اگر دوسروں کی پرواہ نہیں، اپنے انجام کی تو فکر کرو۔ اپنے طرزِ عمل کو درست کرو تا کہ فساد کا دروازہ کھلنے نہ پائے اور اس کی یہی ایک صورت ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے اللہ کے دین کو اختیار کر لو۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿٨٦﴾ (سورۃ ہود : ۸۶)
(اللہ کا بخشا ہوا منافع تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم صاحبِ ایمان ہو اور میں تم پر نگران نہیں ہوں۔)

گزشتہ مضمون کی تکمیل

یہ گزشتہ آیت کے مضمون کی تکمیل ہے اور اس میں انسان کی نفسیاتی کمزوریوں میں سے ایک بہت بڑی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ چاہے اس کے پاس قارون کا خزانہ کیوں نہ ہو، وہ کبھی اسے اپنے لئے کافی نہیں سمجھتا۔ جب اپنے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ یہ خواہش کرتا ہے کہ کاش مجھے اتنا مل جائے کہ میری ضرورتوں کیلئے کفایت کرے لیکن جب بقدرِ کفایت مل جاتا ہے تو پھر قدم آگے بڑھنے لگتا ہے جو کہیں رکنے کا نام نہیں لیتا۔ کفایت کے بعد تکلف آتا ہے، پھر تعیش آتا ہے اور پھر آدمی ان حدود سے گزر جاتا ہے جو انسانیت سے عبارت ہیں۔ اس لئے اس آیتِ کریمہ میں پہلے قدم کو روکا گیا ہے کہ تم اگر ایک آسودہ زندگی گزارنا چاہتے ہو تو اس کیلئے پہلا سبق یہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ تمہیں عطا کیا ہے اور جو کچھ تم نے اپنے کاروبار میں لگا رکھا ہے اس میں جائز منافع پر اکتفا کرو کیونکہ جائز سے ناجائز کی طرف قدم بڑھانا یہی خرابی کا پہلا زینہ ہے۔ جب تم نے اس زینے پر قدم رکھ دیا پھر تم چڑھتے چلے جاؤ گے۔ کاروبار اللہ کی نعمت ہے۔ تاجر معاشرے کا ایک کارآمد فرد ہوتا ہے، لیکن وہ اس وقت تک معاشرے کے کام آتا ہے جب وہ تجارت کو لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ نہیں بناتا بلکہ جائز منافع پر اکتفا کرتا ہے اور دوسروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت سے صرفِ نظر کرنا اپنے ایمان کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو دولت کی حرص اور ہوس سے اپنے آپ کو بچاؤ اور ہمیشہ ذہن میں یہ بات واضح رکھو کہ مال و دولت اللہ کی امانت بھی ہے اور ابتلاء بھی۔ انسان کو اس کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔ تمہیں مومن ہونے کی وجہ سے اپنا ایمان عزیز ہونا چاہئے۔ دولت کی ہوس اگر اس پر غالب آ گئی تو ایمان تو کیا بچے گا دیانت و امانت بھی باقی نہیں رہیں گی۔ کردار کی عظمت گہنا کر رہ جائے گی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے میں نے تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے۔ تم اگر اس سے اِبا کرتے ہو تو میں تمہارا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں کیونکہ مجھے تم پر نگران نہیں بنایا گیا۔ میرا کام ابلاغ ہے، منوانا نہیں۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿٨٧﴾ (سورۃ ہود : ۸۷)
(انہوں نے کہا اے شعیب کیا تمہاری نماز تمہیں حکم دیتی ہے کہ ہم انہیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کیا کرتے تھے یا ہم اپنے مالوں میں تصرف نہ کریں جیسے ہم چاہیں۔ بیشک تم ہی ایک دانا اور راست رو رہ گئے ہو۔)

Marfat.com

حضرت شعیب کی دعوت کا جواب قوم کی طرف سے طنزیہ انداز میں

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی دعوت کے آغاز میں دو باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اِلٰہ نہ مانو، اس کے سوا کوئی اور بندگی کے لائق نہیں۔ سروری اسی کو زیب دیتی ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی غیر مشروط اطاعت کا مستحق نہیں۔ اس کی بے پناہ قدرتیں ہر ایک کے سہارے کیلئے کافی ہیں۔ اس لئے اس کے سوا کوئی اور سہارا نہیں اور دوسری بات آپ نے یہ فرمائی کہ تم اپنے معاملات میں خیانت کرنا چھوڑ دو۔ ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو، لوگوں کی چیزیں انہیں گھٹا کے مت دو، یعنی تم اپنے معاملات میں اللہ کے احکام کی اطاعت کرو اور اپنے خواہشات کے مطابق ان میں ہیرا پھیری مت کرو۔ چنانچہ انہیں دونوں باتوں کے حوالے سے قوم نے آپ پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ ہم تو تجھے بہت دانا اور بینا آدمی سمجھتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تیری نمازوں نے تیری عقل برباد کردی۔ نماز ایک نیکی کی علامت ہے، اللہ ہی کی بندگی کا اظہار ہے اور اسی کے ہو رہنے کی ایک تربیت ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ تمہیں یہ بات سمجھائے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی مت کرو اور ان تمام معبودوں کو چھوڑ دو جن کی پوجا ہمارے آباؤاجداد کرتے رہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہمارے آباؤاجداد بیوقوف اور گمراہ تھے تو کیا تمہاری عقل و دانش نے تمہیں یہی سمجھایا ہے کہ تم اپنے آباؤاجداد کو گمراہ ثابت کرو۔ ہم اپنے آباؤاجداد کی عزت میں اگر کوئی اضافہ نہیں کرسکتے تو کیا ان کی ذلت کا باعث بنیں، یہ ہم سے نہیں ہوسکتا۔ اور دوسری یہ بات کہ تمہارے امانت و دیانت کے اس وعظ کے نتیجے میں کیا ہم اپنے مالی معاملات میں اپنی آزادروی سے دستبردار ہوجائیں، اپنے مال کے ہم خود مالک ہیں، اس میں تصرف بھی اپنی مرضی سے کریں گے۔ تمہاری بات کا مطلب تو یہ ہے کہ ہمیں شاید اپنے مال پر حق ملکیت حاصل نہیں اور اس لئے ہمیں تصرف کا کوئی حق نہیں، حالانکہ یہ دونوں باتیں آج کے سرمایہ دارانہ نظام کی طرح قابلِ قبول نہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام اپنے لوگوں میں اس بات کا حق دیتا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت میں جس طرح چاہیں تصرف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، ان کی اس آزادی پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ اس لئے ہمیں ایسی نصیحت مت کریں جس سے ہماری عملی آزادی متاثر ہوتی ہو۔ ہم اپنے کاروبار میں اضافے کیلئے جس چیز کو مناسب سمجھیں گے وہ کریں گے۔ اور جس طرح کے طریقے اختیار کرنے سے ہمیں زیادہ نفع مل سکتا ہو، ہم وہی طریقے اختیار کریں گے۔ ہم بھی مومن ہیں، لیکن ایمان کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کاروباری معاملات میں مذہب کو داخل کردیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کو صرف پوجا پاٹ تک محدود رکھنا اور زندگی کے تمام معاملات کو یکسر اس سے لاتعلق قرار دے دینا جسے آج سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ یہ آج کی اختراع نہیں، یہ ساڑھے تین ہزار سال پہلے کی سوچ ہے۔ وہ اللہ کو مانتے تھے، اپنے طریقے کے مطابق اس کی عبادت بھی کرتے تھے لیکن گھر کی چاردیواری سے باہر یا عبادت گاہ سے باہر وہ مذہب کو دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

آیت کے آخری حصے میں حضرت شعیب پر طنز کیا گیا ہے کہ تم جس متحکم لہجے میں ہمارے طور اطوار پر تنقید کرتے ہو اور ہمارے معمولات کو غلط قرار دیتے ہو اس کا مطلب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ہی ایک دانش مند ہو جسے عقل کی بات سوجھتی ہے اور تم ہی رشد و ہدایت کے مالک ہو۔

رہی یہ بات کہ قوم شعیب نے بطورِ خاص نماز کا حوالہ دے کر تنقید کیوں کی؟ تفہیم القرآن کا نوٹ اس حوالے سے قابلِ توجہ ہے:

یہ دراصل ایک طعن آمیز فقرہ ہے جس کی روح آج بھی آپ ہر اس سوسائٹی میں موجود پائیں گے جو خوفِ خدا سے غافل اور فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی ہے چونکہ نماز دینداری کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ نمایاں مظہر ہے اور دینداری کو فاسق و فاجر لوگ ایک خطرناک بلکہ سب سے زیادہ خطرناک مرض سمجھتے ہیں، اس لئے نماز ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں عبادت کے بجائے علامتِ مرض شمار ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اپنے درمیان نماز پڑھتے دیکھ کر انہیں فوراً یہ احساس ہوجاتا ہے کہ اس شخص پر "مرضِ دینداری" کا حملہ ہوگیا ہے، پھر یہ لوگ دینداری کی اس خاصیت کو بھی جانتے ہیں کہ یہ چیز جس شخص کے اندر پیدا ہوجاتی ہے وہ صرف اپنے حسنِ عمل پر قانع نہیں رہتا بلکہ دوسروں کو بھی درست کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بے دینی و بداخلاقی پر تنقید کئے بغیر اس سے رہا نہیں جاتا۔ اس لئے نماز پر ان کا اضطراب صرف اسی حیثیت سے نہیں ہوتا کہ ان کے ایک بھائی پر دینداری کا دورہ پڑ گیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ کھٹکا بھی لگ جاتا ہے کہ اب عنقریب اخلاق و دیانت کا وعظ شروع ہونے والا ہے اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں کیڑے نکالنے کا ایک لامتناہی سلسلہ چھڑا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی سوسائٹی میں نماز سب سے بڑھ کر طعن و تشنیع کا ہدف بنتی ہے اور اگر کہیں نمازی آدمی ٹھیک ٹھیک انہی اندیشوں کے مطابق جو اس کی نماز سے پہلے ہی پیدا ہوچکے تھے برائیوں پر تنقید اور بھلائیوں کی تلقین بھی شروع کردے تب تو نماز اس طرح کوسی جاتی ہے کہ گویا یہ ساری بلا اسی کی لائی ہوئی ہے۔

Marfat.com

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾

(حضرت شعیب نے کہا، اے میری قوم! تمہارا کیا خیال ہے اگر میں اپنے رب کی طرف سے روشن دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے عمدہ روزی بھی عطا کی۔ ہے اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس امر میں تمہاری مخالفت کروں جس سے میں تمہیں روکتا ہوں۔ میں تو صرف تمہاری اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرا بس ہے۔ اور نہیں ہے میرا راہ پانا مگر اللہ تعالیٰ کی امداد سے۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔) (سورۃ ہود: ۸۸)

بینۃ اور رزق حسن کا مفہوم

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ہم نے پڑھا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے ان پر طنز کرتے ہوئے نماز کا طعنہ دیا تھا۔ ان کا گمان یہ تھا کہ نمازی لوگ سیدھے سادھے، صوفی صافی اور دنیا سے بے خبر ہوتے ہیں۔ انہیں یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ دنیوی معاملات کیسے چلتے ہیں۔ البتہ نماز کی وجہ سے انہیں نیکی کا زعم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو نیک سمجھتے ہوئے دوسروں پر جا و بے جا تنقید کرتے رہتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں حضرت شعیب نے ان کے طنز اور ان کی بے خبری کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں جو میری نماز کھلتی ہے اور تم نے اس کو طنز کا ذریعہ بنالیا ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نماز دراصل ضمیر کی زندگی اور نورِ فطرت کے روشن ہونے کی دلیل ہے، جس شخص کے دل میں روشنی ہے، جس کے اندر اجالا ہے، جس کا ضمیر اسے صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کی یاد سے غافل ہو۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ نماز اللہ کے ذکر کیلئے پڑھی جاتی ہے اور اس کی یاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور وہ پھر بھی نماز نہ پڑھے یہ کیسے ممکن ہے۔ تمہیں میری نماز پر نہیں بلکہ اپنے نورِ فطرت کے بجھ جانے پر ملال ہونا چاہئے۔ اپنے ضمیر کی موت پر فکرمندی ہونی چاہئے۔ رہی یہ بات کہ میں تمہیں کاروبار میں امانت و دیانت کی ترغیب کیوں دیتا ہوں اور ناپ اور تول میں کمی بیشی سے کیوں روکتا ہوں اور مالی معاملات کو جائز طریقوں پر چلانے کی تاکید کیوں کرتا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے تمہاری خوشحالی سے حسد ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تم اپنے کاروبار میں ترقی کرو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کوئی نادار اور قلاش آدمی نہیں ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے رزقِ حسن کی روزی دی ہے۔ مجھے خوشحالی سے نوازا ہے۔ مجھے ایسی دولت دی ہے جس میں حرام کا کوئی پیسہ نہیں اور جو میری آسودگی کا باعث ہے اور میرا کاروبار تمہارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے لیکن میں کاروبار کی ترقی کیلئے تمہاری طرح غلط ذرائع اختیار نہیں کرتا۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ میری ضرورتیں پوری فرما رہا ہے۔

ما ارید ان اخالفکم کا محمل

جو آدمی ضمیر کی زندگی سے زندہ ہو، جس کے اندر فطرت کا نور روشن ہو، جو زندگی کے معاملات میں نہایت صاف ستھرا اور حدود میں محدود رہنے والا ہو اس کے بارے میں یہ کیسے سوچا جاسکتا ہے کہ وہ جن غلط کاموں سے تمہیں روک رہا ہے خود ان کی مخالفت کرے گا۔ جب اس نے تمہارے اندر رہتے ہوئے بھی نبوت سے پہلے بھی غلط طریقہ اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی اور کبھی کسی غلط راستے پر چلتے ہوئے تم نے اسے نہیں دیکھا تو آج جبکہ وہ نبوت کے منصب پر فائز ہے تو وہ ان باتوں میں غلط راستہ کیسے اختیار کرسکتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ کے احکام نازل ہو چکے ہوں اور جن کی وجہ سے وہ تمہیں غلط باتوں سے روکتا ہے۔

پیغمبر کی حیثیت

آپ نے قوم کے سامنے اپنی اصل حیثیت واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ تم مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارا کسی معاملے میں حریف نہیں ہوں۔ میں تمہاری بہتری کا خواہاں تو ہوسکتا ہوں، حاسد نہیں ہوسکتا۔ میری صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں صرف تمہاری اصلاح چاہتا ہوں۔ یعنی تمہارے عقائد اور تمہارے اعمال کو سنوارنا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے تمام معاملات کی درستی چاہتا ہوں اور یہ چاہنا صرف خواہش تک محدود نہیں بلکہ اس کیلئے اللہ نے مجھے جتنی طاقت عطا فرمائی ہے اسے آخری حد تک نچوڑ دینا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے دنیوی رہنماؤں کی طرح اپنی ذات پر بھروسہ نہیں بلکہ اللہ کی ذات پر بھروسہ ہے۔ میں اپنے تمام کاموں اور تمام مقاصد میں اسی سے توفیق مانگتا ہوں۔ اسی کے ہاتھ میں ہر کام کی ابتدا اور انتہا ہے۔ تمام وسائل اسی کے قبضے میں

Marfat.com

ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے، سو ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اور اپنی ناکامیوں یا اپنی ناتوانیوں میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ وہی میری طاقت ہے اور وہی طاقت عطا کرنے والا ہے۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ (سورۃ ھود : ۸۹)

(اور اے میری قوم کہیں میری ضد تمہارے لئے اس امر کا باعث نہ بن جائے کہ تم پر بھی اس طرح کی آفت نازل ہو جس طرح کی آفت قومِ نوح یا قومِ ہود یا قومِ صالح پر نازل ہوئی اور قومِ لوط تو تم سے کچھ دور بھی نہیں۔)

ھدایت کے ردوقبول میں افراد کی ذھنیت

ہدایت کے ردوقبول میں افراد اور اقوام کی ذہنیت ایک جیسی واقع ہوئی ہے۔ جب بھی ان کی ہدایت کیلئے اللہ کا کوئی رسول آیا ہے یا کوئی مصلح ان کی اصلاح کیلئے اٹھا ہے تو یہ شروع شروع میں اس سے بے اعتنائی اختیار کرتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ مخالفت شروع ہوتی ہے اور اس میں شدت آتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے جب داعی سے مخالفت دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر اس کا ہدف داعی کی ذات ہی نہیں رہتی بلکہ دعوت کی ہر بات سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ دعوت دینے والے کی ہر بات کو رد کیا جائے گا بلکہ حتی الامکان اس کا راستہ روکا جائے گا۔ اس کیلئے چاہے اپنا نقصان کیوں نہ کرنا پڑے۔ اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ شاید اس کی دلیل بن سکے کہ جب مسیلمہ کذاب نے نجد کے علاقے میں نبوت کا کھڑاگ رچایا اور بنوتمیم کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا جبکہ بنوتمیم کو قریش سے پرانی دشمنی تھی۔ چنانچہ جب ایک گفتگو میں ایک مسلمان نے بنوتمیم کے ایک ذمہ دار آدمی سے یہ کہا کہ تم سمجھدار لوگ ہو، ہمیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم نے نبی کریم ﷺ کے مقابلے میں مسیلمہ میں آخر ایسی کیا بات دیکھی کہ تم نے اس کو نبی مان لیا۔ تو اس نے جواب دیا کہ مسیلمہ جو کچھ ہے وہ ہم جانتے ہیں، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے نزدیک بنوتمیم کا جھوٹا نبی قریش کے سچے نبی سے بہتر ہے۔ جب ہدایت اور حق کے ردوقبول میں اس طرح کی دشمنیاں حائل ہو جائیں تو پھر حق و ناحق کا فرق اٹھ جاتا ہے اور قومیں تعصبات کا شکار ہو کر صرف اپنی عصبیتوں کی پیروی کرتی ہیں، حق کی پیروی نہیں کرتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم بھی ایسے ہی امراض کا شکار تھی اور اسی طرح کی صورتحال سے دوچار ہو چکی تھی۔ انہیں اس سے غرض نہیں تھی کہ حضرت شعیب جس بات کی طرف بلا رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔ انہیں تو حضرت شعیب کی ہر بات سے ضد تھی۔ ان کے اس رویئے کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت شعیب حقِ نصیحت ادا کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ اے میری قوم! میں تمہیں اپنی دشمنی سے نہیں روکتا لیکن خدا کیلئے میری دشمنی میں اپنی ناک تو نہ کٹوالو۔ اپنے نفع وضرر کے پیمانوں کو تو نہ توڑو۔ تم کھلے دل سے غور کرو کہ میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں، وہ صحیح ہے یا غلط۔ اگر وہ صحیح ہے تو پھر محض میری دشمنی میں اس کو رد کر دینا اپنی قسمت پھوڑنا ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم سے پہلے جن قوموں پر عذاب آیا ہے ان کا رویہ بھی یہی تھا۔ اور بالآخر وہ تباہ ہو گئیں تو کیا تم بھی انہیں کا رویہ اختیار کرنے کے بعد اپنے آپ کو اسی تباہی کی طرف لے جا رہے ہو۔ عقلمندی کی بات یہ ہے کہ جس بات سے کسی نے نقصان اٹھایا ہے اس نقصان دہ بات سے بچا جائے، چاہے وہ بات دشمن ہی کیوں نہ کہہ رہا ہو، پھر میں تو تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں نے خون کے گھونٹ پی پی کر تمہاری اصلاح کی کوشش کی ہے، ہمیشہ تمہارے ساتھ خیر خواہی کا ثبوت دیا ہے۔ اب ایک ایسی واضح بات جسے قبول نہ کر کے قومیں کی قومیں تباہ ہو چکی ہیں تم بھی محض اس لئے اس کو قبول نہیں کر رہے ہو کیونکہ تمہارے دلوں میں میری دشمنی اتر گئی ہے۔ خدا کیلئے اس بات پر غور کرو، قومِ لوط کا انجام تو بہت دور کی بات بھی نہیں۔ ان کا علاقہ کا بھی تم سے دور نہیں۔ دوسروں سے نہیں تو انہیں سے عبرت حاصل کرو۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾ (سورۃ ھود : ۹۰)

(اور اپنے رب سے مغفرت طلب کرو، پھر اسی کی طرف رجوع کرو۔ بیشک میرا رب بڑا مہربان اور بہت پیار کرنے والا ہے۔)

استغفار و توبه کی ترغیب

ایک ایسی قوم جو اللہ کے رسول کی دعوت سے دشمنی کا رشتہ استوار کر چکی ہے۔ وہ رسول کی جان کے درپے ہے اور اس کی دعوت کی ہر بات کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ایسی قوم کے بارے میں انتہائی غیر جانبدار شخص کو بھی اگر فیصلہ کرنے کیلئے بھی کہا جائے تو وہ بھی یقیناً یہی کہے گا کہ ایسی قوم

Marfat.com

کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اللہ کے رسولوں کی صداقت اور ان کے من جانب اللہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہی یہ ہے کہ وہ آخر حد تک کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس میں انسانی جذبات نظر آ رہے ہوں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں دیکھئے قوم دشمنی پر تلی کھڑی ہے لیکن حضرت شعیب اللہ کے حکم سے انہیں استغفار کی دعوت دے رہے ہیں اور نہایت پیار سے ترغیب دے رہے ہیں کہ نادانو! اس سے مغفرت کی طلب کرو جو صرف تمہارا خالق و مالک ہی نہیں بلکہ تمہارا رب بھی ہے۔ تمہارے ظاہری اور باطنی تربیت کے تمام امکانات اسی نے مہیا کئے ہیں۔ اس نے تمہاری زندگی کو کس قدر مطمئن اور آسودہ بنایا ہے اور تمہیں ایسی ایسی نعمتوں سے نوازا ہے جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور پھر وہ ایسا رب ہے کہ بڑے سے بڑے پاپی پر بھی اپنے کرم کے دروازے بند نہیں کرتا۔ اس کی رحمت ہمیشہ پکارتی رہتی ہے اور اس کا درِ مغفرت ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ تم تباہی کی طرف بڑھ رہے ہو، میں تمہارا خیر خواہ ہوں، میں تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرو۔ یعنی آج تک تم نے جیسی کچھ اس کی نافرمانیاں کی ہیں اس کی معافی مانگو اور پھر اس کی طرف پلٹ جاؤ۔ یعنی آئندہ کیلئے عہد کرو کہ تم کوئی ایسا کام نہیں کرو گے جو اسے ناراض کرنے والا ہو۔ اور یہ مت خیال کرو کہ تمہاری گزشتہ سرکشی اور نافرمانی کے باعث وہ تم سے منہ پھیر لے گا یا تمہیں دھتکار دے گا، ایسا ہرگز نہیں، وہ تو رحیم بھی ہے اور ودود بھی ہے۔ بجائے غضب فرمانے کے وہ رحم فرماتا ہے اور بجائے ناراض ہونے کے وہ محبت کرتا ہے۔ جب کوئی روسیاہ شکستہ دل ہو اس کے حضور میں حاضر ہوتا ہے تو بجائے دھتکارنے کے نہایت خوشی کا اظہار فرماتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں حضرت عمر فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیر خوار بچہ چھوٹ گیا تھا اور وہ مامتا کی ماری ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پالیتی اسے چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلانے لگتی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے اس کا حال دیکھ کر ہم سے پوچھا، کیا تم لوگ یہ توقع کر سکتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں آگ میں پھینک دے گی۔ ہم نے عرض کیا، ہرگز نہیں۔ خود پھینکنا تو درکنار وہ آپ گرتا ہو تو یہ اپنی حد تک اسے بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی۔ فرمایا: اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے جو یہ عورت اپنے بچے کیلئے رکھتی ہے۔

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا ۚ وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۫ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ ۝ (سورۃ ھود : ۹۱)

(وہ بولے اے شعیب! ہم نہیں سمجھتے بہت سی باتیں جو تو کہتا ہے، بلاشبہ ہم تجھے دیکھتے ہیں کہ تو ہم میں بہت کمزور ہے۔ اگر تیرے خاندان کا لحاظ نہ ہوتا تو ہم نے تمہیں سنگسار کر دیا ہوتا۔ اور تم ہم پر کوئی بھاری نہیں۔)

بات نہ سمجھنے کا مفہوم

حضرت شعیب علیہ السلام کی تمام تر خیر خواہی اور ہمدردی کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم کے رویئے میں کوئی تبدیلی نہیں آتی بلکہ ان کی دشمنی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ جس قدر محبت اور پیار سے انہیں پکارتے ہیں وہ اسی قدر رعونت اور نفرت سے جواب دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی رعونت کے انداز میں انہوں نے کہا کہ شعیب اپنی دعوت اور اپنا وعظ بند کرو۔ تم جو کچھ کہتے ہو اس میں بیشتر باتیں ہمیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم اتنی عالمانہ باتیں کرتے ہو جو ہم جیسے عامیوں کیلئے ناقابل فہم ہیں۔ حالانکہ حضرت شعیب انہیں میں سے ایک فرد تھے، انہیں کی زبان بولتے تھے اور انہیں کی عادات قبیحہ کی اصلاح فرمانا چاہتے تھے۔ انہیں کے برے افکار اور غلط عقائد پر تنقید کر رہے تھے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ان کے فہم سے بالا تھی اور نہ ان کیلئے اجنبی تھی، لیکن ان کا یہ کہنا کہ ہم تمہاری بیشتر باتوں کو سمجھ نہیں رہے، اس کا مطلب اظہار رعونت کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ہم تمہیں اس قابل نہیں سمجھتے کہ تمہاری باتوں پر غور کر سکیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم کسی اور بستی کا رخ کرو۔

اس کا ایک مفہوم اور بھی ممکن ہے جس میں رعونت بھی ہے اور علمی برتری کا پندار بھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام جب انہیں کاروبار کے معاملے میں دیانت و امانت کے ملحوظ رکھنے، سچ بولنے اور اللہ کے احکام کی پابندی کرنے کا حکم دیتے تو وہ جواب میں یہ کہتے کہ تم نہ جانے کس زمانے کی باتیں کرتے ہو۔ آج اگر کوئی شخص کاروبار کو ترقی دینا چاہتا ہے تو وہ سچ بول کر اور دیانت و امانت کو ملحوظ رکھ کر کبھی نہیں دے سکتا۔ کاروبار میں قدم قدم پر جھوٹ

Marfat.com

بولنا پڑتا ہے۔قدم قدم پر خیانت کرنا پڑتی ہے۔رہے وہ احکام جو حلال وحرام پر مشتمل ہیں تو ان کی پابندی کرنا تو اور بھی مشکل ہے اور آپ کو انہیں باتوں پر اصرار ہے اور ساتھ ہی آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ آپ کے کاروبار میں ترقی بھی دے گا تو یہ باتیں ہماری سمجھ سے بالا ہیں۔ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ کاروبار بغیر جھوٹ بولے اور بغیر خیانت کئے اور بغیر دنیا کے ساتھ چلے ممکن نہیں۔اور آپ اس کے بالکل برعکس ہمیں چلانا چاہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم آپ کی باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں،لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت سے رکنے والے نہیں اور آپ کو اپنی باتوں پر اس حد تک یقین ہے کہ آپ کسی اور بات کو خاطر میں نہیں لاتے۔اس لئے ہمارے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم سختی سے کام لیں اور آپ سے صاف صاف کہہ دیں کہ تم ہمارے لئے کمزور آدمی ہو۔تم قوت سے اپنی بات کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔البتہ ایک تشویش ضرور پیدا کر سکتے ہو۔اس کا علاج اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم تمہاری زبان بند کر دیں۔ابھی تک تمہارے کنبے کا لحاظ ہمیں روکے ہوئے ہے ورنہ تمہیں قتل کر دینا ہمارے لئے کوئی گراں نہیں۔

قوم شعیب نے آخر کار جو رویہ اختیار کیا یہ اس رویہ سے بالکل مختلف نہیں جو قریش آنحضرت ﷺ کے بارے میں اختیار کر چکے تھے۔وہ آپ کی دعوت سے تنگ آ کر آپ کے قتل کے منصوبے باندھنے لگے تھے۔ان کے راستے میں بھی اگر کوئی رکاوٹ تھی تو وہ صرف آپ کا خاندان تھا۔لیکن ابوطالب کی وفات کے بعد اب وہ اپنے منصوبوں پر عمل کرنے میں آسانی محسوس کرنے لگے تھے۔اس لئے انہوں نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔لیکن اللہ نے آپ کو بخیریت تمام وہاں سے نکال لیا۔ان آیات کے نزول سے مشرکینِ مکہ کو ان کے رویئے پر توجہ دلانا بھی مقصود ہے کہ تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو یہ کوئی نئی بات نہیں،اس سے پہلے بھی اللہ کے رسولوں کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔لیکن وہ لوگ کبھی اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور تم بھی اس میں کامیاب نہ ہو سکو گے اور ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کو تسلی بھی ہے کہ یہ لوگ ہزار تدبیریں کریں اللہ تعالیٰ آپؐ کی حفاظت فرمائے گا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ؕ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝

(حضرت شعیب نے فرمایا:اے میری قوم!کیا میرا کنبہ زیادہ بھاری ہے تم پر اللہ تعالیٰ سے،اور اس کو تو تم نے پس پشت ڈال رکھا ہے۔میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔) (سورۃ ہود:۹۲)

نبی کا سہارا خاندان نہیں، خدا ہے

سابقہ آیتِ کریمہ میں جو کچھ قوم نے حضرت شعیب سے کہا وہ انتہائی ناگوار اور ناقابل برداشت تھا۔لیکن حضرت شعیب نے نہ جانے اسے کس طرح برداشت کیا اور نہایت ٹھنڈے انداز میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے میری قوم تم یہ کہتے ہو کہ تم نے آج تک میرے کنبے کی وجہ سے مجھے زندہ رہنے دیا ہے لیکن مجھے اس بات پر حیرت ہے،میں اللہ کا رسول ہوں،میں جو کچھ کہہ رہا ہوں،اس کی جانب سے کہہ رہا ہوں اور جو کچھ کر رہا ہوں،اس کے احکام کی تعمیل میں کر رہا ہوں۔

میں ان کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
میں ان کی محفل سجا رہا ہوں ، چراغ میرا ہے رات ان کی

میرا آقا و مولا بھی وہی ہے اور میرا ملجا و ماویٰ بھی وہی۔میری قوت بھی وہی ہے اور میری پناہ گاہ بھی وہی۔اور تم بھی اس کی قوتوں سے بے خبر نہیں ہو۔لیکن تمہیں اس کا خوف نہیں نہ اس کا لحاظ ہے۔البتہ تمہیں میرے خاندان کا خوف یا لحاظ ہے۔اور اللہ کی ذات کو تم نے ایسے پس پشت ڈال دیا ہے جیسے وہ تمہارے نزدیک ناقابل اعتناء ہے۔کیا تم اس بات سے لاپرواہ ہو گئے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو تمہارے اعمال کو جانتی ہے اور تم اپنے تئیں کچھ بھی سمجھو وہ تمہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔اس کا حلم اور اس کی بے نیازی اگر تمہیں مہلت دے رہی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اس کی ذات کو ناقابل اعتناء سمجھنے لگو۔تم جس انتہا تک پہنچ گئے ہو اس میں شاید نصیحت کا تو کوئی موقع باقی نہیں رہا۔البتہ ایک بات کہی جا سکتی ہے جسے اگلی آیتِ کریمہ میں کہا جا رہا ہے۔

Marfat.com

وَیٰـقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنِّیْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ رَقِیْبٌ ﴿۹۳﴾ (سورۃ ھود : ۹۳)

(اور اے میری قوم تم اپنی جگہ پر عمل کیے جاؤ اور میں اپنی جگہ پر عمل کروں گا۔ تم عنقریب جان لو گے کس پر آتا ہے وہ عذاب، جو اسے رسوا کردے گا اور کون جھوٹا ہے اور تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔)

اظہار براءت

اب تم سے صرف یہی ایک آخری بات کہی جاسکتی ہے کہ تمہیں اگر میری کسی بات پر اعتماد نہیں بلکہ ہر بات کو دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے ہو تو پھر تم سے اظہار براءت کرتے ہوئے یہ کہتا ہوں کہ میرے بس میں جو کچھ تھا اس کے کرنے میں، میں نے کوتاہی نہیں کی۔ تبلیغ و دعوت کے جس قدر تقاضے ہو سکتے ہیں، میں نے ایک ایک کے پورا کرنے میں اپنی جان کھپادی، لیکن اب جبکہ تم نے میری نبوت سے انکار کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے اور میری طرف سے اتمام حجت ہو چکا ہے تو اس کے بعد مجھ پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ میں نے ہر نیک و بد تم پر واضح کردیا ہے، اب اگر تم اپنی ڈگر پر قائم رہنا چاہتے ہو تو شوق سے اپنے راستے پر چلتے رہو، جو تمہارے معمولات ہیں انہیں جاری رکھو اور میں اپنے معمولات کو جاری رکھوں گا۔ اِنِّیْ عَامِلٌ کے بعد عَلٰی مَكَانَتِیْ محذوف ہے اور سابقہ جملہ اس پر قرینہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اگر اپنی سرکشی سے باز آنے والے نہیں تو میں بھی اپنی تبلیغ و دعوت کے فریضہ کی ادائیگی سے رکنے والا نہیں، لیکن یہ میں یہ واضح کرتا ہوں کہ اب میں معاملہ اللہ کے سپرد کرچکا ہوں۔ اب اس کے بعد صرف عذاب آئے گا اور کسی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ عذاب کب آتا ہے، میں کوئی عالم الغیب نہیں کہ تمہیں ٹھیک اس کا وقت بتاسکوں۔ البتہ یہ ضرور جانتا ہوں کہ تمہارے اندر وہ تمام علامات پیدا ہو چکی ہیں جس کے بعد عذاب آجایا کرتا ہے۔ اس لئے اب تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں کہ اللہ ہم دونوں میں کیا فیصلہ کرتا ہے کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنا رسول بھیج کر جب کسی قوم پر اتمام حجت کردیتا ہے تو پھر اس قوم کا فیصلہ چکا دیتا ہے۔ اب تمہارا بھی فیصلہ چکانے کا وقت آگیا ہے۔ البتہ وہ فیصلہ کب آتا ہے اس کیلئے انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ عنقریب تم دیکھ لوگے کہ اللہ کی طرف سے ایک عذاب آئے گا جو سچے اور جھوٹے میں فیصلہ کردے گا۔ جو اس عذاب کا نشانہ بنے گا وہ جھوٹا ہوگا۔ اور جو اس سے بچ جائے گا تو وہ سچا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسے اپنی حفاظت میں لے لیں گے۔ اب جبکہ کوئی دلیل اور کوئی حجت ہمارے درمیان فیصلہ کن نہیں رہی تو اس عذاب سے اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائیں گے، لیکن اس فیصلے کے نتیجے میں ان لوگوں کو زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا جنہوں نے اپنے کفر پر اصرار جاری رکھا۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا شُعَیْبًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۹۴﴾ كَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾ (سورۃ ھود : ۹۴،۹۵)

(اور جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے بچالیا شعیب کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے تھے، آپ کے ساتھ، اپنی خاص رحمت سے۔ اور پکڑلیا ظالموں کو خوفناک کڑک نے، تو انہوں نے صبح کی اپنے گھروں میں اس حال میں کہ وہ اوندھے منہ گرے ہوئے تھے۔ گویا وہ کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے، خبردار دوری ہے مدین کیلئے جیسے دوری ہے ثمود کیلئے۔)

قوم شعیب پر عذاب

حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کو جس عذاب کے انتظار کیلئے کہا تھا آخر وہ عذاب آگیا اور وہ اس طرح آیا کہ ایک کڑک اور دھماکے نے ان کے جگر پاش پاش کردیئے اور قرآن کریم کی دوسری تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر ان پر زلزلہ بھی آیا اور آسمان پر اس طرح گھٹا تل کے آئی جس سے ان پر پتھر برسائے گئے۔ وہ آواز ہی کے دھماکے سے اوندھے منہ اپنے گھروں میں گر گئے اور عذاب کی تکمیل کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان گھروں میں کبھی کوئی آباد نہیں رہا تھا اور یہ ایک ویرانہ تھا جس میں کبھی کوئی بسنے والا نہیں بسا تھا۔ پھر اس کے بعد دنیا والوں کو سنا کے فرمایا: کہ لوگو! اچھی طرح سن لو، کہ مدین کیلئے دوری اور ہلاکت ہو جس طرح ثمود کیلئے ہو۔ یعنی یہ وہ قومیں ہیں جو ہمیشہ کیلئے اللہ کی رحمت سے دھتکار دی گئیں۔

Marfat.com

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٦﴾ اِلٰى
فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ
بِرَشِيْدٍ ﴿٩٧﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ
الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿٩٨﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ
الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿٩٩﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا
قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿١٠٠﴾ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَمَاۤ
اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ
شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿١٠١﴾ وَكَذٰلِكَ
اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ
شَدِيْدٌ ﴿١٠٢﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ
يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿١٠٣﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهٗۤ اِلَّا
لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ
شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ﴿١٠٥﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ
وَّشَهِيْقٌ ﴿١٠٦﴾ ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا
مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٠٧﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا

Marfat.com

فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا
مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿١٠٨﴾ فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ
هٰٓؤُلَآءِ ؕ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا
لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿١٠٩﴾ ع

(ہم نے بھیجا موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی آیات اور ایک روشن نشانی کے ساتھ رسول بنا کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، تو انہوں نے فرعون ہی کی بات مانی، حالانکہ فرعون کی بات راست نہ تھی۔ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ میں لے جا اتارے گا اور کیا ہی برا گھاٹ ہوگا جہاں انہیں اتارا جائے گا۔ اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں لعنت۔ اور قیامت کے دن بھی۔ کیا ہی بُرا عطیہ ہے جو انہیں دیا گیا ہے۔ یہ ان بستیوں کی کچھ سرگزشتیں ہیں جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو قائم ہیں اور کچھ کی فصل کٹ گئی۔ اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر زیادتی کی تو ان کے وہ دیوتا جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے جب تیرے رب کا عذاب آیا تو ان کے کچھ بھی کام نہ آیا۔ ان کے دیوتاؤں نے ان کی بربادی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا۔ اور اسی طرح ہوتی ہے تیرے رب کی پکڑ جبکہ وہ بستیوں کو ان کے ظلم میں پکڑتا ہے۔ بیشک اس کی پکڑ بڑی ہی دردناک اور سخت ہے۔ بیشک اس میں ان لوگوں کیلئے بڑی نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہوگا جس میں سب لوگ اکٹھے کئے جائیں گے اور وہ ایسا دن ہوگا جب سب کو حاضر کیا جائے گا۔ ہم اس کو ٹال رہے ہیں بس ایک گنتی کی مدت کیلئے۔ جب وہ دن آئے گا کوئی جان اس کے اذن کے بغیر کلام نہ کر سکے گی، پس ان میں کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔ پس رہے وہ لوگ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے۔ ان کیلئے اس آگ میں چیخنا ہے اور پھنکارنا ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہے۔ مگر جو چاہے آپ کا پروردگار۔ بیشک آپ کا رب کر گزرنے والا ہے اس کا جس کا ارادہ کرتا ہے۔ اور رہے وہ لوگ جو خوش نصیب ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں۔ مگر جو آپ کا رب چاہے، یہ وہ عطا ہے جو ختم نہیں ہوگی۔ پس آپ ان کے باب میں کسی تردد میں نہ پڑیں جن کی یہ لوگ پوجا کر رہے ہیں۔ یہ اسی طرح پوج رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے رہے اور ہم ان کا حصہ ان کو پورا پورا بغیر کسی کمی کے دے کے رہیں گے۔)

Marfat.com

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ﴿۹۷﴾
یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ بِئْسَ
الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾
(سورۃ ھود : ۹۶،۹۷،۹۸،۹۹)

(ہم نے بھیجا موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی آیات اور ایک روشن نشانی کے ساتھ رسول بنا کر فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، تو انہوں نے فرعون ہی کی بات مانی، حالانکہ فرعون کی بات راست نہ تھی۔ وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ میں لے جا اتارے گا اور کیا ہی برا گھاٹ ہوگا جہاں انہیں اتارا جائے گا۔ اور ان کے پیچھے لگا دی گئی اس دنیا میں لعنت۔ اور قیامت کے دن بھی۔ کیا ہی بُرا عطیہ ہے جو انہیں دیا گیا ہے۔

تمھید

متعدد انبیاء اکرام کے حالات بیان کرنے کے بعد اب نہایت اختصار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بیان فرمائی جا رہی ہے۔ یاد ہوگا کہ سورۂ یونس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت تفصیل سے بیان کی گئی تھی اور باقی انبیاء اکرام کی اختصار سے۔ اب اس سورت میں اس کے بالکل برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کی طرف صرف اشارات کیے گئے ہیں اور باقی چند انبیاء کرام کی سرگزشتیں تفصیل سے بیان ہوئی ہیں۔ مقصد اس کے بیان کا وہی ہے جو دیگر انبیاء کرام کی سرگزشتوں کا مقصد ہے۔ مشرکینِ مکہ کو تنبیہ کرنا ہے کہ تم نے اگر اپنا رویہ نہ بدلا اور تم اسی ڈگر پر چلتے رہے جس طرح پہلی معذب قومیں چلتی رہی ہیں تو پھر ان کی سرگزشتوں کے آئینہ میں تمہیں اپنا انجام دیکھ لینا چاہئے اور نبی کریم ﷺ کو یہ تسلی ہے کہ آپ مخالفین کی دشمنی سے پریشان نہ ہوں ہر پیغمبر کے ساتھ اس کی قوم نے ہمیشہ یہی سلوک کیا ہے لیکن آخر کار غلبہ ہمیشہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والوں کو ملتا رہا ہے۔ مشرکینِ مکہ بہت جلد تاریخ کی اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور آپ پر بھی ان شاء اللہ بہت جلد فتح و نصرت کی سحر طلوع ہوگی۔

حضرت موسیٰ و فرعون کی سرگزشت اور سلطان مبین کا مفہوم

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت کا آغاز کرتے ہوئے پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور سلطان مبین کے ساتھ فرعون اور اعیانِ فرعون کی ہدایت کیلئے بھیجا تھا۔ اس میں آیات سے مراد وہ نو نشانیاں ہیں جس کا ذکر سورۃ الاسراء میں آئے گا اور سلطان مبین سے مراد معلوم ہوتا ہے، عصائے موسیٰ ہے۔ یہ وہ عظیم معجزہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے کوہ طور پر نبوت عطا فرماتے ہوئے عطا فرمایا۔ جیسے ہی آپ کوہ طور پر پہنچے اور آپ کو بتایا گیا کہ آپ طور کی پاکیزہ وادی میں پہنچ گئے ہیں۔ سب سے پہلے جوتا اتارنے کا حکم دیا گیا ہے، پھر آپ کو نبوت سے نوازا گیا اور دین کی چند بنیادی حقیقتوں سے آگاہ کیا گیا۔ اس کے بعد اچانک پوچھا کہ موسیٰ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کیا: میری لاٹھی ہے، جس سے میں تھکاوٹ کے وقت ٹیک لگا لیتا ہوں اور بکریاں چراتے ہوئے اس کے ذریعے بکریوں کے چرنے کیلئے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں اور بھی اس سے کئی کام لیتا ہوں۔ ارشاد فرمایا: اسے زمین پر پھینک دو۔ پھینکنے کی دیر تھی کہ وہ ایک اژدھا بن گیا اور دوڑنے لگا، کیونکہ اگر ایسا اژدھا بنتا جو بے حس و حرکت پڑا رہتا تو یہ سمجھا جاتا کہ شاید نظر کا فریب ہے لیکن اسے دوڑتا ہوا دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے۔ ان کیلئے رات کی تاریکی اور پہاڑوں کے سناٹے ایک عجیب تجربہ تھا کہ وہ غیب سے آوازیں سن رہے تھے۔ ایک درخت سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جل رہا ہے لیکن جلنے کے باوجود اس کی سرسبزی میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی۔ اس کی سرسبز شاخیں اور اس کے سبز پتے ویسے ہی آگ میں لہرا رہے تھے۔ ایک عجیب، حیران اور سراسیمہ کر دینے والا منظر تھا۔ اس میں اچانک دیکھا کہ اپنے ہاتھ کی لاٹھی اتنا بڑا سانپ بن گئی ہے۔ آپ ڈر کے بھاگے، آواز آئی کہ موسیٰ پیغمبر ڈرا نہیں کرتے۔ تم اسے پکڑ لو، ہمیں اس کو پہلی حالت میں لوٹا دیں گے۔ چنانچہ آپ نے آگے بڑھ کر اسے ہاتھ لگایا تو وہ پہلی جیسے لاٹھی بن گئی۔ اس معجزے کو سلطان مبین شاید اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ جب ہدایت کی دعوت لے کر فرعون کے دربار میں پہنچے تو اس نے نہایت تند و تلخ باتیں کیں۔ لیکن جب آپ نے اسے بتایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے پوچھا تمہارے پاس اس کی کیا نشانی ہے تو آپ نے سندِ ماموریت کے اظہار کے طور اپنا عصا پھینکا تو وہ اژدھا بن کر دربار میں لہرانے لگا تو پورے دربار پر ایک خوف طاری ہو گیا اور وہ فرعون جو بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہا تھا اور اس کا انگ انگ اظہار تمکنت میں پھڑک رہا تھا، سہم گیا۔

Marfat.com

لوگوں نے اسے تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں یہ سراسر جادوگری ہے، شعبدہ بازی ہے۔ ہم بھی اپنے جادوگروں کو اکٹھا کرتے ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں یہ فن نہایت ترقی یافتہ ہے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اس پر غالب آ جائیں گے، لیکن جب جادوگروں کے ساتھ ایک کھلے مقابلے میں ہزاروں آدمیوں کی نگاہوں کے سامنے اس عصا نے سانپ بن کر جادوگروں کا تمام طلسم توڑ ڈالا اور جادوگر سجدے میں گر گئے تو اب فرعون اور آل فرعون کیلئے اور کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ کسی طرح اس موقع کو ٹال دیں، لیکن وہ دل ہی دل میں اس حد تک مرعوب ہو چکے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سامنا کرنا ان کیلئے آسان نہ رہا۔ اس وجہ سے قرآن کریم نے اسے سلطان مبین یعنی کھلے کھلے غلبے یا حجت غالبہ کے نام سے یاد فرمایا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اعیانِ سلطنت اور قومِ فرعون کے دوسرے سربرآوردہ لوگ جو قوم کو لیڈ کرتے تھے باوجود اس کے کہ وہ اس حقیقت کو پا چکے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام دونوں اللہ کے پیغمبر ہیں، لیکن اربابِ اقتدار کیلئے اقتدار سے الگ ہونا اور ایک فقیر بے نوا کی اقتداء کرنا ناممکن سی بات تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہیں پیغمبر تسلیم کر لیا گیا تو پھر ہر معاملے میں فرمانبرداری ان کی کرنا پڑے گی اور وہ پرتعیش زندگی جس کے وہ عادی تھے اور وہ حاکمانہ وجاہت جو ان کی پہچان تھی اس سے یکسر دستکش ہونا پڑے گا۔ اس لئے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے کی بجائے فرعون اور فرعون کے حکم کی پیروی کی حالانکہ وہ جانتے تھے کہ نہ فرعون راستی پر ہے اور اس کے احکام راستی پر ہیں۔ وہ انسان ہو کر انسانوں سے پوجا کرواتا ہے، محتاج ہو کر اپنے آپ کو رب کہتا ہے۔ اپنے اعیانِ سلطنت اور اپنی قوم کے سوا اس نے سب کو غلام بنا رکھا ہے۔

تیسری آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جس طرح دنیا میں قومِ فرعون نے اس کی پیروی کی اور اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے بالآخر اس کے نتیجے میں وہ بھی بحرِ قلزم میں غرق ہوا اور اس کی قوم کے تمام بڑے بڑے لوگ بھی۔ قیامت کے دن بھی اللہ تعالیٰ ان سے یہی معاملہ کرے گا کہ جب انہیں جہنم کی طرف لے جایا جائے گا تو فرعون اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور وہ اس طرح چل رہا ہوگا جیسے کسی صحرا میں قافلہ بھٹک جائے اور پانی کا ذخیرہ ان کے پاس ختم ہو جائے تو وہ پانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں کہ اس کے بغیر زندگی نہیں بچے گی تو ان کا جو اصل پانی کا کھوج لگانے والا ہوتا ہے وہ سب سے آگے آگے چلتا ہے۔ یہاں بھی فرعون ان کے آگے آگے چلے گا اور انہیں جہنم کی آگ پر لا اتارے گا کیونکہ وہاں جہنم کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کس قدر بُرا ہے وہ گھاٹ جس پر انہیں اتارا گیا۔

قرآنِ کریم کی دوسری تصریحات سے اس منظرنامے پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خیر و شر کے حوالے سے قوموں کے لیڈر وہاں بھی اپنے پیروکاروں کے آگے چلیں گے، لیکن وہ منظر دیکھنے کے قابل ہوگا۔ اگر آگے چلنے والا شر اور گمراہی کا امام ہوگا اور لوگ دیکھیں گے کہ اسی شخص کی غلط قیادت کی وجہ سے ہم اس انجام کو پہنچے ہیں۔ اگر یہ شخص گمراہی میں ہماری قیادت نہ کرتا تو ہم آج یہ دن نہ دیکھتے۔ چنانچہ وہ شخص آگے آگے ان کی قیادت کرتا ہوا جہنم کی طرف بڑھتا جائے گا اور پیچھے چلنے والے مسلسل گالیوں، بددعاؤں اور لعنتوں سے اسے نوازر ہے ہوں گے۔ دنیا ہوتی تو یہ بھی اس کے سامنے زبان نہ کھولتے لیکن آج یہ وہاں ہیں جہاں کوئی کسی کی زبان نہیں پکڑ سکتا۔

لیکن اگر قیادت کرنے والا نیکی کا امام ہوگا اور وہ انہیں جنت کی طرف لے جا رہا ہوگا تو پیچھے چلنے والے مسلسل اس پر تحسین و تبریک کے پھول برسائیں گے اور اس کی ترقی و درجات کیلئے دعائیں مانگیں گے اور ساتھ ہی اس کا شکریہ بھی ادا کریں گے کہ اگر آپ نے اس نیک راستے کی طرف ہماری رہنمائی نہ کی ہوتی تو آج یہ عزت و کرامت ہمیں نصیب نہ ہوتی۔

ورد کا معنی

ورد کا معنی کسی گھاٹ پر پانی پینے پلانے کیلئے اترنے کے بھی ہیں اور گھاٹ کے بھی۔ کیونکہ یہ مصدر اور ظرف دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ ورد اسم ہے اور اس کا مصدر ورود ہے۔ ورد اس پانی کو کہتے ہیں جس کا قصد کیا گیا ہو۔ مآل سب کا ایک ہے کہ فرعون نے اپنی قوم کو جس پانی پر اتارا یا جس گھاٹ پر اتارا اس سے بدتر گھاٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

اور چوتھی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ فرعون اور قومِ فرعون ایسے بدنصیب ہیں کہ دنیا میں بھی ہمیشہ ان پر لعنت کی گئی۔ ان کے مرنے کے بعد جس نے بھی انہیں یاد کیا، لعنت سے یاد کیا اور قیامت میں بھی ان پر لعنت کی پھٹکار ہوگی۔ اربابِ حکومت چونکہ انعامات اور عطیات سے ہمیشہ واسطہ رکھتے ہیں۔ دیتے بھی ہیں اور لیتے بھی ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا کہ کیسا بُرا ہے وہ انعام یا وہ عطیہ جو انہیں دیا گیا۔ دنیا میں بحرِ قلزم میں غرق کر دیا گیا اور آخرت میں جہنم ان کا مقدر ٹھہرا۔

Marfat.com

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾
(سورۃ ھود : ۱۰۰)
(یہ ان بستیوں کی کچھ سرگزشتیں ہیں جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو قائم ہیں اور کچھ کی فصل کٹ گئی۔)

گزشتہ سرگزشتوں کی طرف اشارہ

یہاں سے وہ آیات شروع ہو رہی ہیں جو خاتمہ سورہ کی آیات ہیں۔ گزشتہ آیات میں جتنے انبیاء اکرام کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں پیش نظر آیات میں ان پر تبصرہ ہے جس میں ان حقائق کو نمایاں کرنا ہے جو ان سرگزشتوں کے بیان کرنے کا مقصد ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ فرمائی کہ جن بستیوں کے حالات ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں آپ غور کیجئے ان میں سے کچھ تو ابھی تک کھڑی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جن کے نشانات تک مٹ گئے ہیں۔ مثلاً فرعون اور قوم فرعون پر اللہ کا عذاب آیا تو فرعون اور اس کے اعیانِ قوم کو تباہ کر دیا گیا، لیکن مصر کی ریاست اور اس کے شہر باقی رہے۔ مکین ختم ہو گئے، مکان کھڑے رہے۔ قوم لوط اپنے مکانوں سمیت تباہ کر دی گئی۔ قوم ثمود اور قوم مدین کے بعض کھنڈرات ابھی تک باقی ہیں۔ ان کے بعض زمینی آثار بھی موجود ہیں اور ان کے وہ مکانات بھی جو انہوں نے پہاڑ کھود کے بنائے تھے۔ اور یہ تمام کھنڈرات اپنے مکینوں کی داستانِ عبرت سنانے کیلئے باقی ہیں۔ قریش کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم اسی روش پر چل رہے ہو جس کے نتیجے میں محولہ بالا قومیں تباہ ہوئیں۔ اگر تم نے اس سے توبہ نہ کی اور اپنا رویہ نہ بدلا تو پھر یاد رکھو تمہیں بھی اپنا نام ان دونوں قسم کی قوموں میں سے کسی ایک کے ساتھ لکھوانا پڑے گا۔ یعنی تمہیں مٹا دیا جائے گا اور تمہارے مکان باقی رہیں گے اور یا تمہیں مکانوں سمیت تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِىْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾
(سورۃ ھود : ۱۰۱)
(اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنی جانوں پر زیادتی کی تو ان کے وہ دیوتا جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے تھے جب تیرے رب کا عذاب آیا تو ان کے کچھ بھی کام نہ آیا۔ ان کے دیوتاؤں نے ان کی بربادی کے سوا کسی چیز میں اضافہ نہیں کیا)

اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا

قوموں کی ہلاکت اور بربادی کے واقعات پڑھ کر یا سن کر آدمی سوچنے لگتا ہے کہ قوموں کو تباہ کر دینا بہت بڑا ظلم ہے۔ پروردگار یہ کیسے پسند فرماتا ہے کہ اس کی زمین پر لاشوں کے ڈھیر لگے ہوں۔ اس کی ذات تو نہایت رحیم و کریم ہے۔ وہ خود فرماتا ہے کہ میری نگاہ میں ظلم نہایت ناپسندیدہ ہے۔ میں نے کسی پر کبھی ظلم نہیں کیا۔ تم جن بستیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اپنے مکینوں سمیت تباہ ہو گئیں وہ اللہ کے ظلم کی وجہ سے نہیں بلکہ لوگوں نے اپنی جانوں پر خود ظلم کیا۔ اس کے نتیجے میں ان پر عذاب آیا۔ اللہ نے اپنے رسول بھیج کر ان پر یہ بات واضح کر دی کہ تمہارے سامنے دو راستے ہیں، ایک عافیت اور کامیابی وکامرانی کا راستہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ تم اپنے خالق و مالک کی مرضی کے مطابق اس کی خوشنودی کے حصول کیلئے زندگی گزارو۔ اسی کو اپنا الٰہ سمجھو، اسی کے سامنے سر جھکاؤ، اسی کی غیر مشروط اطاعت کرو۔ اس کے نتیجے میں تمہیں دنیوی کامیابیاں بھی نصیب ہوں گی اور اخروی کامرانیاں بھی۔ اور دوسرا راستہ ہے ہلاکت و تباہی کا۔ اگر تم اللہ کی فرمانبرداری کی بجائے شیطان یا اپنے نفس کی پیروی کرو، اس کے رسولوں پر ایمان لانے کی بجائے طاغوت پر ایمان لاؤ، اسی کے سامنے سر جھکانے اور اسی کو معبود سمجھنے کی بجائے اوروں کو اس کا شریک بناؤ اور خواہش نفس کے نتیجے میں بداخلاقیوں کو اپنا شعار بنالو، تو یہ وہ راستہ ہے جو بالآخر ہلاکت اور تباہی پر منتج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح رحیم و کریم ہے اور اس کی رحمت تمام مخلوقات کو زندگی بخشتی ہے اور زندگی کی بقا کا سامان کرتی ہے اور اس کی ربوبیت تمام مخلوقات کی تربیت کے اسباب فراہم کرتی ہے۔ اسی طرح وہ عادل بھی ہے۔ وہ جب دیکھتا ہے کہ میری مکلف مخلوق جن میں جن وانس شامل ہیں وہ میری نعمتوں سے تو شادکام ہوتے ہیں، میرے احسانات سے بہرہ ور ہوتے ہیں اور میری رحمتوں کے مزے لوٹتے ہیں، لیکن میری حاکمیت، میری الوہیت، میری وحدانیت اور میری بندگی سے انکار کرتے ہیں اور انہوں نے نہ جانے کتنی دیویوں اور دیوتاؤں کو میرا شریک بنا رکھا

Marfat.com

ہے، پھر وہ اپنے رسول بھیج کر لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ انہیں سمجھنے کیلئے مہلت دیتا ہے لیکن جب وہ اپنی ہٹ پر قائم رہتے ہیں تو آخر اس کی صفتِ عدل حرکت میں آتی ہے تو یہ لوگ جنہوں نے اس کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہے اور گلشنِ ہستی کو اپنی بداعمالیوں کے جھاڑ جھنکار سے ویرانے میں تبدیل کر دیا ہے۔ انہیں تباہ کر کے ازسرِنو اس ویرانے کو گلشن میں تبدیل کرتا ہے۔ تو یہ تباہی و بربادی ان لوگوں کی نافرمانی اور ان کی سرکشی کے نتیجے میں ان پر مسلط ہوتی ہے اور اس کا سبب وہ خود بنتے ہیں اور یہی وہ ظلم ہے جو وہ اپنے اوپر کرتے ہیں، اللہ ان پر ظلم نہیں کرتا۔

گمراہی کا عمومی سبب

آیت کے دوسرے حصے میں قوموں کے بگاڑ کا ایک عمومی سبب بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ کم ہوتے ہیں جنہیں سرے سے اس بات کا احساس ہی نہ ہو کہ اگر قیامت کے دن اللہ کے سامنے حاضری ہوئی اور وہاں اپنی زندگی کے اعمال کے بارے میں جوابدہی کرنا پڑی تو ہم کیا کریں گے۔ ہر شخص کے دل میں یہ خواہش موجود رہتی ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ رہوں۔ اس سے بچنے کا ایک راستہ تو وہ ہے جو پیغمبر لوگوں کو بتاتے ہیں لیکن وہ راستہ چونکہ کٹھن ہے، اس میں قدم قدم پر آزمائشیں ہیں، خواہش نفس کی مخالفت ہے اور ایک خاص دائرے میں رہ کر زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ اسی مشکل کو محسوس کرتے ہوئے کچھ لوگ ادھر ادھر دیکھنے لگتے ہیں، شیطان ایسے ہی موقعوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ان لوگوں کیلئے شارٹ کٹ تجویز کرتا ہے اور ان کے ذہن میں یہ بات ڈالتا ہے کہ تمہیں قیامت یا جوابدہی سے ہراساں نہیں ہونا چاہئے۔ اولاً تو یہ ساری باتیں ہی باتیں ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں، لیکن اگر حقیقت ہو بھی تو تم ان قوتوں سے اپنا رشتہ جوڑو جو اللہ سے قریبی رشتہ رکھتی ہیں۔ ان کی بندگی بجا لاؤ، ان کیلئے قربانیاں کرو اور جب ضرورت پڑے انہیں سے استمداد کرو۔ انہیں اللہ نے اپنی صفات اور اپنے اختیارات میں شریک کر رکھا ہے اور وہی اس کائنات کا نظام چلا رہے ہیں۔ قیامت کے دن یہی لوگ تمہاری شفاعت کریں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے تمہیں کسی طرح کا تردد نہیں کرنا چاہئے۔ شفاعت کا یہ وہ غلط تصور ہے جس نے قوموں کی قومیں برباد کی ہیں۔ جب کوئی شخص یہ یقین کر لیتا ہے کہ میں جن قوتوں کو اللہ کے مقابلے میں پکارتا ہوں وہ مجھے اللہ سے چھڑا سکتی ہیں۔ میں نے جن کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے رکھا ہے اور جن کا میں نے دامن تھام رکھا ہے وہ میری شفاعت کریں گی۔ تو ایسے شخص کو پھر کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر عمل کرے یا کسی بھی معاملے میں اللہ سے ڈر کر صحیح راستہ اختیار کرنے کی کوشش کرے۔ شفاعت کا غلط تصور اور قیامت کے حقیقی تصور میں بُعد المشرقین ہے۔ قیامت تو اس لئے آئے گی تا کہ ان لوگوں کو جزاء دی جائے اور اچھے بدلے سے نوازا جائے جنہوں نے اللہ کی فرمانبرداری میں زندگی گزاری اور اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے ہر قربانی دی۔ حتیٰ کہ اگر اس راہ میں جان بھی قربان کرنا پڑی تو اس سے بھی دریغ نہ کیا۔ اگر اس کے مقابلے میں یہ تصور قبول کر لیا جائے کہ زندگی جیسے چاہو خواہشِ نفس کی پیروی میں گزارو، جیسے چاہو داد عیش دیتے رہو، جہاں بس چلے دوسروں کے حقوق چھین لو اور کمزوروں پر ظلم توڑو اور اگر قیامت کے دن کوئی باز پرس ہوئی تو تم جن کے دامن گرفتہ ہو ان کی سفارش تمہاری نجات کا باعث بن جائے گی۔ تمہاری کوئی بدعملی اور نافرمانی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ اندازہ فرمایئے، شفاعت کے اس غلط تصور کے نتیجے میں قیامت کا کیا مفہوم باقی رہ جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں اللہ کی کوئی فرمانبرداری کرے تو کیونکر اور اس کے راستے میں قربانی دے تو کیوں؟ جب کسی نیکی کا کوئی صلہ نہیں اور کسی بُرائی کی کوئی سزا نہیں تو نیکی کی رغبت اور بُرائی سے پرہیز آخر اس کی کیا علت باقی رہ جاتی ہے۔ بگاڑ کے اسی حقیقی سبب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جب ان بگڑی ہوئی قوموں پر ہمارا عذاب آیا تو جن دیوی دیوتاؤں کی شفاعت کے سہارے پر وہ شرک اور نافرمانی کرتے رہے، کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ ان سے تعلق کی وجہ سے قدرت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، لیکن جب اس کی گرفت آئی تو دور دور تک کوئی ان کا مددگار نہ پہنچا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اگر یہ غلط تصور ان کا سہارا نہ بنتا تو شاید وہ ہدایت کی بات قبول کر لیتے اور پیغمبر کی تبلیغ و دعوت کے نتیجے میں سوچنے پر آمادہ ہو جاتے، لیکن شفاعت کے اس غلط تصور نے انہیں بچانے کی بجائے ان کی ہلاکت میں اضافہ کیا۔ اس کے سہارے وہ اپنی ڈگر پر چلتے رہے اور کسی بات کو سننا بھی گوارا نہ کیا۔

Marfat.com

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾ (سورة ھود : ۱۰۲)

(اور اسی طرح ہوتی ہے تیرے رب کی پکڑ جبکہ وہ بستیوں کو ان کے ظلم میں پکڑتا ہے۔ بیشک اس کی پکڑ بڑی ہی دردناک اور سخت ہے)

قریش کو تنبیہہ

گزشتہ چند رکوع میں جن معذب قوموں کی داستان بیان ہوئی ہے اور جیسا ہولناک عذاب ان پر ٹوٹا ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہو‌ئے پروردگار فرما رہا ہے کہ جب قومیں اپنے رب کو بھول جاتی ہیں اور اس کی نافرمانی اور سرکشی پر دلیر ہو جاتی ہیں، اس کی ربوبیت کے فیضان سے پلتی اور پروان چڑھتی ہیں لیکن اسی کی نافرمانی بھی کرتی ہیں تو پھر جب اللہ کی پکڑ آتی ہے تو وہ اس طرح آتی ہے جیسے آپ نے ان قوموں کی تباہی دیکھی ہے۔ کسی کو بحرِ قلزم میں غرق کیا اور کسی پر زلزلہ آیا اور پھر ان پر پتھروں کی بارش ہوئی، کسی کی دھرتی الٹ ڈالی گئی۔ غرضیکہ تباہی کی جتنی بھی بدترین شکلیں ہو سکتی ہیں انہیں ان تمام کا شکار ہونا پڑا اور یہ سب کچھ ان کے ساتھ اس لئے ہوا کہ ان بستیوں کے رہنے والے ظالم تھے۔ یعنی انہوں نے ہر وہ کام کیا جس سے انہیں روکا گیا تھا اور اپنی صلاحیتوں اور اپنے جسم و جان کو ان تمام کاموں میں صرف کیا جس کیلئے انہیں یہ صلاحیتیں اور جسم و جان عطا نہیں کئے گئے تھے۔ اور ان قوموں پر یہ سخت ترین عذاب کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ جب بھی اللہ پکڑتا ہے تو اس کی پکڑ ہمیشہ ایسی ہی دردناک اور شدید ہوتی ہے۔ وہ مہلت ضرور دیتا ہے کیونکہ وہ رحیم و کریم ہے، جلد بازی نہیں کرتا۔ لیکن جب پکڑتا ہے تو پھر نکل جانے اور بچ جانے کا کوئی موقع نہیں ہوتا۔

نہ جا اس کے تحمل پر کہ بے ڈھب ہے گرفت اس کی
ڈر اس کی دیرگیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

مشرکینِ مکہ کو توجہ دلائی جا رہی ہے کہ تم بھی اب اسی میزان میں ہو جس میں باقی قومیں تولی جا چکی ہیں۔ ابھی موقع ہے کہ تلنے سے پہلے اپنے آپ کو درست کر لو، ورنہ اللہ کا عدل بے لاگ ہے جو کچھ دوسری قوموں کے ساتھ ہوا ہے تم اس سے بچ نہیں سکو گے۔

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ﴿۱۰۳﴾

(بیشک اس میں ان لوگوں کیلئے بڑی نشانی ہے جو آخرت کے عذاب سے ڈریں۔ وہ ایک ایسا دن ہو گا جس میں سب لوگ اکٹھے کئے جائیں گے اور وہ ایسا دن ہو گا جب سب کو حاضر کیا جائے گا۔)
(سورۃ ھود:۱۰۳)

آیت کا مفہوم اور آج کی گمراھی

معذب قوموں کے واقعات میں ایک نشانی ہے ان لوگوں کیلئے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ اس میں پہلی بات تو جس کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ جن قوموں پر اللہ کا عذاب آیا ہے اور قرآن کریم مختلف مواقع پر انہیں بیان فرماتا ہے اس سے مقصود محض داستان سرائی نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کیلئے اس میں نشانیاں ہیں جو عذابِ آخرت سے ڈرتے ہیں لیکن جنہیں اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ آخرت بھی کوئی چیز ہے، قیامت بھی آنے والی ہے، اس دن حساب کتاب بھی ہو گا اور اسی کے مطابق جزاء و سزا کا فیصلہ ہو گا، ان کیلئے اس میں کوئی نشانی نہیں بلکہ وہ تو ایسی قوموں کے کھنڈرات پر اس لئے جاتے ہیں تاکہ وہاں تفریح کر سکیں۔ جہاں اللہ کے عذاب کا کوڑا برس چکا ہے ان کے نزدیک وہ تفریح کی جگہ ہے، ان کے کھنڈرات کو دلچسپی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اگر غور و فکر کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ وہاں سے ان معذب قوموں کا کلچر تلاش کیا جا سکے۔ اس طرح سے تاریخ کے مصنوعی فلسفے کی کڑیاں جوڑی جا سکیں اور جب کبھی یہ بحث چھڑتی ہے کہ یہ بستیاں تباہ کیوں ہوئیں اور بستے ہوئے شہر کیسے تباہی کا شکار ہو گئے، قوموں کی قومیں کس طرح موت کی دلدل میں اتر گئیں تو بڑے اطمینان سے یہ جواب دیتے ہیں کہ فلاں علاقے میں زلزلہ آیا، اس میں اتنے لاکھ آدمی مر گئے اور یہ کوئی انہونی بات نہیں، زلزلے آیا ہی کرتے ہیں۔ فلاں زمانے میں فلاں علاقے میں دریاؤں میں طغیانی آئی، بارشوں نے زور باندھا، پانی نے سیلاب کی شکل اختیار کر لی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بستیوں کی بستیاں سیلاب میں بہہ گئیں اور ان کا نام و نشان مٹ گیا اور سیلاب بھی کوئی

Marfat.com

غیر معمولی بات نہیں، مختلف علاقوں میں آتے ہی رہتے ہیں۔ ہر تباہی کے پیچھے ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ طبعی اسباب کام کرتے ہیں جن کی وجہ سے تباہی کا عمل بروئے کار آتا ہے۔ آج کے دانشور انہیں طبعی عوامل کو خود مختار اور فیصلہ کن سمجھتا ہے۔ سیلاب جسے چاہتا ہے بہا کے لے جاتا ہے۔ کائناتی قوتیں جب چاہتی ہیں زمین کے کسی حصے میں زلزلہ بپا کر دیتی ہیں، نہ انہیں کوئی کنٹرول کرنے والا ہے اور نہ یہ کسی کے احکام کی پابند ہیں۔ یہ وہ جاہلانہ تصور ہے جس نے بڑی سے بڑی تباہی سے بھی سبق سیکھنے سے ہمیں محروم کر دیا ہے۔ ہم گمراہ قوموں کی دیکھا دیکھی وہاں کلچر ڈھونڈتے ہیں، عبرت کی تلاش نہیں ہوتی۔ موہنجوڈارو اور ہڑپہ وغیرہ علاقوں میں ہم نے نہ جانے کتنی قوموں کا کلچر تلاش کر ڈالا لیکن یہ کبھی بھول کر بھی خیال نہ آیا کہ آخر یہ آبادیاں تباہ کیوں ہوئیں۔

عبرت کی اک چھٹانک برآمد نہ ہو سکی
کلچر نکل پڑا ہے منوں کے حساب سے

البتہ جو لوگ عذاب آخرت کی فکر رکھتے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں ایک تسلسل کے ساتھ قومیں اٹھتی بھی ہیں اور گرتی بھی ہیں اور جب سے اس زمین پر انسان کی بساط بچھائی گئی ہے یہ عمل جاری ہے اور پھر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ سر اٹھا کر چلنے والی قومیں وہ رہی ہیں جنہوں نے علم و اخلاق کے چراغ روشن کیے۔ جنہوں نے انسانی اور اخلاقی حدود کو پامال کرنے کی بجائے ان کی پاسداری کی۔ البتہ وہ قومیں جنہوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اخلاق کا ایک ایک ٹانکا توڑ ڈالا وہ بالآخر تباہی کا شکار ہوئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات پر طبعی عوامل کی حکومت نہیں ہے بلکہ ایک ایسی ذات کی حکومت ہے، جس کے نزدیک انسانی زندگی کی بقاء، اخلاق کی زندگی کی بقاء سے وابستہ ہے۔ جو قومیں صرف ضروریات زندگی تک اپنی مساعی کو منحصر رکھتی ہیں اور اسی میں ترقی کرتی ہیں اور مقاصدِ زندگی کو فراموش کر دیتی ہیں، وہ آخر کار اللہ کے عذاب کا شکار ہوتی ہیں۔ اگر اس حقیقت کا ادراک ہو جائے تو اس سے یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ اگر اس زمین پر قوموں کی حیات و ممات کا دارومدار اللہ کے احکام کی اطاعت اور اس کے نظامِ زندگی کی پابندی پر ہے اور اسی کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ قوموں کو ڈھیل بھی دیتا ہے اور گرفت بھی کرتا ہے۔ تو یقیناً ایک ایسا دن بھی ضرور آئے گا جب پوری دنیا کے اعمال و افکار کا جائزہ لینے اور قربانیوں اور مظالم پر جزاء و سزا کیلئے سب لوگوں کو اکٹھا کیا جائے گا۔ جب نیکوں کو نیکیوں کا صلہ ملے گا اور بُرے اپنی بُرائیوں کے باعث جہنم کا شکار ہوں گے۔ اور مزید غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح کوئی نیکی ایک دن میں پروان نہیں چڑھ جاتی بلکہ اس پر برسوں محنت ہوتی ہے۔ اسی طرح کوئی برائی بھی اپنی تباہ کن شکل اچانک اختیار نہیں کر لیتی، اس کا ارتقاء بھی وقت لیتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ کسی قوم پر بھی اللہ تعالیٰ کا عذاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک وہ اپنے عقیدے کی خرابیوں، اعمال کی ناہمواریوں اور اخلاق کی بداطواریوں میں مایوس کن حد تک نہیں پہنچ جاتا اور یہ سمجھنے کیلئے کسی بڑی عقل کی ضرورت نہیں کہ کوئی قوم بھی ایسی حالت کو صرف ایک نسل کی فکری ژولیدگی اور رویے کی گمراہی سے نہیں پہنچتی بلکہ اس میں ان سے پہلے گزرنے والی قوموں کا بھی رول ہوتا ہے۔ ابتداء کہیں سے ہوتی ہے اور انتہا کسی نسل پر جا کر رکتی ہے لیکن پکڑی جانے والی نسل آخری ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کی نسلیں جنہوں نے عقیدے اور عمل کی خرابیوں کو پیدا کیا اور پھر سیراب کیا وہ اپنے اپنے وقتوں میں طبعی موت کا شکار ہو کر اللہ کے عذاب سے بچ جاتی ہیں۔ اس پر جب کوئی انسان غور کرتا ہے تو وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ بات تو ظلم سے کم نہیں کہ ایک طرح کی بدعملی اور عقیدے کی خرابی پر ایک نسل کو پکڑا جائے اور دوسری نسلوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اسی کی طرف قرآنِ کریم اشارہ کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ اللہ جیسی عادل ذات سے ظلم کا صدور کبھی نہیں ہوتا۔ اس نے اسی لئے قیامت کے دن کو عدل کا فطری تقاضا قرار دیا ہے تا کہ جن قوموں کو جو عذاب کی مستحق تھیں، عذاب نہیں ہوا، انہیں قیامت کے دن پکڑا جائے گا اور اس دن ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ کس نسل نے کسی خرابی کی نمود و پرداخت میں کتنا حصہ لیا اور وہ عذاب میں بھی بقدر حصہ گرفت میں آئے گا۔

مندرجہ بالا حکمتوں کو جنہیں قرآنِ کریم نے اشاروں میں بیان کیا ہے اگر اپنے ذہن میں بٹھا لیا جائے تو پھر یہ بات سمجھنا مشکل نہیں رہتی کہ ہماری عافیت اسی میں ہے کہ ہم معذب قوموں کے حالات کے آئینہ میں آنے والی قیامت کو دیکھنے کی کوشش کریں۔ اور یہ یقین پیدا کر لیں کہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ہر شخص اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ اللہ کے سامنے ہوگا اور وہ اسی کے مطابق جزاء یا سزا سے گزارا جائے گا۔

Marfat.com

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝١٠٤ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّ سَعِيْدٌ ۝١٠٥

(ہم اس کو ٹال رہے ہیں بس ایک گنتی کی مدت کیلئے۔ جب وہ دن آئے گا کوئی جان اس کے اذن کے بغیر کلام نہ کر سکے گی، پس ان میں کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔) (سورۃ ہود: ۱۰۴،۱۰۵)

قیامت کو دُور مت سمجھو

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ قیامت کو بہت دور سمجھتا ہے۔ اگر اس کے سامنے قیامت کا ذکر بھی کیا جائے تو وہ اسے چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ سمجھتا ہے کہ ابھی معاملہ بہت دور کا ہے، تو جس چیز کا آنا ابھی بہت دور ہے اس کیلئے ابھی سے اپنا عیش مکدر کیوں کیا جائے۔ پروردگار فرمارہا ہے کہ قیامت کو کوئی ایسا دور مت سمجھو، بس ایک گنی چنی سے مدت ہے۔ جس کے بعد قیامت کا آنا یقینی ہے، پھر یہ ایسی مدت بھی نہیں جس میں تاخیر ہو سکے، اس کا وقت مقرر ہے اور اگر اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کو پیشِ نظر رکھا جائے تو پھر تو معاملہ ابھی سے فکرمندی کا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ جو شخص مرگیا اس کی قیامت آ گئی۔ کیونکہ موت کے ساتھ ہی عمل کا موقع ختم ہو جاتا ہے برزخی زندگی انتظار کا وقت ہے، صورِ قیامت کے ساتھ ہی برزخ کا تصور ذہن سے نکل جائے گا۔ لوگ قبروں سے اس طرح اٹھیں گے جیسے ابھی سوئے تھے۔ بعض اٹھنے والے کہیں گے مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا کس نے ہمیں ہماری خوابگاہ سے اٹھایا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو قیامت دور کہاں ہے۔ قیامت کو دور وہی کہہ سکتا ہے جو موت کو دور سمجھتا ہو۔ اور موت کو دور سمجھنا سب سے بڑی خود فریبی ہے۔ موت جس طرح بوڑھوں کو آتی ہے جوانوں اور بچوں کو بھی آتی ہے۔ کسی عمر کے ساتھ مخصوص نہیں، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ چند خوش قسمت لوگ ہوں گے جو اس خود فریبی سے بچ سکے ہوں گے ورنہ ہر شخص موت کو بڑھاپے تک بھی اپنے آپ سے دور سمجھتا ہے حالانکہ زندگی میں آنے والی تبدیلیاں اور مختلف عوارض موت کی یاد دلانے کیلئے ہی آتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی بزرگ نے حضرت عزرائیل علیہ السلام کو خواب میں دیکھا تو ان سے شکایت کی کہ ہر آنے والا ہمیشہ اپنے آنے کی اطلاع دیتا ہے لیکن ایک آپ ہیں کہ اچانک آ دھمکتے ہیں۔ انہوں نے کہا: کہ جتنی اطلاعات میں بھیجتا ہوں، کوئی بھی نہیں بھیجتا۔ جب بخار چڑھتا ہے تو یہ میرا پیغام ہوتا ہے، کوئی اور بیماری آتی ہے تو میرا سندیسہ بن کے آتی ہے، جب داڑھی میں پہلا سفید بال آتا ہے تو وہ میری طرف سے وارننگ ہوتی ہے، میں تو کبھی بلا اطلاع نہیں آتا۔ اس سے اندازہ فرمائیں کہ موت بار بار ہمیں بتا کے دیتی ہے کہ میں زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہوں۔ اس لئے مجھے کبھی اپنے سے دور نہ سمجھو۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہم اسی حقیقت کو خود فریبی کی نظر کر دیتے ہیں۔

قیامت کی ہیبت

دوسری آیتِ کریمہ میں فرمایا کہ تم نہ جانے قیامت کو کیا سمجھتے ہو، اس دن کی ہیبت کا تو عالم یہ ہوگا کہ کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی اس دن زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ بجز اس کے کہ اللہ کسی کو اذنِ گویائی دے۔ قیامت میں سب سے پہلے جو مسئلہ تمام امتوں کیلئے انتہائی تکلیف دہ ہوگا، وہ حساب کتاب کا انتظار ہوگا۔ ہر شخص اپنے پسینے میں ڈوبا ہوا ہوگا اور سورج کی گرمی جلائے دے رہی ہوگی۔ لوگ اپنی ناقابلِ برداشت تکلیف سے مجبور ہو کر اللہ کے رسولوں کے پاس جائیں گے کہ آپ بارگاہِ ایزدی میں التجا کریں کہ حساب شروع ہوتا کہ ہمیں اپنے انجام کی خبر ہو لیکن حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسٰی علیہ السلام تک کوئی بھی اس کیلئے تیار نہیں ہوگا۔ سب نفسی نفسی پکاریں گے۔ آخر میں لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے تو حضورؐ فرماتے ہیں کہ میں اس کیلئے اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاؤں گا۔ اب میں نہیں جانتا کہ اس وقت کن کلمات کے ساتھ میں اللہ کی تعریف کروں گا۔ اسی وقت وہ کلمات میرے دل میں ڈالے جائیں گے۔ میں بار بار اپنے اللہ سے التجا کروں گا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میں کتنی دیر سجدے میں رہوں گا۔ آخر آواز آئے گی، محمد ﷺ اپنا سر اٹھا لو، مانگو، دیا جائے گا۔ اجازت ملنے پر آپ التجا کریں گے، الٰہی تیری مخلوق بہت تکلیف میں ہے۔ ان کا حساب کتاب شروع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ چنانچہ ادھر سے اجازت ہوگی اور حساب شروع ہو جائے گا۔ یہ وہ پہلی شفاعت ہے جو حضورؐ فرمائیں گے اور اسے شفاعت کبریٰ کہا گیا ہے۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ دن کس قدر ہیبت ناک ہوگا۔ حساب کتاب کے نتیجے میں انسانوں کی سب تقسیمیں ختم ہو جائیں گی سوائے دو تقسیموں کے۔ کچھ لوگ وہ ہوں گے جنہیں یہاں سعید کہا گیا ہے، جس کا معنی ہے خوش بخت۔ اور کچھ لوگ وہ

Marfat.com

ہوں گے جنہیں شقی فرمایا گیا ہے، جس کا معنی ہے بد بخت۔ جن کے پاس ایمان و عمل کا سرمایہ ہوگا، وہ سعید اور خوش بخت ہوں گے۔ اور جو ایمان و عمل سے تہی دامن ہوں گے، وہ بد بخت اور شقی ہوں گے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّ شَهِيْقٌ ﴿۱۰۶﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿۱۰۷﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿۱۰۸﴾ (سورۃ ھود : ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸)

(پس رہے وہ لوگ جو بدنصیب ہیں وہ آگ میں ہوں گے۔ ان کیلئے اس آگ میں چیخنا ہے اور پھنکارنا ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم ہے۔ مگر جو چاہے آپ کا پروردگار۔ بیشک آپ کا رب کر گزرنے والا ہے اس کا جس کا ارادہ کرتا ہے۔ اور رہے وہ لوگ جو خوش نصیب ہیں تو وہ جنت میں ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان اور زمین قائم ہیں۔ مگر جو آپ کا رب چاہے، یہ وہ عطا ہے جو ختم نہیں ہوگی۔

انسانوں کی تقسیم

جو لوگ اپنی بداعمالی کے باعث بد بخت ٹھہریں گے یعنی وہ سرے سے ایمان سے ہی تہی دامن ہوں گے اور ان کے اعمال میں سوائے اللہ سے سرکشی کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا تو ان کا انجام جہنم ہوگا۔ جب انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا تو وہاں عذاب کی شدت اور پیاس کی بے تابی کے باعث اس طرح ان کے منہ سے آوازیں نکلیں گی جیسے گدھے کے منہ سے نکلتی ہیں۔ گدھا جب چیختا ہے تو جو سانس وہ باہر کی طرف نکالتا ہے اس کو زفیر کہتے ہیں اور جو سانس اندر کو لے جاتا ہے اس کو شہیق کہتے ہیں یعنی اس بدنصیب کا حال یہ ہوگا کہ سزا کے طور پر آگ میں تو جلنا ہی ہوگا لیکن ساتھ ہی ذلت کا عالم یہ ہوگا کہ گدھوں کی طرح چیخیں اور چلائیں گے اور اس آگ میں وہ اس وقت تک رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں یعنی یہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیونکہ زمین و آسمان سے مراد یہ دنیوی زمین و آسمان نہیں بلکہ وہ زمین و آسمان ہیں جو قیامت کے بعد دوبارہ وجود میں لائے جائیں گے کیونکہ قیامت کے بپا ہونے کے ساتھ ہی زمین بھی ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور آسمان بھی تباہ ہو جائیں گے۔ البتہ ان کی جگہ نئی زمین اور نئے آسمان بنیں گے۔ قرآنِ کریم میں ہے يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ قیامت کے دن زمین و آسمان بدل دیئے جائیں گے۔ زمین پہلی سی زمین نہیں ہوگی اور آسمان پہلا سا آسمان نہیں ہوگا۔ اب یہ دونوں ہمیشہ باقی رہیں گے، کبھی انہیں زوال نہیں آئے گا۔ یہاں یہ جو فرمایا گیا کہ جب تک زمین و آسمان قائم ہیں تو اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح وہ ہمیشہ قائم رہیں گے، اسی طرح اہلِ جہنم ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ اس کے بعد ایک استثنا ہے اِلَّا مَاشَآءَ رَبُّكَ مگر جو چاہے تیرا رب، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام بد بخت یعنی کافر لوگ بھی ہمیشہ جہنم میں نہیں رہیں گے جن کے بارے میں اللہ کچھ اور چاہے گا وہ اس کے مطابق جہنم سے نکال دیئے جائیں گے، مگر اس سے یہ مراد نہیں کیونکہ احادیث میں وضاحت موجود ہے کہ کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ قرآنِ کریم میں بھی ہے وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ، کہ وہ لوگ جہنم سے کبھی نہیں نکلیں گے۔ اس لئے آیت کے اس جملے سے تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس قانون کے ہاتھوں مجبور ہے، اب وہ اگر چاہے بھی تو کسی کافر کو جہنم سے نکال نہیں سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ تیرا رب اگر چاہے تو وہ اس سے مختلف فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنے فیصلے بدلا نہیں کرتا۔ کوئی قانون بھی اس پر لازم نہیں ہوتا۔ البتہ ہر قانون اس کا محتاج ہے۔ اس کی مشیت جو بھی چاہے وہی ہو جائے گا۔ لیکن دوسری تصریحات کے مطابق وہ ایسا چاہے گا نہیں اور آیت کے آخری حصہ میں خود اس کی وضاحت بھی موجود ہے کہ تیرا رب جو چاہے اسے کر گزرنے والا ہے۔ یعنی وہ خود مختار ہے۔ وہ کسی دوسرے کی مرضی کا پابند نہیں۔

اہل جنت کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے گی

تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ رہے وہ لوگ جو خوش بخت ٹھہرے کہ جو ایمان و عمل کی وجہ سے اللہ کے یہاں خوش نصیب ہوں گے انہیں اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں۔ زمین و آسمان قیامت کے بعد چونکہ ہمیشہ قائم رہیں گے اس لئے یہ

Marfat.com

لوگ بھی ہمیشہ رہیں گے۔ البتہ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اہلِ جنت کے حالات اور مدارج میں ہمیشہ یکسانی نہیں رہے گی۔ ان میں جب اللہ کو منظور ہوگا تبدیلی بھی آئے گی۔ لیکن یہ تبدیلی خوب سے خوب تر کی طرف ہوگی کہ جن مقامات پر انہیں فائز کیا جائے گا، وقت کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ لیکن یہ اس وقت ہوگا جب اللہ کی مشیت کو منظور ہوگا۔ آیت کے آخری حصہ میں اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جنت کا جنت میں جانا یہ وہ عطا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تبدیلی کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اہلِ جنت کو جنت سے نکالا جائے گا کیونکہ ان کا جنت میں دخول اللہ کی عطا ہے جس کے انقطاع کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو اس عطا و بخشش میں یقیناً نئے نئے پھول کھلیں گے۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

(سورۃ ھود : ۱۰۹)

(پس آپ ان کے باب میں کسی تردد میں نہ پڑیں جن کی یہ لوگ پوجا کر رہے ہیں۔ یہ اسی طرح پوج رہے ہیں جس طرح ان سے پہلے ان کے باپ دادا پوجتے رہے اور ہم ان کا حصہ ان کو پورا پورا بغیر کسی کمی کے دے کے رہیں گے۔)

عتاب مخالفین پر ہے

اس آیتِ کریمہ میں خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے لیکن روئے سخن مشرکینِ مکہ کی طرف ہے۔ قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ جب پروردگار مشرکین سے انتہائی ناراضی کے طور پر ان سے خطاب کرنا بھی ناگوار محسوس فرماتا ہے تو اس میں خطاب آنحضرت ﷺ سے کیا جاتا ہے۔ یہ بتانے کیلئے کہ تم خطاب کے قابل نہیں رہے۔ لیکن اس میں عتاب کا رخ مشرکین کی طرف ہوتا ہے اور بعض اہلِ علم اس کو یوں سلجھاتے ہیں کہ یہاں خطاب کسی بھی غیر متعین مخاطب سے ہے کہ یہ مشرکین جس طرح اپنے بتوں کو یا اپنے دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اور ہزار سمجھانے کے باوجود بھی وہ اس سے رکتے نظر نہیں آتے تو آپ کو اس سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ لوگ سوچنے سمجھنے والے اور عقل و فکر کے حامل لوگ ہیں۔ اگر غیر اللہ کی پوجا پاٹ میں انہیں کچھ نہ ملتا تو یہ یقیناً اسے چھوڑ دیتے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ جتنا انہیں سمجھایا جاتا ہے وہ اتنا ہی اور زیادہ پختہ ہوتے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیر اللہ کی پوجا پاٹ میں بھی کوئی سچائی تو ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن لوگوں کو تم یہ سمجھتے ہو کہ سوچ سمجھ کر عمل کرنے والے لوگ ہیں، ایسا نہیں بلکہ یہ تو لکیر کے فقیر ہیں۔ اندھی تقلید ان کا شیوہ ہے۔ انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کو جنہیں پوجتے دیکھا ہے، انہیں کو یہ پوج رہے ہیں۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان کے آباؤ اجداد کا کسی کو پوجنا اور پرستش کرنا ان کیلئے قیامت کے دن عذر نہیں بنے گا۔ وہ اپنے کئے کی سزا بھگتیں گے اور یہ اپنے جرائم میں پکڑے جائیں گے۔ ہم ان کا حصہ بھی انہیں پورا پورا دیں گے اور ان کا بھی۔ یعنی کوئی بھی اپنی گمراہی کی سزا سے بچ نہیں سکے گا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ

فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ
وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ
اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ

Marfat.com

وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاۗءَ
ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿١١٣﴾ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ
الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿١١٤﴾
وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١١٥﴾ فَلَوْلَا كَانَ
مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ
فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى
بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ
اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿١١٨﴾ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ
وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ
الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿١١٩﴾ وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ
الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاۗءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ
مَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا
عَلٰي مَكَانَتِكُمْ ۭ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿١٢١﴾ ۙ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٢٢﴾ وَلِلّٰهِ
غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ

Marfat.com

وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

(اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پس اس میں اختلاف کیا گیا۔ اور اگر ایک بات پہلے طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا گیا ہوتا۔ بیشک وہ ایسے شبہ میں مبتلا ہیں جو الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔ اور یقیناً تیرا رب ان سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس سے باخبر ہے۔ پس ثابت قدم رہئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی (ثابت قدم رہیں) جنہوں نے آپ کے ساتھ توبہ کی ہے اور سرکشی نہ کرو۔ بیشک جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اسے خوب دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جنہوں نے ظلم کیا ہے کہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ آ پکڑے اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی حامی نہیں، پھر تمہاری مدد بھی نہیں کی جائے گی۔ اور نماز قائم کیجئے دن کے دونوں سروں پر۔ اور کچھ رات کے حصوں میں۔ بیشک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کیلئے اور صبر کیجئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوبکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ پس کیوں نہ ہوئے تم سے پہلے کی امتوں میں ایسے اہلِ خیر جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے؟ مگر تھوڑے ان میں سے جن کو ہم نے ان میں سے نجات بخشی، اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ اسی عیش میں پڑے رہے جس میں تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔ اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق (ظلم سے) تباہ کر دے حالانکہ اس میں بسنے والے نیکوکار ہوں یا اصلاح میں سرگرم ہوں۔ اور اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا سکتا تھا اور اب تو وہ مختلف طریقوں پر چلتے رہیں گے، بجز ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے اور اسی لئے ان کو اس نے پیدا کیا ہے اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔ اور ہم رسولوں کی سرگزشتوں میں سے ہر ایک تمہیں سنا رہے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور ان میں تمہارے پاس حق آیا ہے اور مومنوں کیلئے ان میں نصیحت اور یاددہانی ہے۔ اور اے پیغمبر کہہ دیجئے ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لا رہے ہیں کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کام کئے جاتے ہیں اور تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں۔ اور اللہ ہی کیلئے آسمانوں اور زمین کا غیب۔ اور وہی تمام امور کا مرجع ہے۔ تو اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو، تیرا رب اس سے بےخبر نہیں۔)

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ (سورۃ ھود: ۱۱۰)

(اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، پس اس میں اختلاف کیا گیا۔ اور اگر ایک بات پہلے طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا گیا ہوتا۔ بیشک وہ ایسے شبہ میں مبتلا ہیں جو الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

اس آیتِ کریمہ میں تین باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں اور یہ تینوں باتیں جاری سلسلۂ بیان سے مربوط ہیں۔ گزشتہ آیات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

Marfat.com

معاندین اور مخالفین کی بڑھتی ہوئی دشمنی کے حوالے سے تسلی دی جارہی ہے اور مخالفین کو گزشتہ تاریخ کا آئینہ دکھایا جارہا ہے تا کہ وہ اگر اندھے نہیں ہو گئے ہیں تو اپنا انجام دیکھ سکیں۔ اس آیت میں بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ آپ اس بات پر کیوں دل گرفتہ ہوتے ہیں کہ آپ کی ایک ایسی دعوت جس میں کوئی پیچیدگی نہیں آپ کی ہر بات عقل اور انصاف کے ترازو میں تلنے کے لائق ہے۔ آپ کی ہر دلیل محکم ہے، آپ کا لب ولہجہ یقین کی خبر دیتا ہے۔ آپ کا کردار یہ کہنے کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ کوئی غلط بات بھی کہہ سکتے ہیں۔ بایں ہمہ مخالفین آپ کی ہر بات میں کیڑے ڈالتے اور مختلف راستے نکالتے ہیں، مختلف باتیں کہتے اور عجیب وغریب تبصرے کرتے ہیں۔ ہر بات میں اختلاف کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ پروردگار تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ان اختلافی باتوں اور مخالفین کے رویئے سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ یہ ایک ایسا رویہ ہے جو ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ جب بھی کسی پیغمبر نے اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے اور ان میں اصلاح کا آغاز کیا ہے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ قوم نے یکسو ہو کر اسے قبول کر لیا ہو۔ قوم کے مختلف طبقات اپنے اپنے فہم کے مطابق اور بقدر ہمت اللہ کے نبی کا راستہ روکنے کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ بہت کم ایسی خوش نصیب قومیں گزری ہیں جو ہدایت سے بہرہ ور ہوئی ہوں ورنہ عموماً رسول کی بعثت کے بعد اس کی برسہا برس کی مساعی جمیلہ کے ناکام ہو جانے کے بعد اتمامِ حجت ہو جاتا ہے اور قوم اللہ کے عذاب کا شکار ہو جاتی ہے۔ جو شخص بھی تاریخ پر نظر رکھتا ہے وہ اس حقیقت کو کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے آپ کو اطمینان رکھنا چاہئے کہ آپ کی تبلیغی مساعی میں بفضلہ تعالیٰ کوئی کمی نہیں، لیکن آپ کی قوم اسی راستے پر بڑھتی جارہی ہے جس راستے پر پہلی قومیں چل کر تباہ ہوئی ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ممکن ہے آپ کی طرف سے اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد ان کا انجام بھی گزشتہ قوموں کی طرح ہو۔ اس لئے آپ کو ہرگز فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رہی یہ بات کہ اگر ان کا رویہ ایسا ہی مایوس کن ہے تو پھر ان پر اللہ کا عذاب کیوں نہیں آجاتا۔ یہ وہ دوسری بات ہے جسے اس آیتِ کریمہ میں نمایاں کیا جارہا ہے۔ نہایت اختصار سے سابقہ تاریخی حقیقت کی طرح اس تاریخی حقیقت کی طرف بھی توجہ دلائی جارہی ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ قوموں کی اصلاح کیلئے رسول بھیجتا اور کتابیں اتارتا ہے اور رسول دنیا میں آکر ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کر لیں اور اس کے غضب سے بچ جائیں لیکن جب قوم کسی طرح بھی راہ راست اختیار نہیں کرتی تو پھر ان پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے لیکن عذاب کے بارے میں اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ اس میں جلد بازی کبھی نہیں کرتا۔ قوموں کو مہلت پہ مہلت دیتا ہے تا کہ اگر وہ بچنا چاہیں تو بچ جائیں۔ ان کے کرتوت دیکھنے والوں کی نگاہ میں اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دن کی مہلت نہ دی جائے بلکہ اللہ کا عذاب آکر ان کو تباہ کر دے لیکن اللہ فرماتا ہے کہ عذاب اپنے وقت سے کبھی پہلے نہیں آتا۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ عذاب کے نزول کا وقت کون سا ہے۔ کیونکہ کسی شخص کے علم میں یہ بات نہیں آسکتی کہ قوم میں قبولیت کی صلاحیت مکمل طور پر کب ختم ہوتی ہے۔ کیونکہ دلوں کے حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اللہ مہلتِ عمل اس لئے دیتا ہے کہ اگر کسی میں تھوڑی بہت بھی قبولیت ایمان کی استعداد باقی ہے تو اسے بروئے کار آنے کا موقع دینا چاہئے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ مکھن کا آخری شمہ بھی نکالا جا چکا ہے اور اب پیچھے لسی کے سوا کچھ نہیں، تب اس کی طرف سے نزول عذاب کا حکم آتا ہے۔ اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنا یہ قانون طے نہ کر چکے ہوتے تو ممکن تھا کہ بہت پہلے ان پر عذاب آچکا ہوتا۔ لیکن اللہ نے چونکہ اپنے اوپر یہ پابندی قبول کر رکھی ہے، اس لئے وقت مقرر آنے سے پہلے وہ کبھی عذاب نازل نہیں فرماتا، اور جب وقت مقرر آجاتا ہے تو پھر ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہوتی۔

تیسری بات اس آیتِ کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ مخالفین ایک ایسے شک میں مبتلا ہیں جو الجھن میں ڈال دینے والا ہے۔ مریب اسمِ صفت ہے۔ اس کا معنی ہے الجھن میں ڈال دینے والا یا بے چین کر دینے والا۔ حقیقت کا علم تو اللہ کو ہے لیکن جو بات بظاہر اس سے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ مخالفین اپنے شک میں بھی یکسو نہیں ہیں۔ انہیں اس بات پر پورا اطمینان نہیں کہ ہم جو رویہ اللہ کے پیغمبر کے بارے میں اختیار کر چکے ہیں وہ سو فیصد صحیح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جب کسی حقیقت کا انکار کرتا ہے تو حقیقت پسندانہ رویہ یہ ہونا چاہئے کہ وہ اس حقیقت کا اچھی طرح جائزہ لے۔ اور اگر وہ اس بارے میں یکسو ہو جائے کہ یہ حقیقت نہیں، محض واہمہ یا فریب ہے تو پھر اسے پوری جرأت سے اس کا انکار کر دینا چاہئے۔ لیکن اگر اس کا یہ حال ہو کہ یا تو وہ اصل حقیقت پر توجہ ہی نہ دے، لوگوں نے مخالفت کا جو ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے یہ ان کی اڑائی ہوئی دھول میں گم ہو جائے۔ اور یا توجہ تو دے لیکن مکمل طور پر اسے سمجھ کر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اور اگر اس کا انکار کرے تو اپنے انکار کے بارے میں یکسو نہ ہو تو ایسا شخص یقیناً دوہرے عذاب میں مبتلا ہوتا ہے۔ ایک حقیقت کا انکار اور دوسرا انکار کے بارے میں شک اور تردد۔ مشرکینِ مکہ بھی ایسی ہی صورتحال سے دوچار معلوم

Marfat.com

ہوتے ہیں کہ جب وہ نبی کریم ﷺ کی دعوت کو سنتے ہیں تو اپنے پشتوں کے عقائد کی مخالفت انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ بجائے غور و فکر کرنے کے اندھی عصبیت اور غیر حقیقت پسندانہ جذباتیت کا شکار ہو کر ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت کو دیکھتے ہیں تو اپنے انکار کے بارے میں انہیں تردد ہونے لگتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جس نے زندگی بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا کیا اب وہ ڈھلتی عمر میں جھوٹ بولے گا۔ جس کی سیرت و کردار میں آج تک کبھی کوئی جھول نہیں پڑا، جس نے کبھی کوئی کمزور بات نہیں کہی، جس نے کبھی معاملات میں خیانت نہیں کی، جس نے کبھی کسی کو فریب نہیں دیا، آخر وہ اپنی قوم کو اتنا بڑا فریب کیسے دے سکتا ہے۔ پھر وہ مزید دیکھتے ہیں کہ وہ ہماری ہی طرح کا ایک اُمی عرب ہے جسے کہیں سے علم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، اس کے پاس معلومات کا وہی ذخیرہ ہے اور وہی ذرائع ہیں جو ہر عرب کے پاس ہیں۔ بایں ہمہ وہ باتیں وہ کہتا اور ان حقائق کو بیان کرتا ہے جس سے بڑے سے بڑا صاحبِ علم بے بہرہ ہے۔ اس نے ان تاریخی حقائق کو صحت کا لباس پہنایا ہے جن میں دنیا آج تک ٹھوکریں کھا رہی تھی۔ اس نے اشاروں میں ایسی گتھیاں سلجھا دی ہیں جو انسانوں کیلئے لاینحل بنی ہوئی تھیں تو وہ سوچنے لگتے ہیں کہ آخر ایسے حقائق کی خبر اس کو کون دیتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ انکار پر اس لئے قائم ہیں کہ خاندانی عصبیت سے وہ الگ نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہی انکار ان کے شک و تردد میں بار بار الجھن بھی پیدا کرتا ہے کہ تمہارے انکار کی کوئی دلیل بھی تو ہونی چاہئے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ تم اس لئے پیغمبر اور اس کی دعوت کی صداقت کے بارے میں شک کر رہے ہو کہ تمہارا قبیلہ مان کے نہیں دے رہا۔

وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾ (سورۃ ھود : ۱۱۱)

(اور یقیناً تیرا رب ان سب کو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ بیشک اللہ تعالیٰ جو کچھ یہ کر رہے ہیں اس سے باخبر ہے۔)

لَمَّا کی تحقیق

آیت کی تشریح سے پہلے "لَمَّا" کی تحقیق! بعض قراء نے اسے بغیر تشدید کے پڑھا ہے اور بعض نے تشدید کے ساتھ۔ پھر الگ الگ اس کی تعلیل اور توجیہ کی ہے، لیکن ہم تفصیل سے بچتے ہوئے صرف اتنا عرض کرتے ہیں کہ "لَمَّا" میں "لام" تاکید اور قسم کیلئے ہے اور "مَا" زائد ہے۔ عربی زبان میں بعض دفعہ صوتی آہنگ کی درستی کیلئے اس طرح الفاظ کا استعمال عام معمول ہے اور قرآنِ کریم میں بھی مختلف مقامات پر اس طرح الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

مشرکین کو تنبیہ

مشرکینِ مکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ نبی کریم ﷺ کی مخالفت میں جس طرح بے روک ٹوک بگٹٹ بھاگے جا رہے ہیں اور انہیں اپنے انجام کی کوئی فکر نہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ان کا ایک خدا بھی ہے جو ان کے ایک ایک عمل کی خبر رکھتا ہے۔ ان کے ہر عمل کو لکھا جا رہا ہے۔ ان کے کندھوں پر بیٹھے ہوئے فرشتے ان کا نامۂ عمل تیار کر رہے ہیں۔ دنیا میں کسی محفوظ سے محفوظ دفتر میں بھی کوائف اس طرح محفوظ نہیں ہوں گے جیسے فرشتوں کے نوشتوں اور اللہ کے علم میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ہر شخص کو اس کا نامۂ اعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ خود تسلیم کرے گا کہ یہ ایسا نامۂ عمل ہے جس میں کوئی چھوٹی بڑی بات چھوٹنے نہیں پائی۔ اس لئے مشرکین کو آج یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں ان میں سے ہر بات اور ہر عمل کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے اور قیامت کے دن اسی کے مطابق ان سے بازپرس ہوگی۔ آج یہ اپنے آپ کو قوت کی علامت سمجھتے ہیں اور انہیں گمان یہ ہے کہ انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں، لیکن قیامت کے دن ہم پورے اعمال کا حساب لیں گے۔ اور تمام اعمال پر جزاء اور سزا دیں گے۔ آیتِ کریمہ میں اگرچہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم ان کے اعمال پورے کے پورے انہیں دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تحریری شکل اور محفوظ حالت میں ان کے اعمال کا ریکارڈ انہیں دیا جائے گا اور دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اعمال سے پہلے جزاء کا لفظ محذوف ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے تمام اعمال کی جزاء و سزا دیں گے جو انہوں نے برسرِ عام یا برسرِ مجلس کئے یا گھروں میں چھپ کر سازشیں کیں یا باہمی مشاورت گاہوں میں آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف منصوبے باندھے۔ ان میں سے کوئی بھی عمل اس دن بغیر فیصلے کے نہیں رہے گا۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

Marfat.com

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۲﴾ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ (سورۃ ھود : ۱۱۲، ۱۱۳)

(پس ثابت قدم رہئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ بھی (ثابت قدم رہیں) جنہوں نے آپ کے ساتھ توبہ کی ہے اور سرکشی نہ کرو۔ بیشک جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اسے خوب دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جنہوں نے ظلم کیا ہے کہ تمہیں بھی دوزخ کی آگ آ پکڑے اور تمہارے لئے اللہ کے سوا کوئی حامی نہیں، پھر تمہاری مدد بھی نہیں کی جائے گی۔)

جادۂ مستقیم پر استقامت کی ہدایت

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کو استقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ مخالفین کی اذیت رسانیوں کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے منہ زور اور خونخوار دشمنوں کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ نہ ان کی زبانوں پر کوئی روک ہے، نہ ان کی آنکھوں میں حیا ہے، نہ ان کے دلوں میں کوئی لحاظ و مروت ہے۔ وہ تمام رشتوں کو بھول کر دشمنی پر کمر ہمت باندھ چکے ہیں۔ غریب صحابہ کو بطور خاص نشانہ بنایا جا رہا ہے اور تپتی ہوئی ریت پر انہیں گھسیٹا جاتا ہے اور کبھی دہکتے انگاروں پر لٹایا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں جبکہ مقابلے کی کوئی صورت ممکن نہ ہو اور برداشت کرنا بھی آسان نہ ہو۔ ایسے حالات میں استقامت کا حکم دینا بجائے خود بہت بڑا امتحان ہے۔ اللہ کے آخری نبی جو اللہ کے حبیب بھی ہیں اور بے انتہا نعمتوں کے مالک بھی۔ سب سے پہلے انہیں حکم دیا جا رہا ہے اور اس میں اتنی کی بھی نہیں چھوڑی جا رہی کہ آپ حالات کو دیکھ کر اپنا رویہ متعین کریں بلکہ صاف فرمایا جا رہا ہے کہ جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہونی چاہئے بلکہ اسی راستے پر چلتے رہنا، انہیں مقامات پر کھڑے رہنا اور اپنے عقائد میں کوئی اضمحلال پیدا نہ ہونے دینا اور کسی طرح کا کوئی سمجھوتہ کرنے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ یہ سب باتیں استقامت کے برعکس ہیں۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے مختصر الفاظ میں نہایت خوبصورتی سے اس کا مفہوم واضح فرمایا ہے۔ آپ نے کہا! اَلِاسْتِقَامَۃُ اَنْ تَسْتَقِیْمَ عَلَى الْاَمْرِ وَالنَّھْیِ وَلَا تَرُوْغُ رُوْغَانَ الثَّعْلَبِ کہ استقامت یہ ہے کہ تو اللہ کے اوامر و نواہی پر ثابت قدمی سے عمل پیرا رہے اور لومڑی کی طرح پینترے نہ بدلے۔

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ استقامت کا نمونہ ہیں۔ آپ نے مکی زندگی میں ۱۳ سال اور مدنی زندگی میں ۱۰ سال کفر کے مقابلے میں جس طرح استقامت دکھائی ہے وہ تاریخ کا نہایت قابل فخر کارنامہ ہے۔ آپ کو ایک اکھڑ اور اجڈ قوم سے واسطہ پڑا جو اپنے معتقدات کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتی تھی۔ آپ نے نہ صرف ان کی گمراہیوں پر تنقید کی بلکہ ان کی ایک ایک غلط بات اور غلط عقیدے کو ہدفِ تنقید بنایا۔ ان کی ہر طرح کی مخالفت کو برداشت کیا۔ حتیٰ کہ معاملہ قتل کی منصوبہ بندی تک پہنچ گیا لیکن آپ کے ارادوں میں کبھی ضعف پیدا نہ ہوا۔ صحابہ کرام نے بھی اسی طرح اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرتے ہوئے مشکل سے مشکل مرحلوں کو طے کیا۔ کلمۂ حق کہنے میں انہوں نے کبھی کسی مخالفت یا اذیت کی پرواہ نہ کی۔ انہوں نے زندگی کا ہر دکھ اٹھایا لیکن اعلائے کلمۃ الحق پر کبھی آنچ نہ آنے دی۔

آنحضرت ﷺ کو تو صرف استقامت کا حکم دیا لیکن صحابہ کرام کو اس کے ساتھ ساتھ سرکشی اختیار نہ کرنے کا حکم دیا۔ اس لئے استقامت کا حکم واحد مذکر حاضر کی صورت میں آیا اور صحابہ کو اس حکم میں عطف کے ذریعے شامل کیا گیا لیکن سرکشی اختیار نہ کرنے کا حکم جمع کی صورت میں دیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس میں آنحضرت ﷺ شریک نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو سرکشی کی اجازت ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ نے آپ کو معصوم پیدا فرمایا۔ اس لئے سرکشی کا آپ سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن نئے نئے ایمان لانے والے لوگ جو صحابہ کرام ہی کہلاتے ہیں ان سے اس بات کا اندیشہ ہو سکتا تھا کہ ان میں کبھی کوئی کمزوری پیدا ہو جاتی اور وہ جب حالات کو ناموافق دیکھتے اور اذیتوں کو ناقابل برداشت سمجھتے تو ممکن تھا ان کے اندر نفسانیت سر اٹھا لیتی اور کبھی نہ کبھی سرکشی کی نوبت آ جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی تربیت نے صحابہ میں وہ کردار پیدا فرما دیا تھا اور ان کے دلوں میں انقیاد اور اطاعت کا وہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا جس کے بعد سرکشی تو کیا نافرمانی کو بھی جگہ نہیں مل سکتی تھی۔ لیکن تربیتی مراحل میں چونکہ ہر بات کا اندیشہ ہوتا ہے اور پھر آئندہ بھی انہیں احکام کو قیامت تک امت کیلئے مشعلِ راہ بننا تھا۔ اس لئے یہ حکم قرینِ تربیت تھا بلکہ تربیت کا تقاضا تھا اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ برابر اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی نگاہ کبھی چوکتی نہیں اور نہ اسے کبھی اونگھ آتی ہے۔ یہ وہ تصور ہے کہ

Marfat.com

جب دل و دماغ میں اتر کر عقیدے کی مضبوط بن جاتا ہے تو پھر وہ تقویٰ کی قوت پیدا ہوتی ہے جو انسان کو ہمیشہ راہ راست پر رہنے کی ضمانت دیتی ہے۔

دوسری آیتِ کریمہ میں مزید ایک بات کا حکم دیا گیا ہے اور اس حکم کے مخاطب بھی آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔ جس طرح اللہ سے سرکشی ایک بہت بڑا جرم ہے اسی طرح دشمن کی طرف جھک جانا اور اس کی طرف مائل ہو جانا بھی مشکل حالات میں اسلامی قوت کیلئے بہت نقصان دہ ہے۔ یہ سورت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں اسلام کے پاس خطرناک حد تک افرادی قوت کی کمی تھی۔ دشمن ہر قیمت پر ایمان کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسے حالات میں چھوٹی سے کمزوری بھی بُرے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ ایسی کمزوریوں کا آغاز ہمیشہ ایسی ہی باتوں سے ہوتا ہے۔ مشکل حالات میں کھڑے رہنے کیلئے ایک مضبوط جذبے کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں آدمی کا جھکاؤ دشمن کی طرف ہو جائے وہاں مقابلہ تو دور کی بات ہے، عہد وفا کے شکست ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اور سمجھدار دشمن ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں ہوتا ہے۔ عام لوگوں کے ساتھ معاملات کرتے ہوئے ہمیں نہایت رواداری کا حکم دیا گیا ہے لیکن فرعونِ وقت کے ساتھ جب تصادم شدت اختیار کر جائے تو پھر لب و لہجہ میں وہی کاٹ ہونی چاہئے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لب و لہجہ میں تھی۔ اس لئے قرآن کریم نے شدید رویہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تمہارا جھکاؤ اعدائے دین کی طرف ہو گیا تو اندیشہ ہے کہ تمہیں آگ نہ آ پکڑے، یعنی تمہارا انجام بھی وہی ہو۔ ایسی صورت میں پھر کوئی تمہارا حامی و مددگار نہیں ہوگا اور نہ تم مدد کئے جاؤ گے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ ؕ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ ذٰلِکَ ذِکۡرٰی لِلذّٰکِرِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۱۵﴾

(سورۃ ھود: ۱۱۴، ۱۱۵)

(اور نماز قائم کیجئے دن کے دونوں سروں پر۔ اور کچھ رات کے حصوں میں۔ بیشک نیکیاں بُرائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کیلئے اور صبر کیجئے۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوبکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔)

نماز سے استقامت پر مدد لیجئے

گزشتہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دنوں میں یہ آیات نازل ہو رہی تھیں وہ دن وہ تھے جبکہ اذیت رسانی کی چکی پوری شدت سے گھوم رہی تھی۔ ان اذیتوں کی تاب نہ لا کر بہت سے لوگ ہجرت کر چکے تھے۔ جو پیچھے رہ گئے تھے انہیں پوری طرح تختۂ مشق بنایا جا رہا تھا۔ ایسے حالات میں استقامت دکھانا اور دشمن کی طرف معمولی جھکاؤ سے بھی بچنا بلکہ ان سے ترکِ تعلق کر دینا نہایت مشکل کام تھا۔ ایسا کٹھن کام اللہ کی مدد اور نصرت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اسی مشکل کو آسان بنانے کیلئے پروردگار مسلمانوں کو ایک ایسا فارمولا بتا رہے ہیں جس پر عمل کر کے مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں۔ وہ فارمولا یہ ہے کہ دن کے دونوں طرفوں میں نماز کا اہتمام کرو۔ اور رات کے بھی کسی حصے میں اللہ کے سامنے نماز کیلئے قیام کرو۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے تمہارا رشتہ اللہ سے مضبوط ہو جائے گا۔ اللہ سے تمہارا تعلق اس قدر پختہ ہو جائے گا کہ تم بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی کبھی اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھو گے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ سورت معراج شریف سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر دن کے دونوں اطراف کی نماز سے مراد فجر اور مغرب ہو سکتی ہے اور قیام لیل سے عشاء بھی مراد لی جا سکتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تہجد مراد لی جائے کیونکہ صبح شام کی دو نمازیں پنج وقتہ نماز سے پہلے بھی مشروع تھیں اور تہجد کی نماز کا پڑھنا تو ضروری تھا۔ چنانچہ طلوع آفتاب سے پہلے فجر کی نماز دن بھر کی مشکلات پر قابو پانے کا ذریعہ تھی۔ اور رات کی نماز اللہ سے توفیق مانگنے کا اور ہمت طلب کرنے کا ایک مؤثر واسطہ تھی۔ نماز ایک عظیم فریضہ ہے جس میں ایک طرف تو آدمی اللہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ ہاتھ اٹھا کر جب نیت باندھتا ہے تو تمام دنیا سے ترکِ تعلق کا اعلان کرتا ہے اور دونوں ہاتھ باندھ کر اللہ کی غلامی کا نہ صرف اقرار کرتا ہے بلکہ اس پر کمر ہمت باندھ لیتا ہے۔ پھر اسی غلامی کا اظہار کبھی رکوع کی شکل میں ہوتا ہے اور کبھی سجود کی شکل میں اور کبھی قعود کی حالت میں۔ پھر اس میں تسبیحات اللہ سے مناجات کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ اس میں دعائیں پگھلتے ہوئے دل کی داستان دہراتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہر رکن کی ادائیگی پر اللہ اکبر کا اعلان انسان کو ایک ایسی بے کراں قوت سے جوڑ دیتا ہے جس کے بعد کسی کمزوری کا احساس باقی نہیں رہتا۔ ایک طرف بندگی کے تمام تقاضے پورے ہوتے ہیں اور دوسری طرف عظمت اور قوت دل میں اترتی چلی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ کوئی آستان نظروں میں جچتا ہے اور نہ تخت و تاج کے لوگ نگاہوں میں بستے ہیں۔ کیفیت یہ ہوتی ہے کہ:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

Marfat.com

صبر بھی ذریعۂ استقامت ہے

اس فارمولے کا دوسرا حصہ صبر پر عمل کرنا ہے۔ صبر بے بسی کا نام نہیں۔ اور نہ طاقت وقوت دیکھ کر حق سے دستبردار ہوجانے کا نام ہے بلکہ صبر ایک ایسی قوت ہے جوانسان کو کسی ظلم کے سامنے جھکنے نہیں دیتی۔ کسی تخت کے سامنے سجدہ ریز نہیں ہونے دیتی۔ وہ حق وصداقت کا علمبردار بن کر اٹھتا ہے تو اس راستے میں آنے والی مشکلات اس کے نزدیک سامانِ سفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ کٹ سکتا ہے لیکن جھکنا نہیں جانتا۔ چنانچہ جب ایک مسلمان نماز سے بندگی اور عظمت کا راز پاکر اور صبر سے استقامت کا درس لے کر اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ نماز اور صبر سے جو کردار وجود میں آتا ہے اسے صرف نیکی نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ برترین نیکی ہے جس کے آگے نیکی کا کوئی مقام نہیں اور اسی مقام کو مقامِ احسان کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ احسان پر عمل کرنے والوں کا اجر کبھی ضائع نہیں فرمایا۔ ضائع تو وہ کسی کا اجر بھی نہیں کرتا لیکن اس میں ایک طرح کی ضمانت دی گئی ہے اور مقام کی بلندی کی خبر کی گئی ہے۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۚ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿١١٦﴾ (سورۃ ھُود : ۱۱۶)

(پس کیوں نہ ہوئے تم سے پہلے کی امتوں میں ایسے اہلِ خیر جو لوگوں کو زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے ؟ مگر تھوڑے ان میں سے جن کو ہم نے ان میں سے نجات بخشی، اور جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ اسی عیش میں پڑے رہے جس میں تھے اور وہ مجرم بن کر رہے۔)

مشکل الفاظ کی تشریح

تشریح سے پہلے مشکل الفاظ کا مفہوم:۔ اُولُوا بَقِيَّةٍ اس کا لفظی معنی ہے بقیہ والے۔ بقیہ کا معنی عقل ودانش بھی کیا جاتا ہے اور خیر وصلاح بھی۔ لیکن استعمال میں اس کے معنی میں وسعت آجاتی ہے۔ جب یہ کہیں کہ فلان بقية قومه تو اس کا معنی صرف یہ نہیں ہوتا کہ فلاں آدمی اپنی قوم کے اہلِ دانش میں سے ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے اخیار وصالحین میں سے ہے اور یہ بات واضح ہے کہ قوم کے اخیار جس طرح مکارمِ اخلاق کے پیکر ہوتے ہیں اسی طرح عقل ودانش میں بھی فائق ہوتے ہیں۔ اس لئے جن لوگوں نے اس کا ترجمہ اصحابِ خیر کیا ہے اس میں ایک طرح کی جامعیت پائی جاتی ہے۔

مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ اتراف، مال ودولت کی فراوانی کو کہتے ہیں۔ اترفه المال کے معنی ہوں گے کہ مال واسباب نے اس کو طغیان وفساد میں مبتلا کردیا تو مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ کا مفہوم ہوگا کہ اسبابِ عیش کی فراوانی نے ان کو جس سرمستی میں مبتلا کردیا تھا، اسی میں پڑے رہے۔

عذاب کے اسباب

گزشتہ ۶ رکوع میں جن معذب قوموں کا ذکر ہوا ہے، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بتایا جارہا ہے کہ ان پر نزول عذاب کے اسباب کیا تھے تاکہ مشرکینِ مکہ کو سمجھنے میں آسانی ہو کہ کہیں وہی اسباب ان میں موجود تو نہیں ہیں جن کی وجہ سے ان پر بھی عذاب نازل ہوسکتا ہو اور اگر وہ اسباب ان میں موجود ہیں تو انہیں ان کے دور کرنے کی فکر کرنی چاہئے ورنہ اللہ تعالیٰ کا عدل بے لاگ ہے، اس کے یہاں کوئی رورعایت نہیں، وہ ایک ہی ترازو سے سب کو تولتا ہے۔ جن اسباب سے محولہ بالا قومیں عذاب کی مستحق ٹھہریں، کوئی وجہ نہیں کہ کوئی اور قوم انہیں اسباب کی حامل ہوتے ہوئے، اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔

آیتِ کریمہ میں غور کرنے سے مندرجہ ذیل اسباب ذہنی افق پر ابھرتے ہیں۔ سب سے پہلا یہ ہے کہ جب کوئی قوم بگاڑ کا شکار ہوتی ہے، اس کے عقائد اور افکار میں گمراہی پیدا ہوجاتی ہے اور اس کے اعمال واخلاق بگاڑ کا شکار ہوجاتے ہیں تو اللہ کی طرف سے فوراً ان پر عذاب نازل نہیں ہوجاتا ہے بلکہ عذاب اس وقت اترتا ہے جب ان میں ایسے لوگ ختم ہوجاتے ہیں یا بہت کم رہ جاتے ہیں جو اپنی قوم کو برائی سے روکنے اور نیکی کی طرف مائل

Marfat.com

کرنے کی کوشش کریں، اور ایسا دو صورتوں میں ہوتا ہے، یا تو اس وقت جب قوم اتنی بانجھ ہو جاتی ہے کہ اس میں اچھے لوگ پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اور ان کا ماحول اور ان کی اجتماعی فضا اس قدر سمّیت کا شکار ہو جاتی ہے کہ وہاں خیر و صلاح کا کوئی پودا پروان نہیں چڑھتا اور دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اصحابِ خیر عزیمت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر کہ لوگوں کا اجتماعی ضمیر نیکی کی کسی بات کو قبول کر کے نہیں دیتا تو وہ اپنے گھروں میں سمٹ کر رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ صورت کوئی بھی ہو، حقیقت صرف یہ ہے کہ جب قوم کا بگاڑ انتہائی صورت اختیار کر جائے اور اس میں منکرات سے روکنے والے عزیمت کا راستہ چھوڑ دیں یا سرے سے پیدا ہی نہ ہوں تو ایسی قوم پر عموماً اللہ کا عذاب آ جاتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ قوم کے وسائلِ معیشت یا اقتدار کی چابیاں ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی جائیں جنہیں عیش و تنعم کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ ہو۔ خواہشاتِ نفس اور سفلی جذبات کی حکمرانی ہو جائے اور پیٹ کا دائرہ پھیل کر پوری زندگی پر حاوی ہو جائے اور ایسے لوگ قوم کے رہنما بن کے اٹھیں اور قوم بجائے کسی شریف آدمی کی بات سننے کے انہیں کی پیروی کرنے کو اپنے لئے کامیابی سمجھے تو ایسی قوم میں نیکی کے سوتے آہستہ آہستہ خشک ہو جاتے ہیں اور برائی کا احساس رفتہ رفتہ دم توڑ جاتا ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پوری قوم مجرموں کی قوم بن جاتی ہے جس میں ڈھونڈے سے نیکی کے آثار نہیں ملتے۔ وہ کہنے کو تو ایک قوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں برائیوں کا ایسا جھاڑ جھنکار ہے جسے اٹھا کر باہر پھینک دینے میں ہی گلشن کی زندگی ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ (سورۃ ھود: ۱۱۷)

(اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ناحق (ظلم سے) تباہ کر دے حالانکہ اس میں بسنے والے نیکوکار ہوں یا اصلاح میں سرگرم ہوں)

مفسرین کرام نے اس آیت کریمہ کے مختلف مفاہیم بیان کئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی غلط نہیں۔ اس لئے ہم انہیں ایک ترتیب سے بیان کر دیتے ہیں۔

ظلم کے مختلف مفاہیم

۱۔ ظلم سے مراد انفرادی خرابیاں ہیں، مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی قوم انفرادی طور پر بگڑ جائے اور اس کے اعمال و اخلاق میں خرابیاں پیدا ہو جائیں، معاملات میں بگاڑ پیدا ہو جائے لیکن اجتماعی طور پر اس کے ادارے درست کام کر رہے ہوں، منزل تبدیل نہ ہوئی ہو، جہت سفر میں بھی تغیر نہ آیا ہو اور اصلاح کیلئے کام کرنے والے لوگ اور ادارے اپنا اپنا فرض انجام دے رہے ہوں تو محض کسی قوم کے انفرادی گناہ اللہ کے عذاب کا موجب نہیں بنتے۔ کیونکہ اجتماعی حالت میں خیر غالب رہنے تک انفرادی زندگی کی اصلاح کی امید باقی رہتی ہے اور یہی امید ہے جو عذاب کو روکے رکھتی ہے۔ اسی کی طرف اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

۲۔ ظلم کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو بھی ناحق سزا نہیں دیتا۔ وہ ایسا رحیم و کریم ہے کہ اس سے ظلم کا صدور ممکن ہی نہیں۔ جس کسی فرد کو سزا ملتی ہے یا کسی قوم پر عذاب آتا ہے تو وہ اس کے عدل و انصاف کا اظہار ہوتا ہے۔ ورنہ بجائے خود وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ یہاں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ ظلم سے اور ناحق اللہ تعالیٰ کسی بستی کو ہلاک کر دے اس حال میں کہ بستی کے رہنے والے اصلاح کا کام کر رہے ہوں یا خود نیک ہوں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب بھی کسی قوم پر عذاب آیا ہے تو مت سمجھو کہ اللہ نے کسی کو بے سبب مارا ہے بلکہ اس قوم کی تاریخ اور ان کے حالات میں اس عذاب کے اسباب تلاش کرو، تو تمہیں مل جائیں گے۔

۳۔ ظلم سے مراد شرک ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ شرک اللہ کے یہاں کفر کے بعد سب سے بڑی گمراہی اور سب سے بڑا جرم ہے، لیکن اتنے بڑے جرم کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ شرک کرنے والی قوم کو بھی تباہ نہیں کرتا، اسے بھی مہلت دیتا ہے، بشرطیکہ اس مشرک قوم میں اصلاحِ اعمال جاری و ساری ہو۔ ان کی عدالتیں ٹھیک کام کر رہی ہوں، مظلوموں کو انصاف دیا جا رہا ہو، ان کے رفاہی ادارے اپنا فرض انجام دے رہے ہوں، ان کا کاروبار ٹھیک بنیادوں پر چل رہا ہو، لوگوں کی جان و مال اور عزت محفوظ ہو تو قدرت ایسی قوم کو تباہ نہیں کرتی۔ جہاں تک ان کے شرک و کفر کا تعلق ہے اس کی سزا انہیں آخرت میں ملے گی۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ قومیں شرک اور کفر سے زندہ رہ سکتی ہیں لیکن ظلم سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔

Marfat.com

وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ ؕ وَلِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ کَلِمَةُ رَبِّکَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ (سورۃ هود : ۱۱۸، ۱۱۹)

(اور اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا سکتا تھا اور اب تو وہ مختلف طریقوں پر چلتے رہیں گے، بجز ان کے جن پر تیرا رب رحم فرمائے اور اسی لئے ان کو اس نے پیدا کیا ہے اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔)

ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں قانونِ الٰہی

ان دو آیتوں میں دفع دخلِ مقدر بھی ہے اور قانونِ ہدایت وضلالت کی وضاحت بھی۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ طبیعتوں میں اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مشیت سے ہی ہو رہا ہے۔ کیا وہ اپنی مشیت سے یہ نہیں کر سکتا تھا کہ تمام انسانوں کو ایک امت بنا دیتا۔ سب اللہ کی توحید کو ماننے والے ہوتے، کفر اور شرک سے نفرت کرنے والے، اسی کی یاد سے اپنے سینوں کو آباد کرنے والے اور انحراف کے راستوں سے کوسوں دور بھاگنے والے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ کسی کے جہنم میں جانے کا خدشہ نہ ہوتا، سب لوگ دنیا میں بھی ایک دوسرے کے ہمدرد و غمگسار ہوتے اور آخرت میں جنت کی نعمتوں سے شادکام ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے کفر اور ایمان کی آزادی دے کر انسانوں کو ایک بہت بڑے خطرے میں مبتلا کر دیا ہے۔

چنانچہ اس کا جواب دیتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بات بعید نہیں، وہ چاہتا تو وہ سب کو ایک امت بنا دیتا، لیکن اگر اس کو ایسا ہی کرنا ہوتا تو پھر جن وانس کی تخلیق کی ضرورت کیا تھی۔ فرشتے ایک ہی امت بن کر جی رہے تھے۔ ان میں اللہ کے احکام سے نافرمانی کا جذبہ ہی پیدا نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے وہ ہمہ وقت اس کی فرمانبرداری میں لگے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہوا، اس کی حکمت نے یہ چاہا کہ میں ایک ایسی مخلوق پیدا کروں جنہیں خیر وشر کے حوالے سے آزادی دوں۔ لیکن خیر وشر کی پہچان کیلئے انہیں عقل سے نوازوں، قوتِ امتیاز بخشوں، پھر مزید آسانی کیلئے اپنے رسول بھیجوں اور کتابیں نازل کروں تاکہ جو بلید لوگ اپنے تئیں نہ سمجھ سکیں وہ بار بار کی یاددہانی اور تبلیغ ودعوت سے سمجھ جائیں لیکن میں کسی طرح ان پر جبر نہ کروں، نہ کسی کو زبردستی ایمان دے کر جنت کے راستے پہ ڈالوں اور نہ کسی کو ایمان سے محروم رکھ کر جہنم کا مستحق بناؤں۔ ہدایت ورشد کی ایک ایک بات واضح کر دی جائے اور سرکشی اور نافرمانی کا نقصان اور انجام بھی کھول کر بیان کر دیا جائے اور پیغمبر اپنی عملی زندگی سے ان دونوں چیزوں کو کھول کھول کر بیان کر دیں۔ اس کے بعد انسان کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ چاہے ایمان وتسلیم کا راستہ اختیار کرے اور چاہے کفر اور طغیان کا۔ اگر وہ زبردستی سب کو مومن بنا دیتا تو یہ اسی طرح جبر ہوتا اور قابلِ مذمت ہوتا جس طرح کسی کو زبردستی کافر اور گمراہ بنا دینا ظلم اور قابلِ مذمت ہے۔ اللہ کے اس قانون کے نافذ ہو جانے کے بعد اب اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی یا برائی میں جبر سے کام لے گا۔ اب تو لوگ برابر ایک دوسرے سے مختلف راستہ اختیار کریں گے اور اس پر چلتے رہیں گے۔ لیکن اس کی ذمہ داری ان پر ہوگی۔ اور اسی ذمہ داری کے حوالے سے قیامت کے دن وہ ماخوذ ہوں گے۔ البتہ جو شخص اپنی رائے اور عقل کی آزادی سے صحیح راستے کا انتخاب کرے گا اور اللہ سے اس کیلئے توفیق مانگے گا تو اللہ فرماتا ہے کہ وہ میرے رحم کا مستحق ہوگا۔ چنانچہ ہدایت وضلالت کے اعتبار سے اللہ کا یہ وہ قانون ہے جس کا ہر ایک شخص کو پابند کیا گیا ہے اور اسی قانون کی بالادستی میں ہر انسان کی آزمائش ہے اور اسی لئے تمام انسانوں کو اللہ نے پیدا فرمایا ہے کہ وہ عقل وقوتِ امتیاز کی آزادی لے کر اس کا صحیح استعمال کرتے ہیں یا غلط استعمال کرتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ شیطانی قوتیں ہمیشہ انسان کے بگاڑ میں لگی رہتی ہیں۔ تو یہ بات چنداں قابلِ تشویش نہیں، کیونکہ اگر ایک طرف شیطانی قوتیں اپنا کام کر رہی ہیں تو دوسری طرف انبیاء ورسل اور ان کے راستے پر چلنے والے مصلحین ہمیشہ اصلاحی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔ البتہ ان کی کوششوں کے باوجود بھی جو لوگ شیطان کی پیروی کرتے ہوئے اس کے راستے پر چلیں گے تو یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب شیطان کو جنت سے نکالا تھا اور پھر اسے اور حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کو دنیا میں بھیجا تھا تو شیطان نے سرکشی دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ پروردگار آپ نے [illegible] آدم کو سجدہ نہ کرنے کے جرم میں جس طرح راندۂ درگاہ ٹھہرایا ہے، میں اس کا آدم کی اولاد سے انتقام لوں گا۔ میں ان کے چاروں طرف سے حملہ آور ہوں گا۔ آپ دیکھیں گے کہ میری کوششوں کے نتیجے میں بہت کم لوگ آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا تھا کہ اس سے میری خدائی میں کیا کمی واقع ہوگی۔ تجھے بھی ا[illegible]ر تیرے پیروکاروں کو بھی میں جہنم میں پھینکوں گا اور تیرے

Marfat.com

جیسے لوگوں ہی سے جہنم کو بھروں گا۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ بات جو پروردگار نے شیطان سے فرمائی تھی لوگوں کا کفر پر اصرار اور اللہ پر ایمان سے انکار کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ثابت ہو کے رہے گا کہ انہیں لوگوں سے جہنم بھرا جائے گا۔

وَ كُلًّا نَّقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَکَ ۚ وَ جَآءَکَ فِیْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَ مَوْعِظَةٌ وَّ ذِکْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۱۲۰

(سورۃ ھود : ۱۲۰)

(اور ہم رسولوں کی سرگزشتوں میں سے ہر ایک تمہیں سنا رہے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کو مضبوط کرتے ہیں اور ان میں تمہارے پاس حق آیا ہے اور مومنوں کیلئے ان میں نصیحت اور یاددہانی ہے۔)

معذب قوموں کے واقعات سنانے سے مقصود

گزشتہ معذب قوموں کی سرگزشتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہم ان قوموں کی سرگزشتیں آپ کو اس لئے سناتے ہیں کہ آپ کو ان سے حوصلہ پیدا ہو۔ آپ کی قوم آپ سے جو بہیمانہ سلوک کر رہی ہے اور جس طرح اس نے اذیت رسانی کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے ان کا سامنا کرنا یقیناً ایک مشکل ترین کام ہے اور آپ اس مشکل کام کو خندہ پیشانی سے انجام دے رہے ہیں لیکن جب آپ محولہ بالا پیغمبروں کے واقعات دیکھیں گے تو آپ کو اس سے حوصلہ ملے گا۔ اس راستے پر چلنے والے صرف آپ ہی نہیں ہر دور کے پیغمبر کو ان راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ان میں سے بعض نے تو صدیوں تک ناقابلِ برداشت تکلیفیں اٹھائی ہیں لیکن کبھی اپنے اللہ سے شکایت نہ کی۔ انہیں یقین تھا کہ فتح و کامرانی ہمارا مقدر ہے۔ ہم حق پر ہیں تو یقیناً اللہ آپ کا ساتھ دے گا۔ اور آپ نے دیکھا ہے کہ پھر اللہ نے ان کا ساتھ دیا۔ ان کی قومیں تباہ کر دی گئیں اور اللہ نے انہیں نہ صرف نجات دی بلکہ سرفراز بھی فرمایا۔

دوسری بات یہ بیان فرمائی کہ ان سرگزشتوں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی بات ایسی نہیں فرمائی گئی جس میں غلطی کا امکان ہو۔ اس میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے اس کا ایک ایک لفظ حق اور سچ ہے۔ اس کی تاریخ حقائق پر مبنی ہے۔ یہ محض تاریخی افسانے نہیں بلکہ ایسے سچے واقعات ہیں جس سے قوموں کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ ان واقعات سے نہایت آسانی سے آپ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ کے نبی کا حق لے کے آنا اور قوم کا اسے قبول کرنے سے انکار کر دینا اور پھر برسوں تک اس کشمکش کا جاری رہنا اور بالآخر قوم کا اپنے انکار کی پاداش میں عذاب کا شکار ہونا اور پیغمبر اور ایمان لانے والوں کا نجات پا جانا یہ وہ حق ہے جو سبق دینے کیلئے کافی ہے کہ آپ اطمینان سے اپنا کام کرتے جائیں، کامیابی آپ کا مقدر ہے اور آپ کا انکار کرنے والے اگر اپنی روش نہیں بدلیں گے تو تباہی اور ہلاکت ان کے انتظار میں ہے۔

ان ہی واقعات میں اہلِ ایمان کیلئے موعظت اور یاددہانی ہے۔ وہ ان سرگزشتوں کو بار بار پڑھیں اور پھر ان سے وہ باتیں اخذ کریں جو اس دور کے اہلِ ایمان کا سرمایہ تھیں اور جن باتوں کی وجہ سے وہ اللہ کی عنایات کے مستحق ٹھہرے۔ اور ان باتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں جن سے بچنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اور جن باتوں پر بعض دفعہ گرفت بھی کی گئی اور پھر اس پر پیغمبر اور اصحابِ ایمان کا رویہ دیکھیں کہ کس قدر انہوں نے توبہ و استغفار سے اپنے اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۝۱۲۱ وَ انْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝۱۲۲

(اور اے پیغمبر کہہ دیجئے ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لا رہے ہیں کہ تم اپنے طریقے پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کام کئے جاتے ہیں اور تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں۔)

(سورۃ ھود: ۱۲۱، ۱۲۲)

مخالفین کو فیصلہ کن جواب

ان آیتوں میں کلامِ خداوندی کے تیور بدلے ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ نے اب تک ریشمی لب و لہجہ میں قریشِ مکہ کو اللہ کے دین کی طرف بلایا لیکن ان کی طرف سے اذیتوں اور مخالفتوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ انہوں نے آپ کی دعاؤں کے جواب میں بھی بدزبانی کی، اللہ کے کلام کا تمسخر اڑایا۔ یہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کسی اندھے راجے کی نگری ہے جس میں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ کاش انہیں اس بات کا یقین

Marfat.com

ہوتا کہ اس دنیا کا خالق و مالک بڑی قدرتوں کا مالک ہے۔ وہ کمزور حکمرانوں کی طرح پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا لیکن جب پکڑتا ہے تو پھر اس کی گرفت سے نکل کوئی نہیں سکتا۔ اب آپ ان سے لہجہ بدل کر صاف صاف فرما دیجئے کہ میں تم سے براءت کا اعلان کرتا ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ تمہاری ساری ژاژخایوں کے بدلے میں ہم اپنی ذمہ داریوں سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ تم سے جو ہوسکے کر گزرو اور اپنا کام جاری رکھو۔ ہم تمہیں برابر اللہ کے دین کی طرف دعوت دیتے رہیں گے اور وہ دیکھنے والا تمہیں بھی دیکھے گا اور ہمیں بھی دیکھے گا اور اس کے بعد کیا ہوگا جس کی نگاہوں میں انبیاء کرام اور ان کی قوموں کی تاریخ ہے وہ جانتا ہے۔ اس لئے میں تمہیں بار بار اللہ کے عذاب سے ڈراتا ہوں کیونکہ تم نے اپنے رویئے سے عذاب کے تمام امکانات پیدا کردیئے ہیں لیکن عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ تم بھی انتظار کرو، ہم بھی انتظار کریں گے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

(اور اللہ ہی کیلئے آسمانوں اور زمین کا غیب۔ اور وہی تمام امور کا مرجع ہے۔ تو اسی کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو، تیرا رب اس سے بے خبر نہیں۔) (سورۃ ہود: ۱۲۳)

قریشِ مکہ کو فیصلہ کن جواب دینے کے بعد آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آئندہ چل کر کیا ہونے والا ہے، غیب میں کیا فیصلے منتظر ہیں، اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں، سارے معاملات اسی کو طرف لوٹائے جاتے ہیں، وہی تمام امور کا مرجع ہے اور تمام اختیارات کا مالک۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ آپ اسی کی بندگی بجالاتے رہیں اور اسی پر بھروسہ کریں۔ مخالفین جو کچھ کرتے ہیں اور جو کچھ آپ کرتے ہیں وہ کسی بات سے بھی بے خبر نہیں۔ آپ کی نیازمندیاں بھی اس کے علم میں ہیں اور اس کی عنایات برابر آپ پر برس رہی ہیں اور مخالفین کی جسارتیں بھی اس سے مخفی نہیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اس بے نیاز ذات کی پکڑ کتنی شدید ہے۔

صدق اللہ العظیم

Marfat.com

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ [illegible]

کیا ایمان والوں کیلئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی [illegible]

هُدًى لِلنَّاسِ

جدید اسلوب میں تفسیری نکات پر مشتمل

تفسیر روح القرآن

(جلد: ۵)

(سُورَةُ الْاَنْفَال) ...... تا ...... ([illegible])

مؤلف

[illegible]

[illegible]

Marfat.com